تفسیر نعیمی

شیخ التفسیر حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر
نعیمی کتب خانہ
مفتی احمد یار خان روڈ چوک پاکستان، گجرات

اشرف التفاسیر

تفسیر نعیمی

پارہ نمبر ۴

شیخ التفسیر حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر
نعیمی کتب خانہ
مفتی احمد یار خان روڈ ۰ چوک پاکستان۔ گجرات،

نام کتاب ———— تفسیر نعیمی پارہ ۱۳ مکمل۔

نام مصنف ———— صاحبزادہ مفتی اقتدار احمد خان یوسف زئی، بدایونی ابن حضرت حکیم الامت مفتی احمد یار خان اشرفی قادری بدایونی

ناشر کتاب ———— نعیمی کتب خانہ محلہ مسلم آباد مفتی احمد یار خان روڈ گجرات پاکستان

تعداد پہلی بار ———— گیارہ سو عدد ۱۱۰۰

سن اشاعت ———— دسمبر 2003ء اور ۱۴۲۴ ہجری شوال

مطبع ———— اصغر پریس لاہور

سرٹیفکیٹ

تین بار اس کی تصحیح کی گئی، اور عربی آیت کی تصحیح تین عدد قرآن مجید سے کی گئی ۱ مکتبہ قرآن کمپنی پیکو $\frac{9}{4}$ ۲ تاج کمپنی ۵۲ پاکستان ۳ مثل تاج کمپنی مطبع دہلی انڈیا تین حضرات نے تصحیح فرمائی۔ ۱ صاحبزادہ مفتی اقتدار احمد خان ۲ صاحبزادہ الحاج محمد عبد القادر خان۔ ۳ مولانا مولوی نذیر احمد مغل صاحب۔

التماس

حتی الامکان کوشش و جانفشانی سے حرفاً حرفاً، اس کی اردو عربی تصحیح کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود اگر کسی صاحب کو اردو یا عربی کی کوئی غلطی نظر آئے تو براہ کرم پورے حوالے کے ساتھ۔ یعنی صفحہ نمبر سطر نمبر لکھ کر ہم کو آگاہ فرمائیں ہم شکر گزار ہوں گے۔ اجر و ثواب کی امید رب تعالیٰ کی بارگاہِ قدس سے ہے۔
شکراً مع الاحترام۔

ادارہ نعیمی کتب خانہ گجرات

فہرست مضامین تفسیر نعیمی پارہ چہارم

کتاب	تفسیر نعیمی پارہ سوم
مصنف	حضرت حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی رحمتہ اللہ علیہ
ناشر	نعیمی کتب خانہ مفتی احمد یار خان روڈ، گجرات
تعداد	گیارہ سو
سال اشاعت	2002ء
ہدیہ	

تقسیم کار

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا گنج بخش روڈ، لاہور۔فون:۔7221953

فیکس:۔7238010

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ۬ؕ

ہرگز نہ پاؤ گے تم بھلائی کو یہاں تک کہ خرچ کرو اس سے جو تم پسند کرتے ہو

تم ہرگز بھلائی کو نہ پہنچو گے جب تک راہ خدا میں اپنی پیاری چیز

وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیۡمٌ ﴿۹۲﴾

اور جو خرچ کرو گے تم کسی چیز سے پس بے شک اللہ اسے جاننے والا ہے

نہ خرچ کرو اور تم جو کچھ خرچ کرو اللہ کو معلوم ہے

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ قیامت میں اگر کفار زمین بھر سونا بھی فدیہ دے دیں تو عذاب سے نہیں بچ سکتے اب ارشاد ہو رہا ہے کہ مسلمان اگر اپنی تھوڑی سی پیاری چیز بھی خیرات کریں تو عذاب سے بچ ہی جائیں گے۔ اللہ کی رحمتیں بھی پالیں گے غرضکہ پچھلی آیت میں مردودین کا ذکر تھا اس میں محبوبین کا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اس وقت کا ذکر تھا جب خیرات یا تمنائے خیرات بیکار ہوگی یعنی قیامت کا دن، اب اس وقت کا ذکر ہو رہا ہے جبکہ ہر قسم کا صدقہ وخیرات مقبول ہے، یعنی زندگی کا زمانہ، جیسے بے وقت بویا ہوا بیج پھل نہیں دیتا، ایسے ہی بے وقت دیا ہوا صدقہ بھی پھل نہیں دیتا، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں موت کے بعد بے فائدہ آرزو کا ذکر تھا اس میں فائدہ مند صدقہ اور تمنائے صدقہ کا ذکر ہے۔

تفسیر

لَنۡ تَنَالُوا عربی زبان میں یہ وسعت ہے کہ اس میں ایک معنی کے لئے کئی لفظ موجود ہیں جو تھوڑے فرق کے ساتھ مختلف مقامات پر استعمال ہوتے ہیں اور زبانوں میں یہ فراوانی نہیں، دیکھو نفی کے لئے اردو میں ''نہیں'' فارسی میں ''نے'' پنجابی میں ''ناہیں'' اور انگریزی میں ''نو (No)'' ہے، اور ایجاب کے لئے اردو میں ''ہاں'' فارسی میں ''ہست'' انگریزی میں ''یس (YES)'' اور پنجابی میں ''آہو'' ایک ہی ایک لفظ ہے مگر عربی میں نفی کے مَا، لَا، لَنۡ، لَمۡ، لَیۡسَ، اِن نافیہ وغیرہ بہت سے حروف ہیں، اور ایجاب کے لئے نَعَمۡ، بَلٰی، اَجَلۡ، جَیۡرِ، اِیۡ وغیرہ بہت سے الفاظ ہیں جن میں سے ہر ایک کا استعمال حسب موقعہ ہوتا ہے۔ دیکھو اِلَّا، غَیۡرَ، دُوۡنَ، حَاشَا، خَلٰی، عَدَا ان سب کے معنے سواء ہیں لیکن ان کے موقع استعمال جدا جدا ہیں، اگر کوئی کلمہ طیبہ میں بجائے اِلَّا کے دون پڑھے اور کہے لَا اِلٰهَ دُوۡنَ اللّٰهِ تو یہ کلمہ بجائے توحید کے کلمہ شرک ہو جائے گا، انہی فرقوں کا لحاظ کئے بغیر لوگوں نے ترجمے کئے اور گمراہ ہوگئے، یہاں لَا یا لَمۡ ارشاد نہ ہوا بلکہ لَنۡ فرمایا گیا کیونکہ لَنۡ مستقبل کی تاکیدی نفی کرتا ہے، یہ بات دوسرے حرف نفی سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ تَنَالُوۡا نَیۡلٌ سے بنا بمعنے پانا، حاصل کرنا، پہنچ جانا، کبھی ناراضی کو بھی نیل کہہ دیتے ہیں کیونکہ اس سے فریقین کو تکلیف پہنچتی ہے مگر اس کے بعد مِن آتا ہے یہاں بمعنے پانا

رسولوں کے قصے آپ کو سنا دیئے۔ ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں لہٰذا اگر یہاں تِلْکَ الرُّسُلُ سے وہ انبیاء ورسول مراد ہوں جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ تو بعض رسول ہوں گے اور اگر وہ رسل مراد ہوں جو حضور کے علم میں ہیں۔ تو سارے رسول مراد ہوں گے اَلرُّسُلُ یہ رسول کی جمع ہے جس کے لغوی معنی ہیں۔ قاصد اصطلاح میں رسول وہ باکمال مرد ہیں۔ جو رب کی طرف سے تبلیغ کے لئے بھیجے گئے۔ اوران کے ساتھ کوئی نئی یا پرانی آسمانی کتاب بھی ہو؟ نبی میں کتاب کی قید نہیں لہٰذا ہر رسول نبی ہے۔ اور ہر نبی رسول نہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نبی ایک لاکھ چوبیس ہزار (۱۲۴۰۰۰) یا کم وبیش ہیں۔ اور رسول تین سو تیرہ (۳۱۳) مگر کبھی رسول بمعنی نبی بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں ایسا ہی ہے۔ خیال رہے کہ رسول لغوی معنی سے فرشتے بھی ہیں۔ رب فرماتا ہے۔ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ (فاطر:۱) اور فرماتا ہے اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا مِّنَ النَّاسِ (حج:۷۵) مگر شرعی معنی سے رسول صرف انسان ہیں۔ یعنی مبعوث مِنَ اللّٰهِ لِلتَّبْلِیْغِ صرف انسان ہی رسول ہوئے۔ حضرت جبرائیل وغیرہ علیہم السلام نہ کسی قوم کے مبلغ ہوئے نہ کوئی قوم ان کی امت ہوئی۔ قرآن کریم میں جب رسول مطلق ہوتا ہے تو اس سے شرعی رسول یعنی انسان پیغمبر مراد ہوتے ہیں۔ جیسے رجل سے مراد صرف انسان مرد ہیں۔ اگرچہ جنات کو رجال فرمایا گیا ہے۔ بہرحال مِنَ الْجِنِّ رب فرماتا ہے۔ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (بقرہ:۲۸۵) لہٰذا یہاں انسان رسول مراد ہیں۔ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یہ تفضیل سے بنا جس کا مادہ فضل ہے۔ بمعنی بزرگی تفضیل فضیلت عطاء کرنے یا کسی وصف خصوصی میں ممتاز کرنے کو کہتے ہیں۔ یا تو تِلْکَ الرُّسُلُ مبتدا تھا۔ اور یہ اس کی خبر یا مبتدا اور رُسُلُ اسی جملہ سے مل کر خبر یعنی یہ وہ رسول ہیں جن میں بعض کو بعض سے ہم نے بزرگی دی۔ اور خاص صفتوں سے ممتاز فرمایا۔ یا یہ انبیاء مذکورین بعض بعض سے افضل ہیں۔ خیال رہے کہ یہ فرق نبوت کے سوا دیگر اوصاف میں ہے نبوت میں سب یکساں ہیں۔ اسی لئے تِلْکَ الرُّسُلُ میں سب کو شامل فرما کر فرق مراتب بیان فرمایا گیا رسول وہ ہی ہوسکتا ہے جو بھیجنے والے سے لے سکے اور جس کی طرف بھیجا گیا ہے اسے دے سکے کہ اس کے بغیر رسالت ناممکن ہے۔ اسی وجہ سے رسول کی نسبت بھیجنے والے سے کی جاتی ہے اور جس کی طرف بھیجا گیا اس سے بھی۔ حضور اللہ کے بھی رسول ہیں یعنی اس سے لینے والے اور ہمارے بھی رسول یعنی ہم کو دینے والے جو کہے رسول کچھ نہیں دیتے وہ درحقیقت ان کی رسالت کا انکار کر رہا ہے۔ ایسے ہی جو کہے اللہ نے رسول کو کچھ نہ دیا وہ بھی ان کی رسالت کا منکر ہے۔ جب ان میں رب سے لینے ہم کو دینے کی طاقت نہیں تو وہ رسول کیوں کہلائے۔ خلق اور خالق میں رشتہ قائم کرنے والے رسول ہی تو ہیں۔ ورنہ خلق تو خالق سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ پھر جیسے رب تعالیٰ نے آسمان کے تارے زمین کی تاثیریں اور دیگر تمام مخلوق میں فرق مراتب رکھا۔ تاروں کی روشنیاں اور رنگ مختلف صفات الٰہیہ کے مظہر ہیں۔ اسی اجمال کی کچھ تفصیل یہ ہے۔ کہ مِنْهُمْ مَّنْ کَلَّمَ اللّٰهُ اس ضمیر کا مرجع رُسُل ہیں کَلَّمَ کلام سے بنا کلام بامعنی منظوم الفاظ کا نام ہے۔ بندہ سے رب کا کلام چند طرح ہوتا ہے۔ ایک دل میں ڈال کر جسے وحی خفی کہتے ہیں۔ ایک حجاب کے پیچھے سے۔ ایک بواسطہ ایک بلاواسطہ ظاہر ہو کر اس کا ذکر سورہ شوریٰ میں بھی ہے۔ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ الخ (شوریٰ:۵۱) یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔ یعنی پس پردہ بلا واسطہ فرشتہ کلام فرمانا۔ اور مَنْ سے موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے۔ رب نے ان سے کوہ طور پر بلا واسطہ فرشتہ کلام کیا۔

کرلیا (بیضاوی و خازن) حضرت عمر ابن عبدالعزیز مصری کی بوریاں خرید کر خیرات کرتے تھے، کسی نے کہا کہ آپ اس کی قیمت ہی کیوں خیرات نہیں کردیتے؟ فرمایا مجھے مصری پیاری ہے لہٰذا یہی خیرات کرتا ہوں اور یہی آیت پڑھی (تفسیر مدارک) حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابوموسیٰ اشعری کو لکھا کہ میرے واسطے ایک لونڈی خرید کر بھیجو، آپ نے بھیج دی، وہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بہت پسند آئی، آپ نے یہی آیت پڑھ کر اسے فی سبیل اللہ آزاد کردیا (خزائن و خازن) بعض علماء فرماتے ہیں کہ جب انسان کو خود مال کی حاجت ہو پھر اس میں سے خیرات کرے تو اس کا بڑا درجہ ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے:
وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر:۹)

فوائد

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** مسلمان کو اعمال نیک سے بے نیاز نہیں ہونا چاہئے۔ جو بن پڑے نیکی کرے دیکھو رب تعالیٰ نے صحابہ کرام جیسی ہستیوں کو بھی صدقہ و خیرات کا حکم دیا۔ ایمان جڑ ہے اور اعمال شاخیں، پھل وہی کھائے گا جو درخت کی جڑ اور شاخوں دونوں کی حفاظت کرے۔ **دوسرا فائدہ:** سارا مال خیرات نہ کرے کچھ اپنے اور بال بچوں کے لئے بھی رکھے جیسا کہ مِمَّا کی مِن تبعیضیہ سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** صرف ایک ہی قسم کا مال خیرات نہ کرے بلکہ بقدر طاقت ہر قسم کا مال خیرات کرے جیسا کہ ما کے عموم سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** صرف صدقات واجبہ اور فرضیہ پر قناعت نہ کرے بلکہ نفلی صدقے بھی کیا کرے، ہر جگہ دانہ پھینکو نہ معلوم کون سا اگ جائے، یہ بھی ما کے عموم سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** صرف ایک بار خیرات پر قناعت نہ کرے بلکہ جب تک ہو سکے کرتا رہے جیسا کہ تُنْفِقُوْنَ کے مضارع سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** ردی اور خراب چیزوں کی ہی خیرات نہ کرے بلکہ اعلیٰ درجہ کی چیزیں بھی خیرات کرے جو اپنے کو بڑی پیاری ہیں جیسا کہ تُحِبُّوْنَ سے معلوم ہوا، رب تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ (بقرہ:۲۶۷) **ساتواں فائدہ:** ہمیشہ خوش دلی سے خیرات کرے، خیرات کو بوجھ نہ سمجھے، اس بارگاہ عالی میں صرف مال کی مقدار نہیں دیکھی جاتی بلکہ دل کا حال پہلے دیکھا جاتا ہے جیسے کہ شَيْئًا کی تنکیر سے معلوم ہوا۔ **آٹھواں فائدہ:** مسلمان بعض بڑی تاریخوں میں خاص مرغوب چیزیں خیرات کرتے ہیں جیسے شب برات میں حلوا، عید میں سویاں، بقرعید میں گوشت عاشورہ کے دن حلیم وغیرہ، ان خیراتوں کا ماخذ یہی آیت کریمہ ہے کہ یہ کھانے مسلمانوں کو پیارے ہیں، حدیث شریف میں ہے کہ مسلمان میٹھا ہے میٹھی چیز پسند کرتا ہے، اور حدیث میں ہے کہ کھانوں کا سردار گوشت ہے وغیرہ مسلمان چاہتے ہیں کہ محبوب راتوں میں محبوب چیز خیرات کی جائے۔ **نواں فائدہ:** بعد موت میت کی طرف سے اس کے اہل قرابت میت کی پیاری اور مرغوب چیز خیرات کرتے ہیں، اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے وصایا شریف میں ان کھانوں کی فہرست بتائی ہے جو آپ کو مرغوب تھے اور ان کے خیرات کرنے کی وصیت کی ہے اس کا ماخذ بھی یہی آیت ہے کہ نائب کا فعل اپنا ہی فعل ہوتا ہے، اپنی طرف سے خیرات کرو تو اپنی محبوب چیز، اور دوسرے کی طرف سے اس کی محبوب چیز، **دسواں فائدہ:** بعض لوگ پیاری چیزیں خیرات کرتے ہیں اور پیاروں کو دیتے ہیں، یہ مسئلہ بھی اس آیت سے نکل

رائے کو قوت ملتی ہے۔ بِرُوْحِ الْقُدُسِ یہاں موصوف کی اضافت صفت کی طرف ہے روح حضرت جبرائیل علیہ السلام کا نام ہے۔ کیونکہ ان سے زندگی ملتی ہے۔ انہیں کے گھوڑے کی ٹاپ کی خاک سامری کے بچھڑے کے منہ میں پہنچی تو اسے زندگی بخش دی۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش انہیں کی سانس سے ہوئی تھی۔ اس لئے آپ کے ساتھ ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ نیز وحی لانے والے جبرائیل ہی ہیں۔ اور وحی بھی روح ہے جس سے ایمان کی زندگی ہے۔ رب فرماتا ہے۔ کَذٰلِکَ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ رُوْحاً مِنْ اَمْرِنَا (شوریٰ: ۵۲) انہیں کہا جاتا ہے۔ قدس بمعنی بزرگ جیسے کہا جاتا ہے۔ رَجُلٌ صِدْقٌ بعض علماء نے فرمایا۔ کہ قدس سے رب تعالیٰ مراد ہے اور اس کی طرف روح کی اضافت تشریفی ہے۔ جیسے بیت اللہ (روح البیان) یعنی ہم نے بذریعہ جبرائیل عیسیٰ علیہ السلام کو قوت دی کہ انہی کی سانس سے انہیں پیدا فرمایا۔ اور انہی کے ذریعہ سے حضرت کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھا کہ حضرت جبرائیل امین ہر وقت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہتے تھے۔ جیسے سلطان کے ساتھ ان کے باڈی گارڈ یا خاص خدام۔ اور آخر کار یہود نے آپ کو شہید کرنا چاہا۔ تو انہی کے ذریعہ انہیں آسمان پر بلایا گیا۔ ان وجوہ سے صرف عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرمایا۔ ورنہ حضرت جبرائیل امین سارے ہی نبیوں کے معاون و مددگار ہیں۔ سب پر وہ ہی وحی لاتے تھے۔ اور ان کی خدمات انجام دیتے تھے۔ اور ہوسکتا ہے کہ روح القدس سے مراد حضور ﷺ ہوں۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے حضور ﷺ کو روح القدس ہی فرمایا کہ میں جاتا ہوں تاکہ روح القدس آئے اگر میں نہ جاؤں تو وہ نہ آئے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں'' (برنباس) اور ظاہر ہے کہ حضور ہی کی طفیل ان کی والدہ ماجدہ کنواری بتول مریم کی عصمت کے خطبے پڑھے گئے۔ اور ان کی حقانیت کا دنیا نے اقرار کیا ورنہ یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کردیا تھا۔ اور ان کی والدہ طیبہ طاہرہ کو تہمت لگادی تھی۔ دنیا والے ان کی نبوت سے مشکوک ہو چکے تھے۔ ان کی نبوت کا اعلان ان کی والدہ ماجدہ کی عصمت کے خطبے فرمائے حتیٰ کہ قرآن شریف میں سوائے بی بی مریم کے کسی عورت کا نام نہ لیا۔ اور حضرت مریم کا نام جگہ جگہ لیا۔ یہاں تک کہ ان کے نام کی ایک سورت یعنی سورۂ مریم قائم فرمائی یہ ہے جناب مسیح کی تائید و تقویت۔ تو معنی ہوئے اللہ کی روح جیسے عیسیٰ علیہ السلام کا نام شریف ہے۔

خلاصہ تفسیر

یہ جو رسول مذکور ہوئے یہ فضل و درجات میں یکساں نہیں۔ بلکہ ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر بزرگیاں دیں۔ اور یہ حضرات اپنی خصوصیات و کمالات میں مختلف ہیں۔ ان میں سے بعض یعنی موسیٰ علیہ السلام سے رب نے بلا واسطہ فرشتہ کلام فرمایا۔ اور انہیں کلیم اللہ کا خطاب بخشا۔ اور ان میں سے بعض یعنی محمد ﷺ کو تو بدرجہا بلند و بالا کیا۔ کہ ان کی عظمت اور درجات انسانی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ اور وہ سید الانبیاء ہونے میں اس قدر مشہور ہیں کہ ان کے نام پاک لینے کی بھی حاجت نہیں ہر ایک خود بخود ہی سمجھ جاتا ہے کہ اس شان والے حضور ہی ہیں اور بنی اسرائیل کے آخری نبی یعنی عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو کھلی ہوئی نشانیاں اور معجزات عطا فرمائے کہ انہیں بغیر باپ پیدا فرمایا۔ انہوں نے مردوں کو زندہ اور مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کیا۔ مٹی سے پرندہ بنا کر اس میں جان ڈالی۔ غیب کی خبریں دیں۔ انجیل جیسی عظیم الشان کتاب انہیں ملی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روح القدس یعنی جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ ان کی تائید فرمائی گئی۔

ہے، اسی لئے لَنْ تَنَالُوا فرمایا گیا، ہم جیسے گنہگار انشاء اللہ نیک کاروں کے طفیل بخشے جائیں گے **شعر:**

شنیدم کہ در روز امید و بیم بداں رابنیکاں بجشند کریم

رب تعالیٰ فرماتا ہے: وَاَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (طور: ۲۱) ہم مومنوں کی ذریت کو جنت میں ان کے ساتھ ہی رکھیں گے اور ان کے عمل سے کچھ کم نہ کریں گے، مسلمانوں کو ایصال ثواب کا اس لئے حکم ہے کہ ان کے اعمال میں دوسروں کا بھی حصہ ہو جائے، حضور علیہ السلام اپنے غریب امتیوں کی طرف سے قربانی فرماتے تھے۔

تفسیر صوفیانہ

صوفیاء فرماتے ہیں کہ بریعنی بھلائی حاصل کرنے کے لئے اپنے محبوب مال میں سے بعض حصہ خیرات کرنا چاہیے لیکن باری تعالیٰ کو حاصل کرنے کے لئے اپنی ساری محبوب چیزیں قربان کرنا پڑیں گی، سب سے پیاری چیز اپنا نفس ہے، لقائے یار کے لئے اس کی قربانی ضروری ہے پروانہ شمع کا شعلہ حاصل کرنے کے لئے اپنے کو قربان کرتا ہے، امام کاشانی فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ کو پانے کا ذریعہ ماسواء اللہ کو چھوڑ دینا ہے، ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہتیں تو ایک دل میں دو محبتیں کیسے رہ سکتی ہیں، عشق وہ آگ ہے جو ماسواء اللہ کو پھونک ڈالتی ہے **لا الہ الا اللہ** کے معنے عوام کرتے ہیں **لا معبود الا اللہ** اور خواص کہتے ہیں **لا موجود الا اللہ** اور عشاق کہتے ہیں **لا محبوب الا اللہ**، بعض کہتے ہیں **لا مقصود الا اللہ**، صوفیاء کی نگاہ میں ما سوی اللہ وہی ہے جو خدا سے غافل کرے۔ **شعر:**

ترا ہرچہ مشغول دارد ز دوست اگر راست خواہی دلارام اوست

جو چیز یار سے غافل کرے وہی بت ہے۔ **شعر:**

اگر یاری از خویشتن دم مزن کہ شرک است با یار و با خویشتن

سید الشہداء امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کرب و بلا کے میدان میں اس آیت کی زندہ جاوید عملی تفسیر کرنے گئے تھے انہوں نے سب کچھ لٹا کر یار کو منالیا، سب کچھ کھو کر سب کچھ پالیا۔ ع

شبیر نے نماز میں سر کو کٹا کے پی

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ
ہر کھانا تھا حلال واسطے اولاد یعقوب کے سوائے اس کے جو حرام کر لیا تھا
سب کھانے بنی اسرائیل کو حلال تھے مگر وہ جو
اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ
یعقوب نے اوپر جان اپنی کے اس سے پہلے کہ اتاری جائے توریت
یعقوب نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا توریت اترنے سے پہلے

(انعام: ۹۰) نہ تو اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ اے محبوب آپ اصول دین میں سارے پیغمبروں کی پیروی کیجئے۔ کہ اصول دین میں تقلید ناجائز ہے۔ اور نہ یہ مراد ہے کہ آپ فروع دین میں ان کی اطاعت کریں۔ کیونکہ آپ کا دین تمام دینوں کا ناسخ ہے۔ یہ ہی مطلب ہے کہ آپ ان سب کے اخلاق سے متصف ہو جایئے۔ (۹) سارے پیغمبر خاص خاص جماعتوں کی طرف آئے۔ مگر نبی ﷺ ساری مخلوق کے لئے نبی ہوئے کہ فرمایا گیا۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (سباء: ۲۸) اور فرمایا گیا لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (الفرقان: ۱) اور جس کا رقبہ سلطنت بڑا وہ سلطان بھی عظیم الشان۔

خیال رہے کہ آدم و نوح علیہما السلام ساری مخلوق کے نبی تھے۔ بلکہ اس وقت انسان تھوڑے ہی تھے۔ اس وجہ سے ان تھوڑے انسانوں کے نبی ہوئے۔ (۱۰) حضور کا دین تمام دینوں سے افضل کہ وہ سب کا ناسخ ہے لہٰذا حضور بھی سارے پیغمبروں سے افضل (۱۱) حضور کی امت ساری امتوں سے افضل رب نے فرمایا كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ (آل عمران: ۱۱۰) حضور کی بیبیاں تمام عورتوں سے افضل رب نے فرمایا يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (الاحزاب: ۳۲) حضور بھی سارے پیغمبروں سے افضل جن کے دم کی یہ ساری بہار ہے۔ (۱۲) حدیث شریف میں ہے کہ قیامت میں آدم و ماسواء آدم حضور کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ آپ ہی اولاد آدم کے سردار ہیں۔ آپ ہی جنت میں سب پیغمبروں سے پہلے تشریف لے جائیں گے۔ آپ کی امت سب امتوں سے پہلے جنت میں داخل ہوگی۔ سب سے پہلے قیامت میں آپ ہی اٹھیں گے۔ جب سب خاموش ہوں گے تو آپ ہی رب سے کلام فرمائیں گے۔ آپ ہی کے ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا۔ آپ ہی کو حبیب اللہ کا خطاب ملا۔ آپ ہی شفیع المذنبین ہیں۔ آپ ہی اولین آخرین کے سردار ہیں۔ حضور ہی کو معراج کرائی گئی۔ حضور ہی نے معراج کی شب تمام نبیوں کی امامت کی حضور ہی نے رب کو بلا حجاب دیکھا اور بلا حجاب رب تعالیٰ سے کلام کیا۔ یہ عظمتیں حضور کے سوا کسی کو نہیں ملی۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (النجم: ۱۳) اور فرماتا ہے فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (النجم: ۱۰) دیدار الٰہی کی بحث ہماری کتاب شان حبیب الرحمٰن میں ملاحظہ کرو۔ نیز اس آیت میں حضور کی بلندی درجات بغیر کسی قید کے مطلق ارشاد ہوئی۔ جس سے معلوم ہوا کہ امکانی درجہ جو کسی بندہ کو دیا جاسکتا ہے۔ وہ حضور انور کو عطا فرمادیا گیا۔ حضور انور عبدیت کے اعلیٰ درجہ پر ہیں۔ ایمان۔ تقویٰ۔ ولایت۔ قطبیت۔ غوثیت۔ قرب الٰہی وغیرہ تمام درجے حضور کی منزلیں تھیں۔ جنہیں طے فرماتے ہوئے سرکار اعلیٰ درجہ پر پہنچے۔ جس کے اوپر کوئی درجہ نہیں۔ شعر۔

جو ہوتی خدائی بھی تحت مشیت   خدا بن کے آتا ہو وہ بندہ خدا کا

(۱۳) حضور فرماتے ہیں۔ کہ چند چیزوں سے ہمیں بزرگی دی گئی۔ (۱۴) سارے عالم کے ہم نبی ہیں۔ (۱۵) ساری زمین ہمارے لئے مسجد اور طہارت گاہ ہے۔ (۱۶) ایک مہینہ کی راہ سے ہمارا رعب قائم کیا گیا۔ (۱۷) ہمارے ہی لئے غنیمتیں حلال ہوئیں۔ (۱۸) ہم ہی کو شفاعت کبریٰ عطا ہوئی۔ (۱۹) ہم ہی پر نبی ختم کئے گئے۔ کہ ہمارے بعد کوئی نیا نبی نہیں آسکتا۔ (۲۰) قاعدہ ہے کہ جتنی بڑی سلطنت اتنا ہی زیادہ سلطان کا خزانہ لشکر اور علم اور انتظام کی قابلیت بڑھ کر آدم علیہ السلام کو علم اسماء عطا ہوا سلیمان علیہ السلام کو جانوروں کی بولیاں بتائی گئیں۔ حالانکہ ان کا رقبہ سلطنت محدود تھا۔ تو جب نبی ﷺ مشرق و مغرب جن و انس کے نبی ہیں۔ تو ضروری ہے کہ آپ کا علم و معرفت اور خزانہ حکمت سب سے زائد ہوں۔ اور آپ کو وہ علوم دیئے گئے

تردید اور حضور انور ﷺ کی تائید میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (روح البیان، خازن، خزائن، کبیر، معانی، جلالین وغیرہ) ہو سکتا ہے کہ بعض یہود نے حضور انور ﷺ سے یہ گفتگو کی ہو اور بعض نے وہ، ان دونوں واقعات پر یہ آیت آئی ہو لہٰذا ان روایات میں تعارض نہیں۔

تیسری روایت

بعض یہود نے اسلام اور قرآن پر اعتراض کیا تھا کہ اسلام کے بعض احکام اور قرآن شریف کی بعض آیات منسوخ ہیں اور جو منسوخ ہو یا جس دین میں تنسیخ ہو وہ حق نہیں ہو سکتا، اس پر حضور انور ﷺ نے فرمایا کہ تم پر فلاں فلاں جانور اور چربیاں پہلے حلال تھیں بعد میں حرام ہوئیں تو لازم آتا ہے کہ نہ دین یہودیت حق ہو نہ توریت، وہ بولے کہ یہ چیزیں تو ہمیشہ سے حرام ہی تھیں کبھی حلال نہ تھیں، تب ان کی تردید میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، جس میں ان سے مطالبہ کیا گیا کہ لاؤ توریت اور اپنا دعویٰ اس سے ثابت کرو، وہ شرما گئے اور توریت نہ لائے کیونکہ توریت میں حضور انور ﷺ کی تائید تھی اور ان کی تردید، جس سے حضور ﷺ کی نبوت اور زیادہ آشکارا ہوگئی کہ آپ باوجود امی ہونے کے یہود کی چھپائی ہوئی تورات سے خبردار ہیں۔ (تفسیر کبیر)

تفسیر

كُلُّ الطَّعَامِ یہاں کل افرادی ہے نہ کہ مجموعی جس کے معنے ہیں ہر یا تمام اور یہ اقسام کی تعمیم کے لئے ہے نہ کہ صرف افراد کی یعنی ہر قسم کے کھانے، طعام طعم سے بنا بمعنے چکھنا یا کھانا جو چیز غذاء کھائی جائے اسے طعام کہتے ہیں، میوہ جات طعام نہیں کیونکہ وہ لذتاً کھائے جاتے ہیں، کبھی چکھنے کے معنے میں بھی آتا ہے جیسے وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ (بقرہ: ۲۴۹) جو وہ پانی چکھے بھی نہیں وہ میری جماعت سے ہے، یہاں تمام کھانوں سے وہ کھانے مراد ہیں جو اسلام میں حلال ہیں یا وہ جن پر اس وقت یہود سے بحث تھی، جیسے کہا جاتا ہے کہ سارے کھانے پک گئے یا سارے لوگ کھا گئے، یہاں کھانوں سے اور لوگوں سے وہی مراد ہوتے ہیں جن کے پکانے یا کھلانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ **كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ** حل اور حلال ہم معنے ہیں جیسے حرم اور حرام، اس کے لغوی معنے ہیں کھولنا، چونکہ جائز چیز سے پابندیاں اٹھی ہوتی ہیں اور انسان اس کے متعلق آزاد اور کھلا ہوتا ہے لہٰذا اسے حلال کہتے ہیں، حلال و حرام ہونا حقیقتاً انسان کے فعل کی صفت ہے اور مجازاً ان چیزوں کی، لہٰذا شراب وغیرہ حرام ہونے کے معنے یہ ہیں کہ ان کا استعمال حرام ہے، یعنی ان غذاؤں کا کھانا حلال تھا، بعض نے اس کے برعکس بھی کہا ہے اور بعض نے فرمایا کہ یہ فعل اور مفعول دونوں کی حقیقتاً صفت ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (التحریم: ۱) بنی اسرائیل یعقوب علیہ السلام کی اولاد کا لقب ہے۔ **اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ** اسرائیل عبرانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں اللہ کا بندہ، اسرا بمعنے بندہ اور ایل رب تعالیٰ کا نام، آپ کا نام شریف اسرائیل تھا اور لقب یعقوب، کیونکہ آپ اپنے بھائی عیص کے ساتھ جڑواں پیدا ہوئے تھے اس طرح کہ عیص کے عقب یعنی ایڑی میں آپ کا سر تھا اس لئے آپ کا لقب یعقوب ہوا، حضرت یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کی بیماری نے بہت تنگ کیا ہوا تھا، آپ نے نذر مانی تھی کہ خدایا اگر مجھے اس سے

فرمایا یوں نہ کہو۔ بلکہ یوں کہو کہ" شان یوسف جو بڑھی وہ بھی اسی در سے بڑھی" حضور سے بلندیاں ملتی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تمام انبیاء نبوت میں یکساں ہیں۔ کوئی نبی عارضی نہیں۔ مگر امام بوصیری قصیدہ بردہ میں فرماتے ہیں۔ شعر۔

فَاِنَّهٗ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ كَوَاكِبُهَا يُظْهِرْنَ اَنْوَارَهَا لِلنَّاسِ فِي الظُّلَمِ

دوسرا اعتراض: کہ حضور آپ تو بزرگی کا سورج ہیں۔ اور دیگر انبیاء تارے۔ معلوم ہوا کہ حضور اصلی نبی ہیں باقی رسول عارضی ہیں۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس شعر میں نبوت کا ذکر نہیں۔ بلکہ فضل کی بزرگی کا ذکر ہے۔ یعنی دیگر انبیاء کرام نے آپ کے ذریعہ بزرگیاں لیں۔ جیسے تاروں نے سورج کے ذریعہ نور لیا۔ رہی نبوت وہ تمام میں یکساں۔ دوسرا یہ کہ اس شعر میں اصلیت و عارضی کا ذکر نہیں۔ بلکہ توسل وساطت کا ذکر ہے۔ یعنی آپ کے توسل سے نبیوں کو نبوت ملی۔ مگر ملی اصلی ہی نہ کہ عارضی۔ چنانچہ تاروں نے اگر چہ سورج ہی سے نور لیا۔ مگر وہ سب اصلی منور ہیں۔ ذروں اور آئینوں کی طرح عارضی نورانی نہیں۔ کسی کو ہم نے اپنا مکان رہنے کو عارضی طور پر دیا۔ یہ شخص وہاں عارضی طور پر ہے۔ دوسرے کو ہم نے مکان کا مستقل مالک بنا دیا۔ وہ مکان کا اصل مالک بن گیا۔ مگر بنا ہمارے دینے سے۔ انبیاء کرام قصر نبوت کے اصلی مالک ہی ہیں۔ مگر حضور کی عطا سے کہ اللہ معطی ہے حضور قاسم۔ **تیسرا اعتراض:** بعض انبیاء کرام کے معجزات حضور کے معجزات سے کہیں بڑھ کر ہیں نمبر ا آدم علیہ السلام کو ملائکہ نے سجدہ کیا نہ کہ حضور علیہ السلام کو ابراہیم علیہ السلام پر آگ گلزار ہوئی نہ کہ حضور پر موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا ملا نہ کہ حضور کو داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں لوہا نرم ہوا نہ کہ حضور کے ہاتھ میں۔ سلیمان علیہ السلام کے قبضہ میں جن وانس وحوش وطیور اور ہوائیں تھیں۔ نہ کہ حضور ﷺ کے قبضہ میں عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ نہ کہ حضور عیسیٰ علیہ السلام نے مردے زندہ کیے۔ بیماروں کو شفا بخشی نہ کہ حضور ﷺ نے ان کا لقب کلمۃ اللہ ہے نہ کہ حضور ﷺ کا لہٰذا یہ حضرات حضور ﷺ سے افضل ہوئے۔ **جواب:** اس قسم کے اعتراضات کے دو جواب ہیں۔ ایک اجمالی دوسرا تفصیلی۔ اجمالی تو یہ ہے کہ یہ خصوصی فضیلتیں ہیں۔ اور حضور علیہ السلام کو فضیلت کلی حاصل ہے۔ اگر بادشاہ کسی جرنیل کو کوئی خاص تمغہ عنایت فرمائے۔ تو اگر چہ یہ تمغہ وزیر اعظم کو نہ ملا۔ مگر درجہ اسی کا بڑا ہے اور قرب اسی کو زیادہ۔ جواب تفصیلی یہ ہے کہ آدم علیہ السلام مسجود ملائکہ ہونے کی وجہ سے حضور ﷺ سے افضل نہ ہوئے۔ کیونکہ قیامت میں حضور ہی کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ نیز حضور ﷺ اس وقت نبی تھے۔ جب حضرت آدم آب وگل میں جلوہ گر تھے۔ نیز معراج کی رات جبرائیل امین نے براق مصطفیٰ کی رکاب تھامی سارے ملائکہ حضور کو جھرمٹ میں لے کر دولہا بنا کر لے گئے۔ یہ سجدے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ نیز سارے فرشتے اور خود رب حضور پر ہمیشہ درود بھیجتے ہیں۔ سجدہ ایک وقت خاص بھی ہوا اور صرف ملائکہ نے کیا۔ مگر یہ درود قیامت تک جاری ہے نیز اس سجدہ کا انتظام ملائکہ نے کیا اور صلوٰۃ کا انتظام خود رب نے۔ نیز آدم علیہ السلام کو سجدہ اسی لئے کرایا گیا کہ ان کی پیشانی میں نور محمدی تھا۔ (کبیر) نمبر ۲ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام پر آگ کا باغ بننا بھی اسی لئے ہوا کہ ان کی پیشانی میں نور محمدی تھا۔ نیز حضور کے غلاموں پر دوزخ کی آگ گلزار ہو جائے گی۔ بلکہ پکارے گی۔ کہ خدایا ان کو جلد یہاں سے نکال حضور علیہ السلام کے لئے پتھر نرم ہوئے۔ نیز سارے وحوش وطیور حضور کے قبضہ میں بھی تھے۔ ایک بار استنجا کی ضرورت ہوئی تو درختوں کو حکم دیا گیا۔ وہ مل گئے اشارے

اور حضور انور ﷺ پر ایمان لانے کے ان احکام پر فخر کرنے لگے اور انہیں اپنی حقانیت اور اسلام کے بطلان کی دلیل قرار دینے لگے، رب تعالیٰ نے اس آیت میں ان کی حماقت ظاہر فرماتے ہوئے فرمایا بیوقوفو! یہ تو سوچو کہ نزول توریت یعنی زمانہ موسوی سے پہلے بجز اونٹ کے گوشت اور اس کے دودھ کے اور کون سی چیز حرام تھی، اور ان دو کی حرمت بھی یعقوب علیہ السلام کے حرام فرمالینے سے ہوئی، ان کی بیماری ونذر سے پہلے تو یہ بھی حرام نہ تھیں، اگر ان چیزوں کی حرمت ہی حقانیت کی دلیل ہے تو چاہیے کہ دین ابراہیمی اور دیگر تمام دین باطل ہو جائیں کیونکہ ان سب میں یہ تمام چیزیں حلال تھیں، یہ واقعات جو ہم نے بیان فرمائے توریت میں بھی موجود ہیں، اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ یہ چیزیں پہلے بھی حرام تھیں تو توریت لے آؤ اور وہ آیات پڑھ کر ہمیں سنادو جن میں تمہارے دعوے کی تصدیق ہو۔ **نوٹ:** تفسیر صاوی نے اس جگہ فرمایا کہ عرق النساء رگ کی بیماری جو ران کے نچلے حصے میں زور کرتی ہے اور انسان کو چلنے پھرنے سے مجبور کر دیتی ہے اس کا علاج نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ عربی دنبہ کی چکتی (لاٹ) کی چربی آگ میں پگھلالی جائے اور اس کے تین حصے کئے جائیں اور ران کی اس رگ میں جسے ریق کہتے ہیں پہلے ایک حصہ جذب کر دیا جائے، پھر کچھ دن بعد دوسرا، پھر تیسرا حصہ، انشاء اللہ شفا ہوگی، حضرت انس فرماتے ہیں میں نے سو سے زیادہ بیماروں پر اسے آزمایا، مجرب پایا، (تفسیر صاوی)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** علم تاریخ بھی بہترین علم ہے کہ کبھی اس سے دین میں مدد ملتی ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں بہت سے تاریخی واقعات بیان فرمائے، دیکھو یہاں یہود نے ایک تاریخی واقعہ لے کر ہی اسلام پر اعتراض کیا تھا صحیح واقعہ سننے پر انہیں خاموش ہونا پڑا۔ **دوسرا فائدہ:** اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوب بندوں کی ادائیں بڑی محبوب ہیں دیکھو حضرت یعقوب علیہ السلام کی منت قبول فرمائی اور اسے ان کے دین کا حکم شرعی قرار دے دیا۔ **تیسرا فائدہ:** بزرگوں کی یادگاریں قائم کرنا سنت الٰہیہ ہے، دیکھو یعقوب علیہ السلام کی شفا کی یادگار میں ہمارے حضور انور ﷺ کے زمانہ پاک تک اونٹ کا گوشت اور دودھ حرام رہا، ہمارے اسلام میں بھی یادگاروں پر بہت زور دیا گیا ہے، ماہ رمضان کی دھوم دھام نزول قرآن کی یادگار ہے، بقر عید کی تکبیر تشریق اور قربانی جناب خلیل کی یادگار، حج میں صفا و مروہ پر دوڑنا حضرت ہاجرہ کی یادگار، جمروں کی رمی اسمٰعیل کی یادگار ہے علیہم الصلوٰۃ والسلام، عاشورہ کا روزہ نجات موسےٰ علیہ السلام کی یادگار، بلکہ پانچوں نمازیں پانچ نبیوں کی یادگاریں ہیں لہٰذا عید میلاد، عید معراج، عرس بزرگان منانا اور ان میں عبادتیں کرنا باعث ثواب ہے کہ یہ بھی یادگاروں کا قائم کرنا ہے۔ **چوتھا فائدہ:** ہم مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے، کہ ہمارے گناہوں اور خطاؤں کی وجہ سے ہم پر احکام سخت نہ ہوئے، اعمال ہمارے گندے اور احکام ہمارے نہایت آسان۔ **پانچواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ نے حضور انور ﷺ کو علوم غیبیہ عطا فرمائے اور آپ کو علم لدنی بخشا کہ باوجود امی ہونے کے حضور ﷺ نے توریت کے مضامین سے دلائل پیش فرمائے۔ **چھٹا فائدہ:** اسلام کی حقانیت ظاہر کرنے یا اسلام سے اعتراضات اٹھانے کے لئے بے دینوں سے مناظرہ کرنا سنت ہے، دیکھو حضور ﷺ نے یہود سے مناظرہ فرمایا،

غالب ہیں۔ سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ عَلٰى غَضَبِيْ اس لئے بعض انبیاء بعض سے افضل ہیں۔ جمالی پیغمبر مثلاً ابراہیم علیہ السلام جلالی نبی (موسیٰ علیہ السلام) سے افضل اور چونکہ ہمارے نبی ﷺ مظہر ذات ہیں۔ لہٰذا ان سب سے افضل اسی طرح اولیاء اللہ انبیاء کے قدم پر ہیں۔ اور انبیاء کی شانیں مختلف لہٰذا ان کے درجات بھی جداگانہ ولایت عیسوی والے تارک الدنیا ولایت موسوی والے جلالی ہوتے ہیں۔ ولایت سلیمانی والے بہت شان وشوکت کے مالک ہوتے ہیں۔ اور ولایت محمدی والے جامع صفات اور تمام اولیاء اللہ سے افضل ہوتے ہیں۔ حضور غوث الثقلین محی الدین عبدالقادر جیلانی قدس سرہ فرماتے ہیں شعر

وَ كُلُّ وَلِيٍّ لَهٗ قَدَمٌ وَاِنِّيْ عَلٰى قَدَمِ النَّبِيِّ بَدْرِ الْكَمَالِيْ

اس کی تحقیق پہلے بھی کی جا چکی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ساری مخلوق کا یہ ہی حال ہے۔ نہ سب فرشتے برابر نہ عالم کی دیگر چیزیں مساوی۔

دوسری تفسیر

گروہ انبیاء نورانی جماعت ہے۔ نور کی تجلیات مختلف لہٰذا ان کے درجات بھی متفاوت بلکہ (علم) نور ذات کی چمک ہے۔ نبی کا جس قدر علم زیادہ اتنا ہی درجہ بلند حضور علیہ السلام نے معراج میں آدم علیہ السلام کو پہلے آسمان پر یحییٰ وعیسیٰ علیہما السلام کو دوسرے پر یوسف علیہ السلام کو تیسرے پر ادریس علیہ السلام کو چوتھے پر حضرت ہارون کو پانچویں پر موسیٰ علیہ السلام کو چھٹے پر اور ابراہیم علیہ السلام کو ساتویں آسمان پر ملاحظہ فرمایا۔ اس کی یہ ہی وجہ تھی۔ اور خود سدرۃ المنتہیٰ ہوتے ہوئے عرش سے گزرتے ہوئے قاب قوسین او ادنیٰ تک پہنچے۔ جہاں نہ مکان تھا نہ امکان کیونکہ آپ علم میں سب سے افضل اور آپ کی نورانیت سب سے اعلیٰ ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نور وحدانیت ظلمت انسانیت پر اتنا غالب ہوا کہ وہ ظلمت تجلی صفات جمال وجلال میں فنا ہو گئی۔ اسی لئے رب نے انہیں عین نور فرمایا۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ (مائدہ: ۱۵) اور ظاہر ہے کہ زینہ کی سیڑھیاں عمارت کی بلندی کے بقدر ہوتی ہیں۔ جتنی عمارت اونچی زینہ بھی اتنا ہی دراز (روح البیان) بلکہ حق یہ ہے کہ آپ کے درجات تک نہ کسی کا وہم پہنچے نہ گمان نہ قیاس بس یہ ہی کہتے بن پڑے گی۔ کہ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ بعض نادان لوگ تمام اولیاء کو یکساں رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ بے وقوف ہیں۔ جب صفات الٰہیہ اور حضرات انبیاء کرام یکساں نہیں تو مظہر انبیاء یعنی اولیاء اللہ یکساں کیسے ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ولی وہ جو تارک الدنیا ہو۔ ولایت و دولت جمع نہیں ہو سکتی۔ وہ بے وقوف ہیں۔ دیکھو حضور غوث پاک بڑے غنی تھے مگر ولی تھی۔ بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام تو نبی تھے مگر بڑی دولت ومملکت والے تھے۔ ہاں یہ درست ہے کہ ولی کے دل میں دنیا نہیں رہتی وہ دنیا میں رہتا ہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ حضرت جبرائیل امین تمام فرشتوں سے افضل ہیں کیوں؟ اس لئے یہ حضرات انبیاء کرام کے خادم خاص ہیں۔ اور وحی لانے والے۔ جب حضرات انبیاء اور وحی الٰہی کی خدمت کرنے والا فرشتہ تمام فرشتوں سے افضل ہے تو حضرات صحابہ کرام تمام مسلمانوں سے افضل کہ انہیں حضور ﷺ کی خدمت کا موقع ملا۔ پھر صحابہ میں خلفاء راشدین پھر ان میں حضرت ابوبکر صدیق بعد از انبیاء تمام خلق سے افضل ہیں۔ کہ ان حضرات نے حضور ﷺ کی اعلیٰ درجہ کی خدمت کی۔ جب قرآن کی رحل اور کعبہ کا غلاف یوسف علیہ السلام کی قمیض سب سے اعلیٰ تو حضرت صدیقہ کا زانو عائشہ صدیقہ کی گود جن پر حضور انور نے آرام فرمایا کہ

یعقوب علیہ السلام کی عظمت ظاہر کرنے اور ان کی یادگار قائم کرنے کے لئے دیکھوایک خاص موقعہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قربانی کی مگر وہ بطور ان کی یادگار قیامت تک باقی رکھی گئی، ایک خاص موقعہ پر بی بی ہاجرہ صفا مروہ کے درمیان دوڑیں مگر یہ دوڑنا تمام حاجیوں پر لازم کر دیا گیا، ہمارے پاکستان میں قائد اعظم کے بہت سے کارنامے بطور یادگار قائم رکھے گئے ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر غذا طعام ہے مگر احناف کہتے ہیں کہ طعام صرف گندم ہے باقی کھانے طعام نہیں، حنفیوں کا یہ مسئلہ قرآن کی اس آیت کے خلاف ہے (تفسیر کبیر) **جواب:** حنفیوں کا یہ مسئلہ قسم کے متعلق ہے قسم میں عرف کا لحاظ ہوتا ہے نہ کہ لغت کا، اس زمانہ میں عرفاً گندم ہی کو طعام کہتے تھے، اس لئے اگر کوئی قسم کھاتا کہ میں طعام نہ کھاؤں گا تو اس سے گندم مراد ہوتا جیسے تمہارے ہاں بھی گوشت کی قسم میں مچھلی داخل نہیں ہوتی کیونکہ محاورے میں مچھلی کو گوشت نہیں کہا جاتا حالانکہ قرآن کریم نے مچھلی کو گوشت فرمایا ہے لَحْمًا طَرِيًّا (فاطر: ۱۲) قرآن میں لغوی معنی مراد ہیں اور قسم میں عرفی معنی۔

تفسیر صوفیانہ

اللہ تعالیٰ نے تین قسم کی مخلوق پیدا فرمائی ایک روحانی ونورانی فرشتے، ان کی غذا ذکر الٰہی اور ان کی پیدائش عبادت کے لئے، دوسری مخلوق جسمانی ظلمانی، ان کی غذا طعام اور ان کی پیدائش عبرت وخدمت کے لئے ہے، اور تیسری مخلوق انسان جو ملکی روحانی اور حیوانی وجسمانی سے مرکب ہے، ان کی روحانی غذا ذکر ہے اور جسمانی غذا طعام، ان کی پیدائش عبادت ومعرفت کے لئے ہے، پھر انسان تین قسم کے ہیں، بعض وہ جن کی حیوانیت روحانیت پر غالب آگئی ہو وہ تو جسمانی غذا میں مشغول ہو کر روحانی غذا بھول بیٹھے حتے کہ ان کی روحانیت فنا ہو گئی أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (اعراف: ۱۷۹) شیخ سعدی فرماتے ہیں۔ **شعر:**

مرد درپئے ہرچہ دل خواہدت — کہ تمکین تن نور جاں کاہدت
کند مرد را نفس امارہ خوار — اگر ہوشمندی عزیزش مدار
دریغ آدمی زادۂ بر محل — کہ باشد چو انعام بل ہم اضل

اور بعض انسان مقتصد یعنی میانہ رو ہیں جن کی روحانیت اور حیوانیت برابر ہے، ہر ایک کو غذا مل رہی ہے ان کے متعلق رب تعالیٰ فرماتا ہے عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ (التوبہ: ۱۰۲) تیسرے وہ انسان ہیں، جن کی روحانیت حیوانیت پر غالب ہے، انہوں نے روحانی غذا میں مبالغہ کیا اور جسمانی غذا یعنی کھانے میں اختصار حتے کہ ان کا نفس مر گیا اور روحانی قوتیں بہت بڑھ گئیں جن کے بارے میں فرمایا گیا أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (البینۃ: ۷) یہی لوگ سابقین ہیں یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ انسان کے لئے ساری جسمانی غذائیں حلال تھیں بجز ان کے جنہیں سابقین بالخیرات نے اپنے نفس امارہ پر حرام کر دیا، نفس کو مار کر دل کو زندہ کر کے اور روح کو غالب کر کے یہ واقعہ اس وقت ہوا جبکہ اس پر مشاہدات کی توریت نازل نہ ہوئی تھی، صوفیاء کے ہاں پہلے مجاہدات ہیں پھر مشاہدات، مجاہدات مشاہدات کی سیڑھی ہیں، اللہ تعالیٰ اس قال کو حال بنا دے۔

جنگ ہوگی۔ عرض کیا کہ یا حبیب اللہ جنگ کے بعد کیا ہوگا۔ فرمایا معافی اور رضا امیر معاویہ کہنے لگے۔ رَضِیْنَا بِقَضَاءِ اللّٰهِ تب یہ جملہ نازل ہوا وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا الخ (درمنثور) یعنی اس جنگ کا انجام آپس کی صلح صفائی ہوگی۔ کہ آخر کار صلح ہو جائے گی۔ یا بارگاہ الٰہی میں حضرت علی مرتضٰی کے لئے رضا ہوگی۔ اور امیر معاویہ کے لئے معافی ہوگی۔ گو جناب علی کی ڈگری اور امیر معاویہ کی معافی، کیونکہ اس جنگ کی بنیاد نفسانیت پر نہیں للّٰہیت پر ہے۔

تفسیر

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ۔ شَآءَ مشیت سے بنا مشیت اور ارادہ کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں۔ خیال رہے کہ رضا اور ارادہ میں فرق ہے۔ اسی فرق سے غفلت کی وجہ سے مسئلہ تقدیر پر اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔ مَا اقْتَتَلَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ اقْتَتَلَ اقتتال سے بنا یہ مقاتلۃ کے ہم معنی ہے۔ یعنی آپس میں جنگ کرنا الَّذِیْنَ سے گزشتہ پیغمبروں کی امتیں مراد ہیں۔ اور ہم کا مرجع وہ انبیاء ہیں۔ یعنی اگر اللہ چاہتا کہ سب لوگ ہدایت پر متفق ہو جائیں۔ تو ان پیغمبروں کی امتیں ان کے بعد کبھی جنگ نہ کرتیں۔ رب ہی کے ارادے سے ان میں لڑائیاں ہوئیں اور اس ارادہ میں صدہا حکمتیں ہیں۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ یہ اقْتَتَلَ کے متعلق ہے۔ مَا یا موصولہ ہے یا مصدریہ بینات سے انبیاء کرام کے معجزات اور ان کی ہدایت اور دلائل مراد ہیں۔ یعنی یہ معجزات غلطی سے بچانے ہدایت پر رکھنے کے لئے کافی تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے اختلاف ہونا ہی نہ چاہیے تھا۔ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا مگر چونکہ رب نے ان کے متفق نہ رہنے کا ارادہ فرمایا لہٰذا وہ اختلاف کر بیٹھے۔ یا تو اخْتَلَفُوْا کا فاعل گزشتہ امتوں کے کفار اور مومنین ہیں۔ یا صرف وہ مومنین جن میں سے بعض لوگ بگڑ گئے۔ یعنی وہ مختلف رہے۔ یا وہ اختلاف کر بیٹھے۔ اور یہ اختلاف نسبی یا رہی نہ تھا۔ بلکہ دینی کہ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ اگر اخْتَلَفُوْا کا فاعل گزشتہ مومنین ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان میں سے بعض مومن رہے۔ اور بعض کافر ہو گئے۔ اور اگر اس کا فاعل سارے مومنین اور کفار ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بعض ان میں سے ایمان لے آئے۔ اور بعض کافر رہے پہلی توجیہ نہایت قوی ہے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا۔ اقْتَتَلُوْا کا فاعل گزشتہ لوگ ہی ہیں یا تو یہ جملہ پہلے کی تاکید ہے اور یا اس میں بعد کی جنگیں مراد ہیں۔ یعنی اگر رب چاہتا تو پھر آپس میں نہ لڑتے مگر وہ لڑتے ہی رہے لیکن ہم نے جو درمنثور سے ان کا شان نزول نقل کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فاعل حضور ﷺ کی امت اور اس سے مسلمانوں کی آئندہ جنگیں مراد ہیں یعنی اے نبی ﷺ اگر رب چاہتا تو آئندہ آپ ﷺ کے امتی نہ لڑتے مگر چونکہ ارادہ الٰہی ہو چکا۔ لہٰذا ان میں بھی جنگیں ہوں گی۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کو کوئی نہیں روک سکتا۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب ﷺ اگر رب چاہتا تو گزشتہ پیغمبروں کے بعد ان کی امتوں میں جنگ نہ ہوتی کیونکہ ان کے پاس بے شمار معجزات آ چکے تھے۔ جو انہیں ہدایت پر رکھنے کے لئے کافی تھے۔ لیکن رب کا ارادہ ہی یہ ہوا۔ کہ ان میں دینی اختلاف پیدا ہوں اور جنگ و جدال بھی واقع ہوں۔ کہ اس میں صدہا حکمتیں ہیں لہٰذا ان میں اختلاف ہوا کہ بعض تو ایمان پر قائم رہے اور بعض کافر ہو گئے۔ اور ان میں سخت جنگیں واقع ہوئیں۔ اور اگر رب چاہتا تو ان لڑائیوں کے بعد بھی ان کی آنکھ کھل جاتی۔ اور وہ

اپنا دعویٰ خود اپنی توریت سے ثابت نہ کر سکے بلکہ توریت ان کے خلاف پڑی فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ چونکہ من لفظاً تو مفرد تھا اس لئے افتریٰ واحد لایا گیا مگر معنے جمع تھا کہ اس سے وہ تمام یہود مراد تھے اس لئے اولئک اور ظالمون جمع لائے گئے۔ ظالم ظلم سے بنا بمعنے اندھیرا نور کے مقابل، اسی سے ہے ظلمۃ، اصطلاح میں دوسرے کا حق مارنے کو بھی ظلم کہتے ہیں اور کسی کی چیز میں بلا اجازت تصرف کرنے کو بھی، وہ یہود خود اپنے نفس کا حق مار رہے تھے کہ خدا تعالیٰ پر بہتان باندھ کر اپنے کو دوزخی بنا رہے تھے اور توریت و گذشتہ دینوں پر بھی زیادتی و ظلم کر رہے تھے، قرآن کریم میں کافر کو بھی ظالم فرمایا گیا ہے وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (بقرہ: ۲۵۴) اور گنہگار کو بھی جیسے وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (بقرہ: ۲۳۱) اور خطار کار و بھول چوک والے کو بھی جیسے اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (انبیاء: ۸۷) یہاں پہلے معنے میں ہے یعنی اب اللہ پر جھوٹ باندھنے والے کافر ہیں، خیال رہے کہ اب تک بے خبری میں جن یہود نے یہ عقیدے رکھے کہ یہ چیزیں ہمیشہ سے ہی حرام تھیں یا دین میں نسخ درست نہیں وہ تو کچھ ہلکے مجرم ہیں، مگر اب باخبر ہونے کے بعد جو اس عقیدے پر قائم رہے وہ بڑا مجرم ہے کہ بے خبری کے کفر سے ضد و عناد کا کفر سخت تر ہے۔ اس لئے مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ارشاد ہوا قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ یعنی آپ اے محبوب اعلان فرما دو کہ اب اللہ تعالیٰ کا سچا و حق ہونا ظاہر ہو گیا اس نے فرمایا تھا کہ یہ تمام چیزیں پہلے حلال تھیں، پھر یہود کی نافرمانیوں پر سزاءً حرام کی گئیں، یا فرمایا تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اونٹ کا گوشت و دودھ خود ہی اپنے پر حرام فرما لیا تھا یا فرمایا تھا کہ نسخ احکام حق ہے تم نے ان کے خلاف بکو اس کی تھی مگر از روئے توریت شریف رب تعالےٰ کی سچائی اور تمہارا جھوٹ عیاں ہو گیا، یا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا سچ ظاہر ہو گیا جیسے يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ (بقرہ: ۹) میں رسول اللہ ﷺ کو دھوکہ دینا مراد ہے۔ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا۔ یہ ف ترتیب کی ہے اور مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ سے دین اسلام یعنی شریعت محمدیہ مراد ہے جو تمام اصول میں اور بہت سے فروع میں دین ابراہیمی کے مطابق و موافق ہے، دین، ملت اور مذہب کا فرق ہم پہلے پارے کی تفسیر میں عرض کر چکے ہیں، ابراہیم کے معنے اور آپ کے فضائل بھی وہاں ہی بیان ہو چکے، حنیف حنفٌ سے بنا ہے، حفٌ کے مقابل، کسی کی طرف جھکنا و مائل ہونا جَنَحٌ یا جَنَفٌ کہلاتا ہے اور کسی سے مائل ہونا، علیحدہ و بیزار ہونا حنف، لہٰذا حنیف کے معنے ہیں تمام بدعقیدگیوں، بدعملیوں اور بے دینوں سے علیحدہ و کنارہ کش، حنیف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صفت ہے کیونکہ صفت و حال معنے میں ایک ہیں (تفسیر کبیر) وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری صفت بیان ہوئی اگرچہ حنیف میں یہ وصف بھی داخل تھا مگر عرب کے یہود و نصاریٰ اور مشرکین تمام پر چوٹ فرماتے ہوئے خصوصیت سے اسی کا ذکر فرمایا یعنی اے مشرکو تم بت پرست ہو، فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں مانتے ہو، یہودیو تم جناب عزیر کو رب تعالیٰ کا بیٹا، اور اے عیسائیو تم جناب مسیح کو رب تعالیٰ کا فرزند اور جناب سیدہ بتول مریم کو رب تعالیٰ کی بیوی ٹھہراتے ہو، بتاؤ یہ شرکیہ عقیدے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تھے؟ ہرگز نہیں، تو پھر تم کس منہ سے اپنے کو ابراہیمی اور اپنے دین کو ملت ابراہیمی کہتے ہو، اگر ملت ابراہیمی دیکھنا ہے تو ہمارے محبوب حضور محمد ﷺ کا دین دیکھو، اور اگر ابراہیمی لوگ دیکھنا ہوں تو محمد مصطفیٰ ﷺ اور ان کے غلاموں کو دیکھو لہٰذا تم بھی اسی دامن میں آ جاؤ۔

خلاصہ تفسیر

اے یہود یو اب تک جو تم نے جھوٹے عقیدے اور جھوٹے اعمال اور جھوٹی باتیں اختیار کیں، ہوسکتا ہے کہ بعض نے بے خبری میں کی ہوں، اب اس مناظرہ سے تم کو اپنی غلطی اور حضور محمد مصطفیٰ ﷺ کا سچا ہونا عیاناً معلوم ہوگیا، اب اس کے بعد بھی جو یہ ہی بکواس کیے جائے کہ دین میں نسخ جائز نہیں، یہ جانور ہمیشہ سے ہر دین میں حرام تھے تو اب وہ مفتری اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ گھڑنے والا ہوگا، کہ اب یہ جھوٹ خطاءً یا بے خبری میں نہیں بلکہ دیدہ و دانستہ ہے اور ہر مفتری بڑا ہی ظالم ہوتا ہے چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے نبیوں پر افتراء کرنے والا کہ وہ تو پرلے درجے کا ظالم ہے، اور ظالم کی سزا دائمی دوزخ میں رہنا ہے، اے محبوب ﷺ از راہ کرم کریمانہ ان سے فرمادو کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے ابھی وقت ہے سنبھل جاؤ اور دین اسلام قبول کر کے ملت ابراہیمی میں داخل ہو جاؤ، تمہارے ادیان دین ابراہیمی نہیں، صرف اسلام ہی ملت ابراہیمی ہے، دیکھو خالص توحید جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عقیدہ تھا، صرف اسلام میں ہے ختنہ، کعبۃ اللہ کی طرف نماز، حج، قربانی، مقامِ ابراہیم (علیہ السلام) کا احترام، داڑھی رکھنا، مونچھ ترشوانا وغیرہ تمام مسائل ابراہیمی اسلام ہی میں ہیں، تمہارے دینوں میں ان چیزوں کا نشان بھی نہیں، عقائد و اعمال دیکھ کر پتہ لگا لو کہ ابراہیمی تم ہو یا مسلمان۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** جاہل کے گناہ سے عالم کا گناہ بدتر ہے اگرچہ شریعت میں جہالت عذر نہیں اور جاہل معذور نہیں، دیکھو یہاں فرمایا گیا کہ اب جو اس مناظرہ کے بعد افتراء کرے گا وہ ظالم ہوگا۔ **دوسرا فائدہ:** انبیائے کرام پر تہمت باندھنا رب تعالیٰ کو بہتان لگانا ہے کہ یہاں ارشاد ہوا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ حالانکہ یہود گذشتہ انبیائے کرام پر جھوٹ بولتے تھے، **تیسرا فائدہ:** کامیاب مناظرہ کو اپنی فتح کا اعلان کرنا اور لوگوں میں اس کی شہرت کرنا سنت الٰہیہ بھی ہے اور سنت نبوی بھی، یہاں ارشاد ہوا کہ فرمادو اللہ کا سچ ظاہر ہوگیا۔ **چوتھا فائدہ:** انبیائے کرام کی فتح و نصرت در حقیقت رب تعالیٰ کی فتح و نصرت کا ظہور ہے، انبیاء کے صدق کا ظہور رب تعالیٰ کے صدق کا ظہور ہے، انہیں سچا ماننا رب تعالیٰ کو سچا ماننا ہے، انہیں جھوٹا کہنا در حقیقت رب تعالیٰ کو جھوٹا کہنا ہے، دیکھو یہود نے مناظرہ حضور انور ﷺ سے کیا اور ان کی شکست اور حضور ﷺ کی فتح پر حضور ﷺ کا صدق ظاہر ہوا مگر فرمایا گیا صدق اللہ، اللہ تعالیٰ کا صدق ظاہر ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** شکست خوردہ مناظر پر سختی، اسے جھڑک، ڈانٹ ڈپٹ نہ چاہیے بلکہ اسے نرمی سے حق قبول کرنے کی دعوت دینی چاہیے کہ مناظرہ کا مقصود دوسرے کو ذلیل کرنا نہیں بلکہ اسے حق قبول کرنے کی دعوت دینا چاہئے، دیکھو ان شکست خوردہ یہود سے ارشاد ہوا فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا، اب تم دین ابراہیمی کی پیروی کرو، مناظرہ، مکابرہ، مجادلہ ان سب میں بڑا فرق ہے، آج کل مناظرے کم، مکابرے اور مجادلے زیادہ ہیں۔ **چھٹا فائدہ:** حضور انور ﷺ کی شریعت تمام شریعتوں کی جامع ہے، خود حضور انور ﷺ تمام صفاتِ انبیاء کے جامع ہیں، دیکھو ارشاد ہوا کہ دین ابراہیمی کی پیروی کرو یعنی مسلمان ہو کر ملت محمدی کی پیروی کرو اس میں ملت ابراہیمی کی پیروی ہو جائے گی، جیسے سو میں

ساری اکائیاں دہائیاں جمع ہیں اور حاصل جمع میں تمام جمع شدہ عدد جمع ہیں، ایسے ہی حضور انور ﷺ میں تمام صفات انبیاء جمع ہیں۔ **ساتواں فائدہ:** مومن کامل کی شان یہ ہے کہ ہر بے دینی اور ہر بے دین سے الگ رہے، صلح کل ہونا ملت ابراہیمی کے خلاف ہے دیکھو رب تعالیٰ نے ان کی صفت حنیف فرمائی، عقائد میں بے دینی کا خلط ایسا ہے جیسے گلاب کی بوتل میں دو قطرے پیشاب، جس سے سارا گلاب گندا ہو جاتا ہے، اور اعمال میں بے دینوں کے اعمال کا خلط ایسا ہے جیسے سونے میں پیتل کی ملاوٹ، کہ اس سے سونا تو پیتل نہیں بن جاتا مگر بازار میں اس کا بھاؤ گر جاتا ہے، خالص گھی اور خالص سونے کی اچھی قیمت ہے، ایسے ہی بازار قیامت میں خالص مومن کی قدر و قیمت زیادہ ہوگی۔ **آٹھواں فائدہ:** حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی ایک آن کے لئے بھی بے دینی اختیار نہیں فرمائی، آپ بچپن سے آخر تک موحد مومن رہے جو آپ کو ایک آن کے لئے بھی مشرک مانے وہ خود بے دین ہے جیسا کہ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ سے معلوم ہوا۔ **نواں فائدہ:** ابراہیم علیہ السلام کے سارے آباء واجداد موحد و مومن تھے، آذر آپ کا چچا تھا نہ کہ والد، والد تو تارخ تھے، کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ یعنی آپ کی پیدائش مشرکوں سے نہ تھی یعنی آپ مشرکین کی اولاد نہ تھے، قرآن کریم نے آذر کو مجازاً آپ کا والد فرمایا، عربی میں چچا کو باپ کہہ دیتے ہیں، اس کی تحقیق پہلے پارے میں حضرت آمنہ خاتون کے ایمان کی بحث میں ہو چکی۔ **دسواں فائدہ:** مدینہ کے یہودی اور عیسائی مشرک تھے اور آجکل کے عیسائی یہودی سب مشرک ہیں کیونکہ اللہ کے لئے اولاد مانتے ہیں، یہ بھی مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ سے معلوم ہوا یعنی تم مشرک ہو، حضرت ابراہیم علیہ السلام مشرک نہ تھے، پھر تم ان کے دین پر کیونکر ہوئے، لیکن اس کے باوجود یہ ایک نبی کے ماننے والے ہیں، اس لئے انہیں اہل کتاب کہا گیا، اور ان کی عورتوں سے مسلمان مردوں کا نکاح جائز ہوا، معلوم ہوا کہ نبی کی طرف غلط نسبت سے بھی کچھ فائدہ پہنچ جاتا ہے تو جسے ان کے ساتھ صحیح نسبت حاصل ہو جائے اس کا کیا پوچھنا۔ **شعر:**

بزرگوں سے نسبت بڑی چیز ہے خدا کی یہ نعمت بڑی چیز ہے

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اس مناظرہ کے بعد اللہ پر جھوٹ باندھنے والے یہودی ظالم ہوں گے، تو چاہیے کہ اس سے پہلے کے یہودی ظالم نہ ہوں حالانکہ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (بقرہ: ۲۵۴) سارے ہی کافر ظالم ہیں، آیتوں میں تعارض ہے۔ **جواب:** یہاں ظالم سے مراد بڑے اور سخت ظالم ہیں اور اس آیت میں مطلقاً ظالم مراد ہیں کیونکہ اب بعد مناظرہ ضد و عناد سے افتراء ہوگا۔ اس سے پہلے بے خبری کا افتراء ہو سکتا تھا۔ **دوسرا اعتراض:** رب تعالیٰ نے یہاں صاف کیوں نہ فرما دیا کہ دین محمدی کی پیروی کرو، یہ کیوں کہا کہ دین ابراہیمی کی پیروی کرو۔ **جواب:** اس لئے کہ وہ لوگ اپنے دین کو دین ابراہیمی کہتے تھے اور اپنے کو ابراہیمی کہلواتے تھے، نیز ابراہیم علیہ السلام کی محبت کا دعویٰ کرتے تھے، اس لئے ان الفاظ میں انہیں اسلام کی تبلیغ کی گئی جیسے آج ہم کفار سے کہیں کہ سچے دین یا برابری والے دین میں آجاؤ، مطلب یہ ہے کہ ملت ابراہیمی حقیقت میں اسلام ہی ہے۔ **تیسرا اعتراض:** اگر اسلام

ملت ابراہیمی ہے، تو یہ دین تمام دینوں کا ناسخ نہ ہوا پھر حضور ﷺ کے تشریف لانے کی ضرورت کیا تھی وہی دین باقی رکھا جاتا؟ **جواب:** اسلام کے دین ابراہیمی ہونے کے معنے نہ تو یہ ہیں کہ یہ دین بعینہٖ بالکل وہی ہے، اس وقت قرآن کریم نہ تھا، اور اسلام کے ہزاروں احکام نہ تھے، اور نہ یہ معنے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ابراہیم علیہ السلام کے متبع ہیں اور نہ کوئی مسلمان اسلام کے احکام کی ان کے احکام جان کر اتباع کرتا ہے بلکہ اسلام کو ملت ابراہیمی سے وہ نسبت ہے جو شرح کو متن سے ہوتی ہے یا درخت کو تخم سے، کہ شرح اپنے میں پورے متن کو لئے ہوتی ہے مع ہزارہا فوائد کے، اسی طرح اسلام اپنے اندر ان کی ملت کو لئے ہوئے ہے اور ان کے موافق ہے، اور اب ہم ان کی ملت پر اس لئے عمل کرتے ہیں کہ ہمارے حضور انور ﷺ کا فرمان ہے کہ، اسلام تمام دینوں کا ناسخ بایں معنے ہے کہ اب ان کے احکام کی اتباع نہیں بلکہ اسلام کی اتباع ہے۔ اور ہم ان کی امت نہیں بلکہ حضور ﷺ کی امت ہیں۔ نسخ کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ان کے سارے احکام مٹا دیئے جائیں، لہٰذا نسخ موافقت کے خلاف نہیں۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے کبھی شرک نہ کیا، اور قرآن کریم دوسرے مقام پر فرمارہا ہے کہ آپ نے چاند، سورج اور تاروں کو اپنا رب فرمایا فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ (انعام: ۷۷) یہ شرک ہے، معلوم ہوا پہلے آپ مشرک تھے بعد میں موحد مومن ہوئے، **جواب:** نعوذ باللہ آپ کی ذات تو بہت اعلیٰ وارفع ہے، آپ ابوالانبیاء ہیں، کوئی نبی کسی وقت شرک نہیں کرتے، یہ حضرات پیدائشی عارف باللہ ہوتے ہیں، جناب کا اس وقت چاند، سورج کو هٰذَا رَبِّیْ فرمانا کفار کو الزام دینے کے لئے تھا کہ کیا تم اسے میرا رب بتاتے ہو، جو ڈوب جائے وہ خدا کیسا، اسی لئے رب تعالیٰ نے ان کے کلام کی تائید و تعریف فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَیْنٰهَآ اِبْرٰهِیْمَ عَلٰی قَوْمِهٖ (انعام: ۸۳) یعنی ابراہیم علیہ السلام کو یہ دلیل ان کی قوم کے مقابلہ میں ہم نے سکھائی، نیز آپ نے اپنے اس فرمان سے متصل فرمایا یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (انعام: ۷۸) اے میری قوم میں تمہارے شرک سے دور ہوں اور بیزار، ورنہ آپ یوں فرماتے کہ میں اپنے شرک سے توبہ کرتا ہوں۔ بری سے معلوم ہوا کہ آپ شرک سے قریب بھی نہ تھے۔

تفسیر صوفیانہ

جو شخص بغیر مجاہدہ نفس رب تعالیٰ تک پہنچنا چاہے اور اس راستہ کو آسان اور اس کے طے کرنے کو مذاق جانے وہ بڑا ظالم ہے، اے محبوب فرمادو اللہ سچا ہے اس نے سچ فرمایا کہ اللہ کی رضا بغیر اپنی رضا فنا کئے نہیں پاسکتے، اے مجاہدو تم ملت ابراہیمی اور جبلت خلیلی کی اتباع کرو کہ ان کی ملت و جبلت یہ تھی کہ وہ مہمانوں پر مال خرچ کرتے تھے، امتحان پر بیٹے کی قربانی اور اپنے کو نار نمرود میں ڈال دینے سے دریغ نہ فرماتے تھے، خلت کی ملت ہی اور ہے، ابراہیم علیہ السلام مشرکین میں سے نہ تھے کہ اللہ کے ساتھ اوروں سے بھی دوستی کریں۔ **شعر:**

اگر جز بحق مے رود جادہ ات در آتش فشانند سجادہ ات

اللہ کے ولی وہ ہیں جو اللہ ہی سے محبت کریں اور اسی کی محبت کے لئے اس کے محبوبوں سے محبت کریں، صوفیاء فرماتے ہیں کہ بغیر خلوص و محبت عبادات کرنا ایسا ہے جیسے ٹھنڈے لوہے کو کوٹنا کہ اس میں محنت بہت، نتیجہ کچھ نہیں، دل کو پہلے عشق کی بھٹی میں

گرم وزم کرو، پھر عبادتوں کے ہتھوڑوں سے کوٹو، محمد ابن حسان فرماتے ہیں کہ میں لبنان کے پہاڑوں میں گھوم رہا تھا اچانک ایک جلے بھنے جوان کو دیکھا، مجھے دیکھتے ہی وہ بھاگا، میں نے کہا اللہ کے بندے مجھے کچھ نصیحت کئے جا، وہ بھاگتے ہوئے کہتا گیا اللہ سے ڈرو وہ بڑا غیور ہے وہ نہیں چاہتا کہ اس کے بندے کے دل میں اس کے سوا کوئی اور بھی رہے رب تعالیٰ دل کا خلوص عطا فرمائے۔ (از روح)

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾
بیشک پہلا وہ گھر جو رکھا گیا واسطے لوگوں کے یقیناً وہ ہی ہے جو مکہ میں برکت والا اور ہدایت تمام جہانوں کے لئے
بے شک سب میں پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کا مقرر ہوا وہ مکہ میں ہے برکت والا اور سارے جہان کا رہنما

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ نے یہود کے اس طعن کو دفع فرمایا، جو وہ نبی ﷺ کی نبوت پر اونٹ وغیرہ کی حلت سے کرتے تھے، اب انہی کے اس طعن کو دفع فرمایا جارہا ہے جو وہ کعبہ شریف کے قبلۂ اسلام ہونے کی بنا پر کرتے تھے کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو آپ کا قبلہ بیت المقدس کیوں نہیں جو پچھلے انبیاء کا قبلہ تھا اور ان کی ہجرت گاہ اور وہیں قیامت قائم ہوگی۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں جواز نسخ پر دلیل قائم کی گئی تھی کہ کچھ کھانے پہلے حلال تھے پھر حرام کئے گئے، اب اس آیت میں کعبہ معظمہ کے قبلہ بننے کا ذکر فرمایا جارہا ہے، اس کا قبلہ ہونا بھی بیت المقدس کے نسخ کے بعد ہے یعنی جانوروں کی حلت کے نسخ میں وہ حکمتیں تھیں اور نسخ قبلہ میں یہ حکمتیں ہیں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں دین ابراہیمی کے اتباع کا حکم دیا گیا تھا اور اس دین کا بڑا رکن حج بیت اللہ ہے لہٰذا اب کعبہ شریف کے فضائل بیان ہورہے ہیں تاکہ حج واجب ہونے کی حکمتیں معلوم ہوسکیں۔ **چوتھا تعلق:** یہود و عیسائی اپنے کو ابراہیمی کہتے تھے اور اپنی ملتوں کو ملت ابراہیمی بتاتے تھے، ان کی تردید میں پہلے فرمایا گیا کہ ان کے دین میں فلاں فلاں جانور حلال تھے تمہارے ہاں حرام، اب فرمایا جارہا ہے کہ ان کا قبلہ کعبہ شریف تھا تمہارا قبلہ بیت المقدس، ان کے ہاں حج فرض تھا تمہارے ہاں نہیں، ان کے ہاں کعبہ کی تعظیم رکن ایمان تھی تم کعبہ سے بے تعلق ہو، تو تم ابراہیمی کہاں سے ہوئے؟ ابراہیمی تو مسلمان ہیں۔

شان نزول

ایک بار یہود نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ ہمارا قبلہ بیت المقدس ہے تمہارا قبلہ کعبہ، اور بیت المقدس کعبہ سے کہیں افضل ہے، کہ وہ کعبہ سے پہلے اور پرانا ہے، انبیائے کرام کا قبلہ اور ان کی ہجرت گاہ ہے، اور شام کے علاقہ میں واقع ہے جو متبرک زمین ہے، جہاں قیامت قائم ہوگی، مسلمانوں نے کہا نہیں ہمارا کعبہ افضل ہے، اس موقعہ پر یہ آیت اتری، جس میں ان کی تردید اور مسلمانوں کی تائید کی گئی۔ (تفسیر خازن و خزائن و روح المعانی و جلالین، صاوی وغیرہ)

قلب کے سیاہ دانہ میں ہوتی ہے۔ خلۃ سے خلیل اور حب سے حبیب مشتق ہے یہ نفی خاص کفار کے لئے ہے کہ مسلمانوں کی دوستیاں وہاں کام آئیں گی۔ رب فرماتا ہے۔ اَلْاَخِلَّاۗءُ يَوْمَىِٕذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ (زخرف: ۶۷) وَلَا شَفَاعَةٌ یہ شفیع سے بنا بمعنی جوڑا اسی لئے طاق عدد کو فرد اور جفت کو شفع کہتے ہیں۔ سفارش کو اسی لئے شفاعت کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے مشفوع اکیلا نہیں رہتا۔ شفاعت کی نفی بھی کفار ہی کے ساتھ ہے۔ مسلمانوں کی شفاعت ہوگی۔ رب فرماتا ہے۔ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ (المدثر: ۴۸) یہ ہی بتانے کے لئے فرمایا جارہا ہے۔ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ کافر ہی ظالم ہیں۔ کافر بمعنی منکر ہے اور بہت ممکن ہے کہ یہاں منکر زکوٰۃ مراد ہو۔ اسی لئے روح البیان نے اس کی تفسیر میں فرمایا۔ اے التَّارِكُوْنَ لِلزَّكٰوةِ۔ ھم حصر کے لئے اور الظّٰلِمِيْنَ کا الف لام عہدی ہے۔ یہ لفظ ظلمٌ سے بنا۔ جس کے معنی ہیں کسی چیز کے غیر محل میں خرچ کرنا یا مالک کی بلا اجازت صرف کرنا کبھی منع کرنے کو بھی ظلم کہہ دیتے ہیں جیسے اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا (کہف: ۳۳) (کبیر) یعنی کافر ہی اپنے نفس یا مساکین پر ظلم کرتے ہیں۔ یا کافر ہی بخیل ہوتے ہیں۔ خیال رہے کہ کافر کو دو وجہ سے ظالم فرمایا گیا۔ ایک یہ کہ ظالم کی ساری چیزیں اللہ کی ہیں۔ اور انسان اللہ کے بندے۔ فرمانبردار بندے کو مالک کی چیزیں استعمال کرنے کا حق ہوتا ہے۔ نافرمان کو حق نہیں ہوتا۔ کافر نافرمان بندہ ہے۔ اس کا اللہ کی چیزوں کو استعمال کرنا ناحق ہے۔ اور کسی کی چیز ناحق پر خرچ کرنا ظلم ہے۔ دوسرا اس لئے برات کی دعوت کھانے کا اس کو حق ہے جو دولہا سے تعلق رکھتا ہے۔ تعلق نہ رکھنے والا چور بن کر کھاجاتا ہے۔ مہمان بن کر نہیں۔ عالم برات ہے۔ اور محمد مصطفیٰ ﷺ دولہا۔ مسلمان ان کے بندے غلام ہیں۔ کفار ان کے دشمن لہٰذا کفار جو کچھ کھا رہے ہیں وہ چور بن کر ظلماً کھا رہے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو ہماری دی ہوئی نعمتوں میں سے حسب موقعہ خرچ کرو۔ اور اس دن سے پہلے خیرات کرلو۔ جس میں نہ تجارت ہوگی کہ کچھ کما کر خیرات کرو یا کسی سے اعمال خرید کر نامہ اعمال بھرلو۔ اور منکرین زکوٰۃ یعنی کفار کے لئے کسی کی دوستی بھی کام نہ آئے گی۔ جس کا وہ یہاں بھروسہ کئے بیٹھے ہیں۔ اور نہ انہیں کسی کی سفارش ہو اور بخیل کافر تو بڑے ہی ظالم ہیں۔ کہ فقراء کا حق مار کر ان پر ظلم کرتے ہیں۔ شرک کفر کر کے اپنی جان پر ظلم کرتے ہیں۔ بغیر اذن خداوندی مال خرچ کر کے اپنے پر ظلم کرتے ہیں۔ خیال رہے کہ دنیوی مقدمات میں تین ہی چیزوں سے کام لیا جاتا ہے۔ رشوت۔ دوستی۔ سفارش۔ حاکم کی مٹھی گرم کردی چھوٹ گئے۔ حاکم کے ساتھ دوستی ہے۔ اس نے رعایت کردی۔ حاکم کے پاس کوئی زبردست سفارش پہنچی۔ جس سے جرم معاف ہوگیا۔ یہاں ان تینوں کی نفی فرما کر بتایا گیا کہ وہاں کوئی حیلہ کارگر نہ ہوگا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** شفاعت اور محبت کا کام نہ آنا کفار کے لئے ہے جیسا کہ وَالْكٰفِرُوْنَ الخ سے معلوم ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** عوام کو سارا مال خیرات نہ کرنا چاہیے بلکہ بعض جیسا کہ مِمَّا سے پتہ لگا۔ **تیسرا فائدہ:** صدقہ حلال مال سے چاہیے نہ کہ حرام مال سے جیسا کہ رزقنا میں رزق کو رب کی طرف نسبت دینے سے معلوم ہوا۔ کیونکہ اگرچہ ہر مال خدا کا ہی عطیہ ہے مگر اس کی طرف نسبت صرف حلال مال کی کی جاتی ہے۔ **چوتھا**

کچل ڈالنا، چونکہ اس شہر کے دشمن اصحاب فیل وغیرہ کچل دیئے گئے، اس لئے اسے بکہ کہا جاتا ہے، اور مکہ مک سے بنا بمعنی چوس لینا، خشک کر دینا، چونکہ یہ شہر حاجیوں کے گناہوں کو جذب کر لیتا ہے، اس لئے اسے مکہ کہا جاتا ہے، مکہ معظمہ کے بہت نام ہیں، مکہ، بکہ، ام رحم، کو لیساء، بشاشہ، حاطمہ، ام القریٰ، بلدامین، المامون، صلاح، عرش، قادس، مقدس، راس، کوثاء، مبینہ (ث) (تفسیر خازن وکبیر) یونہی کعبہ کے بہت نام ہیں، کعبہ، بیت العتیق، بیت اللہ، مسجد الحرام، ان تمام ناموں کے معانی اور وجہ تسمیہ اس جگہ تفسیر کبیر میں دیکھو، اور ہم بھی انشاء اللہ سورۂ حج میں ذکر کریں گے مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ مبارک بورک سے بنا بمعنی بیٹھ جانا، لازم ہو جانا، کہا جاتا ہے بَرَكَ الْبَعِيْرُ اونٹ بیٹھ گیا، اونٹوں کے طویلہ کو مبارک الابل کہتے ہیں، مفردات راغب میں اَلْبَرَكَةُ ثُبُوْتُ الْخَيْرِ الْاِلٰهِي اصطلاح میں اس کے معنی بڑھنا اور زیادہ ہونا بھی ہیں اور بقاء دوام بھی، دوسرے معنے سے یہ خدا کی صفت ہے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (مؤمنون: ۱۴) پہلے معنی کے لحاظ سے خانہ کعبہ کی بھی صفت ہے اور انبیائے کرام علیہم السلام کی بھی عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا (مریم: ۳۱) چونکہ مکہ مکرمہ میں ایک نیکی کا ثواب ایک لاکھ ہے، اور وہاں ہر طرف سے کھنچ کر پھل ودانے پہنچتے ہیں، اور کعبہ مثل مرکز ہے، نماز کی صفیں مثل دائرے کے، اس لئے اسے مبارک فرمایا گیا، هُدًى سے مراد ہدایت دینے والا ہے یا باعث ہدایت، چونکہ کعبہ معظمہ انسان جنات بلکہ فرشتوں کا بھی قبلہ ہے، اس لئے اسے عالمین کی ہدایت فرمایا گیا، نیز یہ انسانوں کو جنت کی ہدایت دیتا ہے اس لئے هُدًى فرمایا گیا، ہدایت کی پوری بحث اور اس کے اقسام اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (فاتحہ: ۵) کی تفسیر میں گزر چکی۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو یا اے سارے انسانو! یقین سے جان لو کہ ساری روئے زمین پر سب سے پہلا اور سب سے افضل گھر جو لوگوں کے دینی اور دنیوی فائدوں کے لئے پیدا کیا گیا اور بنایا گیا وہی ہے جو کہ مکہ شریف میں واقع ہے نہ کہ بیت المقدس جو شام میں ہے وہ درجہ میں بھی کعبہ کے بعد ہے اور فضیلت میں بھی وجود وفیوض اسی کے مقدم ہیں، یہ بڑا برکتوں والا گھر ہے جس میں ایک نیکی کا ثواب ایک لاکھ ہے اور یہ صرف انسانوں کے لئے نہیں بلکہ تمام جہانوں کے لئے باعث ہدایت اور ان کا راہنما ہے لہٰذا ان محبوب ﷺ کی افضلیت اور ان کے دین کی اکملیت اور ان کی امت کی شرافت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ان کا قبلہ کعبہ معظمہ ہے، کسی کی افضلیت معلوم کرنے کے لئے اس کے دوست احباب اور اس کے سامان کو بھی دیکھا جاتا ہے، جس دین کے لانے والے محمد رسول اللہ ﷺ ہوں، پھیلانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور قبلہ کعبہ ہو وہ دین خود کیسا ہوگا۔

کعبہ کی اولیت

مکہ معظمہ اور کعبہ شریف کے تاریخی حالات پہلے پارے کی تفسیر میں بیان کئے گئے، یہاں اس کی اولیت اور افضلیت کے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہے، تفسیر روح المعانی وغیرہ نے اس آیت کے ماتحت بیان فرمایا کہ زمین وآسمان کی پیدائش سے پہلے پانی

ہمارے ذکر کے لئے وقف کردو۔ چوبیں ہزار سانسوں میں سے کچھ سانس ہماری راہ میں خرچ کرو۔ چلنے۔ چھونے۔ دیکھنے۔ بولنے۔ سمجھنے کی قوتیں جو تم کو ملی ہیں۔ یہ ہماری دی ہوئی روزیاں ہیں۔ ان سب میں سے ہماری راہ میں خرچ کرو۔ کہ کچھ ہمارے لئے بولو۔ ہمارے لئے چلو۔ ہمارے لئے چھوؤ۔ ہمارے لئے دیکھو۔ ہمارے لئے سوچو۔ چونکہ دنیا میں کمائی کے تین ہی طریقے ہیں۔ تجارت دوستوں کے ہدیہ بڑوں کی مدد۔ انہیں تین کی نفی کردی گئی۔ کہ قیامت میں ان میں سے کچھ نہ ہوگا۔ خیال رہے کہ بدزعیب بخل ہے کہ یہ کبھی کفر تک پہنچادیتا ہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جیسے رب نے بعض لوگوں کو ان کی ضرورت سے زیادہ مال دیا جنہیں غنی کہا جاتا ہے اور بعض کو ان کی ضرورت سے کم دیا جنہیں فقیر کہا جاتا ہے۔ یوں ہی رب نے اندرونی روزی یعنی اعمال وکمال بعض کو ان کی ضرورت سے زیادہ بخشی ہے۔ جیسے حضرات انبیاء' صحابہ' اولیاء اور بعض کو ان کی ضرورت سے کم جیسے ہم گنہگار۔ پھر جیسے اغنیاء کو حکم دیا کہ اپنے مال میں غریبوں کو شریک کرلو۔ تم ان کی روزی کا وسیلہ ہو۔ ہم بلا وسیلہ انہیں بھی دے سکتے تھے۔ مگر تمہیں ثواب دینے کے لئے انہیں فقیر تمہیں غنی کیا۔ ایسے ہی باطنی اغنیاء کو حکم دیا کہ اپنے اعمال وکمال میں گنہگاروں کا بھی حصہ رکھو۔ اس آیت میں ان سے بھی خطاب ہے کہ ہماری دی ہوئی روزی یعنی اعمال وکمال میں سے گنہگاروں پر خرچ کرو۔ اس لئے حضور ﷺ اپنی امت کی طرف سے بھی قربانی فرماتے تھے۔ لہٰذا اس آیت سے ایصال ثواب بھی ثابت ہے۔

حکایت: کسی بزرگ نے شیطان سے پوچھا۔ کہ تو لوگوں کو کس طرح بہکاتا ہے۔ وہ بولا تین ذریعوں سے۔ بخل' غصہ اور نشے میں۔ غصہ ور آدمی کو ایسا گھماتا ہوں جیسے بچے گیند کو اور نشہ والے آدمی کو ایسے ہانکتا ہوں جیسے چرواہا بکریوں کو محمد بن اسمٰعیل بخاری سے روایت ہے کہ رب تعالیٰ نے حضرت جبرائیل سے پوچھا کہ اگر ہم تم کو زمین پر رکھتے تو تم کیا کرتے۔ عرض کیا کہ تین کام' غریبوں کی مدد کرتا۔ خلق کے عیب چھپاتا۔ پیاسوں کو پانی پلاتا (روح البیان) نیز یہاں خرچ کا تو حکم دیا مگر اس کا مصرف نہ بتایا۔ کیونکہ ہر خرچ کا مصرف جداگانہ ہے۔ صدقات کا مصرف فقراء ہدیہ کا مصرف اہل قرابت۔ جان کا مصرف جہاد کا میدان' سانس کا مصرف ذکر رحمٰن غرضکہ بیشمار مصرف ہیں۔ ان سب کا اجمال یہ ہے کہ ساری نیکیوں کا مصرف رضاء خدا ومصطفیٰ ﷺ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس عبادت سے وہ محبوب راضی ہوجائیں۔ وہ ہی درست ہے۔ باقی برباد رب فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (التوبہ:۶۲) نماز روزہ سے یہ ہی مقصود ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے کیا خوب فرمایا۔ شعر

مجھے فکر کب تھا رکوع کا مجھے کام کیا تھا سجود سے — کسی نقش پا کی تلاش تھی جو جھکا رہا میں نماز میں
در مصطفیٰ پہ رکھا جو سر تو ندا ہوئی کہ اے بے خبر — تیرے وہ بھی سجدے ادا ہوئے جو قضا ہوئے تھے نماز میں

بظاہر وہ عابد معبود ہیں۔ مگر درحقیقت عابدوں کے اصل مقصود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کیا خوب کہا۔ شعر

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر
وہ بزم طیبہ میں لاکھ بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ

جلیل آمر حضرت خلیل معمار، جناب ذبیح سنگ بردار اور حضرت جبریل انجینئر، علیہم السلام (کبیر)، ۲۔ کعبہ معظمہ میں مقام ابراہیم (علیہ السلام) سنگِ اسود وغیرہ ایسی قدرت کی نشانیاں موجود ہیں جو بیت المقدس میں نہیں، ۳۔ کعبہ معظمہ پر پرندے نہیں اڑتے بلکہ اس کے آس پاس بیٹھ جاتے ہیں، بیت المقدس میں یہ بات نہیں، ۴۔ حرم کعبہ میں بکری اور شیر ایک جگہ پانی پی لیتے ہیں، وہاں شکاری جانور بھی شکار نہیں کرتے۔ ۵۔ حرم کعبہ میں تا قیامت جنگ وقتال حرام ہے، یہ اس دعا کا اثر ہے رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا (بقرہ:۱۲۶)۔ ۶۔ کعبہ معظمہ سارے حجازیوں خصوصاً مکہ والوں کی پرورش کا ذریعہ ہے کہ وہ جگہ وادی غیر ذی زرع ہے جہاں معاش کے ذریعہ سب ناپید ہیں، مگر وہاں کے باشندے دوسروں سے زیادہ مزے میں ہیں، غرضکہ وہ جگہ صرف عبادتوں کے لئے ہے، کماتے دنیا والے ہیں اور کھاتے کعبہ والے ہیں، بیت المقدس سرسبز وشاداب زمین میں واقع ہے الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ (الاسراء:۱)، ۷۔ رب تعالیٰ نے کعبہ کی حفاظت خود فرمائی، کہ فیل والوں کو ابابیل سے مروا دیا۔ ۸۔ حج ہمیشہ کعبہ ہی کا ہوا، بیت المقدس کا حج کبھی نہ ہوا۔ ۹۔ اللہ کے آخری نبی حضور محمد ﷺ کعبہ معظمہ کے پاس مکہ شریف میں پیدا ہوئے۔ ۱۰۔ رب تعالیٰ نے کعبہ کے شہر ہی کو بلد امین فرمایا اور اسی کی قسم فرمائی کہ فرمایا وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ (التین:۳)۔ ۱۱۔ کعبہ معظمہ کے پاس نیکی کا ثواب ایک لاکھ اور بیت المقدس کے پاس پچاس ہزار، ۱۲۔ فرشتوں اور بہت سے انبیاء کا قبلہ کعبہ ہی رہا نہ کہ بیت المقدس۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** مقبول بندوں اور محبوب چیزوں پر اعتراض کرنا طریقہ کفار ہے، اوران کے فضائل بیان کرنا، معترضین کے جوابات دینا سنت الٰہیہ ہے، دیکھو یہود نے کعبہ پر اعتراض کئے، رب تعالیٰ نے جواب دیئے اور فضائل بیان فرمائے۔ **دوسرا فائدہ:** مقبول بندوں اور محبوب چیزوں میں فرق مراتب ہے اگرچہ نفس محبوبیت ومقبولیت میں سب یکساں ہیں، دیکھو کعبہ و بیت المقدس دونوں گھر اللہ کے ہیں، مگر بیت المقدس اعلیٰ اور کعبہ معظمہ بہت ہی اعلیٰ ہے، یہی فرق مراتب انبیاء کرام اور اولیاء اللہ میں بھی ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (بقرہ:۲۵۳) ساری مسجدیں اللہ کا گھر ہیں مگر جامع مسجد سبحان اللہ، **تیسرا فائدہ:** سب سے پہلے اور سب سے پیچھے ہونا بھی وجہ افضلیت ہے، دیکھو رب تعالیٰ نے کعبہ کی افضلیت اس کی اولیت سے ثابت فرمائی اور ہمارے حضور انور ﷺ کی افضلیت آپ کی خاتمیت یعنی آخریت سے بیان فرمائی، کہ فرمایا وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (احزاب:۴۰) لہٰذا مولوی محمد قاسم صاحب نے جو تحذیر الناس میں فرمایا کہ اولیت وآخریت میں کوئی افضلیت نہیں وہ غلط ہے اور اس آیت کے خلاف ہے، خیال رہے کہ کعبہ فقط اول ہے اور ہمارے حضور انور ﷺ اول بھی آخر بھی هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ (حدید:۳) کے مظہر اتم ہیں، کہ وجود میں اول ہیں ظہور میں آخر، حضور ﷺ کعبہ اور تمام مخلوق کی علت غائی واصل مقصود ہیں کہ سب کچھ ان کی خاطر بنا، اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں۔ **شعر:**

ہوتے کہاں خلیل و بناء کعبہ و منیٰ ۔۔۔ لولاک والے صاحبی سب تیرے گھر کی ہے

مرزوق، مسموع، مبصر حادث ہیں۔ وہ رازق ہے خواہ کوئی اس سے روزی لے یا نہ لے۔ آفتاب چمکانے والا ہے کوئی اس سے چمکے یا نہ چمکے غرضیکہ چمکانا صفت اور ہے چمکانا فعل اور فعل چمکانا چمکنے والے پر موقوف ہے۔ مگر صفت اس پر موقوف نہیں۔ اسی طرح صفات الٰہیہ قدیم ہیں۔ افعال الٰہیہ حادث۔ دیکھو انسان سونے میں بھی بصیر ہے۔ اگرچہ وہ اس وقت کچھ نہیں دیکھ رہا۔ دیکھنا اور ہے۔ دیکھنے والا ہونا کچھ اور ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہاں اللہ سے سچا معبود مراد ہے کیونکہ جھوٹے معبود تو بت وغیرہ بھی ہیں۔ یعنی اس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں۔ عبادت کے معنی ہیں انتہائی عجز و نیاز۔ عابد انتہائی عاجز۔ معبود انتہائی عزت والا جس کے سامنے دوسرے انتہائی عاجزی کریں۔ بندہ جو کام اپنے کو بندہ سمجھ کر اور دوسرے کو رب یا رب کی مثل سمجھ کر کرے وہ عبادت ہے۔ سجدۂ تعظیمی عبادت نہیں۔ وہ تو دوسری شریعتوں میں جائز تھا۔ مگر سجدۂ تعبدی عبادت ہے۔ وہ ہمیشہ اللہ ہی کو کیا گیا۔ کسی آسمانی دین میں غیر اللہ کو جائز نہ ہوا۔ دونوں سجدوں میں فرق صرف نیت کا ہے۔ محترم سمجھ کر سجدہ تعظیمی ہے۔ ربّ یا ربّ کی مثل سمجھ کر سجدہ تعبدی ہے۔ مشرکین سورج، گنگا وغیرہ کو ربّ کی مثل سمجھ کر ان کی پوجا کرتے ہیں۔ اِذْ نُسَوِّیْکُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (الشعراء:۹۸) اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ یہ اللہ کی خبر بعد خبر ہے۔ حی اصل میں حیو تھا۔ واؤ ی ہو کر ی میں مدغم ہو گیا۔ یہ حیات سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ زندگی۔ تفسیر کبیر نے فرمایا۔ کہ ہر کامل کو حی کہا جاتا ہے۔ اسی لئے زمین کے آباد کرنے کو احیاء اموات کہتے ہیں۔ رب فرماتا ہے۔ کَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (الروم:۵۰) چونکہ زندگی ہی جسم کا کمال ہے۔ اور وہ تمام صفات کا موقوف علیہ ہے۔ اسی لئے اسے بھی حیات کہہ دیتے ہیں۔ درختوں کی سرسبزی کو بھی حیات کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب ہے۔ اپنی صفات میں کامل کہ وہ اور اس کی صفات حقیقیہ وصفات اضافیہ قابل عدم نہیں۔ اور نہ اس کے کمال کی کوئی حد بندی ہے۔ اَلْقَیُّوْمُ یہ قیام کا مبالغہ ہے۔ خیال رہے کہ قائم کے تین مبالغے ہیں۔ قیوم، قیام اور قیم جیسے دار کا مبالغہ دیار۔ دیور اور دیر یہ اصل میں قیووم تھا۔ بروزن فیعول واؤ ی ہو کر ی میں مدغم ہوا (کبیر) اس کے معنی خود قائم اور سارے عالم کا قائم رکھنے والا کہ سب اسی سے قائم ہیں۔ نہ وہ کسی میں ہے نہ کسی سے ہے۔ بلکہ سب اس سے ہیں۔ اس کا وجود کسی پر موقوف نہیں۔ موجودات تین طرح کے ہیں بعض وہ جو دوسرے سے قائم ہیں۔ جیسے جسم کا رنگ و بو یا اجسام کا سایہ کہ رنگ و بو تو اپنے محل کا محتاج ہے۔ اور سایہ تین چیزوں کا حاجتمند۔ سایہ دار جسم کا۔ نور کا اور اس محل کا جہاں سایہ پڑے۔ انہیں عرض کہتے ہیں۔ دوسرا وہ جو بغیر کسی محل کے خود موجود ہیں۔ جیسا اجسام انہیں جوہر یا قائم بالذات کہا جاتا ہے۔ تیسرے وہ جو خود بھی آپ موجود اور اس سے دوسرے موجود اسے قیوم کہتے ہیں۔ رب تعالیٰ قیوم حقیقی ہے کہ اس کے ارادہ و اذن سے عالم موجود و قائم ہے۔ اور بعض حضرات اولیاء قیوم بالعرض ہیں جن کے ذریعہ عالم کو ربّ نے قائم رکھا ہے یہاں قیوم حقیقی یعنی جہان کو رکھنے والا مراد ہے۔ یہ رب تعالیٰ ہی کی صفت ہے۔ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ تَاْخُذُ اَخْذٌ سے بنا بمعنی پکڑنا یہ کبھی غلبہ کے ساتھ ہوتا ہے جسے بطش کہتے ہیں اور کبھی عارضی یہاں ہر قسم کی پکڑ کی نفی ہے۔ سِنَةٌ وسنٌ سے بنا بمعنی غفلت اصطلاح میں نیند کے مقدمہ کو جس سے اعضاء بے قابو ہو جائیں اور پوری غفلت طاری نہ ہو۔ سِنَةٌ کہتے ہیں۔ بمعنی اونگھ۔

شاعر کہتا ہے۔ مصرع:

فِیْ عَیْنِهٖ سِنَةٌ وَّلَیْسَ بِنَائِمٖ

میں آئی، ظاہر ہے کہ اس وقت تک لوگ بغیر گھر کے نہ رہے، رہنے سہنے کے لئے انہوں نے مکانات ضرور بنائے، خیال رہے کہ ایک ہے کعبہ کا تقرر، اور ایک ہے وہاں عمارت کا موجود ہونا، اور ایک ہے انسانوں کا وہاں گھر بنانا، کعبہ کا تقرر تو سارے عالم اجسام سے پہلے ہوا، اور وہاں عمارت کا آسمان سے لایا جانا آدم علیہ السلام کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے ہوا جبکہ آسمان زمین بلکہ بیت المعمور بھی بن چکے تھے، اور انسانوں کا بشکل بیت بنانا ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ہوا، پہلے معنی سے کعبہ اول حقیقی ہے، اور دوسرے دو معنی سے اول اضافی، اسی لئے رب تعالیٰ نے یہاں وضع فرمایا بُنِیَ نہ فرمایا، لہٰذا یہاں یہ تفسیر بھی درست ہے اور ان بزرگوں کے فرامین بھی صحیح۔ **تیسرا اعتراض:** تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ کو بکہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ زمین اپنے دشمنوں کو کچل ڈالتی ہے، دیکھو اصحاب فیل اسی سرزمین کی وجہ سے ہلاک کر دیئے گئے، مگر حجاج ابن یوسف نے بوقبیس پہاڑ پر گوپھن قائم کر کے مسجد حرام پر سنگ باری کی، جس سے اس عمارت کو نقصان پہنچا، ایسے ہی یزید پلید کے زمانہ میں کعبہ معظمہ کی بے حرمتی کی گئی۔ حتیٰ کہ غلاف کعبہ کو آگ لگ گئی، مگر یہ دونوں ہلاک نہ ہوئے تو یہ جگہ بکہ کہاں رہی؟ **جواب:** حجاج و یزید خانہ کعبہ کے دشمن نہ تھے اور ان مردودوں نے اسے برباد کرنے کے لئے یہ حرکتیں نہ کی تھیں بلکہ حجاج نے تو حضرت عبد اللہ ابن زبیر کے قتل کے لئے یہ حرکت کی، ان کی فوج حرم شریف میں تھی، اسی لئے حضرت ابن زبیر کی شہادت کے بعد پھر اسی نے کعبہ معظمہ کو بہت اہتمام سے بنایا اور سارے حرم شریف کی درستی و مرمت کی اور یزید پلید نے ان مکہ والوں کی مخالفت میں جنہوں نے اس کی حکومت کے خلاف قدم اٹھایا تھا اور واقعہ کربلا کے بعد عام طور پر اس کی سلطنت کی (اس کے خیال میں) بغاوت کی تھی یہ حرکت کی، اس کی نیت بھی کعبہ معظمہ کو برباد کرنے کی نہ تھی، اس لئے یہ لوگ عذاب سے بچے رہے، ورنہ جو کعبہ کی بربادی کی نیت سے اس پر حملہ کرے یقیناً برباد ہوگا، اللہ اس کا حافظ و ناصر ہے، اور اس کا نام بکہ بالکل درست ہے۔

تفسیر صوفیانہ

اس آیت کریمہ نے جیسے کعبہ معظمہ کے فضائل بیان کئے، ویسے ہی مکہ معظمہ کے بھی فضائل بیان کئے۔ اس لئے کہ اس میں کعبہ ہے، قیمتی موتی کی سیپ بھی قیمتی ہوتی ہے، مومن کا دل بیت اللہ ہے اور مومن کا جسم مکہ معظمہ جس میں یہ بیت اللہ واقع ہے، مومن کا دل لوگوں کے نفع کے لئے بنایا گیا، اسی سے تمام جہانوں کے لئے ہدایت کے چشمے پھوٹتے ہیں، یہ دل بڑا برکت والا ہے، صوفیاء فرماتے ہیں کہ قلب مومن کی عظمت کعبہ معظمہ سے زیادہ ہے۔ **شعر:**

دل بدست آور کہ حج اکبر است — از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
کعبہ تعمیر خلیل اطہر است — دل گذر گاہِ جلیل اکبر است

مولانا جلال الدین رومی مثنوی شریف میں فرماتے ہیں۔

گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ است — من نمی گنجم در ایں بالا و پست
در دل مومن بگنجم اے عجب — گر مرا جوئی در ایں دلہا طلب

انکار ہے۔اور شفاعت بالاذن کا ثبوت شفاعت کا انکار کرنا نادانی ہے۔

خلاصہ تفسیر

آیت الکرسی اول سے آخر تک کفار اور بد مذہبوں کا رد ہے۔ خالق کے منکر دہریوں کی تردید اللہ سے ہوئی۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ میں مشرکین کا رد ہے۔ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْم منکرین کی صفات کی تردید ہے۔ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ سے مجوس کا رد ہے جو دو خدا مانتے ہیں ایک یزدان خالق خیر دوسرا اہرمن خالق شر معتزلہ کی بھی پوری تردید ہوگئی۔ جو ہر بندہ کو اپنے برے اعمال کا خالق مانتے ہیں۔ من ذالذی میں بتوں کی شفاعت ماننے والوں کی تردید ہے۔ اِلَّا بِاِذْنِہٖ میں معتزلہ اور عام دیوبندی وہابیوں کا رد ہے جو شفاعت کے منکر ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ وہ ذات ہے جس کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں وہ ہی ازلی ابدی زندہ ہے اور تمام عالم کا قائم رکھنے والا غفلت سے پاک نہ اسے اونگھ آئے نہ اس پر نیند غلبہ کرے۔ آسمانوں زمین کی ساری چیزیں اسی کی مخلوق و مملوک ہیں۔ اس کے دربار کے دبدبے کا یہ عالم ہے کہ کسی کو بلا اجازت دم مارنے کی بھی جرأت نہیں۔ لہٰذا مشرکین جو اپنے بتوں کی شفاعت کے بھروسہ میں ہیں۔ سخت غلطی پر ہیں۔ خیال رہے کہ رب تعالیٰ کی صفات دو قسم کی ہیں۔ بعض وہ ہیں۔ جن کی تجلی مخلوق پر نہیں پڑی اور ان کو کسی معنی سے مخلوق کے لئے استعمال نہیں کر سکتے جیسے واجب الوجود۔ معبود۔ خالق۔ قدیم۔ بعض کے نزدیک رحمان بھی اور بعض صفات وہ ہیں جن کی جھلک مخلوق پر ڈالی گئی اور مخلوق پر بھی ان کا بول دینا درست ہے۔ جیسے حی۔ سمیع۔ بصیر۔ مالک۔ ملک۔ عزیز رؤف رحیم آیۃ الکرسی میں جو رب کی پہلی صفت ہے لا الله الا ھو۔ یہ پہلی قسم کی صفت ہے کہ کسی بندے کو اَللّٰہُ یا لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ نہیں کہہ سکتے۔ مگر حی و قیوم وغیرہ دوسری قسم کی صفات ہیں۔ کہ بندے پر بھی مجازاً بولی جاتی ہیں۔ دیکھو اونگھ و نیند نہ آنا رب کی بھی صفت ہے۔ اور اللہ نے فرشتوں کو اور بعد قیامت جنتیوں کو بھی یہ صفات بخشے ہیں۔ کہ نہ انہیں اونگھ ہے نہ نیند ایسے ہی آسمان و زمین کی ملکیت کہ ربّ نے بعض بندوں کو بخشی جیسے ابھی تفسیر میں عرض کیا گیا۔

شفاعت

ہم مسئلہ شفاعت پہلے سیپارہ میں وَلَا یُقْبَلُ مِنْھَا شَفَاعَةٌ (بقرہ:۴۸) کی تفسیر میں بہت کچھ عرض کر چکے ہیں۔ یہاں چند ضروری باتیں بتاتے ہیں۔ کفار اپنے بتوں کے متعلق دو عقیدے رکھتے تھے۔ ایک یہ کہ ان میں الوہیت ایسے حلول کئے ہوئے ہے۔ جیسے پھول میں رنگ و بو اسی لئے ان کو آلہ اور شُرَکا کہتے تھے اور خدا تعالیٰ الہ اکبر۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اکیلا اللہ تعالیٰ اتنا بڑا جہان نہ سنبھال سکتا ہے نہ چلا سکتا ہے۔ اس نے اپنی مدد کے لئے اپنے کچھ بندوں کو اپنا معاون و مددگار بنایا ہے اور ان میں کام تقسیم کر دیئے ہیں۔ ان بندوں میں بعض تو اللہ کی لڑکیاں ہیں۔ اور بعض اللہ کی بیویاں و بیٹے اور بعض اگرچہ ہیں تو نرے بندے ہی مگر الوہیت کی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ اسلئے انہیں خدا کا بندہ بھی کہتے ہیں۔ اور خدا کا شریک بھی انہی کی تردید کے لئے رب نے فرمایا لَمْ یَکُنْ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ (اسراء:۱۱۱) اللہ نے مجبوری کی بنا پر کسی کو ولی نہ بنایا انہی کو ولی مِنْ دُوْنِ اللہِ فرمایا گیا۔ یہ عقیدہ صریحی شرک ہے۔ دوسرا یہ کہ چھوٹے خدا بڑے خدا کے ہاں ہماری شفاعت کریں گے۔ اور اس بڑے کو جبراً ان کی شفاعت ماننی پڑے گی۔ جیسے بادشاہ کو ارکان سلطنت کی سفارش اس لئے ماننی پڑتی ہے کہ ان کے بگڑ جانے سے زوال سلطنت کا اندیشہ ہے۔ اس آیت میں دونوں عقیدوں کا رد بلیغ فرمایا گیا۔ گویا فرمایا گیا کہ وہاں تو وہ ہی

سے بھی مانو اور نفس وطبیعت سے بھی۔

تفسیر

فِيهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ۔ فیہ کا مرجع بیت اللہ شریف ہے نہ کہ بکہ، کیونکہ بیت مذکر ہے اور بکہ مؤنث اور فیہ میں ضمیر مذکر ہے، اس سے مراد خود کعبہ معظمہ اس کے آس پاس مسجد حرام شریف، سارا مکہ مکرمہ اور حدود حرم کی نشانیاں ہیں، کیونکہ یہ تمام کعبہ شریف ہی کی برکت سے ہیں لہٰذا اس پر یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ مقام ابراہیم وغیرہ خود کعبہ میں نہیں ہیں۔ آیات جمع آیت کی بمعنے علامت ونشانی، اس سے یا تو رب کی قدرت کی نشانیاں مراد ہیں یا کعبہ معظمہ کی عظمت کی علامتیں مقصود، انبیائے کرام کی ہجرت، اولیاء اللہ کی کرامات قرآن شریف کے جملے آیات کہلاتے ہیں کیونکہ وہ سب رب تعالیٰ کی قدرت اور اسلام کی حقانیت کی دلیلیں ہیں، اگر چہ عالم کا ہر ذرہ وقطرہ رب تعالیٰ کے لئے آئتیں ہیں، لیکن یہ چیزیں رب تعالیٰ کی بڑی آئتیں ہیں، اس لئے انہیں خصوصیت سے آیات فرمایا گیا بَيِّنٰتٌ بينة کی جمع ہے جو بین سے ماخوذ ہے بمعنی علیحدگی وجدائی، چونکہ ظاہر واضح چیز دوسروں سے الگ وچھٹی ہوئی ہوتی ہے اس لئے اسے بینہ کہا جاتا ہے، اسی لئے کھلے کلام کو بیان کہتے ہیں یعنی کعبہ معظمہ میں حقانیت کی ایسی نشانیاں ہیں جو خود اپنا بیان ہیں ظاہر ظہور معلوم ہو جاتی ہیں۔ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ یہ آیات کا بیان ہے یا منها محذوف کا مبتداء چونکہ مقام ابراہیم بہت سے عجائبات پر مشتمل ہے اس لئے یہ آیات جمع کا بیان ہوسکتا ہے یعنی وہ نشانیاں مقام ابراہیم ہے یا ان نشانیوں میں سے مقام ابراہیم ہے۔ بعض نے فرمایا کہ مقام ابراہیم اور من دخله، دونوں مل کر آیات کا بیان ہیں، یعنی وہ نشانیاں مقام ابراہیم اور وہاں کا امن ہے عربی میں دو پر بھی جمع بول دیتے ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (تحریم: ۴) (تفسیر کبیر وغیرہ) مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہوکر ابراہیم علیہ الصلوٰۃ و السلام نے کعبہ معظمہ کی دیواریں اونچی کی تھیں۔ ۱۔ جس قدر دیوار اونچی ہوتی جاتی تھی یہ پتھر بھی اونچا ہوتا جاتا تھا اور شام کو اترتے وقت نیچا ہو جاتا تھا۔ ۲۔ یہ پتھر آپ کے قدم کی جگہ ریت یا گارے کی طرح اس طرح نرم ہو گیا تھا کہ اس میں بخوبی نشان قدم واقع ہو گئے جواب تک اس میں موجود ہیں۔ ۳۔ باقی آس پاس کا حصہ سخت ہی رہا۔ ۴۔ تعمیر کعبہ کے بعد اسی پتھر پر کھڑے ہوکر جبل بوقبیس میں آپ نے آوازیں دیں تھیں کہ اللہ کے بندو اس کے گھر کی طرف آؤ، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (الحج: ۲۷)۔ ۵۔ اسی پتھر پر قدم رکھ کر آپ نے اپنی بہو یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زوجہ سے اپنا سر شریف دھلوایا تھا (کبیر، معانی، روح البیان وغیرہ)، ۶۔ یہ پتھر ہزار ہا سال گذرنے کے باوجود اب تک ویسے ہی محفوظ ہے۔ ۷۔ رب تعالیٰ نے اس پتھر کو اتنی عظمت بخشی کہ تمام حجاج کے سر اس کی طرف جھکوا دیئے کہ فرمایا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (بقرہ: ۱۲۵) اس پتھر کی تحقیق وتاریخ اور ابراہیم علیہ السلام کے تاریخی حالات پہلے پارے میں عرض کئے جا چکے ہیں وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا واو یا تو عاطفہ ہے یا ابتدائیہ، من سے مراد مطلقاً انسان ہیں، مومن ہوں یا کافر یا مرتد، اور ایک تفسیر کی بنا پر اس میں جانور بھی حبعاً داخل ہیں جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، دخول کے معنی ہیں باہر سے آنا، وہاں رہنے کو دخول نہیں کہتے، یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے، ہ کا مرجع یا مقام ابراہیم ہے یا بیت اللہ، دوسرے معنی زیادہ ظاہر ہیں لیکن

السّمٰوٰتِ سے معلوم ہوا جب وہ ساری آسمانی زمینی چیزوں کا خالق ہے تو اعمال کا بھی خالق ہوا کہ وہ بھی اسی میں داخل ہیں۔ **دوسرا فائدہ:** کفار کے لئے دعاء مغفرت کرنا ان پر نماز جنازہ پڑھنا انہیں مرحوم و مغفور کہنا حرام ہے کیونکہ یہ سب شفاعتیں ہی ہیں اور کفار کے لئے شفاعت منع۔ **تیسرا فائدہ:** رب کے لئے غفلت بے توجہی بے علمی محال ہے۔ جو کوئی ایک آن کے لئے اسے بے علم مانے وہ بے دین ہے۔ جیسے بعض دیوبندی جو رب کو ہر وقت عالم الغیب نہیں مانتے۔ دیکھو تقویت الایمان اور کتاب بلغۃ الحیر ان۔

حکایت: ایک دفعہ موسیٰ علیہ السلام نے فرشتوں سے پوچھا کہ کیا رب کو نیند اور اونگھ آسکتی ہے حکم الٰہی پہنچا کہ تم اپنے ہاتھ میں دو پانی سے بھری ہوئی کچی شیشیاں لو۔ آپ نے اس پر عمل کیا۔ کچھ دیر بعد نیند کا جھونکا جو آیا تو ہاتھ سے شیشیاں گر کر ٹوٹ گئیں۔ وحی آئی کہ اے موسیٰ جب تم نیند میں دو شیشیاں نہ سنبھال سکے تو اگر مجھے نیند آتی تو میں زمین و آسمان کیسے سنبھال سکتا۔ (کبیر و روح البیان) خیال رہے کہ یہ سوال اطمینان قلب کے لئے تھا نہ کہ بدعقیدگی سے انبیاء کرام پیدائشی عارف باللہ ہوتے ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ رب نے ہر چیز اپنے لئے بنائی وہ تو ان باتوں سے پاک ہے۔ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے **خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا** (بقرہ:۲۹) ہر چیز تمہارے لئے پیدا کی ان دونوں آیتوں میں مطابقت کیونکر ہو (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** یہاں لام ملکیت کا ہے اور خَلَقَ لَكُمْ میں نفع کا یعنی ہر چیز اللہ کی ملکیت ہے اور مخلوق کے نفع کے لئے خدا نفع حاصل کرنے سے پاک ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر چیز کا مالک رب تعالیٰ ہی ہے۔ پھر تم کیوں کہتے ہو کہ حضور ﷺ دونوں جہان کے مالک ہیں۔ کیا وہ خدا کے شریک ہیں۔ (دیوبندی) **جواب:** رب کی ملکیت حقیقی ذاتی اور قدیم ہے۔ اس کی مخلوق کی ملکیت مجازی۔ عطائی اور حادث کہا جاتا ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ قسطنطنیہ ترکوں کا ہے۔ یہ گھر میرا ہے یہ ہی معنی وہاں بھی ہیں۔ **تیسرا اعتراض:** مسئلہ شفاعت عقل کے خلاف ہے کیونکہ جو لوگ شفاعت سے بخشے جائیں گے۔ رب انہیں بخشنا چاہتا تھا یا نہیں۔ اگر چاہتا تھا تو شفاعت بیکار ہوئی۔ وہ تو ویسے ہی بخشے جاتے اور اگر نہ چاہتا تھا تو رب تعالیٰ کی مجبوری لازم آئی کہ رب بخشنا تو چاہتا نہ تھا۔ شفیع کی وجہ سے اسے بخشنا پڑ گیا۔ **جواب:** اس اعتراض کے دو جواب ہیں۔ ایک الزامی۔ دوسرا تحقیقی۔ الزامی جواب یہ ہے کہ پھر تو دوائیں دعائیں بلکہ عالم کے تمام اسباب بیکار ہوئے۔ بیمار نے دوا کھائی۔ شفا پائی۔ بتاؤ رب نے اس کی شفا چاہی تھی یا نہیں۔ اگر چاہی تھی تو دوا کی کیا ضرورت تھی۔ خود ہی آرام ہو جاتا۔ اور اگر نہ چاہی تھی تو خدا کے ارادے کے خلاف کیسے ہو گیا۔ جواب تحقیقی یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے انہیں بخشنا چاہا تھا۔ بذریعہ شفاعت کے۔ یعنی بخشش بھی رب کے حکم سے اور شفاعت بھی اس کے حکم سے ہے۔ رب نے بیمار کی شفا بھی چاہی اور دوا بھی۔ یہ معنی ہیں اسباب کے۔

چوتھا اعتراض: حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تارک سنت کی شفاعت نہ ہوگی اور فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ نہ دینے والے میرے پاس کندھوں پر مال لادے ہوئے شفاعت چاہنے آئیں گے ہم شفاعت سے انکار کر دیں گے۔ جب حضور ﷺ

مالداری، کہ ان کے گھر ہی میں حج ہوتا ہے وَمَنْ كَفَرَ کفر کے معنی انکار ہیں، شریعت میں یہ ایمان کا مقابل ہے، کفر عملی بھی ہوتا ہے اعتقادی بھی، یہاں دونوں معنے بن سکتے ہیں یعنی جو کوئی حج پر قادر ہو کر کفار کی طرح حج نہ کرے یا جو کوئی حج کی فرضیت کا انکار کر کے کافر ہو جائے تو فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے پرواہ ہے لہٰذا وہ تارکین حج سے بھی بے پرواہ ہے، یہ لوگ اپنے بھلے کے لئے حج کریں گے نہ کہ رب تعالیٰ کے لئے۔

خلاصہ تفسیر

یہود نے تو بیت المقدس کی خانہ کعبہ پر افضلیت اس کی اولیت سے ثابت کی، مگر وہ اس میں جھوٹے نکلے کیونکہ بیت المقدس سے کعبہ پہلے ہے لیکن کعبۃ اللہ شریف کی افضلیت بہت طرح ثابت ہے، کہ سب سے اول کعبہ مقرر ہوا، کعبہ ہی مبارک ہے کعبہ ہی جہان والوں کا ہادی ہے، کعبہ تعمیر ابراہیمی ہے، کعبہ معظمہ کے پاس مقام ابراہیم پتھر موجود ہے، کعبہ ہی کے پاس حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ایڑی سے جاری ہونے والا زمزم کا پانی موجود ہے، اسی کی حطیم میں سنگِ اسمٰعیل (علیہ السلام) یعنی حضرت اسماعیل وحاجرہ (علیہما السلام) کی قبریں ہیں، اسی کے مطاف میں چار سو انبیاء کرام کے مزارات ہیں، اسی کعبہ میں سنگ اسود ورکن یمانی ہے اسی کے پاس صفا مروہ پہاڑ ہیں جو شعائر اللہ ہیں، اسی کعبہ کا شہر یعنی مکہ مکرمہ دارالامان ہے، اسی کا شہر مکہ مکرمہ آخری پیغمبر حضور محمد مصطفیٰ ﷺ کی ولادت گاہ ہے، اسی کے سایہ میں منیٰ، مزدلفہ اور عرفات متبرک مقامات ہیں، اسی کا ہمیشہ حج ہوا اور ہوتا ہے، اسی کا عمرہ ہوا اور ہوتا رہے گا، اسی کا طواف ہوا اور ہوتا رہے گا، یہیں ایک نیکی کا ثواب ایک لاکھ ہے، اس کعبہ پر سوا بیمار کے اور کوئی پرندہ نہیں اڑتا، اسی کعبہ کی حفاظت کے لئے ابابیل سے فیل مروائے گئے، اسی کعبہ کی طرف لوگوں کے دل قدرتی طور پر کھنچتے ہیں، اسی کعبہ کی برکت ہے کہ وہاں پیداوار کوئی نہیں، لیکن وہاں کبھی قحط نہیں پڑا اور نہ کوئی قحط سے مرا، اسی کعبہ کی برکت ہے کہ ہر سال آٹھ دس لاکھ آدمی وہاں پہنچ جاتے ہیں، لیکن نہ وہاں دانہ میں کمی آتی ہے نہ پھلوں میں، اسی کعبہ کی برکت ہے کہ وہاں ہر سال حج کے موقعہ پر تیس چالیس لاکھ جانور ذبح ہو جاتے ہیں مگر جب بچے ہوئے واپس لوٹتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، ان میں سے ایک بھی ذبح نہ ہوا غرضکہ اس جیسی ہزاروں ایسی آیات بینات ہیں جو بیت المقدس میں نہیں ہیں، وہ کچھ عرصہ کے لئے قبلہ رہا، پھر تم کس منہ سے کہتے ہو کہ بیت المقدس کعبہ سے افضل ہے، جیسے ہمارے محبوب ﷺ بے مثال محبوب ہیں، ایسے ہی ان کا کعبہ بے مثال قبلہ ہے، اے مسلمانو! تم یہود کی باتیں نہ سنو، کبھی وہم بھی نہ کرو کہ بیت المقدس کعبہ سے افضل ہے، تم کعبہ کے حج کے لئے تیار رہو، جس میں طاقت ہو وہ ضرور حج کعبہ کرے، خیال رکھو کہ اگر تم باوجود طاقت کے حج کو نہ گئے یا حج کا انکار کر کے کافر بن گئے، تو تم سے تو کیا ہم سارے جہان سے بے پرواہ ہیں، ہمارے کعبہ کی آبادی اور وہاں کا حج تم پر موقوف نہیں، وہاں ہمیشہ رونق میلے لگے ہی رہیں گے، ہاں تم ایک بڑی نعمت سے محروم ہو جاؤ گے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** متبرک مقامات کے پاس ہونا اور رہنا اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور

متعلق فرماتا ہے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ۔ (مائدہ ۱۱۹) اور فرماتا ہے يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ (مائدہ: ۵۴) اور اللہ ان سے محبت کرتا ہے۔ اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ لہٰذا دھونس کی شفاعت ماننا کفر و شرک ہے۔ مگر محبت یا وجاہت کی شفاعت محبوب بندوں کے لئے ماننا ایمان ہے۔ کعبہ کی طرف سجدہ کرنا ایمان ہے۔ بت کی طرف سجدہ کرنا کفر۔ زمزم کی تعظیم ایمان ہے' گنگا کی تعظیم کفر۔ رمضان کا احترام ایمان ہے۔ ہولی دیوالی کا احترام کفر ہے افعال یکساں ہیں مگر نیت جداگانہ۔ اسی طرح بتوں کی شفاعت ماننا کفر ہے۔ اور حضرات انبیاء و اولیاء کی شفاعت ماننا ایمان۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا
جانتا ہے اس کو جو درمیان ہاتھوں ان کے ہے اور جو پیچھے ان کے اور نہیں گھیر سکتے وہ کسی چیز کو علم سے اس کے مگر ساتھ اس کے
جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے اور وہ نہیں پاتے اس کے علم میں سے مگر جتنا
بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ
کہ چاہے گھیر لیا ہے کرسی نے اس کی آسمانوں اور زمین کو اور نہیں بھاری ہوتی ہے اسے حفاظت ان کی
وہ چاہے اس کی کرسی میں سمائے ہوئے آسمان اور زمین اور اسے بھاری نہیں ان کی نگہبانی
وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾
اور وہ بلند عظمت والا ہے
اور وہی ہے بلند بڑائی والا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلے جملہ میں رب تعالیٰ کی چند صفات کا ذکر ہوا۔ اب اس کی صفت علم کا ذکر ہے کہ بغیر علم سلطنت وغیرہ نہیں چل سکتی۔ **دوسرا تعلق:** پچھلے جملہ میں رب تعالیٰ سے چند عیوب کی نفی کی گئی۔ کہ اسے نیند اور اونگھ عارض نہیں ہوتی۔ اب علم ثابت کر کے جہالت سے پاکی بیان ہو رہی ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلے جملہ میں فرمایا گیا تھا کہ اس کی بارگاہ میں بلا اجازت کوئی کسی کی سفارش نہیں کر سکتا۔ اب اس کی وجہ بیان ہو رہی ہے کہ رب تعالیٰ شفیع و مشفوع دونوں کے حالات جانتا ہے کہ کون قابل شفاعت ہے اور کون نہیں اور کسے شفیع ہونا چاہیے اور کسے نہیں لہٰذا ضروری ہے کہ شفاعت اس کی اجازت سے ہی ہو۔

تفسیر

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ يَعْلَمُ حال استمراری ہے یعنی ہمیشہ سے جانتا ہے۔ مَا سے مراد مخلوق کے سارے حالات ہیں۔ عربی میں بین ایدی سامنے کی چیز کو اور خلف پیچھے کی چیز کو کہتے ہیں۔ اَيْدِيْهِمْ میں ھم ضمیر یا تو مَا فِي السَّمٰوٰتِ الخ کی طرف لوٹتی ہے۔ چونکہ ملائکہ انبیاء و دیگر انسان اہل عقل ہیں۔ انہیں کی تغلیب فرما کر عقلاء کی ضمیر ارشاد ہوئی یعنی رب تعالیٰ اس

حج پر قادر ہو پھر بلا عذر حج نہ کرے، وہ چاہے یہودی ہو کر مرے چاہے نصرانی ہو کر۔ **نواں فائدہ:** حج مبرور و مقبول کی کوشش چاہیے جیسا کہ لِلّٰہِ سے معلوم ہوا، حج مبرور یہ ہے کہ حلال کمائی سے حج کیا جاوے، تمام فرائض، واجبات، سنت و مستحبات صحیح طور پر ادا ہوں، خالص لوجہ اللہ نام نمود کو دخل نہ ہو، حج مبرور کی پہچان یہ ہے کہ حاجی کے دل میں نرمی پیدا ہو جائے، اور گناہوں میں کمی، نیکیوں میں زیادتی کی توفیق ملے۔ **دسواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ کے مقبولوں کے منہ سے جو نکلتا ہے رب تعالیٰ وہی کر دیتا ہے، یہ حضرات سیفِ زبان ہوتے ہیں دیکھو ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکہ معظمہ کے متعلق عرض کیا تھا رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا (بقرہ:۱۲۶) خدایا اس جنگل کو شہر بنا دے امن والا رب تعالیٰ نے فرمایا مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا اور جنابِ خلیل نے عرض کیا تھا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (البقرہ ۱۲۶) خدایا یہاں کے باشندوں کو پھل فروٹ دے، رب تعالیٰ نے فرمایا يُّجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ (قصص:۵۷) غرضکہ جو خلیل کے منہ سے نکلا وہ ہی رب جلیل نے کر دیا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: فِيْهِ کی تقدیم سے معلوم ہوا کہ صرف کعبہ معظمہ میں ہی قدرت کی نشانیاں ہیں حالانکہ قدرت کی نشانیاں تو عالم کے ذرہ ذرہ میں ہیں رب تعالیٰ فرماتا ہے وَفِيْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذاریات:۲۱) یعنی خود تمہاری ذاتوں میں نشانیاں موجود ہیں تم غور کیوں نہیں کرتے، تو یہ آیت صحیح کیونکر ہو؟ **جواب:** یہاں آیات بینات سے وہ نشانیاں مراد ہیں جن کا ذکر خلاصہ تفسیر میں کیا گیا جس سے کعبہ معظمہ کے بے مثالی اور اس کی بیت المقدس سے افضلیت ثابت ہو، اسی واسطے آگے فرمایا گیا مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو بھی حرم میں آجائے اسے دوزخ سے امن ملے گی تو ابوجہل، ابولہب اور سارے کفار مکہ حرم میں ہی رہتے تھے کیا وہ دوزخی نہیں؟ **جواب:** اس کا جواب تفسیر سے معلوم ہو چکا کہ اگر امن سے مراد دنیوی امن ہے تو مَن سے مراد وہ انسان ہوگا جو حرم سے باہر جرم کرے پھر حرم میں پناہ لے لے، اور اگر امن سے مراد اخروی امن ہے تو مَن سے مراد مومن ہوں گے یعنی جو ایمان کے ساتھ حج کرے تو اس کے گناہ معاف ہو گئے اور وہ دوزخ سے امان میں آگیا۔ **تیسرا اعتراض:** حدیث شریف میں ہے کہ مکہ مکرمہ میں ایک نیکی کا ثواب بھی ایک لاکھ ہے اور ایک گناہ کا وبال بھی ایک لاکھ، تو یہ حرم میں امن کہاں ہوئی؟ حرم تو پوری مصیبت بن گیا، اسی ڈر سے حضرت عبداللہ ابن عباس مکہ معظمہ میں نہ رہے طائف شریف میں رہے، لہٰذا قرآن و حدیث میں تعارض ہے۔

جواب: یہ گناہ کی زیادتی حرم کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی بے ادبی کی وجہ سے ہے، کچہری میں حاکم کے سامنے جرم کرنا دیگر مقام پر جرم کرنے سے بدتر ہے کہ اس میں کچہری کی بے حرمتی اور حاکم بے ادبی بھی ہے، آیت کا منشاء یہ ہے کہ جو مجرم رب تعالیٰ کی پناہ لینے کے لئے حرم شریف میں آجائے اسے دوزخ سے امن ہوگی، یہاں رہ کر جرم کرنے والا پناہ کب لے رہا ہے وہ تو ڈھٹائی کر رہا ہے، پناہ لینے والا قصور سے بچا کرتا ہے۔ **چوتھا اعتراض:** عَلَى النَّاسِ کے مقدم کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حج صرف انسانوں پر ہی فرض ہے حالانکہ اسلام کے ارکان پانچ ہیں، اور بعض جنات بھی مسلمان ہیں ان پر بھی حج فرض ہونا چاہیے۔ **جواب:** بعض لوگوں نے تو یہی کہا ہے ان کے ہاں انسانوں کے لئے اسلام کے ارکان پانچ ہیں،

آسمان و زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس صورت میں یہ جملہ یَعْلَمُ کی تفسیر ہے نمبر ۲ کرسی سے مراد خود عرش ہے نمبر ۳ کرسی وہ چیز ہے جو عرش کے نیچے اور ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے جسے فلاسفہ آٹھواں آسمان یا فلک بروج کہتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ کرسی کے مقابلہ میں ساتوں آسمان و زمین ایسے ہیں۔ جیسے جنگل میں انگوٹھی۔ اور یہ ہی نسبت کرسی کو عرش کے مقابلہ میں ہے (درمنثور) اس کرسی کو چار فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں۔ ایک فرشتہ حضرت آدم کی شکل پر ہے دوسرا گدھ کی شکل پر تیسرا بیل کی شکل پر اور چوتھا شیر کی شکل پر۔ (روح البیان از ابن عباس و درمنثور) بعض روایت میں ہے کہ حاملین عرش اور حاملین کرسی کے درمیان ستر حجاب ظلمت کے اور ستر حجاب نور کے ہیں ہر حجاب کی موٹائی پانچ سو سال کا راہ ہے۔ اگر یہ حجاب حائل نہ ہوتے تو ملائکہ حاملین عرش کے نور سے حاملین کرسی جل جاتے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ کرسی کوئی جسم وغیرہ نہیں۔ اس کلام سے لوگوں کے ذہن میں رب کی عظمت کا نقشہ کھینچنا مقصود ہے جیسے کعبہ کو بیت اللہ قرار دیا گیا۔ اس میں دروازہ لگایا گیا' وہاں دعائیں منگائیں گئیں۔ حالانکہ نہ وہاں رب رہتا ہے اور نہ وہ رب کا مکان ہے یہ سب کچھ اظہار عظمت کیلئے ہے۔ ایسے ہی اس کیلئے عرش و کرسی کا ثابت کرنا اس کی سلطنت کا خیال جمانے کے لئے ہے۔ وَلَا یَؤُدُہٗ۔ یہ اوْدٌ سے بنا بمعنی مشقت اور بوجھ یہ نَصَرَ یَنْصُرُ سے ہے اور اَوْ یَؤُدُہٗ کا مرجع رب تعالیٰ ہے۔ حِفْظُھُمَا حفظ کے معنی ہیں۔ نگہبانی ھما کا مرجع آسمان و زمین ہیں کہ یہ دو جنسیں ہیں۔ یعنی رب تعالیٰ کو اتنے بڑے آسمان و زمین کی نگہبانی بھاری نہیں۔ وَ ھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ یہ دونوں لفظ قریب المعنی ہیں۔ علی بمعنی بلند اس سے مکانی بلندی مراد نہیں بلکہ کمالات میں اعلیٰ ہونا مراد ہے۔ یعنی وہ علم سلطنت۔ غلبہ اور صفات میں سب سے اعلیٰ درجہ والا اور عظیم ہے کہ اس کے سامنے ہر شئی حقیر خیال رہے کہ عظمت صفت اضافی ہے۔ ہر چیز اپنے حقیر کے مقابل عظیم ہوتی ہے۔ اسی لئے رب تعالیٰ سب سے عظیم ہے۔ نبی علیہ السلام اپنی امت سے عظیم شیخ اپنے مریدین سے اور استاد اپنے شاگردوں سے کیونکہ ان چھوٹوں کی عقلیں اپنے بڑوں کے صفات کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ ھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ فرما کر اشارۃً بتایا گیا کہ رب تعالیٰ کی شان بہت ہی بلند و بالا ہے۔ اور آسمان و زمین معمولی حقیر چیزیں ایسے شان والے رب کو ایسی حقیر چیزوں کی حفاظت بھاری کیسے ہوسکتی ہے۔ تو یہ کلمے لَا یَؤُدُہٗ کی دلیل ہے۔ جو نادان ریل کی قطار دیکھ کر کہے کہ ایک انجن اسے کھینچ نہیں سکتا اس نے ابھی انجن دیکھا ہی نہیں۔ صرف ریل دیکھی ہے۔ ایسے ہی جو کہے کہ اتنے بڑے زمین و آسمان کو ایک خدا نہیں سنبھال سکتا۔ اس نے آسمان و زمین کو تو دیکھا۔ مگر رب کی شان میں غور نہ کیا۔ اگر رب کی شان میں غور کر لیتے تو یقین کرتے کہ ایسے لاکھوں عالم ربّ تعالیٰ قائم رکھ سکتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

رب تعالیٰ اپنی مخلوق کے سارے اگلے پچھلے حال و اعمال جانتا ہے اور کوئی مخلوق اس کی معلومات کو نہیں جان سکتی مگر اتنا ہی جتنا وہ چاہے اور بتائے۔ اور وہ بقدر قابلیت ہر ایک کو بتاتا ہے۔ سمندر سے کوئی مشک بھر کر لاتا ہے۔ کوئی گھڑا کوئی لوٹا کوئی پیالہ اس کے عرش کا تو پوچھنا کیا۔ کرسی کی عظمت کا یہ حال ہے کہ تمام آسمان و زمین اس میں سمائے ہوئے ہیں۔ رب تعالیٰ کو اتنی وسیع مملکت کا سنبھالنا اور زمین و آسمان کی نگہبانی کچھ دشوار نہیں۔ نہایت آسانی سے ان سب کی نگرانی فرما رہا ہے۔ وہ اپنی صفات میں اعلیٰ و بالا ہے۔ کہ اس کی عظمت تک کسی کا خیال بھی نہیں پہنچ سکتا خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض بندوں کو اپنے علم

کو تڑپا دیا، عاشق یہ سن کر جھوم گئے کہ کعبۃ اللہ کو خلیل اللہ سے نسبت ہے کہ انہی کی تعمیر ہے اور ان کے نقشِ قدم (مقام ابراہیم) کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے، صوفیاء فرماتے ہیں کہ جیسے بعض مقام ذریعہ امان ہیں، حرم شریف عام انسانوں کے لئے امن، وادی سینا سے موسیٰ علیہ السلام کے لئے امن، کہ رب تعالیٰ نے ان سے فرمایا اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ (قصص: ۳۱) ایسے ہی اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے عالم کے لئے امن ہیں رب تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ (انفال: ۳۳) اللہ تعالیٰ انہیں عذاب نہ دے گا کیونکہ ان میں آپ ہیں، حضور انور ﷺ فرماتے ہیں کہ میرے صحابہ زمین والوں کے لئے امن ہیں۔

حکایت

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں صحابہ کی دعوت تھی، کپڑے کا دسترخوان لایا گیا جو میلا تھا، آپ نے وہ دسترخوان بھڑکتے ہوئے تندور میں ڈال دیا، میل جل گیا، کپڑے کے تار گرم بھی نہ ہوئے، تو حاضرین نے پوچھا، **شعر:**

قوم گفتند اے صحابی عزیز چوں نہ سوزید و منقے گشت نیز

اے صحابی رسول یہ آگ میں جلا کیوں نہیں؟ اور صاف کیوں ہو گیا، آپ نے جواب دیا،

شعر: گفت روزے مصطفیٰ دست و دہاں بس بمالید اندریں دستار خواں

فرمایا ایک دن نبی کریم ﷺ نے اس دسترخوان سے اپنا ہاتھ و منہ شریف پونچھ لیا تھا اس دن سے آگ اسے نہیں جلاتی، مولانا فرماتے ہیں، **شعر:**

اے دل تر سندہ از نار و عذاب با چنیں دست و دہن کن انتساب

اے دل اگر تجھے عذاب کی آگ کا خطرہ ہے تو اس لب اور ہاتھ سے نسبت پیدا کر، کعبہ معظمہ میں لاکھوں خوبیاں ہیں، مگر سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ خلیل اللہ کے مقام کا حامل ہے اور حبیب اللہ کا ولادت گاہ، دیکھو رب تعالیٰ فرماتا ہے لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ (البلد: ۱۔۲) مجھے اس شہر مکہ معظمہ کی قسم، حالانکہ اس مکہ میں تم تشریف فرما ہو یعنی میری قسم کی وجہ تمہاری موجودگی ہے، حضور انور ﷺ کی ہجرت کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں کو بلا عذر مکہ معظمہ میں رہنا حرام ہو گیا تھا اور ہجرت فرض، حالانکہ وہاں کعبہ معظمہ عرفات و منیٰ، مقام ابراہیم سب کچھ موجود تھا، صرف حضور انور ﷺ وہاں سے چلے گئے تھے، یہ ہے نسبت کا ظہور۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ
فرمادو اے کتاب والو تم کیوں انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا
تم فرماؤ اے کتابیو اللہ کی آیتیں کیوں نہیں مانتے
وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ۝۹۸

گناہ مٹاتا رہتا ہے۔ دوسرے دن کی اسی ساعت تک یہ ہی کرتا رہتا ہے۔ (درمنثور)

آیۃ الکرسی کے فوائد: نمبر ا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو کوئی ہر فرض نماز کے پیچھے آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرے تو اس میں اور جنت میں صرف موت کی آڑ ہوگی کہ مرتے ہی جنت میں داخل ہو جائے اور اس پر ہمیشگی کرنے والا صدیقین و عابدین کے زمرہ میں شمار ہوگا۔ (کبیر) نمبر ۲ جو کوئی سوتے وقت بستر پر لیٹ کر آیۃ الکرسی پڑھ لے تو اس کا اور اس کے پڑوسیوں کا گھر چوری ڈکیتی اور آگ لگ جانے غرض ساری اچانک مصیبتوں سے صبح تک محفوظ رہے گا۔ (کبیر) نمبر ۳ جس گھر میں آیت الکرسی پڑھی جائے۔ اس گھر سے شیطان ایک ماہ تک اور جادوگر چالیس دن تک دور رہتے ہیں۔ (کبیر و درمنثور) نمبر ۴ ایک بار ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ایک جن کو پکڑ لیا اور اس سے پوچھا کہ انسان تم سے کیونکر بچیں۔ اس نے عرض کیا کہ صبح و شام آیۃ الکرسی پڑھ لیا کریں۔ صبح کو یہ واقعہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو فرمایا اس خبیث نے سچ کہا (روح البیان) نمبر ۵ جو کوئی صبح و شام اپنے اور اپنے بچوں پر آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کر دے۔ وہ شیطان اور جادو اور نظر بد سے محفوظ رہے گا نمبر ۶ ابن سنی نے امام زین العابدین سے نقل کیا کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو دردزہ کی تکلیف تھی۔ حضور علیہ السلام نے ام سلمہ اور زینب بنت جحش کو حکم دیا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر آیت الکرسی اور فلق و ناس پڑھیں۔ (درمنثور) اس سے معلوم ہوا کہ آیت الکرسی دردزہ میں مفید ہے۔ نمبر ۷ ایک صحابی نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں بے برکتی کی شکایت کی کہ میرے گھر میں برکت نہیں ہوتی۔ فرمایا آیۃ الکرسی پڑھا کرو۔ (درمنثور) اس سے معلوم ہوا کہ آیت الکرسی برکت کے لئے مفید ہے نمبر ۸ جو کوئی سوتے وقت آیت الکرسی پڑھ لے تو رات بھر دو فرشتے اس کی حفاظت کرتے ہیں (درمنثور) نمبر ۹ جو کوئی سفر کے وقت اپنے گھر پر آیت الکرسی پڑھ کر دم کر جائے تو اس کا مال و اہل و عیال اس کی واپسی تک محفوظ رہیں گے۔ (درمنثور) نمبر ۱۰ جو کوئی کہیں پارسل وغیرہ بھیجے اس پر آیۃ الکرسی دم کر دے تو انشاء اللہ خیریت سے پہنچے گا۔ (مجرب) نمبر ۱۱ جو کوئی فجر اور مغرب کے بعد اول آخر تین تین بار درود شریف اور درمیان میں اکتالیس بار یا حیی یا قیوم پڑھ لیا کرے۔ تو انشاء اللہ اسے خاتمہ بالخیر نصیب ہوگا۔ نمبر ۱۲ جو کوئی نماز پنجگانہ کے بعد آیت الکرسی پڑھے اور جب وَلَا یَؤُدُہٗ حِفۡظُھُمَا تک پہنچے تو اپنی پانچوں انگلیوں کے پورے دونوں آنکھوں پر رکھ کر گیارہ بار یہ لفظ پڑھے۔ اور پھر ایک بار وَھُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ پڑھ کر اپنے پوروں پر دم کر کے آنکھوں پر پھیرے تو انشاء اللہ اندھا نہ ہوگا۔ نہایت مجرب ہے۔ نمبر ۱۳ جو کوئی سفر میں یَا حَیُّ یَا قَیُّوۡمُ بِرَحۡمَتِکَ اَسۡتَغِیۡثُ پڑھتا رہے تو انشاء اللہ اس پر سفر آسان ہوگا۔ نمبر ۱۴ آیت الکرسی سے شیطان بھاگتے ہیں۔ بے چین دل کو چین آتا ہے۔ مرگی والے کو فائدہ ہوتا ہے۔ اس سے غصہ شر اور حرام شہوت دور ہوتی ہے۔ ظالم کا ظلم کم ہوتا ہے۔ مگر اخلاص شرط ہے۔ (روح البیان) شعر۔

دل پردرد را دوا قرآن　　جانِ مجروح را شفا قرآن
ہر چہ جوئی زنص قرآن جو　　کہ بود گنج علماء قرآن

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** سارا قرآن رب کا کلام ہے۔ مگر اس کی آیتوں کی تاثیریں

لئے ہے، قرآن کریم میں پکارنا کبھی اظہار کرم کے لئے ہوتا ہے جیسے یَاۤاَیُّهَا النَّبِیُّ کبھی غافلوں کو بیدار کرنے کے لئے، جیسے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، کبھی اظہار غضب کے لئے، جیسے قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ۔ یہاں دو آخری وجوہ سے ہوسکتا ہے، کتاب کے لغوی واصطلاحی معنی کی تحقیق الم کے شروع ذٰلِكَ الْكِتٰبُ میں ہوچکی، یہاں اتنا سمجھ لو کہ قرآن شریف میں نامۂ اعمال کو بھی کتاب کہا گیا ہے، جیسے اِقْرَاْ كِتٰبَكَ، (الاسراء:۱۴) اور خط ومراسلہ کو بھی جیسے اُلْقِیَ اِلَیَّ كِتٰبٌ كَرِیْمٌ (نمل:۲۹) قرآن شریف کو بھی، جیسے اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ (النساء:۱۰۵) اور قرآن شریف کے علاوہ دیگر آسمانی کتب کو بھی، یہاں کتاب چوتھے معنی میں ہے یعنی توریت، زبور، انجیل، مگر ظاہر یہ ہے کہ صرف توریت وانجیل مراد ہے، بلکہ بعض مفسرین نے صرف توریت مراد لی ہے، کیونکہ اس مخاطبہ کے وقت یا صرف یہود سامنے تھے یا یہودی وعیسائی دونوں، خیال رہے کہ اہل کتاب کے خطاب میں مسلمان کبھی داخل نہیں ہوتے ان کے لئے قدرت نے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا پیارا خطاب رکھا ہے۔ یہاں اہل کتاب سے مراد یا تو کتاب پر ایمان رکھنے والے ہیں یعنی سارے یہودی عیسائی یا ان کتابوں کا علم رکھنے والے یا ان کی سمجھ بوجھ رکھنے والے یعنی ان کے پوپ دپادری (خازن وکبیر) یا کتاب کی اہلیت رکھنے والے جن کے آئندہ ایمان کی امید ہے (روح المعانی وبیان) یعنی اے کتاب ماننے والو، یا اے کتاب جاننے والو، یا اے کتاب سمجھنے والو، لِمَ تَكْفُرُوْنَ لِمَ حرف استفہام وسوال ہے رب تعالیٰ کا کچھ پوچھنا، اپنے علم کے لئے نہیں ہوتا کہ وہ علیم وخبیر ہے بلکہ دیگر مقاصد کے لئے ہوتا ہے، جیسے آئندہ کلام کی تمہید یا اظہار غضب یا تبلیغ احکام یا بندوں کو تعجب دلانا، یہاں آخری تین معنی میں ہوسکتا ہے، کفر کے معنی انکار بھی ہیں اور چھپانا بھی، یہاں دونوں معنے درست بِاٰیٰتِ اللّٰهِ آیات ایۃ کی جمع ہے جس کی تفسیر ابھی پچھلی آیت کے ماتحت ہوچکی، اللہ کی آیتوں سے مراد اللہ کی قائم کردہ کھلی نشانیاں ہیں اس میں گفتگو ہے کہ یہاں ان نشانیوں سے کیا مراد ہے یا تو توریت وانجیل کی وہ آیتیں مراد ہیں جن میں نبی کریم ﷺ کی نعت شریف ہے جنہیں اہل کتاب چھپاتے تھے یا بدلتے تھے، یا معنوی تحریف یعنی غلط تفسیریں کرتے تھے، یا ساری توریت وانجیل کیونکہ کتاب اللہ کی ایک آیت کا انکار گویا سب کا انکار ہے یا قرآن شریف کی آیتیں مراد ہیں جس پر ایمان لانا ان کے لئے ضروری تھا، کیونکہ قرآن سارے جہان کے لئے آیا ہے یا حضور انور ﷺ کے معجزات جو حضور ﷺ کی نبوت کی کھلی نشانیاں ہیں، چونکہ دیگر انبیائے کرام کو گنتی کے معجزے ملتے تھے مگر حضور ﷺ کے معجزات بے حد وبے عد ہیں اس لئے جمع فرمایا گیا، یا حضور انور ﷺ کی نبوت کے عقلی دلائل مراد ہیں، تھوڑی عقل والا بھی جان سکتا ہے کہ حضور انور ﷺ سچے اور آخری نبی ہیں، دیکھو ہماری کتاب "نئی تقریریں" مگر تفسیر خازن اور تفسیر تنویر المقیاس نے فرمایا کہ آیات اللہ سے مراد حضور نبی کریم ﷺ ہیں، کیونکہ حضور ﷺ از سرتا پا اللہ کی دلیل ہیں، آپ کا ہر حال آپ کا ہر کمال دلیل رب ذوالجلال ہے، رب تعالیٰ نے حضور ﷺ کو برہان فرمایا قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (النساء:۱۷۴) یعنی تمہاری حرکت تعجب کے قابل ہے، تم توریت وانجیل کا یا قرآن شریف یا ہمارے محبوب کے معجزات کا یا خود میرے محبوب کی ذات بابرکات کا کیسے انکار کرتے ہو، تم تو پھر بھی ذی عقل انسان ہو، ارے انہیں تو جانور، پتھر، زمین کے ذرے، آسمان کے تارے بھی جانتے پہچانتے ہیں وَاللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ یہ واؤ حالیہ ہے، شہید کے معانی پہلے پاروں میں بیان ہوچکے

گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ است — من نہ گنجم ہیچ در بالاؤ پست !!
در زمین و آسمان و عرش نیز — من نہ گنجم از یقین داں اے عزیز
در دل مومن بگنجم اے عجب — گر مرا جوئی دراں دلہا طلب
خود بزرگی عرش باشد بس مدید — لیک صورت چیست چوں معنی رسید

دوسری تفسیر

آیۃ الکرسی میں اللہ سے عظیم تک گیارہ صفات کا ذکر ہے۔ بعض صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ مَنْ ذَالَّذِیْ سے بِمَا شَآءَ تک حضور علیہ السلام کی تین صفات ہیں۔ اور اس سے پہلے کی پانچ اور آخر کی تین خدا کے صفات مطلب یہ ہے کہ رب کی بارگاہ میں کون کسی کی شفاعت کر سکتا ہے۔ سوا اس ایک محبوب علیہ السلام کے جنہیں شفاعت کا اذن مل چکا کہ شفاعت کبریٰ کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ اس شفیع المذنبین کی صفت یہ ہے کہ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ سب کے سارے اگلے حالات جانتے ہیں کیونکہ سب سے پہلے انہیں کا نور پیدا ہوا سارا عالم ان کا دیکھا بھالا ہوا ہے۔ وَمَا خَلْفَھُمْ اور پچھلے حالات قیامت کی وحشت خلق کی گھبراہٹ رب کا غضب انبیاء کرام کا نفسی نفسی کہنا اور پھر سارے عالم کا بھکاری بن کر اس محبوب کے دروازہ پر آنا غرضیکہ سب کچھ جانتے ہیں کیونکہ بغیر علم شفاعت ناممکن علم والا جان سکتا ہے کہ کون کس قسم کی شفاعت کا مستحق ہے اور کون محروم جو طبیب بیماروں کی بیماریوں سے بے خبر ہو وہ علاج کیا کر سکتا ہے۔ اور اگر حضور علیہ السلام لوگوں کے ایمان وکفر وغیرہ سے بے خبر ہوں تو شفاعت کیسے کر سکتے ہیں۔ پھر آپ کو پتہ کیسے لگے۔ کہ کون شفاعت کے لائق ہے۔ اور کون نہیں۔ اور کون کس شفاعت کے لائق ہے۔ وہ شفیع المذنبین تو سب کے حالات جانتے ہیں مگر وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْئٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ملائکہ' انبیاء' اولیاء بلکہ سارا عالم اس شفیع المذنبین کے علوم میں سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے مگر اسی قدر جتنا کہ محبوب عطا فرمائیں۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں۔ کہ اولیاء اللہ کا علم انبیاء کے مقابلہ میں ایسا ہے۔ جیسے سات سمندروں کے مقابلہ میں ایک قطرہ اور سارے انبیاء کے علوم حضور علیہ السلام کے مقابل ایسے ہی ہیں۔ جیسا سات سمندروں کے مقابل ایک قطرہ اور یہ ہی نسبت ہمارے حضور علیہ السلام کے علم کو خدا کے علم سے ہے۔ خیال رہے کہ انبیاء اور اولیاء میں حضرت آدم وابراہیم علیہم السلام اور حضرت خضر بھی داخل ہیں۔ قصیدہ بردہ شریف میں خوب فیصلہ کیا گیا کہ فرمایا۔ شعر۔

وَکُلُّھُمْ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ مُلْتَمِسٌ — غُرْفًا مِّنَ الْبَحْرِ اَوْرَشْفًا مِنَ الدِّیَمِ
وَ وَاقِفُوْنَ لَدَیْہِ عِنْدَ حَدِّھِمْ — مِنْ نُّقْطَۃِ الْعِلْمِ اَوْ مِنْ شَکْلَۃِ الْحِکَمِ

یعنی سارے انبیاء اولیاء اپنی قابلیت کے مطابق حضور علیہ السلام سے علم حاصل کرتے ہیں اور ان کے علوم حضور علیہ السلام کے علم کے سامنے ایسے ہیں۔ جیسے کتب خانہ کے مقابل ایک نقطہ یا تیز بارش کے مقابلہ ایک چھینٹا (روح البیان از تاویلات نجمیہ) یہ نہایت نفیس تفسیر ہے۔ اور اس پر کوئی شرعی الزام نہیں۔ اس کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے ہوتی ہے جو مشکوٰۃ شریف باب مناقب ابی بکر وعمر میں ہے۔ کہ انہوں نے ایک بار حضور علیہ السلام سے دریافت کیا کہ کیا کسی کی نیکیاں تاروں کے برابر بھی ہیں۔ فرمایا ہاں عمر کی تو عرض کیا کہ ابوبکر کی نیکیاں کا کیا حال ہے فرمایا عمر کی ساری نیکیاں ابوبکر کی ایک نیکی کی طرح

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہاں صرف اہل کتاب کو خصوصیت سے کیوں تبلیغ کی گئی، اسلام کی تبلیغ سارے کفار کو چاہیے!
جواب: چند وجہ سے، ایک یہ کہ اس سے پچھلی آیتوں میں انہی کے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے تھے، تو اب بھی انہی کو تبلیغ کی گئی کہ پہلے سے ان ہی کا تذکرہ ہے، دوسرے یہ کہ وہ اسلام سے قریب تر ہیں خدا کی ذات وصفات انبیاء کی نبوت اور کتب آسمانی کے اقراری ہیں انہیں مسلمان کرنا بمقابلہ مشرکین کے آسان تر ہے، تیسرے یہ کہ یہ لوگ حضور انور ﷺ کی نبوت کے پہلے سے قائل تھے، توریت وانجیل میں حضور انور ﷺ بلکہ ان کے صحابہ کرام کے حالات سے خبردار تھے، رب تعالیٰ فرماتا ہے ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۖ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ (الفتح:۲۹) بخلاف مشرکین کے کہ وہ زیادہ بے خبر تھے چوتھے یہ کہ عام اہل عرب ان کا ادب واحترام کرتے تھے اوران کی باتیں مانتے تھے کیونکہ ان میں علماء بھی تھے، اور یہ اولاد انبیاء بھی تھے ان کے ایمان لے آنے پر دوسروں کے ایمان کی قوی امید تھی۔ **دوسرا اعتراض:** رب تعالیٰ نے یہ صاف کیوں نہ فرمادیا کہ اللہ کی آیتوں کا انکار نہ کرو، یہ کیوں فرمایا کہ انکار کیوں کرتے ہو، کیا رب تعالیٰ کو خبر نہیں جو پوچھ رہا ہے؟ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گذر گیا کہ اس سوال میں اشارۃً کفر سے روکنا ہے جیسے کسی عالم بے عمل سے کہا جائے کہ تم عالم ہو کر نماز کیوں نہیں پڑھتے، کبھی اشارۃً تبلیغ صراحتاً تبلیغ سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ **تیسرا اعتراض:** یہاں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں پر گواہ ہے، رب تعالیٰ تو حاکم ہے نہ کہ گواہ، گواہ ہے تو کس کچہری میں گواہی دے گا اور وہاں حاکم کون ہوگا؟ **جواب:** یہاں شہید بمعنے مطلع وخبردار ہے، اور اگر بمعنی گواہ بھی ہو تو اس کا مقصد ڈرانا ہے کہ ہم حاکم حقیقی ہیں، اور ہمارے حضور میں تم یہ حرکتیں کررہے ہو، تمہاری سزا تو بہت آسان ہے، گواہی حاکم کے علم کے لئے ہوتی ہے، مگر جب حاکم کے سامنے ہی جرم ہو، پھر تو مقدمہ بنا بنایا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

بظاہر یہ خطاب اہل کتاب سے ہے مگر حقیقتاً ان علماء سوء سے بھی ہے جو دین کو دنیا کے عوض فروخت کرڈالتے ہیں اور اپنے جانے ہوئے پر عمل نہیں کرتے اور اگر ظاہری عمل کرتے بھی ہیں تو دنیا کے لئے، فرمایا جارہا ہے کہ اے کتاب اللہ والو تم آیات قرآنیہ کے عملی منکر کیوں ہوئے جاتے ہو، رب تعالیٰ نے ورع، تقویٰ، نفس کو خواہشات سے روکنے، اور فانی دنیا پر باقی آخرت کو ترجیح دینے، مخلوق سے منہ پھیر کر خالق کی طرف متوجہ ہونے، مقصود حاصل کرنے کے لئے وجود ترک کردینے کا حکم جگہ جگہ دیا ہے، اللہ تعالیٰ تمہاری نیتوں پر مطلع ہے، تمہارے خیر وشر، اعمال کو دیکھتا ہے، صوفیاء فرماتے ہیں کہ دنیا صفر ہے اور دین عدد، اکیلا صفر خالی ہے، مگر عدد سے مل کر اسے دس گنا کردیتا ہے، بغیر اخلاص نماز بھی بیکار ہے، اور اخلاص ونیت خیر سے کھانا پینا بھی عبادت ہے، یوں ہی جس شخص کو اللہ تعالیٰ کے مقبولوں سے نسبت ہو، فرشتوں سے اعلیٰ ہو جاتا ہے، اور اگر ان سے بے تعلق ہو جائے تو شیطان سے بدتر، **شعر:**

گر سر میں رہے سودا ان کا سر گنبد خضرا ہو جائے
گر دل میں کھنچے نقشہ ان کا دل عرش معلیٰ ہو جائے

صفات کا نہایت بہترین ذکر فرمایا گیا۔ اور یہ ہی چیزیں اسلام کے اصول ہیں۔ اب اسلام کی حقانیت کا ذکر فرمایا جارہا ہے۔ گویا پہلے اسلامی اصول کا تذکرہ تھا۔ اور اب اسلامی حقانیت کا ذکر ہے۔ **دوسرا تعلق:** آیت الکرسی میں صفات الٰہیہ کا کچھ اس طرح ذکر فرمایا گیا جس کے قبول کرنے پر ہر عاقل مجبور ہے۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ چونکہ اس بیان کے بعد عاقل کے لئے قبول حق میں کوئی تامل کی گنجائش باقی نہ رہی۔ لہٰذا اسلام پر کسی کو مجبور نہ کیا جائے۔ جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے حجت پوری ہو چکی۔ **تیسرا تعلق:** آیت الکرسی میں فرمایا گیا تھا۔ کہ رب تعالیٰ لوگوں کے اگلے پچھلے حالات جانتا ہے اب فرمایا جارہا ہے کہ کسی کو اسلام لانے میں مجبور نہ کیا جائے کیونکہ جن کا کفر علم الٰہی میں آچکا وہ جبر سے مومن نہ ہوں گے۔ لہٰذا یہ چیز بے کار ہے۔

شان نزول

انصار کے قبیلہ بنی سالم میں ایک صاحب تھے۔ حصین جن کے دو بیٹے عیسائی تھے وہ ایک بار مدینہ منورہ میں روغن کی تجارت کے لئے آئے حضرت حصین نے انہیں پکڑ لیا۔ اور فرمایا کہ تمہیں ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ جب تک ایمان نہ لے آؤ۔ انہوں نے انکار کیا یہ مقدمہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا۔ حضرت حصین نے عرض کیا کہ یا حبیب اللہ میں یہ کبھی نہیں برداشت کرسکتا کہ میرے جگر کے ٹکڑے دوزخ میں جائیں اور میں دیکھوں۔ اس پر یہ آیت کریمہ اُتری۔ اور حضور ﷺ نے حکم دیا کہ انہیں چھوڑ دو۔ (درمنثور) دوسری روایت انصار میں رواج تھا کہ جن عورتوں کے بچے نہیں جیتے تھے۔ وہ نذر مانتی تھیں کہ خدایا اگر تو ہمارا بچہ زندہ رکھے تو ہم اسے یہودی کردیں گے۔ اگر ان کی حاجت پوری ہو جاتی تو وہ نذر پوری کرتیں۔ اور ان کے یہ بیٹے یہودی ہی رہتے جب مدینہ منورہ میں اسلام کا آفتاب چمکا اور وہاں سے قبیلہ بنی نضیر کو ملک بدر کیا گیا۔ تو ان میں انصار کی ایسی اولاد بھی تھی۔ انصار نے چاہا کہ ان کو نہ جانے دیں۔ کہ یہ ہماری اولاد اور ہمارے بھائی بھتیجے ہیں۔ اس موقعہ پر یہ آیت آئی۔ اور ان لوگوں کو اختیار دیا گیا۔ کہ چاہیں تو ایمان لے آئیں اور چاہیں تو اپنے کفر پر قائم رہ کر نکل جائیں۔ (خازن و درمنثور) مگر ممکن ہے کہ حصین کے وہ دونوں بچے بھی اسی قسم کے ہوں لہٰذا ان روایتوں میں اختلاف نہیں۔

تفسیر

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ اِکْرَاہَ کرہٌ سے بنا بمعنی ناپسندیدگی اکراہ انسان سے ایسا بوجھ اٹھوانا جسے وہ پسند نہ کرتا ہو یا زبردستی اور مجبوراً منوانا الدین میں الف لام عہدی ہے۔ یا مضاف الیہ کے عوض میں یعنی دین اللہ اس سے مراد اسلام ہے (کبیر) اس جملہ کے دو معنی کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ دین میں جبر جائز نہیں۔ کہ کسی کو ڈرا دھمکا کر مسلمان کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ جو کافر جنگ کے بعد ایمان لائے۔ اسے صحیح مسلمان جانو یہ نہ کہو کہ مجبوراً ڈر کے مارے ایمان لایا۔ جس کی تفسیر یہ آیت ہے۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (النساء: ۹۴) (کبیر) پہلی صورت میں باب افعال تعدیہ کے لئے ہے اور دوسری صورت میں نسبت کیلئے یعنی اسلام میں مجبوری کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں۔ خیال رہے کہ کسی کافر کو جبراً مسلمان بنانا جائز نہیں۔ مگر مسلمان سے جبراً دین پر عمل کرانا جائز بلکہ ضروری ہے۔ لہٰذا بے نمازی پر سختی درست ہے۔ ماہ رمضان کی

گمراہ اہل کتاب سے خطاب تھا، یہاں گمراہ گروں سے یا گمراہی مستقل ایک عیب ہے اور دوسروں کو بہکانا اس سے سخت ترعیب یا پچھلا عتاب اور نوعیت کا تھا، یہ عتاب دوسری نوعیت کا، ان وجوہ سے اس آیت میں بھی قل اور اہل کتاب کو نداء مکرر فرمائی گئی، کیونکہ اسی خطاب ونداء کے ماتحت یہ مضمون بھی بیان کردینے سے اس کی وہ اہمیت ظاہر نہ ہوتی جو اب مستقل خطاب ونداء سے ہوئی، یہاں اہل کتاب سے وہی یہود ونصاریٰ مراد ہیں جن میں دوسروں کو بہکانے کا عیب ہو، ان کے پوپ پادری ہوں یا ان کے حاشیہ نشین لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ہماری قرأت تَصُدُّوْنَ ہے ت کے زبر اور ص کے پیش سے، باب نصر سے، امام حسن کی قرأت میں تُصِدُّوْنَ ہے ت کے پیش اور ص کے زیر سے باب افعال سے، صَدَّ اور اَصَدَّ دونوں ہم معنی ہی آتے ہیں پھیرنا اور روکنا (تفسیر کبیر) یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں جیسا کہ مَنْ اٰمَنَ کی تفسیر سے معلوم ہوگا، سبیل وہ وسیع راستہ ہے جو مسافروں کو اپنے میں لے لے، سبیل خود مقصود نہیں ہوتا بلکہ مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ ہوتا ہے، قرآن شریف میں سبیل اللہ ان عقائد واعمال کو کہا جاتا ہے جو رب کے ملنے کا ذریعہ ہوں، یہاں اسلامی عقائد مراد ہیں، کیونکہ اہل کتاب مسلمانوں کو عقائد سے پھیرتے تھے مَنْ اٰمَنَ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد وہ ضعیف اور نومسلم مسلمان ہیں جن کے دلوں میں ابھی اسلام مضبوط نہیں ہوا تھا کہ یہ یہود انہی کے دلوں میں شبہے ڈالا کرتے تھے کہ اسلامی عقائد میں یہ خرابیاں ہیں اور اسلامی اعمال میں یہ برائیاں، اس صورت میں تَصُدُّوْنَ سے مراد ہوگا اسلام سے پھیرنا، اور ہوسکتا ہے کہ مَنْ اٰمَنَ سے مراد وہ لوگ ہوں جو مائل باسلام ہوں تو تَصُدُّوْنَ سے روکنا مراد ہوگا، ایسے لوگوں سے اہل کتاب یہ کہا کرتے تھے کہ ہماری کتب میں حضور ﷺ کی کوئی صفت مذکور نہیں بلکہ ان کے خلاف صفات مذکور ہیں کہ نبی آخر الزمان بنی اسرائیل سے ہوں گے، شام میں پیدا ہوں گے اور حضور انور ﷺ بنی اسمٰعیل سے ہیں اور مکہ میں جلوہ گر ہوئے وغیرہ یعنی اے کتابیو تم ان لوگوں کو اللہ کی راہ سے کیوں پھیرتے ہو جو مسلمان ہو چکے ہیں یا ان لوگوں کو اللہ کی راہ سے کیوں روکتے ہو جو مائل باسلام ہیں اور ایمان لانے کے قریب تر ہیں تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا، تبغون بَغْىٌ سے بنا بمعنی ڈھونڈنا اور تلاش کرنا، نہ کہ بغاوۃ سے بمعنی سرکشی اور اطاعت سے نکل جانا، کہا جاتا ہے بَغَيْتُ الْمَالَ اَوِ الْاَجْرَ وَالثَّوَابَ میں نے مال اجرت اور ثواب تلاش کئے۔

لطیفہ

جب حضرت امیر معاویہ کے ہاتھوں حضرت عمار ابن یاسر شہید ہوئے جو سیدنا علی مرتضیٰ کی فوج کے ساتھ تھے تو لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ باغی ہیں اور علی مرتضیٰ امام برحق کیونکہ حضور انور ﷺ نے حضرت عمار سے فرمایا تھا تَقْتُلُكَ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ اے عمار تمہیں باغی جماعت قتل کرے گی، تو امیر معاویہ نے فوراً فرمادیا نَحْنُ فِئَةٌ بَاغِيَةٌ لِدَمِ عُثْمَانَ، ہاں ہم خونِ عثمانی کا قصاص تلاش کرنے والا گروہ ہیں یعنی سرکار کے فرمان میں باغیہ بَغْیٌ سے ہے نہ کہ بغاوۃ سے، خیال رہے کہ بغیٌ ایک مفعول چاہتا ہے، اگر دو مفعول آئیں تو وہاں لام ضروری ہے اسی لئے بعض مفسرین نے تَبْغُوْنَهَا میں لام مقدر مانا ہے کہ اصل میں تَبْغُوْنَ لَهَا تھا اور عِوَجًا کو مفعول بہ مانا اور بعض نے فرمایا کہ مفعول تو ھا

کرام کو بجائے مومن بہ کے ما یکفر بنایا ہے۔ یہ ہے تحریف طاغوت وہ ہے جو لوگوں کو گمراہ کرے۔ جیسا شیطان اور سرداران کفر یا وہ جسے گمراہی کے لئے بنایا گیا ہو اور وہ ذریعہ گمراہی ہو جیسے بت وغیرہ حضرات انبیاء کرام نے نہ کسی کو گمراہ کیا۔ نہ انہیں رب نے گمراہی کے لئے بنایا۔ یہ حضرات ہادی اور سبب ہدایۃ ہیں۔ اگر کوئی انہیں خدا کا بیٹا مان لے تو یہ اس کی اپنی بدقسمتی ہے۔ وہاں سے طغیان نہ ملا۔ یہ تفسیر اس آیۃ کے صریحی خلاف ہے۔ اِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ (النساء: ۶۰) معلوم ہوا کہ طاغوت کو حاکم بنانا حرام و کفر ہے۔ دوسری جگہ رب فرماتا ہے۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (النساء: ۶۵) معلوم ہوا کہ نبی کو حاکم بنانا مدار ایمان ہے۔ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى۔ اِسْتَمْسَکَ سک سے بنا بمعنی اخذ بالقوۃ مضبوطی سے تھامنا عروۃ اصل میں عری تھا۔ بمعنی ننگا ہونا۔ اس لئے چٹیل میدان کو عراء کہا جاتا ہے۔ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ اور عراء کے معنی جانب یا پہلو کے بھی ہیں۔ عروۃ دستہ کو بھی کہتے ہیں۔ جو برتن کے ایک کنارے پر ہو جس سے برتن پکڑا جائے۔ اسی لئے ڈول اور کوزہ کی جائے گرفت کو بھی عروہ کہا جاتا ہے۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ عروہ وہ چیز جس کو پکڑ کر لٹکا جائے یعنی رسی وثقٰی وثیق کا مونث ہے۔ بمعنی مضبوط یہاں قوی دلائل کو مضبوط گرہ والی رسی سے تشبیہ دی گئی ہے جو ہاتھ سے نہ چھوٹے لَا انْفِصَامَ لَهَا یہ وثقٰی کا بیان ہے۔ انفصام فصم سے بنا بمعنی کھل کر ٹوٹنا کٹنے کو ابانت کہتے ہیں۔ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ سمیع کا مفعول اقوال اور علیم کا مفعول عقائد و خطرات اور ارادے ہیں۔ یعنی اللہ ہر ایک کی بات سننے والا اور ہر ایک کی نیت جاننے والا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو دین میں کسی پر زبردستی نہیں کسی کو مجبور کر کے مسلمان نہ بناؤ کیونکہ قرآن کریم سے ہدایت اور گمراہی پوری ظاہر ہو چکیں کہ کسی ہوشیار کو اس میں دم مارنے کی گنجائش نہیں اب جو کوئی شیطان سے دور رہے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے دین کی ایسی مضبوط رسی پکڑ لی۔ اور ایسی محکم گرہ تھام لی جو کبھی کھل سکتی ہی نہیں۔ وہ اس کے ذریعے یقیناً جنت میں پہنچے گا۔ تم کسی کی فکر کیوں کرتے ہو۔ اللہ ہر ایک کی بات سنتا ہے۔ اور سب کی نیتوں کو جانتا ہے۔ ہر ایک کو اس کے لائق سزا و جزا دے گا۔ دنیا مذہبوں کا جنکشن ہے۔ جنکشن پر تحقیق کر کے گاڑی میں بیٹھو۔ تب منزل مقصود پر پہنچو گے۔ طغیان کی ریل میں بیٹھ کر رحمٰن تک نہیں پہنچ سکتے۔ طغیان کے ذریعہ نیران تک ہی پہنچو گے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کسی کو جبراً مسلمان کرنا جائز نہیں۔ اس لئے جہاد سے پہلے اسلام پیش کیا جاتا ہے۔ اگر کفار نہ مانیں تو جزیہ کی پیش کش ہوتی ہے۔ اگر اس کا بھی انکار کریں تب جنگ۔ اگر اسلام میں جبر ہوتا تو جزیہ کی پیش کش نہ ہوتی۔ مگر اس حکم سے مرتدین اور مشرکین عرب مستثنیٰ ہیں کہ ان کے لئے دو ہی صورتیں ہیں۔ یا اسلام یا تلوار۔ **دوسرا فائدہ:** اس آیت سے موجودہ کفار کا یہ الزام بھی اٹھ گیا کہ اسلام تلوار سے پھیلا یا مسلمانوں نے کفار کو جبراً کلمہ پڑھایا جبراً مسلمان کرنا اسلام کا قانون ہی نہیں اگر یہ قانون ہوتا تو آج ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد صرف دس کروڑ ہندوؤں کی تعداد پچیس کروڑ نہ ہوتی۔ بلکہ یہاں سب مسلمان ہی ہوتے اور ملک بجائے ہندوستان کے اسلام استان

حرکات سے بے خبر نہیں، وقت آنے پر تمہیں ایسی مار ماریں گے کہ یاد کرو گے، ابھی کچھ نہیں بگڑا، سنبھل جاؤ، ایمان لے آؤ اور دوسروں کو بھی مسلمان بنا کر اپنا فرض ادا کرو،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حضور انور ﷺ کی تشریف آوری کے بعد سے تا قیامت اللہ سے ملنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے یعنی اسلام جیسا کہ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے معلوم ہوا، **دوسرا فائدہ:** اپنے اپنے زمانوں میں ان آسمانی کتابوں پر عمل باعثِ ہدایت تھا لیکن اب ان پر عمل باعث گمراہی ہے، یہ بھی عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے ہی معلوم ہوا، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران: ۸۵) اس سے وہ آزاد خیال، ہندو نواز علماء عبرت پکڑیں، جو کہتے ہیں کہ جس دین میں رہ کر نیکیاں کرلو نجات پاؤ گے، اگر ایسا ہوتا تو حضور انور ﷺ لوگوں کو دعوت ایمان کیوں دیتے، **تیسرا فائدہ:** بہکانے والا بہر حال مجرم ہو جاتا ہے خواہ اس سے کوئی بہکے یا نہ بہکے، دیکھو خدا کے فضل سے صحابہ کرام علماء یہود کے بہکائے بہک نہ سکے، مگر بہکانے والوں پر وبال پڑ گیا، ایسے ہی ہدایت دینے والا عالم بہر حال ثواب پائے گا خواہ اس سے کوئی ہدایت پائے یا نہ پائے۔ **چوتھا فائدہ:** مسلمان کو مرتد بنانا اور اسلام لانے والے کو اس سے روکنا دونوں کا گناہ تقریباً یکساں ہے جیسا کہ لِمَ تَصُدُّوْنَ کی دونوں تفسیروں سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** جن علماء کی تقریریں یا تحریریں مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی طرف سے شکوک پیدا کریں وہ علماء انہی پوپ پادریوں کی طرح مجرم ہیں جن کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے اس سے موجودہ زمانے کے نئے نئے فرقوں کو سبق لینا چاہئے، جن کی تبلیغ صرف مسلمانوں کو بہکانے میں محدود رہ گئی ہے، فقہاء فرماتے ہیں کہ عوام کے سامنے فقہی معمے پیش نہ کرو، اور ان سے ایسی باتیں نہ کرو جو ان کی سمجھ سے وراء ہوں کہ اس سے ان کے دلوں میں شکوک پیدا ہوں گے یہ بھی اللہ کے راہ سے پھیرنے کی ایک صورت ہے، **چھٹا فائدہ:** شریعت میں گواہ وہ ہے جو واردات سے واقف ہو، اسے جانتا ہو، دیکھ کر یا کسی اور ذریعہ سے گواہی دے یا نہ دے، دیکھو رب تعالیٰ نے علمائے یہود کو حقانیت اسلام کا گواہ فرمایا حالانکہ وہ اس کی گواہی نہ دیتے تھے بلکہ اس کے خلاف باتیں کیا کرتے تھے، کیوں؟ اس لئے کہ وہ حقانیتِ اسلام سے اپنی کتب کے ذریعہ واقف تھے، گواہ ہونا اور ہے گواہی دینا کچھ اور، نکاح دو گواہوں کے سامنے ہوتا ہے حالانکہ وہ اس وقت نکاح کی گواہی دیتے نہیں،

اعتراضات

پہلا اعتراض: رب تعالیٰ نے یہاں صرف اہل کتاب کو خطاب کیوں کیا چاہیے تھا کہ سارے کفار سے خطاب ہوتا کیونکہ سب ہی مومنوں کو ایمان سے پھیرنے کی اور لوگوں کو اسلام سے روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ **جواب:** دو وجہ سے ایک یہ کہ ساری سورۂ بقر مدنی ہے اور مدینہ منورہ میں مشرکین سارے مسلمان ہو چکے تھے، روکنے والے صرف اہل کتاب تھے اس لئے ان سے ہی خطاب ہوا، دوسرے یہ کہ دلائل کے ذریعہ اور لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کر

اور ارشاد ہوا۔ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ۔ (بقرہ:۲۸۵)

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب دین میں جبر نہیں تو مسلمانوں نے جہاد کیوں کئے۔ (آریہ) **جواب:** دنیا میں امن قائم کرنے کفر کا زور مٹانے اور اسلامی آزادی کے لئے تا کہ نیک لوگوں کو اللہ اللہ کرنے میں رکاوٹ نہ ہو۔ جہاد سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ جبراً کافروں کو مسلمان کیا جائے۔ **دوسرا اعتراض:** جب جبراً مسلمان کرنا جائز نہیں۔ تو جبر یہ ایمان کا اعتبار کیوں کیا گیا۔ اور ایسے مسلم کو مسلمان رہنے میں مجبور کیوں کیا گیا چاہیے تھا کہ ایسے ایمان پر اسلام کے احکام جاری نہ ہوں۔ **جواب:** شریعت کا حکم ظاہر پر ہوتا ہے اور بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں دل کی خوشی نا خوشی کا اعتبار نہیں زبانی اقرار کا لحاظ ہے جیسے طلاق اور غلام کا آزاد کرنا ایسے ہی اسلام بھی ہے۔ ورنہ لوگوں کو مرتد بننے کا بہانہ مل جاتا کہ جب چاہتے اسلام چھوڑ دیتے۔ اور حیلہ کر دیا کرتے کہ ہم جبراً مسلمان ہوئے تھے (از احکام القرآن) **تیسرا اعتراض:** جب دین میں جبر نہیں تو مرتد کو جبراً کیوں مسلمان کیا جاتا ہے؟ **جواب:** اسی لئے کہ وہ سلطنت الٰہیہ کا باغی ہے۔ جس کی سزا قتل یا اطاعت ہے۔ جبراً مسلمان کرنا منع مسلمان کو اسلام پر جبراً قائم رکھنا ضروری۔ **چوتھا اعتراض:** جب دین میں جبر نہیں تو مشرکین عرب کو مذہبی آزادی کیوں نہ دی گئی؟ **جواب:** اسی لئے کہ وہ سلطنت الٰہیہ کا دارالخلافہ ہے۔ وہاں صرف خدام ہی رہنا چاہئیں۔ شاہی عمارتوں میں صرف خدام رہ سکتے ہیں۔ **پانچواں اعتراض:** جن لوگوں نے اس آیت کو منسوخ مانا کیا ان کے نزدیک کفار کو جبراً مسلمان کرنا جائز ہے۔ **جواب:** نہیں ان کے نزدیک اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ دین میں کسی پر کسی قسم کی سختی نہیں نہ مرتد پر نہ مشرکین عرب پر اور نہ کسی اور پر اور ظاہر ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے جو لوگ اس آیت کو باقی مانتے ہیں ان کے نزدیک آیت کے وہ معنی ہیں جو ہم عرض کر چکے۔ **چھٹا اعتراض:** جب اسلام مضبوط رسی ہے کہ اس کے پکڑنے والا خطرے سے نکل جاتا ہے تو لوگ مرتد کیوں ہو جاتے ہیں۔ **جواب:** بعض لوگوں کا ارتداد اسلام کی کمزوری سے نہیں بلکہ اپنی کمزوری سے ہوتا ہے کہ انہوں نے اس مضبوط رسی کو مضبوطی سے پکڑا نہیں۔ ان کی گرفت کمزور تھی۔

تفسیر صوفیانہ

علماء کے ہاں لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے معنی ہیں کسی کو دینِ اسلام جبراً نہ دو۔ یعنی کافر کو جبراً مسلمان نہیں کر سکتے۔ صوفیاء کے ہاں اس کے معنی ہیں کہ کسی سے نورِ ایمانی جبراً نہیں لے سکتے۔ یعنی نہیں ہے جبر نورِ ایمان میں یہ نور ایمانی جسے معرفت کہتے ہیں۔ چار طریقے سے ملتا ہے۔ محض عطاءِ الٰہی سے پیدائشی طور پر۔ جیسے غوث پاک پیدائشی ولی۔ دوسرا مصیبت و آفات کے ذریعہ جیسے نصوح کو آفت میں مبتلا ہو کر ایمان و معرفت نصیب ہوا۔ جس کا قصہ مثنوی میں ہے۔ عیش میں غفلت مصیبت میں توبہ میسر ہوتی ہے۔ تیسرا نورانی لوگوں کی صحبت سے جیسا صحابہ کرام کو حضور ﷺ کی صحبت سے وہ کمال معرفت ملا جو دوسرے کو نہیں مل سکتا۔ آگ میں رہنے سے بعض چیزیں آگ بن جاتی ہیں۔ اور بعض چیزیں گرم ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی نور کے ساتھ رہنے سے بعض نور بن جاتے ہیں اور بعض نورانی ہو جاتے ہیں۔ چوتھا کسی کے فیض نظر سے جیسے موسیٰ علیہ السلام

تفسیر صوفیانہ

دنیا صدہا راستوں کا جنکشن ہے، یہاں سے بہت سی ریلیں جہنم کی طرف جارہی ہیں، جن کے مختلف پلیٹ فارم ہیں، اور بعض گاڑیاں جنت سے ہوتی ہوئی رب تعالیٰ تک پہنچیں گی، یہ سب رنگ و روغن میں یکساں ہیں، مگر ان کے رخ مختلف ہیں، جو رب تعالیٰ کی طرف جارہی ہے وہ اللہ کے راستہ پر ہے اسی لائن کا نام سبیل اللہ بھی ہے اور صراط مستقیم بھی جہنم میں جانے والی گاڑیاں ٹیڑھے راستوں پر ہیں انہی راستوں کا نام عوج ہے، رب تعالیٰ نے فرمایا وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ (انعام: ۱۵۳) علمائے حق اس پلیٹ فارم کی طرف بلا رہے ہیں جہاں سے رب تعالیٰ تک پہنچنے والی گاڑی ملتی ہے اور علماء سوء ان پلیٹ فارموں کی طرف داعی ہیں جو جہنم تک پہنچانے والے ہیں، اس آیت میں بظاہر خطاب علمائے اہل کتاب سے ہے مگر درحقیقت ان علمائے سوء سے ہے جنہوں نے اپنا دین دنیا کے عوض فروخت کردیا، مشائخ فرماتے ہیں کہ جس علم کے ساتھ خوف خدا نہ ہو وہ علم خدا کا عذاب ہے، عالم دین وہ ہے جس کی زبان پر اللہ رسول کے فرمان ہوں اور اس کے دل میں ان کے فیضان، جہاں فرمان فیضان سے خالی ہوگا وہاں زبان پر قال قال ہوگا، دل کا کالا کالا عالم ریڈیو کی پیٹی ہے، اگر اس کے دل کی سوئی مدینہ شریف کی طرف ہے تو اس سے مدینہ ہی کی آواز نکلے گی، اور اگر خدا نہ کرے اس کا رخ اور طرف ہوگیا، تو پڑھائے گا قرآن مگر سکھائے گا وہ طغیان کتاب سے دین تب ملے گا، جب معلم عالم دین ہوگا، دیکھو علمائے یہود اسی توریت سے لوگوں کو گمراہ کرتے تھے سیدنا عبداللہ ابن سلام اسی توریت سے لوگوں کو ہدایت دیتے تھے کہ حضور انور ﷺ کی نعت کی آیتیں لوگوں کو سنا کر ان کے ایمان تازہ کرتے تھے، یہ علم اللہ تعالیٰ کا فضل ہو تو تریاق ہے ورنہ زہر، مولانا فرماتے ہیں، شعر:

تلخ تر از فرقت تو ہیچ نیست ۔۔۔ بے پناہت غیر پیچا پیچ نیست
رخت ما ہم رخت مارا راہ زن ۔۔۔ جسم ما مر جانِ مارا جامہ کن
دست ما ہم پائے ما رامے خورد ۔۔۔ بے امان تو کسے جاں کے برد

خدایا اگر تو ہمیں پناہ نہ دے تو ہمارا سامان ہی ہم کو جلادے گا، ہمارا جسم جان کا دشمن ہے اور اعضاء ایک دوسرے کے خلاف، اگر تو کرم فرمائے تو یہ سب ہمارے معاون ہوجائیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے اگر تم اطاعت کروگے گروہ کی ان لوگوں کے جنہیں کتاب
اے ایمان والو اگر تم کچھ کتابیوں کے کہنے پر چلے
يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾
دی گئی تو وہ تم کو لوٹادیں گے بعد تمہارے ایمان کے کافر

تو وہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں کافر کر کے چھوڑیں گے

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں علمائے یہود کو مسلمانوں کے بہکانے سے روکا گیا تھا، اس آیت میں مسلمانوں کو بہکنے سے منع کیا جارہا ہے، کسی چیز سے پرہیز پورا جب ہی ہو سکتا ہے جب مضر چیز کو اس سے بچایا جائے اور اس کو مضر سے گویا پرہیز کا ایک جزء پہلے بیان ہوا تھا دوسرا اب، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اشارۃً صحابہ کرام کی پختگی کی اظہار تھا، اہل کتاب کے علماء سے خطاب تھا کہ تم انہیں بہکا نہیں سکتے، اس آیت میں مسلمانوں سے فرمایا جارہا ہے کہ تم اس پختگی کے باوجود ان سے پرہیز کرو کہ بروں سے بچنا بھی عبادت ہے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ٹیڑھے راستہ اور اس پر چلنے والوں کا ذکر تھا، اب اس آیت میں سیدھے راستہ کا تذکرہ ہے اور اس پر چلنے والوں کو استقامت کی ہدایت،

شانِ نزول

اسلام سے پہلے انصار مدینہ کے دو گروہ تھے، اوس، خزرج، جن کی آپس میں سخت عداوت تھی اور ان میں سو برس تک جنگ رہی تھی ان کے ملنے کی بظاہر کوئی صورت ہی نہ تھی کہ اچانک رحمت الٰہی نے ان کی دستگیری کی اسلام کا آفتاب مدینہ پر چمکا، نبی ﷺ ہجرت فرما کر یہاں تشریف لائے، تو حضور انور ﷺ نے ان دونوں قبیلوں کو ملا کر شیر و شکر کر دیا، یہ صدیوں کے بچھڑے چند دنوں میں آپس میں اس طرح گھل مل گئے کہ ان میں کبھی کوئی رنجش تھی ہی نہیں۔ **شعر:**

بد خلق جو تھے وہ نیک ہوئے لڑتے تھے ہمیشہ جو ایک ہوئے
جھگڑے تو نے آ کر میٹ دیئے تری فہم و ذکا کا کیا کہنا

ایک روز اشعث بن قیس ایک بوڑھا یہودی جو سخت کافر اور مسلمانوں کا بدترین دشمن تھا ایک مجلس پر گذرا جہاں یہ دونوں قبیلے بیٹھے پیار و محبت کی باتیں کر رہے تھے اسے ان کا متفق ہو جانا بہت ہی ناگوار ہوا، اس نے ایک غیر معروف جوان یہودی کو بلایا اور اس سے کہا کہ تو انہیں جنگ بعاث یاد دلا دے جو اوس و خزرج کے درمیان نہایت خونریز طور پر ہوئی تھی جس میں اوس نے خزرج پر فتح پائی تھی، خیال رہے کہ قبیلہ اوس تو اوس بن قبطی حارثی کی اولاد میں تھے اور قبیلہ خزرج جبار ابن صخر سلمے خزرجی کی اولاد سے تھے بولا قسم رب کی اگر یہ متفق ہو گئے تو ہمارا ٹھکانہ پھر کہیں نہیں، چنانچہ اس جوان نے اس مجمع میں پہنچ کر وہ اشعار گائے جن میں اس جنگ کا ذکر تھا، یہ اشعار سن کر ان لوگوں کو وہ جنگ یاد آ گئی، مندمل شدہ زخم پھر ہرے ہو گئے، دونوں فریق بھڑک گئے، اور السلاح السلاح (ہتھیار ہتھیار) کہتے ہوئے گھروں کو دوڑے اور آن کی آن میں فریقین مسلح ہو گئے تھے، کسی نے اس بچھڑوں کو ملانے والے محبوب ﷺ کو خبر دی کہ اے مغیث کونین جلد پہنچو ورنہ آج نہ اوس رہیں گے نہ خزرج، یہ حضرات صف بستہ ہو چکے تھے آپس میں ٹکرانے والے ہی تھے کہ **شعر:**

ناگہانے آں مغیث ہر دو کون　　　مصطفیٰ پیدا شدہ از بہرِ عون

حضورانور ﷺ وہاں پہنچ گئے، حضور ﷺ کو دیکھتے ہی فریقین ٹھہر گئے، سرکار نے فرمایا کیا تم میرے ہوتے لڑو گے، اور کیا تم ہدایت پر آ کر پھر گمراہ ہوئے جاتے ہو؟ ان چند کلموں نے صوراسرافیل کا کام دیا اور وہ حضرات غفلت سے چونک پڑے اور سوچنے لگے کہ ہم کیا کر رہے ہیں، چیخ پڑے سَمْعًا وَّطَاعَةً یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ (ﷺ) حضور ہم نے فرمان سن لیا، ہم آپ کے مطیع ہیں ہتھیار پھینک کر ایک دوسرے سے گلے مل کر چیخیں مار کر رونے لگے، حضرت جابر فرماتے ہیں کہ میں نے ایسا کوئی دن نہ دیکھا جس کا اول ایسا شر ہو اور آخر ایسی خیر، تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (تفسیر کبیر و معانی، روح، خازن، مدارک وغیرہ) **شعر:**

بچھڑے ہوؤں کو کس نے ملایا تیرے بغیر　　　اجڑے ہوؤں کو کس نے بسایا تیرے بغیر

تفسیر

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اہل کتاب کو خطاب فرماتے وقت دونوں جگہ قل فرمایا گیا مگر اب مسلمانوں سے رب تعالیٰ نے براہِ راست خطاب فرمایا، کہ یہاں قل نہ فرمایا ان کی عزت افزائی کے لئے چونکہ اگلا مضمون بہت اہم ہے جس پر مومنوں کے مومن ہونے کا دارومدار ہے، اس لئے پہلے مسلمانوں کو پکارا، پھر ان سے کلام فرمایا، خطاب سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتے ہیں، فقیر کی تحقیق یہ ہے کہ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا کے خطاب میں نبی کریم ﷺ داخل نہیں ہوا کرتے حضورانور ﷺ کے لئے یہ خطاب بنا ہی نہیں، انہیں تو یاایھا النبی، یاایھا الرسول کے پیارے پیارے خطابات سے پکارا جاتا ہے، بہت سی آئتیں قرآن کریم میں ایسی ہیں جہاں الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا میں حضورانور ﷺ کو داخل ماننے سے معنی ہی فاسد ہو جائیں گے، جیسے اے ایمان والو اللہ رسول سے آگے نہ بڑھو، یا اے ایمان والو نبی کی آواز پر اپنی آواز اونچی نہ کرو، یا اے ایمان والو نبی کی وفات کے بعد ان کی ازواج سے نکاح نہ کرو وغیرہ، یہاں بھی حضور انور ﷺ کو داخل ماننے سے معنی فاسد ہوں گے، اور کلام الٰہی کی تحریف لازم آئے گی، اس کی تحقیق ہماری کتاب "درس القرآن" میں دیکھو، یہاں بظاہر اوس وخزرج سے خطاب ہے مگر درحقیقت تاقیامت مسلمانوں سے خطاب، چونکہ ظاہری مسلم منافق بھی کہلاتے تھے، انہیں نکالنے کے لئے رب تعالیٰ نے اٰمَنُوْا فرمایا، اَسْلَمُوْا نہ فرمایا، ایمان و اسلام کبھی ہم معنی آتے ہیں کبھی ان میں فرق ہوتا ہے، مسلم و مومن میں عام خاص من وجہ کی نسبت ہے اس کی تحقیق ہماری کتاب "نعیم الباری شرح صحیح بخاری" عربی میں دیکھو، چونکہ اوس وخزرج پہلے سے مسلمان نہ تھے بعد میں ایمان لائے تھے نیز ہم لوگ بذاتِ خود مومن نہیں کسی کے کرم سے مومن ہوئے اس لئے امنوا ماضی فرمایا گیا، زمین خود روشن نہیں آفتاب کی مہربانی سے روشن ہے، ہمارے دل تاریک زمین ہیں، مدینہ کے سورج دلوں کے سورج ہیں، **شعر:**

ہے جہاں میں جن کی چمک دمک ہے چمن میں جن کی چہل پہل
وہی ایک مدینہ کے چاند ہیں سب انہی کے دم کی بہار ہے

یعنی اللہ مسلمانوں کا والی یا مددگار یا ان سے قریب یا ان کا پیارا یا ان کا کام بنانے والا متولی ہے۔ خیال رہے کہ جب مسلمانوں کا رب تعالیٰ ولی و وارث ہو گیا تو اس کے تمام مقبول بندے فرشتے' انبیاء کرام' اولیاء اللہ ان کے ولی و وارث مددگار اور تمام زمین' ہوا' پانی وغیرہ خدمت گار ہو گئے۔ جس پر بادشاہ مہربان ہو گیا اس پر تمام احکام ارکان و دولت مہربان ہو گئے اور مملکت کی ہر چیز پر گویا اس کا قبضہ ہو گیا۔ اس لئے دوسرے مقام پر ارشاد ہوا۔ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (مائدہ: ۵۵) مولانا فرماتے ہیں ۔

ہر کہ دیوانہ بود در ذکر حق! زیر پائش عرش و کرسی نہ طبق

لہٰذا یہ ولایت اپنے میں صدہا ولایتیں لئے ہوئے ہے۔ کیا تمہیں نہیں پتہ کہ بدر میں مسلمانوں کی مدد کے لئے فرشتے آئے اور غزوۂ خندق میں مسلمانوں کی خدمت کے لئے ہوا مامور ہوئی اور تمام کفار کو درہم برہم کر دیا۔ کہ یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ ظُلُمَاتِ جمع ظلمۃ کی ہے' بمعنی اندھیری اور نور بمعنی روشنی جو خود ظاہر ہو اور دوسروں کو ظاہر کرے۔ اگر مومنین سے نو مسلم یا جو علم الٰہی میں مؤمن تھے وہ مراد ہیں۔ تو ظلمات سے کفر اور نور سے ایمان مراد ہے۔ کیونکہ کفر میں اصل راستہ کا پتہ نہیں لگتا اور ایمان میں حق و باطل ممتاز ہو جاتا ہے۔ اسی لئے کفر کو اندھیری اور ایمان کو نور فرمایا گیا۔ سر کی آنکھوں کے لئے تاریکی و روشنی اور ہے۔ دل کی آنکھوں کے لئے تاریکی و روشنی کچھ اور۔ دل کے لئے کفر گمراہی' حسد' بغض' گناہ تاریکی ہے۔ ایمان' عرفان' رحمت رحمان' نیک اعمال نور ہے۔ آنکھ کا سرمہ و عینک اور ہے دل کا سرمہ و عینک کچھ اور ہے...... اور چونکہ کفر کی صدہا قسمیں ہیں دھریت۔ عیسائیت۔ یہودیت بت پرستی وغیرہ اور اسلام ایک ہی دین ہے۔ اس لئے ظلمت کو جمع اور نور کو واحد فرمایا گیا۔ اور اگر مومنین سے قدیمی مسلمان مراد ہیں تو ظلمات سے گناہ یا شبہات یا شکوک مراد اور نور سے یقین و اطمینان قلب کیونکہ پرانا مسلمان تو کبھی کفر میں تھا ہی نہیں۔ اس کے کفر سے نکلنے کے کیا معنی۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ ان مسلمانوں کو کفر سے نکالنے سے مراد ہے کفر سے بچانا کبھی بچنے کو نکلنا اور چھوڑنا کہہ دیتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ۔ (یوسف: ۳۷) یعنی اختیار نہ کیا۔ حضور ﷺ نے ایک شخص کو کلمہ پڑھتے ہوئے سن کر فرمایا۔ خَرَجَ مِنَ النَّارِ۔ یعنی آگ سے بچ گیا نہ یہ کہ آگ میں تھا اور نکلا۔ یعنی اللہ مسلمانوں کو ظلمت کفر سے نور ایمان کی طرف نکالتا ہے۔ یا قدیمی مسلمانوں کو ظلمت کفر سے بچا کر نور ایمان میں رکھتا ہے۔ یا انہیں شہادت اور شکوک کی تاریکیوں سے نکال کر نور یقین عطا فرماتا ہے۔ یا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ولی ہے جو مدینہ میں پہلے تو مشرک تھے۔ مگر حضور ﷺ کی تشریف آوری پر مسلمان صحابی ہو گئے۔ انصار کہلائے۔ رب نے انہیں شرک کی تاریکیوں سے ایمان کی روشنی میں داخل فرما لیا۔ یہ لوگ پہلے شرک' کفر' عناد و حسد' آپس کی لڑائی بھڑائی' غرضیکہ صدہا تاریکیوں میں پھنسے تھے۔ ایک آفتاب نبوت کے طفیل تمام تاریکیاں چھٹ گئیں۔ اجالا ہو گیا۔ یہ رب تعالیٰ کا کرم ہے۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓـُٔھُمُ الطَّاغُوْتُ۔ یہاں بھی کفروا سے یا مرتدین مراد ہیں یا وہ جو علم الٰہی میں کافر ہیں۔ اگرچہ فی الحال مومن ہوں۔ یا قدیمی کفار۔ اولیاء ولی کی جمع ہے۔ جس کے معنی پہلے معلوم ہو چکے۔ طاغوت واحد جمع۔ مذکر مؤنث سب پر بولا جاتا ہے۔ اس کی تحقیق پچھلی آیت میں ہو چکی اس سے یا شیاطین مراد ہیں۔ یا کافروں کے سردار یا کاهن یا بت یا سارے ہی گمراہ کرنے والے (روح البیان و

مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے، اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ (آل عمران: ۲۸) مسلمان کبھی کافروں کو دوست نہ بنائیں۔ **دوسرا فائدہ:** مسلمانوں کو آپس میں لڑانا کفار کا پرانا طریقہ ہے، اب بھی انگریزوں کا یہ قول تھا (پھاڑو اور راج کرو) **تیسرا فائدہ:** کفار کبھی بھی مسلمانوں کی ترقی یا ان کے اتفاق کو پسند نہیں کریں گے جیسا کہ تجربہ بھی ہو رہا ہے پاکستان کی ترقی سے ہندوستان میں صف ماتم بچھ جاتی ہے، بفضلہ تعالیٰ اب بھی اسلامی سلطنتیں بہت ہیں مگر آپس میں متفق نہیں، کیوں؟ کفار کی مہربانی سے، **چوتھا فائدہ:** مسلمانوں کا آپس میں لڑنا بھڑنا کافروں کا سا کام ہے جیسا کہ كٰفِرِيْنَ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا، جیسے ہم پر نماز روزہ وغیرہ عبادات فرض ہیں ایسے ہی حتی الامکان آپس میں متفق رہنا بھی فرض ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران: ۱۰۳) اسی اتفاق کے لئے اسلام نے سلام با جماعت نمازیں، حج میں سارے مسلمانوں کا اجتماع مقرر کیا، **پانچواں فائدہ:** مسلمانوں کو لڑانا، ان میں جنگ کرانا طریقہ یہود ہے، اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو چغلیوں اور غیبتوں کے ذریعہ مسلمانوں کے گھروں اور محلوں و برادریوں میں جنگیں کراتے رہتے ہیں، یہ بیماری بہت عام ہے، **چھٹا فائدہ:** لڑے ہوئے مسلمانوں کو ملا دینا سنت رسول علیہ السلام ہے، کاش کہ ہم اس سنت پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرتے، ہم اس سبق کو بھول چکے، **شعر:**

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

تا توانی پا منہ اندر فراق كَاَبْغَضُ الْاَشْيَاءِ عِنْدِیْ الطَّلَاقُ

ساتواں فائدہ: کافر کی کوئی بات بغیر سوچے سمجھے کبھی نہ ماننی چاہئے، اگرچہ بظاہر اچھی ہی ہو کہ اس میں اس کی کوئی چال پوشیدہ نہ ہو، اگر کافر نماز کے لئے بھیجے تو سوچ سمجھ کر جاؤ کہ تمہارے پیچھے کوئی کا نشانہ مارے، ایک بار سیدنا امیر معاویہ کو ابلیس نے نماز فجر کے لئے جگایا تھا، مگر اس میں بھی اس کی چال تھی، جیسا کہ مثنوی شریف میں مفصل مذکور ہے، **آٹھواں فائدہ:** مسلمانوں کو مسلمانوں ہی سے اتفاق چاہیے، کفار مرتدین سے اتفاق کیسا؟ نبی کریم علیہ السلام نے اوس و خزرج کو تو ملا دیا مگر صحابہ کرام کو منافقین یا مسیلمہ کذاب کے معتقدین سے نہ ملایا، ان سے چھانٹ دیا، حضرت صدیق اکبر نے منکرین زکوٰۃ اور مسیلمہ و اسود عنسی کے معتقدین سے صلح نہ کی، بلکہ ان پر لشکر کشی فرمائی، اگر دودھ و پیشاب کو ملایا گیا تو دودھ گندا ہی ہوگا، **نواں فائدہ:** مومن کو چاہیے کہ اپنے ایمان کی قدر و حفاظت کرے، بے دینوں کے پاس نہ بیٹھے، نہ ان کی سنے کہ وہ ایمان کے چور ہیں، مال کو چور سے بچاتے ہیں، جان کو سانپ سے تو ایمان کو بے ایمانوں سے بچاؤ رب تعالیٰ فرماتا ہے فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (انعام: ۶۸)

اعتراضات

پہلا اعتراض: تم نے کہا کہ نبی علیہ السلام الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے خطاب میں داخل نہیں ہوتے، لیکن رب تعالیٰ فرماتا ہے اے ایمان والو نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، یا اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے، کیا اس میں بھی حضور علیہ السلام

نکلنا محض فضل ربانی ہے۔ ہمارا اپنا کوئی کمال نہیں۔ دیکھو یہاں ظلمۃ کے نکالنے کو رب کی طرف منسوب قرار دیا گیا۔ ہم تو مٹی کے بنے ہیں۔ جب چھوڑ دیئے جائیں تو نیچے ہی گریں گے۔ اوپر تو کسی اور ہی کی طاقت سے جائیں گے۔ **تیسرا فائدہ:** جو رب سے قرب چاہے وہ رب کے مقبول بندوں کے پاس بیٹھے کہ یہ شخص ان بزرگوں کے قریب ہوگا۔ اور رب تعالیٰ ان کے قریب ہے۔ قریب سے قریب خود اس سے قریب ہوتا ہے۔ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے قرب الٰہی معلوم ہو ایمان والے زندہ ہوں یا وفات یافتہ سب سے رب قریب ہے۔ اور جو شیطان سے قریب ہونا چاہے وہ کفار کے پاس جائے۔ اس لئے بت خانہ مندر گرجے میں نماز مکروہ ہے کہ وہاں شیاطین کا قرب ہے۔ بزرگوں کے آستانہ میں نماز بہتر کہ وہاں رب کا قرب ہے۔ **چوتھا فائدہ:** ابلیس اور اس کی ذریت تمام دنیا کے کفار کے قریب ہے۔ دیکھو یہاں فرمایا گیا۔ اَوْلِیٰٓـءُهُمُ الطَّاغُوْتُ اور سب کو دیکھتے ان کے دلوں کا حال جانتے ہیں رب فرماتا ہے۔ اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (اعراف: ٢٧) جب اس ناری کی یہ طاقت ہے کہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے تو رب کی نوری مخلوق جو اس مردود سے کہیں زیادہ قوت و طاقت رکھتی ہے۔ اس کا تصرف و علم اس سے کہیں زیادہ ہے۔ دوا کی طاقت بیماری سے زیادہ چاہیے۔ **پانچواں فائدہ:** اگرچہ ہر چیز خیر و شر رب کی طرف سے ہے۔ مگر تقاضا ادب یہ ہے کہ خیر کو رب کی طرف اور شر کو اپنی یا اپنے بُرے ساتھیوں کی طرف نسبت کرے۔ جیسا اس آیت میں کیا گیا۔ شیطان نے کہا تھا۔ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ (اعراف: ٤٦) اے رب تو نے مجھے گمراہ کر دیا۔ مردود ہوا۔ آدم علیہ السلام نے عرض کیا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (اعراف: ٢٣) اے مولیٰ ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا وہ محبوب ہوئے۔ **چھٹا فائدہ:** اسی طرح اگرچہ ساری مخلوق اللہ کی ہے۔ مگر اسے اعلیٰ مخلوق کی طرف نسبت کرو۔ رب العالمین۔ رب العرش۔ رب محمد ﷺ۔ رب کعبہ کہو۔ رب کفار یا رب شیطان نہ کہو۔ **ساتواں فائدہ:** بُرے ساتھی اللہ کا عذاب ہیں کہ سب کو بہکاتے ہیں۔ اور اچھے ساتھی اللہ کی رحمت اسی لئے صحابہ کرام پردیس میں پہنچ کر رب سے اچھے ساتھی مانگتے تھے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: مومن تو پہلے ہی سے نور میں تھا۔ اور کافر ہمیشہ سے اندھیرے میں پھر مومن کو ظلمت سے اور کافر کو نور سے نکالنے کے کیا معنی نکالا اسے جائے جو پہلے وہاں موجود ہو (آریہ) **جواب:** اس کے نہایت نفیس جواب تفسیر میں گزر گئے کہ یا تو مومن سے مراد نو مسلم اور کافر سے مراد مرتدین ہیں۔ اور یا نکالنے سے مراد روکنا اور باز رکھنا ہے وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان رب کی طرف سے ہے اور کفر شیطان کی طرف سے پھر تم یہ کیوں کہتے ہو کہ ہر خیر و شر رب کی طرف سے ہے (معتزلی) **جواب:** اس کا جواب فوائد میں گزر گیا۔ کہ ہر خیر و شر رب کی طرف سے ہے۔ مگر چونکہ شیاطین شر کا سبب ہیں اس لئے شر کو انہیں کی طرف نسبت کر دیا گیا تا کہ مسلمان ادب سیکھیں۔

تیسرا اعتراض: جیسے کفر کا سبب شیطان ہے ویسے ہی ہمارے ایمان کا ذریعہ اللہ کے نیک بندے انبیاء۔ اولیاء۔ مشائخ و علماء ہیں۔ تو یوں کہنا چاہیے تھا کہ مسلمانوں کے ولی۔ انبیاء۔ اولیاء۔ علماء ہیں۔ اور کفار کے ولی شیاطین۔ **جواب** اللہ کے پیارے فنا فی اللہ ہونے کی وجہ سے خدا کے غیر میں داخل نہیں۔ ان کا فعل رب کا فعل ہے۔ شیاطین ہر طرح اس کے

تخم ہیں، اچھی صحبت اور اچھے وعظ سے اسی دل میں ایمان، تقویٰ، عرفان اور خوف الٰہی، محبت مصطفٰی کے درخت پیدا ہوتے ہیں جس میں عبادتوں کے پھول اور ریاضتوں کے پھل لگتے ہیں، جس سے یہ خود بھی اور دوسرے لوگ بھی فائدے اٹھاتے ہیں، لیکن اگر اسی دل میں بری صحبتوں اور ان کی نصیحتوں کا تخم بویا جائے، تو پھر یہاں کفر، طغیان اور نفاق وغیرہ کے درخت پیدا ہوتے ہیں جن میں حسد، کینہ، جنگ وفساد کے کانٹے لگتے ہیں، صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ دل گویا مومن ہے اور نفس امارہ وشیطان گویا دشمن، پوپ پادری ہیں، فرمایا جارہا ہے اے دل اگر تو نفس امارہ (پوپ) اور شیطان (پادری) کی اطاعت کرے گا، تو یہ تیرے ایمان کا باغ اجاڑ کر اس میں کفر وطغیان کے تخم بودیں گے، جس سے تیرا چمن بجائے گلستان کے خارستان ہو جائے گا، جیسے مالی اپنے باغ کو ہر گرم سرد ہوا سے بچاتا ہے، ایسے ہی مومن کو چاہیے کہ اپنے ایمان کو بری صحبتوں سے بچائے، دنیا میں نسبی خاندان دیکھے جاتے ہیں، مگر آخرت میں نسبتی خاندان پوچھے جائیں گے یعنی یہاں پوچھتے ہیں کہ تو کس کا بیٹا ہے، وہاں پوچھیں گے تو کس کا صحبت یافتہ ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے یَوۡمَ نَدۡعُوۡا کُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمۡ (الاسراء:۷۱) رب تعالیٰ نسبت صحیح رکھے۔

وَكَيۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ
اور کیسے کفر کرو گے تم حالانکہ تلاوت کی جاتی ہیں
اور تم کیونکر کفر کرو گے تم پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں
اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيۡكُمۡ رَسُوۡلُهٗ ؕ وَمَنۡ يَّعۡتَصِمۡ
تم پر اللہ کی آیتیں اور تم میں رسول ہیں اللہ کے اور جو مضبوط پکڑے
اور تم میں اللہ کا رسول تشریف فرما ہے اور جس نے اللہ کا
بِاللّٰهِ فَقَدۡ هُدِىَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۱۰۱﴾
اللہ کو تو یقیناً ہدایت دیا گیا طرف سیدھے راستہ کے
سہارا لیا تو ضرور وہ سیدھی راہ دکھایا گیا

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے کئی طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں ایمان برباد کرنے والی چیزوں کا ذکر تھا یعنی صحبتِ کفار واطاعتِ اہل کتاب، اس آیت کریمہ میں ان نعمتوں کا ذکر ہے جن سے ایمان ملتا ہے اور تازہ رہتا ہے یعنی پرہیز کا ذکر پہلے تھا اور سفید غذا کا ذکر اب ہو رہا ہے، قابل طبیب ان دو چیزوں سے اپنے مریضوں کا علاج کرتا ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ایمانی آفت کا ذکر تھا اور اس آیت کریمہ میں اس آفت سے حفاظت کا

دوسری تفسیر

عالم دو ہیں۔ ا۔ عالم اجسام جسے ظلمت کہتے ہیں۔ ۲۔ عالم ارواح جسے عالم نور بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ اسی عالم اجسام میں۔ نفس، خیال، وہم دنیوی تعلقات مال اولاد وغیرہ ہزار ہا حجاب ہیں۔ گویا یہ مجموعہ ظلمات ہے۔ رب تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے سارے معاملات اور محبت کا خود متولی اور منتظم کار ہے۔ کہ انہیں خود ان کی کوشش سے نہیں بلکہ اپنے کرم خاص سے ان ظلمات سے نکال کر عالم نور میں پہنچا دیتا ہے کہ یہاں کی کوئی چیز ان کے لئے حجاب نہیں رہتی کفار کے مددگار وہ اغیار ہیں۔ جن پر ان کی ہر وقت نظر ہے۔ وہ انہیں فطری ہدایت کے نور سے نکال کر صفات نفس اور شکوک وشبہات کی اندھیریوں میں پھنسا دیتے ہیں۔ حق تعالیٰ ہر ایک کے کلام کو سننے والا اور ہر ایک کی حالت جاننے والا ہے۔ سب کو ان کی استعداد کے لائق دیتا ہے (ابن عربی) فرعون نے اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی (النازعات: ۲۴) کہا بے ایمان ہوا۔ حضرت منصور نے اَنَا الْحَقُّ کہا مومن رہے۔ کہ وہ حجاب میں رہ کر کہتا تھا۔ اور یہ ظلمت حجاب سے گزر کر۔ صوفیاء کرام کے ہاں دل کی بے چینیاں ظلمات وتاریکیاں ہیں۔ اور دل کا چین واطمینان نور ہے۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کو بے چینیوں سے نکال کر چین کے نور میں داخل کرتا ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (رعد: ۲۸) دنیا میں عیش بے چینی کا باعث ہے۔ رب سے تعلق چین کا ذریعہ اس زندگی کا نام حیات طیبہ ہے۔ شعر۔

نانک دکھیا سب سنسار وہ سکھیا جسے نام ادھار

خیال رہے کہ روح سب کی نور ہے کہ عالم امر کی چڑیا ہے قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (الاسراء: ۸۵) اور نفس امارہ ظلمات۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ (یوسف: ۵۳) مومن کو اللہ تعالیٰ نفس کی ظلمات سے نکال کر روح کے نور میں داخل فرماتا ہے۔ اور کافر کو روح کے نور سے نکال کر نفس کی ظلمت میں داخل کر دیتا ہے۔ یا یوں کہو کہ مومن کا نفس روح کی صحبت سے منور ہو جاتا ہے۔ اور کافر کی روح نفس کی صحبت سے سیاہ وتاریک۔ کہ انسان کا دل نفس وروح کے درمیان ہے۔ جیسے زمین پر کبھی دن آتا ہے کبھی رات ایسے دل پر کبھی نفس کی رات ہوتی ہے کبھی روح کا دن۔ اللہ تعالیٰ مومن کے دل کو نفس کی رات سے نکال کر روح کے نور یا دن میں لاتا ہے۔ اور کافر کے دل کو روح کے نور سے نکال کر نفس کی رات میں داخل کر دیتا ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ روز ازل میں جس پر نور کا چھینٹا پڑ چکا ہے وہ اگر دنیا میں کافر بھی ہو گیا تو اسکا کفر عارضی ہوگا۔ آخر کار مومن ہو جائے گا۔ جیسے سونا کیچڑ میں پڑ کر عارضی طور پر گندہ ہو جائے۔ اور جس پر وہ چھینٹا نہ پڑا ہے۔ اگر وہ دنیا میں مومن بھی ہو جائے تو اسکا ایمان عارضی ہوگا۔ آخر کافر ہو جائے گا۔ جیسے کوئلہ پر چونا لگ کر سفید ہو جائے۔ مگر دھلتے ہی کالا نکلے گا۔ یہ اس آیت کا منشا ہے مومن کو ظلمات سے نور کی طرف اور کافر کو نور سے ظلمات کی طرف نکالنے کا۔ خیال رہے کہ یہ آیۃ تمام ان آیات کی تفسیر ہے۔ جن میں اولیاء مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی برائیاں ہیں۔ یا انہیں بھی اتنا کفر قرار دیا گیا۔ اَوْلِيٰٓئُهُمُ الطَّاغُوْتُ نے بتایا کہ وہ اولیاء مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ ہیں ان ہی کو ماننا شرک ہے۔ عربی میں اِلَّا۔ غیر۔ سوا۔ دشمن سب کے معنی ہی سوا یا علاوہ مگر الا تو مطلقاً علاوہ کو کہتے ہیں۔ اور غیر اجنبی کو کہا جاتا ہے مگر دون مقابل یا دشمنی پر بولا جاتا ہے۔ جس میں علیحدگی ہو۔ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ۔ (قصص: ۲۳) بعض بندے رب کے دشمن ہیں جنہیں حزب الشیطان

کے آثار وشواہد تا قیامت رہیں گے (از روح المعانی) وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ يَعْتَصِمُ اعتصامٌ سے بنا جس کا مادہ عَصمٌ ہے بمعنی روک رکھنا اعتصام کے معنی ہیں اپنے آپ کو روک کر بچا رکھنا، رب تعالیٰ فرماتا ہے مَالَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ (مومن: ۳۳) اسی سے معصوم ہے جو گناہوں سے بچایا گیا ہو، اسی سے عصمت ہے بمعنی پاکدامنی یعنی اپنے کو بدکاری سے بچانا، اعتصام کے دوسرے معنی ہیں کسی چیز کو پکڑنا، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ (آل عمران: ۱۰۳) یہاں دونوں معنے ہو سکتے ہیں (غیاث وتفسیر کبیر) یعنی جو اپنے کو برائیوں سے بچائے بذریعہ امداد الٰہی، یا جو اللہ کو پکڑے (اللہ کے دین کو یا دامن رسول اللہ ﷺ کو) فَقَدْ هُدِيَ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ہدایت اور صراط مستقیم کے معانی اور ان کے اقسام پہلے بیان ہو چکے، یہاں هُدِيَ سے مراد یا ہدایت دیا گیا یا ہدایت پر رکھا گیا، صراط مستقیم سے مراد اچھے عقیدے ہیں یا اچھے اعمال یا آپس کی صلح، محبت اور جنگ و جدال سے پرہیز کرنا، جیسا کہ شانِ نزول سے معلوم ہو رہا ہے یعنی جو اللہ کے دین کو یا رسول اللہ ﷺ کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے گا اسے سیدھے راستہ پر رہنے کی ہدایت ملے گی،

خلاصه تفسیر

اے جماعت صحابہ تم ایمان چھوڑ کر کفر کیسے اختیار کر سکتے ہو، یا لڑائی بھڑائی، آپس کے خون خرابے، کفار کے کام کیسے کئے لیتے ہو، تمہیں تو رب تعالیٰ نے تین نعمتیں عطا فرمائی ہیں جو تمہیں ان برائیوں سے بچانے والی ہیں ایک یہ کہ تم کو رسول اللہ ﷺ سناتے اور سکھاتے ہیں، دوسرے یہ کہ خود وہ ذاتِ کریم تم میں تشریف فرما ہیں، تمہارا ہر شبہ وہ دور فرماتے ہیں اور تم ان سے ہر مسئلہ دریافت کر سکتے ہو **شعر:**

خوشا وہ وقت کہ دیدار عام تھا اس کا — خوشا وہ وقت کہ طیبہ مقام تھا اس کا

تیسرے یہ کہ تم نے اللہ کے دین اور اس کے حبیب ﷺ کے دامن کو مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے اور جو اس دامن کو تھامے وہ ہمیشہ راہِ راست پر رہتا ہے اور ان کے ساتھ رہنے والا نہ گرتا ہے نہ بگڑتا ہے، **شعر:**

سن لیں اعدا میں بگڑنے کا نہیں — وہ سلامت ہیں بنانے والے

حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے اس آیت میں دو علموں کا ذکر کیا، ایک کتاب اللہ، دوسرے نبی اللہ، نبی اللہ تو تشریف لے گئے (ﷺ) کتاب اللہ تا قیامت باقی رہی (مسلم) زید ابن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک پانی کے گھاٹ پر تشریف فرما ہوئے جسے ماء خم یا غدیر خم کہا جاتا تھا وہاں ہمیں وعظ فرمایا، جس میں فرمایا کہ اے لوگو قریب ہے کہ مجھے رب تعالیٰ کا بلاوا آ جائے اور میں اسے قبول کر لوں، تم میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں ایک کتاب اللہ جس میں ہدایت و نور ہے، اسے مضبوطی سے پکڑے رہنا، دوسرے میرے اہل بیت، میرے اہل بیت کے بارے میں اللہ سے ڈرنا (تفسیر خازن)

سے مستقبل بمعنی ماضی یعنی اے محبوب کیا آپ نے اس سے پہلے حضرت خلیل جلیل اور ایک کافر ذلیل کا مناظرہ ان آنکھوں سے ملاحظہ نہ فرمایا تھا۔ یعنی ضرور دیکھا تھا۔ کیونکہ آپ ولادت پاک سے پہلے سارے عالم کو دیکھ رہے تھے۔ اِلَی الَّذِیْ حَاجَّ اِبْرَاهِیمَ فِیْ رَبِّهٖ۔ اَلَّذِیْ سے اس وقت کا بادشاہ مراد ہے۔ جس کا نام نمرود ابن کنعان ابن سنجاریب تھا۔ (روح المعانی) یا نمرود ابن کنعان ابن سام ابن نوح علیہ السلام (روح البیان) یہ ہی پہلا وہ بادشاہ ہے۔ جس نے تاج پہنا رعایا پر ظلم کیا۔ خدائی کا دعویٰ کیا۔ اور سارے جہان کی بادشاہت کی اس کی عمر آٹھ سو ۸۰۰ برس ہوئی۔ چار سو ۴۰۰ سال عزت کے ساتھ اور چار سو برس مچھر کی وجہ سے پٹ کٹ کر اس نے رب سے مقابلہ کرنے کے لئے نہایت اونچا قلعہ بنایا تھا۔ اس کا پایہ تخت بابل تھا۔ (روح البیان وخازن) حَاجَّ حاجۃ سے بنا۔ جس کا مادہ حج اور حجۃ ہے بمعنی غلبہ حاجۃ کے معنی ایک دوسرے کے مقابلہ میں غلبہ کی کوشش کرنا دلیل کو اسی لئے حجت کہتے ہے کہ وہ غلبہ کا ذریعہ ہے۔ چونکہ اس مناظرہ کی ابتداء نمرود نے کی تھی۔ اس لئے حَاجَّ کا فاعل اسے ہی قرار دیا گیا۔ یا حَاجَّ سے مراد ہے کم بختی اور ناجائز حجۃ بازی کی جو دلیل وحجۃ حق بات پر کی جاوے وہ حجۃ بھی حق حجۃ والا بھی حق وہ حجۃ اللہ کی حجۃ ہے۔ رب فرماتا ہے تِلْکَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَیْنٰهَاۤ اِبْرٰهِیْمَ عَلٰی قَوْمِهٖ (انعام: ۸۳) اور جو حجت حق کے خلاف کی جاوے وہ حجۃ باطل ہے۔ حجۃ والا بھی باطل یہاں باطل حجۃ مراد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ یہ مناظرہ ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے سے پہلے ہوا۔ جبکہ آپ نے بت شکنی فرمائی۔ اور نمرود مناظرہ سے عاجز ہو کر آپ کو آگ میں ڈالنے پر آمادہ ہوا۔ یہ قول مقاتل کا ہے۔ امام جعفر صادق سے مروی ہے کہ یہ مناظرہ ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے کے بعد ہوا کہ جب آپ پر آگ گلزار ہوگئی۔ تب اس نے پوچھا کہ بتاؤ تو آپ کا رب کون ہے۔ جس کی طرف مجھے بلاتے ہو۔ (روح المعانی وکبیر) فی سے پہلے حق یا صفات پوشیدہ ہے۔ اگرچہ حق تعالیٰ ان دونوں کا رب ہے۔ مگر ابراہیم علیہ السلام کی عزت افزائی کے لئے اپنے کو انہیں کی طرف نسبت کیا یا چونکہ ابراہیم علیہ السلام حق تعالیٰ کی ربوبیت کے مدعی تھے۔ اور نمرود اپنی خدائی کا اس لئے رَبِّهٖ فرمایا گیا۔ یعنی اس بادشاہ نے ابراہیم علیہ السلام سے ان کے رب کے بارے میں مناظرہ کیا۔ صوفیاء کے مشرب میں حق تعالیٰ خصوصی رب صرف ابراہیم علیہ السلام کا ہی ہے نہ کہ نمرود کا رب۔ اللہ کی ربوبیّت عام ساری خلق کے لئے ہے۔ یعنی پرورش جسم اور جسمانی روزیاں دینا۔ مگر ربوبیت خاصہ یعنی روحانی پرورش اور روحانی روزیاں دینا صرف مومنوں سے خاص پر ایک کو ایمان تقویٰ۔ ولایت۔ نبوت نہیں ملتی۔ پھر جیسے جسمانی ربوبیت بندوں کے توسل سے ظاہر ہوتی ہے۔ یوں ہی روحانی ربوبیت حضرات انبیاء و اولیاء کے توسل سے حاصل ہوتی ہے کہ ایمان عرفان وغیرہ انہی کے ذریعہ ملتی ہے چونکہ نمرود حضرت خلیل سے دور رہا اس لئے رب کی خصوصی ربوبیّت سے حصہ نہ پاسکا۔ یا یوں کہو کہ رب تعالیٰ کو اچھوں کی طرف نسبت کرنا اچھا ہے۔ یہ نہ کہو کہ اے ابوجہل کے رب یوں کہو اے محمد ﷺ کے رب یہ نہ کہو اے گھروں کے رب یوں کہو اے کعبہ کے رب۔ اَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْکَ۔ یا تو ان سے پہلے لام پوشیدہ ہے اور یہ جملہ مناظرہ کی علت ہے نہ کہ حاجّ کا مفعول لہ کیونکہ مفعول لہ میں لام وہاں پوشیدہ ہوسکتا ہے۔ جہاں فعل اور اس کا فاعل ایک ہی ہو۔ اور یہاں حَاجَّ کا فاعل نمرود ہے۔ اور اٰتٰی کا فاعل اللہ تعالیٰ یا اس سے پہلے غلٰی پوشیدہ ہے۔ یا فی شکر یا وقت آخیری توجیہ پر یہ حَاجَّ کا ظرف ہے۔ اور خیال رہے کہ مصدر جعلی بھی ظرف بن

تعالیٰ نے یہ نہ فرمایا کہ تم میں قرآن شریف ہے اور رسول ہیں، اور نہ یوں فرمایا کہ تم قرآن شریف پڑھ لیتے ہو بلکہ یوں فرمایا کہ تم پر اللہ کی آئتیں پڑھی جاتی ہیں، اور تم میں اس کے رسول ہیں اس کی تفسیر وہ آیت ہے وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (بقرہ:۱۲۹) وہ نبی انہیں قرآن وحکمت سکھاتے ہیں، معلوم ہوا کہ ان سے بغیر سیکھے قرآن سے ہدایت نہیں ملتی، اور فرماتا ہے یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ (بقرہ:۲۶) قرآن کے ذریعہ بہتوں کو ہدایت دیتا ہے بہتوں کو گمراہی، جو نبوت کی روشنی سے قرآن کو دیکھتے ہیں انہیں ہدایت ملتی ہے اور جو محض اپنی عقل ولغت سے سمجھتے ہیں وہ گمراہ ہی ہوتے ہیں، قرآن کے سمندر میں خود چھلانگ نہ لگاؤ بلکہ حدیث کے جہاز میں اسے عبور کرو جس جہاز کے کپتان کوئی امام مجتہد ہوں، **چوتھا فائدہ:** کوئی مسلمان خواہ کتنے بڑے پائے کا ہو کسی صحابی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا کہ وہ صحبت یافتہ جنابِ مصطفیٰ ﷺ ہیں اور ان میں نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی گزاری ہے، انہوں نے اس قرآنِ ناطق کے شب وروز دیکھے ہیں جیسا کہ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** تمام انبیائے کرام کے معجزات قصے بن کر رہ گئے، مگر حضور انور ﷺ کے صدہا معجزات زندۂ جاوید ہیں جو آج بھی دیکھے جارہے ہیں اور تا قیامت دیکھے جائیں گے، اب نہ تختِ سلیمانی ہے نہ عصائے موسوی نہ توریت رہی نہ انجیل بلکہ ان کی زبان عبرانی بھی فنا کردی گئی، مگر قرآن محمدی بلاکم وکاست بعینہٖ ویسے ہی موجود ہے بلکہ حضور انور ﷺ کے احوال، اقوال، افعال، اعمال، اشغال بتمامہ عالم کے سامنے ہیں، یہ فائدہ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** اگرچہ نبی کریم ﷺ ہماری ظاہری آنکھوں سے پردہ فرماگئے لیکن وہ اب بھی ہم میں موجود ہیں، انہیں ہماری سر کی آنکھیں نہیں دیکھتیں، مگر دل کی آنکھیں دیکھتی ہیں، بعض خوش نصیب انہیں ظاہری آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں جیسا کہ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ کی تیسری تفسیر سے معلوم ہوا، ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں، **شعر:**

در دل مومن مقامِ مصطفیٰ است   آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است

اسی لئے مومن قبر میں انہیں بے تکلف پہچان لے گا کہ وہ تو اس کے دل میں رہتے تھے، ہم نے عرض کیا ہے **شعر:**

قبر میں دیکھا جو اس پردہ نشیں کو تو کھلا   میرے ہی دل میں رہا تھا مجھے معلوم نہ تھا

تاقیامت مسلمانوں کے اندر حضور انور ﷺ کے رہنے کی بہت آیات ہیں، یہاں رب تعالیٰ نے فرمایا وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ اے مسلمانو تم میں اللہ کے رسول جلوہ گر ہیں، لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ (توبہ:۱۲۸) اے مسلمانو تم سب کے پاس اللہ کے رسول آگئے، اور فرمایا اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا (آل عمران:۱۶۴) مسلمانوں میں رب تعالیٰ نے اپنا رسول بھیج دیا، اور فرمایا مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ (انفال:۳۳) اللہ تعالیٰ انہیں عذاب نہ دے گا حالانکہ ان میں آپ ہیں، ان آیات سے مسئلہ حاضر وناظر واضح ہوتا ہے، اس کی تحقیق ہماری کتاب جاء الحق حصہ اول میں دیکھو، **ساتواں فائدہ:** اب ہدایت کے لئے آیاتِ قرآنیہ ضروری ہیں، توریت وانجیل کی آیتوں سے ہدایت نہیں مل سکتی، جیسے کہ دھوپ میں چراغ سے روشنی نہیں ملتی، جیسا کہ اٰیٰتُ اللّٰهِ سے معلوم ہوا، **آٹھواں فائدہ:** جو دین سے وابستہ رہے

سورج کو مغلوب کر کے اس کے ارادے کے بغیر الٹی حرکت دیدے بہر حال آپ کی یہ دلیل نہایت مکمل تھی کسی پہلو کو اس میں چھوڑا نہیں گیا تھا۔ خیال رہے کہ یہ ترک دلیل نہیں ہے۔ ترک دلیل تو مغلوب کیا کرتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی دلیل کو دوسری واضح...... عبارت سے بیان فرمایا ہے آپ یہ فرماتے تھے کہ رب وہ جس کا عالم میں عمل درآمد ہو۔ اس کا تصرف موت زندگی سے بیان فرمایا۔ جب نمرود نے اس میں کج بحثی کی تو اس تصرف کو اور واضح طریق سے بیان فرمایا۔ جس سے وہ آسانی سے شکست کھا گیا۔ اور انجام یہ ہوا کہ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ۔ بُهِتَ بھتٌ سے بنا بمعنی حیرانی تہمت کو بہتان اسی لئے کہتے ہیں کہ سننے والا حیران رہ جاتا ہے۔ کبھی دلیل نہ سوچنے کو بھی بُهتَ کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ بُهِتَ یعنی وھبت فعل مجہول سے اس جانب اشارہ ہے کہ وہ کافر رب کی طرف سے حیران کر دیا گیا۔ ورنہ کج بحثی اس میں بھی کر سکتا تھا۔ کہتا کہ آپ ہی رب سے عرض کر کے یہ کام کرا دو۔ كَفَرَ میں اس جانب اشارہ ہے کہ اس کی یہ حیرانی و پریشانی کفر کی وجہ سے تھی۔ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔ یَهْدِیْ ہدایۃ سے بنا اس کے معنی ہم اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں بیان کر چکے۔ قوم ظالمین سے کفار مراد ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس کا متعلق یا تو الی الدلائل ہے۔ یا الی طریق الجنۃ اور یھدی بمعنی حال ہے۔ یا بمعنی مستقبل یعنی رب تعالیٰ کافروں کو آخرت میں جنت کے راستہ کی ہدایت نہ دے گا۔ یا دنیا میں انہیں دلائل حق نہیں سوجھتا یا ظالم رہنے کی حالت میں اسے ہدایت نہیں دیتا۔ اور جب ہدایت دیتا ہے تو ظالم نہیں رہتا۔ چنانچہ دیکھ لو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایسی پاکیزہ و نفیس دلیل سے وہ ہدایت نہ پا سکا جیسے اندھی آنکھ سورج سے روشنی نہیں پاتی ایسے ہی ظالم دل نبی سے کوئی ہدایت حاصل نہیں کرتا۔ بصارت سے سورج مفید ہوتا ہے اور بصیرت سے نبوت فائدہ مند ہوتی ہے۔

خلاصه تفسیر

نمرود تمام دنیا کا بادشاہ تھا۔ اسکا پائے تخت شہر بابل میں تھا جب ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو توڑا تو اس نے آپ کو قید کر دیا۔ پھر قید سے نکال کر آگ میں ڈالا۔ رب تعالیٰ نے آپ پر آگ کو گلزار بنا دیا۔ کچھ دنوں بعد سخت قحط سالی پڑی نمرود نے غلہ تقسیم کرنا شروع کیا جو کوئی اس کے پاس غلہ لینے آتا۔ وہ پوچھتا کہ تیرا رب کون ہے۔ وہ کہہ دیتا کہ تو ہے۔ اسے غلہ دے دیتا اسی سلسلہ میں ابراہیم علیہ السلام بھی غلہ کے لئے اس کے پاس گئے۔ اس نے آپ سے بھی یہ ہی پوچھا کہ آپ کا رب کون ہے۔ آپ نے فرمایا۔ وہ ہے جو زندگی اور موت بخشتا اور عالم میں تصرف کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ قدرت تو مجھ میں بھی ہے دو قیدی بلا کر ایک کو قتل کر دیا۔ دوسرے کو چھوڑ دیا۔ اور کہا کہ جسے چھوڑا ہے اسے میں نے زندگی دی اور جسے قتل کیا اسے مار دیا۔ لہٰذا آپ کے اس قائدہ سے میں ہی خدا ہوا۔ کہ میرے قبضہ میں موت و زندگی ہے۔ یا تو وہ بہت غبی تھا۔ کہ ابراہیم علیہ السلام کا مقصد نہ سمجھ سکا۔ یا اپنی جھینپ اُتارنے کے لئے اس نے یہ کج بحثی کی۔ خیال رہے کہ عقلی علوم سمجھنے کے لئے عقل کامل درکار ہے کیونکہ وہ علوم عقل نے ایجاد کئے ہیں۔ عقل سے ہی سمجھے جاتے ہیں۔ مگر نقلی علوم عرشی ہیں۔ یہ محض عقل سے نہیں سمجھے جاتے بلکہ ان کے لئے اللہ کا فضل اور عرفان کا نور ضروری ہے۔ کلام نبی کی فہم نور عرفان سے ہوتی ہے آج بھی بے نورے بے بہرے لوگ قرآن و حدیث میں وہ ٹھوکریں کھاتے ہیں کہ رب کی پناہ رب تعالیٰ فرماتا ہے لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ:۷۹) قرآن کو پاکوں کے سوا کوئی مس بھی نہ کرے گا۔ بہر حال ابراہیم علیہ السلام نے اسی

استفادہ کی دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ دینے والے میں دینے کی طاقت ہو، دوسرے یہ کہ لینے والے میں اخذ کی قوت ہو، اگر لینے والے میں لینے کی طاقت نہ ہوگی تو اسے فیض نہ ملے گا، سورج میں چمکانے کی طاقت ہے مگر چمگادڑ کی آنکھ اور نابینا چشم میں چمکنے کی طاقت نہیں، اس لئے وہ بے نور رہتی ہیں، ان مرتدین میں اخذ کی پوری قوت نہ تھی،

تفسیر صوفیانه

دنیا ایک جنگل ہے جس میں شکار کرنے والے جانور بھی ہیں اور شکار ہونے والے بھی یعنی شکاری بھی یہاں رہتے ہیں اور شکار بھی یہاں بستے ہیں، جیسے شکار وہی محفوظ رہے گا جو کسی کی پناہ میں آجائے، جو حفاظت سے باہر گیا، وہ شکاری کا لقمہ بن گیا، ہم لوگ شکار ہیں، شیطان برے ساتھی اور دنیا کی الجھنیں شکاری ہیں، اگر ہم اپنے ایمان وتقویٰ کی حفاظت چاہتے ہیں تو کسی مامن میں آجائیں اور کسی کی حفاظت قبول کریں، اسلام امن گاہ ہے اور حضور نبی کریم ﷺ ہمارے ایمانوں کے حافظ امن گاہ کی حدود کے اندر رہنا لازم ہے، ایسے ہی ہمیں اسلام کی حدود میں رہنا ضروری ہے، یہاں فرمایا جارہا ہے اے مسلمانو تم کافر کیونکر ہوسکو گے، تم تو دین کی حدود میں ہو تمہاری نگرانی فرمانے والے رسول اکرم ﷺ تم میں جلوہ گر ہیں، قرآنی آیات تم پر دن رات پڑھی جاتی ہیں بیدار رہو اپنے کو ان امانوں میں رکھو، اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے کیا خوب فرمایا، **شعر:**

جاگ سنسان بن ہے رات آئی گرگ بہر شکار پھرتے ہیں

مبارک ہے وہ جس کی زندگی امن وامان میں گزرے صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ کفر، فسق، بری حرکات ہم کرتے ہیں، ایمان، تقویٰ، نیکیاں، رب تعالیٰ کی طرف سے نصیب ہوتی ہیں، اسی لئے یہاں کفر کو ہماری طرف منسوب کیا گیا کہ فرمایا گیا **تَكْفُرُوْنَ** تم کفر کرتے ہو، اور ہدایت کو رب کی طرف کہ فرمایا گیا **فَقَدْ هُدِيَ** ہماری پیدائش مٹی سے ہے، مٹی نیچے خود گرتی ہے مگر اوپر کسی کے اٹھائے اٹھتی ہے،

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾
اے وہ لوگو جو ایمان لائے اللہ سے ڈرو حق اس سے ڈرنے کا اور ہرگز نہ مرو مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو
اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو کفر یا کفران سے روکا گیا جو بڑا بھاری عیب ہے، اس آیت میں انہیں تقویٰ اور پرہیزگاری کا حکم دیا گیا جو مومن کی زینت اور ایمان کا زیور ہے، یعنی عیوب سے بچنے کا پہلے ذکر تھا اور صفات اختیار کرنے کا اب ذکر ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں کفار سے علیحدگی اور ان کی باتوں میں نہ آنے کا ذکر تھا، اب وہ بتائی جارہی ہے، جس سے بفضلہ تعالیٰ مومن کا دل ان سے متنفر ہو

لئے کوشش کرے اعمال کا تخم بوئے دنیا اسے خود ملے گی۔ اعمال تخم ہے آخرت دانہ دنیا بھوسا۔ **چھٹا فائدہ:** بندے کا اصلاح قلب کی طرف مائل ہونا فضل الٰہی کی علامت ہے۔ اور سرکشی غضب کی نشانی کوئی سرکش ہدایت نہیں پا سکتا۔ اور جب ہدایت کا وقت آتا ہے تو اس سے سرکشی نکل جاتی ہے۔ جیسا کہ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** سارا عالم اور خود ہماری ذات رب تعالیٰ کا پتہ ہے۔ مگر یہ تمام چیزیں ناقص ہیں۔ جن سے رب تعالیٰ کی معرفت پوری حاصل نہیں ہوتی۔ حضرات انبیاء رب کا کامل پتہ ہیں۔ جن کے ذریعہ رب کو پہچاننا معرفت کا ذریعہ ہے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام کے جادوگروں نے سجدہ میں گر کر کہا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ (اعراف:۱۲۲) ہم اس پر ایمان لائے جو حضرت موسیٰ و ہارون کا رب ہے۔ برادران یوسف علیہ السلام نے یعقوب علیہ السلام سے عرض کیا تھا۔ نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ الخ (بقرہ:۱۳۳) ہم اس کی عبادت کریں گے۔ جو آپ کا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہم کا رب ہے۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ربی فرما کر رب کا پورا پتہ بتایا۔ پھر يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فرما کر بتایا کہ خود تیری زندگی و موت رب کا پتہ ہے تو اپنے ہی میں رب کو دیکھ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذاریات:۲۱) مثنوی شریف میں ایک جوہری اور ایک چور کا واقعہ بیان فرمایا۔ کہ جوہری رات کو چور کی جیب میں شب چراغ موتی ڈال دیتا تھا۔ اور چور جوہری کا سامان تلاش کرتا تھا۔ موتی نہ پاتا تھا۔ آخر جوہری سے پوچھا کہ تو موتی کہاں رکھتا ہے وہ بولا تیری جیب میں اگر تو اپنے کو ڈھونڈھتا موتی پالیتا۔ یونہی معرفت الٰہی کا موتی خود ہمارے میں موجود ہے۔ تلاش کی کمی ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے مقابلہ میں دلیل اول کیوں چھوڑ دی۔ مناظرہ میں دلیل چھوڑنا مغلوبیت کی علامت ہے۔ **جواب:** ہم تفسیر میں عرض کر چکے کہ یہ ترک دلیل نہیں۔ بلکہ ترک مثال ہے۔ یعنی ایک ہی دلیل دوسری واضح مثال سے سمجھائی گئی۔ مطلب یہ تھا کہ رب وہ ہے جو جہاں میں تصرف کرنے جیسے موت و حیات جب وہ اسے نہ سمجھا تو آپ نے فرمایا جیسے آفتاب کی حرکت۔ **دوسرا اعتراض:** نمرود نے جیسے موت و حیات پر جرح کی ایسے ہی اس مثال پر بھی کج بحثی کر سکتا تھا۔ کہ سورج میرے حکم سے ادھر جارہا ہے۔ اگر رب کوئی اور ہے تو اس سے کہو کہ اسے پچھم سے طلوع کردے وہ خاموش کیوں ہو گیا۔ **جواب:** وہ سمجھ گیا کہ اگر میں نے جرح کی تو ابھی ان کے کہنے سے آفتاب الٹے پاؤں لوٹے گا جس سے عالم میں انقلاب عظیم پیدا ہو جائے گا۔ اور لوگ اس معجزہ کو دیکھ کر مجھ سے پھر کر ان کے ساتھ ہو لیں گے۔ اس لئے منہ تکتا رہ گیا (بیان القرآن مصنفہ مولوی اشرف علی صاحب) **(نوٹ)** الحمد للہ کہ مولوی صاحب دیوبندی ہو کر قدرت پیغمبر کے قائل تو ہو گئے۔ روح المعانی و کبیر نے فرمایا کہ اگر وہ اس وقت یہ کہہ دیتا تو یقیناً آفتاب مغرب سے طلوع ہو جاتا۔ روح البیان نے فرمایا کہ یہ کلام ابراہیم علیہ السلام کے منہ سے نکلا تھا۔ رب قریب قیامت آفتاب مغرب سے نکالے گا۔ تاکہ ان کی بات نہ ٹلے۔ بلکہ حضرت خلیل کے فرزند جلیل رب کے مختار احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ نے خیبر میں علی کی نماز عصر کے لئے پچھم سے سورج نکال دیا۔ باپ کے فرمان کو فرزند نے پورا کر دکھایا۔ **تیسرا اعتراض:** سورج نہ مشرق سے مغرب کی طرف اور نہ مغرب سے مشرق کی طرف آتا جاتا ہے وہ تو اپنے محور پر گھومتا

جائے، خوف، خشیت، رہبت اور تقویٰ، ان سب کے معنی ڈرنا ہی ہیں، مگر بہت فرق کے ساتھ، خوف خدا شیطان کو بھی ہے، اس نے خود کہا تھا اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ (حشر:۱۶) چونکہ یہاں اتقوا کے بعد اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اس لئے اس کے معنی ہوئے اللہ تعالیٰ سے خوب ڈرو حَقَّ تُقٰتِہٖ یہ کلمہ اتقاء مصدر محذوف کا حال ہے، حق باطل کا مقابل نہیں بلکہ بمعنی استحقاق یا لائق، تقات اصل میں وقیۃ تھا، و، ت سے بدل گیا جیسے وَھْمٌ سے تُھَمَۃٌ اور وخَمٌ سے تُخَمَۃٌ اور ی الف بن گئی، زجاج فرماتے ہیں کہ تقاۃ و قاۃ اور اقاۃ تینوں طرح جائز ہے (تفسیر روح المعانی) یعنی ایسا ڈرنا ڈرو جو ڈرنے کا حق ہے یعنی رب تعالیٰ کی شان کے لائق یا تمہاری طاقت کے مطابق ہو وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ مسلم اسلام سے بنا جس کا مادہ ہے سلم بمعنی صلح، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ (انفال:۶۱) عرف میں فرمانبرداری واطاعت شعاری کو اسلام کہتے ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّہٗ لِلْجَبِیْنِ (صافات: ۱۰۳) اصطلاح شریعت میں کبھی بمعنی ایمان آتا ہے کبھی بمعنی اظہار ایمان اور کبھی بمعنی نیک اعمال اور دین محمدی کا نام بھی اسلام ہے یہاں بمعنی ایمان ہے یا دین محمدی، کیونکہ مرتے وقت اعمال ختم ہو جاتے ہیں، دین و ایمان باقی رہتا ہے، اسی لئے نماز جنازہ میں پڑھا جاتا ہے فَمَنْ اَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الْاِسْلَامِ الٰہی تو ہم میں سے جسے زندگی دے تو اسلام پر دے وَمَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْاِیْمَانِ اور ہم میں سے جسے موت دے تو ایمان پر دے یعنی اے مومنو ایمان کے سوا کسی اور حال پر نہ مرنا، جب بھی مرو تو اس حال پر مرنا کہ تم پہلے سے مسلم ہو، اسی لئے اِلَّا مُسْلِمِیْنَ نہ فرمایا (روح المعانی)

خلاصہ تفسیر

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے، صرف ایمان لا کر بے فکر نہ ہو جانا اور اپنے کو نیک اعمال سے بے نیاز نہ جان لینا بلکہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ایسے ڈرتے رہنا جو اس کی شان کے لائق ہو یا تمہاری حیثیت کے مطابق، اس کی شان کے لائق خوف تو یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، نافرمانی کبھی نہ کی جائے، اسے یاد رکھا جائے، بھولا کبھی نہ جائے، اس کا شکر کیا جائے، ناشکری کبھی نہ کی جائے وغیرہ یہ تقویٰ انبیائے کرام اور خصوصی اولیاء ہی کو نصیب ہوتا ہے، اور ہماری حیثیت کے لائق تقویٰ یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے گناہ سے بچیں، اور اگر گناہ ہو جائیں تو فوراً توبہ کر لیں رب تعالیٰ نصیب کرے، اور خیال رکھو کہ ہمیشہ مومن رہنا جب بھی تمہیں موت آئے تو بحالت ایمان آئے، ملک الموت تمہیں جان لینے کے وقت کافر نہ پائیں، مومن بارگاہِ الٰہی میں دولہا بن کر جاتا ہے، اور جان نکالنے والے فرشتے براتی ہوتے ہیں، کافر وہاں قیدی ہو کر جاتا ہے اور یہ فرشتے رب تعالیٰ کی پولیس، **خیال رہے:** کہ اس آیت کا آخری جملہ وَلَا تَمُوْتُنَّ الآیہ بالاتفاق محکم ہے مگر پہلا جملہ اتَّقُوا اللّٰہَ الخ اس میں اختلاف ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مسعود، عبداللہ ابن عباس، سعید ابن جبیر وغیرہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی، تو صحابہ کرام نے راتوں کو سونا چھوڑ دیا، نماز کے لمبے قیام سے ان کے پاؤں سوج گئے اور زیادہ سجدوں سے ان کی پیشانیاں زخمی ہو گئیں، تب

ربانی ان کے شامل حال نہیں۔ یہ آخری جماعت ہر چیز کو ظاہری حواس سے دیکھتی ہے۔ اور اسے بجز دنیا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ چونکہ انسان کی پیدائش مٹی سے ہے۔ اور مٹی ہمیشہ نیچے گرتی ہے۔ ایسے ہی نفسانی خواہشات انسان کو نیچے گراتے ہیں۔ وہ نفسانی قدم سے دنیاوی کمالات کی طرف بھاگتا ہے۔ اس طرح کہ اولاً جمع مال کو کمال سمجھ کر مالدار بنتا ہے پھر عزت وآبرو کو کمال جان کر حاصل کرتا ہے۔ پھر عہدے کو کمال جان کر ادھر دوڑتا ہے پھر سلطنت کو اعلیٰ درجہ کا کمال سمجھ کر اسے طلب کرتا ہے اور اگر موقع ملے تو نمرود کی طرح ساری دنیا کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ پھر بھی اس کی ہوس کی آگ نہیں بجھتی۔ اتنے کمالات حاصل کر کے اب عالم بالا کی طرف نظر اٹھاتا ہے۔ یعنی جس قدر اس کی غنا بڑھتی ہے اسی قدر ہوس کی آگ زیادہ بھڑکتی ہے۔ یہاں تک کہ سلاطین کو شکست دے کر رب العالمین سے مقابلہ کرتا ہے۔ اور اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (نازعات: ۲۴) کا دم بھرتا ہے۔ جیسا کہ نمرود کا حال ہوا کہ جتنا اس کا کمال بڑھا طغیان میں زیادتی ہوئی۔ مگر وہ طالبین جو قبضہ قدرت میں ہیں۔ اور تائید ربانی ان کی شامل حال ہے اور ان کے ہاتھوں میں کسی پیغمبر اور نائب پیغمبر عالم دین یا شیخ طریقت کا دامن ہے وہ ماسوی اللہ سے بچنے کو کمال جانتے ہیں۔ اولاً ہر چیز کو رب کی دلیل سمجھ کر اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ پھر اپنے ذرات وجود کو واجب الوجود میں فنا اور قطرۂ ہستی کو بحر احدیت میں گم کر دیتے ہیں۔ وہ بجائے اَنَا اُحْیِ وَ اُمِیْتُ کے یہ کہتے ہیں مَا فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا اللّٰهُ ان کا شیخ نمرود نفس کے دماغ کو الا اللہ کے ہتھوڑوں سے یہاں تک کوٹتا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لا کر طاغوت وجود ماسویٰ اللہ کا انکار کر بیٹھتا ہے۔ مگر رب تعالیٰ مشرکین کو اس میدان میں نہیں آنے دیتا۔ شرک ظلم عظیم ہے۔ عاقل کو چاہیے کہ دوئی کے شرک سے بچے اور زیادتی مال ومتاع سے دھوکہ نہ کھائے (روح البیان) خلاصہ یہ ہے کہ انسان مٹی سے بنا اور مٹی کی تین خصوصیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ طبعاً نیچے گرتی ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر کوئی پھینکنے والا اسے اوپر پھینکے تو اس کی طاقت سے اوپر جاتی ہے۔ تیسرا یہ کہ اگر اسے اوپر روکنے والی کوئی چیز نہ ہو تو نیچے لوٹ آتی ہے یہ ہی انسان کی حالت ہے کہ جب وہ اپنی رائے سے ترقی کرتا ہے تو نیچے ہی گرتا ہے اور گرنے کو کمال جانتا ہے۔ ہاں روحانیت والے شیخ کی امداد سے ترقی کرتے ہیں۔ لیکن اگر فیض ربانی شامل حال نہ ہو تو پھر گر جاتا ہے ورنہ کمال کو پہنچتا ہے۔ ایک پتھر پایا گیا جس پر تین سطریں لکھی تھیں۔ ۱۔ دنیا سے خوش ہونا اللہ سے دور ہونے کی نشانی ہے۔ ۲۔ اپنی چیز پر بھروسہ کرنا رب پر بھروسہ کم ہونے کی علامت۔ ۳۔ مصیبت میں لوگوں کی طرف رجوع کرنا رب کو نہ پہچاننے کی علامت ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا۔ شعر۔

شنیدم کہ جمشید فرخ سرشت — بسر چشمۂ بر بسنگے نوشت
بریں چشمہ چوں ما بسے دم زدند — برفتند چوں چشم برہم زدند
گرفتیم عالم بمردی و زور — ولیکن نہ بردیم با خود بگور
برفتند و ہر کس درود آنچہ کشت — نماند بجز نام نیکو و زشت

رب تعالیٰ ہمیں عمر لمبی اعمال نیک دینوی امیدیں تھوڑی اور عقل کامل اور حسن خاتمہ نصیب فرمائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نفسانی انسان چند چیزوں کو کمال سمجھ کر ان کے لئے دوڑتا ہے۔ مال، عزت، شہرت، حکومت، سلطنت، پھر الوہیت اور رحمانی انسان

اس کی تحقیق ہماری کتاب "الکلام المقبول فی طهارة نسب الرسول" میں ملاحظہ کرو، **پانچواں فائدہ:** ہر شخص کا تقویٰ اس کی حیثیت کے لائق ہے، طاقت بھر اعمال چاہئیں، امیر کے تقویٰ کے لئے زکوٰۃ و حج بھی ضروری ہے، فقیر کو ان سے معافی ہے جیسا کہ حَقَّ تُقٰتِهٖ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** اسلام میں خاتمہ اچھا ہونے کا اعتبار ہے اس سے پہلے کسی شئے پر اعتماد نہ چاہیے اللہ تعالیٰ خاتمہ اچھا نصیب فرمائے جیسا کہ وَلَا تَمُوْتُنَّ الخ سے معلوم ہوا، **ساتواں فائدہ:** مرتے وقت تک نیکیاں کرنا چاہئیں ایک دو بار کی نیکی پر قناعت نہ کرے یہ بھی وَلَا تَمُوْتُنَّ سے معلوم ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں سارے ہی مسلمانوں کو تقویٰ کا حکم دیا گیا، مسلمانوں میں بعض حضرات گناہوں سے محفوظ اور پہلے ہی سے متقی ہیں، انہیں اس آیت کا حکم کیونکر شامل ہوگا تحصیل حاصل محال ہے، **جواب:** ان کے حق میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تقویٰ پر قائم رہو، رب تعالیٰ فرماتا ہے يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ (احزاب:۱) اور فرماتا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا (نساء:۱۳۶) یعنی اے نبی یونہی اللہ سے ڈرے جاؤ اور اے مسلمانوں ایمان پر قائم رہو، یا یہ مطلب ہوگا کہ اس سے بھی اعلیٰ درجہ کا تقویٰ حاصل کرو، تقویٰ کے مختلف درجے ہیں جیسا متقی ویسا اس کا تقویٰ، **دوسرا اعتراض:** جن مفسرین نے حَقَّ تُقٰتِهٖ کو منسوخ نہیں مانا انہوں نے طاقت سے زیادہ کی تکلیف مان لی حالانکہ یہ قرآن شریف کے خلاف ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ:۲۸۶) کیونکہ خدا تعالیٰ کی شان کے لائق پرہیزگاری ہم سے ناممکن ہے، **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گذر گیا کہ ان بزرگوں نے حَقَّ تُقٰتِهٖ میں بندہ کی جانب کا خیال کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے اتنا ڈرو جتنا تم کو ڈرنے کا حق ہے یعنی جتنا تمہاری حیثیت کے لائق ہے، **تیسرا اعتراض:** لَا تَمُوْتُنَّ الخ سے معلوم ہوا کہ اسلام صرف موت کے وقت ضروری ہے اس سے پہلے انسان کیسا ہی رہے کیونکہ حال عامل ذوالحال سے مقارن چاہیے، **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرتے وقت تک مسلم رہو اسی لئے رب تعالیٰ نے نہ مُوْتُوْا مُسْلِمِيْنَ فرمایا اور نہ اِلَّا مُسْلِمِيْنَ بلکہ اتنی بڑی عبارت فرمائی اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ یعنی تمہیں موت صرف اس حال میں آئے کہ تم پہلے ہی سے مسلمان ہو، جیسے کہا جائے کہ زید میرے پاس نہ آیا مگر اس حال میں کہ وہ سوار تھا یعنی سوار پہلے سے تھا آیا اب، دوسرے یہ کہ آیت کا یہی منشاء ہے کہ مرتے وقت مسلمان ہوؤ، مگر یہ کیا علم کہ وقت موت کب ہے اور کونسا ہے، ہر سانس میں یہ احتمال ہے کہ وہ آخری ہو تو مطلب یہ ہے کہ مسلمانو مرتے وقت مسلمان ہونا یعنی ہر وقت مسلمان رہو، ممکن ہے کہ یہی وقت آخر ہو، شعر،

ہوائے رفتہ باز آید کہ ناید   نسیمے از حجاز آید کہ ناید

کیا، خبر کہ اندر گئی ہوئی سانس واپس آئے یا نہ آئے، کیا خبر کہ کل کی رات زمین پر آئے یا زمین میں، بہر حال ہر وقت

دے کر عرش پر چڑھایا۔ یا یہ کہ غوث پاک نے ملک الموت کی زنبیل چھین لی اور تمام قبض کردہ روحیں اس سے چھڑا دیں۔ یا حضور علیہ السلام نے معراج کی شب قاب قوسین میں پہنچ کر جب پردہ اٹھا کر دیکھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پردہ کے اندر سے بول رہے تھے یعنی وہ ہی خدا تھے نعوذ باللہ! ان انبیاء کرام میں سے حضرت عزیر علیہ السلام بھی ہیں جنہیں یہود خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ اور ان کے متعلق نہایت لغو و بیہودہ روایات گھڑ لی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کے کچھ صحیح حالات بیان فرمائے۔

تفسیر

اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ۔ اَوْ عاطفہ ہے۔ اور کاف یا اسمیہ ہے بمعنی مثل یا حرف تشبیہ کے لئے یا زائدہ یہ الذی پچھلی آیت کے اَلَّذِىْ حَآجَّ پر معطوف ہے۔ اور اَلَمْ تَرَ کا مفعول چونکہ دعویٰ ربوبیت کرنے والے بہت تھوڑے گزرے اور قیامت کے منکر بہت ہیں اس لئے اس آیت میں اَلَّذِىْ پر کاف نہ آیا۔ اور یہاں لایا گیا خیال رہے کہ اگر یہ کاف زائدہ ہو تب تو عطف میں کوئی دشواری نہیں۔ اور اگر زائدہ نہیں ہے تو عطف کی چند صورتیں ہیں۔ یا یہاں اَلَمْ تَرَ۔ پوشیدہ مان کر جملہ کو جملہ پر عطف کیا جائے یا وہاں بھی کاف پوشیدہ مانا جائے اس گزرنے والے میں اختلاف ہے کہ وہ کون تھے۔ بعض نے فرمایا کہ ارمیاء ابن حلقیا علیہ السلام تھے۔ جن کا لقب حضرت خضر ہے۔ آپ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ یہ ہی حضرت ابن عباس کا فرمان ہے (کبیر و خازن) مگر حضرت قتادہ اور عکرمہ ضحاک وغیرہم نے فرمایا کہ وہ حضرت عزیر ابن شرخیہ علیہ السلام تھے۔ یہ ہی قول زیادہ ترصحیح ہے۔ مَرَّ مرور سے بنا بمعنی گزرنا معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کہیں جا رہے تھے۔ راستہ میں یہ بستی پڑی عَلٰى قَرْيَةٍ قریۃ قریٰ سے بنا بمعنی جمع ہونا اسی لئے مہمان کے کھانے کو قری حیض کو قروء کہا جاتا ہے چونکہ بستی میں بھی ہر قسم کے انسان جمع ہوتے ہیں اسلئے اسے قریہ کہتے ہیں۔ اس کا استعمال گاؤں اور شہر دونوں کے لئے ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے بڑے شہروں کو کئی جگہ قریہ فرمایا ہے۔ مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (زخرف:۳۱) مکہ معظمہ اور طائف شریف کو قریہ فرمایا۔ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ (بقرہ:۵۸) یہاں بھی شہر ہی کے لئے استعمال ہوا۔ لہٰذا وہ جو حدیث شریف میں ہے کہ پہلا جمعہ قریہ جواثی میں ہوا وہاں بھی قریہ سے مراد شہر ہے نہ کہ گاؤں۔ اور اس حدیث کی بنا پر گاؤں میں جمعہ جائز نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی مکمل بحث ہمارے فتاویٰ نعیمیہ میں ملاحظہ فرماؤ۔ حق یہ ہے کہ قریہ مطلقاً بستی کو کہتے ہیں۔ بلکہ صرف شہر کو اور بدو گاؤں کو اس لئے گاؤں والوں کو بدو ہی کہا جاتا ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ کہ یہ کونسی بستی تھی۔ بعض نے فرمایا کہ یہ مقام داوردان تھا جو طاعون سے ویران ہوا تھا۔ بعض نے فرمایا کہ وہ سابرآباد تھا۔ جو فارس کا مشہور شہر ہے بعض نے فرمایا سلمہ آباد تھا۔ جو جرجان یا ہمدان کے متصل ہے بعض نے کہا کہ وہ دیر ہرقل تھا جو بصرہ اور عسکر مکرم کے درمیان ہے۔ بعض نے کہا وہ قریہ غصب ہے جو بیت المقدس سے دو کوس دور ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ وہ بستی خود بیت المقدس تھی جسے بخت نصر بادشاہ نے ویران کر دیا تھا (خازن) یعنی اے نبی کیا آپ نے ان کی مثل کو نہ دیکھا جو ایک بستی پر گزرے۔ وَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا خاویۃ خویٰ سے بنا بمعنی خالی ہونا کہا جاتا ہے۔ المرۃ یعنی عورت جننے سے فارغ ہو کر خالی ہو گئی جس گھر کی چھت گر جائے اسے بیت خاویہ کہتے ہیں کہ وہ بھی چھت سے خالی ہو گیا۔ عروش جمع عرش کی ہے بمعنی چھت چھپر ہر چھتی ہوئی چیز کو عرش کہا جاتا ہے۔ جس سے سایہ لیا جائے تخت کو بھی عرش اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اکثر چھتا ہوتا ہے علٰی یا بمعنی عن ہے یا اپنے ہی معنی میں اگر بمعنی عن ہو تو مطلب یہ ہے کہ وہ بستی چھتوں سے خالی تھی۔ فقط دیواریں کھڑی رہ

ہے، شعر

حضوری گرہمی خواہی ازو غائب مشو حافظ   متٰی ما تلق من تھوی دع الدنیا واھملھا

(روح البیان)

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

اور مضبوط پکڑلو اللہ کی رسی کو سارے اور نہ الگ الگ ہو جاؤ

اور اللہ کی رسی مضبوط تھام لو سب مل کر آپس میں پھٹ نہ جاؤ

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ

اور یاد کرو اللہ کی نعمت جو تم پر ہے جبکہ تم تھے

اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب تم

اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ

دشمن تو اللہ نے جمع فرما دیا درمیان تمہارے دلوں کے تو ہو گئے تم

میں بیر تھا اس نے تمہارے دلوں میں ملاپ کر دیا تو

بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ

رب کے فضل سے بھائی بھائی اور تھے تم کنارے پر آگ کے گڑھے کے

اس کے فضل سے تم آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور تم ایک غار

مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ

تو الگ کر دیا رب نے تم کو اس سے اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ

دوزخ کے کنارے پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے بچا دیا اللہ تم سے یوں

لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

تمہارے لئے اپنی آیتیں تاکہ تم ہدایت پاؤ

ہی اپنی آیتیں بیان فرماتا ہے کہ کہیں تم ہدایت پاؤ

فرمایا نہیں بلکہ تجھے سو برس گزر گئے اور اپنے کھانے اور پانی کو دیکھ کہ اب تک بو نہ لایا اور اپنے گدھے

اِلٰی حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ

اپنے کے اور تاکہ کریں ہم تم کو نشانی واسطے لوگوں کے اور دیکھو طرف ہڈیوں کے کیسے اٹھاتے ہیں ہم انکو پھر پہناتے ہیں

کو دیکھ (جس کی ہڈیاں تک سلامت نہ رہیں) اور یہ اس لئے کہ تجھے ہم لوگوں کے واسطے نشانی کریں اور ان ہڈیوں کو دیکھ کیونکر ہم انہیں

نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾

ہم ان کو گوشت پس جبکہ ظاہر ہوا واسطے اس کے تو کہا کہ جانتا ہوں میں کہ تحقیق اللہ اوپر ہر چیز کے قدرت والا ہے

اٹھان دیتے پھر انہیں گوشت پہناتے ہیں جب یہ معاملہ اس پر ظاہر ہو گیا بولا میں خوب جانتا ہوں کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے

تعلق

پچھلے جملہ میں حضرت عزیر علیہ السلام کے سو برس بعد زندہ ہونے اور وہاں مدت قیام کے اندازہ لگانے کا ذکر تھا۔ اب انہیں غلطی اندازہ پر متوجہ کرنے کا ذکر ہو رہا ہے کہ انہوں نے اندازہ میں غلطی کی اور ہم نے صحیح مدت بتائی۔

تفسیر

قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ قَالَ کا فاعل یا رب تعالیٰ ہے یا فرشتہ بَلْ اضراب کے لئے ہے جو دو کلاموں کے درمیان ہوتا ہے۔ اور اگلے کی نفی کر کے مابعد کو ثابت کرتا ہے۔ اس لئے یہاں لا پوشیدہ ہے۔ روح المعانی نے فرمایا کہ بَلْ سے پہلے۔ مَا لَبِثْتَ پوشیدہ ہے۔ اور بل عاطفہ اس کا مابعد جملہ اس پوشیدہ جملہ پر معطوف ہے۔ خیال رہے کہ لَبِثْتَ سے ان کے جسم شریف کا وہاں رہنا مراد ہے۔ نہ کہ جسم مع روح کا کہ روح تو نکال لی گئی تھی۔ یعنی رب نے فرمایا۔ کہ اے عزیر علیہ السلام آپ کا جسم شریف ایک دن نہیں۔ بلکہ سو سال یہاں رہا۔ چونکہ بعد موت روح کو جسم سے کچھ تعلق رہتا ہے۔ اس لئے جسم کے مقام کو ان کا مقام قرار دیا۔ جیسے زندگی میں بھی نیند یا غشی کی حالت میں انسان کو بے خبر بنا دیا جاتا ہے۔ کہ وہ جاگنے یا ہوش میں آنے کے بعد اپنے متعلق کچھ خبر نہیں رکھتا کہ میں کہاں رہا اور کتنا رہا ایسے ہی رب تعالیٰ نے انہیں اس زمانہ میں ایسا غیر متوجہ رکھا کہ آپکو پتہ نہ چلا کہ ہم یہاں کتنے دن رہے لہٰذا آیۃ پر یہ اعتراض نہیں کہ بعد موت انسان اپنی جگہ رہ کر جہاں اس کے روح کا مقام ہے۔ وہاں کے حالات تو جانتا ہی ہے پھر آپ کو برزخی حالات بھی کیوں یاد نہ آئے۔ رب نے اس وقت انہیں سب کچھ بھلا دیا تھا تاکہ اگلا کلام درست ہو۔ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ نظرٌ سے آنکھ سے دیکھنا مراد ہے نہ کہ فقط غور کرنا کیونکہ اس کے بعد الیٰ آ رہا ہے۔ نیز غذا اور پانی آنکھ سے ہی دیکھے جاتے ہیں۔ طعام سے مراد انگور و انجیر ہیں۔ اور شراب سے پینے کی چیز یعنی شیرہ انگور یا دودھ جسے وہ اپنے پاس رکھ کر سو گئے تھے۔ یعنی اپنی اس غذا اور شربت وغیرہ کی طرف دیکھو کہ لَمْ یَتَسَنَّهْ یہ لفظ یا سنوٌ ناقص واوی سے بنا۔ اور ہ وقفی ہے جیسے واقتدہ مالیہ سلطانیہ ماھیہ یا سِنَةٌ سے بنا اور ہ اصلی ہے۔ ان دونوں کے معنی برس اور سال ہیں۔ باب تفعل میں آ کر اس کے معنی ہوئے۔ کسی پر سال گزرنا۔ چونکہ چیز پرانی ہو کر گل سڑ جاتی ہے۔ اس لئے اصطلاح میں اس سے گلنا سڑنا بد بو دینا مراد ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ سِنَنٌ سے مشتق ہو بمعنی سڑ جانا مِنْ

اور بھٹکنے کا اندیشہ ہے، ایسے راستے اور تنگ زینہ پر مضبوط رسی باندھی جاتی ہے جسے پکڑ کر چلا اور چڑھا جا سکے، اس لئے رب تعالیٰ نے فرمایا تم سارے ہی اس رسی کو مضبوط پکڑ لو، پھر اس راستہ پر چلو اور اس زینہ پر چڑھو جَمِیۡعًا، اِعۡتَصِمُوۡا کے فاعل کا حال ہے یعنی جماعت کے ساتھ اس رسی کو پکڑ و، وَّلَا تَفَرَّقُوۡا یہ فرق سے بنا بمعنی بکھرنا وجدا ہونا جمعٌ کا مقابل ہے، اسی سے ہے افتراق فرقہ وتفرقہ، تفرقہ اور اختلاف میں فرق یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود جماعت قائم رہ سکتی ہے، مگر تفرقہ کے ساتھ جماعت قائم نہیں رہتی اور نہ ان کا باہمی تعلق رہتا ہے، چنانچہ صحابہ میں اختلاف تھا تفرقہ نہ تھا ہم میں اور شوافع و مالکیوں وغیرہ میں اختلاف ہے تفرقہ نہیں مگر بے دین جماعتوں اور ہم میں تفرقہ ہے، تفسیر کبیر نے فرمایا کہ یہاں تفرقہ سے مراد یا تو دینی علیحدگی ہے کہ حق ایک ہے اور باقی دین باطل ہیں یا وہ دنیاوی ونفسانی جنگیں ہیں جن سے الفت ومحبت ایک دم جاتی رہے یعنی آپس میں بکھر نہ جاؤ وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اُذۡکُرُوۡا ذکرٌ سے بنا، ذکر کے معانی فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ اَذۡکُرۡکُمۡ (بقرہ:۱۵۲) کی تفسیر میں بیان ہو چکے، یہاں ذکر سے مراد یا یاد کرنا ہے یا یاد رکھنا یا لوگوں میں چرچا کرنا یا اقرار واعتراف کرنا، نعمت کے معانی اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ (فاتحہ:٦) میں بیان ہو چکے، یہاں اتنا سمجھ لو کہ نعمت وہ اچھا عطیہ ہے جو بغیر استحقاق مل جائے، اسی سے انعام بنا، نعمت دنیاوی بھی ہوتی ہے دینی بھی، یہاں رب تعالیٰ نے پہلے اِذۡ کُنۡتُمۡ الخ میں دنیوی نعمت یعنی اتفاق واتحاد کا ذکر فرمایا، اور وَکُنۡتُمۡ عَلٰی شَفَا الخ میں اخروی نعمت کا، یہاں نِعۡمَتَ اللّٰہِ سے مراد یا اسلام ہے یا ان کا متفق ہو جانا، یا حضور انور ﷺ کی ذات گرامی کہ جن کے دم سے یہ ساری بہاریں ہیں، شعر

رب اعلیٰ کی نعمت پر اعلیٰ درود حق تعالیٰ کی منت پہ لاکھوں سلام
ہم غریبوں کے آقا پر دائم درود ہم فقیروں کی ثروت پہ لاکھوں سلام

اگر اُذۡکُرُوۡا میں انصار سے خطاب تھا تو عَلَیۡکُمۡ میں بھی انہی سے خطاب ہے کہ حضور انور ﷺ کے بعض خصوصی فیوض صحابیت، انصاریت جنگ کے بعد صلح وغیرہ انہی کو نصیب ہوئیں، اور اگر اُذۡکُرُوۡا میں عام مسلمانوں سے خطاب تھا تو عَلَیۡکُمۡ میں بھی ان ہی سے خطاب ہے کیونکہ حضور انور ﷺ کی عمومی نعمتیں ایمان، تقویٰ، اسلامی اتحاد وآگ سے نجات اور جنت کی نعمتیں ہم سب ہی کو ملیں اِذۡ کُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ، اوس وخزرج جو انصار کے دو قبیلوں کے مورث اعلیٰ ہیں آپس میں بھائی تھے لڑ پڑے، ان کی لڑائی اتنی دراز ہوئی کہ ان کی اولاد میں ایک سو بیس سال تک رہی، جن میں سے جنگ بعاث بڑی خونریز جنگ ہوئی، یہ صدیوں کے بچھڑے ہوئے حضور انور ﷺ کے دم قدم کی برکت سے آپس میں ایسے گھل مل گئے گویا جسم چند تھے لیکن جان ایک تھی، اس جگہ تفسیر خازن نے انصار کی گذشتہ جنگوں اور پھر دونوں بیعت عقبہ میں ان کی شرکتوں کا اور یہ کہ حضور انور ﷺ نے کس حکمت سے ان کو ملایا بہت تفصیل سے بیان کیا ہے وہاں ملاحظہ کرو، یہاں اتنا سمجھ لو کہ نبی کریم ﷺ نے سوید ابن صامت اور عمرو ابن عوف میں صلح اور بھائی چارہ ہجرت سے پہلے ہی کرا دیا پھر بتدریج سب کو ملا دیا، اَعۡدَآءً عدوٌ کی جمع ہے جو عدوٌ (بمعنی حد سے بڑھ جانا) سے بنا بروزن فعول صفت مشبہ ہے چونکہ دشمن دوستی کی حد سے بڑھ جاتا ہے اس لئے اسے عدو کہا جاتا ہے، دشمن جان کا بھی ہوتا ہے ایمان کا بھی، اولاد کا بھی، عزت کا بھی، مال کا بھی،

یہاں دن بھر یا اس سے کم ٹھہرا اجتہادی خطا تھی جو سورج کو دیکھ کر پیدا ہوئی۔ رب تعالیٰ نے انہیں فوراً اس خطا سے مطلع فرما دیا اس پر کوئی عتاب نہ فرمایا اس سے اجتہاد کے متعلق بہت سے مسائل نکل سکتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر اور حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ

بیت المقدس میں بنی اسرائیل آباد تھے۔ جب ان کا فسق و فجور نافرمانی و طغیانی حد سے بڑھا۔ اور انہوں نے پیغمبر وقت کی ہدایت پر عمل نہ کیا تو عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً چھ سو برس پیشتر بخت نصر بابلی نے بیت المقدس پر سخت حملہ کیا۔ ان کے ساتھ چھ لاکھ جھنڈے تھے۔ اور ہر جھنڈے کے ساتھ بے شمار فوج اس نے بیت المقدس کو ویران کر ڈالا۔ توریت شریف کے نسخے جلا دیئے بنی اسرائیل کے تین حصے کئے۔ ایک گروہ کو قتل کر ڈالا۔ دوسرے کو بہت ذلت و خواری سے شام میں رکھا۔ تیسرے کو قید کیا اس قیدی گروہ کی تعداد دس لاکھ تھی۔ ان قیدیوں کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ انہیں قیدیوں میں حضرت عزیر و دانیال علیہما السلام بھی تھے جو اس وقت بچے تھے۔ (روح البیان) جب بہت عرصہ بعد ان میں سے بعض لوگ قید سے چھوٹے تو حضرت عزیر علیہ السلام بیت المقدس پر گزرے جو اس وقت تک اجڑا پڑا تھا۔ آپ تمام شہر گھومے کوئی آدمی نہ ملا۔ مگر وہاں کے باغات قسم قسم کے میوے سے لدے ہوئے تھے۔ جن کا کوئی کھانے والا نہ تھا۔ آپ نے کچھ انگور اور انجیر توڑ کر کھائے اور کچھ انگوروں کا رس نکال کر پیا اور کچھ انگور و انجیر توشہ دان میں رکھ لئے اور تھوڑا سا شیرۂ انگور ساتھ لے لیا۔ حدود آبادی سے باہر نکل کر حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر بولے کہ رب تعالیٰ اسے کیونکر آباد کرے گا اور اب یہاں رونق کیسے ہوگی۔ منظور الٰہی یہ ہوا کہ اپنی قدرت کاملہ انہیں دکھائے آپ نے اپنے دراز گوش کو وہاں باندھ دیا۔ انجیر و انگور کا توشہ دان اپنے سرہانہ ایک جانب اور شیرۂ انگور کا برتن دوسری جانب رکھ کر خود آرام کے لئے لیٹ گئے۔ لیٹتے ہی نیند آ گئی اور سوتے میں جان نکال لی گئی گدھا بھی مر گیا۔ یہ واقعہ صبح کے وقت ہوا۔ رب تعالیٰ نے بخت نصر بادشاہ کو نمرود کی طرح مچھر سے ہلاک فرما دیا۔ باقی بنی اسرائیل کو آزادی مل گئی۔ ستر برس کے بعد حق تعالیٰ نے شاہان فارس میں سے کسی کو مسلط کیا۔ جو اپنی فوجیں لے کر بیت المقدس پہنچا۔ اور اس کو پہلے سے بھی بہتر طریقہ پر آباد کیا بکھرے ہوئے بنی اسرائیل پھر وہاں آکر آباد ہو گئے۔ اور تیس سال کے عرصہ میں یہ لوگ بہت بڑھ گئے۔ حق تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کے جسم شریف وغیرہ کو ایسا غائب فرما دیا کہ نہ تو آپ کو کسی انسان نے دیکھا نہ کسی چرند و پرند و درند جانور نے جب آپ کی وفات کو سو سال پورے ہو گئے تب آپ کو زندہ کیا گیا۔ اولاً آنکھ کھلی آپ نے اپنے سارے جسم کو بے جان پایا۔ پھر آپ کے دیکھتے دیکھتے سارا جسم شریف زندہ ہو گیا۔ یہ واقعہ شام کے وقت ہوا۔ تب رب نے پوچھا کہ آپ یہاں کتنی مدت رہے۔ آپ نے خیال فرمایا کہ یہ وہ ہی دن ہے جب میں لیٹا تھا۔ تو اندازاً فرما دیا۔ کہ ایک دن بلکہ اس سے بھی کچھ کم چونکہ آپ اپنے خیال و اندازے کی حکایت فرما رہے تھے۔ نہ کہ واقعہ کی یعنی میرا اندازہ یہ ہے کہ میں دن بھر یہاں رہا۔ اس لئے نہ یہ کلام جھوٹ ہے اور نہ آپ کا ایسے بولنا کذب' کلام بھی سچا ہے اور آپ کا بولنا بھی حق جیسے کہا جاتا ہے۔ زَيْدٌ قَائِمٌ فِيْ ظَنِّيْ۔ میرے خیال میں زید کھڑا ہوا ہوگا لہٰذا اس جواب میں یہ سوال نہیں ہو سکتا کہ غلط بات پیغمبر کی زبان پر کیوں آئی اس لئے رب نے اس جواب پر عتاب نہ فرمایا بلکہ واقعہ کی طرف متوجہ کر دیا۔ یا کہو کہ

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو چار چیزوں کا حکم دیا، دین پر متفق رہنا، فرقہ فرقہ نہ بننا، اللہ کی اس نعمت کو یاد کرنا کہ وہ پہلے دشمن تھے اب دوست بن گئے، اور یہ کہ وہ دوزخ کے کنارے جا لگے تھے، وہاں سے ہٹ گئے، یعنی اے اوس وخزرج یا اے سارے مسلمانو اللہ کی رسی یعنی دین اسلام یا قرآن شریف یا مسلمانوں کی جماعت یا اہل بیت اطہار یا نبی کریم ﷺ کے دامن پاک کو تم سارے کے سارے مضبوطی سے تھامے رہو تاکہ دنیا میں راہ حق سے پھسل نہ جاؤ اور بآسانی معرفت الٰہی کے تنگ زینہ پر چڑھ جاؤ، ہرگز ہرگز فرقوں اور جماعتوں میں بکھر نہ جاؤ کہ بکھرے ہوئے تنکے کوڑا ہیں جس کو بندھے ہوئے تنکے جھاڑو کی شکل بن کر نکال باہر کرتے ہیں، اگر تم فرقوں میں بٹ کر آپس میں لڑتے بھڑتے رہے تو دوسری متفق قومیں تمہیں دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی کوشش کریں گی اور تم اللہ کی یہ نعمت دل میں سوچتے رہو یا زبان سے اس کا ذکر کرتے رہو یا لوگوں میں اس کا چرچا کرتے رہو کہ پہلے تم آپس میں ایک دوسرے کے جانی ومالی اور آبرو کے دشمن تھے جس سے تمہاری زندگیاں تلخ تھیں رب تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کے ذریعہ تمہارے دلوں کو جوڑ دیا جس سے تم دشمنی کے بعد ایک دوسرے کے دلی دوست اور دینی بھائی بن گئے اور رب تعالیٰ نے تم پر دینی فضل یہ فرمایا کہ تم اپنے کفر وشرک وبے دینی کے باعث دوزخ کے کنارے جا لگے تھے کہ وہاں پہنچنے میں آنکھ بند ہونے کی دیر تھی، رب تعالیٰ نے تمہاری دستگیری کی کہ انہی محبوب کے ذریعہ تم گرتوں کو سنبھال لیا، پہلے تم کافر تھے، اب تم فقط مومن ہی نہیں بلکہ مومن گر بن گئے کہ لوگ تمہارے نقشِ قدم پر چل کر ہدایتیں حاصل کیا کریں گے اللہ تعالیٰ قرآن کی آیتیں یا نشاناتِ قدرت یا اپنی نعمتوں کے تذکرے اسی طرح کرتا رہے گا تاکہ تم ہدایت پر قائم رہو یا نیکیوں کی ہدایت پاؤ،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** مسلمانوں کو اتفاق واتحاد سے رہنا چاہیے، تھوڑی سی متفق قوم بہت سی بکھری قوم پر غالب رہتی ہے، اسی لئے قرآن وحدیث نے اتفاق پر بہت زور دیا ہے بلکہ جماعت کی نمازیں، عیدین کے اجتماعات، حج میں سارے مسلمانوں کو ایک جگہ جمع کرنا اس اتفاق کے لئے ہے جیسا کہ وَلَا تَفَرَّقُوْا سے معلوم ہوا،

دوسرا فائدہ: اتفاق وہ اچھا ہے جو اللہ رسول کی اطاعت پر ہو، ان کا راستہ چھوڑ کر اتفاق لعنت ہے، اسی اتفاق کو مٹانے کے لئے انبیائے کرام علیہم السلام تشریف لائے، رب تعالیٰ فرماتا ہے كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ الآیہ (بقرہ: ۲۱۳) جیسا کہ وَاعْتَصِمُوْا سے معلوم ہوا، یعنی متفق ہو جاؤ مگر کس پر؟ دین کی رسی پکڑنے پر، **تیسرا فائدہ:** مسلمانوں میں فرقہ بندی کرنا سخت جرم ہے اور اس کا ذمہ دار وہ ہوگا جو فرقے ایجاد کرے گا جیسا کہ لَا تَفَرَّقُوْا سے معلوم ہوا،

چوتھا فائدہ: اللہ تعالیٰ کی نعمت یاد کرنا، اس کے چرچے کرنا رب تعالیٰ کو پسند ہے جیسا کہ واذکروا الخ سے معلوم ہوا، لہٰذا میلاد شریف کرنا، عید معراج منانا بہت بہتر ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا عملی تذکرہ ہے، **پانچواں فائدہ:** بکھرے دلوں کو جوڑنا سنت الہیہ ہے جیسا کہ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ الخ (آل عمران: ۱۰۳) سے معلوم ہوا، مبارک ہے وہ شخص

خزائن عرفان وجمل وخازن وروح وغیرہ)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** قدرت الٰہی پر حیرت وتعجب کرنا گناہ نہیں۔ انکار کرنا جرم ہے کیونکہ حیرت بشری کمزوری سے ہے۔ نہ کہ رب کی قدرت کے انکار سے دیکھو پیغمبر نے حیرت کی۔ **دوسرا فائدہ:** انبیاء کرام کی بارگاہ الٰہی میں وہ عزت ہے کہ سبحان اللہ رب تعالیٰ ہر طرح ان کی تسلی تشفی فرماتا ہے۔ دیکھو حضرت عزیر نے تعجب ہی کیا تھا کہ تسلی کر دی گئی کیونکہ یہ تو دنیا کی تسلی کرنے آتے ہیں۔ اگر خود ان کو حیرت وتعجب رہے تو دوسروں کی تشفی کیسے کریں۔ **تیسرا فائدہ:** داعی کے مراتب اور آداب دعا کے لحاظ سے دعا کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت عزیر کی تسلی سو برس بعد کی گئی۔ مگر حضرت ابراہیم کی تسلی فوراً ہی کر دی گئی جس کا قصہ اگلی آیت میں ہے۔ **چوتھا فائدہ:** اللہ تعالیٰ حضرات انبیاء کی خواہش کو پورا فرما دیتا ہے۔ انہیں منہ سے دعا مانگنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ دیکھو حضرت عزیر علیہ السلام نے بیت المقدس کی آبادی کی صراحۃً دعا نہ کی صرف حیرت کا اظہار کیا۔ ہاں دل میں تمنا ضرور تھی کہ یہ شہر پھر آباد ہو جائے رب تعالیٰ نے ان کی تمنا کس شاندار طریقہ سے پوری فرما دی حضور ﷺ نے تبدیل قبلہ کی دعا نہ کی صرف شوق وحی میں آسمان کو دیکھا۔ کہ تبدیلی قبلہ واقعہ ہوگئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرودی آگ سے بچنے کی دعا نہ کی صرف دل میں آرزو تھی کہ رب نے انہیں آگ کے شر سے صرف بچا نہ لیا بلکہ آگ کو ہی ٹھنڈا وسلامت کر دیا۔ یہ ہے ان کی محبوبیت۔ **پانچواں فائدہ:** کسی شخص کا ایمان نبی کے ایمان کی مثل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ سب کا ایمان بالغیب ہے۔ مگر نبی کا ایمان بالشہادۃ بھی ہے۔ ان حضرات کے لئے اکثر غیوب مشاہدہ کرا دیئے جاتے ہیں۔ دیکھو مر کر جینے پر ہم سب کا ایمان بالغیب ہے۔ مگر حضرت عزیر وابراہیم وعیسیٰ علیہم السلام کا ایمان بالشہادہ کہ انہوں نے مردے جیتے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہمارے حضور ﷺ نے تو سارا عالم الغیب حتیٰ کہ رب تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ نیز ہمارے ایمان علم حصول ان کا ایمان علم حضوری کیونکہ نبوت ان کی اپنی صفت ہے۔ اور اپنی ذات وصفات کا علم حضوری ہوتا ہے نیز ہم محض مومن ہیں۔ مگر وہ حضرات مومن بھی اور ایمان بھی کہ ان کا ماننا ہمارے ایمان کا رکن ہے۔ ہمارے کلمہ میں حضور انور کا نام ہے حضور ﷺ کے کلمہ میں ہمارا نام نہیں کہ وہ میرا امتی ہے۔ **چھٹا فائدہ:** بعد موت اور قبل پیدائش کا زمانہ عمر میں محسوب نہیں ہوتا۔ دیکھو حضرت عزیر نے چالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ سو سال بعد جب زندہ ہوئے تو وہ ہی چالیس سال عمر شریف تھی۔ اسی کو رب نے آیت فرمایا کہ والد چالیس سال کے اور فرزند ایک سو اٹھارہ سال کے بلکہ داد جوان اور پوتے بوڑھے۔ تفسیر خازن نے فرمایا کہ حضرت عزیر کے بال کالے تھے اور آپ خوب جوان اور آپ کے پوتوں کے بال سفید اور وہ بالکل بوڑھے تھے۔ یہ قدرت رب کی عجیب نشانی ہے۔ **قرآنی معمہ:** وہ کون صاحب ہیں جو خود چالیس سالہ جوان اور ان کے فرزند ایک سو بیس سالہ اور پوتے نوے سالہ بوڑھے۔ **جواب:** وہ حضرت عزیر علیہ السلام ہیں۔ جنہوں نے سو سال کی مدت زمانہ موت میں گزاری اور جب زندہ ہوئے تو خود جوان تھے۔ مگر آپ کی اولاد بڈھی۔ **ساتواں فائدہ:** کبھی فساق کی وجہ سے بے گناہوں پر بھی مصیبت آ جاتی ہے دیکھو بنی اسرائیل کے فساق کی وجہ سے بے گناہ بچے بھی بخت نصر کی مصیبت میں گرفتار ہوئے

تفسیر صوفیانہ

کنوئیں میں صاف شفاف پانی بھی ہوتا ہے اور کیچڑ ریت وغیرہ بھی، کنوئیں کا پانی حاصل کرنے کے لئے ڈول ڈالا جاتا ہے مگر اس طرح کہ اس میں رسی باندھی جاتی ہے اس طرح کہ اس کا ایک کنارہ ڈول میں بندھا ہوتا ہے اور دوسرا کنارہ مالک کے ہاتھ میں، اگر یہ رسی ٹوٹ جائے یا مالک چھوڑ دے یا ڈول میں سے کھل جائے تو یقیناً ڈول بجائے پانی لانے کے خود کنوئیں میں رہ جائے گا اور کیچڑ میں پھنس جائے گا، دنیا ایک کنواں ہے جس میں ایمان، اعمال اور تقویٰ کا شفاف پانی بھی ہے اور کفر، طغیان و فسق کی کیچڑ بھی، ہم لوگ یہاں اعمال کا پانی حاصل کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں، کیونکہ دارالعمل دنیا ہی ہے، قبر میں بعض مقبولین نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور قرآن حکیم بھی، مگر صرف لذت کے لئے، اس نماز و تلاوت پر کوئی ثواب نہیں اسی لئے زندہ لوگ انہیں ایصال ثواب کرتے رہتے ہیں، اب ضرورت تھی کہ ہم لوگوں کے ہاتھ میں کوئی ایسی مضبوط رسی ہو جس کا ایک کنارہ مخلوق کی طرف ہو دوسرا خالق کی طرف، اور پختہ ایسی ہو کہ تمام جہان اسے پکڑے مگر وہ نہ ٹوٹے نہ کھلے، اس مضبوط رسی کا نام **محمد رسول اللہ** ہے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جن کا ایک رخ مخلوق کی طرف ہے دوسرا خالق کی طرف، ہمارا ہاتھ حضور ﷺ کے ہاتھ میں ہے اور حضور ﷺ کا ہاتھ رب تعالیٰ کے دستِ قدرت میں، جو دنیا میں حضور انور ﷺ سے وابستہ رہا وہ تو یہاں سے ایمان، تقویٰ کا پانی لے کر جائے گا، جو ان سے الگ رہا وہ یہیں بے ایمانی، کفر و فجور کے دلدل میں پھنسے گا، اس آیت میں یہی فرمایا گیا کہ اے انسانو اللہ کی اس مضبوط رسی کو پکڑ لو رسی کھلے گی نہیں ہم اسے چھوڑیں گے نہیں، اپنے پکڑنے کی تم فکر کر لو، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان سے وابستہ رکھے،

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ
اور چاہئے کہ ہو تم میں سے ایک جماعت جو بلائے طرف بھلائی کے اور حکم دیں
اور تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے کہ بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھی
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٤﴾
وہ اچھی بات کا اور منع کریں بری باتوں سے اور یہ ہی لوگ وہ کامیاب ہیں
بات کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور یہ ہی لوگ مراد کو پہنچے

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیت سے کئی طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں مسلمانوں کو کامیابی کے دو اصول بتائے گئے، تقویٰ و طہارت اختیار کرنا، اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑنا، اب کامیابی کا تیسرا اصول بتایا جا رہا ہے یعنی اسلام کی تبلیغ کرنا، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو رب تعالیٰ نے ایک خاص نعمت یاد دلائی، ان کی دشمنیاں ختم ہو جانا اور آپس میں بھائی بھائی ہو جانا، اب اس کے شکریہ کا حکم دیا جا رہا ہے کہ اس نعمت کا شکریہ یہ ہے کہ تم دوسروں کو بھی دعوتِ اسلام دے کر

نماز۔ اور یہاں دونوں قسم کے دن کا اثر موجود تھا۔ کہ گدھے پر سو سال گزر گئے تھے اور کھانے شربت پر ایک دن ہی گزرا تھا۔ لہٰذا عزیر علیہ السلام کا اسے ایک دن فرمانا بھی درست تھا اور رب کا سو سال فرمانا بھی ٹھیک تھا۔ وہ حس کے لحاظ سے تھا۔ اور یہ حقیقت کے لحاظ سے اور یہ بھی معجزہ کے طور پر ہوا۔ اگر یہ حضرات بعد وفات اس جہان سے بے خبر تھے۔ تو انہیں حضور ﷺ کے حج اور معراج کی کیسے خبر ہوئی۔ کہ حضور ﷺ کے حج میں حضرت یونس علیہ السلام و دیگر انبیاء شریک ہوئے۔ اور معراج میں سارے نبیوں نے حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی۔ انہیں کیا خبر تھی کہ اس دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ۔ (زخرف: ۴۵) اے محبوب اگلے رسولوں سے پوچھ لو۔ کیا ہم نے رب کے سوا اور معبود مقرر کئے۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ گذشتہ نبیوں سے ملاقات بھی کرتے ہیں ان سے گفتگو بھی۔ تب ہی تو ان سے پوچھا جا سکتا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے عذاب سے ہلاک شدہ قوم سے کلام فرمایا ہے۔ رب فرماتا ہے۔ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ الخ (اعراف: ۹۳) ہمارے حضور ﷺ نے جنگ بدر کے بعد ابو جہل امیہ ابن خلف وغیرہم کی نعشوں سے کلام فرمایا کہ بولوں میں سچا ہوں یا نہیں۔ اب تمہیں میری حقانیت معلوم ہوئی یا نہیں۔ غرض کہ سماع موتی اور حیات اموات پر بیشمار دلائل قائم ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

بہت سے لوگ حشر ارواح کے معتقد ہیں حشر اجسام کے منکر وہ کہتے ہیں کہ روح کو جسموں میں کمال حاصل کرنے کے لئے ایسا بھیجا گیا تھا۔ جیسے بچہ کو مکتب میں علم حاصل کرنے کے بعد میں بچہ کو دوبارہ مدرسہ میں نہیں بھیجتے۔ بلکہ دفاتر و اعلیٰ مقامات پر ایسے ہی جب روح بقدر استعداد شر یا خیر کما کر جسم سے نکل گئی۔ تو اب دوبارہ اسے جسم میں ڈالنا اور اس حجرہ میں قید کرنا خلاف حکمت ہے۔ صرف روح کو ہی جنت یا دوزخ میں جانا چاہیے۔ رب نے اپنے کمال فضل و رحمت سے عزیر علیہ السلام اور ان کے گدھے کو موت دے کر غذا اور شراب کو محفوظ اور گدھے کے جسم کو خاکستر کر کے اس شک کا جواب سمجھا دیا۔ روح گویا عزیر ہے جسم گویا گدھا۔ شراب گویا عشق ہے اور غذا اس کے اعمال۔ جیسے کہ عزیر علیہ السلام کا جسم شریف اور غذا شراب محفوظ رکھا گیا۔ اور گدھا خاکستر کر دیا گیا۔ پھر دوبارہ گدھے کو زندہ کر کے انہیں بیت المقدس میں داخل کیا گیا۔ ایسے ہی جب عزیر روح کو حیات بخشی جائے گی تو اس کے ساتھ اس کا دراز گوش (جسم) بھی زندہ کیا جائے گا اور اسکے اعمال وعقائد بعینہ اس عالم میں محفوظ ملیں گے۔ پھر جہاں روح پہنچے گی وہاں اسکا جسم بھی کہ جب جسم اعمال کے وقت روح کے ساتھ رہا تو جزا اور سزا کے وقت بھی ساتھ ہی رہنا چاہیے کیونکہ جسم اس کی سواری ہے۔ عارفین کی روح تجلی جلال و جمال کے جام پئے گی۔ اور وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (الدھر: ۲۱) کا ظہور ہوگا۔ تب جسم جنت کے باغوں میں چرے گا۔ اور کوثر و سلسبیل کے حوضوں سے پانی پئے گا (تفسیر روح البیان و ابن عربی) خیال رہے کہ نیک اعمال دو قسم کے ہیں۔ نفسانی و رحمانی نفسانی وہ ہیں جو رضاء رحمان کے لئے کئے جاویں۔ ریا۔ نام۔ نمود۔ حصول دنیا ان کا مقصد ہے۔ اور رحمانی وہ ہیں جو رضاء رحمان کے لئے کئے جائیں یعنی اخلاص خشوع وخضوع ان میں داخل ہو۔ چونکہ جسم کو فنا ہے لہٰذا جسمانی اعمال کو بھی فنا یہ اعمال برباد ہو جائیں گے۔ رب فرماتا ہے۔ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (فرقان: ۲۳) حدیث شریف میں ہے کہ ریا

نفرت پیدا کرنا، اس لئے آگے ارشاد ہوا وَ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ یامرون امرٌ سے بنا بمعنی حکم، اس میں حکم دینا، رغبت دینا، مشورہ دینا، سختی سے منوانا، غرضکہ جیسا موقعہ ہو ویسا کرنا سب کچھ شامل ہے معروف ہر وہ عقیدہ و عمل ہے جس کی خوبی و بہتری شریعت میں معلوم و مشہور ہو، یہ لفظ عرف بمعنی پھیلنے سے بنا، اسی لئے خوشبو کے مہکنے کو عرف اور شہرت کو عرف کہا جاتا ہے کہ وہاں پھیلنا موجود ہے، مشہور کو معروف کہتے ہیں معرفۃ بھی اسی سے ہے بمعنی پہنچانا، کہ عام پہچانی ہوئی چیز لوگوں میں پھیل جاتی ہے، شریعت میں معروف کے معنی ہیں الذی عرف خیریتہٗ فی الدین جس کا اچھا ہونا دین میں پہچانا گیا ہو، جتنے احتمالات ہم نے امر میں عرض کئے، اس کے مقابل اتنے ہی احتمالات نہی میں ہیں یعنی زبان و قلم و عمل و طاقت کے ذریعے روکنا منع کرنا، نفرت دلانا، منکر انکار سے بنا بمعنی منع کرنا، ناپسند کرنا اور شریعت میں وہ ہر چیز منکر ہے جو شرعاً ممنوع یا ناپسند ہو یعنی وہ جماعت لوگوں کو اچھی باتوں کی طرف دعوت دے اور بری باتوں سے منع کرے اور روکے وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ اُولٰٓئِكَ میں اسی مبلغ جماعت کی طرف اشارہ ہے هُمْ حصر کے لئے ارشاد ہوا، اور اَلْمُفْلِحُوْنَ میں الف لام عہدی ہے اور مفلح فلاح سے بنا بمعنی مقصد وری اور کامیابی یعنی یہ تبلیغ کرنے والے لوگ ہی کامل کامیابی والے ہیں کہ دنیا میں بھی ان کی عزت و عظمت ہے، بادشاہ و سلاطین ان کی غلامی کریں گے اور آخرت میں بھی ان پر رب تعالیٰ کا خاص کرم ہوگا،

خلاصہ تفسیر

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے تین چیزوں کا مکلف فرمایا، بھلائی کی دعوت دینا، اچھی باتوں کا حکم دینا، بری باتوں سے حتی الامکان روکنا، اور ان تین چیزوں پر دارین کی کامیابی کا وعدہ فرمایا، اس آیت کریمہ کی دو تفسیریں ہیں ایک یہ کہ اے مسلمانو تم سب ایسی جماعت ہو یا بنو یار ہو جو تمام ٹیڑھے لوگوں کو خیر کی دعوت دے، کافروں کو ایمان کی، فاسقوں کو تقویٰ کی، غافلوں کو بیداری کی، جاہلوں کو علم و معرفت کی، خشک مزاجوں کو لذت عشق کی، سونے والوں کو بیداری کی، اور اچھی باتوں، اچھے عقیدوں، اچھے عملوں کا زبانی، قلمی، عملی، قوت سے، نرمی سے، گرمی سے حکم دے، اور بری باتوں، برے عقیدے، برے کاموں، برے خیالات سے لوگوں کو زبان، دل، عمل، قلم، تلوار سے روکے، جس جماعت میں یہ تین خوبیاں ہیں وہ ہی پورے طور پر کامیاب ہے لہٰذا تم سب کے سب ہی کامیاب ہوؤ گے اس کی تفسیر وہ آیت کریمہ ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۱۰) جس سے معلوم ہوا کہ سارے مسلمان مبلغ ہیں اور سب پر ہی فرض ہے کہ لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں،

دوسری تفسیر

یہ ہے کہ اے مسلمانو نہ تو تم سب دنیا میں ہی مشغول ہو جاؤ کہ تبلیغ چھوڑ دو، اور نہ تم سب دنیا چھوڑ کر مبلغ ہی بن جاؤ بلکہ تم میں ایک جماعت ایسی بھی رہنی ضروری ہے جو زندگی بھر تبلیغ اور دعوت خیر کرے، پوری عالم بنے اور اپنا مقصد زندگی اسے بنائے کہ لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم دے اور بری باتوں سے روکے، سارے مسلمانوں میں یہ مبلغ علماء کی جماعت بہت ہی کامیاب ہے کہ دنیا میں بھی اس کی عزت ہوگی اور آخرت میں بھی اسے عظمت ملے گی، اس معنی کی تفسیر وہ آیت ہے، فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ

فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ (توبہ: ۱۲۲) جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ ہر مسلمان پر پورا عالم بننا فرض نہیں بلکہ ان میں ایک جماعت علماء کی بھی چاہیے، جب ہر شہر میں طبیب، حاکم، مستری، دکاندار وغیرہ ضرور ہونے چاہئیں، تو ہر شہر میں عالم بھی ضرور ہونا چاہیے کہ ان سے دنیاوی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور عالم سے دینی حاجت روائی ہوتی ہے،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** اسلام میں تبلیغ بڑی اہم عبادت ہے کہ تمام عبادتوں کا فائدہ خود اپنے کو ہوتا ہے مگر تبلیغ کا فائدہ دوسروں کو بھی، لازم سے متعدی افضل ہے، درہ بنت ابولہب سے روایت ہے کہ کسی نے حضور انور ﷺ سے پوچھا کہ بہترین بندہ کون ہے؟ فرمایا اچھی باتیں بتانے والا، برائیوں سے روکنے والا، اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور صلہ رحمی کرنے والا، حضرت حسن فرماتے ہیں کہ جو اچھی باتوں کا حکم دے، برائیوں سے روکے، وہ اللہ تعالیٰ کا بھی خلیفہ ہے اس کے رسول کا بھی، اس کی کتاب کا بھی، اگر مسلمانوں نے تبلیغ چھوڑ دی، تو ان پر ظالم بادشاہ مسلط ہوں گے اور ان کی دعائیں قبول نہ ہوں گی (روح المعانی) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اے لوگو بھلائی کا حکم دو، برائی سے منع کرو تمہاری زندگی بخیر گذرے گی، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ تبلیغ بہترین جہاد ہے (تفسیر کبیر) **دوسرا فائدہ:** جیسے تبلیغ کرنا بہترین عبادت ہے ایسے ہی تبلیغ چھوڑ دینا بدترین جرم اور چھوڑنے والا ذلیل وخوار جیسا کہ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کے حصر سے معلوم ہوا، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جو بھلائی کا حکم نہ دے اور برائی سے نہ روکے وہ اوندھا لٹکایا جائے گا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی مثال ایک جہاز کے سواروں کی طرح ہے کہ اگر ایک شخص جہاز کا تختہ توڑ دے دوسرے اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو سب ہی ڈوبیں گے، سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ جو اپنے پرائے اور سارے پڑوسیوں اور دوستوں کا محبوب ہو وہ مداہن اور دین میں پلپلا ہے، دیندار کی پہچان یہ ہے کہ اس سے پرہیزگار راضی ہوتے ہیں اور فساق، فجار، کفار اس سے ناراض (تفسیر کبیر) صحابہ کرام پر آج تک بے دین تبرا کرتے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ وہ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (فتح: ۲۹) تھے اور رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (فتح: ۲۹) **تیسرا فائدہ:** مناسب یہ ہے کہ تبلیغ پہلے نرمی سے کی جائے پھر سختی سے جیسا کہ يَدْعُوْنَ کے عموم سے معلوم ہوا، رب تعالیٰ نے لڑنے والے مسلمانوں کے متعلق فرمایا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدٰهُمَا عَلَى الْأُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ الآیہ (حجرات: ۹) یعنی پہلے تو ان میں صلح کرانے کی کوشش کرو، اگر اس سے کام نہ چلے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو، نافرمان بیویوں کے بارے میں فرمایا وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ (النساء: ۳۴) معلوم ہوا کہ ایسی بیوی کی اصلاح پہلے بائیکاٹ سے کی جائے، جب اس سے کام نہ چلے تب سزا دی جائے، **چوتھا فائدہ:** مطلقاً تبلیغ ہر مسلمان کے ذمہ ہے جو مسئلہ اسے معلوم ہو دوسرے ناواقف کو بتائے جیسا کہ منکم کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** پورا مبلغ بننا اور اپنے کو تبلیغ کے لئے وقف کر دینا ہر مسلمان پر لازم نہیں، بعض کر لیں کافی ہے جیسا کہ مِنْكُمْ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** تبلیغ بقدر

مچھلیاں اس کا گوشت نوچتی ہیں۔ اور جب ہٹ جاتا ہے تو اسے درندے کھاتے ہیں۔ اور اس کے بعد چیل کوے وغیرہ اسے نوچتے ہیں۔ تو عرض کیا کہ مولیٰ تو ان مختلف جانوروں کے پیٹ سے اسے کیسے نکال کر زندہ فرمائے گا کہ ایک جانور کا گوشت چرندے۔ پرندے۔ تیرندے جانوروں میں تقسیم ہو گیا۔ پھر ان مقامات سے جمع کیسے ہوگا۔ نیز ایک ہی پیٹ میں سینکڑوں جانوروں کے اجزاء پہنچ جاتے ہیں۔ مرغ۔ بٹیر۔ بکری۔ گائے۔ بھینس وغیرہ سب کو کھائے جاتے ہیں۔ ایک ایک پیٹ گویا قبرستان بنا ہوا ہے۔ اس صورت میں اجزاء جسم کیونکر جمع ہوں گے۔ ۲۔ جب آپ کا مناظرہ نمرود کے ساتھ ہوا اور اس نے قتل کو موت دینا اور معافی کو زندہ کرنا سمجھا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ میرا رب مرے ہوئے کو زندہ فرماتا ہے۔ وہ بولا کہ کیا کبھی آپ نے یہ دیکھا ہے تب آپ نے یہ دعا کی تاکہ آئندہ کبھی بے دین سے اس قسم کا مناظرہ ہو جائے تو آپ احیاء موتیٰ کی عینی شہادت دے سکیں۔ حضرات انبیاء کے لئے ایمان بالغیب ضروری نہیں ان کو ایمان بالشہادہ بھی ہوتا ہے۔ ۳۔ رب تعالیٰ نے آپ کی خدمت میں ملک الموت کے ذریعہ خوشخبری بھیجی کہ آپ علیہ السلام کو رب نے خلیل بنایا۔ آپ نے پوچھا کہ اس کی علامت کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ کی دعا سے مردے زندہ ہوں گے۔ تب آپ نے یہ دعا فرمائی۔ ۴۔ آپ سے بعض لوگ سوال کرتے تھے کہ مردے کیونکر زندہ ہوں گے۔ تب آپ نے انہیں دکھانے کے لئے رب سے دعا کی۔ ۵۔ آپ نے صحیفوں میں پڑھا تھا کہ میری اولاد میں عیسیٰ علیہ السلام مردے زندہ کریں گے۔ تو رب سے یہ دعا کی۔ ۶۔ جب آپ کو ذبح فرزند کا حکم ملا۔ آپ نے اس میں جلدی کی اور آپ کی قربانی قبول ہوئی۔ تب آپ نے دعا کی کہ مولیٰ تو نے مجھے جاندار کو بے جان کرنے کا حکم دیا میں تیار ہو گیا۔ اب میری خواہش ہے کہ مجھے بے جان کو جاندار کر کے دکھا دے۔ ۷۔ آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ قیامت کے دن سب ہی مردوں کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔ مولیٰ مجھے دنیا ہی میں دکھا دے۔ ۸۔ بعض نے فرمایا کہ احیاء ہوتا دیکھنا آپ کا اصل مقصود نہ تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ کسی صورت رب تعالیٰ سے بلاواسطہ کلام کریں۔ اس کے لئے آپ نے یہ ذریعہ اختیار فرمایا۔ (از کبیر و خازن وغیرہ) رَبِّ اَرِنِیْ۔ رب حق تعالیٰ کی حمد ہے اور قبول دعا کا ذریعہ۔ رب تعالیٰ کبھی تو اپنے نبی کی دلی تمنا بغیر کچھ عرض کئے ہی پوری فرما دیتا ہے جیسے تبدیلی قبلہ کا واقع ہوا اور کبھی اشارۃً عرض پر جیسے حضرت زکریا کے اشارے پر انہیں فرزند کی بخشش ہوئی۔ اور کبھی صراحۃً عرض پر اس قال سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم نے صراحۃً دعا کی دعا کے وقت رب کو پکارنا سنت ہے بہتر یہ ہے کہ اسے ربنا یا رب کہہ کر پکارے کہ اکثر انبیاء کرام نے اس نام سے پکارا ہے۔ اَرِ اراءۃٌ کا امر ہے جس کا مادہ رئیٰ ہے۔ آنکھ کی بصارت کو بھی رویت کہتے ہیں۔ اور دل کی بصیرت کو بھی۔ یعنی دکھانا یا سمجھانا و بتانا جیسے رب فرماتا ہے۔ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا (بقرہ: ۱۲۸) خدایا ہمیں ارکان حج دکھا دے یعنی بتا دے سمجھا دے مگر یہاں آنکھ سے دکھا دینا مراد ہے۔ کیونکہ وہ دل سے تو پہلے ہی جانتے تھے سمجھے ہوئے تھے۔ بلکہ لوگوں کو سمجھاتے و بتاتے تھے۔ نیز اگلا واقعہ بتا رہا ہے کہ رب تعالیٰ نے انہیں دلائل سے نہ سمجھایا بلکہ آنکھوں دکھایا لہٰذا یہاں آنکھوں دکھانا ہی مراد ہے۔ مرزائیوں کا اسے سمجھا دینے کے معنی میں کرنا تفسیر نہیں تحریف ہے باب افعال میں آ کر اس نے دو مفعولوں کو چاہا۔ پہلا مفعول یہ ہے اور دوسرا كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتٰى۔ یہ کیف بمعنی کیفیت ہے۔ جیسے وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ۔ (ابراہیم: ۴۵) (روح المعانی) یعنی اے میرے پالنے والے تو مردہ زندہ کرنے کی کیفیت مجھے آنکھوں سے دکھا

دے۔ خیال رہے کہ احیاء موتیٰ کا سوال نہیں فرمایا کہ تو زندہ کرے گا یا نہیں۔ بلکہ عرض کیا کہ یہ تو مجھے یقین ہے کہ تو زندہ کرے گا۔ مگر مجھے دکھا دے کہ کیسے زندہ کرے گا۔ چونکہ معترض کو یہ کہنے کا موقعہ مل سکتا تھا۔ کہ آپ کو مردوں کی زندگی میں شک تھا اس لئے رب نے ان سے کہلوالیا۔ کہ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ۔ قَالَ سے نیا جملہ ہے۔ اور اَوَلَمْ میں ہمزہ استفہامیہ اور واؤ عاطفہ ہے۔ اور ہمزہ کے بعد ایک فعل پوشیدہ یعنی اَلَمْ تَعْلَمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ اگر سوال کے موقعہ پر یہ آیت آئی ہے تو ایمان بمعنی یقین ہے اور اگر خلت کی بشارت پر یہ آیت آئی تو ایمان بمعنی اطمینان رب نے فرمایا کہ کیا تمہیں احیاء موتی کا یقین نہیں یا کیا تمہیں اطمینان نہیں کہ فرشتہ نے یہی بشارت دی ہے اور آپ خلیل اللہ ہیں۔ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ۔ بَلٰى منفی کا ثبوت ہے۔ اور نعم نفی کا یعنی ہاں میں ایمان لایا۔ اگر نعم ہوتا تو معنی یہ ہوتے کہ ہاں میں ایمان نہ لایا۔ اسی لئے میثاق کے دن تمام روحوں نے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (اعراف: ۱۷۲) کے جواب میں بَلٰى عرض کیا۔ نہ کہ نعم لِيَطْمَئِنَّ اطمینان سے بنا اس کا مادہ طمن بمعنی سکون باب اقشعراء کا مضارع ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہ اصل میں ليطمئنّ تھا۔ قلب ہو کر یطمئن ہوا۔ یعنی خداوندا میں ایمان تو لایا مگر علم الیقین سے ترقی کر کے عین الیقین چاہتا ہوں۔ تاکہ مجھے حق الیقین کا اطمینان حاصل ہو۔ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ۔ فخذ میں ف جزائیہ ہے۔ اور طیر صفت مشبہ یا طار یطیر کا مصدر ہے۔ بمعنی اسم فاعل یعنی رب نے فرمایا کہ تم چار پرندے پکڑلو۔ آپ کو اختیار تھا کہ جو چاہیں لے لیں مگر آپ نے مور۔ مرغ۔ کبوتر یا گدھ اور کوا لیا۔ (خزائن العرفان وکبیر وغیرہ) چونکہ حضرت خلیل کو تین چیزیں دکھانا تھیں مردوں کے اجزاء جسم کا مختلف مقامات میں آ کر ملنا۔ ہر قسم کے مخلوط گوشتوں کی چھانٹ۔ مردہ میں جان پڑنا اس لئے رب نے چار پرندے ذبح کرنے کا اور انہیں چار پہاڑوں پر رکھنے کا حکم دیا یہ پہاڑ گویا درندوں کے پیٹ ہیں اور مخلوط گوشت پوست گویا ان پیٹوں میں مختلف جانوروں کے گوشت ہیں حضرت عزیر کو صرف مردہ جلانا دکھانا تھا۔ اس لئے وہاں صرف ایک مردہ جلایا گیا۔ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ۔ ہماری قرأت ص کے پیش سے ہے۔ بعض قرأتوں میں ص کے زیر سے بھی ہے۔ اس کا مادہ صور یا صیر ہے۔ صار یصور اور صار یصیر بمعنی کاٹنا اور مائل کرنا صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ عربی ہے بعض نے اسے حبشی یا رومی مانا ہے (روح المعانی) اگر یہاں صیر بمعنی کاٹنا اور ذبح کرنا ہو تو الی کا متعلق پوشیدہ ہے۔ اور اگر بمعنی پالنا اور ملا لینا ہے تو الیٰ صرهنّ کے متعلق یعنی انہیں اپنی طرف مائل کرلو اور بلالو۔ تاکہ تمہیں پہچان رہے کہ تمہارے ہی پرندے زندہ ہوئے ہیں۔ دوسرے نہیں آ گئے۔ یا انہیں ذبح کردو اور ان کے سر اپنی طرف رکھ لو۔ عبداللہ ابن عباس کی قرأت میں صرّهن ہے تصریہ سے ہے باب تفعیل کا امر اس کے معنی ہیں جمع کرنا۔ جس گائے کا دودھ چند روز نہ دوہا جائے اسے مصرات کہتے ہیں۔ (روح المعانی) یعنی ان سب پرندوں کو جمع کرلو کہ یہ کام ایک دم ہو نہ کہ آگے پیچھے ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ...... ثُمَّ مہلت کے لئے ہے۔ اِجْعَلْ کے معنی ہیں رکھ دو یا ڈال دو۔ جبل لغت میں مضبوط گڑی ہوئی میخ کو کہتے ہیں اصطلاح میں ہر مضبوط چیز کو جبل کہہ دیتے ہیں۔ اسی لئے پیدائشی خصلت کو جبلت اور مضبوط جماعت کو جبل کہتے ہیں۔ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا (یٰسین: ۶۲) (روح البیان) آیت وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ (طٰہٰ: ۱۰۵) پہاڑ کو بھی اس کی مضبوطی کی وجہ سے جبل کہا جاتا ہے دنیا میں کل چھ ہزار چھ سو تہتر (۶۶۷۳) پہاڑ ہیں۔ یہاں کل جبل سے یا چار پہاڑ مراد ہیں۔ شرقی غربی جنوبی شمالی یا سات یا دس یا اس میدان کے سارے پہاڑ (روح

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ

اور نہ ہو مثل ان کے جو جدا جدا ہو گئے اور اختلاف کر بیٹھے اس کے پیچھے کہ

اور ان جیسے نہ ہونا جو آپس میں پھٹ پڑے اور ان میں پھوٹ پڑ گئی بعد اس کے

مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٥﴾

آئیں ان تک روشن نشانیاں اور یہ لوگ ہیں کہ ان کے لئے عذاب ہے بڑا

کہ روشن نشانیاں انہیں آ چکی تھیں اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ

جس دن سفید ہوں گے بعض چہرے اور کالے ہوں گے بعض چہرے تو لیکن وہ لوگ

جس دن کچھ منہ اجیالے ہوں گے اور کچھ منہ کالے تو وہ

اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ

کہ کالے ہوئے ان کے منہ کیا کفر کیا تم نے بعد تمہارے ایمان لانے کے

جن کے منہ کالے ہوئے کیا تم ایمان لا کر کافر ہوئے

فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿١٠٦﴾

تو چکھو تم عذاب اس وجہ سے کہ تم کفر کرتے تھے

تو اب عذاب چکھو اپنے کفر کا بدلہ

وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۚ

اور لیکن وہ لوگ کہ سفید ہوئے چہرے ان کے پس وہ اللہ کی رحمت میں ہیں

اور وہ جن کے منہ اجالے ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہیں

هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٠٧﴾

وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے

وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے

الیقین اس چیز میں فنا ہو کر رب فرماتا ہے۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ایمان کے لئے علم الیقین کافی ہے جو ابراہیم علیہ السلام کو پہلے سے حاصل تھا۔ دیکھو ہم کو آج بھی مکہ معظمہ کا یقین ہے مگر سن کر اور جب دور سے وہ شہر دیکھ لیں تو بھی یقین ہوگا مگر اس میں داخل ہو کر سما کر پہلا علم الیقین ہے۔ دوسرا عین الیقین۔ تیسرا حق الیقین۔ جب ہم خود مر کر جئیں گے تو اس کا حق الیقین ہم کو حاصل ہوگا۔ **تیسرا فائدہ:** حضور علیہ السلام سید الانبیاء اور افضل البشر ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ کمال تھا کہ انہوں نے احیاء موتیٰ کا مشاہدہ کیا۔ مگر حضور علیہ السلام نے جنت و دوزخ' حشر و نشر بلکہ رب تعالیٰ کو بچشم سر دیکھا۔ **چوتھا فائدہ:** دعا کی قبولیت دعا مانگنے والے کے درجہ کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ عزیر علیہ السلام نے بھی یہ ہی تمنا کی تھی اور ابراہیم علیہ السلام نے بھی مگر ان کی دعا ۸۰ برس بعد ظاہر ہوئی اور آپ کی فوراً۔ **پانچواں فائدہ:** زیادتی علم کی ہمیشہ کوشش کرنی چاہیے مال کی حرص بری مگر علم کی حرص اچھی ہے۔ دیکھو ابراہیم علیہ السلام نے وسیع علم کے باوجود ترقی علم کی کوشش کی۔ حضور علیہ السلام کو حکم ہوا۔ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۔ (طٰہٰ: ۱۱۴) کم مال پر قناعت صبر ہے۔ مگر کم علم پر قناعت کرنا غلطی ہے۔ **چھٹا فائدہ:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کی ضد پوری فرماتا ہے اور ان کے عرض پر اپنے قوانین بدل دیتا ہے۔ دیکھو مردے زندہ ہونا قیامت میں بذریعہ صور اسرافیل ہوگا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عرض پر ابھی دنیا میں مردے زندہ کر دیئے گئے قانون اور ہے محبوبیت کا اظہار کچھ اور۔ **ساتواں فائدہ:** اگر حضرت خلیل اللہ کی دعا سے مردے زندہ ہو سکتے ہیں تو حضور محمد رسول اللہ ﷺ کی نگاہ کرم سے مردہ دل بھی زندہ ہو سکتے ہیں۔ شعر۔

تو جو چاہے تو ابھی میل میرے دل کے دھلیں
کہ خدا دل نہیں کرتا کبھی میلا تیرا

کیوں نہ ہو کہ یہ حضرات رب کی مانتے ہیں تو رب بھی ان کی مانتا ہے۔

آٹھواں فائدہ: ابراہیم علیہ السلام کو کسی قسم کا شک نہ تھا بلکہ کامل ایمان سے اکمل کی طرف ترقی کرنے کا شوق' اس لئے رب نے ان سے اس کا اقرار کرا لیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ۔ یعنی بمقابلہ ابراہیم کے ہم زیادہ شک کے مستحق ہیں۔ اس کا یہ ہی مطلب ہے کہ انہیں شک نہیں تھا۔ اگر انہیں ہوتا تو ہمیں بدرجہ اولیٰ ہوتا مگر ہمیں تو ہے نہیں تو انہیں بھی نہیں۔ **نواں فائدہ:** علم استدلالی سے علم معائنہ افضل ہے کہ دلیل میں ضعف اور معائنہ میں قوت ہے۔ اسی لئے علماء ظاہری سے صوفیاء کرام اعلیٰ ہیں۔ **دسواں فائدہ:** اگرچہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے مگر وسیلہ و واسطہ سے۔ دیکھو ان پرندوں کو رب نے زندہ کیا مگر حضرت ابراہیم کی آواز کے وسیلہ سے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کو شفا دی مگر ان کے قدم سے پیدا شدہ پانی کے ذریعہ سے تاکہ کوئی شخص اپنے کو نبی سے مستغنی نہ جانے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: مسلمانوں کا خدا' دیا بھان متی کا تماشا کرتا ہے۔ کیا ایسی ہی باتوں سے خدا کی خدائی ظاہر ہوتی ہے۔ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** نہ معلوم پنڈت دیانند کی وہ کون سی بھان متی تھی اور کہاں رہتی تھی جو مردے زندہ کرتی ہو۔ اگر قدرت کا اظہار بھان متی کا تماشا ہے تو ... کے پیٹ میں بچہ بنانا' چاند سورج کا طلوع و غروب۔ جانداروں کا بے جان

ہیں، کالے اور گورے عیسائیوں کے کشت وخون کی خبریں برابر آتی رہتی ہیں، یہ لوگ ایک گرجا میں عبادت نہیں کر سکتے، اور مرنے کے بعد ایک قبرستان میں دفن نہیں ہو سکتے گورے عیسائیوں کا اور قبرستان اور کالوں کا اور مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ بَیِّنٰتُ کے معنی بارہا بیان کئے جا چکے ہیں اس سے مراد توریت وانجیل یا قرآن حکیم کی واضح آیات ہیں یا عقلی دلائل جن سے پتہ لگتا ہے کہ دینی و دنیاوی اتفاق واتحاد نہایت ضروری ہے اور فساد و جھگڑے دین و دنیا کی ہلاکت کا باعث ہیں، چونکہ بَیِّنٰتُ مؤنث لفظی ہے جس کا فعل مذکر بھی آسکتا ہے، مؤنث بھی اس لئے جاء مذکر لایا گیا وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ اُولٰٓئِکَ سے اختلاف وافتراق پیدا کرنے والوں کی طرف اشارہ ہے یعنی جو لوگ نئے فرقے اور جدید مذہب ایجاد کر کے کتاب اللہ میں فاسد تاویلیں گھڑ کر لوگوں میں فرقے بنا دیتے ہیں لَهُمۡ کے مقدم کرنے سے معلوم ہوا کہ بڑا عذاب ان فرقہ سازوں کو ہوگا اور سادہ لوح لوگوں کو ان سے ہلکا عذاب کے معنی بارہا بیان کئے جا چکے ہیں عظیم فرما کر یہ بتایا گیا کہ انہیں اتنا بڑا عذاب ہوگا جو تمہارے خیال وگمان و وہم سے وراء ہے، فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ جو جماعت مسلمین سے ایک بالشت بھی الگ ہو گیا اس نے اسلام کا پھندا اپنے گلے سے نکال دیا (ابوداؤد) امام بغوی نے بروایت حضرت عمر مرفوعاً نقل کیا کہ فرمایا نبی کریم ﷺ نے جو جنت کے وسط میں رہنا چاہتا ہے وہ دنیا میں جماعت مسلمین کے ساتھ رہے، کہ بھیڑیا ریوڑ سے دور رہنے والی بکری کو شکار کرتا ہے، اور شیطان جماعت مسلمین سے علیحدہ رہنے والے کا یَّوۡمَ تَبۡيَضُّ وُجُوۡهٌ وَّتَسۡوَدُّ وُجُوۡهٌ یوم یا تو لهم کے متعلق کا ظرف ہے یا اُذۡكُرُوۡا یا اُذۡكُرۡ پوشیدہ کا یعنی یہ عذاب اس دن ہوگا یا اے مسلمانو وہ دن یاد کرو یا یاد رکھو، یا اے محبوب انہیں وہ دن یاد دلا دو، یوم دن کو بھی کہتے ہیں اور وقت کو بھی، یہاں وقت مراد ہے، کیونکہ قیامت میں سورج والا دن نہ ہوگا سفیدی وسیاہی سے مراد یا تو خوشی وغم کے آثار کا چہرے پر ظاہر ہونا ہے جیسے رب تعالیٰ فرماتا ہے ظَلَّ وَجۡهُهٗ مُسۡوَدًّا (نحل: ۵۸) لڑکی کی پیدائش کی خبر سن کر کفار مکہ کے چہرے کالے پڑ جاتے ہیں، یا حقیقی سفیدی وسیاہی مراد ہے، یہی ظاہر ہے بلا وجہ حقیقی معنے چھوڑنا نہ چاہئیں، قیامت میں مومنوں کے چہرے بقدر قوت ایمان وتقویٰ چمکیلے ہونگے حتی کہ بعض کے منہ دوپہر کے آفتاب سے زیادہ روشن ہوں گے (صاوی) اور کفار کے چہرے بقدر کفر و بدکاری کالے، خیال رہے کہ یہ سیاہی سفیدی سارے جسم پر ہی ہوگی، مگر چونکہ پہلے چہرہ ہی نظر آتا ہے اور حسن و بدصورتی کا چہرے پر ہی مدار ہے، اس لئے صرف چہرے کا ذکر فرمایا گیا، یہ رنگوں کے اختلاف یا قبروں سے اٹھتے ہی ہوں گے یا وزن اعمال کے وقت یا مومن و کافر کی چھانٹ کے وقت جبکہ اعلان ہوگا وَامۡتَازُوا الۡيَوۡمَ اَيُّهَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ (یٰسین: ۵۹) اے مجرمو مومنین سے چھٹ جاؤ، یا نامۂ اعمال کی تقسیم کے وقت، حق یہ ہے کہ قبر سے اٹھتے وقت ہی رنگتیں مختلف ہوں گی، مگر مذکورہ بالا موقعوں پر ان رنگوں میں تیزی آتی جائے گی، (از روح المعانی) فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اسۡوَدَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ اجمال میں پہلے سفید چہروں کا ذکر تھا مگر تفصیل میں پہلے روسیاہوں کا ذکر ہے بعد میں نورانی چہرے والوں کا، تاکہ یہ مضمون مرحومین ہی کے ذکر سے شروع ہوا اور اسی پر ختم اور پتہ لگے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت غضب پر غالب ہے اور اس کے پڑھنے و سننے والے خوشی پر یہ مضمون ختم کریں (تفسیر کبیر) اَكَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ اس میں بہت گفتگو ہے کہ یہ خطاب کس سے ہے اور فرمانے والا کون ہے اور یہ سوال کیوں ہے، سوال تو انہیں

شرمندہ کرنے یا ان سے اقرار کفر کرانے یا ان پر اظہار غضب کرنے کے لئے ہے نہ کہ حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے، کیونکہ ان کا کفر رب تعالیٰ کو بھی معلوم ہے فرشتوں کو بھی، انبیائے کرام کو بھی، بلکہ سارے حاضرین محشر کو، ان کا چہرہ ہی ان کے کفر کا چلتا پھرتا اشتہار ہے اور یہ سیاہی ان کے دلوں کی سیاہی کا کھلا پتہ ہے، فرمانے والا یا خود رب تعالیٰ ہے یا عذاب کے فرشتے یا انبیائے کرام یا سارے مسلمان، رہا یہ کہ کس سے خطاب ہے اس میں چند قول ہیں، چنانچہ خواجہ حسن بصری فرماتے ہیں کہ یہ منافقین سے خطاب ہوگا جو زبان سے ایمان لائے اور دل میں کافر رہے، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ یہ خطاب مرتدین سے ہوگا، بعض نے فرمایا یہ خطاب خوارج سے ہوگا جنہوں نے حضرت مولائے کائنات علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر خروج کیا، چنانچہ جب جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان مردودین کے سر لٹکوائے تو حضرت زید ابن وہب نے ان سروں کو دیکھ کر یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا کہ میں نے حضور انور ﷺ کو یہ فرماتے سنا، پھر پوری حدیث خوارج ارشاد فرمائی کہ یہ بے ایمان نمازی، روزہ دار، قاری، حافظ ہونے کے باوجود دین سے ایسے نکل گئے جیسے تیر کمان سے یا شکار سے، ان توجیہوں کی بنا پر بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ بالکل ظاہر ہے، مگر ایک قول یہ ہے کہ ان سے مراد وہی عیسائی و یہودی ہیں جو حضور انور ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے آپ پر ایمان رکھتے تھے، مگر آپ کے ظہور کے بعد منکر ہو گئے، اور ایک قول یہ ہے کہ سارے کفار سے خطاب ہے کہ میثاق کے دن سب ہی قَالُوْا بَلٰى (اعراف: ۱۷۲) کہہ کر ایمان لا چکے تھے کفر کی بیماری دنیا میں آ کر لگی، ان دو صورتوں میں ایمان سے مراد شرعی ایمان نہیں بلکہ کتابی یا میثاقی ایمان مراد ہے (تفسیر خازن و کبیر و صاوی وغیرہ) فَذُوْقُوا الْعَذَابَ یہ ف تعلیلیہ ہے ذُوْقُوْا ذوق سے بنا بمعنی چکھنا، عذاب کو اس کڑوی چیز سے تشبیہ دی گئی جو چکھ کر تھوک دی جائے اس کے نگلنے کی طاقت نہ ہو، عربی میں بلکہ اردو میں بھی سزا پانے کو چکھنے سے تعبیر کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ تجھے اپنی بدکاریوں کا مزا چکھنا ہوگا، اکثر کفار کی سزا کو عقاب یا عذاب کہتے ہیں اور گنہگار مسلمانوں کی سزا کو عتاب، یہاں چونکہ کفار سے خطاب ہے اس لئے عذاب فرمایا گیا، یہاں روح المعانی نے فرمایا کہ کافر ہر رونگٹے سے یہ عذاب چکھے گا اور محسوس کرے گا، العذاب میں الف لام عہدی ہے اور اس سے بڑا عذاب مراد ہے یا وہ عذاب جس کی دنیا میں انہیں خبر دے دی گئی تھی بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ب سببیہ ہے تکفرون سے یہ بتایا گیا کہ یہ عذاب کفر کے سبب ہے خواہ کفر اصلی ہو یا ایمان کے بعد کا، لہٰذا اصلی کافر اور مرتد دونوں عذاب پائیں گے، اس آیت نے بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ کے معنی واضح کر دیئے، خیال رہے کہ کافر کا کفر اعتقادی تو دائمی ہوتا ہے، مگر کفر عملی وقتاً فوقتاً صادر ہوتا رہتا ہے اس لئے اسے ماضی ناتمام سے تعبیر فرمانا درست ہے یعنی چونکہ تم کفر کرتے رہتے تھے لہٰذا اب اس کے عوض میں عذاب چکھتے رہو، وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ اس سے وہی سفید چہرے والے مومن مراد ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا، خیال رہے کہ مومن کے چہرے کی سفیدی ایمان کے باعث بھی ہوگی اور نیک اعمال کے باعث بھی، خصوصاً وضو کی وجہ سے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے لہٰذا جن مسلمانوں کو عمل کا وقت ہی نہ ملا یا وقت ملا مگر شامت نفس سے اعمال کئے نہیں ان کے چہرے بھی ایمان کی وجہ سے ضرور سفید ہوں گے اگرچہ یہ سفیدی متقین کی سی نہ ہو فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ یہاں اللہ کی رحمت صفت الٰہی مراد نہیں کیونکہ وہ کسی کا ظرف نہیں بن سکتی بلکہ یا

رحمت کے آثار مراد ہیں یا رحمت کی جگہ یعنی جنت مراد، اس میں اشارۃً فرمایا گیا کہ بخشش اور جنت جسے بھی ملے گی، اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے ملے گی نہ کہ محض اپنے اعمال سے بلکہ اعمال کی توفیق ملنا بھی اس کی مہربانی سے ہی ہے یعنی سفید چہرے والے مومن قیامت میں تو اللہ تعالیٰ کی بخشش میں ہوں گے پھر اللہ کی جنت میں ھُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ فیھا کا مرجع رحمت ہے یعنی مومنوں پر یہ رحمت دنیاوی نعمتوں کی طرح عارضی نہ ہوگی بلکہ دائمی ہوگی کہ نہ انہیں موت آئے گی نہ جنت فنا ہوگی اور نہ یہ وہاں سے نکالے جائیں گے، یہاں دوبارہ فیھا فرمانے میں تاکید بھی ہے اظہار اہمیت بھی اور لذت بھی،

خلاصہ تفسیر

اے انصاریو یا اے صحابہ یا اے علمائے اسلام تم اخلاق، عادات، صورت و سیرت، لڑائی جھگڑائی، تفرقہ بازی اور مذاہب سازی میں بھی ان اہل کتاب کی طرح نہ ہونا جو آپس میں دین میں پھٹ گئے اور جن میں پھوٹ پڑ گئی جس کے باعث ان میں دینی فرقے پیدا ہو گئے اور ملکی، قومی و زبانی پارٹی بندیاں اور ان کی یہ ساری حرکتیں بے خبری، ناسمجھی، نادانی سے نہ تھیں، ان کے پاس کتاب الٰہی پہنچ چکی تھی جس میں انہیں سنبھالنے کے لئے روشن آئتیں موجود تھیں وہ کتابوں سے خود نہ بنے بلکہ کتابوں کو بگاڑ دیا، اس طرح کہ انہوں نے اپنے کو کتب کے سانچے میں نہ ڈھالا بلکہ کتب الٰہیہ کو اپنے سانچے میں ڈھالا، ان لوگوں کو ایسی مار و سزا دی جائے گی جو خیال و گمان اور وہم سے وراء ہے، مگر آج نہیں بلکہ اس دن جب تمام مخلوق جمع ہوگی، اور مومن و کافر چھانٹ دیئے جائیں گے کہ کافروں کے منہ کالے ہوں گے، مومنوں کے اجیالے، کافروں سے پرسش ہوگی کہ بدنصیبو تم ہمارے ہاں سے مومن گئے تھے، وہاں جا کر کافر ہو گئے، لہٰذا اب تم اپنے اعتقادی دائمی کفر کی وجہ سے اور ان کفریہ عملوں کی وجہ سے جو تم کرتے رہتے تھے عذاب کا مزا چکھو اور ہمیشہ چکھتے رہو، اجیالے منہ والے مومن وہ تو قبر میں بھی حشر میں بھی اور حشر کے بعد بھی اللہ کی رحمت یعنی مغفرت و جنت میں ہیں جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے نہ انہیں موت آئے اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** مسلمانوں کو کفار کی مشابہت سے بچنا چاہیے کہ صورت، سیرت، لباس، اخلاق، نام و کام ہر چیز میں ان سے ممتاز رہیں، جب دنیا میں ہر محکمے کی وردی علیحدہ ہے تو مومن کی وردی بھی علیحدہ چاہیے جیسا کہ وَلَا تَكُوۡنُوۡا الخ سے معلوم ہوا، اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو مسلمان ہو کر عیسائیوں کی وضع قطع پسند کرتے ہیں، اب تو مسلمانوں نے اپنے نام بھی بگاڑنا شروع کر دیئے اللہ ہدایت دے، **دوسرا فائدہ:** نااتفاقی اور پھوٹ کا مجرم وہ ہوگا جو مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر نئی راہ نکالے جو پرانے اسلامی راستہ پر ہے وہ مجرم نہیں جیسا کہ تَفَرَّقُوۡا سے معلوم ہوا، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَیَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی (النساء: ۱۱۵) لہٰذا جماعت اہل سنت حق پر ہے اور باقی فرقے پھوٹ ڈالنے والے ہیں، پولیس اور ڈاکو اگر آپس میں جنگ کریں تو مجرم ڈاکو ہیں نہ کہ پولیس کے سپاہی، **تیسرا فائدہ:** قوم کا اتفاق اللہ کی رحمت ہے اور قوم میں پھوٹ رب تعالیٰ کا عذاب خواہ دینی فرقہ بندی ہو یا دنیوی فسادات جیسا

کہ تَفَرَّقُوْا اور اختلفوا سے معلوم ہوا، **چوتھا فائدہ:** عالم کا گناہ جاہل کے گناہ سے زیادہ خطرناک بھی ہے اور سخت عذاب کا باعث بھی، ایک عالم کی غلطی سارے عالم کو تباہ کر سکتی ہے، انجن کے ڈرائیور کی غلطی ساری ٹرین کو تباہ کر دیتی ہے جیسا کہ من بعد ما الخ سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** اگر عالم سنبھل جائے تو اس کے لئے ثواب بھی بہت ہے، اور اگر بگڑے تو اس کے لئے عذاب بھی سخت، جیسا لھم کے مقدم کرنے سے معلوم ہوا،

حکایت: امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہیں جا رہے تھے ملاحظہ فرمایا کہ ایک شخص مدہوش سا ہے، چلنے میں لڑکھڑا رہا ہے، آپ نے فرمایا، ہوش کر! گر نہ جانا! وہ بولا اے امام میری فکر نہ کر و اپنی کرو، میں گروں گا تو اکیلا، تم گرو گے جہان گرے گا، مجھ پر اپنی جان کی ذمہ داری ہے، آپ پر جہان کی، **چھٹا فائدہ:** قیامت میں ہر مومن و کافر کی پہچان ان کے چہروں سے ہی ہو جائے گی، تو جو یہ کہے کہ نبی کریم ﷺ قیامت میں مومن و کافر کو نہ پہچانیں گے وہ جھوٹا ہے اس آیت کے خلاف کہتا ہے، **ساتواں فائدہ:** بلکہ مومن کے ایمانی درجے اور کافروں کے کفر کے درجے بھی ان کے چہروں سے ہی معلوم ہوں گے، یہ دونوں فائدے تَبْیَضُّ اور تَسْوَدُّ الخ سے معلوم ہوئے، **آٹھواں فائدہ:** ہر سوال، پوچھنے والے کی بے علمی سے ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے مقاصد اور بھی ہوتے ہیں، دیکھو رب تعالیٰ علیم و خبیر ہے مگر پھر کافروں سے پوچھے گا، اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ لہٰذا جو کہتے ہیں کہ اگر حضور انور ﷺ کو علم ہوتا تو فلاں سے یہ بات کیوں پوچھتے، وہ اس آیت سے عبرت پکڑیں، **نواں فائدہ:** سزا اور جزاء، عذاب و ثواب قیامت ہی میں ہوگا، دنیا اس کی جگہ نہیں، جیسا کہ یَوْمَ تَبْیَضُّ سے معلوم ہوا، دنیا میں اگر کافر کو تکلیف پہنچ جائے یا مومن کو کچھ راحت، تو قیامت میں اسے وضع نہ کیا جائے گا، حوالات کا زمانہ قید کی مدت سے وضع نہیں ہوتا اور نہ بھتہ تنخواہ سے کٹے، **دسواں فائدہ:** ہر قسم کا کفر دائمی عذاب کا باعث ہے، ہاں کفر کے مراتب کے لحاظ سے عذاب کی نوعیتوں میں فرق ہوگا جیسا کہ تَكْفُرُوْنَ کے عموم سے معلوم ہوا، **گیارھواں فائدہ:** کسی مومن کا خواہ وہ کیسا ہی گنہگار ہو قیامت میں منہ کالا نہ ہوگا اور نہ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہے جیسا کہ الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ کے عموم سے معلوم ہوا، ایمان دل کا نور ہے جس کا ظہور قیامت میں چہرے پر ہوگا، **بارھواں فائدہ:** کوئی شخص اپنے عمل سے جنت نہیں پا سکتا جب تک رب تعالیٰ اپنا فضل نہ فرمائے، فرمایا نبی کریم ﷺ نے کسی کو اس کا عمل جنت میں نہ پہنچائے گا بغیر رب تعالیٰ کی رحمت کے، عرض کیا گیا نہ آپ کو فرمایا نہ مجھے مگر یہ کہ رب تعالیٰ مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ لے (کتب احادیث و روح المعانی) **تیرھواں فائدہ:** جنت، جنت کی نعمتوں اور جنتیوں کو فناء نہیں جیسا کہ خٰلِدُوْنَ سے معلوم ہوا، خیال رہے کہ کوئی چیز خدائے تعالیٰ کے سواء ازلی قدیم نہیں، ہاں اس کے حکم و ارادے سے چیزیں ابدی و باقی ہیں، اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (رحمٰن: ۲۶) جو زمین پر ہیں انہیں فناء ہے، معلوم ہوا جو جنت میں ہیں انہیں فنا نہیں، یہ بات بڑی اہم ہے خیال میں رکھی جائے،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ تفرقہ و اختلاف بہت بری چیز ہے اور تفرقہ پیدا کرنے والے لوگ بدترین

جاتا ہے یا کنوئیں کا پانی روکے رکھنے سے بگڑ جاتا ہے۔ کیاریوں میں پھیلانے سے سب کو سیراب کر دیتا ہے۔ ایسے ہی مال روک رکھنے سے برباد ہوتا ہے۔ راہ مولٰی میں ہر طرف خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ دنیا کی چیز متحرک ہے۔ تو مال کو بھی متحرک رکھو۔ بقا آخرت کے لئے ہے۔ اچھی جگہ بخوشی خرچ کرو۔ ورنہ بری جگہ خرچ ہو جائے گا۔ یا تمہارے بغیر اجازت نکل جاوے گا۔ حاکم وکیل کھا جائیں گے۔ یُنۡفِقُوۡنَ مضارع میں بنایا گیا۔ صرف ایک بار ہی خرچ پر بس نہ کریں بلکہ ہمیشہ خرچ کرتے رہیں۔ احوال فرمایا۔ بتایا کہ کھانا۔ لباس زمین ہر قسم کی خیرات کرو ہر جگہ خرچ کرو کَمَثَلِ حَبَّۃٍ یہ مثل الذین کی خبر ہے۔ کاف تشبیہ کا اور مثل بمعنی کہاوت ہے۔ نہ کاف زائدہ ہے نہ مثل کیونکہ کاف بمعنی مثل ہے اور مثل بمعنی کہاوت۔ خیال رہے کہ حبۃ حبٌ کا واحد ہے۔ بمعنی بیج عربی میں حبۃٌ بفتح ح غلہ وغیرہ کے بیج کو بولتے ہیں۔ جس کا پھل عرصہ تک باقی رہے۔ اور حِبۃ بکسر ح ترکاریوں کے بیج کو (روح المعانی) اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ انبات بمعنی اخراج ہے۔ اصطلاح میں زمین سے نکالنے یعنی اگانے کو انبات کہا جاتا ہے۔ اسی لئے گھاس کو نبات کہتے ہیں۔ سنابل جمع سنبلہ کی ہے یا تو اس کا نون زائد ہے اور اس کا مادہ سبل کہا جاتا ہے۔ اَسۡبَلَ الزَّرۡعِ۔ کھیتی بالی والی ہو گئی بعض نے فرمایا کہ بروزن فعلۃٌ ہے۔ لہٰذا اس کا نون اصلی ہے۔ انبات کو دانہ کی طرف نسبت دینا مجازاً ہے کہ وہ ذریعہ پیداوار ہے۔ حقیقتاً اگانے والا رب تعالیٰ ہے۔ فِیۡ کُلِّ سُنۡۢبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ یہ سَبۡعَ سنابل کا بیان ہے۔ اگرچہ اکثر درختوں میں سات بالیاں اور اکثر بالوں میں سو دانے نہیں ہوتے مگر جوار یا باجرہ جب اچھی زمین میں بو دیا جائے تو ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ۔ یہ علیحدہ جملہ ہے۔ یُضٰعِفُ ضِعۡفٌ سے بنا بمعنی زیادتی۔ یہاں علیہ پوشیدہ ہے یعنی اللہ جس کے لئے چاہے اس سے بھی زیادتی فرمادے۔ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ۔ وَاسِعٌ وسع بمعنی گنجائش سے بنا ہے۔ یہ ضیق کا مقابل ہے اور یہ جملہ گویا گذشتہ کلام کی دلیل ہے۔ جو لوگ کسی کار خیر میں اپنا کسی قسم کا مال کسی طرح خرچ کریں۔ خواہ زکوٰۃ فطرہ ادا کریں یا مسجدیں اور مدرسے بنائیں یا شفا خانے اور مسافر خانے تیار کریں یا اہل قرابت کے ساتھ سلوک کریں یا مساکین اور فقراء کو صدقہ نفلی دیں یا طلبہ کو کتابیں خرید دیں وغیرہ وغیرہ انکے صدقات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ زمین میں بو دیا جائے جس سے سات شاخیں پھوٹیں۔ ہر شاخ میں ایک ایک بال ہو۔ اور ہر بال میں سو سو دانے کل سات سو دانہ جیسے دنیا میں ایک دانہ سے سات سو دانے حاصل ہوتے ہیں۔ ایسے ہی آخرت میں ایک صدقہ سے سات سو حاصل ہوں گے۔ اسی پر ہی بس نہیں بلکہ رب تعالیٰ جس کو چاہے بقدر اخلاص و مشقت اور زیادہ بھی عطا فرما دیتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو جہاد میں روپیہ بھیج دے تو اسے ہر درم کے عوض سات سو ملیں گے۔ اور جو خود میدان جنگ میں جا کر خرچ کرے۔ اس کے لئے ہر دِرم کے عوض سات لاکھ دوسری روایت میں ہے کہ خرچ کرنے والے نمازیوں کے لئے اللہ نے رحمت کے اتنے خزانے رکھے ہیں جو انسان کے علم میں نہیں آسکتے (روح المعانی) عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ حج اور جہاد کے خرچہ کا یکساں ثواب ہے یعنی ایک کا سات لاکھ (درمنثور) بلکہ بعض روایات میں ہے کہ صدقہ دنیوی مصیبتوں اور فتنہ قبر اور عذاب قیامت کو دور کرتا ہے اور سخاوت ایسا درخت ہے جس کی جڑ جنت میں اور شاخیں دنیا میں لٹکی ہوئی ہیں جو کوئی اس کی کسی شاخ کو پکڑے گا وہ جنت تک پہنچ جائے گا اور بخل ایسا درخت ہے جس کی جڑ جہنم میں اور شاخیں دنیا میں ہیں جو اس کی ایک شاخ پکڑے گا جہنم میں جائے گا۔

کہ محشر میں مومن و کافر چہروں سے ہی پہچان لئے جائیں گے حالانکہ مسلم بخاری کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ مرتدین کو بھی نہ پہچان سکیں گے، جب وہ حوض پر آتے ہوئے روکے جائیں گے تو سرکار فرمائیں گے یہ میرے صحابہ ہیں، جب فرشتے عرض کریں گے کہ یہ آپ کے بعد مرتد ہو گئے تھے تب آپ کو پتہ لگے گا، **جواب:** یہ غلط ہے حضور ﷺ یہاں تو خبر دے رہے ہیں بلکہ اسی حدیث میں فرماتے ہیں اعرفهم میں انہیں پہچانتا ہوں کہ وہ کون ہیں، پھر وہاں بھول جائیں ناممکن ہے انہیں اصحاب فرمانا طعن کے لئے ہوگا جیسے رب تعالیٰ جہنمی کفار سے فرمائے گا ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ (الدخان: ۴۹) **پانچواں اعتراض:** کافروں کے منہ کالے ہوئے اور متقی مومنوں کے منہ اجیالے تو فساق کے چہرے کیسے ہوں گے کہ یہ تو نہ کافر ہیں نہ مومن، **جواب:** معاذ اللہ فاسق عملی مومن ہے اس کا چہرہ سفید ہوگا، ایمان ایک نور ہے کیونکہ ہمارے ہاں کفر و ایمان کے درمیان کوئی درجہ نہیں اس کی دلیل یہ ہی آیت ہے، معتزلہ کہتے ہیں کہ فاسق نہ مومن ہے نہ کافر، اور خوارج فاسق کو کافر مانتے ہیں، اس آیت میں دونوں کی تردید ہے، ہاں فاسق کے چہرہ کا نور متقی کے نور کے برابر نہ ہوگا، بعض فساق کے چہروں پر داغ دھبے ہوں گے جو شفاعت کے پانی سے دھل جائیں گے، **چھٹا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ عذاب صرف کافروں کو ہوگا، مومن کتنا ہی گناہ کرے اسے عذاب سے کوئی تعلق نہیں کہ رب تعالیٰ نے فرمایا بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (مرجیہ اور اس زمانہ کے دتے شاہی ملنگ) **جواب:** یہ کفر کی قید دائمی عذاب کے لئے ہے جیسا کہ خُذْ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا، دائمی جہنمی ہونا کفار ہی کے لئے ہے، **ساتواں اعتراض:** جب جنتیوں کے لئے جنت میں ہیشگی ہے اور کافروں کے لئے دوزخ میں ہیشگی، تو پھر یہاں هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ صرف مومنوں کے لئے آیا، کفار کے لئے کیوں نہیں آیا؟ **جواب:** اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ رب تعالیٰ کی رحمت غضب پر غالب ہے (تفسیر کبیر) **آٹھواں اعتراض:** یہاں عذاب کو کفار کے کفر کی طرف نسبت کیا گیا جو ان کا اپنا فعل ہے اور جنت کو رحمت کی طرف، فصاحت تو یہ تھی کہ جب وہاں تَكْفُرُونَ فرمایا تھا تو یہاں تُؤْمِنُونَ فرمایا جاتا، **جواب:** اس میں ہم بندوں کو تعلیم ادب ہے کہ ہمیشہ برائیوں کو اپنی طرف نسبت کرو اور خوبیوں کو رب تعالیٰ کی طرف جو جنت میں گیا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے گیا، اور جو دوزخ میں گیا وہ اپنی بری حرکتوں سے گیا،

تفسیر صوفیانه

رب تعالیٰ نے ہم کو دل بھی دیا ہے، روح بھی اور نفس بھی، دل کا میلان نور کی طرف ہے اور نفس کا میلان نار کی طرف، شیطان نفس کا مددگار ہے اور فرشتہ دل کا معاون، ان کی آپس میں ہمیشہ جنگ ہے، بعض خوش نصیبوں کا نفس دل سے مغلوب ہو کر اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اس کے ساتھ متفق ہو جاتا ہے بلکہ دل کے ساتھ تعاون کرتا ہے، اور بعض لوگوں کے نفوس دل سے نہیں دبتے بلکہ دل کی آواز کو دبا دیتے ہیں، پہلی جماعت متفقین کی ہے اور یہ جماعت متفرقین کی جن کے نفس و دل الگ الگ رہے، فرمایا جا رہا ہے کہ اے مسلمانو تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جن کا نفس دل سے متفق نہ ہو سکا، اس سے الگ ہی رہا، باوجودیکہ دل کو اسلحہ و سامان جنگ یعنی بینات بہت دیئے گئے، ایسے لوگوں کا انجام خراب ہے اور یہ بڑے عذاب کے مستحق

روڈ ہے۔ مسلمانوں کو بہشت روڈ پر چلنا چاہیے کام رضاء الہٰی کے لئے کرنا چاہیے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ صدقہ کے چند درجے ہیں۔ عوام کی خیرات مال ہے اور اس کی جزا جنت۔ اور خواص کی خیرات اصلاح حال ہے اور صفائی نفس۔ اس کی جزاء رضاء رب مومن کو چاہیے کہ اپنے حال کی اصلاح کرے (روح البیان) صوفیاء فرماتے ہیں کہ صدقات کے ثواب میں زیادتی کی چند وجہ سے ہوتی ہے اخلاص کا فرق۔ زمان کا فرق۔ زمین کا فرق۔ فقیر کا فرق۔ مقام خیرات کا فرق۔ جس قدر اخلاص زیادہ اسی قدر ثواب زیادہ صحابہ کرام کے سوا سیر جو ہمارے پہاڑ بھر سونے کی خیرات سے کیوں افضل ہے۔ اس لئے کہ ان کا سا اخلاص ہم کو کیسے میسر ہو۔ ماہ رمضان۔ جمعہ شب قدر کا صدقہ بہت ثواب کا باعث ہے دوسرے زمانہ کے صدقات کا وہ ثواب نہیں مکہ معظمہ مدینہ منورہ کے صدقات کا ثواب ایک کا ایک لاکھ یا پچاس ہزار ہے۔ اور زمین میں یہ نہیں عالم فقیر اور زیادہ حاجتمند پر صدقہ دوسروں پر صدقہ سے زیادہ ثواب کا باعث ہے۔ جیسے دانہ کی پیداوار زمین و زمان کے فرق سے مختلف ہوتی ہے۔ غرضکہ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ بالکل حق و درست ہے صدقہ مقبول کی توفیق بھی وہ ہی دیتا ہے۔ صدقہ کا یہ ثواب جو بیان ہوا اس کے ملنے کی جگہ آخرت ہے۔ اگر دنیا میں رب تعالیٰ سخی کو کچھ برکت دیدے تو اس کا کرم ہے مگر یہ بدلہ نہیں بدلہ تو قیامت میں ملے گا۔ لہٰذا کوئی شخص آج خیرات دے کر کل ہی سات سو کا مطالبہ نہ کرے۔ کھیت بونے کا وقت اور ہے کاٹنے کا وقت اور۔ دوسرا آج بو کر آج ہی کاٹنے کی کوشش نہ کرو صدقہ کا ایک فائدہ تو یہاں بیان ہوا اور دوسرے فائدے دیگر آیات اور احادیث میں مذکور ہیں۔ صدقہ کی برکت سے مصیبت ٹل جاتی ہے۔ صدقہ کی برکت سے ایمان پر خاتمہ نصیب ہوتا ہے۔ صدقہ کی برکت سے گناہوں کی معافی ہوتی ہے۔ صدقہ کی برکت سے غضب الہٰی کی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔ ایک رنڈی مرتے ہوئے کتے کو پانی پلانے سے بخش دی گئی۔ غرضکہ صدقہ کے بہت فوائد ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا

وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں مالوں کو اپنے بیچ راستہ اللہ کے پھر نہیں پیچھے کرتے ہیں اس کے جو خرچ کیا احسان کو

وہ جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر دیئے پیچھے نہ احسان رکھیں

وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

اور نہ ایذا کو واسطے ان کے ثواب ہے ان کا نزدیک رب ان کے اور نہیں ہے ڈر اوپر ان کے اور نہ وہ غمگین

نہ تکلیف دیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم

يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ

ہوں گے بات بھلی اور بخشش اچھی ہے اس صدقہ سے کہ پیچھے ہو اس کے ایذا

اچھی بات کہنا اور درگذر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد ستانا ہو

وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

اور اللہ بے پرواہ حلم والا ہے
اور اللہ بے پرواہ حلم والا ہے

تعلق

اس آیت کا تعلق پچھلی آیتوں سے چند طرح سے ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں صدقہ کے ثواب کا ذکر تھا اور اب اس کی کیفیت کا تذکرہ ہے کہ صدقہ کیسا ہونا چاہیے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں صدقہ مقبول کے فضائل بیان ہوئے۔ اب شرائط قبول کا ذکر ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ صدقات کا ثواب یکساں نہیں۔ بعض کا سات سو گنا اور بعض کا اس سے بھی زیادہ اب گویا ان کی وجہ بیان ہو رہی ہے کہ صدقہ کرنے والوں کا حال یکساں نہیں۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں صدقہ مقبول کے بدلہ کا ذکر تھا۔ اب اس کے دیگر فوائد کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت میں صدقہ مقبول دینے کا ذکر تھا جو فی سبیل اللہ ہو اب دیئے ہوئے صدقہ کو سنبھالنے کا ذکر ہے کہ کوئی ایسی حرکت نہ ہو جس سے صدقہ باطل ہو جائے۔ کمانا ایک کمال ہے اور کمائی کا سنبھالنا اس سے بڑا کمال ہے۔

شان نزول

یہ آیت حضرت عثمان ابن عفان اور عبدالرحمٰن ابن عوف کے بارے میں اُتری عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تبوک کے موقعہ پر ایک ہزار اونٹ معہ ساز و سامان کے پیش کئے۔ اس کے علاوہ اعلان فرمایا۔ کہ جس غازی کے پاس سامان نہ ہو، میں دوں گا۔ مدینہ منورہ میں میٹھے پانی کی کمی تھی تو آپ نے بیر رومہ خرید کر وقف فرما دیا۔ حضور علیہ السلام نے رات بھر ان کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعائیں فرمائیں کہ مولیٰ میں عثمان بن عفان سے راضی ہوا۔ تو بھی راضی ہو جا۔ جب دعا کرتے کرتے سویرا ہو گیا۔ تب یہ آیت اُتری۔ عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس آٹھ ہزار درہم تھے۔ آپ چار ہزار تو گھر رکھ آئے۔ اور چار ہزار لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کرنے لگے کہ یا حبیب اللہ چار ہزار بچوں کے لئے چھوڑے ہیں اور چار ہزار رب کو قرض دیتا ہوں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اللہ تمہارے خرچ کئے اور رکھے ہوئے مال میں برکت دے۔ تب یہ آیت اُتری۔ (خزائن العرفان، روح المعانی و کبیر) بعض روایات میں اس کا شان نزول یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر ایک بار کھانا نہ تھا۔ آپ نے مجبوراً فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی قمیص چھ درم میں فروخت کی۔ درہم لے کر آ ہی رہے تھے کہ کوئی سائل مل گیا۔ سب درم اسے عطا فرما دیئے۔ آگے بڑھے کہ ایک شخص آپ کو اونٹنی بیچتا ہوا ملا۔ آپ نے اس سے قرض خرید لی۔ لے کر چلے ہی تھی کہ خریدار مل گیا۔ جس نے بہت نفع سے خرید لی۔ آپ نے چاہا کہ قرض خواہ کا قرض ادا کر دیں۔ بازار میں بہت تلاش کیا۔ نہ پایا تب آ کر یہ واقعہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ فرمایا کہ سائل رضوان (مالک جنت) تھے اور بائع میکائیل اور خریدار حضرت جبرائیل۔ تب یہ آیت کریمہ اُتری۔ (روح البیان) ہو سکتا ہے کہ یہ تینوں واقعات بیک وقت ہوئے ہوں۔ تب یہ آیت آئی ہو۔

تفسیر

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ اس کی تفسیر پچھلی آیت میں گزر چکی کہ اَلَّذِیْنَ سے مراد مسلمان ہیں اور یُنْفِقُوْنَ

رب تعالیٰ کی ہے مگر چونکہ غیر عاقلوں کے افراد و اقسام زیادہ ہیں اور عاقلوں کے کم، اس لئے تغلیباً ما فرمایا گیا، سموات سماء کی جمع ہے جو سمو بمعنی بلندی سے بنا، اور اَرْض وَرَضَ کے معنی ہیں بکھرنا، پراگندہ ہونا، اسی لئے دال کو رضیض اور دلیہ کو رضاض کہتے ہیں اور سر کچلنے کو رض الراس کہا جاتا ہے، دیمک کو ارضہ، زمین کی حقیقت بھربھری اور بکھری ہوئی مٹی ہے، اس لئے اسے ارض کہا جاتا ہے وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ، اِلَى اللّٰهِ کا تُرْجَعُ پر مقدم کرنا بیانِ حصر کے لئے ہے امور سے مراد حاجتیں ہیں یا عبادتیں یا احکام یا انتظام، تُرْجَعُ میں حال کا بھی احتمال ہے استقبال کا بھی یعنی تمام مخلوق کی حاجتیں یا ان کی عبادتیں ہماری بارگاہِ عالی میں پیش کی جاتی ہیں یا قیامت میں پیش کی جائیں گی یا عالم کے سارے انتظامات واحکام کا رجوع ہماری طرف ہی ہے،

خلاصہ تفسیر

اے محبوب ﷺ قرآن کی ساری آیتیں یا وہ سزا اجزاء کی آیات جو ابھی آپ کو سنائی گئیں اللہ کی آیتیں ہیں، جب متکلم اتنا شاندار ہے تو غور فرمالو کہ کلام کیسا شاندار ہوگا، ہم یہ آیات بواسطۂ جبریل یا بلاواسطہ آپ پر تلاوت کرتے ہیں، ہم بھی حق ہمارے جبریل بھی حق آیتیں بھی حق، تلاوت کرنا بھی حق، اور تم بھی حق یہاں باطل کا شائبہ بھی نہیں لہٰذا جو کچھ کہا گیا بالکل سچ ہے نہ اس میں مبالغہ ہے نہ جھوٹ، کفار کی یہ سخت سزائیں ان کی اپنی حرکتوں سے ہیں نہ کہ ہماری زیادتی سے، اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے، وہ کسی پر ظلم کرنے کا ارادہ بھی نہیں فرماتا، ظلم یا خبیث النفس کرتا ہے یا عاجز یا جاہل یا حاجت مند (تفسیر کبیر) ہم ان سب عیوب سے پاک ہیں کیونکہ آسمانوں اور زمینوں کی چیز ہماری اپنی ہی ملک ہے جو چاہیں کریں، پھر ہمیں ظلم کرنے کی کیا حاجت ہماری شان یہ ہے کہ سب کا رجوع ہماری ہی طرف ہے، کوئی بخوشی، کوئی مجبوراً لوٹ کر ہماری طرف ہی آتا ہے،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** کسی چیز کی عظمت چیز والے کی عظمت سے ظاہر ہوتی ہے، بڑے کی معمولی چیز بھی بڑی ہے اور چھوٹے کی بڑی چیز بھی معمولی ہے، لاٹ صاحب کی شاندار کوٹھی سے کچی چھپر والی مسجد کا درجہ زیادہ ہے کہ یہاں بے غسل نہیں آسکتا کوٹھی میں جاسکتا ہے جیسا کہ آیات اللہ کی اضافت سے معلوم ہوا، **دوسرا فائدہ:** اسلام کی عظمت دکھانے کے لئے نبی کریم ﷺ صحابہ کرام، اولیاء وعلماء کی شانوں کے خطبے پڑھنا ضروری ہیں، کیونکہ اسلام چلا ہے حضور انور ﷺ سے، اور پروان چڑھا ہے ان گودوں میں، اس کے لئے ہماری کتاب "سلطنت مصطفیٰ ﷺ" کا مطالعہ کیجئے، یہ فائدہ بھی اٰيٰتُ اللّٰهِ کی اضافت سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کو اللہ تعالیٰ سے ایسا قربِ خصوصی حاصل ہے کہ ان کے کام کو رب تعالیٰ فرماتا ہے میرا کام ہے، اور رب تعالیٰ کے کام کو وہ فرماتے ہیں ہمارا کام ہے جیسا کہ نَتْلُوْا کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا، کہ تلاوت کرتے ہیں جبریل، مگر رب تعالیٰ فرماتا ہے ہم تلاوت کرتے ہیں، دیکھو بیٹا دینا رب تعالیٰ کا کام ہے مگر بی بی مریم رضی اللہ عنہا سے جبریل امین نے کہا تھا لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (مریم:۱۹) صلح حدیبیہ میں صحابہ کرام حضور انور ﷺ سے بیعت کرتے ہیں رب تعالیٰ فرماتا ہے مجھ سے بیعت کی، فرماتا ہے اِنَّمَا

انہیں مرتے وقت اور برزخ وحشر میں خوف وغم سے بچائیں گے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے۔ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ۔ قول مصدر ہے یا حاصل مصدر یعنی بات کہنا یا بات معروف بمعنی مشہور یا معلوم ہے۔ یہاں شرعاً مشہور مراد ہے۔ یعنی اچھی اور بہتر مغفرت۔ غفر سے بنا بمعنی ڈھکنا۔ یہاں قول معروف سے سائل کو نرمی سے منع کر دینا مراد ہے۔ اور مغفرت سے فقیر کی سختی برداشت کرنا اور اس کے عیب کا چھپانا یعنی نرمی سے منع کر دینا اور منع کرنے پر جو سائل سختی کرے اس سے درگزر کرنا۔ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى۔ اس صدقہ دینے سے اچھا ہے۔ جس کے بعد فقیر کو ایذا اور تکلیف ہو خیال رہے کہ یہاں اذی میں احسان جتانا بھی داخل ہے۔ اور یہ بہتر ہونا سائل کے حق میں بھی ہے اور دینے والے کے حق میں بھی کہ سائل تو ایذا سے اور دینے والا عذاب الٰہی سے بچ جاتا ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ لوگوں سے خوش خلقی سے بات کر لینا اور ان کی خطاؤں سے درگزر کرنا بد خلقی کے صدقہ سے بہتر ہے۔ جب رب تعالیٰ غنی ہو کر حلیم ہے کہ نافرمانوں کو روزی دیتا ہے تو تم حلم و بردباری کیوں اختیار نہیں کرتے۔ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ۔ اللہ تمام صدقات سے بے پرواہ ہے اور حلیم ہے کہ طعنہ باز کو جلد عذاب نہیں دیتا۔

خلاصہ تفسیر

جو لوگ اپنے مختلف مال حسب ضرورت اللہ کی راہ میں خرچ کریں پھر خرچ کرنے کے بعد آخر دم تک نہ تو احسان جتائیں کہ دوسروں کے سامنے فقیر سے کہیں کہ ہم نے تیرے ساتھ فلاں موقعہ پر یہ سلوک کیا اور اسے لوگوں میں ذلیل کریں۔ اور نہ اسے طعنہ دیں کہ تو نادار، مفلس، مجبور، قلاش نکمہ تھا۔ ہم نے تیری خبر گیری کی اور آج تو ہمارے مقابلہ میں آ گیا اور نہ کسی اور طرح اس پر دباؤ ڈالیں کہ صدقہ دے کر اس سے اپنے گھر کے کام لیں۔ یا اسے نظر حقارت سے دیکھیں یا اس وجہ سے اسے اپنے پاس نہ بیٹھنے دیں۔ صرف ایسے ہی لوگوں کو رب کے پاس صدقہ کا ثواب ملے گا۔ اور یہ ہی صدقہ ثواب کا پھل دے گا۔ انہیں نہ کسی قسم کا دنیا اور قبر میں خوف کا اندیشہ ہو اور نہ محشر میں یہ لوگ غمگیں ہوں۔ خوب خیال رکھو کہ سائل کو مجبوری کے وقت میں کچھ نہ دینا۔ اور اس سے اچھی بات کہنا اور خوش خلقی سے منع کر دینا۔ اور اگر وہ سوال میں اصرار کرے یا منع کرنے پر زبان درازی کرے تو اس سے درگزر کرنا، اس صدقہ دینے سے بہتر ہے جس کے بعد طعن تشنیع دیئے جائیں کہ اس میں مال بھی گیا اور بجائے ثواب کے عذاب ہوا، اور فقیر کو رنج و غم بڑھا یہ سمجھ رکھو کہ اللہ کو تمہارے صدقات کی ضرورت نہیں۔ اور نہ فقیری کا رزق تمہارے دینے پر موقوف ہے۔ اگر تم نہ دو گے تو اسے اور دروازہ سے ملے جائے گا۔ اللہ غنی ہے۔ اس نے تمہارے ہی نفع کے لئے صدقات کا حکم دیا۔ اور وہ بہت علم والا ہے کہ گناہ پر جلد عذاب نہیں دیتا۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر صدقہ دے کر سلام کرنے سے بھی فقیر کو تکلیف ہو تو اسے سلام بھی نہ کرے تاکہ تمہارا اسلام صدقہ کی یاد کا سبب نہ بن جائے (خازن) امام شعبی فرماتے ہیں کہ جتنا تمہارے صدقہ کا فقیر محتاج ہے۔ اس سے زیادہ ثواب کے تم محتاج ہو۔ تمہارا فقیر پر دے کر احسان ہوا، تو فقیر کا بھی تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایک فرض سے ہلکا کر دیا۔ امام ہدائی فرماتے ہیں کہ چونکہ مال سے جسم کو راحت ہوتی ہے اور اچھی بات سے قلب کو، اور قلب جسم سے اعلیٰ لہٰذا اچھی بات خالی صدقہ سے اعلیٰ۔ سب سے بہتر وہ شخص ہے جو فقیر کو خوش کر کے دے۔ اور بڑا خبیث وہ شخص ہے جو صدقہ بھی نہ دے۔ اور فقیر کو ایذا بھی پہنچائے۔ اور بد نصیب وہ ہے جو صدقہ دے۔ اور ایذا بھی پہنچائے کہ اس کا مال بھی گیا اور ثواب بھی نہ ملا۔

عزت افزائی کے لئے ان کی تلاوت کو اپنی تلاوت فرمایا، یا رب تعالیٰ کی ہی تلاوت مراد ہے، وہ تلاوت جو اس کی شان کے لائق ہے، فعل کے معانی فاعل کے لحاظ سے ہوتے ہیں، **دوسرا اعتراض:** حدیث شریف میں ہے کہ اگر رب تعالیٰ تمام جہان کو دوزخ میں ڈال دے تو وہ ظالم نہیں بلکہ عادل ہے، شارحینِ حدیث فرماتے ہیں کہ دوسرے کی چیز میں بلا اجازت تصرف کرنا ظلم ہے، چونکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ہے تو وہ جو کچھ بھی کرے ظالم نہیں، جب اس کے لئے کوئی کام ظلم ہی نہیں تو اس آیت کے کیا معنی؟ کہ اللہ تعالیٰ ظلم کا ارادہ نہیں کرتا، **جواب:** بعض لوگوں نے اس آیت کے یہ معنی کئے کہ رب تعالیٰ دنیا والوں کے لئے ظلم کرنا پسند نہیں کرتا یعنی وہ نہیں چاہتا کہ کوئی کسی پر ظلم کرے، مگر یہ معنی کچھ بعید ہیں، کیونکہ ارادہ بمعنی پسندیدگی نہیں آتا اور اگر ارادہ اپنے معنی میں ہو تو آیت کے معنی بالکل فاسد ہو جائیں گے کہ اب مطلب یہ ہوگا کہ دنیا میں ظلم وغیرہ رب تعالیٰ کے ارادے کے بغیر ہو رہے ہیں، یہ عقیدہ صریح گمراہی ہے، اس کا صحیح جواب وہ ہے جو امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں دیا کہ غیر مجرم کو عذاب دینا اور متقی کو ثواب نہ دینا اگرچہ رب تعالیٰ کے لئے حقیقتاً ظلم نہیں مگر صورۃً ظلم ضرور ہے، پروردگار صورۃً ظلم سے بھی پاک ہے اسی کا یہاں ذکر ہے، اور کبھی مثل کو اصل کا نام دے دیتے ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ (شوریٰ: ۴۰) **نوٹ:** اکثر علماء کا مذہب یہ ہے کہ کفار کے ناسمجھ فوت شدہ بچے دوزخ میں نہیں جائیں گے ان کی دلیل یہ آیت بھی ہے، **تیسرا اعتراض:** جن کفار کی بستیوں پر عذاب الٰہی آئے ان کے بچے و جانور بھی ہلاک کر دیئے گئے، یہ ظلم ہے اور اس آیت کے خلاف، انہوں نے کون سا قصور کیا تھا؟ (آریہ) **جواب:** پنڈت جی دنیا میں موت و زندگی، راحتیں و آفتیں بھیجنا ملکی انتظامات ہیں نہ کہ عذاب، ورنہ تم کل یہ کہہ دو گے کہ ہزاروں انسان و جانور جلتے، ڈوبتے، مرتے ذبح ہوتے رہتے ہیں کیا یہ سب رب تعالیٰ کا ظلم ہے؟ گذشتہ قوموں پر جو عذاب آئے مجرموں کے حق میں عذاب تھے، ان کے جانوروں کے حق میں ملکی انتظام اور ان کے چھوٹے بچوں اور وہاں کے مومنوں کے حق میں جو وہاں ہلاک ہو گئے رحمت، جس سے ان کے درجات اخروی بڑھ گئے، **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ ظلم کرنے پر قادر تو ہے مگر کرے گا نہیں، کیونکہ رب اگر ظلم پر قادر ہی نہ ہو تو اس کے ظلم نہ کرنے کی تعریف ہی کیا جیسے کہ دیوار کی تعریف یہ نہیں ہوتی کہ وہ ظلم نہیں کرتی یا جھوٹ نہیں بولتی! (تقویۃ الایمانی قانون) **جواب:** عیب نہ کرنا بھی وصف ہے، اور عیب نہ کر سکنا اور اس سے بالکل پاک و صاف ہونا بھی تعریف کے لائق ہے، اگر آپ کا یہ قاعدہ درست ہو تو لازم آئے گا کہ رب تعالیٰ سونے، کھانے، مرنے اور صاحبِ اولاد ہونے پر بھی قادر ہو، کہ قرآن کریم میں ان سب کی نفی سے خدا کی تعریف کی گئی ہے، رب تعالیٰ نے فرمایا وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ (انعام: ۱۴) اور فرمایا لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (بقرہ: ۲۵۵) اور فرمایا لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ (اخلاص: ۳) **پانچواں اعتراض:** قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان بھی سات ہیں، اور زمینیں بھی سات، پھر یہاں سموات جمع اور ارض واحد کیوں ارشاد ہوا؟ **جواب:** دو وجہ سے، ایک یہ کہ تمام زمینوں کی حقیقت ایک ہی ہے یعنی مٹی، مگر آسمانوں کی حقیقتیں مختلف ہیں، ان حقائق کے لحاظ سے آسمان کو جمع اور زمین کو واحد فرمایا جاتا ہے، دوسرے یہ کہ زمین کے تمام طبقے آپس میں ایسے چپٹے ہوئے ہیں جیسے پیاز کے چھلکے اور پرت، جس کی وجہ سے وہ

زمینیں حسا ایک ہیں، مگر آسمان ایک دوسرے سے پانچ پانچ سو سال کے فاصلے پر ہیں، لہٰذا وہ حسا بھی جداگانہ، **چھٹا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ آسمان وزمین کی چیزیں اللہ کی ہیں، تو کیا ان کے خلاء کی چیزیں کسی اور کی ہیں، اور کیا عالم امر اور عالم انوار وارواح وغیرہ جو کہ آسمانی احاطہ سے باہر ہیں وہ رب تعالیٰ کے نہیں؟ **جواب:** یہاں عالم اجسام کا ذکر ہے جو ہمیں نظر آرہا ہے، دوسرے عالم جو ہمارے حواس سے خارج ہیں ان کا ذکر نہیں، اور چونکہ آسمان وزمین اس عالم اجسام کے دو کنارے ہیں ان کے ذکر سے درمیانی چیزوں کا ذکر خود بخود ہوگیا، اگر کہا جائے کہ کراچی سے پشاور تک پاکستان ہے، تو مطلب یہ نہ ہوگا کہ ان کے درمیان کوئی اور ملک ہے، **ساتواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام کام اللہ کی طرف لوٹتے ہیں، جہاں سے آئے وہاں پھر جانے کا نام لوٹنا ہے، تو کیا سب اچھے اور برے کام رب تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں، **جواب:** عربی میں رجوع کے چند معنی ہیں، ۱۔ جہاں سے آئے تھے وہاں جانا جیسے اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓی اَبِیْكُمْ (یوسف: ۸۱) ۲۔ غلام کا حاکم کے سامنے پیش ہونا جیسے ارْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ (یوسف: ۵۰) ۳۔ کسی کے سامنے کوئی معاملہ پیش کرنا، کہا جاتا ہے کہ اس معاملہ میں حکام کی طرف یا اس بیماری میں حکیم کی طرف رجوع کرو، ۴۔ مجاز سے گزر کر حقیقت تک پہنچنا، یہاں یہ سارے معنی بن سکتے ہیں کہ سب کی ابتداء بھی رب تعالیٰ سے ہے اور سب کی انتہا بھی رب تعالیٰ پر هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (الحدید: ۳) نیز سب کو مع اپنے اعمال کے قیامت میں رب تعالیٰ کے حضور پیش ہونا ہے، نیز دنیا میں پہلے انسان ہر طرف بھاگتا ہے، پھر آخر تھک ہار کر رب تعالیٰ کے دروازے پر گرتا ہے، وہ مجاز تھا یہ حقیقت ہے، غرضکہ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ کا نظارہ ہوتا ہی رہتا ہے،

تفسیر صوفیانہ

نقوش قرآن کی جگہ کاغذ ہے، الفاظ قرآن کی جگہ زبان یا کان، معانی قرآن کی جگہ اذہان، مقاصد قرآن کی جگہ ارکان یعنی اعضائے ظاہری، اور اسرار قرآن کی جگہ جنان یعنی دل ہے، حضور نبی کریم ﷺ پر ان چاروں چیزوں کا نزول ہوا، جبریل امین الفاظِ قرآن لاتے تھے، باقی اسرار قرآنی مقاصدِ قرآنی کا القاء بلا واسطہ رب تعالیٰ کی طرف سے ہوتا تھا، رب تعالیٰ فرماتا ہے نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ الخ (بقرہ: ۹۷) اور حضور انور ﷺ نے ان کی تبلیغ مختلف طریقوں سے فرمائی، بعض کی تبلیغ عمومی تھی اور بعض کی خصوصی، یہاں اسی بلا واسطہ نزول کا ذکر ہے کہ فرمایا گیا نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ تلاوت الفاظ کی نوعیت اور ہے تلاوت معانی کی نوعیت اور، تلاوت مقاصد واسرار کی کیفیت جداگانہ ہے، حضرات انبیائے کرام علیہم السلام فیض دینے والے مختلف آسمان ہیں، اور دیگر لوگ اپنی حیثیت کے لائق فیض لینے والی مختلف زمینیں، فرمایا جارہا ہے کہ ان نبوت کے آسمانوں میں جو فیوض و برکات ہیں، وہ بھی ہماری طرف سے ہیں، اور جو لوگوں کے دلوں کی زمین میں مختلف تاثرات ہیں، وہ بھی ہماری طرف سے ہیں، بجلی کا پاور یکساں آتا ہے مگر مختلف طاقتوں کے رنگ برنگ بلب اپنی حیثیت کے لائق فیض لیتے ہیں، بارش تمام زمینوں پر یکساں برستی ہے، مگر زمین کے مختلف طبقے اپنے میں بویا ہوا تخم ہی اگاتے ہیں، ان سب کی ابتداء بھی رب تعالیٰ کی طرف سے تھی اور آخر کار ان کا رجوع بھی رب تعالیٰ ہی کی طرف ہوگا، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ زمین میں خواہ کیسا ہی اعلیٰ تخم بویا ہوا

ہواور زمین خواہ کیسی ہی عمدہ ہو مگر کسی وقت بھی آسمان سے بے نیاز نہیں، اسے ہمیشہ دھوپ، بارش، سردی گرمی وغیرہ کی حاجت رہتی ہے اور یہ سب چیزیں آسمان سے ہی آتی ہیں یونہی کوئی شخص کیسے ہی اعلیٰ طبقہ کا ہو، اور کتنے ہی عمدہ عمل کرتا رہے، مگر فیضان نبوت سے ایک ساعت کے لئے بھی مستغنی نہیں، وہ زندگی وموت، قبر وحشر میں نبی کا محتاج ہے کہ قبر میں انہی کی پہچان پر اور حشر میں انہی کی شفاعت پر بیڑا پار ہوگا، ایمان، عرفان، تقویٰ وغیرہ کی ہر وقت ہر شخص کو ضرورت ہے، اور یہ تمام اسی آستانے کے فیوض ہیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ
ہو تم بہترین امت ظاہر کی گئی واسطے لوگوں کے حکم کرتے ہو
تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں بھلائی کا
بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ
بھلی چیزوں کا اور منع کرتے ہو بری چیزوں سے اور ایمان رکھتے ہو اللہ پر
حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو
وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ
اور اگر ایمان لے آتے کتاب والے تو البتہ ہوتا ان کے لئے اچھا
اور اگر کتابی ایمان لاتے تو ان کا بھلا تھا
مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾
ان میں سے کچھ مومن ہیں اور زیادہ بدکار
ان میں کچھ مسلمان ہیں اور زیادہ کافر

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں فرمایا گیا تھا کہ قیامت میں کچھ منہ کالے ہوں گے کچھ اجیالے، کالے منہ کفار کے ہوں گے، اور روشن چہرے والے اللہ کی رحمت میں، مگر یہ نہ بتایا گیا تھا کہ روشن چہروں والے کون لوگ ہوں گے، اب اس آیت میں اس خوش نصیب جماعت کا تعین فرمایا جارہا ہے کہ اے مسلمانو چمکیلے چہرے والے تم ہی لوگ ہو، گویا یہ آیت اس کی تفسیر ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیات میں ارشاد ہوا تھا کہ اے مسلمانو تم میں ایک مبلغ جماعت رہنی چاہیے، جس سے شبہ ہوتا تھا کہ باقی مسلمانوں پر مطلقاً تبلیغ نہیں، اب اس شبہ کو دور کیا جارہا ہے اور فرمایا جارہا ہے کہ مطلقاً تبلیغ تو ہر مسلمان پر ہے، وہاں اس تبلیغ کا ذکر تھا جس میں اپنی عمر صرف کردی جائے اور بجز تبلیغ کوئی

مشغلہ اختیار نہ کیا جائے، گویا یہ آیت پچھلی آیتوں سے وہم دفع کر رہی ہے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں حضور انور ﷺ کی مدحت وثناء کی گئی تھی کہ آپ پر ہم آیات تلاوت فرماتے ہیں، اب حضور ﷺ کے طفیل ان کے غلاموں کی تعریف کی جارہی ہے، کہ اس شاندار نبی کی امت بھی شاندار ہے، **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ نے اپنی حمد بیان فرمائی، کہ آسمانوں وزمین کی ہر چیز ہماری ہے، اب اپنے مومن بندوں کی تعریف فرمائی جارہی ہے کہ ہم ایسی شان والے ہیں کہ ایسے شاندار بندے پیدا فرمائے، غرضکہ یہ آیات حمد الٰہی، نعت مصطفوی اور منقبتِ مسلمین کا مجموعہ ہیں،

شان نزول

ایک مرتبہ مالک ابن صیف اور وہب ابن یہودا علمائے یہود نے حضرت عبداللہ ابن مسعود، ابی ابن کعب، معاذ ابن جبل، سالم مولیٰ حذیفہ اور دیگر انصار سے کہا کہ تم نے مسلمانوں میں کیا خوبی دیکھی کہ ہم سے محبت توڑ کر ان سے محبت جوڑ لی! ان بزرگوں نے جواب دیا کہ مسلمانوں کا دین بہترین دین ہے، اور ان کی قوم بہترین اقوام ہے اور ان کے نبی افضل الانبیاء ہیں، تب وہ یہودی بولے، نہیں بلکہ یہودیت تمام دینوں سے افضل ہے اور بنی اسرائیل تمام جہان سے اعلیٰ، تمہارا قرآن بنی اسرائیل سے فرمارہا ہے وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ (بقرہ:۴۷) تب ان یہود کی تردید میں اور ان بزرگوں کی تائید میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (از تفسیر خازن وخزائن عرفان ومعانی وابن جریر عن عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

تفسیر

كُنْتُمْ كَانَ یا زائدہ ہے یا تامہ یا ناقصہ یا بمعنی صَارَ، اگر كَانَ ناقصہ ہو تو اس کے معنی ہیں تھے تم یا ہو تم یا ہو گئے تم، اور اگر بمعنی صَارَ ہے تب معنی ہوں گے ہو گئے تم، اور یہاں خطاب یا ان بزرگوں سے ہے جنہوں نے یہودیوں کو مذکورہ بالا جواب دیا، یا سارے صحابہ کرام سے یا ساری امت رسول اللہ ﷺ سے (تفسیر کبیر) اگر اس کے معنی ہوں "تم تھے" تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کے علم میں یا لوح محفوظ میں یا گذشتہ آسمانی کتب میں یا پچھلے انبیائے کرام علیہم السلام کے بیانوں میں یا پچھلی امتوں کے عقیدوں میں تم بہترین امت تھے (کبیر) خَیْرَ اُمَّةٍ امت کے معانی پہلے بیان ہو چکے، یہاں اتنا سمجھ لو کہ حضور نبی کریم ﷺ کی امت دو قسم کی ہے، ایک وہ جن کے حضور ﷺ نبی ہیں اور جن پر حضور ﷺ کا ماننا فرض ہے، اسے امتِ دعوت کہتے ہیں، دوسری وہ جنہوں نے حضور انور کو صحیح طور پر مان بھی لیا اور حضور ﷺ پر ایمان لے بھی آئے، انہیں امت اجابت کہتے ہیں، سارا عالم حضور انور ﷺ کی امتِ دعوت ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (فرقان:۱) اور امت اجابت مسلمان ہیں، یہاں امت اجابت مراد ہے، خیر سے مراد ہے دنیا میں بہتر، آخرت میں افضل، یا تو یہاں صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے، اصل میں اُمَّةً خَیْرًا تھا یا اضافت من والی ہے اور امت سے مراد یا صرف مسلمان ہیں یا پچھلی امتیں یعنی امت اسم جنس ہے، اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کا ترجمہ اسی طرف اشارہ کر رہا ہے یعنی اے صحابہ کرام تم ساری امت مصطفیٰ ﷺ میں افضل و بہتر ہو کہ کوئی غوث وقطب تمہاری گردِ قدم کو نہیں پہنچ سکتا، یا اے مسلمانو تم ساری امتوں سے افضل ہو، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ یہ جملہ یا تو خَیْرَ اُمَّةٍ کی صفت ہے یا اُمَّة کی، اعلیٰ حضرت کا

تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا تراب خشک مٹی کو کہتے ہیں۔ اور وابل وہ بارش ہے جس کے قطرے وزنی ہوں۔ اس کا مادہ وبلٌ ہے بمعنی بوجھ۔ اسی سے وبال بمعنی مصیبت اور وبیل بمعنی مصیبت کا خوف بھی ہے۔ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ (تغابن: ۵) اور جیسے فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّ بِيْلًا۔ (مزمل: ۱۶) صلد وہ سخت اور چکنا پتھر جس پر نہ غبار ہو اور نہ کچھ اُگے۔ اسی لئے گنجے سر کو اس صلد کہتے ہیں۔ جس پر بال نہ اگیں۔ ریاء کار منافق بے وقوف کسان ہے۔ اور اس کا صدقہ پتھر کا غبار اس سے نفع کی امید اس گھاس کی طرح ہے جو پتھر پر کبھی اگ آئے اور اس کا کفر یا نفاق یا موت یا قیامت تیز بارش ہے۔ اور وہاں ثواب کا نہ ملنا اس پتھر کا غبار سے صاف ہو جانا ہے۔ یا یوں سمجھو کہ کافر چٹان ہے۔ اس کی خیرات مٹی کفر تیز بارش اور عمل کی بربادی۔ اس پتھر کا دھل جانا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا۔ اس کا فاعل اَلَّذِيْ ہے کیونکہ اس سے ایک گروہ مراد تھا۔ نہ قدرت رکھنے سے نہ پانا مراد ہے۔ اور شی سے ثواب اور كَسَبُوْا سے اعمال یعنی وہ اپنے کسی عمل کا ثواب نہیں پاتے۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ۔ لَا يَهْدِيْ یا تو بمعنی مستقبل ہے یا بمعنی حال یعنی اللہ کفار کو قیامت کے دن راہ جنت کی ہدایت نہ دے گا۔ یا دنیا میں انہیں اعمال درست کرنے کی ہدایت نہیں دیتا۔ وہ ہر کام بگاڑ کر ہی کرتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اس آیت کی تفسیر و تشبیہ سمجھنے سے پہلے ایک مثال ذہن نشین کر لو کسی بادشاہ نے کارخانہ والے کو جہاں ہر قسم کا مال تیار ہوتا ہے، بہت بڑا آرڈر دیا کہ ایک لاکھ فوجی وردیاں دو لاکھ گھوڑوں کی کاٹھیاں بہت جلدی جلدی تیار کر دو جن کا میٹریل فلاں فلاں قسم کا ہو۔ اور ساتھ ہی نمونے دیئے کہ اس انداز ے اور اس نمونے کی چیزیں ہوں۔ کارخانہ والوں نے میٹریل تو صحیح استعمال کیا۔ مگر نمونہ بدل دیا ناپ نمونہ میں فرق کر دیا۔ لہٰذا بادشاہ اس مال کو نہ قبول کرے گا۔ نہ قیمت دے گا۔ اب سمجھو کہ ہم لوگ کارخانہ دار ہیں۔ ہماری زندگیاں کارخانہ ہیں۔ جن میں اعمال تیار ہوتے ہیں۔ رب تعالیٰ خریدار شہنشاہ اس نے ہم کو نماز روزے حج زکوٰۃ وغیرہ کا آڈر دیا۔ جس کے ارکان بتا دیئے گئے۔ مگر ساتھ ہی فرما دیا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (احزاب: ۲۱) ہمارے رسول کے نمونہ پر اعمال تیار کر لو۔ اب جس کے اعمال اس نمونے کے مطابق ہوں گے وہ قبول ہوں گے جنت بھی ملے گی اور جس کے اعمال کفار۔ شیاطین کے نمونہ کے ہوں گے وہ رد ہوں گے۔ صدقہ پر طعن و تشنیع کرنا کفار کا نمونہ ہے۔ ہمارے محبوب نے ایسا صدقہ نہ کیا تھا لہٰذا وہ رد ہو گا حضور انور تو وہ صدقہ دیتے تھے شعر۔

جب لینے کو بھیک آئے سر کوئے گدایاں　　لب پر یہ دعا تھی تیرے منگتے کا بھلا ہو

یہ ہی حال نماز حج بلکہ زندگی موت کا ہے۔ جب یہ مثال سمجھ لی تو اب تفسیر سنو۔ اے مسلمانو! فقیر پر احسان رکھ کر یا اسے ایذا پہنچا کر اپنے خیرات کا ثواب اس منافق کی طرح برباد نہ کر لو۔ جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے کہ لوگ مجھے سخی کہیں۔ نہ اس کا ایمان خدا پر ہے نہ قیامت پر اس منافق کی حالت یا طعنہ اور تکلیف سے ثواب برباد کرنے والے کی کہاوت ایسی ہے جیسے کوئی نادان کسان ایسے پتھر پر بیج بو دے جس پر ہلکی سی گرد و غبار کی تہ جمی ہوئی ہے۔ اس کے بیج سے کچھ سبزی اگ آئے۔ وہ سمجھے کہ میں اس بونے میں کامیاب ہوا۔ اور دوسرے کسانوں کی طرح وقت پر میں بھی کھیت کاٹوں گا۔ وہ اسی خیال میں تھا کہ اچانک تیز بارش آ گئی جس نے اس مٹی کی تہ کو دھو دیا اس پر جمے ہوئے گھاس پھوس کو بالکل ختم کر دیا۔ اور

سے نکاح کر لے، تیسرے وہ اہل کتاب جو مسلمان ہو جائے، یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ علمائے یہود آمدنیاں بند ہونے کے خوف سے ایمان نہیں لاتے، ورنہ وہ اسلام کی حقانیت جانتے ہیں، لیکن اگر یہ لوگ ایمان لے آئیں تو انہیں پہلے سے زیادہ اور بہتر وطیب آمدنیاں ہوں مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ منھم کا مرجع اہل کتاب ہیں، لفظ اہل کتاب صورۃً واحد ہے اور معنی جمع، اس لئے ضمیر جمع ادھر لوٹ سکتی ہے، اور مومنین سے مراد سیدنا عبداللہ ابن سلام اور ان کے وہ ساتھی ہیں جو پہلے یہودی تھے اور پھر حضور انور ﷺ پر ایمان لا کر صحابی بنے، ایسے ہی نجاشی بادشاہ اور ان کے ساتھی جو پہلے عیسائی تھے پھر مسلمان ہوئے، یعنی ان اہل کتاب میں سے بعض وہ بھی ہیں جو صحیح معنی میں مومن ہیں وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ فاسق فسق بنا بمعنی حد سے نکل جانا، بدعمل کو بھی فاسق کہتے ہیں گمراہ کو بھی اور کافر کو بھی، مگر جب فاسق کا مقابلہ مومن سے ہوگا، تو اس کے معنی کافر ہوں گے، چنانچہ یہاں بمعنی کافر ہی ہیں یعنی اہل کتاب میں تھوڑے ہی لوگ ایمان لائے باقی کافر ہی رہے،

خلاصہ تفسیر

اس آیت کریمہ کی بہت سی تفسیریں ہیں جو ابھی تفسیر کے سلسلہ میں عرض کر دی گئیں، ہم یہاں خلاصہ میں صرف دو تفسیریں عرض کرتے ہیں،

تفسیر اول

اے جماعت صحابہ کرام جنہیں ایمان کے ساتھ دیدار نبی بھی میسر ہوا، تم لوگ ساری امت رسول اللہ ﷺ سے بہتر اور افضل ہو، کہ کوئی شخص کتنے ہی نیک عمل کرے تمہارے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا، تم سارے مسلمانوں کے لئے نشانِ ہدایت بنا کر پیدا کئے گئے ہو، تم وہ ہدایت کے تارے ہو، کہ تمہارے ذریعہ ساری امت رسول اللہ ﷺ کے بیڑے پار لگیں گے سب کا ایمان واعمال تم سے وابستہ ہیں، تمہاری صفت یہ ہے کہ تاقیامت لوگوں کو بھلائیوں کا حکم دو اور برائیوں سے روکو کہ تم ہی سے نبوت کا فیض دنیا میں جاری ہو، اور تمہاری بتائی ہوئی احادیث وتفاسیر پر لوگ عمل کر کے اچھائیاں اختیار کریں اور برائیوں سے بچیں، اس امت مسلمہ میں اللہ تعالیٰ پر صحیح طور پر ایمان لانے والے پہلے تم ہو کہ تم نے قرآن شریف کی جیتی جاگتی تفسیر نورانی تصویر یعنی حضور محمد مصطفیٰ ﷺ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، تم مسلمانوں کی صف اول ہو، کہ امام کو صرف تم دیکھ رہے ہو، اور آئندہ لوگ تمہارے نقشِ قدم کو دیکھیں گے، اگر تمہاری طرح مدینہ کے اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو ان کا بھلا ہو جاتا کہ وہ بھی خلق کے مقتداء بن جاتے، مگر ہوا یہ کہ ان میں سے تھوڑے لوگ تو ایمان لے آئے، جیسے سیدنا عبداللہ ابن سلام اور ان کے ساتھی، اور بہت سے لوگ اپنی ناجائز عزتیں اور آمدنیاں برقرار رکھنے کے لئے کافر ہی رہے،

دوسری تفسیر

اے محبوب کی امت تاقیامت مسلمانو! تم ساری گذشتہ امتوں سے بہتر ہو، تمہیں لوگوں کے بھلے کے لئے پیدا کیا گیا کہ تم ہی قیامت میں انبیائے کرام کے حق میں گواہی دو گے، اور گواہ مدعی کو بڑا پیارا ہوتا ہے، تم تو سارے نبیوں کو پیارے ہو، تمہارے ذریعہ لوگوں میں تبلیغ ہوگی اور کافر مسلمان ہوں گے، تمہارے ہی ذریعہ لوگوں پر اللہ کی رحمتیں آئیں گی، تمہاری ہی بقاء سے لوگوں

باطل کرنے کے لئے ایک ہی کافی ہے۔ **دوسرا اعتراض:** بارش کی مثال غلط ہے وہ تو رب کی رحمت ہے جس سے کھیت کو قوت ملتی ہے اور اس سے پتھر صاف ہو جاتا ہے۔ منافق کے عمل کو اس سے کیوں تشبیہ دی گئی (بعض بے دین) **جواب:** تشبیہ کی وجہ ہم تفسیر میں بیان کر چکے۔ بارش اس کھیت کے لئے فائدہ مند ہے جو صحیح زمین میں بویا جائے۔ اینٹوں پتھروں پر جو گھاس اگ آتی ہے وہ بارش سے برباد ہو جاتی ہے۔ یہ ہی یہاں بتانا منظور ہے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جیسے نیکیوں سے برائیاں مٹ جاتی ہیں اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (ہود: ۱۱۴) ایسے ہی گناہوں سے نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ دیکھو طعنہ ایذا گناہ ہیں۔ جن سے صدقے برباد ہو گئے۔ (معتزلہ) **جواب:** اس آیت کے معنی یا تو یہ ہیں کہ باطل صدقے نہ دو۔ نہ یہ کہ صدقہ صحیحہ کو طعنہ سے باطل نہ بناؤ ریاء کار کا صدقہ اول ہی سے غلط ہے۔ یا یہ مطلب کہ اس کا ثواب مٹ کھو دو ریا سے عمل باقی رہتا ہے۔ محض ثواب جاتا رہتا ہے۔ بخلاف گناہوں کے کہ وہ نیکیوں کی برکت سے اصل سے ہی مٹ جاتے ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** اگر لوگوں کو دکھا کر اعمال کرنا ریا اور برا ہے۔ تو نبی ﷺ نے اونٹ پر طواف اور ممبر پر نماز لوگوں کو دکھانے کے لیے کیوں ادا فرمائی؟ **جواب:** لوگوں کو اپنے ایمان دکھانے کی تین وجہ ہوتی ہیں۔ تبلیغ، ترغیب، اپنی ناموری۔ پہلی دو صورتیں تو بڑی اہم عبادت ہیں۔ آخر صورت بری۔ اس آخری صورت کو ہی ریا کہا جاتا ہے۔ یہ ہی بری ہے حضور انور ﷺ کا اپنے اعمال لوگوں کو دکھانا، تعلیم تبلیغ کے لیے تھا۔ حضور انور ﷺ اس کے مامور تھے۔ صحابہ کرام کا بعض اعمال لوگوں کو دکھا کر کرنا ترغیب کے لیے تھا۔ موجد نیکی کو بہت ثواب ملتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

صدقہ صدق سے بنا بمعنی سچائی، جس صدقہ میں صداقت اور سچائی نہ ہو وہ صدقہ ہی نہیں۔ صدقہ میں چار حروف ہیں۔ ص، د، ق، ہ، ص سے صد بمعنی (رکاوٹ) کی طرف اور دسے دلالت (بمعنی رہنمائی) کی طرف اشارہ ہے۔ ق سے قرب الی اللہ اور ہ سے ہدایت کا پتہ لگتا ہے گویا صدقہ کے چار فائدے ہیں۔ (۱) صدقہ نقصان، چوری، ڈکیتی وغیرہ ہر مصیبت کے مقابلہ میں رکاوٹ ہے۔ (۲) صدقہ نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ (۳) رب سے قریب تر کرتا ہے۔ جنت کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ جب صدقہ فقیر کے ہاتھ میں پہنچتا ہے تو دینے والے کو خطاب کر کے پانچ باتیں عرض کرتا ہے۔ اے خیرات کرنے والے! میں قلیل تھا تو نے مجھے کثیر بنا دیا۔ (۲) میں حقیر تھا تو نے مجھے عظیم بنا دیا۔ (۳) میں فانی تھا تو نے مجھے باقی کر دیا۔ (۴) میں دنیا کی گھومنے والی حقیر دولت تھا تو نے اپنے صدق و اخلاص سے مجھے آخرت کی پائیدار نعمت بنا دیا۔ (۵) مہربانی کر کے مجھے برباد نہ کرنا۔ زندہ اور آباد رکھنا۔ مجھے اخلاص کے پانی اور ایمان کی ہوا سے سرسبز رکھنا۔ مگر یہ تمام خوبیاں اس صدقہ میں ہیں جو اخلاص سے ہو۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ ریا کار بندہ اس شخص کی طرح ہے جس کے کیسہ میں ٹھیکریوں کے روپیہ بندھے ہوں۔ لوگ اسے دیکھ کر مالدار سمجھیں۔ مگر بازار میں اس کی کوئی قیمت نہ ہو ایسے ہی ریا کار کو صرف لوگوں کی تعریف ملے گی۔ بازار قیامت میں اس سے کوئی سودا نہ خرید سکے گا۔ ضروری ہے کہ سکہ کی چاندی بھی کھری ہو۔ اور اس کی مہر بھی درست، مال حلال اس کی چاندی ہے۔ اور اخلاص اس کی مہر اس لئے بعض لوگ نابینا فقیروں کو خیرات دیتے ہیں بعض علمائے کرام سوتے ہوئے فقیر کے کپڑے میں کچھ باندھ آتے تھے تاکہ اسے خبر نہ ہو کہ کون دے گیا۔ مولانا فرماتے ہیں ۔

گفت پیغمبر بیک صاحب ریا | صَلِّ اِنَّکَ لَمْ تُصَلِّ اَیْ فَتٰی
از برائے چارۂ ایں خوف ہا !! | آمد اندر ہر نمازے اِهْدِنَا
کیں نمازم را میامیز اے خدا | با نماز ضَآلِّیْنَ و اہل ریا

خیال رہے کہ دنیا داروں کو دکھانا اور انہیں راضی کرنا ریا کاری ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کو اپنی نیکیاں دکھانا اور انہیں راضی کرنا عین عبادت۔ کیونکہ ان کی رضا میں رب کی رضا ہے، جس عمل سے حضور ﷺ راضی نہ ہوں اس سے رب بھی راضی نہیں۔ رب فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ (التوبہ ۶۲) ایک بار حضور ﷺ نے ابوموسیٰ اشعری سے فرمایا کہ آج آخر رات ہم تمہارے دروازہ پر گئے اور تمہارا قرآن پاک سنا۔ تمہیں رب نے لحن داؤدی دی ہے۔ عرض کیا کہ اگر مجھے خبر ہوتی کہ میرا قرآن صاحب قرآن ﷺ سن رہے ہیں۔ تو اور بھی عمدہ طریقے سے پڑھتا۔ اس کی پوری تحقیق ہماری کتاب سلطنت مصطفےٰ اور شانِ حبیب الرحمٰن میں دیکھو۔ دیکھو ہجرت کے بعد فتح مکہ کے پہلے مسلمانوں کو مکہ معظمہ میں رہنا حرام ہو گیا۔ سوائے معذورین کے جو لوگ وہاں رہے ان پر قرآن کریم میں سخت عتاب ہوا حالانکہ مکہ معظمہ کعبۂ مقام ابراہیم عرفات و منیٰ سب تھے کیوں اس لئے کہ اس وقت وہاں رہنے سے اللہ کے حبیب راضی نہ تھے۔ ایک بار حضور ﷺ نے محض صحابہ کو حکم دیا کہ کل فجر کے بعد جہاد میں روانہ ہو جائیں۔ سب چلے گئے ایک صحابی نے خیال کیا کہ آج جمعہ ہے۔ نماز جمعہ کو حضور کے پیچھے پڑھ کر جاؤں گا اور لشکر سے مل لوں گا۔ نماز جمعہ کے بعد حضور نے ٹھہر جانے کا سبب پوچھا۔ انہوں نے ماجرا عرض کر دیا۔ فرمایا کہ جو ثواب ان لوگوں کو صبح نکل جانے اور جنگل میں ظہر پڑھنے کا مل گیا۔ وہ تم کو یہاں میرے پیچھے صدہا جمعہ پڑھنے کا نہیں مل سکتا۔ کیوں حضور انور کی رضا کی وجہ سے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ معاملات میں دنیوی اغراض کا شامل ہونا حق سے اعراض (منہ پھیرنا) کی علامت ہے۔ جس نے حق سے اعراض کیا اس نے باطل کو لیا۔ اور جس نے باطل کو لیا اس نے اپنے اعمال کے حقوق باطل کر دیئے۔ جب تم نے فقیر پر صدقہ کا احسان جتایا تو معلوم ہوا کہ صدقہ سے تم طالبِ حق نہ تھے۔ ورنہ تم فقیر کا احسان مانتے کہ اس نے تم سے چند پیسے لے کر تمہیں رب تک پہنچا دیا۔ ہمارے مشرب میں جنت حاصل کرنے یا جہنم سے بچنے کے لئے نیکی کرنا بھی غلطی ہے۔ عاشق کی نظر صرف محبوب پر چاہیے۔ جب کسی بندہ پر عشق الٰہی غالب ہوتا ہے تو مال و اولاد اور نفس میں شرکت کی رگ کاٹ ڈالتا ہے۔ وہ اپنے کام کی اجرت دیدار یار کو قرار دیتا ہے۔ مولینا فرماتے ہیں۔

عاشقاں را شاد مانی و غم اوست | دست مزدو اجرت خدمت ہم اوست
غیر معشوق ار تماشائی بود !! | عشق نہ بود ھرزہ سودائی بود
عشق آں شعلہ است کوچوں برفروخت | ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(روح البیان) مولینا غنیمت فرماتے ہیں۔

بر آمد در مکتب خروشم | کہ من سیپارۂ دل مے فروشم
بگفتہ قیمتش گفتم نگاہے | بگفتہ کم ترک گفتم کہ گاہے

سیپارۂ دل کی قیمت یار کی نگاہ ناز ہے۔ اگر وہ کم کرائے تو نگاہ گاہ بگاہ کر لیا کرے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ قدرت نے قریباً

جیسا کہ خَيْرَ اُمَّةٍ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** یہ امت مرحومہ ہمیشہ سے افضل ہے اور رہے گی جیسا کہ کُنْتُمْ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا، **چوتھا فائدہ:** اس امت کی موجودگی عالم کے بقاء کا سبب ہے کہ اگر یہ نہ رہے تو دنیا ختم کردی جائے جیسا کہ لِلنَّاسِ کی تیسری تفسیر سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** ہر مسلمان کو مبلغ ہونا چاہئے کہ جسے جو مسئلہ معلوم ہو دوسرے کو بتادے اور عمل سے بھی تبلیغ کرے جیسا کہ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ کے عموم سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** حضور انور ﷺ کو ماننا رب تعالیٰ کو ماننا ہے جیسا کہ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا، **ساتواں فائدہ:** مبلغ کو چاہیے کہ اللہ پر توکل رکھے، دنیا سے امید وخوف منقطع کرے، ورنہ وہ لوگوں کو صحیح تبلیغ نہیں کر سکتا جیسا کہ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا، علمائے یہود اسی لئے توریت کی صحیح تبلیغ نہ کر سکے کہ انہیں اپنے نذرانے بند ہوجانے کا اندیشہ تھا، **آٹھواں فائدہ:** حضور انور ﷺ کا انکار درحقیقت رب تعالیٰ کا بھی انکار ہے اور ساری ایمانیات کا بھی، دیکھو اہل کتاب رب تعالیٰ کی ذات وصفات، قیامت وغیرہ کے اقراری تھے، مگر رب تعالیٰ نے فرمایا لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اگر کتابی ایمان لے آتے، **نواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والے مبلغ کو دنیا میں بھی عزت، دولت، شہرت اور عافیت وغیرہ ملتی ہے اور آخرت میں بھی مغفرت، رحمت اور جنت وغیرہ ملے گی جیسا کہ خَيْرًا لَّهُمْ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا، جس میں فرمایا گیا کہ اگر کتابی ایمان لے آتے تو انہیں یہ سب کچھ ملتا، **دسواں فائدہ:** مسلمانوں کا اجماع شرعی حجت ہے کہ جو مسئلہ قرآن وحدیث میں موجود نہ ہو اور علمائے امت متفقہ طور پر اس کا کوئی فیصلہ کردیں تو اس کا ماننا ایسا ہی ضروری ہوگا جیسا قرآن وحدیث کا ماننا ضروری ہے، یہ فائدہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ سے بھی نکالا اور تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ کے عموم سے بھی، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ الخ (النساء:۱۱۵) یعنی جو مسلمانوں کے راستہ کے علاوہ کسی اور راستہ پر جائے گا ہم اسے جہنم میں جھونک دیں گے، فرمایا نبی کریم ﷺ نے جسے مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک اچھا ہے،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمان سب سے افضل ہیں، دوسرے مقام پر رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (بقرہ:۴۷) اے اسرائیلیو میں نے تم کو تمام جہانوں پر بزرگی دی دونوں آیتوں میں تعارض ہے، **جواب:** یہاں دائمی افضلیت مراد ہے، اور وہاں اس آیت میں بنی اسرائیل کی عارضی افضلیت کا ذکر ہے یعنی اس زمانہ میں جب یہ امت موجود نہ تھی بنی اسرائیل افضل تھے اور اب مسلمان افضل، رات میں جب سورج موجود نہ ہو، چاند افضل ہوتا ہے مگر دن میں سورج نکل آنے پر چاند کی کوئی حقیقت نہیں رہتی، **دوسرا اعتراض:** یہاں تبلیغ کا ذکر پہلے ہے اور ایمان کا بعد میں حالانکہ ایمان تبلیغ سے مقدم ہے تو چاہیے تھا کہ ایمان کا ذکر پہلے ہوتا، **جواب:** ایمان تبلیغ کی شرط ہے، اور شرط کا ذکر بعد میں بھی کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ نماز فرض ہے وضو کے ساتھ یہاں بھی یہی مطلب ہے کہ تمہاری شان یہ ہے کہ لوگوں کو تبلیغ کرو، اس حال میں کہ مومن ہو، اور اگر ایمان سے مراد توکل ہو تو، تب تو بالکل ظاہر ہے یعنی تم ہی صحیح تبلیغ کر سکتے

قبول ہوتی ہے۔ نفقہ سے صدقات و خیرات اور اموال سے ہر قسم کے مال مراد۔ اَمْوَالَهُمْ فرمانے میں اس جانب اشارہ ہے کہ جب وہ ان کے اپنے ہوں تب خیرات کریں۔ (یعنی زندگی و تندرستی میں مرتے وقت) مرنے کے بعد مال ورثاء کا ہو جاتا ہے۔ خیال رہے کہ قیمت اجرت ہدیہ نذرانہ عطیہ یہ کام نفقے ہیں۔ اگر یہ رضاء الٰہی کے لئے ہوں تو سب کا ثواب ہے۔ حج کی سواری کا کرایہ مسجد کی زمین خریدنا فقیر کو کچھ دینا۔ بچوں پر خرچ یہ سب اس یُنْفِقُوْنَ میں داخل ہیں۔ یعنی ان مسلمانوں کی کہاوت جو اپنے مال خیرات کرتے ہیں۔ اِبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ۔ اِبْتِغا۔ باب افتعال کا مصدر ہے۔ بغی بمعنی طلب و تلاش سے بنا۔ کہا جاتا ہے بغیت خیال رہے کہ باغی بغاوت سے بنا ہے۔ نہ کہ بغی سے۔ یہاں ینفقون کا مفعول لہٗ ہے۔ لام پوشیدہ مرضات بمعنی رضا ہے۔ یعنی اللہ کی رضا تلاش کرنے کے لئے۔ بعض نے کہا کہ ابتغاء بمعنی اسم فاعل ینفقون کے فاعل سے حلال ہے۔ ابتغا اور مرضات میں دو طرف اشارہ ہے ایک یہ کہ تلاش کرنے والا ہر جگہ پر دروازہ پر جستجو کرتا ہے دنیا کا تلاشی نوکری تجارت کاشت غرضکہ جہاں تک اس کا بس چلتا ہے وہاں تک کاروبار کرتا ہے گمشدہ پیسے کا جویاں ہر دروازے پر ہر محلہ ہر شہر میں ڈھونڈتا ہے لہٰذا طالب مولیٰ کو چاہیے کہ اسے ہر دروازے پر ڈھونڈے جتنی نیکیاں کر سکے کرے حضرات اولیاء اللہ کے آستانوں کی حاضری دے۔ ہر جگہ صدقے دے حج زکوٰۃ نفلی صدقے غرضکہ صدقات کا تخم ہر جگہ بکھیرے نہ معلوم کہاں اور کب اگ پڑے ہر طلب میں جئے جستجو میں مرے دوسرا یہ کہ رب کی رضا چاہے۔ بلکہ مرضات چاہے پوری پوری اور خالص اس کی رضا تلاش کرے جس میں اپنے نفع کی خواہشات کا شائبہ نہ ہو۔ حتیٰ کہ جنت حاصل کرنے دوزخ سے بچنے کی آرزو بھی شامل نہ ہو محض رضاء الٰہی کی نیت ہو وہ چیزیں مل ہی جائیں گی۔ جسے بادشاہ مل گیا اسے سب کچھ مل گیا۔ شعر

مروت نہ باشد کہ اہل صفا بخواہند غیر از خدا از خدا

وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ...... تثبیت ثبات سے بنا اس کے معنی تصدیق یا یقین یا تحقیق یا قرار یا برقرار رکھنا ہے مِنْ یا تو زائدہ ہے یا تبعیضیہ یا ابتدائیہ یا بمعنی لام (روح المعانی و کبیر وغیرہ) یہ ترکیب میں یا تو ابتغاء پر معطوف ہے۔ اور ینفقون کا مفعول لہٗ یا تثبتون فعل محذوف کا مفعول مطلق یعنی اپنے نفس کو سکون و قرار دینے کے لئے خیرات کرتے ہیں کہ عبادات سے دل کا چین ہے۔ یا پہلے تحقیق کر لیتے ہیں کہ یہاں خرچ کرنے سے رب راضی ہوگا یا نہیں پھر خرچ کرتے ہیں۔ یا دلی اطمینان اور قبولیت کے یقین پر خرچ کرتے ہیں۔ یا صداقت ایمانی پر خرچ کرتے ہیں۔ یا اپنے نفسوں کو عبادت کا عادی بنانے کے لئے یا اپنے بعض نفس کو ایمان پر ثابت رکھنے کے لئے خیرات کرتے ہیں۔ یا خوشی سے اور رب تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خیرات کرتے ہیں کہ اس نے ہم کو اس عبادت کی توفیق بخشی۔ زکوٰۃ کو بوجھ ٹیکس سمجھ کر نہیں دیتے۔ کَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ۔ کاف تشبیہ کا اور مثل بمعنی کہاوت ہے۔ جنت کا مادہ جن بمعنی چھپنا ہے۔ جو باغ چار دیواری سے محفوظ کیا جائے۔ وہ جنت کہلاتا ہے۔ فراء نے کہا کہ بستان ہر باغ کو کہتے ہیں۔ اور جس باغ میں کھجوریں ہوں وہ جنت اور جس میں انگور ہوں وہ فردوس کہلاتا ہے۔ (خازن) ربوۃ ربو سے بنا بمعنی زیادتی اور بلندی اسی لئے سود اور اونچی کھیتی کو ربو کہا جاتا ہے۔ اونچی نالی کو بھی رابیہ کہتے ہیں۔ اصطلاح میں اونچی اور اعلیٰ درجہ کی ہموار زمین کو ربوہ بولا جاتا ہے جو دریا کے سیلابوں اور شہر کے گندے پانیوں سے محفوظ رہے۔ جس کے درخت خوش نما اور پھل بے شمار ہوں۔ یعنی مسلمانوں کی خیرات اس باغ کی طرح ہے جو بلند اور اعلیٰ

کے بعد توبہ نصیب ہو جائے وہ اس عبادت سے افضل ہے جس سے شیخی پیدا ہو جائے، ان حضرات کی توبہ کی قبولیت کا اعلان تو قرآن میں کر دیا گیا، رب تعالیٰ نے فرمایا عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ (آل عمران: ۱۵۵) ان کی ایسی خطائیں ہماری عبادات سے افضل،
ساتواں اعتراض: تمہاری دوسری تفسیر سے معلوم ہوا کہ سارے مسلمان تمام امتوں سے افضل ہیں حالانکہ جتنے گناہ و بدکاریاں مسلمانوں میں ہیں دوسری قوموں میں نہیں، اور جتنے برے پیشے مسلمان کرتے ہیں دوسری قومیں نہیں کرتیں، یہ عجیب خیریت ہے کہ سب سے بدتر کام کریں اور ہوں خیر الامم، **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ قرآن کریم کی یہ بشارت قوم مسلم کو ہے، رہے افراد وہ اس بشارت کے جب مستحق ہوں گے، جب اپنے میں وہ تین صفتیں پیدا کریں گے جو یہاں مذکور ہوئیں یعنی بھلائی کا حکم دینا، برائی سے روکنا، رب تعالیٰ پر صحیح معنی میں ایمان رکھنا، جو ان صفات سے محروم ہوا، وہ من حیث الفرد اپنی حرکتوں کی وجہ سے خیریت سے نکل گیا، رہی قوم مسلم، وہ بفضلہ تعالیٰ خیر ہے اور رہے گی کہ اس میں اولیاء، علماء، صلحاء تہجد گزار، شب بیدار ہمیشہ رہیں گے، دوسرے یہ کہ نبی کریم ﷺ سے نسبت اور بزرگان دین سے تعلق وہ اللہ کی رحمت ہے جس سے ہم جیسے گنہگار بھی خیر الامم ہیں، اور کفار کے ظاہری پرہیزگار بھی خیر الامم نہیں، فسٹ کلاس کا ڈبہ بھی انجن سے کٹ جائے تو اس کی کوئی قدر نہیں، تھرڈ کا پھٹا پرانا ڈبہ جس کی کڑی انجن سے ملی ہے قابلِ قدر ہے، حضور انور ﷺ کے قدم کی برکت سے سارا مکہ و مدینہ شریف و مقدس بن گیا کہ رب تعالیٰ نے ان کی قسم فرمائی، حالانکہ وہاں کفار بھی تھے اور کوڑیاں و روڑیاں بھی۔ پھولوں کی برکت سے، چمن کے کانٹے و گھاس بھی عظمت پا جاتے ہیں کہ لوگ ان کی سیر کرنے آتے ہیں، لہٰذا گنہگار، بدکار مسلمان بھی اس نسبت کی وجہ سے خیر امم ہیں اور یہ آیت بالکل برحق ہے، شعر

زاہد ان کا میں گنہگار وہ میرے شافع — اتنی نسبت مجھے کیا کم ہے تو سمجھا کیا ہے

علماء فرماتے ہیں کہ بے عمل عالم اندھے مشعل دار کی طرح ہے جو اپنے چراغ سے خود تو فائدہ نہیں اٹھاتا مگر دوسرے اس کے نور سے فیض لے لیتے ہیں،

تفسیر صوفیانہ

مخلوق صفات الٰہی کی مظہر ہے، رب تعالیٰ کی صفت تو ضار بھی ہے اور نافع بھی، مضل بھی ہے اور ہادی بھی، اسی لئے اسمائے الٰہیہ میں ہے ضَارٌّ، نَافِعٌ، هَادٍ، مُضِلٌّ ہے، چنانچہ بعض مخلوق بھی نقصان دہ ہے اور بعض فیض رساں، بعض گمراہ کن ہے اور بعض ہادی، جیسے عالم جسمانیات میں زہر مضر ہے تریاق مفید، سانپ جان لیوا ہے اور بعض چیزیں جان بخش، ایسے ہی عالم روحانیات میں بعض چیزیں ایمان لیوا ہیں اور بعض ایمان بخش، شیطان اور اس کی ذریت ایمان لیوا ہیں، پیغمبر اور ان کے متبعین ایمان بخش، اس آیت میں فرمایا گیا کہ اے محبوب کی امت تم میری صفتِ ہدایت کے مظہر ہو لہٰذا تم بہترین امت ہو، تمہارے دم سے تمام لوگ فائدے اٹھاتے رہیں گے، میں تمہارے ذریعہ لوگوں کو ایمان، قرآن اور عرفان بخشوں گا، اور تمہاری ہی روشنی سے انہیں راہِ جنان دکھلاؤں گا، جو مجھ تک پہنچنا چاہے تمہارے زمرہ میں آ جائے، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ عام مسلمان تو عمل سے اچھی باتوں کا حکم کرتے ہیں اور بری باتوں سے منع، علماء قلم سے، غازی تلوار سے، سلطان طاقت سے، مگر دل و نظر

والے نگاہوں سے، دوسروں کی تبلیغ کان و دماغ تک پہنچتی ہے اور ان کی تبلیغ قلوب کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے، پھولوں کی صحبت تل کے رنگ و بو کو بدل دیتی ہے مگر انبیاء و اولیاء کی صحبت دل کا رنگ بدل دیتی ہے، غرضکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چیز ایک ہے لیکن نوعیتیں اس کی مختلف ہیں،

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ

ہرگز نہ نقصان دیں گے وہ تم کو سواء تکلیف دینے کے اور اگر جنگ کریں گے

وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے مگر یہی ستانا اور اگر تم سے لڑیں تو تمہارے

يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۛ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

وہ تم سے تو پھیر دیں گے وہ تم سے پیٹھوں کو پھر نہ مدد کئے جائیں گے

سامنے سے پیٹھ پھیر جائیں گے پھر ان کی مدد نہ ہوگی

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ نے مسلمانوں کو اعلیٰ درجہ کی تبلیغ کا حکم دیا، اس تبلیغ کی ترغیب کے لئے دو طریقے اختیار فرمائے، ایک مسلمانوں کے فضائل کا ذکر کہ تم بہترین امت ہو، تمام جہان کے استاد ہو جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہوا، دوسرے ان کی حفاظت کا وعدہ جس کا ذکر اس آیت میں ہے یعنی اس تبلیغ کی بنا پر انشاء اللہ تمہارا کوئی کچھ بگاڑ نہ سکے گا، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو اللہ پر ایمان اور اس پر توکل رکھنے کا حکم دیا گیا، اس آیت میں ایمان و توکل کے فوائد کا ذکر ہو رہا ہے کہ یہ تمام موذیوں سے بچنے کا بہترین قلعہ ہے کہ جو اس قلعہ میں آ گیا وہ بفضلہٖ تعالیٰ تمام ایذاؤں سے محفوظ رہتا ہے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے کرنے والے کاموں کا حکم دیا تھا، ایمان، توکل، اور تبلیغ وغیرہ، اب اس آیت میں ان کاموں پر اپنے دنیاوی انعاموں کا ذکر فرما رہا ہے یعنی تم وہ کام کئے جاؤ، ہم تمہاری ہر موذی سے حفاظت کئے جائیں گے، **چوتھا تعلق:** گذشتہ آیت میں اہل کتاب کی تصویر کا ایک رخ دکھایا گیا تھا کہ ایمان لانے کی صورت میں ان کا بہتر ہو جانا، اب ان کی تصویر کا دوسرا رخ دکھایا جا رہا ہے یعنی ایمان نہ لانے کی صورت میں ان کا ذلیل و خوار ہو جانا اور مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکنا،

شانِ نزول

جب یہودِ مدینہ کے چوٹی کے عالم سیدنا عبداللہ ابن سلام مع اپنے ساتھیوں کے ایمان لے آئے اور صحابیت سے مشرف ہو گئے تو ابو رافع، ابو یاسر، کعب ابن اشرف، کنانہ اور ابن صوریا وغیرہ سردارانِ یہود نے ان بزرگوں کو طعنہ اور ملامتیں شروع کر دیں اور ان کے خلاف سازشیں کرنے لگے جس سے ان بزرگوں کو کچھ فکر لاحق ہوئی، ان بزرگوں کی تسلی کے لئے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، (تفسیر خازن و روح المعانی)

تفسیر

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى لَنْ يَّضُرُّوْا کا فاعل وہی اہل کتاب ہیں جن کا ذکر پچھلی آیت میں گزرا، یَضُرُّوْا ضرر سے بنا بمعنی تکلیف ونقصان، خواہ تکلیف قولی ہو یا عملی یا فعلی، خواہ تکلیف کا تعلق سامنے والی کی جان سے ہو یا مال سے، یا آبرو یا ایمان سے، یا دلی جذبات سے، کم میں خطاب ظاہر یہ ہے کہ صحابہ کرام سے ہے، اور ہوسکتا ہے کہ سارے مسلمانوں سے ہو، اس صورت میں شرط یہ ہوگی کہ مسلمان کامل الایمان ہوں، رب تعالیٰ فرماتا ہے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران:۱۳۹) اذًى ہلکی تکلیف کہا جاتا ہے، چنانچہ اس سورۃ کے آخر میں مشرکین واہل کتاب کے زبانی طعن وتشنیع کو اذًى فرمایا گیا کہ ارشاد ہوا وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا (آل عمران:۱۸۶) نبی کریم ﷺ نے اس شخص سے فرمایا تھا جو جمعہ کے دن نمازیوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے آرہا تھا کہ وہیں بیٹھ جا تو نے اللہ رسول کو ایذاء دی یعنی ان کی ناراضی والا کام کیا، راستہ کے اینٹ روڑے کانٹے وغیرہ کو اذیٰ کہا جاتا ہے اور اس کے ہٹا دینے کو اِمَاطَةُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ کہتے ہیں، بعض مفسرین نے اس استثناء کو منقطع مانا ہے، ان کے خیال میں ضرر سخت تکلیف کو کہتے ہیں اور اذی معمولی کو جو ضرر سے خارج ہے، اس لئے استثناء منقطع ہے، مگر حق یہ ہے کہ ضرر ہر تکلیف کو کہتے ہیں چھوٹی ہو یا بڑی، اور اذی معمولی تکلیف کو، لہٰذا اذی ضرر میں داخل ہے اور استثناء متصل ہے، وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ، یقاتلوا قتالٌ سے بنا جس کے معنی ہیں دو شخصوں یا دو جماعتوں کا آپس میں آمنے سامنے لڑنا اور مقابلہ کرنا، اس کا فاعل یا سارے اہل کتاب ہیں یہودی ہوں یا عیسائی! یا صرف یہودی، دوسرا احتمال قوی ہے جیسا کہ اگلی آیتوں سے ظاہر ہے کُمْ میں خطاب صحابہ کرام سے ہے، اور ہوسکتا ہے کہ ان سارے مسلمانوں سے ہو جو اخلاص سے جہاد کریں اور سچے پکے مسلمان ہوں يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ یُوَلُّوا وَلیٌ سے بنا بمعنی قرب باب تفعیل میں آ کر سلب قرب یعنی دوری کے معنی پیدا ہوئے، جب اس کے ساتھ دُبر یا ادبار یا وجہ ہو تو بمعنی پھیرنا ہوتا ہے، پیٹھ پھیرنے میں جانے و بھاگنے کے معنی ہوتے ہیں، اور منہ پھیرنے میں سامنے ہونے کے، رب تعالیٰ فرماتا ہے فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (بقرہ:۱۴۴) اور دوسری جگہ فرماتا ہے وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ (انفال:۱۶) پہلی آیت میں قبلہ کے سامنے ہونا اور ادھر منہ کرنا مراد ہے دوسری میں دشمن کو پیٹھ دکھانا اور میدان سے بھاگ جانا مراد ہے، ادبار دبر کی جمع ہے بمعنی پیٹھ یا پچھلا حصہ قُبُل کا مقابل یعنی اے صحابہ کرام اگر کبھی تمہاری اور یہود کی جنگ ہوئی تو ہم تمہیں خبر دیتے ہیں کہ یہ تمہیں پیٹھ دکھا دیں گے اور میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ یہ جملہ پوری شرط وجزاء پر معطوف ہے نہ کہ فقط جزاء پر، اسی لئے اس مضارع کا نون اعرابی نہ گرا اور ثُمَّ زمانی ترتیب کے لئے نہیں بلکہ خبری ترتیب کے لئے ہے یعنی پھر ہم یہ بھی بتائے دیتے ہیں کہ کسی طرف سے ان کی مدد نہ ہوگی، نہ مشرکین مکہ کی طرف سے، نہ منافقین مدینہ کی جانب سے، منافقین یہود سے کہا کرتے تھے وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ (حشر:۱۱) رب تعالیٰ نے پہلے ہی خبر دے دی تھی کہ فرما دیا تھا وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (منافقون:۱) یہاں بھی منافقین کے اسی وعدہ ووعید کی تردید ہے،

خلاصہ تفسیر

اے اہل کتاب مومنین یا اے تمام صحابہ انصار ومہاجرین، یا اے تا قیامت امت سید المرسلین تم ان یہود مدینہ سے جو تمہیں ڈراتے دھمکاتے ہیں، یا سارے یہودیوں سے یا سارے اہل کتاب سے، یہودی ہوں یا عیسائی، کچھ خوف وہراس نہ کرو، یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، بجز اس کے کہ تمہیں کچھ ستائیں یا محض زبان سے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت میں طعن کریں، کفر بکیں کہ ادھر عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہیں اور جناب عیسیٰ ومریم کو گالیاں دیں، توریت مسخ کریں، نومسلموں کے دل میں اسلام کی طرف سے شبہات ڈالیں یا تمہارے خلاف سازشیں کریں ہم تمہیں خبر دیئے دیتے ہیں کہ اگر کبھی تمہارا، یہود مدینہ سے یا سارے یہودیوں سے یا یہود ونصاریٰ سے مقابلہ ہوا تو وہ تمہارے مقابل میدان میں ٹھہریں گے نہیں، پھر تمہیں یہ بھی بتلائے دیتے ہیں کہ ان کی کسی طرف سے مدد نہ ہوگی، ہماری یا ہمارے فرشتوں کی طرف سے مدد کیا ہوتی، منافقین مدینہ اور مشرکین مکہ جو انہیں اکساتے ہیں یا جن کو یہ اکساتے ہیں وقت پڑنے پر وہ بھی ان کی امداد نہ کریں گے، تمہاری مدد پر اللہ تعالیٰ اور سارے فرشتے ہیں لہٰذا تم ان سے بے خوف رہو،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** اس آیت میں رب تعالیٰ نے چند غیبی خبریں دیں، جو ہو بہو پوری ہوئیں، ایک یہ کہ یہود مدینہ مسلمانوں کو تباہ نہ کر سکیں گے ایسا ہی ہوا باوجودیکہ وہ یہودی طاقت اور بے پایاں دولت کے مالک تھے مسلمان عموماً کمزور وغریب تھے مگر پھر بھی وہ ان کا بال بیکا نہ کر سکے، دوسرے یہ کہ جنگ کی صورت میں وہ مسلمانوں کے مقابل نہ ٹھہر سکیں گے، ایسا ہی ہوا کہ ہر موقع پر خصوصاً جنگ احزاب میں جبکہ سارے مدینہ کے یہودی اور مکہ ہی کے نہیں بلکہ سارے حجاز کے ہر قسم کے کافر جمع ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے مگر سب خائب وخاسر ہوئے، مسلمان ان کے شر سے محفوظ رہے، پھر بنی قریظہ اور بنی نضیر سے مسلمانوں نے مدینہ خالی کرا لیا کہ بنی قریظہ کے سارے جوان قتل کر دیئے گئے اور بنی نضیر جلا وطن، مگر انہیں مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی پھر عہد صدیقی وفاروقی میں عیسائیوں پر مسلمانوں کو جو عظیم الشان فتوحات حاصل ہوئیں وہ تا قیامت یادگار رہیں گی، جنگ قادسیہ ویرموک میں لاکھوں اہل کتاب کے مقابل چند ہزار مسلمان تھے مگر میدان مومنین کے ہاتھوں رہے، تیسرے یہ کہ ان جنگوں میں شکست کھانے کے بعد بھی ان اہل کتاب کو کبھی شوکت نصیب نہ ہوگی، یوں ہی ہوا، یہ قرآن کریم کا زندہ جاوید معجزہ ہے، **دوسرا فائدہ:** اسلام اور نبی کریم ﷺ کا دامن کرم بلکہ حضور انور ﷺ کا نام شریف مسلمانوں کے لئے ایک مضبوط حفاظتی قلعہ ہے، اگر مسلمان اس قلعہ میں پناہ گزیں رہیں تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی، جیسا کہ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** مسلمانوں پر کفار خصوصاً اہل کتاب کے زبانی وقلمی اعتراضات ان کے خلاف کتب چھاپنا، تدابیر کرنا ہمیشہ رہے گا جیسا کہ اِلَّآ اَذًى سے معلوم ہوا، **چوتھا فائدہ:** ایمان میں قدرتی دلیری ہے اور کفر میں بزدلی جیسا کہ يُوَلُّوْكُمُ سے معلوم ہوا، دیکھو فرعونی جادوگر ہمیشہ اس سے دبتے تھے مگر ایمان لاتے ہی فرعون سے بے خوف ہو گئے، **پانچواں فائدہ:** مسلمانوں کو دلیری دیتے

کی زمین کو بھی کہتے ہیں اور درختوں کو بھی۔ مگر یہاں درخت مراد ہیں کیونکہ درختوں ہی کے نیچے نہر جاری ہوتی ہے نہ کہ زمین کے نیچے اور لو یا بگولے سے درخت جلتے ہیں نہ کہ زمین مِنْ بیانیہ ہے کائنۃٌ پوشیدہ کے متعلق اور یہ جنت کی صفت ہے۔ نخیلٌ یا تو نخل کی جمع ہے یا اسم جمع یا اسم جنس بمعنی درخت کھجور اعناب عنبۃ کی جمع ہے۔ عنب انگور کی بیل اور پھل دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جہاں کہیں قرآن میں نخل اور عنب جمع ہو کر آتا ہے تو نخل سے درخت کھجور مراد ہوتا ہے نہ کہ پھل اور اعناب سے انگور کا پھل مراد ہوتا ہے نہ کہ بیل (روح المعانی) یا تو یہ مراد ہے کہ وہ کھجور اور انگور ہی کا باغ ہے یا یہ کہ اس باغ میں انگور اور کھجور بھی کثرت سے ہیں لَہٗ جَنَّۃٌ میں چند لطیف اشارے ہیں۔ ایک یہ کہ باغ اس بڈھے کا اپنا ہے کسی دوسرے کا پٹہ پر لیا ہوا نہیں دوسرا یہ کہ وہ باغ خود اس بڈھے نے ہی لگایا ہے۔ اس کے باپ دادا کا لگایا ہوا نہیں خود اپنی محنت کی چیز بڑی پیاری ہوتی ہے۔ تیسرا یہ کہ وہ باغ ہے کھیت نہیں کھیت جلنے پر صدمہ کم ہوتا ہے یا مالک سمجھتا ہے کہ میں نے ابھی بویا تھا۔ اور اب پھر دوسرا بو لوں گا۔ باغ جلنے کا صدمہ زیادہ کہ عمر بھر میں ایک بار بویا جاتا ہے اس کے جل جانے کے بعد اب دوسرا باغ بو کر بہار نہیں کھا سکتا۔ چوتھا یہ کہ وہ باغ ایک پھل کا نہ تھا سال میں چار ماہ پھل دے آٹھ ماہ یوں ہی رہے۔ بلکہ ہر قسم کے پھلوں کا باغ تھا۔ جس کے پھل سال بھر تک بازار میں پہنچتے ہیں۔ آمدنی ہوتی رہتی ہے۔ پانچواں یہ کہ اس باغ میں کھجور بکثرت ہے۔ جس کا پھل لکڑی پتے وغیرہ سب ہی کام آتے ہیں۔ عرب لوگ کھجور کا شربت گڑ بناتے اس میں چائے پکاتے ہیں۔ اس کے تنے شہتیر شاخوں کی کڑیاں پتوں کی چھت مکان میں ڈالتے ہیں۔ غرضکہ کھجور ان کی زندگی کا سہارا ہے۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ۔ یہ جملہ جنت کی صفت ہے یا اس کا حال۔ انہار سے مراد پانی کی چوڑی نالیاں ہیں۔ جو مختلف سمتوں میں بہتی ہوں۔ لَہٗ فِیْھَا مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ۔ لَہٗ پوشیدہ مبتدا کی خبر ہے ثابت کا متعلق فِیْھَا ثَابِتٌ کی ضمیر سے حال اور مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ۔ اس پوشیدہ مبتدا کی صفت مِنْ زائدہ ہے یا بیانیہ یعنی اس باغ میں باغ والے کے لئے ہر قسم کا رزق ہے ثمرات سے بہت پھل مراد ہیں نہ کہ عام کیونکہ وہ باغ تو صرف انگور اور کھجور کا ہی ہے اور اگر مختلف میووں کا بھی ہو تب بھی عام پھل مراد نہیں لئے جا سکتے کیونکہ ایسا باغ دنیا میں کوئی نہیں جس میں دنیا بھر کے سارے پھل ہوں۔ بعض زمین بعض پھلوں کے لئے موزوں ہوتی ہے اور دوسری دوسرے پھلوں کے لئے اس لئے تمام پھلوں کا اجتماع ایک زمین میں ہونا ناممکن ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ ثمرات سے مراد منافع ہیں۔ یعنی اس باغ سے مالک کو ہر قسم کا نفع ہے کہ پھلوں کو کھاتا ہے۔ درختوں کی لکڑیاں جلاتا اور ان سے عمارات بناتا ہے۔ اور پیداوار کی قیمت سے اپنی ہر ضرورت پوری کرتا ہے۔ وَاَصَابَہُ الْکِبَرُ۔ ظاہر یہ ہے کہ واؤ حالیہ ہے اور قد پوشیدہ اور یہ جملہ یَوَدُّ کے فاعل کا حال اور ہو سکتا ہے کہ عاطفہ ہو اور تکون پر معطوف اور یہ ماضی بمعنی مضارع ہو یا تکون بمعنی ماضی کبر بمعنی بڑھاپا یعنی بڑی عمر یعنی اس باغ کے سوا کسی اور ذریعہ سے وہ روزی حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ بوڑھا ہے۔ محنت مزدوری کے لائق نہیں۔ وَلَہٗ ذُرِّیَّۃٌ ضُعَفَآءُ یہ جملہ اصابہ کی ضمیر سے حال ہے۔ لہٗ خبر۔ ذریۃ مبتداء۔ ذریت ذرّ سے بنا بمعنی چھوٹی چیونٹی۔ اسی مناسبت سے ریت کے ذروں کو ذرہ کہتے ہیں۔ یہاں چھوٹی اولاد کے معنی میں ہے۔ ضعفاء جمع ضعیف کی ہے جیسے امیر کی جمع امراء اور غریب کی غربا یعنی وہ باغ والا خود بڈھا ہو اور اس کی اولاد کمزور ناتواں کہ اس کا بوجھ بھی اسی پر ہو جس کی وجہ سے باغ کی اور بھی زیادہ حاجت ہو کہ اگر باغ نہ رہے تو خود بھی بھوکا مرے اور

ہوگی جنگ ہو یا نہ ہو (تفسیر کبیر) **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنگ میں ہمیشہ کفار ہی پیٹھ دکھائیں گے حالانکہ عہد صحابہ بلکہ زمانہ نبوی میں بھی بعض جنگوں میں مسلمانوں کو شکست ہوئی جس کی مثال جنگ احد وحنین موجود ہیں، خود رب تعالیٰ فرماتا ہے، اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ الخ (آل عمران: ۱۵۳) **جواب:** اس کے جوابات سوال اول کے جواب میں گذر چکے، کہ یہ وعدہ یہود مدینہ کے مقابلہ میں ہے یا وہ ہزیمتیں عارضی تھیں جو مسلمانوں کی اپنی غلطیوں سے ہوئیں،

تفسیر صوفیانہ

انسان کا سینہ میدانِ جنگ ہے جہاں روح وقلب کی لڑائی نفس امارہ سے ہورہی ہے، شیطان اور اس کی ذریات روح وقلب کو ڈراتے ہیں اور نفس امارہ کو اپنی مدد اور اس کی فتح کے سبز باغ دکھاتے ہیں، دنیا کی الجھنیں اور رب تعالیٰ سے غفلت پیدا کرنے والی چیزیں نفس کا سامانِ جنگ ہیں اور شرعی احکام دل کے ہتھیار، رب تعالیٰ قلب مومن سے خطاب فرمارہا ہے گھبرانا نہیں یہ نفس مع اپنے ساز وسامان کے تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے بجز اس کے کہ تجھے نفس کی حرکتوں سے کچھ تکلیف پہنچے اور کچھ نہ ہوگا، ہمارا وعدہ ہے کہ اگر تیری اس سے جنگ ہوئی تو نفس تیرے مقابلہ میں شکست کھا جائے گا اور اس کے یار ومددگار یعنی شیطان و شیطانی لوگ وقت پر کچھ اسے کام نہ دیں گے،

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا

ڈال دی گئی ان پر ذلت جہاں کہیں پائے گئے مگر

ان پر جمادی گئی خواری جہاں ہوں امان نہ پائیں مگر

بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ

اللہ کے ذمہ سے اور لوگوں کے ذمہ سے اور لوٹے وہ اللہ کے غضب کے ساتھ

اللہ کی ڈور اور آدمیوں کی ڈور سے اور غضب الٰہی

مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ

اور ڈال دی گئی اوپر ان کے غریبی یہ اس وجہ سے ہے کہ

کے سزاوار ہوئے اور ان پر جمادی گئی محتاجی اس لئے کہ وہ

كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ

وہ کفر کرتے تھے اللہ کی آیتوں کا اور قتل کرتے تھے نبیوں

اللہ کی آیتوں سے کفر کرتے اور پیغمبروں کو

بگولا جس سے یہ باغ تباہ ہو جائے' قیامت کا دن گویا اس کے بڑھاپے کا وقت' نہ کام آنے والے اہل قرابت و اولاد اس کی کمزور ذریت' اس دن کی انتہائی پریشانی' یہ گویا باغ والے کی حسرت ہے (روح المعانی وغیرہ نے بحوالہ بخاری و حاکم وغیرہ) عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جماعت صحابہ کرام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے عرض کیا کہ یہ ہر اس شخص کی مثال ہے جو پہلے نیکیاں کرے اور پھر شیطان اس سے گناہ کرا کے اس کے نیکیوں کے باغ کو آگ لگا دے۔ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے بہت پسند فرمایا۔ اس قول کی بنا پر یہ آیت فقط صدقات کے لئے ہی نہیں' بلکہ ساری نیکیوں کے لئے ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** تبلیغ و وعظ کے لئے مثالیں بہت ضروری ہیں کہ اس سے غیر محسوس مثل محسوس ہو جاتا ہے اسی لئے رب تعالیٰ نے بہت مثالیں بیان فرمائیں۔ ہم اس کی پوری تحقیق اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ (بقرہ:۲۶) کی تفسیر میں کر چکے۔ **دوسرا فائدہ:** عمل کا مدار خاتمہ پر ہے۔ زندگی میں سارے اعمال اس کچی کھیتی کی طرح ہیں۔ جس پر بہت سی آفتوں کا خطرہ ہے۔ لہٰذا کوئی بھی اپنے مال پر نازاں نہ ہو۔ **تیسرا فائدہ:** رب کے افعال کو مجازاً مخلوق کی طرف نسبت کر سکتے ہیں کہ یہاں باغ کے جلانے اور برباد کرنے کو بگولے کی طرف نسبت کیا گیا۔ ورنہ فاعل حقیقی رب تعالیٰ ہے۔ **چوتھا فائدہ:** ادب یہ ہے کہ بندہ بھلائی کو رب کی طرف اور برائی کو اپنی طرف نسبت دے۔ دیکھو باغ کا جلانا بگولے کی طرف نسبت کیا گیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ۔ (شعراء:۸۰) اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو رب مجھے شفا دے دیتا ہے۔ بیماری کو اپنی طرف اور شفاء کو رب کی طرف نسبت دی۔ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو وداع کرتے وقت فرمایا فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا۔ (کہف:۷۹) میں نے چاہا کہ کشتی کو عیب ناک بنا دوں عیب دار کرنے کو اپنی طرف نسبت کیا وہاں بھی فرمایا فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا (کہف:۸۲) رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے جوان ہو جائیں یہ ہے ان حضرات کا ادب۔ **پانچواں فائدہ:** جیسے دنیا میں کام بگاڑنا آسان ہے مگر بنانا مشکل باغ لگانا مشکل' مکان بنانا مشکل مگر انہیں اجاڑ دینا آسان' کسی کو دوست بنانا مشکل ہے مگر دوستی ختم کر دینا آسان کنویں سے نکلنا مشکل ہے مگر گر جانا آسان۔ ایسے ہی آخرت کے متعلق سوچ لو کہ اسے بنانا مشکل ہے بگاڑنا آسان' شیطان کی لاکھوں برس کی عبادتیں صرف سجدہ کے انکار کر دینے پر برباد ہو گئیں برباد ہوتے ایک منٹ نہ لگا رب تعالیٰ بنانے کی توفیق دے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہ تشبیہ صحیح نہیں کیونکہ اس باغ میں صرف کھجور اور انگور کے درختوں کا ذکر تھا مگر بعد میں فرمایا گیا کہ اس میں ہر قسم کے پھل ہو سکتے ہیں دو قسم کے درخت میں دو ہی طرح کے پھل ہوتے ہیں۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا کہ یا تو کھجور اور انگور کا ذکر عظمت کی وجہ سے کیا گیا ہے ورنہ اس باغ میں ہر قسم کے درخت ہیں یا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ سے بہت سے انگور اور کھجور مراد ہیں۔ کُلٌّ بمعنی کثیر۔ **دوسرا اعتراض:** وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ۔ میں اصاب فعل ماضی ہے۔

اس کا عطف تکون مضارع پر کیونکر صحیح ہے۔ عطف میں معطوف اور معطوف الیہ یکساں چاہئیں؟ **جواب**: تفسیر سے معلوم ہوا کہ واؤ یا تو حالیہ ہے یا اَصَابَ بمعنی مضارع۔ یا اَنْ تَکُوْنَ بمعنی ماضی یعنی لَوْ کَانَتْ بِهٖ۔

تفسیر صوفیانہ

اس آیت میں دو شخصوں کی مثال دی ہے ایک راہِ حق میں خرچ کرنے والا دوسرا باطل رسموں میں۔ کہ پہلے شخص کو اچھا بدلہ دونوں جہان میں عزت رب تعالیٰ کی محبوبیت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے کو ضبطی اعمال خسارہ مال برائی حال اور اثقال وبال۔ کانٹے بونے والا کانٹے ہی کاٹے گا۔ اور پھل کے بیج بونے والا عمدہ پھل معاذ ابن جبل فرماتے ہیں کہ اپنے دین کو خالص کرو۔ تھوڑا عمل بھی کافی ہوگا۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ ریا کے دو علاج ہیں۔ ایک ریا کے اسباب کا ختم کر دینا دوسرا ریا کے شبہات سے بچنا۔ پندرہ شخصوں کا شیطان دشمن ہے۔ (۱) نبی (۲) بادشاہ عادل (۳) انکسار کرنے والا غنی (۴) سچا تاجر (۵) عاجزی کرنے والا عالم (۶) خیر خواہ مومن (۷) رقیق القلب مومن (۸) تائب بندہ (۹) متقی (۱۰) ہمیشہ باوضو رہنے والا آدمی (۱۱) سخی مرد (۱۲) خلیق (۱۳) لوگوں کو نفع پہنچانے والا۔ (۱۴) ہمیشہ تلاوت قرآن کرنے والا (۱۵) تہجد گزار دس ۱۰ شخصوں سے شیطان کو بہت محبت ہے۔ (۱) ظالم بادشاہ۔ (۲) غنی متکبر (۳) بددیانت بیوپاری (۴) شرابی (۵) چغل خور (۶) ریا کار (۷) سود خور (۸) مال یتیم کھانے والا (۹) زکوٰۃ نہ دینے والا۔ (۱۰) لمبی امیدیں رکھنے والا۔ ابوذر غفاری فرماتے ہیں کہ اپنی کشتی کی مرمت کرتے رہو۔ کیونکہ سمندر بہت گہرا ہے۔ زیادہ توشہ ساتھ لو۔ کہ سفر دراز ہے۔ اپنا بوجھ ہلکا رکھو کیونکہ راستہ خطرناک ہے۔ عمل کو ریا سے پاک رکھو۔ پرکھنے والا سمیع بصیر ہے۔ جہاں کسی کا دھوکا نہیں چل سکتا۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ اسی زمین سے پھل بوٹے پھل پھول سبزے نکلتے ہیں اور اس زمین سے خاردار درخت اور زہریلی گیس زہریلے جانور نکلتے ہیں ایک ہی زمین کے مہر وقہر کی مظہر ہے یوں ہی ہمارا جسم گویا زمین ہے۔ اس سے ایمان نماز حج وغیرہ عبادات حاصل ہوتی ہیں۔ اور اسی سے کفر شرک گناہ وغیرہ صادر ہوتے ہیں۔ انسان بعض کام ایسے کر لیتا ہے جس سے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور بعض بات ایسی بک دیتا ہے جس سے ساری نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ اس خیمہ میں دل ونفس دو متضاد چیزیں جمع ہیں۔ دل کا میلان نیکیوں کی طرف ہے۔ نفس کا میلان برائیوں کی طرف گویا ایک کمرہ میں رومی وحبشی بٹھا دیئے گئے ہیں۔ رومی کو گرمی کی برداشت نہیں اور حبشی کو سردی کا تحمل نہیں۔ اس کشمکش میں اللہ تعالیٰ ہی دستگیری کرے تو بیڑا پار ہو جائے۔ کوشش کی جائے کہ عبادات وایمان کا لہلہاتا باغ اجڑ نہ جائے مگر صرف اپنی کوشش پر اعتماد نہ کرے۔ رب کی مہربانی مانگے۔ ہم ضعیفوں کو وہ ہی اپنی مہربانی میں لینے والا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم

اے وہ لوگو جو ایمان لائے خرچ کرو پاک چیزوں میں سے جو کمایا تم نے اور اس سے جو نکالا ہم نے واسطے تمہارے

اے ایمان والو اپنی کمائیوں سے کچھ دو اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا اور

مِّنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ

کے تحت میں ہے یعنی گذشتہ زمانہ میں نبیوں کو قتل کرتے رہے ہیں، چنانچہ ایک بار ان بدنصیبوں نے ایک دن میں چار سو ستر پیغمبروں کو قتل کیا، صبح کے وقت ستر کو اور شام کو چار سو کو، پھر قتل محض ظلماً کیا، خود یہ بھی اس قتل کی وجہ بیان نہیں کر سکتے، جس پیغمبر نے ان کی نفسانی خواہش کے مطابق فتویٰ نہ دیا اسے شہید کر دیا، بِغَیْرِ حَقٍّ سے مراد ان کے اپنے گمان کی وجہ ہے کہ واقعی وجہ، قتل نبی کے لئے واقعی وجہ تو ہو سکتی ہی نہیں کہ قتل یا تو ارتداد سے ہوتا ہے یا کسی کو قتل کر دینے کی وجہ سے، یا زنا یا فساد و بغاوت سے، انبیائے کرام صلوات اللہ علیہم وسلامہ کو ان حرکات سے دور کا بھی تعلق نہیں، ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ، اس ذالک کا اشارہ اسی کفر و قتل انبیاء کی طرف ہے جو ابھی مذکور ہوا، عَصَوْا عصیان کا فعل ماضی ہے بمعنی گناہ اور یَعْتَدُوْنَ عَدْوٌ کا مضارع بمعنی حد سے بڑھ جانا، گناہ سے مراد بدعملی ہے اور حد سے بڑھنے سے مراد بدعقیدگی، یا گناہ سے مراد صغیرہ گناہ ہیں اور حد سے بڑھنے سے مراد کبیرہ گناہ، یا گناہ سے مراد حضرات انبیائے کرام کی بات نہ ماننا ہے اور حد سے بڑھنے سے ان کا مذاق اڑانا، بے ادبی کرنا، یا گناہ سے مراد شرعی احکام پر عمل نہ کرنا ہے اور تجاوز حد سے مراد ان احکام کو درست نہ سمجھنا ہے، یعنی ان بد نصیبوں کو اس کفر و قتل انبیاء کی جرات اس لئے ہوئی کہ انہوں نے پہلے تو گناہ کئے، پھر ان کے عقیدے بگڑے، انبیائے کرام کی بے ادبی کا جذبہ ان کے دلوں میں پیدا ہوا، پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفر کر بیٹھے آخر کار انبیائے کرام جیسی ہستیوں کے قتل کے مرتکب ہو گئے، اس لئے ان مردودوں پر ہمارے یہ عذاب نازل ہوئے کہ دنیا میں خوار و ذلیل کر دیئے گئے، غضب الٰہی میں گرفتار ہو گئے،

خلاصہ تفسیر

اے صحابہ کرام خصوصاً مومنین اہل کتاب مدینہ کے یہ یہودی تمہارا تو کیا بگاڑیں گے، تمہارے مقابل تو کیا ٹھہریں گے ان کا اپنا حال یہ ہے کہ یہ کہیں بھی رہیں، مدینہ منورہ میں یا خیبر میں یا کسی اور جگہ، جہاں بھی ہوں گے ذلیل و خوار ہوں گے، کہ کہیں بھی ہوں بغیر اللہ کے ذمہ یعنی ادائے جزیہ اور بغیر مسلمانوں کی امان، ان کے ساتھ صلح و صفائی، ان کی رعایا بنے بغیر کہیں ٹھہر نہ سکیں گے، ان پر ذلت و خواری ایسی لازم کر دی گئی ہے جیسے سکے پر نقوش، یہ تو اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار ہو چکے ہیں، ان پر غریبی، بے چارگی، درماندگی، دوسروں کے امان کی محتاجی جما دی گئی، کہ اگرچہ لاکھوں کے مالک ہوں مگر حرکتیں فقیروں کی سی کریں گے، ذلیل خصلتیں بھکاریوں کی رکھیں گے، ان جیسی کنجوس قوم کوئی ہی ہو گی، ان پر ان عذابوں کا نزول اسی وجہ سے ہوا کہ یہ لوگ گذشتہ کتابوں، انبیائے کرام کی ذات و صفات اور ان کے معجزات کا ہمیشہ ہی انکار کرتے رہے، حد یہ ہے کہ بلاوجہ محض اپنی خواہش نفسانی سے حضرات انبیاء کو قتل کرتے رہے، زکریا علیہ السلام، یحیٰ علیہ السلام انہی کے ہاتھوں صرف اس لئے شہید ہوئے کہ ان حضرات نے ان کی رائے کے مطابق باپ کے لئے بیٹی حلال ہونے کا فتویٰ نہیں دیا، اور سینکڑوں حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کو انہوں نے ہی شہید کیا، اور اس کفر و قتل کی جرأت انہیں اسی لئے پڑی کہ یہ پہلے سے گناہوں، نافرمانیوں اور حد سے بڑھ جانے کے عادی تھے،

دونوں ہی معنی مراد ہوں یعنی شرعاً وعقلاً وطبعاً پسندیدہ مال وہ ہی ہوگا جو حلال بھی ہو اور کھرا بھی۔ بعض علماء نے فرمایا کہ اَنْفِقُوْا سے حلال مال مراد ہے۔ اور طیبات سے کھرا' کیونکہ حرام مال کی خیرات بھی حرام ہے۔ دراصل طیبۃ طیب سے بنا بمعنی دل کی پسندیدگی رب فرماتا ہے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (النساء: ۳) اس لئے خوشبو کو طیب کہتے ہیں کہ وہ دل پسند چیز ہے پھر کھری اور چنی ہوئی اچھی چیز کو طیب کہتے ہیں۔ اس لئے مدینہ منورہ کا نام طیبہ بھی ہے یعنی صاف کی ہوئی چھانٹی ہوئی بستی کہ رب نے یہاں کی وبا نکال کر اسے مقام شفاء بنا دیا طیبات جمع فرما کر بتایا کہ اپنی ہر دل پسند چیز میں سے خیرات کرو' روپیہ پیسہ' کھانا' پانی' لباس' پھل فروٹ وغیرہ میں مرغوب' پاکیزہ چیز سے خرچ کرو۔ مَا كَسَبْتُمْ میں ما یا موصولہ ہے اور كَسَبْتُمْ اس کا صلہ۔ یا ما مصدریہ بمعنی مکسوب۔ خیال رہے کہ کسب وہ ہر کام ہے جو نفع کی غرض سے کیا جائے اس میں تجارتی مال سونا' چاندی' جانور وغیرہ سب ہی داخل ہیں۔ یعنی اے مسلمانو! اپنی کمائی میں سے کھرے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو' بہترین خیرات وہ ہے جو اپنی کمائی سے ہو۔ کسب سے حلال کسب مراد ہے لہٰذا ناچ گا کر' جوئے شراب سے پیسہ کمانا ہی حرام ہے اور اس حرام کمائی سے خیرات کرنا بھی حرام ہے اس لئے بعض لوگ خیرات میں سب وحج میں بہت حلال کمائی خرچ کرتے ہیں۔ بعض محتاط لوگ قرض لے کر خیرات یا حج کرتے ہیں پھر قرض اپنی کمائی سے ادا کرتے ہیں۔ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ۔ واؤ عاطفہ ہے۔ اور مِنْ تبعیضیہ' اور ما سے ہر زمینی پیداوار مراد ہے۔ خواہ ترکاریاں ہوں یا پھل یا غلے وغیرہ یعنی اس میں سے بھی خیرات کرو۔ جو ہم تمہارے لئے زمین سے نکالیں۔ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ۔ تَيَمَّمُوا ام سے بنا بمعنی قصد اَمَمْتَ تَمَمْتُ اور تَاَمَّمْتُ وَيَتَمَمْتُ سب کے ایک ہی معنی ہیں تیمم کو بھی اس لئے تیمم کہا جاتا ہے کہ اس میں پانی چھوڑ کر مٹی کا قصد ہے۔ خبیث طیب کا مقابل ہے۔ بمعنی ناپسندیدہ' ہر خسیس چیز خبیث ہے۔ خواہ محسوس ہو' یا معقول۔ غلط اعتقاد۔ برے افعال گندی چیزیں برے لوگ سب کو خبیث کہا جاتا ہے۔ جیسے يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (اعراف: ۱۵۷) بمعنی گندی چیزیں كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ (انبیاء ۷۴) بمعنی بدعملیاں اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ۔ (النور: ۲۶) بمعنے گندے لوگ۔ یہاں اگر طیب سے حلال مراد تھا تو خبیث سے حرام اور اگر اس سے کھرا مال مراد تھا تو خبیث سے ردی مال۔ اور اگر طیّب سے مراد خوش دلی سے دیا ہوا مال تھا۔ تو خبیث سے مراد ہوگا ناخوشی سے دیا ہوا مال غرضکہ خبیث یا خبث بمعنی میل کچیل سے بنا یا خباثت یعنی باطنی واندرونی نجاست سے بنائی ہے ظاہری پاکی کو طہارت کہتے ہیں اور ظاہری گندگی کو نجاست اور باطنی پاکی کو طیّب کہتے ہیں۔ باطنی ناپاکی کو خباثت' یہاں طیّب وخبیث کی بہت تفسیریں ہو سکتی ہیں۔ یعنی حرام اور ردی مال کی خیرات کا ارادہ بھی نہ کرو مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ۔ جار مجرور تنفقون کے متعلق ہے۔ اور ضمیر کا مرجع خبیث ہے متعلق کے مقدم کرنے سے حصر کا فائدہ ہوا۔ یہ جملہ تَيَمَّمُوا کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی کہ صرف ردی ہی سے خرچ کرو۔ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ یہ تُنْفِقُوْنَ کی ضمیر سے حال ہے۔ یعنی تم ردی مال خیرات تو کرتے ہو مگر خود تم اس کا لینا گوارا نہیں کرتے۔ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ۔ یا تو ظرف ہے اور اَنْ سے پہلے وقت پوشیدہ ہے یا باب پوشیدہ ہے۔ تُغْمِضُوْا' اغماض سے بنا بمعنی آنکھ بند کرنا۔ غفلت سستی کو بھی اسی مناسبت سے اغماض کہا جاتا ہے۔ چھپی بات کو کلام غامض اور محفوظ جگہ کو ارض غمض کہتے ہیں۔ یہاں درگزر' چشم پوشی مراد ہے۔ واعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ۔ حمید یا تو بمعنی اسم فاعل ہے یا اسم مفعول یعنی جان رکھو کہ اللہ تمہاری

ماخذ یہ آیت بھی ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے وَلَمْ يُصِرُّوا عَلٰى مَا فَعَلُوْا (آل عمران: ۱۳۵) **ساتواں فائدہ:** کفار و بے دین کے لئے اولاد نبی ہونا مفید نہیں، مومنوں کے لئے بہت مفید ہے، دیکھو مومنین بنی اسرائیل کے متعلق فرمایا گیا وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (بقرہ: ۴۷) اور وہی بنی اسرائیل جب کافر و انبیاء کے دشمن ہو گئے تو ان کے لئے فرمایا گیا، ان پر ذلت، خواری، غضب نازل ہو گیا باوجودیکہ یہ خاندان نبوت ہے، جس میں ہزاروں انبیائے کرام تشریف لائے، اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو اولادِ نبی ہونے کا دعویٰ کریں، نماز روزہ سے قریب نہ آئیں، بے دینی اختیار کرلیں، پھر چاہیں کہ لوگ ہمارے ہاتھ پاؤں چومیں، اس کے متعلق ہماری کتاب "الکلام المقبول" کا مطالعہ فرمایئے۔ **آٹھواں فائدہ:** کفر دو قسم کا ہے، عداوتِ انبیاء کا اور ناجائز محبت کا مگر کفرِ عداوت کفرِ محبت سے بدتر ہے، دیکھو یہاں رب تعالیٰ نے یہود کے کفر کے ساتھ قتلِ انبیاء کا ذکر فرمایا تاکہ پتہ لگے کہ یہ لعنت غضب و ذلت و خواری اس لئے ہے کہ وہ عداوت کے کافر ہیں، عیسائیوں کے بارہ میں یہ سخت کلمات نہیں آتے، کہ وہ اندھی محبت سے کافر ہوئے اللہ تعالیٰ محبوبوں کی عداوت سے محفوظ رکھے، **نواں فائدہ:** سلطنت اللہ کی رحمت ہے، دوسروں کی غلامی اللہ کا عذاب ہے جیسا کہ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ سے معلوم ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہودی ذلیل بھی رہیں گے اور مسکین و غریب بھی، حالانکہ یہودی بڑی مالدار قوم ہے، **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ اس میں ان یہودِ مدینہ کا ذکر ہے جو حضور ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے، ان کی ذلت، خواری، جلاوطنی، جزیہ قائم ہونا قتل و قید اب تک تواریخ میں موجود ہے، دوسرے یہ کہ یہاں سارے ہی یہود مراد ہیں مگر ذلت سے مراد ذلیل حرکتیں ہیں، اور مسکنت سے مراد مال سے خالی ہونا نہیں بلکہ غنیٰ سے خالی ہونا ہے، مالداری اور ہے غنیٰ کچھ اور، غضب الٰہی سے مراد ان کا کفر میں سخت ہونا اور گناہوں میں گرفتار رہنا ہے، **دوسرا اعتراض:** فلسطین میں یہود کی سلطنت قائم ہو گئی، حالانکہ قرآن کریم نے خبر دی ہے کہ قیامت تک ان پر رسوائی لازم کر دی گئی اور اب تک ہم سنا کرتے تھے کہ ان کی بادشاہت کبھی قائم نہ ہوگی، **جواب:** اس کا جواب اس آیت میں موجود ہے کہ فرمایا گیا وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (آل عمران: ۱۱۲) ان کی سلطنت مستقل اپنی نہیں بلکہ بپائے مردی امریکہ آج اس کا سایہ ہٹ جائے تو انہیں کہیں رہنے کا ٹھکانہ بھی نہ ملے، اب تک یہ جگہ جگہ سے نکالے گئے، انہیں کوئی ملک بھی قبول نہ کرتا تھا، جب ہٹلر نے انہیں جرمنی سے نکالا تو ان کے جہاز سمندر میں مارے مارے پھرتے تھے، کوئی سلطنت اپنے ہاں اترنے کی انہیں اجازت نہ دیتی تھی، یہود کی سلطنت کے قیام اور ان سے مسلمانوں کی جنگ کی خبر حدیث شریف میں دی گئی ہے، غالباً یہ سلطنت کا قیام اس جنگ کی تمہید ہے، یہودی ایسے مارے جائیں گے کہ انہیں کوئی پتھر بھی پناہ نہ دے گا وہ بھی پکارے گا کہ اے مسلمان میرے پیچھے یہودی پوشیدہ ہے اسے مار لے (حدیث شریف) **تیسرا اعتراض:** یہاں ارشاد ہوا کہ یہود پر مسکینیت ڈالی گئی، مسکینیت تو اچھی چیز ہے جس کی دعا حضور انور ﷺ نے کی ہے کہ خدایا مجھے مسکین جلا، مسکین اٹھا، مسکینوں میں حشر فرما، **جواب:** مسکینیت کے تین معنی ہیں۔ ا۔ مال سے خالی ہونا، رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ (توبہ:

۶۰) ۲۔دل کا غرور تکبر سے خالی ہونا، اس میں تواضع وانکساری ہونا، حضور انور ﷺ فرماتے ہیں اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا ۳۔کسی شخص یا قوم کا عزت سے خالی ہونا، خوار و رسوا ہونا، یہاں تیسرے معنی کی مسکینی مراد ہے، اور حدیث شریف میں دوسرے معنی کی، غرضکہ یہاں مسکینی عزت کے مقابل ہے نہ کہ تکبر کے اور نہ بمعنی فقیری، اسی لئے اتنی دراز عبارت فرمائی گئی،

چوتھا اعتراض: اس آیت میں ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ الخ سے معلوم ہوا کہ یہود کی ذلت کی علت ان کا کفر وقتل ہے اور ذٰلِكَ بِمَا الخ سے معلوم ہوا کہ اس کی علت ان کے گناہ اور حد سے بڑھنا ہے، اور یہ دوسرا جملہ پہلے کی تاکید ہوسکتا نہیں کہ تاکید و مؤکد ایک ہونے چاہئیں، یہاں جدا ہیں، **جواب:** ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ ذلت کی علت ہے اور ذٰلِكَ بِمَا الخ علت کی علت یعنی یہود کی ذلت کا باعث ان کا کفر وقتلِ انبیاء ہے، اور اس کفر وقتلِ انبیاء کا باعث ان کے گناہ اور حد سے آگے بڑھنا ہے،

پانچواں اعتراض: رب تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ انبیاء کرام اور ان کے متبعین کی امداد فرمائے گا فرماتا ہے حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (روم: ۴۷) پھر یہ حضراتِ انبیاء یہود کے ہاتھوں قتل کیسے ہوگئے، رب تعالیٰ نے ان کی امداد کیوں نہ فرمائی، **جواب:** اس کا تفصیلی جواب تو پہلے پارے میں گذر گیا، یہاں اتنا سمجھ لو کہ قتل وشہادت مدد کے خلاف نہیں کبھی قتل کے بعد مشن کامیاب ہوتا ہے، وہ حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام جن مسائل کی تبلیغ میں شہید ہوئے، وہ مسائل آخر کار رائج ہوگئے اور یہود اپنی کوشش میں ناکام رہے اور ان انبیائے کرام کو درجۂ شہادت ملا، شعر

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

چھٹا اعتراض: یہ عجیب بات ہے کہ قتلِ انبیاء تو کریں یہودِ مدینہ کے باپ دادے، اور اس کی پاداش بھگتیں یہ لوگ! رب تعالیٰ تو فرماتا ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (انعام: ۱۶۴) ان یہودیوں نے کسی نبی کو قتل نہیں کیا، **جواب:** چونکہ یہ لوگ اپنے ان مردود باپ دادوں کے مداح اور حامی تھے، اور ان کے دلوں میں بھی عداوتِ انبیاء کی ایسی ہی آگ بھڑک رہی تھی جیسی ان کے باپ دادوں کے دلوں میں تھی، اگر یہ بھی ان کا زمانہ پاتے تو ضرور قتل کرتے، چنانچہ انہوں نے بھی کئی دفعہ حضور انور ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش کی حتی کہ آپ کو ایک مرتبہ زہر بھی دے دیا، اس لئے یہ بھی سزا کے مستحق ہوئے، چور کا حمایتی بھی مجرم ہے، **ساتواں اعتراض:** ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ کی ضمیر اہل کتاب کی طرف لوٹتی ہے، اور اہل کتاب میں یہودی، عیسائی دونوں داخل ہیں، تو چاہیے کہ مذکورہ عذاب عیسائیوں پر بھی ہوں، حالانکہ عیسائی تو بڑے مزے میں ہیں، مستقل سلطنتوں کے مالک ہیں، **جواب:** مدینہ منورہ میں زیادہ یہودی ہی رہتے تھے، انہی کا زور تھا، اور اس زمانہ میں اسلام کے مقابل زیادہ یہی نکلے، اس لئے قرآن کریم میں ایسی وعیدوں کے موقعہ پر اکثر یہی مراد ہوتے ہیں، عیسائی ایسے موذی نہیں جیسے یہودی ہیں، رب تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے فرماتا ہے وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (آل عمران: ۵۵)

تفسیر صوفیانہ

اسلام ایک مضبوط قلعہ ہے جس کی بہت سی حفاظتی دیواریں ہیں، مستحبات، سنتیں، واجبات، فرائض، عقائد، بزرگوں کا ادب و

احترام یہ اس قلعہ کی ترتیب وار دیواریں ہیں، چور پہلے اگلی دیوار کو عبور کرتا ہے پھر دوسری دیواروں کو چاہئے کہ اسے پہلی دیوار سے ہی دور رکھا جائے، شیطان چور ہے پہلے مستحبات چھڑاتا ہے پھر سنتیں پھر واجبات پھر فرائض، ان سے ہٹ کر عقائد پر ہاتھ ڈالتا ہے، پھر بے ادب بناتا ہے، بے ادبی آئی اور دین گیا، دین گیا اور لعنت آئی، دیکھو یہاں رب تعالیٰ نے یہود کے متعلق لعنت کے اسباب کیسی نفیس ترتیب سے بیان فرمائے، کہ ان میں پہلے گناہ صغیرہ اور کبیرہ، پھر حد سے بڑھنا پیدا ہوئے، اس کے بعد کفر، پھر قتل انبیاء جب یہاں تک پہنچے تو لعنت، غضب وغیرہ کے مستحق ہوئے، عقلمند وہ شخص ہے جو مستحبات پر ہی شیطان کو روک دے اور صغیرہ گناہ کو ہلکا نہ جانے، صوفیاء فرماتے ہیں کہ نبوت سے قرب رحمت کا باعث ہے، اور نبوت سے دوری لعنت کا سبب،

حکایت: مثنوی شریف میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں صحابہ کرام کی دعوت تھی، مہمان بیٹھ گئے، کپڑے کا دسترخوان بچھایا گیا جو میلا تھا، آپ نے خادمہ کو حکم دیا کہ دسترخوان صاف کرلاؤ، خادمہ نے اسے بھڑکتے تندرو میں ڈال دیا، لوگ حیران ہوئے، اور منتظر تھے کہ کپڑا جلے اور شعلہ اٹھے، مگر حاضرین کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب ان کی آنکھوں نے یہ دیکھا کہ دسترخوان سلامت نکال لیا گیا، میل جل گیا تھا، مگر اس کے تار جلنا تو کیا گرم بھی نہ ہوئے تھے، حیرت سے سوال کرنے لگے، شعر

قوم گفتند اے صحابی عزیز   چوں نسوزید و منقیٰ گشت نیز

اے صحابی رسول یہ کپڑا آگ میں جلا کیوں نہیں؟ اور بجائے جلنے کے صاف کیسے ہوگیا، آپ نے جواب دیا، شعر

گفت روزے مصطفیٰ دست و دہاں   بس بمالید اندر ایں دستار خواں

کہ ایک روز میرے ہاں حضور سید عالم ﷺ کی دعوت تھی، یہی دسترخوان بچھایا گیا تھا، سرکار نے اس سے اپنا ہاتھ اور منہ شریف پونچھ لیا تھا، اس نور سے قرب کے باعث اس میں نار اثر نہیں کرتی، مولانا فرماتے ہیں، شعر

اے دلِ ترسندہ از نار و عذاب   با چنیں دست و دہن کن انتساب

اے دل اگر تجھے بھی دوزخ کی آگ کا خوف ہے تو ان ہاتھوں اور لبوں سے وابستہ ہوجا، ایمان ایک بیش قیمت موتی ہے، اس کی حفاظت کے لئے ایک مضبوط قلعہ چاہیے اور سرکاری پہرہ، شریعتِ محمدیہ مضبوط حفاظتی قلعہ ہے اور حضرات اولیاء عظام و علمائے کرام اس کا حفاظتی دستہ،

لَیْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ
نہیں ہیں یہ لوگ برابر کتاب والوں میں سے ایک جماعت درست ہے
سب ایک سے نہیں کتابیوں میں کچھ وہ ہیں کہ حق پر قائم ہیں
یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَهُمْ یَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

جو تلاوت کرتے ہیں اللہ کی آیتیں رات کے اوقات میں اور وہ سجدے کرتے ہیں
اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں رات کی گھڑیوں میں اور سجدہ کرتے ہیں
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور آخری دن پر اور حکم دیتے ہیں اچھی بات کا
اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں اور بھلائی کا حکم
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ
اور منع کرتے ہیں بری بات سے اور جلدی کرتے ہیں بھلائیوں میں
اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نیک کاموں پر
وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾
اور یہ ہی لوگ نیکوں میں سے ہیں
دوڑتے ہیں اور یہ لوگ لائق ہیں

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** حضور انور ﷺ کی ہجرت کے بعد یہود مدینہ کے دو گروہ ہو گئے، اکثر تو اپنی ضد پر قائم رہے اور ایمان نہ لائے مگر ان میں سے بعض ایمان لا کر صحابی بن گئے، پچھلی آیت میں ان ضدیوں پر غضب الٰہی کا ذکر تھا اس آیت میں ان میں سے مومنین پر اللہ کی رحمتوں کا ذکر ہے، چونکہ ان میں ضدی زیادہ تھے مومن تھوڑے، اس لئے ضدیوں کا ذکر پہلے ہوا مومنین کا بعد میں، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں کافر کتابیوں کے برے اعمال کا ذکر تھا، کفر، قتلِ انبیاء، نافرمانی، حد سے بڑھنا وغیرہ، اس آیت میں مومنین کتابیوں کے نیک اعمال کا تذکرہ ہے، تلاوتِ قرآن، تہجد کی نماز، دین کی تبلیغ وغیرہ تا کہ قرآن پڑھنے والے کافروں کے عیوب سے بچیں، اور ان مومنوں کے صفات حاصل کریں، قرآن شریف، طب روحانی کی کتاب ہے جس میں ایمانی دواؤں کا ذکر بھی ہوتا ہے اور ایمانی پرہیزوں کا بھی، چونکہ پرہیز دوا پر مقدم ہے اور اس کا فائدہ دوا سے بھی زیادہ ہے اس لئے پرہیز کا ذکر پہلے ہوا دوا کا بعد میں، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت سے شبہ پڑتا تھا کہ مومن اہلِ کتاب بھی مذکورہ عتاب میں داخل ہوں گے، کیونکہ یہ بھی انہی قاتلین انبیاء کی اولاد میں ہیں جن کے باپ دادوں نے مذکورہ بالا عیوب کئے، اس وہم کو دفع کرنے کے لئے ان بزرگوں کو اس جماعت سے نکالا، گویا پچھلی آیت میں اجمال تھا اس میں تفصیل، **چوتھا تعلق:** گذشتہ آیت میں فرمایا گیا تھا کہ کفار اہل کتاب اپنے گذشتہ گناہوں اور حد سے بڑھنے کی وجہ سے ان عذابوں کے مستحق ہوئے، اس سے شبہ ہوتا تھا کہ مومنین اہل کتاب بھی

سے گزرنا اسی سے مباشرت فاحشہ ہے۔ بدکار عورت کو بھی فاحشہ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بدکاری میں حد سے بڑھ گئی۔ یہاں اس سے یا تو بخل مراد ہے کہ اہل عرب بخل کو فاحشہ کہتے ہیں۔ کعب کہتا ہے ؎

اَخِیْ یَا اَخِیْ لَا فَاحِشًا عِنْدَ بَیْتِهٖ وَلَا برم عِنْدَ اللِّقَآءِ هَیُوْبُ

یا اس سے بخل کے برے نتائج مراد ہیں۔ جیسے مال کی حرص، رب سے ناامیدی، وعدہ الٰہی میں شک، رب سے بدگمانی۔ خالق سے منہ پھیر کر خلق پر توجہ۔ قلب کا غیر اللہ سے تعلق۔ خواہشات کی اطاعت، ترک قناعت، حب دنیا وغیرہ یا اس سے گندی و معیوب باتیں مراد ہیں۔ یعنی شیطان تمہیں بخل یا حرص و ہوس یا برے رسم و رواج میں خرچ کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ کُمْ میں سارے مسلمانوں کی طرف خطاب ہے کسی درجہ کے ہوں اور کسی جگہ کے، یعنی اے مسلمانو! شیطان سے بےفکر نہ رہنا۔ وہ ہمیشہ تمہاری تاک میں ہے۔ تم کتنے ہی بڑے متقی ہو، کسی جگہ رہتے ہو، مکہ شریف میں یا مدینہ منورہ میں، یا خاص خانہ کعبہ میں رہتے ہو، داؤں لگانے سے نہیں چوکتا اس سے ہمیشہ چوکنے رہو۔ وَاللّٰهُ یَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا۔ یہاں یَعِدُ وعدہ خبر میں استعمال ہوا، رب تعالیٰ کے وعدے دو طرح کے ہیں ایک تو وہ جو براہ راست اس نے بندوں سے کئے۔ دوسرے وہ جو حضرات انبیاء کرام نے کئے وہ بھی رب کے ہی وعدے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوا۔ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ (آل عمران: ۱۹۴) خدایا اپنے وہ وعدے پورے کر جو تو نے اپنے رسولوں کی زبان پر ہم سے کئے، ان کی زبان رب کا قلم ہے۔ مَغْفِرَةً سے مراد یا گناہوں کی بخشش یا عیب پوشی دنیا و آخرت میں، کہ سخی کے عیب دنیا میں بھی چھپ جاتے ہیں اور آخرت میں بھی چھپے رہیں گے۔ انشاء اللہ باری تعالیٰ سخی کے گناہ مٹا دیتا ہے یا ثواب آخرت ہے۔ اور فضل سے دنیا میں وسعت رزق، لوگوں کی محبت، اور صدقہ کا اچھا عوض مراد یعنی رب تعالیٰ صدقہ پر دونوں جہان کی نعمتوں کا تم سے وعدہ فرماتا ہے کہ دنیا میں رزق کی برکت، آخرت میں مغفرت و رحمت عطا فرمائے گا، خیال رہے کہ فضل عدل سے وراء ہے، اجرت دینا عدل ہے بلا استحقاق بچہ بخشنا فضل رب تعالیٰ صدقہ کا عوض بھی دے گا فضل بھی، اور یہ رب کو کچھ مشکل نہیں کیونکہ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔ رب وسعت والا بھی ہے کہ اس کے خزانے میں کمی نہیں اور علم والا بھی۔ اہل ہی کو نعمتیں بخشتا ہے۔ اس کا کرم تو دیکھو کہ یُؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ علم جیسی نعمت جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ حکمت کے معنی ہیں واقعی چیزوں کو صحیح طور پر جاننا، وہمی باتوں کا جاننا حکمت نہیں۔ یوں ہی غلط تحقیق علم نہیں، جہالت ہے۔ یہاں حکمت میں ۲۹ قول ہیں کہ اس سے مراد یا تو نبوت ہے، یا قرآن کا علم ناسخ و منسوخ و محکم و متشابہ کی پہچان، یا علم فقہ یا قرآن کا تدبر یا اچھے اعمال، یا علم نافع، یا علم باعمل، یا رب کی معرفت، یا قلبی نور جو الہام و وسوسہ میں فرق کر دے، یا الہام، یا قرآنی اسرار، یا توفیق خیر، یا خوف الٰہی وغیرہ (معانی وغیرہ) حضرت مقاتل فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں لفظ حکمت اکثر چار معنی میں استعمال ہوا، قرآنی وعظ، جیسے۔ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَیْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ یَعِظُكُمْ بِهٖ (بقرہ: ۲۳۱) فہم و علم وَ اٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا۔ (مریم: ۱۲) فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (النساء: ۵۴) قرآن و اسرار قرآن اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ (نحل: ۱۲۵) (کبیر) یہاں سارے معنی درست ہیں۔ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا۔ یہ نیا جملہ ہے جس میں علم و حکمت کی فضیلت ارشاد ہوئی۔ حکمت میں لام جنسی ہے۔ خیر شر کا مقابل (بھلائی) یعنی جسے کچھ بھی حکمت عطا ہوئی۔ اسے بہت بھلائی

قَآىِٕمًا (زمر:۹) ۳۔حفاظت کرنا وخیال رکھنا جیسے وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (بقرہ:۴۳) ۴۔کسی چیز کا ارادہ کر لینا جیسے اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ (مائدہ:۶) ۵۔ٹھیک و درست ہونا جیسے اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ ۶۔یا کسی چیز پر قائم اور پابند رہنا، یہاں یا تو بالاختیار نماز میں کھڑا ہونا مراد ہے یا درست و سیدھا ہونا، یا حق عبودیت کی حفاظت کرنا یا اللہ کی اطاعت پر استقامت یعنی ان اہل کتاب میں ایک ایسی جماعت بھی ہے یا یہ مومنین وہ جماعت ہیں جو نماز میں کھڑے رہتے ہیں یا راہ حق پر قائم ہیں یا اللہ کے حقوق کے محافظ ہیں یا اطاعت پر مستقیم ہیں يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ يَتْلُوْنَ اُمَّةٌ کی دوسری صفت ہے تلاوتٌ سے بنا، جس کا مادہ تلوٌ ہے بمعنی اتباع یا پیچھے ہونا چونکہ قرآن پڑھنے والا الفاظ قرآن کی اتباع کرتا ہے، اس لئے اسے تلاوت کہا جاتا ہے، آیتِ اللہِ قرآن شریف کی آیتوں کو بھی کہتے ہیں اور ساری مخلوق کو بھی، کیونکہ یہ سب قدرتِ خداوندی کی نشانیاں ہیں، یہاں قرآنی آیتیں مراد ہیں کہ تلاوت انہی کی ہوتی ہے اس تلاوت سے یا تو نماز کی تلاوت مراد ہے یا علاوہ نماز تلاوتِ قرآن، پہلے معنی زیادہ ظاہر ہیں جیسا کہ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ سے معلوم ہو رہا ہے (تفسیر کبیر) اٰنَآءَ اَنًی کی جمع ہے یا اَنَا کی یا اِنْیٌ کی، اس کے بہت معنی ہیں وقت و ساعت، کسی چیز کا اپنی انتہاء کو پہنچ جانا، رب تعالیٰ فرماتا ہے اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا (حدید:۱۶) اہل عرب کہتے ہیں اَنَی الْحَرُّ گرمی انتہاء کو پہنچ گئی، سخت گرم اور کھولتے پانی کو انٍ کہتے ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ (رحمٰن:۴۴) اور فرماتا ہے عَيْنٍ اٰنِيَةٍ، (غاشیہ:۵) کھانا پک جانے کو اِنَا کہا جاتا ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ (احزاب:۵۳) اور اٰنَآءٌ برتن کو کہتے ہیں جس کی جمع اٰنِيَةٌ ہے کہ کھانا اس میں محدود رہتا ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ (دہر:۱۵) یعنی رات کی گھڑیوں میں وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، یا جب رات انتہاء کو پہنچ جائے اور صبح ہونے والی ہو تو نماز تہجد پڑھتے ہیں وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ اگر واؤ حالیہ ہے، اور یہ جملہ يَتْلُوْنَ کے فاعل کا حال ہے تو سجدہ سے مراد نماز ہوگی، کیونکہ سجدہ اور رکوع میں تلاوت منع ہے، اور نماز سے مراد تہجد وغیرہ نفلی نمازیں ہوں گی نہ کہ نماز پنجگانہ فرضی، کیونکہ یہ نمازیں وہ حضرات حضور انور ﷺ کے پیچھے جماعت سے پڑھتے تھے، اور مقتدی نماز میں تلاوت کرتا نہیں، اور اگر واؤ عاطفہ ہے اور یہ جملہ علیحدہ، تو سجدہ اپنے معنی میں ہے یعنی وہ حضرات نماز میں اور نماز سے علاوہ تلاوتِ قرآن کریم بھی کرتے ہیں اور سجدے بھی (تفسیر کبیر) ان بزرگوں کے اعمال صالحہ اور بدنی عبادتیں بیان فرمانے کے بعد ان کے عقائد کی تعریف کی جا رہی ہے کہ ارشاد ہو رہا ہے يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اس کی تفسیر پہلے ہو چکی کہ ایمانیات کے دو کنارے بیان فرما کر سارے ایمانیات کی طرف اشارہ کر دیا یعنی ذات الٰہی سے لے کر قیامت تک کی ساری باتوں کو نبی کی معرفت سے ماننے ہیں کہ اسی معرفت کا نام ایمان ہے، نبوت کے بغیر ربوبیت وغیرہ ماننا توحید تو ہے مگر ایمان نہیں، ان بزرگوں کی لازمی صفات بیان فرما کر متعدی صفتوں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے کہ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، ان جملوں کی تفسیر پہلے کی جا چکی ہے یعنی وہ لوگ خود اپنی اصلاح پر قناعت نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو بھی اپنی طرح بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اسی لئے ہر شخص کو ہر اچھی بات کا مشورہ دیتے ہیں اور ہر بری بات سے روکتے ہیں، وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ يُسَارِعُوْنَ سرعت سے بنا بمعنی دوڑنا اور جلدی کرنا، جلدی ختم کرنے کی کوشش مراد نہیں، اس کا نام تو عجلت ہے بلکہ جلدی حاصل کرنے کی

بے دریغ مال خرچ کر دیتے ہیں۔ رب کے نام پر چار پیسہ خرچ نہیں کر سکتے مگر شادی' موت' ممبری' بیماری' مقدمہ بازی میں خوب خرچ کرتے ہیں۔ **پانچواں فائدہ:** خیرات سے روکنے والا' یا روکنے کے حیلے کرنے والا شیطان ہے۔ لہٰذا فی زمانہ دیوبندی' وہابی جو ہزار حیلوں سے کار خیر روکتے ہیں یہ بھی اخوان الشیٰطین ہیں۔ مثلاً میلاد شریف' تیجہ' دسواں' چالیسواں پر چار پیسہ خرچ کرنا بدعت بھی ہے' حرام بھی مگر سیاسی جلسوں پر ہزار ہا روپیہ برباد کرنا بدعت ہے نہ حرام' رب سمجھ عطا فرمائے۔ آج کل نئی تہذیب کے ولدادا قربانی کے موقعہ پر کہتے ہیں کہ قربانی نہ کرو۔ اس سے پیسہ برباد ہوتا ہے۔ قوم غریب ہے۔ اتنا پیسہ کالجوں سکولوں میں لگاؤ۔ آج تک ان کی نظر سینما و دیگر عیاشیوں پر نہ گئی۔ ایک سال کی قربانی کا خرچ مسلمانوں کے ایک رات کی سینما بینی سے کم ہے۔ مگر اسے بند کرنے کا خیال بھی نہیں۔ یہ ہے اس آیۃ کریمہ کا ظہور مگر انشاء اللہ کوئی دینی کام بند نہ ہوگا گرگٹ کی پھونک سے حضرت خلیل کی آگ تیز نہ ہوگئی تھی۔ **چھٹا فائدہ:** علم بڑی نعمت ہے کہ یہ باقی ہے دیگر سب فانی۔ دین کی تمام بہار علم دین سے ہے مسجد میں نمازیں' میدان جنگ میں جہاد' عدالتوں میں انصاف' بازار کی رونق' موت کے وقت مدد قبر کا نور' محشر کی نجات علم دین کی برکت سے ہے۔ **ساتواں فائدہ:** تھوڑا علم دین' بہت مال سے افضل ہے کہ رب نے ساری دنیا کو قلیل فرمایا۔ مگر تھوڑے علم و حکمت کو خیر کثیر' حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے بارگاہ نبوی میں اپنے شوہر کی غربت کی شکایت کی۔ حضور علیہ السلام نے اسکے شوہر سے پوچھا کہ تجھے کچھ قرآن بھی یاد ہے؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں۔ فلاں فلاں سورۃ فرمایا خوب خوب! تو بہت بڑا غنی ہے۔ وہ بیوی بھی راضی ہوگئی۔ کچھ روز بعد وہ مالدار ہوگیا۔ (درمنثور) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جسے رب نے قرآن کریم کا علم دیا پھر وہ اپنے غریب اور مالداروں کو امیر جانے وہ نعمت رب کا ناقدرہ ہے۔ (تاریخ بخاری) ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ خوف الٰہی حکمت و معرفت کی اصل ہے۔ (ابن ابی حاتم) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قرآن وہ غنا ہے جس کے بعد فقیری نہیں (ابونعیم) **آٹھواں فائدہ:** قرآن کی صحیح فہم نعمت ہے۔ اور اس کی کج فہمی رب کا عذاب' قرآن کی غلط فہمی کے باعث مسلمانوں میں بارہا کشت و خون ہوا۔ کفار کی آیتوں کو مسلمانوں پر' اور بتوں کی مذمت کی آیات انبیاء کرام پر چسپاں کرنا وہ جہالت ہے جس نے صدہا مسلمانوں کا خون کرا دیا (از خازن و روح البیان) **نواں فائدہ:** فلسفہ' منطق' ریاضی وغیرہ حکمت نہیں صرف قرآن و حدیث' فقہ وغیرہ علوم دینیہ حکمت ہیں جس کی یہاں تعریف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے توریت جمع فرمانے اور اس کا مطالعہ کرنے کی اجازت چاہی۔ منع فرما دیا گیا اور فرمایا کہ اگر صاحب توریت موسیٰ علیہ السلام بھی آج زندہ ہوتے تو ہماری پیروی کرتے (تفسیر روح المعانی) تو کیا بوعلی' جالینوس کی خلاف شرع بکواس توریت سے بڑھ کر ہے۔ **دسواں فائدہ:** حضور علیہ السلام کے پاس خیر کثیر ہے کہ رب نے حکمت کو خیر کثیر فرمایا اور حضور علیہ السلام کے متعلق فرمایا۔ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ نبی علیہ السلام علم و حکمت دیتے ہیں۔ لہٰذا دیوبندیوں کا یہ کہنا کہ اگر حضور علیہ السلام کو علم غیب ہوتا تو خیر کثیر جمع کر لیتے۔ اور خیر تو جمع کی نہیں۔ لہٰذا آپ کو علم غیب بھی نہیں' غلط ہے۔ آیت لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (اعراف ۱۸۸) کے معنی یہ بھی ہیں کہ سمجھ لو اگر میرے پاس علم غیب ہے تو خیر کثیر بھی ہے اور خیر کثیر تو ہے لہٰذا علم غیب بھی ہے تاکہ آیات میں تعارض نہ ہو۔ خیال رہے کہ مال و دولت خیر کثیر نہیں۔ اسے تو رب تعالیٰ نے قلیل فرمایا۔ اگر یہ خیر کثیر ہے تو چاہیے تھا کہ اکثر انبیاء کرام جیسے حضرت عیسیٰ' یحییٰ' جو مال نہ رکھتے تھے۔ وہ خیر

کثیر سے محروم ہوتے۔ اور فرعون' نمرود' قارون وغیرہ بے دین مالدار خیر کثیر والے ہوتے۔ ایسے ہی حضرت بلال وصہیب تو خیر کثیر سے محروم ہوتے۔ اور ابو جہل خیر کثیر والا ہوتا۔ **گیارھواں فائدہ:** ہر میٹھی باتیں کرنے والا دوست نہیں۔ ہر چمکتی چیز سونا نہیں۔ کبھی دشمن کے لئے خیر خواہی ظاہری کی جاتی ہے۔ دیکھو شیاطین فقر سے ڈرا کر صدقہ سے روکتے ہیں۔ لہٰذا ہر ایک کی اچھی باتیں نہ سننی چاہئیں۔ **بارھواں فائدہ:** حکمت یعنی علم دین محض اپنی کوشش سے نہیں ملتا۔ رب کی کرم نوازی سے ملتا ہے دیکھو ارشاد باری ہوا۔ جسے چاہے حکمت عطا فرمائے۔ کتب اور استاد تو اس علم کے حاصل ہونے کے اسباب ہیں۔ کام مسبب الاسباب کے ہاتھ ہے۔ کتب واستاد سے جو علم ملتا ہے وہ ایسا ہے جیسا بجلی کی فیٹنگ کر دینا۔ اور فیض ربانی ایسا ہے جیسے اس میں پاور کا آ جانا کہ بغیر پاور ساری فٹنگ دیکھنے میں سب کچھ ہے مگر بے کار۔ **تیرھواں فائدہ:** حضور علیہ السلام کا آستانہ دربار الٰہی ہے اور حضور علیہ السلام کی عطا رب کی عطا ہے۔ دیکھو یہاں رب نے فرمایا کہ جسے اللہ چاہے حکمت دے۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے **وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ** کہ نبی علیہ السلام انہیں علم وحکمت سکھاتے ہیں۔ عطا حکمت کو یہاں رب کی طرف نسبت فرمایا وہاں انہیں حبیب کی طرف۔ **چودھواں فائدہ:** جیسے دنیاوی نعمتیں بعض عمومی بعض خصوصی ہیں۔ جیسے دھوپ پانی اور سلطنت ایسے ہی دینی نعمتیں بعض عمومی ہیں بعض خصوصی' حکمت خصوصی نعمت ہے جو کسی کو ملتی ہے اور جیسے دنیاوی روزیوں کے لئے دروازے مختلف ہیں کہ کسی کو کچہری سے روزی ملتی ہے کسی کو سکول سے کسی کو بازار سے کسی کو مسجد سے ہر ایک اپنے دروازہ سے وابستہ ہے۔ ایسے ہی حکمت کسی کو پیدائشی ملتی ہے کسی کو مدرسہ وکتب سے کسی کو کسی کی نظر سے صحابہ کرام نے کوئی کتاب نہ پڑھی' مگر حکمت میں سب کے استاد تھے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں فرمایا' کہ رب جس کو چاہے حکمت دیتا ہے تو جسے چاہے حماقت بھی دیتا ہوگا۔ خدا ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ طرفداری سے پاک ہے وہ سب کا رب ہے۔ سب پر یکساں فضل کرتا ہے ہمیں تو ایسا خدا پسند نہیں ہے۔ جو سب سے یکساں سلوک نہ کرے۔ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** پنڈت جی کو بہت دور کی سوجھتی ہے۔ جناب دنیا میں یکسانیت ہو سکتی ہی نہیں۔ یہاں ہر چیز رنگ برنگی ہر انسان کی علیحدہ شان چاہیے۔ بعض زمینیں کھاری ہیں۔ بعض ریتلی۔ بعض سر سبز وشاداب' جیسے زمین کشمیر' بعض درخت پھل پھول والے ہیں۔ بعض محض خاردار ایک ہی شیشم کے تختے تو عمارات میں کام آتے ہیں مگر شاخیں چولہے میں۔ ایسے ہی انسان کوئی عالم' کوئی جاہل' کوئی بدنصیب' کوئی بختاور' کوئی کالا' کوئی گورا' کوئی وزیر دامیر' کوئی غریب' غرضکہ جو جس کے لائق ہے۔ رب اسے وہ ہی عطا فرماتا ہے۔ رب حلیم وحکیم ہے۔ عالم کی حالت مختلف چیزیں چاہتی ہیں۔ اگر انسان محض اعمال کی وجہ سے دولت مند وغریب ہوتا ہے تو ایک ہی شخص کبھی بادشاہ کبھی گھسیارا کیوں ہوتا۔ ہم اس کی پوری بحث پارہ الٓمٓ میں کر چکے ہیں۔ تعجب ہے کہ ایک کمہار کو تو یہ قوت ہو کہ ایک ہی مٹی سے آبخورے بھی بنا دے جس میں ہمیشہ پانی رہے اور ہانڈی بھی جو ہمیشہ آگ پر جلے مگر رب تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر اتنا بھی اختیار نہ ہو۔

تفسیر صوفیانہ

ہر ایک چاہتا ہے کہ میرے ہم جنس زیادہ ہوں۔ تاجر کی خواہش ہے کہ سب تاجر ہو جائیں۔ عالم کی تمنا ہے کہ دنیا علم ومعرفت

سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا رب تعالیٰ کو بہت پسند ہے جیسا کہ یُسَارِعُوْنَ کی دو تفسیروں سے معلوم ہوا، **تیرھواں فائدہ:** صحابہ کرام کا صالح و نیک ہونا ایسا ہی قطعی و یقینی ہے، جیسے رب تعالیٰ کی توحید اور حضور انور ﷺ کی رسالت، کیونکہ یہاں انہیں صالحین فرمایا اور دوسری جگہ صدیقین تیسری جگہ مومنین حقا کہ فرمایا وَاُولٰٓئِکَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ (آل عمران: ۱۱۴) اور فرمایا اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (حجرات: ۱۵) اور فرمایا اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا (انفال: ۴) اس آیت میں تو صحابہ کے مناقب کی حد ہوگئی،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ گنہگار تھے مگر کفار سے کم، ان کے برابر نہیں کیونکہ یہاں برابری کا انکار کیا گیا نہ کہ گناہ کا، **جواب:** سواء نکرہ ہے جو نفی کے تحت آ کر عموم کا فائدہ دے رہا ہے یعنی وہ کسی بات میں کفار کے برابر نہیں، نہ کسی بدعقیدگی میں اور نہ کسی بدعملی میں، اگر ایک عیب بھی ان میں ہوتا تو اس عیب میں تو کفار کے برابر ہو جاتے، اگر ایسی آیتوں کے یہ معنی سمجھے جائیں تو مصیبت آ جائے گی، رب تعالیٰ فرماتا ہے لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ (حشر: ۲۰) جنتی و دوزخی برابر نہیں، کیا یہ کہو گے کہ جنتی بھی دوزخیوں کی طرح کافر فاسق تو ہیں، ہاں کچھ ان سے کم ہیں برابر نہیں نَعُوْذُ بِاللّٰهِ، اس کا دوسرا جواب وہ ہے جو تفسیر میں عرض کیا گیا کہ یہاں سواء سے مراد مشابہت ہے، **دوسرا اعتراض:** جو کتابی ایمان لا چکے تھے انہیں اہلِ کتاب کیوں کہا گیا، وہ تو مسلمان تھے مسلمانوں کو اہل کتاب کہا نہیں جاتا، **جواب:** یا نسب کے اعتبار سے یا پچھلی حالت کے لحاظ سے، یعنی بنی اسرائیل میں سے بعض مومن ہیں، یا جو پہلے اہل کتاب تھے جیسے کہا جاتا ہے کہ بہت سے کافر مسلمان ہو گئے یعنی جو پہلے کافر تھے، **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ نیکیوں میں جلدی کرنا اچھا ہے اور حدیث شریف میں ہے اَلْعَجْلَةُ مِنَ الشَّیْطَانِ بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ تعجیل کار شیاطین بود، جلدی کرنا شیطانی کام ہے ان دونوں میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** نیکیوں میں سرعت اچھی ہے عجلت بری، سرعت سستی کی مقابل ہے اور عجلت اطمینان کی، قرآن پاک نے سرعت کی تعریف کی اور حدیث شریف نے عجلت کی برائی کی، خلاصہ یہ ہے کہ نیکیوں میں جلدی کرو اپنی موت اور اس کے فوت سے پہلے کر لو، مگر ادائے اطمینان سے کرو، غالباً یہ حدیث ہے کہ عَجِّلُوْا الصَّلٰوةَ قَبْلَ الْفَوْتِ وَعَجِّلُوْا التَّوْبَةَ قَبْلَ الْمَوْتِ یعنی فوت سے پہلے نماز پڑھ لو اور موت سے پہلے توبہ کر لو یہاں علجت بمعنی سرعت ہے،

تفسیر صوفیانہ

جیسے تخم سے درخت کی پیدائش ہے کہ تخم ایک ہے مگر درخت کے اجزاء مختلف شاخیں تنا، پتے، پھول پھل، یہ آپس میں سب برابر نہیں، نہ ان کا مقام ایک ہے، شاخیں اور پتے جلائے جاتے ہیں، تنے کے تختے، کواڑ اور فرنیچر وغیرہ بنائے جاتے ہیں، پھل پھول عزت سے کھائے اور آنکھوں سے لگائے جاتے ہیں، کانٹے ہٹائے جاتے ہیں، ایسے ہی انسانی نسل کی اصل ایک ہی ہے مگر انسان مختلف، کوئی کانٹوں کی طرح ہٹانے کے لائق ہیں، کوئی بیکار شاخوں، پتوں کی طرح جلانے کے قابل، کوئی پھولوں

وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

اور نہیں ہے واسطے ظالموں کے کوئی مددگار

اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے کئی طرح سے تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں مقبول و مردود صدقات کا ذکر ہوا۔ اب ان دونوں کے انجام کا اجمالی تذکرہ ہے۔ **دوسرا تعلق:** صدقات چند قسم کے ہیں۔ واجبہ و نفلی پھر واجبہ کی دو قسمیں ہیں۔ خود رب کے واجب فرمائے ہوئے اور وہ جو انسان اپنے پر خود لازم کرے اگلی قسموں کا ذکر پچھلی آیتوں میں ہوگیا۔ اب تیسری قسم یعنی منت کا ذکر ہو رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں شرائط صدقہ کا بیان تھا۔ اب ایک نئے طریقہ سے ان شرائط کی پابندی کی تاکید فرمائی جارہی ہے۔

تفسیر

وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ۔ مَا موصولہ ہے بعد کی عبارت اس کا صلہ انفاق سے مطلقاً خرچ کرنا مراد ہے۔ خواہ راہ الٰہی میں ہو یا دنیاوی کاروبار میں' نفقہ نکرہ ہے جس کا عموم مِنْ کی وجہ سے اور بھی زیادہ ہوگیا۔ اس سے حرام و حلال' قلیل و کثیر' نفاق و ریاء و اخلاص' حق و باطل' پوشیدہ و ظاہر سارے خرچہ مراد ہیں۔ (روح البیان و معانی وغیرہ) گویا یہ آیت سارے نفقات کا حکم کلی بیان فرمارہی ہے۔ اَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ۔ نَذْرِ کے لغوی معنی ہیں خوف و ڈر' اسی سے نذیر و انذار ہے۔ عرف میں کسی چیز کے لازم کرنے کو نذر کہا جاتا ہے کہ ڈر ہی کے وقت صدقہ وغیرہ لازم کیا جاتا ہے اور التزام کے بعد ادا نہ کرنے سے ڈر بھی لگتا ہے۔ لہٰذا اسے نذر کہتے ہیں۔ شریعت میں کوئی عبادت اپنے پر لازم کر لینے کو نذر کہا جاتا ہے۔ مگر اس کی کچھ شرائط ہیں جو فوائد میں بیان ہوں گی۔ نذر کی تنکیر اور مِنْ کی زیادتی سے اس کے عموم کا فائدہ ہوا۔ یعنی تم کوئی سی منت مانو مال کی یا اعمال کی' طاعت کی یا معصیت کی شرط سے یا بغیر شرط مبہم یا معین۔ فَاِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُهٗ یہ ما مبتدا بمعنی شرط کی خبر بمعنی جزاء ہے ہٗ کا مرجع یا مَا ہے یا نذر' کیونکہ نفقہ مؤنث ہے۔ اس کی طرف ضمیر مذکر نہیں لوٹ سکتی۔ چند چیزیں بول کر کبھی مقدم کی طرف ضمیر لوٹائی جاتی ہے۔ جیسے وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَیْهَا (جمعہ:۱۱) اور کبھی مؤخر کی جانب جیسے۔ وَمَنْ یَّكْسِبْ خَطِیْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓئًا (النساء:۱۱۲) یعنی اللہ ان سب کو جانتا ہے۔ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۔ یہ مَا نافیہ ہے۔ اور ظالمین ظلم بمعنی تاریکی سے بنا' اصطلاح میں ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو غیر محل میں استعمال کرنا۔ چونکہ اندھیرے میں بھی چیز جگہ سے بے جگہ ہوتی ہے اس مناسبت سے اسے ظلم کہا جاتا ہے۔ ظلم کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جان پر ظلم' مال یا اولاد یا غیروں پر ظلم' اس لئے ظالمین جمع فرمایا گیا۔ یا تو اس سے کفار مراد ہیں یا بخیل یا منت پوری نہ کرنے والے یا سارے ظالم۔ انصار' ناصر یا نصیر کی جمع ہے۔ جیسے حبیب کی احباب' یا شاہد کی اشہاد۔ یہاں یہ جمع ظالمین جمع کے مقابلہ میں ہے اور نوعیت کے لئے یعنی ظالمین کے لئے کوئی قسم کی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔

اور وہ جہنمی ہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے

تعلقات

اس کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** گزشتہ آیتوں میں مومنوں کے نیک اعمال اور کفار کی بدعملیوں کا ذکر تھا، ان آیتوں میں مومنوں کی جزاء اور کافروں کی سزا کا ذکر ہے، **دوسرا تعلق:** گزشتہ آیتوں میں کافر و مومن دو جماعتوں کا ذکر تھا، اب ان آیتوں میں فرمایا جارہا ہے کہ مومنوں کی کوئی نیکی برباد نہ جائے گی اور کافروں کی کوئی بھلائی کام نہ آئے گی، گویا ابتداء کا ذکر وہاں تھا اور انتہا کا یہاں، **تیسرا تعلق:** گزشتہ آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ مومنین صالح یعنی لائق ہیں، جس سے معلوم ہوا تھا کہ کفار نالائق ہیں، اب اس لیاقت و نالائقی کی تفسیر بیان ہورہی ہے کہ مومن کن جزاؤں کے لائق ہے جن کے کافر لائق نہیں، **چوتھا تعلق:** گزشتہ آیتوں میں رب تعالیٰ نے مومنین کی آٹھ صفات بیان فرمائیں جن سے شبہ ہوتا تھا کہ جس میں یہ آٹھ صفات علیٰ وجہ الکمال جمع نہ ہوں، وہ نہ مومن ہے نہ امت قائمہ ہے نہ کسی جزاء کا مستحق، اس خیال سے ہم جیسے گنہگاروں کی ہمت ٹوٹتی تھی، اب ہم جیسوں کی ہمت افزائی کے لئے فرمایا جارہا ہے کہ گھبرانا مت جو کچھ بن پڑے نیکی کئے جاؤ، جزاء ملے گی، جیسا کہ مِنۡ خَیۡرٍ سے معلوم ہورہا ہے، شعر

اترتے چاند، ڈھلتی چاندنی، جو ہو سکے، کر لے — اندھیرا پاکھ آتا ہے، یہ دو دن کی اجالی ہے!

شانِ نزول

جب سیدنا عبداللہ ابن سلام اور ان کے ساتھی ایمان لائے، تو علمائے یہود نے وہ اعتراضات کئے جن کا ذکر و تردید پہلے ہو چکی، عوام اور جہلائے یہود نے ان بزرگوں سے کہا کہ تم نے بڑے ٹوٹے و خسارہ کا سودا کیا کہ ہدایت چھوڑ کر گمراہی لے لی، ہدایت سے مراد انہوں نے یہودیت لی، اور گمراہی سے مراد اسلام، ان کی اور ان بزرگوں کی حمایت میں یہ پہلی آیت اتری (کبیر و خازن) ۲۔ مکہ مکرمہ کے مشرکین خصوصاً ابوجہل نے اسلام کے خلاف اور مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت پیسہ خرچ کیا، اور بعد ہجرت مدینہ کے یہودیوں نے اسلام کے مٹانے کے لئے بہت جانی و مالی زور لگائے، اور اس پر وہ ثواب کی امید رکھتے تھے، نیز مشرکینِ مکہ کہا کرتے تھے وَقَالُوۡا نَحۡنُ اَکۡثَرُ اَمۡوَالًا وَّ اَوۡلَادًا ۙ وَّ مَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِیۡنَ (سباء: ۳۵) یعنی ہماری اولاد اور مال زیادہ ہے ہمیں عذاب نہ ہوگا کیونکہ ہم سے ہی خدا راضی ہے، ورنہ ہمیں اتنا کچھ نہ دیتا، ان سب کی تردید میں دوسری آیت اِنَّ الَّذِیۡنَ الخ نازل ہوئی (تفسیر روح المعانی و صاوی و خازن وغیرہ)

تفسیر

وَمَا یَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ بعض قرأتوں میں تَفۡعَلُوۡا "ت" سے ہے جس میں خطاب صحابہ کرام سے ہے یا عام مسلمانوں سے، ہماری قرأت میں یفعلوا "ی" سے ہے یہی راجح ہے، کیونکہ گزشتہ آیات میں سارے صیغے غائب کے تھے، اور آئندہ بھی غائب کے صیغے آرہے ہیں لہٰذا اس کا بھی صیغہ غائب ہونا مناسب ہے، ما موصولہ ہے جس میں ابہام و پوشیدگی ہے، اور فعل سے مراد قلبی، بدنی، اصلاً و نیابتہً سارے کام ہیں، من بیانیہ تنکیریہ ہے جس نے ما کا تو بیان کردیا، اور خیرٍ کا اطلاق و عموم دوبالا

کر دیا، خیر کے بہت سے معنی ہیں جو پہلے بیان ہوئے، یہاں نیکی مراد ہے خواہ اعتقادی ہو یا بدنی یا مالی، چھوٹی ہو یا بڑی، خفیہ ہو یا علانیہ یعنی صحابہ کرام یا سارے مسلمان جب کبھی کوئی بدنی، مالی، اعتقادی، چھوٹی بڑی کسی قسم کی کوئی نیکی کریں گے فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ يُكْفَرُوْا كُفْرٌ سے بنا جس کے معنی ہیں انکار کرنا، چھپانا، نہ ماننا، اسی لئے چھلکے کو کُفَرّٰی کہتے ہیں کہ وہ مغز کو چھپائے ہوتا ہے، اور ایک دوا کا نام کافور ہے، جو اپنی تیز بو سے دوسری خوشبویوں کو چھپا لیتی ہے، ناشکری کو کفران اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ناشکرا رب تعالیٰ کی نعمت کا انکار کرتا ہے، لوگوں پر ظاہر نہیں کرتا، حق مار لینے کو بھی کفران کہا جاتا ہے کہ وہاں دوسرے کے حق کا انکار ہی ہوتا ہے، رب تعالیٰ کے لئے یہ سارے معنی ناممکن ہیں نہ اس پر کسی کی نعمت و احسان ہے اور نہ کسی کا ذاتی استحقاق، اس لئے جب شکر و کفر کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کی جائے تو وہاں شکر کے معنی ہوتے ہیں جزا دینا، قدر دانی فرمانا، جیسے فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ (بقرہ: ۱۵۸) رب تعالیٰ قدر فرمانے والا علم والا ہے، اور کفر کے معنی ہوتے ہیں جزاء سے محروم کر دینا، یہاں یہی معنی مراد ہیں، اسی لئے یہاں کفر متعدی بدو مفعول کیا گیا اس کا مفعول اول هم پوشیدہ ہے جس کا مرجع مومنین ہیں، اور دوسرا مفعول ہ ضمیر ہے جس کا مرجع خیر ہے یعنی وہ اس خیر کی جزاء سے ہرگز محروم نہ کئے جائیں گے (روح البیان) وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ اس جملہ میں فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ کی دلیل کی طرف ایک لطیف اشارہ کیا گیا، وہ یہ کہ کسی کے عمل کی جزاء نہ دینا یا مجبوری سے ہوتا ہے یا بخل سے، یا خباثت سے، یا بے علمی سے، ہم ان تمام عیوب سے پاک ہیں، نہ ہم بخیل ہیں، نہ نادار، نہ ظالم، کیونکہ ہم اللہ ہیں، اور نہ ہم بے علم ہیں، کیونکہ ہم عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ہیں، متقین فرما کر یہ بتلایا گیا کہ ہماری بارگاہ میں تقویٰ کی قدر ہے، اگر ہم سے کچھ لینا چاہتے ہو تو تقویٰ اختیار کرو، چونکہ اب تک نیکوں کی جزاء کا ذکر ہوا، اور ہر چیز کی پوری معرفت اس کے مقابل سے ہوتی ہے، اس لئے آگے کفار اور ان کی سزاؤں کا ذکر ہے کہ ارشاد ہوا اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا چونکہ کفار اپنے کفر کے ذریعہ نجات اور بدکاریوں کو نیکی سمجھتے تھے، اس لئے اس مضمون کو اِنَّ سے شروع فرمایا گیا، کفر کے معنی انکار ہیں ایمان و اقرار کا مقابل، اس سے مراد ہر کفر ہے، خواہ الوہیت کا انکار ہو یا نبوت کا، یا ضروریاتِ دین میں سے کسی مسئلہ کا، نماز، روزہ وغیرہ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْــًٔا تغنی اِغْنَاءٌ سے بنا جس کا مادہ غنی ہے بمعنی بے پرواہی و بے نیازی، باب افعال میں آ کر دفع ضرر کے معنی دیتا ہے، اسی لئے اس کے بعد عن آتا ہے، کیونکہ دفع ضرر کے بعد انسان بے نیاز ہو جاتا ہے من الله کا تعلق یا تو لن تغنی سے ہے یا ثابت پوشیدہ کا متعلق ہو کر شیئاً کا حال ہے اور شیئاً سے مراد دنیوی و اخروی عذاب ہے یعنی ان کے مال و اولاد میں رب تعالیٰ کی طرف سے یہ طاقت نہ ہوگی کہ وہ کسی عذاب کو دور کر سکیں یا ان کے مال و اولاد رب تعالیٰ کی طرف سے آئے ہوئے کسی عذاب کو دفع نہ کر سکیں گے، تو وہ مال و اولاد پر اتنا کیوں پھولتے ہیں وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ اولئک میں ان مذکور کفار کی طرف اشارہ ہے، اَصْحٰبُ جمع صاحب کی ہے بمعنی ساتھی اور والا، یہاں والا کے معنی زیادہ موزوں ہیں، نار سے مراد دوزخ کا عذاب ہے خواہ وہ گرم ہو یا سرد، کیونکہ ٹھنڈا عذاب بھی آگ کی وجہ سے ہی ہوگا، جیسے دنیا میں سردی کا موسم آفتاب سے ہی آتا ہے یعنی یہ لوگ آگ والے ہیں، خٰلِدُوْنَ خلود سے بنا جس کے معنی ہیں بہت رہنا ہمیشہ رہنا، جب گنہگار مومن کے لئے یہ لفظ آئے گا، تو اس کے معنی ہوں

گے بہت ٹھہرنا جیسے ظلماً قاتل کے لئے فرمایا گیا خَالِدًا فِيهَا (النساء: ۱۴) اور اگر کافروں کے لئے ہوگا تو معنی ہوں گے ہمیشہ ٹھہرنا، یہاں چونکہ کفار کے لئے استعمال ہوا، اس لئے بمعنی ہیشگی ہے یعنی سارے کفار آگ میں ہمیشہ ہی رہیں گے،

خلاصہ تفسیر

اے گنہگار مسلمانو ہمت نہ ہارنا، یہ نہ سمجھنا کہ جس میں یہ آٹھ خوبیاں جمع ہوں وہی ہماری رحمت کا مستحق ہے، ہمارا قانونِ رحمت یہ ہے کہ جو مسلمان کوئی معمولی سے معمولی بدنی، مالی کسی قسم کی نیکی کرے، وہ ہمارے آستانہ سے محروم نہیں کیا جاتا للہٰذا تم سے جو بن پڑے نیکی کرتے رہو، ہم ہر متقی کے اعمال اور درجہ تقویٰ کو بخوبی جانتے ہیں، کسی کے کسی عمل سے بے خبر نہیں تاکہ وہ ہماری رحمت سے رہ جائے خیال رکھنا جیسے ہماری رحمت مومنوں، متقیوں کو گھیرے ہوئے ہے جس کے دائرہ سے کوئی خارج نہیں، ایسے ہی ہمارا عذاب بھی کافروں کو اپنے میں لئے ہوئے ہے جس نے کسی قسم کا کفر اختیار کیا نہ اس کا مال عذاب الٰہی کو دفع کر سکے نہ اولاد نہ جتھا نہ کنبہ، ان کے لئے ہمارا فیصلہ ہو چکا وہ دوزخ والے ہیں کہ دوزخ انہی کے لئے بنائی گئی اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے کبھی وہاں سے رہائی نہ پائیں گے،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** مسلمان کو چاہیے کہ اپنی زندگی کو غنیمت جانے اور جو چھوٹی بڑی نیکی ہو سکے کر گزرے، بڑی نیکی کے انتظار میں چھوٹی نیکیاں نہ چھوڑے، نہ معلوم کون سی نیکی بیڑا پار کر دے جیسا کہ مِنْ خَيْرٍ کے عموم سے معلوم ہوا، **دوسرا فائدہ:** مومن کی کسی نیکی کو رب تعالیٰ ضائع نہیں کرتا جیسا کہ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ سے معلوم ہوا بندہ خود ضائع کرے تو اس کی اپنی حماقت ہے، ہاں وہ کریم اپنے کرم سے ہمارے گناہ معاف کر دیتا ہے، فرماتا ہے وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (نساء: ۴۸) رب تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، اس کا رسول ﷺ سچا ہے، **تیسرا فائدہ:** ایمان کے بعد تقویٰ اللہ کی بڑی نعمت ہے، یہ خوش نصیبوں کو ہی ملتا ہے، تقویٰ کے بہت درجے ہیں، تقویٰ عام، تقویٰ خاص، تقویٰ خاص الخاص، ان کی تشریح هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (بقرہ: ۲) کی تفسیر میں عرض کی گئی، یہ فائدہ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ سے حاصل ہوا، **چوتھا فائدہ:** انشاء اللہ مومن کا مال و اولاد رب تعالیٰ کے حکم سے کام آئیں گے، عذاب الٰہی دفع کریں گے، مومن کے صدقات، نیک اولاد کی برکت سے اللہ تعالیٰ عذاب دفع فرمائے گا کیونکہ اس آیت میں مال و اولاد کا دفع عذاب نہ کرنا کفار کے لئے عذاب کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے، اور کفار کے عذاب سے مومن محفوظ ہیں جیسا کہ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ الخ سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** کافر کی کوئی نیکی آخرت میں کام نہ آئے گی، اس سے عذاب دفع نہ کر سکے گی، کیونکہ اعمال کی قبولیت مومن کے لئے رحمت کے طور پر یہاں مذکور ہوئی جس سے کفار محروم ہیں جیسا کہ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** مومن کی نیکیوں کی برکت سے گناہ تو معاف ہو جاتے ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ (ہود: ۱۱۴) مگر کسی گناہ کی وجہ سے اس کی نیکیاں برباد نہ ہوں گی جیسا کہ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ سے معلوم ہوا، خیال رہے کہ یہاں گناہ کا ذکر ہے ارتداد کا ذکر نہیں، وہ دوسری چیز ہے، **ساتواں فائدہ:** مومن کیسا ہی گنہگار ہو انشاء اللہ

تعالیٰ دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہے گا آخر کار نجات پائے گا جیسا کہ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ الخ سے معلوم ہوا، اللہ تعالیٰ نے آگ والا کفار کو فرمایا ہے، معلوم ہوا کہ مومن آگ والا نہیں، گھر والا وہ ہوتا ہے جو وہاں ہمیشہ رہے، جس کا گھر ہو، مہمان گھر والا نہیں کہلاتا، مومن کو رب تعالیٰ نے فرمایا اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ جنت والے یعنی ان کا گھر جنت ہے، دوزخ تو ان کے سفر کی ایک منزل ہے،

اعتراضات

پہلا اعتراض: فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ مومن کی کوئی نیکی رائیگاں نہیں جاتی، حدیث شریف میں ہے کہ ریاکار کے اعمال برباد ہیں، ان دونوں میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** ریاکار کی نیکیاں خیر ہی نہیں بلکہ شر ہیں، یہاں خیر کا ذکر ہے، اسی لئے رب تعالیٰ نے مِنْ عَمَلٍ نہیں فرمایا، عمل عام ہے خیر خاص، خیر وہ نیکی ہے جس کے ساتھ نیت بھی نیک ہو، **دوسرا اعتراض:** اسی فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ سے معلوم ہوا کہ مومن کی نیکیاں ضبط نہیں ہوتیں، مگر قرآن شریف میں دوسرے مقام پر فرمایا گیا وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (فرقان: ۲۳) ہم نے ان کے اعمال اڑا کر رکھ دیئے دونوں آیتوں میں تعارض ہے! **جواب:** یہاں مومنوں کے اعمال ضبط نہ ہونے کا ذکر ہے، وہاں کافروں کی ضبطی اعمال کا تذکرہ، اس آیت کی تفسیر یہ آیت ہے اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ الخ (کہف: ۱۰۵) **تیسرا اعتراض:** دوسرے مقام پر مسلمانوں سے رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہمارے نبی کی آواز پر آوازیں اونچی نہ کرو اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (حجرات: ۲) معلوم ہوا، کہ مسلمان کی نیکیاں بھی معمولی گناہ سے ضبط ہو جاتی ہیں، پھر فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ کا کیا مطلب؟ **جواب:** اس آیت میں بے ادبی کے طور پر حضور انور ﷺ کی آواز پر اونچی آواز کرنا مراد ہے، اور نبی کی بے ادبی کفر ہے، کفر سے ضبطی اعمال، ورنہ حضور انور ﷺ کی موجودگی میں اذانیں دی جاتی تھیں جس کا سرکار آہستہ جواب دیتے تھے، بعد نماز پنجگانہ تمام صحابہ مل کر اونچی آواز سے ذکر اللہ کرتے تھے، اور خود سرکار انور ﷺ بھی اور یقیناً ان سب بزرگوں کی مجموعی آوازیں حضور انور ﷺ کی آواز سے اونچی ہوتی تھیں، یہ عمل نہ کفر تھا نہ گناہ بلکہ رب تعالیٰ کو محبوب تھا، **چوتھا اعتراض:** یہاں فرمایا گیا، کہ کفار کے مال و اولاد عذاب دفع نہ کر سکیں گے، تو کیا ان کی دیگر چیزیں سلطنت، عزت وغیرہ عذاب دفع کریں گی؟ **جواب:** ہرگز نہیں، یہاں خصوصیت سے مال و اولاد کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ انسان اکثر انہی دو سے مصیبت میں کام لیتا ہے جب کفار کو یہ دو چیزیں ہی کام نہ آئیں، تو بقیہ چیزیں کیا کام آسکتی ہیں، **پانچواں اعتراض:** تم نے فوائد میں کہا کہ مسلمانوں کی اولاد و مال عذاب الٰہی دفع کر دیں گی، تو کیا مسلمانوں کی اولاد و مال میں خدا تعالیٰ سے زیادہ طاقت ہے؟ کہ خدا تعالیٰ نے عذاب بھیجا انہوں نے دفع کر دیا، **جواب:** ہرگز نہیں، ہمارا مقصد یہ ہے کہ یہ چیزیں بحکم پروردگار عذاب دفع کر دیتی ہیں، مسلمانوں کے بعض گناہوں سے دریائے غضب جوش میں آتا ہے، مگر رب تعالیٰ ان کی برکت سے اسے ٹھنڈا کر دیتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے دوا نے بخار رفع کر دیا یعنی بحکم پروردگار نہ کہ اس کے مقابلہ میں، **چھٹا اعتراض:** كَفَرُوْا سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک آن کے کفر سے

شان نزول

امام کلبی فرماتے ہیں کہ جب آیت وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ (بقرہ:۲۷۰) نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا حبیب اللہ جب خدا کو ہر صدقہ کی خبر ہے تو علانیہ صدقہ بہتر ہے یا پوشیدہ۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (روح المعانی)

تفسیر

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ چونکہ یہ جملہ پچھلی آیت کی گویا تفصیل ہے۔ اس لئے یہاں واؤ نہ لایا گیا۔ تبدوا 'بدءٌ' سے بنا۔ بمعنی ظہور اور یہاں وہ اظہار مراد ہے جو ریا کاری اور شہرت کی غرض سے نہ ہو بلکہ اس لئے ہو کہ دیکھا دیکھی لوگ بھی خیرات کریں۔ خیال رہے کہ ابداءٌ۔ اظہار، جہران سب کے معنی ہیں۔ اعلان و اظہار مگر جہر میں ہے بتانا اظہار میں ہے دکھانا 'ابداءٌ' دونوں کو شامل ہے۔ ظاہر ظہور صدقہ دینا' یا صدقہ سے پہلے اس کا اعلان کر دینا کہ ہم یہ دیں گے۔ یا صدقہ کے بعد اعلان کرنا کہ ہم نے یہ دیا۔ سب ابدا میں داخل ہیں۔ حضرت عثمان غنی نے غزوۂ تبوک کے موقعہ پر نو سو اونٹ' نو سو دینار دینے کا اولاً اعلان فرمایا۔ پھر سب کے سامنے لا کر حاضر کر دیئے۔ یہ ابداءٌ سے دو معنی پر عمل ہوا' پھر رومہ اپنے بہو سے خریدا پھر اس کے وقف کا اعلان فرما دیا۔ یہ ابداء کی تیسری صورت پر عمل ہوا۔ غرضکہ ان حضرات کے اعمال اس آیت کریمہ کی تفسیریں ہیں۔ صَدَقَاتٌ صدقةٌ کی جمع ہے۔ اس کی لفظی تحقیق پہلے گزر چکی۔ یہاں اس سے صدقہ کی اقسام مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ صدقہ نفلی مراد ہے بعض نے فرمایا۔ صدقہ فرض بعض کے نزدیک عام صدقات۔ صدقہ فرض و نفلی ہر خیرات کو کہتے ہیں۔ (کبیر) یعنی اگر تم اپنے صدقات لوگوں پر ظاہر کرو۔ فَنِعِمَّا هِيَ۔ ف جزائیہ اور نعما نعم فعل مدح اور ما تنکیریہ کا جملہ ہے۔ یہ جملہ ھِیَ کی خبر اور ھِیَ کا مرجع یا صَدَقَاتٌ ہیں۔ یا تُبْدُوْا کا مصدر یعنی ظاہر صدقے یا صدقات کا ظاہر کرنا۔ کیا ہی اچھا' یا بہت ہی اچھا ہے۔ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ۔ اخفاء اظہار کا مقابل ہے۔ جیسے معنی ابداء و اظہار میں ملحوظ تھے ان سب کی نفی اخفاء میں معتبر ہو گی کہ نہ پہلے صدقہ کا اعلان ہو نہ صدقہ دیتے وقت نہ بعد میں۔ ھَا کا مرجع یا مطلقاً صدقات ہیں یا اس کی خاص نوع۔ یعنی صدقہ واجبہ جیسے کہا جاتا ہے۔ عِنْدِیْ دَرَاهِمُ وَ نِصْفُهٗ اس نصفهٗ میں ہٗ کا مرجع دوسرا درم ہے نہ کہ یہ مذکورہ۔ اظہار اور اخفاء کو جمع کرنے میں صنعت طباق لفظی ہے اور چونکہ صدقہ پوشیدہ میں فقیر و غنی کی پہچان دشوار ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ یہ قید لگا دی کہ فقیر کو دو۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ زکوٰۃ کا ظاہر کرنا بہتر۔ اس لئے وہاں فقراء کا ذکر نہ کیا اور چونکہ زکوٰۃ میں فقیر ہی مصرف نہیں۔ دیگر مصارف بھی ہیں اور صدقہ نفل پوشیدہ کرنا بہتر۔ اور اس کا مصرف صرف فقراء اس لئے یہاں فقراء کی قید لگا دی (روح المعانی) فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔ یہ ف بھی جزائیہ ہے اور ھُوَ کا مرجع تُخْفُوْا کا مصدر چونکہ علانیہ صدقہ اکثر دینے والے کے لئے مضر اور دوسرے کو فائدہ مند ہوتا ہے اور پوشیدہ خیرات اس کے برعکس۔ اس لئے یہاں لَكُمْ فرمایا گیا نہ کہ پہلی صورت میں یعنی صدقہ پوشیدہ کر کے دینا تمہارے واسطے بہتر ہے۔ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ۔ يُكَفِّرُ کفر سے بنا' بمعنی ڈھانپنا۔ اسی سے کفارہ ہے۔ اس کا فاعل یا تو اللہ ہے' یا صدقہ پوشیدہ یا صدقہ علانیہ یا ہر صدقہ۔ مِنْ تبعیضیہ ہے سَیِّاٰت جمع سیئۃ کی ہے' بمعنی ناگوار چیز' یہاں گناہ مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ مِنْ' بمعنی مِنْ اجل ہے۔ بعض کے نزدیک مِنْ زائدہ یعنی رب تعالیٰ یا وہ صدقہ تمہارے سامنے گناہوں کو یا بعض گناہوں کو ڈھانک دے گا یا مٹا دے گا۔ (کبیر) خیال رہے کہ

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ
مثال اس کی جو وہ کفار خرچ کرتے ہیں اس دنیاوی زندگی میں اس ہوا کی
کہاوت اس کی جو اس دنیا کی زندگی میں خرچ کرتے ہیں اس ہوا کی سی
رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ
طرح ہے جس میں ککر ہو لگ جائے ایسی قوم کے کھیت کو جنہوں نے کیا ظلم کیا اپنی جانوں پر
ہے جس میں پالا ہو وہ ایک ایسی قوم کی کھیتی پر پڑی جو اپنا ہی برا کرتے تھے
فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾
تو برباد کر گئی اسے اور ان پر نہیں ظلم کیا اللہ نے لیکن وہ ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں
تو اسے بالکل مار گئی اور اللہ نے ان پر ظلم نہ کیا ہاں وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے

تعلقات

اس آیت کا گذشتہ آیتوں سے کئی طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** گذشتہ آیت میں فرمایا گیا تھا کہ کفار کے مال و اولاد آخرۃ میں انہیں عذاب سے نہ بچائیں گے، اب اس غیبی خبر کو ایک عینی مثال سے سمجھایا جا رہا ہے جس سے عقل بھی اسے قبول کرے کہ واقعی یہ بیکاری برحق ہے، گویا پہلے غیبی خبر تھی اب اس کی عینی مشاہدہ والی شہادت، **دوسرا تعلق:** گذشتہ آیت میں ارشاد ہوا تھا، کہ کفار کے مال و اولاد دفع ضرر نہیں کر سکتے، اب ارشاد ہو رہا ہے کہ انہیں فائدہ بھی نہیں پہنچا سکتے، انسان مال و اولاد سے دو قسم کی امیدیں رکھتا ہے، مصیبت ٹالنا، فائدہ دینا، ایک امید کو گذشتہ آیت میں توڑا گیا، دوسری آس یہاں توڑی جا رہی ہے، **تیسرا تعلق:** گذشتہ آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ کفار کے مال و اولاد آخرت میں مفید نہیں، اب فرمایا جا رہا ہے کہ دنیا میں بھی انہیں اس سے فائدہ نہیں پہنچتا، انہیں یہ دونوں چیزیں وقت پر دھوکا دے جاتی ہیں، **چوتھا تعلق:** گذشتہ آیتوں میں کفار کے عام اخراجات کی بیکاری بیان ہوئی، اب ان کے صدقات و خیرات کی بیکاری کا تذکرہ ہے،

تفسیر

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ عربی میں عام تشبیہوں کو مثال یا مثل کہتے ہیں جیسے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (شوریٰ: ۱۱) مگر مثل میم وث کے زبر سے اس عام تشبیہ کو کہا جاتا ہے جو ضرب المثل بن جائے جسے عام موقعوں پر لوگ استعمال کرتے ہوں اور عموماً سمجھانے کے لئے بولی جاتی ہو، مَا يُنْفِقُوْنَ سے یا تو کفار کے وہ مال مراد ہیں جو وہ بدکاریوں میں خرچ کرتے تھے، جیسے جوئے بازی، شراب خوری وغیرہ، یا وہ مال جسے وہ دنیاوی مباح کاموں میں خرچ کرتے تھے، جیسے کھانا، پہننا وغیرہ، یا وہ مال مراد ہے جنہیں وہ اپنے خیال میں اچھی جگہ خرچ کرتے تھے، مگر وہ مقامات تھے برے جیسے بت پرستی اور اپنے پنڈتوں کی خدمات یا مال مراد ہے

ہیں جیسا کہ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ سے معلوم ہوا اغنیا کو نہ دیئے جائیں۔ **پانچواں فائدہ:** اس سے معلوم ہوا کہ کبھی ذکر بالجہر بھی افضل ہے کہ اس میں دوسروں کو ذکر کی ترغیب ہے۔ شیطان کو بھگانا ہے۔ اپنی نیند دفع کرنا ہے۔ جیسے صدقہ کا اظہار کبھی افضل ہے کہ وہ عبادت ہے اور اظہار عبادت بھی افضل۔ ایسے ہی ذکر اللہ عبادت ہے اس کا اظہار کبھی افضل ہے۔ **مسئلہ:** صدقات جاریہ کو اغنیاء بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ جیسے قبرستان اور مسجد کی زمین اور وقف کنوئیں کا پانی' مسافر خانے وغیرہ۔ **مسئلہ:** ظاہری مال یعنی جانور اور زمین کی پیداوار کی زکوٰۃ سلطانِ اسلام ہی کو دیئے جائیں۔ خود فقراء کو نہ دیئے جائیں (احکام القرآن) **مسئلہ:** جیسے صدقاتِ واجبہ اور بعض نفلی صدقے علانیہ دینا بہتر اور اکثر نفلی صدقے خفیہ دینا افضل ایسے ہی دیگر عبادات' نماز' حج وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے۔ نماز پنجگانہ' عید' جمعہ جماعت ہی سے پڑھے۔ اشراق' تحیۃ الوضو' نماز سفر' تحیۃ المسجد وغیرہ مسجد میں افضل' باقی نوافل گھر میں بہتر (احکام القرآن) **مسئلہ:** اعلان کے ساتھ حج کو جانا اسی لئے بہتر ہے کہ اس میں دوسروں کو حج کی رغبت ہوتی ہے۔ **چھٹا فائدہ:** خفیہ صدقہ اکثر علانیہ سے افضل ہے جیسا کہ خَيْرٌ لَّكُمْ سے معلوم ہوا۔ حدیث شریف میں ہے کہ سات شخص قیامت کے دن سایہ عرش پر ہوں گے۔ (۱) عادل سلطان۔ (۲) جوان صالح۔ (۳) اور وہ شخص جسے حسینہ عورت حرام کاری کے لئے بلائے اور وہ رب سے ڈر کر باز رہے۔ (۴) وہ شخص جس کا دل مسجد سے لگا رہتا ہو۔ (۵) جو محض اللہ کے لئے محبت یا عداوت رکھیں۔ (۶) وہ شخص جو اکیلے میں رب کو یاد کر کے روئے۔ (۷) وہ شخص جو صدقہ اس قدر چھپا کر دے کہ بائیں ہاتھ کو خبر بھی نہ ہو (مسلم بخاری) **ساتواں فائدہ:** صدقات سے گناہ معاف ہوتے ہیں جیسا کہ ویکفر سے معلوم ہوا۔ **آٹھواں فائدہ:** صدقہ سے گناہ ہی معاف ہوں گے نہ کہ شرعی پابندوں کے حقوق' جیسا کہ مِن تبعیضیہ سے معلوم ہوا۔ خیرات سے قضا نمازیں معاف نہ ہو جائیں گی۔ **مسئلہ:** کبھی صدقہ حقوق العباد اور حقوق شریعت سے بھی بری کر دیتا ہے۔ کمزور بڈھا روزہ کا فدیہ دے سکتا ہے۔ میت کے فوت شدہ روزے' نمازوں کا کفارہ مال دیا جا سکتا ہے۔ جب قرض خواہ کا پتہ نہ لگے۔ یا امین کے پاس امانت کا مال پڑا ہے اور مالک گم ہو گیا تو اگر اسکے ورثاء موجود ہیں تب تو انہیں دے دے' ورنہ بعد انتظار اسکے نام پر خیرات کر دے (کتب فقہ) یہ بھی مِنْ سَيِّاٰتِكُمْ سے معلوم ہوا۔ **نواں فائدہ:** کسی علانیہ عبادت کرنے والے کو ریا کار نہ کہنا چاہیے۔ دیکھو رب نے علانیہ صدقہ دینے کی تعریف فرمائی' بعض مصنفین نے اپنی کتب اپنے نام پر رکھی جیسے موطاء امام محمد۔ یا موطا امام ابوحنیفہ یا حاشیہ عبدالحکیم تاکہ لوگ ان کی زندگی میں ان کتب کے متعلق ان سے کچھ دریافت کرنے کی اور بعد وفات دعائے خیر سے یاد کریں۔ اور بعض مصنفین نے اپنا نام بھی ظاہر نہ کیا۔ جیسے صاحب مشکوٰۃ وغیرہم تاکہ ریا نہ پیدا ہو۔ ہر ایک کی نیت خیر ہے۔ اس سے وہ دیوبندی حضرات عبرت پکڑیں جو میلاد شریف' گیارھویں' عید معراج منانے والوں اور جلوس میلاد نکالنے والوں کو ریا کار وغیرہ کہتے ہیں تاحقیقی نے محض علانیہ خیرات کرنے والے صحابہ کو ریا کار کہا تو رب نے ان منافقوں پر غضب کا اظہار فرمایا کہ ارشاد کیا۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوْا مِنْهَا۔ (التوبہ: ۵۸)

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں علانیہ صدقے کے متعلق نِعِمَّا هِیَ آیا خفیہ کے بارے میں خَيْرٌ لَّكُمْ کیوں ارشاد ہوا اس

میں فرق کیا ہے؟ **جواب:** دوسرے کے مقابلہ میں بہتر کو خیر کہا جاتا ہے۔ اور مطلقاً بہتر کو نعم۔ مقصود یہ ہے کہ خفیہ خیرات علانیہ سے بہتر ہے۔ **دوسرا اعتراض:** خَیْرٌ کے ساتھ لَّکُمْ کیوں ارشاد ہوا اور نِعِمَّا کے بعد کیوں نہ ہوا۔ **جواب:** اس لئے کہ خفیہ خیرات کا فائدہ صرف خیرات دینے والے کو ہے اور علانیہ کا فائدہ اس کو بھی اور دوسرے مسلمانوں کو بھی۔ کہ اس کی پیروی سے وہ بھی خیرات کریں گے۔ گویا یہ لازم ہے اور وہ متعدی اس لئے یہاں تخصیص کلام ارشاد ہوا۔ **تیسرا اعتراض:** خفیہ صدقہ کے ساتھ یہ قید کیوں لگائی کہ فقراء کو دو اعلانیہ کے ساتھ یہ قید کیوں نہ لگی؟ **جواب:** اس لئے کہ علانیہ صدقہ امیر لینے کی ہمت ہی نہ کرے گا۔ کہ اس میں ذلت ہے نیز اگر لینا چاہیے گا تب بھی واقف کار لوگ کہہ دیں گے کہ تو مالدار ہو کر خیرات کیوں لیتا ہے مگر خفیہ صدقہ ہر ایک لینے کی ہمت کرسکتا ہے۔ اسلئے وہاں زیادہ احتیاط کرنی چاہیے۔ نیز خفیہ صدقہ کرنے والا فقیر کی زیادہ چھان بین نہیں کرسکتا' کہ تحقیقات میں اظہار کا اندیشہ ہے۔ اس لئے زیادہ احتیاط کا حکم دیا گیا۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ صدقات صرف فقراء لیں اور دوسری آیت میں اس کے مصرف آٹھ بیان کئے گئے۔ فقراء' مساکین' یتیم' مسافر' وغیرہ ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ یہاں تمام مصارف کا ذکر نہ ہوا بلکہ بعض کا۔ اور ایک کے ذکر سے دوسرے کی نفی نہیں ہوجاتی۔ دوسرا یہ کہ وہ آٹھوں قسمیں فقراء کی ہی اقسام ہیں۔ کہ جو یتیمی کی وجہ سے یا مسافر ہو کر فقیر ہو جائے۔ ورنہ غنی یتیم زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ عامل زکوٰۃ کو بھی زکوٰۃ میں سے تنخواہ اسی لئے دی جاتی ہے کہ وہ فقراء کا خدمت گار ہے۔ **پانچواں اعتراض:** فقراء کے جمع لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ کم از کم تین فقیروں کو دینا چاہیے (شافعی)؟ **جواب:** الفقراء میں الف لام جنسی ہے جس نے اس کی جمعیت باطل کردی۔ نیز صدقات بھی جمع ہیں اور واقعی جمیع فقراء کو دیئے جائیں گے۔ **چھٹا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ صدقہ و خیرات ہر قسم کے فقراء کو دیا جائے مگر احادیث وفقہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ سید کو اور اپنے اصول و فروع کو نہ دے خاوند و بیوی کو نہ دے۔ وہ احادیث وفقہی مسائل اسی آیت کے خلاف ہیں۔ لہٰذا انہیں رد کردینا چاہیے۔ **جواب:** وہ احادیث وفقہی عبارت اس آیت کی تفسیر و شرح ہیں جن سے معلوم ہوا کہ یہاں فقراء سے فلاں قسم کے فقراء مراد ہیں۔ جیسے اَقِیْمُو الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (بقرہ: ۸۳) قرآن کریم میں مجمل ہے جسے حدیث وفقہ نے واضح فرمایا کہ فلاں فلاں وقت فلاں فلاں نماز اتنی رکعات اور اس شرائط سے پڑھو۔ یہ آیات مطلق نہیں بلکہ مجمل ہیں۔ مجمل کی تفصیل حدیث سے بھی ہوسکتی ہے۔ فقہ سے بھی' منکرین حدیث اس آیت کی تفسیر نہیں کرسکتے۔

تفسیر صوفیانہ

شریعت میں صدقہ علانیہ وہ ہے جو لوگوں پر ظاہر ہو اور خفیہ وہ جو لوگوں سے پوشیدہ مگر طریقت میں صدقہ علانیہ وہ ہے جس میں شہوات نفسانیہ داخل ہوں۔ اور خفیہ وہ جو خالص رب کے لئے ہو۔ فرمایا جارہا ہے کہ اگر تم صدقات میں حور و قصور' جنت وغیرہ کی نیت کر کے اسے علانیہ بنادو تو بھی اچھا ہے لیکن اگر تمہارا صدقہ ان سب سے خالی ہو صرف رب کی رضا جوئی کے لئے ہو اور اس کا اجرا اپنے اعضاء ظاہری اور باطنی کو دو جو کہ حقیقی فقیر ہیں تو تمہارے واسطے بہتر ہے۔ وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (محمد: ۳۸) سخی قیامت کے دن اپنے صدقہ کے سایہ میں ہوگا صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر سخی کا صدقہ رب کے لیے ہے

فَفَسَقُوْا الخ (الاسراء:۱۶) لہٰذا سرداروں کو اپنی زندگی بہت احتیاط سے گذارنی چاہیے، علماء، صوفیاء، بادشاہ امراء سب اس آیت سے عبرت پکڑیں، **پانچواں فائدہ:** نیکیوں کی بالکل بربادی کفار کے لئے ہے مومن کتنا ہی گنہگار ہو انشاء اللہ اس کی اصل نیکی برباد نہ ہوگی، کمی ثواب اور چیز ہے، بالکل بربادی کچھ اور، کیونکہ قرآن کریم جو کفار کا عذاب بیان فرماتا ہے، مسلمان اس سے محفوظ ہوتے ہیں، **چھٹا فائدہ:** برباد کرنا، ہلاک کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے مگر رب تعالیٰ نے اسے پالے والی برفانی ہوا کی طرف نسبت کیا، معلوم ہوا کہ نسبت مجازی درست ہے یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں چیز ہلاک کرتی ہے، فلاں چیز برکت دیتی ہے، لہٰذا یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضور انور ﷺ عزت، ایمان دیتے ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ (بقرہ:۲۷۵) شیطان چھوکر دیوانہ کر دیتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ (آل عمران:۴۹) میں اللہ کے حکم سے کوڑھوں اور اندھوں کو شفا دیتا ہوں، یہ سب اسنادیں مجازی ہیں، ایسے ہی یہاں بھی ہے، **ساتواں فائدہ:** کبھی انسان کے کفر وفسق کے وجہ سے کھیتیاں برباد، رزق میں کمی، بلاؤں کا نزول ہوتا ہے جیسا کہ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں تشبیہ درست نہیں معلوم ہوتی، کیوں کہ یہاں کفار کے صدقات کو برفانی ہوا سے تشبیہ دی ہے، حالانکہ برفانی یا آتشی ہوا تباہ کن ہوتی ہے، اور یہ صدقات تباہ کن نہیں بلکہ تباہ شدہ ہیں، مثال ممثل لہٗ کے مطابق نہیں، **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گذر گیا کہ اگر تشبیہ مرکب ہے، پھر تو بالکل ظاہر ہے کہ پورے واقعہ کو پورے واقعہ سے تشبیہ دی گئی ہے، جیسے گرم سرد ہوا سے لہلہاتا کھیت آن کی آن میں فنا ہو جاتا ہے، ایسے ہی ان کے صدقات کفر وشرک کی وجہ سے آناً فاناً ختم ہو جاتے ہیں، اور اگر تشبیہ مفرد ہے تو مثل کے بعد کفر وغیرہ پوشیدہ ہے، یعنی کفار کے صدقات کے ساتھ کفر کرنے کی مثال اس ہوا کی سی ہے، لہٰذا آیت واضح ہے، **دوسرا اعتراض:** یہاں یہ تشبیہ واقع کے مطابق نہیں، کیونکہ کفار کا صدقہ اول ہی سے مردود ہے، درست ہی نہیں، پھر کفر سے برباد ہونے کے کیا معنی، برباد وہ ہو جو پہلے آباد بھی ہو، تو یہ صدقات اس برباد شدہ کھیت کے مشابہ کیونکر ہوئے کھیت تو پہلے موجود تھا، ہرا بھرا تھا، یہ صدقے پہلے ہی سے معدوم ہیں، **جواب:** یہاں بربادی کا ظہور مراد ہے یعنی دنیا میں کافر اپنے صدقات وخیرات کو ہری کھیتی کی طرح آباد سمجھتا ہے، مگر بعد موت اسے معلوم ہوگا کہ سب کچھ برباد ہو چکا ہے، اس کا موت پر مرنا گویا برفانی ہوا ہے، اور اگر کفار کے خرچ سے مراد خلاف اسلام مال صرف کرنا ہے تو تشبیہ ظاہر ہے کہ انہوں نے مال خرچ کر کے اسلام کے خلاف اسکیم تیار کی، یہ اسکیم ان کا ذہنی وخیالی باغ ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دے کر ان کی اسکیموں کو فنا کر دیا، یہ اس باغ کی بربادی ہے جیسا کہ غزوۂ خندق وغیرہ میں ہوا، لہٰذا آیت بالکل واضح ہے، **تیسرا اعتراض:** تم نے کہا کہ مسلمان کی نیکیاں برباد نہیں ہوتیں، یہ بربادی کفار پر عذاب ہے، مگر قرآن کریم فرماتا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (بقرہ:۲۶۴) اے مسلمانو اپنے صدقات احسان جتا کر، ایذاء پہنچا کر باطل نہ کرلو، اور فرماتا ہے كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ (بقرہ:۲۶۴) اس کی طرح

عبادت ہے اور صدقہ بذات خود تو معاملہ ہے مگر نیت خیر سے ہو تو اس کا ثواب عبادت کا سا ہے۔

شان نزول

اس کے شان نزول میں چند روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر کی والدہ نقیلہ اور ان کی دادی حضرت اسماء کے پاس کچھ حاجت لے کر آئیں۔ مگر یہ دونوں مشرکہ تھیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں حضور ﷺ کی بغیر اجازت تمہیں کچھ نہیں دے سکتی کیونکہ تم بے دین ہو۔ بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئیں تب یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی اور حضور ﷺ نے انہیں مشرکہ ماں و دادی پر صدقہ کرنے کا حکم دیا (کبیر) دوسرا یہ کہ بعض انصار کی یہود بنی نضیر و بنی قریظہ سے قرابت تھی۔ انصار انہیں اپنی خیرات نہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم جب تک مسلمان نہ ہو جاؤ۔ ہماری خیرات کے مستحق نہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (کبیر) تیسرا یہ کہ اسلام سے پہلے مسلمانوں کی یہود سے رشتہ داریاں تھیں۔ اس وجہ سے وہ ان کے ساتھ سلوک کیا کرتے تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد انہیں یہود کے ساتھ سلوک کرنا ناگوار ہونے لگا اور انہوں نے اس سے ہاتھ روکنا چاہا تا کہ یہود اسلام کی طرف مائل ہوں۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (خزائن العرفان و خازن) چوتھا یہ کہ مدینہ کے مسلمان پہلے عام فقرائے مدینہ پر صدقہ کرتے تھے۔ خواہ کافر ہوں یا مومن۔ جب مسلمانوں کی کثرت ہوگئی تو نبی ﷺ نے مشرکین کو خیرات دینے سے ممانعت کردی تا کہ وہ اسلام لانے پر مجبور ہو جائیں۔ تب یہ آیت کریمہ اُتری (خازن) غرضیکہ یہ آیت کفار اہل قرابت کے ساتھ سلوک کرنے کے لئے اُتری۔ اور ان روایات میں کوئی تعارض بھی نہیں۔ ممکن ہے کہ سارے واقعات پیش آئے ہوں۔ تب یہ آیت کریمہ اُتری ہو۔

تفسیر

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ۔ عَلٰی ضرر یا الزام کے لئے آتا ہے یہاں الزام کے لئے ہے۔ کاف سے خطاب یا نبی ﷺ کو ہے یا ہر قرآن پڑھنے والے کو۔ کیونکہ اس سے پہلے اور بعد مسلمانوں سے ہی خطاب ہو رہا ہے۔ ھُدٰی بمعنی ہدایت ہے۔ ھُمْ کا مرجع کفار ہیں جن کے متعلق سوالات ہوئے تھے ہدایت سے یا تو مطلوب تک پہنچانا مراد ہے یا توفیق خیر دینا' یا اسلام پر مجبور کرنا' نہ کہ راہ دکھانا کیونکہ نبی ﷺ نے سب کو راہ دکھائی' اور آپ اس لئے بھیجے گئے تھے۔ یعنی اے نبی ﷺ اے قرآن پڑھنے والے یا اے کفار کو خیرات دینے سے انکار کرنے والے تم پر انہیں ہدایت دے دینا واجب نہیں کیونکہ آپ صرف بشیر و نذیر ہیں اور آپ کے ذمہ صرف تبلیغ' اس دعوت پر آپ کا فرض ختم ہو جاتا ہے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔ لٰکِنَّ دفع وہم کے لئے آیا۔ یَھْدِیْ سے ہدایت خاصہ مراد ہے یعنی مقصود تک پہنچا دینا یا توفیق خیر دینا۔ یَشَآءَ کا مفعول (ہدایۃ) پوشیدہ ہے لیکن جسے رب ہدایت دینا چاہے' اسے ہدایت دے۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ مَا شرطیہ ہے اور انفاق سے خیرات مراد ہے۔ اور من تنکیریہ یا بیانیہ ہے۔ خیر سے زیادہ مال مقصود یعنی نفلی صدقات لِاَنْفُسِکُمْ سے پہلے ھو پوشیدہ ہے یعنی جو کچھ تم مال راہ الٰہی میں خرچ کرو گے۔ وہ درحقیقت تمہارے ہی لئے ہوگا۔ لہٰذا تم نہ تو ردی مال خیرات کرو نہ فقیر کو طعنے دو۔ نہ ریاکاری کو دخل دو۔ نہ فقیر کے کفر و ایمان کو دیکھو۔ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ۔ یہ مَا نافیہ ہے اور تُنْفِقُوْنَ سے صدقات مراد اِبْتِغَآءِ مفعول لہٗ وَجْہِ اللّٰہِ سے مراد رضائے الٰہی ہے یا تو یہ جملہ نفی ہی ہے یا بمعنی

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

خود رب تعالیٰ نے فرمادیا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ الخ (بقرہ: ۱۵۵) غرضکہ فَاَهْلَكَتْهُ نے بہت سے معمے حل کر دیئے ہیں،

تفسیر صوفیانہ

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ ہر انسان کسان ہے، اس کی زندگی کھیت یا باغ، اعمال اس کے پھل، موت کھیت کٹنے کا دن ہے، آخرت ان پھلوں کے استعمال کا زمانہ، جسے اللہ تعالیٰ ایمان پر موت نصیب کرے تو سمجھو کہ اس کی محنت ٹھکانے لگی، اور اس کا کھیت بخیریت کٹا، جیسے ایک شخص کے کھیت سے سینکڑوں فائدہ اٹھاتے ہیں، جانور، فقیر، بیوپاری اور عوام الناس، ایسے ہی مومن کے اعمال کی کھیتی سے انشاء اللہ بہت لوگ فائدہ اٹھائیں گے، جیسے معمولی کسان کی کھیتی ایک خاندان کو مفید، مگر مربعے والوں کی کھیتیاں ملک بھر کو فائدہ مند، ایسے ہی معمولی مسلمان کے اعمال کی کھیتی اور ہے، اولیاء، انبیاء خصوصاً حضور سید الانبیاء ﷺ کی کھیتیاں اور ہی کچھ ہیں، انشاء اللہ ہم جیسے سینکڑوں گنہگاران کے سوالی، بھکاری بن کر مزے اڑائیں گے، شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں، شعر

شنیدم کہ در روزِ امید و بیم بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

لیکن اگر خدا نہ کرے خاتمہ بگڑ گیا، تو اس کا سارا کھیت اجڑ گیا، کی ہوئی محنت برباد گئی، کہ اب بجز کفِ افسوس ملنے کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا، کیونکہ اب دوبارہ کھیت بونے کا وقت بھی نہ رہا، اس آیت کریمہ میں ان دوسرے بدنصیب کسانوں کا ہی ذکر ہے کہ انہوں نے اپنے پر ظلم کیا کہ کفر و شرک کرکے اپنے اعمال کی کھیتی برباد کر لی،

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ
اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے نہ بناؤ اندرونی مشیر اپنے غیر کو
اے ایمان والو غیروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ
دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ط وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ج قَدْ بَدَتِ
وہ کوتاہی نہیں کرتے تمہارے متعلق فساد میں پسند کرتے ہیں اسے جس سے تمہیں ایذاء ہو بیشک
وہ تمہاری برائی میں کمی نہیں کرتے ان کی آرزو ہے جتنی تمہیں ایذا پہنچے
الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ
ظاہر ہو چکا ہے بغض منہ سے ان کے اور جو دشمنی چھپاتے ہیں سینے ان کے وہ بہت
بیر ان کی باتوں سے جھلک اٹھا اور وہ جو سینہ میں چھپاتے ہیں بڑا ہے

أَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيٰتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿١١٨﴾

بڑی ہے بے شک بیان فرمادیں ہم نے تمہارے لئے نشانیاں اگر تم عقل رکھتے ہو

ہم نے نشانیاں تمہیں کھول کر سنادیں اگر تمہیں عقل ہو

تعلقات

اس آیت کا گزشتہ آیتوں سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** گزشتہ آیت میں کفار کا اپنی جانوں پر ظلم بیان ہوا، اب ان کا ظلم وستم مسلمانوں پر بیان ہورہا ہے، یعنی پہلے ان کی لازم بیماری کا ذکر تھا، اب متعدی بیماری کا تذکرہ ہے، یعنی وہ اپنے دشمن تو ہیں ہی، تمہارے بھی دشمن ہیں، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں مومن وکافر کا فرق بیان کیا گیا تھا کہ یہ دونوں جماعتیں بالکل غیر جنس ہیں، ایمان نور ہے، کفر اندھیری، ایمان دن ہے، کفر رات، اب مسلمانوں کو کفار کی دوستی ومخالطت سے منع فرمایا جارہا ہے کہ ناجنس کی صحبت اور غیر جنس سے الفت سخت نقصان دہ ہے، **تیسرا تعلق:** گزشتہ آیت میں ارشاد ہوا کہ کفار کا مال واولاد ان کے کفر کی وجہ سے ان کے لئے مفید نہ ہوئے، مضر ہوئے، اب فرمایا جارہا ہے کہ اے مسلمانو ان سے الفت ودوستی تمہارے لئے بھی مضر ہی ہوگی، مفید نہ ہوگی، جب انہوں نے اپنے کو برباد کرلیا تو تمہیں بھی برباد ہی کریں گے، ان کی متعدی بیماری سے پرہیز کرو،

شان نزول

۱۔ بعض انصار کی یہود مدینہ سے پہلے کی دوستی ورشتہ داریاں رضاعت، سسرالی رشتے وغیرہ تھے، جن کے باعث یہ حضرات مسلمان ہونے کے بعد بھی ان یہود سے میل جول رکھتے اور ان سے مشورے وغیرہ لیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس میل جول، صلاح مشورہ سے روکنے کے لئے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (ابن اسحاق عن ابن عباس، تفسیر کبیر، صاوی، روح المعانی، خازن، خزائن وغیرہ)۔ ۲۔ منافقین مسلمانوں سے ملے جلے رہتے تھے، حتی کہ انہی کے ساتھ نماز وغیرہ ادا کرتے تھے، جلیل القدر صحابہ تو ان سے متنفر بھی تھے، اور ان سے احتیاط بھی برتتے تھے، مگر بعض سیدھے اور سادے مسلمان انہیں مخلص مسلمان سمجھ کر ان سے خلط ملط بھی رکھتے تھے اور اپنے ومسلمانوں کے اسرار اور جنگی ارادوں وتیاریوں کا بھی ان سے تذکرہ کر دیتے تھے، یہ مردود فوراً یہود کو ان رازوں سے مطلع کر دیتے تھے، گویا یہ منافقین یہود کے جاسوس تھے، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، جس میں ان سادہ لوح حضرات کو اس سے روکا گیا اور منافقین کے دلی بغض وعناد سے انہیں آگاہ کیا گیا، جنگ میں رازداری ہی تو ایک چیز ہے، اگر راز فاش ہوگیا تو جنگ ناکام ہوکر رہ گئی،

تفسیر

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ اظہار کرم یا مضمون کی اہمیت بتانے کے لئے مسلمانوں کو پکار کر حکم سنایا جاتا ہے، چونکہ پرانے رشتہ داروں کو بالکل چھوڑ دینا اور ان سے قرابت داریاں ختم کر دینا اہم بھی تھا اور مشکل بھی، اس لئے رب

تعالیٰ نے پہلے مسلمانوں کو پکارا، پھر انہیں حکم سنایا کہ اس ندائے محبوب کی لذت سے مشکل کام آسان ہو جائے، یہ نداء اور اس کی لذت اس ٹیکہ کی طرح ہے جس سے آپریشن کی تکلیف محسوس نہیں ہوتی، لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً تتخذوا اِتِّخَاذٌ سے بنا جس کا مادہ اخذٌ ہے بمعنی بنانا، پکڑنا، لینا، اختیار کرنا، یہ دو مفعول چاہتا ہے جیسے جعل دوسرے معنی میں آ کر بِطَانَۃٌ بَطْنٌ سے بنا بمعنی پیٹ، اصطلاح میں چیز کے ظاہر کو ظِہارہ اور اندرون کو بطانۃ کہا جاتا ہے، چنانچہ لحاف کے استر کو بطانۃ کہتے ہیں اور ابرے کو ظہارہ، پھر بطور استعارہ دلی دوست کو جسے دل کی باتیں بتا دی جائیں، پیٹ کے خفیہ راز سنا دیئے جائیں بطانۃ کہنے لگے یعنی رازدار اور مشیر کار، یہاں یہ ہی معنی مراد ہیں (تفسیر کبیر، معانی وغیرہ) قبیلہ کے خاندان کو عربی میں بطن بھی اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بطن یعنی پیٹ کی طرح ہوتا ہے، جیسے جسم میں پیٹ ایسے ہی قبیلہ میں وہ خاندان مِّنْ دُوْنِكُمْ من یا تو زائدہ ہے یا صلہ کا، یا تبیین کا اور یا تو لَا تَتَّخِذُوْا کے متعلق ہے، یا کسی پوشیدہ چیز کے، اور بطانۃ کی صفت، یعنی ایسوں کو دلی راز نہ بتاؤ، جو تمہارے غیروں میں سے ہوں، دون کبھی غیر کے معنی میں آتا ہے کبھی سواء کے معنی میں، اور کبھی اَدْوَنَ یا دَنِی کے معنی میں، اسی لئے کلمہ طیبہ میں اِلَّا اللّٰہ کہا جاتا ہے دُوْنَ اللّٰہ نہیں کہا جاتا، اس کے لغوی معنی ہیں قصر و علیحدگی، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ (قصص: ۲۳) موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں سے علیحدہ اور دور دو لڑکیوں کو پایا، اور فرماتا ہے وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (بقرہ: ۲۳) قرآن کریم کے مقابلہ کے لئے اللہ کے غیر جو اللہ تعالیٰ سے الگ ہوں ان معبودوں یا علماء کو بلا لو، غرضکہ ہر ماسویٰ دون نہیں بلکہ وہ ماسویٰ دون ہے جو اجنبی یا مقابل یا دشمن ہو، یہ معنی خیال میں رکھے جائیں، آج اسی لفظ سے دھوکا دیا جاتا ہے، چنانچہ یہاں دُوْنِكُمْ سے مراد منافقین یہود یا دوسرے کفار ہیں نہ کہ مسلمان، حق یہ ہی ہے کہ اگرچہ اس آیت کا نزول یہود یا منافقین کے متعلق ہے، مگر مراد سارے ہی کفار ہیں، کیونکہ آیات میں عموم الفاظ کا لحاظ ہوتا ہے نہ کہ خصوصی نزول کا (کبیر) چنانچہ دُوْنِكُمْ میں خوارج کو داخل کیا گیا ہے (تفسیر روح المعانی) لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا یالون اَلْوٌ سے بنا بمعنی کوتاہی، باب نصر سے ہے اَلَا يَاْلُوْ، یہ خود در اصل لازم ہے، مگر کبھی حرف جر کے ذریعہ متعدی ہو جاتا ہے، کہا جاتا ہے لَمْ اٰلُ فِي الْجُهْدِ، اور اگر اس میں منع کے معنی کی تضمین ہو جائے تو متعدی بہ دو مفعول بن جاتا ہے جیسے لَا اٰلُوْكَ نُصْحًا یا لَا اٰلُوْكَ جُهْدًا، جب بمعنی ترک یا چھوڑنا ہو تو متعدی بہ یک مفعول (روح المعانی) یہاں منع کے معنی پر شامل ہے، متعدی بہ دو مفعول ہے، خَبَالٌ وہ فساد جو کسی جاندار میں اضطراب و بے چینی پیدا کر دے، جیسے جنون یا بے چین کر دینے والی بیماری کبھی بمعنی مطلق فساد بھی آتا ہے، خَبَالٌ یا تو لا یالون کا مفعول دوم ہے یا یہاں فی پوشیدہ ہے یا کم ضمیر سے حال ہے یا تمیز یعنی وہ تمہاری برائی و فساد میں کوئی کمی نہیں کرتے، وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ودوا وَدٌّ سے بنا بمعنی بہت محبت یا تمنا و آرزو، عنتم عنتٌ سے بنا بمعنی سخت مشقت اور بہت محنت و تکلیف، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ (بقرہ: ۲۲۰) ما مصدریہ ہے یا موصولہ یعنی انہیں تمہارا سخت مشقت و تکلیف میں پڑنا بہت پیارا ہے، یا انہیں اس کی آرزو ہے یا انہیں ہر وہ چیز پیاری ہے جو تمہیں مصیبت و مشقت میں ڈالے قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ بدت بدوٌ سے بنا بمعنی ظاہر ہونا، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ الخ (بقرہ: ۲۸۴) بغضآء بغضٌ دشمنی کے معنی میں ہے جیسے ضرٌّ سے ضراء سخت ہے،

ایسے ہی بغضٌ سے بغضا شدید تر، اَفْوَاہ فم کی جمع اس کی اصل فُوْہٌ ہے بمعنی دہان یا منہ، چہرہ کو وجہ کہتے ہیں لہٰذا فم اور وجہ میں فرق ہے، یعنی یہ یہود و منافقین اگرچہ دلی عداوت چھپانے کی کوشش تو بہت کرتے ہیں، مگر قدرتی طور پر کبھی ان کے منہ سے ایسی باتیں نکل ہی جاتی ہیں، جس سے ان کے دل کی آگ کا پتہ چل جاتا ہے، آگ کا پتہ دھوئیں سے ہی لگ جاتا ہے، تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ تُخْفِیْ اخفاءٌ سے بنا بمعنی چھپانا، صدور صدر کی جمع ہے بمعنی سینہ اگرچہ محبت و عداوت، نفرت و رغبت دل میں رہتے ہیں مگر چونکہ دل سینہ میں ہے اس لئے سینہ کو ان کی جگہ قرار دیا گیا، کہا جاتا ہے کہ سینہ کینے سے صاف کرو تاکہ اس میں انوارِ مدینہ دیکھو، یعنی ان بدنصیبوں کے سینوں میں جو تمہاری عداوت کی آگ جل رہی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو ان کے منہ سے ظاہر ہوتی ہے قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ بینا تبیین سے بنا بمعنی خوب ظاہر اور واضح کر دینا، بین کے معنی علیحدگی و جدائی، ظاہر ہو کر بھی ہر چیز الگ الگ اور ممتاز ہو جاتی ہے، لَكُمْ میں لام نفع کا ہے یا صلہ کا، کم میں خطاب صحابہ کرام سے ہے یا سارے مسلمانوں سے، ایٰت سے مراد قرآن حکیم کی آئتیں ہیں یا کفار کی عداوت و دشمنی کی علامتیں، یعنی اے مسلمانو ہم نے تم سے یا تمہارے نفع کے لئے یہ آیتیں، یا تمہارے دشمنوں کی دشمنی کی علامتیں واضح طور پر صاف صاف بیان فرمادی ہیں اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ یہاں عقل بمعنی جاننا ہے یا سمجھنا، اس کا مفعول بہ پوشیدہ ہے، اور ان کی جزاء بھی مقدر ہے یعنی اگر تم اللہ کے مواعظ یا قرآنی منافع یا دوست دشمن میں فرق کو جانتے، سمجھتے ہو تو ان کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آؤ، اور ان سے دھوکا نہ کھاؤ،

خلاصہ تفسیر

مدینہ منورہ میں مسلمان دو دشمنوں میں پھنسے تھے، یہودی اور مارِ آستین منافقین، یہود نے ادھر تو نبی کریم ﷺ سے معاہدے کر رکھے تھے اور ادھر مسلمانوں کے دشمنوں سے ملے ہوئے تھے، کہ انہیں مسلمانوں پر چڑھائی کرنے کے لئے اکساتے رہتے تھے، منافقین کی زبانیں بظاہر مسلمانوں کے ساتھ تھیں مگر ان کے دل یہود کے ساتھ مسلمانوں میں رہتے تھے اور ان کے راز یہود تک پہنچاتے تھے، ادھر بعض سادہ لوح مسلمان منافقین کے ظاہری اسلام پر اعتبار کر کے اور یہود مدینہ سے پرانی رشتہ داریوں کا لحاظ کر کے ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی رکھتے تھے اور ان سے صلاح مشورہ بھی کرتے تھے جس سے کبھی ان کے منہ سے مسلمانوں کے اسرار بھی ظاہر ہو جاتے تھے، رب تعالیٰ نے اس آیت میں ان لوگوں کو ہدایت فرمائی، کہ فرمایا اے مخلص مومنو! اپنے دشمنوں یعنی یہودیوں کو اور اپنے غیروں یعنی منافقین کو نہ اپنا مشیر کار بناؤ، نہ راز دار، کیونکہ یہ تمہارے دوست نہیں بلکہ کھلے و چھپے دشمن ہیں، یہ موقع پا کر تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچانے میں کوتاہی نہ کریں گے، تمہاری ترقی انہیں کھٹکتی ہے، اور تمہاری تکلیف و مصیبت انہیں پیاری ہے، تم ان کی باتیں غور سے سنا کرو، کبھی کبھی ان کے منہ سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جن سے ان کی چھپی عداوت جھلک جاتی ہے، یہ الفاظ تو ان کی خفیہ دشمنی کی ہلکی سی غمازی کرتے ہیں، ورنہ ان کے دلوں میں تمہاری طرف سے بڑی بھاری عداوت ہے، ایسوں کو اپنے رازوں سے مطلع کرنا درحقیقت اپنی موت کو دعوت دینا ہے، ہم نے تو ان کی دشمنی کی علامتیں اور ان کے قلبوں کے حالات واضح طور پر تمہیں بتا دیئے، اگر تم میں عقل ہے تو سمجھ جاؤ، اور اپنے دوست

شان نزول

مسجد نبوی کے پاس ایک صفہ (چبوترہ) تھا۔ جہاں چار پانچ سو فقراء مہاجرین رہتے تھے۔ جن کے پاس نہ گھر تھا' نہ دنیوی سامان' نہ کوئی کاروبار ہمیشہ مسجد میں حاضر رہنا' دن میں روزہ و تلاوت قرآن اور رات میں شب بیداری ہر جہاد میں لشکر اسلام کے ساتھ جانا' ان کا کام تھا۔ انہیں اصحاب صفہ کہتے ہیں یعنی چبوترہ پر رہنے والے۔ نہ ان حضرات کی شادی ہوئی تھی نہ ان کا یہاں کنبہ و قبیلہ تھا۔ ان کی غریبی کا یہ حال تھا کہ ان میں سے ستر (۷۰) کے پاس ستر پوشی کے لئے پورا کپڑا بھی نہ تھا۔ ان کے متعلق یہ آیت کریمہ اُتری جس میں مسلمانوں کو انہیں صدقہ و خیرات دینے کی رغبت دی گئی۔ (کبیر و خزائن العرفان) ایک بار حضور ﷺ ان کے پاس تشریف فرما ہوئے۔ ان کی سخت فقیری اور بھوک کی شدت ملاحظہ فرما کر ارشاد فرمایا کہ اے صفہ والو میری امت میں سے جو تمہاری طرح صابر شاکر اور پرہیزگار ہوگا۔ وہ قیامت میں میرا رفیق ہوگا۔ پھر فرمایا کہ اے لوگو! ایک وقت وہ آنے والا ہے جب تمہارے سامنے دسترخوان پر غذاؤں کے پیالوں کے پیالے رکھے جائیں گے۔ انہوں نے عرض کیا یا حبیب اللہ اس دن ہم بڑے ہی خیر میں ہوں گے۔ فرمایا بلکہ خیر میں آج ہی ہو۔

تفسیر

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ۔ یہ لام جارہ ہے اور فُقَرَآء فقیر کی جمع' لفظ فقیر کی تحقیق پچھلی آیت میں ہو چکی۔ جار مجرور فعل پوشیدہ اِجْعَلُوْا صَدَقَاتِکُمْ کے متعلق ہے۔ اگر صدقات سے فرضی زکوٰۃ مراد ہے تو اِجْعَلُوْا امر وجوب کے لئے ہے اور اگر صدقہ نفلی مراد ہو تو استحباب کے لئے کیونکہ صدقہ فرض کسی کافر کو دینا جائز نہیں' ہوسکتا ہے کہ یہ عبارت صَدَقَاتِکُمْ مبتدا محذوف کی خبر ہو۔ یعنی اپنے صدقے ان فقراء کے لئے مقرر کردو یا تمہارے صدقے ان فقراء کے لئے ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ یہ جار مجرور وَمَا تُنْفِقُوْنَ کے متعلق ہے۔ اور وَلَا اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ جملہ معترضہ یعنی جو کچھ تم ایسے فقراء پر خرچ کرو گے تو تمہیں پورا اجر ملے گا۔ (روح المعانی) فقراء فرما کر یہ بتایا گیا کہ اگر یہ لوگ بفضلہ تعالیٰ غنی ہوں تو انہیں زکوٰۃ صدقات سے بچنا چاہیے۔ فی سبیل اللہ دینی خدمات کرنی چاہئیں۔ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ اُحْصِرُوْا۔ احصار سے بنا جس کا مادہ حصر ہے بمعنی رک جانا' اصطلاح میں بیماری' یا حاجت یا خوف کی وجہ سے مقصود سے رک جانے کو احصار کہا جاتا ہے۔ جو حاجی ادائے حج سے مرض یا خوف کی وجہ سے رک جائے' وہ محصر کہلاتا ہے۔ اُحْصِرُ کا نائب فاعل فقراء ہیں۔ روکنے والا کون۔ اس میں چند احتمال ہیں۔ سبیل اللہ سے ہر نیک کام مراد ہے۔ جہاد ہو یا طلب علم یا دیگر عبادات یعنی وہ فقراء جو جہاد یا طلب علم یا ضروری عبادات کی وجہ سے دنیوی کاروبار سے روک دیئے گئے۔ اس میں طلباء کی طرح فقیر' علماء' قاضی' مصنف وغیرہ تمام ہی داخل ہیں کہ یہ لوگ دینی خدمات کرتے ہیں اگر دنیا کی طلب میں مشغول ہو جائیں تو دین برباد ہو جائے گا۔ روک دیئے گئے کا مطلب یہ ہے کہ یا تو انہیں طلب علم سے روک دیا گیا۔ یا رب تعالیٰ نے روک دیا۔ یا حضور ﷺ کے حکم نے روک دیا کیونکہ فرض کفایہ شروع کر دینے سے فرض عین ہو جاتا ہے جیسے نماز جنازہ کہ فرض کفایہ ہے۔ مگر جو شروع کر دے اس پر فرض عین ہے۔ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ۔ یہ احصروا کا بیان ہے۔ ضرب سے چلنا پھرنا اور دنیوی کاروبار کے لئے نقل و حرکت مراد ہے۔ یعنی یہ حضرات طلب علم اور تیاری جہاد میں اس قدر مشغول ہیں کہ زمین میں چل پھر کر کمائی نہیں کر سکتے۔ یعنی کمائی

انہوں نے مسلمانوں کو دبایا تو مگر مٹایا نہیں، لیکن اب دس بارہ سال سے وہاں ہندوؤں کی بادشاہت ہے، اس دوران میں انہوں نے مسلمانوں کو مٹا کر رکھ دیا کہ وہاں اکثر صوبے مسلمانوں سے خالی ہوگئے، **آٹھواں فائدہ:** ہر ماسوی کو دون نہیں کہتے، بلکہ اجنبی، غیر اور دشمن و مقابل کو دون کہا جاتا ہے دیکھو یہاں مِنْ دُوْنِكُمْ کفار و منافقین کے لئے فرمایا گیا نہ کہ مومنین کے لئے، لہٰذا جہاں کہیں قرآن کریم نے فرمایا وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (بقرہ:۱۰۷) وہاں دون کے معنی مقابل ہی ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ خدا کا مقابل ہو کر نہ تمہارا کوئی دوست ہے نہ مددگار جو اس کے مقابل تمہیں عذاب سے بچالے، غَيْرَ، اِلَّا، سِوا، دُوْنَ خَاشَا، ان سب کے معنی سوئی ہی ہیں، مگر ان کے استعمال کے مواقع الگ الگ ہیں، چنانچہ اِلَّا ہر ماسوی کو کہتے ہیں، اپنا ہو یا غیر ہو دشمن ہو یا دوست، مگر دون اس ماسوی کو کہا جائے گا جو دشمن یا غیر یا بے تعلق ہو، اسی لئے کلمہ طیبہ میں الا اللہ ہے دون اللہ نہیں اس کی تحقیق ہماری کتاب ''علم القرآن'' میں دیکھو، دون کا مادہ اشتقاق اور اس کے لغوی معنی ابھی تفسیر میں عرض کئے جاچکے،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کافر کو دوست و مشیر نہ بنایا جائے، تو آج زندگی کیسے گذاریں، پاکستان بلکہ تمام جہان کی اسلامی سلطنتیں عیسائیوں کی امداد پر قائم ہیں فی زمانہ اس آیت پر عمل ناممکن ہے (نئی روشنی) **جواب:** تعاون اور رازداری میں بڑا فرق ہے، یہاں رازدار بنانے سے روکا گیا ہے، تعاون، تعلقات، لین دین جسے عربی میں برٌ وقسط کہتے ہیں کفار سے جائز تھا اور جائز ہے، خود حضور انور ﷺ نے یہود مدینہ سے تجارتی لین دین کئے اور کفار سلاطین کے ہدیے قبول فرمائے اور انہیں ہدیے دیئے ہیں، اور ان کی مہمانیاں کی ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ الخ (الممتحنہ:۸) ہجرت میں حضور انور ﷺ نے ایک کافر کی راہبری قبول فرمائی ہے (از شامی) انشاء اللہ اس کی پوری تحقیق سورۂ نور کی تفسیر میں کی جائے گی، **دوسرا اعتراض:** جب کفار خصوصاً یہود کو مشیر اور دوست بنانا منع ہے تو ان کی عورتوں سے نکاح کیوں جائز ہوا؟ بیوی لامحالہ مشیر و رازدار ہوتی ہے، **جواب:** ان سے نکاح اس لئے جائز کیا گیا کہ وہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے اسلام سے کچھ قریب ہیں، اور عورت مرد کے ماتحت ہوتی ہے، امید ہے کہ کتابیہ عورت مسلمان کی صحبت سے ہدایت پاجائے، کتابیہ عورت کو گھر بار کے کاروبار کا مشیر بناؤ نہ کہ ملکی اور قومی سیاسیات کا، یاد رکھو کہ اگر کتابیہ سے نکاح میں مسلمان کے بہک جانے کا خطرہ ہو تو ہرگز ان سے نکاح نہ کیا جائے، **تیسرا اعتراض:** اس آیت میں رب تعالیٰ نے کفار کی دو دشمنیاں بیان فرمائیں، برائی میں کمی نہ کرنا اور مسلمانوں کی ایذاء کی تمنا کرنا، ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ بظاہر دونوں ایک ہی معلوم ہوتی ہیں، **جواب:** پہلی عداوت میں تو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش مراد ہے اور دوسری عداوت میں کوشش میں ناکام ہو کر مسلمانوں کی تکلیف کی تمنا کرنا مراد ہے، لہٰذا ان دونوں میں بڑا فرق ہے، **چوتھا اعتراض:** اگر دون مقابل و دشمن کو کہتے ہیں، تو رب تعالیٰ نے عیسیٰ و عزیر علیہما السلام کو دُوْنَ اللّٰهِ کیوں فرمایا؟ کہ ارشاد ہوا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْۤ اَوْلِيَآءَ (کہف:۱۰۲) اور فرمایا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (نمل:

خلاصہ تفسیر

صدقہ اصل حق ان فقیروں کا ہے جو راہ الٰہی میں مقید ہو گئے ہوں اور دین کی خدمت میں ایسے مشغول ہوں کہ اس کی وجہ سے طلب معاش کے لئے زمین میں نقل وحرکت کی عادۃً طاقت نہ رکھتے ہوں۔ ان کے طلب معاش میں مشغول ہونے سے دینی کام بند ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی سوال سے بالکل دور ہوں۔ جس سے ناواقف آدمی انہیں مالدار سمجھتا ہے۔ لیکن تم ان کی طرز پریشان ہیئت اور قدرتی علامات سے پہچان سکتے ہو کہ یہ فقیر ہیں۔ ان کے چہروں پر فاقہ کے آثار آواز کی کمزوری رفتار میں ضعف ان کے فقر وفاقہ کا پتہ دیتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ سخت شدت میں بھی لوگوں سے کچھ نہیں مانگتے تا کہ انہیں گڑگڑانا پڑے اور تم ان لوگوں کی خدمت میں جو کچھ تھوڑا بہت مال خرچ کرو گے۔ حق تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے۔ تمہیں بقدر اخلاص ثواب دے گا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** زندگی ہر شخص کی گزرتی ہی ہے مگر بہترین زندگی وہ ہے جو رب کے لئے وقف ہو جائے کہ وہ شخص جو کام کرے نفس کے لئے نہیں' بلکہ اللہ کے لئے کرے۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے صدقات کا حکم خصوصی دیا جو اپنی زندگی اللہ کے لئے وقف کر چکے جنہیں اُحْصِرُوْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فرمایا گیا۔ دیکھو اگر زمین اللہ کے لئے وقف مسجد بن جائے تو اس کی عظمت بڑھ جاتی ہے۔ اصحاب کہف کے کتے نے اپنی زندگی اللہ کے پیاروں کی خدمت کے لئے وقف کی تو اسے حیات جاودانی ملی۔ تو زمین اور ناپاک کتا اس وقف زندگی کی وجہ سے شان والے ہو گئے تو اگر انسان اپنی زندگی وقف کرے تو انشاء اللہ فرشتوں سے افضل ہو جائے۔ دیکھو حضرات صدیق و فاروق کی شان۔ **دوسرا فائدہ:** خاص ضرورت کے وقت گنہگار بلکہ کفار کے ساتھ بھی احسان کرنا بہتر ہے مگر فی نفسہ متقی پرہیز گار کی خدمت کرنا بہت ثواب کہ عمدہ زمین کا تخم زیادہ پھل دیتا ہے۔ **تیسرا فائدہ:** بمقابلہ عام فقراء کے غریب علماء دینی طلباء' مدرسین کو خیرات دینا افضل ہے۔ جنہوں نے اپنے کو دینی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ اگر ان کی خدمت نہ کی گئی اور یہ طلب معاش کے لئے مجبور ہو گئے تو دین کا سخت نقصان ہو گا۔ یہ سب لوگ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ میں داخل ہیں ایک شخص بیک وقت دو کام نہیں کر سکتا۔ **چوتھا فائدہ:** بمقابلہ پیشہ ور بھکاریوں کے چھپے فقیروں کو صدقہ دینا زیادہ اچھا ہے۔ جیسا کہ تَعَفُّف سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** مخلوق سے اپنی تنگ دستی اور فقر وفاقہ چھپانا بہت اچھا عمل ہے۔ دیکھو رب نے اصحاب صفہ کے لئے اسی عمل کی تعریف فرمائی۔ **چھٹا فائدہ:** قیمتی لباس والے فقیر کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ دیکھو رب نے ان کو زکوٰۃ دینے کا حکم دیا جو بظاہر غنی معلوم ہوتے ہیں۔ (احکام القرآن) **ساتواں فائدہ:** تندرست فقیر کو بھی زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ دیکھو رب نے ان مہاجرین کو زکوٰۃ دینے کا حکم دیا جو تندرست مجاہد تھے۔ اپاہج یا نابینا نہ تھے۔ **آٹھواں فائدہ:** جس پر فقیر کی علامت دیکھے اسے زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ جیسا کہ سِیْمَاھُمْ' سے معلوم ہوا۔ **نواں فائدہ:** علامات پر احکام شرعی جاری ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا میت کی زنار چوٹی وغیرہ اس کے کفر کی علامت ہے۔ اسے غسل وکفن نہ دیا جائے اور نہ اسلامی قبرستان میں دفن کیا جائے اور ختنہ علامت ایمان کی ہے۔ اگر کوئی علامت بھی نہ ہو تو مسلمان کے محلے

یا اسلامی ممالک میں ہونا' علامت ایمان اور دار الکفر میں ہونا علامت کفر ہے۔ یہ ہی حکم پڑے ہوئے بچہ کا ہے۔ دیکھو رب نے ظاہر علامت کو دلیل فقر قرار دے کر انہیں زکوٰۃ دینے کا حکم دیا۔ شیر خوار بچہ نے عزیز مصر سے کہا تھا۔ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَ هُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (یوسف: ۲۷) یوسف علیہ السلام کی چاک دامنی ان کی پاکدامنی کی دلیل ہوئی۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔ (الفتح: ۲۹) سجدہ کا داغ قلبی ایمان کی نشانی (احکام القرآن) **دسواں فائدہ:** سوال میں اصرار و ضد کرنا منع ہے جیسا کہ الحافا سے معلوم ہوا۔ **گیارھواں فائدہ:** استعمالی کپڑے اور گھر کا ضروری سامان زکوٰۃ لینے سے محروم نہیں کر دیتا۔ خواہ کتنا ہی قیمتی ہو (احکام القرآن) **مسئلہ:** فقر کے تین درجے ہیں۔ (۱) قدر نصاب سے کم مال کا مالک ہونا۔ اس درجہ میں زکوٰۃ لینا جائز' مگر سوال حرام۔ (۲) چند فاقے یا مقروض ہونا' اس صورت میں سوال بھی جائز ہے۔ (۳) بھوک سے قریب المرگ ہو جانا اور کوئی حلال غذا میسر نہ ہونا' اس صورت میں مردار کھانا بھی جائز' حدیث شریف میں ہے کہ تین شخصوں کے سوا کسی کو سوال جائز نہیں۔ مقروض جب ادائے قرض کی کوئی صورت نہ دیکھے' ہلاکت مال اور فاقہ (مسلم) دوسری روایت میں ہے کہ جو کوئی اپنے پر سوال کا دروازہ کھولے گا۔ رب اس پر فقر کا دروازہ کھول دے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ جو بلا ضرورت لوگوں سے سوال کرے گا۔ روز قیامت اس کے چہرے پر کھرونچے وغیرہ ذلت کے آثار ہوں گے۔ (ابو داؤد) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو مسلمان بھیک نہ مانگنے کا عہد کرلے میں اس کے لئے جنت کا ضامن ہوں (مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ) فرماتے ہیں نبی ﷺ جو کوئی مال بڑھانے کے لئے بھیک مانگے' وہ آگ کے انگارے جمع کرتا ہے۔ (ابن ماجہ) بعض صحابہ کرام کا طریقہ یہ تھا کہ اگر گھوڑے سے کوڑا گر جاتا تو بھی کسی سے نہ مانگتے' بلکہ خود اُتر کر لیتے۔ **مسئلہ:** ذلت کا سوال منع ہے۔ عام معمولی استعمالی چیزوں کا سوال جائز' جیسے ضرورتاً آگ پانی یا سوئی دھاگہ' یا تھوڑے نمک کا سوال۔ کیونکہ یہ چیزیں سید المحبوبین ﷺ نے بھی طلب فرمائی ہیں۔ **مسئلہ:** دوسرے کے لئے سوال جائز ہے۔ حضور ﷺ نے اغنیاء صحابہ سے فقراء کے لئے مال طلب فرمایا ہے۔ **مسئلہ:** مسجد میں اپنے لئے سوال سخت منع' ہاں دیگر فقراء یا دینی ضرورت کے لئے چندہ کرنا جائز ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: مقید کی نفی قید کی نفی ہے۔ لہٰذا اس آیت کے یہ معنی ہونے چاہئیں کہ وہ فقراء لوگوں سے مانگتے تو ہیں گڑگڑاتے نہیں۔ **جواب:** یہ قاعدہ کلیہ نہیں۔ اکثر تو یہ ہے مگر قید اتفاقی اور قرائن کی موجودگی اس سے خارج ہے یہاں تعفف سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ بالکل سوال نہیں کرتے رب فرماتا ہے۔ لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (آل عمران: ۱۳۰) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دگنا' تگنا سود نہ کھاؤ' سوایا' ڈیوڑھا کھالو بلکہ بالکل نہ کھاؤ۔ رب فرماتا ہے۔ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا (النور: ۳۳) اگر تمہاری لونڈیاں زنا سے بچنا چاہیں تو انہیں اس پر مجبور نہ کرو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر وہ چاہیں تو زنا کرلیں بلکہ ہرگز نہ کرنے دو۔ نیز ہم نے تفسیر میں عرض کر دیا کہ اِلْحَافًا کا ظرف بھی ہوسکتا ہے اور منفی کا مفعول لہٗ بھی یعنی وہ سخت مصیبت میں بھی سوال نہیں کرتے' اگر حال بھی ہو تو بھی قرینہ کی وجہ سے مقید ہی کی نفی ہوگی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ الحافا سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ ایسی چیزوں کا سوال کسی سے نہیں کرتے۔ جس کا مانگنا ذلت و

تفسیر

هَاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ ھا حرف تنبیہ ہے جو غافل کو بیدار کرنے یا سوئے کو جگانے کے وقت استعمال ہوتا ہے، چونکہ بعض مسلمان کفار و منافقین کی چالوں سے غافل و بے خبر تھے اس لئے ھا فرمایا گیا، اَنْتُمْ سے ان ہی سیدھے سادے صحابہ کرام کو خطاب ہے جو ان کی چالوں سے بے خبر تھے نہ کہ تمام صحابہ سے، اور اب تا قیامت تک کے سیدھے سادے اور کفار کی چالوں میں آ جانے والے مسلمانوں سے خطاب ہے، اَنْتُمْ مبتداء ہے اور اُولَآءِ اسم موصولہ تُحِبُّوْنَهُمْ صلہ، موصول صلہ سے مل کر انتم کی خبر ہے یعنی اے سیدھے مسلمانو! تم تو وہ غرٌ کریم ہو جو ان کفار سے محبت کرتے ہو، اس محبت سے مراد نہ تو ان کے کفر سے محبت ہے کہ یہ خود کفر ہے، اور نہ قومِ کفار سے محبت نہ ان کی طرف میلان جو حرام ہے، کہ صحابہ کرام ان دونوں جرموں سے محفوظ تھے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (ھود: ۱۱۳) بلکہ ان دونوں ناجائز محبتوں کے سواء کوئی اور محبت مراد ہے جس کا ذکر ابھی آ رہا ہے، وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ سارے کفار و منافقین کا یہ ہی حال ہے خواہ مشرکین ہوں یا یہود و عیسائی وغیرہ، ایسے کفار کے جاسوس مسلم نما کافروں و منافقوں کا بھی یہ ہی وطیرہ ہے، اس جملہ کے چند معنی ہیں، ۱۔ تم ان سب کے مسلمان ہو جانے کی رغبت رکھتے ہو، یہ ان سے اصل محبت و خیر خواہی ہے مگر وہ تمہارا کافر ہو جانا چاہتے ہیں، یہ ان کی دشمنی ہے، ۲۔ تم ان کی رشتہ داریوں و قرابت کی وجہ سے دنیاوی محبت طبعی رکھتے ہو، مگر انہیں تم سے اس بنا پر مطلقاً محبت نہیں، وہ تمہیں دشمن سمجھتے ہیں، ۳۔ تم ان کے اظہار ایمان کے سبب محبت کرتے ہو، انہیں مسلمان سمجھتے ہو، مگر وہ اپنے اندرونی کفر اور چھپے ہوئے نفاق کے سبب تم سے کوئی محبت نہیں رکھتے، ۴۔ تم انہیں آفات و مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتے، کیونکہ یہودِ مدینہ سے تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے، تم اپنے عہد کے پابند ہو مگر وہ تمہیں آفات میں ڈالنا چاہتے ہیں کہ اس عہد و پیمان و معاہدہ کے باوجود تمہارے کھلے دشمنوں سے وہ ساز باز رکھتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے عہد و پیمان تو کیا اپنی قسموں کے بھی پابند نہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ (توبہ: ۱۲) ان کی قسموں کا بھی اعتبار نہیں، ۵۔ تم اپنی سادگی کی وجہ سے ان پر اپنے بعض اندرونی راز ظاہر کر دیتے ہو، مگر وہ عیار و چالاک لوگ تمہیں اپنے راز پر کبھی مطلع نہیں کرتے، غرضکہ تمہاری محبتیں تمہاری سادگی کی بنا پر ہیں تم ہوشیار رہو، وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ یہ مسلمانوں کا دوسرا حال ہے، اور اس کے مقابل کفار و منافقین کا دوسرا فریب و مکر، کِتٰبْ یا تو اسم جنس ہے یا اسم مصدر، اور اس سے مراد تمام آسمانی کتب ہیں یا قرآن شریف مراد ہے، یعنی تم تو تمام کتب آسمانی پر ایمان رکھتے ہو، توریت ہو یا انجیل، مگر ان کا یہ حال ہے کہ وہ نہ تو تمہارے قرآن شریف پر ایمان رکھتے ہیں نہ توریت و انجیل پر اگر وہ توریت و انجیل پر ایمان رکھتے ہوتے تو مسلمان ہو جاتے کہ ان کتب نے نبی آخر الزمان پر ایمان لانے کا حکم دیا تھا، یا تو تم سارے قرآن شریف پر ایمان رکھتے ہو جس میں ذمی کفار کے حقوق کی ادائیگی معاہدین سے اچھے سلوک، عہد و پیمان کی پابندی کی تاکید ہے، وہ قرآن شریف کا ایک حکم بھی نہیں مانتے، انہیں کیا معلوم کہ عہد و پیمان کیا چیز ہے، اسلامیت تو کیا انسانیت سے بھی بے خبر ہیں، وہ باطل پر ایسے مضبوط ہیں، تم حق پر مضبوط کیوں نہیں رہتے، (کبیر) وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا یہ منافقین کا دوسرا حال ہے بلکہ یہود کی بھی دوسری چال، یعنی جب منافقین تم سے مسجدوں یا کسی اور جگہ میں

اعظم اس مدرسہ کا نام مدرسہ نظامیہ اور اس کے مقرر کردہ درس کا نام درس نظامی ہے جو آج تک پڑھایا جاتا ہے۔ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے جن علماء سے فتاویٰ عالمگیری لکھوایا انہیں دولاکھ روپے اور دو سو قرش سونا نذرانہ میں دیا۔ رب تعالیٰ تو فرماتا ہے ایسے لوگوں کو دو۔ اور مسلمان کہتے ہیں کہ مت دو۔ کس کی مانیں' رب کی یا ان کی۔ **چھٹا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ لوگوں سے کچھ نہ مانگنا چاہیے۔ اللہ اور صرف اللہ سے مانگے تو چاہیے کہ نبیوں ولیوں سے کچھ نہ مانگے۔ تم لوگ بزرگوں کی قبروں تک سے مانگتے ہو اس آیت کی مخالفت کرتے ہو؟ **جواب:** النَّاسُ سے دنیا دار مراد ہوئے ہیں۔ حضرات محبوبین بارگاہ الٰہی عموم اس سے مستثنٰی ہوتے ہیں لوگوں سے بھیک مانگنا ذلت وخواری ہے۔ حضور انور ﷺ سے رب کی تمام نعمتیں مانگنا ہر مومن سلاطین کے لئے فخر ہے۔ دیکھو لوگوں کو راضی کرنے کے لئے انہیں دکھلاوے کے لئے اعمال کرتا رہا ہے۔ مگر حضور انور اور رب تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے نیکیاں کرنا بہت ہی محبوب' رب فرماتا ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْہُ۔ (التوبہ: ۶۲) غرضکہ لوگوں سے بھیک مانگنا اور ہے اور اللہ کے پیاروں سے شفاعت وغیرہ مانگنا کچھ اور۔

تفسیر صوفیانہ

مشائخ کی خانقاہیں اور ان کی مساجد و عبادت گاہیں ومصلّٰی سب سبیل اللہ ہیں اور ان حضرات کا اللہ سے مشغول رہنا' حالات میں مستغرق ہونا۔ اپنے اوقات کو عبادت میں گھیر دینا ان کا مشغلہ۔ اس پر ان لوگوں سے بے پرواہ رہنا' کسی سے سوال نہ کرنا یہ تعفف پھر ان کے چہروں کا نور پیشانیوں پر سجدوں کے داغ اور عرفان کی چمک' ان کی علامت و پہچان۔ فرمایا جا رہا ہے کہ جو سبیل اللہ یعنی مساجد اور خانقاہوں میں گھرے ہوئے ہیں اور عبادات اور اشتغال باللہ کی وجہ سے کسب و تجارت نہیں کر سکتے۔ عام مسلمان ان کا استغناد دیکھ کر انہیں غنی سمجھتے ہیں مگر ان کے چہرے کا نور اور آثار فقر ان کے قلب کا پتہ دیتے ہیں۔ انہیں یا تو خدا ہی پہچانتا ہے یا ان کے گروہ کا آدمی' لوگوں سے بالکل نہیں سوال کرتے۔ ہر حاجت رب پر پیش کرتے ہیں۔ اے مسلمانو! تم حلال کمائیوں میں ان کا حصہ رکھو تا کہ تمہارے مال میں برکت رہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ مال اللہ کا مال ہے اور فقراء اللہ کے عیال۔ جو اس کا مال اس کے عیال پر خرچ نہ کرے گا اس پر وبال آئے گا۔ اور رب کو اس کی پرواہ بھی نہ ہوگی۔ لطف یہ ہے کہ ان فقراء نے رب سے مانگا اور رب نے ہم سے فرمایا کہ جاؤ انہیں دے آؤ۔ تو گویا جو ان مقبولین پر خیرات کرے وہ رب کا وکیل ہے (از ابن عربی) صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ سبیل اللہ دو ہیں۔ ایک تو کھلا ہوا واضح وصاف راستہ جسے شریعت کہتے ہیں۔ دوسرا چھپا ہوا پیچ دار راستہ' یعنی گلی در گلی' جسے طریقت کہا جاتا ہے۔ علماء نے تو اپنے کو شریعت کیلئے وقف کیا ہے کہ عام لوگوں کو اس پر چلائیں۔ صوفیاء نے اپنے کو طریقت کے لئے وقف کیا کہ خواص کو ان گلی کوچوں سے واقف کریں۔ دونوں جماعتیں مدد فی سبیل اللہ میں شامل ہیں۔ سبیل مطلق ہے اور شریعت و طریقت اس کی دو قسمیں ہیں۔ دونوں جماعتیں دینی خدمات کے باعث سفر و کمائی کے قابل نہ رہیں جو مال ان کی خدمات میں خرچ ہو وہ اچھے راہ میں گیا۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ

امن میں ہیں، اور تم ہماری طرف سے ہر طرح امان میں، ہم تم گویا ایک ہی ہیں، زبان تو ان کی یہ ہے، مگر دل کا یہ حال ہے کہ جب اکیلے ہوتے ہیں یا آپس میں اکٹھے ہوتے ہیں تو تمہارے اتفاق، اتحاد اور تمہاری فتوحات و دینی ترقیوں کا ذکر کر کے غصہ کے مارے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں، اور سوچتے ہیں کہ کوئی تدبیر ایسی بن پڑے، جس سے مسلمانوں کو ہلاک کر دیا جائے، جب وہ اپنے کفر میں اتنے پختہ ہیں، تو تم ایمان میں پختہ کیوں نہیں ہوتے، اے محبوب ﷺ تم ان جلنے والے حاسدوں سے خواہ زبان سے صراحتہً یا عمل سے اشارۃً یا استغناء سے کنایۃً فرما دو کہ تم غصہ اور جلن میں مر جاؤ، تمہارے جلنے سے مسلمانوں اور اسلام کا کچھ نہ بگڑے گا، چمگادڑ جلتے رہیں گے اور قرآن پاک کا سورج چمکتا رہے گا، اللہ تعالیٰ دلوں کی بات کا جاننے والا ہے، تمہاری خفیہ تدابیر پر مسلمانوں کو مطلع فرما دے گا،

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** صحابہ کرام کامل الایمان اور سچے مخلص مسلمان تھے جیسا کہ تُؤْمِنُوْنَ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا، جو ان کے ایمان میں شک کرے وہ اس آیت کا منکر ہے، صحابہ کرام پر ایمان لائے بغیر قرآن پر ایمان میسر نہیں ہو سکتا، ان بزرگوں کا ایمان ایسا ہی قطعی و یقینی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کی توحید اور حضور انور ﷺ کی رسالت، **دوسرا فائدہ:** صحابہ کرام کا ایمان سارے قرآن پر پہلے ہی سے تھا جتنا نازل ہو چکا تھا اس پر تفصیلاً اور جو نازل نہ ہوا تھا اس پر اجمالاً (کہ جو کچھ آئے گا حق ہوگا) جیسا کہ کُلِّهٖ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** مسلمانوں کو ساری آسمانی کتب پر اجمالاً ایمان لانا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ سارے انبیائے کرام علیہم السلام پر، عمل صرف قرآن کریم و سنت پر ہے، مگر ایمان ان سب پر بھی، جیسا کہ تُؤْمِنُوْنَ کی پہلی تفسیر اور کُلِّهٖ سے معلوم ہوا، **چوتھا فائدہ:** کفار قرابت داروں سے بھی دلی محبت حرام ہے جیسا کہ تُحِبُّوْنَهُمْ سے معلوم ہوا، مگر دلی محبت اور ہے ادائے حقوق کچھ اور بروقسط کچھ اور اس کی تفسیر گذشتہ آیت میں گذر گئی، کفار مسلمان سے کبھی محبت نہیں کر سکتے، اگرچہ عزیز و قرابت دار ہی ہوں جیسا کہ وَلَا یُحِبُّوْنَكُمْ سے معلوم ہوا، تجربہ نے بھی بتا دیا کہ مسلمان کا کفار کی دوستی پر اعتماد کرنا، اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، حال ہی میں تقسیم ملک کے موقعہ پر بہت مسلمان اپنے کافر دوستوں کے ذریعہ ہلاک ہوئے، **پانچواں فائدہ:** مسلمان فطرۃً سیدھا اور دھوکا کھا جانے والا ہوتا ہے، کافر فطرۃً چالاک اور دھوکا باز ہوتا ہے، جیسا کہ هٰۤؤُلَآءِ الخ سے معلوم ہوا، حدیث شریف میں ہے اَلْمُؤْمِنُ غِرٌّ كَرِیْمٌ وَالْكَافِرُ خَبٌّ لَئِیْمٌ، **چھٹا فائدہ:** قدرتی طور پر ایمان میں قوت ہے اور کفر بزدلی کا باعث، مومن بے دھڑک اپنے ایمان کا اظہار کرتا ہے، کافر کفر چھپاتا پھرتا ہے، دیکھو فرعونی جادوگر ایمان لاتے ہی کتنے دلیر ہو گئے کہ بے دھڑک کہہ دیا فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ (طٰہٰ:۷۲) **ساتواں فائدہ:** تقیہ بازی اور اپنا ایمان چھپانا طریقہ کفار ہے جیسا کہ وَاِذَا لَقُوْكُمْ الخ سے معلوم ہوا، **آٹھواں فائدہ:** کفار کتنی ہی سازشیں کریں مگر اسلام انشاء اللہ نہیں مٹ سکے گا، اگر مسلمان اسلام پر قائم رہیں تو وہ بھی کفار کے شر سے محفوظ رہیں گے، رب تعالیٰ کا وعدہ ہے جیسا کہ قُلْ مُوْتُوْا الخ سے معلوم ہوا، مگر افسوس ہے کہ اب تو مسلمان ہی اسلام کو مسخ و تبدیل کرنے کی فکر میں ہیں، مسلمان خیال

رکھیں کہ تبدیل کرنے والے انشاء اللہ تبدیل ہو جائیں گے، اسلام تبدیل نہ ہوگا، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ (توبہ:۳۹) مروان نے نماز عید میں صرف اتنی تبدیلی کرنا چاہی تھی کہ خطبہ نماز سے پہلے کر دیا تھا مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ مروان اور مروانیت ختم ہوگئی مگر خطبہ نماز کے بعد ہی رہا، اللہ تعالیٰ خود اپنے محبوب کی سنتوں کا حافظ و ناصر ہے، مسلمانو! اسلام کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اپنے کو اسلامی سانچے میں ڈھالو، ہمیشہ پھلو پھولو گے،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے دلوں میں کفار سے محبت تھی، دیکھو رب تعالیٰ نے فرمایا تُحِبُّوْنَهُمْ اور کفار سے محبت رکھنے والا بحکم قرآن دوزخی ہے مومن نہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا الخ (ہود:۱۱۳) **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک الزامی، دوسرا تحقیقی، جواب الزامی یہ ہے کہ اسی آیت میں صحابہ کرام کے ایمان کی بھی گواہی موجود ہے کہ فرمایا گیا ہے وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ تم ساری کتاب کے پکے مومن ہو، دوسری جگہ ارشاد ہوا، اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (فتح:۲۹) یعنی حضرات صحابہ کرام کافروں پر سخت ہیں آپس میں نرم، جواب تحقیقی یہ ہے کہ تُحِبُّوْنَ کی بہت تفسیریں ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تم چاہتے ہو کفار ایمان لے آئیں، یہ محبت تو عین ایمان ہے، جیسا کہ ہم نے تُحِبُّوْنَ کی تفسیر میں تفسیر کبیر و خازن سے نقل کیا، اور اگر محبت بمعنی میلانِ قلب ہی ہو تو محبت بہت قسم کی ہوتی ہے، کفر سے محبت (یہ کفر ہے) کفار سے محبت (یہ نفاق ہے)، کسی کافر سے قرابت داری کی بنا پر غیر اختیاری طبعی محبت (یہ نہ کفر ہے نہ نفاق) جیسے کافر بیٹے یا بیوی سے محبت، یہاں یہ تیسری محبت ہی مراد ہے، اسی لئے رب تعالیٰ نے ان بزرگوں کو اس محبت کی بناء پر عتاب نہ فرمایا بلکہ آئندہ احتیاط رکھنے کا حکم دیا، اور ساتھ ہی ان کے ایمان کی گواہی بھی دے دی، **دوسرا اعتراض:** یہاں فرمایا گیا مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اے کافرو کفر پر قائم رہو، اور غصہ میں مرجاؤ، اس میں انہیں کفر پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا ایسی بات شانِ نبوت تو کیا شانِ اسلام کے بھی خلاف ہے، **جواب:** اس میں انہیں کافر رہنے کا حکم نہیں بلکہ اسلام کی ترقی کی دعا ہے یا کفار کو ناکامی کی بددعا یعنی خدا کرے اسلام یوں ہی ترقی میں رہے، یا تم بھی کامیابی کا منہ نہ دیکھو اور ایسے ہی جلتے رہو، خیال رہے کہ کفار کی ہلاکت کی دعا بھی جائز ہے، اور ان کے کفر پر مرنے کی بددعا بھی، موسیٰ علیہ السلام نے فرعونیوں کے لئے بددعا کی تھی فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ (یونس:۸۸) یعنی خدایا انہیں عذاب آنے تک ایمان کی توفیق نہ ملے، عذاب آنے پر ایمان لائیں اور قبول نہ ہو، جنابِ کلیم کی دعا حرف بحرف قبول ہوئی، کہ ڈوبتے وقت فرعون پکارا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ (یونس:۹۰) مگر اس ایمان کو یہ فرما کر رد کر دیا گیا، آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ (یونس:۹۱) **تیسرا اعتراض:** رب تعالیٰ نے خبر دی کہ کفار تم سے محبت نہیں کرتے، مگر دیکھا جارہا ہے کہ بعض کفار ہم سے بڑی محبت کرتے ہیں، بہت سے کافر ملکِ پاکستان کو امداد دے رہے ہیں! **جواب:** مسلمانو! یہ دھوکا ہے، وہ تم سے محبت نہیں کرتے، اور نہ تمہیں امداد دیتے ہیں، بلکہ اپنی غرض کے لئے یہ سب کچھ امدادیں ہیں، زیادہ کہنا مناسب نہیں، ان تمام چیزوں کو ڈاکٹر اقبال ایک شعر میں اشارۃً بتا گئے ہیں، شعر

تو چہ دانی عہد ما با ما چہ کرد از جمال مصطفیٰ بیگانہ کرد

آج ہم اپنا سب کچھ کھو چکے ہیں، ہم وہ لٹا ہوا قافلہ ہیں، جس کے موتی اوروں نے لے لئے اور ان کی ٹھیکریاں ہم نے اٹھا لیں، دعا کرو ہمیں اپنے موتی سنبھالنے کی توفیق ملے،

تفسیر صوفیانہ

جیسے ظاہری حواس پر بعض بیماریاں چھا کر یا تو انہیں بیکار کر دیتی ہیں جن سے وہ حواس کام ہی نہیں کرتے، یا انہیں بگاڑ دیتی ہیں، جن سے الٹا اور غلط کام کرتے ہیں، اندھا کچھ دیکھتا ہی نہیں، اور احول (بھینگا) ایک کو دو دیکھتا ہے، خشک زبان کسی چیز کا مزہ محسوس ہی نہیں کرتی، اور صفراوی بخار والا کڑوی چیز کو میٹھی اور میٹھی چیز کو کڑوی محسوس کرتا ہے، ایسے ہی اندرونی بیماریوں والے کے حواس کبھی بگڑ جاتے ہیں جن سے وہ کڑوے کفر کو میٹھا سمجھنے لگتا ہے اور میٹھے ایمان وتقویٰ کو کڑوا جاننے لگتا ہے، دشمن کفار کو اپنا دوست سمجھتا ہے، اور اپنے دوست مسلمانوں کو دشمن تصور کرتا ہے، اس آیت میں اور اس جیسی دوسری آیات میں مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ اپنے ذہنی احساسات نہ بگاڑیں، دوستوں کو دشمن اور دشمنوں کو دوست نہ بنائیں، ان کی دشمنی عیاں ہے نہاں نہیں، اس عیاں کو جانیں اور پہچانیں، صوفیائے کرام فرماتے ہیں اپنا حال اسرار اپنے ہم جنس کو بتاؤ، اگر غیر جنس کو حامل بنایا، تو دھوکا کھاؤ گے، امام غزالی فرماتے ہیں کہ انسان کی ظاہری صورت سے دھوکا نہ کھاؤ جب تک کہ اس کی سیرت نہ آزماؤ، آزمائش یا تو اس کے ساتھ رہنے سہنے سے ہوتی ہے، یا اس کے فقر وغناء کے حالات دیکھنے سے، یا اس کے ساتھ سفر کرنے سے، یا اس کے ساتھ روپیہ پیسہ کا معاملہ پڑنے سے، یا اور کام پڑنے سے، اگر ان موقعوں پر تم اسے درست پاؤ، اگر بڑا ہے تو اپنا اسے والد سمجھو، اگر چھوٹا ہے تو اسے اپنا بیٹا جانو، اگر برابر ہے تو بھائی جانو، اور ایسے دوست کی صحبت غنیمت جانو، شعر

اِنَّ الرِّجَالَ صَنَادِيْقَ مَقْفَلَةٌ وَمَا مَفَاتِيْحُ هَا اِلَّا التَّجَارِيْبُ

یعنی لوگ قفل لگے ہوئے صندوق ہیں، تجربہ وآزمائش ان کی چابی ہے، تصوف میں دو چیزیں بہت ضروری ہیں، اچھوں کی صحبت اور محبت، بروں سے علیحدگی ونفرت، بروں کی صحبت اتنی ہی مضر ہے جتنی اچھوں سے دوری نقصان دہ، رب تعالیٰ کا جس پر کرم خاص ہوتا ہے، اسے اچھے ساتھی عطا فرماتا ہے،

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ
اگر چھو جائے تمہیں کوئی بھلائی تو بری لگتی ہے ان کو اور اگر پہنچے تم کو کوئی برائی تو
تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو انہیں برا لگے اور تم کو برائی پہنچے تو
يَّفْرَحُوْا بِهَا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ
خوش ہوتے ہیں وہ اس سے اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو نہ نقصان دے گا
اس پر خوش ہوں اور اگر تم صبر اور پرہیزگاری کئے رہو تو ان کا داؤں

كَيْدُهُمْ شَيْئًا ۗ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾

تمہیں ان کا مکر کچھ بھی بے شک اللہ اس کو جو وہ کرتے ہیں گھیرے ہے

تمہارا کچھ نہ بگاڑے گا بے شک ان کے سب کام خدا کے گھیرے میں ہیں

تعلقات

اس آیت کریمہ کا گذشتہ آیتوں سے کئی طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** گذشتہ آیت میں فرمایا گیا تھا کہ منافقین تم پر انگلیاں کاٹتے ہیں، اس میں ایک قسم کا اجمال تھا، اس آیت میں اس کی تفسیر بیان ہو رہی ہے کہ تمہاری بھلائیاں دیکھ کر انہیں سخت رنج ہوتا ہے، **دوسرا تعلق:** گذشتہ آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ رب تعالیٰ منافقین کے دلی حالات جانتا ہے، اب ان حالات کی اطلاع مسلمانوں کو دی جا رہی ہے، گویا پہلے رب تعالیٰ کے جاننے کا ذکر ہے، اب اس کے بتانے کا تذکرہ، **تیسرا تعلق:** گذشتہ آیت میں کفار کے کچھ عیوب اور برے حالات بیان کئے گئے، اس آیت میں ان کے حسد اور عناد کا ذکر ہو رہا ہے، یعنی لازمی عیوب کا ذکر پہلے تھا، متعدی عیوب کا ذکر اب فرمایا جا رہا ہے،

تفسیر

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ، تَمْسَسْ مسّ سے بنا جس کے لغوی معنی ہیں لگنا و چھونا، مگر اصطلاح میں ہر قسم کے چھونے، لگنے اور پہنچنے کو مس کہہ دیتے ہیں خواہ بھلائی پہنچے یا برائی، کبھی اصابۃ کے معنی میں آتا ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (ق:۳۸) اور فرماتا ہے: وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ (اسراء:۶۷) اور کبھی اصابۃ کا مقابل یعنی پورا پورا پہنچنا اصابت ہے اور معمولی طور پر چھو جانا مس، بعض مفسرین نے یہاں مسّ کو اصابۃ کا ہم معنی قرار دیا کہ اس کا مقابل ہے، کُمْ یا سارے صحابہ سے خطاب ہے یا تا قیامت مسلمانوں سے، حَسَنَةٌ حسنٌ کا صفت مشبہ ہے، ہر دل خوش کن اور مرغوب چیز کو حَسَنَہ کہا جاتا ہے، یہاں اس سے ہر دنیاوی نفع و بھلائی مراد ہے، تندرستی، ارزانی، جنگ میں فتح، غنیمت کا حصول، دشمنوں کا فرار، مسلمانوں کا آپس میں اتفاق، حسنۃ کی تنکیر تحقیر کے لئے ہے جیسا کہ مسّ سے معلوم ہوا، یعنی اے صحابہ یا اے مسلمانو اگر تمہیں کبھی معمولی سی بھلائی چھو جائے تو تَسُؤْهُمْ سوء سے بنا بمعنی قباحت، رب تعالیٰ فرماتا ہے سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (مجادلہ:۱۵) یہاں سوء سے دلی صدمہ اور غم مراد ہیں، ھم کا مرجع یا منافقین ہیں یا یہود یا سارے کفار یا منافقین و کفار دونوں، یعنی انہیں بہت برا لگتا ہے اور بہت صدمہ و رنج و غم پہنچتا ہے وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ تُصِبْ اصابۃ سے بنا بمعنی پورا پورا پہنچنا، کم میں یا صحابہ سے خطاب ہے یا سارے مسلمانوں سے، سیئۃ حسنۃ کا مقابل ہے بمعنی برائی و غمگین کرنے والی چیز، جیسے حسنہ میں دنیوی نفعے مراد تھے ایسے ہی سیئۃ سے اس کی مقابل تکلیف دہ چیزیں مراد ہیں، بیماریاں، غربت جنگ میں شکست، آپس کی نا اتفاقی، قرابت داروں سے جدائی قتل و غارت وغیرہ سیئۃ کی تنکیر تعظیم کے لئے ہے، یعنی اے صحابہ یا اے مسلمانو! اگر تمہیں بڑی سے بڑی آفت و مصیبت بھی پہنچے، تو یہ منافقین و کفار غم نہ کریں گے، تم پر آنسو نہ بہائیں گے بلکہ يَّفْرَحُوْا بِهَا یہ فرح سے

نفس کی سخاوت میں مشغول کہ کونین سے منہ موڑ کر اور دارین کی نعمتیں دوسروں کے لئے چھوڑ کر خود خالق کونین کی طرف متوجہ رہتے ہیں سوتے ہیں تو رب کے لئے جاگتے ہیں تو اس کے لئے کھاتے ہیں تو اس کے لئے پیتے ہیں تو اس کے لئے بولتے ہیں یا خاموش رہتے ہیں تو اسی کے لئے ان کا ہر کام رب کی رضا جوئی میں ہے۔ ان کا ثواب یہ ہے کہ۔ شعر ۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

حکایت: اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کے ملفوظات میں ہے کہ ایک دن سخت بارش ہو رہی تھی۔ اندھیری رات تھی۔ حضرت سلطان الاولیاء محبوب الٰہی صاحب قدس سرہٗ بدایونی ثم الدھلوی نے اپنے کسی خاص خادم سے فرمایا کہ دہلی کے اس کنارے جمنا پار ایک قطب تشریف فرما ہیں۔ انہیں کھیر کھلا آؤ انہوں نے عرض کیا کہ جمنا جوش پر ہے کوئی کشتی وغیرہ بھی نہیں ہے۔ اسے کیونکر پار کروں گا فرمایا۔ جمنا سے کہہ دینا کہ میں اس کے پاس سے آیا ہوں جو کبھی اپنی بیوی کے پاس نہ گیا۔ مجھے راستہ دے۔ وہ نیک بخت شخص بہت متعجب ہوا سوچا کہ آپ صاحب اولاد ہیں۔ بیوی صاحبہ گھر میں ہیں' پھر یہ کیا فرما رہے ہیں۔ مگر باادب تھے کچھ نہ کہا اور چل دیئے' دریا سے یہ ہی کہا۔ اس میں خشک راستہ بن گیا۔ اس طرف جا کر ان بزرگ کو کھیر کھلائی' جب واپس ہونے لگا تو انہوں نے فرمایا کہ جمنا سے کہہ دینا کہ میں اس کے پاس سے آیا ہوں جس نے کبھی کچھ کھایا ہی نہیں۔ اس کا تعجب اور بڑھ گیا کہ میرے سامنے کھیر کھائی اور یہ فرما رہے ہیں۔ غرض دریا پر آ کر یہ ہی کہا۔ اس میں خشک راہ پیدا ہوا۔ حضرت سلطان الاولیاء کے پاس آ گیا۔ مگر تعجب تھا کہ دریا نے بھی ان کی خلاف واقعہ بات مان لی۔ ایک دن موقعہ پا کر حضرت محبوب الٰہی سے عرض کیا کہ اس دن کیا ماجرا تھا۔ فرمایا کہ ہم اپنے نفس کے لئے کچھ نہیں کرتے جو کرتے ہیں رب کے لئے اس کے لئے کھاتے ہیں۔ اسی کے لئے ازواج سے اختلاط کرتے ہیں۔ اس چوتھی قسم کی سخاوت کی یہ جزا ہے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ چھ چیزوں کی عمدگی چھ چیزوں سے ہے۔ علم کی خوبی عمل سے' سلطنت کی عدل سے غنا کی سخاوت سے' جوانی کی توبہ سے' فقر کی صبر سے' عورتوں کی حیا سے۔ علم بلا عمل ایسا ہے جیسے گھر بغیر چھت' بادشاہ بغیر عدل ایسا ہے جیسا کنواں بغیر پانی کے۔ غنا بغیر سخاوت ایسی ہے جیسے بادل بغیر بارش' جوانی بغیر توبہ ایسی جیسے درخت بغیر پھل' فقیری بغیر صبر ایسی ہے جیسے قندیل بے روشنی' عورت بے حیا ایسی جیسے کھانا بغیر نمک۔ غنی پر لازم ہے کہ غنا کے بادل سے دین و دنیا کی برکتیں برسائے' اور فقراء کے دل کو جو فقر کی خشکی سے سوکھ گئے ہیں تر و تازہ کرے تاکہ رب تعالیٰ اسے ہرا بھرا رکھے۔ جو شخص جمع کرے اور نہ کھائے' وہ در حقیقت اپنے غیر یعنی ورثاء کے لئے جمع کرتا ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ سخی مال کو دنیا میں چور' ڈاکو' دشمن کا خوف نہیں کہ اس کا کوئی دشمن ہوتا ہی نہیں۔ سب اس کی زندگی چاہتے ہیں۔ اگر اتفاقاً اس کا مال ضائع ہو جائے تو اسے غم نہیں کہ اسے مال سے محبت ہوتی ہی نہیں۔ بیماری میں موت کا خوف اس بنا پر نہیں کہ ہائے میرا مال کہاں جائے گا کہ اسے مال سے الفت نہیں۔ نیز اسے موت پر مال چھوٹنے کا غم نہیں بلکہ آگے کی خوشی ہوتی ہے کہ دیدار یار رب کی رحمت نصیب ہو گی۔ مال کے ہوس والے کو موت پر ڈبل صدمہ ہوتا ہے۔ ایک جان نکلنے کا دوسرا مال چھوٹنے کا۔ حشر میں انشاء اللہ اسے اولیاء اللہ کے ساتھ حشر نصیب ہو گا۔ یہ تمام فضائل لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ میں بیان ہو گئے۔ صوفیاء یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے وطن کی چیز سے الفت ہوتی ہے۔ نفس دنیا کی شے ہے اسے یہاں کے مال سے الفت ہے۔ روح اس جہاں کی

کے دلوں پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں، ان کے دل رنج وصدمہ سے بھر جاتے ہیں، تمہارا مل بیٹھنا جنگوں میں فتح پالینا، تمہارا مالدار ہو جانا، تمہارا تندرست وفربہ ہونا، ان کے دل پر سانپ بن کر لوٹتا ہے، اور اگر تم پر کبھی بڑی سے بڑی آفت آجائے مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں، تو انہیں اس پر نہ کبھی غم ہوتا ہے نہ رنج نہ صدمہ بلکہ ان کے دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتے ہیں وہ اس پر خوشیاں مناتے ہیں، مگر خیال رکھو کہ اگر تم عبادات پر قائم رہے یا گناہوں سے بچے رہے یا مصیبتوں میں نہ گھبرا گئے یا کفار سے بدلہ لینے پر جوش میں نہ آگئے، اور پرہیزگاری وتقویٰ کا دامن نہ چھوڑا، کہ تمہارے دلوں میں خوف خدا اور عشق مصطفیٰ علیہ السلام کا دریا موجزن رہا، اور تمہارے اعضاء نیک اعمال میں مشغول رہے، تو ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ کفار کی سازشیں، ان کی چالیں ان کی تمہارے خلاف تدبیریں کبھی تمہارا بال بیکا نہ کرسکیں گی، ان کی تدابیر خود ان پر پڑیں گی، اور وہ ہمیشہ تمہارے مقابلہ میں خائب وخاسر ہوں گے، تمہیں کس بات کی فکر ہے، رب تعالیٰ تمہارا والی ووارث ہے، اور ان کی تمام تدبیروں کو اپنی قدرت علم غضب کے احاطہ میں لئے ہوئے ہے کہ وہ کسی طرح ان گھیروں سے نکل نہیں سکتے، انہیں دنیا میں بھی پکڑے گا اور آخرت میں بھی سزا دے گا، یا اے مسلمانو جو کچھ تم نیکیاں کر رہے ہو، وہ رب تعالیٰ کے علم، اس کی قدرت، اس کی رحمت کے احاطہ میں ہے، تمہیں دنیا وآخرت میں اس کی جزائیں دے گا،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** مسلمانوں کی خوشی پر غم منانا طریقہ کفار ہے، ان کی قومی، دینی، دنیوی، جائز خوشیوں میں شرکت کرنی چاہیے، لہٰذا یادگاری خوشیوں میں شرکت کرنا شعار اسلامی ہے، جیسا کہ اِنْ تَمْسَسْكُمْ الخ سے معلوم ہوا، حصول پاکستان کے دن مسلمانوں کے ساتھ جائز خوشی مناؤ، اس دن شکریہ میں نوافل، صدقات، خیرات، چراغاں وغیرہ کرو، عید میلاد، عید معراج، عید الفطر، عید الاضحیٰ کی خوشیوں میں مسلمانوں کے ساتھ شریک رہو، **دوسرا فائدہ:** مسلمانوں کی مصیبتوں پر خوشی منانا بھی طریقہ منافقین وکفار ہے، علماء فرماتے ہیں کہ عاشورہ کے دن خوشی منانا خارجیوں کا طریقہ ہے، اور اس دن کوٹنا پیٹنا روافض کا شعار، اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں، جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے دن عید مناتے ہیں، **مسئلہ:** خوشی کی یادگاریں قائم کرنا سنت ہے، نبی کریم علیہ السلام نے عاشورہ کے دن موسیٰ علیہ السلام کی نجات کی خوشی منائی، اور روزہ رکھا، مگر غم کی یادگاریں منانا منع ہے، اس میں صبر بہتر، دیکھو بارہ ربیع الاول کو حضور انور علیہ السلام کی ولادت پاک بھی ہے اور وفات شریف بھی، مگر مسلمان اس دن عید میلاد مناتے ہیں، وفات کا غم نہیں مناتے، **تیسرا فائدہ:** مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے حالات درست رکھیں، محبت واتفاق سے رہیں، تاکہ کفار کو ان پر ہنسنے کا موقعہ نہ ملے، **چوتھا فائدہ:** اگر مسلمان صبر وتقویٰ پر قائم رہیں، تو کبھی بھی کفار ان پر غالب نہیں آسکتے اور نہ انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں، تجربہ شاہد ہے کہ ہمیشہ مسلمانوں نے مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مار کھائی ہے، **پانچواں فائدہ:** تقویٰ وپرہیزگاری مسلمان کے لئے مضبوط قلعہ ہے، جس کی برکت سے مومن دنیاوی آفات سے بھی محفوظ رہتا ہے، جہاد میں تقویٰ وہ ہتھیار ہے، جس سے کفار محروم ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ

پانچواں تعلق: بہت دور سے مخلوق کے ساتھ بھلائی کرنے کے احکام بیان ہو رہے ہیں جن میں سے صدقہ بھی ہے۔ اب سود سے منع کیا جارہا ہے کہ یہ بھی خلق کے ساتھ ایک بھلائی ہے۔ **چھٹا تعلق:** پچھلی آیتوں میں عبادات کا ذکر تھا۔ یعنی صدقہ وخیرات دینا۔ اب مالی معاملات کا بیان ہے۔ یعنی سودی لین دین نہ کرنا۔

تفسیر

اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا۔ یہاں اَلَّذِیۡنَ سے ان امرائے عرب کی طرف اشارہ ہے جو سودی کاروبار کرتے تھے مگر لفظی عموم کی وجہ سے سارے سودخور مراد ہیں۔ اَلَّذِیۡنَ سے کبھی تو مراد صحابہ کرام ہوتے ہیں جیسے اِنَّ الَّذِیۡنَ یَغُضُّوۡنَ اَصۡوَاتَہُمۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰہِ (حجرات: ۳) اور کبھی عام مسلمان جیسے اَلَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ (مائدہ: ۵۵) اور کبھی سارے انسان۔ مومن ہو یا کافر متقی یا فاسق جیسے یہاں اَلَّذِیۡنَ تیسرے معنی میں ہے کیونکہ سود لینا ہر انسان کو منع ہے۔ مومن ہو یا کافر اسلامی سلطان کفار کو سود کھانے' شراب پینے کی اجازت تو دے گا مگر سودخوری' قتل وغارت چوری' زنا کی اجازت نہ دے گا کہ یہ معاملات ہیں۔ کسی دین میں زنا چوری حلال ہو اور وہ دارالسلام میں رہتے ہوں تو انہیں اس کی اجازت نہیں۔ غرضکہ اَلَّذِیۡنَ کے متعلق آئندہ مضمون کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ یہاں چونکہ سود کی حرمت کا ذکر ہے جس کا تعلق سب لوگوں سے ہے۔ اس لئے اَلَّذِیۡنَ سے مراد سارے انسان ہیں۔ یَاۡکُلُوۡنَ سے سود لینا مراد ہے مگر چونکہ کھانا مال کا مقصد اعلیٰ ہے اس لئے اس کا ذکر فرمایا گیا۔ جیسے اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا۔ (النساء: ۱۰) اور جیسے وَلَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ (بقرہ: ۱۸۸) ہماری اردو زبان میں سود لینے والے کو سودخور اور حرام کمانے والے کو حرام خور کہتے ہیں یعنی سود کھانے والے حرام کھانے والے مطلب پر ناچنے والے۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ یَاۡکُلُوۡنَ سے یُعَامِلُوۡنَ مراد ہے یعنی جو سود کا معاملہ کرتے ہیں۔ اس معاملہ سے بھی لینا ہی مراد ہے نہ کہ دینا کیونکہ آیت میں سود لینے ہی کا ذکر ہے سود دینے کی حرمت دیگر دلائل سے معلوم ہوئی۔ رِبٰو دراصل ربوٌ تھا۔ بمعنی زیادتی۔ اسی لئے چوڑی نالی کو رابیہ اور اونچی جگہ کو ربوہ اور کسی پر زیادتی کرنے کو ربو کہا جاتا ہے۔ رب فرماتا ہے۔ اِہۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ۔ (حج: ۵) اور فرماتا ہے۔ فَلَا یَرۡبُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ۔ (الروم: ۳۹) یہ لکھنے میں صلٰوۃ وزکوٰۃ کی طرح ربو' اور ربیٰ' اور ربا الف سے ہر طرح مستعمل ہے۔ اس کے لغوی معنی مطلقاً زیادتی ہیں۔ مگر اصطلاح شریعت میں ناپنے تولنے والی ہم جنس چیز میں بلاعوض زیادتی کو ربو' کہتے ہیں۔ اس کی بہت سی صورتیں ہیں۔ جیسا کہ انشاء اللہ آئندہ معلوم ہوگا۔ یعنی جو لوگ سود لیتے ہیں۔ لَا یَقُوۡمُوۡنَ۔ اس قیام سے یا میدان قیامت میں کھڑا ہونا مراد ہے (روح البیان) یا اپنی قبروں سے اٹھنا اور محشر کی طرف چلنا (روح البیان) کیونکہ اس دن سودخور کی یہی ہی پہچان ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ یَقُوۡمُوۡنَ حال کے معنی میں ہی ہوں' اور قیام سے مراد سود دینا ہی قائم وموجود رہنا یعنی سودخور دنیا میں ایسے دیوانے ومحبت مال میں خبطی ہو رہتے ہیں۔ جیسا کسی کو شیطان سے وار پڑ جائے اور وہ دیوانہ ہو جاتا ہے کہ انہیں بجز سودوں کے اور کوئی دھن ہی نہیں ہوتی اگرچہ یہ معنی بعید ہے مگر محتمل ضرور ہے قیام کے معنی ٹھہرنا اور رہنا بھی لغت میں ہے۔ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ۔ یہ نفس قیام میں تشبیہ ہے نہ کہ وجہ میں۔ یَتَخَبَّطُ۔ خبطٌ سے بنا بمعنی خلط۔ جس کی رفتار و گفتار میں یکسانیت نہ ہو چلنے اور بولنے میں بہکتا ہو۔ ایسے خبطی کہا جاتا ہے۔ تخبط بمعنی خبطی ہونا' اور تخبیط خبطی کرنا۔ یہاں

تفعل بمعنی تفعیل ہے۔ شیطان سے یا ابلیس مراد ہے یا ہمزاد یا عام جن یا تو مَسّ لمس کی طرح بمعنی چھونا ہے۔ یا بمعنے جنون مجنون کو ممسوس کہا جاتا ہے۔ یعنی سود خور اپنی قبروں سے اٹھ کر محشر کی طرف ایسے گرتے پڑتے چلیں گے جیسے کسی پر شیطان سوار ہو کر اسے دیوانہ کر دے، جس سے وہ یکساں نہ چل سکے۔ ایسے ہی یہ لوگ اپنے پیٹ کے بوجھ یا جنون سے یکساں نہ چل سکیں گے۔ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا۔ ذٰلِکَ سے یا تو کھانے کی طرف اشارہ ہے۔ یا ان کے عذاب کی طرف (روح المعانی) بِاَنَّهُمْ میں ب سببیہ ہے۔ هُمْ کا مرجع یا سود خور ہیں یا ان کے وہ حمایتی جو سود کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قَالُوْٓا سے یا زبانی قول مراد ہے یعنی کہنا یا دل کا قول یعنی سمجھنا، یا عملی قول، انما حصر کے لئے ہے اور بیع سے مراد عام حلال تجارتیں ہیں۔ اس کلام میں ان لوگوں نے سود کو جائز کہنے میں اتنا غلو کیا کہ تجارت کو مشبہ اور سود کو مشبہ بہ بنایا گویا سود ایسا حلال ہے کہ عام بیعیں بھی مثل اس کی حلال ہیں۔ یعنی ان کی یہ سود خوری یا یہ سزا اس لئے ہے کہ انہوں نے دل سے سمجھا یا عمل سے ثابت کر دیا یا زبان سے صاف صاف کہا کہ دیگر نفع بخش تجارتیں۔ سود کی طرح حلال ہیں کہ ان سے بھی نفع حاصل کیا جاتا ہے اور سود سے بھی اس کی کیا وجہ کہ اگر ایک روپیہ کا کپڑا دو روپے میں بیچیں تو حلال ہو اور اگر ایک روپیہ دو روپے کے بدلے میں بیچیں تو حرام حالانکہ وہاں بھی ایک ہی روپیہ نفع ملا اور یہاں بھی۔ حق تعالیٰ جواب ارشاد فرماتا ہے۔ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ واو یا حالیہ ہے یا استینافیہ یہاں بیع مطلق ہے اور ربو، مجمل جیسا کہ انشاء اللہ فوائد میں معلوم ہوگا۔ یعنی اللہ نے تجارتوں کو حلال کیا اور سود کو حرام۔ اتنا فرق ہوتے ہوئے جو تجارت اور سود کو یکساں کہے گا وہ پاگل ہے۔ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ مَنْ شرطیہ یا موصولہ ہے۔ جَآءَ بمعنی بلغ ہے مَوْعِظَةٌ وَعْظٌ سے بنا بمعنی نصیحت یا جھڑک۔ مِنْ رَّبِّهٖ یا جَآءَ کے متعلق ہے۔ یا کسی پوشیدہ چیز کے اور موعظہ کی صفت یعنی جس کو خدائی نصیحت اور زجر پہنچی فَانْتَهٰی ف عاطفہ ہے یعنی وہ فوراً ہی سود خوری سے باز رہ گیا اور آئندہ کے لئے توبہ کر لی فَلَهٗ مَا سَلَفَ۔ فَلَهٗ کا ف جزائیہ ہے لہٗ جاءَ کے متعلق ہے۔ اور مَا سے مراد سود سَلَفَ بمعنی گزر گیا۔ اسی سے ہے۔ امت سالفہ گزری ہوئی امت، سلافۃ الخمر اوپر کی صاف شراب اور سلفۃ الطعام کھانے سے پہلے جو میوہ جات کھائے جائیں (کبیر) یعنی اس کو پچھلا لیا ہوا سود جائز ہے کیونکہ وہ ممانعت سے پہلے لے چکا۔ اب اسے واپس کرنے کی ضرورت نہیں وَاَمْرُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ۔ امر سے مراد یا نیت ہے یا معاملہ یا باز رہنا یعنی اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ بلا وجہ کسی پر بدگمانی نہ کرو۔ وَمَنْ عَادَ۔ عَادَ عَوْدٌ سے بنا بمعنی لوٹنا یہاں یا عقیدہ کی طرف لوٹنا مراد ہے یا عمل کی طرف یعنی جو کوئی سود کو حرام سمجھ کر پھر حلال کہنے لگے یا اسے چھوڑ کر پھر لینے لگے۔ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۔ اُولٰٓئِکَ سے مَنْ کی طرف اشارہ ہے کہ وہ معنی جمع ہے۔ نَارٌ سے دوزخ مراد ہے خواہ وہاں کا ٹھنڈا عذاب ہو یا گرم کیونکہ دوزخ میں اصلی چیز نار ہے اگر عود سے حلال سمجھنا مراد تھا تو خلود بمعنی ہیشگی ہے اور اگر دوبارہ سود لینا مراد تھا تو خلود بمعنی دراز مدت یعنی جو کوئی سود کو حرام سمجھ کر پھر حلال سمجھنے لگے تو وہ دوزخی ہے اور اس میں ہمیشہ ہی رہے گا یا جو کوئی سود چھوڑ کر پھر لینے لگے تو وہ جہنمی ہے۔ اس میں مدتوں رہے گا۔ یا یہ مطلب ہے کہ دوسرے گنہگاروں کے مقابل سود خور دوزخ میں زیادہ رہے گا کہ یہ رب کا مجرم بھی ہے اور انسانوں کا ظالم بھی حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کے بوجھ اس کے سر پر ہیں۔ سود خور ایک مقروض سے جب سود لیتا ہے تو وہ اس مقروض پر اس کے بال بچوں پر اس کے تمام

نفس کے ساتھ مخالفت سے، شیطان کے ساتھ عداوت سے متقین سے ہو جاؤ گے۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ

اور جب روانہ ہوئے آپ اپنے گھر سے کہ قائم کرتے تھے آپ مسلمانوں کو

اور یاد کروائے محبوب جب تم صبح کو اپنے دولت خانہ سے برآمد ہوئے مسلمانوں کو

مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾

جنگ کے لئے مورچوں پر اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے

لڑائی کے مورچوں پر قائم کرتے اور اللہ سنتا جانتا ہے

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ

جب قصد کیا دو گروہوں نے تم میں سے یہ کہ بزدل ہو جائیں اور اللہ

جب تم میں کے دو گروہوں کا ارادہ ہوا کہ نامردی کر جائیں

وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

والی ہے ان دونوں کا اور اوپر اللہ کے ہی توکل کریں توکل والے

اور اللہ ان کا سنبھالنے والا ہے اور مسلمانوں کو اللہ پر ہی بھروسہ چاہیے

تعلقات

اس آیت کا گذشتہ آیت سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** گذشتہ آیت میں ارشاد ہوا کہ منافقین و کفار کبھی تمہارے دوست نہیں ہو سکتے، اب اس کے ثبوت کے لئے جنگِ احد وغیرہ کے واقعات یاد دلائے جارہے ہیں، جبکہ منافقین نے عین نازک موقعہ پر مسلمانوں سے بدعہدی کی، اور کفار کو قوت پہنچانے کی کوشش کی، گویا پچھلی آیت میں ایک دعویٰ تھا، اس آیت میں اس کی دلیل ہے، **دوسرا تعلق:** گذشتہ آیت میں فرمایا گیا تھا کہ اگر صبر و تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہیں کفار نقصان نہ پہنچا سکیں گے، اب اس کے ثبوت میں جنگِ احد کا واقعہ یاد دلایا جارہا ہے، کہ مسلمان تھوڑی سی بے صبری کی وجہ سے فتح کے بعد ہزیمت اٹھا گئے، تاکہ اس واقعہ سے آئندہ کے لئے سبق لیں اور ایسے موقعوں پر صبر و تقویٰ کا دامن نہ چھوڑیں، **تیسرا تعلق:** گذشتہ آیتوں میں اشارۃً حضور انور ﷺ کی اطاعت و فرماں برداری کا حکم اور مخالفت سے منع فرمایا گیا تھا، اب جنگ احد و بدر کے واقعات کا ذکر کر کے بتایا جارہا ہے کہ غزوۂ احد میں تم ان کے فرمانِ عالی کی غلطی سے مخالفت کر بیٹھے، تو باوجود زیادہ ہونے کے مصیبت میں پڑ گئے، اور جنگ بدر میں تم ان کی اطاعت پر قائم رہے، تو باوجود تھوڑے اور بے سروسامان ہونے کے بہت سے کفار پر جو ساز و سامان سے لیس تھے غالب آ گئے، یقین کر لو کہ تمہاری کامیابی کا دارومدار اللہ رسول کی

فاسق اور حلال جاننے والا کافر ہے جیسا کہ خَالِدُوْنَ کی دو تفسیروں سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** سود لینے کی سزا دیگر کبیرہ گناہوں سے سخت تر ہے کہ قیامت میں کفار بھی قبور سے اٹھ کر آسانی سے چلیں گے مگر سود خور کو چلنا پھرنا مشکل ہوگا اور یہ ہی سود خور کی اس دن پہچان ہوگی کیونکہ سود خور مجرم بھی ہے اور ظالم و خونخوار بھی کہ گھر کے گھر تباہ اور دنیا کو برباد کرتا ہے۔ سب کو اجاڑ کر اپنا گھر بناتا ہے اور مال کی طلب میں دیوانہ وار سرگرداں رہتا ہے لہٰذا اس کے لئے یہ سزا تجویز ہوئی۔ **پانچواں فائدہ:** تفسیر کبیر نے فرمایا کہ یا تو سود خور واقعی اس دن دیوانہ ہوگا جیسا کہ اس تشبیہ سے معلوم ہوا یا اس کا پیٹ اتنا بڑا ہوگا جس کے بوجھ سے گرتا پڑتا چلے گا۔ جیسا کہ حدیث معراج میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے سود خوروں کے پیٹ بڑی کوٹھڑیوں کی طرح دیکھے جس سے وہ گرتے پڑتے ہیں۔ گویا اس دن اُن کی اس ہوس کا ظہور ہوگا جو انہیں دنیا میں تھی یا اس جنونِ مال کا اظہار ہوگا جس میں وہ مبتلا تھے۔ **چھٹا فائدہ:** ممانعت سے پہلے کے جرم معاف ہیں بشرطیکہ اب توبہ کرے جیسا کہ فَانْتَهٰى سے معلوم ہوا اور جو کوئی ممانعت کے بعد بھی باز نہ آئے اس پر اگلے پچھلے سارے گناہوں کا وبال ہے۔ **ساتواں فائدہ:** قیامت میں ہر مجرم چہرے سے ہی پہچان لیا جائے گا کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ دیکھو سود خور گرتا پڑتا دیکھ کر ہی پہچان لیا جائے گا۔ اسی طرح دوسرے مجرم پہچانے جائیں گے بلکہ اللہ والے تو دنیا ہی میں دوزخی جنتی کو پہچان لیتے ہیں کیونکہ ہر ایک کے گلے میں اس کی تختی رب نے ڈال دی ہے جسے آنکھ والے دیکھ بھی لیتے ہیں۔ پڑھ بھی لیتے ہیں۔ رب فرماتا ہے۔ **وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا** (الاسراء: ۱۳) ہر ایک کی تختی اس کے گلے میں پڑی ہے۔ کل قیامت میں یہ ہی تختی نامہ اعمال کی شکل میں نمودار ہوگی۔ **مسئلہ:** مسائل شرعیہ میں بے علمی عذر نہیں۔ لہٰذا جو کوئی بے خبری سے سود لیتا رہا وہ گنہگار ہے۔ **مسئلہ:** سود کا پیسہ قبضہ سے بھی ملک میں نہیں آتا۔ لہٰذا سود خوار سود کا مالک نہیں۔ اس پر واجب ہے کہ مقروض کو واپس دے۔ اگر مقروض مرگیا ہو تو اس کے ورثاء کو واپس کرے ورثاء بھی نہ ہوں تو مقروض کے نام پر خیرات کردے یہ حق العباد ہے توبہ سے معاف نہیں ہوسکتا۔ **مسئلہ:** اگر مقروض بعینہٖ سود کا پیسہ قرض خواہ سے چھین لے تو جائز ہے مگر بعینہٖ کی قید کا لحاظ رہے کیونکہ یہ سود کا پیسہ خود مقروض کا اپنا پیسہ ہے نہ کہ قرض خواہ کا۔

ممانعت سود کی حکمتیں اور سود کی دینی و دنیاوی خرابیاں

سود میں صدہا خرابیاں ہیں جس کی وجہ سے شریعت نے اسے حرام فرمایا اُن میں سے چند وجوہ ہم عرض کرتے ہیں۔

(۱) سود میں دوسرے کا مال بلاعوض لیا جاتا ہے۔ یہ ظلم ہے مثلاً کسی نے ایک روپیہ کے عوض دو روپیہ لئے روپیہ تو روپیہ کے بدلے میں ہوگیا۔ دوسرا روپیہ بلاعوض رہا۔ یہ ظلم ہوا۔

(۲) سود سے تجارت بند ہونے کا قوی اندیشہ ہے کہ جب سود خوار کو بلامحنت اور بلاخوف و خطرہ نفع ملے گا تو وہ تجارت کی محنت اور اس کے خطرات کیوں برداشت کرے گا۔ تجارت بند ہونے سے عالم برباد ہو جائے گا۔

(۳) سود سے پرانی محبت اور مروت ختم ہو جاتی ہے۔ سود خوار میں بہیمیت و خونخواری پیدا ہوتی ہے کہ مقروض بھائی کی تباہی

قول، عمل اور ارادوں کے سچے تھے، یا درۂ احد پر بیٹھنے والے صحابہ کے قول کو سنتا تھا، جب وہ وہاں سے غلطی سے ہٹ گئے، اور ان کی نیت کو جانتا تھا کہ بدنیت نہ تھے غلطی کر گئے، غرض یہ کلمہ یا اظہار کرم کے لئے ہے، یا اظہار عفو کے لئے (از روح البیان) إِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنكُمْ هَمَّتْ هَمٌّ سے بنا بمعنی غم، صدمہ، رنج، قلق، ارادہ قلبی، خیال، اسی لئے مشکل کام کو مہم یا اہم کہتے ہیں، کہ وہ انسان کو فکر و غم میں ڈال دیتا ہے، مضبوط ارادے کو ہمت کہا جاتا ہے، یہ إِذْ یا تُبَوِّئُ کا ظرف ہے یا غَدَوْتَ کا یا سَمِيعٌ عَلِيمٌ کا یا اُذْكُرْ فعل پوشیدہ کا (کبیر و معانی) طَائِفَتَانِ طَائِفَةٌ کا تثنیہ ہے جس کی تحقیق پہلے کی جا چکی ہے کہ یہ طوف بمعنی گھومنے سے ہے، اب قبیلہ و جماعت کو طائفہ کہا جاتا ہے، یہاں دو قبیلوں سے مراد خزرج کی جماعت بنو سلمہ ہے اور اوس کی جماعت بنو حارثہ، خیال رہے کہ یہاں هَمٌّ سے مطلقاً خیال مراد ہے نہ کہ ارادہ نہ غم، نہ صدمہ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ ۖ وَهَمَّ بِهَا (یوسف: ۲۴) هَمَّتْ بمعنی ارادہ ہے اور هم بمعنی خیال، یعنی تم مسلمانوں میں سے دو جماعتوں نے یوں ہی معمولی سا خیال کر لیا أَن تَفْشَلَا یہ جملہ هَمَّتْ کا مفعول ہے، تَفْشَلَا فشلٌ سے بنا بمعنی بزدلی والی کمزوری، ان مذکورہ دو جماعتوں میں منافقین کے لوٹ جانے پر کچھ کم ہمتی پیدا ہوئی، جس کا ذکر ان شاء اللہ آگے آ رہا ہے، وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا ولی کے بہت معانی ہیں، یہاں بمعنی مددگار دوست ہے، یعنی یہ جماعتیں اس ارادے یا خیال کی وجہ سے ہماری دوستی و حمایت سے نکل نہ گئیں ہم ان کے والی، وارث، ساتھی، مددگار و دوست ہیں، ان سے غلطی ہو گئی جو معاف کر دی گئی (ان غلطی والوں پر قربان) وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ یہ جملہ مستقل اور پہلے جملہ سے علیحدہ ہے عَلَى اللَّهِ کو فعل پر مقدم کرنے سے حصر کا فائدہ ہوا، تَوَكُّلٌ وَكْلٌ سے بنا بمعنی سونپنا، سپرد کرنا، یا بھروسہ کرنا، اسی سے ہے وکیل، جسے اپنا مقدمہ سپرد کر دیا جائے، اور ان پر بھروسہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ کو وکیل اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ سب کا متولی، والی، وارث ہے، اسی پر سب بندے بھروسہ کرتے ہیں، الْمُؤْمِنُونَ سے مراد یا تو سارے مسلمان ہیں یا تمام صحابہ کرام یا تمام غازیانِ احد، یا وہ دو جماعتیں جنہوں نے کم ہمتی کا ارادہ کر لیا تھا یعنی مسلمانوں کو خصوصاً غازیوں کو صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا چاہیے وہ کافی وافی ہے،

خلاصہ تفسیر

اے محبوب ﷺ آپ اپنے صحابہ اور ان کی معرفت تمام مسلمانوں کو جنگِ احد کا وہ واقعہ یاد دلا دیں، جبکہ آپ اپنی اہلیہ محترمہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس سے اسی لئے روانہ ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو جنگی مورچوں میں مناسب مقاعد پر جنگ کے لئے بٹھا دیں، اور وہ حضرات یہ مورچے سنبھال لیں، اللہ تعالیٰ آپ کی اور ان کی باتوں کو سنتا جانتا ہے، آپ کا ہر کلام و کام اور ان حضرات کے کلام و کام، نیت و ارادے ہمارے علم میں ہیں، ذرا ادھر بھی توجہ دلا دیں کہ اسی جنگِ احد کے موقعہ پر انصار کے قبیلہ خزرج و اوس کی دو جماعتوں بنو سلمہ اور بنو حارثہ کے دل میں بزدل ہو جانے کا خیال پیدا ہو گیا تھا، ان دونوں کا اللہ تعالیٰ دوست اور والی ناصر مددگار رہے، ان کی یہ غلطی معاف فرما دی گئی، ہمیشہ خیال رکھو، کہ بھروسہ والے مسلمانوں کو صرف اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے، وہ کافی ہے وافی ہے،

جنگ احد کا واقعہ

آپ حضرات تفسیر نعیمی جلد سوم میں قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ الخ (آل عمران: ۱۳) کے ماتحت جنگِ بدر کے بیان میں تو یہ پڑھ ہی چکے ہیں، کہ حضور ﷺ نے ۱۹ غزوں میں بنفسِ نفیس شرکت فرمائی، جن میں سے نو میں باقاعدہ معرکتہ الآراء جنگیں ہوئیں، بدر، احد، احزاب، بنی قریظہ، بنی مصطلق، خیبر، فتح مکہ، غزوۂ حنین، غزوہ طائف، ان باقاعدہ غزوں میں پہلا غزوہ بدر ہے جو ۱۷ رمضان جمعہ کے دن ۲ھ میں واقع ہوا، دوسرا غزوۂ احد ہے جو شوال ۳ھ میں ہوا، اس کا واقعہ بہت تفصیل چاہتا ہے، ہم بقدرِ ضرورت یہاں عرض کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ کفارِ قریش، جب جنگِ بدر میں شکست فاش کھا کر اور ستر کافر جن میں ابو جہل، امیہ ابن خلف عتبہ جیسے ۲۴ سردارانِ قریش قتل ہوئے، جب مکہ معظمہ پہنچے تو وہاں چین سے نہ بیٹھے، غزوۂ بدر سے پہلے ابو سفیان جو تجارتی مال مع منافع لائے تھے جس کی مقدار ایک ہزار اونٹ، ستر ہزار مثقال چاندی سونا تھی دار الندوہ میں رکھ کر میدانِ بدر میں پہنچ گئے تھے، وہاں سے واپسی پر کفارِ مکہ نے ابو سفیان سے مطالبہ کیا کہ اس سارے مال کو یا اس کے نفع کو لشکر پر خرچ کر کے ابھی سے دوسری جنگ کا انتظام کیا جائے، اور مدینہ کے مسلمانوں سے بدر کا بدلہ لیا جائے، چنانچہ عرب کے تیز زبان خطیب جن میں عمرو ابنِ عاص بھی شامل تھے سارے علاقہ میں گشت کر کے کفارِ عرب کو مسلمانوں کے مقابلہ میں صف آراء کرنے میں مشغول ہو گئے، مقتولینِ بدر کے نوحہ کے قصیدے لکھے گئے اور گانے والی عورتوں کو حفظ کرائے گئے، یہ عورتیں ان خطیبوں کے ساتھ گشت میں مشغول ہوئیں، جو عربی قبائل میں اس دردناک لہجہ سے گاتی تھیں کہ ان قبیلوں میں آگ لگا دیتی تھیں، ان گانے والیوں کا انتظام ابو سفیان کی بیوی ہند بنتِ عتبہ ابن ربیعہ نے کیا، ہند کا باپ عتبہ بدر میں حضرت امیر حمزہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا، غرض تھوڑے عرصہ میں تین ہزار جنگجو مردوں کا لشکر جن میں سات سو زرہ پوش تھے، اور تین ہزار اونٹ، دو سو گھوڑے تھے تیار ہو گیا، اس لشکر کے ساتھ پانچ سو عورتیں بھی تھیں تاکہ جوانوں کو لڑنے پر اکسائیں، اور دورانِ جنگ سپاہیوں کی خوراک و مرہم پٹی کا انتظام کریں، حضرت عباس ابن عبد المطلب نے جو اس وقت مکہ مکرمہ میں تھے خفیہ طور پر نبی کریم ﷺ کو کفار کی تیاریوں اور ان کے لشکر کی تعداد کی خبر دے دی، حضور انور ﷺ نے یہ خبر پاکر حضرت **خباب ابن منذر** کو جو عزم و رزم و بزم کے بڑے دھنی تھے حکم دیا کہ وہ اس خبر کی تحقیقات کریں، کچھ روز کے بعد حضرت خباب نے خبر دی کہ لشکرِ کفار جن کے سردار ابو سفیان ہیں اتنے سپاہیوں اور اتنے ساز و سامان کے ساتھ ذو الحلیفہ پہنچ چکا ہے جو مدینہ منورہ سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر ہے، یہاں پر شیخ عبد الحق نے مدارج النبوۃ شریف میں ایک عجیب واقعہ لکھا کہ یہ لشکرِ کفار جب مقام ابواء سے گذرا جہاں نبی کریم ﷺ کی والدۂ مطہرہ آمنہ خاتون کی قبر انور ہے تو انہوں نے چاہا کہ اس قبر اطہر کو اکھیڑ کر حضرت آمنہ کی لاش یا ہڈیاں اپنے ساتھ لے لیں تاکہ اگر اس جنگ میں ہمارے کچھ لوگ مسلمانوں کے قیدی ہو جائیں تو ہم ان سے کہہ سکیں کہ ہمارے قیدی ان ہڈیوں کے عوض چھوڑ دو اور ہم سے ان کی ہڈیاں یا لاش وصول کر لو، ابو سفیان نے اس رائے سے اتفاق نہ کیا، اور کہا کہ اگر تم نے یہ حرکت کی، تو بنو بکر اور بنو خزاعہ جو محمد (ﷺ) کے حلیف ہیں تمہارے مردوں کی

ساری قبریں اکھیڑ کر ہڈیاں باہر پھینک دیں گے، غرضکہ جب حضرت خباب نے یہ خبر سنائی، تو حضور انور ﷺ نے مہاجرین اور انصار کو جمع فرمایا، اور آج اس مجلس میں عبداللہ ابن ابی منافق کو بھی بلایا اور ان سے مشورہ کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے، عبداللہ ابن ابی اور کچھ صحابہ کرام کی رائے یہ ہوئی کہ ہم اس جنگ میں باہر نہ جائیں بلکہ مدینہ منورہ میں رہ کر دشمن کا مدافعانہ جواب دیں، کہ اگر وہ یہاں آ کر جنگ کرے گا تو ہم محفوظ جگہ میں ہوں گے، اور اگر مدینہ کا وہ محاصرہ کرے گا تو کچھ روز بعد پریشان ہو کر خود لوٹ جائے گا، خود حضور اکرم ﷺ کی رائے مبارک بھی یہی تھی، مگر حضرت حمزہ، سعد ابن عبادہ، مالک ابن سنان، (ابو سعید خدری کے والد) اور بہت سے جوشیلے نوجوانوں کی رائے باہر نکل کر جنگ کرنے کی ہوئی، چونکہ کثرات رائے اس جانب تھی، حضور انور ﷺ نے بھی اسی کو قبول فرمالیا، اور فرمایا ہم نے خواب دیکھی ہے کہ ہمارے سامنے کچھ گائیں ذبح کی جارہی ہیں، اور دیکھا کہ ہماری تلوار ٹوٹ گئی ہے مگر بعد میں پہلے سے بھی بہتر ہوگئی ہے، نیز دیکھا کہ ہمارے ہاتھ میں ایک مضبوط زرہ ہے، اور فرمایا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ اَللّٰهُمَّ بِكَ اَحُوْلُ وَبِكَ اَصُوْلُ، خیال رہے کہ حضور ﷺ کی تلوار کا نام ذوالفقار تھا جو پہلے منبہ ابن حجاج سہمی کی تھی بدر کی غنیمت میں آئی تھی، حضور انور ﷺ کے پاس رہتی تھی اور سرکار نے غزوۂ خندق میں امیر المومنین علی المرتضیٰ کو بخش دی تھی، چونکہ اس کے مختلف پرت تھے، اس لئے اسے ذوالفقار کہتے تھے، یعنی جوڑ و پرت والی تلوار، فقرہ بمعنی جوڑ، اسی تلوار کے متعلق حضور انور ﷺ نے یہ خواب دیکھا تھا (مدارج) ادھر بدھ کے دن چار شوال ۳ھ کو یا بقول مدارج جمعہ کے دن لشکر کفار احد شریف کے اس جانب بطن وادی کے میدانِ عقنین میں نازل ہوا، احد مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر جانب شمال ایک پہاڑ ہے، چونکہ یہ تمام پہاڑوں سے علیحدہ ہے، اس لئے اسے احد کہتے ہیں یعنی اکیلا، نبی کریم ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور لوگوں کو خبر دی اگر تم ثابت قدم رہے تو فتح انشاءاللہ تمہاری ہوگی، اور بعد نماز عصر حجرہ شریف میں تشریف لے گئے، حضرت صدیق و فاروق ساتھ تھے، ان دو بزرگوں نے حضور انور ﷺ کے سر مبارک پر عمامہ باندھا، زرہ پہنائی اور حضور انور ﷺ تلوار حمائل کئے، ہاتھ میں برچھا لئے، دو زرہیں زیبِ تن کئے، چمڑے کی پٹی کمر پر کسے ہوئے مجاہدانہ شان سے باہر تشریف لائے، یہاں صحابہ کی بڑی جماعت حضور انور ﷺ کی منتظر تھی، جب صحابہ کرام نے حضور انور ﷺ کو اس لباس میں دیکھا تو حیران رہ گئے، اور حضرت سعد ابن معاذ و اسید ابن حضیر نے تمام صحابہ کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) ہم سے بڑی گستاخی ہوگئی جو ہم نے آپ کی رائے کے خلاف رائے قائم کی، اب ہماری رائے بھی یہی ہے کہ مدینہ منورہ میں رہ کر ہی مدافعانہ جنگ کی جائے (مدارج) حضور انور ﷺ نے تبسم فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا، کہ اللہ کے نبی کی یہ شان نہیں کہ ہتھیار جنگ پہننے کے بعد بغیر جنگ کئے کھول دے، چلو اللہ پر توکل ہے (تفسیر کبیر) یہ تمام کام جمعہ کے دن بعد نمازِ جمعہ ہوئے،

لشکر کی بھرتی

حضور انور ﷺ نے ایک ہزار جانباز صحابہ کرام کا لشکر جمع فرمایا، عبداللہ ابن عمر، زید ابن ثابت، اسامہ ابن زید، زید ابن ارقم،

براء ابن عازب، ابوسعید خدری، سمرہ ابن جندب، رافع ابن خدیج وغیرہم چونکہ یہ بہت چھوٹے تھے انہیں واپس جانے کا حکم دیا، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) رافع ابن خدیج اگرچہ کمسن ہیں مگر غضب کے تیرانداز ہیں انہیں لشکر میں شامل کر لیا جائے، فرمایا منظور ہے، سمرہ ابن جندب نے عرض کیا، جب رافع کو بھرتی کر لیا گیا تو مجھے بھی کر لیا جائے، کیونکہ میں طاقت میں ان سے زیادہ ہوں، کشتی میں انہیں گرا سکتا ہوں، چنانچہ ان دونوں کمسنوں کی کشتی کرائی گئی، اور سمرہ نے رافع کو پچھاڑ لیا، یا رافع سوچی ہوئی تدبیر کے مطابق خود ہی پچھڑ گئے، تو انہیں بھی بھرتی کر لیا گیا، یہ واقعہ ہفتہ کی رات منزل شیخین میں پیش آیا، سرکار نے تین جھنڈے بنائے، مہاجرین کا جھنڈا بروایت مدارج النبوت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیا، اور بروایت تفسیر روح المعانی مصعب ابن عمیر کو عطا فرمایا، اور انصار میں سے اوس کا جھنڈا سعد ابن عبادہ کو اور خزرج کا خباب ابن منذر کو رحمت فرمایا، عبداللہ ابن ام مکتوم کو مدینہ منورہ کا خلیفہ بنایا اور جانب احد روانہ ہو گئے، میدانِ احد میں پہنچ کر لشکر کی ترتیب یوں کی کہ عبداللہ ابن جبیر کو مع پچاس سپاہیوں کے کوہ عینین (احد کا ایک حصہ) کے شگاف پر مقرر کیا جدھر سے خطرہ تھا کہ دشمن یہ شگاف عبور کر کے مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر دے، اور انہیں تاکید فرمائی کہ ہم فتح پائیں یا شکست، تم یہاں سے نہ ہٹنا جب تک کہ ہم تمہیں نہ بلائیں، عکاشہ ابن حصن اسدی کو میمنہ پر (صف کا داہنا حصہ) اور ابوسلمہ ابن عبدالاسد مخزومی کو میسرہ پر (بائیں جانب) ابوعبیدہ ابن جراح، سعد ابن ابی وقاص، مقدمہ پر، اور مقداد ابن عمر کو ساقہ پر مقرر کیا، مشرکین نے اپنی صفیں یوں مرتب کیں کہ خالد ابن ولید کو میمنہ میں، عکرمہ ابن ابوجہل کو میسرہ میں، صفوان ابن امیہ اور عمرو ابن عاص کو پہاڑ کے شگاف کی جانب، ابوسفیان کو قلب میں، اور عبداللہ ابن ربیعہ کو تیراندازوں میں مقرر کیا، طلحہ ابن طلحہ کو پرچم تھمایا، اس دن حضور انور ﷺ کے ہاتھ میں جو تلوار تھی اس پر یہ شعر کندہ تھا:

فِی الْجُبْنِ عَارٌ وَ فِی الْاِقْبَالِ مَکْرُمَةٌ   وَالْمَرْءُ بِالْجُبْنِ لَا یَنْجُوْا مِنَ الْقَدْرِ

یعنی بزدلی میں شرم ہے، بہادری میں عزت ہے، انسان بزدلی کر کے تقدیر سے نہیں بچ سکتا، سرکار نے فرمایا کون ہے جو اس تلوار کو تھامے اور اس کا حق ادا کرے، ابودجانہ اٹھے، عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا، لڑتے لڑتے ٹیڑھا کر دینا، آپ نے تلوار لے لی، اور اس کا حق ادا کر کے دکھلا دیا، کہ کفار کو مارتے ہوئے ابوسفیان کی زوجہ ہند تک پہنچ گئے، جو عورتوں کے ساتھ دف بجا کر مقتولینِ بدر کے مرثیے گا رہی تھیں اور سپاہیوں کو لڑنے مرنے پر ابھار رہی تھیں، ان پر تلوار اٹھائی، مگر ہند پکار اٹھی، میں عورت ہوں، اسلام میں عورتوں کو قتل نہیں کرتے، آپ نے چھوڑ دیا،

منافقین کی غداری اور بعض مسلمانوں کی گھبراہٹ

یہ تو عرض کیا جا چکا ہے کہ عبداللہ ابن ابی کی رائے مدینہ میں رہ کر جنگ کرنے کی تھی جو کثرت رائے کے مقابل فیل ہو گئی اسے اس کا غصہ تھا، دوسرا واقعہ یہ ہو گیا کہ ابن ابی کے حلیف یہودی احد میں مسلمانوں کی امداد کو حاضر ہوئے، تو حضور ﷺ نے انہیں دیکھ کر فرمایا کہ ہم کو کفار کے مقابل کفار کی مدد نہیں چاہیے، تم واپس جاؤ، یہ لوگ چلے گئے، اس پر یہ منافق اور بھی بھن گیا

اور اسی کے زیر سایہ اٹھے گا۔ (از ابن عربی)

دوسری تفسیر

سود خور بھوکے کتے کی طرح دنیا کا حریص ہے کہ کھاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھول جاتا ہے۔ جس سے اسے چلنا پھرنا مشکل ہوتا ہے۔ قیامت میں اس کا ظہور ہوگا۔ عاقل وہ غذا نہیں کھاتا جو ہضم نہ کر سکے۔ سود وہ ثقیل غذا ہے جسے مومن کا معدہ برداشت نہیں کر سکتا۔ صوفیائے کرام شبہ سود سے بھی بچتے ہیں۔ **حکایت:** امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک شخص پر کچھ سیاہ درہم قرض تھے۔ وہ سفید درم لایا۔ آپ نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور فرمایا کہ خوف کرتا ہوں کہ درموں کی یہ سفیدی سود نہ ہو جائے۔ اس سے کالے ہی درم وصول کیے۔ امام ابو بکر فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ کو دیکھا کہ ایک شخص کے دروازہ پر کھڑے ہیں سخت دھوپ ہے مگر کواڑ بچا کر دھوپ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ دیوار کے سایہ میں کیوں نہیں کھڑے ہوتے۔ آپ نے فرمایا کہ اس گھر والے پر میرا قرض ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی دیوار کا سایہ سود میں شمار ہو جائے۔ حضرت بایزید بسطامی نے ہمدان شہر سے کچھ غلہ خریدا۔ جب لوٹ کر بسطام آئے تو اس میں دو چیونٹیاں پائیں۔ پھر لوٹ کر ہمدان شہر گئے اور چیونٹیاں اسی دوکان پر چھوڑ آئے۔ یہ وہ تقویٰ ہے۔ جس کی برکت سے زمین و آسمان قائم ہیں۔ (از روح البیان)

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾
مٹاتا ہے اللہ سود کو اور بڑھاتا ہے خیراتوں کو اور اللہ نہیں پسند کرتا ہر کفر کرنے والے گنہگار کو تحقیق
اللہ ہلاک کرتا ہے سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو اور اللہ کو پسند نہیں آتا کوئی ناشکرا بڑا گنہگار بیشک
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ
وہ لوگ جو ایمان لائے اور کام کیے انہوں نے اچھے اور قائم کیا نماز کو اور دیا زکوٰۃ کو واسطے ان کے
وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی ان کا
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾
ثواب ہے ان کا نزدیک رب ان کے اور نہیں ہے ڈر اوپر ان کے اور نہ وہ غمگین ہوں گے
نیگ ان کے رب کے پاس ہے اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو نہ کچھ غم

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اس سے پہلے اولاً خیرات کی رغبت دی گئی تھی اور پھر سود سے ڈرایا گیا تھا۔ اب ان دونوں کو اسی ایک آیت میں جمع فرما کر سود کی برائی اور صدقہ کی خوبیاں بیان ہو رہی ہیں۔ گویا یہ اجمال کے بعد تفصیل ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں صدقات کے شرعی فائدے اور سود کے شرعی نقصان بیان

اور گانے کے سر پیٹتی روتی چیختی بھاگیں، مسلمان ان کا پیچھا کرتے بہت دور تک انہیں لے گئے، صحابہ کرام فرمانے لگے کہ گویا میدانِ احد سے ہم اب کفار کو بدحواسی میں بھاگتے دیکھ رہے ہیں، غرضکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو شاندار غلبہ عطا فرمایا اور کفار میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے۔

اچانک نقشۂ جنگ کا رخ بدل گیا

عبداللہ ابن جبیر کے پچاس ساتھیوں نے جو درۂ پہاڑ پر متعین تھے جن سے فرمایا گیا تھا کہ درہ نہ چھوڑنا، جب کفار کو بھاگتے اور مسلمانوں کو بھگاتے، مالِ غنیمت حاصل کرتے دیکھا تو یہ بھی درہ سے نکل کھڑے ہوئے تا کہ مالِ غنیمت حاصل کرنے میں فاتح مسلمانوں کا ہاتھ بٹائیں، حضرت عبداللہ ابن جبیر نے بہت کچھ سمجھایا کہ درہ نہ چھوڑو، سرکار نے منع فرمایا ہے، مگر وہ کہنے لگے کہ فتح تو ہو چکی، مقصد حاصل ہو گیا، شعر

ہوئی فضلِ خدا سے ہم کو حاصل آج فیروزی کریں مالِ غنیمت سے نہ کیوں اب بہرہ اندوزی

غرضکہ حضرت ابن جبیر اور ان کے ساتھ سات صحابہ رہ گئے باقی تمام نے یہ درہ چھوڑ دیا، ادھر خالد بن ولید نے درہ خالی دیکھا، عکرمہ ابن ابوجہل اور دوسرے کفار کے ساتھ اسی درہ پر دھاوا بول دیا، یہ آٹھ حضرات جو درہ پر تھے شہید ہو گئے، اور مسلمانوں کی پشت سے خالد ابن ولید کا حملہ ہو گیا، اس اچانک حملہ سے جیتی ہوئی جنگ کا نقشہ بدل گیا، اس سراسیمگی کی حالت میں کچھ مسلمان تو بھاگ اٹھے کچھ آپس ہی میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے، حتیٰ کہ حضرت حذیفہ کے والد یمان کو مسلمانوں نے ہی مار دیا، حضرت حذیفہ چیختے ہی رہے کہ یہ میرے والد ہیں، یہ تو مسلمان ہیں مگر اس شور میں کون سنتا، تمام کے قدم اکھڑ گئے، حضور انور ﷺ اور آپ کے ساتھ آٹھ مہاجر سات انصار جو آپ کے ساتھ تھے اپنے مقام پر جمے رہے مہاجرین میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت علی المرتضیٰ اور عبدالرحمٰن بن عوف، سعد ابن ابی وقاص، زبیر ابن عوام، طلحہ ابن عبداللہ، ابوعبیدہ ابن جراح رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین تھے، اور انصار میں سے خباب ابن منذر، ابودجانہ، عاصم ابن ثابت، سہل ابن حنیف، اسید ابن حضیر، سعد ابن معاذ، حارث ابن صمہ تھے، غرضکہ مسلمان چار گروہ میں بٹ گئے، کچھ تو جمے رہے اور شہید ہو گئے، کچھ پہاڑوں، غاروں میں چھپ گئے، کچھ کے قدم اکھڑ گئے اور مدینہ منورہ چلے گئے، حضرت عثمان اس تیسرے گروہ میں تھے، اور کچھ حضور انور ﷺ کے ہمراہ رہے، حضرت ابوبکر و عمر اور علی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اس چوتھے گروہ میں تھے، (مدارج) اس جماعت پر کفار نے سخت یلغار کی، حتیٰ کہ ایک بدبخت کا پتھر حضور انور ﷺ کے سر مبارک پر پڑا، دوسرے کا پتھر دندان مبارک پر لگا، جس سے خود ٹوٹ کر اس کی کچھ کڑیاں سر شریف میں گڑھ گئیں اور ایک دانت مبارک کا کنگرہ شہید ہو گیا، سر اور منہ سے خون جاری ہو گیا، اور آپ ایک غار میں آ گئے، کفار نے شور مچا دیا اَلَانَ قُتِلَ مُحَمَّدٌ یعنی محمد (ﷺ) شہید کر دیئے گئے، جس سے مدینہ منورہ میں کہرام مچ گیا۔ وہاں کے مرد و زن جن میں حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی تھیں احد شریف پہنچے، حضور انور ﷺ کو زندہ پا کر خدا کا شکر بجالائے،

ہے) یہاں کفار سے اڑیل کافر مراد ہے اہل عرب ہر ہٹ دھرم پر یہ صیغہ بولتے ہیں جیسے فَعَّالُ الْخَیْرِ یَا مَنَّاعُ لِلْخَیْرِ کفر سے یا اصطلاحی کفر مراد ہے یعنی بے ایمانی' یا لغوی کفر یعنی ناشکری' اَثِیْمٍ اَثْمٌ کا مبالغہ کا صیغہ ہے بمعنی گناہ' اس سے بھی دائمی گنہگار مراد ہے یعنی اللہ ہر اڑیل کافر اور دائمی گنہگار سے راضی نہیں ہوتا اور اللہ ہر ناشکرے گنہگار سے ناراض ہے۔ مردودین کے ذکر کے بعد اب مقبولین کا تذکرہ ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ایمان کے معنی اور اس کی لغوی تحقیق پہلے سیپارہ میں ہو چکی۔ اٰمَنُوْا کا متعلق پوشیدہ ہے یعنی وہ لوگ کہ ان ساری چیزوں پر ایمان لائے۔ جن پر ایمان لانا ضروری ہے چونکہ ایمان اعمال صالح پر مقدم ہے کہ یہ مثل شرط ہے۔ نیز ایمان لڑکپن ہی سے ملتا ہے کہ بچے کے کان میں پیدا ہوتے ہی اذان دیتے ہیں اور نا سمجھی سے ہی اسے ایمان سکھاتے ہیں۔ اعمال ہوش سنبھالنے کے بعد سکھائے جاتے ہیں اور بعد بلوغ لازم ہوتے ہیں۔ نیز عالم ارواح میں ایمان عطا ہو گیا تھا۔ مگر اعمال دنیا میں آ کر پیش ہوئے۔ ان وجوہ سے ایمان کو اعمال سے پہلے بیان فرمایا۔ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ اور انہوں نے نیکیاں کیں الصّٰلِحٰتِ میں الف لام جنسی ہے یا استغراقی۔ اس سے بقدر طاقت نیکیاں مراد ہیں۔ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوةَ۔ اَقَامُوْا۔ اِقَامَةٌ سے بنا بمعنی سیدھا کرنا اور درست رکھنا' یہاں نماز پر پابندی کرنا اسے صحیح طریقہ پر مستحبات و واجبات کے ساتھ ادا کرنا مراد ہے اور زکوٰۃ سے صدقہ فرضی مقصود' خواہ روپیہ پیسہ کا صدقہ ہو یا دیگر مال کا' اگرچہ نیکیوں میں نماز اور زکوٰۃ بھی داخل تھی مگر اظہار عظمت کے لئے ان کا ذکر علیحدہ بھی کیا گیا کیونکہ نماز بدنی اور زکوٰۃ مالی اطاعت میں افضل عمل ہے۔ یعنی انہوں نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی۔ زکوٰۃ کے معنی ہیں بڑھا ہوا یا پاکیزگی' چونکہ زکوٰۃ دینے سے مال بڑھتا ہے اور اس کی برکت سے بقیہ مال پاک ہو جاتا ہے اس لئے اسے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ جیسے انگور کی بیل کاٹ دینے سے پھل زیادہ آتے ہیں یا ذبح میں خون نکل جانے سے گوشت چربی وغیرہ سب پاک ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی زکوٰۃ نکالنے سے مال میں زیادتی بھی ہو جاتی ہے اور پاکی بھی شعر۔

زکوٰۃ مال بدر کن کرد ابدر ذرا　　　چو باغ بان بدرد بیشتر دہد انگور

لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ لَهُمْ کے مقدم کرنے سے حصر کا فائدہ ہوا۔ اجر طے شدہ معاوضہ کو کہتے ہیں جیسے اجرۃ۔ یہاں ثواب اعمال مراد ہے جس کا مسلمانوں سے وعدہ کر لیا گیا۔ یعنی ان کا ثواب ان کے رب کے نزدیک محفوظ ہے۔ جس کے مارے جانے کا خوف ہی نہیں۔ اس کے سوا۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ آئندہ اندیشہ کو خوف اور گزشتہ کے رنج و غم کو حزن کہتے ہیں۔ یہ یا دنیا میں ہے یا آخرت میں ہو گا یعنی نیک کار کو نہ دنیا میں اپنی بربادی کا خوف ہو اور نہ گذشتہ پر غم' یا نیک کار بروز قیامت اگلے اندیشہ اور پچھلے غم سے بے کھٹک ہو گا۔

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ دنیا میں سودی مال کو برباد کرتا ہے۔ اور جس مال سے زکوٰۃ نکالی جائے اسے بڑھاتا ہے کیونکہ اکثر سود خوار کا انجام فقر ہے۔ سود خوار کو لوگ برا جانتے ہیں اسے کوئی امین سمجھ کر اپنی امانت نہیں سونپتا۔ اسے ہر ایک فاجر و فاسق کہتا ہے۔ وہ فقراء اور غرباء جو اس کے ہاتھوں تباہ ہوئے۔ دن رات اس پر لعنت کرتے' بددعا دیتے ہیں اور اس کے مال پر ہر ظالم و چور دست درازی کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ پیسہ اس کی محنت کا جمع کیا ہوا نہیں۔ مگر سخی کے مال میں بہت برکت ہوتی ہے کیونکہ وہ

جب اللہ کے بندوں کی پرورش کرتا ہے تو رب تعالیٰ ضرور اس پر کرم فرماتا ہے روزانہ اس کی عزت بڑھتی ہے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ دل اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ فقراء اور مساکین اس کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں اور ایسے آدمی کے مال پر ظالم اور چور نظر کم کرتے ہیں یا اللہ تعالیٰ آخرت میں سود خوار کو ہلاک کرے گا کہ اس کا صدقہ' حج' جہاد' صلہ رحمی سب برباد ہوگا کیونکہ اس نے ساری نیکیاں سودی پیسہ سے کیں۔ خراب تخم سے پھل بھی خراب ہوتے ہیں۔ اس کا مال نہ اسے موت کے وقت کام آئے نہ بعد موت' جب حلال مال جمع کرنے والے امراء پانچ سو برس بعد جنت میں جائیں گے تو اس حرام خوار غنی کا کیا پوچھنا۔ رہا سخی تو اللہ اس کے صدقے قبول فرمائے گا۔ اسے بڑھائے گا۔ اس کے صدقات جاریہ سے بعد موت بھی اسے ثواب ملتا رہے گا۔ رب تعالیٰ کسی ناشکرے گنہگار یا کسی اڑیل کافر اور ضدی گنہگار سے راضی نہیں لہٰذا سود کو حلال جاننے والا کافر یا سود خوار مجرم بارگاہ الٰہی کا مجرم ہے اور جو ایمان لائے اور انہوں نے بقدر طاقت نیکیاں کیں۔ خصوصاً نماز کے پابند رہے' زکوٰۃ دیتے رہے۔ ان کا ثواب ان کے رب کے نزدیک محفوظ ہے جو نہ گھٹے نہ برباد ہو نہ انہیں دنیا میں آئندہ کا خطرہ ہو اور نہ گذشتہ کا غم یا آخرت میں ان پر کوئی خطرہ واقع ہونے والا نہیں اور نہ وہ کسی مقصود کے فوت ہو جانے سے مغموم ہوں گے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حلال میں برکت ہے' حرام میں بے برکتی سود خوار اگرچہ مالدار ہو جائے مگر برکت سے محروم ہے کتیا سال میں چھ بچے دیتی ہے اور کوئی ذبح نہیں ہوتا۔ بکری' گائے بھینس سال میں ایک یا دو بچے دیتی ہیں اور روزانہ ہزاروں ذبح ہوتی ہیں مگر ریوڑ بکری اور گائے بھینس کے نکلتے ہیں نہ کہ کتے کے' کیونکہ وہ حلال ہیں' اور یہ حرام' خیال رہے کہ کثرت و برکت میں فرق ہے۔ کثرت کے معنی ہیں زیادتی' برکت کے معنی جم جانا نہ نکلنا تھوڑی سی نعمت مبارک ہو تو بہت فائدہ دیتی ہے۔ برکت والی تھوڑی بارش رحمت ہے اور کثرت کی بارش کبھی عذاب بھی بن جاتی ہے یوں یہ سود سے اگرچہ کبھی مال کی کثرت ہو جاتی ہے اور یہ کثرت بھی باعثِ عذاب ہوتی ہے مگر اس سے برکت مٹ جاتی ہے۔ لہٰذا یہ آیت بالکل برحق ہے۔ **دوسرا فائدہ:** جس چیز میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہو اسے شریعت منع کر دیتی ہے۔ دیکھو سود میں کچھ منافع بھی ہیں مگر نقصان زیادہ لہٰذا حرام کر دیا گیا۔ شراب اور جوئے کے بارے میں رب فرماتا ہے وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ (بقرہ: ۲۱۹) **تیسرا فائدہ:** کوئی مسلمان خیرات سے غریب نہیں ہو سکتا اور سود سے مالدار نہیں ہوتا۔ دیکھا گیا ہے کہ سود خوار کی اولاد سودی مال سے نفع کم اٹھاتی ہے۔ اس کا انجام خواری و بربادی ہے (روح البیان) دیکھا گیا ہے کہ مسلمان اگر جوئے میں کبھی جیت بھی جائے تو یہ جوے کا جیتا ہوا اس کا اپنا اصلی مال لے آتا ہے کہ پھر جواری کی ہمت بڑھ جاتی ہے۔ زیادہ جواء کھیلتا ہے اور بہت سا مال ہار جاتا ہے جیسا کہ بارہا کا تجربہ ہے۔ **چوتھا فائدہ:** کامیابی کیلئے ایمان و اعمال دونوں ضروری ہیں۔ جیسا کہ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** مسلمان کو نیکیوں کا بدلہ آخرت میں ملے گا کہ دنیا میں کچھ نفع پہنچ جائے تو یہ اجر نہیں بلکہ رب کا فضل ہے جیسا کہ عِنْدَ رَبِّهِمْ سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** اعمال ایمان میں داخل نہیں کیونکہ یہاں عمل کا ایمان پر عطف کیا

حضرت سعد ابن ابی وقاص

آپ تیراندازی میں مشہور تھے، حضور انور ﷺ آپ سے فرماتے تھے ارم فداک ابی و امی اے سعد تجھ پر میرے ماں باپ قربان خوب تیر چلا، مالک ابن زبیر کافر کے ہاتھوں بہت مسلمان شہید و زخمی ہوئے تھے، آپ نے تاک کر اس کی آنکھ پر تیر مارا، جو سر سے پار ہو گیا اور جہنم رسید ہو گیا، حضور انور ﷺ نے دعا دی کہ اے سعد اللہ تمہیں مقبول الدعا بنائے، چنانچہ آپ ایسے مقبول الدعا تھے کہ صحابہ آپ سے دعا کرانے آتے تھے، آخر میں نابینا ہو گئے تھے، کبھی اپنے لئے دعا نہ فرمائی، کہتے تھے یار کا ہدیہ مجھے قبول ہے،

حضرت ابوطلحہ انصاری

آپ احد کے دن حضور انور ﷺ کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہو گئے تھے اور عرض کرتے تھے کہ یارسول اللہ رب تعالیٰ میرے جسم و جان کو آپ کے لئے ڈھال بنا دے، آپ کمال کے تیرانداز تھے، حضور انور ﷺ آپ کو لکڑیاں اٹھا کر دیتے تھے، جب آپ کمان میں لگاتے، تو وہ لکڑی تیر بن جاتی تھی کہ وہ آپ دشمن پر چلاتے تھے، حضور انور ﷺ نے آپ کو کھجور کی شاخ دی جو آپ کے ہاتھ میں پہنچتے ہی تلوار بن گئی، جیسے کہ بدر کے دن حضرت عکاشہ کے ہاتھ میں لکڑی تلوار ہو گئی تھی، چنانچہ اس تلوار کا نام عرجون تھا، یہ شمشیرِ عرجون معتصم باللہ نے دو سو دینار میں خریدی،

حضرت حنظلہ

جنگِ احد سے ایک دن پہلے آپ کی شادی ہوئی، آج شبِ زفاف تھی، آپ صبح کے وقت غسل کی تیاری کر رہے تھے، بعض روایات میں ہے کہ سر کا ایک حصہ دھو بھی لیا تھا کہ اچانک صحابہ کی تنگ حالت کا آپ کو پتہ چلا، بعض روایات میں ہے کہ آپ نے غیبی آواز سنی یَا غَسِیْلَ اللّٰهِ اِرْکَبْ بے قرار ہو کر اسی حال میں احد کی جانب روانہ ہو گئے، تلوار لے کر کفار پر ٹوٹ پڑے، بہت سوں کو جہنم واصل کر کے شہید ہو گئے، جنگ کے بعد جب شہداء کی لاشیں جمع کی گئیں تو آپ کی لاش مبارک سے پانی ٹپک رہا تھا، آپ کی زوجہ جمیلہ سے پوچھا گیا، انہوں نے فرمایا کہ یہ جنابت کی حالت میں تھے، حضور انور ﷺ نے فرمایا، انہیں جبریل و میکائیل نے دوسرے فرشتوں کے ساتھ (علیہم السلام) کوثر کے پانی سے غسل دیا ہے، یہ وہی پانی ٹپک رہا ہے، اسی دن سے آپ کا لقب غسیل الملائکہ ہوا، اسی حدیث کی بنا پر ہمارے امام صاحب فرماتے ہیں کہ جنبی شہید کو غسل دیا جائے گا، آپ کی بیوی کا نام جمیلہ ہے، آپ عبداللہ ابن ابی منافق کی سگی بہن تھیں فرماتی ہیں کہ میں نے اسی رات حضرت حنظلہ کی روانگی سے پہلے خواب دیکھا کہ آسمان میں شگاف ہو گیا حنظلہ اس میں غائب ہو گئے، پھر شگاف بند ہو گیا، میں سمجھ گئی، کہ یہ میرے پاس سے شہید ہونے چل دیئے، چونکہ ایک شب کی بیاہی تھی شرم سے زیادہ بات بھی نہ کر سکی کسی شاعر نے یہ پورا

اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ اعمال سے بقدر طاقت اعمال مراد ہیں یا یہ کہ اس مجموعہ میں سے ہر ایک ثواب کا سبب ہے نہ کہ پورا مجموعہ (کبیر) خیال رہے کہ اسلام میں پہلے صرف ایمان ہی فرض ہوا ظہور نبوت سے گیارہ سال تک کوئی حکم شرعی مسلمانوں پر نہ آیا۔ گیارہویں سال معراج میں صرف نماز آئی پھر بعد ہجرت زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بہت آہستگی سے آئے۔ اس عرصہ میں نجات وبخشش حصول جنت کے لئے صرف ایمان ہی کافی تھا۔ پھر اعمال آتے گئے اور مسلمانوں پر لازم ہوتے گئے۔ اب بھی غریب کی نجات صرف بدنی عبادات سے ہے۔ امیر کی نجات بدنی و مالی دونوں عبادات سے جن میں جہاد کی طاقت ہو۔ ان کی نجات جہاد سے ہے وغیرہ وغیرہ۔ **چوتھا اعتراض:** اس کی کیا وجہ ہے کہ دوسرے صدقات کے لئے اَنْفِقُوْا یَا یُنْفِقُوْنَ ارشاد ہوتا ہے بمعنی خرچ کرنا مگر زکوٰۃ کے لئے آتُوْ یا یوتون فرمایا جاتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ **جواب:** اس لئے کہ دیگر صدقات میں صرف خرچ کر دینا کافی ہے جیسا بھی ہو مگر زکوٰۃ دینا یعنی فقیر کو مالک کر دینا ضروری ہے۔ دینا بغیر لینے کے نہیں پایا جاتا۔ اس لئے زکوٰۃ کے لئے یُؤْتُوْنَ ارشاد ہوتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

نفع ونقصان نتیجے کے اعتبار سے ہے۔ سودی مال چونکہ رب کی مخالفت سے حاصل ہوا۔ لہٰذا اس کا انجام نقصان ہے چونکہ سود خوار سارے گناہ کرتا ہے لہٰذا اس کی سزا سب گناہوں سے بڑھ کر' کیونکہ جیسی غذا' ویسا نتیجہ حرام غذا سے حرام فعل صادر ہوتے ہیں۔ مکروہ غذا سے مکروہ فعل' مباح غذا سے مباح افعال' بہتر غذا سے' بہترین اعمال کی توفیق ملتی ہے لہٰذا سود خوار پر سود کا گناہ بھی ہے' اور ان حرام افعال کا بھی' جو سود کھانے سے پیدا ہوئے' حدیث شریف میں ہے کہ پچھلا گناہ اگلے گناہ کی سزا ہوتا ہے اور اس کے بڑے نتائج بڑھتے رہتے ہیں۔ سود خوار اپنے مال کا نتیجہ نہ زندگی میں دیکھے نہ قبر میں' نہ آخرت میں' مگر صدقہ اس باغ کی طرح ہے' جس کے پھل ہمیشہ کھائے جائیں اور اس کی جڑ ہمیشہ محفوظ رہے۔ یہ بھی معنے ہیں سود کی بربادی اور صدقہ کی برکت کے سخی کا مال' اس کی اولاد اور مسلمانوں میں باقی رہتا ہے۔ اس کی مسجدوں میں نمازیں ہوتی ہیں۔ اس کی سراؤں میں مسافر آرام پاتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے مال کا پھل' زندگی' قبر اور حشر میں پاتا ہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اپنی غذا سنبھالو تا کہ سارے اعمال سنبھل جائیں (از ابن عربی) صوفیاء فرماتے ہیں کہ جنت اور وہاں کی نعمتیں ہمارے اعمال کی جزا مگر دیدار الٰہی کسی عمل کا بدلہ نہیں بلکہ محض رب تعالیٰ کا فضل ہے اور جیسے تخم اچھی زمین میں بو دو تو پھل اعلیٰ پیدا ہوتا ہے۔ ایسے ہی زکوٰۃ وغیرہ کا اجر عند اللہ یعنی اللہ کے نزدیک ہے اس کا پھل بھی بہت زیادہ اور جیسے سرکاری بنک میں مال ضائع نہیں ہوتا۔ ایسے ہی رب کے بنک کا جمع شدہ مال برباد نہیں ہوتا۔ مال ہو یا اعمال جزاء کا استحقاق از روئے قانون اس کو ہے جو عمل کرے بغیر عمل جزا کی امید خیال خام ہے۔ تخم بو کر کاٹنے کی امید کرو۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۷۸﴾
اے وہ لوگو جو ایمان لائے ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو وہ جو باقی رہ گیا سود سے اگر ہو تم ایمان لانے والے
اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود اگر مسلمان ہو

جیسی دوسری آئتیں ہیں، **دوسرا فائدہ:** حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مومنہ، متقیہ اور صالحہ ہیں، اور نبی کریم ﷺ کی اہل بیت، رب تعالیٰ نے انہیں یہاں من اھلک فرمایا، اور کافر اولاد اور کافر بیوی نبی کے اہل بیت نہیں ہوتے، رب تعالیٰ نے نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ان کے بیٹے کنعان کے متعلق فرمایا اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ (ہود: ۴۶) اور لوط علیہ السلام سے ان کی کافرہ بیوی کے متعلق فرمایا اِلَّا امْرَاَتَكَ (ہود: ۸۱) قرآن کریم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حضور ﷺ کی اہل بیت فرما کر ان کے ایمان وتقویٰ سب کی گواہی دے دی، خیال رہے کہ قرآن کریم میں صرف بیوی کو اہل بیت کہا جاتا ہے، چنانچہ یہاں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حضور انور ﷺ کا اہل بیت کہا گیا، دوسری جگہ ارشاد ہوا قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْا (قصص: ۲۹) موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی بیوی سے فرمایا، یہاں ٹھہرو، ایک جگہ فرماتا ہے کہ فرشتوں نے ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ سے کہا رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ (ہود: ۷۳) **تیسرا فائدہ:** اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کو دنیاوی علوم بھی سارے عطا فرمائے جیسا کہ تُبَوِّئُ الخ سے معلوم ہوا، حضور انور ﷺ ہی نماز کی امامت فرماتے تھے، دین کی تعلیم دیتے تھے، جھگڑوں کے فیصلے کرتے تھے، میدانِ جہاد میں اعلیٰ درجہ کے جرنیل یا کمانڈر کا کام کرتے تھے، سپاہیوں کو مورچوں پر جمانا، میدانِ جنگ کا نقشہ، خطرناک دروں کو سنبھالنا، یہ تمام کام بذاتِ خود انجام دیتے تھے، **چوتھا فائدہ:** غزوۂ احد میں شریک ہونے والے تمام صحابہ مخلص مومن تھے، اور ایمان پر ان کا خاتمہ ہوا، دیکھو رب تعالیٰ نے انہیں مومنین فرمایا، اگر ان کا ایمان آئندہ بھی مشکوک ہوتا تو علام الغیوب انہیں ہرگز مومن نہ فرماتا، جو شخص ان میں سے کسی کے ایمان میں شک کرے، وہ اس آیت کا منکر ہے، جنگِ احد میں کوئی منافق وکافر شریک نہ ہوا، تین سو منافقین جو مدینہ منورہ سے لشکرِ اسلام کے ساتھ چلے تھے وہ جنگ سے پہلے ہی مخلصین سے چھٹ کر لوٹ گئے، ایسے ہی بیعت الرضوان میں کوئی منافق یا کافر شریک نہ ہوا، **پانچواں فائدہ:** خیالِ گناہ، گناہ نہیں اور نہ اس سے کوئی شخص مجرم ہوسکتا ہے، دیکھو بنی سلمہ اور بنی حارث نے بھاگ جانے کا قصد کیا تھا مگر رب تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ (آل عمران: ۱۲۲) اے مسلمانو وہ دونوں تمہاری ہی جماعتیں ہیں، اور فرمایا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا (آل عمران: ۱۲۲) اللہ ان دونوں کا والی وارث ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ مومن ہی کا والی ہے نہ کہ کفار کا، اب جو انہیں برا کہے وہ اس آیت کا منکر ہے، **چھٹا فائدہ:** خطاء اجتہادی معاف ہے اگرچہ کتنی ہی سخت ہو اور اس کا نتیجہ کتنا ہی خطرناک ہو، دیکھو احد میں درہ والے مسلمانوں کی غلطی سے کتنا نقصان ہوا کہ خود حضور انور ﷺ بھی زخمی ہوگئے، مگر رب تعالیٰ نے ان غلطی کرنے والوں کو بھی مومنین ہی فرمایا اور ان پر کسی قسم کا عتاب نہ کیا، کیونکہ انہوں نے حضور انور ﷺ کے فرمانِ عالی کا مطلب سمجھنے میں غلطی کی، وہ سمجھے کہ فتح تو ہو ہی چکی ٹھہرنے کی علت جاتی رہی، ہمارے لئے اب یہاں سے ہٹ جانا جائز ہوگیا، یہی مجتہدین کہا کرتے ہیں، اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو ائمہ مجتہدین پر کیچڑ اچھالتے ہیں، یا صحابہ کرام پر ان کی جنگوں کے باعث تبرہ کرتے ہیں، **ساتواں فائدہ:** جہاد کے وقت غنیمت پر ہرگز نظر نہ کی جائے بلکہ دشمن کا مقابلہ ڈٹ کر کیا جائے، ورنہ مسلمان نقصان اٹھائیں گے، دیکھو جنگِ احد میں درہ والے صحابہ نے غنیمت کے لئے درہ

چھوڑا تو جنگ کا نقشہ بدل گیا، **آٹھواں فائدہ:** غزوۂ احد میں مسلمانوں کو شکست ہرگز نہ ہوئی، کچھ سپاہیوں کے بھاگ جانے سے شکست نہیں ہوا کرتی، شکست ہوتی ہے سپہ سالار کے بھاگنے سے، حضور انور ﷺ اپنے مقام سے ایک انچ بھی نہ ہٹے، پھر شکست کیسی؟ علماء فرماتے ہیں جو کہے کہ احد میں مسلمان ہار گئے، وہ توبہ کرے، اگر نہ کرے، تو حاکم اسلام اس کو سزا دے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے (مدارج) ہوا یہ کہ کفار موقعہ پا کر چوروں کی طرح پیچھے سے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے، کچھ کو شہید و زخمی کر کے بھاگ گئے، جب حضور انور ﷺ کے گرد مسلمان پھر جمع ہو گئے، تو کفار میں وہاں ٹھہرنے کی بھی ہمت نہ رہی، اگر انہوں نے فتح پائی ہوتی تو کچھ علاقہ پر قبضہ کرتے، وہاں رہ کر جشن اور رنگ رلیاں مناتے، جیسا کہ اس زمانہ میں فاتحین کیا کرتے تھے لہٰذا حق یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہرگز شکست نہ کھائی، ہاں اپنی غلطی سے کچھ تکلیف اٹھائی،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضور انور ﷺ کی گھر سے روانگی صبح کے وقت ہے کہ ارشاد ہوا اِذْ غَدَوْتَ غدوٌ صبح کے جانے کو کہتے ہیں مگر تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے نماز جمعہ کے بعد ہتھیار پہنے اور روانہ ہوئے، **جواب:** یہاں غدوت میں تجرید ہے، صرف روانگی کے معنی ہیں، جیسے کہ کبھی اَصْبَحَ، ظَلَّ، بَاتَ، صرف صَارَ کے معنی میں آتے ہیں، رات یا صبح کے معنی سے خالی ہو جاتے ہیں، **دوسرا اعتراض:** یہاں مِنْ اَھْلِكَ کیوں فرمایا گیا مِنْ بَیْتِکَ یا مِنْ بَلَدِکَ فرمانا زیادہ مناسب ہوتا، کیونکہ انسان گھر سے جاتا ہے نہ کہ گھر والوں سے، **جواب:** تاکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان کے حجرہ کی عظمت ظاہر ہو کر یہ وہ حجرہ ہے جہاں سے اس غزوہ کے سفر کی ابتداء ہوئی، اور جنابِ عائشہ کی وہ ذاتِ گرامی ہے کہ حضور انور ﷺ ان کے پاس سے روانہ ہوئے، رب تعالیٰ نے سفرِ معراج کی ابتداء مسجد حرام سے بیان فرمائی تاکہ اس مسجد کی عظمت کو چار چاند لگ جائیں، **تیسرا اعتراض:** غزوہ سے بھاگ جانا گناہ کبیرہ ہے، جیسے زنا وغیرہ، اور گناہ کبیرہ کرنے والا فاسق ہے، تو جو حضرات صحابہ جنگِ احد سے بھاگ گئے وہ فاسق ہوئے، نیز جب تم عبداللہ ابن ابی منافق اور اس کے تین سو ساتھیوں کو اس لئے فاسق کہتے ہو کہ وہ جنگِ احد سے پیٹھ دکھا گئے، تو حضرت عثمان وغیرہم کو فاسق کیوں نہیں کہتے، وہ بھی اللہ کے رسول ﷺ کو میدان میں اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، اس کی کیا وجہ ہے کہ جرم ایک مگر تمہارے فیصلے مختلف، (روافض و خوارج) **جواب:** غزوہ سے بھاگ جانے کی تین نوعیتیں ہیں، غداری کر کے بھاگنا تاکہ دوسرے مجاہدین پر برا اثر پڑے، بزدلی سے بھاگ جانا، کسی اچانک حادثہ جانکاہ پیش آ جانے پر حواس باختہ ہو جائیں اور اسی مدہوشی کی حالت میں قدم اکھڑ جائیں، خبر ہی نہ رہے کہ کون کہاں ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں، کدھر جا رہے ہیں، پہلی دو صورتیں گناہ و فسق ہیں، پہلی صورت تو بہت ہی بڑا گناہ قریب کفر ہے، دوسری صورت اس سے کم گناہ ہے مگر تیسری صورت نہ جرم ہے نہ گناہ، عبداللہ ابن ابی منافق اور اس کے ساتھیوں کا فرار پہلی قسم کا تھا یعنی غداری کی بنا پر مسلمانوں کو شکست اور کفار کو فتح دلانے کے لئے، مگر ان حضرات کا قدم اکھڑ جانا تیسری قسم کا تھا، کہ اچانک پیچھے سے حملہ ہوا جس کا انہیں وہم و گمان بھی نہ تھا، ادھر حضور انور ﷺ کی خبر شہادت مشہور ہو گئی، ان پر غم پر غم ایسے پڑ گئے کہ ان کے ہوش و حواس ہی جاتے

رہے، اس افراتفری کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ہی حضرت یمان کو قتل کر دیا، جناب حذیفہ پکارتے ہی رہے یہ تو میرے والد ہیں، مومن ہیں، مگر کسی نے سنا بھی نہیں، ایسی مدہوشی کے اعمال نہ جرم ہوتے ہیں نہ گناہ، اسی لئے ان بزرگوں سے حضرت یمان کا نہ قصاص لیا گیا نہ دیت نہ فدیہ نہ کفارہ، ابھی تقسیم ملک کے موقعہ پر مائیں اپنے شیر خوار بچوں کو ہندوستان چھوڑ کر پاکستان بھاگ آئیں، اور حدود پاکستان میں آ کر معلوم ہوا کہ میری گود میں بچہ نہیں ہے، یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ بچہ میں نے کہاں پھینکا، اور وہ کہاں گرا، یہاں آ کر روئیں، خداوند تعالیٰ ایسا وقت نہ دکھائے، اچھے اچھوں کے ہوش جاتے رہتے ہیں، اور اگر ان کا یہ عمل صورۃً گناہ بھی تھا، تو رب تعالیٰ نے ان کی معافی کا اعلان فرما دیا إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ (آل عمران: ۱۵۵) اے محبوب جوان دو جماعتوں کے ٹکراؤ کے وقت پیٹھ پھیر گئے انہیں ان کی بعض غلطیوں کی وجہ سے شیطان نے پھسلا دیا، اللہ نے انہیں معاف کر دیا، کہو اب ان پر کیا اعتراض ہے؟ درہ خالی کر دینا ان کی اجتہادی غلطی تھی، اس سے ان کے قدم اکھڑ جانا نتیجہ نکلا، رب تعالیٰ کی معافی اس کا انجام ہوا، ان بزرگوں پر یہ اعتراض ایسا ہی ہے جیسے کوئی آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر آج گندم کھا لینے کا اعتراض کرے، ان کی وہ خطائیں جن کی معافی کا قرآن شریف میں اعلان ہو گیا ہماری ان عبادات سے افضل ہیں جن کی قبولیت کی خبر نہیں، **چوتھا اعتراض:** تم نے کہا کہ حضور انور ﷺ نے مدینہ منورہ پہنچ کر فرمایا کہ آج حمزہ پر رونے والی کوئی نہیں، معلوم ہوا کہ شہیدوں پر رونا پیٹنا اور ماتم کرنا اچھی چیز ہے، اسی لئے آج ہم امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر پیٹتے ہیں، (روافض) **جواب:** بوقتِ موت میت پر آنسو بہا کر رونا، اس کے درست حالات بیان کرنا سنت سے ثابت ہے مگر نوحہ پیٹنا، ماتم کرنا، سر کے بال نوچنا، کپڑے پھاڑنا حرام ہے، اور تین دن کے بعد تو رونا، بین کرنا بھی منع، تمہارے بناوٹی رونے اور اجرت دے کر ماتم کرانے میں ان بیویوں کے گریہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے، وہ عین ایمان تھا یہ عین حرام، اس حدیث کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اے بیویو! حمزہ جیسے مظلوم شہید پر ہمارے گھر میں رونا پیٹنا نہیں پڑا، تم اپنے شہداء پر کیوں رو رہی ہو، اس صورت میں یہ فرمان انہیں رونے سے روکنے کے لئے ہے نہ کہ ترغیب کے لئے، **پانچواں اعتراض:** رب تعالیٰ نے ایسے نازک موقعہ پر مسلمانوں کو شکست دی ہی کیوں؟ یہ تو محبت کے تقاضے کے خلاف ہے، حضور انور ﷺ محبوب بھی ہیں، اور ان کے صحابہ کو جنگِ احد میں شکست بھی دے دی گئی، اس میں حکمت کیا ہے؟ **جواب:** اس واقعہ میں تا قیامت مسلمانوں کے لئے نمونہ قائم کرنا تھا کہ جہاد میں غنیمت پر دھیان کرنا شکست کا باعث ہوتا ہے، غنیمت بعد کی چیز ہے، نیز درہ خالی کر دینا سخت مصیبت کا سبب ہے، نازک مورچے جہاد میں کبھی خالی نہ چھوڑنا، نیز ہمارے محبوب کے فرمان پر عمل کرتے رہنا، ان کے حکم کی ادنیٰ معمولی سی مخالفت بڑی مصیبت کا باعث ہے، کہ درہ والے صحابہ نے حضور انور ﷺ کے حکم کی تھوڑی مخالفت کی وہ بھی غلطی سے، تو اس کا انجام یہ ہوا، یہ شکست بھی عملی تبلیغ ہے، جیسے حضور انور ﷺ کی فجر قضا ہوگئی، مسلمانوں کو قضا کے احکام بتانے کے لئے،

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ
اور البتہ تحقیق مدد کی تمہاری اللہ نے بدر میں حالانکہ تم تھوڑے تھے پس ڈرو اللہ سے
اور بے شک اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی جب تم بالکل بے سروسامان تھے تو اللہ سے ڈرو
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ
شاید تم شکر کرو جب فرماتے تھے آپ مسلمانوں سے کیا تمہیں کافی نہیں
کہیں تم شکر گزار ہو جب اے محبوب تم مسلمانوں سے فرماتے تھے کیا تمہیں یہ کافی نہیں
اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾
یہ کہ مدد کرے تمہاری رب تمہارا تین ہزار فرشتوں سے جو اتارے ہوئے ہوں
کہ تمہارا رب تمہاری مدد کرے تین ہزار فرشتے اتار کر

تعلقات

ان آیات کا گذشتہ آیتوں سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** گذشتہ آیت میں حضور انور ﷺ کے فرمان کے خلاف کرنے کا نتیجہ دکھایا گیا یعنی احد میں ناکامی، اس آیت میں حضور انور ﷺ کی فرماں برداری کا نتیجہ یاد دلایا جارہا ہے یعنی بدر میں کامیابی، تاکہ لوگ حضور انور ﷺ کی اطاعت کریں اور مخالفت سے بچیں، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو توکل کا حکم دیا گیا تھا، اب توکل کا فائدہ بتایا جارہا ہے کہ توکل کی برکت سے تم نے بدر میں فتح حاصل کی تھی اگرچہ تم تھوڑے بھی تھے اور بے سامان بھی، گویا پہلے توکل کا حکم تھا اور اب توکل کے مثالی فوائد کا تذکرہ ہے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ احد میں مسلمانوں کی دو جماعتوں نے اپنی کمی تعداد دیکھ کر بھاگ جانے کا ارادہ کرلیا تھا، اب فرمایا جارہا ہے کہ جہاد میں فتح کمی بیشی سے نہیں ہوتی، ہمت اور اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہوتی ہے، دیکھو تم بدر میں بہت ہی تھوڑے تھے مگر جیت گئے لہٰذا آئندہ کمی بیشی کا خیال نہ کرنا، **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں جنگ احد کا ذکر تھا جس میں مسلمان صابر، شہید، زخمی ہوئے، اب بدر کا ذکر ہے جس میں مسلمان شاکر، غازی، فاتح بنے تھے یعنی عملی صبر کے بعد عملی شکر کا ذکر ہے تاکہ مسلمان ہمیشہ آرام وفتح میں شکر اور تکلیف یا ناکامی میں صبر کیا کریں،

تفسیر

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ یہ لام اور قد مضمون کی تاکید کے لئے آتے ہیں، تاکید کبھی شک دفع کرنے کے لئے ہوتی ہے اور کبھی مضمون کی اہمیت دکھانے کے لئے، یہ تاکید صحابہ کرام کے اعتبار سے اظہار اہمیت کے لئے ہے، کفار ومشرکین کے لحاظ سے، دفع شک کے لئے، چونکہ فتح بدر بہت اہم واقعہ ہوا، اس لئے لقد سے شروع فرمایا گیا، اور چونکہ مشرکین وکفار اس فتح کو اتفاقی

ہے؟ **جواب:** بے شک اگر سود کو حلال جانتا ہے تو مرتد ہے اس کا راس جسم (سر) بھی نہ بچے گا۔ چہ جائیکہ راس المال اور اگر حرمت سود کا منکر نہیں اور بادشاہ اسلام کا مقابلہ کرتا ہے تو باغی ہے اور باغی کا مال توبہ سے پہلے اسے نہیں ملتا' بلکہ یہ سلطان کے پاس امانتاً محفوظ رہتا ہے۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک بالکل ضبط ہو جاتا ہے۔ (روح المعانی)

تیسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ سود خوار سے قتال کیا جائے گا۔ حدیث شریف میں ہے کہ کسی مسلمان کو بجز تین صورتوں کے قتل کرنا جائز نہیں۔ ارتداد' قتل' اور زنا۔ اس حدیث اور آیت میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اگر سود خوار سود حلال سمجھ کر اس پر اڑتا ہے تو مرتد ہے۔ اس سے ایسا ہی جہاد کیا جائے جیسا کفار سے اور اگر سود کو حرام تو سمجھتا ہے مگر چھوڑتا نہیں تو سلطانِ اسلام جبراً اسے روکے اگر وہ جبر کو نہ مانے اور گروہ بنا کر مقابلہ کرے تو باغی ہے۔ اس سے ایسی جنگ کی جائے گی جیسے باغیوں سے' غرض بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کی دو نوعیتیں ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** سود میں ایسی کونسی خصوصیت ہے کہ سود خوار کو اعلان جنگ دیا گیا۔ شرابی' جواری' بے نماز سب ہی گنہگار ہیں۔ انہیں اعلان جنگ نہیں؟ **جواب:** حقوق دو قسم کے ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق مخلوق۔ دیگر گناہ میں یا صرف رب کی حق تلفی ہے یا کسی خاص بندہ کی' مگر سود میں خالق و مخلوق دونوں ہی کی حق تلفی ہے کہ سود خوار رب کی مخالفت' شریعت کا مقابلہ کرتے ہوئے عام خلق کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا سزا بھی اس کی سخت ہوئی۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ سود خوار توبہ کرنے کے بعد اصل قرض مقروض سے لے گا۔ اگرچہ توبہ سے پہلے وہ قرض سے کہیں زیادہ وصول کر چکا ہو تو کیا اب بھی سود خوار کو یہ رعایت ملے گی کہ پہلے تو خوب سود وصول کرے پھر توبہ کر کے پورا قرض بھی لے لے اس پر تو یہ شعر صادق آتا ہے۔

رات بھر مے پی اور پھر صبح کو توبہ کر لی		رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

جواب: ہرگز نہیں یہ رعایت صرف اس وقت کے لئے ہے جب کہ حرمت سود کا قانون بننے سے پہلے لوگوں نے سود لے لیا تھا اور وہ سود اسی وقت ان کے لئے جائز تھا۔ اب جبکہ سود حرام ہو چکا ہے تو جو بھی لے گا حرام ہی لے گا اور اب توبہ کرنے پر لیا ہوا سود وضع کرنا پڑے گا اور اگر قرض سے زیادہ لے چکا ہے تو واپس کرنا ہوگا۔ **چھٹا اعتراض:** اس آیت میں ارشاد ہوا کہ اگر تم توبہ کر لو تو بھی اصل قرض ملے گا۔ ان لوگوں نے اس وقت گناہ کونسا کیا تھا۔ جس سے توبہ کرائی جا رہی ہے۔ اس سے پہلے جو سود لیا تھا وہ تو گناہ تھا ہی نہیں کہ اس وقت سود حلال تھا۔ اس سے توبہ کرانے کے کیا معنی؟ **جواب:** بنی ثقیف کے ان چار صاحبوں نے حرمت سود کے بعد گزشتہ قرض کا سود لینا چاہا تھا یہ جرم تھا کہ ارادہ گناہ ہے۔ اس سے یہاں توبہ کا حکم دیا' یا توبہ سے مراد ہے آئندہ سود سے بچنے کا عہد۔

تفسیر صوفیانہ

سود کی حرمت صرف مال میں ہی نہیں بلکہ ہر چیز میں ہے۔ اعضائے ظاہری و باطنی سے جائز کام لینا حلال اور ان سے حرام کام لینا گویا سود ہے۔ اور حرام۔ یہاں حکم ہو رہا ہے۔ کہ اے غافل مسلمانو تم زمانۂ غفلت میں اپنے اعضاء سے جو کچھ حرام کام کر چکے۔ اب ہوش آنے پر اس سود خوری سے بچو اور گزشتہ گناہوں کا اثر مٹا دو یہ مت سمجھو کہ۔

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن		آخری وقت میں کیا خاک مسلمان ہوں گے

سے ہے، اور مُؤْمِنِيْنَ سے مراد یا غازیانِ بدر ہیں یا مجاہدینِ احد، یعنی رب تعالیٰ نے بدر میں اے مسلمانو! تمہاری اس وقت مدد کی، جبکہ اے محبوب تم مسلمانوں سے یہ کہتے تھے، یا اے محبوب انہیں احد کا وہ واقعہ بھی یاد دلاؤ، جب آپ مسلمانوں کو یہ کہہ کر تسلی دیتے تھے، خیال رہے کہ اگر یہ بدر کا واقعہ ہے، تو آیت میں التفات ہے کہ پہلے مسلمانوں سے خطاب تھا پھر محبوب کو خطاب اور مسلمانوں کا بطریق غائب ذکر فرمایا گیا اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ ہمزہ انکاری استفہام کا ہے، يَكْفِىْ کفایت سے بنا بمعنی حاجت پوری کرنا اور کسی کے معاملہ کا انتظام کرنا، اس کے اوپر غنی کا درجہ ہے، يُمِدُّ امداد سے ہے جس کا مادہ مَدَدٌ ہے جس کے معنی ہیں مسلسل دینا یا جاری رکھنا، کہا جاتا ہے مَدَّفِي السَّيْرِ سفر جاری رکھا، برابر چلتا رہا، بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ امداد، بھلائی میں مدد دینے کو کہتے ہیں، مَدَّ برائی میں ڈھیل دینے کو، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (بقرہ: ۱۵) بعض نے فرمایا کہ قوت دینے کے لئے مدد امداد کہلاتی ہے، اور زیادتی کے لئے مدد مدٌ کہلاتی ہے، لَنْ سے معلوم ہو رہا ہے کہ مسلمان اس وقت گھبراہٹ میں اپنی فتح سے مایوس ہو چکے تھے (تفسیر روح البیان و روح المعانی و کبیر وغیرہ) یعنی اے مسلمانو غازیو! کیا تمہیں یہ بھی کافی نہ ہوگا کہ تمہارا مہربان رب تمہیں ایسے نازک موقعہ پر مدد دے، مدد بھی معمولی صرف ہتھیاروں وغیرہ سے نہیں بلکہ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ تین ہزار زمینی فرشتوں سے نہیں بلکہ آسمانی اتارے ہوئے فرشتے ملائکہ ملک کی جمع ہے، ملک کے معنی، ان کی اقسام، ان کے نام و کام ہم پہلے پارہ میں وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ (بقرہ: ۳۰) کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں، ہماری قرأت میں مُنْزَلِيْنَ ز کے فتح سے ہے، یعنی آسمان سے اتارے ہوئے، بعض میں مُنْزِلِيْنَ ز کے کسرہ سے ہے یعنی وہ فرشتے مسلمانوں کے دلوں میں سکون اور کفار کے قلب میں رعب اتارنے والے ہیں،

خلاصہ تفسیر

اے غزوۂ احد کے غازیو! تم اس غزوہ میں منافقین کے دھوکہ دے جانے سے اور اپنی غلطی کی بنا پر اپنے قدم اکھڑ جانے سے بد دل نہ ہو، فتح و شکست جنگ میں ہوتی ہی ہے، مگر یقین کر لو کہ فتح و کامرانی تعداد کی زیادتی یا سامان کی کثرت پر موقوف نہیں بلکہ ہمارے رحم و کرم پر موقوف ہے، جس کا روشن ثبوت یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں تم لوگ تعداد میں تھوڑے تھے کہ صرف ۳۱۳ تھے، اور سامان میں بھی کم کہ تمہارے پاس دو گھوڑے، چھ زرہیں، آٹھ تلواریں تھیں، باقی کھجوروں کی شاخوں سے ہی لڑ رہے تھے مگر رب تعالیٰ نے تمہاری مدد فرمائی اور تمہیں شاندار فتح دی، کہ تم ایک ہزار مسلح کفار پر اس طرح غالب آئے کہ تم نے ان کے ستر پہلوان مار دیئے، جن میں ۲۴ چوٹی کے سردار تھے، اور ستر قید کر لئے، جس کے ذریعہ تمہیں بہت مال ہاتھ آیا، لہٰذا آئندہ ہمیشہ تقویٰ و پرہیزگاری اور خوف خدا کا ہتھیار اپنے ساتھ رکھو، کہ سارے ہتھیار اس کے مقابل ہیچ ہیں، اور تقویٰ اس امید پر اختیار کرو کہ تم بندۂ شاکر بن جاؤ، اے محبوب انہیں وہ وقت بھی یاد دلا دو جبکہ جنگِ احد میں عبد اللہ ابن ابی منافق اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر غداری کر کے چلا گیا، اور غازیوں کو اتنی بھاری جماعت کم ہو جانے سے سخت صدمہ ہوا، تو آپ نے ان پیارے غازیوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا، تم گھبراتے کیوں ہو، اگر تین سو منافق تمہیں پیٹھ دکھا گئے، تو رب العالمین نے تین

پوری بھر دی جاوے گی اور ان پر ظلم نہ ہوگا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مقروضوں پر ایک آسانی کی گئی تھی کہ انہیں سود کے بوجھ سے ہلکا کر دیا گیا۔ اب ان کے لئے دوسری آسانی یہ ہو رہی ہے کہ انہیں ادائے قرض میں مہلت دی جا رہی ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں عام مقروضوں کے احکام بیان ہوئے۔ اب خاص مقروض یعنی دیوالیہ کے احکام بیان ہو رہے ہیں کہ اسے اتنی مہلت دو کہ کما کر قرض ادا کر سکے۔ **تیسرا تعلق:** سود کی آیتوں سے پہلے صدقہ کی رغبت دی گئی تھی۔ اب مسلمانوں کو ایک خاص خیرات کی طرف مائل کیا جا رہا ہے یعنی معافیٔ قرض۔

شان نزول

جب پچھلی آیت نازل ہوئی تو ان چاروں ثقفی بھائیوں نے جن کے بارے میں وہ ہدایت آئی تھی کہا کہ ہم میں اللہ تعالیٰ اور حضور ﷺ سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں۔ ہم سود لینے سے توبہ کرتے ہیں۔ اپنا اصل قرض ہی لیں گے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے مقروضین بنی مغیرہ کے پاس گئے اور بولے کہ سود سب معاف ہمارا اصل قرض ادا کرو۔ انہوں نے کہا کہ ابھی تو ہم تنگ دست ہیں' کچھ مہلت دو' آمدنی ہوتے ہی سب سے پہلے تمہارا قرض ادا کر دیں گے۔ انہوں نے انکار کیا' اور فوراً ادا کا مطالبہ کیا۔ تب یہ آیت اُتری (کبیر و روح المعانی واحمدی)

تفسیر

وَاِنۡ كَانَ ذُوۡ عُسۡرَةٍ ظاہر یہ ہے کہ کان تامہ ہے' بمعنی وقع یا ثبت اور ذُوۡ عُسۡرَةٍ اس کا فاعل اور ممکن ہے کہ کان ناقصہ ہو' اور ذُوۡ عُسۡرَةٍ اس کا اسم اور خبر اور خبر محذوف یعنی مغرما عسرا اعسار کا ہم معنی ہے بمعنی تنگی اور مشکل ہونا۔ اہل عرب کہتے ہیں۔ اعسر الرجل۔ اس کا مقابل یسر ہے بمعنی آسانی اور غنا' یعنی اگر مقروض تنگ دست ثابت ہو۔ **فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيۡسَرَةٍ**۔ نظرۃٌ پوشیدہ مبتدا الحکم کی خبر ہے۔ یہ انظار کا ہم معنی بمعنی ڈھیل اور مہلت دینا ہے۔ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِىۡ اور اِنَّكَ لَمِنَ الۡمُنۡظَرِيۡنَ۔ (الحجر: ۳۷) اسی سے انتظار ہے۔ غور کرنے کو بھی نظر اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے لئے مہلت درکار ہے۔ اسی سے ہے مناظرہ' یعنی ایک مسئلہ میں باہم غور کرنا دیکھنے کو نظر اس واسطے کہتے ہیں کہ اس میں قوت باصرہ کو اپنے کام کرنے کی ڈھیل دی جاتی ہے۔ آنکھ بند کرنے والا گویا اسے مقید کرتا ہے۔ (از کبیر) میسرہ بروزن مفعلہ یسار کا ہم معنی ہے۔ بمعنی آسانی اور غنا یا اسم ظرف ہے۔ اسی کا مادہ یسر ہے۔ یعنی پس حکم یہ ہے کہ اسے غنا تک مہلت دو۔ خیال رہے کہ یہ حکم وجوبی ہے۔ جیسا کہ ان شاء اللہ فوائد میں عرض کیا جائے گا۔ **وَاَنۡ تَصَدَّقُوۡا**۔ اَنۡ مصدریہ ہے۔ اور تَصَدَّقُوۡا صدقۃٌ سے بنا تصدق کے معنی صدقہ دینا ہوتے ہیں مگر کبھی حق معاف کر دینے کو بھی تصدق کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ ہی مراد ہے۔ بعض نے کہا کہ اس صدقہ سے مہلت دینا مراد ہے مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ مہلت کا حکم تو پہلے ہو چکا۔ نیز مہلت دینا واجب اور معاف کر دینا مستحب لہٰذا صحیح یہ ہی ہے کہ اس سے قرض کی معافی مراد ہے۔ خواہ کُلًّا ہو یا بعضًا مگر ظاہر یہ ہے کہ کل معافی مراد ہے اسی لئے بجائے معافی کے صدقہ فرمایا گیا۔ یعنی تمہارا سارا قرض معاف [illegible] لئے یہاں [illegible] متعلق پوشیدہ (مِنَ الۡاِنۡظَارِ) خیر سے زیادہ ثواب مراد

ہے۔ یعنی معافی مہلت دینے سے تمہارے لئے زیادہ باعث ثواب ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اگر دیوالیہ مقروض کے پاس اداء قرض کے لئے پیسہ نہ ہو مگر مکان جائیداد وغیرہ ہو تو اسے مہلت دو۔ اس کی جائیداد نیلام نہ کراؤ۔ وہ اس مہلت میں کما کر تمہارا قرض ادا کر دے گا۔ اور اگر اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو تو معافی دیں۔ اس کا آخرت کا معاملہ صاف کر دو تم اپنے مقروض پر رحم کرو تا کہ رحم کئے جاؤ۔ غرضیکہ مہلت ایک صورت میں ہے اور معافی دوسری صورت میں۔ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ اس فعل کا مفعول اور شرط کی جزا پوشیدہ ہے' یعنی اگر تم یہ جانتے ہو تو معافی پر عمل کرو۔ جیسے قیدی آزاد کرنا ثواب ہے۔ ایسے ہی کسی مقروض کی گردن چھوڑانا ثواب ہے کہ قرض بھی ایک قید ہے، جس میں مقروض دنیا و آخرت میں پھنسا ہوا ہے۔ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ۔ یہاں تقویٰ سے ڈرنا مراد ہے اور یوم سے وقت یا قیامت کا دن مراد اور یہ اتقوا کا مفعول بہ اور ممکن ہے کہ اس سے وقت موت مراد ہو۔ اِلَى اللّٰهِ سے الیٰ امر اللہ یا الیٰ حفظ اللہ مراد یعنی اس دن یا اس وقت سے ڈرو جس میں تم رب کے حکم یا حفاظت کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور اگر خدا کی طرف ہی لوٹنا مراد ہو تو رجوع مکانی نہ ہوگا۔ بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ تم قیامت میں اس حالت میں رب تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو گے کہ سوائے اس کے رحم و کرم کے کوئی ذریعہ دنیاوی نہیں چھڑا سکے گا اور جس دن کسی کی ظاہری بادشاہت بھی نہ ہوگی اور جہاں کوئی حیلہ بہانہ نہ بن سکے گا۔ غرضکہ مصرعہ

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے۔ اس کا سماں ہوگا

خیال رہے کہ اتقوا کا مطلب یہ نہیں کہ صرف دل میں خوف رکھو بلکہ عملی خوف مراد ہے۔ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ۔ توفی' توفیۃ سے بنا' اس کا مادہ وفاءٌ ہے' بمعنی پورا پورا دینا۔ ما کسبت کا مضاف جزاء' پوشیدہ ہے یعنی ہر نفس کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ خیر کا خیر' شر کا شر' خیال رہے کہ کسب ہر اختیاری فعل کو کہتے ہیں۔ خواہ ہاتھ سے صادر ہو یا دیگر اعضاء سے اور كُلُّ نَفْسٍ سے ہر عاقل و بالغ انسان مراد ہے کیونکہ بچے دیوانے اور جانور کے اعمال کی اخروی جزا نہیں۔ اس لئے ارشاد ہوا کہ۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ یہ جملہ کل نفس کا حال ہے اور چونکہ وہ معنا جمع تھا اس لئے ضمیر جمع لائی گئی یعنی ان لوگوں پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا کہ ان کی نیکیاں گھٹ جائیں یا گناہ بڑھ جائیں۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! اگر تمہارا مقروض تنگ دست ہو اور وعدہ پر قرض ادا نہ کر سکے تو اس کو مہلت دے دو کہ جب گنجائش ہو تب ادا کرے اور ایسے فقراء مساکین سے بالکل قرض معاف کر دینا تمہارے لئے مہلت دینے سے زیادہ بہتر ہے کیونکہ اگر تم اپنے قرض سے آزاد کرو گے تو رب تمہیں اپنے قرض سے آزاد کرے گا۔ اگر تمہیں اس کی خبر ہو تو تم ضرور معاف کر دو۔ تم بھی کسی کے مقروض ہو' اپنی اس پیشی کے دن سے ڈرتے رہو۔ جب تمہیں بارگاہ الٰہی میں واپس کیا جائے گا اور ہر شخص کو اس کے سارے برے بھلے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا نہ تو ان کی نیکیاں گھٹیں۔ نہ گناہ بڑھیں۔ اگر تم اس دن اپنی رہائی چاہتے ہو تو آج اپنے مقروض قیدیوں کو رہا کر دو۔ **نوٹ:** مفسرین فرماتے ہیں کہ وَاتَّقُوْا يَوْمًا الخ یہ سب سے اخیری آیت ہے جو حضور ﷺ پر نازل ہوئی۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ اسے سورۂ بقرہ میں ۲۸۰ آیتوں کے بعد رکھئے' چنانچہ یہاں رکھی گئی اس کے بعد حضور علیہ السلام دنیا میں اکیس روز تشریف فرما رہے۔ بعض

بعد بھی رب تعالیٰ نے مدد کی، ورنہ کفار مکہ اس قت سارے مدینہ پر ٹوٹ پڑتے اور اسے برباد کر ڈالتے مگر ہمت نہ پڑی، حتی کہ کچھ دور پہنچ کر ابوسفیان اس ارادہ سے پھر لوٹے اور زخمی مسلمان یہ خبر پا کر پھر تیار ہوئے، مگر ابوسفیان آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکے جیسا کہ اس کا ذکر قرآن شریف میں ہی آئے گا، **تیسرا اعتراض:** کفار کی ہلاکت کے لئے تو ایک فرشتہ ہی کافی تھا، تین ہزار فرشتوں کی کیا ضرورت تھی، قوم لوط کی بستیوں کو ایک فرشتے نے ہی الٹ کر رکھ دیا تھا (بعض جہلا) **جواب:** یہاں کفار کا ہلاک کرنا مقصود نہ تھا بلکہ فقط مسلمانوں کی ہمت افزائی اور ان کا حوصلہ بڑھانا منظور تھا، ہلاکت کے لئے ایک فرشتہ کافی ہے، عزت افزائی کے لئے فرشتوں کی برات چاہیے، حضور انور ﷺ کو معراج میں لے جانے کے لئے لاکھوں فرشتے براتی بن کر آئے تھے، حالانکہ لے جانے کے لئے ایک براق ہی کافی تھا، ان کفار کو ہلاک بھی کیوں کیا جاتا، ان میں سے اکثر وہ تھے جو آئندہ مسلمان ہو کر اسلام کی خدمت کرنے والے تھے، **چوتھا اعتراض:** یہاں تو فرمایا گیا کہ تمہاری مدد تین ہزار فرشتوں سے ہوگی، اور اگلی آیت میں آ رہا ہے کہ پانچ ہزار فرشتوں سے امداد ہوگی، آیتوں میں تعارض ہے، **جواب:** اس کا جواب اگلی آیت میں ہی دیا جائے گا انشاء اللہ کہ تین ہزار کی امداد غیر مشروط ہے، اور پانچ ہزار کی امداد مشروط، لہٰذا دونوں آیات درست ہیں،

تفسیر صوفیانہ

اس آیت کریمہ میں رب تعالیٰ نے مومنوں کو توکل کا حکم بھی دیا اور اس کا نتیجہ بھی دکھایا اور بتایا، جس سے معلوم ہوا کہ توکل مومن کا زیور ہے اور ایمان کا نشان، توکل کی حقیقت یہ ہے کہ اسباب کو جمع کرے، رب تعالیٰ پر اعتماد کرے اور اپنے عجز کا اظہار، گھبراہٹ سے دور رہے، سہل ابن عبداللہ تستری فرماتے ہیں کہ سارے علوم عبادت سے ادنیٰ ہیں اور ساری عبادتیں ورع سے ادنیٰ اور سارے ورع زہد سے ادنیٰ اور سارے زہد توکل سے ادنی، توکل کے تین درجے ہیں، پہلا درجہ اسباب جوڑنا، دوسرا درجہ اسباب چھوڑنا، تیسرا درجہ اسباب توڑنا،

حکایت: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو گوپھن کے ذریعہ نمرودی آگ میں پھینکا گیا، تو راستہ میں جبریل امین ملے، عرض کیا، کچھ آپ کو حاجت ہے، فرمایا تم سے کچھ نہیں، عرض کیا رب تعالیٰ سے ہے، فرمایا حَسْبِیْ عَنْ سَوَالِیْ عِلْمُہٗ بِحَالِیْ، وہ میری حالت کو جانتا ہے، پھر مانگنے کی حاجت نہیں، یہ ہے توکل کا آخری درجہ، کبھی رب تعالیٰ سے دعا کرنا عبادت ہے کبھی دعا نہ کرنا اطاعت، صوفیا فرماتے ہیں کہ اس توکل کی تین نشانیاں ہیں، کسی سے نہ مانگنا، بغیر مانگے جو ملے اسے رد نہ کرنا، جو آجائے اس پر بخل نہ کرنا اور جو کچھ رکھنا نفس کے واسطے نہ رکھنا، رب تعالیٰ کے لئے رکھنا، حضرت ابراہیم خواص متوکلین کے سردار تھے کہ کبھی نہ گھر بنایا نہ سامان رکھا، مگر اس کے باوجود سوئی دھاگہ قینچی اور کوزہ ساتھ رکھتے تھے، کسی نے پوچھا کہ یہ سامان بھی کیوں رکھا ہے؟ فرمایا کوزہ وضو کے لئے اور سوئی دھاگہ پھٹا کپڑا سی کر تن ڈھکنے کے لئے تاکہ نماز درست ہو، صوفیاء فرماتے ہیں کہ متوکلین کا لشکر ملائکہ ہیں جو اپنے پر ادھر کا دروازہ بند کرتے ہیں، ان پر رب تعالیٰ اس طرف کا دروازہ کھول دیتا ہے،

قرض دینے کے فضائل

حاجت مند کو قرض دینا باعث ثواب ہے (۱) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تین شخصوں کو اجازت ہوگی کہ جنت میں جس دروازہ سے چاہیں جائیں اور وہاں کی جو نعمت چاہیں اختیار کریں۔ مقتول کے ورثاء جو قاتل کا خون معاف کر دیں۔ جو ہر فرض نماز کے بعد گیارہ بار قل ھو اللہ پڑھا کرے' جو حاجتمند کو قرض دے۔ (روح البیان) (۲) ابو عمر امامہ باھلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ جنت کے دروازہ پر لکھا ہے کہ صدقہ کا ثواب دس گناہ ہے اور قرض دینے کا اٹھارہ گنا پوچھا اس کی وجہ کیا؟ جواب ملا کہ صدقہ تو غیر ضرورت مند بھی لے لیتا ہے مگر قرض حاجتمند ہی لیتا ہے۔ (روح البیان) (۳) جو کوئی قرض کی میعاد کے بعد مہلت دے اسے ہر دن کے عوض اتنی خیرات کا ثواب ملتا ہے۔ مثلاً کسی پر سو روپے ایک ماہ کے وعدہ پر قرض تھے۔ اب ایک ماہ کے بعد قرض خواہ کو سو روپے روز خیرات کرنیکا ثواب ملے گا۔ (روح البیان) (۴) رب تعالیٰ نے صدقات و خیرات کو قرض فرمایا تا کہ مسلمانوں کو قرض دینے کے فضائل معلوم ہوں۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (بقرہ: ۲۴۵)
حکایت: ایک شخص لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اور اپنے نوکروں سے کہتا تھا کہ جب کوئی مقروض تنگ دست ہو اس سے درگزر کرو' شاید رب تعالیٰ مجھ سے درگزر فرمائے' اسی پر اس کی نجات ہوگئی (مسلم و بخاری و مشکوٰۃ باب الافلاس)

مقروض کو مہلت دینے کے فضائل

غریب مقروض کو مہلت دینے یا معاف کرنے کے بڑے فضائل ہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جو کوئی غریب مقروض کو مہلت دے اسے رب تعالیٰ قیامت کی مصیبتوں سے بچائے گا اور اپنے سایہ میں جگہ عطا فرمائے گا۔ (مسلم و مشکوٰۃ) (۱) ہم پہلے بیان کر چکے کہ مہلت دینے میں روزانہ صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔ (۲) روایت میں ہے کہ جس نے ضرورتاً قرض لیا تو قرض خواہ کے لئے ملائکہ دعا کرتے ہیں۔ **لطیفہ:** بعض سنتوں کا ثواب فرض و واجب سے زیادہ ہے۔ سلام کرنا سنت اور جواب دینا فرض ہے مگر سلام کا ثواب جواب سے زیادہ ہے۔ میعاد پر ادائے قرض واجب ہے اور میعاد سے پہلے سنت ہے مگر ثواب اس کا زیادہ کہ معیاد سے پہلے ادا کیا جائے۔

مسائل و فوائد: شرعاً قرض اور دَین میں فرق ہے۔ دست گردان یعنی نقدی کے لین دین کو قرض کہا جاتا ہے اور معاوضات کے ذمہ رہ جانے کو دَین کسی سے چھ روپے ادھار لئے یہ قرض ہے لیکن چھ روپے کا مال خریدا اور قیمت ادا نہ کی یہ دین قرض کی میعاد کوئی نہیں' قرض خواہ جب چاہے مانگ لے۔ طے شدہ میعاد کی لازم پابندی نہیں۔ مگر دَین کی مقررہ میعاد کی پابندی کرنی ہوگی کہ وقت مقرر سے پہلے تقاضا نہیں ہو سکتا۔ نیز قرض میں زیادتی حرام کہ سود ہے اور دَین میں جائز' تاجر کہہ سکتا ہے کہ اس کپڑے کی نقد قیمت روپیہ گز ہے اور ادھار ڈیڑھ روپیہ گز (کتب فقہ) **مسئلہ:** صحیح یہ ہے کہ ہر غریب مقروض کو مہلت دینا واجب ہے اور قرضہ معاف کرنا مستحب (کبیر) **مسئلہ:** معسر یعنی دیوالیہ وہ مقروض ہے جس کے پاس ادائے قرض کے لائق مال نہ ہو۔ **مسئلہ:** اس کی مہلت دینا واجب ہے مگر اس سے قرض معاف نہ ہو جائے گا۔ جب اسے گنجائش ہو قرض خواہ پھر تقاضا کر سکتا ہے **مسئلہ:** اگر کسی مقروض کا غریب ہونا مشتبہ ہو' احتمال ہو کہ شاید یہ اپنے مال کو چھپاتا

دور پہنچ کر خیال آیا، کہ ہم نے لوٹنے میں جلدی کی، موقع اچھا تھا، ہمیں مدینہ تباہ کر دینا چاہیے تھا اور مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہئے تھا یہ سمجھ کر مع لشکر کے پھر چڑھائی کا ارادہ کیا، ادھر حضور انور ﷺ کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع دے دی گئی، آپ نے انہی مجروح صحابہ کو پھر جنگ کی تیاری کا حکم دیا، یہ حضرات پھٹے ہوئے سروں، ٹوٹے ہوئے بازوؤں زخمی پاؤں میں پٹیاں باندھ کر اسی طرح پھر مقابلہ کے لئے چل دیئے، رب تعالیٰ کو صحابہ کرام کی فرماں برداری اور یہ ادا بہت ہی پسند آئی، اس لئے اس آیت میں ان سے وعدہ کیا گیا، کہ اگر کفار پھر لوٹ کر آئے، تو ہم تمہاری امداد کے لئے پانچ ہزار فرشتے بھیجیں گے، تم بے فکر رہو، تمہیں جو کچھ تکلیف پہنچ گئی اتفاقی بات تھی تمہاری غلطی کی بنا پر، اب تمہیں فتح دی جائے گی، چنانچہ کسی شخص نے جو مسلمانوں کی یہ شان دیکھ کر گیا تھا ابوسفیان کو خبر دی، کہ مسلمانوں کے حوصلے بہت بلند ہیں، ان میں سرفروشی وجانبازی کا جذبہ پہلے سے بھی زیادہ ہے، ابوسفیان اس خبر سے گھبرا گئے، اور بہت تیزی سے مکہ معظمہ بھاگ گئے، اس خوف سے کہ کہیں مسلمان ہمیں یہاں ہی نہ آلیں اور ہم پر یہاں ہی نہ ٹوٹ پڑیں (تفسیر روح المعانی) مرے شیر کی بھی ہیبت ہوتی ہے، شعر

ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست ہیبتِ ایں مرد صاحبِ دلق نیست

تیسرے یہ کہ یہ آیت کریمہ جنگِ احزاب یعنی غزوۂ خندق کی خبر دے رہی ہے کہ اے مسلمانو! خیال رکھنا کہ مشرکینِ عرب بہت ساز وسامان اور بہت ہجوم کے ساتھ پھر تم پر چڑھائی کریں گے تم صابر ومتقی رہنا، ہم تمہاری مدد پانچ ہزار فرشتوں سے کریں گے (تفسیر خازن) خیال رہے کہ کفار عرب صرف تین بار مدینہ طیبہ پر چڑھ کر آئے، بدر میں ایک ہزار نفری کے ساتھ، تو رب تعالیٰ نے بدر میں ایک ہزار فرشتے مسلمانوں کی امداد کے لئے بھیجے، خود فرماتا ہے اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُرْدِفِیْنَ (انفال: ۹) احد میں تین ہزار نفری کے ساتھ، تو رب تعالیٰ نے بھی احد میں تین ہزار فرشتوں سے مسلمانوں کی مدد فرمائی، جیسا کہ ابھی پچھلی آیت میں گذر گیا بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُنْزَلِیْنَ (آل عمران: ۱۲۴) احزاب (خندق) میں اس موقعہ پر تو بہت زیادہ تعداد میں کفار باہر سے حملہ آور ہوئے، اور یہود ومنافقین اندرونِ مدینہ سے مسلمانوں کے پیچھے پڑ گئے، جس سے مسلمانوں کے دل گلے میں آگئے، اور ان کی سخت آزمائش ہوئی، کفار دس ہزار، اور بعض روایات کی بنا پر چوبیس ہزار تھے، جن میں قریش پانچ ہزار تھے، باقی دوسری قومیں، رب تعالیٰ نے بھی مسلمانوں کی امداد کے لئے پانچ ہزار فرشتے نازل فرمائے، پھر غزوۂ خندق کے بعد حضور انور ﷺ نے خبر دے دی، کہ آئندہ کفار مدینہ پر حملہ نہ کریں گے بلکہ اب ہمارے حملے ان پر ہوں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، چوتھے یہ کہ یہ پانچ ہزار ملائکہ کی امداد کا وعدہ قیامت تک کے مسلمانوں سے ہے، کہ اے مسلمانو! اگر تم سب تقویٰ اخلاص کے ساتھ کبھی بھی جنگ کرو گے، تو تمہاری امداد پانچ ہزار فرشتوں سے کی جائے گی، یہی قول خواجہ حسن بصری کا ہے (تفسیر خازن)

تفسیر

بَلٰی دوسری زبانوں میں جواب دینے کا ایک ہی حرف ہوتا ہے، جیسے اردو میں ہاں، فارسی میں بلے، پنجابی میں، آہو وغیرہ، مگر

عربی میں آٹھ حرف ہیں نَعَمْ، بَلٰی، اَجَلْ، اِیْ جَیْرِ وغیرہ، اوران حروف کے استعمال کے موقع علیحدہ، چنانچہ بَلٰی استفہام انکاری کے بعد منفی کے اقرار کے موقعہ پر استعمال ہوتا ہے، اور نَعَمْ سے نفی کا ہی اقرار ہوتا ہے، دیکھو رب تعالیٰ نے فرمایا تھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، تو سب روحوں نے کہا تھا بَلٰی یعنی ہاں، تو ہمارا رب ہے، اگر نَعَمْ کہہ دیتے تو معنی ہوتے، ہاں تو ہمارا رب نہیں، یہاں بھی پہلے الن یکفیکم میں نفی کفایت کا سوال ہو چکا ہے، اب جواب آیا بَلٰی تو معنی یہ ہوئے کہ ہاں ضرور یہ مدد تمہیں کافی ہے، یا تو یہ کلام بھی نبی کریم ﷺ کا ہے تَقُوْلُ کا مفعول جسے رب تعالیٰ نے نقل فرمایا، یا رب تعالیٰ کا اپنا فرمان ہے جو حضور انور ﷺ کی تائید میں ارشاد ہوا، اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا صبر کے معنی ہیں روکنا، اس کی تین قسمیں ہیں، اپنے کو اللہ کی اطاعت پر روکنا، نفس کو گناہوں سے روکنا، اور آفت و مصیبت میں دلوں کو گھبراہٹ و بیقراری سے روکنا، یہاں تیسرے معنی مراد ہیں، کیونکہ پہلے دو معنی تَتَّقُوْا میں داخل ہیں، صبر کی تحقیق و تقسیم دوسرے پارے میں وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (بقرہ:۴۵) کی تفسیر میں ہو چکی ہے، تَتَّقُوْا کا مفعول پوشیدہ ہے، اگر مخالفت، نافرمانی، گناہ مفعول ہو، تو تقویٰ کے معنے ہوں گے بچنا، اور اگر اللہ تعالیٰ ہو تو اس کے معنی ہوں گے ڈرنا، یعنی تم مصیبتوں میں صبر کئے رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے یا مخالفتِ رسول اللہ ﷺ سے بچتے رہو، خیال رہے کہ یہاں خطاب غازیانِ بدر سے ہے یا غازیانِ احد سے، یا سارے ان صحابہ سے جنہیں غزوۂ خندق پیش آنا تھا، یا تا قیامت سارے مسلمانوں سے، جیسا کہ ابھی نزول کے ماتحت عرض کیا گیا، پہلی تین صورتوں میں صبر و تقویٰ سے مراد ہوگا ان پر قائم رہنا جیسے کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ (احزاب:۱) کیونکہ صحابہ خصوصاً غازیانِ بدر و احد و احزاب اول درجہ کے صابر و متقی تھے جن کی تعریف خود قرآنِ کریم جگہ جگہ فرما رہا ہے، اگر وہ حضرات صابر و متقی نہ ہوں تو دنیا میں پھر کوئی صابر و متقی نہیں، ہم نے صبر و تقویٰ سیکھا ہی ان سے ہے، حضور انور ﷺ فرماتے ہیں میرے صحابہ تارے ہیں تم ان میں سے جس کی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے، وہ حضرات، ایمان، اعمال، صبر و شکر، تقویٰ سب میں ہی ہمارے لئے راہبر تارے ہیں، اور اگر ہم لوگوں سے خطاب ہو تو اس سے صبر و تقویٰ کرنا مراد ہے، وَیَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا، یَاْتُوْا کا فاعل یا کرز ابن جابر کی وہ کمک کی فوج ہے جس کے آنے کا اندیشہ جنگ بدر میں تھا یا جنگِ احد سے گئے ہوئے کفار ہیں یا جنگِ احزاب میں آنے والے کافر یا قیامت تک کے وہ کفار جو مسلمانوں کے مقابلہ میں آئیں، اس لحاظ سے کُمْ میں چار قسم کے مسلمانوں سے خطاب ہے، فَوْرٌ کے لغوی معنی شدت و جوش ہیں، چنانچہ آگ کی بھڑک کو فود کہا جاتا ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَّهِیَ تَفُوْرُ (ملک:۷) پانی کے جوش اور ابال کو بھی فود کہتے ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَفَارَ التَّنُّوْرُ (ہود:۴۰) پھر سخت غصہ کو فود کہنے لگے کہ اس وقت بھی نفس جوش میں ہوتا ہے، پھر جلدی کام کو فی الفور یا فورا کہنے لگے کہ وہ بھی جوش میں کیا جاتا ہے، یہاں فود بمعنی جوش و غضب ہے یا بمعنی اسی وقت و فوراً، ھذا میں اسی جوش کی طرف اشارہ ہے، جس کا مظاہرہ کفار جنگ احد میں کر چکے تھے یا اس وقت کی طرف اشارہ ہے، جس کا مسلمانوں کو خطرہ تھا یعنی اگر کفار کی کمک یا جنگِ احد سے گئے ہوئے کفار اسی وقت یا اسی جوش سے تم پر آ پڑیں یا اگر کفار احزاب میں یا تا قیامت اسی احد والے جوش سے تم پر ٹوٹ پڑیں تو یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ تمہارا رب تمہاری مدد کرے گا، مدد کے معنی اور اس کی صورتیں پہلے بیان ہو

چکیں، رَبُّکُمْ فرمانے میں ایک عجیب نکتہ ہے، وہ یہ کہ جسمانی وظاہری ربوبیت کا فیض تو سارے عالم کو مل رہا ہے کیونکہ وہ رب العالمین ہے، مگر باطنی وروحانی ربوبیت کا فیض صرف تم مسلمانوں کو حاصل ہے، رب کے معنی اور ربوبیت کے اقسام سورۂ فاتحہ کی تفسیر رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے ماتحت بیان ہو چکے بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ، مُسَوِّمِیْنَ سومٌ سے بنا، سومٌ کے پانچ معنی ہیں، (۱) جانور کو چرنے کے لئے چھوڑنا، اسی لئے جنگل میں چھوڑے ہوئے جانور کو سائمہ کہتے ہیں (۲) طلب کرنا، (۳) عذاب چکھانا، رب تعالیٰ فرماتا ہے يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (بقرہ:۴۹) (۴) بیچنا، اسی لئے بھاؤ ونرخ کو سوم کہتے ہیں (۵) نشانی، علامت اسی سے ہے سِیْمَا، رب تعالیٰ فرماتا ہے سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (فتح:۲۹) یہاں آخری معنی میں ہے، ہماری قرأت مُسَوِّمِیْنَ واوٴ کے کسرہ سے ہے یعنی وہ فرشتے اپنے پر یا اپنے گھوڑوں پر نشان لگائے ہوئے ہوں گے، چنانچہ جنگِ بدر میں فرشتے سیاہ پگڑیوں میں اور جنگِ احد میں سرخ پگڑیوں میں دیکھے گئے، اور ان کے گھوڑے چتکبرے رنگ میں تھے (ابن ابی شیبہ وغیرہ عن علی رضی اللہ عنہ وروح المعانی) عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ جنگ احد میں ملائکہ کی پگڑیاں زرد تھیں (تفسیر کبیر) بعض قرأتوں میں مُسَوَّمِیْنَ واوٴ کے فتح سے ہے یعنی یہ امدادی فرشتے رب تعالیٰ کی بارگاہ میں تمام فرشتوں سے افضل واعلیٰ ہیں، کہ ان پر افضلیت کے نشان لگا دیئے گئے ہیں، جیسے بہترین گھوڑوں پر خصوصی شاہی نشان ہوتے ہیں،

خلاصہ تفسیر

اس آیت کریمہ کی چار تفسیریں ہیں جیسا کہ شانِ نزول کے ماتحت عرض کیا گیا، ہم یہاں ایک اجمالی تفسیر عرض کرتے ہیں، ہاں تمہیں فرشتوں کی مدد ضرور کافی ہوگی اے جماعتِ صحابہ اگر تم اسی طرح صابر وپرہیزگار رہے، اور اگر تم نے ایسے ہی صبر وتقویٰ کے مظاہرے کئے، جیسے بدر واحد میں کئے ہیں اور اگر کفار کی کمک یا کفار اسی جوش کے ساتھ تم پر آ پڑیں، جس جوش سے وہ جنگ احد میں یا بدر میں آئے تھے یا تم پر اسی وقت ٹوٹ پڑیں، تو تمہارا رب تم سے وعدہ فرماتا ہے کہ تمہاری امداد ایسے پانچ ہزار فرشتوں سے کرے گا جو بارگاہ الٰہی میں دوسرے فرشتوں سے اعلیٰ ان سے افضل اور نشان یافتہ ہیں یا اے مسلمانو! اگر تم صبر وتقویٰ اختیار کرو، اخلاص کے ساتھ جہاد کرو اور کفار تم پر اسی جوش سے ٹوٹ پڑیں، جیسے صحابہ پر احد میں ٹوٹ پڑے تھے، تو ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم پانچ ہزار نشان یافتہ فرشتوں کے ذریعہ تمہاری امداد کریں گے، بشرطیکہ تم ان شرائط کو پورا کرو،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** بدر واحد میں شرکت کرنے والے تمام صحابہ، مہاجرین وانصار ومتقی ہیں، ان کے صبر وتقویٰ کا قرآن کریم گواہ ہے، کیونکہ ملائکہ کی امداد صبر وتقویٰ سے مشروط تھی اور رب تعالیٰ نے ان کی بذریعہ ملائکہ امداد تو کی کہ خود صحابہ کرام نے ان جنگوں میں فرشتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، پتہ لگا کہ وہ حضرات بھی صابر ومتقی تھے ورنہ فرشتے نہ اترتے، **دوسرا فائدہ:** یہ امداد کرنے والے فرشتے دوسرے فرشتوں سے افضل ہیں، ان پر رب تعالیٰ نے خاص نشان لگا دیئے ہیں جن سے وہ دوسرے فرشتوں سے ممتاز معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ مُسَوِّمِیْنَ کی دوسری

قرأت سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** حضور انور ﷺ کی خدمت اعلیٰ عبادت ہے کہ یہ خدام فرشتے دوسرے عابد فرشتوں سے افضل ہیں لہٰذا حضور انور ﷺ کے صحابہ سارے مسلمانوں سے افضل، کہ انہیں سرکار کی خدمت میسر ہوئی، جب سرکار کی خدمت فرشتوں کو افضل کر دیتی ہے تو انسانوں کی افضل کیوں نہ کرے گی؟ **چوتھا فائدہ:** بلکہ جس کو صحابہ کرام کی خدمت نصیب ہو جائے وہ بھی بڑا خوش نصیب ہے، بدر اور احد میں فرشتے درحقیقت صحابہ کرام ہی کی خدمت کرنے آئے تھے جنہیں رب تعالیٰ نے تمام فرشتوں سے افضل قرار دیا، **پانچواں فائدہ:** جب صحابہ کرام کے خدام سب سے افضل ہوئے تو ان کے دشمن سب سے بدتر بھی ہیں، کہ جس کی نسبت بہت اونچا کرتی ہے اس کی عداوت بہت نیچا بھی کرتی ہے، پہاڑ سے گرنے والے کی ہڈیاں بھی سلامت نہیں رہتیں، **چھٹا فائدہ:** مسلمانوں کو ہمیشہ اور خصوصاً جہادوں میں صبر و تقویٰ ضرور اختیار کرنا چاہیے، اسی کی برکت سے ربانی نصرت و فتح اترتی ہے، یہ جو مشہور ہے کہ فوجیوں پر نماز فرض نہیں کہ وہ مجاہد ہیں غلط ہے، انہیں نماز وغیرہ کی زیادہ پابندی چاہیے کہ موت ہر وقت سامنے ہے، **ساتواں فائدہ:** مسلمان غازیوں پر انشاء اللہ ہمیشہ ہی آسمانی امداد آتی رہے گی، جس کا اب بھی مشاہدہ ہو رہا ہے، فقیر سے جنگ کشمیر کے موقعہ پر بعض غازیوں نے غیبی امداد کے عجیب و غریب نظارے بیان کئے، مجھ سے ایک آدمی نے کہا کہ ہم نے بارہ مولا کے محاذ پر ایک دفعہ گیارہ غازیوں نے بارہ ہزار کے جرار لشکر کو بھگا دیا اور بہت سوں کو قید بھی کر لیا، ان قیدیوں کا بیان تھا کہ ہم نے اس میدان میں ہزاروں فائروں کی آوازیں سنیں، اور بھی کئی عجیب کرشمے ان غازیوں نے ہم سے بیان کئے، بہر حال آیت بالکل حق ہے اور رب تعالیٰ کا وعدہ بالکل سچا، مسلمان جہاں بھی شکست کھاتے ہیں اپنی حرکتوں سے،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام نہ صابر تھے نہ متقی، ان کا صبر و تقویٰ مشکوک بلکہ معدوم ہے، دیکھو رب تعالیٰ نے فرمایا اگر تم صبر و تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہاری مدد ہوگی نہ انہوں نے صبر و تقویٰ کیا نہ ان کی مدد ہوئی، اسی لئے جنگ احد میں شکست ہوگئی، (روافض) **جواب:** اس اعتراض کے دو جواب ہیں ایک الزامی دوسرا تحقیقی، الزامی جواب تو یہ ہے کہ اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی نہ متقی ہوں نہ صابر کیونکہ یہاں اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا میں سب ہی سے خطاب ہے، اور بقول تمہارے جنگ احد میں سب ہی کو شکست ہوئی بلکہ حضرت علی مرتضیٰ اور خود حضور انور ﷺ کو سخت زخم پہنچے، جواب تحقیقی تفسیر سے معلوم ہو چکا کہ اگر یہاں تا قیامت مسلمانوں سے خطاب ہے تو آیت بالکل واضح ہے، اور اگر صحابہ کرام سے خطاب ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم صبر و تقویٰ پر قائم رہو تو تمہاری مدد ہوگی، رب تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب ﷺ سے فرمایا یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ (احزاب: ۱) اے نبی پاک اللہ سے ڈرے جاؤ، نیز بیان قانون کے لئے معصوموں، محفوظوں سے اس قسم کے کلام فرما دیئے جاتے ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محبوب آپ کی طرف اور دوسرے انبیاء کی طرف وحی کی گئی تھی لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (الزمر: ۶۵) اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے عمل ضبط ہو جائیں گے، میثاق کے دن حضرات انبیائے کرام علیہم السلام سے فرمایا فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (آل

مُسَمًّى یہ یا تو تداینتم کا متعلق ہے یا موخراً پوشیدہ کے اور دین کی صفت اجل کے معنی دیر لگانا ہے۔ اسی لئے موت کو اجل کہا جاتا ہے کہ وہ انتہائے عمر کے لئے مقرر ہے (کبیر) اجل کی کم سے کم مدت ایک مہینہ ہے (احمدی) چونکہ میعاد دو قسم کی ہوتی ہے ایک وہ جس میں کم وبیشی بالکل ناممکن ہو۔ جیسے سال مہینے اور تاریخ کا تقرر یہ اجل مبہم ہے۔ مُسَمًّى فرما کر مبہم کو نکال دیا۔ یعنی اے مسلمانو! جب تم آپس میں ادھار کا لین دین کرو کہ مال ادھار قیمت پر بیچو یا قیمت نقد لے کر مال ادھار دو اور اس میں صحیح طور پر میعاد مقرر ہو تو اس کے لئے دو حکم ہیں۔ ایک یہ کہ فَاكْتُبُوْهُ یہ حکم سب کو ہے۔ خواہ قرض دینے والا ہو یا لینے والا۔ ہٗ کا مرجع یا دین ہے یا اجل یہ حکم استحبابی ہے اور اگر وجوبی ہو تو فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (بقرہ: ۲۸۳) سے منسوخ ہے۔ (کبیر) اسی لئے حضور ﷺ اور صحابہ کرام نے بارہا ادھار کے معاملات بغیر تحریر بھی کئے۔ خود لکھنا اور کسی سے لکھوانا دونوں ہی اس میں داخل ہیں بلکہ کسی تیسرے سے لکھوانا زیادہ بہتر ہے۔ جیسا کہ اگلے جملہ سے معلوم ہوتا ہے بلکہ لکھواتے وقت گواہ شاہدوں کی موجودگی ان کی گواہی ڈلوا لینا بہت ہی مناسب ہے۔ اس لئے فاکتبوہ وغیرہ تمام صیغے جمع فرمائے گئے۔ یعنی تم سب اس قرض کو لکھ لو یا لکھوا لو۔ خیال رہے کہ اجل مسمی فرما کر اس جانب اشارہ ہے کہ دراز مدت کے قرض جن میں بھول چوک کا خطرہ ہو وہ لکھے جائیں۔ ایک آدھ گھنٹے کا قرض کہ کوئی چیز خریدی جیب میں پوری رقم نہیں ہے کہہ دیا کہ ابھی گھر سے بھجوائے دیتا ہوں یا کل تک پہنچ جائے گی اس کے لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اتنی سی مدت میں بھول چوک جھگڑے شاذ و نادر ہیں۔ اس لئے لکھنے کو اجل مسمی پر مرتب فرمایا۔ غرضکہ اس مختصری عبارت میں دیوان کے بہت سے قوانین بیان فرما دیئے گئے۔ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ یہ فکتبوہ کا بیان ہے اور کیفیت کتابت کی تفصیل۔ يَكْتُبْ کا مفعول بہ پوشیدہ ہے۔ بَيْنَكُمْ یا یکتب کا ظرف ہے یا جالساً قاعداً اور موجوداً پوشیدہ کا جو کاتب کا حال مقدم ہے۔ كَاتِبٌ یکتب کا فاعل بِالْعَدْلِ یا یکتب کے متعلق ہے یا متصفاً پوشیدہ کے اور کاتب کی صفت پہلی صورت میں اس کے معنی انصاف یا برابری یا وضاحت ہیں۔ اور اگر کاتب کی صفت ہو تو بمعنی عدالت و پرہیز گاری۔ خیال رہے کہ یہ بھی حکم استحبابی ہے۔ اگر وجوبی ہو تو وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ (بقرہ: ۲۸۲) سے منسوخ ہے۔ یعنی تم معاملہ کرنے والوں کے درمیان بیٹھ کر کاتب انصاف کے ساتھ صاف صاف دستاویز لکھے یا جاننے والا پرہیز گار متقی کاتب دستاویز لکھے چونکہ دستاویز و تمسک ہر لکھا پڑھا آدمی نہیں لکھ سکتا اس کے لئے قانون دان کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے کاتب محرر سے لکھوانے کا خصوصیت سے ذکر فرمایا لہٰذا ہو سکتا ہے کہ كَاتِبٌ کی تنوین بھی تعظیمی ہو یعنی کوئی شاندار قانون دان کاتب دستاویز لکھے۔ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ۔ لَا يَاْبَ اباء سے بنا بمعنی انکار کرنا۔ اَنْ يَّكْتُبَ کا مفعول پوشیدہ ہے كَمَا یا تو یکتب کے متعلق ہے اور بمعنی علت یا کتاباً پوشیدہ کے اور بمعنی تشبیہ یعنی وثیقہ نویس دستاویز لکھنے سے بلاوجہ انکار نہ کردے کیونکہ اس پر رب نے کرم فرمایا کہ اسے علم دیا۔ اس کا شکر یہ ہے کہ اپنے علم سے لوگوں کے کام نکالے اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (قصص: ۷۷) (روح المعانی) اس صورت میں یہ ممانعت تنزیہی ہے اور اگر تحریمی ہو تو۔ لَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ (بقرہ: ۲۸۲) سے منسوخ (کبیر) یا کوئی کاتب ایسی دستاویز لکھنے سے انکار نہ کرے جو قانون الٰہی کے مطابق ہو اور جیسے لکھنے کا اسے رب نے حکم دیا۔ اس صورت میں یہ ممانعت تحریمی ہے جیسے کہا جائے بے وضو نفل نہ پڑھو۔ یعنی کاتب یہ نہ کہے کہ میں

آنے کا خطرہ ہے، اگر ان مذکورہ کفار کا دل کے اس درہ پر دخل ہو گیا تو مومنین کے لشکر کو سخت خطرہ ہے، اس لئے اس دل کے درہ پر سخت مضبوط پہرہ لگانا ضروری ہے، دل کے درہ پر پہرہ اپنا محاسبہ ہے، اور کبھی نفس سے غافل نہ ہونا، اگر ہم نفس سے بے خبر نہ رہیں، اپنے اعمال کا حساب لیتے رہیں، یہ درہ خالی نہ چھوڑیں، تو اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کے ذریعے جو فرشتوں کی طرح محفوظ و مامون ہے ہماری مدد ضرور فرمائے گا، مرتے دم تک یہ جنگ جاری رہتی ہے اور ہر شخص کو اپنی آخری سانسوں تک اس درۂ دل کی نگرانی رکھنا لازم ہے، یہ جنگ اس دن فتح ہوگی جس دن ہم خیریت سے ایمان لے کر یہاں سے نکل جائیں اور ہم کو خاتمہ بالخیر میسر ہو جائے، حدیث شریف میں ہے اَلْاَمْرُ بِالْخَوَاتِیْمِ اعتبار خاتمہ کا ہے، امدادی فرشتوں کی طرح جو نیک بندے ہم گنہگاروں کی مدد کے لئے مقرر ہیں ان کی خاص نشانیاں رب تعالیٰ نے مقرر فرما دیں ہیں، سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (فتح: ۲۹) صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ دل کا یہ چور درہ جس کی طرف سے کفار نفس کے گھس آنے کا خطرہ ہے، ہر وقت ہی خطرہ میں ہے مگر خوشی وغم کے وقت اس کا خطرہ بڑھ جاتا ہے، اس لئے ان اوقات میں اس درہ کی نگرانی سخت چاہیے،

حکایت: حضرت سلطان العارفین بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک تیلن نے پوچھا کہ حضرت آپ کی داڑھی اچھی ہے یا میرے بیل کی دم؟ آپ نے فرمایا کہ مائی اگر مجھے ایمان پر خاتمہ نصیب ہو جائے تو میری داڑھی تیرے بیل کی دم سے کہیں بہتر ہے، اور اگر خاتمہ بالخیر میسر نہ ہو تو تیرے بیل کی دم میری داڑھی سے افضل ہے، کہ پھر دوزخ میرے لئے ہے اس کے لئے نہیں، وہ تو خاک کر دیا جائے گا (از شرح فقہ اکبر مصنفہ مولانا علی قاری) رب تعالیٰ خاتمہ بالخیر نصیب فرمائے،

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ

اور نہیں بنایا اس کو اللہ نے مگر خوشی تمہارے واسطے اور تاکہ مطمئن ہو جائیں

اور یہ فتح اللہ نے نہ کی مگر تمہاری خوشی کے لئے اور اسی لئے کہ اس سے تمہارے

قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

دل تمہارے اس کی وجہ سے اور نہیں ہے مدد مگر اللہ کی طرف سے

دلوں کو چین ملے اور مدد نہیں مگر اللہ غالب

الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِیَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِیْنَ

جو غالب حکمت والا ہے تاکہ قطع کر دے اللہ ایک کنارہ ان کا جو

حکمت والے کے پاس سے اس لئے کہ

كَفَرُوْۤا اَوْ یَكْبِتَهُمْ فَیَنْقَلِبُوْا خَآىِٕبِیْنَ ﴿۱۲۷﴾

کافر ہیں یا سرزنش فرمائے انہیں پس لوٹیں وہ نقصان والے ہو کر

اسراف نہ کرو۔ اسراف کرنے والے اللہ کو پسند نہیں اور بیجا خرچ کرنے والوں کو فرمایا کہ مبذرین یعنی ناجائز مقام پر خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان رب تعالیٰ کا نافرمان ہے۔ غرضکہ دیگر عبادات کی طرح صحیح خرچ بھی ضروری ہے۔ **دوسرا فائدہ:** رب نے جو فوائد و منافع حرام طریقوں سے حاصل کرنا حرام کئے ان کے لئے حلال ذریعہ بھی مقرر فرمادیئے (کبیر) دیکھو زنا حرام بیوی سے جماع حلال' سود حرام اور بیع سلم حلال شراب حرام' شہد حلال جس میں شراب سے بڑھ کر طاقت ہے اور نشہ بالکل نہیں۔ **تیسرا فائدہ:** بہتر یہ ہے کہ معاملہ کا کاتب معاملے والوں کے سوا کوئی تیسرا شخص ہو جیسا کہ کَاتِبٌ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** بہتر یہ ہے کہ کاتب عاقدین کے درمیان بیٹھے تاکہ دونوں کی بات بخوبی سن سکے جیسا کہ بینکم سے معلوم ہوا۔ (روح البیان) بلکہ ایک کی غیر موجودگی میں دستاویز ہرگز نہ لکھے۔ (روح البیان) **پانچواں فائدہ:** بہتر یہ ہے کہ کاتب مسائل شرعیہ جاننے والا اور متقی پرہیزگار ہو۔ کبیر نے فرمایا کہ کاتب فقیہ ہونا چاہیے۔ جیسا کہ بالعدل کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** ضروری یہ ہے دستاویز کی عبارت نہایت صاف اور واضح ہو جس میں آئندہ جھگڑا نہ پڑ سکے۔ بعض لوگ صد کو چند اور چند کو صد بنا لیتے ہیں۔ اگر سو لکھنا ہو تو حروف میں لکھے اور یوں لکھے کہ سو روپیہ جس کا نصف پچاس روپیہ ہوتا ہے جیسا کہ بالعدل کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** ہر جھگڑے والا معاملہ لکھ لینا بہتر ہے۔ خواہ دین ہو یا نقد لہٰذا زمین وغیرہ کی بیع کا بیعنامہ لکھنا چاہیے اگرچہ نقد خریدی ہو بلکہ رجسٹری بھی کرا دینی چاہیے۔ **آٹھواں فائدہ:** جمہور علماء کے نزدیک یہ تحریر مستحب ہے نہ کہ واجب' مگر عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ واجب ہے۔ ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ تین شخصوں کی دعا قبول نہیں ہوتی ایک وہ جس کی عورت بدخلق ہو اور وہ طلاق نہ دے۔ دوسرا وہ جو اپنا مال دیوانوں اور چھوٹے بچوں کے سپرد کر دے۔ تیسرا وہ جو بغیر لکھے اور گواہ بنائے قرض دے دے۔ یہ حدیث مرفوع بھی آئی ہے (احکام القرآن) **نواں فائدہ:** بہتر ہے کہ قرض بھی لکھ لے۔ اس آیت میں دین کی شرط میعاد کے لحاظ سے ہے۔ **دسواں فائدہ:** دین کی میعاد ایسی مقرر ہونی چاہیے جس میں جھگڑے کی گنجائش نہ رہے۔ یوں لکھے کہ اس ماہ رمضان کی پندرہ تاریخ جمعہ کے دن روپیہ ادا کروں گا۔ یوں نہ کہے کہ جب فصل کٹے گی تو دوں گا کیونکہ فصل کٹنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ کبھی جلدی کٹتی ہے اور کبھی دیر میں اور کہیں دیر میں کٹتی ہے اور کہیں جلدی۔ **گیارھواں فائدہ:** بیع سلم جائز اور قرآن سے ثابت ہے۔ بیع سلم یہ ہے کہ قیمت فی الحال دی جائے اور مال ادھار ہو۔ اس کی سات شرطیں ہیں۔ (۱) مال کی جنس مقرر ہو' گیہوں یا جو' (۲) مال کی قسم مقرر ہو مثلاً ذرا گیہوں یا فارم یا کپڑا ہے تو لٹھا فلاں نمبر کا یا گاڑھا۔ (۳) مال کی صفت مقرر ہو' مثلاً کھرے یا معمولی یا گیہوں شربتی اور رتوا۔ (۴) مال کی مقدار مقرر ہو مثلاً کہے کہ اس نرخ سے اتنے روپے کے کل اتنے خریدے (۵) اور وقت ادا مقرر ہو کہ فلاں مہینہ فلاں تاریخ میں مال لوں گا۔ (۶) ادا کی جگہ مقرر ہو کہ فلاں جگہ مال دیا جائے گا۔ قیمت فی الحال نقد دی جائے۔ (۷) اور اس کی مقدار بھی معلوم ہو۔ اس میں یہ بھی شرط ہے کہ وہ مال ایسا ہو جو وقت عقد سے وقت ادا تک بازار میں مل سکے۔ اس لئے فصل سے پہلے آم کی بیع سلم ناجائز ہے۔ **مسئلہ:** بیع سلم میں خریدار کو رب السلم اور بیچنے والے کو رب المال یا مسلم الیہ اور قیمت کو راس المال اور مال کو مسلم فیہ کہتے ہیں۔ (احمدی وغیرہ) بیع کی چار صورتیں ہیں۔ نقد کی نقد سے' نقد کی ادھار سے' ادھار کی نقد سے' اور ادھار کی

ادھار سے۔ اول تین جائز ہیں اور چوتھی ناجائز (کبیر) کہ مال بھی ادھار ہو اور قیمت بھی (سٹہ) اسی لئے آیت میں بدین فرما دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یک طرف دین جائز ہے دو طرفہ ناجائز۔ **مسئلہ:** کاتب لکھائی کے لئے اجرت لے سکتا ہے لیکن مسئلہ بتانے کی اجرت لینا حرام کیونکہ لکھنا یا مستحب ہے یا فرض کفایہ (احکام القرآن) مگر مسئلہ بتانا فرض عین۔ **مسئلہ:** فرض عین اور حرام پر اجرت لینا حرام۔ باقی کاموں پر جائز۔ **مسئلہ:** جہاں اجرت لینا حرام ہے وہاں دینا بھی حرام داڑھی مونڈنے، حرام تماشہ دکھانے، شراب پلانے وغیرہ کی اجرت لینا بھی حرام اور دینا بھی۔ **بارھواں فائدہ:** دستاویز کی تحریر اور معاملات کے مسائل سیکھنا فرض کفایہ ہیں۔ (احکام القرآن) کہ جس کو یہ کام پڑتے رہتے ہیں انہیں ان مسائل کا سیکھنا فرض عین ہے باقی مسلمانوں میں اگر ایک بھی سیکھ لے تو سب کا فرض ادا ہو جائے گا۔ دستاویز نویس دستاویز کے شرعی احکام ضرور سیکھیں اور معاملات و مقدمات والے ان احکام شرعیہ سے ضرور واقف ہوں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: تداینتم میں دین آ گیا تھا پھر بدین کیوں فرمایا؟ **جواب:** چند وجوہ سے۔ (۱) اس لئے کہ فاکتبوہ کی ضمیر اس کی طرف لوٹ سکے کیونکہ تداینتم میں دین مصدر آیا تھا۔ یعنی قرض دینا اور یہ دین مصدر نہیں بلکہ بمعنی قرض ہے۔ (۲) نیز تاکہ ہر چھوٹے بڑے قرض کو شامل ہو جائیں۔ (۳) اور اس لئے کہ معلوم ہو جائے کہ بیع میں قرض یک طرفہ چاہیے نہ کہ دو طرفہ (۴) اور تاکہ معلوم ہو جائے کہ تداینتم دین بمعنی قرض سے بنا ہے نہ کہ دین بمعنی بدلہ سے جیسے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ **دوسرا اعتراض:** تداینتم باب تفاعل ہے شرکت چاہتا ہے اس سے لازم آتا ہے کہ دو طرفہ دین کی بیع یعنی (سٹہ) جائز ہو حالانکہ فقہا اس سے منع فرماتے ہیں؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ بمعنی تَعَامَلْتُمْ ہے یعنی جب تم ادھار کا معاملہ کرو اور ظاہر ہے کہ معاملہ قرض میں قرض خواہ اور مقروض دونوں شریک ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ باب تفاعل یا مفاعلۃ کے لئے شرکت لازم نہیں کہا جاتا ہے فَاقْطَعْتُ اللِّصَّ۔ میں نے چور کے ہاتھ کاٹ دیئے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت کی عبارت میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔ اولاً فرمایا گیا فاکتبوہ تم خود لکھو۔ اور پھر فرمایا گیا وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ کہ تمہارے درمیان کوئی منشی لکھے؟ **جواب:** یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ فاکتبوہ سے مراد ہے لکھ لو۔ خواہ اپنے آپ یا بذریعہ کسی کاتب کے وکیل کا فعل خود موکل کا ہوتا ہے۔ یا اس آیت میں دونوں کاموں کی اجازت دی۔ اپنے آپ لکھ لیں یا لکھوالیں۔

وَلْيُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ؕ فَاِنْ

اور چاہیے کہ املا کرے وہ جو اوپر اس کے حق ہے اور چاہیے کہ ڈرے اللہ رب اپنے سے اور نہ کم کرے اس سے کچھ پس اگر

اور جس پر حق آتا ہے وہ لکھتا جائے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور حق میں سے کچھ رکھ نہ چھوڑے پھر

كَانَ الَّذِیْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ

ہو وہ شخص کہ جس پر حق ہے بے عقل یا کمزور یا نہیں طاقت رکھتا ہو اس کی کہ املا بولے وہ

اَیْ لِیُهْلِکَ، روح المعانی میں ہے وَالْقَطْعُ اَلْاِهْلَاکُ طَرَفَ کے معنی ہیں جانب و کنارہ، اس کا استعمال جسم، وقت اور اس کے ماسویٰ بھی ہوتا ہے، کبھی جماعت کے ایک حصہ کو بھی طرف کہتے ہیں (غیاث) یہاں طرف سے مراد سرداران قریش ہیں جو جنگ بدر میں مارے گئے، اساس میں ہے اَطْرَافُ الْعَرَبِ اَیْ اَشْرَافُهَا، کیونکہ سردار عوام سے کنارے پر ہی رہتے ہیں، یعنی کنارہ پر رہنے والی سرداروں کی جماعت مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا یہ ثابتاً کے متعلق ہو کر طرفاً کی صفت ہے یا اس کا حال، اس سے کفار مکہ مراد ہیں یعنی جنگ بدر میں تمہیں فتح دینے کا ایک مقصد سرداران کفر کی ایک جماعت کا ہلاک کردینا ہے اَوْ یَکْبِتَهُمْ فَیَنْقَلِبُوْا خَآئِبِیْنَ، یَکْبِتَ کبتٌ سے بنا جس کے معنی ہیں پچھاڑنا، رسوا کرنا، شکست دینا، ذلیل کرنا، چنانچہ لسان العرب میں ہے اَلْکَبْتُ الصَّرْفُ وَالْاِذْلَالُ (کبیر و معانی وغیرہ) انقلاب کے معنی ہیں جدھر سے آیا تھا ادھر لوٹ جانا، خائبین خیبۃٌ سے بنا ظفر کا مقابل، خیبہ کے معنی ہیں محرومی، جو محرومی توقع کے بعد ہو وہ خیبہ ہے، اور مطلق محرومی یاس، خیبہ کا مقابل ظفر ہے اور یاسٌ مقابل رجاءٌ چونکہ کفار بدر اپنی فتح کا یقین کر کے آئے تھے، حتی کہ بعد فتح جشن منانے کے لئے شراب اور رنڈیاں بھی ساتھ لائے تھے، مگر کھا گئے شکست، اس لئے ان کے لئے خَآئِبِیْنَ فرمانا بہت ہی موزوں ہے، یعنی اس فتح کا دوسرا مقصد بقیہ کفار کو ذلیل کر کے واپس لوٹا دینا ہے،

خلاصہ تفسیر

ان دونوں آیتوں میں یا تو جنگ احد ہی کا ذکر ہے یا جنگ بدر کا یا پہلی آیت میں جنگ احد کا ذکر ہے اور دوسری میں جنگ بدر کا، ہم تیسرے معنی کی بنا پر خلاصہ تفسیر لکھ رہے ہیں، اے بدر و احد کے غازیو! جنگ احد میں فرشتوں کا تمہارے پاس آنا اور ان کا تمہاری امداد کرنا کفار کو ہلاک کرنے کے لئے نہ تھا ورنہ ایک فرشتہ ہی زمین کا طبقہ لوٹ سکتا ہے، ان کی جنگ احد میں شرکت اس لئے تھی کہ تمہیں خوشی نصیب ہو، اور تمہارے دلوں کو چین میسر ہو، چنانچہ اسی جنگ احد میں صحابہ کرام کو ایسا سکون نصیب ہوا کہ بعض حضرات کھڑے کھڑے اونگھ رہے تھے، اور ظاہر ہے کہ اونگھ و نیند بے چینی میں نہیں آتی، خیال رکھنا کہ فتح و نصرت محض زیادتی تعداد و اسباب سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اللہ غالب ہے، اگر کمزور پر کرم فرمائے تو وہ غالب ہو جائے لہٰذا وہ اس پر قادر ہے کہ تمہیں جنگ احد کی تکالیف کا بدلہ دلا دے، اور وہ حکمت والا بھی ہے، جو کچھ احد میں پیش آیا، اس میں اس کی ہزاروں حکمتیں ہیں، اور اے مسلمانو جنگ بدر میں جو تمہیں شاندار فتح دی گئی، اس کا مقصد بھی کفار کو بالکل تباہ کرنا نہ تھا، بلکہ اس کے دو مقصد تھے، ایک تو سرداران کفر کو ہلاک کرنا، چنانچہ اس جنگ میں ۷۰ کافر مارے گئے جن میں ۲۴ سردار تھے، اور ان ۲۴ میں اٹھارہ رؤسائے عرب تھے، دوسرا باقی ماندہ کفار کو ذلیل کرنا، اور جو امیدیں باندھ کر وہ آئے تھے ان میں انہیں ناکام بنا کر واپس کر دینا، چنانچہ ان میں سے ۷۰ گرفتار کئے گئے اور باقی بہت برے حال میں بھاگ گئے،

فائدے

ان دو آیتوں سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** اللہ والوں کا قرب اور رحمت کے فرشتوں کا نزول دلی اطمینان اور قلبی خوشی کا ذریعہ ہے کہ اس کی برکت سے قدرتی طور پر چین و سکون میسر ہوتا ہے جیسا کہ اِلَّا بُشْرٰی سے معلوم ہوا،

ضروری ہے۔ یعنی کاتب مقروض کی طرف سے لکھے گا کہ میں فلاں مال فلاں سے قرض لیتا ہوں۔ قرض خواہ کی طرف سے نہ لکھے گا کہ میں فلاں کو اتنا قرض دیتا ہوں۔ خیال رہے کہ مقروض کا مضمون ہونا ضروری ہے نہ کہ عین عبارت لہٰذا کاتب کو یہ جائز ہے کہ اگر مقروض بے ڈھنگی عبارت بولے یا کسی اور زبان میں کلام کرے تو اس کی اصلاح کر کے تحریر کرے (تفسیر احمدی) بشرطیکہ اس کا مقصود نہ بدلے۔ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ یہ واؤ بھی عاطفہ ہے اور یَتَّقِی۔ وقیٌ سے بنا بمعنی ڈرنا۔ رب کے دو نام ارشاد فرمائے گئے۔ اسم ذات جلالی یعنی اللہ اور اسم صفت جمالی یعنی رب تا کہ مقروض خوب ڈرے یعنی چاہیے کہ مضمون لکھاتے وقت مقروض رب کا خوف دل میں رکھے صرف دوسرے کو پھانسنے اور اسے قانونی شکنجہ میں کسنے کی کوشش نہ کرے ہر معاملہ کا یہ ہی حکم ہے۔ نکاح۔ بیع۔ اجارہ۔ قرض۔ بیع سلم' ان سب میں لکھنے والا اپنے بچاؤ کی کوشش کرے نہ کہ دوسرے کو پھانسنے کی اسے اپنا اسلامی بھائی تصور کر کے لکھت پڑھت کرے کہ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا یہ ولیتق پر عطف تفسیری ہے۔ يَبْخَسْ بخسٌ سے بنا بمعنی کمی اور نقصان' کھوٹے پیسوں کو اسی لئے ثمن بخس کہتے ہیں کہ بازار میں ان کی قیمت کم ہوتی ہے۔ منہ کا مرجع وہ حق ہے جس کا املاء بولا جا رہا ہے۔ شیئًا کی تنوین تحقیر کی ہے یعنی مضمون لکھوانے والا مقروض اس قرض میں سے کچھ بھی کم نہ کرے' نہ مقدار میں' نہ قرض کی نوعیت میں اور نہ اس کی مدت میں چونکہ مقروض کے متعلق کمی کا ہی احتمال تھا نہ کہ زیادتی کا۔ اس لئے اسی سے روکا گیا۔ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ یہاں اگرچہ بجائے الذی کے ضمیر ہی کافی تھی لیکن زیادتی وضاحت کے لئے ظاہری لایا گیا۔ اس الذی سے وہ ہی لکھوانے والا مقروض مراد ہے۔ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ یہ تینوں کان کی خبر ہیں اور لا یستطیع یا تو غیر مستطیعین کے معنی میں ہو کر بتاویل مفرد ضعیفًا پر معطوف ہے۔ یا کسی مفرد محذوف کی صفت۔ خیال رہے کہ ان تینوں کو اوٗ سے معطوف کیا گیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے معانی میں بہت فرق ہے۔ سفیہ سفہ یا سَفَاهَةٌ سے مشتق ہے بمعنی بے وقوف احمق' بے عقل' اس میں پورے دیوانے بھی داخل ہیں۔ اور مخبوط الحواس بھی (کبیر و معانی وغیرہ) ضعیف ضعف سے بنا بمعنی کمزوری۔ یہاں وہ کمزوری مراد ہے جو عمر کے لحاظ سے ہو۔ یعنی لڑکپن یا بڑھاپا' جس کی وجہ سے وہ مضمون نہ لکھا سکے۔ لا یستطیع' استطاعت سے بنا بمعنی طاقت رکھنا۔ یہاں کمزوری زبان' گونگا پن' زبان سے ناواقفیت مراد ہے یعنی اگر مقروض بے عقل یا کمزور بچہ اور بڈھا گونگا یا زبان سے ناواقف ہو۔ غرض اس میں کوئی ایسی وجہ ہو جس سے مضمون نہ لکھا سکے تو فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ۔ وَلِیٌّ بمعنی قریب ہوتا ہے اور بمعنی متولی و کارکن بھی یعنی وکیل اور مترجم وغیرہ یہاں بطریق عموم مشترک سارے معنی مراد ہیں۔ مجنوں و بچہ کے معاملات اس کا قریبی کرے گا۔ باپ بیٹا۔ قاضی یا سلطان اور زبان سے ناواقف اور گونگے وغیرہ کے معاملات اس کا کارکن۔ مختار یا وکیل انجام دے گا مگر بچے دیوانہ' پاگل کا ولی اپنی زبان میں اشام لکھوائے گا کہ کسی اپنے فلاں عزیز کی طرف سے یہ عقد کر رہا ہوں اور اس کے حقوق میرے ذمہ ہیں مگر گونگے زبان سے ناواقف کا ولی اس کی زبان میں لکھوائے گا کہ بچے پاگل دیوانہ کا عقد غیر معتبر ہے اور گونگے کا عقد و اقرار معتبر۔ ہٗ کا مرجع مدیون ہے نہ کہ دین کیونکہ قرض خواہ مضمون نہیں لکھوا سکتا۔ یعنی ان سب صورتوں میں مقروض کا ولی یا والی یا کارکن اس کی طرف سے اشام لکھوائے گا۔ مگر عدل و انصاف کے ساتھ کہ نہ قرض خواہ کی رعایت کر کے زیادہ لکھوا دے نہ مقروض کی طرفداری میں کم چونکہ کارکن کے متعلق زیادتی اور کمی دونوں کا اندیشہ

اور عارضی میں فرق ہو جائے، جیسے رب تعالیٰ نے فرمایا لِتَرْكَبُوْهَا وَ زِيْنَةً (نحل: ۸) یعنی ہم نے گھوڑے، گدھے، خچر تمہاری سواری اور زینت کے لئے پیدا فرمائے، چونکہ سواری اصل مقصود تھا، اسے جملہ سے بیان فرمایا، اور زینت کا مقصد عارضی تھا، اس کا ذکر مفرد سے ہوا، دیکھو یہاں زینت جو مفرد ہے لِتَرْكَبُوْا جملہ پر معطوف ہوا، دوسرے یہ کہ واؤ عاطفہ ہے ہی نہیں بلکہ زائدہ ہے، اور وَ لِتَطْمَئِنَّ، بُشْرٰى کی علت، خلاصہ یہ ہے کہ فرشتوں کا اترنا بشارت کے لئے ہے، اور بشارت اطمینان قلب کے لئے، **دوسرا اعتراض:** جب غازیانِ احد و بدر نے فرشتوں کو دیکھا ہی نہیں، تو انہیں فرشتوں کی وجہ سے اطمینان قلبی کیسے نصیب ہوا؟ **جواب:** اس طرح کہ انہیں نبی کریم ﷺ نے نزولِ ملائکہ کی خبر دی، اور مسلمانوں کو حضور ﷺ کی خبر پر اپنی آنکھوں سے زیادہ اعتماد ہے، آج بھی حضور انور ﷺ کی بشارتوں پر مسلمان جان سے کھیل جاتے ہیں، **تیسرا اعتراض:** خدا کے سوا مددگار کوئی نہیں، دیکھو رب تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (انفال: ۱۰) جو ولیوں، نبیوں کو مددگار مانے، وہ اس آیت کا منکر ہے، **جواب:** جی ہاں! تب ہی تو جنگِ بدر میں امداد کے لئے فرشتے بھیجے گئے، اور تبھی تو آپ حضرات مدرسوں کی امداد کے لئے مالداروں کو پکارتے ہو، جناب! حقیقی امداد تو صرف رب تعالیٰ کی ہے، مجازی بندوں کی، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ (تحریم: ۴) **چوتھا اعتراض:** کیا صحابہ کرام کو حضور انور ﷺ کی برکت سے اطمینان قلبی نصیب نہ ہوا، جو ان کے اطمینان کے لئے فرشتے اتارے گئے، **جواب:** اطمینان کی بہت قسمیں ہیں، دیکھو ہم لوگوں کو کوئی اطمینان تو مال سے حاصل ہوتا ہے، اور کوئی اطمینان وطن پہنچ کر، اور کوئی اطمینان دوست واحباب سے مل کر، ان حضرات کو تلاوتِ قرآن شریف سے بھی اطمینان ہوتا تھا، حضور انور ﷺ کے دیدار سے بھی، اور ملائکہ سے بھی، یہ سارے اطمینان مل کر نور علیٰ نور ہو جاتے تھے،

تفسیر صوفیانہ

انسان جسم و روح کا مجموعہ ہے، جسم اس دنیا کا دیس ہے، اور روح یہاں پردیسی، روح کا دیس عالم بالا ہے، ہر شخص کو اپنے وطن پہنچ کر بلکہ اپنے وطن کا ذکر سن کر اپنے وطن کے لوگوں کو دیکھ کر چین ہوتا ہے، پردیس میں بے قراری ہے، دیس میں قرار، کوئی دل روح کی منزل ہے اور کوئی نفسِ امارہ کی، جسم و نفس کی راحت دنیوی سامان ہیں، مگر روح کی راحت و چین اخروی سامان، جس دل پر روح کی جلوہ گری ہے، اس دل کو روحانیات سے چین ملتا ہے، اور جس دل پر نفس امارہ چھایا ہوا ہے، اس کے لئے دنیاوی مشاغل باعثِ راحت ہیں، چونکہ صحابہ کرام کے دلوں پر حضور انور ﷺ کی صحبت کی برکت سے روحانیت غالب تھی، بلکہ وہ حضرات سراپا روحانیت بن چکے تھے، اس لئے ان کا چین حضور انور ﷺ کی صحبت، اللہ تعالیٰ کے ذکر اور ملائکہ کے نزول سے تھا، رب تعالیٰ فرماتا ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (رعد: ۲۸) کفار کے دلوں پر ان کے نفوس چھائے ہوئے تھے، اس لئے انہیں دنیا و دنیاوی سامان میں لذت آتی تھی، دنیا مثل دریا کے ہے اور مومن کا قلب کشتی، اگر کشتی دریا میں رہے تو پار لگ جائے گی، لیکن اگر دریا کشتی میں آجائے تو غرق ہو جائے گی، مومن کا دل دنیا میں رہتا ہے مگر اس کے دل میں دنیا نہیں رہتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کا خوف، حضور انور ﷺ کی محبت و اطاعت کا جذبہ رہتا ہے، مولانا فرماتے ہیں شعر

آب در کشتی ہلاک کشتی است آب اندر زیر کشتی پشتی است

بدر کے میدان میں جسموں ہی کی جنگ نہ تھی، بلکہ روحانی ونفسانی دلوں کا بھی مقابلہ تھا، اللہ تعالٰی نے روحانی دل والوں کے لئے سامانِ فتح ونصرت اتارا، جس کے مقابلہ میں نفسانی دل والے شکست کھا گئے، یہ خیال نہ کرو کہ جنگِ بدر واحد ایک مرتبہ ہی ہوچکیں بلکہ یہ معرکے ہوتے ہی رہتے ہیں، اور اللہ تعالٰی روحانی دلوں کی غیبی امداد فرماتا ہی رہتا ہے، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ عقل اس جنگ کا ہتھیار ہے، اگر عقل نفس کے قبضہ میں آگئی، تو اس کی امداد کرے گی، اگر روح کے قبضہ میں آگئی، تو اس کی مدد ومعاون ہوگی، ابوجہل کی عقل اس کے نفس کا ہتھیار تھی، اور صدیق اکبر کی عقل ان کے روح ودل کا اسلحہ بنی، اسلحہ جس کے قبضہ میں ہو، اسی کی مدد کرتا ہے عقل کا بھی یہ ہی حال ہے، اسی لئے عقل کو نفس کے تابع نہ کرو، عقل روحانی اللہ کی رحمت ہے، عقل نفسانی رب تعالٰی کا عذاب،

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ
نہیں ہے آپ کو لائق اس کام میں سے کوئی چیز یا تو اللہ توبہ ڈالے ان پر
یہ بات تمہارے ہاتھ نہیں یا انہیں توبہ کی توفیق دے یا ان
اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي
یا عذاب دے انہیں کیونکہ وہ ظالم ہیں اور اللہ ہی کا ہے وہ جو
پر عذاب کرے کہ وہ ظالم ہیں اور اللہ ہی کا ہے
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ
آسمانوں میں ہے اور وہ جو زمین میں ہے بخشے گا جس مجرم کو چاہے
جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے جسے چاہے بخش دے
وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾
اور سزا دے گا جسے چاہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے
اور جسے چاہے عذاب کرے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** گذشتہ آیت میں ارشاد ہوا کہ کفارِ بدر کے تین حصے ہوگئے، ایک وہ جو مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے، دوسرے وہ جنہیں مسلمانوں نے قید کرلیا، تیسرے وہ جو بھاگ گئے، اب اس تقسیم کی وجہ بیان ہورہی ہے کہ جو کفر پر مرنے والے تھے اور ان کی پشت سے اب کوئی مومن پیدا ہونے والا نہ تھا انہیں تو بدر

میں قتل کرادیا گیا، اور جنہیں خود مسلمان ہونا تھا یا ان سے مسلمان پیدا ہونے تھے انہیں قتل سے بچالیا گیا، **دوسرا تعلق:** گزشتہ آیت میں فرمایا گیا تھا کہ احد کا واقعہ ہونے میں بھی ہماری حکمت ہے، کیونکہ ہم عزیز وحکیم ہیں، ہمارا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اب اس آیت میں اسی حکمت کا ذکر ہے، **تیسرا تعلق:** گزشتہ آیتوں میں احد کے واقعہ پر مسلمانوں کو تسکین دی گئی، اب اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے، **چوتھا تعلق:** گزشتہ آیات میں جنگِ بدر واحد کا ذکر کیا گیا، جن میں سے بدر میں کفار نے شکست فاش کھائی تھی، اور احد میں مسلمانوں نے تکلیف اٹھائی تھی، اب اس آیت میں رب تعالیٰ کی سلطنتِ قاہرہ کا ذکر ہے، کہ ہم مالک حقیقی ہیں جس کو چاہتے ہیں اونچا کرتے ہیں، اور جسے چاہیں نیچا دکھاتے ہیں، ہم پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں،

شانِ نزول

اس آیت کے نزول کے متعلق چند روائتیں ہیں، (۱) ایک وہ جو مسلم و بخاری میں بروایت انس ابن مالک ہے، کہ جنگِ احد میں عتبہ ابن ابی وقاص نے نبی کریم ﷺ کو زخم بھی پہنچایا، اور اسی کے پتھر سے آپ کا دانت مبارک بھی شہید ہوا، نبی کریم ﷺ اپنے چہرۂ انور سے خون پونچھتے تھے اور سالم یعنی ابوحذیفہ کے غلام اور جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خون دھوتے تھے، اسی حال میں حضور انور ﷺ نے فرمایا وہ قوم کیسے کامیاب ہوگی جس نے اپنے نبی کے چہرہ کو خون سے رنگ دیا، حالانکہ نبی ان کے خیر خواہ ہیں بدخواہ نہیں، وہ تو انہیں دوزخ سے بچانے جنت میں لے جانے کی کوشش کررہے ہیں، تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، (۲) دوسرے یہ کہ جنگِ احد ختم ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ حضرت حمزہ کی لاش پر تشریف لائے، دیکھا کہ آپ کا مثلہ کیا گیا تھا، حضور انور ﷺ کو یہ دیکھ کر بہت صدمہ ہوا، تو آپ نے فرمایا کہ ہم اس کے بدلہ میں کفار کے تیس مقتولوں کا مثلہ کریں گے، تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، (۳) تیسرے یہ کہ صفر ۴ھ کے درمیان بیر معونہ سے جو کہ مکہ معظمہ اور عسفان اور علاقہ ہذیل کے درمیان ہے کچھ لوگ حضور انور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بولے کہ ہم لوگ مسلمان ہوچکے ہیں، ہمیں علم سکھانے کے لئے کچھ علماء دیئے جائیں، اس علاقہ میں رعل، ذکوان، عصیہ، بنی لحیان قبیلے آباد تھے، حضور انور ﷺ نے ستر قاری بھیج دیئے، جن کا امیر حضرت منذر ابنِ عمرو کو بنایا، جب یہ حضرات بیر معونہ پہنچے تو مذکورہ قبائل نے بدعہدی کی، اور عامر ابن طفیل کی سرکردگی میں ان سب کو شہید کردیا، صرف کعب ابن زید نجاری بچے وہ بھی آخری سانسوں میں، جب حضور انور ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی، آپ کو سخت صدمہ ہوا، اور آپ نے ان قبیلوں پر ایک ماہ تک بددعا فرمائی، اس طرح کہ جماعت نمازِ فجر میں دوسری رکعت کے رکوع سے سر اٹھا کر قنوت نازلہ پڑھتے تھے، تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، اور قنوت نازلہ منسوخ فرمائی گئی (بخاری ومسلم وغیرہ وتفسیر کبیر وخازن وبیضاوی وروح المعانی وتفسیر صاوی وغیرہ) مگر ان روایات میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ بیر معونہ کا واقعہ جنگِ احد سے صرف چار ماہ بعد ہوا، ابھی جنگِ احد کے زخم ہرے تھے، کہ بیر معونہ والوں نے یہ چرکے اور لگادیئے، تب نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں نے کفار احد اور قبائل بیر معونہ سب پر ہی بددعا فرمائی، کفارِ احد پر احد کے واقعات کی بنا پر اور ان قبیلوں پر بیر معونہ کے واقعات کی وجہ سے، غرضکہ یہ تمام واقعات ہی اس آیت کے نزول

کا باعث ہیں،

تفسیر

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ لَیْسَ فعل ناقصہ ہے شئیٌ اس کا اسم مؤخر لک خبر مقدم ہے، مِنَ الْاَمْرِ، شَيْءٌ کا حال مقدم، اصل عبارت یوں تھی لَيْسَ شَيْءٌ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ، اَلْاَمْرِ میں الف لام عہدی ہے، جس سے یا تو وہ مذکورہ بالا چیزوں کی طرف اشارہ ہے، بعض کفار بدر کا قتل ہونا، بعض کفار کا قید ہونا اور بعض کا بھاگ جانا، یا آئندہ دو چیزوں کی طرف اشارہ ہے، یعنی کفار کو توبہ کی توفیق ملنا، یا ان پر عذاب آنا، یا اس دعا کی طرف اشارہ ہے جو حضور انور ﷺ نے تیس روز تک پڑھی یعنی قنوتِ نازلہ، اگر اَلْاَمْرِ سے وہ بددعائیں مراد ہیں تو لَکَ یا تو مناسباً محذوف کے متعلق ہے یا لائقاً وغیرہ کے اور اگر پہلی دو چیزوں کی طرف اشارہ ہے تو لَکَ مِلْکًا کے متعلق ہوگا یعنی اے محبوب ﷺ ان بددعاؤں میں سے کوئی چیز آپ کی شان کے لائق نہیں، کیونکہ آپ رحمۃ للعالمین ہیں، یا ان دل گداز واقعات پر اتنا رنج وغم کرنا آپ کی شانِ استقامت کے لائق نہیں، آپ کا دل تو پہاڑوں سے بھی زیادہ مضبوط ہے، یا ان کفار بدر کا ہلاک ہونا، قید ہونا، بھاگ جانا، یا ان کفار کو آئندہ توبہ کی توفیق مل جانا، یا ان کا کفر پر رہنا اور اس کے باعث دنیا وآخرت میں عذاب پانا آپ کے ملک وقبضہ میں نہیں، یہ تو ہمارے قبضہ کی چیزیں ہیں، اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ اس چوتھے معنی کی طرف مشیر ہے (از تفسیر کبیر وبیضاوی ومدارک وغیرہ) اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ اس جملہ کی ترکیب میں بہت اضطراب ہے، اور مفسرین کے اس میں بہت سے قول ہیں، تفسیر بیضاوی نے فرمایا کہ دونوں اَوْ حرفِ عطف ہیں اور یہ اَلْاَمْرِ پر معطوف ہیں، اور دونوں اَوْ کے بعد اَنْ پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے يَتُوْبَ توبہ کے معنی میں ہو گیا، اور يُعَذِّبَ عذاب کے معنی میں، اور آیت کے معنی یوں ہوئے، کہ اے محبوب ان کفار کے گذشتہ معاملات یا ان کی آئندہ توبہ یا عذاب میں سے کوئی چیز آپ کی ملکیت میں نہیں، تفسیر کبیر ومعانی وخازن اور بیضاوی وغیرہ نے فرمایا کہ پہلا اَوْ، اِلٰی اَنْ یا اِلَّا اَنْ کے معنی میں ہے، اور دوسرا اَوْ عاطفہ، اور یہ جملہ لَيْسَ کی انتہا ہے، یعنی اے محبوب (ﷺ) ان کفار کی توبہ یا عذاب تک آپ ان سے کوئی تعلق نہ رکھیں، اگر انہیں توبہ کی توفیق مل جائے، تو آپ شکریہ ادا کریں، اور اگر یہ عذاب پا جائیں تو آپ ان کی تکلیف سے چھوٹ جائیں، بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ دونوں اَوْ عاطفہ ہیں، اور یہ جملہ لِيَقْطَعَ طَرَفًا پر معطوف ہے، اور لَيْسَ سے شَيْءٌ تک کا جملہ معترضہ ہے، یعنی بدر کا یہ واقعہ اس لئے ہوا تا کہ کفار کا ایک حصہ کٹ جائے یا توبہ کرے یا عذاب پائے، (کبیر وغیرہ) بہر حال آیت کی ترکیب پیچیدہ ہے، اور ہوسکتا ہے کہ پہلا اَوْ زائدہ ہو، اور دوسرا عاطفہ، جیسا کہ اَمَّا عاطفہ میں ہوتا ہے، اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کا ترجمہ اسی جانب اشارہ کر رہا ہے فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ یہ جملہ يُعَذِّبَهُمْ کی علت ہے، ظالم بمعنی کافر ومشرک ہے، یعنی انہیں توبہ کی توفیق ملے گی، تو اس لئے، کہ ہم التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ہیں، اور اگر عذاب دے تو اس لئے، کہ یہ کفار ظالم ہیں، وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ یہ جملہ گذشتہ جملہ کی دلیل ہے، لام ملکیت کا ہے، اور ما سے مراد آسمانی وزمینی ساری مخلوق ہے عاقل ہو یا غیر عاقل، چونکہ غیر عاقل مخلوق کے اقسام زیادہ ہیں، اور عاقل مخلوق کے اقسام تھوڑے، اس لئے یہاں ما فرمایا گیا اگرچہ آسمان وزمین کے علاوہ عالم انوار، عالم امر وغیرہ میں بھی مخلوق

الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا۔ یہ دستاویز کی تحریر اللہ کے نزدیک انصاف کی چیز ہے اور گواہی کو درست رکھنے والی ہے۔ **مسئلہ:** اگر گواہ کو دستاویز دیکھ کر بھی واقعہ یاد نہ آئے تو اس کی گواہی درست نہیں کیونکہ یہاں ارشاد ہوا کہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے۔ یہ نہیں فرمایا گیا کہ دستاویز کی تحریر دیکھ لے۔ معلوم ہوا کہ یاد دلانے کا صرف یہ ہی خاص طریقہ ہے۔ **مسئلہ:** قرض کی گواہی واقعہ دیکھ کر جائز ہے نہ کہ محض دستاویز کی تحریر سن کر ہاں اس صورت میں یہ گواہی دے سکتا ہے کہ ہمیں فلاں شخص نے اپنا اقرار نامہ سنایا تھا۔ **مسئلہ:** دستاویز میں گواہوں کے دستخط ضروری نہیں۔ ہاں بہتر ہیں تاکہ یاد رہے اور حاکم گواہوں کو کچہری میں حاضر کر سکے۔ **مسئلہ:** اولاد کی گواہی ماں باپ کے حق میں قبول نہیں۔ ان کے خلاف قبول ہے اور دشمن کی گواہی دشمن کے خلاف مردود اور موافق مقبول۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ متقی غلام کی گواہی قبول ہے کیونکہ آیت نے گواہ میں تین قیدیں لگائیں۔ مرد ہونا مسلمان کی جماعت سے ہونا۔ مِنْ رِّجَالِكُمْ اور متقی ہونا (مِمَّنْ تَرْضَوْنَ) جب اس غلام میں تینوں صفتیں موجود ہیں تو اس کی گواہی کیوں نامقبول ہے؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ رجال سے مراد آزاد مرد ہیں۔ یہ ہی مجاہد کا قول ہے (بیہقی و تفسیر درمنثور) دوسرا یہ کہ اس آیت میں گواہی کی ساری شرائط مذکور نہیں ہوئی۔ باقی شرائط احادیث سے ثابت ہیں۔ تیسرا یہ کہ اگلے جملہ میں ارشاد ہو رہا ہے۔ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا جب گواہ بلائے جائیں تو آنے سے انکار نہ کریں، جس سے معلوم ہوا کہ گواہ وہ ہونا چاہیے جو خود مختار ہو بلانے پر آ سکے۔ غلام مولیٰ کے قبضہ میں ہے۔ اسے مولیٰ کے بغیر اجازت حج اور جماعت نماز کے لئے جانا جائز نہیں تو ادائے شہادت کے لئے جانا کیونکر جائز ہوگا (از کبیر)

دوسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر مسلمان کا ولی نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں بالعدل کی قید ہے جیسے ذَوَیْ عَدْلٍ کی وجہ سے کافر مسلمان کا گواہ نہیں بن سکتا تو اس کا ولی کیسے بن سکتا ہے۔ **جواب:** ذوی عدل میں عدل بمعنی تقویٰ و پرہیزگاری ہے (عدالت) اور بِالْعَدْلِ میں بمعنی انصاف۔ اگر یہ بھی اسی معنی میں ہوتا تو یہاں بجائے ب کے ذوا تا کیونکہ ولی کی صفت ہوتا حالانکہ یہاں املاء بولنے کی قید ہے۔ ابوطالب شرعاً ایمان سے مشرف نہ ہوئے مگر نبی ﷺ کے بچپن شریف سے حضور کے ولی یعنی قریبی تھے۔ رب فرماتا ہے۔ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى۔ (الضحیٰ: ۶) **تیسرا اعتراض:** جب چھوٹے بچوں کی گواہی معتبر نہیں تو چاہیے کہ ان سے حدیث بھی نہ لی جائے حالانکہ محدثین کم عمر صحابہ کرام سے روایت لے لیتے ہیں۔ جب فسق حدیث لینے سے مانع ہے تو صغر مانع کیوں نہیں؟ **جواب:** نقل حدیث حقیقتاً دینی خبر ہے جس میں صرف تقویٰ شرط ہے اگر یہ محض گواہی ہوتی تو ناقلین حدیث کو لفظ اشہد بولنا پڑھتا اور کم از کم دو کی ضرورت ہوتی۔ **چوتھا اعتراض:** تمہاری ایک تفسیر سے معلوم ہوا کہ پہلے اِحْدٰهُمَا سے بھولنے والی عورت مراد ہے اور دوسرے اِحْدٰهُمَا سے دوسری عورت جسے واقعہ یاد ہو حالانکہ علم اصول میں ہے کہ جب معرفہ مکرر ہو تو دونوں سے ایک ہی مراد ہوتا ہے اور جب نکرہ مکرر ہو تو ان سے مختلف مراد ہوتے ہیں تو یہ تفسیر کیونکر صحیح ہوئی؟ **جواب:** یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ رب فرماتا ہے۔ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ۔ (زخرف: ۸۴) اس کا مطلب یہ نہیں کہ آسمان میں اور معبود ہے اور

کرنا مناسب نہیں، آپ آئندہ کا انتظار فرمائیں، کیونکہ ہم نہیں چاہتے، کہ آپ ان کے متعلق بددعا کریں، اور ہم قبول نہ فرمائیں، آپ کی زبان خالی جانا ہمیں پسند نہیں، آپ ان کا معاملہ رب تعالیٰ پر چھوڑیں، اگر ہم انہیں توبہ کی توفیق دیں تو ہم غفور رحیم ہیں، یا انہیں عذاب دیں، تو وہ اسی کے مستحق ہیں، کہ وہ ظالم ہیں، یعنی مشرک و کافر بھی ہیں اور ستمگار و غدار بھی خیال رکھیے کہ آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں اللہ کی مخلوق، اللہ کی مملوک اور اسی کے قبضہ میں ہیں، کوئی شئے اس کے احاطہ قدرت سے خارج نہیں، وہ مالک و مختار ہے، جس کافر کو چاہے توبہ کی توفیق دے کر بخش دے اور جسے چاہے کفر پر مار کر دائمی عذاب دے یا جس گنہگار کو چاہے معافی دے دے، اور جس مجرم کو چاہے سزا دے دے، اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے، مگر اس کی رحمت غضب پر غالب ہے، کہ وہ بخشنے والا غفور بھی ہے اور مہربان رحیم بھی،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** حضور انور ﷺ کی شان تمام جہان سے عالی و نرالی ہے، بہت سی باتیں دوسروں کے لئے مناسب ہیں، مگر حضور انور ﷺ کی شان کے غیر مناسب، جیسا کہ لَیْسَ لَکَ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا، دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی تباہی کی بددعا فرمائی، رب تعالیٰ نے حرف بحرف قبول فرمائی، انہیں بددعا سے روکا نہیں، حتی کہ آپ نے عرض کیا، مولا فرعونیوں کا دل سخت کر دے، کہ ان میں ایمان داخل ہی نہ ہو سکے، اور یہ بھی عرض کیا کہ وہ عذاب دیکھ کر ایمان لائیں اور وہ قبول نہ ہو، میں دیکھوں کہ وہ کلمہ پڑھتے ہوں، اور عذاب آ رہا ہو، فرماتے ہیں فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ (یونس: ۸۸) خیال تو کرو کیسی خطرناک بددعا ہے، مگر رب تعالیٰ نے قبول فرمائی، ہو بہو اور ہو بہو ایسا ہی ہوا، کہ وہ چیخ چیخ کر ایمان لاتا اور ڈوبتا رہا، اور آپ اور سارے بنی اسرائیل دیکھتے رہے، مگر اپنے حبیب کو ہلاکتِ جان کی بددعا سے بھی سمجھا کر روک دیا گیا، کہ اے حبیب! وہ جلال والے تھے، تم جمال والے، وہ کلیم تھے، تم رؤف و رحیم ہو، اور رحمۃ للعالمین ہو، غرضکہ یہ آیت کریمہ اعلیٰ درجہ کی نعت ہے، دیکھو ہم لوگوں کو شادی بیاہ میں نیوتے دینے، پھر ان سے زیادہ وصول کرنے کی اجازت ہے مگر اپنے پیارے محبوب کو اس کی بھی اجازت نہیں، کہ رب تعالیٰ نے فرمایا وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (مدثر: ۶) اے محبوب کسی سے زیادہ وصول کرنے کے لئے اس پر احسان نہ کرو، تم دینے کے لئے ہو، مخلوق لینے کے لئے، شعر

وہی رب ہے جس نے تجھ کو ہمہ تن کرم بنایا ہمیں بھیک مانگنے کو ترا آستاں بتایا

دوسرا فائدہ: عذاب و توبہ کا حقیقی اختیار رب تعالیٰ ہی کو ہے، حضرات انبیائے کرام مصلحین و راہنما ہیں، جیسا کہ لَیْسَ لَکَ الخ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا، رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ (قصص: ۵۶) اور دوسری جگہ فرماتا ہے وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (شوریٰ: ۵۲) وہاں حضور انور ﷺ سے ہدایت حقیقیہ کی نفی ہے، اور یہاں آپ کے لئے ہدایت مجازی یعنی راہبری کا ثبوت، وہ آیت اس کی تفسیر ہے، **تیسرا فائدہ:** حضور انور ﷺ مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہیں، آپ سیف زبان ہیں، کہ جو دعا قابل قبول نہ ہو اس سے آپ کو روک دیا جاتا ہے، دعا سے روکنا اور ہے،

گواہ بن چکنے کے بعد گواہی دینے کے لئے عدالت میں بلانا مراد یعنی جو گواہ بن چکے ہوں۔ جب کبھی انہیں قاضی کی کچہری میں گواہی دینے کے لئے بلایا جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں یا جب کبھی مسلمان بھائی موقعہ واردات پر کسی کو گواہ بنانے کے لئے بلائے تو ان کو بلا وجہ اس سے باز نہ رہنا چاہیے اور ممکن ہے کہ بطریق عموم مشترک یہ دونوں معنی مراد ہوں یہ ہی عبداللہ ابن عباس اور حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے۔ (معانی وکبیر) پہلی صورت میں یہ نہی تحریمی ہے اور دوسری صورت میں تنزیہی (از کبیر) خیال رہے کہ شہداء سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی گواہی شرعاً معتبر ہے۔ لہٰذا چھوٹے بچے' دیوانے' فساق وغیرہ وہ لوگ جن کی گواہی معتبر نہیں انہیں انکار کرنا منع بھی نہیں۔ خیال رہے کہ گواہی چند قسم کی ہے قصاص و حدود کی گواہی' حقوق کی گواہی' شرعی احکام کی گواہی' حدود و قصاص کی گواہی ہیں۔ گواہی دینے یا نہ دینے کا اختیار ہے۔ مگر حقوق کی گواہی میں مدعی کا دعویٰ دار اس کی طلب پر گواہی دینا لازم ہے جیسا کہ اِذَا دُعُوْا سے معلوم ہوا' مگر شرعی حقوق کی گواہی یہ مدعی کے دعویٰ کی شرط ہے نہ کہ طلب کی' گواہ کو خود بخود گواہی دینا لازم ہے۔ جیسے رمضان' شوال کے چاند' رضاعت وغیرہ کی گواہی خود حاکم کے سامنے پیش ہو کر دو۔ اگر کسی جگہ نکاح ہو رہا ہے یعنی خبر ملے کہ زوجین اخیافی بھائی بہن ہیں تو فوراً گواہی دے دو۔ اذا دعو کی قید حقوق عباد کے لئے ہے۔ وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ۔ تَسْئَمُوْا سَاٰمَةٌ سے بنا' بمعنی ملال' دل تنگی' کوتاہی' اکتانا' سستی وغیرہ زہیر کہتا ہے۔

سَئِمْتُ تَكَالِيْفَ الْحَيٰوةِ وَمَنْ يَّعِشْ　　ثَمَانِيْنَ حَوْلًا لَا اَبَاكَ يَسْئَمْ

یہاں سب معنی درست ہیں۔ اَنْ تَكْتُبُوْهُ' تَسْئَمُوْا کا مفعول ہے۔ ہٗ کا مرجع قرض یا حق یا کتابت ہے۔ (دستاویز) ایک قرأت میں لَایَسْئَمُوْا اور اَنْ يَّكْتُبُوْهُ ی سے ہے۔ اس صورت میں اس سے قرض کا معاملہ کرنے والے مراد ہیں۔ یہ ممانعت بھی تنزیہی ہے صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا۔ یا تو یہ دونوں تَكْتُبُوْهُ کی ضمیر کے حال ہیں۔ اس صورت میں صغیر سے مراد تھوڑا اور کبیر سے مراد زیادہ قرض ہے یا کتاب سے حال ہے۔ تو صغیر سے مراد مجمل اور کبیر سے مراد مفصل ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ دونوں كَانَ محذوف کی خبر ہیں۔ صغیر کو کبیر پر اہتمام اور ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کے لئے مقدم کیا۔ اِلٰٓى اَجَلِهٖ۔ یہ بھی تَكْتُبُوْهُ کی ضمیر سے حال ہے اور مستقر اپوشیدہ کا متعلق یا الیٰ بمعنی مع ہے اور تَكْتُبُوْهُ کا متعلق یعنی قرض تھوڑا ہو۔ یا زیادہ اس کے لکھنے میں سستی نہ کرو بمع مدت کے لکھ لو۔ یا اس کی مدت تک لکھ ڈالو یا قرض کی تحریر میں کوتاہی نہ کرو۔ تھوڑی بہت مجمل و مفصل تحریر ضروری کر لو (معانی و مدارک) اب اس حکم کے تین فائدے بیان فرمائے جا رہے ہیں ایک یہ کہ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ۔ یہ کتاب یا گواہی یا دونوں کی گواہی یا دونوں کی طرف اشارہ ہے مگر پہلا زیادہ قوی' چونکہ خطاب سارے مسلمانوں سے ہے اس لئے كُمْ جمع فرمایا گیا۔ اَقْسَطُ' قِسْطٌ سے بنا جس کے معنی عدل بھی ہے اور ظلم بھی اور حصہ بھی' رب فرماتا ہے۔ وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (جن: ۱۵) بعض نے فرمایا کہ باب افعال میں آ کر بمعنی انصاف ہوتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ اور مجرد میں بمعنی ظلم یہاں باب افعال کا تفضیل ہے بمعنی اعدل سیبویہ کا قول ہے کہ باب افعال کا تفضیل بروزن افعل آتا ہے (روح المعانی) بعض کا خیال ہے کہ اقسط بمعنی ذی قسط ہے۔ یعنی یہ تحریر اللہ کے نزدیک بہت ہی انصاف کی چیز ہے کہ اس سے ایک کا حق دوسرے کے پاس نہ جائے گا' دوسرے یہ کہ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ۔ قیام کا تفضیل ہے بمعنی درستی اور سیدھا پن۔ رب

فرماتا ہے۔ اِنَّ الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (الاسراء:۹) کھڑے ہونے کو بھی اسی لئے قیام کہتے ہیں کہ اس حالت میں سارے اعضاء سیدھے رہتے ہیں چونکہ تفعیل فعل تعجب کا مناسب ہے اور فعل تعجب میں بوجہ جامد وغیرہ متصرفہ ہونے کے واؤ الف سے نہیں بدلتا۔ لہٰذا تفعیل میں بھی نہیں بدلا۔ (روح المعانی) ورنہ اَقَامَ ہوتا لِلشَّهَادَةِ میں لام صلہ کا ہے یعنی یہ تحریر گواہی کو درست رکھنے والی ہے جس سے گواہ غلطی سے بچیں گے اور قاضی و مدعی کے علم میں رہیں گے۔ تیسرا یہ کہ وَاَدْنٰی اَلَّا تَرْتَابُوْا ادنی دنوٌ سے بمعنی قرب اور ادنی دناءت سے بمعنی حقیر ہوتا ہے۔ اِلَّا سے پہلے الیٰ یا لام یا من یا فی حرف جر پوشیدہ ہے۔ ترتابوا ریب بمعنی شک سے بنا، باب افتعال میں آ کر عموم کے معنی پیدا ہوئے، یعنی یہ تحریر اس سے زیادہ قریب ہے کہ تم قرض، اس کی مقدار، اس کی مدت وغیرہ میں کسی قسم کا شک وہم نہ کرو اور فریقین کا دل ایک دوسرے سے صاف رہے۔ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً یہ حکم کتابت سے مستثنیٰ منقطع ہے اور اِلَّا بمعنی لٰكِنْ یا استشہاد سے مستثنیٰ متصل، تجارت کے معنی ہیں۔ مال کی ہیر پھیر کرنا نفع کی نیت سے، یہ مصدر ہے۔ تجر یتجر فهو تَاجِرٌ کا باب ضَرَبَ اس کا مفعول مُتَّجَر باب افتعال سے ہے (کبیر) ظاہر یہ ہے کہ یہاں بمعنی مصدر ہے اور حاضرہ سے مراد قیمت اور سودے کی موجودگی ہے اور ممکن ہے کہ یہ بمعنی اسم مفعول ہو یعنی سودا، ایک قرأت میں تجارۃٌ پیش سے اور حاضرۃٌ فتح سے ہے اور ایک قرأت میں دونوں کے پیش سے پہلی دو صورتوں میں تَكُوْنَ ناقصہ ہے اور اخیری صورت میں تامہ یعنی مگر یہ کہ تمہاری بیع نقد کی تجارت ہو یا اس صورت میں کہ تجر یعنی مال و قیمت موجود ہوں کوئی بھی ادھار نہ ہو یا یہ کہ نقدی تجارت واقع ہو۔ چونکہ یہاں وہم تھا کہ تجارت حاضرہ سے مراد موجودہ ایجاب و قبول ہوں، اسی کو دفع فرمانے کے لئے ارشاد ہوا۔ تُدِیْرُوْنَهَا بَیْنَكُمْ تُدِیْرُوْنَ ادارۃ سے بنا، جس کا مادہ دوران ہے بمعنی گھومنا اس میں خطاب تاجر، خریدار دونوں کو ہے ھَا کا مرجع وہ ہی تجارت بمعنی سودا ہے۔ بَیْنَكُمْ تُدِیْرُوْنَ کا ظرف یعنی ایسا نقدی سودا ہو۔ جس کو اے تاجرو اور خریدارو تم آپس میں لے دے کر گھما لو کہ قیمت پر تاجر اور مال پر خریدار قبضہ کر لے اور کسی کی طرف ادھار نہ رہے، خیال رہے کہ تُدِیْرُوْنَ تجارت کی دوسری صفت ہے یا حاضرۃٌ کی تفسیر فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ لَّا تَكْتُبُوْهَا۔ جناح کی لغوی تحقیق ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اَنْ لَّا سے پہلے فی پوشیدہ ہے ھَا کا مرجع تجارت ہے۔ یعنی اس صورت میں تم پر گناہ نہیں کہ اس تجارت کو نہ لکھو چونکہ ایسی بیع دن رات ہوتی ہے اور بوجہ ادھار نہ ہونے کے جھگڑے کا احتمال بھی نہیں ہے۔ اس لئے اس میں لکھنے کی پابندی نہیں۔

خلاصہ تفسیر

جب کبھی گواہ بننے یا کچہری میں گواہی دینے کے لئے گواہوں کو بلایا جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں کیونکہ یہ ضروری کام ہے اگر اس میں سستی کی گئی تو بہت خرابیاں پیدا ہوں گی۔ لوگوں کے حقوق مارے جائیں گے۔ دنیا کا نظام بگڑ جائے گا۔ وَلَا یَاْبَ میں اشارۃً فرمایا گیا کہ بلا وجہ گواہ حاضری سے انکار نہ کرے اگر کوئی دینی یا دنیاوی مجبوری ہے تو انکار کر سکتا ہے لہٰذا اداء شہادت کی تاریخ کے لئے حج نہ چھوڑے۔ اگر بیمار ہو تو معذرت کر سکتا ہے یا حاکم خود اس کے پاس آ کر گواہی لے اور اے مسلمانو تم قرض کے معاملات لکھنے میں سستی نہ کرو، قرض چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی مقدار، نوعیت بلکہ اس کی مدت تک لکھ لو کیونکہ کبھی چھوٹا قرض بڑے جھگڑے کا باعث بن جاتا ہے تھوڑی بات بھی تحریر ضرور کر لو اس تحریر میں چند فائدے ہیں ایک یہ کہ یہ خدا

کر آپ کے قدموں میں گریں، اور بعض کی اولاد آپ پر ایمان لائے، اس لئے اپنے محبوب (ﷺ) کی بددعا رد نہ فرمائی، بلکہ انہیں بددعا کرنے سے روک دیا گیا، جیسے ابراہیم علیہ السلام نے قوم لوط کے لئے دعائے نجات کرنا چاہی، تو ان سے فرمایا گیا یٰۤاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَ اِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ (ہود:۷۶) اے ابراہیم یہ دعا نہ کرو اب ان پر عذاب ہی آئے گا،

حکایت: ایک گستاخ نے کہا کہ تم حضور انور ﷺ سے مال و اولاد مانگتے ہو، اگر ان سے کچھ ملتا ہوتا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ضرور بیٹا ملتا (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ) میں نے کہا کہ حضور انور ﷺ تو جنت بھی دے دیتے ہیں، حضرت ربیعہ نے کہا تھا اَسْئَلُکَ مُرَافَقَتَکَ فِی الْجَنَّةِ یارسول اللہ ﷺ میں آپ سے یہ مانگتا ہوں کہ جنت میں آپ کے ساتھ رہوں، کیا مال و اولاد جنت سے بڑھ کر ہے، عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یا خود سرکار نے بیٹے کی دعا کب مانگی؟ جن نبیوں نے بیٹے کی دعائیں مانگیں، انہیں فوراً بیٹے کی بشارت اور بعد میں فرزند دیا گیا اگر چہ وہ حضرات اس وقت بوڑھے تھے، اور ان کی بیویاں بوڑھی بھی اور بانجھ بھی، دیکھو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور بی بی سارہ کا واقعہ، اور زکریا علیہ الصلوٰۃ و السلام اور ان کی بیوی ایشاع کا واقعہ جو قرآن کریم میں تفصیل وار مذکور ہے، بی بی سارہ نے تو اسحٰق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خوشخبری پا کر حیرت سے کہا تھا کہ کیا میں بوڑھی اور بانجھ بچہ جنوں گی، قرآن کریم فرماتا ہے وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِیْمٌ (ذاریات:۲۹) تعجب ہے کہ حضرت طلحہ کو حضور انور ﷺ کی دعا سے سو اولادیں ملیں یعنی اولاد اور اولاد در اولاد، اور بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ایک بیٹا بھی نہ ملے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے بخش دے اگر چہ کافر ہی کیوں نہ ہو، اور جسے چاہے عذاب دے اگر چہ نبی ہی کیوں نہ ہو، لہٰذا مسئلہ امکانِ کذب ثابت ہو گیا، **جواب:** مسئلہ امکانِ کذب کی مکمل بحث ہم پہلے پارے میں اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (بقرہ:۲۰) کی تفسیر میں کر چکے، اس سوال کا جواب ابھی تفسیر سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہاں گنہگار مسلمانوں کا ذکر ہے، کیونکہ معافی اور سزا گناہ کی ہوتی ہے، اس آیت کو نہ حضرات انبیاء سے کوئی تعلق ہے، نہ کفار سے کوئی واسطہ، ورنہ آیت تمہارے بھی خلاف ہے، کیونکہ تم بھی کذب کا امکان مانتے ہو نہ کہ وقوع، اور یہاں وقوع کا ذکر ہے کہ رب تعالیٰ جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا، **چوتھا اعتراض:** مسلمانوں کے خدا کے راج میں بڑی اندھیر نگری ہے کہ جسے چاہے عذاب دے دیا جائے اگر چہ اس نے کوئی پاپ نہ کیا ہو، اور جسے چاہے جنت دے دی جائے اگر چہ وہ مہا پاپی ہو، ایسا اندھیر مچانے والا خدا نہیں ہو سکتا، ہمارا پرماتما انصاف والا ہے کہ اچھوں کو جزاء اور بروں کو سزا ضرور دیتا ہے (آریہ از ستیارتھ پرکاش) **جواب:** ہم اس کا تحقیقی و تفصیلی جواب سورۂ بقر کے آخر میں دے چکے ہیں، کہ یہاں گنہگاروں کا تذکرہ ہے کیونکہ معافی و سزا کا ذکر ہو رہا ہے، معافی بھی گناہ کی ہوتی ہے اور سزا بھی بھولے ناسمجھ پنڈت نے مغفرت اور عذاب کے معنی ہی نہ سمجھے، **پانچواں اعتراض:** بتاؤ حضور انور ﷺ کا قنوت نازلہ پڑھنا اور کفار کو بددعائیں دینا غلط تھا یا صحیح، اگر صحیح تھا تو رب تعالیٰ نے اس سے کیوں روکا، اور اگر غلط تھا، تو حضور انور ﷺ نے کیوں کیا؟ آپ کا تو ہر قول وحی الٰہی سے ہے اور ہر عمل رب تعالیٰ کی

واجب ہے اور جب بہت سے لوگ مل سکتے ہیں تو اس پر واجب نہیں (از کبیر) **مسئلہ:** گواہی دینے کی چند صورتیں ہیں۔ زنا وغیرہ کی گواہی میں اختیار ہے۔ دے یا نہ دے بلکہ چھپانا مستحب۔ حضور ﷺ نے فرمایا جو کوئی مسلمان کی پردہ پوشی کرے۔ رب تعالیٰ اس کی دنیا اور آخرت میں ستاری فرمائے گا مگر چوری میں مال لینے کی گواہی دے تاکہ مال والے کا حق نہ مارا جائے۔ یہ نہ کہے کہ چور سے لیا ہے تاکہ وہ ہاتھ کٹنے سے بچ جائے (خزائن العرفان) لہٰذا زنا وغیرہ کا چھپانا بہتر اور باقی گواہیاں دینا بہتر۔ **مسئلہ:** اگر گواہی چھپانے سے کسی کا دینی یا دنیوی حق مارا جاتا ہے تو چھپانا منع ہے طلاق وقرض کی گواہی ضروری ہے۔ **مسئلہ:** شرعی حقوق کی گواہی دعویٰ پر موقوف نہیں۔ گواہ پر ضروری ہے کہ بغیر دعویٰ اور بغیر کسی کے بلائے گواہی دے۔ چاند دیکھ لیا ہے فوراً گواہی دے۔ کسی شوہر کو طلاق دیتے سن لیا فوراً گواہی دے۔ **مسئلہ:** اگر کسی کے پاس گواہی ہے اور مدعی اس سے بے خبر ہے اور اس کا حق مارا جارہا ہے تو گواہ پر لازم ہے کہ بلاطلب جا کر گواہی دے۔ لہٰذا اِذَا مَا دُعُوْا کی قید وہاں ہے جہاں حقوق انسانی کی گواہی ہو۔ اور مدعی کے علم میں ہو یا بلانے سے عام بلانا مراد ہے۔ مدعی کا ہو یا شریعت کا۔ **مسئلہ:** اگر کسی کے معاملہ کے گواہ بہت سے ہیں تو گواہی دینا فرض کفایہ ہے اور دو ہی ہوں تو ان پر فرض عین۔ **مسئلہ:** نقد اور معمولی تجارت یا لین دین کا لکھ لینا بھی اچھا ہے۔ حتیٰ کہ امانت کا لین دین بھی تحریری ہو تو بہتر ہے۔ اس لئے یہاں لَا جُنَاحَ فرمایا گیا۔ یعنی اس نقد تجارت کے نہ لکھنے میں گستاخی نہیں۔ جن سے اشارۃً معلوم ہوا کہ لکھ لینے میں فائدہ بہت ہے۔ رہا یہ سوال کہ ادھار اور بڑی تجارت کو نہ لکھنے میں گناہ ہے یا نہیں اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ ہے اس صورت میں یہ آیت منسوخ ہے اور ہوسکتا ہے کہ گناہ نہیں حرج ہو تو اب بھی یہ حکم باقی ہے کہ بڑی تجارت ادھار والی کا نہ لکھنا خرابیوں کا باعث ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ۔ سے معلوم ہوا کہ ادھار تجارت کے نہ لکھنے میں گناہ ہے کیونکہ یہاں یہ فرمایا گیا کہ اگر تجارت نقد ہو تو نہ لکھنے میں گناہ نہیں جس سے لازم آیا کہ اگر ادھار ہو تو نہ لکھنا گناہ ہے۔ اور جس کا ترک گناہ ہو وہ واجب ہوتا ہے۔ پھر فقہاء یہ کیوں فرماتے ہیں کہ یہ تحریر واجب نہیں؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ معترض نے مفہوم مخالف لے کر اعتراض کیا جو صحیح نہیں۔ یہ تو معلوم ہوا کہ نقد تجارت نہ لکھنے میں گناہ نہیں۔ رہی یہ بات کہ ادھار تجارت نہ لکھنے میں گناہ ہے۔ اس سے خاموشی ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ تحریر وگواہی وغیرہ اولاً فرض تھیں پھر ان کی فرضیت منسوخ ہوگئی۔ تیسرا یہ کہ جُنَاحٌ بمعنی حرج۔ مضائقہ یا کج روی ہے۔ یعنی نقد تجارت کے نہ لکھنے میں خطرہ یا نقصان نہیں۔ رب فرماتا ہے۔ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا۔ (انفال:۶۱) یہ تمام توجیہیں اس لئے کی گئیں کہ نبی ﷺ اور صحابہ کرام نے بارہا قرض کا لین دین کیا مگر ہر ایک کی تحریر نہ کی۔ اگر لکھنا واجب ہوتا تو اس پر پابندی ہوتی۔ **دوسرا اعتراض:** حَاضِرَةً کے بعد تُدِیْرُوْنَ کیوں فرمایا گیا؟ **جواب:** یہ حاضرۃً کی تفسیر ہے۔ تجارت حاضرہ کے معنی غیر موقوف تجارت بھی ہوسکتے تھے۔ تدیرون سے معلوم ہوا کہ اس سے نقدی تجارت مراد ہے۔ **تیسرا اعتراض:** فقہاء قرآن کریم کے بعض احکام کو وجوبی قرار دیتے ہیں اور بعض استحبابی۔ یہ کیوں؟ قرآن کے سارے احکام یکساں ہونے

تلاوتِ قرآن، کثرت درود شریف سے ہے، اللہ تعالیٰ اس قال کو حال بنا دے،

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے نہ کھاؤ تم سود چند در چند

اے ایمان والو سود دونا دون نہ کھاؤ

مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾

اور ڈرو اللہ سے شاید تم کامیاب ہو

اور اللہ سے ڈرو اس امید پر کہ تمہیں فلاح ملے

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

اور بچو اس آگ سے جو تیار کی گئی واسطے کافروں کے

اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کر رکھی ہے

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** گذشتہ آیتوں سے معلوم ہوا تھا کہ غزوۂ احد میں مسلمانوں کو جو تکلیف پہنچی وہ مال کی بے جا محبت کی وجہ سے پہنچی، کہ غنیمت لینے کے لئے درہ چھوڑ بیٹھے اب سود کی ممانعت فرمائی جا رہی ہے کہ یہ بھی مال کی ناجائز محبت کی وجہ سے وصول کیا جاتا ہے، اور یہ بھی ایسا ہی نقصان دہ ہے جیسا جہاد میں بے موقعہ غنیمت کے پیچھے پڑنا اور اپنا مورچہ چھوڑنا، **دوسرا تعلق:** گذشتہ آیتوں میں بدر و احد جیسے عظیم الشان غزووں کا ذکر ہوا، اب حرمتِ سود کا تذکرہ ہے، کیونکہ اکثر قومیں سود کے بل بوتہ پر جنگیں کرتی ہیں، کہ سودی روپے سے سامانِ جنگ خریدتی ہیں، اور فوجوں کو تنخواہیں وغیرہ دیتی ہیں، مسلمانوں کو اس سے منع کیا گیا کہ تم ان پاک لڑائیوں کے لئے ناپاک کمائی مت حاصل کرنا، سورۂ بقر میں جنگ و جہاد کے تذکرہ میں شراب و جوئے سے منع کیا گیا تھا، اسی طرح اب جنگ ہی کے تذکرہ کے ضمن میں سود سے منع کیا گیا، **تیسرا تعلق:** جنگ بدر کا بدلہ لینے کے لئے کفار مکہ نے سود سے روپیہ کمایا اور اسے جنگ احد پر خرچ کیا، اندیشہ تھا کہ مسلمان بھی جنگ احد کا بدلہ کفار سے لینے کے لئے سود کی طرف مائل ہو جاتے، اور سودی روپے سے آئندہ جنگیں کرتے، اس لئے رب العالمین نے جنگِ احد کے ذکر کے بعد سود سے ممانعت فرمائی، **چوتھا تعلق:** گذشتہ آیتوں میں جنگوں کا ذکر تھا اور جنگ اگر ضرورۃً ہو تو مفید ہے بلا ضرورت ہو تو مضر، بلا ضرورت جنگوں کا باعث اکثر سود ہوتا ہے کہ جب کسی قوم کے پاس سودی سرمایہ بہت بڑھ جاتا ہے، تو آخر کار وہ قوم یہ روپیہ یا لڑنے پر خرچ کرتی ہے یا لڑانے پر، ان غیر ضروری جنگوں کو روکنے کے لئے رب تعالیٰ نے حرمت سود کا ذکر یہاں فرمایا، گویا ضروری جنگوں کا ذکر فرمانے کے بعد غیر ضروری جنگوں کے

اسباب سے روکا گیا تاکہ پتہ لگے کہ مسلمان کی جنگ بقائے قوم یا قیام امن کے لئے انسانی ہمدردی کے ماتحت ہوتی ہے نہ کہ عالم میں فساد برپا کرنے کے لئے، شعر

جنگِ شاہاں فتنہ و غارت گری ست جنگ مومن سنتِ پیغمبری است

شانِ نزول

کفارِ عرب کا دستور یہ تھا کہ جب ان کے قرض کی مدت پوری ہوتی، اور وہ مقروض سے تقاضا کرتے، اور مقروض اداء پر قادر نہ ہوتا اور معذرت کرتا، تو اس سے کہتے کہ تو قرض بڑھا دے، ہم اداء کی مدت بڑھا دیتے ہیں، چنانچہ مقروض اپنے پر دوگنا قرض مان لیتا، تو یہ اسے دوگنی مہلت دے دیتے، بارہا ایسا ہی ہوتا، وصول ہونے تک قرض کئی گنا ہو جاتا، اور یہ ظالم اس بیچارے مقروض سے ایک ایک کے پچاس بلکہ سو سو وصول کرتے، اس ظلم کو روکنے کے لئے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (تفسیر صاوی، کبیر، خازن، مدارک بیضاوی وغیرہ)

تفسیر

یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا چونکہ مال سے انسان کو فطری طور پر محبت ہے، اور عرب میں صدیوں سے سود کا رواج تھا، گویا سود ان کی گھٹی میں پڑا تھا، اس بنا پر ایک دم سود کا بند کرنا آسان نہ تھا، اس لئے رب العالمین نے پہلے مومنوں کو پیارے خطاب سے پکارا، پھر یہ سخت حکم سنایا، تاکہ اس خطاب کی برکت سے وہ خلافِ نفس امر آسان ہو جائے، کڑوی دوائیں شکر میں لپیٹ کر کھلائی جاتی ہیں، اور آپریشن سے پہلے ٹیکہ لگا دیا جاتا ہے، ایسے ہی سخت احکام پیارے خطاب کے ساتھ سنائے جاتے ہیں، تفسیر تنویر المقیاس میں ہے، کہ یہاں خطاب قبیلۂ بنی ثقیف کے مالداروں سے ہے جو اسلام سے پہلے سودی کاروبار بہت کرتے تھے لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا ربوا کے معنی اور اس کے اقسام و احکام ہم اسی تفسیر کے تیسرے پارے اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا (بقرہ: ۲۷۵) کی تفسیر میں نہایت تفصیل سے عرض کر چکے ہیں وہاں ملاحظہ فرماؤ، یہاں اتنا سمجھ لو کہ سود دو قسم کا ہے، ایک زیادتی کا، دوسرے ادھار کا، زیادتی کے سود میں تو دو طرفہ مال کا جنس و وزن میں ایک ہونا ضروری ہے، مگر ادھار کے سود میں ان دونوں میں سے ایک میں اتحاد کافی ہے، یہاں دونوں قسم کے سودوں کو حرام فرمایا جا رہا ہے، اور اکل یعنی کھانے سے مراد لینا ہے، چونکہ سود لینے کا بڑا مقصد اس کا کھانا ہوتا ہے، نیز اہل عرب عموماً دانہ وغیرہ میں سود لیا کرتے تھے، اور یہ کھانے کی چیز ہے، اس لئے یہاں کھانے کا ذکر فرمایا گیا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً یہ دونوں ربوا کے حال ہیں، اضعاف ضعف کی جمع ہے بمعنی مثل جس کے ساتھ مل کر چیز دوگنی ہو جائے، ایک مثل کو ضعف کہتے ہیں، دو کو ضعفین، اور بہت سی مثالوں کو اضعاف (روح المعانی) چونکہ اضعاف جمع قلت تھی جو نو تک بولی جا سکتی تھی، اور مقصود تھا بہت زیادتیوں کا بیان کرنا اس لئے ساتھ میں مضاعفة بھی فرمایا گیا، مضاعفة اسم مفعول ہے نہ کہ مصدر اور اضعافاً کی صفت ہے، دونوں مل کر ربوا کا حال، خیال رہے کہ یہ اضعافاً بیانِ حالت کے لئے ہے نہ کہ تقیید کے لئے، یعنی یہ مطلب نہیں کہ سوایا ڈیوڑھا سود کھا لیا کرو، اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً یعنی زیادات مکررہ تکنا چوگنا نہ کھایا کرو کہ یہ منشائے کلام کے خلاف ہے، چونکہ جن کے متعلق یہ آیت کریمہ اتری ہے، ان کا عمل ہی یہ تھا کہ

ایک ایک کے پچاس پچاس بلکہ سو سو لیتے تھے، اس حالت کے بیان کے لئے یہ فرمایا گیا، چنانچہ حرمت سود کی دوسری آیات میں یہ قید نہیں، رب تعالیٰ نے فرمایا اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ الخ (بقرہ: ۲۷۵) اور فرمایا وَحَرَّمَ الرِّبٰوا الخ (بقرہ: ۲۷۵) اور فرمایا وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا (بقرہ: ۲۷۸) ان تمام آیتوں میں نہ دوگنے تگنے کی قید ہے، نہ سوائے ڈیوڑھے کی، معلوم ہوا کہ سود کا ایک پیسہ بھی ایسا حرام ہے جیسے اس کے لاکھ روپے وَاتَّقُوا اللّٰهَ اگرچہ ہر گناہ سے بچنا تقویٰ ہے، لیکن یہاں خصوصیت سے سود سے بچنا مراد ہے اور عموماً دوسرے گناہوں سے بچنا یعنی اللہ سے ڈرو کہ سارے گناہوں خصوصاً سود لینے سے بچو (روح البیان و معانی) لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ لعل بمعنی کے ہے یا بمعنی امید تفلحون فلاح سے بنا بمعنی کامیابی فلاح کی تحقیق و بیانِ اقسام پہلے پارہ میں زیرِ آیت وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (بقرہ: ۵) ہو چکا یعنی اللہ سے ڈرو تا کہ تم کامیاب ہو، یا اس امید پر کہ تمہیں کامیابی ملے وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْۤ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اگر تقویٰ کے بعد اللہ کا ذکر ہو تو بمعنی ڈرنا ہوتا ہے، اور اگر آگ کا ذکر ہو تو بمعنی بچنا، لہٰذا یہاں بمعنی بچنا ہے، آگ سے مراد مطلقاً دوزخ ہے، خواہ وہاں کا گرم طبقہ ہو یا ٹھنڈا، آگ سے بچنے سے مراد، ان اعمال سے بچنا ہے جو جہنم میں جانے کا ذریعہ ہیں، یعنی سارے گناہ خصوصاً سود خواری، اُعِدَّتْ اِعْدَادُ سے بنا بمعنی تیاری، کافرین سے مراد سارے غیر مومن ہیں یعنی آگ کے اس طبقہ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کیا گیا ہے، یا مطلقاً آگ سے بچو کہ ہم نے آگ بنائی تو کافروں کے لئے ہے، اب جو ان کی سی حرکتیں کرے گا اسے بھی وہاں جانا پڑے گا،

خلاصہ تفسیر

گذشتہ آیت میں فرمایا گیا تھا کہ رب تعالیٰ جس گنہگار کو چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا، اس آیت کریمہ میں اس کی بخشش حاصل کرنے اور عذاب سے بچنے کی تدبیر بتائی جا رہی ہے، یعنی گناہوں خصوصاً سود خواری سے بچنا، کہ ارشاد فرمایا گیا، اے ایمان والو! اندھا دھند، دونا دون سود خواری سے بچو، اپنے مال کے ذریعہ غریبوں کا خون نہ چوسو، خیال رکھو کہ تمہیں دنیا میں ہمیشہ رہنا نہیں، رب تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور وہاں اپنی کرنی بھرنی ہے، لہٰذا اللہ سے ڈرو، تا کہ کامیابی پاؤ، محض مالداری کامیابی نہیں، ورنہ قارون و فرعون بڑے کامیاب ہوتے، کامیاب وہ ہے جو اپنے رب کو راضی کرے، دوزخ کی آگ سے بچو، جو تیار تو کی گئی ہے کافروں کے لئے، مگر جو مسلمان سود کی حرمت کا انکار کر کے کافر ہو جائے، وہ بھی اس میں ہمیشہ رہے گا، اور جو سود خواری وغیرہ حرکتیں کرے، وہ بھی اس میں جائے گا، اگرچہ عارضی ہی طور پر ہو،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** سود کا لین دین مسلمانوں کے لئے حرام ہے، جیسا کہ اٰمَنُوْا سے معلوم ہوا، اگر کفار آپس میں یہ لین دین کریں، تو کریں، ہاں اسلامی حکومت میں کفار کو مسلمانوں سے سود لینے کی اجازت نہ ہوگی، اور نہ مسلمانوں کو اجازت ہوگی، کہ ان کے سودی لین دین میں ان کا ہاتھ بٹائیں، کہ اس میں ان کے گواہ یا کاتب وغیرہ بنیں بلکہ اسلامی حکام ان کے سودی مقدمات طے بھی نہ کریں گے، کہ یہ بھی سود میں امداد ہے، **دوسرا فائدہ:** گنہگار

کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہیں ہو جاتا، جب تک عقیدہ میں فساد نہ ہو، دیکھو یہاں سودخواروں کو اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے خطاب سے پکارا گیا، آج سودخوار مسلمان بھی اس آیت میں داخل ہوں گے اور اسی آیت کا انہیں وعظ سنایا جائے گا، **تیسرا فائدہ:** سود لینا سود دینے سے زیادہ خطرناک ہے، کہ رب تعالیٰ نے ہر جگہ سود لینے کی ممانعت پر زور دیا ہے، اور انہی سودخواروں کو اعلانِ جنگ بھی دیا ہے، **چوتھا فائدہ:** اگرچہ سودی پیسہ کا استعمال مطلقاً حرام ہے مگر اس کا کھانا بہت برا، کہ حرام غذا سے جو خون و گوشت بنے گا، وہ بہت ہی برا ہوگا، بری خصلتیں، برے خیالات، بری عادات اکثر بری غذا سے پیدا ہوتی ہیں، خراب پٹرول موٹر کی مشین کو خراب کر دیتا ہے، حرام غذا کا خون انسانی مشین کو خراب کر دے گا، یہ فائدہ لَا تَاْكُلُوا سے حاصل ہوا، **پانچواں فائدہ:** سود کا پیسہ حرام، اور اس پیسہ سے جو چیز خریدی جائے، اس کا استعمال حرام، خود سودخوار کو بھی، اور دوسروں کو بھی جیسا کہ لَا تَاْكُلُوا کے عموم سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** سود کھانا گناہِ کبیرہ ہے، اس میں خطرہ ہے کہ سودخوار جہنم کے سخت طبقہ میں جو کافروں کے واسطے ہے جائے، جیسا کہ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حرمت سود کی آیتوں میں یہ آیت سخت خوفناک ہے، کہ اس میں ڈرایا گیا ہے، کہ سودخوار کہیں کافر ہو کر نہ مرے، اور کہیں کافروں والی آگ میں نہ جائے (روح المعانی وخازن وغیرہ) **ساتواں فائدہ:** دوزخ میں عذاب آگ کا ہی ہوگا، خواہ ٹھنڈا عذاب ہو یا گرم، آگ کے قرب سے گرم عذاب ہوگا اور آگ کی دوری سے ٹھنڈا، جیسا کہ وَاتَّقُوا النَّارَ سے معلوم ہوا، **آٹھواں فائدہ:** دوزخ وہاں کی آگ وعذاب سب پیدا ہو چکے ہیں، جیسا کہ اُعِدَّتْ ماضی سے معلوم ہوا، **نواں فائدہ:** تقویٰ بذات خود کامیابی نہیں، بلکہ حصول کامیابی کا ذریعہ ہے جیسا کہ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ سے معلوم ہوا، **دسواں فائدہ:** کوئی شخص اپنی نیکیوں پر نازاں نہ ہو، بلکہ قبولیت کی امید رکھے، اور مردودیت سے ڈرتا رہے، یہ بھی لعل سے معلوم ہوا، عمل کی قبولیت کامیابی ہے، **گیارھواں فائدہ:** ایمان امید وخوف کے درمیان ہے، بے ڈر اور مایوس مومن نہیں جیسا کہ تُفْلِحُوْنَ اور وَاتَّقُوا النَّارَ کے یکجا بیان کرنے سے معلوم ہوا،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا، کہ دگنا، چوگنا، سود کھانا حرام ہے، سوایا ڈیوڑھا جائز، کیونکہ اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً یہاں رِبٰوا کا حال ہے، اور حال قید ہوتا ہے، **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گذر گیا، کہ قید کبھی اتفاقی ہوتی ہے، کبھی احترازی، کبھی بیانِ واقعہ کے لئے، یہاں بیانِ واقعہ کے لئے قید ہے نہ کہ احترازی، **دوسرا اعتراض:** کلام الٰہی میں لَعَلَّ نہ آنا چاہیے، کیونکہ لَعَلَّ امید کے لئے ہوتا ہے، اور امید بے علمی سے ہوتی ہے، علم سے تو یقین ہوتا ہے، امید کیسی؟ **جواب:** یہ لَعَلَّ بندوں کے لحاظ سے ہے، یعنی تم تقویٰ اور نیک اعمال کامیابی کے یقین پر نہ کرو، بلکہ امید فلاح پر کرو، **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا، کہ مومن کتنا ہی بڑا گنہگار ہو، دوزخ میں کبھی نہ جائے گا، ایمان کے ہوتے گناہ مضر نہیں، کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ آگ کافروں کے لئے بنی، **نوٹ:** مسلمانوں میں ایک فرقہ مرجیہ بھی ہے جس کا عقیدہ ہے کہ مسلمان کچھ بھی کرے جنتی ہے، ان کی دلیل یہ آیت ہے، آج کل کے بھنگی چرسی، دتہ شاہی،

فرشتے گواہ ہیں۔ قیامت میں اسی تحریر و گواہی پر فیصلہ ہوگا۔ اگر کوئی گواہی پر جرح کرے گا تو اس مجرم کے اعضاء سے گواہی دلوا دی جائے گی۔ تیسرا تعلق بندوں کا بندوں کے ساتھ ہے بندہ کو غور کرنا چاہیے کہ رب تعالیٰ ہماری خطاؤں اور گناہوں کے باوجود اپنے انعامات بند نہیں فرماتا۔ ہم کو بھی چاہیے کہ آپس کے تعلقات معمولی باتوں سے نہ توڑ دیں اور رب کے حقوق کا لحاظ رکھیں۔ اس لئے فرمایا گیا وَاتَّقُوا اللّٰهَ! یعنی ان تینوں تعلقات میں اللہ سے ڈرو۔ اللہ تمہارے قول و فعل اور تمہارے دل کی باتوں اور رازوں کو جانتا ہے تم کو بقدر خلوص جزا دے گا۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنے قلب کی تختی کو برے اخلاق کے نقوش سے دھو ڈالیں۔ اور اس پر عالم سر و اخلاق کے نقوش قائم کریں اور سارے حالات میں رب سے معاملہ اچھا رکھیں تاکہ درجات پائیں۔ خیال رکھو کہ قلب آراستہ گھر کی طرح ہے اور گندے اخلاق اس پر گرد و غبار اور کوڑا ہیں جب تک کہ یہ گھر اس کوڑے سے صاف نہ کیا جائے۔ تب تک اس کا محبوب اس سے آڑ میں رہے گا (روح البیان) عبادات آسان ہیں مگر صفائی معاملات بہت مشکل۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عبداللہ ابن سلام سے پوچھا کہ عالم کون ہے۔ فرمایا جس کا عمل مطابق علم کے ہو۔ پوچھا علماء کے سینہ سے علم نکالنے والی کون چیز ہے؟ جواب دیا طمع (دارمی و درمنثور) حضرت جابر فرماتے ہیں اولاً خاموشی سیکھو پھر حلم (بردباری) پھر علم، پھر اس پر عمل کرو (بیہقی و تفسیر درمنثور) حضرت ضحاک فرماتے ہیں تین شخصوں کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ ایک زانی جب تک زنا سے توبہ نہ کرے۔ دوسرا وہ شخص جو ادھار کی تجارت کرے اور نہ لکھے نہ گواہ بنائے اور خریدار اسکے قرض کا انکار کردے۔ رب فرماتا ہے کہ تو نے لکھ کر تجارت کیوں نہ کی۔ تیسرا وہ شخص جو کسی کا مال ظلماً کھائے جب تک کہ اسے واپس نہ کردے۔ (تفسیر درمنثور) اور تمام عبادات و معاملات کی اصل خوف الٰہی ہے جس سے انسان کے سارے کام درست ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اس آیت کو حکم تقویٰ پر ختم کیا گیا۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ

اور اگر تم ہو اوپر سفر کے اور نہ پاؤ تم لکھنے والا پس گروی ہے قبضہ کیا ہوا پس اگر امین جانے بعض تمہارا

اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو گرو ہو قبضہ میں دیا ہوا اور اگر تم میں ایک کو دوسرے

بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ

بعض کو پس چاہئے کہ ادا کرے جو امین سمجھا گیا امانت اس کی اور چاہئے کہ ڈرے اللہ رب اپنے سے اور نہ چھپاؤ تم گواہی کو

پر اطمینان ہو تو وہ جسے اس نے امین سمجھا تھا اپنی امانت ادا کردے اور اللہ سے ڈرے جو رب اس کا ہے اور گواہی نہ چھپاؤ

وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

اور جو کوئی چھپائے گا اسے پس تحقیق گنہگار ہے دل اس کا اور اللہ ساتھ اس کے جو کرتے ہو تم جاننے والا ہے

اور جو گواہی چھپائے گا تو اندر سے اس کا دل گنہگار ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو جانتا ہے

لطیفہ: کسی نے حضرت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب علی پوری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ سید دوزخ میں جائیں گے یا نہیں؟ فرمایا رب تعالیٰ تو نہیں چاہتا کہ یہ دوزخ میں جائیں، اگر خود چھلانگ لگادیں، تو ان کی مرضی! رب تعالیٰ نہیں چاہتا کہ مسلمان دوزخ میں جائیں، اس نے دوزخ کافروں کے لئے بنائی ہے، اگر یہ خود کافروں کے سے کام کر کے دوزخ میں جائیں تو ان کی خوشی،

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾
اور اطاعت کرو اللہ اور رسول کی تا کہ تم رحم کئے جاؤ
اور اللہ اور رسول کے فرماں بردار رہو اس امید پر کہ تم رحم کئے جاؤ
وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا
اور جلدی کرو طرف بخشش کے اپنے رب کی طرف سے اور طرف جنت کے جس کی چوڑائی
اور دوڑو اپنے رب کی بخشش اور ایسی جنت کی طرف جس کی چوڑائی
السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾
آسمانوں اور زمین میں تیار کی گئی واسطے پرہیزگاروں کے
میں سب آسمان و زمین آجائیں پرہیزگاروں کے لئے تیار کر رکھی ہے

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں بدکاروں کو دوزخ سے ڈرایا گیا تھا، اب اس آیت میں نیک کاروں کو جنت کا وعدہ دیا جارہا ہے تا کہ مسلمان بدکاری سے پرہیز کریں، اور نیک کاری اختیار کریں، قرآن کریم کا اکثر طریقہ یہ ہی ہے، کہ وعدہ کو وعید کے ساتھ، تقویٰ کو فسق کے ساتھ بیان فرماتا ہے، یہاں بھی ایسا ہی ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی گذشتہ آیت میں ارشاد ہوا تھا، کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، تقویٰ حاصل کرو، اب تقویٰ کا طریقہ ارشاد ہورہا ہے، کہ اللہ رسول کی اطاعت کرو، گویا تقویٰ کا اجمالی حکم دے کر اب اس کی کچھ تفصیل بیان ہورہی ہے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو سود سے منع فرمایا گیا، یہ ممانعت نفس امارہ پر بھاری و گراں تھی، اب ارشاد ہے کہ نفس کے مقابلہ میں اللہ رسول کی اطاعت کرو، کہ تمہیں اس میں فائدہ ہے، گویا نفس امارہ کی اطاعت سے روک کر اللہ رسول کی اطاعت پر لگایا جارہا ہے، **چوتھا تعلق:** پچھلی گذشتہ آیات میں مسلمانوں کو غزوۂ احد کی تکالیف کی وجہ بتائی گئی یعنی حضور انور ﷺ کے حکم عالی پر عمل نہ کرنا اور حکم آئے بغیر درۂ احد خالی چھوڑ دینا، کہ یہ ہی معمولی سی مخالفت بڑی سخت تکالیف و نقصانات کا باعث بنی، اب بطور نتیجہ ارشاد ہورہا ہے، کہ اس واقعہ احد سے عبرت پکڑو اور آئندہ زندگی میں اللہ رسول کی اطاعت کو لازم سمجھو،

خبر کا مبتدا ہے یا پوشیدہ مبتدا کی خبر یا پوشیدہ فعل کا نائب فاعل یعنی الشروع رِهٰنٌ یا فَلْيُوْخَذْ رِهٰنٌ۔ یا فَعَلَيْكُمْ رِهٰنٌ۔ خیال رہے کہ رِهٰنٌ رَهْنٌ کی جمع ہے۔ رے کا فتح یا کسرہ اور رَهْن مصدر ہے بمعنی گروی رکھنا لیکن اصطلاح میں اس چیز کو رہن کہا جاتا ہے جو گروی رکھی جائے مصدر بمعنی اسم مفعول۔ اسی کی جمع رِهٰن بھی ہے جیسے ثمر کی ثمار اور کلب کی کلاب اور فعل کی نعال اور کبش کی کباش اور رُهُنٌ بھی جیسے سَقَفَ کی جمع سُقُف۔ اس کی قرأتیں بھی دو ہیں۔ رِهٰنٌ اور رُهُنٌ۔ خیال رہے کہ رہن کے لغوی معنی دو ہیں۔ مضبوطی اور ہمیشگی۔ اسی واسطے راہن بمعنی دائم و ثابت آتا ہے اور مرہون بمعنی مضبوط۔ شاعر کہتا ہے۔

يُرَاهِنُنِىْ　فَيُرَهِنُنِىْ　بَنِيهِ　　وَاُرْهِنُهٗ　بَنِىْ　بِمَا　اَقُوْلُ

ابوعلی نے کہا۔

فَالْخَبَرُوْا لِلَّحْمِ لَهُنَّ رَاهِنٌ　　وَقَهْوَةٌ رَاوِ فُهَا سَاكِبٌ

گروی چیز کو اسی لئے رہن کہتے ہیں کہ اس سے قرض کی پختگی ہوتی ہے اور وہ تا ادائے قرض قرض خواہ کے پاس ہمیشہ رہتی ہے۔ مقبوضۃ سے قرض خواہ کا قبضہ مراد ہے یعنی کاتب نہ ملنے کی صورت میں مقروض پر گروی رکھنا لازم ہے جس پر قرض خواہ کا قبضہ ہو جائے۔ مگر یہ گروی صرف پختگی قرض کے لئے ہے۔ اسے بزنس یا نفع بخش کاروبار نہ سمجھنا چاہیے۔ جیسا کہ آج کل بعض مسلمانوں نے ہندوؤں بنیوں کی دیکھا دیکھی اسے نفع بخش تجارت سمجھ رکھا ہے یہ خالص سود ہے۔ اب بجائے رہن کے بیع وفا کرنا چاہیے تاکہ حرام سے بچا جائے۔ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا۔ اَمِنَ یا اَمْنٌ سے بنا یا امانۃ سے بنا۔ اَمِنَ بمعنی بے خوفی جس کا مقابل ہے خوف۔ امانت بمعنی امین جاننا۔ اعتماد کرنا' بھروسہ کرنا یا امانت دینا' امن کا اسم فاعل آمن اور امانت کا امین ہے۔ بَعْضُكُمْ سے قرض دینے والا مراد ہے اور بعضا سے قرض لینے والا یعنی اگر اہل معاملہ میں سے قرض خواہ مقروض سے بے خوف ہو اور اس کے انکار وغیرہ کا اندیشہ نہ کرے یا اسے امین جانے' اس بنا پر بغیر لکھے پڑھے۔ اور بغیر گواہ شہادت قرض دیدے۔ فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ۔ فَلْيُؤَدِّ تادیۃ سے بنا۔ جس کا اصل اَدَاءٌ ہے۔ خیال رہے کہ عین واجب کا دینا ادا کہلاتا ہے اور اس کے مثل کا دینا قضاء۔ یہاں ادا بمعنی قضا ہے کیونکہ قرض میں واجب کا مثل دیا جاتا ہے نہ کہ عین نیز چونکہ دَین ذمہ میں واجب ہوتا ہے اس لئے اس کے مثل کا دینا گویا عین ہی کا دینا ہے۔ اسی لئے یہاں ادا فرمایا گیا (از تفسیر احمدی) اَلَّذِىْ سے مقروض مراد ہے او تمن ایتمان سے بنا' جس کا مادہ امن یا امانت ہے۔ خیال رہے کہ امن اور ایتمان دونوں کے معنی امین جاننا ہیں۔ اسی لئے معتمد شخص کو مامون بھی کہتے ہیں اور مومن بھی رب فرماتا ہے۔ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ (یوسف: ۶۴) امانت سے مراد قرض ہے۔ اسے امانت فرما کر مقروض کو ادا کی رغبت دی گئی۔ خیال رہے کہ امانت مصدر ہے بمعنی امن قرض کو اسی لئے امانت فرمادیا گیا کہ دینے والے نے مقروض پر اعتماد کیا ہے بلکہ امانت کو بھی اسی واسطے امانت کہتے ہیں کہ وہ اطمینان اور بے خوفی کی بنا پر کسی کے پاس رکھی جاتی ہیں۔ اَمَانَتَهٗ میں ہٗ مرجع یا قرض خواہ ہے یا مقروض یعنی چاہیے کہ مقروض اس قرض خواہ کا قرضہ وقت پر ضرور ادا کرے جس نے اسے امین جان کر بغیر لکھت پڑھت کئے قرض دے دیا تاکہ اس کا اعتبار باقی رہے یا مقروض اپنا قرض جو اس کے ذمہ واجب الادا ہے صحیح وقت پر ادا کردے۔ قرض کی نسبت قرض خواہ کی طرف بھی ہو جاتی ہے۔ استحقاق کے لحاظ سے اور مقروض کی طرف بھی واجب فی الذمہ ہونے کی حیثیت سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ

قرض خواہ کا قرض اور یہ بھی کہ مقروض کا قرض وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ۔ یہ بھی مقروض سے خطاب ہے یعنی مقروض ادائے قرض میں اپنے رب سے ڈرے کہ بغیر ٹالے ادا کردے۔ حقوق العباد چونکہ سخت تر ہیں۔ اس لئے یہاں رب کے نام دو فرمائے گئے اللہ اور رب وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ۔ یہ گواہوں کو خطاب ہے یا مقروضوں کو یا عام مسلمانوں کو کتم کے لغوی معنی بہت دفعہ بیان ہو چکے۔ یعنی اے مسلمانو یا اے گواہو تم گواہی نہ چھپاؤ تاکہ مدعی کا حق برباد نہ ہو۔ یا اے مقروضو تم کچہری میں جا کر خود اپنے خلاف گواہی دے لو کہ قرض کا اقرار کر لو گواہی چھپانے کی چند صورتیں ہیں۔ گواہی نہ دینا' یا خلاف دینا' یا حق سے کم کی گواہی دینا۔ یا میعاد قرض میں فرق کر کے گواہی دینا کہ تھوڑی میعاد کو زیادہ بتا دینا۔ اس میں سب سے منع کر دیا گیا۔ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ۔ انہ کی ضمیر یا تو من کی طرف لوٹتی ہے یا ضمیر شان ہے۔ اور اٰثِمٌ خبر اور قَلْبُهٗ مبتدا۔ اٰثِمٌ اثم سے بنا بمعنی گناہ یعنی جو گواہ یا مدعی علیہ گواہی چھپائے کہ گواہی نہ دے' یا غلط دے یا حق سے کم کی گواہی دے تو اس کا دل گنہگار' فاسق و فاجر ہے۔ خیال رہے کہ یہاں دل کو فاسق کہنے میں عجیب راز ہیں۔ ایک یہ کہ تمام گناہوں یعنی زنا' شراب خوری جھوٹ وغیرہ کا تعلق ظاہری اعضاء سے ہوتا ہے۔ جھوٹ کا زبان سے زنا کا شرمگاہ سے' شراب کا حلق وغیرہ سے کہ اس سے یہ اعضاء گنہگار ہوتے ہیں مگر گواہی چھپانے کا تعلق دل سے ہے کہ اس سے دل گنہگار ہوتا ہے اور دل چونکہ ظاہری اعضاء سے اعلیٰ ہے۔ اس لئے اس کے گناہ بھی ظاہری گناہوں سے سخت تر۔ کفر و شرک دل سے ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہر فعل کو اسی عضو کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ جس سے وہ صادر ہو۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں واقعہ میری آنکھوں نے دیکھا' فلاں بات میرے کانوں نے سنی' چونکہ گواہی چھپانے کی جگہ دل ہے اس لئے اسے دل کا گناہ قرار دیا گیا۔ تیسرا یہ کہ دل تمام جسم کا اصل ہے۔ اگر وہ بگڑا تو سارا جسم بگڑا۔ اور اگر وہ ٹھیک رہا تو سارا جسم ٹھیک رہا۔ اس لئے فرمایا گیا کہ گواہی چھپانے والے کا دل گنہگار ہوگا۔ جس سے اس کا سارا جسم پھنسے گا۔ چوتھا یہ کہ جھوٹا گواہ یہ نہ سمجھے کہ دیگر جھوٹوں کی طرح اس میں بھی فقط زبان گنہگار ہوئی نہیں بلکہ اس سے دل بھی گنہگار ہوگا۔ پانچواں یہ کہ عربی میں اصل عضووں کو سارا جسم مراد لیتے ہیں۔ یہاں بھی قلب بول کر قلب والا مراد۔ چھٹا یہ کہ بعضے گناہ وہ ہیں جس سے دل میں سیاہی پیدا ہوتی ہے اور پھر وہ بڑھتے بڑھتے سارے دل کو گھیر لیتے ہیں۔ یہاں فرمایا گیا کہ جھوٹی گواہی کا اثر دل پر پڑے گا کہ اس سے گواہ کا دل کالا ہوگا۔ ابن ابی عبلہ نے قَلْبَهٗ فتح سے پڑھا ہے یعنی وہ جھوٹا گواہ اپنے دل کو گنہگار کرنے والا ہے (تفسیر روح المعانی و بیان و مدارک وغیرہم) تفسیر خازن نے فرمایا کہ یہاں اٰثِمٌ بمعنی مسخ ہے یعنی جھوٹے گواہ کا دل مسخ ہو جاتا ہے خدا کی پناہ۔ یہ بھی قرض حسن کی ایک قسم ہے کہ مقروض سے کسی قسم کی پختگی کر دے۔ نیز صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے قرض دے دیا جائے' دوسرا قانونی قرضوں میں تو حکومتیں ذمہ دار ہوتی ہیں۔ ایسے قرض کا اللہ تعالیٰ ذمہ دار ہے کہ اگر مقروض نے نہ دیا تو رب تعالیٰ اس کی سخت پکڑ فرمادے گا۔ دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ۔ مَا سے سارے نیک و بد اعمال مراد ہیں۔ اور تَعْمَلُوْنَ میں عام مسلمانوں سے خطاب یعنی اے مسلمانو اللہ تمہارے سارے نیک و بد اعمال کا جاننے والا ہے۔ ہر ایک کو عمل کے مطابق سزا یا جزا دے گا۔

خلاصہ تفسیر

اے قرض کا معاملہ کرنے والو اگر تم دونوں باہم میں سے کوئی ایک مسافر ہو جہاں اس کا کوئی جان پہچان والا نہ ہو۔ اور تمہیں

ہے کہ یہ کلام جنت کی وسعت دکھانے کے لئے بطور تمثیل بولا گیا، یعنی تمہاری نگاہ میں سب سے بڑی اور فراخ چیزیں آسمان و زمین ہیں، مگر جنت کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ یہ سب مل کر اس کی چوڑائی میں سما جائیں گی اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ حق یہ ہے کہ متقین سے مراد پرہیزگار انسان ہیں، خواہ حضرات انبیاء ہوں، یعنی معصومین یا خاص اولیاء اللہ یعنی محفوظین یا وہ حضرات جو گناہوں پر قائم نہیں رہتے چھوٹے بچے یا دیوانے یا ہم جیسے گنہگار، وہ انشاء اللہ ان پرہیزگاروں کے تابع ہو کر جنت میں جائیں گے، جنت بنی تو پرہیزگاروں کے لئے ہے، دوسرے بھی وابستگانِ دامن وہاں چلے جائیں گے، مُتَّقِيْنَ میں گناہوں سے بچنا، نیکیاں کرنا، ان سب کی طرف اشارہ ہے،

خلاصہ تفسیر

اے انسانو یا اے مسلمانو یا اے ہر عقل رکھنے والی مخلوق! بقدرِ طاقت ہر طرح اللہ تعالیٰ کی اور ان رسول محمد مصطفیٰ ﷺ کی فرماں برداری کرو، جس کا حکم دیں کرو، جس سے منع کریں اس سے بچو، تاکہ تم پر تمہاری حیثیت کے لائق رحم کیا جائے، جنات پر اور رحم ہے انسانوں پر کچھ اور، پھر انسانوں میں صدیقین وشہداء پر رحم کی نوعیت اور ہے، اور ہم جیسے گنہگاروں پر رحم کی نوعیت کچھ اور، اور ان اسباب کے حاصل کرنے میں جلدی کرو، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، جو اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور جنت کا ذریعہ ہیں یعنی اسلام، ادائے فرائض، اخلاص، ہجرت، جہاد، باجماعت نمازوں کی تکبیر اولیٰ، گناہ سے توبہ، اپنی مرضی کو مرضی محبوب میں فنا کر دینا وغیرہ، جنت کی کیفیت یہ ہے کہ سارے آسمان وزمین کی وسعتیں اگر ملالی جائیں، تو یہ سب مجموعہ اس کی چوڑائی ہیں، پھر لمبائی تو تمہارے وہم وگمان میں نہیں آسکتی، یا جنت ایسی قیمتی چیز ہے کہ تمام آسمان وزمین اس کی قیمت ہیں، مگر خیال رکھنا کہ جنت بنی پرہیزگاروں کے لئے ہے،

لطیفہ: ابن جریر نے تنوخی سے روایت کی، کہ میں شاہ روم ہرقل کی طرف سے قاصد بن کر نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا، ہرقل نے میرے ہاتھ حضور انور ﷺ کی خدمت میں ایک عریضہ بھی بھیجا تھا، جس میں دیگر معروضات کے سوا یہ بھی لکھا تھا کہ یارسول اللہ (ﷺ) آپ مجھے اس جنت کی دعوت دے رہے ہیں کہ آسمان وزمین کی وسعتیں اس کی چوڑائی کے برابر ہیں، جب جنت اتنی وسیع ہے تو دوزخ کہاں ہے؟ حضور انور ﷺ نے یہ سوال ملاحظہ فرما کر تبسم فرمایا، اور فرمایا سبحان اللہ جب دن آتا ہے، تو رات کہاں ہوتی ہے (تفسیر کبیر وروح المعانی) کتنا حکیمانہ فیصلہ کن جواب ہے، کہ جیسے آفتاب کے نور کا پھیلاوا باوجود اس قدر وسیع ہونے کے رات کی ہستی کو فنا نہیں کر دیتا، بلکہ زمین کے ایک جانب دن ہوتا ہے تو اس کے مقابل نچلی طرف رات، اسی طرح جنت کی یہ وسعت دوزخ کی ہستی کے منافی نہیں، جنت کے نچلے حصے میں دوزخ ہے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ وسعت ساری جنت کی نہیں، بلکہ جو جنت متقیوں کو ملے گی، اس کی وسعت یہ ہے اور جو ہم گنہگار طفیلیوں کو ملے گی وہ اس کے علاوہ ہے، وہ فرماتے ہیں، کہ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ اس جنت کی صفت ہے جس کی وسعت پہلے مذکور ہوئی، بعض کا خیال ہے کہ ہر متقی کو اتنی بڑی جنت ملے گی جس کی چوڑائی آسمان وزمین ہیں، بعض کا خیال ہے کہ یہ وسعت جنت الفردوس کی ہے جس کے اوپر عرشِ رحمان ہے، رہے جنت کے اور طبقے، وہ اس کے علاوہ ہیں، جیسے جنت عدن، جنت

پاس کچھ غلہ کے عوض گروی تھی جسے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چھوڑایا (خازن) رب فرماتا ہے۔ فَلَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَقۡصُرُوۡا مِنَ الصَّلٰوۃِ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَنۡ یَّفۡتِنَکُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا۔ (النساء:۱۰۱) دیکھو اس آیت میں قصر نماز کو خوف کفار سے مشروط کیا۔ حالانکہ بغیر خوف بھی سفر میں قصر کا حکم ہے۔ **دوسرا فائدہ:** گروی کے لئے کاتب نہ ملنے کی شرط نہیں۔ گواہ وکاتب ملتے ہوئے بھی گروی رکھنا جائز ہے جیسا کہ مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا۔ لہٰذا یہ دونوں شرطیں اتفاقی ہیں نہ کہ احترازی۔ **تیسرا فائدہ:** رہن میں مرہون چیز پر قرض خواہ کا قبضہ ضروری ہے کہ اس کے بغیر رہن مکمل نہ ہوگا جیسا کہ مقبوضۃ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** قرض کے لئے تحریر' گواہ' رہن وغیرہ تمام چیزیں مستحب ہیں نہ کہ واجب اور سارے امر استحبابی ہیں نہ کہ وجوبی۔ جیسا کہ فَاِنۡ اَمِنَ سے معلوم ہوا کیونکہ اگر یہ چیزیں فرض ہوتیں تو ان کے بغیر قرض دینا جائز ہی نہ ہوتا۔ پھر فَاِنۡ اَمِنَ کے کیا معنیٰ؟ **نوٹ:** جن لوگوں نے ان اوامر کو وجوب کے لئے مانا۔ وہ فَاِنۡ اَمِنَ سے ان سب کو منسوخ مانتے ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ یہ احکام استحبابی ہیں اور آیت مداینہ کا کوئی حکم منسوخ نہیں سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ پوری آیت مداینہ محکم ہے (کبیر) **پانچواں فائدہ:** حقوق کی گواہی چھپانا حرام ہے خواہ حقوق شرعیہ ہوں یا بندوں کے حقوق۔ گواہی کی اقسام اور احکام پچھلی آیت میں ہم بیان کر چکے یہ مسئلہ لَا تَکۡتُمُوۡا سے حاصل ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** گواہی چھپانا گناہ کبیرہ ہے جیسا کہ اٰثِمٌ قَلۡبُہٗ سے معلوم ہوا۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اکبرالکبائر شرک ہے اور جھوٹی گواہی اور گواہی چھپانا (تفسیر مدارک واحمدی) **ساتواں فائدہ:** مال برباد کرنا حرام ہے جیسا کہ ان سارے احکام سے معلوم ہوا۔ لہٰذا جوا' شراب خوری' سینما وغیرہ سب حرام کہ اس میں مال کی بربادی ہے (احمدی) **آٹھواں فائدہ:** مسلمانوں میں اتفاق اور اتحاد رہنا بہت ضروری ہے اسی لئے مال کے لین دین پر اتنی قیدیں لگا دی گئیں تاکہ مسلمانوں میں اتفاق قائم رہے۔ **نواں فائدہ:** قرض پر گروی رکھا جا سکتا ہے۔ نہ کہ امانت یا عاریت پر اسلئے قرآن کریم نے دین کے ساتھ رہن کا ذکر کیا۔ **دسواں فائدہ:** بیع سلم میں مسلم فیہ کے عوض گروی رکھنا جائز ہے کیونکہ وہ بھی تاجر پر قرض ہے۔ (احمدی) **مسئلہ:** رہن صرف ذی قیمت مال رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اپنی بیوی بچوں یا اپنے کو گروی نہیں رکھ سکتا کیونکہ یہ مال نہیں۔ اسی طرح کوئی مسلمان شراب یا سور گروی نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ یہ ذی قیمت مال نہیں۔ **مسئلہ:** صرف ایجاب وقبول سے رہن مکمل نہیں ہوتا۔ جب تک کہ مرتہن یعنی قرض خواہ اس پر قبضہ نہ کر لے۔ خیال رہے کہ خرید وفروخت اور نکاح واجارہ صرف ایجاب وقبول سے مکمل ہو جاتے ہیں مگر رہن وہبہ بغیر قبضہ غیر مکمل۔ **مسئلہ:** مرہون چیز سے کوئی فریق فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ نہ گروی دینے والا نہ لینے والا۔ **مسئلہ:** مرہون چیز کی زکوٰۃ کسی پر واجب نہیں کیونکہ مالک کا اس پر قبضہ نہیں اور قرض خواہ کی اس پر ملکیت نہیں۔ ہاں جب مقروض اپنا رہن چھڑا لے تب اس پر گذشتہ سالوں یعنی زمانہ قرض کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ مگر قرض وضع کر کے۔ **مسئلہ:** مرہون چیز قرض خواہ کے پاس بقدر قرض مضمون ہے اور اس سے زیادہ امانت۔ لہٰذا اگر مرہون کی قیمت قرض سے زائد تھی اور وہ قرض خواہ کے پاس ضائع ہو گئی تو قرض خواہ کا قرض گیا اور زیادتی کا ضمان نہیں اور اگر اس کی قیمت قرض کے برابر تھی تو بھی یہ ہی حکم ہے اور اگر قرض سے کم تھی تو بقدر قیمت قرض ختم ہو گیا اور باقی مقروض سے لے۔ **مسئلہ:** مرہون پر جو کچھ قرض خواہ خرچ کرے وہ خرچ بھی

کی حرص اچھی ہے،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کریمہ میں ایک صیغہ اطیعوا کے بعد اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ہے اور اس کے رسول کا بھی، مگر دوسری جگہ ارشاد ہے اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ (آل عمران: ۱۳۲) یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے الگ اطاعت کا صیغہ استعمال ہوا، اور رسول کے لئے الگ، اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ **جواب:** یہاں دونوں اطاعتوں کا متحد النوع ہونا بتایا گیا یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت ایک ہی قسم کی ہے کہ جس کا بھی انسان انکار کرے کافر ہو جائے، قرآن و حدیث دونوں کی اطاعت یکساں فرض ہے، دیکھو حضرت ابو خزیمہ کی گواہی دو کے برابر حدیث سے ہوئی، جسے تمام صحابہ نے بلا تامل قبول کر لیا، حضور انور ﷺ کی میراث تقسیم نہ ہونا حدیث سے ثابت تھا، صدیق اکبر و تمام صحابہ نے بلا تامل مان لیا مگر ان آیات میں دونوں اطاعتوں کی کیفیتوں کا فرق بتانا مقصود ہے، اطاعت خدا کی اور کیفیت ہے، اطاعت رسول کی دوسری، رب تعالیٰ کی اطاعت صرف اس کے فرمان و احکام میں ہے، مگر حضور انور ﷺ کی اطاعت فرمان، اعمال، سکوت سب میں ہے، جو حکم دیں وہ مانو، جو کر کے دکھائیں وہ مانو، اور جو صحابہ کرام کو کرتے دیکھیں، مگر منع نہ فرمائیں وہ مانو، **دوسرا اعتراض:** اس کی کیا وجہ ہے کہ اطاعت میں تو اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ہے، رسول کا بھی اور امر والوں کا بھی، مگر اتباع میں صرف حضور انور ﷺ کا ہی ذکر ہے فَاتَّبِعُوْنِیْ (آل عمران: ۳۱) **جواب:** جیسے عبادت صرف خدا تعالیٰ کی ہی ہو سکتی ہے دوسرے کی نہیں، نہ رسول کی، نہ ولی کی، نہ کسی اور کی، ایسے ہی اتباع صرف رسول کی ہو سکتی ہے، نہ خدا تعالیٰ کی ہو سکتی ہے، نہ کسی اور بندے کی، اتباع کے معنی ہیں کسی کے سے اعمال کرنا، ہم خدا کے سے کام نہیں کر سکتے، موت، زندگی، روزی کسی کو نہیں دے سکتے، رہے دوسرے بندے، ان کے کام اچھے بھی ہو سکتے ہیں برے بھی، برے کام میں اتباع نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کی اصلاح کی جائے گی، اگر بادشاہ نماز نہ پڑھے، تو تم نماز نہ چھوڑو بلکہ اسے سمجھاؤ اور نماز پڑھاؤ، حضور انور ﷺ کا کوئی عمل برا ہو سکتا ہی نہیں، کیونکہ ان کا ہر قول و فعل رب تعالیٰ کی طرف سے ہے، ان کے اعمال کی بے دھڑک نقل کرو، جب تک کہ وہ خود منع نہ فرما دیں اور یہ نہ فرما دیں کہ یہ میرے لئے خاص ہے، تم نہ کرنا، جیسے خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (احزاب: ۵۰) اگر وہ کوئی نماز قضاء کریں، تو تم رب کی اس نماز کا قضاء کرنا فرض ہے، کیا تمہیں نہیں خبر کہ حضور انور ﷺ حج میں عرفہ کے دن نماز مغرب قضاء کر کے مزدلفہ میں عشاء کے وقت میں پڑھی، تو حجاج پر یہ نماز قضاء کرنا قیامت تک فرض ہے، مگر خیال رہے کہ قضاء کرنا اور ہے قضاء ہو جانا کچھ اور، اگر سرکار ﷺ طواف میں رمل کریں (اکڑ کر چلنا) تو قیامت تک اس طواف میں مسلمانوں پر رمل ہی لازم ہے، مولانا فرماتے ہیں، شعر

گر طمع خواہد ز من سلطانِ دیں خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

یعنی اگر چہ قناعت اچھی چیز ہے، لیکن اگر کبھی کسی چیز کی طمع کا سرکار ہی حکم فرما دیں تو قناعت کے سر پر خاک، یہ ہے فَاتَّبِعُوْنِیْ (آل عمران: ۳۱) کی جلوہ گری، خیال رکھیے کہ جیسے ریل کا ڈبہ لائن کاٹ کر انجن سے آگے نہیں نکل سکتا، کہ اس کا راستہ لائن

سے رہن وثیقہ بنتا ہے اور بغیر قبضہ نہ وہ رہن ہے نہ وثیقہ۔ لہٰذا یہ صفت لازم ہے۔ **دوسرا اعتراض:** رہن کا تاوان کیوں واجب ہے۔ چاہیے کہ وہ بھی مثل امانت کے ہو؟ **جواب:** اس لئے کہ اس آیت میں رہن پر امانت کا عطف کیا گیا اور معطوف علیہ معطوف کا غیر ہوتا ہے۔ اگر اس کا تاوان نہ ہوتا' تو یہ امانت بنتی۔ پھر امانت کا اس پر عطف کرنا کیا معنی (احکام القرآن) **تیسرا اعتراض:** تو پھر رہن قرض سے زیادہ میں کیوں امانت ہے؟ **جواب:** اس لئے کہ حدیث شریف میں ایسا ہی آیا ہے۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اَلرَّھْنُ بِمَا فِیْہِ۔ حضرت عطا فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے کسی کے پاس گھوڑا گروی رکھا۔ قرض خواہ کے پاس گھوڑا مر گیا۔ مقروض نے بارگاہ نبوی میں دعویٰ کر دیا۔ حضور علیہ السلام نے قرض خواہ سے فرمایا ذَھَبَ حَقُّکَ۔ دوسری روایت ہے۔ لَا شَیْئَ لَکَ (احکام القرآن) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرہون کا بقدر قرض ضمان ہے۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت میں اَمِنَ سے قرض بلا تحریر دینا مراد ہے نہ کہ امانت۔ پھر اس سے دلیل پکڑنا غلط؟ **جواب:** قرآن کی عبارت میں الفاظ کے عموم کا لحاظ ہوتا ہے اور ہم نے تفسیر میں عرض کر دیا کہ اَمِنَ یا امنؔ سے بنا یا امانۃ سے بلکہ ایسے قرض کو امانت اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ امانت کی طرح محض اعتماد پر دیا گیا۔ ورنہ حقیقتاً امانت وہ ہی ہے جو بطور ودیعت کسی کو دی جائے۔ **پانچواں اعتراض:** جب رہن کا حکم عام ہے تو اس آیت میں سفر کی قید کیوں لگائی گئی۔ **جواب:** اس لئے کہ گروی رکھنا سخت مجبوری کی حالت ہے۔ جب مقروض قرض خواہ کو کسی طرح مطمئن نہ کر سکے تو کچھ گروی رکھے۔ اور ایسی مجبوری اکثر سفر میں درپیش آتی ہے۔ وطن میں لوگ ضامن بن جاتے ہیں گواہی اور تحریر وغیرہ سے قرض خواہ کا اطمینان کرایا جا سکتا ہے اس لئے یہ قید لگا دی گئی۔

خیال رہے: کہ آج کل رہن آمدنی کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ اس لئے وطن میں بھی اس کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ شریعت میں رہن کی آمدنی قرض خواہ کے لئے حرام ہے۔ وہ صرف قرض کی پختگی کے لئے ہے تا کہ قرض خواہ اس کے ذریعہ ضرورت کے وقت قرض وصول کر سکے۔ اس لئے وطن میں اسکی ضرورت کم درپیش ہوتی تھی۔

تفسیر صوفیانہ

دین دار لوگوں کے دو گروہ ہیں۔ واقفین اور سائرین۔ واقف تو وہ لوگ ہیں جو صورت پر ٹھہر گئے۔ معنی کی طرف نہ جا سکے وہ تو مثل اس چوزہ (مرغ کا بچہ) کے ہیں جو انڈے میں قید ہو کہ ان کا رزق صرف عالم اجسام سے ہی ہے اور وہ اسی جیل میں قید' اس پر کراماً کاتبین مقرر ہیں جو اس کے اعمال ظاہرہ برابر لکھتے رہتے ہیں یہ لوگ قالب سے قلب کی طرف' صورت سے سیرت کی طرف جسم سے روح کی طرف راہ نہ پا سکے۔ ان کے سارے اعمال معاملات ہوں یا عبادات اس عالم میں سے ہیں۔ سائرین وہ لوگ ہیں جو صورت پر نہ ٹھہرے۔ اور اس منزل پر قیام نہ کیا بلکہ اس عالم سے عالم معنی کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ ان کی پھر دو قسمیں ہیں۔ سیار اور طیار' سیار وہ ہیں جو شریعت و عقل کے قدم سے طریقت کی راہ طے کر رہے ہیں اور طیار وہ ہیں جن کے پیروں میں شریعت کے گھنگھرو ہیں اور وہ عشق و ہمت کے پروں سے فضائے حقیقت میں اڑ رہے ہیں۔ ان کے باطنی اعمال تحریر کے قابل نہیں ان کی کراماً کاتبین کو خبر بھی نہیں ۔

میانِ عاشق و معشوق رمزیست کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

پھر سمندری راستے، کوئی کچھ دور تیر کر طے کرتا ہے، کوئی لانچ یا کشتی میں کوئی بڑے جہاز میں، یہ اختلاف کار ان لوگوں کے لئے ہیں، جو زمین یا پانی میں رہ کر انہیں طے کریں، مگر پروالے شاہباز ان تمام خشکی وتری کے راستوں کو اڑ کر نرالے انداز سے طے کرتے ہیں، کیونکہ ان کا مقام دوسرا ہوتا ہے، اسی طرح راہ جنت طے کرنے والے مختلف الحال ہیں بعض لوگ عبادت کے قدموں سے اطاعت کی سواریوں میں فرمانبرداری کے جہازوں میں یہ راہ طے کرتے ہیں، پھر جیسی ان کی اطاعت وعبادت، ویسی ان کی رفتار، مگر بعض خوش نصیب بندے وہ بھی ہیں، جو فنا کے پروں سے عشق کی فضاء میں شاہباز لامکانی ہو کر اڑتے ہوئے یہ راہ طے کر کے جنت کی منزل سے گزرتے ہوئے قرب یار تک پہنچتے ہیں، اَطِیْعُوا اللّٰهَ الخ میں ان پہلے مسافروں کا ذکر ہے، جو سواریوں سے یہ راہ طے کر رہے ہیں، اور سَارِعُوْا الخ میں ان لامکانی شاہبازوں کا ذکر ہے، جو اڑ کر یہ راہ طے کر رہے ہیں، چونکہ ان کی رفتار پہلوں سے زیادہ اور تیز ہے، اس لئے ان کے متعلق سَارِعُوْا فرمایا گیا، قرآن کریم گواہ ہے، کہ فرعونی جادوگر نگاہِ موسوی کی برکت سے چند گھنٹوں میں جست لگا کر وہاں پہنچے، جہاں خشک زاہد عمر گذار کر نہیں پہنچ سکتے، اور حدیث گواہ ہے کہ میدانِ جنگ میں ایک کافر سپاہی حضور انور ﷺ پر فدا ہو گیا، مسلمان ہوا، فوراً شہید ہوا، یعنی دل نگاہِ یار سے گھائل ہوا، اور جسم تلوار کفار سے، حضور انور ﷺ نے اس کا سر اپنے زانو مبارک پر رکھ کر فرمایا، کہ مبارک ہو، تیرے اعمال تھوڑے، تیری جزاء زیادہ، یہاں فرمایا گیا کہ اے عقل والو! عبادت واطاعت کی سواریوں میں مجھ تک پہنچو، اور اے عشق والو! جنہیں اپنے تن بدن کی ہوش نہیں، فناء کے بازوؤں سے بقاء کے میدان میں داخل ہو کر لقاء سے کامیاب ہوو،

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ
وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں خوشی اور غم میں اور ضبط کرنے والے غصہ کے
وہ جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں خوشی میں اور رنج میں اور غصہ پینے والے
وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾
اور معاف کرنے والے لوگوں سے اور اللہ محبت کرتا ہے نیک کاروں سے
اور لوگوں سے درگذر کرنے والے اور نیک لوگ اللہ کے محبوب ہیں

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں اللہ رسول کی اطاعت کا اجمالی حکم دیا گیا تھا، اب اس اطاعت کی کچھ تفصیل کی جارہی ہے، گویا یہ آیت کریمہ پچھلے اجمال کی تفصیل ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو اللہ کے رحم وکرم کا امیدوار بنایا گیا، اب اس آیت میں انہیں لوگوں پر رحم کرنے کا حکم دیا گیا، جو رب تعالیٰ کی رحمت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، یعنی مخلوق پر تم رحم کرو خالق تم پر رحم فرمائے گا، رحم چاہتے ہو تو رحم کرو، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ مغفرت اور جنت کی طرف دوڑو، اس آیت میں اس دوڑ کا طریقہ بتایا جارہا ہے، یعنی اس دوڑ کے

لئے بدن کے یہ ہیر کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے اعمال کے قدم چاہئیں، **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ جنت پرہیزگاروں کے لئے بنی، اب پرہیزگاروں کے اوصاف کا ذکر ہے تاکہ معلوم ہو کہ جنت پرہیزگاری سے کمائی جاتی ہے، اور پرہیزگاری ان اعمال سے، **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت میں جنت کی وسعت کا ذکر تھا، اس آیت کریمہ میں متقی مومن کے قلب کی وسعت کا ذکر ہے، یعنی اگر ایسی وسیع جنت چاہتے ہو، تو ایسے وسیع اخلاق اختیار کرو،

تفسیر

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ ظاہر یہ ہے کہ اَلَّذِیْنَ مجرور ہے اَلْمُتَّقِیْنَ کی صفت یا بدل یا بیان ہے، اور ہو سکتا ہے کہ منصوب ہو اَعْنِیْ پوشیدہ کا مفعول، یا مرفوع ھم کی خبر، یُنْفِقُوْنَ مضارع استمراری ہے، کیونکہ ایک بار خیرات کر دینا کمال نہیں، بلکہ خرچ کرتے رہنا کمال ہے، اس کا مفعول پوشیدہ ہے، جس سے عموم کا فائدہ حاصل ہوا، اور یہ مال، اعمال، علم، عزت، سب کے خرچوں کو شامل ہے، یعنی متقی وہ لوگ ہیں، یا جنت ان متقیوں کے لئے ہے، یا ہم متقی انہیں کہتے ہیں، جو اپنی ہر چیز مال، علم وغیرہ خرچ کرتے رہتے ہیں، فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ سراء سرور سے ہے جس کا مادہ سرّ ہے بمعنی چھپانا، چھپے بھید کو سر کہتے ہیں، اور دل کی چھپی خوشی کو سرور، ضَرَّآء ضررٌ سے بنا، ضَرَّاءُ کا مقابل سَرَّاءُ بھی آتا ہے نَعْمَاء بھی، یہاں تو مقابلہ میں سراء آیا ہے، دوسری جگہ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ (ہود: ۱۰) وہاں ضراء کا مقابل نعماء آیا، ان دو لفظوں کی بہت تفسیریں ہیں، عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ امیری میں اور فقیری میں، بعض نے فرمایا خوشی میں اور غم میں، بعض کے ہاں زندگی میں اور بعد وفات، بعض نے فرمایا کہ جہاں دل چاہے وہاں، اور جہاں دل نہ چاہے وہاں جیسے اپنے دوستوں پر خرچ کرنا اور دشمنوں کو دینا، بعض کہتے ہیں مالداروں، تندرستوں پر خرچ کرنا اور غریبوں و بے چاروں پر صرف کرنا، مگر ان سب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی تفسیر زیادہ ظاہر ہے (روح المعانی وکبیر وخازن وغیرہ) چونکہ ہر حال میں خرچ کرنا نفس پر گراں تھا، اس لئے رب تعالیٰ نے پہلے اسی کا ذکر فرمایا وَالْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ کاظمین کظمٌ سے بنا، کظم لغت میں سانس کی نالی کو کہتے ہیں، کظوم سانس روکنا یا خاموش ہو جانا، اصطلاح میں اس کے معنی ہیں بھرنا، روکنا، بھرے ہوئے مشکیزے کا منہ باندھ دینا، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَابْیَضَّتْ عَیْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِیْمٌ (یوسف: ۸۴) یعنی یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں غم سے سفید پڑ گئیں، اور وہ غم کھاتے رہے، یا ان کا دل صدموں سے بھرا رہا، اہل عرب کہتے ہیں كَظِمَ فُلَانًا اس کا گلا گھونٹ دیا (معانی وکبیر) غیظ کے لغوی معنی ہیں دل کا جوش و نفس کی بھڑک عرف میں تیز غصہ کو غیظ کہتے ہیں، جو ناپسندیدہ چیز دیکھ کر دل میں جوش پیدا کر دے غیظ و غضب قریب المعنی ہیں یعنی سخت غصہ، مگر غیظ عام ہے اور غضب وہ غصہ جس کے ساتھ بدلہ لینے کا ارادہ پیدا ہو جائے، بعض نے فرمایا، غضب وہ غصہ ہے جس کی علامات ظاہر ہو جائیں، غیظ میں یہ قید نہیں، خیال رہے کہ غضب خدا کی صفت بھی ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے غَضِبَ اللّٰهُ (نساء: ۹۳) مگر غیظ رب تعالیٰ کی صفت نہیں، یعنی متقیوں کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ غصہ پی جاتے ہیں، سامنے والے سے بدلہ نہیں لیتے، وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ عَافِیْنَ عفوٌ سے بنا بمعنی مٹانا اور چھوڑنا، کہا جاتا ہے عَفَتْ اٰثَارُهَا اس کی نشانیاں مٹ گئیں، فرمایا نبی کریم ﷺ

نیز ہمارے علم کی رسائی' ان آسمان وزمین تک ہی ہے جسے عالم اجسام کہتے ہیں۔ باقی تمام عالم ہمارے مشاہدے سے دور ہیں۔ اس لئے اس عالم کا ہی ذکر ہوا۔ ورنہ رب تعالیٰ کی ملکیت وخلقت' ان چیزوں میں منحصر نہیں۔ یعنی وہ تو رب العالمین ہے۔ اس نے صدہا عالم بنائے سب کو پال رہا ہے اور مَا مبتداء مؤخر۔ اس کے مقدم کرنے سے حصر کا فائدہ ہوا۔ مَا سے آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں مراد ہیں چونکہ بے عقل چیزیں نوعیت میں زیادہ ہیں اور عقل والی کم۔ اس لئے یہاں مَا فرمایا گیا۔ اگرچہ آسمان بھی سات ہیں اور زمینیں بھی سات مگر چونکہ آسمانوں کی حقیقتیں مختلف ہیں۔ کوئی چاندی کا کوئی سونے کا وغیرہ اور ساری زمینوں کی حقیقت ایک مٹی ہے۔ نیز آسمانوں میں فاصلہ ہے اور سات زمینیں پیاز کے چھلکوں کی طرح ایک دوسری سے چمٹی ہوئی ہیں۔ اس لئے سَمٰوٰتِ جمع اور اَرْضِ واحد لایا گیا اور خَلَقَ لَكُمْ میں لام نفع کا ہے۔ یعنی ہر چیز اللہ کی ملک ہے' کسی اور کی نہیں' حقیقی مالک وہ ہے مگر رب نے ہر چیز بنائی ہے تمہارے نفع کے لئے وہ خود نفع اٹھانے سے پاک ہے۔ یعنی آسمان وزمین کی ساری چیزیں اللہ ہی کی ہیں کہ وہ ان کا مالک وخالق ہے جیسا چاہے تصرف کرے۔ اس کے مقابل کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فلاں چیز میری ہے۔ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ یہ جملہ پچھلے جملہ پر متفرع ہے تُبْدُوْا بَدَاءٌ سے بنا جس کا مادہ ہے۔ بدءٌ بمعنی ظہور۔ شروع کرنے کو اسی لئے ابتدا کہتے ہیں کہ اس سے شئی ظہور میں آتی ہے۔ یہاں مَا سے مراد دل کی بری چیزیں ہیں جیسا کہ اگلے جملہ سے معلوم ہو رہا ہے۔ نفس کے چند معنی ہیں۔ سانس' ذات' دل' نفس امارہ یہاں دل یا نفس امارہ مراد ہے۔ دل میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز دل کی صفت بن جائے اور اصلی طور پر اس میں سما جائے' جیسا برے اخلاق' حسد' غرور' تکبر' ناشکری' گواہی چھپانا' اور برے کاموں کا ارادہ (روح المعانی) اس تفسیر کا خیال رہے۔ اس سے بہت اعتراضات خود بخود اٹھ جائیں گے کیونکہ برے خیالات اور اوہام فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ میں داخل ہی نہیں ہوئے کہ اس سے نفس موصوف نہیں ہوئی۔ لہٰذا یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں یعنی اگر تم اپنے دل کے عیوب نفس کی بری صفات لوگوں پر ظاہر کرو کہ علانیہ بری حرکتیں کرو یا خفیہ یا چھپ کر گناہ کرو یا علانیہ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ یہ اِنْ تُبْدُوْا پر معطوف ہے۔ تُخْفُوْا کا مصدر اِخْفَاءٌ اور مادہ خفیٌ ہے بمعنی چھپنا ظہور کا مقابل۔ خیال رہے کہ یہاں ظاہر کرنا یا چھپانا بندوں سے مراد ہے۔ ورنہ رب تعالیٰ پر ہر چیز ظاہر ہے۔ یعنی اگر تم اپنی بری عادتوں اور برے ارادوں اور برے اخلاق کو لوگوں پر ظاہر کرو یا ان سے چھپاؤ کہ خفیہ طور پر گناہ کرو چونکہ علانیہ گناہ خفیہ گناہ سے بدتر ہے کہ اعلان میں گناہ بھی ہے۔ بے شرمی بھی اور لوگوں کو اپنے خلاف قیامت میں گواہ بنانا بھی۔ خصوصاً بزرگوں کے سامنے گناہ کرنا اس لئے علانیہ گناہ کا ذکر پہلے ہوا خفیہ کا بعد میں بہر حال تم جو گناہ بھی کرو۔ رب قیامت میں تم سے حساب ضرور لے گا۔ حساب کے معنی اور اس کی تحقیق اور اقسام پہلے پارہ میں عرض کیے جا چکے۔ بِهٖ کا مرجع مَا ہے اور چونکہ قیامت کے دن فرشتوں کے سارے کام رب کے حکم سے ہوں گے۔ اس لئے ان کا فعل رب کا فعل ہے۔ اس لئے اگرچہ حساب ملائکہ لیں گے مگر وہ فعل حقیقتاً رب ہی کا ہوگا پھر حساب کا انجام یہ ہوگا کہ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ۔ یہ دونوں نئے جملے ہیں اسی لئے مضارع مرفوع ہے۔ یَغْفِرُ غَفَرَ سے اور یُعَذِّبُ عَذَّبَ سے بنا' غَفَرَ بمعنی ڈھکنا اور عَذَبَ بمعنی روکنا اسی لئے چھلکے کو غفر کہتے ہیں کہ وہ مغز کو ڈھانپے ہوتا ہے اور میٹھے پانی کو مَاءٌ عَذَبٌ کہ وہ پیاس کو روکتا ہے۔ اس کی مفصل تشریح پہلے پارہ میں ہو چکی۔ بخشش کو مغفرت اور سزا کو عذاب کہا جاتا

محبوب عالم صاحب قدس سرہٗ نے آپ کی خدمت میں یہی آیت تلاوت کی، اور حضرت امام حسن و امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے یہی واقعات سنائے، سائیں صاحب رو پڑے، نکالے ہوئے خادم کو بلایا، اسے کھانا کھلایا اور کچھ نقدی و کپڑے دیئے، اور معافی بخشی، کچھ دیر کے بعد بہت روپے اس شکریہ میں خیرات کئے، کہ مجھے رب تعالیٰ نے اہل بیت اطہار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اتباع کی توفیق بخشی، اور مجھ سے ان کی طرح عمل کرالیا (ذکر خیر)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** اللہ تعالیٰ کے بندوں پر مہربانی کرنا بہترین عبادت ہے، کہ رب تعالیٰ نے متقین کی صفت میں پہلے اس کا ذکر کیا، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، شعر

خواہی کہ خدائے بر تو بخشد ۔۔۔ با خلق خدائے کن نکوئی

اگر خالق کی بخشش چاہتے ہو، تو مخلوق سے بھلائی کرو، **دوسرا فائدہ:** خوشحالی و تنگی، امیری و غریبی، ہر حال میں جو بن پڑے خیرات کرنا چاہیے، جیسا کہ السَّرَّآءِ الضَّرَّآءِ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا، انسان دو ہی وقت میں خدا کو بھولتا ہے، حد درجہ کے آرام و راحت میں، اور حد درجہ کی تنگی و تکلیف میں، جو ان وقتوں میں رب تعالیٰ کو یاد رکھے، وہ مرد کامل ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک دفعہ پیاز کی گانٹھ خیرات فرمائی، سیدنا عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ایک بار انگور کا ایک دانہ خیرات کیا (از کبیر) رب تعالیٰ کے ہاں مقدار خیرات نہیں دیکھی جاتی، دل کا ولولہ دیکھا جاتا ہے، **تیسرا فائدہ:** شادی بیاہ کے موقعہ پر ولیمہ کرنا، نعمتیں ملنے پر اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرنا، یونہی مصیبتوں میں ختم پڑھوانا، طلباء کو کچھ دینا، میت کو ایصال ثواب کرنا رب تعالیٰ کو بڑے پیارے ہیں کہ پہلے دو خرچ انفاق فِي السَّرَّآءِ میں داخل ہیں، یعنی خوشی کے خرچ اور آخری خرچ انفاق فِي الضَّرَّآءِ میں شامل، جو لوگ بہانے بنا بنا کر مسلمانوں کو ان چیزوں سے روکتے ہیں، وہ اس آیت سے عبرت پکڑیں، ان عقل مندوں کو یہ توفیق تو نہیں ہوتی، کہ بے نمازیوں کو نمازی بنائیں، یا بخیلوں کو سخی کریں، بلکہ لوگوں کو سخاوت سے روکتے ہیں، **چوتھا فائدہ:** جن لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے سے نفس روکے، ان سے سلوک کرنا بڑی بہادری ہے جیسا کہ وَ الضَّرَّآءِ کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا کیا تمہیں نہیں خبر کہ حضرت مسطح جناب صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عزیز قریب تھے ان کا سارا خرچ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھاتے تھے یہی مسطح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تہمت میں شریک ہو گئے، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں ان سے سلوک کروں اور یہ میری بیٹی کو عیب لگائیں! آپ نے ان کا وظیفہ بند کر دیا، تب یہ آیت کریمہ اتری وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ الآیہ (نور: ۲۲) یعنی جنہیں اللہ پاک نے تمام جہان پر بزرگی دی ہے وہ ان غریبوں کی خدمت میں کوتاہی نہ کریں، **پانچواں فائدہ:** غصہ پینا خدا تعالیٰ کو بہت پیارا ہے، حدیث شریف میں ہے جو شخص غصہ جاری کرنے پر قادر ہو، پھر غصہ پی جائے، تو رب تعالیٰ اس کا دل امن و ایمان سے بھر دے گا (عبدالرزاق و ابن جریر عن ابی ہریرۃ) نیز احمد نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً روایت کی، کہ فرمایا نبی کریم ﷺ نے جو قادر ہو کر غصہ پیئے، تو رب تعالیٰ قیامت میں تمام مخلوق کے سامنے اس سے

روافض کا رد ہے جو حساب کے منکر ہیں جب دنیا میں مالک اپنے غلاموں سے معمولی چیزوں کا حساب لیتے ہیں تو رب تعالیٰ اپنی اتنی نعمتوں کا حساب کیوں نہ لے۔ **چوتھا فائدہ:** گناہ کبیرہ کی مغفرت اور گناہ صغیرہ پر عذاب ہو سکتا ہے جیسا کہ لِمَنْ یَّشَآءُ کی تعمیم سے معلوم ہوا مگر خیال رہے کہ کبیرہ سے کفر کے سوا دیگر گناہ مراد ہیں۔ کفر کی مغفرت کبھی نہیں ہو سکتی۔ رب فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء: ۴۸) ایسے ہی مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ میں مَا سے مراد برے خیالات برے ارادے اور بری نیتیں ہیں اچھے اعمال اچھے اقوال اچھے ارادے اس میں داخل نہیں کیونکہ آگے مغفرت اور عذاب کا ذکر ہے۔ اچھے اعمال کی قبولیت ہوتی ہے نہ کہ مغفرت معافی اور اچھے اعمال پر ثواب ملتا ہے نہ کہ عذاب یوں ہی تُظْهِرُوْا اور تُخْفُوْهُ ہم گنہگار مسلمانوں سے خطاب ہے حضور محمد مصطفیٰ ﷺ ان جیسے خطابات میں داخل نہیں کہ وہ گناہوں سے پاک ہیں وہاں گناہ کی پہنچ بھی نہیں۔ **پانچواں فائدہ:** حساب و کتاب ہمارے اظہار پر موقوف نہیں بلکہ ہم جو کام چھپ کے کر لیتے ہیں اس کا بھی حساب ہے۔ جیسا کہ اَوْ تُخْفُوْهُ سے معلوم ہوا۔ مگر خیال رہے کہ حساب حشر دو قسم کا ہے۔ حساب یسیر یعنی پیشی پھر معافی اور حساب عسیر یعنی پوچھ گچھ کہ تم نے گناہ کیوں کئے حساب یسیر تو ہر خطرہ اور وسوسہ پر ہو سکتا ہے۔ رب فرماتا ہے۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ (الزلزلۃ: ۸) مگر حساب عسیر اور سزا گناہ کے ارادہ پر نہیں ہو سکتا لہٰذا آیت واضح ہے۔ **چھٹا فائدہ:** بندے کے افعال بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ بندہ ان کا خالق نہیں کیونکہ وہ بھی زمین و آسمان کی چیزوں میں سے ہی ایک چیز ہے۔ **مسئلہ:** جیسا کہ ظاہری اعضاء سے دو طرح کے کام ہوتے ہیں۔ اختیاری اور غیر اختیاری۔ اختیاری جیسے زبان سے بالارادہ بولنا یا ارادۃً آنکھ سے کچھ دیکھنا یا ہاتھ ہلانا اور غیر ارادی جیسا بلا قصد منہ سے کچھ نکل جانا یا بلا ارادہ کسی عورت پر نظر پڑ جانا یا ہاتھ کے رعشہ کی حرکت ان میں اختیاری کاموں پر عذاب و ثواب ہے۔ غیر اختیاری پر نہیں۔ ایسے ہی دل کے کام بھی بعض اختیاری ہیں اور بعض غیر اختیاری۔ اختیاری جیسے کفر کا عقیدہ اپنے کو بڑا سمجھنا برے کاموں کا ارادہ اور غیر اختیاری جیسے برے وسوسے اور خطرات و خیالات ان میں بھی اختیاری فعل پر پکڑ ہے۔ غیر اختیاری پر نہیں۔ تُخْفُوْهُ سے یہ ہی مراد ہے۔ لہٰذا آیت منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے۔ دیکھو رب فرماتا ہے۔ لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ۔ (بقرہ: ۲۲۵) جس سے معلوم ہوا کہ دلی کسب کا اعتبار ہے نہ کہ فقط وہم کا نیز ارشاد فرمایا لَهَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اکْتَسَبَتْ ان آیتوں اور بہت سی احادیث سے یہ ہی ثابت ہوتا ہے کہ دل کے اختیاری فعل پر سزا اور جزا ہے۔

خیال رہے: کہ بعض صحابہ کرام جیسے حضرت علی و ابن عباس و ابن مسعود اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اور بہت سے علماء نے اس تُخْفُوْهُ میں (وسوسوں اور دلی خطرات کو بھی داخل مانا ہے اور وہ حضرات اس آیت کو لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا سے منسوخ مانتے ہیں۔ دیکھو (تفسیر کبیر و روح المعانی و روح البیان) بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ ابن عمر سے روایت کی کہ یہ آیت لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ سے منسوخ ہے۔ (روح المعانی) ترمذی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہم سب بہت غمگین ہوئے کہ جب دلی خطرات کا بھی حساب ہے تو ہم میں سے کون عذاب سے بچ سکے گا۔ تب آیت لا یکلف اللہ نفسًا نازل ہوئی (درمنثور) تفسیر کبیر و خازن نے فرمایا کہ جب یہ آیت اتری تو

حضرت ابوبکر و عمر، عبدالرحمٰن ابن عوف اور معاذ ابن جبل اور دیگر حضرات (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ یہ حکم طاقت سے زیادہ ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم بھی بنی اسرائیل کی طرح کہنا چاہتے ہو۔ سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا یوں کہو سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا۔ یعنی ہم نے سنا اور اطاعت کریں گے۔ صحابہ کرام نے یہ کہا مگر ان کی آوازیں خوف سے کانپتی تھیں۔ ایک سال کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا الخ غرضکہ اس آیت میں بہت اختلاف ہے ان دونوں قولوں کی مطابقت یوں ہو سکتی ہے کہ اگرچہ صحابہ کرام اس آیت کا صحیح مطلب جانتے تھے لیکن انتہائے خوف الٰہی کی وجہ سے ان کی نظر ظاہری عموم پر پہنچی۔ حضور ﷺ نے خود تفسیر نہ فرمائی بلکہ انہیں اطاعت کا حکم دیا۔ پھر رب نے خود یوں تفسیر فرمادی کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا الخ گویا وہ آیت اسی آیت کی تفسیر ہے۔ جس سے ایک وہم دور کیا جارہا ہے نہ کہ ناسخ کبھی توضیح کو بھی مجازاً ناسخ کہہ دیا کرتے ہیں (روح المعانی) اس کی مثال یوں سمجھو کہ آیت اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ (التوبہ:۸۰) نازل ہونے کے بعد حضور ﷺ نے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ مجھے رب نے اختیار دیا ہے۔ منافقین کے لئے دعائے مغفرت کروں یا نہ کروں۔ میں نے ایک جانب کو اختیار کر لیا۔ اس فرمانے کی وجہ غلبہ رحمت ہے نہ کہ مقصد کلام سے بے توجہی۔ **مسئلہ:** اس میں اختلاف ہے کہ خبر کا نسخ جائز ہے یا ناجائز۔ حضرت عبداللہ ابن عباس و علی و دیگر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) نے جائز فرمایا مگر جمہور کا قول یہ ہے کہ کسی خبر کا نسخ جائز نہیں۔ خواہ قدیمی چیزوں کی خبر ہو۔ جیسے رب کی ذات و صفات یا متغیر چیز کی جیسے ایمان زید وغیرہ (روح المعانی، خازن و کبیر وغیرہ) **مسئلہ:** جن خبروں سے حکم یا ممانعت سمجھی جاتی ہے وہ منسوخ ہو سکتی ہیں جیسے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (بقرہ:۱۸۳) وغیرہ (روح المعانی) **مسئلہ:** حق یہ ہے کہ ارادہ گناہ پر گناہ کا عذاب نہ ہوگا بلکہ ارادہ گناہ کا۔ کوئی چوری کرنے نکلا مگر نہ کر سکا تو اس کے ہاتھ نہیں کٹ سکتے۔ ہاں اس ارادہ کا گنہگار ہوا نہ کہ چوری کا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہاں فرمایا گیا لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ اور دوسری جگہ ارشاد ہوا خَلَقَ لَکُمْ الخ (بقرہ:۲۹) یعنی سب چیزیں تمہارے لئے پیدا کی گئیں۔ یہاں بھی لام ہے اور وہاں بھی ان دونوں میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** یہاں ملکیت کا لام ہے اور وہاں نفع کا۔ یعنی ہر چیز رب کی ملک ہے اور تمہارے نفع کے لئے۔ خدا تعالیٰ نفع حاصل کرنے سے پاک ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین کی چیزیں اللہ کی ہیں۔ بتاؤ خود آسمان و زمین بھی اللہ کے ہیں یا نہیں۔ کیا وہ کسی اور کے ہیں؟ (آریہ) **جواب:** قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز برتن سے جدا نہ ہو سکے۔ تو جو اس چیز کا مالک ہوگا وہ برتن کا بھی مالک ہوگا جو مکان کا مالک ہے وہ ہی اس کے کڑی، تختوں اور کواڑوں کا بھی مالک ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مکان میں منقولی سامان کسی اور کا ہو یہ آسمان و زمین کی چیزیں ان سے نکل سکتی ہی نہیں۔ لہٰذا جب رب ان کا مالک تو آسمان و زمین کا بھی مالک۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا بخشش کے مستحق کو نہ بخشنے اور غیر مستحق کو بخشنے پر قادر ہے کیونکہ فرمایا گیا لِمَنْ یَّشَآءُ اور یہ صریح ظلم ہے کیا مسلمانوں کا خدا ظالم ہے؟ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** یادش بخیر! پنڈت جی بہت دنوں میں بولے مگر ایسے بولے جیسے ہمیشہ بولا کرتے ہیں پنڈت جی اس سے پہلے

اور پانی ایسی چیزیں ہیں، ان کا انجام احسانِ جاودانی ہے، وہ ہر حال میں اور ہمیشہ محسن ہیں، اللہ تعالیٰ کو محسن پیارے ہیں، حضرت فضیل ابن عیاض فرماتے ہیں کہ احسان کے عوض احسان کرنا بدلہ ہے، اور برائی کے عوض برائی کرنا مجازات ہے یا سزا، شعر

بدی را بدی سہل باشد جزاء — اگر مردی اَحسِن اِلٰی مَنْ اَساء

رب تعالیٰ فرماتا ہے وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (شوریٰ: ۴۰) بھلائی کے عوض برائی کرنا خباثت ہے، مگر برائی کے عوض بھلائی کرنا کرم وجود یہی بڑا کمال ہے، اس آیت میں کرم وجود ہی کا ذکر ہے، انہی کو محسن فرمایا گیا، آیت کا مطلب یہ ہے کہ غصہ پینے والے اور مجرموں کو معافی دینے والے تو متقی ہیں، مگر ان کے ساتھ سلوک کرنے والے محسن ہیں، اور محسن خدا تعالیٰ کو بڑے پیارے، تفسیر کبیر میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں، احسان یہ نہیں کہ تو بھلائی کے عوض بھلائی کردے، یہ تو بدلہ چکانا ہے، احسان یہ ہے، کہ جو تیرے ساتھ برائی کریں تو ان سے بھلائی کر، اگر حضرت روح اللہ کے فرمان کی عملی تفسیر دیکھنا ہے تو حبیب اللہ صلوات اللہ علیہ وسلامہ کی زندگی پاک میں غور کرو، وہ اس آیت کی زندہ جاوید تفسیر ہے اور اس قول کی نہ مٹنے والی شرح، شیخ سعدی فرماتے ہیں،

شنیدم کہ مردانِ راہ خدا! — دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام — کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
اور وہ لوگ جو جب کبھی کرلیں فحش یا ظلم کرلیں اپنی جانوں پر
اور وہ کہ جب کوئی بے حیائی یا اپنی جانوں پر ظلم کریں
ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ
تو اللہ کو یاد کریں پھر معافی مانگ لیں اپنے گناہوں کی اور کون بخشتا ہے
اللہ تعالیٰ کو یاد کرکے اپنے گناہوں کی معافی چاہیں اور گناہ کون بخشے
الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا
گناہ سوائے اللہ کے اور نہ اڑیں اس پر جو کریں
اللہ کے سواء اور اپنے کیئے پر جان بوجھ کر اڑ نہ جائیں
وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳۵ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ
حالانکہ وہ جانتے ہوں یہ وہ ہیں جن کا عوض بخشش ہے
ایسوں کا بدلہ ان کے رب کی بخشش

ہے جب تک کہ اس کے مطابق کلام یا عمل نہ کرے اور تمہارے جواب سے معلوم ہوا کہ قلب کے اختیاری فعل یعنی ارادہ گناہ پر پکڑ ہے۔ **جواب:** یہ حدیث احکام شرعیہ کے بارے میں ہے یعنی فقط ارادے سے طلاق یا عتق یا بیع یا صدقہ یا ہبہ نہ ہو گا۔ جب تک کہ اس کا قول یا اس پر عمل نہ ہو اور یہاں اخروی پکڑ کا ذکر ہے حدیث شریف میں ہے کہ جب دو مسلمان جنگ کے لئے نکلے اور ایک نے دوسرے کو قتل کیا تو قاتل مقتول دونوں جہنمی' قاتل تو قتل کی وجہ سے' اور مقتول ارادہ قتل سے کہ وہ بھی اسی ارادے سے آیا تھا مگر اسے موقعہ نہ ملا (از احکام القرآن) **نواں اعتراض:** خبر کا نسخ ناجائز ہونا چاہیے کیونکہ یہ جھوٹ یا لاعلمی سے ہوسکتا ہے پھر اتنے صحابہ کرام اس کے کیوں قائل ہو گئے۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ نسخ خبر کے وہ حضرات بھی قائل نہیں ان کے کلام میں جو نسخ آیا وہ مجازاً بمعنی تفسیر ہے۔ (روح المعانی) دوسرا یہ کہ وہ حضرات واقعات کی حکایت کو قابل نسخ نہیں مانتے بلکہ صرف قوانین کی خبروں کو مثلاً یہ ممکن نہیں کہ رب تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی خبر دے کہ ایسا ہوا تھا اور پھر اسے منسوخ کر دے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ پہلے خبر دی جائے کہ ہم تمہارے دلی ارادوں کا بھی حساب لیں گے۔ پھر ارشاد فرمادے کہ اچھا اس کا معافی ہے۔ اس کا حساب نہ لیں گے۔ یہ کسی خبر کی تبدیلی نہیں بلکہ قانون کی تبدیلی ہے کہ اب تک یہ قانون تھا اور اب سے یہ دوسرا جاری ہوا۔ اور ہم تفسیر میں عرض کر چکے ہیں کہ وہ احکام جو بصورت خبر ہوں نسخ قبول کر لیتے ہیں۔ **دسواں اعتراض:** جس کو چاہا بخش دیا جس کو چاہا سزا دے دی۔ یہ تو لاقانونی ہے اور لاقانونی غلط بھی ہے۔ باعث فساد ملک بھی آج ایسے راج کو چوپٹ راج اور ایسے ملک کو اندھیر نگری کہا جاتا ہے۔ رب کے ہاں ایسی اندھا دھند نہیں ہوسکتی؟ **جواب:** دوسرے کے حقوق میں اس قسم کا طریقہ غلط ہے۔ شریعت میں قانونی مجرم کو معاف نہیں کیا جاسکتا مگر اپنے مجرم کو جسے چاہیں معاف کرنا' جسے چاہیں معاف نہ کرنا بالکل درست ہے۔ ہم اپنے مقروض کو جسے چاہیں معاف کر دیں جسے چاہیں معاف نہ کریں۔ اس سے وصول کر لیں ہم کو حق ہے بندے رب کے مقروض ہیں وہ مختار ہے جس کو چاہے اپنا قرض معاف کر دے جس کو چاہے سزا دے۔ ہاں حقوق العباد میں یہ نہ ہوگا۔ وہاں ظالم سے ضرور مظلوم کا بدلہ دیا جائے گا۔ یا خود مقروض سے معاف کرایا جائے گا۔ یہاں گناہوں کی معافی کا ذکر ہے نہ کہ حقوق العباد کی معافی کا ذکر۔

تفسیر صوفیانہ

انسان روح اور جسم کے مجموعہ کا نام ہے۔ روح عالم امر کی ایک چیز ہے اور جسم عالم خلق کا روح ملکوت میں سے ہے اور جسم ملک میں سے روح نورانی ہے اور جسم ظلمانی روح علوی ہے اور جسم سفلی' ان میں سے ہر ایک اپنے عالم کی طرف جانا چاہتی ہے۔ روح کا قصد قرب رب العالمین ہے اور نفس و جسم کا میلان حق سے دوری اور اسفل السافلین کی طرف حضور ﷺ کی تشریف آوری اس لئے ہے کہ لوگوں کو نفسانی ظلمتوں سے پاک کر کے قرب الٰہی کا مستحق بنائیں اور ان کی ظلمت نفس کو مٹا کر ان پر روح کے انوار ظاہر فرمائیں جس کے بارے میں ارشاد ہوا۔ يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ (بقرہ: ۲۵۷) مگر شیطان کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو روحانی انوار سے نکالے اور نفسانی ظلمتوں میں پھنسائے تاکہ انسان رب العالمین سے دور ہو کر اسفل السافلین میں پہنچے۔ اس آیت میں ارشاد ہو رہا ہے کہ اے انسانو اگر تم اپنی ظلمات نفس کو ظاہر کرو کہ شریعت کے مخالف اور طبیعت کے موافق رہو یا ان ظلمات کو چھپاؤ اور دباؤ کہ طبیعت کی مخالفت کرو اور شریعت کی موافقت رب تعالیٰ

دوستی و بھائی چارہ تھا، وہ کبھی آپس میں جدا ہوتے ہی نہ تھے، ایک بار ثقفی نبی کریم ﷺ کے ساتھ جہاد میں گئے اور اپنے گھر کا انتظام و کاروبار انصاری کے سپرد کر گئے، چنانچہ وہ انصاری کام کاج کے لئے ثقفی کے گھر پردہ کے ساتھ جاتے آتے رہے، ایک دن گوشت یا کوئی اور چیز ثقفی کے گھر دینے گئے، ثقفی کی بیوی نے اندر سے لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا، انہوں نے اس کا ہاتھ چوم لیا، فوراً ہی شرمندہ ہو گئے اور جنگل کی طرف چلے گئے، اپنے سر پر خاک ڈالتے تھے، منہ پر طمانچے مارتے تھے کہتے تھے کہ میں نے غازی بھائی کی خیانت کی، کئی روز تک ان کا یہی حال رہا، جب ثقفی اپنے گھر واپس آئے، تو اپنی بیوی سے پوچھا میرے انصاری بھائی کا کیا حال ہے، وہ بولی خدا ایسے بھائی کسی کو نہ دے، اور تمام ماجرا سنا دیا، ثقفی اس انصاری کی تلاش میں نکلے، انہیں پہاڑوں میں سجدہ ریز اور آنسو بہاتے پایا، جو چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے، الٰہی لٹ گئی میری ساری کمائی، میں اپنے مجاہد و غازی بھائی کا خائن ہوں، اس درد سے عرض کر رہے تھے کہ ثقفی رو پڑے، محسوس یوں ہوتا تھا، کہ پہاڑوں کے پتھر بھی ان کے ساتھ رو رہے تھے، ثقفی نے انصاری کو سجدہ سے اٹھایا اور کہا کہ یہاں سجدے نہ کرو، اس شفا خانہ میں چلو جہاں ہر دردمند کا علاج اور ہر بیماری کی دوا ہے، وہاں چلو جہاں گنہگار جایا کرتے ہیں، وہاں چلو جہاں گنہگاروں کو قرآن بھیج رہا ہے، وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ الخ (النساء: ۶۴) غرضکہ انہیں مدینہ منورہ لے آئے، اتفاقاً عصر کی نماز کے وقت یہ دونوں حضرات مسجد نبوی شریف میں داخل ہوئے ادھر پہاڑ سے یہ دونوں آئے، ادھر سدرہ سے جبریل امین یہ دونوں آیتیں لے کر آئے، حضرت ابن عباس کا یہی قول ہے، (۳) تیسرے یہ کہ مدینہ منورہ میں ایک شخص تیہان تھے، جنہیں تیہان تمار کہا جاتا تھا، کیونکہ ان کی کھجوروں کی دکان تھی، ان کی دکان پر ایک حسین عورت کھجوریں خریدنے کے لئے آئی، انہوں نے اس سے کہا، یہ کھجوریں ردی ہیں، اعلیٰ کھجوریں گھر میں ہیں، وہاں چلو، لے لو، اس بہانے سے اسے گھر میں لے گئے اور اس کا بوسہ لے لیا، عورت نے کہا، اللہ کے بندے اللہ تعالیٰ سے ڈر، کل قیامت میں اللہ کو کیا منہ دکھائے گا، اللہ تعالیٰ کا نام سنتے ہی اسے پسینہ آ گیا، رونگٹے کھڑے ہو گئے، شرمندہ ہو کر بارگاہِ نبوی شریف میں حاضر ہوئے، تب یہ آیتیں نازل ہوئیں (تفسیر کبیر، خازن، خزائن، روح المعانی وغیرہ) لیکن ان روایتوں میں تعارض نہیں ہو سکتا ہے، کہ یہ تینوں واقعات بیک وقت یا قریب وقت میں پیش آئے ہوں، اور ان تینوں واقعات پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ہو،

تفسیر

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً واؤ عاطفہ ہے، اور یہ اَلَّذِيْنَ پہلے اَلَّذِيْنَ پر معطوف ہے اور جو اس اَلَّذِيْنَ کا حال تھا پیش یا کسرہ یا زبر، وہی اس کا بھی حال ہے، اِذَا یہاں عموم زمان کے لئے ہے، یعنی جب کبھی، فَاحِشَہ فحش سے بنا بمعنی بوجھ، وزن، یا بھاری ہونا، یا برائی میں حد سے بڑھ جانا، یہ پوشیدہ موصوف کی صفت ہے، فَعْلَةً فَاحِشَةً موصوف اپنی صفت سے مل کر یا فَعَلُوْا کا مفعول مطلق ہے یا مفعول بہ یعنی جب کبھی کوئی فحش حرکت کر لیں اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یہ جملہ فَعَلُوْا الخ پر معطوف ہے، ظَلَمُوْا ظلم سے بنا جس کے معنی بارہا بیان کئے جا چکے ہیں، انفس نفسٌ کی جمع ہے، نفس کے معنی سانس، دل اور ذات وغیرہ ہیں، یہاں بمعنی ذات ہے، فاحشہ اور ظلم میں چند طرح فرق کیا گیا ہے (۱) گناہ کبیرہ فاحشہ ہے اور گناہ صغیرہ ظلم (۲) عملی

اخیری سانس لفظ رسول اللہ پر ختم ہو۔ **دوسرا تعلق:** جب سلطانی حکم رعایا کی طرف آتا ہے تو اس کے پہلے سلطان کا نام ہوتا ہے بعد میں احکام کا ذکر اور آخر میں مہر عدالت اور وزراء امراء کی تصدیق۔ سورۂ بقرہ میں بھی یہ ہی ہوا کہ پہلے رب کا نام آیا پھر اس کے احکام ارشاد ہوئے اب آخر میں عدالتِ مصطفیٰ ﷺ کی مہر اور خدام بارگاہ صحابہ کرام کی تصدیق۔ یعنی یہ احکام رب نے بھیجے اور مصطفیٰ ﷺ اور ان کے جان نثاروں نے تصدیق کی۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ کے کمال علم وقدرت کا ذکر تھا جس سے اس کی ربوبیت کا ثبوت ہوا اب مسلمانوں کی اطاعت شعاری اور وفاداری کا تذکرہ ہے جس سے ان کی عبدیت کا ظہور ہو۔ یعنی ہم کامل رب اور مسلمان ہمارے کامل بندے ہیں۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ کے جلال کا ذکر تھا کہ ہم تمہارے ہر ظاہر اور ہر چھپے ہوئے عیوب کا حساب لیں گے۔ اب مسلمانوں کی مدح بیان فرما کر جمال الٰہی کا اظہار ہے کہ جیسے دنیا میں ہم مسلمانوں کی تعریفیں فرماتے اور ان کے عیوب چھپاتے ہیں ایسے ہی آخرت میں ہوگا کہ مسلمانوں کی نیکیاں سب دیکھیں گے اور عیبوں پر پردہ ڈال دیا جائے گا' جیسے ہمارا علم قدرت کامل ہے۔ ویسے ہمارے جود ورحمت بھی کامل (کبیر) **پانچواں تعلق:** سورۂ بقرہ کی ابتدا میں پرہیزگاروں کی تعریف کی گئی تھی کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز وزکوٰۃ ادا کرتے ہیں اب ان مومنین کا پتہ بتایا جارہا ہے کہ وہ امت مصطفیٰ ﷺ ہے جس کے عقائد اعمال اور دعا کی یہ نوعیت ہے۔ **چھٹا تعلق:** اب تک عبادات ومعاملات کے بہت سے احکام بیان ہوئے۔ اب ان کی حقانیت کا ثبوت دیا جارہا ہے کہ نبی ﷺ محض اپنے خیال سے یا سن سنا کر یہ احکام بیان نہیں فرماتے بلکہ انہیں دلائل ومشاہدہ سے یقین ہے کہ جبرائیل فرشتہ ہیں نہ کہ جن اور یہ جو کچھ کہتے ہیں۔ رب تعالیٰ کی طرف سے کہتے ہیں نہ کہ اپنی طرف سے۔ اور مسلمانوں کو بذریعہ معجزات یقین ہے کہ یہ قرآن رب کا کلام ہے نہ کہ کسی انسان کا اور نبی وجبریل (علیہما السلام) کلام بدلنے سے معصوم ہیں۔ اور یہ کلام شیطانی اثرات سے بالکل محفوظ۔

شانِ نزول

تفسیر خازن ودرمنثور وغیرہ نے عبداللہ ابن عباس وغیرہم سے روایت کی کہ جب وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ الخ (بقرہ: ۲۸۴) آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام کی ایک جماعت نے بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا حبیب اللہ ہم نے تمام احکام کی اطاعت کی اور ہم وفادار رہیں گے' لیکن دل کے وسوسے اور خطرے قابو سے باہر نہیں ہیں اگر ان پر حساب ہوا تو نجات کی کیا راہ ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم بنی اسرائیل کی طرح کہنا چاہتے ہو سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا ہم نے سن تو لیا مگر مانیں گے نہیں۔ تب وہ حضرات معذرت کرنے لگے۔ اس پر یہ آیت کریمہ اُتری جس میں غلامان مصطفیٰ ﷺ کی صفائی بلکہ سفارش کی گئی کہ اے محبوب (علیہ السلام) ہم گواہی دیتے ہیں کہ یہ لوگ آپ کے خدام ہمارے مطیع اور سچے مسلمان ہیں مگر جمہور مفسرین نے اس جگہ خاموشی اختیار کی کیونکہ ان کے نزدیک آیت وَاِنْ تُبْدُوْا منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے۔ ہم دونوں قولوں کی مطابقت پچھلی آیت میں کر چکے۔

تفسیر

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ اٰمَنَ ایمان سے بنا ماضی ہے۔ ایمان کے معنی تصدیق کرنا' پہچاننا اور

سے معافی چاہتے ہیں یہ جانتے ہوئے کہ ہمارا کوئی رب ہے یا یہ جانتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ غفار ہے یا یہ جانتے ہوئے کہ ہم گنہگار ہیں یا یہ جانتے ہوئے کہ ہمارے گناہوں سے اس کی رحمت زیادہ ہے یا یہ جانتے ہوئے کہ بڑے سے بڑا گناہ بخشا رب تعالیٰ کو آسان ہے یا یہ جانتے ہوئے کہ میں اگرچہ گنہگار ہوں مگر حضور علیہ السلام کا امتی ہوں، قابل معافی ہوں یا یہ مطلب ہے کہ وہ جانتے ہوئے گناہ پر ضد نہیں کرتے، اگر نادانی سے دوبارہ گناہ ہو جائے تو دوسری بات ہے اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ اُولٰٓئِكَ سے ان متقین کی طرف اشارہ ہے جن میں مذکورہ بالا سارے صفات جمع ہوں، ہر حال میں خیرات کرنا، غصہ پینا، لوگوں کو معافی دینا، گناہ کر کے توبہ کر لینا، گناہ پر ضد نہ کرنا اور ہو سکتا ہے کہ اس سے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہو جن میں یہ آخری دو صفتیں ہیں، گناہ پر نہ اڑنا اور توبہ کرنا جَزَآؤُهُمْ میں اشارۃً فرمایا گیا کہ اگلی نعمتیں ان کے پچھلے اعمال کا بدلہ ہیں، اگرچہ ہمارا فضل بھی شامل ہے، مگر ان کے عمل کو بھی اس میں دخل ہے مَغْفِرَةٌ کی تنوین عظمت کی ہے، یعنی ایسے لوگوں کا بدلہ یہ ہے کہ انہیں رب تعالیٰ کی طرف سے عظیم الشان معافی ملے گی، جس سے ان کا کوئی گناہ باقی نہ رہے گا، وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خیال رہے کہ رب تعالیٰ نے ان بزرگوں کے دو انعام بیان کیے، عذاب سے امن ثواب کی عطاء، چونکہ عذاب سے امن مقدم ہے اس لئے پہلے اس کا ذکر ہوا، بعد میں عطائے ثواب کا، یعنی غفران کے بعد جنان دی جائیں گی، خیال رہے کہ جنت پوری بہشت کا نام بھی ہے، اور اس کے ہر طبقہ کا نام بھی، اور ان حصوں کا نام بھی جو ہر ایک کو الگ الگ تقسیم ہوں گے، پھر ہر ایک کے حصہ میں جو مختلف باغ آئیں گے، وہ سب جنت کہلائیں گے، لہٰذا اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایک متقی کو بہت بہت جنتیں عطا فرمائی جائیں گی، انہار فرما کر یہ بتایا کہ جنتیوں میں بحار یعنی دریا نہیں بلکہ انہار یعنی نہریں ہیں، پھر ایک نہر نہیں بلکہ پانی، دودھ، شہد، شراب طہور کی مختلف نہریں ہیں، پھر وہ نہریں کہیں دور نہیں، کہ وہاں سے جا کر یہ چیزیں لائی جائیں، بلکہ درختوں کی جڑوں میں محلوں کے نیچے مکانوں کے اندر موجود ہوں گی، پھر دنیا کی نہروں کی طرح نہیں کہ کبھی خشک کبھی جاری بلکہ ہمیشہ ہی بہتی ہوں گی، پھر ان چیزوں کے تالاب نہیں جہاں یہ چیزیں ٹھہری ہوں بلکہ نہریں ہیں، خیال رہے کہ معمولی وخوش نما بہاؤ کو جریان کہتے ہیں اور تیز وخطرناک بہاؤ کو سیل تجری فرما کر یہ بتایا کہ ان نہروں کی روانگی طوفانی نہ ہو گی بلکہ خوش نما اور رحمانی ہو گی، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ھم ضمیر سے حال ہے، خٰلِدِيْنَ خلود سے بنا جس کے معنی ہمیشہ رہنا بھی ہے اور بہت رہنا بھی، یہاں ہمیشہ رہنا مراد ہے، کیونکہ بعض جگہ اس کے بعد ابداً بھی فرمایا گیا ہے یعنی جنتی وہاں پہنچ کر نہ مریں گے، نہ کبھی نکالے جائیں گے، نہ منتقل ہوں گے، نیز نہ ان کے باغوں کے پھل کبھی ختم ہوں گے، نہ نہروں کے پانی وغیرہ کبھی خشک ہوں، وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ یہ گذشتہ مضمون کا بقیہ ہے، جس میں بتانا یہ ہے کہ ان کا اجر وثواب نہ بیان میں آسکتا ہے نہ اذہان میں، یوں سمجھ لو کہ ان کا ثواب بہت ہی اچھا ہے، جسے رب تعالیٰ اچھا فرمائے، سمجھ لو کہ وہ کیسا ہو گا عَامِلِيْنَ فرما کر یہ بتایا گیا کہ یہ ثواب اعمال کا ہے، اگر تمہیں چاہیے تو نیک عمل کرو،

خلاصہ تفسیر

جن متقیوں سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے، ان میں وہ نیک کار بھی ہیں جن میں مذکورہ بالا صفات ہوں، اور وہ گنہگار بھی داخل

ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جب ان سے کوئی گناہ کبیرہ یا صغیرہ سرزد ہو جائے، تو فوراً ان کا دھیان اللہ کے جلال، اس کے عذاب اور اس کی پکڑ کی طرف جائے اور وہ دل میں سوچیں کہ آج تو ہم نے یہ کر لیا، کل حساب کیا دیں گے، اور رب تعالیٰ کے سامنے کیونکر پیش ہوں گے، یہ سوچ کر فوراً اپنے گناہوں کی معافی مانگیں، یا جب کبھی ان سے کوئی گناہ ہو جائے، تو پہلے اللہ کی حمد و ثناء کرتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں، کیونکہ حمد کے بعد معافی مانگنا زیادہ مفید ہے، خود سوچ لو کہ اے بندو اللہ تعالیٰ کے سواء، تمہارا بخشنہار کون ہے جو تمہاری خطاؤں سے درگزر کرے اور تمہیں معافی دے اور ان کی صفت یہ بھی ہے کہ اپنے کئے ہوئے گناہوں پر اڑ نہیں جاتے، دیدہ و دانستہ پھر گناہ کی ہمت نہیں کرتے، یہی متقی و مقبول بندے ہیں جن کی جزاء یہ ہے، کہ رب تعالیٰ ان کے سارے گناہ بخش دے گا، اور بجائے عذاب دینے کے ان میں سے ہر ایک کو ایسے باغات دے گا جن کے نیچے یا جن میں کوثر، سلسبیل، شراب طہور، دودھ اور شہد کی نہریں رواں ہیں، کبھی خشک نہیں ہوتیں، یہ لوگ ان باغوں اور نہروں میں ہمیشہ رہیں گے، نہ مریں، نہ نکالے جائیں، اور نہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل کئے جائیں، نہ بیمار پڑیں اور نہ کسی چیز سے انہیں پرہیز کرنے کی ضرورت پڑے، ان کا ثواب اور جنتوں کی تعریف احاطۂ بیان میں نہیں آسکتی، الفاظ کا دائرہ تنگ ہے، یہ سمجھ لو کہ ایسے اعمال والوں کو بہت ہی اچھا ثواب دیا جائے گا، ترمذی نے حضرت عطاف ابن خالد سے روایت کی، وہ فرماتے ہیں کہ مجھے حدیث پہنچی ہے، جب یہ آیت کریمہ اتری تو ابلیس چیخنے چلانے، رونے پیٹنے اور سر پر خاک ڈالنے لگا، اس کی ذریت جمع ہو گئی، بولی تجھے کیا ہوا؟ وہ بولا کہ قرآن میں ایسی آیت اتری ہے کہ اب کوئی بھی گنہگار سزا نہ پائے گا، مغفرت کا بڑا عظیم الشان دروازہ کھول دیا گیا ہے، وہ بولے فکر نہ کر، ہم ان انسانوں کو حتی الامکان توبہ کی طرف آنے ہی نہ دیں گے، بلکہ ان کے برے اعمال کو ان کی نگاہوں میں اچھا کر دکھائیں گے، جس سے وہ اپنے گناہوں پر بجائے ندامت کے فخر کیا کریں گے، اس پر وہ بہت خوش ہوا (روح المعانی) ابوداؤد نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ فرمایا نبی کریم ﷺ نے جو شخص گناہوں کی معافی مانگتا رہے، وہ گناہوں پر مصر نہیں اگرچہ دن میں ستر بار گناہ کرے (خازن) بیہقی نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے موقوفاً روایت کی، کہ گناہ صغیرہ اصرار سے کبیرہ ہو جاتا ہے، اور جس سے بندہ توبہ کرے وہ کبیرہ نہیں رہتا (روح المعانی)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** توبہ و استغفار اسلام میں اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے، ہمارے جد امجد حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جنت سے زمین پر آکر پہلی عبادت یہی کی، کہ اپنی لغزش کی معافی مانگتے رہے، استغفار ہی ایک ایسا وظیفہ ہے جس کے فضائل و فوائد قرآن کریم نے بیان فرمائے، کہ ارشاد فرمایا فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا الآیہ (نوح: ۱۱-۱۰) اور استغفار ہی ایسا وظیفہ ہے جس کا وقت بھی قرآن شریف نے بتایا، کہ فرمایا وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ (آل عمران: ۱۷) استغفار ہی ایسا عمل ہے جس کی جگہ بھی قرآن شریف ہی نے بتائی، کہ فرمایا جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ الآیہ (النساء: ۶۴) استغفار کے فضائل، مسائل اور اس کا تفصیلی بیان ہم

کی۔ یعنی مسلمان نبی کا فرمان سن کر عرض کرتے ہیں کہ ہم نے آپ کے سارے فرمان گوش ہوش سنے' اور ان کی حقانیت کا یقین کیا۔ اور آپ کے سارے احکام کی اطاعت کریں گے۔ روح البیان و درمنثور نے فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت جبرائیل نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس آیت میں رب تعالیٰ نے آپ اور آپ ﷺ کی امت کی بڑی تعریف فرمائی۔ لہٰذا آپ کچھ رب سے مانگئے تو حضور ﷺ نے دعا مانگی۔ جس کو رب نے ان الفاظ میں نقل فرمایا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ۔ اس روایت کی بنا پر یہاں قَالَ محذوف ہوگا جس کا فاعل نبی ﷺ ہیں اور یہ جملہ مفعول بہ۔ یا رب تعالیٰ نے مسلمانوں کو تعلیم دی۔ تو یہ قُوْلُوْا فعل پوشیدہ کا مفعول بہ ہے۔ غُفْرَانَ' سبحان کی طرح مصدر ہے یا تو اغفر فعل پوشیدہ کا مفعول مطلق ہے یا نسئل کا مفعول بہ۔ یہ ضَرَبَ یَضْرِبُ سے ہے۔ ک ضمیر غفران کا مضاف الیہ ہے جو حقیقت میں نسئل کا مفعول تھی' رَبَّنَا سے پہلے یا پوشیدہ ہے۔ وَاِلَیْکَ میں واؤ عاطفہ ہے اور یہ جملہ ایک پوشیدہ عبارت کا معطوف ہے یعنی مِنْکَ الْمُبْدءُ وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ۔ اِلَیْکَ ایک پوشیدہ عبارت کے متعلق ہو کر خبر مقدم ہے اور مصیر مبتداء مؤخر۔ مصیر' صَارَ یصیر کا مصدر میمی ہے اس کا مادہ صیر ہے۔ بمعنی ہو جانا اور لوٹنا۔ یعنی وہ عرض کرتے ہیں کہ اے مولیٰ چونکہ ہم تیری اطاعت کا عہد کرتے ہیں تو بھی اپنے کرم سے ہماری خطاؤں کو بخش دے۔ ہم تجھ سے تیری مغفرت مانگتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تجھ سے ہی سب کی ابتداء ہے اور تیری طرف سب کی انتہاء۔

خلاصہ تفسیر

جو کچھ رب کی طرف سے نبی ﷺ پر اترا' اس پر یہ نبی بھی ایمان لائے اور سارے مسلمان بھی۔ کہ یہ رب کا کلام ہے۔ اس میں کسی کی ملاوٹ نہیں۔ نہ جبرئیل نے رب سے حاصل کرنے میں کچھ شک و شبہ کیا' نہ ادا کرنے میں کمی بیشی اور نہ رسول اللہ ﷺ نے سننے میں خطا کی' نہ پہچاننے میں کوتاہی' سارے مسلمان اللہ کی ذات اور اس کے صفات اور اس کے ناموں پر ایمان لائے۔ انہوں نے اعتقاد رکھا' کہ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک و مثل نہیں۔ اسکے علم و قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔ نیز اس کے فرشتوں پر ایمان لائے کہ وہ سب موجود ہیں گناہوں سے پاک ہیں۔ نورانی جسم ہیں۔ رب اور انسان کے درمیان واسطہ ہیں۔ انہی کے ذریعہ پیغمبروں پر کتابیں آئیں۔ نیز اس کی ساری کتابوں پر ایمان لائے کہ یہ اللہ کی کتابیں ہیں۔ کہانت جادو اور شیطانی الہامات سے پاک ہیں۔ قرآن میں کوئی تحریف و تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس میں محکمات و متشابہات ہیں۔ نیز وہ سارے پیغمبروں پر ایمان لائے کہ وہ گناہوں سے معصوم ہیں۔ وحی الٰہی کے امین' ساری خلق سے افضل ہیں۔ اور ان میں سے بعض بعض سے اعلیٰ اور افضل۔ چونکہ رب کی طرف سے کتابیں فرشتے لائے' اور پیغمبروں پر لائے۔ اس لحاظ سے یہاں پہلے ان کا ذکر ہوا پھر فرشتوں کا پھر کتابوں کا' پھر رسولوں کا' مسلمان یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ اے مولیٰ ہم یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح انبیاء پر ایمان لانے یا ان کے نبی ماننے میں فرق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں۔ یا بعض کی نبوت اصلی مانیں اور بعض کی عارضی سب کو اصل نبوت میں برابر مانتے ہیں اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مولیٰ ہم نے تیرا سارا کلام عقیدت سے سنا' اور تجھ سے عہد کرتے ہیں کہ تیرے احکام کی اطاعت کریں گے۔ اے مولیٰ ہمیں بخش دے۔ تجھ سے ہی سب کی ابتدا ہے اور تیری طرف سب کا لوٹنا ہے خیال رہے کہ جیسے حضور ﷺ فرشتوں پر ایمان لائے۔ ایسے ہی سارے

مہر کی معافی دینے والا بیوی کو قرار دیا گیا ہے، یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ گناہ تو بہ سے معاف ہوتا ہے، اور حقوق العباد سے توبہ کے لئے معافی حاصل یا حق کا ادا کر دینا شرط ہے تو گویا یہ معافی وغیرہ اس توبہ کا رکن ہے، **دوسرا اعتراض:** اگر ہمیشہ کا بے نمازی صرف منہ سے توبہ کرے، تو کیا چھوٹی ہوئی نمازیں معاف ہو جائیں گی، اگر نہیں تو کیوں؟ یہاں ذنوب تو مطلق ہے، **جواب:** ہرگز معاف نہیں ہوں گی، بلکہ نمازیں قضا کرے، پھر تاخیر کی معافی مانگے، نماز حق ہے اور اس کا چھوڑنا حق شریعت مارنا ہے، حق کی معافی اداء کے بغیر کیسی؟ نبی کریم ﷺ نے ایک چور کا ہاتھ کٹوایا، پھر اس سے توبہ کرائی، معلوم ہوا کہ ہاتھ کٹنا حق کے لئے تھا، اور توبہ گناہ کی معافی کے لئے، **تیسرا اعتراض:** تم نے کہا کہ گناہ معاف کرنا صرف رب تعالیٰ کا کام ہے، کسی بندہ کو اس کا اختیار نہیں، اور اِلَّا اللّٰہُ سے معلوم بھی یہی ہوا، مگر تمہارا عقیدہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ بھی گناہ معاف کیا کرتے ہیں، تم لوگ پڑھا کرتے ہو، شعر

بخش دو میری خطائیں دور ہوں غم کی گھٹائیں
بھیج دو اپنی عطائیں صلوات اللہ علیک

یہ عقیدہ اور یہ اشعار صریح شرک ہیں اور اس آیت کے خلاف، **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک عالمانہ، دوسرا عاشقانہ، جواب عالمانہ تو یہ ہے کہ شریعت کے سارے احکام اللہ کا بھی حق ہیں اور اس کے رسول کا بھی، عبادات کرنا اللہ رسول کا حق ہے اور گناہوں سے بچنا اللہ رسول کا حق ہے، اسی لئے رب تعالیٰ نے عبادات کے بارے میں فرمایا وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (توبہ: ۶۲) اللہ رسول اس کے حق دار ہیں کہ انہیں لوگ راضی کریں، اور گناہوں کے بارے میں فرمایا وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (توبہ: ۲۹) یعنی جسے اللہ رسول نے حرام کیا اسے یہ حرام نہیں سمجھتے ہیں، اور فرمایا وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (اعراف: ۱۵۷) یہ نبی ان پر گندی چیزیں حرام فرماتے ہیں، اور سارے احکام شرعیہ کے لئے فرمایا وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (مائدہ: ۹۲) معلوم ہوا کہ ہر حکم شرعی میں اللہ کی بھی اطاعت ہے، اس کے رسول کی بھی، اب ہر نیکی کرنے والا دو حق ادا کرتا ہے حق اللہ اور حق الرسول، اور ہر گناہ کرنے والا دو حق مارتا ہے اللہ کا اور اس کے رسول کا، لہٰذا مجرم جو حضور انور ﷺ سے معافی چاہتے ہیں، وہ ان کے حق کی معافی چاہتے ہیں، اب پڑھو، بخش دو میری خطائیں، یعنی یا رسول اللہ! (ﷺ) میں نے جو گناہ کئے، ان سے آپ کو تکلیف پہنچی، مجھے معافی دے دو، دیکھو ہجرت اللہ کی عبادت ہے، مگر رب تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (النساء: ۱۰۰) جواب عاشقانہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ فنا فی اللہ ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حضور انور ﷺ کا قول و فعل رب تعالیٰ کا قول و فعل ہے، حضور اکرم ﷺ کی اطاعت رب تعالیٰ کی اطاعت ہے مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء: ۸۰) اور فرماتا ہے، اے محبوب جو کنکر تم نے پھینکے تھے وہ تم نے نہ پھینکے تھے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (انفال: ۱۷) (اللہ نے پھینکے) اور جو تم سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں، ان کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (فتح: ۱۰) جب یہ معلوم ہو گیا تو سمجھ لو، کہ حضور انور ﷺ کا معاف فرمانا رب تعالیٰ ہی کا معاف فرمانا ہے، جس کو حضور ﷺ فرمائیں معاف کر دیا، وہاں فرما رہا

کا مطالعہ فرماؤ' یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کا ایمان صحابہ کرام کی طرح نہیں ہو سکتا کہ ان کے ایمان کی رب تعالیٰ گواہی دے چکا یہ بھی معلوم ہوا کہ ان حضرات کو رب تعالیٰ نے حسن خاتمہ ایمان پر وفات نصیب فرمائی اگر وہ حضرات ایمان پر قائم رہنے والے نہ ہوتے تو رب تعالیٰ جو عالم الغیب ہے کبھی ان کے ایمان کا اس شاندار طریقہ سے اعلان نہ فرماتا ان کا مومن ہونا تو قرآن شریف سے ثابت ہو چکا۔ اب ان کے ایمان سے نکلنے کے لئے کوئی آیت ہی چاہیے وہ تو ہے نہیں۔ **چوتھا فائدہ:** قرآن پاک میں نہ تبدیلی ہوئی نہ تحریف' جو کوئی اس میں کمی یا زیادتی مانے' وہ کتبہ کا مومن نہیں۔ (کبیر) **پانچواں فائدہ:** سارے فرشتوں ساری کتابوں' اور سارے رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے ان میں سے ایک کا بھی انکار کرنا کفر ہے۔ جیسا کہ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ سے معلوم ہوا۔ **مسئلہ:** بہتر یہ ہے کہ انبیاء کیلئے تعداد مقرر نہ کرے کیونکہ اس کا یقین نہیں۔ یوں کہے کہ سارے پیغمبروں پر ہمارا ایمان ہے۔ **چھٹا فائدہ:** اگرچہ پیغمبر درجات میں مختلف ہیں کہ ان میں بعض بعض سے اعلیٰ مگر نفس نبوت اور ایمان میں سب برابر جو کوئی بعض کا انکار کرے۔ یا مولوی قاسم و مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح بعض کو اصلی نبی اور بعض کو عارضی نبی مانے وہ بے ایمان ہے۔ جیسا کہ لَا نُفَرِّقُ سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** اللہ' فرشتوں' کتابوں' رسولوں' جنت' دوزخ' حشر' نشر سب پر ایمان لانا ضروری ہے اس لئے یہاں پہلے چار کا ذکر صراحتاً فرمایا اور جنت و دوزخ کا ذکر سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا میں حشر اور نشر کا ذکر وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ میں اشارتاً فرمایا گیا۔ **آٹھواں فائدہ:** دعا مانگنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے رب کے صفات پھر اپنی وفاداری اور گنہگاری کا ذکر کر کے پھر طلب حاجت کرے۔ اسلئے یہاں غفران سے پہلے ایمان کا ذکر ہوا معلوم ہوا کہ وسیلۂ اعمال سے دعا جلد قبول ہوتی ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اگر نبی اور مومنین میں فرق ہے تو ایک اٰمَنَ کے فاعل دونوں کیونکر ہو گئے۔ اگر کہا جائے کہ اس اٰمَنَ کے معنی ہی دو ہیں تو غلط ہے کیونکہ مشترک کے دو معنی مراد لینا ناجائز اگر ایمان میں فرق ہوتا تو رسول کے لئے اٰمَنَ الگ لایا جاتا' اور مسلمانوں کے لئے علیحدہ۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اور مومنین حقیقت ایمان میں ایک ہیں۔ لہٰذا نبی کو کیوں نہ بھائی کہا جائے (دیوبندی) **جواب:** ایک فعل کے دو فاعلوں کے لحاظ سے دو معنی مراد لئے جا سکتے ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَکُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِیْنَ۔ (نمل: ۸۷) قیامت میں ساری مخلوق بارگاہ الٰہی میں حاضر ہو گی۔ حالانکہ ان میں سے بعض اڑ کر بعض چل کر اور بعض پیٹ کے بل گھسٹ کر آئیں گے مگر سب کی آمد کو ایک اَتَوْهُ سے بیان فرمایا۔ نیز فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ۔ (احزاب: ۵۶) اللہ اور فرشتے نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ دیکھو اللہ کی صلوٰۃ رحمت ہے اور فرشتوں کی صلوٰۃ دعاء رحمت۔ مگر دونوں کو ایک ہی صیغہ یُصَلُّوْنَ سے بیان فرمادیا گیا۔ ایسے ہی یہاں سے اجتماع مشترک کا قاعدہ یہاں جاری نہیں ہوتا۔ اجتماع مشترک اور ہے عموم مشترک کچھ اور اجتماع مشترک ممنوع ہے۔ عموم مشترک جائز بلکہ بہت واقع ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ سارے پیغمبر درجہ میں یکساں ہیں جیسا کہ لَا نُفَرِّقُ نے بتایا۔ حضور ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا۔ لَا تُفَضِّلُوْنِیْ عَلٰی یُوْنُسَ ابْنَ مَتّٰی۔ مجھے یونس علیہ السلام پر بھی بزرگی نہ دو۔ لہٰذا حضور ﷺ کو سید الانبیاء نہ کہنا چاہیے۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ انبیاء کرام میں نفس رسالت میں

فرق نہیں کہ کوئی اصلی نبی ہو کوئی عارضی۔ دیگر درجات میں فرق ہے۔ اسی لئے بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ فرمایا گیا نہ کہ بین درجات احد۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ۔ دوسرا یہ کہ لا نفرق کا مطلب ہے۔ ہم اپنی طرف سے ان میں فرق نہیں کرتے جو رب نے فرق مراتب فرما دیا اسے مانتے ہیں۔ تیسرا یہ کہ ہم ایسا فرق نہیں کرتے جس سے کسی پیغمبر کی توہین ہو جائے۔ یہ ہی حدیث کا مطلب ہے کہ مجھے یونس علیہ السلام پر ایسی بزرگی مت دو۔ جس سے ان کی توہین نہ ہو' ورنہ حضور ﷺ نے خود فرمایا اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ۔ چوتھا یہ کہ ہم ایمان میں فرق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں جیسے یہودی وعیسائی۔ **تیسرا اعتراض:** ملائکہ یعنی فرشتے بھی تو رسول ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ۔ (فاطر:۱) پھر فرشتوں کے بعد رُسُلًا ہی کا ذکر کیوں کیا؟ **جواب:** فرشتے لغوی معنی سے رسول ہیں یعنی محض قاصد وسفیر صرف پیغام پہنچانے والے وہ بھی حضرات انبیاء پر نہ کہ عام لوگوں پر اور حضرات انبیاء اصطلاحاً رسول ہیں یعنی پیغام الٰہی پہنچانے والے' سمجھانے والے' لوگوں سے عمل کرانے والے وہ بھی تمام لوگوں سے اس لئے انسان ان انسانی رسولوں کی امت ہوتے ہیں۔ فرشتوں کی امت نہیں ہوتے۔ کلمہ میں محمد رسول اللہ ہے۔ جبریل رسول اللہ نہیں۔ ہم پر حضور انور ﷺ کی اطاعت لازم ہے نہ کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی۔ قبر میں حضور ﷺ کی پہچان کرائی جاتی ہے۔ نہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی۔ رسول اصطلاحی کی تعریف یہ ہے کہ وہ انسان ہیں جنہیں اللہ نے تبلیغ احکام کے لئے بھیجا۔ پوسٹ مین اور ڈپٹی کمشنر میں بڑا فرق ہے۔

تفسیر صوفیانہ

ایمان کے معنی ہیں تصدیق کرنا' اور تصدیق کی تین صورتیں ہیں' دل سے' زبان سے اور عمل سے فقط زبان کی تصدیق بالکل بے کار جیسے منافقین کی تصدیق تھی اور صرف تصدیق بغیر عمل چنداں فائدہ مند نہیں۔ علمائے کرام فرماتے ہیں کہ تلاوت بے عمل ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ کے حکم نامہ کو روز پڑھ کر لیا کرے' مگر اس کے مطابق عمل نہ کرے' جیسے محض پڑھ لینے سے وہ شخص فرمانبردار نہیں ہو سکتا ایسے ہی محض تلاوت قرآن سے بغیر عمل جنت حاصل نہیں کر سکتا۔ رب نے فرمایا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ جنت عمل کی جزا ہے۔ تصدیق بالارکان کے بھی چند درجے ہیں۔ حضور سید عالم ﷺ کا ہر عمل قرآن پاک کی تصدیق تھا بلکہ یوں کہو کہ آپ کی زندگی پاک اس کی تفسیر ہے اور قرآن پاک پر عمل آپ کی عادت مبارک اس لئے اٰمَنَ کے بعد رسول کا ذکر علیحدہ ہوا' اور مومنین کا علیحدہ' کہ ان کا ہر فعل ایمان وتصدیق۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ استغفار ایمان کا نتیجہ اور بندگی کا اثر ہے۔ اسی لئے یہاں ایمان کے بعد غفران کا ذکر ہوا' بندہ کو چاہیے کہ اپنے کو ہر برائی کا اور رب کو ہر بھلائی کا اہل سمجھے لہٰذا خوبیوں کو رب کی طرف اور برائیوں کو اپنی طرف نسبت دے۔ اور یہ پڑھتا رہے اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ یہ ذکر دنیا وآخرت کے عذاب سے نجات دینے والا ہے۔ زاہد گناہ سے استغفار کرتا ہے اور عارف عبادت سے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے اوقات کو توبہ اور استغفار میں گھیرے رکھے۔ گناہ کے وقت استغفار' اطاعت کے وقت حمد' نعمت کے وقت شکر کرنا' مردوں کا کام ہے۔ اس توفیق کے چار اسباب ہیں۔ (۱) نور الٰہی' جو بلا واسطہ قلوب میں آئے (۲) علم وسیع جو عقل کامل کے ساتھ ہو (۳) اپنے معاملات میں غور وخوض (۴) شیخ کامل کی صحبت۔ شیخ ابو مدین فرماتے ہیں کہ پیر کامل

انور ﷺ کے اعمال طیبہ وطاہرہ کو بھی کہتے ہیں، اور رب تعالیٰ کی عادت کریمہ کو بھی، لوگوں کے اچھے برے اعمال کو بھی، یہ لفظ قرآن شریف میں ان سب معنی میں آیا ہے، (کبیر، خازن، روح المعانی و بیان وغیرہ) فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ، سیروا سیر سے بنا بمعنی چلنا اور دوڑنا، نئی عربی میں موٹر کو سیارہ کہتے ہیں، کہ وہ چلتی اور دوڑتی رہتی ہے، اَلْاَرْضِ سے مراد وہ زمین ہے جہاں گذشتہ قومیں آباد تھیں، چونکہ اہل عرب اپنے سفروں میں ان زمینوں پر گزرتے تھے، اس لئے خصوصیت سے انہیں یہ حکم دیا گیا، تفسیر کبیر وغیرہ نے فرمایا کہ یہاں سِیْرُوْا میں صرف قدموں سے چلنے کا ہی حکم نہیں، بلکہ وہاں چل کر جانا، جانے والوں سے ان کے حالات پوچھنا، حتی کہ صحیح تاریخ سے ان کے حالات معلوم کرنا سب مراد ہیں، ایک شاعر کہتا ہے، شعر

اِنَّ اٰثَارَنَا تَدُلُّ عَلَيْنَا فَانْظُرُوْا بَعْدَنَا اِلَى الْاٰثَارِ

یعنی ہمارے بعد ہمارے نشان وآثار تمہیں ہمارے حالات بتائیں گے، اگر تمہیں ہم کو دیکھنے کا شوق ہو، تو ہمارے نشانات دیکھ لیا کرنا فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ فاء تعقیبیہ ہے، اُنْظُرُوْا نظرٌ سے بنا بمعنی دیکھنا، غور کرنا، عبرت پکڑنا، یہاں تینوں معنی بن سکتے ہیں، کَیْفَ الخ اس کا مفعول ہے، عَاقِبَۃُ عقبٌ سے بنا بمعنی پیچھے، اس لئے ایڑی کو عقب کہتے ہیں، کیونکہ وہ قدم کے پیچھے ہوتی ہے، اگلی دنیا کو عاقبت کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کے بعد ہے، نتیجہ اور انجام کو عاقبت اس لئے کہتے ہیں کہ وہ کام کے بعد ہوتا ہے، یہاں بمعنی انجام ونتیجہ ہے، مُكَذِّبِیْنَ سے مراد نبیوں اور ان کے علماء کو جھوٹا کہنے والے کفار ہیں یعنی زمین میں اس لئے چلو پھرو اور سیر وکرو، تاکہ تم آنکھوں سے دیکھو، دل میں سوچو اور عبرت پکڑو، کہ ان کو جھٹلانے والے کفار کا جنھوں نے اپنے نبیوں کو جھوٹا کہا کیا انجام ہوا، ظاہر یہ ہے کہ یہ حکم مسلمانوں کو ہے، کیونکہ ابھی ان کا ہی ذکر ہو چکا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ کفار کو حکم ہو، اور ممکن ہے کہ سب ہی کو یہ حکم ہو هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ هذا سے اشارہ یا تو سارے قرآن شریف کی طرف ہے یا ابھی گذری ہوئی آیتوں کی طرف، بیان بینٌ سے بنا بمعنی علیحدگی وکشف، کسی چیز کی حقیقت واضح کر دینے کو بیان کہا جاتا ہے، بیان نطق سے عام ہے، کیونکہ نطق انسان کے بولنے کو کہتے ہیں، مگر بیان کسی خاص حالت پر دلالت کرنے اور خبر دینے کو بھی کہتے ہیں، خواہ نطق کے ذریعہ ہو یا لکھ کر یا اشارۃً وکنایۃً، پھر بیان ہدایت سے عام ہے، بیان ہر اظہار کو کہتے ہیں، خواہ کسی قسم کا ہو، مگر ہدایت کامیابی کا راستہ بتانے کو کہا جاتا ہے، حق یہ ہے کہ لِلنَّاسِ میں الف لام استغراقی ہے، یعنی یہ قرآن شریف یا یہ آیتیں بیان تو سارے ہی لوگوں کے لئے ہیں، مومن ہو یا کافر، مگر وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ہدایت کے معنی اور اقسام سورۂ فاتحہ کی تفسیر زیر آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ بیان ہو چکے، یہاں اتنا سمجھ لو، کہ وہ بیان جو کامیابی کا راستہ دکھائے ہدایت کہلاتا ہے، اور وہ بیان جو برے راستہ سے بچائے موعظت کہلاتا ہے، گویا بیان ایک جنس ہے جس کے نیچے دو نوعیں ہیں، ایک هدایت دوسرے موعظة، خیال رہے کہ موعظة وعظٌ سے بنا بمعنی پند ونصیحت وخیر خواہی، مُتَّقِیْنَ سے مراد یا سارے مسلمان ہیں یا وہ کفار بھی جن کے نصیب میں ایمان لکھا ہے، یعنی یہ قرآن ہدایت ونصیحت صرف پرہیزگاروں کے لئے ہے کہ قرآن سے یہ نعمتیں صرف پرہیزگاروں کو ملتی ہیں،

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری کا ذکر کیا کہ وہ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم نے رب کے احکام سنے بھی اطاعت بھی کریں گے۔ اب اس کی وجہ بیان ہو رہی ہے کہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم کیوں نہ اس کی اطاعت کریں۔ وہ ہمیں طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ جب اس کا یہ فضل ہے تو ہم پر اطاعت لازم۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کی اطاعت کا ذکر تھا۔ اب رب کے اس فضل کا ذکر ہے جو ان پر دنیا میں ہے۔ یعنی جب مسلمان ہماری اطاعت میں ایسے سرگرم ہیں تو ہم بھی ان پر فضل میں کمی کیوں کریں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کی زبانی اطاعت کا ذکر تھا۔ اب ان کی دلی نیک گمانی کا تذکرہ ہے۔ یعنی وہ زبان سے یوں کہتے ہیں اور دل میں رب کے متعلق یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ طاقت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا۔

شان نزول

جب یہ آیت وَاِنْ تُبْدُوْا الخ نازل ہوئی تو صحابہ کرام کی ایک جماعت نے بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا حبیب اللہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ظاہری احکام پر ہم نے عمل کیا مگر دل کے خطرات قابو سے باہر ہیں۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ جس نے اس آیت کی تفسیر کر دی۔ (تفسیر روح البیان و در منثور و خازن)

تفسیر

لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ یہ عبارت یا نیا جملہ ہے اور رب کا فرمان یا اس کا تعلق سَمِعْنَا سے ہے اور قَالُوْا کا مفعول ہے۔ اس صورت میں یہ بھی مسلمانوں کا کلام ہے جو رب نے نقل فرمایا۔ خواہ اس قول سے زبانی قول مراد ہو یا قلبی عقیدہ (کبیر و خازن و روح المعانی وغیرہ) **یُکَلِّفُ**، تکلیف سے بنا۔ جس کا مادہ کلف بمعنی مشقت ہے۔ اس سے کلف بھی ہے۔ یہاں کلف سے یا تو مجبوری مراد ہے اور نفسًا سے دنیا کی ہر چیز مراد۔ یا تکلیف سے وہ احکام مراد ہیں جو طاقت انسانی سے باہر ہوں اور نفسًا سے سارے مکلفین مقصود خواہ مسلمان ہوں یا دوسری امتیں یا تکلیف سے بھاری احکام مراد ہیں۔ اور نفسًا سے صرف مسلمان مقصود۔ خیال رہے کہ کلفت و مشقت والی چیز کسی کے ذمہ لازم کرنے کو تکلیف کہتے ہیں۔ اس کی یہ تین صورتیں ہیں، غرضکہ ہماری اصطلاح میں تکلیف، دکھ، درد، مشقت کو کہتے ہیں مگر شریعت میں کسی کے ذمہ کچھ احکام لازم کر دینے کو تکلیف کہا جاتا ہے۔ چھوٹے بچوں کو غیر مکلف کہتے ہیں اور عاقل و بالغ کو مکلف کہ بلوغ و عقل سے اس کے ذمہ کچھ احکام ہوں گے۔ بچپن میں کوئی حکم اس پر جاری نہ تھا۔ **وُسْعٌ** کے معنی ہیں گنجائش و فراخی۔ اسی لئے بڑے میدان کو وسیع کہا جاتا ہے۔ اس کا مقابل ضیق بھی ہے اور جہد بھی۔ (تنگی و مشقت) ضیق کے معنی ہیں۔ طاقت سے باہر ہونا اور جہد کے معنی ہیں مشکل ہونا اگرچہ طاقت کے اندر ہو۔ لہٰذا وسعت کے بھی دو معنے ہوئے۔ ممکن اور آسان یعنی وہ جو کیا جا سکے اور وہ جو بآسانی کیا جا سکے۔ وسعت کے یہ معانی کلفت کے لحاظ سے ہوں گے۔ یا تو نفسًا سے ہر جان مراد ہے انسان ہو یا غیر انسان یا ہر انسان مراد یا ہر مسلمان مراد۔ اس لئے اس آیت کی تین تفسیریں ہوں گی خیال رہے کہ وُسْعَهَا اندر محذوف کا مضاف الیہ ہے۔ مضاف کے پوشیدہ ہونے سے یہ منصوب رہ گیا۔ یعنی اللہ کسی چیز کو ناممکن کام پر مجبور نہیں کرتا۔ یا اللہ کسی مکلف کو وہ احکام نہیں دیتا جو اس

چھٹا فائدہ: قرآن شریف کا عام فیض تو لوگوں کے لئے ہے، یعنی ہر چیز کا بیان واضح، مگر خاص فیض خاص لوگوں کے لئے یعنی ہدایت دینا اور راہِ راست پر لگا دینا، جیسا کہ هٰذَا بَيَانٌ الخ سے معلوم ہوا، **ساتواں فائدہ:** قرآن کریم کا بیان یا ہدایت ہونا ہم لوگوں کے لئے ہے نہ کہ حضور انور ﷺ کے لئے، حضور انور ﷺ کو پہلے ہی سب کچھ سکھا پڑھا اور سمجھا دیا تھا، اور آپ پہلے ہی سے ہدایت پر تھے، جیسا کہ لِلنَّاسِ اور لِلْمُتَّقِيْنَ سے معلوم ہوا، **پہلا اعتراض:** سِيْرُوْا صیغۂ امر ہے، اور امر وجوب کے لئے آتا ہے، تو چاہیے کہ نماز و روزہ کی طرح کفار کی اجڑی بستیوں پر سفر کر کے جانا بھی ہر شخص پر فرض ہو، حالانکہ اسے کوئی فرض نہیں مانتا، **جواب:** امر صرف وجوب کے لئے نہیں آتا، بلکہ استحباب و اباحت کے لئے بھی ہوتا ہے، یہاں استحباب کے لئے ہے، اور اگر وجوب کے لئے بھی ہو، تو یہ وجوب ان لوگوں کے لئے ہوگا، جنہیں بغیر یہ نظارے کئے ہوئے خوفِ خدا میسر نہ ہوسکے، **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ عذاب کی زمینوں میں سفر کر کے جانا جائز، بلکہ بہتر ہے، مگر حدیث شریف میں آتا ہے کہ سوائے تین مساجد کے اور کسی کی طرف سفر نہ کرو، وہ حدیث اس آیت کے خلاف ہے، **جواب:** حدیث شریف میں ان تین مسجدوں کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف سفر کرنے کی ممانعت ہے، وہ بھی اس وقت جبکہ دوسرے شہر کی مسجدوں میں نماز کا زیادہ ثواب ملنے کا عقیدہ ہو، مثلاً کوئی سمجھے کہ دہلی کی جامع مسجد میں لاہور کی مسجد سے نماز کا زیادہ ثواب ملتا ہے پھر لاہور سے سفر کر کے وہاں نماز پڑھنے جائے، یہ سفر منع ہے، کہ بدعقیدگی پر مبنی ہے، ورنہ خود نبی کریم ﷺ نے جہاد، تجارتوں وغیرہ کے لئے بہت سفر کئے ہیں، قرآن شریف سے بہت سفر ثابت ہیں، سفر کے اقسام و احکام ہماری کتاب ''جاء الحق'' حصہ اول میں دیکھئے، **تیسرا اعتراض:** قرآن کریم نے یہ تو فرمایا کہ زمین میں چلو پھرو اور وہاں کے واقعات سے عبرت پکڑو، مگر جغرافیائی حیثیت سے نہ زمین کا پتہ بتایا، نہ وہاں کے باشندوں کا، مضمون ناقص رہا، یہ فرمانا چاہیے تھا کہ فلاں قوم فلاں جگہ آباد تھی جو تباہ کر دی گئی، **جواب:** یہ بتانے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ عرب میں یہ واقعات اور ہلاک شدہ قوموں کے مقامات مشہور تھے، سب کو معلوم تھے، ان میں کا ہر شخص جانتا تھا، کہ یہ جگہ فلاں قوم کی ہے، اور اس جگہ فلاں قبیلہ آباد تھا، اور نسب و نسبت، شہرت سے بھی معتبر ہے، دیکھو ہم کہتے ہیں فلاں شخص فلاں کا بیٹا ہے، محض شہرت سے، ورنہ ہم نے اس کے والدین کا نکاح نہ دیکھا، فلاں جگہ حضور انور ﷺ کا بال شریف ہے کیوں؟ فقط شہرت سے، ہم نے اس بال شریف کی اسناد نہ پڑھی، آج فلاں تاریخ فلاں دن، فلاں مہینہ ہے، کیوں؟ فقط شہرت سے، ہم نے نہ اس دن و تاریخ اور مہینہ کی پیدائش دیکھی، نہ اس کا تقرر، اس کی پوری بحث ہماری کتاب ''جاء الحق'' حصہ اول میں ملاحظہ فرمائیے، **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم صرف لوگوں کے لئے بیان ہے، حالانکہ یہ تو جنات اور فرشتوں کے لئے بھی بیان ہونا چاہیے کہ جب حضور انور ﷺ ساری مخلوق کے نبی ہیں، تو قرآن بھی ساری مخلوق کی کتاب ہے، **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ اصل مقصود انسان ہیں، دوسری مخلوق ان کے تابع ہے، جب یہ انسانوں کے لئے بیان ہوا، تو دیگر مخلوقات کے لئے بھی ہوگیا، نیز قرآن کریم کے سارے احکام صرف انسانوں پر جاری ہیں، دیگر مخلوق پر نہیں، روزہ و زکوٰۃ فرشتوں پر نہیں، حج مع ان شرائط کے جنات پر فرض نہیں، دوسرا جواب یہ ہے کہ هٰذا سے مراد وہ عذاب

نسیان وخطا میں ارادۃً گناہ بھی داخل ہیں یعنی مسلمان یہ بھی کہتے ہیں۔ یا اے مسلمانو تم یہ بھی دعا مانگو کہ اے مولیٰ اگر ہم کوئی نیکی بھول جائیں یا غلطی سے گناہ کر بیٹھیں تو ہماری پکڑ نہ فرما' نہ تو دنیا میں پکڑ فرما کہ ہم اپنے گناہوں کی شامت سے آفات میں بتلا ہو جائیں' یا نیک اعمال سے محروم ہو جائیں۔ نہ مرتے وقت پکڑ کہ خاتمہ خراب ہو جائے۔ نہ قبر میں پکڑ کہ امتحان میں فیل ہو جائیں۔ نہ آخرت میں پکڑ فرما کہ ہم عذاب میں پھنس جائیں۔ لَا تُؤَاخِذْنَا ان سب کو شامل ہے۔ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا۔ یہ جملہ لَا تُؤَاخِذْنَا پر معطوف ہے اور واؤ عاطفہ ہے۔ اظہار عاجزی کے لئے رَبَّنَا کی تکرار کی گئی۔ لَا تَحْمِلْ کا مادہ حمل ہے۔ بمعنی لادنا اور کسی پر ڈالنا۔ اِصْرًا کے لغوی معنی ذمہ۔ بوجھ اور شدت ہیں۔ عہد کو بھی اسی لئے اِصر کہتے ہیں کہ وہ بھی بوجھ ہوتا ہے۔ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ۔ (آل عمران: ۸۱) قید کو بھی اسی معنی سے اصر کہہ دیتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا کہ ناقابل معافی گناہ اصر ہے۔ (روح المعانی) یعنی ہمارے مولیٰ ہم پر بوجھ نہ ڈال۔ كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا۔ یہ جملہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ جو لا تحمل کا مفعول مطلق ہے اور ہو سکتا ہے کہ اصر کی صفت ہو۔ قبل سے مراد پچھلی امتیں یہود و عیسائی ہیں ان پر تین قسم کے بوجھ تھے۔ احکام کے سزاؤں کے اور توبہ کے چنانچہ انہیں کبھی توبہ کے لئے خودکشی کرنی پڑتی تھی۔ ناپاک کپڑے اور گندی کھال کاٹنا پڑتی تھی۔ رات دن میں ان پر پچاس نمازیں فرض تھیں۔ مسجد کے سوا ان کی نماز کہیں نہ ہوتی تھی۔ ان پر چوتھائی مال زکوٰۃ واجب تھی۔ رات کے پوشیدہ گناہ صبح کو دروازہ پر لکھ دیئے جاتے تھے۔ (روح البیان وکبیر وغیرہ) رب تعالیٰ نے حضور ﷺ کی طفیل یہ تمام مصیبتیں دور فرما دیں۔ ارشاد فرماتا ہے۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (اعراف: ۱۵۷) یعنی اے مولیٰ ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا ہم سے اگلی امتوں یہود و نصاریٰ پر ڈالا تھا۔

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ کام کی تکلیف نہیں دیتا۔ اس لئے کسی کو ناممکن چیزوں کا مکلف نہ کیا کیونکہ وہ طاقت سے باہر ہیں۔ خصوصاً مسلمانوں کو بھاری احکام بھی نہ دیئے۔ نماز' زکوٰۃ' روزہ وغیرہ میں ان کے لئے بے شمار سہولتیں کیں۔ ہر شخص کی نیکیاں اس کے لئے ہیں اور ہر شخص اپنے گناہوں کا ذمہ دار ہے۔ نہ کوئی کسی کی نیکی چھین کر اسے محروم کر سکے اور نہ کسی کے گناہ کا وبال دوسرے پر اس طرح پڑے کہ گنہگار صاف بچ جائے یا ہر شخص کو نیکی معمولی سی بھی مفید ہے اگرچہ اتفاقاً ہی ہو جائے مگر گناہ وہ ہی مضر ہے جو اہتمام سے ہو۔ کبیرہ ہو۔ جس پر اصرار و ضد کی جائے یا نیکی تو وہ بھی مفید ہے جو دوسرے کے لئے دوسرے کی طرف سے کرے مگر گناہ وہ ہی مضر ہو گا جو اپنے لئے کرے کیونکہ گناہ دوسرے کے لئے ہوتا ہی نہیں۔ اے مسلمانو تم ہم سے دعا یوں مانگا کرو کہ اے مولیٰ اگر ہم سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو ہماری پکڑ نہ فرما یا اور ہمیں عذاب نہ دے۔ اگر ہم نیکی کو بدی سمجھ کر چھوڑ بیٹھیں یا بدی کو بھلائی سمجھ کر کر بیٹھیں تو ہم پر ناراض نہ ہو اور اے مولیٰ ہم پر سخت احکام سزاؤں اور توبہ وغیرہ کے ایسے بوجھ نہ ڈال۔ جیسے ہم سے پچھلی امتوں پر ڈالے تھے۔ ہم گنہگار اور کمزور ہیں تو قوی اور قادر و ستار ہے۔

قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ

تو بے شک پہنچی تھی اس قوم کو تکلیف اسی طرح کی اور یہ

تو بے شک وہ لوگ بھی ویسی ہی تکلیف پا چکے ہیں اور یہ دن ہیں

الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ ۚ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ

زمانہ ہے کہ گھماتے ہیں ہم اس کو درمیان لوگوں کے اور تاکہ جان لے اللہ

جنہیں ہم نے لوگوں کے لئے باریاں رکھی ہیں اور اس لئے کہ اللہ پہچان کرا دے

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ

ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور بنائے تم میں سے شہید اور اللہ

ایمان والوں کی اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہادت کا مرتبہ دے اور اللہ

لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَلِیُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ

نہیں پسند کرتا ظالموں کو اور تاکہ صاف کردے اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے

دوست نہیں رکھتا ظالموں کو اور اس لئے کہ اللہ مسلمانوں کو نکھار دے

اٰمَنُوْا وَیَمْحَقَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۴۱﴾

اور مٹادے کافروں کو

اور کافروں کو مٹادے

تعلقات

اس آیت کا گذشتہ آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ گذشتہ زمانہ میں کفار ہلاک کئے گئے، اور مومن غالب رکھے گئے، اب نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کو سمجھایا جارہا ہے، کہ تم احد کی تکلیف پر پریشان نہ ہو، یہ ایک عارضی چیز تھی جو گذر گئی، آخرکار فتح اور غلبہ تمہارے ہی لئے ہے، گویا پچھلی آیت میں مثال تھی اور اس آیت میں اس کے نتیجہ کا بیان ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ قرآن کریم پرہیزگاروں کے لئے ہدایت و نصیحت ہے، اب فرمایا جارہا ہے کہ پرہیزگار وہ ہے جو دنیا کے ہر نرم و گرم برداشت کرنے کا عادی ہو، کہ اس کے بغیر تقویٰ پر استقامت ناممکن ہے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں گذشتہ کافروں کے انجام میں غور کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اب اس آیت میں موجودہ کافروں کا انجام دیکھنے کے لئے مسلمانوں کو تیار کیا گیا،

شانِ نزول

ان آیات کے شانِ نزول میں چند روائتیں ہیں، (۱) ایک یہ کہ جنگ احد کے بعد مسلمانوں کو پتہ لگا کہ ابوسفیان مع اپنے لشکر کے پھر مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لئے آرہے ہیں، وہ میدانِ احد میں اپنے ظاہری غلبہ سے دھوکا کھا گئے ہیں، اور اب مدینہ کو برباد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، حضور انور ﷺ نے حکم دیا کہ صرف وہی حضرات جو غزوۂ احد میں شریک تھے فوراً روانہ ہو جائیں اور ابوسفیان کے مقابلہ میں پہنچیں اور پتہ کریں کہ ان کی فوج کہاں ہے، اس حکم پر ان مسلمانوں کو بہت تکلیف کا احساس ہوا، ان کی تسلی کے لئے یہ آیات کریمہ اتریں، (۲) غزوۂ احد میں عین جنگ کی حالت میں جبکہ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ چکے تھے، اور ان میں افراتفری پھیل گئی تھی، کہ خالد ابن ولید نے مشرکین کی ایک جماعت لے کر احد کے ایک ٹیلہ پر چڑھنے اور وہاں سے مسلمانوں پر بھرپور حملہ کرنے کی کوشش کی، نبی کریم ﷺ ملاحظہ فرما رہے تھے، آپ نے یہ سخت خطرہ محسوس فرما کر دعا کی، خدایا تو ہی ہماری طاقت وقوت ہے، اس وقت سوا ان مسلمانوں کے تیری عبادت کرنے والا دنیا میں کوئی نہیں، تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، اور اس دعا شریف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پریشاں حال مسلمانوں میں سے ہی ایک جماعت خالد ابن ولید سے پہلے احد پر چڑھ گئی، اور انہوں نے حضرت خالد کی اس فوج پر حملہ کر دیا، جس سے مشرکین کی یہ جماعت بھاگ نکلی، اور مسلمانوں پر حملہ نہ کر سکی، اگر خدانخواستہ یہ حملہ ہو جاتا، تو مسلمانوں کو بے اندازہ تکلیف پہنچ جاتی (تفسیر کبیر، روح المعانی، تفسیر خازن وغیرہ) (۳) جنگِ احد ختم ہونے کے بعد ابوسفیان نے تین آوازیں دیں، کیا قوم میں محمد (ﷺ) ہیں؟ کیا قوم میں ابوبکر ہیں؟ کیا قوم میں عمر ابن خطاب ہیں؟ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ادھر حضور انور ﷺ نے ان سے فرما دیا کہ خاموش رہو، جب ادھر سے کوئی جواب نہ گیا تو ابوسفیان بولے یہ تینوں قتل کر دیئے گئے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نہ رہا گیا، چیخ پڑے، کہ اے عدو اللہ! اللہ کی قسم یہ تینوں زندہ ہیں، اور تیرے سینہ میں کھٹکتے رہیں گے، تب ابوسفیان فخریہ یہ گانے لگے، اُعْلُ هُبَلُ اُعْلُ هُبَلُ یعنی اے ہبل اونچا ہو جا اونچا ہو جا، حضور انور ﷺ نے فرمایا جواب دو اَللّٰهُ اَعْلٰى وَاَجَلُّ یعنی ہبل بے چارہ کیا اونچا ہوگا، اونچا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، ابوسفیان بولے اِنَّ لَنَا عُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ یعنی ہمارے پاس تو عزیٰ بت ہے تمہارے پاس کچھ بھی نہیں، حضور انور ﷺ نے فرمایا جواب دو اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ ہمارا والی اور وارث اللہ تعالیٰ ہے تمہارا کوئی والی وارث نہیں، تب ابوسفیان بولے، کہ بدر کا بدلہ ہو گیا، ہم تم برابر ہو گئے، عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے ہرگز نہیں، ہمارے مقتول جنتی، تمہارے مقتول جہنمی، پھر برابری کیسی؟ تب دریائے رحمت الٰہی جوش میں آ گیا، اور یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، جس میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تائید فرمائی گئی اور مسلمانوں سے اس تکلیف کے عوض آئندہ فتح ونصرت کا وعدہ کیا گیا (تفسیر صاوی وکبیر)

تفسیر

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا لَا تَهِنُوْا وهنٌ سے بنا بمعنی ضعف وکمزوری، زکریا علیہ السلام نے دعا کی تھی رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ (مریم: ۴) خدایا میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں، دراصل لَا تُوْهِنُوْا تھا واؤ گر گیا یَعِدُ کے قاعدے سے، لَا تَحْزَنُوْا

کتاب جاء الحق اول میں دیکھو۔ان میں سے چند یہاں عرض کئے جاتے ہیں۔ایک یہ کہ بخشنے سے محض ثواب پہنچتا ہے نہ کہ اصل فعل۔وہ تو کرنے والے ہی کیلئے رہتا ہے اس آیت کا یہ ہی مطلب ہے کہ نفس کا کمایا ہوا فعل اسی کے لئے رہے گا۔دوسرا یہ کہ یہ آیت بدنی عبادتوں کے لئے ہے نہ کہ مالی۔اسی لئے کَسَبَتْ فرمایا گیا۔یعنی کوئی شخص کسی کی طرف سے نماز' روزہ ادا نہیں کر سکتا۔یہ تو خود ہی کرنا پڑیں گے۔خیال رہے کہ عبادات تین قسم کی ہوتی ہیں۔عبادات بدنی' جیسے نماز روزہ' عبادات مالی جیسے زکوٰۃ' بدنی و مالی کا مجموعہ جیسے حج' بدنی عبادات میں نیابت نہیں ہو سکتی۔مالی میں بہر حال ہو سکتی ہے۔بدنی اور مالی کے مجموعہ میں بحالت مجبوری نیابت جائز اور بلا وجہ ناجائز' میری طرف سے نماز کوئی نہیں پڑھ سکتا۔اپنی زکوٰۃ میں مجھے اختیار ہے کہ خود دوں یا کسی سے دلوا دوں۔مگر حج بحالت مجبوری دوسرے سے کرایا جا سکتا ہے نہ کہ بلا ضرورت اسی لئے حج بدل بڈھے یا میت کی طرف سے جائز ہے۔چوتھا یہ کہ لَهَا میں لام ملکیت کا ہے یعنی ہر شخص اپنی ہی نیکیوں کا مالک ہے نہ کہ دوسرے کی کیا خبر دوسرا بخشے یا نہ بخشے اولاد کے بھروسہ پر خود نیکی سے غافل نہ رہو۔

بعد مرنے کے تمہیں اپنا پرایا بھول جائے　　فاتحہ کو قبر پر پھر کوئی آئے یا نہ آئے

پانچواں یہ کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نیکی کرنے والا کبھی نیکی سے محروم نہیں ہو سکتا۔اسے ضرور ملے گی۔چنانچہ ثواب بخشنے سے بخشنے والا ثواب سے محروم نہیں ہو جاتا۔بلکہ اس نے جتنوں کو ثواب بخشا۔اسے ان سب کے برابر ثواب ملتا ہے۔دیکھو (در مختار) چھٹا یہ کہ یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے۔وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَان (طور:۲۱) یہ ہی عبداللہ ابن عباس کا قول ہے۔دیکھو جمل وخازن زیر آیت لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم:۳۹) اگر کسی کی نیکی دوسرے کے کام بالکل نہ آتی' تو مسلمانوں کے نابالغ بچے جنت میں کیوں جاتے اور انبیاء کرام کی نابالغ اولاد ان کے ساتھ جنت الفردوس میں کیوں رہتی۔بتاؤ حضرت ابراہیم ابن رسول اللہ کہاں ہوں گے۔یقیناً جنت میں۔حضور علیہ السلام کے ساتھ ہوں گے۔انہیں یہ درجہ کیوں ملا؟ حضور علیہ السلام کی برکت سے غرضکہ اس آیت میں ہبہ کی نفی نہیں۔ایصال ثواب کا ثبوت صدہا حدیث سے ہے۔بچوں کے حج سے ماں باپ کو ثواب ہے۔روزہ افطار کرانے والے کو روزہ کا ثواب۔**چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ نیکی صرف نیکی کرنے والے کے لئے ہے اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کے دن ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دلوا دی جائیں گی۔اس آیت اور حدیث میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** روح البیان نے اس جگہ فرمایا کہ دنیا میں خدائے پاک اعمال کی زیادتیاں فرماتا ہے۔کسی نیکی کا ثواب پچیس گنا اور کسی کا پانچسو گنا کسی کا سات سو گنا کسی کا لاکھ گنا۔قیامت کے دن مظلوم کو ان زیادتیوں میں سے دیا جائے گا نہ کہ اصلی نیکی۔یہ زیادتیاں اسی لئے کی گئی تھیں۔حکومت دیوالیہ کے لئے کچھ ضرور چھوڑ دیتی ہے مگر روزہ کی نہ زیادتی کسی کو ملے نہ اصل۔اسی لئے فرمایا گیا۔اَلصَّوْمُ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ۔روزہ تو میرا ہے اور میں اس کی ضرور جزا دوں گا۔غرضکہ آیت وحدیث میں کوئی مخالفت نہیں۔**پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ نیکی کرنے والے کو اس کی نیکی ضرور ملتی ہے مگر دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے کہ نبی کی آواز پر اپنی آواز اونچی مت کرو۔ورنہ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۔(حجرات:۲) **جواب:** ہم نے فوائد میں عرض کر دیا کہ یہاں کَسَبَ سے عمل معتبر مراد ہے ضبط شدہ نیکی کسب میں داخل نہیں۔جیسا کہ اسی گناہ کا عذاب ہوگا جو بخشا نہ جائے تو ایسا ہی اس

نہیں، بلکہ تشبیہ ہے، ورنہ احد میں مسلمانوں کو زیادہ تکلیف پہنچی تھی، یعنی اے غازیانِ احد! اگر تمہیں احد میں تکلیف پہنچ گئی تو غم نہ کرو، کیونکہ ان کفار کو بھی بدر میں یا خود احد میں اول وقت اسی طرح تکلیف پہنچی (کبیر و معانی) وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ تلک مبتدا ہے اور ایام خبر، نُدَاوِلُ ایام کی صفت یا تِلْكَ الْاَيَّامُ مبتداء ہے اور نُدَاوِلُ خبر، تِلْكَ سے مراد یا تو تکالیف کے دن ہیں یا راحت کے، ایام یوم کی جمع ہے یوم دن کو بھی کہتے ہیں، وقت کو بھی اور وقت میں ہونے والے واقعات کو بھی، خواہ واقعات رحمت کے ہوں یا عذاب کے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ (ابراہیم: ۵) یعنی انہیں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور رحمت کے واقعات یاد دلاؤ، نُدَاوِلُ دولٌ سے بنا بمعنی پھیرنا، گھمانا، منتقل کرنا، اسی لئے گردش یا باری و نوبت کو دَوْلَةٌ یا دُوْلَةٌ کہتے ہیں، مال کو دولت اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ گھومتا رہتا ہے رہٹ کو دولاب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ گھومتا رہتا ہے، اور پانی گھماتا رہتا ہے، یہ دول اور آب سے بنا، ناس سے مراد سارے ہی انسان ہیں، مومن ہوں یا کافر، یعنی یہی فتح و ظفر یا شکست اور تکلیف کے زمانے یا ان کے واقعات ہم لوگوں میں گھماتے اور چکر دیتے رہتے ہیں، وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، واؤ عاطفہ ہے، اور یہ جملہ ایک پوشیدہ عبارت پر معطوف ہو کر نداول کی علت ہے اور لِيَعْلَمَ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے، الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اس کا مفعول، اٰمَنُوْا سے مراد مخلص مومن ہیں منافقوں کے مقابل، یا یہ جملہ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ کی علت ہے، یعنی فتح و ظفر کا قوموں میں ادلتے بدلتے رہنا یا احد میں مسلمانوں کو تکلیف اور ظاہری شکست پہنچ جانا بہت سی حکمتوں سے ہے، اور اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ ظاہر ظہور مخلص مسلمانوں کو منافقوں سے چھانٹ کر جان لے کہ منافق ان تکالیف پر چیخ اٹھیں یا گھبرا جائیں، مگر مخلص مومن اللہ پر صابر شاکر رہیں، یا اللہ کے دوست صحابہ کرام مخلص مومنوں کو ان علامات سے پہچان لیں، صحابہ کا جاننا پہچاننا گویا رب تعالیٰ ہی کا جاننا ہے (کبیر) وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ یہ جملہ لِيَعْلَمَ الخ پر معطوف ہے، اور نُدَاوِلُ کی دوسری حکمت کا بیان، يَتَّخِذُ اتِّخَاذٌ سے بنا بمعنی بنانا، جیسے بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ (بقرہ: ۵۴) مِنْكُمْ کا مِنْ ابتدائیہ یا تبعیضیہ ہے، شُهَدَاء شہید کی جمع ہے، جس کے لغوی معنی ہیں حاضر، گواہ اور اصطلاحی معنی ہیں، وہ مسلمان جو ظلماً مارا جائے، یہ جمع ایسی ہے جیسے کریم کی جمع كُرَمَاء اور رحیم کی جمع رُحَمَاء ظریف کی ظرفاء یعنی غزوۂ احد کی تکالیف میں یا ان واقعات فتح و شکست کے ادلتے بدلتے رہنے میں دوسری حکمت یہ ہے کہ ان کے ذریعہ مسلمانوں کو درجہ شہادت ملتا ہے، جو اسلام میں بہت اعلیٰ ہے، بعض صحابہ کو غزوۂ بدر میں شرکت نہ کر سکنے پر افسوس ہوا تھا، اور ان کے دلوں میں شوقِ شہادت تھا، اس غزوۂ احد میں وہ حضرات اپنی مراد کو پہنچ گئے وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ، ظالمین سے مراد یا تو منافقین ہیں جو احد کی جنگ سے عین موقعہ پر لوٹ گئے یا کفار، یعنی ان کفار احد کے ظاہری غلبہ یا منافقوں کے ان تکالیف سے بچ جانے کی وجہ یہ نہیں، کہ ہم کفار یا منافقین سے محبت کرتے ہیں، یہ تو ہمارے ہاں بڑے مردود ہیں، ان کی وجہیں وہ ہیں جو بیان ہوئیں، ان کفار کو حقیقی فتح نہ ملی ہے نہ ملے گی، حقیقی فتح تو تمہاری ہوگی، وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ جملہ وَيَتَّخِذَ پر معطوف ہے، اور واقعۂ احد کی تیسری حکمت کا بیان، لِيُمَحِّصَ تمحیصٌ سے بنا جس کا مادہ محصٌ ہے، جس کے لغوی معنی ہیں خالص کرنا، نکھارنا، صاف کرنا، کسی چیز کا ہر عیب سے پاک کر دینا، یہاں جماعت صحابہ کو منافقین سے پاک و صاف کر دینا، مخلص و منافق سے پہچان کرا دینا مراد ہے، یعنی واقعہ احد میں ایک حکمت یہ بھی ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ مخلصین کو نکھار دیا، منافقوں سے پاک و

ہوئے آؤ کہ اے مولیٰ کریم اگر کبھی ہم راستہ بھول جائیں یا شامت نفس سے کبھی اس راستہ سے بہک کر شیطانی گلی کوچوں میں چلے جائیں تو ہماری پکڑ نہ کر اور یہ بھی دعا مانگو کے مولیٰ اس راستے میں ہمیں ہلکا پھلکا رکھ۔ مسافر جتنا ہلکا' اتنا ہی اسے آرام۔ جتنا بھاری اتنی ہی مصیبت۔ اے اللہ تیری رحمت ہمارے گناہوں کے بوجھوں کو اٹھائے' ہمارا بوجھ ہم پر نہ ڈال ورنہ ہم کمزور تجھ تک کیسے پہنچیں گے۔ مولیٰ کریم کرم فرما۔ اس راستہ پر چلانا بھی تیرا ہی کرم ہے اور منزل مقصود تک پہنچانا بھی تیرے فضل پر موقوف۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ دنیا' ایک میلہ گاہ یا نمائش گاہ ہے جہاں مختلف قسم کے بازار' تاجر' دوکانیں ہیں۔ ہم لوگ ناسمجھ بچوں کی طرح ہیں جو یہ میلہ دیکھنے آئے۔ حضرات انبیاء کرام' مشائخ عظام ہمارے والی وارث ہیں جن کے دامن تھامنے کی برکت سے ہم انشاء اللہ بہک نہیں سکتے۔ اگر یہ دامن چھوٹ جائے تو ہم بھٹک کر نہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچ جائیں۔ ہم کو چاہیے کہ یہ میلہ ضرور دیکھیں۔ یہاں سے سودے ضرور خریدیں مگر ان مقبولوں کا دامن پکڑے رہیں تا کہ میلہ دیکھ کر بخیریت اپنے گھر پہنچ جائیں۔ اس آیت میں رب تعالیٰ نے یہ دعا تعلیم فرمائی کہ مولیٰ اگر ہم بھول چوک کر ان کے دامن چھوڑ بیٹھیں تو معافی دے۔ وہ حضرات ہمیں نہ چھوڑ دیں۔ گم شدہ بچہ کو والی وارث ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ہمارے والی وارث ہمیں ڈھونڈھ لیں۔

دوسری تفسیر

اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی گنجائش سے زیادہ کمال حاصل کرنے کی تکلیف نہیں دیتا۔ ہر ایک کو بقدر استعداد تجلیات عطا فرماتا ہے۔ جتنا ظرف اتنی ہی عطا ہر نفس جو کچھ بھلائیاں و کمالات کمائے گا۔ وہ اس کے لئے نافع ہوں گی اور جو کچھ گناہ کرے گا کہ خالق کے سوا مخلوق پر توجہ کرے۔ وہ اسی کے لئے نقصان دہ ہوگا۔ اس کو چاہیے کہ یوں دعا مانگا کرے کہ اے اللہ اگر ہم ظلمت نفس میں پھنس کر تیرا عہد و پیمان بھول جائیں اور ایسے عمل سے خطا کر جائیں جو تیری بارگاہ کے لائق نہ ہو تو ہماری پکڑ نہ فرما۔ اور اے اللہ ہم پر صفات نفس اور افعال خبیثہ کا بوجھ نہ ڈال دے جیسا کہ ان لوگوں پر ڈالا گیا جو ظاہری حجاب میں پھنس کر باطنی صفات سے محروم ہو گئے۔ (روح المعانی)

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ
اے رب ہمارے اور نہ اٹھوا ہم سے وہ کہ نہیں ہے واسطے ہمارے طاقت ساتھ اسکے اور معاف کر ہم سے
اے رب ہمارے اور ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں سہار نہ ہو اور ہمیں معاف فرما دے
وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع
اور بخشش کر واسطے ہمارے اور رحم کر ہم پر تو والی ہے ہمارا پس مدد کر ہماری او پر قوم کافروں کے
اور بخش دے اور ہم پر مہر کر تو ہمارا مولیٰ ہے تو کافروں پر ہمیں مدد دے

پچھلے جملوں میں چند دعائیں ہیں۔ اس میں بھی ایک دعا ہی ہے گویا یہ جملہ گذشتہ کا تتمہ ہے۔ ان جملوں میں دشوار احکام سے

بچانے کی دعا کی گئی تھی جن کی اگر چہ طاقت تو ہو مگر بدشواری ادا ہوسکیں۔ اس میں ان چیزوں سے پناہ مانگی گئی ہے جو طاقت سے باہر ہوں۔

تفسیر

رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ۔ رَبَّنَا کی تکرار رب کا کرم حاصل کرنے کے لئے ہے۔ واؤ عاطفہ ہے اور جملہ وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا پر معطوف۔ حمل اور تحمیل قریباً ایک ہی ہیں۔ البتہ حمل کے بعد علیٰ آتا ہے۔ اور اس کے بعد نہیں آتا۔ بعض نے کہا کہ حمل کے معنی ہیں۔ لادنا تحمیل اٹھوانا اور لدوانا۔ اگر کسی کے سر پر بھاری بوجھ رکھ دیا جائے تو اسے حمل کہا جائے گا اور اگر اٹھانے کا بھی اسی کو مکلف کیا جائے کہ تو خود اٹھا کر اپنے سر پر رکھ یہ تحمیل ہے۔ لہٰذا حمل سے تحمیل سخت تر۔ بعض نے فرمایا کہ ثقیل چیز کا لادنا حمل اور نا قابل برداشت کا لادنا تحمیل نا سے سزائیں مراد ہیں یا ناممکن احکام یا وہ اعمال جو جہنم کا ذریعہ ہوں۔ طَاقَةَ طوق سے بنا۔ بمعنی قوت یہ اطاعت کا ہم معنی ہے۔ جیسے جابت و اجابت یہاں حاصل مصدر ہے لَنَا طَاقَةَ کا متعلق ہے۔ بِہٖ کا مرجع مَا ہے۔ تفسیر خازن نے فرمایا کہ یہاں مَا سے مراد نفس کے وسوسے یا محبت کا جوش ہے۔ تو تحمیل سے مراد پکڑ ہے۔ یا مَا سے مراد دشمنوں کے طعنے دوستوں کی جدائی یا صورتوں کا مسخ ہونا ہے۔ یعنی اے مولیٰ ہم پر ان احکام یا ان سزاؤں یا ان تکالیف کا بوجھ مت ڈال۔ جن کے اٹھانے کی ہمیں طاقت نہیں۔ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اُعْفُ عفو سے بنا، بمعنی مٹانا، معافی کو اسی لئے عفو کہتے ہیں کہ اس سے جرم مٹ جاتا ہے۔ اغفر غفر سے بنا بمعنی چھپانا۔ اسی لئے چھلکا کو غفر کہتے ہیں کہ وہ مغز کو چھپائے ہوتا ہے۔ اصطلاح میں بخشنے کو بھی مغفرت کہا جاتا ہے اور عیب چھپانے کو بھی۔ اِرْحَمْنَا رحم سے بنا بمعنی رقت قلب، رب تعالیٰ کے لئے جب اس کا استعمال ہو تو بمعنی رحمت اور مہربانی ہوتا ہے کیونکہ وہ قلب سے پاک ہے۔ یعنی ہمارے گناہوں کو مٹادے ہمارے عیبوں کو چھپالے اور ہم پر رحمت فرما کہ تھوڑی اور کھوٹی نیکیاں قبول فرمالے۔ اَنْتَ مَوْلٰنَا۔ مَوْلٰی ولیٌّ کا مصدر میمی ہے۔ بمعنی اسم فاعل۔ اس کے معنی ہیں مددگار، مالک سید اور متولی۔ یہاں سب معنی بن سکتے ہیں یعنی ہم تجھ سے یہ دعائیں اس لئے کرتے ہیں کہ تو ہمارا مالک ہے آقا ہے والی ہے۔ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ ف یا جزائیہ ہے اور یہ جملہ شرط محذوف کی جزا یا ترتب کی ہے اور یہ جملہ اَنْتَ مَوْلٰنَا پر مرتب۔ نصر بمعنی مدد ہے۔ جب بغیر علیٰ آئے تو موافق مدد مراد ہوتی ہے۔ اور اگر علیٰ آئے تو مخالف۔ یہاں دوسرے معنی میں ہے۔ قوم بمعنی جماعت ہے جس کی تحقیق پہلے کی جا چکی اور کافرین سے سارے دینی دشمن مراد ہیں۔ خواہ انسان ہوں یا شیاطین وغیرہ یعنی چونکہ تو ہمارا والی ہے۔ ہم تیرے بندے ہیں اور بندوں کی مدد کرنا والی کا کام ہے۔ لہٰذا تو ہماری کفار قوم کے مقابلہ میں مدد کر اور ان پر ہمیں غلبہ دے۔

خلاصہ تفسیر

اے ہمارے مولیٰ ہم پر ان احکام اور عذابوں اور ناممکن باتوں کا بوجھ مت ڈال جن کے برداشت کی ہم میں طاقت نہیں اور ہمارے گناہ اور آثار گناہ کو مٹادے۔ ہمارے عیبوں کو چھپالے اور ہمیں رسوا مت کر۔ اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہمارا والی اور مددگار ہے۔ لہٰذا کافر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔ خیال رہے کہ عفو اور مغفرت اور رحمت میں چند طرح فرق ہے۔ ایک یہ کہ گناہ

لے لیا، **دسواں فائدہ:** رب تعالیٰ کے ہاں شہید کا بڑا درجہ ہے، جیسا کہ شُھَدَآء سے معلوم ہوا، اسے شہید اس لئے کہتے ہیں، کہ یہ جان نکلتے ہی جنت بلکہ بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو جاتا ہے، (شہید بمعنی حاضر) یا اس لئے کہ دوسرے تو اپنی زبان ارکانِ جنان سے توحید و رسالت کی گواہی دیتے ہیں، مگر شہید اپنے خون کے قطروں سے یہ گواہیاں دیتا ہے، دیکھو سب کا خون ناپاک، شہید کا خون پاک، اسی لئے رب تعالیٰ نے شہید کو تیسرے درجے پر رکھا، کہ فرمایا مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ (النساء:۶۹) **گیارھواں فائدہ:** جہاد میں مومن کا قتل اس کے گناہوں سے نکھر جانے کا ذریعہ ہے، جیسا کہ لِیُمَحِّصَ سے معلوم ہوا حتی کہ امام شافعی کے ہاں شہید پر نماز بھی نہیں پڑھی جاتی کہ اس کے سارے گناہ تلوار سے معاف ہو چکے، اب نماز کی ضرورت ہی کیا رہی، اور اسے غسل و کفن تو ہمارے ہاں بھی نہیں، سبحان اللہ شہید ایسا نکھرا، کہ اس کے کپڑے و بدن بھی نکھر گئے، دل، نفس اور روح کے نکھار کا تو کیا پوچھنا؟ **بارھواں فائدہ:** کافر کا قتل اس کے مٹانے کا ذریعہ ہے جیسا کہ وَ یَمْحَقَ الخ سے معلوم ہوا، کیا لطف ہے کہ قتل ایک ہے مگر نتیجے اس کے دو، کہ اس سے مومن بڑھتے اور نکھرتے ہیں، مگر کافر گھٹتے اور بگڑتے ہیں، مومن راہِ خدا میں مر کر دین و قوم کو زندہ کر جاتا ہے،

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کا ایمان مشکوک تھا جسے رب تعالیٰ نے اِنْ کے ساتھ بیان فرمایا کہ فرمایا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ، اِنْ شک کے لئے آتا ہے، **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک الزامی، دوسرا تحقیقی، الزامی تو یہ ہے کہ تم صحابہ کے ایمان کی فکر تو پیچھے کرنا، پہلے خدا کے علم کی خیر مناؤ، کہ اسی تقریر سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اِنْ شک کے لئے آتا ہے اور شک بے علم کرتا ہے، معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ کو خبر نہ تھی، کہ یہ ایمان پر رہیں گے یا نہیں، العیاذ باللہ، جواب تحقیقی یہ ہے کہ ایسے مقام پر اگر مگر شک کے لئے نہیں ہوتا بلکہ سننے والے کو جوش دلانے کے لئے ہوتا ہے، ماں اپنے سگے بیٹے سے کہتی ہے کہ اگر تو میرا بیٹا ہے تو میری نافرمانی نہ کرنا، کیا اسے اس کے بیٹا ہونے میں شک ہے، کتاب اللہ کی فہم کے لئے عقل کے ساتھ ایمان کی بھی ضرورت ہے، **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ مصیبتوں پر غم کرنا ایسا ہی ممنوع ہے، جیسے دیگر محرمات شرعیہ، کیونکہ وہاں بھی صیغہ نہی کا آیا ہے یہاں بھی، پھر تو سارے مسلمان فاسق ہوئے، کہ مصیبت پر غم ایک غیر اختیاری چیز ہے، جو سب ہی کو ہوتا ہے، **جواب:** مطلقاً غم ممنوع نہیں بلکہ غم کے باعث دین میں سستی کرنا ممنوع ہے، اسی لئے یہاں لَا تَحْزَنُوْا کو لَا تَهِنُوْا کے ساتھ جمع فرمایا گیا، **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ کو واقعاتِ عالم کا پہلے سے علم نہیں ہوتا بلکہ ہو چکنے پر وہ جانتا ہے، دیکھو یہاں فرمایا گیا لِیَعْلَمَ اللّٰهُ تا کہ اللہ جان لے اور دوسرے مقام پر ارشاد ہوا وَ لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا (توبہ:۱۶) اب تک اللہ نے مجاہدین کو نہ جانا، ایک جگہ فرمایا گیا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ (بقرہ:۱۴۳) **نوٹ:** مسلمانوں میں ایک ملحد گزرا ہشام ابن حکم، اس نے ان آیات کی بنا پر یہی مذہب اختیار کیا کہ رب تعالیٰ کو علم واقعات ہو چکنے کے بعد ہوتا ہے، اور اس زمانہ میں وان بھچراں کے بعض جہلاء نے بھی یہی عقیدہ

سکھاتا ہے۔ یا یَقُوْلُوْنَ فعل پوشیدہ ہے یعنی ہمارے نیک بندے یوں دعا مانگتے ہیں۔ یا تعلیماً یوں ارشاد فرمایا گیا۔ جیسے استاد پڑھاتے وقت خود پڑھتا ہے تاکہ اسی طرح شاگرد بھی پڑھے۔ کہتا ہے۔ الف ب ت ث وغیرہ یا حاکم رعایا کی زبان میں کلام فرماتا ہے مثلاً نوکری کے فارم کا مضمون یہ ہوتا ہے کہ میں وفادار رہوں گا۔ بخوشی ہر کام کروں گا۔ یہ مضمون اگرچہ حاکم نے لکھا مگر نوکروں کی زبان سے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت میں یہ نہ فرمایا گیا لَا تُکَلِّفْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا الخ بلکہ وَلَا تَحْمِلْنَا فرمایا گیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ ناممکن چیزوں کی تکلیف دینا جائز ہے کیونکہ ناممکنات طاقت سے باہر ہیں اور دعا ممکنات کی مانگی جاتی ہے نہ کہ واجبات اور ناممکنات کی۔ (بعض علماء) **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ تحمیل بمعنی تکلیف ہے۔ دوسرے یہ کہ یہاں مَا سے مراد اخروی عذاب ہے۔ جو برداشت سے باہر۔ تیسرا یہ کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مولیٰ تو دشوار احکام کے تکلیف نہ دینے کے قانون کو منسوخ نہ فرما۔ چوتھا یہ کہ کسی چیز کی دعا مانگنا اسکے امکان کو نہیں چاہتا۔ قرآن پاک میں۔ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ۔ (انبیاء ۱۱۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا۔ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ۔ (شعراء: ۸۷) حالانکہ نہ انبیاء کرام کی رسوائی ممکن اور نہ خدا پاک کا غلط فیصلہ فرما دینا ممکن۔ **تیسرا اعتراض:** جب اللہ تعالیٰ نے خبر دیدی کہ ہم کسی نفس کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے پھر اس دعا مانگنے سے کیا فائدہ مانگی وہ چیز جاتی ہے جس کے نہ ملنے کا اندیشہ ہو۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر سے معلوم ہو چکا کہ یہاں مَا سے مراد یا تو دنیاوی مصیبتیں ہیں یا آخرت کے عذاب یا نفس کے وسوسے وغیرہ یہ چیزیں تو طاقت سے زیادہ بھی ڈالی جاتی ہیں۔ بعض بیماریاں ایسی سخت آتی ہیں کہ انسان کی جان نکل جاتی ہے اور آیت لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ میں شرعی احکام کی تکلیف مراد ہے کہ کسی شخص پر طاقت سے زیادہ احکام شرعیہ لازم نہیں کئے جاتے۔ لہٰذا وہ آیت بھی درست ہے اور یہ دعا بھی صحیح۔

تفسیر صوفیانہ

ابتدا کی طرف لوٹنے کا نام انتہا ہے۔ انسان مسافر ہے۔ جدھر سے چلا تھا۔ ادھر ہی جا رہا ہے۔ كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَعَهٗ شَيْئِيْ۔ رب تھا اور کچھ نہ تھا اس ذات کے تعین اول کا نام حقیقت محمد یہ ہوا۔ وہ ہی اصل وجود اور حقیقت ہر بود ہے۔ جس سے سارا عالم ظہور میں آیا۔ رب نے خاک کو دانہ' دانے کو آٹا' اور آٹے کو روٹی' روٹی کو خون' اور خون کو منی اور منی کو نطفہ اور نطفہ کو مضغہ' اور مضغہ کو علقہ' پھر اسے بے عقل و ہوش بچہ بنایا۔ پھر اس بیہوش کو عقل و ہوش دیا۔ یہ تمام مراتب بعد کے تھے۔ اب اسے اصل کی طرف یوں رجوع کیا کہ پہلے اسے ظاہری شریعت کا پابند کیا پھر ایمان کے بعد عرفان دیا۔ پھر صاحب کشف و الہام بنایا۔ پھر اسے خدمات و کرامات دیئے۔ پھر اسے مدارج طے کرنے کی توفیق دی۔ یہاں تک کہ وہ فنافی الرسول کے درجہ سے ہوتا ہوا فنافی اللہ تک پہنچا۔ یہ اس کی انتہاء تھی۔ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (انبیاء: ۱۰۴) اس سفر میں اسے کئی منزلوں میں ٹھہرنا پڑا۔ ہر منزل کے احکام جداگانہ تھے۔ جن میں سے دو مقام اہم تھے۔ ایک شریعت کی پابندی دوسرا طریقت۔ ان دو مقاموں کے لحاظ سے بندہ نے دعا مانگی۔ پہلے مقام میں ترک سختی کی دعا کی اور دوسرے مقام میں ناقابل برداشت احکام سے پناہ مانگی چونکہ شریعت طریقت سے پہلے ہے اس لئے لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا کو وَلَا تُحَمِّلْنَا سے پہلے بیان کیا گیا۔ یعنی اے مولیٰ اس سفر میں منزل شریعت کی سختیوں سے بچا اور مقام طریقت میں ہم سے وہ اطاعت اور شکر اور معذرت طلب نہ کر جو تیری

ہر چہ گیرد علتے علت شود کفر گیرد ملتے ملت شود

حضرت مولانا حسن رضا خاں صاحب فرماتے ہیں، شعر

جو کچھ نمک کی کان میں آیا نمک ہوا قاتل کے تیر بھی مرے ارمان ہو گئے

دیکھو رب تعالیٰ نے غازیانِ احد کے لئے وہاں کی تکالیف کو شہادت، نکھار، علم یقین کا ذریعہ بنایا، روح البیان نے فرمایا، کہ عیسیٰ علیہ السلام نے ایک جنگل میں ایک شخص کو حیرانی کی حالت میں بیٹھا ہوا دیکھا، جو برابر آسمان کو دیکھ رہا تھا، دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا، آپ نے اسے آواز دی، بازو پکڑ کر ہلایا، مگر اسے مطلقاً خبر نہ ہوئی، وحی آئی، کہ اے عیسیٰ! اگر تم اسے قتل بھی کر دو، تو اسے خبر نہ ہوگی، کیونکہ ہم نے اس کے دل میں اپنی معرفت کا ایک ذرہ رکھ دیا ہے، جسے ادھر کی خبر ہو جائے، وہ ادھر کا نہیں رہتا، مگر خیال رہے کہ مجاہدہ کے بعد مشاہدہ ملتا ہے، ان نعمتوں کو حاصل کرنے کے لئے محنتوں کی ضرورت ہے،

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ
کیا تم نے خیال کر لیا یہ کہ داخل ہو جاؤ تم جنت میں حالانکہ اب تک نہیں جانا اللہ
کیا اس گمان میں ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی اللہ نے
الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾
نے ان لوگوں کو جو جہاد کریں تم میں سے اور نہ جانا صبر والوں کو
تمہارے غازیوں کا امتحان نہ لیا اور نہ صبر والوں کی آزمائش کی
وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠
اور بے شک تم تمنا کرتے تھے موت کی اس سے پہلے کہ تم ملو اس سے
اور تم تو موت کی تمنا کیا کرتے تھے اس کے ملنے سے پہلے
فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾
پس بے شک دیکھ لیا تم نے اسے حالانکہ تم نظر کر رہے تھے
تو اب وہ تمہیں نظر آئی آنکھوں کے سامنے

تعلقات

اس آیت کا گذشتہ آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں جنگ احد کی مصیبتوں کی تین حکمتیں ارشاد ہوئیں، اب چوتھی حکمت کا ذکر ہو رہا ہے، یعنی پچھلی آیتیں بھی بیان حکمت کی تھیں، اور یہ آیت بھی اسی کی ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں واقعاتِ احد کے دنیاوی فوائد کا ذکر ہوا، اب اس آیت میں انہی کے دینی فائدے کا ذکر ہے، یعنی

عدی و درمنثور) (۸) حضرت کعب فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کو چار چیزیں وہ دی گئیں جو کسی پیغمبر کو نہ دی گئیں۔ بقرہ کے آخری رکوع کی تین آیتیں اور آیۃ الکرسی (ابوعبیدہ) (۹) ابوقلابہ فرماتے ہیں کہ جو کوئی سخت مصیبت میں گرفتار ہو وہ دعائے کرب پڑھے۔ وہ یہ ہے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْعَلِيْمُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ. لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ سُبْحٰنَكَ يَا رَحْمٰنُ مَا شِئْتَ اَنْ تَكُوْنَ كَانَ وَ مَا لَمْ تَشَآءْ لَمْ يَكُنْ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اَعُوْذُ بِالَّذِيْ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ السَّبْعَ وَمَنْ فِيْهِنَّ اَنْ يَّقَعْنَ عَلَى الْاَرْضِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَمِنْ شَرِّ مَا بَرَاَ وَاَعُوْذُ بِكَلِمٰتِ اللّٰهِ التّٰمّٰتِ الَّتِيْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ مِّنْ شَرِّ السَّاعَةِ وَالْحَامَةِ وَمِنَ الشَّرِّ. كُلِّهٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ. پھر آیت الکرسی پڑھے۔ پھر سورۂ بقرہ کا اخیری رکوع پڑھے۔ انشاء اللہ نجات ملے گی (تہذیب الآثار)...... (۱۰) حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کوئی سوتے وقت سورۂ بقرہ کی اخیری دو آیتیں پڑھ لیا کرے تو اسے رات بھر شیطان اور دیگر آفات سے پناہ ملے گی اور تمام رات کی عبادت کا ثواب ملے گا (مسلم و بخاری رحمۃ اللہ علیہما و خازن) (۱۱) عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ایک روز جبرئیل حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھے کہ اچانک اوپر سے سخت آواز سنی' حضرت جبرئیل نے عرض کیا یا رسول اللہ اس وقت آسمان کا وہ دروازہ کھلا جو آج تک کبھی نہ کھلا تھا۔ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ ایک فرشتہ حاضر ہوا' حضرت جبرئیل نے عرض کیا کہ حضور علیہ السلام یہ وہ فرشتہ ہے جو آج تک کبھی زمین پر نہ آیا۔ اس فرشتہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں آپ کو ان دو نوروں کی مبارک باد دینے آیا ہوں جو آپ سے پہلے کسی نبی کو نہ ملے۔ ایک سورۂ فاتحہ اور دوسرا سورۂ بقرہ کی اخیری آیتیں۔ اس کے پڑھنے والے کی ہر تمنا پوری ہوگی۔ (مسلم و خازن) (۱۲) سورۂ بقرہ ختم کر کے آمین کہنا چاہیے' کیونکہ حضور علیہ السلام بھی فرماتے تھے اور فرشتے بھی آمین کہتے ہیں (کبیر) (۱۳) اگر دفن کے بعد قبر کے سرہانے سورۂ بقرہ کا پہلا رکوع مفلحون تک اور قبر کی پائتی سورۂ بقرہ کا آخری رکوع پڑھا جائے تو میت کو قبر میں راحت حاصل ہوگی۔ (۱۴) جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے وہاں تین دن تک شیطان نہیں آتا (روح البیان) (۱۵) حضرت معاذ ابن جبل فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بار شیطان کو قید کر لیا۔ وہ بولا اگر آپ مجھے چھوڑ دیں تو میں آپ کو بڑا عمدہ عمل بتاؤں۔ میں نے کہا بتا؟ وہ بولا کہ اگر کوئی انسان رات کو سورۂ بقرہ کی اخیری آیتیں پڑھ لیا کرے تو ہم میں سے کوئی اس گھر میں رات بھر نہیں جا سکتا۔ غرضکہ اس کے فضائل و فوائد بے شمار ہیں۔ فقیر کی یہ وصیت ہے کہ تہجد خواں حضرات اپنی تہجد میں یہ دو دعائیں پڑھا کریں۔ اول رکعت میں سورۂ بقرہ کا یہ آخری رکوع' دوسری رکعت میں سورۂ آل عمران کا یہ رکوع اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ (آل عمران: ۹۰) اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (آل عمران: ۱۹۴) تک معنی پر نظر و دھیان رکھیں انشاء اللہ بہت خشوع و خضوع میسر ہوگا اور قبول کی امید بھی ہے۔ بھاگے ہوئے مجرم کیلئے وارنٹ کی ضرورت ہوتی ہے جو مجرم خود ہی حاکم کے سامنے پیش ہو جائے اسے وارنٹ کی ضرورت نہیں۔ رب تعالیٰ حاضر ہو جانے والے مجرموں کو اپنے کرم سے معافی دے دیتا ہے۔ بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ اسے راضی کرنے کی کوشش کر اللہ تعالیٰ میرے ان الفاظ میں تاثیر دے۔ آخر میں بندہ گنہگار شرمسار اپنے آقا تاجدار مدنی علیہ السلام کا نعت خواں احمد یار خاں بارگاہ پروردگار میں عرض کرتا ہے کہ مولیٰ تیرا ہی فضل و کرم تھا جو میں نے سورۂ بقرہ کی تفسیر ختم کی۔ اگر

غازی یا مطلقاً ہر مصیبت میں صبر کرنے والے لوگ یعنی نہ اب تک اللہ نے صابروں کو ظاہر طور پر جانا ہے یا آزمایا ہے، خیال رہے کہ ایک قرأت اس یَعْلَمُ کے پیش سے ہے، اس صورت میں یہ واؤ ابتدائیہ ہے اور جملہ نیا، اب معنی یہ ہوں گے کہ رب تعالیٰ صابروں کو جانتا ہے، انہیں بقدر صبر اجر دے گا، وَلَقَدْ كُنْتُمْ اس میں خطاب یا تو ان صحابہ سے ہے جو جنگِ بدر میں شریک نہ ہوسکے تھے، کیونکہ اس وقت نہ جنگ کا اعلان تھا نہ اس کا ارادہ، صرف ابوسفیان کے قافلہ کو روکنے کا قصد تھا، کچھ صحابہ گئے تھے، کچھ نہ گئے تھے، واقعہ بدر کے بعد نہ جانے والے بہت پچھتائے، اور بولے کاش! ہم بھی وہاں ہوتے، تو جام شہادت پیتے، یا ان صحابہ سے ہے جنہوں نے غزوۂ احد کے موقعہ پر شوقِ شہادت میں مدینہ میں رہ کر مدافعانہ جنگ کی مخالفت کی تھی، میدانِ کارزار میں جاکر جارحانہ جنگ پر زور دیا تھا، تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ تَمَنَّوْنَ تمنی سے بنا جس کا مادہ مَنًی ہے بمعنی آرزو، خواہش جمع امانی، تمنا ممکن بات کی بھی ہوتی ہے، ناممکن کی بھی، مگر امید صرف ممکن کی ہوتی ہے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ کاش جوانی لوٹ آتی، مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ شائد جوانی لوٹ آئے، موت سے مراد راہِ خدا میں موت یعنی شہادت ہے، اس کی تمنا بری نہیں بلکہ عبادت ہے، اور ہوسکتا ہے کہ اس سے جنگ مراد ہو کیونکہ یہ سبب موت ہے، یعنی اے بدر سے رہ جانے والے صحابہ یا اے میدانِ احد میں آنے کی کوشش کرنے والے جاں نثارو! تم تو شہادت یا جہاد کی تمنا کرتے تھے مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ جار مجرور تَمَنَّوْنَ کے متعلق ہے، تَلْقَوْهُ لقاءٌ سے بناہ کا مرجع موت ہے یعنی تمہاری آرزوئے شہادت موت یا علاماتِ موت یا اسبابِ موت (جنگ) دیکھنے سے پہلے تھی، وقت پڑنے پر تم گھبرا گئے فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ، فَقَدْ کی فا تعقیبیہ ہے یا تعلیلیہ اور وَاَنْتُمْ کا واؤ حالیہ ہے، اور مابعد واؤ ہے یا تو رَاَيْتُمُوْهُ کے واؤ سے حال ہے یا ہ ضمیر سے رویت اور نظر، قریب المعنی ہیں، یہاں یا تو رویت سے مراد آنکھوں سے دیکھنا ہے، اور نظر سے مراد دل سے دیکھنا اور غور کرنا یا دونوں بالکل ہم معنی ہیں، اور دوسرا جملہ پہلے کی تاکید، جیسے کہا جاتا ہے، کہ میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا یا آنکھیں کھول کر دیکھا، یا ایسی آنکھوں سے دیکھا جن میں کوئی بیماری نہیں یعنی تم نے اس تمنا کی ہوئی موت کو ظاہر ظہور آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا، یا آنکھوں سے دیکھا اور دل سے پہچان لیا کہ موت ایسی سخت چیز ہے، بعض لوگوں نے فرمایا کہ تَنْظُرُوْنَ کا مفعول لفظ محمد (ﷺ) ہے، یعنی تم نے موت کو اس حال میں دیکھا کہ تمہاری نظریں حضور انور ﷺ پر لگی ہوئی تھیں، (معانی)

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! کیا تمہیں یہ خیال ہوگیا ہے، کہ تم جنت جیسے اعلیٰ مقام میں یونہی پہنچ جاؤ گے، تمہارا امتحان آزمائش کچھ نہ ہوگی؟ ابھی تو رب تعالیٰ نے یہ دیکھا بھی نہیں ہے کہ تم میں مجاہد کون ہے، غیر مجاہد کون، صبر والا کون ہے، گھبرانے والا کون، جب تک کہ یہ چھانٹ نہ ہو، تب تک جنت میں داخلہ کیسا؟ وہاں تو چنے ہوئے نکھرے ہوئے نتھرے ہوئے مسلمانوں کی جگہ ہے، خیال رہے کہ یہ سوال بمعنی نہی ہے یعنی ایسا خیال کبھی نہ کرنا، جنت میں جانا ہے، تو اس کے لئے مشقتیں برداشت کرنا پڑیں گی، جب دنیا کی فانی نعمت بغیر محنت نہیں ملتی، تو وہ نعمتِ لازوال بغیر کمال کیسے ملے گی، تم تو اس سے پہلے جہاد کی شہادت کی تمنائیں کرتے تھے، اور تمہاری آرزو تھی کہ کبھی ہمیں جاں نثاری کا موقع ملے، اب تم نے ظاہر ظہور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جہاد یہ

ہے اور موت ایسی ہوتی ہے، تمہیں یہ دکھانے کے لئے یہ واقعات پیش آئے آئندہ کبھی مصیبت میں گھبرا نہ جانا، اور آفات ناگہانیہ میں دل چھوڑ نہ دینا، ہمیشہ ثابت قدمی سے جہاد کرنا،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ:** رب تعالیٰ سے امید ایمان کا رکن ہے، مگر صحیح امید یہ ہے، کہ پہلے اس کی فرماں برداری کرے، پھر اس کے کرم سے امید رکھے، نیکی نہ کرنا اور امید رکھنا بوالہواسی ہے، بدکاریاں کرنا اور امید رکھنا گویا اسلام کا مذاق اڑانا ہے، جیسا کہ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ سے معلوم ہوا، ایک شاعر کہتا ہے، شعر

تَرْجُوا النِّجَاةَ وَلَمْ تَسْلُكْ مَسَالِكَهَا   إِنَّ السَّفِيْنَةَ لَا تَجْرِيْ عَلَى الْيُبْسِ

امید کی کشتی نیکیوں کے دریا میں تیراؤ، ریتے میں کشتی نہیں تیرتی، حضرت مشہر ابن حوشب فرماتے ہیں، کہ گناہ کر کے جنت کی طلب، یہ بھی گناہ ہے، شفاعت کا انتظار بغیر سبب دھوکا ہے، جس کی اطاعت نہ کی جائے، اس کی رحمت کا انتظار حماقت ہے (روح المعانی) **دوسرا فائدہ:** جنتیوں اور دوزخیوں کی حقیقی چھانٹ تو قیامت ہی میں ہوگی، کہ جنتیوں کے منہ اجیالے، دوزخیوں کے کالے ہوں گے وغیرہ، مگر اس چھانٹ کی علامات دنیا میں بھی قائم ہیں، جن سے یہاں ہی جنتی، دوزخی کا اندازاً پتہ لگ جاتا ہے، ان علامات میں سے جہد اور صبر بڑی علامتیں ہیں، انشاء اللہ مجاہد اور صابر جنتی ہیں، جیسا کہ جٰهَدُوْا اور الصّٰبِرِيْنَ سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** ہمیشہ نیک اعمال میں رب تعالیٰ کی رضا کی نیت کرنی چاہیے، دکھلاوے اور دنیاوی نام و نمود کا ارادہ ہرگز نہ کرے، یہ بھی وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ سے معلوم ہوا، **چوتھا فائدہ:** تمنائے شہادت جائز بلکہ بہتر ہے، جیسا کہ اَلْمَوْتَ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** جنگ کی تمنا بہتر نہیں، جیسا کہ اَلْمَوْتَ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا، کہ موت سے مراد جنگ ہے، اور یہ کلام عتابانہ ہے، فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ جنگ کی دعائیں نہ کرو اللہ کریم سے امن و عافیت مانگو، اور جب جنگ آپڑے، تو صبر و استقامت سے کام لو، **چھٹا فائدہ:** بارگاہِ الٰہی میں حضرات صحابہ کا بڑا احترام ہے، کہ ان کی خطاؤں کا ذکر بھی اس طرح فرماتا ہے، کہ ان کے احترام و عزت میں فرق نہ آئے، دیکھو جن کے قدم جنگِ احد میں اکھڑ گئے تھے ان سے یہ نہ فرمایا کہ تم نے بغیر عمل جنت میں جانے کی نیت کر رکھی ہے، بلکہ استفہام انکاری کے طریقہ پر یہ مضمون ادا کیا، یہ سب کچھ ہماری تعلیم کے لئے ہے، دیکھو داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ان کی ایک لغزش یا خطاء پر خبردار کرنے کے لئے رب تعالیٰ نے ان کی خدمت میں دو فرشتے فتویٰ لینے بھیجے، جنہوں نے عرض کیا کہ اس کے پاس ۹۹ بکریاں ہیں، میرے پاس ایک، مجھ سے وہ یہ ایک بھی لینا چاہتا ہے، فرمایئے اس کے متعلق آپ کا کیا حکم ہے؟ اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں، جو بے دھڑک حضرات انبیاء کرام یا صحابہ عظام پر زبانِ طعنہ دراز کرتے رہتے ہیں، رب تعالیٰ تو رب تعالیٰ ہو کر ان کا احترام فرمائے، اور یہ بندے ہو کر بے لگام ہو جائیں، **ساتواں فائدہ:** سارے صحابہ جنتی ہیں جیسا کہ اَنْ تَدْخُلُوا الخ سے معلوم ہوا، کیونکہ رب تعالیٰ نے یہاں ان حضرات کے جنتی ہونے کی نفی نہ فرمائی، بلکہ انہیں جنت میں جانے کی تدبیر بتائی، کہ تم جنت کے لئے منتخب ہو چکے ہو، فلاں فلاں نیکیاں کرو،

(۳) سورۂ بقرہ کو آدم علیہ السلام کے قصہ سے شروع کیا گیا تھا۔ جن کی نہ ماں تھی نہ باپ اور اس سورۃ کو عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے شروع کیا گیا جن کی والدہ تھیں۔ والد نہ تھا۔ چونکہ آدم علیہ السلام پہلے انسان تھے۔ اس لئے ان کا ذکر قرآن کی پہلی سورۃ میں آیا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا ان کے بعد۔ اس لئے ان کا ذکر بعد کی سورۃ میں۔ نیز عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش عجیب و انوکھی تھی مگر آدم علیہ السلام کی پیدائش عجیب تر۔ لہٰذا عجیب تر کا ذکر پہلے فرمایا گیا۔ نیز عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو محض اس لئے خدا کا بیٹا مانا کہ وہ بغیر باپ پیدا ہوئے۔ لہٰذا رب نے پہلے آدم علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا۔ اب اس سورۃ میں عیسیٰ علیہ السلام کا تاکہ ان کی تردید میں آسانی ہو کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہو تو آدم علیہ السلام کو بھی مانو۔ نیز عیسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو آدم علیہ السلام کے قصہ پر قیاس کیا گیا ہے اور مقیس علیہ مقیس سے پہلے ہوتا ہے۔ لہٰذا سورۂ بقرہ پہلے آئی اور آل عمران اس کے بعد۔

(۴) سورۂ بقرہ کو متقین کے ذکر سے شروع کیا گیا اور پھر جہنم کے بارے میں فرمایا اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (بقرہ: ۲۴) وہ کافروں کے لئے تیار کی گئی۔ اور اس سورۃ کے آخر میں فرمایا گیا۔ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ (آل عمران: ۱۳۳) جنت پرہیز گاروں کے لئے تیار کی گئی۔ لہٰذا یہ سورتیں گویا یکساں ہیں۔

(۵) اس سورۃ کی انتہا سورۃ بقرہ کی ابتدا کے مناسب ہے کہ وہاں متقیوں کے بارے میں فرمایا گیا۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (بقرہ: ۵) اور اس کے اخیر میں ارشاد ہوا۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (آل عمران: ۲۰۰)

(۶) سورۂ بقرہ میں ابراہیم علیہ السلام کی دعا نقل فرمائی گئی۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (بقرہ: ۱۲۹) اس سورۃ میں اس دعا کی قبولیت کا ذکر ہے۔ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (آل عمران: ۱۶۴) غرضکہ اس سورۃ کو سورۂ بقرہ سے مناسبت ہے۔

آیت کا تعلق: اس آیت کا سورۂ بقرہ کی آخری آیت سے چند طرح تعلق ہے۔

(۱) یہ کہ اس آیت میں بندہ کی مجبوری اور معذوری کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں رب تعالیٰ کی قدرت و عظمت کا ذکر ہے جس سے بندہ کی بندگی اور خدا کی ربوبیت کا پتہ لگتا ہے اور ان دونوں پر ہی ایمان کا مدار ہے کہ بندہ اپنے کو مجبور معذور جانے رب کو قادر مطلق سمجھے تب ہی تو اسی پر ایمان لائے گا۔ اسی کی اطاعت کرے گا۔

(۲) یہ کہ اس آیت میں مسلمانوں سے قوم کفار کے مقابلہ میں فتح کی دعا منگائی تھی۔ اب اس آیت میں اس فتح کا ذکر ہے جو رب تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو عیسائیوں کے مناظرہ میں عطا فرمائی لسانی جنگ سنانی جنگ سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ سنانی جنگ تو کبھی کسی سے ہو جاتی ہے مگر لسانی جنگ یعنی مناظرہ ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ نیز مناظرہ میں کبھی لوگ راستہ پر آ جاتے ہیں مگر جنگ میں اکثر شکست کھا کر بھاگ جاتے ہیں۔ اس لئے رب تعالیٰ نے مناظرہ کا بڑے اہتمام سے ذکر فرمایا۔

(۳) یہ کہ یہ ساری سورۃ سورہ بقرہ کے اخیر جملہ سے خاص تعلق رکھتی ہے کیونکہ اس میں کفار پر فتح مانگی گئی اور اس سورۃ کی بہت سی آیتوں میں کفار کے ساتھ مناظرہ اور جہاد کا ذکر ہے۔

سے منع فرمایا گیا ہے، اور اسے جرم قرار دیا گیا، **جواب:** حدیث شریف میں تمنائے موت سے ممانعت اس صورت میں کی گئی، جبکہ دنیوی تکالیف سے پریشان ہو کر ہو، لیکن شہادت کے شوق، دیدار مصطفوی کے ذوق اور رب تعالیٰ سے ملنے کی خواہش کی بنا پر یہ تمنا ہو، تو بہت بہتر ہے، اس آیت میں یہ آخری تمنا ہی مراد ہے، حضرت خالد ابن ولید، ضرار ابن ازور، عبداللہ ابن رواحہ وغیرہم جلیل القدر صحابہ سے یہ تمنا بلکہ شوق شہادت ثابت ہے، خود حضور انور ﷺ فرماتے ہیں، میری تمنا یہ ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل ہوں، پھر زندہ ہوؤں، پھر قتل ہوؤں، پھر زندہ، پھر قتل ہوؤں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دعا مانگی تھی کہ خدایا مجھے اپنے حبیب کے شہر میں شہادت کی موت دے، جو قبول ہوئی، اور آپ کو بے مثال شہادت نصیب ہوئی، **پانچواں اعتراض:** اپنی شہادت کی تمنا در پردہ کفار کے غلبہ کی تمنا ہے، لہٰذا یہ بھی منع ہونی چاہیے، **جواب:** ہرگز نہیں، بلکہ اس میں اپنی بلندی درجات کی نیت ہے جو شہادت سے نصیب ہوتی ہے، اس میں غلبہ کفار کا خیال بھی نہیں ہوتا، جیسے بیمار مسلمان کافر حکیم سے علاج کرائے تو اس کی نیت اپنی شفاء ہے نہ کہ اس کافر کی نفع رسانی یا اس کی دکان چمکانا،

تفسیر صوفیانہ

گرنا آسان ہے مگر چڑھنا مشکل، کنوئیں میں گرنے کے لئے فقط چھلانگ لگا دینا ہی کافی ہوتا ہے، مگر وہاں سے نکلنے کے لئے سیڑھی یا رسی، پھر اس کا پکڑنا، پھر اس پر چڑھنا غرضکہ بہت چیزیں درکار ہیں، ہمیں دنیا میں گرانے کی کوشش نفس کر رہا ہے، اور رب تعالیٰ ہمیں اونچا کرنا پسند کرتا ہے، اس لئے اس کریم نے یہاں اعمال کی سیڑھی بھی لگائی ہے اور کرم کی ڈور بھی لٹکائی ہے، اور ہمیں اس رسی کے پکڑنے کا بھی حکم دیا ہے اور اس سیڑھی پر چڑھنے کا بھی، اس آیت کریمہ میں اس سیڑھی کا ہی ذکر فرمایا گیا ہے، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ حب دنیا اور سعادت آخرت کبھی جمع نہیں ہو سکتے، ان دونوں میں سے ایک جس قدر زیادہ اور قوی ہوگی، اسی قدر دوسری کم اور کمزور، رب تعالیٰ نے اس آیت میں ہمیں پر آرام طلبی سے منع فرمایا، حب الٰہی اور حب آخرت ایک دعویٰ ہے جس کے دلائل نیک اعمال اور مکروہات میں صبر اور حرام چیزوں سے اپنے کو روکنا ہیں، محبت کامل وہ ہے جو یار کی جفا سے کم نہ ہو، اور اس کی وفاء سے زیادہ نہ ہو، یہاں فرمایا گیا کہ اے مسلمانو! تم ایمان لا کر میری محبت کے دعوے دار بنے، اس کے کچھ دلائل تو دو، رب تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (عنکبوت: ۲) کسی نے حضرت شبلی سے پوچھا کہ عارف کی پہچان کیا ہے؟ فرمایا جس کی زبان ناطق ہو، دل صادق ہو، سر واثق ہو، روح سابق ہو، جو اللہ کی راہ میں سبقت کرے، اور وہ خود اللہ پر عاشق ہو، جس میں یہ باتیں نہ ہوں وہ معرفت کا مدعی ہے عارف نہیں، شیخ سعدی فرماتے ہیں، شعر

تحمل چو زہرت نماید نخست ولے شہد گردد چو در طبع رست
ز علت مدار اے خردمند بیم چو داروئے تلخت فرستد حکیم

یعنی مصائب بظاہر زہر ہوتے ہیں، حقیقت میں شہد، عقلمند کو چاہیے کہ آفات سے گھبرا نہ جائے، یہ تو کڑوی دوا ہے جو حکیم نے ہماری شفاء کے لئے بھیجی ہے،

اقرار کیا تو فرمایا کیا عیسیٰ علیہ السلام بھی بغیر تعلیم الٰہی کچھ جان سکتے ہیں۔ وہ بولے نہیں' حضور علیہ السلام نے فرمایا تم جانتے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام حمل میں رہے۔ پیدا ہونے والے کی طرح پیدا ہوئے۔ بچوں کی طرح کھاتے پیتے تھے۔ انسانی عوارضات بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے اقرار کیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ پھر وہ الٰہ کیسے ہیں اس پر وہ سارے خاموش ہو گئے۔ تب سورۂ آل عمران کی کچھ اور (۸۰) اسی آیتیں نازل ہوئیں (کبیر و خازن و خزائن وغیرہ) اس مناظرے سے عاجز ہو کر پھر وہ مباہلہ پر آمادہ ہوئے۔ جس کا قصہ اس سورۃ میں آئے گا مگر پھر مباہلہ کی بھی ہمت نہ کی۔ وہ جانتے تھے کہ حضور ﷺ سچے نبی ہیں اور نبی کی بد دعا ہلاک کر دیتی ہے۔ (کبیر)

تفسیر

الٓمٓ اس کے متعلق سیپارہ میں بہت کچھ عرض کیا جا چکا۔ یہاں صرف یہ سمجھ لو کہ یا تو الف سے اللہ کی طرف اشارہ ہے اور لام سے لطیف کی طرف اور میم مجید کی جانب یعنی قرآن اللہ نے اتارا۔ جو رحم و کرم و بزرگی والا ہے۔ یا الف سے اشارہ اللہ کی طرف ہے۔ لام سے جبریل کی طرف اور میم سے محمد مصطفیٰ ﷺ کی طرف۔ یعنی یہ قرآن یا سورۃ اللہ نے اتارا' جبریل لائے اور محمد مصطفیٰ ﷺ پر اترا۔ بعض قرأتوں میں الف لام میم پر وقف ہے اور بعض میں اس کی میم کو زیر دے کر لام سے ملا دیا گیا ہے۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ اس جملہ کی پوری تفسیر آیۃ الکرسی میں ہو چکی۔ اللہ مبتدا ہے۔ اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس کی خبر۔ اور اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ خبر دوم۔ الحی وہ ہے جسے کبھی موت نہ آ سکے۔ یعنی حی کامل صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اَلْحَیُّ میں لام عہدی ہے۔ اس کے ماسوا بھی اگرچہ حی ہیں مگر حی ناقص قابلِ موت لہٰذا الحی رب تعالیٰ ہی کی صفت ہے اور قیوم وہ جو خود بالذات قائم ہو اور دوسرے اس سے قائم ہوں۔ اور جو خلق کی دنیوی اخروی ساری حاجتوں کا انتظام فرمائے۔ قیوم حقیقی یعنی عالم کو قائم' باقی رکھنے والا صرف رب تعالیٰ ہے۔ اس کے بعض بندے قیام عالم کا ذریعہ ہیں حدیث شریف میں ہے کہ تارے' چاند' سورج آسمان کے بقا کا ذریعہ ہیں اور میرے صحابہ قیام زمین کا وسیلہ اسی لئے صوفیاء کی اصطلاح میں بعض بزرگوں کو قیوم اول' قیوم دوم کہا جاتا ہے۔ بعض اولیاء اللہ عالم کی حاجت روائی کا ذریعہ ہیں۔ حضور انور ﷺ چالیس ابدال کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کی برکت سے لوگوں پر بارشیں ہوں گی۔ جنگوں میں فتح و نصرت نصیب ہو گی۔ لہٰذا یہ حضرات مجازاً قیوم ہیں۔ ہم ان دو لفظوں کی نہایت نفیس تحقیق آیت الکرسی میں کر چکے ہیں۔ یعنی اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ہی ہمیشہ زندہ رہنے والا' اور سب کو قائم رکھنے والا ہے چونکہ توحید کا عقیدہ بغیر حضور ﷺ کو ماننے معتبر نہیں۔ نیز رب تعالیٰ کی قیومیت کا تقاضا تھا کہ بندوں کو بقاء کے ذریعے دیئے جائیں۔ چنانچہ بقاء اجسام کے لئے اس نے غذائیں و دوائیں و ہوائیں وغیرہ پیدا فرمائیں اور بقاء ارواح یا بقاء ایمان کے لئے۔ انبیاء مبعوث کئے۔ کتابیں اتریں۔ گویا کتب آسمانی کا نزول قیومیت باطنی کا ظہور ہیں۔ اس لئے ارشاد ہوا کہ نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ۔ نَزَّلَ تنزیل سے بنا بمعنی آہستہ اُتارنا۔ اَلْكِتٰبِ میں الف لام عہدی ہے۔ جس سے قرآن پاک مراد۔ چونکہ یہ پہلے لوح محفوظ میں تھا اور اس کے مضامین پچھلے پیغمبروں کے صحیفوں میں لکھے ہوئے تھے اور آئندہ بھی اس کی کتابت ہوتی رہے گی۔ اس لئے اسے کتاب فرمایا۔ اگرچہ اس کا نزول پڑھ کر ہوا نہ کہ لکھ کر۔ کتاب فرمانے میں اس جانب بھی اشارہ ہے کہ کامل کتاب یہ ہی ہے' اس کے مقابلہ میں سب

ناقص۔ بالحق یا نَزَّلَ کے متعلق ہے یا متلبسًا پوشیدہ کے اور وہ کتاب کی صفت حق مقابل باطل کا ہے۔ جیسے صدق مقابل کذب کا۔ ہر واقعی حقیقت رکھنے والی چیز حق کہلاتی ہے۔ یعنی اس رب نے حق کے ساتھ آپ پر کتاب اتاری۔ جس میں باطل بالکل شامل نہ ہو سکا کہ بھیجنے والے رب نے حق بھیجا' لانے والے جبریل حق لائے' کوئی ملاوٹ نہ کی' لینے والے نبی کریم ﷺ نے حق لیا کہ زیر زبر تک بھول نہ سکے۔ یا رب نے آپ پر وہ کتاب اُتاری جو حق سے موصوف ہے اور ممکن ہے کہ حق بمعنی صدق ہو۔ یعنی قرآن میں پچھلوں کی سچی خبریں ہیں یا حق بمعنے فیصلہ کرنے والا کلام یعنی یہ تو قول فیصل ہے نہ کہ ہزل یا حق بمعنی عدل و انصاف ہے۔ یا حق بمعنی استحقاق یا حق فاسد کا مقابل ہے۔ یعنی اس کلام میں تناقص اور تقابل نہیں۔ یا یہ کلام اس کا مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے (کبیر و معانی وغیرہ) مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ۔ مُصَدِّقًا یا تو علیک کی ضمیر مجرور کا حال ہے۔ یا کتاب کا یا بِالْحَقِّ کے متعلق کا جو کہ کتاب کا حال اول تھا۔ یہ لفظ تصدیق سے بنا بمعنی سچا کرنا اور سچا کہنا' یا سچا کہلوانا' قرآن کریم گذشتہ نبیوں' کتابوں وغیرہ کا تینوں طرح مصدق ہے۔ لِمَا مُصَدِّقًا کے متعلق ہے۔ مَا سے پچھلی آسمانی کتابیں مراد ہیں۔ چونکہ پہلے کچھ کتابیں آئی تھیں۔ کچھ صحیفے۔ کچھ انبیاء کرام کے معجزات۔ ان سب کو شامل کرنے کے لئے مَا ارشاد ہوا۔ قرآن کریم نے سب ہی کی تصدیق فرمائی۔ بَیْنَ ثبت فعل محذوف کا ظرف ہے جو مَا کا صلہ ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں سامنے' خواہ زمانہ کے لحاظ سے سامنے ہو' یا جگہ کے لحاظ سے' یہاں زمانہ کے لحاظ سے مراد ہے۔ یعنی یہ قرآن پچھلی کتابیں' صحیفے' انبیائے کرام کے معجزات کو سچا کرنے والا ہے یا سچا بتانے والا ہے۔ خیال رہے کہ جیسے مصدق میں احتمال ہے کہ علیک کے کاف خطاب سے حال ہو ایسے ہی بالحق میں بھی احتمال ہے کہ متلبسًا ثابتًا کے متعلق ہو' علیک کے کاف خطاب کا حال ہوگا۔ یعنی آپ پر کتاب اُتاری اس حال میں کہ آپ حق سے وابستہ و متصف ہیں اس طرح کہ آپ (ﷺ) کی ہر ادا حق ہے۔ آپ (ﷺ) سراپا حق ہیں۔ بلکہ آپ مطلقًا حق ہیں۔ ہمارے اعمال نفسانی' شیطانی' رحمانی ہر طرح کے ہوتے ہیں مگر آپ ﷺ وہ ہیں کہ آپ (ﷺ) کا سونا' جاگنا' دیکھنا' سننا' بولنا عین حق ہے۔ یعنی بے عیب ہے۔ چونکہ قرآن عین حق ہے اس لئے جس پر قرآن اُترا' وہ بھی عین حق ہونا چاہیے۔ نیز جو حضور ﷺ سے وابستہ ہو وہ حق جو آپ (ﷺ) سے علیحدہ ہو گیا' باطل ہو گیا۔ طلوع و غروب کے وقت نماز حق نہیں' باطل ہے کیونکہ حضور (ﷺ) نے اس سے منع فرما دیا۔ ایسے ہی جو عالم حضور ﷺ سے وابستہ ہے وہ حق ہے' جو وابستہ نہیں باطل ہے۔ جب قرآن کا کاغذ' سیاہی' قلم' لکھنے والا' چھونے والا پاک چاہیے' سب کا احترام ہے۔ ایسے ہی جس ذات کریم پر قرآن اترے وہ بھی پاک و حق چاہیے۔ ان کا احترام بھی لازم' وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ۔ یہ جملہ نزل پر معطوف ہے اور گویا بَیْنَ یَدَیْهِ کا بیان خصوصی ہے۔ چونکہ توریت و انجیل کی خصوصیت سے تصدیق فرمائی' اور انہی کتابوں کے ماننے والے عرب موجود تھے۔ اس لئے اس کو علیحدہ بیان فرمایا۔ اگرچہ زبور شریف اور تمام صحیفے برحق ہیں اور سب پر ہمارا ایمان ہے اور قرآن کریم و حضور ﷺ نے سب ہی کی تصدیق فرمائی مگر توریت کی تصدیق زبور کی تصدیق ہے۔ اور داؤد علیہ السلام کی امت عرب میں تھی نہیں اس لئے زبور کا ذکر ہوا' نہ کہ دوسرے صحیفوں کا اور چونکہ توریت و انجیل کا آنا یکبارگی ہوا تھا اور قرآن شریف کا نزول آہستگی سے تئیس سال میں۔ لہٰذا اس کے لئے نزل فرمایا گیا۔ اور ان کے لئے اَنْزَلَ [illegible] توریت زبان عبرانی کا لفظ ہے اور انجیل زبان سریانی کا۔ اس کے اس

مسلمان بولے، اگر حضور شہید ہو گئے تو اللہ تو زندہ ہے، پھر سب سے پہلے حضرت کعب ابن مالک نے حضور انور ﷺ کی سلامتی کی لوگوں کو خبر دی، اور حضور انور ﷺ نے فرمایا، اے مسلمانو! میرے پاس آؤ، چنانچہ مسلمان آپ کے پاس جمع ہو گئے، تب یہ آیت کریمہ اتری، جس میں راسخین کی تائید کی گئی، منافقین کی تردید، اور ضعفاء مومنین پر عتاب فرمایا گیا (تفسیر خازن، کبیر، روح المعانی، روح البیان، صاوی وغیرہ) اس جگہ خازن و معانی میں بہت تفصیلی واقعات ہیں جو ہم نے اختصاراً چھوڑ دیئے۔

تفسیر

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ما نافیہ ہے، **مُحَمَّدٌ** حضور انور ﷺ کا اسم ذات ہے، حضور انور ﷺ کے ذاتی نام دو ہیں، محمد، احمد، باقی صفاتی نام دو سو ایک ہیں (دلائل الخیرات) اور بروایت مدارج النبوۃ ایک ہزار ہیں، قرآن شریف میں محمد چار جگہ آیا ہے، ایک تو اس آیت میں، دوسرے **مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ** (فتح: ۲۹) تیسرے **بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ** (محمد: ۲) چوتھے **مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ** (احزاب: ۴۰) میں، اور احمد ایک جگہ سورۂ صف میں **يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ** (صف: ۶) محمد حمد بمعنی تعریف سے بنا، باب تفعیل میں آکر مبالغہ اور استمرار کا مفید ہے، اس کے معنی ہوئے، ہمیشہ تعریف کئے ہوئے کہ جب سے عالم بنا، تب سے ان کی حمد وثنا ہوئی، اور ہمیشہ ہمیشہ دنیا میں، قیامت میں، جنت میں، مقام محمود پر ان کی حمد وثناء ہوتی رہے گی، اور ہر طرح حمد کئے ہوئے، کہ آپ کی ذات وصفات، احوال کی تعریفیں ہوتی ہیں اور ہوتی رہیں گی، حضور انور ﷺ کی ولادت پاک کے ساتویں دن عبدالمطلب نے یہ نام رکھا، لوگوں نے اس انوکھے نام کی وجہ پوچھی، تو بولے کہ میں نے خواب میں حکم پایا ہے کہ یہ نام رکھوں، اور مجھے امید ہے کہ میرے اس فرزند کی ہمیشہ اور ہر طرح تعریفیں ہوا کریں گی، احمد کے معنی ہیں بہت حمد کرنے والے، کس کی اپنے رب تعالیٰ کی، حضور ﷺ کی محمدیت کا ظہور تو دنیا میں بھی ہو رہا ہے کہ ہر زبان میں آپ کی تعریفیں ہر زبان میں ہر جگہ ہو رہی ہیں، اور احمدیت کا ظہور قیامت میں ہو گا کہ حضور انور ﷺ اپنے رب تعالیٰ کی ایسی حمد کریں گے کہ کسی نے نہ کی ہو گی، رب تعالیٰ نے اپنے ناموں میں سے یہ نام اپنے محبوب کے لئے نکالے، رب تعالیٰ حامد ہے، حضور انور ﷺ محمود، رب تعالیٰ محمود ہے اور حضور انور ﷺ احمد، انشاء اللہ العزیز اس نام پاک کے فضائل وفوائد ہم خلاصہ تفسیر سے متصل عرض کریں گے، **اِلَّا رَسُوْلٌ** اِلَّا قصر وحصر کے لئے ہے، اور حصر اضافی ہے نہ کہ حقیقی لہٰذا اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضور انور ﷺ صرف رسول ہیں اور کچھ نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ آپ خدا نہیں، خدا تعالیٰ کے فرزند نہیں بلکہ رسول ہیں، اگرچہ رب تعالیٰ نے حضور انور ﷺ کو کروڑوں صفات بخشیں، مگر صفت رسالت بہت جامع ہے، کہ رسول کی نسبت رب تعالیٰ سے بھی ہے اور ساری خلقت سے بھی، رسول خالق ومخلوق کے درمیان برزخ کبریٰ ہیں، کہ رب تعالیٰ جسے جو دے، وہ حضور انور ﷺ کے وسیلہ سے دے، اور خلقت جو لے، وہ حضور انور ﷺ کے توسل سے لے، حضور انور ﷺ ہی کے دم سے خالق ومخلوق کا تعلق قائم ہے، اگر یہ واسطہ درمیان میں نہ ہو، تو مخلوق خالق سے علیحدہ ہو جائے، دیکھو مختلف ممالک کے درمیان ڈاک، ریل اور تار وغیرہ ہی ایسے وسائل ہیں جن سے ممالک ملتے رہتے ہیں، کہ خبر،

مال، انسان ان ہی کے ذریعہ ایک دوسرے ملک میں آتے جاتے ہیں، اسی لئے رب تعالیٰ نے حضور انور ﷺ کو یہاں رسول فرمایا اور کلمہ طیبہ میں بھی آپ کا وصف رسالت ہی بیان ہوا، مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (فتح: ۲۹) کہ تمام اوصاف اس میں آ جاتے ہیں، خیال رہے کہ حضور انور ﷺ اللہ کے رسول ہیں، وکیل نہیں، وکیل وہ جو اپنی ذمہ داری پر کام کرے، رسول وہ جو بھیجنے والے کی ذمہ داری پر کام کرے، وکیل وہ جس کے الفاظ وکلام بھی اپنا ہو، اور زبان بھی اپنی، مگر رسول وہ جس کی زبان تو اپنی ہو، کلام بھیجنے والے کا، وکیل وہ جس سے خود اسی کے معاملہ کا مطالبہ ہو، اور رسول وہ جس کے معاملہ کا مطالبہ بھیجنے والے سے ہو، رسولٌ کی تنوین عظمت کے لئے ہے، یعنی بہت بڑے اور شان دار رسول، اور رسالت کا اطلاق عموم کے لئے، یعنی ساری خلقت کے رسول، حتیٰ کہ رسولوں کے بھی رسول، ان شاء اللہ العزیز اس کی تحقیق لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ (توبہ: ۱۲۸) کی تفسیر میں ہوگی اگر زندگی رہی، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ قَدْ خَلَتْ کی تحقیق ابھی کچھ پہلے ہو چکی ہے، مِنْ قَبْلِهٖ میں ہ ضمیر حضور انور ﷺ کی طرف راجع ہے، رُسُلُ سے مراد سارے نبی ہیں خواہ رسول بھی ہوں یا مرسل بھی ہوں یا صرف نبی ہوں، یعنی حضور محمد مصطفیٰ ﷺ سے پہلے سارے رسول گذر چکے، کہ نہ تو کوئی رسول آپ کے زمانہ میں تشریف فرما ہیں، کہ ان کے احکام جاری ہوں، اور نہ آپ کے بعد کوئی نیا نبی نبوت پا کر آنے والا ہے، رسولوں کا گذر جانا یا تو اس طرح ہے کہ وہ حضرات وفات پا چکے، جیسے حضرت موسیٰ وابراہیم علیہما السلام وغیرہم، یا زمین سے آسمان پر اٹھائے جا چکے، جیسے حضرت عیسیٰ و ادریس علیہما السلام یا اس طرح کہ زمین پر وہ حضرات ہوں، مگر ان کی نبوت منسوخ ہو چکی، اور وہ لوگوں کی نگاہوں سے روپوش ہو گئے، جیسے حضرت خضر اور الیاس علیہما السلام، غرضکہ قَدْ خَلَتْ بہت جامع کلمہ ہے، اسی لئے رب تعالیٰ نے یہاں موت کا صیغہ استعمال نہ فرمایا کہ ابھی بعض رسول زندہ ہیں مگر چونکہ ان کی نبوت منسوخ ہو چکی، اور ان کے احکام نافذ نہ رہے، ان کی اطاعت لوگوں پر واجب نہ رہی، لہٰذا فرمایا گیا قَدْ خَلَتْ وہ حضرات گذر گئے، اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ یہاں لفظ اِنْ جو شک و تردد کے لئے آتا ہے، ہم بندوں کے لحاظ سے ہے، کہ رب تعالیٰ شک وتردد سے پاک ہے، وہ تو جانتا ہے کہ حضور انور ﷺ کی وفات شہادت کے ذریعہ نہ ہوگی، طبعی ہوگی، وہ تو خبر دے چکا ہے وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ: ۶۷) رب تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا، اور فرما چکا ہے اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (الزمر: ۳۰) اور فرما چکا ہے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (توبہ: ۳۳) یعنی اگر ہمارے محبوب اپنی طبعی وفات سے وفات پائیں یا جام شہادت نوش کریں، تو انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ انقلاب قلب سے بنا بمعنی لوٹ جانا اور اعقاب عقب کی جمع ہے بمعنی ایڑی، انسان جہاں سے آیا ہو بالکل ادھر ہی لوٹ جانے کو ایڑیوں پر لوٹ جانا کہاں جاتا ہے، کہ اگر ایڑی اپنی جگہ رہے باقی جسم پھرے، تو اسے مڑنا اردو میں کہتے ہیں، اور التفات عربی میں، جب ایڑی بھی گھوم جائے، تو اسے اردو میں پھر جانا، اور عربی میں انقلاب کہا جاتا ہے، یہاں انقلاب سے مراد یا تو دین اسلام سے پھر کر مرتد ہو جانا ہے، یا بزدل ہو کر جہاد نہ کرنا، یا جہاد سے بھاگ جانا ہے، روح المعانی نے فرمایا کہ الٹے پاؤں چلے جانے کو ایڑی پر لوٹ جانا کہتے ہیں، اگر چہ یہ حضرات احد شریف میں صرف گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے، مگر رب تعالیٰ نے سختی سے روک دینے کے لئے یہ صیغہ استعمال فرمایا، کہ تم لوگ حضور انور ﷺ کی شہادت کی جھوٹی خبر سن

کر جب ایسا گھبرا گئے، تو کیا جب سچی خبر شہادت کی سنو گے، تو اسلام ہی چھوڑ دو گے، یا جہاد ہی بند کر دو گے؟ خبردار! ایسا ہرگز نہ کرنا!! یا روئے سخن ان ضعفاء کی طرف ہے جو گھبرا کر کہہ اٹھے تھے کہ ہم کو ابو سفیان سے امان دلوا دو، یا ان لوگوں سے کلام ہے جن سے منافقین نے کہا تھا کہ حضور انور ﷺ کی تو شہادت ہو چکی، اب تم لوگ اپنے پرانے دین کی طرف لوٹ جاؤ، مقصد یہ ہے کہ نبی تبلیغ کے لئے تشریف لاتے ہیں نہ کہ امت کے پاس ہمیشہ رہنے کے لئے، جیسے پچھلے رسول تشریف لائے اور تبلیغ فرما کر چلے گئے، ہمارے یہ محبوب بھی آخر وفات پائیں گے، نبی کی وفات سے دین ختم نہیں ہو جاتا وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ اس مَنْ میں سارے مسلمان داخل ہیں، صحابہ کرام ہوں یا بعد کے لوگ، انقلاب سے مراد اسلام چھوڑ دینا ہے، یا جہاد چھوڑ بیٹھنا، یا جہاد سے بھاگ جانا، یعنی جو بھی اسلام سے، یا جہاد سے، یا جہاد میں بہادری دکھانے سے لوٹ جائے تو فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا وہ اللہ تعالیٰ کو ذرہ بھر نقصان نہ پہنچا سکے گا، یا اللہ تعالیٰ کے حبیب کا، یا دین اسلام کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا کہ اللہ تعالیٰ کا دین حضور محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان کا علو تو ہمیشہ پھیلتا ہی رہے گا، اور قومیں پیدا ہو کر دین کی خدمت کریں گی، ضُرٌّ ضررٌ سے بنا بمعنی نقصان یا کمی، خواہ بدنی نقصان ہو یا جانی یا مالی یا عزت و آبرو کا، بھاری ہو یا معمولی شیئا فرما کر عموم کی طرف اشارہ کیا، یعنی معمولی سا نقصان بھی نہ کر سکے گا، خود اپنا ہی نقصان کرے گا، کہ دارین کی سعادت سے محروم ہو جائے گا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ س قرب استقبال کے لئے ہے، جزا مطلقاً بدلہ کو کہتے ہیں، ثواب ہو یا سزا، مگر یہاں اچھا بدلہ مراد ہے، شاکرین سے مراد دین پر قائم رہنے والے یا جہاد کرنے والے یا جہاد میں ثابت قدم رہنے والے مسلمان ہیں، کیونکہ ہر نیک عمل رب تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ہے، شکر قولی بھی ہوتا ہے، عملی بھی، اعتقادی بھی،

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! حضور انور ﷺ خدا نہیں ہیں کہ انہیں وفات نہ ہو، وہ تو خالص بندے اور تمام جہان کے شاندار رسول ہیں، ان سے پہلے بہت سے پیغمبر گذرے، جو دنیا میں تشریف لائے، اور اپنا فرض تبلیغ ادا کر کے تشریف لے گئے، اور ان کے بعد ان کی امتوں نے دین پر استقامت کی، دینی خدمات انجام دیں، اگر محمد مصطفیٰ ﷺ آئندہ وفات پا جائیں، یا فرض کرو شہادت کا جام نوش فرما لیں، تو کیا تم اسلام سے یا جہاد سے یا جہاد میں استقامت سے پھر جاؤ گے، ہرگز نہ پھرو گے، پھر تم غزوۂ احد میں حضور انور ﷺ کی شہادت کی خبر سن کر گھبرا کیوں گئے، اور تم میں بعض نے ابو سفیان سے امان کی درخواست کرنے کا خیال بھی کیوں کیا، اور تم سے منافقین نے یہ کیوں کہا کہ اسلام چھوڑ کر پرانے دین کی طرف لوٹ جاؤ، ان بدنصیبوں کو تم سے یہ کہنے کی ہمت و جرأت ہی کیوں ہوئی؟ خیال رکھو کہ اسلام تو قائم رہے گا اور پھلتا پھولتا رہے گا، اگر کوئی اسلام یا جہاد سے پھر بھی جائے، تو نہ اللہ کا کچھ بگاڑ سکتا ہے، نہ اس کے حبیب کا اور نہ اسلام کا بلکہ اپنا ہی بگاڑ لے گا، دیکھو مکہ معظمہ کے سردارانِ قریش نے اسلام کی خدمت نہ کی، بلکہ اسے بگاڑنا اور فنا کرنا چاہا، تو وہ ہی ختم ہو گئے، اسلام کی خدمت کرنے کے لئے مدینہ منورہ کے غریب انصار مقرر فرما دیئے گئے، اس سے عبرت پکڑو، اور اسلام و جہاد پر استقامت اختیار کرو، تا کہ تمہارا نام شاکر بندوں کی فہرست میں آئے، اللہ تعالیٰ شکر گذاروں کو دنیا میں بھی بدلہ دیتا ہے، اور آخرت میں بھی ثواب، لہٰذا شاکر رہو، ناشکر نہ بنو، خیال

پتہ ہیں۔ بغیر پتہ خط اور اس کا سارا مضمون منزل مقصود تک نہیں پہنچتا۔ ایسے ہی بلا واسطہ انبیاء سارے عقائد بیکار ہوں گے۔
آٹھواں فائدہ: کبھی نام کام کا پتہ دیتے ہیں۔ دیکھو رب تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے اسماء سے عیسیٰ علیہ السلام کی بندگی ثابت فرمائی۔ **نواں فائدہ:** مناظرہ کے قانون قرآن شریف سے مستنبط ہیں۔ چنانچہ دلیل تخلف اس آیت سے مستنبط ہوسکتی ہے وہ اس طرح کہ کہا جائے کہ تم عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت میں جھگڑا کرتے ہو یا ان کی نبوت میں۔ اگر انہیں خدا مانتے ہو تو یہ غلط ہے۔ اللہ حی و قیوم ہے اور عیسیٰ علیہ السلام میں یہ وصف نہیں۔ اور اگر ان کی نبوت ثابت کرنا چاہتے ہو تو ہمیں منظور ہے مگر جن دلائل سے ان کی نبوت ثابت کرتے ہو وہ سارے دلائل محمد مصطفیٰ ﷺ میں موجود ہیں۔ اگر ان پر انجیل آئی تھی تو ان پر قرآن اترا۔ اگر ان کے ہاتھ شریف پر چند معجزات ظاہر ہوئے تو حضور علیہ السلام کے دستِ اقدس پر صدہا معجزات ظاہر ہوئے۔ غرض جن وجوہ سے تم انہیں نبی مانتے ہو انہی سے انہیں بھی نبی مان لو۔ اس کی کیا وجہ کہ دلیل تو عام ہو اور دعویٰ خاص ہو جائے۔ اب ہماری اس تقریر کو آیت پر منطبق کرو کہ عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے انکار کے لئے الحی القیوم فرمایا گیا اور ان کی نبوت کے ساتھ حضور ﷺ کی نبوت ثابت فرمانے کے لئے پہلے فرمایا گیا نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ پھر ارشاد ہوا۔ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ۔ یعنی چونکہ نزول کتاب آپ میں اور ان میں مشترک ہے تو ضروری ہے کہ نبوت بھی مشترک ہو۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ عیسیٰ علیہ السلام نبی ہوں اور آپ نہ ہوں۔ بے شک وہ سچے نبی ہیں۔ روح اللہ ہیں مگر اے پیارے تم سید الانبیاء ہو اور حبیب اللہ ہو کیونکہ تم میں یہ خصوصیت ہے کہ تمہاری کتاب مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ساری کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ جب قرآن بڑی کتاب ہے تو قرآن والا بھی بڑا پیغمبر بڑی کتاب بڑے معلم پڑھاتے ہیں۔ **دسواں فائدہ:** اگر کسی بزرگ کے متعلق بعض لوگ حد سے بڑھ جائیں تو ان کی تردید کے لئے بزرگ کو گالیاں مت دو بلکہ حد سے بڑھنے والوں کو سمجھاؤ۔ دیکھو عیسیٰ علیہ السلام کو عیسائیوں نے خدا کا بیٹا مانا' مگر قرآن اور صاحب قرآن ﷺ نے ان کی توہین نہ کی بلکہ عیسائیوں کی تردید فرمائی۔ دیکھو اس آیت میں عیسائیوں کے مقابلہ میں فرمایا گیا کہ بے شک رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر توریت اور عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل اتاری۔ وہ حضرات بھی سچے' ان کی کتابیں بھی سچی' مگر اے بے ایمانو تم جھوٹے کہ تم نے انہیں خدا کا بیٹا مان لیا۔ اسی لئے اگلی آیت میں کفار کی برائی فرمائی گئی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ الخ اس سے اسمٰعیل کی ذریت غیر مقلد اور دیوبندیوں کو عبرت پکڑنی چاہیے۔ ان بدنصیبوں نے مسلمانوں کی تردید کیلئے حضور ﷺ کو گالیاں دیں معاذ اللہ اور تقویۃ الایمان براہین قاطعہ وغیرہ جیسی گندی و ناپاک کتابیں لکھ ڈالیں۔
گیارھواں فائدہ: نزول قرآن شریف کا بھی ہوا اور توریت و انجیل کا بھی مگر ان کے نزولوں میں چند طرح فرق ہے۔ ایک یہ کہ نزول قرآن پڑھ کر ہے اور ان کتابوں کا نزول لکھا ہوا۔ اس لئے اسے قرآن کہتے ہیں۔ ان کتب کا نام قرآن نہیں۔ دوسرا یہ کہ ان کتب کے نزول کے لئے جگہ مقرر تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر بلا کر توریت دی گئی۔ مگر نزول قرآن کے لئے کوئی جگہ مقرر نہیں۔ مکہ معظمہ کے کوچہ و بازاروں میں مدینہ پاک کے دشت و آبادی میں نزول ہوتا رہا۔ تیسرا یہ کہ توریت و انجیل کے نزول کے لئے وقت مقرر کہ فلاں مہینہ فلاں تاریخ میں توریت دی گئی مگر نزول قرآن کے لئے کوئی وقت مقرر نہ ہوا۔ دن رات حضور ﷺ کے ہر حال میں حتیٰ کہ بستر پر آرام فرماتے آیات قرآنیہ نازل ہوتی تھیں۔ اس لئے

اگرچہ چودہ سو برس کا زمانہ گذر چکا، مگر ان کے فتوحات ان کی قوم یعنی مسلمانوں کے پاس رہی یہ ہے بقاء اللہ کا ظہور، ۵۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ میں حرف ۱۲، اسی طرح مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ، ابوبکر صدیق، عمر ابن الخطاب، عثمان ابن عفان علی ابن ابی طالب، سب میں حرف ۱۲ ہی ہیں، محمد کے زبر دوالے عدد ۳۱۴ ہیں، کہ تین میم ہیں، ہر میم کے عدد ۹۰ نوے، حاء کے ۱۰ دس دال کے ۴ چونتیس تین سو تیرہ رسولوں کی تعداد ہے، اور ایک مرسل خود حضور انور ﷺ ہیں، گویا آپ کے نام کے ایک عدد میں ایک کمال ہے، دوسرے عدد میں دوسرا کمال، ۶۔ سب کے نام ان کے ماں باپ رکھتے ہیں، لقب قوم دیتی ہے، خطاب حکومت سے ملتا ہے، مگر حضور انور ﷺ کے نام، لقب و خطاب سب رب تعالیٰ کی طرف سے ہیں، کہ عبد المطلب نے فرشتے کی بشارت سے یہ نام رکھا، (۷) دوسروں کے نام پیدائش سے ساتویں دن رکھے جاتے ہیں، مگر حضور انور ﷺ کا نام رب تعالیٰ نے عالم کی پیدائش سے پہلے عرش اعظم پر لکھا، اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضور انور ﷺ کی ولادت سے قریباً چھ سو برس پہلے اپنی قوم کو فرمایا اِسْمُہٗٓ اَحْمَدُ (صف:۶) ان کا نام پاک احمد ہے، پچھلی قومیں آپ کے نام کی برکت سے دعائیں مانگتی تھیں۔ ۸۔ کوئی شخص آپ کو محمد کہہ کر برا نہیں کہہ سکتا، اگر کہے گا تو خود اپنے منہ سے جھوٹا ہوگا، کہ انہیں کہتا تو ہے محمد لائق حمد، اور کرتا ہے برائیاں، اسی لئے کفار مکہ نے آپ کا نام مذمم رکھ کر آپ کی شان اقدس میں بکواس کی، حضور انور ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو ہم کو ہمارے رب تعالیٰ نے ان کفار کی گالیوں سے بچایا، یہ لوگ مذمم کو برا کہتے ہیں، ہوگا کوئی مذمم، ہم تو محمد ہیں، ۹۔ حضور انور ﷺ کا نام محمد بہت ہی جامع ہے، جس میں حضور انور ﷺ کے بے شمار فضائل بیان ہوگئے، آدم کے معنی تھے مٹی سے پیدا ہونے والے، ابراہیم کے معنی ہیں مہربان باپ، (اب رحیم)، نوح کے معنی ہیں خوفِ خدا سے گریہ وزاری و نوحہ کرنے والے، عیسیٰ کے معنی ہیں بہت شریف النفس کریم الطبع، ان تمام ناموں میں ایک ایک وصف کی طرف اشارہ ہے، مگر محمد کے معنی ہیں ہر طرح ہر وصف میں بے حد تعریف کئے ہوئے، اس میں حضور انور ﷺ کے لاتعداد کمالات وخوبیوں کی طرف اشارہ ہوگیا، ۱۰۔ لفظ محمد میں غیبی خبر بھی ہے کہ ہمیشہ یعنی دنیا و آخرت میں ان کی ہر جگہ ہر طرح حمد و ثناء ہوا کرے گی، اسی خبر کی صداقت ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، کہ آج بھی حضور انور ﷺ کے برابر کسی کی تعریف نہیں ہوتی، بلکہ جو حضور انور ﷺ سے وابستہ ہوگئے، ان کی بھی تعریف ہوگئی، فرش پر ان کے دھوم، عرش پر ان کے چرچے، اعلیٰ حضرت نے کیا خوب فرمایا، شعر

فرش پہ طرفہ دھوم دھام عرش پہ طرفہ چھیڑ چھاڑ — کان جدھر لگایئے تیری ہی داستان ہے

۱۱۔ محمد ایسا اچھوتا نام ہے، کہ رب تعالیٰ نے کسی نبی کو نہ دیا، حضور انور ﷺ ہی کے لئے منتخب فرمایا، بلکہ حضور انور ﷺ سے پہلے کسی اور عام انسان کا نام بھی محمد نہ ہوا، لسان العرب سے اتنا ثابت ہوتا ہے، کہ حضور انور ﷺ سے پہلے سات آدمیوں نے اپنے بچوں کے نام محمد رکھے، اس امید پر کہ نبی آخر الزمان وہ ہی ہوں، مگر وہ لوگ اس نام میں مشہور ہی نہ ہوئے، شعر

ذات ہوئی انتخاب وصف ہوئے لاجواب — نام ہوا مصطفیٰ تم پہ کروڑوں درود

۱۲۔ جو اپنے بیٹے کا نام محبت میں محمد رکھے، اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا، فرمائے گا کہ مجھے ایسے شخص کو عذاب دیتے شرم آتی

ہے جس نے میرے محبوب کی محبت میں اپنے بیٹے کا نام محمد رکھا تھا، ۱۳۔ جس دستر خوان پر محمد نام کا مسلمان ہو اس کھانے میں برکت ہوتی ہے، ۱۴۔ جس کا نام محمد ہو اس کا بھی احترام کرنا چاہیے اور اس کے نام کا بھی، کہ یہ نام بگاڑ کر نہ لے، چنانچہ تفسیر روح البیان نے سورۂ احزاب مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ (احزاب: ۴۰) کی تفسیر میں فرمایا کہ سلطان محمود غزنوی نے ایک بار ایاز کے بیٹے کو پکارا، اے ایاز کے بیٹے! استنجے کے لئے پانی لا، ایاز نے تھوڑے دنوں بعد عرض کیا، کہ حضور مجھ سے یا اس سے کیا قصور ہوا کہ آپ نے اس کا نام نہ لیا؟ فرمایا تیرے بیٹے کا نام محمد ہے، میں اس دن بے وضو تھا، میں نے کبھی بغیر وضو محمد نام کو اپنی زبان سے ادا نہ کیا، شعر

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

اسی روح البیان میں اسی جگہ ہے کہ ایک اسرائیلی سو برس کا گنہگار تھا، بعد موت اسے لوگوں نے گھورے (روڑی) پر ڈال دیا، رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو وحی کی، کہ میرے اس بندے کو غسل، کفن، نماز کے بعد دفن کرو، اس نے ایک بار توریت میں محمد نام دیکھ کر اسے بوسہ دیا تھا، آنکھوں سے لگایا تھا، ہم نے اس کے گناہ معاف فرما دیئے، (روح البیان سورۂ احزاب) ۱۵۔ جس شخص کے لڑکیاں ہی ہوتی ہوں بیٹا نہ ہو، وہ شروع زمانہ حمل میں اپنی بیوی کے پیٹ پر انگلی سے یہ عبارت لکھ دیا کرے مَنْ كَانَ فِي هٰذَا الْبَطْنِ فَاِسْمُهٗ مُحَمَّد، جو اس پیٹ میں ہے اس کا نام محمد ہے، انشاء اللہ بیٹا ہوگا، اور زندگی والا ہوگا، یہ عمل مجرب ہے، مگر حمل کے چار ماہ کے اندر یہ عمل چالیس دن تک کرے، (۱۶) سکھوں کے گورونانک صاحب نے محمد کے متعلق ایک عجیب بات بیان کی، وہ کہتے ہیں، شعر

نام لیو جس چیش کا کرو چوگنا تاء دو ملاؤ پچگن کرو کاٹو بیس بنا

نانک بچے سونو گنے دو اس میں اور ملا اس بد ہر کے نام سے نام محمد بنا

یعنی کسی نام کے عدد نکال کر انہیں چوگنا کرو، پھر دو ملا کر پنج گنا کرو، پھر اس مجموعہ سے بیس بیس نکالتے چلے جاؤ، جو بچیں کہ بیس ان سے نہ نکل سکیں، انہیں نو گنا کرے، دو اور ملاؤ تو ۹۲ کا عدد حاصل ہوگا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ عالم کی اصل ہیں، کہ سب کچھ انہیں کے نور سے بنا، غرضکہ لفظ محمد بڑی خوبیوں والا نام ہے، اس نام کو لے کر سو برس کا کافر، گنہگار، مومن متقی بن جاتا ہے، جب نام کا فیض یہ ہے تو نام والے کا فیض کیسا ہوگا؟ شعر

چو نام ایں ست نام آور چہ باشد گرامی تر بود از ہرچہ باشد

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** مومن کو ہر نیک کام میں استقامت چاہیے، کسی خوشی و غم میں اپنے راستہ سے نہ ہٹے، دیکھو مسلمانوں کے لئے سب سے بڑی مصیبت حضور انور ﷺ کی وفات تھی، فرمایا گیا کہ اس وفات سے اپنی راہ سے نہ ہٹنا اس کے لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی شریف اعلیٰ درجہ کا نمونہ ہے، کہ حضور

یوں کہو کہ وہ سب اللہ کے پیارے بندے' اور اس کے رسول سچے ہیں۔ بندگی وہ رشتہ اور تعلق ہے جو مخلوق و خالق میں قائم ہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ حضور سید عالم ﷺ کا مخلوق سے ظاہری رشتہ لباس بشریت کا اثر تھا۔ ورنہ حقیقت محمد یہ کا نہ کوئی باپ ہے نہ بیٹا' نہ بھائی' نہ بھتیجا' مغز کے احکام اور ہیں پوست کے کچھ اور (مثنوی شریف) اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس مضمون کو کیا خوب ادا فرمایا۔

وہ شرف کہ قطع ہیں نسبتیں وہ کرم کہ سب سے قریب ہیں کوئی کہہ دو یاس و امید سے وہ کہیں نہیں وہ کہاں نہیں ہیں

بعض اولیاء اللہ پر حالت وجدان طاری ہوتی ہے تو تمام عالم سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

خیال رهے کہ انسان کا نفس گویا زمین ہے اور روح گویا آسمان انبیائے کرام رحمت کا بادل۔ آسمانی کتابیں گویا بارش۔ جیسے زمین پر آسمان کی مدد سے بارش کے ذریعہ پھل پھول پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے ہی نفس پر روح کے ذریعہ انبیائے کرام کی تعلیم کی برکت سے ایمان عرفان اور تقویٰ پرہیزگاری کے باغ کھلتے ہیں۔ فرشتوں میں صرف آسمان یعنی روح ہے۔ زمین یعنی نفس نہیں۔ اسی لئے ان کے پاس اعمال کی کھیتی نہیں۔ اور ان کے اعمال پر جزا نہیں انسان کے پاس چونکہ نفس بھی ہے اسی لئے اس کے اعمال قابل جزا ہیں جیسا کہ ایک بارش سے زمین پر مختلف پھول کھلتے ہیں۔ ایسا ہی بارش قرآن سے زمین نفس پر رنگ برنگے مختلف پھل پھول پیدا ہوئے۔ صدیق' فاروق' عثمان غنی' حیدر کرار اولیاء و اقطاب ان کے نفوس میں قدرت نے جیسا تخم امانت رکھا تھا۔ قرآن کی بارش سے ویسے ہی ان پر باغ لگے۔ اور یہ بھی خیال رکھو کہ اخیری بارش پچھلی ساری بارشوں کا تتمہ ہوتی ہے اگر یہ نہ ہو تو وہ سب برباد۔ اب اس آیت کا مطلب سمجھو کہ رب تعالیٰ نے زمین نفس پر توریت و انجیل وغیرہ کی بارش بھیجی۔ پھر جب یہ کھیتی پکنے کے قریب آئی تو اس پر قرآن کی بارش برسائی جو مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ہے۔ یعنی گزشتہ کتابوں کی تکمیل اور تصدیق اسی بارش سے ہوئی جو یہودی یا عیسائی قرآن کی تعلیم سے الگ رہ کر صرف انجیل پر قناعت کئے رہا اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کسی کے کھیت کو اگلی بارشیں ملیں پچھلی نہ ملیں۔ جس سے کھیت جل کر تباہ ہو جائے۔ ہاں کچھ ترکاریاں اور کچی کھیتیاں بھی تھیں وہ بھی تھیں جو اسی زمانہ میں کٹ گئیں مگر اب بغیر اطاعت مصطفیٰ ﷺ کوئی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ یہاں رب تعالیٰ نے تنزیل قرآن۔ انزال توریت و انجیل' انزال فرقان کا ذکر بطور احسان بیان فرمایا۔ دنیا لیٹر بکس کی طرح ہے۔ یہاں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔ دوزخ میں جانے والے بھی یہاں ہی ہیں۔ جنت میں جانے والے بھی۔ پھر جیسے ڈاک چھانٹ کر ہر طرف کو بھیجی جاتی ہے۔ ایسے ہی رب تعالیٰ انسانوں کو چھانٹ کر جنت دوزخ میں بھیجے گا۔ اب جو چیز چھانٹ پیدا کرنے والی ہے۔ اسی کو فرقان کہا جاتا ہے۔ کتاب اللہ معجزات نبی۔ ان کے فرمان عالیہ سب فرقان ہیں۔ ان ہی سے جنت دوزخ کے لوگوں میں فرق ہوتا ہے جو انہیں مان گیا جنتی ہے جو انکاری ہے دوزخی ہے۔ صدیق زندیق ابوجہل وغیرہ ہیں۔ ان ہی چیزوں نے چھانٹ فرمائی۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ④

تحقیق وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ساتھ آیتوں اللہ کے واسطے ان کے عذاب ہے سخت اور اللہ غالب بدلہ والا ہے

جواب: اس سوال کا تفصیلی جواب ہم تیسرے پارہ کی تفسیر حیات مسیح کے مسئلہ میں زیر آیت اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى (آل عمران: ۵۵) دے چکے ہیں، یہاں اتنا سمجھ لو، کہ خَلَتْ خلوٌ سے بنا، خلو کے معنی موت نہیں بلکہ علیحدگی اور خالی ہونا ہیں، اسی لئے بیت الخلاء پاخانہ کو کہتے ہیں، نہ کہ پھانسی گھر کو، لہٰذا اس کے معنی ہوئے گذر گئے، گذرنے سے مرجانا لازم نہیں، گذشتہ انبیائے کرام کا دین منسوخ ہو جانا، ان کا دنیا سے روپوش ہو جانا، خواہ موت سے ہو یا کسی اور ذریعہ سے، یہ ہی ان کا گذر جانا ہے، دوسری آیات میں عیسیٰ علیہ السلام کی حیات صراحۃً مذکور ہے جو ہم تیسرے پارہ میں پیش کر چکے ہیں، اگر مان بھی لیا جائے کہ یہاں خلو سے موت مراد ہے، تو بھی یہ واقعہ کلیہ نہیں، بلکہ اکثریہ ہے، چونکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں میں صرف تین چار پیغمبر ہی زندہ ہیں، اس لئے انہیں خَلَتْ فرما دیا گیا، دیکھو رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ (الدھر: ۲) ہم نے انسان کو مخلوط منی یعنی ماں باپ کے نطفے سے پیدا فرمایا، حالانکہ حضرت آدم و عیسیٰ علیہما السلام کی پیدائش نطفہ سے نہیں، وہاں عام قانون کا ذکر ہے، ایسے ہی قانون کا ذکر یہاں بھی ہے، قانون اور ہے قدرت کچھ اور، ہم قانون پر بھی ایمان رکھتے ہیں، اور رب تعالیٰ کی قدرت پر بھی بہر حال قَدْ خَلَتْ سے موت تمام انبیاء کی ثابت نہیں ہوتی، **تیسرا اعتراض:** اسی مضمون کی ایک آیت قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی ہے، مگر تم نے وہاں خلت کے معنی موت کئے ہیں، تو یہاں موت کے معنی کیوں نہیں کرتے؟ رب تعالیٰ فرماتا ہے مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (مائدہ: ۷۵) دیکھو اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا، کہ ان سے پہلے رسول گذر چکے، تم مانتے ہو کہ حضرت مسیح سے پہلے تمام رسول وفات پا چکے، تو جیسے تم عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے تمام رسولوں کو وفات یافتہ مانتے ہو، ایسے ہی حضور انور ﷺ سے پہلے تمام رسولوں کو مان لو،

نوٹ: مولوی محمد علی صاحب لاہوری مرزائی نے بہت فخر سے یہ دلیل اپنی تفسیر بیان القرآن میں پیش کی ہے، **جواب:** معلوم ہوتا ہے کہ معترض کو ہمارے مذہب کا یا تو پتہ نہیں، یا اگر ہے، تو وہ دیدہ دانستہ دھوکا کھا رہے ہیں، جناب! ہم چار پیغمبروں کو زندہ مانتے ہیں، دو کو آسمان میں، حضرت ادریس و عیسیٰ علیہما السلام اور دو کو زمین میں حضرت الیاس و خضر علیہما السلام، حضرت ادریس، الیاس اور خضر علیہم السلام یہ تینوں پیغمبر حضرت عیسیٰ سے پہلے کے پیغمبر ہیں، لہٰذا وہاں بھی خلت کے معنی ہیں گذر گئے، وفات پانے یا مرجانے کے معنی وہاں بھی نہیں ہیں، بہر حال یہ دلیل نہایت ہی کمزور ہے، **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور انور ﷺ کا ادب و احترام اور آپ سے نفع، یہ تمام چیزیں آپ کی حیات شریف میں ہی تھیں، بعد وفات تمام فیوضات و برکات ختم ہو چکے، اب آپ سے کسی کو کچھ فائدہ نہیں، دوسرے مردوں کی طرح آپ بھی ہیں، **جواب:** آپ کی یہ بکواس اس آیت کے کسی لفظ سے ثابت نہیں، یہاں ذکر صرف وفات کا ہے، باقی بعد وفات فیوض بند ہو جانے کا ذکر یہاں تو کیا کسی آیت میں بھی نہیں، اگر حضور انور ﷺ کے فیوض وفات کے بعد بند ہو چکے، تو اب ان کے نام کا کلمہ کیوں پڑھتے ہو، یہ بھی تو حضور انور ﷺ کا ہی فیض ہے، کہ ان کے نام سے کافروں کو ایمان مل جاتا ہے، رب تعالیٰ نے فرمایا وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء: ۱۰۷) جب حضور انور ﷺ تمام جہانوں کے

سمجھے ہوئے تھے۔ اس لئے رب نے اس آیۃ کو ان سے شروع فرمایا اِنَّ دَفعِ شک کے موقعہ پر بولا جاتا ہے۔ الذین سے یا تو وہ عیسائی مراد ہیں جن سے مناظرہ ہوا تھا جیسا کہ پچھلے شانِ نزول سے ظاہر ہے یا سارے کفار جیسا کہ لفظ کے عموم سے معلوم ہوتا ہے۔ کفر کے یا لغوی معنی مراد ہیں۔ یعنی انکار کرنا یا اصطلاحی معنیٰ ب صلہ کی ہے نہ کہ تعدیہ کی۔ آیات جمع آیت کی ہے۔ بمعنی نشانی۔ اس کی اضافت یا تو جنسی ہے اور اس سے گذشتہ کتابیں۔ یا انبیائے کرام کے معجزات یا قرآن پاک کی آیتیں یا ساری چیزیں مراد ہیں کیونکہ یہ سب رب کی نشانیاں ہیں۔ یا اضافت عہدی ہے اور اس سے توریت وانجیل کی وہ آیتیں مراد ہیں جن میں نبی آخر الزماں کی بشارت دی گئی تھی۔ آیات کو ذات کی طرف نسبت کرنے میں ان کے کفر کا بیان ہے۔ یعنی یہ عیسائی یا وہ سارے کفار جنہوں نے رب کی ساری نشانیوں کا یا توریت وانجیل کی ان خاص آیتوں کا یا حضور ﷺ کے قائم کردہ دلائل کا انکار کیا۔ انکار آیات کی چند صورتیں ہیں یا تو الفاظ آیات کا ہی انکار کر دیا جائے یا مضمون آیات کا انکار ہو یا ان احکام کا انکار ہو جس پر امت کا اجماع ہو وہ لوگ ان تینوں قسم کا انکار کرتے تھے۔ بعض آیات انہوں نے بدل دی تھیں۔ بعض کی غلط تاویلیں کرتے تھے۔ حضور ﷺ کی نعت والی آیتوں کو حضور انور ﷺ پر چسپاں نہیں مانتے تھے۔ آج مسلمانوں کے اندر آخری دو انکاروں کی بیماری پیدا ہو گئی ہے۔ وہ بھی اس سے عبرت پکڑیں ہمیشہ قرآنی آیات کا وہ ہی مطلب سمجھو جو چودہ سو برس سے آج تک عام مومنین سمجھتے آئے۔ خاتم النبیین کے معنی آخری نبی ہی ہیں۔ اَقِیمُو الصَّلٰوۃَ میں صلٰوۃ کے معنی نماز ہی ہیں۔ تو وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ۔ لَهُمْ خبر مقدم ہے اور عذاب مبتداء مؤخر اور یہ جملہ ان کی خبر عذاب کی تنوین عظمت کے لئے اور شدید کی تنوین شدت کے لئے ہے۔ اسی لحاظ سے حصر کیا گیا۔ معنی یہ ہوئے کہ خاص ایسے ہی کافروں کے لئے جو جان بوجھ کر آیات کا انکار کریں۔ بڑا ہی سخت عذاب ہے جس کی شدت سوا رب کے کوئی نہیں جان سکتا۔ رہے بے خبر کافران کے لئے عذاب تو ہے مگر اتنا سخت نہیں۔ (معانی وروح) غرضکہ سرداران کفر کا عذاب سخت ہے بے خبری میں کافر ہونے والوں کا عذاب ہلکا یا یہ حصر گنہگار مسلمانوں کے لحاظ سے ہے۔ تو معنی یہ ہوئے کہ کفار ہی کو سخت عذاب ہوگا۔ رہے گنہگار مومن اگر انہیں عذاب ہوا تو ہلکا ہوگا کہ اس کا عذاب عارضی ہوگا۔ کافر کا دائمی اس کی پردہ پوشی ہوگی' کہ کسی کو خبر نہ ہوگی کہ کوئی عذاب پا رہا ہے۔ کافر کی پردہ دری ہوگی۔ اسے غذائیں یعنی کفار کا پیشاب' پاخانہ' خون' پیپ کھانے کو نہ دیا جائے گا کہ اس کے منہ میں کبھی اللہ تعالیٰ ورسول ﷺ کا نام تو آتا تھا۔ کافر کو دیا جائے گا۔ مومن کو چاہیے کہ اپنا منہ زبانی گندی باتوں سے محفوظ رکھے کہ یہاں اللہ تعالیٰ ورسول اللہ ﷺ کا ذکر آتا ہے۔ رب تعالیٰ نے انسان کو ان کے پیٹ میں حیض کا خون منہ سے نہ پلایا بلکہ ناف سے پہنچایا۔ کہ اس کا منہ گندگی سے محفوظ رہے۔ تو ہم کو احتیاط لازم ہے۔ مومن کا منہ بہت ہی حرمت والا ہے۔ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ ذُوانتِقَام۔ یہ مستقل جملہ ہے۔ پہلے جملہ کی تائید کرتا ہے۔ عَزِیزٌ عزٌ سے بنا بمعنی غلبہ تام۔ عزیز وہ غالب جو کسی سے مغلوب نہ ہو۔ انتقام نقمۃ کا باب افتعال ہے اس کے معنی غلبہ' قبضہ' سزا اور تکلیف ہے۔ نَقمَةٌ باب ضَرَبَ يَضرِبُ سے ہے۔ قرآن فرماتا ہے وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ اِلَّا اَنْ يُّؤْمِنُوا الخ (البروج:۸) اور فرماتا ہے وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا (اعراف:۱۲۶) بدلہ کو انتقام اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں سزا دی جاتی ہے اگرچہ ذوانتقام اور منتقم کے معنی قریباً یکساں ہیں مگر ذوانتقام میں زیادہ مبالغہ ہے۔ صاحب سیف وہ ہی کہلائے گا جس سے اکثر قتل واقعہ ہو۔ نہ وہ کہ جس کے پاس

تلوار ہو۔ یعنی اللہ غالب ہے۔ اسے کوئی مغلوب نہیں کرسکتا اور دشمنوں سے سخت بدلہ لینے والا ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ یہ خبر عذاب شدید کی تحقیق کے لئے ہے یعنی رب تعالیٰ کا عذاب سخت بھی ہے اور بہت بڑا بھی کیونکہ وہ رب سب پر غالب ہے کوئی اسے مجرم کو سخت عذاب دینے سے روک نہیں سکتا اور جیسے وہ کرم کرنے والا ہے ایسے ہی بدلہ لینے والا بھی باغی کو یوں چھوڑ دینا بھی لاقانونی ہے بڑا حاکم ہی بڑی سزا دے سکتا ہے۔ معمولی حاکم پھانسی کی سزا نہیں دے سکتا اور انتقام فرما کر یہ بتایا کہ رب بغیر جرم کے کسی کو سزا نہیں دیتا۔ بدلہ میں سزا دیتا ہے' مجرم کی سزا کا بدلہ دنیا میں بھی ہوتا ہے۔ برزخ میں بھی حشر میں بھی آخرت میں کفار کے لئے دنیاوی مصیبتیں بھی عذاب ہیں مومن کے لئے رحمت۔ یہ جملہ گویا معترضہ تھا اب پھر اصل مضمون کی طرف رجوع ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ۔ یہ نیا جملہ ہے جس میں رب تعالیٰ کی وسعت علم کا ذکر ہے۔ چونکہ بعض لوگ اس کے علم یا وسعت علم کے منکر تھے۔ اس لئے اسے اِنَّ سے شروع فرمایا گیا۔ لَا يَخْفٰى ۔ خفاءٌ سے بنا۔ بمعنی پوشیدگی اور چھپنا۔ اس کا مقابل ظہور ہے۔ پوشیدگی کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک تو شے کا فی الحال موجود نہ ہونا۔ دوسرے پردہ میں ہونا۔ یہاں دونوں کی نفی ہے کہ خدا کے علم کے لئے نہ عدم مانع ہے نہ پردہ نہ کوئی اور آڑ۔ خیال رہے کہ لَا يَخْفٰى یہاں دوام واستمرار کے لئے ہے۔ یعنی کبھی نہیں چھپتا۔ علیہ يَخْفٰى کے متعلق ہے اور شَيْءٌ اس کا فاعل۔ شَيْءٌ موجود کو بھی کہتے ہیں۔ ممکن کو بھی اور معلوم کو بھی مگر یہاں موجود یا ممکن مراد ہے کیونکہ غیر مخفی یعنی ظاہر ہونا۔ اس ہی کی شان ہے نہ کہ ناممکنات کی۔ رب کو معلوم تو ہر چیز ہے مگر غیر مخفی یعنی ظاہر۔ صرف موجودات یا ممکنات ہیں۔ فِي الْاَرْضِ ثابت پوشیدہ کے متعلق ہو کر شَيْءٌ کی صفت ہے۔ لا تاکید کی نفی کے لئے دوبارہ لایا گیا اور فِي السَّمَآءِ بھی شَيْءٌ کی صفت۔ بعض لوگوں نے فرمایا کہ یہ دونوں جار مجرور لَا يَخْفٰى کے متعلق ہیں چونکہ انسان کو بمقابلہ آسمان کے زمین کا زیادہ علم ہے اس لئے یہاں زمین کا ذکر پہلے ہوا اور آسمان کا بعد میں اور چونکہ عالم اجسام کے دو ہی کنارے ہیں۔ زمین و آسمان۔ اس لئے اس سے مراد عالم اجسام کی ساری چیزیں ہیں۔ یعنی رب تعالیٰ پر کوئی چھوٹی بڑی گذشتہ موجودہ اور آئندہ چیز بھی پوشیدہ نہیں۔ سب کچھ ظاہر ہے۔ اب اظہار قدرت کے لئے فرمایا جاتا ہے۔ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ۔ هُوَ سے ذات الٰہی مراد ہے اور الَّذِيْ سے اس کی صفت۔ يُصَوِّرُ تصویر سے بنا جس کے معنی ہیں۔ صورت بخشنا۔ ظاہر چیز کو دیکھ کر جانا جاتا ہے اور اچھی چیز کو اس کے علامات و آثار سے بھی جانا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ کی ذات تمام غیبوں سے بڑھ کر غیب ہے۔ اس لئے اسے اس کی قدرت و صنعتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ هُوَ الَّذِيْ فرما کر یہ بتایا کہ اگر تم اس نادیدہ کو جاننا پہچاننا چاہتے ہو تو خود اپنے کو دیکھو تم بذات خود اس کی معرفت کی کتاب ہو وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذاریات:۲۱) صورت لغت میں صار یصور کا مصدر ہے بمعنی مائل ہونا اور مائل کرنا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ (بقرہ:۲۶۰) صور کو اسی لئے صور کہتے ہیں کہ تمام مخلوق اس کی آواز پر اس کی طرف مائل ہوگی۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ (الکہف:۹۹) اور صیر ضرب یضرب سے بمعنی مائل کرنا اور منقلب ہونا ہے۔ اصطلاح میں صورت اس ہیئت کا نام ہے جو ترتیب اجزاء سے حاصل ہو یعنی شکل چونکہ یہ بھی اجزاء کے ایک دوسرے کی طرف میلان سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے اسے صورت کہا جاتا ہے۔ ارحام جمع رحم کی ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں مہربانی اور رقت قلبی۔ اسی سے رحمت ہے عورت کی بچہ دانی کو اسی لئے رحم کہتے ہیں کہ وہ

آیت میں نبی کریم ﷺ کی وفات کی خبر اشارۃً دی گئی، اب فرمایا جارہا ہے کہ چونکہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا، اس لیے انہیں رب تعالیٰ نے محفوظ رکھا، ورنہ وفات یا قتل کے سارے اسباب جمع ہو چکے تھے کہ غازیوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے، کفار نے گھیر لیا تھا، بھرپور حملہ کردیا تھا، اور حضور انور ﷺ کے پاس بچاؤ کا سامان کوئی نہ تھا، مگر پھر بھی محفوظ رہے، گویا پچھلی آیت میں ایک واقعہ کا اجمالی ذکر تھا اور اس آیت میں اس کا نتیجہ بیان ہورہا ہے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اشارۃً منافقین کا وہ قول نقل کیا گیا جو انہوں نے حضور انور ﷺ کی خبر شہادت سن کر کہا تھا کہ اگر آپ سچے رسول ہوتے تو شہید کیوں ہوتے یا اے مسلمانو! اب تم اسلام سے پھر جاؤ، اور فرمایا جارہا ہے کہ ہر نفس کو موت تو آتی ہے، نبی کی وفات سے دین ختم نہیں ہوجاتا۔

تفسیر

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ اس جملہ کی نحوی ترکیبیں بہت کی گئی ہیں، آسان ترکیب یہ ہے کہ کَانَ فعل ناقصہ ہے، اور اَنْ تَمُوْتَ الآیہ اس کا اسم لِنَفْسٍ ممکنًا کے متعلق ہوکر خبر مقدم، باقی دیگر ترکیبوں میں اشکال زیادہ ہے اور معنی میں پیچیدگی، حق یہ ہے کہ نفس سے مراد مطلقاً جان ہے، انسان ہو یا جانور یا جنات وغیرہ، بعض مفسرین نے بلا وجہ اس سے حضور انور ﷺ کی ذات مراد لی، اذن کے معنی حکم بھی ہیں، اجازت بھی، ارادہ بھی، علم بھی، بتانا بھی، اور چھوڑ دینا بھی، یہاں سارے ہی معنی بن سکتے ہیں، رب تعالیٰ جب کسی کی موت کا ارادہ کرلیتا ہے تو ملک الموت حضرت عزرائیل علیہ السلام کو قبض روح کا حکم دیتا ہے، اجازت دیتا ہے انہیں اس مرنے والے پر مسلط کردیتا ہے، حق یہ ہے کہ ہر ایک کی روح قبض کرنے والے صرف حضرت عزرائیل علیہ السلام اکیلے ہیں، ان کے ساتھی فرشتے قبض روح نہیں کرتے، بلکہ قبض روح کے انتظامات کرتے ہیں، جیسے ہڈی، پٹھوں، گوشت اور رگوں سے روح کو سمیٹنا، روح نکالنے کا کام صرف حضرت عزرائیل علیہ السلام کا ہی ہے، معتزلہ کہتے ہیں کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام صرف جن وانس کی جان نکالتے ہیں، بعض بے دین کہتے ہیں، کہ جانوروں کی جان حضرت عزرائیل کے خدام فرشتے نکالتے ہیں، مگر یہ سب باطل ہے حق یہی ہے، کہ ہر جاندار کی جان صرف اکیلے حضرت عزرائیل قبض کرتے ہیں، حتی کہ اپنی جان بھی خود ہی نکالیں گے (تفسیر روح المعانی)

لطیفہ: اس زمانہ کے بعض جہلاء کہتے ہیں کہ چونکہ ایک فرشتہ بیک وقت ہر جگہ نہیں پہنچ سکتا، اور اتنوں کی جان نہیں نکال سکتا، اس لئے رب تعالیٰ نے جان نکالنے کے لئے کروڑوں فرشتے مقرر کیے ہیں جن کے علاقے بٹے ہوئے ہیں، مگر یہ سب باتیں ملائکہ کی طاقت کا علم نہ رکھنے کی وجہ سے ہیں، سارا جہان ملک الموت کے سامنے دسترخوان کی طرح ہے، کہ جہاں سے چاہا لقمہ اٹھالیا، اور بیک وقت بیسیوں چاول اپنی انگلیوں میں لے لئے، انشاء اللہ اس کی پوری تحقیق اس آیت میں کی جائے گی قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (سجدہ:۱۱) **كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا** کِتٰبًا کَتَبَ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے مؤجل تاجیل سے بنا جس کا مادہ اجل ہے بمعنی مدت مقررہ، کبھی انسانی زندگی کو بھی اجل کہہ دیتے ہیں، اور کبھی موت پر یہ لفظ بولا جاتا ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ (یونس:۴۹) (اجل بمعنی موت) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی موت مقرر کرکے کتاب لوح محفوظ میں لکھ دی ہے کہ کون، کب، کہاں اور کس طرح مرے گا، کتاب سے مراد یا تو لوح محفوظ ہے جس میں قیامت

تک کے سارے واقعات من وعن لکھ دیئے گئے ہیں یا ہر شخص کی اپنی کتاب مراد ہے جو کاتب تقدیر نے ماں کے پیٹ میں ہی بچے کی پیشانی پر لکھ دی ہے، جس میں اس کے سارے حالات من وعن درج ہیں، یا وہ کتاب مراد ہے جو ہر سال شب قدر میں فہرست کے طور پر ملک الموت کو دے دی جاتی ہے جس میں سال بھر میں مرنے والوں کے نام، موت کی جگہ اور وقت کا ذکر ہوتا ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے، فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ (دخان: ۴) اس شب قدر میں تمام کام تقسیم کر دیئے جاتے ہیں، خیال رہے کہ اس رات میں ساری ہی فہرستیں تیار ہوتی ہیں پیدائش، موت، رزق، عمل، عزت، ذلت وغیرہ، ان میں سے ہر فہرست اس فرشتے کو ملتی ہے جس کے ذمہ یہ کام ہے، اسی لئے اس رات کو شب قدر کہتے ہیں، یعنی مقرر کرنے کی رات، انشاء اللہ اس کی پوری تحقیق سورۂ دخان میں اسی آیت کے ماتحت کی جائے گی، وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا ظاہر یہ ہے کہ مَنْ سے مراد مومن انسان ہیں، ارادہ سے مراد نیت ہے، ثواب ثوب سے بنا بمعنی لوٹنا، کپڑے کو ثوب اسی واسطے سے کہتے ہیں کہ وہ لوٹ لوٹ کر پہنا جاتا ہے یا تہ کرنے میں لوٹا جاتا ہے، اصطلاح میں ثوب کے دو معنی ہیں، کسی چیز کا اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ جانا، کہا جاتا ہے ثَابَ فُلَانٌ اِلٰى دَارِهٖ فلاں شخص اپنے گھر کو لوٹ گیا، دوسرے کسی چیز کا اپنی مقدر حالت کی طرف آ جانا جس کے لئے وہ بنی تھی، عمل کے بدلہ کو خواہ اچھا ہو یا برا، اسی لئے ثواب کہا جاتا ہے کہ وہ عمل کے نتیجہ کے طور پر انسان کی طرف لوٹ کر آتا ہے، گویا عمل خود نتیجہ کی شکل میں عمل والے کی طرف لوٹتا ہے، خیال رہے کہ انسان سمجھتا ہے میرا عمل ایک چڑیا تھی جو کرتے ہی میرے ہاتھ سے نکل گئی، مگر حقیقت یہ نہیں ہے، اس کا عمل اس کے گلے کا ہار بن جاتا ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ (اسراء: ۱۳) یعنی ہم نے ہر انسان کے اعمال کو جسے وہ پرندہ سمجھا تھا اس کے گلے لگا دیا، ثواب دنیا سے مراد یا غنیمت ہے یا دنیاوی عزت و نیک نامی وغیرہ یعنی جو کوئی جہاد وغیرہ سے صرف دنیوی فائدوں کی نیت کرے گا تو نُؤْتِهِ مِنْهَا ہ ضمیر کا مرجع مَنْ ہے، اور مِنْهَا کی ضمیر دنیا کی طرف لوٹتی ہے، یعنی ہم اسے دنیا میں سے ہی کچھ دے دیں گے، اس طرح کہ یہاں کے عیش و آرام اور نعمتوں کو اس کے اعمال میں وضع کر دیں گے یا اگر چاہیں گے تو جتنا چاہیں گے اسے دنیا سے دے دیں گے، اس کی تفسیر وہ آیت ہے مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ الآیہ (اسراء: ۱۸) یہ مطلب نہیں کہ ایسے شخص کو اس کی خواہش کے مطابق دنیا دے دی جائے گی، بہت لوگ دنیا کی خاطر نماز و روزے ادا کرتے ہیں، مگر دنیا نہیں پاتے، اس جملہ میں اشارۃً ان حضرات پر عتاب ہے جو غزوۂ احد میں مسلمانوں کی فتح ہو جانے پر مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے درہ سے ہٹ گئے، جس کی وجہ سے جنگ کا نقشہ بدل گیا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ یہاں بھی مَنْ سے مراد مسلمان ہیں، کفار ثواب آخرۃ کے لئے کوئی بھی نیکی کریں، انہیں وہاں کا ثواب نہیں ملتا، ان کے اعمال برباد ہیں کہ اعمال کی قبولیت کے لئے ایمان ایسا شرط ہے جیسے نماز کے لئے وضو، ثواب آخرۃ سے مراد جنت اور وہاں کی نعمتیں ہیں، عشاق کے نزدیک رب تعالیٰ کی رضا کہ اصل ثواب یہ ہی ہے کہ پیارا راضی ہو جائے، مِنْهَا کی ضمیر آخرت کی طرف لوٹتی ہے، مِنْ ابتدائیہ ہے نہ کہ تبعیضیہ، کیوں کہ رب تعالیٰ نیت خیر والے مومن کو اس کی امید سے زیادہ ثواب دے گا نہ کہ کم، اور ہو سکتا ہے کہ یہ ضمیر بھی دنیا کی طرف راجع ہو، یعنی جو آخرت کے ثواب کی امید سے نیکیاں کرے گا، ہم اسے ثواب آخرت ضرور دیں گے یا جو آخرت کے ثواب کی

نیت سے نیکیاں کرے گا، اسے دنیا بھی ضرور دیں گے ثواب آخرۃ اس کے علاوہ، یہ تفسیر بہت بہتر ہے، اس جملہ میں ان غازیان احد کی تعریف ہے جو احد میں ثابت قدم رہے، اگر چہ آیت کا نزول خاص طور سے غزوہ احد کے متعلق ہوا، مگر تمام نیکیوں کو شامل ہے، کہ عموم عبارت کا اعتبار ہوتا ہے، نہ کہ خصوصی شان نزول کا، خیال رہے کہ آیت سے مراد قبر سے اٹھنے سے ابدالآباد تک کا زمانہ ہے، کبھی برزخی زندگی بھی آخرت میں شامل ہوتی ہے، انسان کی زندگیاں تین ہیں، دنیاوی، برزخی، اخروی، دنیاوی اور برزخی زندگیاں تو محدود ہیں، مگر اخروی زندگی غیر محدود، وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ یا تو شاکرین سے مراد یہ ہی دوسری جماعت ہے، آخرت کے لئے نیکیاں کرنے والے، تب تو یہ جملہ اس آخری جملہ کی تفسیر ہے، یا شاکرین سے وہ لوگ مراد ہیں جو محض رضاء الٰہی کے لئے فرائض سے زیادہ نیکیاں کریں، اس صورت میں یہ عاشقین کی مدح ہے، یعنی ان شاکرین کو جو آخرت کے لئے عمل کریں پورا پورا بلکہ زیادہ بدلہ عطا کریں گے، یا جو لوگ شاکر ہو کر ہماری رضاء کے جویاں ہیں ان کو وہ بدلہ دیں گے، جو ان کے خیال سے وراء ہے، بہر حال یہ جملہ شاکرین کے بڑے فضائل بیان فرما رہا ہے،

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! خیال رکھو کہ کوئی جاندار بغیر حکم الٰہی، بغیر ارادۂ خداوندی مر نہیں سکتا، ہر ایک کی موت کا وقت مقرر ہے جو لوح محفوظ میں یا اس کی پیشانی میں لکھ دیا گیا، اس سے آگے پیچھے مرنا ناممکن ہے، لہٰذا جہاد میں ثابت قدم رہنے سے کوئی مر نہیں جاتا، اور بھاگ جانے سے کوئی بچ نہیں جاتا، اگر ابھی موت نہیں آئی ہے، تو تم کتنے ہی خطرناک مقامات میں ہو، کیسی ہی دشمن کی بھیڑ میں کود جاؤ، مرو گے نہیں، اور اگر موت آگئی ہے تو خواہ تم کیسے ہی آرام کی جگہ میں ہو اور خواہ تم جہاد سے بھاگ بھی جاؤ بچ نہیں سکتے، غرضکہ ثابت قدمی مار نہیں دیتی، اور گھبراہٹ بچا نہیں لیتی، خوب یاد رکھو کہ جو شخص دنیاوی عیش و آرام پر نگاہ رکھے گا، اسی کی نیت سے جہاد وغیرہ نیک اعمال کرے گا تو اسے کچھ دنیا ہی مل جائے گی جتنی ہم چاہیں، اور جو آخرت کے ثواب کی نیت سے کرے گا، تو اسے دنیا بھی ملے گی اور آخرت بھی، ہم شکر گذار بندوں کو بہت بڑا اجر دیں گے، اور عنقریب دیں گے، لہٰذا ہمیشہ نیک اعمال میں آخرت کی نیت کیا کرو، دانہ کی نیت کرو، بھوسہ اپنے آپ مل جائے گا، حدیث شریف میں ہے کہ مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** جو کچھ عالم میں ہونے والا ہے اس سب کی تحریر پہلے ہی ہو چکی ہے جیسا کہ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا، یہاں واقعات یوں ہی اتفاقاً نہیں ہو رہے ہیں بلکہ طے شدہ پروگرام کے ماتحت ہو رہا ہے، **دوسرا فائدہ:** سال بھر کے واقعات کی فہرستیں بنا کر متعلقین فرشتوں میں تقسیم کر دی جاتی ہیں جس کے مطابق وہ فرشتے سال بھر تک عمل درآمد کرتے رہتے ہیں، جیسا کہ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** ہر شخص کے پورے حالات زندگی، رزق، زندگی و موت، سعادت، بدبختی، اس کے ماں کے پیٹ میں لکھ دی جاتی ہے، جس کے مطابق اس کی زندگی گذرتی ہے، جیسا کہ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا کی تیسری تفسیر سے معلوم ہوا، خیال رہے کہ

ترقی کرتا ہوا اسی بارگاہ تک پہنچ جاتا ہے۔ جہاں سے چلا تھا پھر اسے اس کے قلب میں روح خاص پھونکی جاتی ہے۔ جسے روح القدس کہہ سکتے ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (مؤمن: ۱۵) نیز فرماتا ہے کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (مجادلۃ: ۲۲) جب اس میں یہ روح پھکتی ہے تب یہ اپنے وقت کا آدم ہوتا ہے اور تمام ملائکہ کا گویا مسجود (روح البیان) جیسے ایک ہی رحم سے مختلف اولاد پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایک ہی تعلیم سے مریدین کے مختلف حالات ہوتے ہیں۔ نگاہِ مصطفوی (ﷺ) ایک ہی تھا مگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے درجات مختلف۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ ہماری بندگی کی سب سے بڑی دلیل ہماری مجبوری و معذوری ہے۔ بندہ خود مختار ہو کر دعویٰ خدائی کر بیٹھتا ہے اور اپنی ناکامی و مجبوری دیکھ کر بندہ بنتا ہے۔ فرعون جب طوفان میں پھنسا تو بولا اٰمَنْتُ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ۔ (یونس ۹۰) ہم اگرچہ دوران زندگی میں کچھ مختار بھی ہیں مگر پیدائش و موت میں محض مجبور کہ جب چاہا، جیسا چاہا رب نے بنا دیا وہاں ہماری تدبیر کو دخل نہیں اور جب چاہا جس طرح چاہا بلا لیا کوئی تدبیر و علاج موت پر مفید نہیں ہوتا۔ انسان اپنی ابتدائی و انتہائی مجبوریوں پر نظر رکھے تو گناہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ

وہ اللہ وہ ہے جس نے اتارا اوپر آپ کے اس کتاب کو اس میں سے بعض آیتیں مضبوط کی ہوئی ہیں وہ اصل کتاب ہیں اور دوسری

وہ ہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری اس کی کچھ آیتیں صاف معنی رکھتی ہیں وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری وہ

مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ

متشابہ والی پس لیکن وہ لوگ کہ بیچ دلوں ان کے کجی ہے پس پیچھے پڑتے ہیں وہ ان کے جو متشابہ رکھتی ہیں اس میں سے تلاش کرنے

ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے وہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اشتباہ والی کے پیچھے پڑتے ہیں

الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ؔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ

والے فتنہ اور تلاش کرنے تاویل کو اس کی اور نہیں جانتا ہے تاویل اس کی کوئی سوا اللہ کے اور مضبوط لوگ ہیں بیچ علم کے

گمراہی چاہنے اور اس کا پہلو ڈھونڈنے کو اور اس کا ٹھیک پہلو اللہ ہی کو معلوم ہے اور پختہ علم والے

یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

کہتے ہیں کہ ایمان لائے ہم ساتھ اس کے سب پاس سے ہے رب ہمارے کے اور نہیں نصیحت پکڑتے مگر عقل والے

کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کے پاس سے ہے اور نصیحت نہیں مانتے مگر عقل والے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** مناظرہ کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ (۱) اپنے دلائل (۲)

نیکیوں سے عمر بڑھتی ہے، جیسے مرض اور دوا دونوں لوح محفوظ میں تحریر ہیں کہ فلاں شخص فلاں تاریخ بیمار ہوگا اور فلاں دوا سے شفا پائے گا، ایسے ہی وہاں یہ موجود ہے کہ فلاں شخص فلاں نیکی کرے گا اور اس قدر عمر پائے گا یا فلاں کی دعا سے اس کی یہ بگڑی بنے گی غرضکہ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا میں یہ سب چیزیں موجود ہیں، لہٰذا حدیث وقرآن میں تعارض نہیں۔ **دوسرا اعتراض:** تم نے کہا کہ ہر جاندار کی جان حضرت عزرائیل نکالتے ہیں، حالانکہ رب تعالیٰ فرماتا ہے تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (انعام:۶۱) ہمارے بہت سے فرشتے اسے موت دیتے ہیں، اس سے پتہ لگتا ہے کہ موت کے فرشتے بہت ہیں۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں عرض کیا جاچکا کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام جان نکالتے ہیں ان کے مددگار فرشتے ان کا تعاون کرتے ہیں، جیسے آپریشن بڑا ڈاکٹر کرتا ہے، مگر دوسرے کمپوڈر وغیرہ اس کا تعاون کرتے ہیں، اس لئے دوسرے مقام پر ارشاد ہے قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (السجدہ:۱۱) اگر یہ مطلب نہ ہو تو ان دونوں آیتوں میں تعارض ہوگا۔ **تیسرا اعتراض:** تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا، کہ تمام کی روح ملک الموت ہی قبض کرتے ہیں، مگر حضرت جریر ابن عبد اللہ کی روایت میں ہے کہ دریا کے شہید کی جان خود رب تعالیٰ قبض فرماتا ہے، وہ حدیث اس تفسیر کے خلاف ہے۔ **جواب:** وہاں اضافت اور نسبت تشریفی ہے یا حقیقۃً فاعل مراد ہے، کہ تمام کاموں کا فاعل حقیقی رب تعالیٰ ہے، خود رب تعالیٰ فرماتا ہے وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ (انعام:۶۰) الخ اور فرماتا ہے اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا (زمر:۴۲) **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ نیک اعمال میں آخرت کے ثواب کی نیت چاہیے، دنیا کی نیت نہ کرے، مگر بعض نمازیں بارش، حاجت کے لئے پڑھی جاتی ہیں، ایسے ہی بہت سے وظیفے، عملیات بھی دنیاوی مقاصد کے لئے پڑھے جاتے ہیں وہ سب ان آیات کے خلاف ہیں۔ **جواب:** یہ اعمال بھی رضائے الٰہی کے لئے کرنے چاہئیں، خیال یہ کرے کہ اس کے طفیل رب تعالیٰ ہمارا کام بھی کردے، جیسے جہاد رضائے الٰہی کے لئے کرے، پھر غنیمت اور فتح ملک بھی مل جاتے ہیں، لہٰذا وہ احادیث اس آیت کے خلاف نہیں، ہم کو دعا کی تعلیم خود رب تعالیٰ نے دی رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (بقرہ:۲۰۱) رب تعالیٰ سے دنیا بھی مانگو، آخرت بھی، یہاں ان کی برائی ہو رہی ہے جو رب تعالیٰ سے صرف دنیا مانگیں، آخرت نہ مانگیں یا نیک اعمال سے صرف دنیا کی نیت کریں،

تفسیر صوفیانہ

دنیا میں تین قسم کے لوگ ہیں، طالب دنیا، طالب آخرت، طالب مولا، طالب دنیا کا ثواب صرف دنیا ہے، آخرت میں اسے کچھ نہیں ملتا، طالب آخرت کا ثواب آخرت میں ملے گا، مگر طالب مولا کا ثواب دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (حدید:۴) بندے کو چاہیے کہ طالب مولا ہو، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ بعض لوگ دنیا میں رہتے ہیں، اور بعض لوگوں میں دنیا رہتی ہے، جن میں دنیا رہے وہ غرق ہوں گے، اور جو دنیا میں رہیں وہ پار لگیں گے، جو کشتی دریا میں رہے پار لگے گی، جس کشتی میں دریا آجائے وہ ڈوبے گی، عصر کے وقت نمازی کے آگے سورج ہوتا ہے، اور سورج کے پجاری بھی سورج ہی کے آگے سجدے کرتے ہیں، مگر نمازی مسلمان اس سجدے سے مشرک نہیں متقی بن جاتا ہے،

سورج پرست اس سجدے سے مشرک ہو جاتا ہے، کیونکہ اگرچہ مومن کے آگے بھی سورج ہے، مگر اس کا مقصود رب تعالیٰ ہے، مشرک کا مقصود سورج ہے، موجود ہونے اور مقصود ہونے میں بڑا فرق ہے، مومن کا مقصود اللہ ہے، منافق کا مقصود دنیا، اگرچہ دونوں کے سامنے دنیا موجود تو ہے، مگر مومن کی مقصود نہیں، اللہ تعالیٰ نیت خیر نصیب کرے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ
اور بہت سے نبی جن کے ساتھ جہاد کیا بہت سے اللہ والوں نے
اور کتنے ہی انبیا نے جہاد کیا ان کے ساتھ بہت خدا والے تھے
فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا
پس نہ سست پڑے اس وجہ سے جو انہیں پہنچی اللہ کی راہ میں اور نہ
تو سست نہ پڑے ان مصیبتوں سے جو اللہ کی راہ میں انہیں پہنچیں اور نہ
ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾
ضعیف و ناتواں ہوئے اور نہ دبے اور اللہ پسند فرماتا ہے صبر والوں کو
کمزور ہوئے اور نہ دبے اور صبر والے اللہ کو محبوب ہیں

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیات میں غازیان اسلام کو اخروی نعمتوں کا ذکر سنا کر انہیں بہادر و دلیر بنایا گیا، اب گذشتہ انبیائے کرام کے غازی امتیوں کا ذکر سنا کر انہیں بہادری کا سبق پڑھایا جا رہا ہے، کہ بہادر سپاہیوں کو کبھی لالچ دے کر کبھی دوسروں کی مثال دے کر دلیر کیا جاتا ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں مخلصین شاکرین کی جزاء و ثواب کا ذکر تھا، اب اسی جزاء ثواب کے مستحقین کا تذکرہ ہے کہ پچھلی امتوں میں لوگ بڑے کارنامے کر کے ان جزاؤں کے مستحق ہو گئے، منشاء یہ ہے کہ اے امت مصطفوی تم ان سے پیچھے نہ رہو، ان سے بڑھ چڑھ کر حصہ لو **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں جہاد میں بہادری کی ایک عظمت کا ذکر ہوا کہ یہ اخروی نعمتوں کا بھی ذریعہ ہے اور دنیاوی نعمتوں کا بھی، کہ اس سے فتح ملک، سلطنت، سرخروئی وغیرہ میسر ہوتی ہے، اور اس سے رضائے الٰہی، جنت وغیرہ نصیب ہوتی ہے، اب اس بہادری و استقامت کی دوسری عظمت بیان ہو رہی ہے، کہ گذشتہ نبیوں اور ان کے ساتھیوں کی سنت ہے، کسی چیز کا سنت انبیاء ہونا اس کی عظمت کی دلیل ہے، **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں ایک عقیدے کا مسئلہ بیان ہوا، کہ کوئی نفس بغیر پوری کئے نہ مرے گی، اب اس کے معتقدین کا ذکر ہے کہ گذشتہ انبیاء اور ان کے ساتھیوں کا عقیدہ یہی تھا، کہ وہ حضرات یہ عقیدہ رکھ کر میدانِ جہاد میں جاتے تھے، اور بڑے بڑے کارنامے کر دکھاتے تھے، تم نبیوں کے سردار کی امت ہو، چاہیے

انہی سے احکام نکالے جاتے ہیں اور متشابہات کو انہی کی طرف پھیرا جاتا ہے اور حرام و حلال میں ہر شخص انہیں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس لئے انہیں ام الکتاب کہا گیا۔ سوۂ فاتحہ کا نام بھی ام الکتاب ہے یہاں کتاب سے یا تو کل کتاب مراد ہے اور اضافت فی کی یعنی وہ اس قرآن میں اصل آیتیں ہیں۔ یا اس سے بعض کتاب مراد یعنی غیر محکم آیتیں۔ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ۔ اُخَرُ اُخریٰ کی جمع ہے جو آخر اسم تفضیل کی تانیث ہے۔ یہاں آیات کی صفت ہے۔ اس کے معنی ہیں بہت پیچھے رہنے والی۔ کبھی بمعنی غیر بھی بولا جاتا ہے یہاں یہ ہی معنی مراد ہیں۔ اسی لئے اس کا استعمال نہ الف لام سے ہوا نہ اضافت سے نہ من سے۔ بعض نے فرمایا کہ یہ اُخَرُ منہ سے معدول ہے۔ متشابہات تشابہ سے بنا' جس کا مادہ شبہٗ ہے۔ جس کے معنی ہیں کیفیت میں کسی کی مثل ہونا۔ اسی لئے تصویر کو شبیہ اور مثل ہونے کو مشابہت یا تشبیہ کہا جاتا ہے۔ اصطلاح میں متشابہ وہ کہلاتا ہے جو کسی کے مشابہ اس طرح ہو جائے کہ اس میں فرق نہ ہو سکے۔ یعنی یکساں' رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا (بقرہ:۷۰)۔ اور فرماتا ہے وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (بقرہ:۲۵)۔ نیز فرماتا ہے۔ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (بقرہ:۱۱۸)۔ اہل عرب کہتے ہیں اِشْتَبَهَ عَلَیَّ اِمْرَاتَانِ۔ یہاں وہ آیتیں مراد ہیں جن میں بہت سے معنی کا احتمال ہو اور کسی کو ترجیح نہ ہو۔ یا جس کے معنی سمجھ میں نہ آتے ہوں۔ یعنی محکمات کے علاوہ کچھ آیتیں ایسی ہیں جن کے معنی ظاہر نہیں۔ یا ان میں چند معنی کا احتمال ہے یا ان کی مراد رب کے سوا کسی کو نہیں معلوم۔ یا اس کی حکمت رب جانے۔ متشابہ کے شرعی معنی انشاء اللہ آئندہ بیان ہوں گے یہاں تک تو آیات کی تقسیم کی گئی۔ اب لوگوں کے حالات سنو! فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ۔ اَمَّا تفصیل کے لئے ہے اَلَّذِیْنَ سے یا تو وہ نجرانی عیسائی مراد ہیں جو روح اللہ کے لفظ سے دھوکہ دیتے تھے۔ یا وہ مشرکین ہیں جنہوں نے الٓمّٓ سے غلط مطلب حاصل کیا۔ یا منافقین۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت ابوامامہ نقل کیا کہ اس سے مراد خارجی لوگ ہیں اور ممکن ہے کہ اس سے سارے وہ بدمذہب مراد ہوں جو قرآن پاک کے غلط معنی کریں اور متشابہات کی غلط تاویلیں کریں۔ زیغ ضرب یضرب کا مصدر ہے۔ بمعنی جھک جانا۔ مائل ہو جانا۔ اس کا مقابل استقامات ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ۔ (الصف:۵) نیز فرماتا ہے مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (النجم:۱۷) یعنی وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ٹیڑھا پن اور سیدھے راستہ سے میلان ہے۔ اگر تکلا ٹیڑھا ہو تو سوت نہیں کاتتا۔ اگر مشین کا کوئی پرزہ ٹیڑھا ہو تو ساری مشین کو بیکار کر دیتا ہے کہ پھر مشین کام نہیں کرتی۔ اگر پہیے کا دھرا ٹیڑھا ہو جائے تو تانگہ چل نہیں سکتا۔ سارا تانگہ بیکار ہوتا ہے۔ اگر راستہ ٹیڑھا ہو تو اسے اختیار کر کے کوئی سیدھے راستہ پر نہیں پہنچتا۔ ایسے ہی اگر عالم کا دل ٹیڑھا ہو تو اس کے عقیدے' اعمال' احوال سب غلط ہوتے ہیں۔ لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ ٹیڑھے دل والا عالم قرآن سے گمراہی لیتا ہے اور لوگ اس سے گمراہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ارشاد ہوا وَاَمَّا الَّذِیْنَ ٹیڑھے دل والا عالم وہ ہوتا ہے جس کی زبان پر دین دل میں دنیا ہو۔ یا جس کے دل کا رخ مدینہ طیبہ سے ہٹا ہو۔ جیسے نمازی کا رخ اگر ٹیڑھا ہو تو نماز نہیں ہوتی۔ ایسے ہی اگر عالم کے دل کا رخ ٹیڑھا ہو تو ایمان درست نہیں ہوتا اور نہ اس کی تقریر درست ہو۔ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ۔ یہ اَلَّذِیْنَ کی خبر بمعنی جزا ہے۔ اتباع کا مادہ تبع ہے۔ بمعنی پیچھے اتباع پیچھے چلنے اور پیچھے پڑنے کو کہتے ہیں جیسے فَاتَّبِعُوْنِیْ اس کا فاعل اَلَّذِیْنَ ہے مَا سے متشابہ آیات مراد ہیں۔ مِنْهُ کا مرجع کتاب اللہ ہے۔ یعنی جن کے دلوں میں کجی ہے وہ آیات محکمہ کو چھوڑ کر متشابہات کے پیچھے

لوگ اللہ کی راہ میں کمزور نہ ہوئے بلکہ قوی و بہادر رہے، وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا، اس اِسْتَكَانُوْا کا مصدر اِسْتِكَانَۃٌ ہے جس کا مادہ سَكَنٌ یا سكونٌ ہے بمعنی عاجزی و تضرع، بعض نے فرمایا کہ دلی کمزوری استکانت ہے بعض کے نزدیک دشمن کے دین کی طرف منتقل ہو جانا استکانت ہے، (کبیر) اس صورت میں اِسْتَكَانُوْا باب افتعال کا ماضی جمع مذکر غائب ہے، اصل میں اِسْتَكْنُوْا تھا الف اشباع کا ہے وَاللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ، صابرین صبر سے بنا بمعنی روکنا، اطاعت پر رکنا، گناہوں سے رکنا، آفات میں گھبراہٹ سے رکنا، یہاں تیسرے معنی مراد ہیں یعنی اللہ تعالیٰ مصیبتوں میں نہ گھبرانے والوں اور استقامت والوں کو دوست رکھتا ہے،

خلاصہ تفسیر

اے احد کے غازیو! تم تو اپنے نبی کی خبر شہادت پر گھبرا گئے، تم سے پہلے جن نبیوں نے جہاد کئے، ان کے ساتھ بڑے اللہ والوں نے شرکت کی، ان پر جہاد میں کیسی ہی مصیبت آئی، مگر وہ نہ تو سست پڑے، نہ کمزور ہوئے، نہ دشمن کے آگے دبے، پھر تم تو سید الانبیاء ﷺ کی امت ہو، تمہیں چاہیے کہ ان سے بڑھ چڑھ کر صابر و شاکر اور بہادر بنو، تاکہ کل قیامت میں تم ان سے اول نمبر رہو، تم نے احد میں کیا کیا، کہ بعض تو بھاگ پڑے، اور بعض نے ابو سفیان سے امان مانگ لینے کی خواہش کی، حالانکہ ابو سفیان بھاگ چکے تھے، بعض نے ابن ابی وغیرہ منافقین کو بیچ میں ڈالنے کی کوشش کی، آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا، اگر ہمارے پیارے بننا چاہتے ہو، تو ہر طرح کا صبر اختیار کرو، کیونکہ ہم صبر والوں سے محبت کرتے ہیں،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** افضل شخص، افضل قوم کو اعلیٰ و افضل کام کرنے چاہئیں، صرف نسب یا نسبت پر قناعت نہ کرنا چاہیے، علماء مشائخ، صوفیاء اور سادات کو چاہیے، کہ ان کے اعمال دوسرے مسلمانوں سے زیادہ اعلیٰ ہوں، بڑا انعام لینا ہے تو بڑا کارنامہ کرو، جیسا کہ اس آیت کے مقصد سے معلوم ہوا، ہیڈ ماسٹر اپنے ماتحتوں سے زیادہ قابل ہونا چاہیے، **دوسرا فائدہ:** دوسروں کے کارنامے سنا کر مسلمانوں کو جوش دلانا سنت الہیہ ہے، بلکہ اس نیت سے تاریخی حالات جاننا، سیکھنا عبادت ہے، **تیسرا فائدہ:** جہاد بڑی پرانی سنت ہے کہ اسلام سے پہلے بھی حضرات انبیاء نے کیا، جیسا کہ وَكَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ سے معلوم ہوا، لہٰذا یہ سنت ہی نہیں بلکہ فطرت بھی ہے، **چوتھا فائدہ:** سارے نبیوں کے دین میں جہاد نہ تھا، بلکہ بہت سے انبیاء کے دین میں جہاد تھا، بہت سوں کے دین میں نہ تھا دیکھو یہاں رب تعالیٰ نے كَاَیِّنْ فرمایا كُلٌّ یا جمیع نہ فرمایا، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کسی نبی پر جہاد نہ تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جہاد شروع ہوا، اور آپ کے بعد بھی کسی نبی پر جہاد فرض ہوا، کسی پر نہ ہوا، چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں جہاد نہیں، عیسائی لوگ سیاسی جنگیں کرتے ہیں مذہبی نہیں، وہ جہاد جانتے بھی نہیں، **پانچواں فائدہ:** جہاد کے لئے طاقت و قوت شرط ہے، اور فوج بھی طاقت ہی کا ایک رکن ہے، جیسا کہ رِبِّیُّوْنَ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا، کہ ان حضرات نے اکیلے جہاد نہ کیا، بلکہ آپ پر اس وقت جہاد فرض ہی نہ ہوا کہ طاقت ہی نہ تھی، **چھٹا فائدہ:** غازی مجاہدوں کو بحالت جہاد نہایت، نیک صالح ہونا، اپنا

صفات کو یقین اور قرآنی آیات کو دلائل یقینیہ سے پہچانے (کبیر) بعض نے فرمایا کہ راسخ عالم وہ جس کے دل و دماغ اور زبان پر علم نے ایسا قبضہ کرلیا ہو۔ جیسے درخت کی جڑنے زمین پر کہ زبان سے علمی تقریر کرے دماغ میں علم محفوظ رکھے اور دل میں معرفت ہو۔ بعض نے فرمایا کہ راسخ فی العلم وہ جس کا علم معرفت الٰہی کا ذریعہ ہو اور اسے علم کے ساتھ عشق بھی حاصل ہو۔ انہی کی شان میں ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر:۲۸)۔ ورنہ علم بغیر معرفت حجاب ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (جاثیہ:۲۳)۔ بعض نے فرمایا کہ جس دکان میں ترازو اور باٹ ہیں وہ دکان راسخ و مضبوط ہے اور جو ترازو سے خالی وہ کمزور۔ اسی طرح راسخ عالم وہ ہے جس کے پاس شریعت کا ترازو ہو کہ اپنے اور دوسرے کے کاموں کو اس پر تول کر عمل کرتا ہو۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں راسخ عالم ہوں۔ حضرت مجاہد نے فرمایا کہ میں ان عالموں میں سے ہوں جنہیں متشابہات کا علم ہے۔ (خزائن) تفسیر خازن نے فرمایا کہ یہاں راسخین سے وہ علماء اہل کتاب مراد ہیں جو ایمان لے آئے تھے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ سارے علمائے کاملین مراد ہیں۔ اٰمَنَّا بِهٖ۔ یَقُوْلُوْنَ کا مفعول ہے اور ضمیر کا مرجع یا کتاب ہے یا مَا تَشَابَهَ کا یعنی مضبوط علم والے متشابہات کی تاویل کے پیچھے نہیں پڑتے۔ بلکہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم متشابہات پر ایمان رکھتے ہیں اس کے جو معنی ہیں حق ہیں۔ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا۔ یہ اٰمَنَّا کی تاکید ہے كُلٌّ کا مضاف الیہ پوشیدہ ہے اور مِن کا متعلق ثبت ہے۔ جو کل کی خبر ہے یعنی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سارا قرآن یا محکم متشابہ ساری آیتیں ہمارے رب کی طرف سے ہیں۔ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ یہ رب تعالیٰ کا مقولہ ہے نہ کہ علماء کا۔ یہ نیا جملہ ہے یَذَّكَّرُ باب تفعل کا مضارع ہے۔ جس کی ت ذال میں مدغم ہو گئی۔ اولو ذو کی جمع ہے۔ الباب لب کی جمع ہے بمعنی اصل اور مغز عقل کو بھی لب اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اصل انسانیت یعنی سوا عقل والوں کے اور کوئی قرآن سے نصیحت حاصل نہیں کرتا۔

خلاصہ تفسیر

وہ اللہ ایسی قدرت والا ہے جس نے آپ پر اے محبوب ﷺ یہ قرآن اُتارا۔ جس کی سب آیتیں یکساں نہیں بلکہ بعض آیتیں محکم ہیں۔ جن کے معانی بھی صاف ہیں۔ اور ان کی مراد بھی واضح۔ یہ قرآن میں اصل آیتیں ہیں جن کی طرف حلال و حرام اور احکام شرعیہ میں رجوع کیا جاتا ہے۔ یہ ہی شریعت کی اصل ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ آیتیں متشابہ ہیں جن کے معنی واضح نہیں اور ان کا مقصود ظاہر نہیں۔ ان میں بہت اشتباہ ہے پھر لوگ بھی چند قسم کے ہیں جن کے دل میں کجی ہے اور جو سیدھے راستہ سے ہٹے ہوئے ہیں وہ تو محض فتنہ پھیلانے، قرآن کو جھٹلانے اور آیات قرآنیہ میں تعارض دکھانے کی غرض سے نیز قرآن کو اپنی رائے کے مطابق بنانے کے لئے محکم آیتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ جیسے یہ نجران کے عیسائی اور دیگر گمراہ فرقے۔ حالانکہ ان متشابہات کے حقیقی معنی اور صحیح مقصود خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا یا وہ جانے جسے اپنے کرم سے رب تعالیٰ نوازے اور علم متشابہات عطا فرمائے (خزائن وغیرہ) اور پختہ علم والے یعنی متقی پرہیز گار علماء متشابہات کے متعلق یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لے آئے۔ ان کے جو بھی معنی ہیں حق ہیں کیونکہ سارے محکمات و متشابہات ہمارے رب کی طرف سے ہیں۔ ہماری عقل میں آئیں یا نہ آئیں اور نصیحت نہیں پکڑتے مگر وہ جن کے پاس عقل کامل ہو غرضکہ اس کتاب سے تقویٰ والے ہدایت لیتے ہیں اور بے نصیب گمراہی۔ خیال رہے کہ خود رو درخت جو ریگستان،

کوہستان، چھتوں پر عارضی طور پر خود جم جاتے ہیں۔ ان میں پھل پھول نہیں لگتے۔ کچھ سبزہ دکھا کر سوکھ جاتے ہیں مگر جو پودے کسی نے زمین نرم کر کے لگائے ہیں وہ پھول بھی دیتے اور پھل بھی۔ ایسے ہی خودرو عالم جو ترجمہ قرآن شریف دیکھ کر عالم بن جاتے ہیں۔ ان سے فیض نہیں ہوتا مگر جو کسی کامل کی نگاہ کرم سے محنتیں کرنے کے بعد عالم بنتے ہیں کہ علم کی جڑ ان کے دلوں میں قائم ہوتی ہے اور اس کی شاخیں ان کے تمام اعضاء میں پھیلی ہوتی ہیں کہ اس عالم کی زبان، ہاتھ پاؤں گندے اعمال سے روک دیتی ہے وہ عالم راسخ فی العلم ہے کہ اس کے علم سے لوگ فیض پاتے رہتے ہیں جیسے زمین کو نرم کر کے بیج بوتے ہیں لوہے کو آگ میں نرم کرکے اوزار بناتے ہیں۔ مٹی کو پانی سے نرم کر کے اس کے برتن بناتے ہیں۔ ایسے ہی استاد کامل شاگرد کے دل کو نرم کرتے ہیں پھر اس میں علم کا تخم بوتے ہیں۔ تب انسان راسخ فی العلم بنتا ہے۔ عالم ہونا آسان ہے مگر راسخ فی العلم ہونا بہت مشکل ہے۔

محکم و متشابہ!

ان دونوں لفظوں کے لغوی معنی ہم تفسیر میں بتا چکے۔ اس میں گفتگو ہے کہ یہاں ان دونوں سے کیا مراد ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ محکم وہ عبارت ہے جس کی مراد پہچانی جاسکے۔ خواہ ظاہر ظہور یا کسی قدر تاویل سے اور متشابہ وہ جو کسی طرح سے سمجھ میں نہ آسکے، جیسے قیامت، دجال اور دابۃ الارض کے آنے کا وقت اور جیسا کہ سورتوں کے اول میں حروف مقطعات بعض علماء نے فرمایا کہ محکم وہ جس میں ایک ہی معنی کا احتمال ہو اور متشابہ وہ جس میں چند احتمالات ہوں بعض نے فرمایا کہ جو ناسخ ہے وہ محکم اور جو منسوخ ہے وہ متشابہ۔ بعض کے نزدیک محکم وہ جو مقرر نہ ہو اور متشابہ وہ جس کے الفاظ مقرر ہوں۔ بعض کے خیال میں محکم وہ جس کی وجہ سمجھ میں آسکے اور متشابہ وہ جس کی وجہ عقل سے باہر ہو۔ جیسا نماز کے اوقات اور رکعات کی تعداد اور ماہ رمضان میں روزہ کا ہونا نہ کہ شعبان میں۔ کہ اس کی صحیح حکمت رب ہی کے علم میں ہے۔ بعض نے فرمایا کہ محکم وہ جس کا ہر دین میں حکم رہا جیسے ایمان اور عبادات کے احکام۔ متشابہ وہ احکام جو صرف قرآن میں آئے، غرضکہ اس کے متعلق سترہ قول ہیں (تفسیر احمدی) سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ جو احکام شریعتوں کے اختلاف سے بدل جائیں۔ وہ متشابہ اور جو نہ بدلیں وہ محکم۔ اہل اصول کے نزدیک محکم وہ ہے جس کے معنی بالکل ظاہر ہوں اور وہی کلام سے مقصود ہوں۔ اس میں تاویل یا تخصیص کی گنجائش نہ ہو۔ نسخ یا تبدیل کا احتمال نہ ہو اور متشابہ وہ ہے جس کی مراد عقل میں نہ آسکے۔ اور یہ بھی امید نہ ہو کہ رب تعالیٰ بیان فرمائے۔ خیال رہے کہ یہ اقوال اس طرح جمع ہو سکتے ہیں کہ متشابہات کی بہت قسمیں ہیں۔ ہر بزرگ نے ایک قسم کی تعریف فرمائی ہے۔ لہٰذا یہ سب متشابہ کی اقسام ہیں۔

متشابہ کی قسمیں: متشابہ کی چند قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو صرف لفظاً متشابہ ہوں۔ دوسرے وہ جو صرف معناً۔ تیسرا وہ جو لفظاً بھی متشابہ ہوں اور معناً بھی۔ لفظاً متشابہ کی پھر چند قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو صرف معنی کے لحاظ سے متشابہ ہو۔ دوسرا وہ جو معنی کے عموم خصوص کے لحاظ سے ہوں۔ تیسرے وہ جو کیفیت کے لحاظ سے متشابہ ہوں چوتھے وہ جو شرائط کے لحاظ سے متشابہ ہوں (روح المعانی) پھر متشابہات دو قسم کے ہیں ایک وہ جن کے معنی بالکل سمجھ میں نہ آئیں جیسے الٓمٓ وغیرہا جنہیں آیات مقطعات کہتے

خاک تو گارے وغیرہ میں کام بھی آتی ہے، مگر راکھ بجز گندا برتن صاف کرنے کے کسی اور مصرف کی نہیں، ڈاکٹر اقبال نے کیا خوب فرمایا، شعر

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے دل مرتضیٰ سوز صدیق دے

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّآ أَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا
اور نہ تھا ان کا کہنا اس کے سواء کہ وہ بولے اے ہمارے پالنہار بخش دے ہمارے
وہ کچھ بھی نہ کہتے تھے سواء اس دعا کے کہ اے رب ہمیں بخش دے ہمارے گناہ
ذُنُوْبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِيْٓ أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا
گناہوں کو اور ہماری زیادتیوں کو ہمارے کاموں میں اور ثابت رکھ ہمارے قدموں کو
اور جو زیادتیاں ہم نے اپنے کام میں کیں اور ہمارے قدم جمادے
وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ
اور مدد فرما ہماری کافر قوم پر پس دیا
اور ہمیں ان کافروں پر مدد دے تو اللہ نے
اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ
اللہ نے ان کو ثواب دنیا کا اور اچھا ثواب آخرت کا
انہیں دنیا کا انعام دیا اور آخرت کے ثواب کی خوبی
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾
اور اللہ پسند کرتا ہے نیک کاروں کو
اور نیکی والے اللہ کو پیارے ہیں

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں امت کے غازیوں کی عملی خوبیاں بیان ہوئیں یعنی مصیبت میں گھبرا نہ جانا، سست نہ پڑنا، اب اس آیت میں ان کی قولی خوبیاں بیان ہو رہی ہیں، یعنی ایسے نازک حالات میں بھی رب تعالیٰ سے دعائیں کرنا گویا ارکانی نیکیوں کے بعد ان کی لسانی و زبانی نیکیوں کا ذکر ہے، **دوسرا**

تعلق: پچھلی آیت میں گذشتہ غازیوں کی استقامت کا ذکر تھا، اب بحالتِ جہاد ان کی عبادت کا ذکر ہے کہ وہ حضرات ایسی خطرناک حالت میں بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوتے تھے، اور جہاد میں دو ہی چیزیں لازم ہیں، استقامت وعبادت، رب تعالیٰ فرماتا ہے اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا (انفال: ۴۵) جب کفار سے مُڈھ بھیڑ ہو تو ڈٹ جاؤ اور اللہ کا ذکر بہت کرو، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں گذشتہ غازیوں کی اعلیٰ عبادت یعنی جہاد میں ڈٹ جانے کا ذکر تھا، اب اس عبادت کی قبولیت کا ذریعہ بتایا جارہا ہے یعنی مومن کا اپنی عبادت پر نازاں نہ ہونا، اپنے کو ہر حال میں گنہگار جان کر رب تعالیٰ سے توبہ کرنا، کہ وہ حضرات اتنی بڑی نیکیاں کرنے کے بعد بھی توبہ واستغفار کرتے تھے، شیخی میں نہ آتے تھے، **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے گذشتہ غازیوں کے متعلق اپنے فیصلہ کا ذکر فرمایا کہ وہ حضرات صابر تھے، اور صابر ہمارے پیارے ہیں، لہٰذا ہمیں پیارے تھے، اب اس آیت میں خود ان کے فیصلہ کا ذکر ہے، جو انہوں نے اپنے متعلق کیا تھا کہ ہم گنہگار خطا کار ہیں، لطف جب ہی ہے کہ بندہ کہے میں گنہگار، رب تعالیٰ فرمائے تو متقیوں کا سردار تو پرہیزگار، غرضکہ ان کے ایک کمال کا ذکر پچھلی آیت میں تھا، رب تعالیٰ کے ہاں مقبول وصابر ہونا، دوسرے کمال کا ذکر اب ہے، اپنے کو گنہگار جاننا،

تفسیر

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا حق یہ ہے کہ قَوْلَهُمْ کی ضمیر رِبِّیُّوْنَ کی طرف راجع ہے، اس میں انبیائے کرام داخل نہیں، کہ حضرات انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں، ان کے نزدیک بھی گناہ واسراف نہیں جاتے (صاوی وخازن) روح البیان نے فرمایا کہ یہ مناجات وہ حضرات سخت خطرناک حالت میں کرتے تھے، جبکہ جنگ خطرناک صورت اختیار کر جاتی تھی، اور غازیوں کو اپنی شکست نظر آتی تھی، تب یہ عرض کرتے تھے کہ مولیٰ ہماری یہ حالت ہمارے اپنے گناہوں کی وجہ سے ہے معافی دے، کرم کر، اور ہوسکتا ہے کہ وہ جہاد میں ہر وقت ہی یہ کہتے رہتے ہوں، قَوْلَهُمْ، كَانَ کی خبر مقدم ہے، اور اَنْ قَالُوْا مصدر ہو کر اسم موخر الاستثنا مفرغ ہے، یعنی وہ حضرات جہاد میں ان کلمات کے سواء اور کوئی بھی کلام منہ سے نہ نکالتے تھے رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا یہ پورا جملہ قَالُوْا کا مفعول بہ ہے، مغفرت اور ذنب کے معانی پہلے بارہا عرض کئے جاچکے ہیں، ان غازیوں کا یہ عرض کرنا اگلی دعا کی تمہید ہے، کہ دعا سے پہلے اپنے گناہوں کا اقرار وتوبہ سنت بزرگان ہے اور ہر دعا پر اپنے رب کو رَبَّنَا کہہ کر پکارنا ذریعہ قبولیت ہے، یہ پکار اظہار عجز کے لئے ہے، نہ کہ رب تعالیٰ کو بے خبر جاننے کی بنا پر، ذنوب سے سارے گناہ مراد ہیں نئے ہوں یا پرانے، یا بحالتِ جہاد کوتاہیاں وغلطیاں کریم کو پکار کر اپنے قصور کا اقرار سنت ابرار ہے، وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا، واؤ عاطفہ ہے، اور مابعد ذنوب پر معطوف، اِسْرَاف سَرْف سے بنا بمعنی حد سے بڑھ جانا، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا (اعراف: ۳۱) اور فرماتا ہے قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ (زمر: ۵۳) اور فرماتا ہے فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ (اسراء: ۳۳) امر سے مراد اپنا ہر عمل ہے بدنی ہو یا مالی اس میں گفتگو ہے، کہ ذنب واسراف میں کیا فرق ہے، امام ضحاک فرماتے ہیں کہ ذنب صغیرہ گناہ ہیں، اور اسراف کبیرہ بعض کے نزدیک ذنب عام ہے اسراف خاص یعنی ذنب ہر گناہ، اسراف بڑا گناہ، بعض کے نزدیک نہ کرنے والے کام کر لینا ذنب ہے اور کرنے والے کام نہ کرنا اسراف ہے، بعض کہتے

ہیں بدنی گناہ، اخیاری اعمال ذنب ہیں، اور دلی گناہ حسد، بغض یا جہاد میں بے ہمتی اسراف ہے بعض کے نزدیک حقوق اللہ میں زیادتی کی ذنب ہے، حقوق العباد میں کج روی اسراف کچھ بھی سہی، ان حضرات نے اپنے ہر قسم کے سارے گناہوں سے معافی مانگ لی، خیال رہے کہ یہ لوگ افراط وتفریط سے پاک وصاف تھے، رب تعالیٰ نے انہیں رَبِّيُّونَ یعنی اللہ والے فرمایا مگر پھر بھی ان کا اپنے کو گنہگار جاننا اور بھی کمال ہے، یعنی وہ لوگ جہاد کی حالت میں یہ ہی کہتے تھے، کہ خدایا ہمارے سارے چھوٹے بڑے، کھلے چھپے، شرعی اور حقوق العباد کے گناہ معاف فرمادے وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا، وہ جملہ تمہید تھا یہ اصل دعا ہے، ثبت تثبیت سے بنا بمعنی جما دینا، یہ لغزش کا مقابل ہے، اگرچہ ذکر تو قدموں کا کیا، مگر مراد دلی قوت وہمت ہے، کہ دل میں ہمت ہو تو قدم جمے رہتے ہیں، دل گھبرایا کہ قدم اکھڑے، یہاں ثابت قدمی سے مراد جہاد میں جمے رہنا ہے، کسی آفت سے نہ گھبرانا، چونکہ یہ ثابت قدمی رب تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے، اس لئے بہت اہتمام سے ان بزرگوں نے اس کی دعا کی، یعنی اے مولیٰ! ہمیں جہاد میں ثابت قدمی نصیب کر، کہ مضبوط دیوار کی طرح جمے رہیں، میدان سے بھاگ نہ جائیں وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ نصرت کے معنی مدد بھی ہیں اور فتح بھی، یہاں دونوں معنی درست ہیں، قوم کافرین سے مراد سارے ہی کفار ہیں، مشرکین ہوں یا اہل کتاب، اب ہمارے مقابل آگئے ہوں یا آئندہ آئیں، اور نصرت سے مراد غیبی امداد ہے جو فرشتوں کے ذریعہ ہو، جس کا اثر یہ ہے کہ مومنوں کے دل قوی اور مضبوط ہو جاتے ہیں، اور کفار کے دلوں پر رعب وہیبت چھا جاتی ہے، رب تعالیٰ کی امداد کی بہت صورتیں ہیں، جنگ بدر میں فرشتوں کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد فرمائی، اور غزوۂ خندق میں ہوا کے ذریعہ، موسیٰ علیہ السلام کو پانی کے ذریعہ فرعون پر فتح بخشی، یعنی اے مولیٰ ہم کو اپنی کثرت قوت، ہتھیاروں پر ناز نہیں، تیری بارگاہ میں التجا ہے کہ ہمیں فتح ونصرت نصیب کر فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فاء ترتیب کی ہے اور یہ عطا پہلی دعا پر مرتب ہے، ثَوَاب کے معنی ہم ابھی پہلے عرض کر چکے، کہ یہ ثوب سے ہے بمعنی لوٹنا، پلٹنا، اب جزاء عمل کو ثواب کہتے ہیں، کہ یہ بندے کی طرف لوٹتی ہے، یہاں دنیاوی ثواب سے مراد فتح، غنیمت، ملک، نیک نامی، غلبہ وغیرہ سب ہی مراد ہیں، یعنی جب ان لوگوں نے ایسی استقامت دکھائی، اور استقامت کے باوجود ایسی دعائیں مانگیں، تو ہم نے انہیں صرف اخروی ثواب ہی نہ دیا بلکہ دنیا میں بھی اچھا نتیجہ وثواب بخشا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ مرنے کے بعد سے ابد الآباد تک کا نام آخرت ہے، وہاں مختلف اوقات میں مختلف ثواب ہیں، نزع کی سختی سے حفاظت جانکنی کا ثواب ہے، قبر میں حساب وکتاب نہ ہونا یا آسان ہونا یا اس میں کامیاب ہو جانا قبر کا ثواب ہے، قیامت کی دھوپ سے بچ جانا، حساب میں آسانی ہونا، پل صراط سے بخیریت گذر جانا، قیامت کا ثواب ہے، جنت کا داخلہ رب تعالیٰ کا راضی ہو جانا، یہ بعد کا ثواب ہے، اس ایک جملہ میں رب تعالیٰ نے ان تمام ثوابوں کا ذکر فرما دیا، چونکہ دنیا کے ثواب سے آخرت کا ثواب زیادہ اہم ہے، کہ دنیا کی راحتیں فانی ہیں، مصیبتوں سے مخلوط ہیں، اور تھوڑی ہیں، آخرت کی نعمتیں بہت ہیں، باقی ہیں، خالص ہیں، اسی لئے آخرت کے ثواب کے ساتھ لفظ حسن ارشاد ہوا، چونکہ دنیا پہلے ہے، آخرت بعد میں، اسے لئے ثواب دنیا کا ذکر پہلے ہوا آخرت کا بعد میں، خیال رہے کہ آخرت کا ثواب ابھی ملا نہیں، آئندہ ملے گا، مگر چونکہ رب تعالیٰ کے وعدے یقینی ہیں، جن کے غلط ہونے کا احتمال ہی نہیں، اس لئے یہاں ماضی فرمایا گیا، یا یہ مطلب

متشابہات کی حکمتیں

متشابہات کو نازل فرمانے اور انہیں اور قرآن میں باقی رکھنے کی چند حکمتیں ہیں۔(۱) حکومت کی طرف سے حکام کے پاس صریحی احکام کے ساتھ کچھ رموز اور اشارے بھی آتے ہیں۔ جسے چٹھی رسان اور ڈاکخانہ کے ملازمین بھی نہیں سمجھ سکتے صرف حاکم جانتا ہے یا وہ افسر' ایسے ہی قرآن کریم میں رب تعالیٰ کی طرف سے حضور علیہ السلام پر صاف احکام کے ساتھ کچھ راز و نیاز بھی آئے۔ جنہیں حضرت جبرائیل امین بھی نہ سمجھ سکے۔ انہی کا نام متشابہات ہے۔ (۲) متشابہات میں علماء کا امتحان ہے۔ جہلا کو حکم دیا گیا کہ علم سیکھو' علماء کو حکم دیا گیا کہ ان باتوں کو نہ سیکھو' اور نہ ان میں غور کرو ہر ایک کا امتحان اس کے تقاضائے طبیعت کے خلاف سے ہوتا ہے۔ (۳) متشابہات کے ذریعہ سے بندہ اپنی بندگی کا اقرار کرتا ہے کہ عالم ہر جگہ اپنی عقل کا گھوڑا دوڑاتا ہے مگر یہاں پہنچ کر کہنا پڑتا ہے کہ رب جانے۔ ان کا کیا مطلب' اور اپنے قصور کا اقرار علامت بندگی ہے۔ (۴) متشابہات کے ذریعہ خدائی کتاب اور انسانی کتاب میں فرق ہوتا ہے کہ انسانی کتاب وہ جسے ہر کوئی اول سے آخر تک سمجھ لے اور خدائی کتاب وہ جہاں ہر ایک اپنے عجز کا اقرار کرے۔ اسی لئے قرآن سے پہلے دیگر آسمانی کتابوں میں بھی متشابہات تھے۔ انہی متشابہات میں پھنس کر عیسائی گمراہ ہو گئے۔ چنانچہ انجیل شریف میں عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا کہا گیا' نہ آپ خدا تھے۔ نہ خدا کے بیٹے۔ بلکہ متی رسول ہیں۔ خود ہمارے حضور ﷺ کی نبوت کو خدا کی بادشاہت کہا گیا۔ بلکہ حضور ﷺ کو خدا کہا گیا۔ دیکھو متی رسول ۲۱۔ ۳۳۔ ۴۰۔ جہاں انگورستان کے مالک کے بیٹے کی مثال دی ہے۔ زبور شریف میں سارے جہان کو خدا کا بیٹا کہا گیا۔ چنانچہ زبور ۸۲۔۶ میں ہے کہ میں نے تو کہا تم اللہ ہو۔ اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو۔ غرضکہ تمام کتاب آسمانی میں متشابہات موجود ہیں۔ (۵) متشابہات کا انسانی علم سے بالاتر ہونا ذریعہ ہدایت ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: قرآن کریم کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بعض آیتیں محکم ہیں اور بعض متشابہ مگر ایک جگہ سارے قرآن کو محکم کہا کِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰیٰتُهٗ (ھود: ۱) اور دوسری جگہ سارے قرآن کو متشابہ فرمایا گیا۔ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا (الزمر: ۲۳) جس سے معلوم ہوا کہ سارا قرآن متشابہ ہے۔ ان میں مطابقت کیونکر ہو؟

جواب: وہاں محکم سے مراد فساد معنیٰ اور لفظی خرابیوں سے محفوظ ہے۔ یعنی سارے قرآن کے معنے اور الفاظ فساد سے خالی ہیں اور وہاں متشابہ سے مراد سارے قرآن کا یکساں ہونا ہے یعنی سارا قرآن فصاحت و بلاغت میں یکساں ہے۔ شعراء کے کلام کی طرح بعض اعلیٰ بعض ادنیٰ نہیں اور یہاں محکم سے مراد ہے ظاہر المعنی اور متشابہ سے مجہول المعنی۔ لہٰذا آیتوں میں تعارض نہیں۔ **دوسرا اعتراض:** اِلَّا اللّٰهُ پر وقف کرنے سے معلوم ہوا کہ متشابہات کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں' اور تم نے کہا کہ حضور ﷺ بلکہ اولیاء اللہ کو بھی ہے۔ تمہارا یہ کلام اس آیت کے خلاف ہے (بعض جہلاء دیوبند) **جواب:** ہم علم متشابہات کے مسئلہ میں عرض کر چکے کہ اماموں کا یہ اختلاف علم بالدلائل میں ہے۔ اس علم میں کسی کا اختلاف نہیں جو بذریعہ کشف یا الہام ہو۔ رب تعالیٰ حضور علیہ السلام کے فعل کو اپنا فعل قرار دیتا ہے کیونکہ حضور (علیہ السلام) فنافی اللہ ہیں۔ فرماتا

ہوتی ہیں، **دوسرا فائدہ:** جہاد کی حالت میں ناجائز باتیں نہ کی جائیں، اللہ تعالیٰ کا ذکر اور دعائیں کرنا چاہئیں، مجاہد کی حالت یہ ہونی چاہیے کہ اس کے ہاتھ میں تلوار ہو، اور منہ پر ذکر اللہ، کیونکہ جہاد بھی روزہ و نماز کی طرح عبادت ہے، اور عبادتوں میں اللہ کا ذکر بہتر ہے، **تیسرا فائدہ:** دعا سے قبل رب تعالیٰ کو پکارنا چاہیے، جیسی دعا مانگنا ہو، ویسے ہی نام سے اسے پکارو، دعائے مغفرت میں یا غفار کہو، اور دعائے شفا میں یا شافی الامراض، مگر رَبَّنَا ہر دعا کے ساتھ استعمال ہو سکتا ہے، **چوتھا فائدہ:** دعا سے پہلے اپنے گناہوں سے توبہ کرنی چاہیے، دعا مانگنے والا پہلے حمد الٰہی کرے، پھر درود شریف پڑھے، پھر استغفار کرے، پھر دعا مانگے، کہ یہ سب دعا کے آداب ہیں، **پانچواں فائدہ:** مجاہدین جہاد میں اپنے سامان اور فوج کی تعداد پر بھروسہ نہ کریں، بلکہ رب تعالیٰ کے کرم پر اعتماد کریں، اور اس سے ثابت قدمی مانگیں، جیسا کہ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** کوئی نیک کار اپنی نیکی پر پھول نہ جائے، رب تعالیٰ کو بھول نہ جائے، بڑی سے بڑی نیکی کرنے کے بعد بھی اپنے کو خطا کار ہی جانے، دیکھو ان غازیوں کو رب تعالیٰ نے صابر اور محسن فرمایا مگر انہوں نے اپنے کو گنہگار ہی کہا، **ساتواں فائدہ:** دین کی خدمت کرنے والے کو دنیا بھی ملتی ہے، جیسا کہ ثَوَابَ الدُّنْيَا سے معلوم ہوا، تجربہ بھی ہے کہ دینی خدمت کرنے والے ننگے بھوکے نہیں رہتے بلکہ بعض کی قبروں پر بھی زر و جواہر نثار ہوتے رہتے ہیں، کہ ان کے نام سے دوسرے پلتے ہیں، یہ ہے ثَوَابَ الدُّنْيَا کا ظہور، **آٹھواں فائدہ:** نیک کاروں کی دنیوی نعمتیں آخرت کی نعمتوں کو کم نہ کریں گی، بلکہ وہاں اس دنیا سے بڑھ چڑھ کر نعمتیں ملیں گی کہ جن کے مقابلہ میں دنیاوی نعمتوں کی کوئی حقیقت ہی نہیں جیسا کہ وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ سے معلوم ہوا، **نواں فائدہ:** فتح، ظفر، غنیمت، نیک نامی، اچھی شہرت، اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتیں ہیں، جو اکثر مجاہدوں کو نصیب ہوتی ہیں جیسا کہ ثَوَابَ الدُّنْيَا کی تفسیر سے معلوم ہوا، **دسواں فائدہ:** غازی و شہید بفضلہ تعالیٰ جانکنی کی شدت، قبر کے حساب، آخرت کے عذاب ان سب سے محفوظ ہے، حدیث شریف میں ہے کہ شہید کو جانکنی میں صرف ایسی تکلیف ہوتی ہے، جیسے چیونٹی کاٹنے کی، **گیارھواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ کو نیک کار پیارے ہیں، اگر رب تعالیٰ کا پیارا بننا ہے تو نیکیاں کرو، ہندی مثل و کہاوت ہے کہ "چام پیارا نہیں، کام پیارا ہے" جیسا کہ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ سے معلوم ہوا،

اعتراضات

پہلا اعتراض: ذنوب کے بعد اسراف کا ذکر کیوں کیا گیا؟ اسراف بھی ذنوب میں داخل تھا، **جواب:** اس کے کئی جواب تفسیر سے معلوم ہو گئے، کہ یا تو ذنوب اسراف سے عام ہے، کہ اسراف بھی ذنوب میں داخل ہے تب تو اظہار اہتمام کے لئے بطریق تخصیص بعد تعمیم خصوصیت سے اس کا ذکر زیادہ کیا، کہ ذنوب میں گناہ کبیرہ و صغیرہ سب داخل تھے، اور اسراف میں گناہ کبیرہ شامل، چونکہ گناہ کبیرہ دیگر گناہوں سے سخت ہے، اس لئے ان کی معافی خصوصیت سے علیحدہ مانگی، اور اگر اسراف ذنب کا مقابل ہے، تب تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، **دوسرا اعتراض:** اس آیت کریمہ میں قوم کافرین پر فتح کیوں مانگی گئی؟ کافرین پر ہی فتح مانگنا چاہیے تھی یعنی یوں فرمایا جاتا وَانْصُرْنَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ، لفظ قوم کا اضافہ کیوں کیا گیا؟

جواب: اس لئے کہ ان کافروں پر فتح مانگی گئی ہے، جو مجتمع قوم ہو کر ہمارے مقابلہ میں جنگ کے لئے آئے، رہے وہ کفار جو ہمارے ملک میں رعایا بن کر رہیں یا امن لے کر چندروز کے لئے ہمارے ملک میں آئیں یا جن سے ہمارا معاہدہ وصلح ہو، ان سے نہ جنگ ہے اور نہ ان کے مقابلہ میں دعائے فتح، اگر یہاں قوم کا لفظ نہ ہوتا تو اس میں سارے کافر داخل ہو جاتے، **تیسرا اعتراض:** قوم واحد ہے، پھر اس کی صفت کافرین جمع کیوں آئی؟ **جواب:** اس لئے کہ قوم لفظاً واحد ہے مگر معنی جمع، کہ اس میں اگرچہ افراد نہ صحیح اجزاء بہت زیادہ ہیں کہ ہر شخص قوم کا جزو ہے، **چوتھا اعتراض:** تم نے ثَوَابَ الدُّنْيَا کی تفسیر میں فتح، غنیمت، عزت و شہرت کا بیان کیا، حالانکہ اسلام سے پہلے مجاہدین کے لئے غنیمت حلال تھی ہی نہیں، فاتحین مال غنیمت جمع کر کے پہاڑ پر رکھ آتے تھے، اور غیبی آگ اسے جلا جاتی تھی، پھر ان کے لئے غنیمت ثَوَابَ الدُّنْيَا میں داخل کیسے ہوئی؟ **جواب:** امام ابن جریج نے اس کی تفسیر فتح اور غنیمت سے کی ہے، تفسیر روح المعانی نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ اس زمانہ میں غنیمت کے جانور مجاہدین کے لئے حلال تھے، حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے لئے حرام جانوروں کے علاوہ دوسرے مال سونا، چاندی وغیرہ مطلقاً حرام تھے، وہی پہاڑ پر رکھے جاتے تھے، اور انہی کو آ کر آگ کھاتی تھی، یہ جواب قرین قیاس بھی ہے کہ اس زمانہ میں بھی لڑ کے کفار غنیمتاً گرفتار کئے جاتے تھے، اور انہیں لونڈی و غلام بنا کر خدمتیں لی جاتی تھیں، تفسیر صاوی نے اس کا جواب یہ دیا کہ اس زمانہ میں بھی غازی مال غنیمت کے مالک ہو جاتے تھے، اگرچہ اسے استعمال نہ کر سکتے تھے، ان بزرگوں کا مالک غنیمت بن جانا ہی ثوابِ دنیا تھا،

تفسیر صوفیانہ

جہاد میں ظاہری ہتھیاروں کے ساتھ باطنی اسلحہ بھی ہونا چاہیے، ظاہری ہتھیار تو دنیوی کارخانوں کے بنے ہوئے توپ و تفنگ ہیں، اور باطنی ہتھیار کارخانۂ قدرت کے ڈھلے ہوئے استغفار، ذکر اللہ، تقویٰ اور طہارت ہیں، کفار کے پاس جسمانی ہتھیاروں کا توڑ تو ہے، مگر روحانی ہتھیار کا توڑ کوئی نہیں، اگر مسلمان غازی اس ہتھیار سے بھی آراستہ ہوں، تو انشاء اللہ مدد الٰہی ضرور ان کی دستگیری کرے، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ صبر و احسان خدا کی صفات ہیں، اور خدا تعالیٰ کو پیاری، اسی لئے رب تعالیٰ نے پہلے فرمایا کہ ہم صابروں سے محبت کرتے ہیں، اور اب فرمایا کہ ہمیں احسان والے پیارے ہیں، یوں تو ہر وقت ہی انسان کو ان صفات سے موصوف رہنا چاہیے، مگر جہاد میں تو ضرور یہ صفتیں اختیار کرنی چاہئیں، کہ اس وقت موت سامنے ہوتی ہے، شیخ سعدی فرماتے ہیں، شعر

کنوں باید عذر تقصیر گفت ۔۔۔ نہ چوں نفس ناطق زگفتن بخفت

تو پیش از عقوبت در عفو کوب ۔۔۔ کہ سودے ندارد فغاں زیر چوب

ابھی زبان چل رہی ہے کچھ معذرت کر لو، زبان بند ہو جانے پر پچھتاؤ گے، سزا سے پہلے معافی مانگ لو، کہ جب ڈنڈا پڑنے لگے، تو شور مچانا بیکار ہوتا ہے، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جو اپنے کو مُسِيْئی (گنہگار) سمجھے وہی رب تعالیٰ کے ہاں محسن یعنی نیک کار ہے، دیکھو ان لوگوں نے اپنے گناہوں اور اسراف کا اقرار کیا، تو رب تعالیٰ نے انہیں محسن فرمایا، اور اپنی محبوبیت کا ان

کہ مولوی اسمٰعیل دہلوی، رشید احمد گنگوہی وغیرہما کی کفریہ عبارات کی جب کوئی توجیہہ نہ کر سکے تو کہنے لگے کہ یہ متشابہات ہیں۔ اس کے معنی خدا ہی جانے۔ یا وہ جانیں اس لئے ہم متشابہات کے بارے میں کچھ عرض کرتے ہیں کہ

متشابہ ہونے کی تین علامتیں ہیں: (۱) ایک یہ کہ بولنے والا وہ شخص ہو جس کی ولایت پر سارے مسلمانوں کا اتفاق ہو۔ ورنہ پھر تو ابلیس بھی کہہ سکتا تھا کہ میرا کلام متشابہ ہے۔ (۲) دوسرے یہ کہ اس عبارت کو عقیدہ نہ بنایا گیا ہو۔ نہ بولنے والے نے اس کی تبلیغ کی ہو نہ اس کے ماننے والوں نے۔ منصور نے انا الحق جوش میں کہہ دیا۔ نہ اس کی طرف کسی کو دعوت دی اور نہ کسی نے اس کی تبلیغ کی ہو۔ (۳) تیسرا یہ کہ اس کلام میں کسی نبی کی توہین نہ ہو۔ توہین نبی مثل متشابہ نہیں بن سکتی۔ یہاں یہ کچھ بھی نہیں۔ تقویۃ الایمان کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ اسے عقائد میں پیش کیا جاتا ہے۔ مرزا جی نے عمر بھر دعویٰ نبوت پر مناظرے، مباہلے کئے۔ پھر یہ متشابہ کیسا۔ ان سب کے باوجود ان میں سے بعض اولیاء کو علماء نے قتل کرا دیا۔ جیسے حضرت منصور اور انہوں نے شریعت کے سامنے اپنی گردن رکھ دی تاکہ ان کی اس بے اختیاری عبارت سے دین میں فتنہ واقع نہ ہو۔ کسی ولی نے بارگاہ نبوی ﷺ میں گستاخی کرنے کی جرأت نہیں کی جوش میں اَنَا اللّٰہ تو کہہ گئے۔ مگر اَنَا محمد ﷺ کسی نے نہ کہا۔ کیونکہ دربار الٰہی بارگاہِ ناز ہے اور آستانہ مصطفیٰ ﷺ مقامِ نیاز' یہاں اونچی آواز سے بولنے پر نیکیاں برباد ہوتی ہیں۔ یہ تقریر بہت خیال میں رکھنی چاہیے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے محبوب ﷺ قبول فرمائیں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ وَ نُوْرِ عَرْشِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ

اے رب ہمارے نہ ٹیڑھا کر دلوں کو ہمارے پیچھے اسکے کہ ہدایت دی تو نے ہم کو اور دے تو واسطے ہمارے پاس سے اپنی رحمت

اے رب ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا کر

اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ

تحقیق تو بہت دینے والا ہے اے رب ہمارے تحقیق تو جمع فرمانے والا ہے لوگوں کو واسطے اس دن کے کہ نہیں ہے

بیشک تو ہے دینے والا اے رب ہمارے بیشک تو سب لوگوں کو جمع کرنے والا ہے اس دن کے لئے جس میں

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۹ ع

بیشک بیچ اس کے تحقیق اللہ نہیں خلاف کرتا وعدہ

کوئی شبہ نہیں بے شک اللہ کا وعدہ نہیں بدلتا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں ربانی علماء کے ایمان کا ذکر تھا کہ وہ متشابہات پر بغیر غور کئے ایمان لے آتے ہیں۔ اب ان کے خوف اور خشیت الٰہی کا ذکر ہے کہ وہ باوجود کمال ایمان کے پھر بھی

اور کھرے ہوں، کہ ان کے دلوں میں کفار کی طرف میلان بالکل نہ ہو، کھرا سونا قیمتی، خالص دودھ قابل قدر، یوں ہی خالص اور کھرا مومن رب تعالیٰ کو پیارا ہے،

شانِ نزول

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب جنگِ احد میں مسلمانوں کو ہزیمت ہوئی، تو عبداللہ ابن ابی نے ضعفاء مومنین سے کہا، کہ چلو ہم ابوسفیان کے پاس چلیں، اور ان سے اپنے جان و مال کے لئے امان لے لیں، میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ حضور انور ﷺ سچے نبی نہیں، ورنہ وہ جنگ میں شہید نہ کئے جاتے، اور دوسرے منافقین ان سے بولے کہ اسلام ایک عارضی چیز تھی جو آج ختم ہوگئی، چلو اپنے پرانے بھائیوں کے دین میں داخل ہو کر ان سے گلے مل لیں، ہمیں ان میں رہنا سہنا اور عمر گذارنا ہے، تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (تفسیر کبیر، مدارک وصاوی وبیضاوی وروح المعانی وغیرہ) بعض روایات میں ہے کہ یہودِ مدینہ اسلام کی طرف سے نومسلم مومنین کے دلوں میں شکوک وشبہات ڈالتے رہتے تھے، ان کے متعلق یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (روح المعانی) اور ہوسکتا ہے کہ ان یہودیوں نے احد کے اس واقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان مسلمانوں کو شبہات میں ڈالنے کی کوشش کی ہو، لہٰذا ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں،

تفسیر

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا ظاہر یہ ہے کہ اس میں خطاب ان ہی نومسلم مومنوں سے ہے جنہیں کفار ومنافقین نے بہکانے کی کوشش کی تھی، یا تو اگلے مضمون کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے پہلے پکارا گیا، پھر ان سے کچھ فرمایا گیا، یا اظہار کرم کے لئے یا اظہار تعجب کے لئے یا عتابانہ انداز میں یہ خطاب ہوا، یعنی اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے کیسے ہوسکتا ہے کہ تم ان کی اطاعت کرلو، یا اے ایمان والو تم مومن ہو کر ان بے ایمانوں کی بات سن لیتے ہو، یا اے ایمان والو تم احد میں بھاگ جانے اور منافقین کی یہ بات سن لینے ابوسفیان سے امن لینے کا ارادہ کرلینے پر ایمان سے خالی نہیں ہوگئے، تم سے غلطی ہوگئی، ہم تمہارے ہیں تم ہمارے ہو، بہر حال اس خطاب میں نرالے ناز ہیں اور انوکھے انداز اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا تُطِیْعُوْا، اِطَاعَةٌ سے بنا جس کا مادہ طوع ہے اس کے معنی بارہا بیان کئے جاچکے ہیں، یہاں اطاعت سے مراد یا تو کفار ومنافقین کی بات مان لینا ہے، یا ان کے سامنے گڑگڑا کر عاجزی اختیار کرنا، یا ان کی ماتحتی قبول کرلینا، یا ان کی ہاں میں ہاں ملانا، یا ان کا دین اختیار کرلینا ہے، غرضکہ یہ کلمہ اطاعت قولی، عملی اور اعتقادی سب ہی کو شامل ہے، كَفَرُوْا سے مراد یا تو منافقین ہیں کہ یہ حقیقت میں کافر ہی تھے، اگرچہ مسلمان تھے، یا یہود ونصاریٰ یا سارے کفار مراد ہیں، جس کا نتیجہ امان طلبی ہے، یعنی اگر تم کافروں کی رائے مانو گے یا اگر تم کافروں کے پیش کردہ شبہات کو اپنے دل میں جگہ دو گے یا اگر تم ان سے امان مانگ کر ان کی ماتحتی قبول کرو گے، تو یَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ یَرُدُّوْا رَدٌّ سے بنا جس کے معنی ہیں پہلی حالت، پہلی جگہ، پہلے عقیدے کی طرف لوٹا دینا، چونکہ یہ مومنین پہلے مشرک ہی تھے اس لئے اب ان کے دوبارہ مشرک ہو جانے کو رد یعنی لوٹ جانا فرمایا گیا، اعقاب عقب کی جمع ہے بمعنی پیچھے، ایڑی کو عقب اس لئے کہتے ہیں، کہ یہ قدم کے پیچھے ہوتی ہیں، اور اس پر گھوم جانے سے انسان پورا پیچھے پلٹ جاتا ہے، اس لئے اسے عقب

چمکنا۔ دنیا میں رزق کی وسعت' امن' تندرستی' علم' موت کے وقت آسانی' قبر کی روشنی' منکر نکیر کے امتحان میں آسانی' قیامت کے دن گناہوں کی معافی' نیکی کا پلہ بھاری ہونا' عذاب الٰہی سے بچنا' یہ سب ہی رحمت ہیں' اور سب مراد بڑے دربار میں چھوٹی چیز کیوں مانگو' یعنی اے مولیٰ بغیر کسی احسان اور بغیر مخلوق کے واسطہ کے' ہمیں اپنی طرف سے ہر قسم کی بڑی رحمت عطا فرما۔ خیال رہے کہ مال کے عوض مال دینا تجارت یا بیع ہے۔ کام کے عوض دینا مزدوری و اجرت ہے اور بغیر معاوضہ کچھ دینا ہبہ ہے۔ اگر رب تعالیٰ کی رضا کے لئے عطا ہے تو صدقہ ہے ورنہ ہدیہ' بیع و مزدوری میں حساب سے دینا ہوتا ہے۔ مگر ہبہ میں بے حساب عطا هَبْ فرما کر عرض کیا کہ ہماری قابلیت نہ دیکھ اپنا کرم دیکھ۔ حساب سے نہ دے بے حساب دے۔ لَنَا کا لام نفع کا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ چیز دے جو تیرے علم میں ہمارے لئے خیر ہے۔ ہم تو کبھی نادانی سے بڑی چیزیں مانگ لیتے ہیں یا جمع فرما کر عرض کیا کہ بے منت مخلوق۔ ہم کو رحمت دے مخلوق کے واسطے والی رحمت میں دوسرے کا احسان بھی ہوتا ہے اور وہ رحمت فانی بھی ہوتی ہے۔ رحمت میں تمام رحمتیں شامل ہیں۔ لہٰذا یہ دعا بہت جامع ہے چونکہ بڑی رحمتیں مانگی تھیں' لہٰذا عرض کیا کہ اے مولیٰ یہ انعامات میرے لحاظ سے بہت بڑے ہیں مگر تیرے کرم کے مقابلہ میں حقیر ہیں کیونکہ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔

اَنْتَ یا تو مبتدا ہے اور اپنی خبر وَهَّاب سے مل کر اَنَّ کی خبر۔ اور یا ضمیر فعل ہے۔ یا اسم اَنَّ کی تاکید۔ وَهَّابٌ هِبَةٌ کا مبالغہ ہے۔ یعنی بہت دینے والا۔ یعنی اے مولیٰ تو بہت ہی دینے والا ہے۔ تیرا کرم' تیری بخشش ہمارے خیال' قیاس' وہم سے بالاتر ہے۔ جو تیرے سوا ہے وہ تیری سخا ہے۔ تیرا احسان ہے' تیرا کرم ہے۔ اے قدیم الاحسان مجھ مسکین کو اپنے دروازہ سے مایوس نہ پھیر اور میری حقیر دعا کو رد نہ کر۔ مجھے اپنے فضل سے اپنی رحمت کا اہل بنا۔ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ وَ یَا اَکْرَمَ الْاَکْرَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحٰبِهٖ اَجْمَعِیْنَ۔ چونکہ اس دعا میں دینی اور دنیوی تمام حاجتیں مانگی گئی تھیں۔ لہٰذا اب دینی حاجتوں کو مقدم رکھنے کے لئے عرض کیا جا رہا ہے۔ رَبَّنَا اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ۔ یہاں بھی یَاقُوْلُوْا پوشیدہ ہے۔ یا یَقُوْلُوْنَ اور یا تو رب کا اپنا مقولہ ہے۔ یا ان علماء کا۔ جامع کے معنی جمع فرمانے والا' یہاں قیامت کا اجتماع مراد ہے۔ جیسا کہ لِیَوْمٍ سے معلوم ہو رہا ہے کیونکہ اس دن ایسا بڑا مجمع ہوگا جس کی مثال دنیا میں کبھی قائم نہ ہوئی۔ کہ از آدم تا روز قیامت کے سارے انسان ایک میدان میں بیک وقت جمع ہوں گے۔ دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوا' نیز دنیا میں مجمع بہت دیر میں جمع ہوتا ہے مگر قیامت میں آناً فاناً ہوگا۔ اَلنَّاسُ سے سارے لوگ مراد ہیں۔ مکلف ہوں یا غیر مکلف' مومن ہوں یا کفار' اگرچہ وہاں ساری مخلوق جمع کی جائے گی مگر چونکہ انسان سب سے افضل ہے اس لئے اسی کا ذکر کیا گیا۔ لِیَوْمٍ کا لام یا بمعنی فی ہے یا بمعنی الیٰ۔ یا تعلیلیہ ہی ہے مگر یہاں جزا پوشیدہ یعنی لجزاء یوم۔ یَوْمٌ سے یا دن مراد ہے کیونکہ اس وقت آفتاب طلوع ہوگا اور یا وقت لَا رَیْبَ فِیْهِ یا تو یوم کی صفت ہے یا جامع الناس کی تاکید۔ ریب کے معنی ہم شروع سورۂ بقرہ میں عرض کر چکے۔ فِیْهِ کی ضمیر یا یوم کی طرف لوٹتی ہے یا جمع کی طرف۔ یعنی اے پروردگار ہمیں یقین ہے کہ تو قیامت کے دن تمام لوگوں کو سزا و جزا کے لئے ایک جگہ ایک ہی وقت میں جمع فرمائے گا۔ لہٰذا ہمیں اس دن کی رحمتیں عطا فرما۔ اور یہ دعا اپنی اظہار بندگی کے لئے ہے اور اس لئے کہ ہمیں اپنے ایمان پر اعتماد نہیں۔ اس لئے نہیں کہ تجھ پر بے اعتباری ہے کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ [illegible] دعا مانگنے کی۔ نیز یا تو یہ رب کا

مقولہ ہے یا علمائے راسخین کا کلام اور ان کی دعا کا تتمہ۔ مخلف اخلاف سے بنا جس کا مادہ خلف ہے بمعنی خلاف کرنا اور پورا نہ کرنا۔ میعاد وعد کا مصدر میمی ہے۔ دراصل موعاد تھا واؤ ی سے بدل گیا۔ خیال رہے کہ وعدہ کے معنی ہیں خیر کا امیدوار بنانا۔ اور وعید کے معنی ہیں بلا سے ڈرانا۔ یہ میعاد بمعنی وعدہ ہے نہ کہ بمعنی وعید یعنی اللہ اپنے وعدہ کے خلاف کبھی نہیں کرتا کیونکہ وعدہ خلافی جھوٹ ہے اور جھوٹ عیب اور جو عیب دار ہو وہ اللہ نہیں۔

خلاصہ تفسیر

علمائے ربانی سارے قرآن پر ایمان لا کر اور متشابہات کو بغیر بحث و مناظرہ کے مان کر ہم سے عرض کرتے ہیں کہ اے مولیٰ جب تو نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ہدایت دے دی اور اپنا راستہ دکھا دیا تو اب ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر اور ہمیں ہدایت کے بعد گمراہ نہ کر کیونکہ کریم فقیر کو دے کر اس سے واپس نہیں لیا کرتے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں اپنی خاص بڑی بڑی رحمتوں سے نواز کہ ہمارے دل میں اپنی معرفت کا نور دے۔ ہمارے اعضاء سے اپنے دین کی خدمت لے۔ ہمیں دنیا میں رزق و امن اور تندرستی دے۔ سکرات موت کو آسان کر' سوالات قبر میں سہولت فرما' ہماری قبروں کو روشن کر' قیامت کے دن ہمارے عیبوں کو چھپا لے۔ ہمارے گناہوں کو معاف کر دے۔ میزان میں نیکیوں کا پلہ بھاری فرما دے۔ صراط پر آسانی فرما۔ خیر کی توفیق دے۔ اے مولیٰ تو بڑا دینے والا اور بڑا رحیم و کریم ہے۔ اگرچہ یہ عطائیں ہمارے لحاظ سے بہت بڑی ہیں مگر تیرے نزدیک کچھ نہیں۔ اے مولیٰ ہمیں یقین ہے کہ تو قیامت کے دن سب کو ایک جگہ ایک وقت میں جمع فرمائے گا۔ اس دن ہماری عیب پوشی فرمانا۔ اس مجمع میں ہماری رسوائی نہ ہو تو نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ایمان دیا۔ ہدایت دی اور تو نے مومنوں کے لئے رحمت کا وعدہ فرمایا اور تو اپنے سارے وعدے پورے فرمانے والا ہے۔ تیرے وعدوں میں خلاف کا احتمال بھی نہیں۔ یہ دعائیں صرف اس لئے ہیں کہ ہمیں اپنے پر اعتماد نہیں کہ تیری رحمت کے اہل رہیں گے یا نہ رہیں گے تو ہی قابلیت عطا فرمانے والا ہے اور تو ہی اس پر قائم رکھنے والا ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** بندہ کی ہدایت اور گمراہی رب کی طرف سے ہے۔ دونوں کا خالق پروردگار عالم ہی ہے جیسا کہ لَا تُزِغْ اور هَدَيْتَنَا سے معلوم ہوا۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ انسان کے دل میں کفر کی طرف جھک جانے کی بھی قابلیت ہے اور ایمان کی جانب میلان کی بھی طاقت' میلانِ کفر کو خذلان' ازاغۃ' صد اور ختم' طبع' رین' قسوۃ' وقر اور کنان کہتے ہیں۔ یہ سارے الفاظ قرآن کریم میں وارد ہوئے اور ایمان کی طرف مائل ہونے کی توفیق' رشاد' ہدایت' تسدید تثبیت اور عصمت وغیرہ کہتے ہیں۔ یہ سب الفاظ قرآن کریم میں آئے اور ان کے مختلف درجے ہیں۔ **دوسرا فائدہ:** دعا کے آداب دعا میں سے یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی حمد الٰہی ہو اس کے بعد بھی بیچ میں دعا ہو کہ حمد و درود میں گھری ہوئی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔ دیکھو پہلے عرض کیا رَبَّنَا اور بعد میں کہا اَنْتَ الْوَهَّابُ۔ **تیسرا فائدہ:** رب تعالیٰ کی ایسی حمد کرے جو اپنی دعا کے [illegible] اَنْتَ الْوَهَّابُ۔ اگر دعا میں کہا ہے اِغْفِرْ لَنَا تو آخر میں کہے اِنَّکَ اَنْتَ [illegible] اَنْتَ الْغَفَّارُ اگر کہا ہے استر عیوبنا۔ ہمارے عیب چھپا لے تو آخر میں کہے اِنَّکَ اَنْتَ

کی ہر سختی سہتا ہے، یہ رب تعالیٰ کی نعمتیں کھا کر سرتابی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی فرمانبرداری کی توفیق دے، آمین ہماری اطاعت بھی اسی کی کرم نوازی سے ہے، کسی شاعر نے کیا خوب فرمایا، شعر

میری طلب بھی تمہارے کرم کا صدقہ ہے قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

دسواں فائدہ: تمام جہان کی متفقہ مدد سے اکیلے رب تعالیٰ کی مدد اعلیٰ ہے جیسا کہ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ سے معلوم ہوا، کہ النّٰصِرِيْنَ جمع معرف وجمع کثرت ہے، سب سے رب تعالیٰ قوی ہے،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ مومنوں کو کفار کی اطاعت نہ چاہیے، حالانکہ ہم کافر بادشاہوں کی اطاعت کرتے ہیں، ان کے قوانین پر عمل پیرا ہیں، تو کیا ہم سب مجرم ہیں؟ **جواب:** یہاں اطاعت سے دینی اطاعت مراد ہے اوران کے مشورہ قبول کرنا، کہ یہ ہی خطرناک ہے، نیز ہم مسلمان جبراً کفار کے قوانین پر عمل کرتے ہیں نہ کہ خوشی سے ضرورات محذورات کو مباح کردیتے ہیں، **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہمارا والی وارث صرف اللہ تعالیٰ ہے، اوروہ ہی تمام سے افضل واعلیٰ ہے، پھر نبیوں، ولیوں سے مدد کیوں مانگتے ہو؟ کیا خدا تعالیٰ کی مدد کافی نہیں؟ **جواب:** اس اعتراض کے دو جواب ہیں، ایک الزامی، دوسرا تحقیقی، الزامی جواب تو یہ ہے کہ آپ حضرات حکیم وحاکم سے مدد کیوں لیتے ہو، مدرسہ کے لئے امیروں سے چندہ کیوں کرتے ہو، کیا حق تعالیٰ کی مدد کافی نہیں؟ ایسے ہی ہم نبیوں ولیوں سے مدد لیتے ہیں، جواب تحقیقی یہ ہے، کہ یہ حضرات رب تعالیٰ کے خدام اوراس کے مظہر ہیں، خدام کی مدد مولیٰ کی مدد ہے، حکام کی امداد اوران کی طرف رجوع کرنا سلطان ہی کی مدد ہے، اس کی طرف رجوع ہے، رب تعالیٰ خود ہی ہم کو ان بزرگوں کے آستانوں پر بھیج رہا ہے، شعر

مجرم بلائے آئے ہیں جاؤک ہے گواہ پھر رد ہو کب یہ شان کریموں کے در کی ہے

تیسرا اعتراض: اس جگہ يَرُدُّوْكُمْ کیوں فرمایا گیا؟ رد کے معنی ہیں پہلی حالت پر پہنچا دینا، کیا کفر پہلا حال ہے، اصلی حال تو اسلام ہے، **جواب:** یہاں روئے سخن ان غازیانِ احد سے ہے جو پہلے سے مومن نہ تھے، کفر میں مبتلا تھے، حضور انور ﷺ کی مدینہ میں تشریف آوری پر ایمان لائے، ان کا پہلا حال کفر تھا، فرمایا جا رہا ہے، کہ اگر تم ان کفار کی باتوں میں آ گئے، تو جیسے تم پہلے تھے، یعنی کفر میں، ویسا ہی تم کو پھر کردیں گے، وہ جو کہا جاتا ہے کہ اسلام فطری دین ہے، اور اسلام ہی ہمارا اصلی حال ہے، وہاں اسلام سے مراد لغوی اسلام ہے، یعنی میثاق کے دن جو رب تعالیٰ سے سب نے اقرارِ توحید ورسالت کیا تھا، اس اقرار پر ہر بچہ پیدا ہوتا ہے، پھر یہاں آکر ماں باپ اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، وہ حالت یہاں مراد نہیں، **چوتھا اعتراض:** احد کی ہزیمت پر نو مسلم حضرات کو ورغلانے والے عموماً منافقین تھے جو یہود تھے یا پہلے یہود ورغلاتے تھے، یہ دونوں ٹولے ان حضرات کا پھر مشرک بن جانا نہیں چاہتے تھے، یہ تو انہیں یہود بنانا چاہتے تھے، پھر يَرُدُّوْكُمْ کیوں درست ہوا، رد کے معنی ہیں پہلی حالت پر لوٹ جانا، پہلی حالت ان حضرات کی شرک تھی نہ کہ یہودیت، **جواب:**

یہود چاہتے تھے، کہ یہ حضرات مسلمان نہ رہیں، خواہ اپنے ہی دین میں لوٹ جائیں یعنی مشرک بن جائیں، ہر کافر اسلام دشمنی میں یکساں ہے، اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ بالکل حق ہے، کہ وہ بہکانے والے یہود ان حضرات کو پھر دوبارہ مشرک کر دینا ہی چاہتے تھے کہ اسلامی طاقت و جماعت کم ہو، کیا تمہیں خبر نہیں کہ یہود مدینہ مشرکینِ مکہ کے پاس جا کر ان کے بتوں کی قسمیں کھا آئے، اور بولے اے مشرکو تم حق پر ہو، مسلمانوں سے تم زیادہ ہدایت پر ہو، جیسے قرآن کریم فرماتا ہے يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ الآیہ (النساء:۵۱)

تفسیر صوفیانہ

مال کا چور تین چیزیں دیکھ کر کسی گھر میں گھستا ہے، دولت اور غفلت و ظلمت یعنی گھر دولت سے بھرا ہو، مالک غافل ہو، وقت اندھیرے کا ہو، دنیا اندھیری جگہ ہے، دل دولتِ ایمان کا گھر ہے، اگر مومن بیدار و ہوشیار ہے، تو شیطان جو ایمان کا چور ہے، وہاں نہیں گھستا، اور اگر غافل ہے تو داؤں لگاتا ہے، دیکھو جنگِ بدر کے شکست خوردہ کفار سے مدینہ کے منافقین یا یہودیوں سے نہ کہا کہ اگر تم حق پر ہوتے تو شکست کیوں کھاتے، کیونکہ ان کے دل دولتِ ایمان سے پہلے ہی خالی تھے، وہاں جا کر چور لیتا گیا، اور جنگِ احد کی ہزیمت پر حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما سے کسی بے دین کو ایسی گفتگو کرنے کی ہمت نہ پڑی، کیونکہ وہاں خانۂ دل میں دولت تو تھی مگر مالک بیدار تھا، ہاں ضعفائے مومنین اور نو مسلم حضرات جن کی بیداری ابھی مکمل نہ ہوئی تھی، وہاں چور نے نقب لگانے کی کوشش کی، ان سے ان بے دینوں نے کہا، اگر تم حق پر ہوتے، تو شکست کیوں کھاتے یا اگر نبی کریم ﷺ سچے نبی تھے، تو وہ شہید کیوں ہو گئے وغیرہ وغیرہ، مگر چونکہ ان دلوں پر بھی آفتابِ نبوت کی شعائیں پہنچ رہی تھیں، یہاں ظلمت نہ تھی، اس لئے چور یہاں بھی ناکام رہے، اس آیت کریمہ میں رب تعالیٰ نے ہم غافلوں کو جگایا ہے، اور فرمایا ہے کہ اے ایمان کی دولت والو! تمہارے گھر میں چونکہ دولت ہے، تمہارے واسطے غفلت اور ظلمت بڑی خطرناک ہے اگر تم نے کفار کے مشوروں کو مان لیا، تو جان لو، کہ چور تمہارے گھر میں داخل ہو گیا، اب تمہاری دولت کی خیر نہیں، دنیا کا یہ سنسان اور ویران جنگل، بہت بیداری سے طے کرو، یہ جگہ سونے کی نہیں، آنکھ سے سونا گانٹھ کے سونے کی چوری کراوے گا، اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے اس کا کیسا نفیس نقشہ کھینچا ہے کہ فرمایا، شعر

سونا جنگل رات اندھیری چھائی بدلی کالی ہے — سونے والو جاگتے رہیو چوروں کی رکھوالی ہے
سونا پاس ہے سونا بن ہے سونا زہر ہے اٹھ پیارے — تو کہتا ہے میٹھی نیند ہے مت ہی تیری نرالی ہے

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ خاسرین فرمانے میں ایک لطیف اشارہ اس جانب ہے کہ خاسر وہ ہوتا ہے، جس کے پاس پہلے مال ہو، پھر نہ رہے، جو پہلے ہی سے قلاش تھا وہ خاسر کیسا؟ تمہارے پاس دولتِ ایمان ہے، اگر کھو بیٹھے، تو بڑا خسارہ اٹھاؤ گے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی دولت ایمان کا حافظ و ناصر ہے،

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ

عنقریب ڈال دیں گے ہم ان کے دلوں میں رعب جو کافر ہوئے اس لئے کہ
کوئی دم جاتا ہے ہم کافروں کے دلوں میں رعب ڈالیں گے
اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا
انہوں نے اللہ کا شریک مانا ان چیزوں کو جن پر کوئی حجت نہ اتاری
کہ انہوں نے اللہ کا شریک ٹھہرایا جس پر اس نے کوئی سمجھ نہ اتاری
وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾
اوران کا ٹھکانا آگ ہے اور بری ہے خواب گاہ ظالموں کی
اوران کا ٹھکانا دوزخ ہے اور کیا برا ٹھکانہ ہے ناانصافوں کا

تعلقات

اس آیت کا گزشتہ آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مسلمان غازیوں کو گزشتہ زمانوں کے مجاہدین کے کارنامے سنا کر انہیں جہاد پر دلیر کیا تھا، اب انہی غازیوں کو فتح و نصرت کے وعدے دے کر دلیر بنایا جا رہا ہے، غرضکہ پچھلی آیتیں بھی دلیری کے لئے تھیں، اور یہ آیت بھی اسی لئے ہے، مگر وہ آیتیں ماضی کے لحاظ سے تھیں، اور یہ مستقبل کے لحاظ سے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں منافقین و یہود کی ان باتوں کا ذکر تھا جو غازیوں میں بزدلی پیدا کریں، اب رب تعالیٰ کے ان وعدوں کا ذکر ہے جن سے غازیوں کی ہمتیں بڑھیں، گویا زہر کا ذکر پہلے تھا، تریاق کا ذکر اب ہے، **تیسرا تعلق:** گزشتہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا تھا، کہ اے مسلمانو تمہارا والی وارث اللہ تعالیٰ ہے، اور وہی تمہارا مددگار ہے، اب اس آیت میں اسی کا ثبوت دیا جا رہا ہے، کہ ہم تمہیں کفار کے سامنے شکست نہ کھانے دیں گے، تم یہاں رہو گے، مگر تمہارا رعب کفار کے سینوں میں نیزہ بن کر گڑھا رہے گا،

شانِ نزول

ابن جریر نے سدی سے روایت کی، کہ جب ابوسفیان اور مشرکینِ مکہ احد کے میدان سے واپس مکہ کی طرف گئے، تو ابوسفیان نے ایک مقام پر اپنے ساتھی کفار سے کہا کہ ہم نے بڑی غلطی کی، کہ درختِ اسلام تو کاٹ آئے، مگر اس کا تنا اور جڑ باقی چھوڑ آئے، حالانکہ ان کا کاٹنا اس وقت نہایت آسان تھا، لوٹو! اسلام کا خاتمہ ہی کر کے دم لیں گے، ایک اعرابی (بدوی) کو کچھ مزدوری دے کر حضور انور ﷺ کی خدمت میں ابوسفیان نے بھیجا کہ کہہ دینا ہم پھر آ رہے ہیں، سنبھل جائیں، نبی کریم ﷺ نے انہی صحابہ کو حکم دیا کہ چلو، یہ حضرات اسی حالت میں زخموں پر پٹیاں باندھے ہوئے، ابوسفیان کے مقابلہ کے لئے نکل پڑے، حتی کہ منزل حمراء الاسد پر پہنچ گئے، مگر کفار کا کہیں پتہ نہ لگا، اسی منزل میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، جس میں فرمایا گیا، گھبراؤ نہیں اب وہ تمہارے مقابلہ میں نہیں آ سکیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ابوسفیان اور ان کے ساتھیوں پر مسلمانوں کی

متعلق فرمایا لَا رَیْبَ فِیْهِ مگر افسوس ہے کہ ہم کو ان مشکوک دنوں کی فکر بھی ہے اور ان کی تیاری بھی۔ بارش سے پہلے مکان بناتے ہیں۔ سردی آنے سے پہلے اس کے لباس بناتے ہیں مگر اس یقینی دن کی نہ فکر نہ تیاری۔ اگر ہم اس دن کی فکر و تیاری کریں تو رب تعالیٰ ان فکروں سے آزاد کردے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْــًٔا ؕ
تحقیق وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہرگز نہ دفع کرے گی ان سے مال ان کے اور نہ اولاد ان کی طرف اللہ کے کسی چیز کو
بے شک وہ جو کافر ہوئے ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ سے انہیں کچھ نہ بچا سکیں گے
وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ﴿۱۰﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ
اور یہ لوگ وہ ایندھن ہیں آگ کے مثل طریقہ اہل فرعون کے اور ان کے جو پہلے سے تھے ان کے
اور وہ ہی دوزخ کے ایندھن ہیں جیسے فرعون والوں اور ان سے اگلوں کا طریقہ
كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۱﴾
جھٹلایا انہوں نے نشانیوں کو ہماری پس پکڑا ان کو اللہ نے بوجہ گناہوں ان کے اور اللہ سخت عذاب والا ہے
انہوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں تو اللہ نے ان کے گناہوں پر ان کو پکڑا اور اللہ کا عذاب سخت ہے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** قرآن کریم کا دستور ہے کہ ایمان کے ساتھ کفر کا' مسلمانوں کے ساتھ کفار کا' نور کے ساتھ تاریکی کا ذکر فرماتا ہے تاکہ انسان مومنوں کی صفتیں حاصل کرے اور کفار کے عیوب سے بچے۔ چنانچہ اب تک مسلمانوں خصوصاً علماء کے اوصاف بیان فرمائے گئے۔ اب کفار کے عیوب کا ذکر ہو رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں مسلمانوں کی دعا' ان کی عاجزی وزاری کا ذکر فرمایا گیا تھا۔ اب کفار کی سخت دلی اور رب تعالیٰ سے بے پرواہی کا ذکر ہے کیونکہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں بتایا گیا تھا کہ مسلمانوں کو اپنی اولاد و مال تو کیا خود اپنے پر بھی اعتماد نہیں کہ وہ نیکیاں کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں اور رب تعالیٰ سے دعائے استقامت مانگتے ہیں۔ اب کفار کا ذکر ہے کہ وہ اس کے برخلاف اپنے مال اور اولاد پر بھروسہ کر کے رب سے بے پرواہ رہتے ہیں مسلمانوں کا وہ خوف ہی ان کی مقبولیت کا ذریعہ ہے اور کفار کی یہ بے خوفی ان کی مردودیت کا سبب۔

تفسیر

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا۔ ظاہر یہ ہے کہ اس سے سارے کفار مراد ہیں۔ خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرکین مگر بعض نے کہا کہ اس سے فقط وہ نجرانی عیسائی مراد ہیں جو اپنی آمدنی بند ہو جانے کے خوف سے اسلام قبول نہ کرتے تھے۔ (معانی) عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس سے مر[illegible] کافروں کے لئے ہے۔ کفر کی صد ہا

السلام نے اپنے بھائی کو اپنے سے ملالیا، اور فرماتا ہے اٰوٰی اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ (ہود: ۸۰) ٹھکانے کو ماوی اس لئے کہتے ہیں، کہ ٹھکانے والا اس سے جا کر ملتا ہے، اور وہیں ٹھہرتا ہے وَبِئْسَ مَثْوَی الظّٰلِمِیْنَ مثوی ثوی سے بنا بمعنی مستقل ٹھہرنا یوں سمجھو کہ اوی عارضی طور پر ٹھہر جانے کو کہا جاتا ہے، اور ثوی مستقل طور پر ٹھہرنے کو چونکہ دوزخ کفار کی دائمی قیام گاہ ہے، اس لئے اسے مثوی کہا گیا یعنی کفار کا یہ دائمی ٹھکانہ بہت ہی برا ہے، ظَالِمْ ظلم بمعنی کفر سے ہے،

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! احد کا واقعہ ایک عارضی تھا تم اس سے بددل مت ہونا، اور جو خبریں کفار مکہ کے لوٹنے کی آرہی ہیں، تم ان سے گھبرا نہیں جانا، ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تمہارا رعب و ہیبت ان کے دلوں میں ایسا پیدا کر دیں گے، کہ اب انہیں تمہاری طرف رخ کرنے کی ہمت ہی نہ پڑے گی، وہ سمجھیں گے، کہ احد میں ہمارا یہ غلبہ ایک اتفاقی امر تھا جو ایک دھوکا کی بنا پر ہوگیا، ورنہ پہلے مسلمان ہی جیت گئے تھے، اب اگر مقابلہ ہوا تو مسلمان ہمیں پیس کر رکھ دیں گے، ان کی یہ مرعوبیت اس بنا پر ہے، کہ وہ ہیں مشرک، جنہوں نے بغیر نقلی یا عقلی دلیل کے محض اپنے وسوسوں سے بہت چیزوں کو خدا کا شریک مان لیا، اب مصیبت کے وقت انہیں یہی نہیں سوجھتا کہ ہم جائیں کدھر، اور فریاد کون سے خدا سے کریں، چند گھروں کا مہمان بھوکا ہی رہتا ہے، خصوصاً جبکہ ناخواندہ اور بن بلایا بھی ہو، دنیا میں تو ان کی یہ ذلت و خواری ہے اور آخرت میں ان کا یہ حال ہوگا کہ ان کا عارضی ٹھکانہ یعنی جائے پناہ بھی آگ ہوگی، اور دائمی قیام گاہ بھی آگ کہ جب وہاں کی مصیبتوں سے گھبرائیں گے، تو آگ ہی کے کسی طبقہ کے طرف بھاگیں گے، پیاسے ہوں گے تو حمیم یعنی کھولتے پانی کی طرف بھاگیں گے، اور بھوکے ہوں گے تو زقوم یعنی تھوہر کی طرف پناہ لیں گے، جس کا کھانا پینا ان کے لئے بھوک سے زیادہ تکلیف دہ ہوگا، سوچ لو، ایسی جائے قرار کیسی بری اور کتنی تکلیف دہ ہے،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** رعب یعنی دلوں میں ہیبت اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت ہے جو کسی کو ملتی ہے، اس ہیبت سے دینی دنیوی بہت کام نکلتے ہیں، حضور انور ﷺ بڑے اخلاق کے مالک تھے کہ جو آپ کے ساتھ رہتا، آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا، مگر ہیبت کی یہ کیفیت تھی، کہ ایک مہینہ کی راہ سے آپ کی ہیبت زائر کے دل میں بیٹھ جاتی تھی، چنانچہ احمد وغیرہ نے حضرت ابو امامہ سے مرفوعاً روایت کی، کہ رب تعالیٰ نے میری ہیبت ایک ماہ کے راستہ سے قائم فرمائی، بلکہ اب بھی زائرین مدینہ کے دلوں میں راہ مدینہ میں ہی ہیبت بیٹھ جاتی ہے، بعض حضرات حاضری کے وقت باب السلام پر ہی کانپتے اور لرزتے دیکھے گئے ہیں، **دوسرا فائدہ:** ایمان و تقویٰ کی برکت سے متقی مومن کی ہیبت لوگوں کے دلوں میں بیٹھتی ہے، اگرچہ وہ مومن بالکل سیدھا سادھا ہی ہو بلکہ بعض اللہ والوں کی ہیبت تو جانوروں، دریاؤں، لکڑی، پتھروں میں بھی ہوتی ہے، اور وہ سب اس کی اطاعت کرتے ہیں، کیا تمہیں خبر نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم اور ہیبت سے سوکھا ہوا دریائے نیل تا قیامت جاری ہوگیا، اور آپ کے خوف سے زمین نے جو سا ہوا تیل اگل دیا، تاریخ دان حضرات پر یہ باتیں مخفی

نہیں، مولانا فرماتے ہیں، شعر

ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

اور پھر مولانا یوں فرماتے ہیں، شعر

ہر کہ دیوانہ بود در ذکر حق زیر پائش عرش و کرسی نہ طبق

بوستاں میں شیخ سعدیؒ نے فرمایا کہ میں نے ایک شخص کو شیر پر سوار دیکھا تو گھبرا گیا، اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے فرمایا، شعر

توہم گردن از حکم داور مپیچ کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

تیسرا فائدہ: کفر میں قدرتی طور پر بزدلی ہے، اور کافر میں مرعوبیت، ایمان وتقویٰ وہ نور ہے جو کافر کے دل کی آنکھ کو خیرہ کر دیتا ہے، یہ تو قرآن شریف فرمارہا ہے، کہ فرعون کے جادوگر بحالتِ کفر اس کی پرستش کرتے تھے، مگر ایمان لاتے ہی ایسے دلیر ہو گئے، کہ اسے للکار کر کہنے لگے فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (طٰہٰ: ۷۲) یعنی جو تجھ سے ہو سکے ہمارا بگاڑ لے، ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہتیں، ایک دل میں دو خوف جمع نہیں ہوتے خوفِ خالق اور خوفِ مخلوق، **چوتھا فائدہ:** مشرکین نے جن چیزوں کو بھی خدا کا شریک ٹھہرایا، بلا دلیل محض اپنے خیال فاسد سے ٹھہرایا، جیسا کہ مَالَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ الآیہ سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** اگرچہ بعض گنہگار مسلمان بھی دوزخ میں جائیں گے، مگر دوزخ ان کا ٹھکانہ نہ ہوگا، محض عارضی منزل ہوگا، ٹھکانہ صرف کفار کے لئے ہے جیسا کہ مَاْوٰىهُمُ سے معلوم ہوا،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار کے دل میں مومنوں کا قدرتی رعب ہوگا، مگر اب معاملہ بالکل برعکس ہے، کہ اب تو مسلمانوں کے دلوں میں کافروں کا رعب ہے اور کافر مسلمانوں پر دلیر ہیں، تو یہ آیت صحیح کیونکر ہوئی؟

جواب: اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ یہ وعدہ غازیانِ احد کے لئے تھا، جو پورا ہو چکا کہ رب تعالیٰ نے ابوسفیان وغیرہ کفار مکہ کے دلوں میں ان زخمی مسلمانوں کا ایسا رعب ڈالا کہ وہ واپس لوٹنے کا ارادہ کر کے نہ آسکے اور مسلمانوں پر دوبارہ حملہ نہ کر سکے، دوسرے یہ کہ یہ وعدہ تا قیامت مسلمانوں کے لئے ہے، مگر جب مسلمان صحیح طور پر مسلمان رہیں، اور اخلاص کے ساتھ جہاد کریں، لیکن اگر مسلمان خود ہی اپنا جوہر کھو دیں کہ نہ دل میں تقویٰ ہو نہ نیت میں اخلاص، تو ان کا اپنا قصور ہے، رب تعالیٰ کی رحمت اب بھی تیار ہے، ہم لینے والے تو بنیں، حدیث شریف میں فرمایا گیا، ایک زمانہ وہ آجائیگا کہ کفار ایک دوسرے کو مسلمانوں کو مٹانے کے لئے ایسی دعوت دیں گے، جیسے دسترخوان پر کھانے والوں کو بلایا جاتا ہے، عرض کیا گیا کیوں؟ فرمایا مسلمانوں کی ہیبت کفار کے قلب سے نکل جائے گی، عرض کیا گیا، کیوں نکلے گی، فرمایا دو وجھوں سے، محبت دنیا اور موت سے ڈر، ڈاکٹر اقبال اسی کو دیکھ کر روئے ہیں، کہ اپنی کتاب جواب شکوہ میں فرماتے ہیں، شعر

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

دوسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا، کہ شرک کی دلیل تو ہے، مگر رب تعالیٰ نے اتاری نہیں، کیونکہ مَالَمْ یُنَزِّلْ

معنی پکڑنا ہیں مگر یہاں عذاب دینا مراد ہے۔ ھُمْ کا مرجع فرعونی اور سارے کفار ہیں۔ ب سببیہ ہے اور ذنوب ذنب سے بنا۔ بمعنی تابع اور پیچھے لگنے والا۔ اس لئے دم کو ذنب کہتے ہیں۔ گناہ کو بھی اس لئے ذنب کہتے ہیں کہ وہ اپنے کرنے والے کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ (معانی و روح) تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اصطلاح میں ہر اس فعل کو ذنب کہتے ہیں جس کا نتیجہ ناگوار ہو۔ لسان العرب میں ہے۔ الذنب الاثم والجرم والمعصیۃ کہ ذنب اثم اور جرم اور معصیت سب کو کہتے ہیں۔ جو ثواب سے روکے وہ اثم ہے اور جو رب سے تعلق قطع کر دے وہ جرم۔ جرم قطع اور معصیت نافرمانی کو کہتے ہیں خواہ جان بوجھ کر ہو یا بھول چوک سے معلوم ہوا کہ لفظ ذنب زبان عرب میں بہت وسیع ہے۔ کبھی اس کام کو ذنب کہہ دیتے ہیں جو حقیقت میں گناہ نہ ہوگا مگر اس کا انجام ناگوار ہو اور غلطی کو بھی ذنب کہہ دیا جاتا ہے۔ اس کا بہتر ترجمہ قصور ہے۔ بڑے گناہ کو بھی ذنب کہہ دیتے ہیں اور چھوٹی سی غلطی کو بھی یہاں بڑے بڑے گناہ جیسے کفر بت پرستی انبیائے کرام کا قتل ان کی مخالفتیں سب مراد ہیں کیونکہ انہوں نے یہ سارے گناہ کئے تھے۔ اس لئے یہاں جمع ارشاد ہوا۔ یعنی ان سب کو اللہ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا اور کیوں نہ پکڑتا۔ وَاللّٰہُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ۔ اللہ سخت عذاب والا ہے۔ عقاب عقب سے بنا۔ بمعنی پیچھے اسی لئے ایڑی کو عقب کہتے ہیں کہ وہ پیچھے ہوتی ہے ہم عتاب عذاب اور عقاب کا فرق پہلے سیپارہ میں بیان کر چکے۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی ﷺ کفار اپنے مال' اولاد کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ کفر کی وجہ سے جو ہم پر عذاب آئے گا اسے ہم دنیوی مصیبتوں کی طرح اپنے مال' اولاد کے ذریعہ ٹال دیں گے مگر ان کا یہ خیال غلط ہے۔ کفار پر جب کفر کی وجہ سے عذاب الٰہی آئے گا تو ان کے مال اولاد سب بے کار ثابت ہوں گے۔ وہ اللہ کی بھیجی مصیبت کو دفع نہیں کر سکیں گے اور یہ لوگ دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔ جیسے ایندھن کی رگ و ریشہ میں آگ سرایت کر جاتی ہے۔ ایسے ہی ان کے رگ و ریشہ میں جہنم کی آگ بھڑکے گی۔ اسلام کے مقابلہ میں ان کی ناکام کوشش ایسی ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں فرعونیوں کی کوشش تھی یا ان پر کفر کا وبال ایسا آئے گا جیسے فرعونیوں اور ان سے پہلے والے کافروں پر آیا کہ وہ ان سے بڑھ کر مالدار اور صاحب اولاد تھے مگر جب عذاب آیا تو کوئی چیز ان کے کام نہ آئی۔ انہوں نے ہماری آیتوں' نشانیوں' انبیاء کے معجزات کو جھٹلایا' ان کو ایذائیں پہنچائیں۔ پہلے تو رب نے انہیں مہلت دی۔ پھر جب ان کا پیالہ گناہوں سے بھر گیا تو سارے گناہوں کے عوض رب نے اچانک انہیں پکڑ لیا۔ اللہ سخت عذاب والا ہے۔ اس کے عذاب سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ ایسے ہی ان کا حال ہوگا۔ جب جرم یکساں ہے تو عذاب کیوں نہ یکساں ہو۔ خیال رہے کہ رب کی پکڑ جلد نہیں ہوتی۔ بہت مہلت ملتی ہے کہ بندہ سنبھل جائے مگر جب بندہ رب کے حلم سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے تب پکڑا جاتا ہے۔ فرعون دعویٰ خدائی کرتا رہا' بچے ذبح کرتا رہا مگر سر میں درد بھی نہ ہوا جب پیالہ بھر گیا تو پکڑ لیا۔ آیا ایسے ہی کفار عرب رب کی ڈھیل سے دھوکہ نہ کھائیں بلکہ جلد سنبھل جائیں ورنہ مارے جائیں گے۔ اللہ کی چکی دیر میں پیستی ہے مگر بہت باریک پیستی ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے ... پہلا فائدہ: ... مال ... کام نہ آنا اور ان کے ذریعہ عذاب الٰہی

طبیعت کی بیماری کیا ہے؟ فرمایا حرام غذا کھانا، پوچھا گیا، عادت کی پیروی کیا ہے؟ فرمایا ناجائز نگاہیں، حرام چیز سننا، غیبت کرنا، عرض کیا گیا کہ صحبت کی خرابی کیا ہے؟ فرمایا جو نفس چاہے وہ کر لینا، اس آیت میں فرمایا گیا کہ ہم مومن دلوں کا رعب نفس امارہ پر ڈال دیں گے، نفس امارہ نے دنیا کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا کہ اسے اصل مقصود بنا لیا، نفس امارہ کی پیروی کرنے والوں کا انجام فراق یار کی نار ہے جو ان کا برا ٹھکانہ ہے (از روح البیان مع زیادت)

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ
اور یقیناً سچ کر دکھایا تم کو اللہ نے وعدہ اپنا جب قتل کرتے تھے تم انہیں
اور بے شک اللہ نے تمہیں سچ کر دکھایا اپنا وعدہ جبکہ تم اس کے حکم
بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ
اللہ کے حکم سے تا آنکہ جب بزدلی کی تم نے اور جھگڑ پڑے تم حکم میں
سے کافروں کو قتل کرتے تھے یہاں تک کہ جب تم نے بزدلی کی اور حکم میں جھگڑا ڈالا
وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ
اور نافرمانی کی تم نے پیچھے اس کے کہ دکھا دی رب نے تمہیں وہ چیز جو پسند کرتے تھے تم
اور نافرمانی کی بعد اس کے کہ اللہ تمہیں دکھا چکا تھا تمہاری خوشی کی بات تم
مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ
تم میں بعض وہ تھے جو ارادہ کرتے تھے دنیا کا اور تم میں بعض وہ تھے جو ارادہ کرتے تھے آخرت کا پھر
میں کوئی دنیا چاہتا تھا اور تم میں کوئی آخرت چاہتا تھا پھر تمہارا
صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ
پھیر دیا تم کو ان سے تاکہ امتحان کرے تمہارا اور یقیناً معاف کر دیا تم سے
منہ ان سے پھیر دیا کہ تمہیں آزمائے اور بے شک اس نے تمہیں معاف کر دیا
وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾
اور اللہ مہربانی والا ہے مسلمانوں پر
اور اللہ مسلمانوں پر فضل کرتا ہے

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں ہے کہ صرف کفار ہی جہنم کا ایندھن ہیں۔ اور وہ ہی جہنم میں جائیں گے جیسا کہ ھم کے حصر سے معلوم ہوا' حالانکہ حدیث شریف سے ثابت ہے کہ گنہگار مسلمان بھی کچھ دن جہنم میں رہیں گے۔ ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ جہنم صرف کفار کی خاطر بنی ہے۔ مسلمانوں کا جانا ان کی طفیل ہے کہ جو مسلمان کافروں جیسے کام کریں' یا مسلمانوں کے مقابل ان سے الفت و محبت رکھیں۔ وہ ان ہی کے ساتھ دوزخ میں جائیں۔ لہٰذا جہنم کے ایندھن وہ ہی ہوئے۔ جیسے لکڑی کے ساتھ کا کیڑا بھی آگ میں پہنچ جائے۔ وہ آگ کا ایندھن نہیں۔ یہاں ایندھن ہونے کا حصر ہے نہ کہ جانے کا۔ دوسرا یہ کہ آگ میں جانا دو طرح ہے۔ لوہار کی بھٹی میں لوہا بھی جاتا ہے اور کوئلہ بھی رکھا جاتا ہے مگر کوئلہ اس کا ایندھن ہے اور لوہا کچھ دیر کے لئے صاف ہونے گیا ہے۔ پھر نکال لیا جائے گا۔ یونہی کفار وہاں کے ایندھن ہیں اور مسلمان گناہوں کا میل اتارنے جائیں گے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ سارے کفار آگ ہی میں جائیں گے تو دوزخ کے ٹھنڈے طبقوں میں کون جائے گا۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں کفروا سے وہ خاص کفار مراد ہیں جن کے بارے میں یہ آیت آئی کہ یہ کفار آگ میں جائیں گے۔ دوسرا یہ کہ نار سے مراد دوزخ ہیں جز بول کر کل مراد لیا گیا۔ تیسرا یہ کہ دوزخ کی ٹھنڈک بھی آگ کی وجہ سے ہوگی جو طبقے آگ سے قریب ہیں وہ گرم اور جو دور ہیں وہ ٹھنڈے۔ جیسے دنیا کی سردی گرمی سورج کی وجہ سے ہے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار سے عذاب دفع نہ ہوگا۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ ابو طالب کا عذاب ہلکا ہے۔ حضور انور ﷺ کی خدمت کے باعث اور ابولہب کا عذاب سوموار کو ہلکا ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کی ولادت کی خوشی کے باعث (بخاری شریف) تو اس آیت اور ان احادیث میں موافقت کیونکر ہو؟ **جواب:** ان احادیث میں عذاب ہلکے ہونے کا ذکر ہے اور اس آیۃ میں عذاب دفع ہونے کی نفی ہے۔ تخفیف عذاب اور ہے اور دفع عذاب کچھ اور۔ تخفیف کا ثبوت ہے' دفع کی نفی لہٰذا آیت و حدیث میں تعارض نہیں۔

تفسیر صوفیانہ

مسلمان کے مال و اولاد قرب الٰہی کا ذریعہ ہیں اور اس کے لئے باعث ثواب۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ بیوی بچوں کو پالنا عبادت ہے۔ حتیٰ کہ بیوی کے منہ میں لقمہ دینا عبادت اس سے صحبت کرنا ثواب' کیونکہ مسلمان کو ان سے دلی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ ان کی خدمت اس لئے کرتا ہے کہ رب تعالیٰ کا حکم ہے۔ لہٰذا یہ تمام چیزیں اس لئے کہ جمال الٰہی کا آئینہ ہیں لیکن کفار ان کی اولاد و مال ان کے لئے سبب حجاب ہیں۔ اور رب سے دوری کا ذریعہ' کیونکہ اسے ان چیزوں سے دلی تعلق ہے اور یہ ہی اس کے حقیقی محبوب' لہٰذا یہ چیزیں اسے عذاب سے بچاتیں۔ تو کیا اور عذاب بڑھائیں گی۔ دیکھو فرعون اور فرعونیوں کا سارا مال و اسباب ذریعہ عذاب بنا۔ (ابن عربی) اس کی مثال یوں سمجھو کہ پریس میں ایک پلیٹ پر قرآن ہے اور دوسری پلیٹ پر باغیانہ مضمون' قرآن والی پلیٹ سے جو کاغذ چھپے گا وہ قرآن بنے گا۔ خواہ ہلکا ہو یا وزنی اور دوسری پلیٹ سے جو کچھ چھپے گا وہ باغیانہ کتاب ہوگی۔ اس کاغذ کا بلا وضو چھونا جائز' اور ناپاکی کی حالت میں چھونا حرام۔ نیز اس کا ہر جگہ ادب و احترام مگر اس کاغذ

کا چھاپنا جرم رکھنا بغاوت شائع کرنا باعث سزا۔قرآن میں فرعون کا نام آ جائے' یا ہامان کا' یا ابولہب کا آ جائے یا شیطان کا وہ قابل تعظیم ہے کہ اس کے پڑھنے پر ثواب اور اس کو بلاوضو چھونا گناہ کہ اگرچہ وہ لوگ خبیث تھے مگر یہ الفاظ تو جزو قرآن ہیں۔ ان پر قرآن کے احکام جاری مگر باغیانہ کتاب میں بادشاہ کا نام آ جائے۔ یا وزیر کا' فقیر کا آ جائے یا امیر کا کچھ معظم نہیں۔ حکومت سب کو جلوادے گی۔ یہ ہی حال کفار اور ان کے مال کا ہے۔ کفار باغیانہ مضمون کی پلیٹ ہیں۔ جو چیز ان سے قرب حقیقی رکھے وہ خدا کا عذاب ہے۔ مسلمان رحمت الٰہی کے پلیٹ ہیں جو چیز ان کے پاس آئے وہ رحمت۔ غور تو کرو کہ قیامت میں چاند' سورج' تارے' کفار کے بت سب ہی جہنم میں جائیں گے۔ بولو ان بے چاروں نے کونسا گناہ کیا تھا مگر کفار نے ان سے تعلق رکھا۔ ان کا بیڑا غرق کیا۔ اصحاب کہف کا کتا' صالح علیہ السلام کی اونٹنی وغیرہ جنت میں جائیں گے۔ بتاؤ انہوں نے کون سی نیکی کی تھی' صرف یہ کہ وہ نیکوں کے پاس رہے تھے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ بے دین مولوی کے علم کی مثال ایسی ہے جیسے سامری کا بچھڑا' سامری نے فرعونیوں کے سونے سے بچھڑا بنایا اور اس کے منہ میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے گھوڑے کی ٹاپ کے نیچے کی خاک ڈالی جو نہایت طیب و طاہر تھی۔ اس خاک کے اثر سے اس میں آواز پیدا ہوئی۔ اس آواز نے ہزاروں اسرائیلیوں کو گمراہ کر دیا۔ اگر یہ خاک کسی اللہ والے کے منہ میں جاتی تو نہ معلوم کیا تاثیر دکھاتی۔ خاک تو اشرف تھی مگر وہ سونا خبیث کا تھا۔ ایسے ہی بے دین عالم کا حال ہے کہ اس کا قلب گویا فرعونی ہوتا ہے اس کا علم گویا وہ جبریلی خاک۔ اس علم کے ذریعہ وہ جو بولتا ہے اس سے ہزاروں گمراہ کر دیتا ہے۔ اس کا علم' اس کی عبادت' اس کے رکوع' سجدے' اس کی قرآن خوانی' اس کا مال و اسباب' سب جہنم کے ایندھن ہیں۔ فرعون کے ساتھ اس کا گھوڑا' اس کا لباس' اور باقی ساز و سامان سب ہی ڈوبا۔ اللہ علم کے ساتھ ایمان بھی عطا فرمائے۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾

فرمادو واسطے ان کے جنہوں نے کفر کیا عنقریب مغلوب ہوگے تم اور جمع کیے جاؤ گے طرف دوزخ کی اور برا ہے وہ بستر

فرمادو کافروں سے کوئی دم جاتا ہے کہ مغلوب ہوگے اور دوزخ کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ بہت ہی برا بچھونا

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰیَةٌ فِیْ فِئَتَیْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ اُخْرٰى

بیشک ہے واسطے تمہارے نشانی بیچ دو جماعتوں کے جن میں ایک جماعت جنگ کرتی ہے بیچ راستے اللہ کے اور دوسری

بیشک تمہارے لئے نشانی تھی دو گروہوں میں جو آپس میں بھڑ پڑے ایک جتھا اللہ کی راہ میں لڑتا اور دوسرا

كَافِرَةٌ یَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَیْهِمْ رَاْیَ الْعَیْنِ ؕ وَ اللّٰهُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ

کافرہ ہے دیکھتے ہیں وہ ان کو دو مثل اپنا دیکھنا آنکھ کا اور اللہ قوت دیتا ہے ساتھ مدد اپنی کے جس کو چاہتا ہے

کافر کہ انہیں آنکھوں دیکھنا اپنے سے دونا سمجھیں اور اللہ اپنی مدد سے زور دیتا ہے جسے چاہتا ہے

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

نے کہا نہ چھوڑو وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ یہ واؤ عاطفہ ہے، اور اس جملہ کی ترکیب پہلے بیان کی جا چکی ہے، یا تو فَشِلْتُمْ پر معطوف ہو کر شرط ہے، اور یا تَنَازَعْتُمْ پر معطوف ہو کر جزاء عصیان سے مراد دیدہ و دانستہ نافرمانی نہیں، بلکہ خطاءً سرکار کے فرمان پر عمل نہ کرنا ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (طٰہٰ: ۱۲۱) ان جیسے مقامات میں جو عصیان کے معنی نافرمانی کر کے صحابہ کرام یا آدم علیہ السلام کو فاسق یا کافر کہے وہ بے ایمان ہے، دونوں ما موصولہ ہیں، اَرٰىكُمْ سے آنکھوں سے دکھانا مراد ہے، مَّا تُحِبُّوْنَ سے مراد کفار کا بھاگنا، مسلمانوں کا غلبہ اور غنیمت کا حصول ہے، یعنی تم نے اس وقت دھوکا کھایا اور نبی ﷺ کے فرمان کی مخالفت کر بیٹھے، جبکہ تمہیں رب تعالیٰ نے تمہاری پسندیدہ چیز، تمہاری فتح، کفار کی بھاگڑ، غنیمت کا حصول آنکھوں دکھا دیا، خیال رہے کہ یہ تینوں خطائیں اگرچہ صرف ان چالیس حضرات سے سرزد ہوئیں، جنہوں نے درہ چھوڑ دیا، مگر چونکہ اس کا اثر ساری قوم پر پڑا، اس لئے ان سب سے ہی خطاب کیا گیا، ورنہ دوسرے غازی ان تینوں خطاؤں سے محفوظ تھے، جیسے رب تعالیٰ نے مدینہ کے یہود سے فرمایا اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا الآیہ (بقرہ: ۷۲)، مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا یہاں بھی انہی صحابہ سے خطاب ہے جو احد کے درہ پر حفاظت کے لئے کھڑے کئے گئے تھے یہ حضرات پچاس تھے، جن میں سے کفار کی بھاگڑ پر چالیس حضرات درہ چھوڑ گئے، دس وہاں رہ گئے، دنیا سے مراد مال غنیمت ہے، اور ارادہ کرنے سے مراد اس کا حاصل کرنا ہے، یہاں دنیا سے مراد وہ دنیا نہیں، جو دین کے مقابل ہو کہ وہ تو بری چیز ہے، بلکہ غنیمت اگر خلاف قانون حاصل کی جائے تو دنیا ہے، اور اگر قانون کے ماتحت لی جائے تو دین ہے جیسے قتل کفار قانون کے ماتحت عبادت ہے، خلاف قانون جرم، چونکہ ان حضرات کو یہاں سے ہٹنا ممنوع تھا، اس لئے ان کے حق میں غنیمت دنیا بن گئی، اور دوسروں کے لئے یہی غنیمت دین تھی وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ اس میں بھی انہی درہ والوں سے خطاب ہے، آخرت سے مراد درہ پر ڈٹا رہنا ہے، اور وہاں سے نہ ہٹنا، چونکہ یہ عمل سرکار کے فرمان کے ماتحت تھا اور آخرت کے بڑے ثواب کا باعث، اس لئے اسے آخرت فرمایا گیا، یعنی اس موقعہ پر تم درہ والوں کی دو جماعتیں ہو گئیں، ایک وہاں سے ہٹ جانے والوں کی، جو خطائے اجتہادی کی بنا پر غنیمت لینے کے لئے درہ چھوڑ گئے، اور دوسرے ڈٹے رہنے والوں کی، جو وہاں شہید ہو کر بارگاہِ الٰہی میں بہت سرخرو ہوئے ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ ظاہر یہ ہے کہ کُمْ میں خطاب ان غازیوں سے ہے، جن کے قدم میدان سے اکھڑ گئے تھے، اور عنہم سے مراد کفار ہیں، چونکہ یہ واقعہ درہ چھوڑنے کی وجہ سے ہوا، اور اس کے بعد ہوا کہ بھاگے ہوئے کفار درہ میں گھس پڑے، وہاں ڈٹے ہوئے صحابہ کو شہید کر دیا، پھر ان پیچھا کرنے والے غازیوں پر ٹوٹ پڑے، اس لئے یہاں ثُمَّ فرمایا گیا، خیال رہے کہ اس موقعہ پر مسلمانوں کے منہ پھرنے کا اسباب تو ان کی اپنی طرف سے ہوئے، اور قیام اسباب کے بعد اس واقعہ کی خلق رب تعالیٰ کی طرف سے، اس لئے صَرَفَ کا فاعل رب تعالیٰ ہے، یعنی تمہاری ان غلطیوں کی بنا پر تمہیں رب تعالیٰ نے کفار سے پھیر دیا کہ پہلے کفار آگے تھے تم پیچھے، کفار کی پشتیں تھیں تمہارے چہرے، مگر اب جو حالات بدلے اور نقشہ جنگ نے پلٹا لیا تو اس کے برعکس ہو گیا کہ تم آگے ہو گئے، کفار تمہارے پیچھے، تمہاری پشتوں کی طرف ان کے منہ ہو گئے، تم پر غالبیت کے بعد مغلوبیت کے آثار نمودار ہو گئے لِيَبْتَلِيَكُمْ یہ لام تعلیلیہ ہے اور یہ جملہ صَرَفَكُمْ کی وجہ اِبْتِلَاءً

بَلَاءٌ سے بنا بمعنی آفت اور امتحان و جانچ و چھانٹ یہاں سارے معنی درست ہیں یعنی یہ نقشہ جنگ کی تبدیلی اور تمہارا کفار سے پھر جانا اس لئے ہوا، تاکہ رب تعالیٰ تمہیں آفت میں مبتلا کر کے صابر و شہید بنائے یا تاکہ تم میں قوی الایمان اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کا امتحان لے کہ جو اس موقعہ پر حرف شکایت زبان پر لائے وہ ضعیف ہے، اور جو صبر و شکر سے کام لے وہ قوی الاعتقاد یا تاکہ اس کے ذریعہ مخلص و منافق میں چھانٹ فرمادے کہ جو اس وقت اسلام کو برا، رب تعالیٰ کے وعدوں کو جھوٹا اور حضور انور ﷺ کی نبوت کا انکار کرنے لگے وہ منافق ہے، اور جو اس سے محفوظ رہے وہ مخلص وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ حق یہ ہے کہ عَنْكُمْ میں خطاب درہ چھوڑنے والوں سے بھی ہے، اور ان سے بھی جن کے قدم میدانِ جنگ سے اکھڑ گئے چونکہ رب تعالیٰ جانتا تھا کہ بعض بدباطن ان بزرگوں کے ان اعمال پر اعتراضات کیا کریں گے، اس لئے اس جملہ کو لام اور قد کی تاکیدوں سے مؤکد کیا، عَفَا عَفْوٌ سے بنا بمعنی مٹانا، یہاں دنیاوی اور دینی دونوں مٹانے مراد ہیں، خیال رہے کہ اس موقعہ پر نہ درہ سے ہٹنے والے گنہگار تھے، کیونکہ وہ خطاء اجتہادی سے ہٹے تھے، اور خطاء اجتہادی گناہ نہیں، اور نہ وہ گنہگار تھے جن کے قدم یہاں سے اکھڑ گئے، کیونکہ یہ حضرات سخت اضطرار کی حالت میں اپنی جان بچانے کے لئے وہاں سے ہٹے تھے، جب کفار کا دباؤ بہت زیادہ بڑھ جائے، تب میدان سے ہٹ کر جان بچانا گناہ نہیں ہوتا، اس وقت تو خود نبی کریم ﷺ نے بھی ایک غار کی آڑ لی تھی، بلکہ ہجرت کی رات شر کفار سے بچنے کے لئے غار ثور میں کئی دن قیام فرمایا، مگر چونکہ یہ عمل صورۃً غلط تھا، اور اگر یہ آیت نہ اترتی، تو تا قیامت بدباطن ان بزرگوں کے ان اعمال پر زبانِ طعن دراز کرتے رہتے، اس لئے رب تعالیٰ نے اس کی بھی معافی کا اعلان فرمادیا، یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ رب تعالیٰ نے اس سید المعصومین سند المحبوبین ﷺ سے فرمایا عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (توبہ: ۴۳) حالانکہ حضور انور ﷺ کے دامن تک کسی گناہ کی رسائی نہیں، یعنی اے درہ سے ہٹ جانے والو اور اے احد کے میدان سے چلے جانے والو! اللہ نے تمہاری ساری خطائیں مٹادیں، کہ نہ تم دنیا میں خطا کار رہے نہ آخرت میں، جب ہم معاف کرتے ہیں تو کسی کو اعتراض کا کیا حق ہے، تم سب ابرار، اخیار اور متقیوں کے سردار ہو وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اس آخری جملہ نے گذشتہ ساری آیت کی تشریح کردی، فضل کے معنی ہیں مہربانی، یعنی کسی کو بلا استحقاق یا استحقاق سے زیادہ نعمت دے دینا، الْمُؤْمِنِيْنَ سے مراد یا وہی درہ والے ہیں اور قدم اکھڑنے والے صحابہ ہیں یا سارے غازیانِ احد یا وہ بھی اور ان کے طفیل ہم جیسے سارے گنہگار مسلمان بھی، یعنی اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر بڑا ہی مہربان ہے، کہ اگر ان پر راحت آئے تو بھی اچھی، آفت آئے تو بھی اچھی، اگر فتح پائیں تو بھی کامیاب، اگر ان کے قدم اکھڑ جائیں تو بھی کامیاب ان کی شکستوں میں بھی رب تعالیٰ کی لاکھوں حکمتیں ہوتی ہیں،

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! تم واقعات احد کو دیکھ کر یہ کبھی خیال بھی نہ کرنا اور کسی کی اس بکواس پر دھیان بھی نہ دینا کہ رب تعالیٰ نے اپنا اور اپنے حبیب کا وعدہ سچا نہ کیا، احد کے اول واقعے پر دھیان دو، کہ تم فتح تو پاچکے تھے، کفار میدان چھوڑ چکے تھے، تم نے رب تعالیٰ کے فضل و کرم سے انہیں خوب قتل کیا تھا حتی کہ وہ بھاگ رہے تھے، اور تم ان کے تعاقب میں تھے، نقشہ جنگ بدلا، اس لئے کہ تم

میں سے بعض لوگوں نے یعنی درہ والوں نے بزدلی کی، کہ ان کے دل میں غنیمت کی محبت آگئی، اور وہ اپنے امیر سے جھگڑ پڑے، ان میں سے اکثر ہمارے محبوب کی نافرمانی کر بیٹھے کہ بغیر سرکاری حکم آئے درہ سے ہٹ گئے، یہ سب کچھ اس وقت ہوا، جب رب تعالیٰ نے تمہیں تمہاری پیاری چیزیں اسلام کی فتح، کفار کی شکست، غنیمت کا حصول سب کچھ تمہاری آنکھوں کو دکھلا دیا، پھر درہ والوں کی غلطی کا انجام یہ ہوا، کہ تم پر کفار کا پیچھے سے حملہ ہوگیا جس سے تمہارے رخ بدل گئے، جو بھگا رہے تھے خود بھاگ پڑے، یہ سب کچھ اس لئے ہوا تا کہ رب تعالیٰ تمہیں جانچ لے، چھانٹ دے، اور اس کے ذریعہ تمہارے درجات بلند کردے، تم سے جو کچھ بھی ہوگیا، رب تعالیٰ نے سب کچھ معاف کردیا، کہ نہ دنیا میں اس پر عتاب نہ آخرت میں، اس کا حساب نہ تمہارے نامۂ اعمال میں اس کی تحریر، سمجھ لو اللہ تعالیٰ مومنوں پر بڑا ہی مہربان ہے، ان پر ہر طرح فضل و کرم فرماتا ہے،

حکایت

بخاری وغیرہ میں حضرت عثمان ابن موہب سے روایت ہے کہ ایک خارجی حضرت عبداللہ ابن عمر کی خدمت میں بیت اللہ شریف کے اندر حاضر ہوا، اور بولا کہ آپ کو اسی کعبہ کے رب کی قسم، کیا آپ جانتے ہیں، کہ عثمان ابن عفان احد کے دن بھاگ گئے تھے، فرمایا ہاں، بولا آپ کو یہ بھی خبر ہے کہ وہ جنگ بدر سے غائب رہے، فرمایا ہاں، بولا آپ کو اس کا بھی علم ہے، کہ وہ بیعت رضوان میں شریک نہ ہوئے، فرمایا ہاں، اس نے خوشی میں نعرہ مارا اَللّٰهُ اَكْبَر (خارجی حضرت عثمان، علی، معاویہ، حسنین کریمین وغیرہم کے بدترین دشمن ہیں) آپ نے فرمایا، جواب بھی سنتا جا، جنگِ احد میں بھاگ جانے کی رب تعالیٰ نے معافی دے دی ہے، جس کا اعلان قرآن کریم میں کئی جگہ ہوا ہے، جنگ بدر کے موقعہ پر آپ کی زوجہ رقیہ بنت رسول اللہ ﷺ بیمار تھیں، حضور انور ﷺ نے فرمایا، تم یہیں رہو، ان کی تیمارداری کرو، تمہیں غزوۂ بدر کا ثواب گھر بیٹھے ملے گا، پھر بعد میں آپ کو غنیمت بدر کا حصہ بھی دیا، بیعتِ رضوان کے موقعہ پر حضرت عثمان حضور انور ﷺ کے نمائندہ ہوکر کفار مکہ سے صلح کی بات چیت کے لئے تشریف لے گئے، اس کام کے لئے آپ ہی موزوں تھے، آپ کی غیر موجودگی میں بیعت الرضوان ہوئی، حضور انور ﷺ نے اپنے ایک ہاتھ کو فرمایا، یہ عثمان کا ہاتھ ہے، اور اس ہاتھ کو دوسرے ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ یہ عثمان کی طرف سے بیعت ہے، جا یہ جوابات ساتھ لے جا،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** رب تعالیٰ کے سارے وعدے بالکل برحق ہیں، اس کی وعدہ خلافی ایسی ہی ناممکن ہے، جیسے دو رب ہونا، اگر کبھی کسی وعدہ کا ظہور نہ ہو، تو اس میں قصور ہمارا اپنا ہوتا ہے، جیسا کہ احد کے پورے واقعہ سے معلوم ہوا، **دوسرا فائدہ:** حضور انور ﷺ کے وعدے رب تعالیٰ کے ہی وعدے ہیں، کہ ان کا پورا کرنا رب تعالیٰ کے ذمہ کرم پر لازم ہے، جیسا کہ وَعَدَهٗ کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا، ہم کو تو رب تعالیٰ نے یہ دعا سکھائی رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ (آل عمران: ۱۹۴) خدایا ہمیں وہ سب چیزیں دے، جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبانی ہم سے وعدہ کرلیا ہے، **تیسرا فائدہ:** حضور انور ﷺ کے احکام کی مخالفت دنیاوی تکالیف کا بھی باعث ہے، جیسا کہ وَ

میں مسلمانوں نے کفار کو زیادہ محسوس کیا۔ اور کفار نے مسلمانوں کو تھوڑا جانا تا کہ مسلمانوں کے صبر کی آزمائش ہو اور کفار جنگ کی ہمت کریں مگر جنگ چھڑ جانے پر مسلمانوں کو کفار تھوڑے دکھائی دینے لگے۔ اور کفار کو مسلمان زیادہ۔ لہٰذا یہ دونوں تفسیریں درست ہیں۔ یہ واقعہ یا تو حضور علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ یا کفار کو وہ فرشتے نظر آنے لگے تھے جو مسلمانوں کی مدد کے لئے آئے تھے۔ اسی لئے ارشاد ہوا۔ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ یہ نیا جملہ ہے۔ يُؤَيِّدُ تائید سے بنا جس کا مادہ اید بمعنی قوت ہے۔ یعنی اللہ جسے چاہے اپنی مدد و فتح سے قوت دے۔ خواہ اس کے پاس فتح کا سامان ہو یا نہ ہو۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ۔ ذٰلِکَ سے یا تو سارے واقعہ کی طرف اشارہ ہے یا اس دیکھنے کی طرف یا فتح بدر کی طرف۔ عِبْرَةً عبور سے ہے۔ بروزن فعلۃ جیسے جلسۃ وجلوس ورکبۃ ورکوب۔ اس کے لغوی معنی گذر جانا ہے۔ اسی لئے راستہ طے کرنے کو عبور کہا جاتا ہے چونکہ عبرت ونصیحت سے انسان جہالت سے علم کی طرف آ جاتا ہے۔ اس لئے اسے عبرت کہتے ہیں۔ اَبْصَارِ جمع بصر کی ہے مگر یہاں بمعنی بصیرت یا عقل ہے۔ یعنی اس جنگ بدر کے واقعہ میں عقلمندوں یا بصیرت والوں کے لئے بڑی عبرت ہے کہ اسے دیکھ کر آئندہ کے لئے نصیحت پکڑیں۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب ﷺ جو کفار اسلام مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں یا اس کی تباہی کے منتظر ہیں ان سے علانیہ فرما دو کہ تم سارے اکٹھے ہو جاؤ' اپنی طاقت جمع کر لو مگر تمہاری قسمت میں دونوں جہان کی رسوائی ہے۔ وہ اس طرح کہ دنیا میں تو کوئی دم جاتا ہے۔ جو تم اسلام کے مقابلہ میں مغلوب ہو جاؤ گے اور آخرت میں تم سب دوزخ کی طرف جانوروں کی طرح ہانک دیئے جاؤ گے اور دوزخ تو بڑا برا بستر ہے جہاں آرام کی کوئی صورت نہیں اور مصیبت کے سارے اسباب جمع ہیں مسلمانوں کی کمی اور ان کی بے سامانی کو مت دیکھو۔ یہ تھوڑی جماعت ہیں' تمام دنیا پر چھا جائے گی۔ اگر تمہیں اس کا ثبوت چاہیے تو جنگ بدر والا واقعہ یاد کر لو وہ اس کی قدرت کی کھلی نشانی ہے۔ اس دن میدان بدر میں دو لشکر اکٹھے ہوئے تھے ایک مسلمانوں کا جو راہ الٰہی میں سر بکف ہو کر آ گیا تھا۔ اور دوسرا کافروں کو جو اپنی نفسانی خواہشوں پر جنگ کر رہا تھا۔ مسلمان حقیقت میں تھوڑے اور بے سامان تھے۔ کفار کے تہائی تھے مگر رب کی شان تو دیکھو کہ وہ کافروں کو اپنے سے دوگنے تگنے نظر آئے اور یہ تھوڑے ان بہت پر چھا گئے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کی مدد ان کے شامل حال تھی۔ رب تعالیٰ جس کی چاہتا ہے مدد فرماتا ہے۔ اگر غور کرو تو جنگ بدر میں عقل والوں کے لئے بڑی ہی عبرت ہے۔ وہ اس سے آئندہ کا پتہ لگا لیں اور آئندہ اسلام کے مقابلہ کی ہمت نہ کریں۔ خیال رہے کہ جنگ بدر کو چند وجہوں سے نشانِ قدرت قرار دیا گیا۔ ایک یہ کہ اس جنگ کی پیشگوئی پچھلی آسمانی کتابوں میں بھی ہے۔ چنانچہ یسعیاہ نبی کی کتاب ۲۱۔ ۱۳ سے آبلہ تک کہ وہاں ارشاد فرمایا گیا۔ عرب کے صحرا میں تم رات کو کاٹو گے۔ اے دوانیوں کے قافلو۔ پانی لے کے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو۔ روٹی کو لئے ہوئے بھاگنے والوں کے ملنے کو نکلو کیونکہ وہ تلواروں کے سامنے سے ننگی تلوار سے اور کھچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا ہنوز ایک برس ہاں مزدور کے سے ایک ٹھیک برس قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی۔ اور تیراندازوں کے جو باقی [illegible] بہادر لوگ گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا۔ دیکھو اس

فسق ہے، **جواب:** اس کے چند جواب ہیں، ایک یہ کہ عَصَیْتُمْ سے مراد حضور انور ﷺ کی نافرمانی نہیں بلکہ اپنے امیر سیدنا عبداللہ ابن جبیر کی مخالفت مراد ہے، کہ ان چالیس درہ والوں نے ان کی بات نہ مانی، اور درہ سے ہٹ گئے، دوسرے یہ کہ عَصَیْتُمْ سے حضور انور ﷺ کی ہی نافرمانی مراد ہے، مگر سرکشی نہیں، بلکہ غلط فہمی سے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (طٰہٰ: ۱۲۱) آدم علیہ السلام نے اپنے رب کی نافرمانی کی، یہاں بھی غلط فہمی کی نافرمانی مراد ہے، **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام دلوں میں حب دنیا رکھتے تھے، اور حب دنیا تمام گناہوں کی جڑ ہے، دیکھو رب تعالیٰ نے فرمایا مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا (آل عمران: ۱۵۲) اور صوفیائے کرام فرماتے ہیں حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ كُلِّ خَطِیْئَةٍ **جواب:** دنیا کی بہت نوعیتیں ہیں، اور محبت دنیا کی بھی بہت سی قسمیں ہیں، بعض دنیا کفر ہے، بعض فسق، بعض غفلت اور بعض دنیا عین ایمان، ابوجہل کی دنیا کفر تھی، اور حضرت عثمان غنی کی دنیا عین ایمان، یوں ہی قارون، فرعون کی دنیا کفر تھی، حضرت سلیمان علیہ السلام کی دنیا عین ایمان، ایسے ہی محبت دنیا اگر نفسانی یا شیطانی ہو تو بری، اور رحمانی یا ایمانی ہو تو اچھی، ان حضرات کی یہ محبت دنیا ان کے خیال میں آخری قسم کی تھی، وہ سمجھے کہ ہم بھی یہاں سے ہٹ کر قتل و غنیمت میں حصہ لیں، تو کفار زیادہ مارے جائیں گے اور غنیمت زیادہ ہاتھ آئے گی، جس سے مسلمان مضبوط ہو کر آئندہ خوب جہاد کریں گے، مگر چونکہ حضور انور ﷺ کی اجازت کے بغیر ہٹ گئے، عتاب میں آ گئے، آخر میں عرض ہے کہ براہ مہربانی صحابہ کرام کی غلطیاں مت پکڑو، اور ان کی فکر نہ کرو، ان کی خطاؤں کی معافی کا تو قرآن کریم نے اعلان کر دیا، اپنی فکر کرو، اور اپنی خطاؤں پر آنسو بہاؤ، **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو احد میں رب تعالیٰ نے پھیر دیا کہ فرمایا ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ مگر دوسرے مقام پر اسی واقعہ کے متعلق ارشاد ہوا اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ (آل عمران: ۱۵۵) انہیں شیطان نے پھسلا دیا، ان دونوں آیتوں میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** ہر برے کام میں تین چیزیں ہوتی ہیں ترغیب، کسب، خلق: ترغیب شیطان کی طرف سے ہوتی ہے، کسب بندہ کی طرف سے، خلق رب تعالیٰ کی طرف سے، غصہ میں کسی کے تلوار مار دی، جس سے وہ مر گیا، یہاں تلوار مارنے کی رغبت شیطان نے دی، تلوار انسان نے ماری، اور خلق موت رب سبحان کی طرف سے ہوا، کہ زندگی موت اسی کی طرف سے ہے، یہاں خلق کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف ہے، اور تمہاری پیش کردہ آیت میں ترغیب اور دھوکہ دینے کی نسبت شیطان کی طرف ہے، اسی لئے یہاں صَرَفَ فرمایا اور وہاں اِسْتَزَلَّ، اس کی تحقیق ہم تیسرے پارے میں تقدیر کی بحث میں کر چکے ہیں، اور مرأت شرح مشکوٰۃ باب التقدیر میں بھی اس کا مفصل ذکر کر چکے ہیں، **پانچواں اعتراض:** تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ صحابہ احد میں کوئی بھی گنہگار نہ تھا، نہ درہ چھوڑنے والے، اور نہ میدان چھوڑنے والے، تو پھر معافی کس کو دی گئی، اور کس جرم کی دی گئی، کہ فرمایا گیا وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ جناب جہاد سے بھاگنا بڑا بھاری گناہ ہے (کبیرہ) رب تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَىٕذٍ دُبُرَهٗۤ الآیہ (انفال: ۱۶) غضب ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) کو دشمنوں میں اکیلا چھوڑ کر بھاگ جائیں اور پھر بے گناہ رہیں (یہ مخالفین کا انتہائی اعتراض ہے) **جواب:** حق یہی ہے کہ وہ حضرات اس موقعہ پر خطاکار تھے، گنہگار نہ تھے، معافی خطا کی ہے نہ کہ گناہ کی، جیسا ہم تفسیر میں عرض کر چکے،

کہ لفظ عصٰی قرآن کریم میں انبیائے کرام کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، حالانکہ وہ حضرات معصوم ہیں، وہاں بھی خطاء کی معافی مراد ہے، تم نے یہ آیت پوری نہ پڑھی، وہاں ارشاد ہوا ہے وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (انفال:۱۶) اس سے معلوم ہوا کہ جہاد میں وہ بھاگنا برا ہے جو بے وفائی یا بزدلی سے ہو، جنگی چال سے یا پناہ کی طرف دوڑ کر جانا ممنوع و گناہ نہیں، اس موقعہ پر صحابہ نے جس شان سے حضور انور ﷺ کی حفاظت کی ہے، اس کی مثال نہ ملے گی، کفار حضور انور ﷺ کو ہی شہید کرنا چاہتے تھے، اسی لئے پوری یلغار سے انہوں نے آپ پر حملہ کیا، اور ہر طرف سے آپ پر وار کئے، ایک طرف ابودجانہ حضور انور ﷺ کی طرف منہ اور کفار کی طرف پشت کر کے کھڑے ہو گئے، اور کفار کے سارے وار اپنی پیٹھ پر لئے، دوسری جانب طلحہ نے اپنا ہاتھ حضور انور ﷺ کی ڈھال بنا دیا، اور اتنے زخم کھائے کہ ہاتھ شل (یعنی بیکار) ہو گیا، اور تمام جسم زخموں سے چور ہو گیا، جب احد سے لوٹے، تو اپنے جسم سے خون اس طرح پونچھتے تھے، جیسے غسل کے بعد غسل کا پانی ہاتھ سے جھاڑا جاتا ہے، اور فرماتے تھے کہ خدا کا شکر ہے کہ میں نے وہ مقصد پورا کر دیا جس کے لئے میری ماں نے مجھے جنا تھا، ان ہی ابوطلحہ کے متعلق قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ (احزاب:۲۳) یعنی بعض صحابہ نے اپنی منت پوری کر دی، اور تیسری طرف حضرت مصعب ابن عمیر حضور انور ﷺ کے سامنے فولاد کی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے، اور کفار کے وار اپنے پر لیتے رہے یہاں تک کہ ایک وار گردن پر پڑا، سر دھڑ سے الگ ہو گیا، اور حفاظتِ مصطفٰی ﷺ میں جان دے دی، حضرت صدیق و فاروق و علی مرتضٰی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اپنے اپنے مورچے سنبھالے ہوئے کفار سے لڑ رہے ہیں، جو شجاعت بہادری اور حضور انور ﷺ کی حفاظت صحابہ کرام نے اس میدان میں کی اس کی مثال تاریخ میں نہیں مل سکتی، اس لئے رب تعالیٰ نے خوش ہو کر فرمایا وَلِيَبْتَلِيَكُمْ، احد میں تم سب کا امتحان تھا، سارے ہی پاس ہوئے کوئی فسٹ ڈویژن، کوئی سیکنڈ، کوئی اس کے بعد، غرضکہ حضور انور ﷺ بے مثال نبی ہیں، تو مہاجرین و انصار بے مثال یار،

تفسیر صوفیانہ

صبر، یقین، توکل علی اللہ، دنیاوی ٹیپ ٹاپ سے بچنا اور نبی ﷺ کی مخالفت سے باز رہنا دینی و دنیوی فتح و نصرت کا ذریعہ ہے، گویا فتح کی عمارت ان چار ستونوں پر قائم ہے، اسی طرح محبت دنیا، دنگے فساد حضور انور ﷺ کی نافرمانی، دنیا کی ٹیپ ٹاپ میں دل لگانا، ناکامی اور دشمن کے غلبہ کا سبب ہیں، جو شخص ظاہری باطنی دشمنوں پر فتح چاہے وہ نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے راستہ کے سواء اور راستہ پر نہ جائے، رب تعالیٰ کی بھیجی ہوئی مصیبت پر راضی رہے، دنیا کے غم پر آخرت کے غم کو ترجیح دے، صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے، مولانا فرماتے ہیں، شعر

صبر آرد آرزو را نے شتاب صبر کن وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب

یعنی صبر تمام آرزوؤں کو پورا کرتا ہے، مگر جلدی نہیں، اس لئے صبر اختیار کرنا چاہیے، ذوالنون مصری فرماتے ہیں، مرید کامل وہ ہے، کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے زندہ آگ میں ڈال دے، تو یہ آگ اس کے عشق کی آگ کو اور بھڑکا دے، اور جو اپنے نفس کو اطاعت

اور ہتھیار تھے۔ اس کے علاوہ شراب کے مٹکے' گانے والی عورتیں۔ عیش و طرب کا سامان بکثرت تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہم مسلمانوں کو شکست دے کر کچھ دن وہاں مزے اڑا کر جشن کر کے لوٹیں گے۔ ادھر ابو سفیان نے مدینہ منورہ کا راستہ چھوڑ کر سمندر کے کنارے کا راستہ اختیار کیا اور صحیح سلامت قافلہ کو مکہ پہنچا دیا اور ابو جہل کو کہلا بھیجا کہ اب جنگ کی ضرورت نہیں۔ تمہارا قافلہ بخیریت مکہ پہنچ گیا۔ مغرور ابو جہل نہ مانا۔ اور ابو سفیان کو کہلا بھیجا کہ مرد جس کام کے لئے نکل پڑتے ہیں۔ بغیر انجام دیئے واپس نہیں لوٹتے۔ ابو سفیان تم بھی معہ قافلہ ہم سے آملو۔ مسلمانوں نے ہمارے مقابلے کی ہمت ہی کیوں کی۔ ان کو ہمیشہ کی نیند سلا دو۔ غرضکہ پچاس آدمی یہ بھی لشکر کفار سے مل گئے۔ جن مؤرخین نے کفار کی تعداد ساڑھے نو سو (۹۵۰) بیان کی ہے۔ وہ مکہ سے نکلتے وقت کی تعداد ہے اور جن حضرات نے ایک ہزار بیان کی۔ وہ بوقت جنگ کی تعداد ہے' غرضکہ کفار اب ایک ہزار ہو گئے۔ ادھر مسلمانوں کو سارے حالات کا پتہ لگا۔ ان میں سے بعض لوگ اس لئے پریشان ہو گئے کہ کیا سمجھ کر آئے تھے۔ اور کیا پیش آ گیا۔ حضور ﷺ نے اپنے ان جان نثاروں سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے اور انصار سے فرمایا کہ اگر اس وقت جنگ ہو گئی تو تم میرا ساتھ دو گے۔ حضرت سعد ابن معاذ جوش میں اٹھے اور عرض کیا کہ حضور ﷺ خود غور فرمالیں۔ ہمارا حال تو یہ ہے ۔

تعالیٰ اللہ یہ شیوہ ہی نہیں ہے باوفاؤں کا — پیا ہے دودھ ہم لوگوں نے غیرتمند ماؤں کا
نبی ﷺ کا حکم ہو تو پھاند جائیں ہم سمندر میں — جہاں کو محو کر دیں نعرۂ اللہ اکبر میں
قریش مکہ تو کیا چیز ہیں دیووں سے لڑ جائیں — سنانِ نیزہ بن کر سینۂ باطل میں گڑ جائیں

حضرت مقداد نے عرض کیا کہ یا حبیب اللہ ہم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی نہیں ہیں جو اپنے پیغمبر سے کہہ دیں کہ آپ اپنے رب کو لے کر کفار سے جنگ کریں۔ ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے۔ حضور ﷺ نے ان کے حق میں دعائے خیر کی۔ اور وہاں سے کوچ کر کے میدان بدر میں اس کنارہ پر قیام کیا۔ جو مدینہ منورہ سے قریب ہے اور کفار مکہ اس کے مقابل کنارہ پر ٹھہر گئے۔ خیال رہے کہ مقام بدر مدینہ منورہ سے جانب مکہ معظمہ تین منزل فاصلہ پر ہے۔ اسے بدر اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے پاس ایک گاؤں ہے۔ جسے بدر ابن مخلد ابن نضر ابن کنانہ نے آباد کیا تھا اور اس جگہ بدر ابن حارث نے ایک کنواں کھدا دیا تھا جس کنوئیں کا نام چاہ بدر اور گاؤں کا نام قریہ بدر مشہور ہو گیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ بدر کے معنٰی ہیں چودھویں رات کا چاند' چونکہ اس کنوئیں کی مَن پورے چاند کی طرح بالکل گول ہے۔ اور اس کے صاف و شفاف پانی میں چاند کا عکس پڑتا تھا۔ اس لئے اسے بدر کہتے ہیں۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم) خدا کی شان مسلمانوں کا کنارہ ریگستان تھا۔ جس میں چلنا مشکل اور پانی بہت کم تھا اور کفار کا کنارہ خالص زمین تھا۔ انہوں نے وہاں کنواں بھی کھود لیا۔ مسلمانوں کو بہت دشواری پیش آئی۔ رب نے رحمت کی بارش برسائی۔ جس سے ریت جم کر اچھی زمین بن گئی۔ اور کفار کی طرف زمین پھسلنی شروع ہو گئی۔ مسلمانوں نے اپنے مشکیزے بھر لئے قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُم الخ (انفال:۱۱) میدان بدر کی یہ جمعہ کی رات بھی عجیب رات تھی جبکہ بدر کے ایک کنارے پر ایمان تھا اور دوسری طرف طغیان' ایک طرف شیطانی لشکر تھا اور دوسری طرف رحمانی۔ اس طرف [illegible] کفار شراب کے نشہ میں چور' غرض

اختلاف کاذکر ہے،

تفسیر

اِذْ تُصْعِدُوْنَ، یا تو یہ اذ گذشتہ آیت کے عَفَا یا صَرَفَكُمْ یا لِیَبْتَلِیَكُمْ کاظرف ہے، اور یہ ساری آیت پہلی آیت سے متعلق ہے، یا اذکروا فعل محذوف کاظرف ہے، اور یہ آیت مستقل الگ جملہ تُصْعِدُوْنَ جمہور کی قرأت میں ت کے پیش اور ع کے زیر سے ہے، باب افعال کا مضارع، بعض قرأتوں میں ت اور ع دونوں کے زبر سے ہے، یعنی باب فتح کا مضارع، بہر حال یہ لفظ صَعَدٌ یا صَعُوْدٌ سے ہے، لطف یہ ہے، کہ صعدٌ مجرد میں آ کر چڑھنے کے معنی دیتا ہے، اور باب افعال میں پہنچ کر بڑھنے کے معنی میں ہو جاتا ہے، بعض نے فرمایا کہ افعال میں بھی چڑھنے ہی کے معنی میں آتا ہے، مگر یہاں تجرید کے طریقہ پر بڑھنے کے معنی میں ہے، گویا اس کے معنی تھے اوپر جانا، اب معنی رہ گئے جانا جیسے تعال کہ اس کی اصل عُلُوٌّ ہے، اس کے معنی ہونے چاہیے تھے اوپر آؤ، مگر اب بطریق تجرید فقط آؤ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، بہر حال یہاں جانے، دوڑنے، بھاگنے کے معنی میں ہے، اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے تو کمال ہی کر دیا، کہ ترجمہ فرمایا، جب تم منہ اٹھائے چلے جاتے تھے، اس ترجمہ میں صعود کے اصلی معنی بھی رہے اور منشاء بھی حاصل ہو گیا، یہ تمام توجیہیں اس لئے کی گئیں، کہ غزوۂ احد میں ہزیمت یافتہ حضرات پہاڑ پر نہ چڑھے تھے کہ ادھر سے تو کفار نے پیچھے سے یلغار کی تھی، بلکہ میدان ہی میں بھاگڑ پڑ رہی تھی، یعنی ہم نے تمہیں اس وقت کفار سے پھیرا یا اس وقت تمہارا امتحان لیا یا اس وقت تم کو معافی دے دی تھی جبکہ میدان میں دوڑے چلے جارہے تھے یا یہ معنی ہیں کہ اے مسلمانو! یا اس وقت کو بھی یاد رکھو جب کہ تم میدانِ احد میں دوڑے چلے جارہے تھے تاکہ تم خدا کا شکر ادا کرو کہ اب اس نے تمہیں کتنی قوت دیدی، وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ تلون لویٌ سے بنا بمعنی پھیرنا اور موڑنا، اسی لئے رسی بٹنے کو بھی کہا جاتا ہے، کہ اس میں رسی کے اجزاء کو موڑ کر بل دیا جاتا ہے، کبھی ٹھہرنے اور انتظار کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے، کیونکہ کسی کے لئے ٹھہرنے اور انتظار کرنے والا منہ پھیر پھیر کر اس کی طرف دیکھتا ہے، یہاں سارے معنی بن سکتے ہیں، یعنی تم اس افراتفری کے عالم میں ایک دوسرے کو مڑ کر اور پھر کر بھی نہ دیکھتے تھے یا تم کسی کے لئے نہ ٹھہرتے تھے نہ انتظار کرتے تھے، اگر اس وقت مڑ کر دیکھ لیتے، تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا کیونکہ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ فِیْٓ اُخْرٰىكُمْ واؤ یا عاطفہ ہے، اور یہ جملہ تُصْعِدُوْنَ پر معطوف یا حالیہ ہے، اور یہ جملہ تُصْعِدُوْنَ کی ضمیر ھم سے حال، الرَّسُوْلُ سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں، آپ کو یہاں الرَّسُوْلُ سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ نبی کی پکار سننا ہر امتی پر واجب ہے، نیز یہ پکار رب تعالیٰ کی طرف سے تھی، جسے آپ بطریق رسالت ادا کر رہے تھے، یَدْعُوْا دعوٌ سے بنا بمعنی پکارنا، بلانا، یا پوجنا، یہاں پہلے دو معنی میں ہو سکتا ہے، اُخْرٰی آخر کا مونث ہے، پچھلی جانب کو بھی اُخْرٰی کہتے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے جَآءَ فُلَانٌ فِی اُخْرَیَاتِ الْقَوْمِ، اور پچھلی جماعت کو بھی کہا جاتا ہے، جِئْتُ فِی اٰخِرِ النَّاسِ وَاُخْرٰی ھُمْ یہاں دوسرے معنی میں ہے، یعنی یہ رسول اللہ ﷺ تمہیں پچھلے لوگوں میں تشریف فرما ہو کر پکار رہے تھے، چنانچہ آپ فرما رہے تھے، اے لوگو! میں یہ ہوں! لوٹ آؤ! جو لوٹ آئے گا جنتی ہو گا فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ: ف یا تعقیبیہ ہے یا جزائیہ، اور یہ جملہ یا پہلے معطوف ہے یا پوشیدہ شرط کی جزاء، اَثَابَ ثَوْبٌ سے بنا بمعنی لوٹنا اسی سے ہے

فرمایا کہ معوذ اس دن شہید ہو گئے۔ مگر بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندہ رہے اور ابو جہل کے سامان کا مطالبہ کیا۔ خیال رہے کہ جنگ بدر میں جو کفار آئے تھے ان میں بہت سے مسلمانوں کے قرابت دار تھے۔ اور ہر صحابی کے ہاتھ سے اس کا قریبی مارا گیا۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہ نے اپنے والد جراح کو اور حضرت مصعب ابن عمیر نے اپنے بھائی عبداللہ ابن عمیر کو اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ماموں عاص ابن ہشام ابن مغیرہ کو اور حضرت علی وحمزہ نے اپنے قرابت داروں یعنی ربیعہ کے بیٹوں کو قتل کیا۔ انہی کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ (مجادلہ: ۲۲) الخ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے عبدالرحمٰن اور حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس اور حضور علیہ السلام کے داماد حضرت ابو العاص بھی اس جنگ میں کفار کی طرف سے آئے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عبدالرحمٰن کو جنگ کے لئے بلایا۔ فرمایا کہ تو شیطان کا ساتھی ہے۔ میں رسول اللہ ﷺ کا غلام۔ آ باپ بیٹے کے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ حضور علیہ السلام نے روک دیا۔ فرمایا کہ ابو بکر بس۔ اس کی اجازت نہیں۔ حضور علیہ السلام جانتے تھے کہ یہ سب لوگ آخر میں ایک دن صحابی بننے والے ہیں۔ انہی کے لئے فرمایا گیا۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (مجادلہ: ۲۲) غرض جنگ کیا تھی قدرت الٰہی کا نمونہ تھا۔ اسی جنگ میں چودہ صحابی شہید ہوئے۔ چھ مہاجر اور آٹھ انصار اور ستر کافر مارے گئے۔ اور ستر گرفتار ہوئے اور خدا کے فضل وکرم سے مسلمانوں نے شاندار فتح پائی۔ جنگ کے بعد حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما ابو جہل کی لاش پر پہنچے دیکھا کہ وہ سسک رہا ہے۔ آپ اس کے سینہء ناپاک پر بیٹھے۔ اس کی داڑھی پکڑ کر بولے کہ ابو جہل تو ہی ہے وہ بولا کہ آج تم نے عرب کے سردار کو مار لیا۔ کاش مجھے کوئی بڑا آدمی مارتا' افسوس یہ ہے کہ مجھے دیہاتیوں کے دو لڑکوں نے مارا۔ چنانچہ عبداللہ ابن مسعود نے اس کا مغرور سر تن سے جدا کیا۔ خیال رہے کہ اس جنگ میں کفار کے چوبیس بڑے بڑے سردار مارے گئے جن میں ابو جہل اور امیہ بن خلف' حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پہلا مالک بھی تھا۔ ان کی لاشیں چاہ بدر کے جھیرے میں ڈالی گئیں۔ جن سے بدبو نکلتی تھی۔ حضور سید عالم ﷺ نے فتح بدر کے بعد تین دن وہاں قیام فرمایا۔ واپسی کے وقت ان خبثاء کی لاشوں پر کھڑے ہو کر آواز دی کہ اے فلاں فلاں کیا تم نے رب کے وعدہ کو سچا پایا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ بے جان جسموں سے کلام فرماتے ہیں۔ فرمایا اے عمر تم ان سے زیادہ نہیں سنتے (بخاری) اس جنگ میں کفار کا وہ سارا سامان مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ گویا وہ سب کچھ انہی کیلئے لائے تھے۔ پھر حضور ﷺ نے صحابہ کرام (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) سے ان قیدی کفار کے بارے میں مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ یا حبیب اللہ یہ کفر کے سردار ہیں میری رائے یہ ہے کہ ہم میں سے ہر مسلمان اپنے قرابت دار کافر کو قتل کرے۔ چنانچہ آپ ﷺ عباس اور ابو العاص کو قتل کریں ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کو قتل کریں۔ اپنے بھائی کو میں قتل کروں۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا حبیب اللہ انہیں مال لے کر چھوڑ دیا جائے۔ ممکن ہے کہ یہ لوگ آئندہ ایمان لے آئیں اور خدمت اسلام انجام دیں۔ نبی کریم ﷺ نے صدیق اکبر کی رائے کو اختیار کیا مگر بعد میں قرآن کریم نے فاروق اعظم کی رائے کو ترجیح دی۔ چنانچہ ان سب کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ اس فدیہ میں بہت پر لطف واقعہ یہ درپیش آیا۔ کہ جب حضرت

عباس سے فدیہ طلب کیا گیا تو انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔ کیا آپ ﷺ کو یہ گوارا ہوگا کہ آپ ﷺ کے چچا کو چھڑانے کے لئے مکہ میں چندہ جمع کیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ جب تم جنگ کے لئے چلے تھے تو آپ نے میری چچی یعنی اپنی بیوی کو چار سو دینار چھپ کر دیئے تھے اور کہا تھا کہ اگر میں لوٹ آیا تو لے لوں گا اور اگر جنگ میں مارا گیا تو اس سے بچوں کو پالنا۔ ان سے فدیہ ادا کرو۔ حضرت عباس خاموش ہوئے اور فدیہ ادا کیا۔ حضور ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب جو ابوالعاص کی اس وقت بیوی تھیں۔ انہوں نے اپنا ہار اور کچھ زیور جو حضور علیہ السلام نے انہیں جہیز میں دیا تھا۔ انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا اور عرض کیا کہ یہ آپ ﷺ کے قیدی یعنی میرے شوہر کا فدیہ ہے قبول فرمایا جائے۔ اور میرے شوہر کی جان بخشی کی جائے اس سامان کو دیکھ کر خود نبی ﷺ پر رقت طاری ہوئی اور صحابہ کرام زار زار رونے لگے کیونکہ یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا زیور تھا۔ اور طے یہ ہوا کہ یہ زیور واپس کر دیا جائے اور ابوالعاص کو بلا معاوضہ چھوڑ دیا جائے۔ جب ابوالعاص چھوٹ کر چلے تو انہیں حکم دیا گیا کہ حضرت زینب کو یہاں پہنچا دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اور بعد میں خود وہ بلکہ حضرت عباس حضرت عبدالرحمٰن وغیرہ سب مسلمان اور صحابی ہوئے۔ (رضی اللہ عنہم) اس لئے فرمایا گیا کہ جنگ بدر شان قدرت ہے۔

فائدے

اس آیت اور اس واقعہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو علم غیب عطا فرمایا۔ دیکھو نبی ﷺ نے بدر سے پہلے اس کے واقعات کی خبر دی۔ **دوسرا فائدہ:** کون کہاں مرے گا یہ ان پانچ علوم میں سے ہے۔ جس کا دیوبندی سخت انکار کرتے ہیں مگر اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا علم بھی حضور ﷺ کو عطا فرمایا۔ دیکھو حضور ﷺ نے خطوط کھینچ کر فرمادیا کہ فلاں کافر یہاں مرے گا۔ **تیسرا فائدہ:** کفار مکہ جو حضور علیہ السلام کی نبوت کے منکر تھے۔ آپ ﷺ کے علم غیب کے قائل تھے۔ دیکھو امیہ ابن خلف کو جب یہ خبر پہنچی کہ حضور ﷺ نے میرے مارے جانے کی خبر دی ہے تو اس نے یہ نہ کہا کہ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں بلکہ اسے یہ ہی کہتے بنی کہ ان کی بات کبھی جھوٹی نہیں ہوتی جیسا کہ بخاری کی روایت سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** جنگ بدر بڑی مقبول جنگ ہوئی۔ اس میں شرکت کرنے والے صحابہ کرام یقیناً جنتی ہیں بلکہ جو فرشتے امداد کے لئے اس جنگ میں آئے تھے وہ دوسرے فرشتوں سے افضل ہیں۔ جو کوئی خلفاء راشدین کو برا کہے وہ سخت جاہل ہے کیونکہ وہ حضرات اس میں شریک تھے۔ **پانچواں فائدہ:** ہار جیت کمی اور زیادتی سے نہیں ہوتی۔ بلکہ محض اللہ کے فضل سے۔ دیکھو جنگ بدر میں مسلمان تھوڑے اور بے سروسامان تھے۔ اور کفار زیادہ اور سامان والے مگر جیتے مسلمان۔ اس سے ان موجودہ مسلمانوں کو عبرت پکڑنی چاہیے جو اپنی تعداد بڑھانے کے لئے بے دینوں کو اپنی انجمنوں اور تحریکوں میں شامل کرتے ہیں۔ وہ ہی اسلامی تحریک اور انجمن کامیاب ہوگی جس میں خالص سنی مسلمان شامل ہوں۔ عطر کو پیشاب میں ملا کر نہ بڑھاؤ۔ ورنہ اصل عطر بھی جاتا رہے گا۔ **چھٹا فائدہ:** غازیان بدر مخلص اور مجاہدین فی سبیل اللہ پکے مومن تھے۔ ان میں کوئی کافر یا منافق نہ تھا نہ آئندہ ہونے والا تھا۔ دیکھو رب تعالیٰ نے انکے جہاد کو تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فرمایا اور تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ جب ہی ہوگا جب صحابہ مومن بھی ہوں مخلص بھی۔ اب جو انکے ایمان یا

کوشش سے کفار حضور انور ﷺ پر بھر پور وار نہ کر سکے، ورنہ وہ تو حضور انور ﷺ ہی کی فکر میں تھے، یہ فائدہ فِیۤ اُخۡرٰىكُمۡ سے حاصل ہوا، چنانچہ حضور انور ﷺ کی حفاظت میں سات انصاری جنگ کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے شہید ہوئے، اور حضرت طلحہ نے اس حالت میں ستر سے زیادہ زخم کھائے، حتیٰ کہ آپ کی انگلیاں بھی کٹ گئیں، بعض مفسروں نے فرمایا کہ احد سے بھاگ کر مدینہ پہنچنے والوں کی تعداد کل سات یا دس ہے، باقی تمام حضرات اس میدان ہی میں رہے، کچھ تو اپنے مورچوں پر ہی جمے ہوئے لڑتے رہے، جیسے حضرت صدیق و فاروق و علی مرتضٰی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جو بعد میں حضور انور ﷺ کے پاس پہنچ گئے، اور بعض اسی میدان میں پریشان حال رہے، تفسیر صاوی نے فرمایا کہ حضور انور ﷺ کے ساتھ بارہ یا اٹھارہ آدمی رہے، جن میں سے حضرت طلحہ ایک آن کے لئے بھی آپ کے پاس سے نہ ہٹے، اگر سارے ہی بھاگ گئے ہوتے تو صرف ستر شہید نہ ہوتے بلکہ پورے سات سو ہی شہید ہو جاتے، **چھٹا فائدہ:** محبوبیت الٰہی کی علامت یہ ہے کہ دنیا میں اس کی معمولی خطا پر بھی پکڑ ہو جاتی ہے، اور اس پر عتاب آجاتا ہے، جیسا کہ اَصَابَكُمۡ الخ سے معلوم ہوا، دیکھو آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معمولی خطاء یعنی گندم کھانے پر عتاب آگیا، اور ہم ہزاروں گناہ کرتے رہتے ہیں، مگر ہمیں کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ وہ وہ تھے اور ہم ہم ہیں، ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

ساتواں فائدہ: یہ عتاب اور دنیوی تکالیف ان بزرگوں کی خطاؤں کا کفارہ بن جاتے ہیں جس سے یہ محبوبین پاک و صاف ہو کر بارگاہ الٰہی میں جاتے ہیں، جیسا کہ بِغَمٍّ سے معلوم ہوا، یعنی تم سے جو غم ہمارے نبی کو پہنچا، اس کے بدلہ میں رب تعالیٰ نے تم کو یہیں غم پہنچا دیا، تمہارا اگلا معاملہ بالکل صاف ہے، **آٹھواں فائدہ:** اس معرکہ میں خود حضور انور ﷺ پر کفار کے لوٹ آنے کا کوئی غم اور صدمہ نہیں ہوا جیسا کہ اَصَابَكُمۡ میں كُمۡ ضمیر سے معلوم ہوا یعنی صرف تمہیں غم پہنچا یا نہ کہ اپنے حبیب کو، نہ آپ سرکار اپنی جگہ سے ہٹے، لہٰذا احد میں مسلمانوں کو شکست نہیں کہ شکست جرنیل کے ہٹنے پر ہوتی ہے، ع

مصطفٰی تیری شوکت پہ لاکھوں سلام

نواں فائدہ: اس موقعہ پر حضور انور ﷺ کو غم تھا مگر کس کا؟ ان صحابہ کی تکلیف کا، نہ کہ اپنا! جیسا کہ بِغَمٍّ کی تفسیر سے معلوم ہوا، اس کی شرح وہ آیت ہے عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ (توبہ: ۱۲۸) **دسواں فائدہ:** صحابہ کرام کو حضور انور ﷺ اپنے مال و اولاد اور جان سے زیادہ پیارے تھے، کہ آپ کی شہادت کی خبر سے وہ حضرات اپنے سارے غم بھول گئے، جیسا کہ لِّكَيۡلَا تَحۡزَنُوۡا کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا، صحابہ کرام اس حدیث کی چلتی پھرتی اور زندۂ جاوید تفسیر ہیں لَا يُؤۡمِنُ اَحَدُكُمۡ حَتّٰى اَكُوۡنَ اَحَبَّ اِلَيۡهِ مِنۡ وَّالِدِهٖ وَ وَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے ماں باپ، اولاد اور تمام سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں ان بزرگوں کی زندگی اس حدیث کا بیان بلکہ عیاں ہے، **گیارھواں فائدہ:** صحابہ کرام کی بارگاہ الٰہی میں وہ شان ہے کہ خود رب تعالیٰ ان کے غم دور فرماتا ہے، ذرا سی غلطی ہوئی کہ فوراً معافی کا اعلان، تاکہ زخم پر فوراً مرہم لگا دیا جائے جیسا کہ لِّكَيۡلَا تَحۡزَنُوۡا کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ صحابہ کو پکارتے رہے، مگر صحابہ نے آپ کی پکار بھی نہ سنی اور جو نبی کی پکار بھی نہ سنے، وہ بڑا گنہگار ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ (انفال: ۲۴) جس نے حضور انور ﷺ کی نہ سنی، خدا کی کیا سنے گا، **جواب:** گناہ اس صورت میں ہے جبکہ کانوں میں حضور انور ﷺ کی آواز پہنچے، اور بندہ بلا وجہ حاضر نہ ہو، اس افراتفری میں ایسا شور برپا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، ابھی تم نے جنگ کے حالات دیکھے نہیں، کمرے میں بیٹھ کر اعتراض ہی کرنا سیکھے ہیں، اور جن کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی، وہ حاضرِ بارگاہ ہو گئے تھے، جیسے جنابِ صدیق وفاروق اور علی مرتضیٰ وغیرہم صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم، **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام سے گناہ بھی ہوتے تھے اور انہیں ان کی سزائیں بھی ملتی تھیں، جیسا کہ خود تم نے اَصَابَكُمْ الخ کی تفسیر میں بتایا، پھر تم کیوں انہیں پاکباز اور متقیوں کا سردار سمجھتے ہو! **جواب:** ہم نے ان تمام حضرات کو معصوم نہیں مانا ہے، بلکہ عادل ومتقی مانا ہے، ان میں سے بعض سے گناہ سرزد ہوتے تھے، مگر بفضلہٖ تعالیٰ وہ یہاں ہی پاک وصاف ہو جاتے تھے، یہ تو انسان کی خوش نصیبی ہے کہ گناہ سارے یہیں چھوڑ جائے، صرف نیکیاں لے کر رب تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو، ہم گنہگاروں کو ان سے نسبت ہی کیا، ہم تو صرف گفتار ہیں وہ سراپا کردار تھے، شعر

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی　　　که تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارہ

تیسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کو امداد کے لئے پکارنا جائز ہے، مگر دوسری آیت میں اس سے منع فرمایا گیا، رب تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ (یونس: ۱۰۶) **جواب:** ان تمام آیات میں دعا سے مراد عبادت ہے، یعنی خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اس کی شرح وہ آیت ہے وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِينَ (احقاف: ٦)

تفسیر صوفیانہ

بندوں کے مختلف حالات ہیں، بعض وہ ہیں جو مانگیں، اور نہ ملے بعض وہ ہیں کہ مانگتے ہی ان کی مراد پوری کر دی جائے، بعض وہ خوش نصیب ہیں کہ جن کے دل میں خیال آئے اور کام ہو جائے، بعض وہ بھی ہیں جو بحرِ عشق میں فنا ہو کر اس درجہ پر پہنچ گئے، کہ رب تعالیٰ انہیں دے دے کر بخششیں کر کر کے منائے، یہ حضرات غازیانِ احدان آخری دو درجہ والوں میں سے ہیں، کہ رب تعالیٰ نے ان کی خطا کا ذکر تو کیا، مگر ان سے توبہ یا کفارہ کا مطالبہ نہ کیا، بلکہ بغیر توبہ کا مطالبہ فرمائے معافی کا اعلان کیا، پھر اس کی وجہ بھی بتلا دی کہ یہ اس لئے کیا گیا، تاکہ تمہارے دلوں پر صدموں کا میل نہ آنے پائے، کہ فرمایا لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا الخ، یہ درجہ انسان کا انتہائی کمال ہے جو بہت مشکل سے میسر ہوتا ہے، اس درجہ میں پہنچ کر رب تعالیٰ وہی کرتا ہے جو بندہ چاہتا ہے، اس بارگاہ میں بعض مرید ہیں اور بعض مراد، یہاں روح البیان نے فرمایا کہ ایک بار علی مرتضیٰ نے صدیق اکبر سے پوچھا کہ آپ کس وجہ سے ہم سب پر سبقت لے گئے؟ فرمایا پانچ وجہ سے، ایک یہ کہ میں نے کسی کو مرید دنیا پایا اور کسی کو مرید آخرت، مگر میں مرید مولیٰ ہوا، دوسرے یہ کہ جب سے میں اسلام میں داخل ہوا، دنیا کے کھانوں سے سیر نہ ہوا، کیونکہ مجھے معرفت کی

لذت نے دنیا کی لذت سے بے نیاز کردیا، تیسرے یہ کہ میں اسلام لاکر دنیا کے پانیوں سے سیراب نہ ہوا، کہ عشق الٰہی کی شراب نے مجھے ان شربتوں سے بے نیاز کردیا، چوتھے یہ کہ جب میرے سامنے دنیا اور دین کے اعمال آئے تو میں نے دنیا کے کاموں پر دین کے کام کو مقدم رکھا، پانچویں یہ کہ مجھے حضور انور ﷺ کی صحبت میسر ہوئی، تو میں نے آپ کو راضی رکھنے کی کوشش کی، سبحان اللہ، فقیر کہتا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غار ثور میں پہلے صدیق گئے، بعد میں حضور انور ﷺ کو بلایا، اور غار قبر میں پہلے حضور انور ﷺ تشریف لے گئے، بعد میں صدیق کو بلایا، اور غار ثور میں ایک شب حضور ﷺ کو اپنے پہلو پر سلایا، اور غار قبر میں تا قیامت حضور ﷺ نے اپنے پہلو میں صدیق کو سلالیا، صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى حَبِيْبِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَ بَارَكَ وَسَلَّمْ،

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا
پھر اتارا اللہ نے تم پر غم کے بعد امن یعنی اونگھ
پھر تم پر غم کے بعد چین کی نیند اتاری
يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ
جو چھا جاتی تھی تم میں سے ایک گروہ پر اور دوسرا گروہ بیشک غم میں ڈال دیا تھا ان کو
کہ تمہاری ایک جماعت کو گھیرے تھی اور ایک گروہ کو اپنی
اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ
ان کی جانوں نے گمان کرتے تھے اللہ پر ناحق یعنی جاہلیت کا گمان
جان کی پڑی تھی اللہ پر بے جا گمان کرتے تھے جاہلیت کے سے گمان
يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ
کہتے تھے کیا ہے ہمارے لئے اس کام میں کچھ اختیار فرماؤ بیشک
کہتے کیا اس کام میں کچھ ہمارا بھی اختیار ہے تم فرمادو
الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ
اختیار سارا اللہ کا ہے چھپاتے تھے اپنے دلوں میں وہ جو نہیں ظاہر کرتے تھے آپ کے لئے
کہ اختیار تو سارا اللہ کا ہے اپنے دلوں میں چھپاتے رہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے
يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ

محسوس کرتی ہے۔ شہادت کی لذت حضرت حسین سے پوچھو پھر جیسے بعض بیماریوں سے آنکھ ناک زبان درست احساس نہیں کرتے۔ یوں ہی بعض روحانی بیماریاں ان لذتوں کو محسوس نہیں ہونے دیتیں۔ یہاں اگر زُیِّنَ کا فاعل شیطان ہو تو اس سے دھوکہ کی نیت مراد ہے۔ جیسے کالے کو پاؤڈر لگا کر گورا بنا دیا جائے۔ لِلنَّاسِ سے یا تو وہ یہودی مراد ہیں یا مشرکین یا سارے لوگ اور یہ ہی صحیح ہے حُبُّ الشَّهَوَاتِ میں اضافت لام کی ہے۔ حب بمعنی مصدری ہے۔ یعنی محبت کرنا۔ شہوات جمع شہوت کی ہے۔ بمعنی نفسانی خواہش اور نفس کا اشتیاق۔ شہوت دو قسم کی ہے سچی اور جھوٹی۔ سچی شہوت وہ جس کے بغیر بدن کا نقصان ہو۔ اور جھوٹی شہوت وہ جو ایسی نہ ہو۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ بعض چیزیں جسم کو مفید ہیں اور بعض روح کو پہلی چیزیں شہوات نفسانیہ ہیں اور دوسری شہوات روحانیہ۔ خیال رہے کہ یہاں شہوت بمعنی اسم مفعول ہے۔ بمعنی مشتہات اور نفس کے مرادات یعنی رب کی طرف سے لوگوں کے دل میں دنیوی اور نفسانی چیزوں کی محبت پیدا کی گئی یا شیطان نے دنیوی مرادوں کی محبت کو دلوں میں جما دیا اور شہوتوں پر بھڑکا دیا۔ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ۔ یا تو مِنْ بیانیہ ہے اور یہ عبارت شہوات کا بیان ہے۔ یا یہ شہوات کا حال ہے اور جار مجرور کائنۃ کے متعلق۔ نساء جمع ہے جس کا واحد کوئی نہیں۔ جیسے قوم اور ہر رہط بعض نے کہا کہ یہ امرء ۃ کی جمع بغیر لفظ کے ہے چونکہ دنیا میں سب سے بڑھ کر محبت عورت سے ہوتی ہے نیز مرد کے جنت سے آنے کا سبب بھی عورت ہی ہوئی۔ اور عورت کی پیدائش مرد کے جسم سے ہوئی۔ نیز پہلے قتل کی بنا عورت ہی ہوئی۔ اس لئے پہلے اس کا ذکر کیا گیا۔ بَنِيْنَ ابن کی جمع ہے یا تو اس سے بیٹے بیٹیاں ساری اولاد مراد ہے یا صرف بیٹے کیونکہ عام انسان خصوصاً اہل عرب لڑکوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس لئے بیٹوں ہی کا ذکر کیا گیا اور چونکہ اولاد کی محبت عورت کے بعد ہے۔ اس لئے اس کا ذکر نساء کے بعد ہوا۔ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ۔ قَنَاطِيْرِ قنطار کی جمع ہے یا تو بروزن فعلال ہے یا فنعال۔ پہلی صورت میں اس کا نون اصلی ہے اور دوسری میں زائدہ۔ لغت میں ہر مضبوط چیز کو قنطر کہتے ہیں۔ اسی لئے مضبوط پل اور مضبوط عمارت اور مضبوط بات کو بھی قنطر کہا جاتا ہے۔ اہل عرب بولتے ہیں۔ قَنْطَرْتُ الشَّيْئَ۔ یہاں بہت مال مراد ہے۔ کسی نے کہا کہ سولہ سو (۱۶۰۰) دینار کسی کے خیال میں بارہ ہزار دینار (۱۲۰۰۰) کوئی کہتا ہے ستر ہزار دینار (۷۰۰۰۰) کوئی اسی ہزار دینار (۸۰۰۰۰) مگر صحیح یہ ہے کہ قنطار کی کوئی حد نہیں۔ ہر زیادہ مال قنطار کہلائے گا۔ (کبیر و معانی وغیرہ) بعض نے کہا کہ قنطار قنطرۃ سے بنا بمعنی پل۔ چونکہ مال کے ذریعہ انسان آسانی سے زندگی کا زمانہ عبور کر لیتا ہے۔ جیسے پل کے ذریعہ دریا کو۔ اس لئے اسے قنطار کہتے ہیں۔ مُقَنْطَرَةِ قنطرۃ کا اسم مفعول ہے۔ معنی مضبوط کرنا، جمع کرنا، پل باندھنا، ڈھیر لگانا۔ ایک دوسرے پر چلنا۔ یہاں سب معنی بن سکتے ہیں کیونکہ سب کا مطلب قریباً ایک ہی ہے۔ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ۔ قناطیر کا بیان ہے یا اس کا حال۔ ذَهَبَ اور فضہ کے معنی ہم پہلے بیان کر چکے۔ یہاں اتنا عرض کرتے ہیں کہ ذَهَبَ مؤنث ہے کہا جاتا ہے۔ الذھب الحمراء۔ اس کی تصغیر ذھیبۃ آتی ہے۔ اس کی جمع اذھاب بھی ہے۔ ذھوب بھی اور ذھبان بھی۔ بعض کے نزدیک یہ خود ذھبۃ کی جمع ہے اور ذھاب سے مشتق بمعنی جانا' کیونکہ یہ ملک سے جا کر فائدہ دیتا ہے نہ کہ قبضہ میں رہ کر۔ اس لئے ذھب کہلاتا ہے۔ فضۃ کی جمع فضض ہے اور یہ الفضاض سے مشتق ہوا۔ بمعنی بکھرنا چونکہ چاندی بہت دیر جیب میں جمع نہیں رہتی بلکہ بازار میں جاتے ہی متفرق ہو جاتی ہے۔ اس لئے فضہ کہتے ہیں۔ (روح المعانی) وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ۔ یہ قناطیر پر

شانِ نزول

ابن جریر نے سدی سے روایت کی، کہ مشرکین مکہ احد سے لوٹتے وقت نبی ﷺ سے بولے کہ اگلے سال بدر میں پھر ہمارا آپ کا مقابلہ ہوگا، حضور انور ﷺ نے فرمایا، ضرور، مسلمانوں کو خطرہ ہوا کہ کہیں یہ کفار ابھی جاتے ہوئے مدینہ پر بلہ نہ بول دیں، نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو بھیجا، اور فرمایا دیکھو تو وہ کیا کر رہے ہیں، اگر اپنے گھوڑوں پر سوار ہو رہے ہوں، تو سمجھ لو کہ ان کی نیت بری ہے، وہ مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، ان کے مقابلہ کے لئے تیار ہو جاؤ، اور اگر وہ سامان باندھ کر اونٹوں پر لاد رہے ہیں، تو سمجھ لو کہ وہ گئے، قاصد نے آکر بتایا، کہ وہ بہت تیزی سے سامان باندھ کر بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ وہ گئے، مسلمان کچھ تو پہلے ہی سے حضور انور ﷺ کے پاس جمع ہو گئے تھے، اور جو تتر بتر بھی تھے، ان میں بھی وہ اضطراب نہ رہا، اللہ کی شان کہ اسی حال میں احد والوں کے دو گروہ ہو گئے، ایک وہ جن پر قدرتی طور پر اونگھ چھا گئی، ان کا یہ حال تھا کہ بار باران کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ جاتی تھی، پھر اٹھاتے تھے، چنانچہ حضرت طلحہ فرماتے ہیں، کہ کئی دفعہ میرے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی، جسے میں نے کئی دفعہ اٹھایا، حالانکہ ابھی ہم صف بستہ ہی تھے، حضرت زبیر ابن عوام فرماتے ہیں، میں نے خود اپنے کو دیکھا کہ سخت خطرناک حالت میں اونگھ رہا تھا، اور تلوار میرے ہاتھ سے گر جاتی تھی، ترمذی شریف میں حضرت انس سے مروی ہے، کہ احد کے دن سارے ہی مسلمان تلواریں اور ڈھالیں ہاتھوں میں لئے اونگھ رہے تھے، ان کا اونگھ سے جھومنا گویا میں اب دیکھ رہا ہوں، دوسری جماعت کا سخت خراب حال تھا، پراگندہ خیال تھا، چہرے اترے ہوئے تھے، سونا تو کیا انہیں قرار بھی نہ تھا، کبھی کہتے، ہم ناحق یہاں آگئے، کبھی کہتے ہم نے پہلے ہی کہا تھا کہ مدینہ میں رہ کر مدافعانہ جنگ کرو، مگر ہماری نہ مانی گئی، کبھی کہتے، کہ نہ مسلمان یہاں آتے، نہ مارے جاتے، اس دن امن چین اور نیند مخلص مومن کی علامت تھی اور بدحواسی پریشانی منافق کی پہچان، اس آیت کریمہ میں یہی حالات دکھائے گئے ہیں، اور اسی موقعہ پر یہ آیت کریمہ نازل کی گئی (تفسیر روح المعانی وخازن)

تفسیر

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ ثُمَّ حرف عطف ہے، اور یہ جملہ اَثَابَكُمْ پر معطوف، چونکہ یہ نیند مذکورہ غم کے کچھ بعد تھی، اس لئے ثُمَّ ارشاد ہوا، اَنْزَلَ کا فاعل رب تعالیٰ ہے، کیونکہ یہ نیند غیبی طریقہ پر رب تعالیٰ کی طرف سے اتری تھی، ورنہ ایسے موقعہ پر نیند کسے آتی ہے، نیند تو سکون وچین چاہتی ہے، عَلَيْكُمْ میں مخلصین صحابہ سے خطاب ہے، کہ انہی کو نیند آئی تھی، جیسا کہ اگلے مضمون سے ظاہر ہو رہا ہے، مِنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا کی تحقیق اور اس کے معانی ابھی پچھلی آیت میں بیان ہو چکے، بعض نے فرمایا کہ اَمَانٌ، اَمْنٌ، اَمَنَةٌ تینوں ہم معنی ہیں، یہ اَمِنَ يَاْمَنُ کا مصدر ہے، جیسے عظمۃ اور غلبۃ مگر تفسیر صاوی وخازن نے فرمایا کہ امن وہ چین وسکون ہے جو زوال خوف کے ساتھ ہو، اور اَمَنَةٌ وہ سکون قلبی ہے جو خوف واسباب خوف کی موجودگی میں ہو، چونکہ احد میں مسلمانوں کو یہ امن خطرناک حالت میں ہی نصیب ہوا تھا اس لئے یہاں اَمَنَةً فرمایا گیا، اَمَنَةً اَنْزَلَ کا مفعول بہ ہے، اور نُّعَاسًا اس کا عطف بیان یا بدل، بعض نے فرمایا کہ اَنْزَلَ کا مفعول بہ نُّعَاسًا ہے اور اَمَنَةً اس نُّعَاسًا کا یا حال مقدم

ہے یا مفعول لہٗ لہٰذا اس جملہ کے کئی معنی ہیں، یعنی اے مخلص غازیو! رب تعالیٰ نے تم پر یہ کرم کیا، کہ ایسی پریشانی میں ایسے غم کے بعد تم پر اپنی طرف سے دلی چین واطمینان اتارا، جو اونگھ کی شکل میں تھا، یا امن کے لئے اونگھ اتاری، نعاس ہلکی نیند کو کہتے ہیں یعنی اونگھ، سِنَةٌ اور نعاسٌ قریباً ہم معنی ہیں یَّغْشٰى طَآىِٕفَةً مِّنْكُمْ یغشٰی غشیٌ سے بنا بمعنی چھا جانا اور ڈھانپ لینا اسی لئے موٹے پردے کو غِشَاوَہ کہا جاتا ہے کہ وہ بھی اندر کی چیز چھپائے ہوتا ہے، طَآىِٕفَةٌ طوف سے بنا بمعنی گھومنا، اسی سے طواف ہے، چھوٹی جماعت کو طائفہ اس لئے کہتے ہیں، کہ ان کے معاملات وضروریات آپس میں دائر ہوتے ہیں، کہ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کی ضرورت ہوتی ہے، سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں، کہ اس طائفہ سے مراد مہاجرین اور عام انصار ہیں، مِّنْكُمْ سے معلوم ہوا کہ یہ نیند سب کو نہیں آئی یعنی آئی سب کے لئے تھی، چھائی بعض پر، اسی لئے اَنْزَلَ کے بعد عَلَيْكُمْ تھا، اور يَّغْشٰى کے بعد مِّنْكُمْ، ہماری قرأت میں مِّنْكُمْ ہے ی سے، جس کا فاعل نعاس ہے، بعض قرأتوں میں تَغْشٰى ہے ت سے جس کا فاعل اَمَنَةً ہے، یعنی وہ نیند تم حاضرین احد میں سے ایک گروہ پر چھا گئی، یعنی مخلصین پر، کُمْ سے مراد حاضرین احد ہیں، اور من تبعیضیہ، اور ہوسکتا ہے کہ کُمْ سے مراد مومنین ہوں، اور من بیانیہ یعنی ساری مومن جماعت پر نیند چھا گئی وَطَآىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ اس طائفہ سے مراد منافقین ہیں، عبداللہ ابن ابی معتب ابن قشیر کے ساتھی، چونکہ یہ مومن نہ تھے، اس لئے یہاں منکم نہ فرمایا گیا، اَهَمَّتْ اِهْمَامٌ سے بنا بمعنی غم میں ڈالنا، اَنْفُسُ نفس کی جمع ہے بمعنی جان وذات طائفہ موصوف ہے قَدْ اَهَمَّتْ الخ صفت يَظُنُّوْنَ خبر اول، يَقُوْلُوْنَ الخ خبر دوم (تفسیر کبیر) اور ہوسکتا ہے کہ قَدْ اَهَمَّتْ بھی اس کی خبر ہی ہو، یعنی میدانِ احد میں ایک گروہ وہ بھی تھا جنہیں صرف اپنی جان کا غم اور ذات کی فکر تھی، نہ اسلام کی فکر تھی، نہ نبی کریم ﷺ کی، اس لئے انہیں نیند اور چین کہاں، يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَظُنُّوْنَ ظنّ سے بنا بمعنی بدگمانی، اسی لئے آگے غَيْرَ الْحَقِّ فرمایا گیا، جس سے مراد وہ بدگمانی ہے جو باعثِ کفر ہے، ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ، غَيْرَ الْحَقِّ کا بدل ہے، جاهلیت سے پہلے اهل پوشیدہ ہے، یعنی یہ منافقین اللہ تعالیٰ کے ساتھ ویسی بدگمانیاں کرتے تھے، جیسے جاہلیت والے یعنی مشرکین کیا کرتے ہیں، مثلاً یہ کہ رب تعالیٰ حضور انور ﷺ کی مدد نہ کرے گا، یا یہ کہ اگر حضور انور ﷺ سچے نبی ہوتے، تو کفار کے ہاتھوں شہید کیوں ہوتے، یا یہ کہ حضور انور ﷺ کی شہادت سے اسلام ختم ہوگیا، اب ہم کو پرانے دین کی طرف لوٹ جانا چاہیے، پہلی بدگمانی بلا واسطہ اللہ تعالیٰ پر بدگمانی ہے، اور دوسری، تیسری بدگمانیاں بلاواسطہ تو نبی کریم ﷺ اور اسلام پر ہیں، اور بالواسطہ رب تعالیٰ پر، بہرحال بِاللّٰهِ فرمانا بالکل درست ہے يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ، يَقُوْلُوْنَ قَوْلٌ سے بنا بمعنی کہنا، یا تو اپنے دل میں کہنا مراد ہے، یعنی سوچنا، تب یہ يَظُنُّوْنَ کا بیان ہے، اور یا آپس میں ایک دوسرے منافق سے کہنا مراد، تب یہ ان کا دوسرا عیب ہے، هل استفہام انکاری ہے، الْاَمْرِ سے مراد فتح ونصرت ہے، شَیْءٍ سے مراد حصہ یعنی وعدہ تو ہم سے یہ کیا گیا تھا کہ پروردگار مسلمانوں کی مدد کرے گا، مگر دیکھ لو، پوری مدد تو کیا ہوتی، کیا ہمیں مدد کا کچھ حصہ بھی ملا، یعنی کچھ نہ ملا، سارے وعدے غلط تھے (روح المعانی) تفسیر کبیر وخازن نے اس جملہ کے کچھ اور بھی معنی بیان کئے، وہ یہ کہ امر سے مراد مشورہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ کیا نبی کریم ﷺ اور ان مسلمانوں نے ہمارے مشورہ میں

فائدہ: چونکہ دنیا فانی ہے اس لئے اس کی ہر چیز فانی۔ اور چونکہ آخرت باقی ہے اس لئے اس کی ہر چیز باقی۔ کمزور بنیاد کی دیوار کمزور ہے اور مضبوط بنیاد کی دیوار مضبوط۔ انسان کو چاہیے کہ متاع دنیا کو آخرت کا توشہ بنالے اور ایسے کام میں خرچ کرے جس میں اس کی عاقبت درست ہو۔ جیسا کہ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا سے معلوم ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ مردوں کے دل میں عورتوں کی اور باپ کے دل میں بیٹوں کی محبت دی گئی۔ حالانکہ یہ محبت دوطرفہ ہوتی ہے۔ شوہر کو بیوی سے اور بیوی کو شوہر سے ایسے ہی باپ کو اولاد سے۔ اولاد کو باپ سے۔ پھر یہاں یک طرفہ محبت کا کیوں ذکر فرمایا گیا؟ **جواب:** یہ درست ہے مگر مرد میں محبت کا غلبہ ہے اور عورت میں محبوبیت کا۔ ایسے ہی باپ میں محبت غالب ہے۔ اولاد میں محبوبیت۔ جیسا کہ جانور انسان کے خدمتگار ہیں۔ اور انسان ان کا مخدوم مگر انسان بھی ان کی خدمتیں کرتا ہے۔ **دوسرا اعتراض:** یہاں یہ کیوں فرمایا گیا۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ یا تو زُيِّنَ الشَّهَوَاتِ کہہ دیا جاتا۔ یا حُبِّبَ الشَّهَوٰتِ۔ اس چھوٹی عبارت میں بھی مقصد حاصل ہو جاتا؟ **جواب:** اس سے مبالغہ مقصود ہے۔ اولاً تو محبوب چیزوں کو شہوت فرمایا گیا یعنی سراپا محبت' پھر ان کی محبت کو زین کا مفعول قرار دیا گیا۔ یعنی یہ دنیا کی پیاری چیزیں گویا سراپا شہوات ہیں۔ وہ خود تو کیا ان کی محبت بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گویا وہ انتہائی درجہ کے محبوب ہیں۔ جیسے فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ (بقرہ: ۲۳) **تیسرا اعتراض:** اس آیت میں سونے چاندی کی قید کیوں لگائی گئی۔ انسان کو تو غلہ کا ڈھیر بھی پیارا معلوم ہوتا ہے' بلکہ سونا چاندی بہت جلد قبضہ سے نکل جاتا ہے اور زمین وغیرہ ہمیشہ اپنے پاس ہی رہتی ہے ان کی محبت سونے چاندی سے بڑھ کر ہے۔ **جواب:** قدرت نے چاندی سونے کو تمام چیزوں کی قیمت قرار دیا۔ ان کا مالک گویا ہر چیز کا مالک ہے وہ سمجھتا ہے جو چاہوں گا خرید لوں گا۔ لہٰذا اس سے زیادہ محبت ہے اور سونا چاندی ہی تمام مالوں کی اصل ہے۔ نیز سونے چاندی کی ملکیت سے انسان کو قدرت حاصل ہوتی ہے۔ اور قدرت کمال ہے اور کمال محبوب بالذات۔ لہٰذا یہ دونوں مال بھی ہیں اور کمال بھی ان دو وجہ سے پیاری ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑوں سے محبت کرنا بھی برا ہے حالانکہ دوسری جگہ قرآن کریم گھوڑوں کی قسم کھا رہا ہے۔ وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا۔ (العادیات: ۱) اور حضور انور ﷺ فرماتے کہ گھوڑے کی پیشانی کے بالوں سے خیر و بھلائی وابستہ ہے۔ ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** گھوڑے تین قسم کے ہیں۔ جہاد کے گھوڑے' کاروبار کے گھوڑے۔ جیسا تانگہ وغیرہ کے گھوڑے' فخر و ریا کے گھوڑے۔ پہلے گھوڑوں کی تعریف ہے اور تیسرے گھوڑوں کی یہاں برائی ہے دیکھو حدیث شریف میں کھیتی باڑی کی تعریف بھی آتی ہے کہ ارشاد ہوا غلہ دبانے والا لعنتی ہے اور غلہ اگانے والا' لانے والا مرزوق ہے اور برائی بھی وارد ہے کہ فرمایا جس گھر میں کھیتی باڑی کے آلات ہوں گے وہاں ذلت و خواری ہوگی۔ جس کھیتی سے غفلت ترک جہاد ہو وہ ذلت کا سامان ہے اور جس سے بندوں پر رزق کی فراوانی ہو وہ رحمت ہے۔

تفسیر صوفیانہ

فرشتوں میں عقل ہے' شہوت نہیں۔ اور جانوروں میں شہوت ہے عقل نہیں مگر انسان میں عقل بھی ہے اور شہوت بھی۔ جس کی

بعد ایک فعل پوشیدہ ہے (وَقَعَ هٰذَا) یا واؤ عاطفہ ہے، جس کا معطوف علیہ پوشیدہ ہے، کُمْ میں خطاب منافقین سے ہے، ما سے مراد نفاق وغیرہ ہیں، یعنی بدر میں جو کچھ ہزیمت وغیرہ ہوئی، اس کی وجہ یہ نہیں، کہ رب تعالیٰ نے مسلمانوں کو چھوڑ دیا ہے، بلکہ یہ سب کچھ اس لئے ہوا، کہ تمہارے دلی نفاق کی جانچ ہو جائے، اور سارے مسلمان تمہارے کردار سے تمہیں پہچان لیں وَ لِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِکُمْ، یہ واؤ عاطفہ ہے، اور جملہ لِیَبْتَلِیَ پر معطوف، لِیُمَحِّصَ تَمْحِیْصٌ سے بنا بمعنی تخلیص یا اظہار، ما سے مراد وسوسے اور برے عقیدے ہیں، چونکہ اعتقاد اور وسوسے دل میں رہتے ہیں، اس لئے یہاں قلوب فرمایا گیا، بعض نے فرمایا کہ اسلام کی جگہ سینہ ہے، اور ایمان کی جگہ دل مشاہدہ کی جگہ فواد اور توحید کی جگہ لُب، دیکھو رب تعالیٰ فرماتا ہے اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (زمر: ۲۲) جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا، اسلام کے لئے سینہ استعمال کیا گیا، اور فرماتا ہے اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ (مجادلہ: ۲۲) ان کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا، دیکھو ایمان کے لئے دل فرمایا گیا، یعنی یہ واقعہ اس لئے ہوا، کہ اے منافقو! اللہ تمہارے دل کے نفاق اور وسوسے ظاہر فرمائے، یا اے مسلمانو! تمہارے دل کا ایمان و اخلاص اللہ ظاہر فرمائے، یہ سب کچھ تم پر ظاہر کرنے کے لئے ہے، ورنہ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اللہ تو ہمیشہ سے ہی ہر ایک کے دل کی بات جانتا ہے، یہ امتحان وغیرہ اس کے علم کے لئے نہیں، علیم، عالم، عَلّام کے فرق بارہا بیان کئے جا چکے ہیں، ذَاتٌ ذُوْ کا مونث ہے اصل میں ذَوَۃٌ تھا، فتح ماقبل کی وجہ سے واؤ الف بن گیا ذُوْ کے معنی والا اور ذات کے معنی والی،

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! احد میں جو واقعہ درپیش آیا، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ہمارا وعدۂ نصرت غلط تھا، یا ہم تم سے ناراض ہو گئے تھے، تم تو ہمارے حبیب کے امتی ہو، ہم تم سے ناراض کیوں ہوں، بلکہ تمہاری کچھ اپنی غلطی تھی جس سے یہ حادثہ پیش آیا، ورنہ ہم تو تم پر ویسے ہی مہربان ہیں، اس کا ثبوت یہ ہے، کہ اسی احد کے میدان میں ایسی مصیبت کی حالت میں ہم نے تمہارے دلوں پر سکینہ اتارا، جس سے تمہارے قلبوں کو چین آ گیا، اور ایسا چین و سکون نصیب ہوا کہ تم اونگھنے لگے، حضرت زبیر فرماتے ہیں اس دن کی کیفیت یہ تھی کہ جس کو دیکھو وہ جھونکے کھا رہا ہے، اور اس کی ٹھوڑی سینہ سے لگی ہوئی ہے، حتی کہ بعض خراٹے لے رہے تھے، انہی اونگھنے والوں میں میں بھی تھا، اسی حالت میں میں نے معتب ابن قشیر کا یہ کلام سنا کہ اگر ہمارا اختیار ہوتا تو ہم کیوں مارے جاتے میں نے ایسے سنا جیسے خواب میں سن رہا ہوں (معانی) اے مسلمانو! یہ چین و سکون اور اونگھ کھرے کھوٹے میں فرق کا باعث تھی کہ مخلصین تو اللہ رسول کے وعدہ پر مطمئن تھے، مزے سے خراٹے لے رہے تھے، مگر منافقین جنہیں ان وعدوں پر اعتماد نہ تھا انہیں اس وقت اپنی جانوں کے لالے پڑے تھے، چہرے اترے ہوئے تھے، رنگ زرد تھے، دل میں سوچتے تھے کہ اللہ رسول نے ہم سے وعدے غلط کئے تھے، اگر وعدے سچے ہوتے تو ہم پر یہ آفت کیوں آتی، اور دبی زبان سے یہ کہتے تھے، کہ پہلے ہماری رائے نہ مانی گئی، اگر مسلمان ہماری بات مان لیتے اور مدینہ میں رہ کر مدافعانہ جنگ کرتے، تو یہ نوبت کیوں آتی، اے محبوب ان بے عقلوں سے فرما دو کہ ہر چیز کا اختیار اللہ کو ہے، اس کا فیصلہ اٹل ہے، اے محبوب یہ منافق بڑے بدطینت

جن کے نیچے نہریں رواں ہمیشہ ان میں رہیں گے اور ستھری بیویاں اور اللہ کی خوشنودی
وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾
اور اللہ دیکھنے والا ہے بندوں کو
اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں اجمالاً فرمایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔ اب اس کی تفصیل فرمائی جارہی ہے کہ وہ ٹھکانا جنت اور وہاں کی نعمتیں ہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں یہ بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے مگر اس کا ذکر نہ ہوا تھا کہ کس کے لئے۔ اب اس کا ذکر بھی ہو رہا ہے کہ ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ خاص پرہیزگاروں کے لئے ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں دنیوی نعمتوں کا آخرت سے مقابلہ کیا گیا تھا کہ وہ رذیل ہیں۔ اور آخرت عزیز۔ اب اس کے دلائل ارشاد ہو رہے ہیں کہ دنیا' دوست' دشمن' سب کے لئے ہے مگر آخرت صرف پرہیزگاروں کے لئے۔ دنیا کو فنا ہے' آخرت کو بقا۔ دنیا میں پھنسنا ناراضی رب کا ذریعہ' اور جنت میں رب سب سے راضی' گویا وہ دعویٰ تھا یہ دلائل۔

تفسیر

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ۔ قُلْ میں حضور ﷺ سے خطاب ہے۔ چونکہ اعمال عصاء موسوی کی طرح مفید ہیں اور حضور انور ﷺ کا توسل دست موسوی کی طرح ہے۔ عصاء موسوی دست موسوی میں اثر دکھاتا تھا۔ اس ہاتھ کے بغیر عصا بیکار ہوتا تھا۔ ایسے ہی حضور ﷺ کے توسل کے بغیر اعمال بیکار ہیں۔ اس لئے قُلْ فرمایا گیا کہ مضمون ہمارا ہو محبوب زبان و توسل تمہارا ہو۔ اَؤُنَبِّئُكُمْ کا پہلا ہمزہ استفہام تقریری کا ہے۔ اُنَبِّئُ نباءٌ سے بنا بمعنی خبر۔ اصطلاح میں عظیم الشان خبر یا غیب کی خبر پر اکثر بولا جاتا ہے۔ دیگر پر کم۔ اسی لئے ہر قاصد کو مخبر کہہ سکتے ہیں۔ نبی نہیں کہہ سکتے۔ لہٰذا نبی وہ جو غیب کی خبریں لائے۔ جو حضور انور ﷺ کے علوم غیبیہ کا انکار کرتا ہے۔ وہ درپردہ آپ (ﷺ) کی نبوت کا انکار کرتا ہے۔ كُمْ میں سارے لوگوں سے خصوصاً کفار سے خطاب ہے کیونکہ حضور انور ﷺ سارے عالم کے نبی ہیں تو آپ (ﷺ) کے فرمان سارے عالم کے لئے ہیں۔ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ۔ (سباء: ۲۸) لہٰذا حضور ﷺ کا فرمان سارے جہاں کے لوگوں کے لئے ہے۔ بِخَيْرٍ کا ب یا تعدیہ کا ہے۔ یا صلہ کا۔ اور یہ اُنَبِّئُ کے متعلق۔ خیر معنی اسم تفضیل ہے۔ مِنْ سے مستعمل۔ ذٰلِكُمْ میں عورتوں' اولاد سونے چاندی کے ڈھیر اور اچھے گھوڑے وغیرہ سب کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اے نبی ﷺ آپ ان سب لوگوں سے یا غافلین سے فرمائیں کہ کیا میں تمہیں اس چیز کی خبر دوں جو اس دنیوی سارے سامان سے بہتر ہے یا یہ چیزیں وہ ہیں جو گذشتہ مذکورہ چیزوں میں شامل ہو جائیں تو انہیں خیر کردیں۔ یہ وہ چورن ہے جو ہر غذا کو ہضم کر دیتا ہے۔ خیال رہے کہ بتانا ہی منظور تھا مگر یہ سوال شوق دلانے کے لئے ہے کیونکہ پوچھ کر جو شئی بتائی جائے اس کو سننے والا شوق سے سنتا ہے۔ نیز

خیال رہے کہ چونکہ دنیا کی ساری راحتیں تکلیف سے مخلوط ہیں اور فانی۔ آخرت کی نعمتیں خالص نعمتیں ہیں اور باقی اس لئے وہ اس سے بہتر ہیں۔ لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ نیا جملہ ہے بخیر کا بیان۔ لِلَّذِیْنَ خبر مقدم جَنّٰتٌ مبتدا اور عِنْدَ رَبِّهِمْ جنت کا ظرف یا حال۔ لِلَّذِیْنَ میں اگر لام ملکیت کا ہے تو تقویٰ سے مراد پرہیز گاری نیک کاری ہے۔ یعنی واجبات کا ادا کرنا اور گناہوں سے بچنا' کیونکہ جنت اصل ملک پرہیز گاروں کی ہے اور اگر اس کا متعلق ثابت ہے تو تقویٰ سے مراد شرک وکفر سے بچنا ہے کہ آخر کار سارے ہی مسلمان جنت میں جائیں گے۔ گنہگار ہوں یا پرہیز گار۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ قرآن کے عرف میں تقویٰ بمعنی ایمان عام مستعمل ہے۔ رب فرماتا ہے۔ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى۔ (الفتح:۲۶) عِنْدَ سے قرب مکانی مراد نہیں بلکہ قرب ربی' کیونکہ رب تعالیٰ جگہ سے پاک ہے۔ جَنّٰتٌ جمع جنت کی ہے بمعنی گھنا باغ۔ جس کی زمین کھلی نہ ہو۔ چونکہ ایک ایک جنتی کو کئی کئی باغ ملیں گے۔ اس لئے جمع ارشاد ہوا۔ یعنی پرہیز گاروں یا مسلمانوں کے لئے ان کے رب کے پاس خوبصورت باغ ہیں۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ فرما کر یہ بتایا کہ جنت دنیا میں ہی نہ ملے گی بلکہ رب تعالیٰ کے پاس پہنچ کر ملے گی۔ دنیا کام کی جگہ ہے۔ آخرت حصول انجام کی۔ فصل بوتے ہی دانہ نہیں ملتا۔ باغ لگاتے ہی پھل نہیں کھائے جاتے۔ بھینس کی کٹی پیدا ہوتے ہی دودھ نہیں دیتی۔ بچہ اسکول میں پہنچتے ہی بی اے نہیں ہو جاتا۔ ان چیزوں کے انجام بہت بعد میں دیکھے جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایمان ونماز وغیرہ اختیار کرتے ہی جنت نہیں مل جاتی۔ جنت' روضہ' بستان' حدیقہ' حائط' ان سب کے معنی باغ ہیں مگر جنت خصوصی باغ ہے۔ ہر باغ کو جنت نہیں کہا جاتا۔ بعض علماء نے فرمایا کہ عِنْدَ رَبِّهِمْ اتقوا کا ظرف ہے اور اس سے منافقین کو نکالنا مقصود ہے یعنی جو رب کے نزدیک متقی ہیں ان کے لئے جنتیں ہیں۔ منافق لوگوں کی نگاہ میں تو پرہیز گار ہے مگر رب تعالیٰ کے نزدیک کافر۔ لہٰذا وہ اس سے خارج ہے۔ (کبیر) اللہ کے نزدیک متقی یا تو وہ جو فقط جسم کا ہی متقی نہ ہو' بلکہ دل کا بھی متقی نیک اعمال جسم کا تقویٰ ہے اور شعائر اللہ کی تعظیم دل کا تقویٰ رب فرماتا ہے۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۔ (حج:۳۲) عمل اور ہے ادب کچھ اور' عمل والا عند الناس متقی ہے اور ادب والا عند اللہ متقی یا عند اللہ متقی وہ ہے جس کا خاتمہ تقویٰ وطہارت پر ہو۔ ہم حال کو دیکھتے ہیں۔ رب کے یہاں مال یعنی انجام دیکھا جاتا ہے۔ یا رب تعالیٰ کے ہاں متقی وہ ہے جس کا نام متقیوں کی فہرست میں آچکا ہے۔ یا رب تعالیٰ کے ہاں متقی وہ ہے جو اخلاص والا ہو۔ نفاق والا متقی اگرچہ مخلوق اسے متقی کہے مگر خالق کے ہاں متقی نہیں۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ یہ جملہ جنت کا حال یا صفت ہے۔ تَجْرِیْ جریٌ سے بنا بمعنی بہنا۔ تحتھا کا مرجع جنّٰتٌ ہیں۔ انہار نہر کی جمع ہے جس کی تحقیق ہم پہلے پارہ میں کر چکے ہیں۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ جو دریا سے کاٹ کر سیدھی نکالی جائے جس میں کچھ کجی ٹیڑھا پن نہ ہو وہ نہر کہلاتی ہے۔ بہنا پانی کی صفت ہے۔ یہاں نہر کی صفت قرار دینا مجازاً ہے۔ چونکہ جنت میں دودھ' شہد پانی اور شراب طہور کی مختلف نہریں ہوں گی۔ اس لئے جمع ارشاد ہوا۔ یعنی جنتیں ایسی ہیں کہ ان کے نیچے ہمیشہ نہریں بہتی ہیں۔ ان کے خشک ہو جانے کا کبھی احتمال نہیں۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا۔ یہ اَلَّذِیْنَ کا حال ہے۔ خَالِدِیْنَ خلود سے بنا بمعنی ہمیشگی اور دراز مدت۔ یہاں ہمیشگی مراد ہے۔ یعنی متقی ان جنتوں میں ہمیشہ رہیں گے' کبھی نہ نکلیں گے۔ یا ان باغوں میں سدا بہار رہے گی' کبھی خزاں نہ آئے گی۔ یا ان باغوں کے پھل دائمی ہوں گے۔ فصل یا موسم کے پابند نہ ہوں گے۔ غرضکہ خلود میں بڑی وسعت ہے۔ اس سے جنت اور جنتی لوگ

تھا، کہ ہم میدانِ جہاد میں آ کیوں گئے، نہ آتے تو اچھے رہتے، جسے انہوں نے لَوْ کَانَ لَنَا الخ سے بیان کیا لہٰذا آیت میں تکرار نہیں، **چوتھا اعتراض:** یہاں رب تعالیٰ نے فرمایا کہ منافقین اپنے دلوں میں وہ باتیں چھپائے ہوئے ہیں جو آپ پر ظاہر نہیں کرتے، مگر یَقُوْلُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ ظاہر کر گئے تھے، ان دو جملوں میں مطابقت کیونکر ہو! **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ ظاہر کرنا اور ہے، اور بے اختیار ظاہر ہو جانا کچھ اور، مطلب یہ ہے کہ، اے محبوب ﷺ یہ باتیں ان کے منہ سے بے اختیار نکل جاتی ہیں، جس سے ان کا نفاق ظاہر ہو جاتا ہے، ورنہ وہ اپنا نفاق ظاہر کرنا چاہتے نہیں، دوسرے یہ کہ جو کچھ ظاہر کرتے ہیں وہ بہت کم ہے جو ان کے دل میں ہے، وہ بہت زیادہ ہے، ظاہر صرف یہ کیا کہ ہم یہاں کیوں آگئے، نہ آتے تو اچھا تھا مگر دل میں یہ ہے کہ اسلام غلط ہے، رب تعالیٰ کے وعدے جھوٹے ہیں، نبی کریم ﷺ سچے رسول نہیں ہیں، اگر یہ سب کچھ درست ہوتا، تو ہم احد میں ہزیمت کیوں پاتے، **پانچواں اعتراض:** اس آیت کریمہ میں وَلِيَبْتَلِيَ کے بعد صُدُوْرِ فرمایا گیا، اور وَلِيُمَحِّصَ کے بعد قُلُوْبِكُمْ ارشاد ہوا، اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ **جواب:** تفسیر میں عرض کیا جا چکا کہ سینہ محبت یا کینہ کا گنجینہ ہے، وسوسہ یا الہامات سینہ میں ہوتے ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ (الناس:۵) اور کفر و ایمان، نفرت و میلان دل میں رہتے ہیں، یہاں فرمایا یہ گیا، کہ واقعہ احد میں مومنوں کے ایمان اور منافقوں کے کفر کا بھی امتحان تھا، اور ان کے نفرت و میلان، وسوسوں اور الہام کی بھی جانچ تھی، بعض صرف مدینہ میں رہتے تھے، اور بعض کے سینوں میں مدینہ آباد تھا! ایک جنگِ احد نے ان سب کو نکھار کر رکھ دیا، اور سب کو ایک دوسرے سے ممتاز کر دیا،

تفسیر صوفیانہ

اللہ تعالیٰ نے ایک جانور ایسا پیدا فرمایا، جو پانی میں بھی رہتا ہے، خشکی میں بھی اور ہوا میں بھی اڑتا ہے، جسے مرغابی کہتے ہیں، کہ وہ مرغ بھی ہے اور آبی بھی، یعنی تیرندہ بھی ہے اور پرندہ بھی بلکہ چلندہ بھی، اسے قدرت نے اڑنے کے لئے پر بھی دیئے ہیں، چلنے کے لئے پیر بھی، اور تیرنے کے لئے پنجوں میں جالی بھی، جس سے وہ دریا میں چپو کا کام بھی لیتا ہے، ایسے ہی رب تعالیٰ نے مومن کامل کو وہ قوتیں بخشی ہیں، کہ مصائب کے سمندر میں صبر کے بازوؤں سے تیر بھی لیتا ہے، راحتوں کی فضاؤں میں شکر کے پروں سے اڑ بھی لیتا ہے، اور نارمل حالات کے میدانوں میں عبادات کے پیروں سے چل بھی لیتا ہے، ایسا مومن بندۂ کامل ہے، اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کو چھانٹنے کے لئے بدر و احد کے میدان قائم فرمائے، کوئی کمزور صبر کے دریا کو طے نہیں کر سکتا، اور کوئی ضعیف نعمتوں کی فضاؤں میں اڑ نہیں سکتا، اور کوئی عبادات میں کچا نکلتا ہے، مبارک ہے وہ بندہ جو ہر طرح پختہ ہو، حضرات صحابہ نے بدر کے میدان میں شکر کے پروں سے اڑ کر دکھا دیا، اور احد کے بحرِ ناپیدا کنار میں صبر کے بازوؤں سے تیر کر دکھلا دیا، اب رب تعالیٰ ان سے راضی ہو چکا، وہ رب تعالیٰ سے راضی، یہ مصیبتیں اور راحتیں انسان کی امتحان گاہ ہیں، ہر حال میں راضی رہنے والے مرد کامل ہیں، انہی سے شیطان گھبراتا ہے،

حکایت: حضرت جنید بغدادی نے شیطان کو خواب میں ننگا دیکھا فرمایا تو لوگوں سے حیا کیوں نہیں کرتا؟ وہ بولا یہ لوگ

ہی نہیں، بلکہ لوگوں کے لباس میں کوڑا ہیں، لوگ وہ ہیں جو شونیزیہ مسجد میں رہتے ہیں، انہوں نے میرا کلیجہ پھاڑ دیا، اور میرا جسم فنا کر دیا، حضرت جنید فرماتے ہیں، میں بیدار ہو کر اس مسجد میں گیا، وہاں ایک قوم کو دیکھا، جو بحرِ فکر میں ڈوبی ہوئی ہے، وہ حضرات مجھے دیکھ کر بولے، اے جنید! اس خبیث کی حدیث (یعنی بات) سے دھوکا نہ کھانا، دل کے تنور میں نورِ معرفت چمکاؤ، تاکہ ناری شیطان اس کے قریب بھی نہ آسکے، شیطان لاٹھی سے نہیں ڈرتا، وہ نورِ معرفت سے خوف کرتا ہے، (از روح البیان مع زیادت)

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِۙ
بیشک وہ لوگ جو پیٹھ پھیر گئے تم میں سے اس دن کہ بھڑ گئیں دو جماعتیں
بیشک وہ جو تم میں سے پھر گئے جس دن دونوں فوجیں ملی تھیں
اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْاۚ
بجز اس کے نہیں کہ انہیں شیطان نے پھسلا دیا بوجہ بعض ان اعمال کے جو انہوں نے کئے
انہیں شیطان ہی نے لغزش دی ان کے بعض اعمال کے باعث
وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ۠ (۱۵۵)
اور بیشک معاف فرما دیا ان کو اللہ نے بے شک اللہ بخشنے والا حلم والا ہے
اور بیشک اللہ نے انہیں معاف فرمایا بے شک اللہ بخشنے والا حلم والا ہے

تعلقات

اس آیت کے گذشتہ آیات سے چند طرح تعلق ہیں، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں میدانِ احد میں مسلمانوں کی ہزیمت کی حکمتیں بیان فرمائی گئیں، کہ اس سے کھرے کھوٹے کی جانچ مقصود تھی، اب اس ہزیمت کا سبب بیان فرمایا جارہا ہے، کہ یہ واقع کیوں ہوئی، تاکہ مسلمان آئندہ اس چیز سے بچیں، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں تقدیر خداوندی کا ذکر تھا کہ احد میں جو کچھ ہوا، ہمارے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوا، یہ پہلے ہی سے ہمارے علم میں آچکا تھا، اب بندہ کی تدبیر کا ذکر ہے، کہ چونکہ تم سے تدبیر میں غلطیاں ہوئیں، اس لئے ان چیزوں کا ظہور ہوا، تمہیں چاہیے کہ تم صرف تقدیر پر شاکر نہ رہو، بلکہ تدبیریں بھی ٹھیک کرو، مضر چیزوں سے پرہیز تقدیر کے خلاف نہیں، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ کی ان نعمتوں اور رحمتوں کا ذکر تھا جو احد میں غازیوں پر نازل ہوئیں، اب شیطان کے ان وسوسوں کا تذکرہ ہے، جن کی بنا پر اسے موقعہ ملا،

تفسیر

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ چونکہ اس آیت کے مضمون کے انکاری زمانہ رسالت میں بھی تھے، اور آئندہ قیامت تک پیدا ہونے

والے بھی تھے، کہ بعض بدبخت احد کے واقعہ کو آڑ بنا کر صحابہ کرام پر تبرا کرتے تھے اور کریں گے، اس لئے رب تعالیٰ نے اسے اِنَّ سے شروع کیا، اور درمیان میں اِنَّمَا فرمایا، اور آخر میں لَقَدْ کی تاکید فرمائی، تاکہ معلوم ہو، کہ اس دھوکہ کا ذمہ دار شیطان ہی ہے، اور اس دھوکہ کی بنا پر جو کچھ صحابہ سے ہوا، رب تعالیٰ نے بالکل معاف فرمایا اَلَّذِیْنَ سے احد کے مخلص غازی مراد ہیں، منافقین اس میں داخل نہیں، کیونکہ معافی مخلصین ہی کی ہوئی، تَوَلَّوْا وَلْیٌ سے بنا بمعنی قرب باب تفعل سلب کے لئے ہے، باب افعال بھی اسی لئے آتا ہے، تَوَلِّیْ اور اِیْلَاء کے لغوی معنی ہیں قرب نہ رہنا، اصطلاح میں پیٹھ پھیرنے، منہ پھیرنے اور بھاگنے کو بھی تَوَلِّیْ کہہ دیتے ہیں، تَوَلِّیْ بمعنی محبت ودوستی وِلَایَۃ سے بنا ہے نہ کہ وَلْیٌ سے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (مائدہ:۵۱) جو کفار سے دوستی ومحبت کرے گا وہ ان میں سے ہوگا، یہاں تَوَلَّوْا کا مفعول بہ، وَجہ یا دبر اور ظرف بِاُحُدٍ پوشیدہ ہے مِنْكُمْ میں خطاب مسلمانوں سے ہے، یوم سے مراد احد کا دن ہے، التقاء سے مراد بھڑ جانا، گتھم گتھا ہو جانا ہے نہ کہ محبت کی ملاقات، جَمْعَانِ سے مراد ایمانی اور ابوسفیانی لشکر ہیں جن کا مقابلہ احد میں ہوا تھا، یعنی وہ مخلص مسلمان جنہوں نے احد میں اسلامی اور کفار کی فوج کی جنگ کے وقت اپنے چہرے یا پیٹھیں پھیرلیں، یہاں تفسیر کبیر وغیرہ نے فرمایا کہ غازیانِ احد کے تین حصے ہو گئے تھے، ایک حصہ جو وہاں جما رہا، اور ایک حصہ زخمی ہوا، اور ایک حصہ کے قدم اکھڑ گئے، قدم اکھڑنے والوں میں سے بعض وہ تھے جو مدینہ منورہ میں پہنچ گئے، ان میں سے سعد ابن عثمان نے وہاں یہ کہا کہ نبی کریم ﷺ شہید کر دیئے گئے ہیں، اُنہی میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے اور دو انصاری بھی سعد وعقبہ جو تیسرے دن احد کی طرف لوٹے، اور بعض وہ تھے جن کے پہلے قدم اکھڑے، مگر وہ فوراً ہی پہاڑ کے پاس جا کر جم گئے، اور وہیں کفار سے جنگ کرتے رہے، حضور انور ﷺ کی سلامتی کی خبر پا کر فوراً وہاں حاضر ہو گئے، ان میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے، اور بعض وہ حضرات تھے جو قطعاً اپنی جگہ سے نہ ہٹے، بلکہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر رہے، اور آپ کی حفاظت کرتے رہے، یہ چودہ حضرات تھے، سات مہاجر، ۱۔ابوبکر صدیق، ۲۔علی مرتضیٰ، ۳۔عبدالرحمان ابن عوف، ۴۔سعد ابن ابی وقاص، ۵۔طلحہ ابن عبیداللہ، ۶۔ابوعبیدہ ابن جراح، ۷۔زبیر ابن عوام، اور سات انصاری، ۱۔خباب ابن منذر، ۲۔ابودجانہ، ۳۔عاصم ابن ثابت، ۴۔حارث ابن صمہ، ۵۔سہل ابن حنیف، ۶۔اسید ابن حفیر، ۷۔سعد ابن معاذ، یہ تفسیر کبیر اور روح المعانی کی تحقیق ہے، تفسیر خازن نے بھی اس کے قریب قریب ہی کہا، مگر فقیر کو اس میں دو طرح گفتگو ہے، ایک یہ کہ ٹھہرنے والے حضرات اگر صرف تہائی ہوتے، تو ان کی تعداد قریباً دو سو تینتیس ہوتی، کیونکہ غازیانِ احد کل سات سو تھے، اور کفار مکہ تین ہزار، اتنی تعداد کو کفار کی یہ جماعت بالکل فنا کر دیتی، یقیناً ڈٹے رہنے والے بہت زیادہ ہوں گے جنہوں نے کفار کی یلغار روک لی، دوسرے عمر فاروق کا وہاں سے ہٹنا مسلم بخاری کی روایت کے خلاف ہے، تفسیر روح المعانی نے بحوالہ ابن جریر کچھ جرح کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے، لہٰذا حق یہی ہے کہ حضرت عمر اپنے مرکز سے قطعاً نہ ہٹے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اپنی جگہ سے ہٹ کر حضور انور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے ہوں، اس کا نام بھاگنا نہیں، بلکہ اہم مقام پر پہنچ جانا ہے، کیونکہ جب ابوسفیان نے اعلان کیا کہ نبی کریم ﷺ اور ابوبکر وعمر شہید ہو چکے، تو اس وقت جناب عمر نے ہی للکار کر کہا

عورت مرد کے لئے ذریعہ عیش ہے نہ کہ مرد عورتوں کے لئے۔ یہ طرفداری نہیں بلکہ نیک کاروں کے لئے سامان عیش جمع فرمانا ہے۔ **چوتھا اعتراض:** ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور وہاں کی نعمتیں پیدا ہو چکی ہیں مگر حدیث معراج سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے ہم کو پیغام بھیجا کہ جنت کی زمین خالی ہے اور زرخیز ہے۔ اعمال کرو تا کہ اس زمین میں باغ لگیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی وہاں کوئی سبزہ نہیں؟ **جواب:** اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جنت کی بعض زمین سفید بھی ہے جس میں اعمال سے باغ لگیں گے۔ لہٰذا یہ حدیث بھی درست ہے اور آیات قرآنیہ بھی ٹھیک ہیں۔ آدم علیہ السلام جنت میں رہے۔ حضور انور ﷺ نے وہاں کی سیر فرمائی۔ اب بھی حضرت ادریس علیہ السلام وہاں موجود ہیں۔ بی بی مریم کو بہشتی پھل دیئے گئے اگر جنت میں کچھ نہیں تو یہ تمام کاروبار کیسے ہو رہا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

جو لوگ اغیار کو دیکھنے سے بچتے ہیں ان کے چند جنتیں ہیں۔ جنت یقینی' جنت مکاشفہ' جنت مشاہدہ' جنت رضا' اور وہ جنت جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی' نہ کان نے سنی' اور نہ کسی کے وہم وگمان میں آئی۔ اس جنت کے نیچے تجلیات کی نہریں بہتی ہیں۔ جو غیبی چشموں سے نکلی ہیں۔ وہ لوگ اس میں بقا وفنا کی لذتیں پائیں گے۔ ان کے لئے ازواج یعنی ارواح مقدسہ کے جوڑے ہوں گے۔ جو نفسانی عیوب سے پاک ہوں گے اور صفات الٰہیہ کے خیموں میں رہنے والی۔ اس کے سوا رب تعالیٰ کی ایسی رضا مندی ہے جو اندازے سے باہر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی روحوں کے انقلاب کو دیکھتا ہے کہ کبھی وہ عالم ملکوت میں ہیں اور کبھی عالم جبروت میں۔ کبھی عالم انوار میں کبھی عالم شوق میں۔ کبھی رنج وغم میں مبتلا (روح المعانی) صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جنات جسمانی جنتوں کی طرف اشارہ ہے اور رضوان جنت روحانی کی طرف۔ جنت میں سب سے اعلیٰ مقام روحانیت ہے۔ جہاں بندہ کی روح پر انوار الٰہی کی تجلی ہوتی ہے اور بندہ دریائے معرفت میں غرق ہو جاتا ہے۔ ان مقامات میں پہلے بندہ اللہ سے راضی ہوتا ہے اور پھر اللہ بندہ سے۔ پہلے بندہ مولیٰ کا طالب ہوتا ہے اور پھر اس کا مطلوب اور محبوب۔ اس کی طرف اس میں اشارہ ہے۔ راضیۃ مرضیۃ (روح البیان) تفسیر ابن عربی میں فرمایا کہ جو خدا کے لئے دنیا کی ہر چیز چھوڑیں تو ان کے لئے آخرت کی ہر چیز ہے۔ افعال کی جنت جنت ہیں اور روحانیات وہاں کے ازواج اور رضوان جنت صفات غرض وہ رب کا ہے تو سب اس کا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا
وہ لوگ جو کہتے ہیں اے رب ہمارے تحقیق ہم ایمان لائے پس بخشدے واسطے ہمارے گناہ ہمارے اور بچا ہم کو
جو کہتے ہیں اے رب ہمارے ہم ایمان لائے تو ہمارے گناہ معاف کر
عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ
عذاب سے آگ کے صبر کرنے والے اور سچ بولنے والے اور اطاعت کرنے والے اور خرچ کرنے والے
اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے صبر والے اور سچے اور ادب والے اور راہ خدا میں خرچ کرنے والے

محبوب آپ بھی انہیں فرمادو، اوران کے لئے دعائے مغفرت فرمادو، یعنی ہم نے انہیں معاف کردیا، تم بھی معافی دے دو، ہم سفارش فرماتے ہیں، سبحان اللہ ایسی خطاؤں پر ہماری ساری عبادات قربان ہوں جن کی معافی کا اتنا اہتمام ہے، لام اور قد کی تاکید سے اس مضمون کو اور زیادہ مؤکد فرمادیا، رب تعالیٰ جانتا تھا کہ بعض بد باطن ان حضرات پر زبان طعن دراز کریں گے، اس لئے معافی کا اتنا اہتمام فرمایا گیا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ یہ جملہ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ کی دلیل ہے، یعنی ہم نے ان حضرات کو معافی دے دی، اس لئے کہ ہم غفور بھی ہیں کہ جو توبہ کرے، اسے بخش دیتے ہیں، اور حلیم بھی ہیں، کہ جو توبہ نہ کرے، اپنے جرم پر ڈٹا رہے، اس پر عذاب جلد نہیں بھیجتے، اسے توبہ کا موقعہ دیتے ہیں کہ اب بھی باز آجائے، یہ حضرات تو اپنی اس خطا پر نادم بھی ہیں شرمسار بھی، ہم غفور بھی ہیں، رحیم بھی، ہم نے سب کچھ معاف کردیا،

خلاصہ تفسیر

غزوۂ احد میں دو جماعتوں سے دو لغزشیں وخطائیں ہوئیں، درہ والوں میں سے چالیس حضرات سے تو یہ خطا ہوئی، کہ انہوں نے غلط فہمی میں مبتلا ہوکر درہ چھوڑ دیا، جس پر بھاگے ہوئے کفار ٹوٹ پڑے، اور گھبرا کر بھاگ پڑنے والوں سے یہ خطا ہوئی، کہ وہ حضور انور ﷺ کی طرف نہ بھاگے، بلکہ دوسری طرف ان کا رخ ہوگیا، اگر حضور انور ﷺ کی طرف بھاگتے، تو سبحان اللہ بہت ہی اچھا ہوتا اس آیت کریمہ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ میں دوسری خطا کا ذکر ہے، اور بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا میں پہلی لغزش کا ذکر اور دونوں لغزشوں کی معافی کا اعلان ہے، یعنی اے غازیانِ احد تمہاری جماعت میں سے جو مسلمان دو لشکر یعنی لشکرِ اسلام اور لشکرِ کفار کی گھمسان کی جنگ ہونے کی حالت میں منہ پھیر گئے یہ عمداً یا ارادۃً نہ تھا، وہ لغزش کھا گئے، پھسل گئے، اور لغزش و پھسلن بھی اپنی نفسانی وجہ سے نہ ہوئی، انہیں شیطان نے دھوکا دے دیا، اس دھوکا کی وجہ یہ ہوئی، کہ ان کے بعض سے بعض غلطیاں سرزد ہوگئیں، جس سے شیطان کو انہیں لغزش دے دینے کا موقعہ مل گیا، تم لوگ کان کھول کر سن لو، کہ یقیناً بے شک اللہ نے انہیں معافی دے دی، اب جو ان پر طعن کرے گا، وہ مردود ازلی ہوگا، اللہ تعالیٰ بخشنے والا بھی ہے کہ بڑے سے بڑے قصور کو بخش دیتا ہے، اور حلم والا بھی، کہ سرکشوں کو بھی یکدم نہیں پکڑتا، انہیں بھی توبہ وغیرہ کا موقعہ بخشتا ہے، اب جو رب تعالیٰ کے معافی دے دینے کے بعد بھی ان حضرات کو برا کہے، وہ ہماری پکڑ میں یقیناً آئے گا، اگرچہ ہم اسے جلد نہ پکڑیں، کہ ہم حلیم ہیں، مگر اسے چھوڑیں گے نہیں،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** غازیانِ احد میں سے صرف معدودے چند حضرات سے غلطی ہوئی، تمام سے نہ ہوئی، جیسا کہ مِنكُمْ سے معلوم ہوا، کہ من تبعیضیہ ہے، **دوسرا فائدہ:** ان بعض حضرات سے بھی صرف ایک ایک غلطی ہوئی، درہ والوں سے درہ چھوڑنے کی اور بھاگنے والوں سے رخ غلط ہوجانے کی، ان کے بقیہ تمام اعمال درست صحیح باعثِ ثواب تھے جیسا کہ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** ان بزرگوں سے بھی جو غلطیاں ہوئیں، وہ دانستہ طور پر نہ ہوئیں، بلکہ خطاء اجتہادی یا غلط فہمی کی بناپر ہوئیں، جیسا کہ اِسْتَزَلَّهُمْ سے معلوم ہوا، کہ یہ ہی کلمہ

حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے لئے ارشاد ہوا، حضرت یوشع علیہ السلام نے فرمایا تھا وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ (کہف: ۶۳) **چوتھا فائدہ:** ان حضرات سے جو بھی غلطی ہوئی، وہ دنیاوی لالچ یا نفسانی خواہش کی بنا پر نہ ہوئی، بلکہ شیطان نے انہیں دھوکا دے دیا، جس سے وہ دھوکا کھا گئے، جیسے حضرت آدم وحوا علیہما السلام سے ہوا، **پانچواں فائدہ:** جو کچھ ان حضرات سے خطاء سرزد ہوا، وہ بھی معاف ہو چکا، جس کا اعلان قرآن کریم نے بارہا فرمادیا، اب کسی کو ان پر طعن کرنا اپنا ایمان برباد کرنا ہے، **چھٹا فائدہ:** کبھی بعض کی خطا دوسروں کی خطا کا ذریعہ بن جاتی ہے، دیکھو درہ والوں کی خطا، ان بزرگوں کی خطا کا ذریعہ بن گئی جن کے قدم اکھڑ گئے، صوفیائے کرام فرماتے ہیں خطا سے خطا سرزد ہوتی ہے نیکیوں سے نیکیاں، **ساتواں فائدہ:** کبھی بعض صاحبوں کی خطا دوسروں کے لئے مصیبت کا ذریعہ بن جاتی ہے، دیکھو درہ والوں کی خطا غزوۂ احد کی ہزیمت کا سبب بنی، ایسے موقعہ پر ہر شخص کو نہایت احتیاط سے کام لینا چاہیے، **آٹھواں فائدہ:** شیطان کا مکر وفریب بہت سخت ہے، کوئی شخص اپنے کو شیطان سے محفوظ نہ جانے دیکھو حضرات صحابہ کرام جن میں سے ایک صحابی تمام جہان کے اولیاء سے افضل ہے، انہیں بھی اس مردود نے دھوکا دے دیا، تو ہم کس شمار میں ہیں، **نواں فائدہ:** کبھی ہمارے بعض اعمال سے شیطان کو ہم پر موقعہ مل جاتا ہے، اور وہ ہم کو بہکا دیتا ہے، جیسے بعض اعمال شیطان کے دفعیہ کا ذریعہ ہیں، ویسے ہی بعض اعمال شیطان کے تسلط کا سبب ہیں، ایسے اعمال سے بچنا چاہیے، جیسا کہ بِبَعْضِ کی ب سے معلوم ہوا، **دسواں فائدہ:** صحابہ کرام کا جنگ احد میں بھاگ جانا گناہ نہ تھا، دیکھو رب تعالیٰ نے انہیں لغزش فرمایا، لغزش وہ جو بغیر ارادہ سرزد ہو جائے، اور گناہ میں ارادہ ضروری ہے،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا، کہ صحابہ کرام کو شیطان نے بہکا دیا، اور دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (حجر: ۴۲) میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکتا، پھر ان دونوں آیتوں میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کا جواب بارہا دیا جا چکا ہے، کہ شیطان اللہ کے خاص بندوں کو گمراہ نہیں کر سکتا، معصومین ومحفوظین سے عمداً گناہ نہیں کرا سکتا، رہیں غلطیاں وخطائیں وہ سرزد کرا سکتا ہے، یہاں خطا ہی سرزد ہوئی، نہ کہ بدعقیدگی یا بدعملی، لہٰذا دونوں آیتیں اپنی جگہ درست ہیں، **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ احد میں دو لشکر ملتے ہی یہ حضرات بھاگ پڑے، تاریخ کہتی ہے کہ اولاً مسلمانوں کو فتح ہو گئی تھی، کفار بھاگ گئے تھے، بتاؤ کہ ان دونوں واقعہ میں کونسا درست ہے؟ **جواب:** یہاں ملنے سے مراد کفار کا پیچھے سے حملہ کرنا ہے، اس وقت فوراً ہی مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے تھے اور مسلمانوں کو فتح پہلی مڈبھیڑ میں میسر ہوئی تھی، لہٰذا دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں، پہلی مڈبھیڑ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی، اور دوسری مڈبھیڑ میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، آیت واضح ہے، **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا، کہ ان حضرات سے غلطی پہلے ہوئی، اور ابلیس نے بعد میں بہکایا، کیونکہ ارشاد ہوا بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا، کسب کو سبب فرمایا گیا، اور شیطان کے بہکانے کو مسبب، اور سبب پہلے ہوتا ہے، حالانکہ شیطان بہکاتا ہے پہلے اور انسان غلطی کرتا ہے بعد میں ہماری غلطی یا گناہ

مراد ہیں جو صبح اٹھ کر استغفار پڑھیں چونکہ اس وقت دنیوی شور کم ہوتا ہے۔ نیز دل کو سکون ہوتا ہے۔ رحمت الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ اس لئے اس وقت توبہ اور استغفار دعا وغیرہ زیادہ بہتر ہے۔ یعنی متقی وہ ہیں جو صابر بھی ہوں۔ صادق بھی ہوں' عبادت گزار بھی ہوں۔ اور راہ الٰہی میں خرچ کرنے والے بھی۔ اور نماز تہجد پڑھنے والے۔ یا فجر جماعت سے ادا کرنے والے' یا صبح اٹھ کر توبہ واستغفار کرنے والے۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی ﷺ جنت کے حقدار پرہیزگار ہیں اور پرہیزگار وہ لوگ ہیں جن میں یہ آٹھ صفتیں موجود ہوں۔ ایک یہ کہ وہ رب تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی وفاداری کا اظہار کریں اور عرض کریں کہ اے مولیٰ ہم بے ایمان نہیں' باغی نہیں' بلکہ تجھ کو تیرے رسولوں کو' تیری کتابوں کو' تیرے احکام کو سچا جانتے ہیں اور ہم مومن ہیں پھر صرف ایمان پر ہی قناعت نہیں کرتے بلکہ اپنے کو گنہگار سمجھ کر عرض کرتے ہیں کہ اے مولیٰ ہم خطار کار ہیں تو غفار' ہم گنہگار ہیں۔ تو ستار' ہمارے سارے چھوٹے بڑے' اگلے پچھلے' ظاہر پوشیدہ گناہ معاف کردے۔ تیسرا یہ کہ وہ خدا کی جباری قہاری سے ڈرتے بھی ہیں۔ اپنی نیکیوں پر اعتماد نہیں کرتے۔ اس لئے عرض کرتے ہیں کہ مولیٰ ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔ اسی طرح کہ قبر میں آگ ہمارے پاس نہ آئے اور بعد حشر ہم آگ میں سزا کے لئے نہ جائیں بلکہ دنیا میں رب کی نعمتیں' صحت' دولت' عزت' اولاد ہمارے لئے نور رہوں۔ نار نہ ہوں۔ جو نعمت رب سے غافل کردے وہ نار ہے کہ یار سے فراق کا باعث ہے۔ اور جو نعمت رب سے ملادے وہ نور ہے۔ بلکہ عبادت' ریاضت' علم بھی یا نار ہے یا نور۔ اسی ایک کلمے میں ان تمام قسم کی آگ کے عذاب سے پناہ مانگی ہے۔ بہت جامع دعا ہے۔ شیطان کا علم وعبادت نار تھیں۔ ابوجہل وقارون کی دولت نار فرعون کی سلطنت نار بنی کہ ان چیزوں نے انہیں نار میں داخل کیا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمِهٖ (جاثیہ: ۲۳) چوتھے یہ کہ وہ مصیبتوں اور عبادت کی مشقتوں' اور جہاد کی دشواریوں پر بھی صبر کرتے ہیں اور اپنے نفس کو گناہوں سے روکتے ہیں۔ پانچویں یہ کہ وہ قول کے سچے ہیں۔ خبر دیتے ہیں تو سچی وعدہ کرتے ہیں تو سچا' اپنے فعل کے سچے ہیں کہ جو نیک کام شروع کرتے ہیں اسے بغیر پورا کئے نہیں چھوڑتے' نیت کے بھی سچے ہیں کہ ہر نیکی اللہ کے لئے کرتے ہیں اور جس کام کا ارادہ کرلیتے ہیں اسے کرکے چھوڑتے ہیں۔ چھٹے یہ کہ وہ اللہ کے مطیع اور فرمانبردار بندے ہیں کہ ہمیشہ ہر قسم کی عبادت میں سرگرم رہتے ہیں۔ نمازیں پڑھیں تو ہمیشہ روزہ رکھیں تو پابندی سے' زکوٰۃ دیں تو پورے حساب سے۔ ساتویں یہ کہ وہ بخیل وکنجوس نہیں۔ جائز کاموں میں اور نیکیوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ بندوں کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ آٹھویں یہ کہ جب سب لوگ سوتے ہیں اور نیند کا اچھا وقت ہوتا ہے تب یہ لوگ اپنے نرم وگرم بستر چھوڑ کر مصلے پر آجاتے ہیں۔ اور رب تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ استغفار کرتے ہیں۔ یہ ہی سچے متقی ہیں اور جنت کے حقدار۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** نیک اعمال کی برکت سے دعا کرنی چاہیے۔ دیکھو یہاں متقیوں کی یہ پہچان بتائی گئی کہ وہ دعا کے وقت اپنے ایمان کا ذکر کرتے ہیں اور اسی کے طفیل دعا مانگتے ہیں۔ **دوسرا فائدہ:**

حرام نہیں ہوتی، مگر صحت کی حفاظت کے لئے اس سے بچو، تمام رات بیدار رہ کر اللہ اللہ کرنا حرام نہیں، بظاہر اچھا ہے، مگر عوام اس سے بچیں، کہ اس کے ذریعہ آئندہ فرض نمازیں چھوٹ جانے کا خطرہ ہے، اللہ تعالیٰ شیطان کے اغواء سے بچائے،

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا
اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو کافر ہوئے
اے ایمان والو ان کافروں کی طرح نہ ہونا
وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ
اور اپنے بھائیوں کے متعلق بولے جبکہ وہ چلے زمین میں
جنہوں نے اپنے بھائیوں کی نسبت کہا جب وہ سفر کو یا جہاد کو گئے
اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا
یا ہوئے غازی کہ اگر یہ لوگ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ
کہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے یا نہ مارے جاتے
قُتِلُوْاۚ لِیَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْؕ
قتل کئے جاتے تاکہ کر دے اللہ اس کو حسرت ان کے دلوں میں
اس لئے کہ اللہ ان کے دلوں میں اس کا افسوس رکھے
وَ اللّٰهُ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۱۵۶﴾
اور اللہ ہی زندہ رکھتا اور موت دیتا ہے اور اللہ دیکھنے والا ہے اسے جو تم کرتے ہو
اور اللہ جلاتا اور مارتا ہے اور اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ نے غازیان احد کو ان کی گذشتہ غلطی پر متنبہ فرمایا یعنی درہ چھوڑ دینا، اب انہیں دوسری قسم کی غلطی سے بچنے کی ہدایت فرما رہا ہے، یعنی توکل چھوڑ دینا، کہ اس درہ کے چھوڑ دینے سے تو کفار مکہ لوٹ پڑے تھے مگر اس درہ کو چھوڑ دینے سے شیطان تم پر پلٹ پڑے گا اور مسلط ہو جائے گا۔

دوسرا تعلق: پچھلی آیت میں اس قابل معافی قصور کا ذکر تھا جس کی رب تعالیٰ نے معافی دے دی، یعنی میدان سے قدم اکھڑ جانا، اب اس ناقابل معافی جرم کا ذکر ہو رہا ہے جو انسان کو تقدیر کا انکاری بنا دیتا ہے، اور اپنی تدبیر پر اعتماد دلاتا ہے

زیادہ قریب تھی۔ اس کی بخشش کر دی۔

(۳) مسلم شریف اور مشکوٰۃ میں ہے کہ رب تعالیٰ بندہ کی توبہ سے بہت خوش ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص جنگل میں ہو اور اس کے توشہ کا اونٹ گم جائے اور یہ زندگی سے مایوس ہو کر مرنے کے لئے لیٹ جائے۔ پھر اچانک اس کا اونٹ معہ توشہ کے آ جائے۔ جتنی خوشی اس شخص کو ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ خوشی رب تعالیٰ کو بندہ کی توبہ سے ہوتی ہے۔

(۴) مسلم بخاری اور مشکوٰۃ میں ہے کہ بندہ گناہ کر کے رو کر عرض کرتا ہے کہ رَبِّ اَذْنَبْتُ فَاغْفِرْهُ. تو رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو سزا و جزا پر قادر ہے۔ جاؤ میں نے بخش دیا۔ بندہ پھر گناہ کر بیٹھتا ہے۔ اور پھر توبہ کرتا ہے پھر اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔

(۵) ترمذی شریف میں ہے کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے بندے اگر تیرے گناہ بادل تک پہنچ جائیں پھر تو استغفار کرے تو میں بخش دوں گا۔ اور کوئی پرواہ نہ کروں گا۔ اور اے بندے اگر تو میرے پاس زمین بھر کے گناہ لائے گا۔ بشرطیکہ شرک و کفر سے بچا رہے تو میں تجھے زمین بھر کر مغفرت دوں گا۔

(۶) ابوداؤد ابن ماجہ میں ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو انسان ہمیشہ استغفار پڑھتا رہے تو رب تعالیٰ اسے ہر تنگی سے نجات اور ہر غم سے خلاصی دے گا اور اس جگہ سے رزق دے گا جہاں سے اس کا گمان بھی نہ ہو گا۔

(۷) احمد ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے کہ گناہ مومن کے دل میں کالا داغ پیدا کرتا ہے اور اس کے لئے توبہ و استغفار ایسی ہے جیسے زنگ آلود لوہے کے لئے صیقل۔

(۸) نسائی اور ابن ماجہ میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا مبارک ہے وہ شخص جس کے نامۂ اعمال میں زیادہ توبہ و استغفار پائی جائے۔

(۹) بخاری شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا' مومن اپنے گناہوں کو مثل پہاڑ کے سمجھتا ہے کہ گویا وہ پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہے اور وہ اس پر گرا جا رہا ہے اور فاسق اپنے گناہوں کو مکھی کی طرح سمجھتا ہے کہ بالکل پرواہ نہیں کرتا۔

(۱۰) بیہقی نے شعب الایمان میں اور ابن ماجہ نے روایت کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے گناہ کیے ہی نہ تھے۔

(۱۱) تمام درود و وظائف کی تاثیریں اور فوائد احادیث یا مشائخ کے اقوال سے ثابت ہیں۔ صرف استغفار ہی وہ عمل و وظیفہ ہے جس کے فوائد قرآن کریم نے بیان فرمائے کہ نوح علیہ السلام کا وہ فرمان نقل فرمایا جو انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا اَسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا الخ (نوح ۱۱) غرضکہ استغفار قرآنی عمل اور قرآنی وظیفہ ہے۔

(۱۲) انسان اس وقت کسی سے معافی مانگتا ہے جب اپنی بے کسی' بے بسی' دوسرے کی قوت و قدرت کا معتقد ہو۔ اس طرح بندہ جب ہی رب تعالیٰ سے معافی مانگے گا۔ جب اپنے کو بے بس گنہگار جانے۔ رب تعالیٰ کو قوت و قدرت والا مانے' یہ عقیدہ ہی عبدیت کی دلیل ہے اور کریم معافی مانگنے والے کو نہیں پکڑتے گرے کو کوئی نہیں گراتا۔ بلکہ گرے کو اٹھاتے ہیں۔ رب تعالیٰ

بھی معافی مانگنے والوں کو پکڑتا نہیں بلکہ معافی دیتا ہے۔ وہاں بہانے نہ بناؤ، عجز و انکسار لے کر حاضر ہو۔ شعر ؎

عجز کار انبیاء و اولیاء است — عاجزی محبوب درگاہ خدا است

توبہ واستغفار کے مسائل

توبہ واستغفار کی حقیقت یہ ہے کہ گنہگار گذشتہ گناہ پر دل میں شرمندہ ہو اور آئندہ بچنے کا عہد کرے۔ شرح سنہ اور مشکوٰۃ باب الاستغفار میں ہے کہ اَلنَّدَمُ تَوْبَةٌ شرمندہ ہونا بھی توبہ ہے۔ اس کی شرح مرقاۃ میں فرمایا کہ توبہ کے تین رکن ہیں۔ گذشتہ پر شرمندگی۔ آئندہ بچنے سے عہد اور گذشتہ کوتاہیوں کا بقدر طاقت بدلا کر دینا۔

مسئلہ: توبہ بقدر گناہ چاہیے یعنی چھپے گناہ کی چھپی توبہ۔ اور ظاہر گناہ کی ظاہر توبہ۔ **مسئلہ:** توبہ کی تین صورتیں ہیں۔ حقوق شریعت سے توبہ، حقوق العباد سے توبہ اور حقوق اللہ سے توبہ۔ حقوق شریعت کی توبہ میں ضروری ہے کہ وہ حقوق ادا کر دیئے جائیں۔ نمازیں رہ گئی ہیں تو قضا کرے۔ روزے رہ گئے ہوں تو پورے کرے۔ داڑھی منڈاتا ہے تو توبہ کرے اور آئندہ نہ منڈانے کا عہد کرے۔ ایسے ہی بندوں کے حقوق ادا کر کے پھر توبہ کرے۔ غیبت کی ہے تو معافی چاہے۔ مقروض ہے تو قرض ادا کرے۔

نوٹ: توبہ کے باقی مسائل ان شاء اللہ اس آیت کی تفسیر میں آئیں گے۔ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ الخ (النساء:۱۷)

مسئلہ: توبہ واستغفار کا بہتر وقت صبح صادق ہے۔ ابن جریر نے عبداللہ ابن عمر سے روایت کی کہ وہ رات کو نماز پڑھتے رہتے تھے۔ پھر اپنے غلام سے پوچھتے کہ اے نافع کیا صبح صادق ہو گئی ہے وہ عرض کرتے نہیں۔ تو پھر نماز میں مشغول ہو جاتے جب وہ عرض کرتے کہ ہاں صبح ہو گئی ہے تو بیٹھ کر استغفار پڑھتے (روح المعانی وکبیر) **مسئلہ:** جو کوئی سنت فجر اپنے گھر پڑھے اور اس کے بعد ستر بار یہ پڑھ لیا کرے۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّىْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ۔ اول وآخر درود شریف تین تین بار وہ ان شاء اللہ متقین اور استغفار کرنے والوں کے زمرہ میں ہوگا۔ (ابن مردویہ وروح المعانی) اور تجربہ یہ ہے کہ اس سے گھر میں اتفاق اور مصیبتوں سے نجات اور رزق میں برکت رہتی ہے۔ **مسئلہ:** توبہ واستغفار کے لئے صبح صادق کا وقت نہایت مناسب ہے۔

(۱) ابن جریر اور احمد نے نقل کیا کہ داؤد علیہ السلام نے حضرت جبرائیل سے پوچھا کہ اے جبرائیل رات کا کون سا حصہ افضل ہے۔ انہوں نے عرض کیا۔ اے نبی اللہ! یہ تو مجھے خبر نہیں۔ ہاں میں دیکھتا ہوں کہ صبح کے وقت عرش الٰہی ہلتا ہے (روح المعانی)

(۲) نیز حدیث پاک میں ہے کہ رب تعالیٰ رات کے آخری حصہ میں پہلے آسمان کی طرف توجہ کرم کر کے فرماتا ہے کہ کون دعا مانگتا ہے کہ قبول کروں، کون مجھ سے مانگتا ہے کہ میں اسے دوں۔ مجھ سے کون مغفرت مانگتا ہے کہ اسے بخش دوں۔ صبح تک یہ ہی ندائیں رہتی ہیں۔ (روح المعانی) حضرت لقمان نے اپنے فرزند سے فرمایا کہ اے بیٹے مرغ سے بدتر نہ ہو جانا کہ وہ صبح ہی ذکر الٰہی کرے اور تم اس وقت سوتے رہو (خزائن العرفان) بلکہ صبح کو سونے والا کتے سے بدتر ہے کہ کتا تمام رات مالک کا پہرا دے کر پھر صبح کو سوتا ہے اور یہ شخص رات گناہوں میں گزار کر عبادت کے وقت غافل ہو جاتا ہے۔

ساتھ ہیں، دوسرے یہ کہ وہ بے صبرے ناشکرے ہیں، خود بھی بزدل ہیں دوسروں کو بھی بزدل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ ان کا حال یہ ہے کہ جب ان کے ہم مذہب منافق یا ان کے رشتہ دار مسلمان کسی لمبے سفر میں جائیں کاروباری سلسلہ میں یا کسی اور وجہ سے، اور وہاں اتفاقاً فوت ہو جائیں یا جہاد میں جائیں اور وہاں شہید ہو جائیں، تو ان مرحومین کے عزیزوں و قرابت داروں کے پاس بڑے خیرخواہ اور غمگسار بن کر پہنچتے ہیں، اور بظاہر خیرخواہی کرتے ہوئے، مگر درحقیقت انہیں بزدل بنانے کے لئے کف افسوس ملتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم تو پہلے ہی انہیں منع کرتے تھے کہ نہ جاؤ، اگر وہ ہماری بات مان لیتے اور مدینہ منورہ ہی میں ہمارے پاس رہتے، تو نہ سفر میں مرتے اور نہ جہاد میں مارے جاتے، خیال رکھو کہ اس گفتگو سے کوئی فائدہ نہیں، یہ محض ایک حسرت ہے، جو ان کے دل میں رہ جاتی ہے، رہا مرنا جینا، تو خیال رکھو کہ یہ اللہ کے قبضہ میں ہے، جسے چاہتا ہے زندہ رکھتا ہے، اور جسے چاہتا ہے موت دیتا ہے، لہٰذا موت کا خوف تمہارے لئے دنیوی و دینی سفروں اور جہادوں سے رکاوٹ نہ بنے، کہ بات بات میں ڈرنے والے کمزوردل ہو کر نکمے ہو جاتے ہیں، اور نکما آدمی کبھی عزت نہیں پا سکتا، خیال رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر کھلے چھپے کام کو دیکھ رہا ہے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر تم نہ بھی شہید ہوئے تب بھی ضرور مرجاؤ گے قسم رب تعالیٰ کی تلوار کی ہزار ضربیں، بستر پر ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے آسان ہیں، جو موت کے خوف سے چھپ کر گھروں میں بیٹھ رہتے ہیں، وہ جہالت اور ذلت کی موت میں رہتے ہیں، اور عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** مسلمانوں کو لازم ہے کہ کافروں کی سی باتیں بھی منہ سے نہ نکالا کریں، صورت، سیرت، اعمال، افعال، اقوال میں ان سے ممتاز رہیں، جیسا کہ لَا تَكُونُوا الخ سے معلوم ہوا، جو لوگ مسلمان ہو کر وضع قطع اور لباس کافروں کے سے رکھتے ہیں، وہ اس سے عبرت پکڑیں، **دوسرا فائدہ:** کھلے کفار اور منافقین در پردہ ایک ہی ہیں، جیسا کہ كَفَرُوا کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ نے منافقوں کو کافر فرمایا، **تیسرا فائدہ:** زیادہ اگر مگر کرنا کفار کی علامت ہے، مومن تدبیر کر کے تقدیر پر صابر ہوتا ہے، جیسا کہ لَوْ كَانُوا الخ سے معلوم ہوا، **چوتھا فائدہ:** تقدیر پر صابر نہ ہونے سے غم و تکلیف زیادہ ہوتے ہیں، صبر و شکر دلی راحت کا ذریعہ ہیں، جیسا کہ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** دنیا میں زیادہ مشغولیت زندگی کی زیادہ چاہت موت کو سخت بنا دیتی ہے، اور آخرت سے تعلق موت کو آسان کر دیتا ہے، جیسا کہ مَا مَاتُوا الخ سے اشارۃً معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** موت زندگی حقیقتاً رب تعالیٰ ہی دیتا ہے، سانپ کو مارنے والا یا بعض نبیوں اور ولیوں کو زندہ کرنے والا مجازاً کہا جاتا ہے جیسا کہ يُحْيِي وَيُمِيتُ سے معلوم ہوا، **ساتواں فائدہ:** زندگی کی چاہت اور موت سے کراہت انسان میں بزدلی پیدا کرتی ہے، جیسا کہ لَوْ كَانُوا الخ سے معلوم ہوا، آرام طلب قوم کو دنیا میں رہنے کا حق نہیں، جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا بھی نہیں آتا، **آٹھواں فائدہ:** کوئی تدبیر موت سے نہیں بچا سکتی، موت آنی ہے اور ضرور آنی ہے، جیسا کہ اس آیت کے پورے مضمون سے معلوم ہوا، **نواں فائدہ:** ایمان صرف زبانی اقرار کا نام نہیں، جب تک عقائد درست نہ ہوں، دیکھو رب

تعالیٰ نے ان منافقوں کو کافر فرمایا، جو زبان سے ایمانیات کے اقراری تھے (کبیر)

اعتراضات

پہلا اعتراض: تمہاری ایک تفسیر سے معلوم ہوا کہ یہاں كَفَرُوْا سے مراد منافقین ہیں حالانکہ وہ تو مسلمانوں میں شمار تھے، اور ان پر زندگی و موت میں اسلامی احکام جاری تھے، تو یہ تفسیر کیسے درست ہوئی؟ **جواب:** شریعت کا حکم ظاہر پر ہے مگر بارگاہِ الٰہی میں حقیقت پر حکم ہوتا ہے، یہاں كَفَرُوْا سے شرعی کفر مراد نہیں، بلکہ حقیقی کفر مراد ہے، **دوسرا اعتراض:** لِاِخْوَانِهِمْ کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا کہ غازی مسلمان منافقین کے بھائی تھے، کیا کفار مسلمانوں کے بھائی ہیں، اور کیا انہیں بھائی کہنا درست ہے؟ **جواب:** بھائی بہت سی قسم کے ہیں، نسبی، قومی، دینی، عملی، یہاں نسبی بھائی مراد ہیں، واقعی بعض منافقین مسلمانوں کے رشتوں میں بھائی تھے، مگر محبت کے طور پر کفار و منافقین کو بھائی کہنا درست نہیں، بھائی ہونا اور ہے، بھائی کہنا کچھ اور، دیکھو خاوند بیوی کا دینی، قومی، وطنی بلکہ بعض صورتوں میں رشتہ کا بھی بھائی ہوتا ہے چچا زاد وغیرہ، مگر اسے بھائی کہنا بیوی کے لئے درست نہیں، **تیسرا اعتراض:** اس آیت میں قَالُوْا ماضی ہے، اور اِذَا ضَرَبُوْا بمعنی مستقبل تو معنی کیسے درست ہوئے؟ اگر بجائے اِذَا ضَرَبُوْا کے حِيْنَ ضَرَبُوْا ہوتا تو بہتر تھا، **جواب:** تفسیر کبیر و روح المعانی نے اس کے کئی جواب دیئے ہیں، ایک یہ کہ اِذَا بمعنی اِذْ ہے، لہٰذا ضَرَبُوْا ماضی ہی رہا، دوسرے یہ کہ قَالُوْا بمعنی يَقُوْلُوْنَ ہے عربی میں کبھی یقینی مستقبل کو ماضی سے تعبیر کر دیتے ہیں، آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب مسلمان سفر یا جہاد میں جاتے ہیں، اور وہاں فوت یا شہید ہو جاتے ہیں، تو منافقین یہ کہا کرتے ہیں، **چوتھا اعتراض:** سفر کے بعد غزوہ کا ذکر کیوں کیا، غزوہ میں سفر بھی آ گیا تھا کہ جہاد سفر ہی میں ہوتے ہیں؟ **جواب:** یہ غلط ہے، بہت دفعہ جہاد گھر میں یا گھر سے قریب ہی ہوتے ہیں، دیکھو غزوۂ خندق خاص مدینہ شریف ہی میں ہوا، اور غزوۂ احد مدینہ پاک سے بہت قریب تین میل کے فاصلہ پر ہوا، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سفر سے مراد دنیاوی کاروباری سفر ہیں، اور غزوہ سے مراد جہاد کے سفر، اور ہو سکتا ہے کہ ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ سے مراد عام سفر ہوں، اور غُزًّى سے مراد خاص جہاد کے سفر چونکہ سفر جہاد تمام سفروں سے اعلیٰ ہے، اس لئے خصوصیت سے اس کا ذکر علیحدہ کیا گیا (کبیر و معانی) بہر حال آیت کا جواب بالکل واضح ہے،

تفسیر صوفیانہ

دنیا میں انسان دو قسم کے ہیں، واقفین اور سائرین، واقفین کو اغیار کہتے ہیں، اور سائرین کو اخیار، واقفین وہ ہیں جو دنیا پر قناعت کر گئے، اور سائرین وہ ہیں، جنہوں نے دنیا کو ایک منزل جانا، اور اپنے وطن کی طرف چلنے کی کوشش کی، ان سائرین میں بعضے طائرین ہیں، اور بعضے راجلین یعنی بعض پیدل جا رہے ہیں آہستہ یا تیز، اور بعض اڑ کر، غرضکہ یہ راستہ کوئی پیروں سے طے کر رہا ہے کوئی پروں سے، واقفین کم ہمت ہیں، وہ جب ان سائرین کے اس سفر کو دیکھتے ہیں، اور جب ان کے اس جہاد پر نظر کرتے ہیں، جو انہیں اس راستہ میں شیطان نفس اور دنیاوی الجھنوں سے کرنے پڑتے ہیں، تو کہتے ہیں، کہ یہ لوگ بلاوجہ یہ ریاضتیں مشقتیں کر رہے ہیں، کہ اگر ہماری طرح یہ بھی دنیا پر قناعت کر لیں اور آگے بڑھنے کی کوشش نہ کریں، تو

مزے سے کھائیں پئیں اور چین کریں، ان کم ہمتوں کی یہ باتیں کل قیامت میں حسرتیں ہوں گی، کہ یہ لوگ سائرین کے درجات دیکھ کر کفِ افسوس ملیں گے کہ ہم نے بڑی غلطی کی، اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے فَنَا فِی اللّٰہِ کے ذریعہ بَقَا بِاللّٰہِ کی دائمی زندگی بخشتا ہے، اور جسے چاہتا ہے جہالت اور دوری بارگاہ کی موت دیتا ہے، اللہ تعالیٰ تمہاری ہمتوں کو بھی دیکھ رہا ہے اور کم ہمتوں کو بھی (روح المعانی) امام غزالی نے احیاء العلوم میں فرمایا، کہ ابلیس نے زمانہ صحابہ میں اپنے شیطانی لشکر پھیلائے، وہ سب نہایت مایوس ہو کر لوٹے، ابلیس بولا، کیا حال ہے، کہنے لگے، کچھ نہ پوچھ، ان صحابہ نے ہمیں تھکا دیا، اور اپنی سیر سے باز نہ آئے، وہ بولا کہ تمہارا ان پر داؤں نہ چلے گا، یہ لوگ اپنے نبی کے صحبت یافتہ ہیں، انہوں نے وحی اترتے دیکھی جب زمانہ تابعین آیا، تو ابلیس نے پھر اپنے لشکر چھوڑے، وہ بولے کہ ان سے ہم گناہ تو کرا لیتے ہیں، مگر کریں کیا، کہ شام کو یہ لوگ توبہ کر کے ہمارا کرا دھرا اکارت کر دیتے ہیں، کیونکہ ان کی توبہ سے گناہ نیکیاں بن جاتے ہیں، وہ بولا، یہ لوگ اپنے نبی کی سنت کے قلعہ میں ہیں، تم ان پر بھی کامیاب نہ ہو سکو گے، البتہ ان کے بعد ایسے مسلمان ہوں گے، جو گناہ کر کے توبہ نہ کریں گے، اپنی اکڑ کی وجہ سے تمہاری پکڑ میں آ جائیں گے، تم انہیں جہاں چاہنا لئے پھرنا، شعر

نہ ابلیس درحق ما طعنہ زد کز ایناں نیاید بجز کار بد
چو ملعون پسند آمدش قہر ما خدائش برانداخت از بہر ما
کجا سر بر آریم ازیں عار و ننگ کہ با او بصلحیم و باحق بجنگ

(تفسیر روح البیان)

افسوس کہ رب تعالیٰ نے ہماری خاطر ابلیس کو جنت سے نکالا، مگر ہم اسی ابلیس کو اپنے خانہ دل میں آباد کرتے ہیں،

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ
اور البتہ اگر تم قتل کیے جاؤ اللہ کے راستہ میں یا مر جاؤ البتہ بخشش اللہ کی
اور بے شک اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی بخشش
مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾
اور مہربانی اچھی ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں
اور رحمت ان کے سارے دھن دولت سے بہتر ہے
وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾
اور البتہ اگر تم مر جاؤ یا قتل کیے جاؤ یقیناً اللہ کی طرف ہی جمع کیے جاؤ گے
اور اگر تم مرو یا مارے جاؤ تو اللہ ہی کی طرف اٹھنا ہے

اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں عزت والا حکمت والا بیشک اللہ کے یہاں اسلام ہی دین ہے
وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ
اور نہیں اختلاف کیا ان لوگوں نے جو دیئے گئے کتاب مگر پیچھے سے اس کے کہ آیا ان کے پاس علم
اور پھوٹ میں نہ پڑے کتابی مگر بعد اس کے کہ انہیں علم آچکا
بَغْيًا بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ⑲
حسد سے درمیان اپنے اور جو کوئی انکار کرے آیتوں کا اللہ کی پس تحقیق اللہ جلد حساب لینے والا ہے
اپنے دلوں کی جلن سے اور جو اللہ کی آیتوں کا منکر ہے تو بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے

تعلق

اس آیت کا تعلق پچھلی آیتوں سے چند طرح ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں متقین کے اوصاف اور تقویٰ کے ارکان بیان کیے گئے۔ اب تقویٰ کی وجہ بیان ہو رہی ہے کہ پرہیز گار اس لئے رب سے ڈرتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ایمان کا ذکر تھا۔ اب دلائل ایمان بیان ہو رہے ہیں کہ رب تعالیٰ کی وحدانیت پر خود پروردگار اور اس کی مخلوق گواہ ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ بغیر تقویٰ جنت نہیں مل سکتی۔ اب اس کی دلیل بیان ہو رہی ہے کہ رب تعالیٰ کے ہاں انصاف ہے ظلم نہیں اور اس کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ جس کے ہاں اس کے فیصلہ کی اپیل کی جا سکے۔ لہٰذا تقویٰ ہی جنت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں متقیوں کی صفات میں ایمان کا ذکر ہوا تھا۔ اب ایمان کے رکن اعلیٰ یعنی رب کی ذات و صفات کا ذکر ہے گویا ایمان کا ایمانی ذکر پہلے ہوا تھا۔ اب اس کی قدرے تفصیل ہو رہی ہے۔

شان نزول

شام کے علمائے یہود میں سے دو عالم حضور سید دو عالم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ جب انہوں نے مدینہ منورہ کو دیکھا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ نبی آخر الزمان (ﷺ) کے شہر کی یہ ہی صفت ہے جو اس شہر میں پائی جاتی ہے۔ جب آستانہ اقدس پر حاضر ہوئے تو انہوں نے حضور علیہ السلام کی شکل مبارک اور اخلاق کریمانہ کو توریت کے مطابق دیکھ کر حضور علیہ السلام کو پہچان لیا۔ اور عرض کیا کہ آپ محمد ہیں (ﷺ) حضور علیہ السلام نے فرمایا ہاں۔ پھر فرمایا کیا آپ احمد ہیں۔ فرمایا ہاں (ﷺ) عرض کرنے لگے۔ ہم ایک سوال پیش کرتے ہیں۔ اگر آپ نے اس کا ٹھیک جواب دے دیا۔ تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ فرمایئے کہ کتاب اللہ میں سب سے بڑی گواہی کونسی ہے؟ اس پر آیت کریمہ شَهِدَ اللّٰهُ الخ نازل ہوئی۔ جسے سن کر وہ دونوں مسلمان ہو گئے۔ (خزائن العرفان روح البیان و روح المعانی وغیرہ)۔ غرضکہ یہ لوگ کہیں سے آئے تھے۔ اور کہیں جا رہے تھے۔ راستہ میں ایمان و عرفان بھی مل گیا۔ اور صحابیت بھی میسر ہو گئی۔ شعر

خدا کے در [illegible] کہ آ کر [illegible] کو جائیں پیغمبری مل جائے

آرائش و آسائش ہے نہ کہ اخروی اعمال، کیونکہ مومن کے بعض اعمال، ایمان معرفت الٰہی، صحبتِ مصطفوی شہادت سے بھی افضل ہے، وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ اس جملہ میں بھی وہی تحقیق ہے جو ابھی لَئِنْ قُتِلْتُمْ کی تفسیر میں کی گئی، چونکہ قتل فی سبیل اللہ موت فی سبیل اللہ سے افضل ہے، اس لئے پہلی آیت میں قتل کا ذکر موت سے پہلے ہوا، اور چونکہ موت قتل سے زیادہ ہوتی ہے اور عام قتل موت سے کچھ افضل نہیں، اس لئے یہاں موت کا ذکر پہلے ہوا، اور قتل کا بعد میں لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ یہ جملہ بھی لَئِنْ کا جواب قسم ہے، تُحْشَرُوْنَ حشر سے بنا بمعنی جمع ہونا یا جمع کرنا، لَاِلَى اللّٰهِ کے مقدم کرنے سے حصر کا فائدہ ہوا یعنی تم دنیا سے کیسے ہی جاؤ، معمولی موت سے یا قتل کے ذریعہ تم سب کو جمع رب تعالیٰ کی بارگاہ ہی میں ہونا ہے، اس دن رب تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اس کی راہ میں دنیا سے جاؤ تا کہ وہاں درجات پاؤ،

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! تم منافقین و کفار کے بزدلانہ اور ہمت ہاری باتوں پر دھیان نہ دو، بجائے دنیا جمع کرنے کے رب تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کرو، قسم ہے اسی کے وجہ کریم کی، کہ اگر تم جہاد میں مارے یا اللہ کی راہ میں رب تعالیٰ کا کام کرتے ہوئے اپنے بستر پر ہی مر گئے، تو تم بخشے بھی جاؤ گے اور تم پر رحم بھی کیا جائے گا، اور یقین رکھو کہ رب تعالیٰ کی تھوڑی بخشش اور تھوڑی مہربانی بھی ان سارے کفار کے سارے جمع کردہ مال، دھن و دولت، ملک وغیرہ سے بہتر ہے، لہٰذا وہ اگر بہت جئیں اور بہت کچھ جمع کرلیں، اور تم تھوڑا جی کر اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو جاؤ، یا اللہ تعالیٰ کی راہ میں مارے جاؤ، اور دھن و دولت جمع نہ کرو، تو نفع میں تم ہی ہو نہ کہ وہ، چند وجوہ سے، ۱۔ ایک یہ کہ مال جمع کرنے میں مشقت یقیناً ہے، مگر اس سے نفع حاصل کرنا غیر یقینی ممکن ہے، کہ کل مال رہ جائے تم نہ رہو، لیکن رب تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت یقیناً تمہیں نفع دے گی، رب تعالیٰ فرماتا ہے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (زلزال: ۷) عمرو مال بے وفا ہیں، رحمتِ ذوالجلال باوفا، تم بے وفا کی محبت میں وفادار کو کیوں چھوڑتے ہو، ۲۔ دوسرے یہ کہ ممکن ہے کہ تم رہو مگر مال نہ رہے، بہت دیکھا گیا ہے کہ ایک انسان آج امیر ہے کل فقیر اور پرسوں اسیر، رب تعالیٰ کی رحمت کا یہ حال نہیں، وہ تمہارا ساتھ کبھی نہ چھوڑے گی، خود فرماتا ہے مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (نحل: ۹۶) ۳۔ تیسرے یہ ہو سکتا ہے کہ تم بھی رہو اور مال بھی رہے، مگر نفع حاصل نہ کر سکو، دیکھا گیا ہے کہ لکھ پتی لوگ ایسی بیماری میں پھنس جاتے ہیں کہ ایک لقمہ نہیں کھا سکتے، آخرت کی رحمتیں ایسی نہیں، ۴۔ چوتھے یہ کہ ہو سکتا ہے تم ان سے نفع بھی حاصل کرلو، مگر دنیا کی لذتیں تکالیف سے مخلوط ہیں، یہاں کے پھول کانٹوں سے گھرے ہوئے ہیں، آخرت کے نفعے خالص ہیں، ۵۔ پانچویں یہ کہ مان لو کہ کچھ دیر کے لئے دنیا میں نفع خالص بھی مل جائے، مگر وہ باقی نہیں فانی ہے، آخرت کی نعمتیں باقی، ۶۔ چھٹے یہ کہ دنیا کے نفعے حسی اور خسیس ہیں، آخرت کے نفعے عقلی اور شریف ہیں، یہاں کے پیٹ بھرنے کی لذت دیدار الٰہی اور قرب مصطفوی ﷺ کی لذتوں سے کچھ نسبت ہی نہیں رکھتی، اتنے فرق ہوتے ہوئے جو کوئی دنیا کو آخرت پر ترجیح دے بڑا بے وقوف ہے، قسم ہے اسی کی ذاتِ کریم کی، کہ تم سب کو جانا رب تعالیٰ کی بارگاہ ہی میں ہے، خواہ شہادت کے راستہ سے جاؤ یا بیداری کی موت کے ذریعہ پہنچو یا غفلت کی موت مرو، یا مجرمانہ زندگی بسر کر کے پکڑے ہوئے وہاں جاؤ، لہٰذا

بہتر ہے، کہ وہاں معزز مہمان کی شکل میں جاؤ، قیدی کی شکل میں نہ جاؤ،

جانا ہے انہیں کے دسوا میں چاہے اُس جائی چاہے بس جائی

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** زندگی بھی تین قسم کی ہے اور موت بھی تین طرح کی رحمانی، نفسانی، شیطانی رحمانی زندگی اور موت تو وہ ہے جس سے رحمان راضی ہو جائے، ہم نے عرض کیا ہے، شعر

وہی موت ہے وہی زندگی جو خدا نصیب کرے مجھے کہ مرے تو ان ہی کے نام پر جو جئے تو ان پہ نثار ہو

نفسانی زندگی وہ جو غفلت میں گذرے، اس کی حقیقت یہ ہے، شعر

عمر گراں مایہ درایں صرف شد تاچہ خورم صیف چہ پوشم شتا

شیطانی زندگی اور موت وہ ہے، کہ زندگی گزرے گناہوں میں، اور موت آئے کفر پر، پہلی زندگی و موت مغفرت و رحمت کا ذریعہ ہے، دوسری زندگی و موت حسرت و ندامت کا وسیلہ، اور تیسری زندگی اور موت غضب و لعنت کا سبب، یہ فائدہ فِي سَبِيْلِ اللهِ سے حاصل ہوا، **دوسرا فائدہ:** کفار کے تمام مال و منال سے مسلمان کی غریبی اور فقیری افضل ہے، کہ کفار کے گھر میں مال رہتا ہے، اور مومن کے خانہ دل میں نور ذوالجلال، یہ فائدہ يَجْمَعُوْنَ غائب فرمانے سے حاصل ہوا، **تیسرا فائدہ:** کافر کے سارے نیک اعمال صدقہ و خیرات وغیرہ سے مومن کا شہید ہو کر مرنا یا اللہ کی راہ میں جان دینا افضل ہے، یہ فائدہ قُتِلْتُمْ اور مُتُّمْ کے حاضر فرمانے سے حاصل ہوا، لیکن شہادت یا فی سبیل اللہ موت مومن کے سارے اعمال سے افضل نہیں، دیکھو حضرات صحابہ کرام کا ایک آن جمال مصطفائی دیکھنا ہماری لاکھوں شہادتوں سے افضل ہے، اسی لئے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ عہد پاک مصطفوی میں مومن کی زندگی موت سے افضل تھی، مگر حضور انور ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد اکثر موت زندگی سے افضل ہوتی ہے کہ اب نظارۂ یار موت کے بعد ہے، اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ العزیز نے ایک شعر میں یہ معمہ حل فرما دیا ہے، کہ فرماتے ہیں، شعر

جان تو جاتے ہی جائے گی قیامت یہ ہے کہ یہاں مرنے پہ ٹھہرا ہے نظارہ تیرا

یہ فائدہ بھی يَجْمَعُوْنَ سے ہی حاصل ہوا، **چوتھا فائدہ:** اللہ تعالیٰ کی تھوڑی سی رحمت دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے جیسا کہ رَحْمَةٌ کی تنوین سے معلوم ہوا، لہٰذا مومن فقیر، کافر امیر بلکہ بادشاہ سے بھی افضل ہے، بعض علماء نے فرمایا کہ یہاں رحمت سے مراد جنت ہے، کہ رحمت جنت کا ایک نام ہے، تو خیال کرو کہ نبی کریم ﷺ جن پر خدا کی بڑی ہی رحمت ہے بلکہ حضور انور ﷺ رب تعالیٰ کی رحمتوں کا مرکز ہیں، رب تعالیٰ خود فرماتا ہے وَكَانَ فَضْلُ اللهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (النساء: ۱۱۳) لہٰذا کوئی شخص حضور انور ﷺ کے برابر نہیں ہو سکتا، نہ کسی پر حضور انور ﷺ کی سی رحمت ہوگی اور نہ کوئی آپ کی مثل ہوگا، اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں، جو اپنے کو حضور انور ﷺ کی مثل کہتے ہیں اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ تو کہتے ہیں، يُوْحٰى اِلَيَّ (کہف ۱۱۰) پر نظر نہیں کرتے، حالانکہ وحی الٰہی نے نبی اور غیر نبی میں زمین و آسمان کا فرق کر دیا، **پانچواں فائدہ:**

چونکہ قدرت سے موصوف ہونا اتصاف علم سے مقدم ہے اس لئے پہلے عزیز فرمایا گیا پھر حکیم چونکہ اب تک پرہیز گاروں کی تعریف اور ان کے فضائل ارشاد ہوئے تھے۔ شاید کوئی کہتا کہ جنت کے لئے نیک اعمال کی ضرورت ہے۔ کسی دین میں رہ کر کرلئے جائیں۔ اس وہم کو دفع کرنے کے لئے ارشاد ہوا۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔ بعض قرأتوں میں اَنَّ الف کے فتح سے ہے۔ شَهِدَ کا مفعول یعنی اللہ فرشتوں اور علماء نے توحید کی بھی گواہی دی۔ اور حقانیت اسلام کی بھی۔ مگر عام قرأت میں اِنَّ الف کے کسرہ سے ہے نیا جملہ دین کے متعلق ہم سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں بیان کر چکے۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ اس کے لغوی معنی بدلہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کَمَا تُدِیْنُ تُدَانُ تو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا' پھر اطاعت اور تصدیق عقائد اور شریعت کو دین کہا جانے لگا۔ عِنْدَ اللّٰهِ ایک پوشیدہ لفظ کا ظرف ہے المعتبر یا الصحیح یا المحبوب یا الثابت یا المرضی یعنی ایسا دین جو اللہ کے نزدیک معتبر و پسندیدہ ہو۔ وہ صرف اسلام ہے۔ اسلام کے لغوی معنی تین ہیں:۔ (۱) اطاعت میں داخل ہونا۔ سلم بمعنی اطاعت (۲) سلامتی میں داخل ہونا سلم بمعنی سلامتی (۳) عبادت میں اخلاص کرنا۔ سلم بمعنی خلوص کہا جاتا ہے۔ سلم الشیئی لفلان۔ یہ چیز فلانے کی ہوگئی۔ اصطلاح شریعت میں اسلام بمعنی ایمان ہے اسی لئے یہاں دین کو اسلام کہا گیا۔ ایک جگہ ارشاد ہوا۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ۔ (آل عمران: ۸۵) جہاں کہیں اسلام ایمان کا مقابل استعمال ہوا وہاں لغوی معنی میں ہے۔ یعنی اطاعت جیسے۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا۔ (حجرات: ۱۴) (کبیر) خیال رہے کہ ہر اصولی مذہب کو دین کہا جاسکتا ہے۔ خواہ سچا ہو یا جھوٹا مگر اسلام سچے دین کو کہا جائے گا۔ یہ بھی خیال رہے کہ اصول عقائد کو دین کہا جاتا ہے اور فروعی مسائل کو مذہب۔ لہٰذا ہم میں اور شافعیوں میں دینی اختلاف نہیں۔ مذہبی اختلاف ہے مگر ہم میں اور عیسائی یہودیوں میں دینی اختلاف ہے' اس لئے یہاں دین ارشاد ہوا نہ کہ مذہب۔ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔ یہ وجہ گمراہی کا بیان ہے اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے یا یہودی مراد ہیں یا عیسائی یا یہ دونوں۔ تفسیر کبیر وغیرہ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت ستر آدمیوں کو چن کر انہیں توریت سپرد کی اور ان سے تبلیغ دین کا عہد لیا۔ یوشع علیہ السلام کو ان کا امیر مقرر کیا۔ تین پشت تک یہ سب لوگ ہدایت پر قائم رہے۔ پھر ان کی اولاد نے دنیوی طمع سے دین کو بگاڑ دیا۔ اس طرف اس آیت میں اشارہ ہے یہاں اختلاف سے مراد یا تو ان کے آپس کا دینی اختلاف ہے جو انہوں نے پیدا کر رکھا تھا۔ یا حضور علیہ السلام کی نبوت کی مخالفت۔ وہ کہتے تھے کہ نبوت کے مستحق ہم ہی ہیں نہ کہ قریش اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَ هُمُ الْعِلْمُ۔ یہ پچھلی عبارت کا مستثنیٰ مفرغ ہے اور اس عبارت سے مقصود ان کی سخت برائی بیان کرنا ہے کہ لوگ نادانی میں ایک دوسرے کے مخالف نہ ہوئے بلکہ جان بوجھ کر خیال رہے کہ ما مصدریہ ہے اور علم سے مراد آسمانی کتابوں کا علم ہے یا حضور علیہ السلام کی نبوت کا علم۔ یعنی ان لوگوں نے آسمانی کتابوں کو جان کر آپس میں اختلاف کیا۔ یا حضور علیہ السلام کی اپنی کتابوں کی بیان کی ہوئی علامات سے پہچان کر ان کی مخالفت کی۔ کیوں بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ۔ بَغْيًا اِخْتَلَفَ کا مفعول لہٗ ہے۔ اس سے پہلے لام چھپا ہوا ہے۔ اس کے لغوی معنی تلاش اور طلب ہیں لیکن حسد کو بھی اسی لئے بغی کہہ دیتے ہیں کہ اس میں حاسد محسود کی برائی تلاش کرتا ہے۔ بَيْنَهُمْ ثابتًا کا ظرف ہو کر بَغْيًا کی صفت ہے یعنی ان لوگوں نے جان بوجھ کر صرف حسد سے اختلاف کیا۔ حسد کا اختلاف خلاف ہے جو سخت برا ہے اور تحقیق کا اختلاف صلی اللہ ... اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے جس سے مسئلہ کی

عبادت سے فائدہ اٹھائے، صوفیائے کرام فرماتے ہیں، دنیا زاد المعاد ہے یعنی مسافر کے راستہ کا توشہ، جو مراد کو پہنچ گیا، اسے زاد کی ضرورت نہیں، اس آیت میں یہ ہی ارشاد ہوا ہے کہ مسافر زاد میں پھنس کر مراد کو نہ بھول جانا مبارک ہے وہ بندہ جس کی مراد ذات الٰہی ہو، نہ دورخ سے بچنا، نہ جنت حاصل کرنا، جس سے رب تعالیٰ راضی ہوگیا، اسے یہ سب کچھ خود ہی مل جائے گا،

حکایت

عیسیٰ علیہ السلام عابدین کی ایک جماعت پر گذرے، جن کے بدن مشقتِ عبادت کی وجہ سے کمزور تھے اور چہرے پیلے، فرمایا تم عبادت سے کیا چاہتے ہو، وہ بولے عذاب الٰہی سے پناہ، فرمایا رب تعالیٰ تمہیں اس سے پناہ دے، دوسری جماعت پر گذرے، جن میں یہی آثار عبادت تھے، فرمایا، تم کیا چاہتے ہو؟ وہ بولے، جنت ورحمت، فرمایا خدائے تعالیٰ تمہیں نصیب کرے، تیسری جماعت پر گزرے، جن پر آثار عبادت پہلوں سے زیادہ تھے، پوچھا تم کیوں یہ مشقتیں کررہے ہو؟ وہ بولے، اس لئے کہ ہم ہیں بندے، وہ ہے رب، بندے کا حق ہے مولیٰ کو راضی کرنا، ہم صرف اس کی رضا چاہتے ہیں، نہ جہنم سے پناہ، نہ جنت کا حصول، آپ نے فرمایا کہ مخلص عابد تم ہی ہو، حافظ فرماتے ہیں، شعر

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن　　　　که خواجه خود روش بنده پروری داند

یعنی رب تعالیٰ کی عبادت کرو، مزدوری نہ کرو، رب تعالیٰ سے دعائیں کرو، اسے رائے نہ دو، اس نے تم جیسے کروڑوں پالے ہیں، اسے بندہ پروری خوب آتی ہے، سر کا قبلہ بیت اللہ ہے، دل کا قبلہ رضاء اللہ ہونا چاہیے، جب ان دو قبلوں کا اجتماع ہوگا، تو عبادت مجمع قبلتین ہوگی، اور وہ بندہ مجمع بحرین ہوگا، اللہ تعالیٰ اس قال کو حال بنائے، اور ایسی جامع عبادت نصیب کرے،

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا

پس بوجہ اللہ کی رحمت کے آپ نرم ہوئے ان کے لئے اور اگر ہوتے آپ تیز مزاج

تو کیسی کچھ اللہ کی مہربانی ہے کہ اے محبوب تم ان کے لئے نرم دل ہوئے اور اگر تند مزاج

غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ

سخت دل تو وہ ضرور بکھر جاتے آپ کے آس پاس سے لہٰذا آپ انہیں

سخت دل ہوتے تو وہ ضرور تمہارے گرد سے پریشان ہوجاتے تو

عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا

معافی دے دو اور معافی مانگو ان کے لئے اور مشورہ فرماؤ ان سے کاموں میں پھر جب

تم انہیں معاف فرماؤ اور ان کی شفاعت کرو اور کاموں میں ان سے مشورہ کرو

عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

کوئی متقی نہیں بن سکتا۔ خواہ کتنی ہی نیکی کرے گا اسلام کی حقانیت اور نبی ﷺ کی سچائی کو سارے اہل کتاب بھی جانتے ہیں۔ ان کی یہ مخالفت نادانی سے نہیں بلکہ جان بوجھ کر ہے۔ صرف حسد کی وجہ سے وہ اسلام کی حقانیت کے منکر ہیں۔ انہیں جلن یہ ہے کہ نبوت بنی اسمٰعیل کو کیوں مل گئی۔ اس کے ٹھیکیدار صرف بنی اسرائیل ہیں' یا اہل کتاب کا دین ایک ہی تھا۔ یعنی اسلام انہوں نے حسد کی وجہ سے جان بوجھ کر آپس میں اختلاف کیا اور صدہا فرقے بن گئے۔ ہر شخص خیال رکھے کہ جو کوئی اللہ کی کتابوں۔ اللہ کی آیتوں' اللہ کے دلائل قدرت کا انکار کرے گا وہ جلد سزا پائے گا۔ یہ نہ سمجھے کہ ابھی قیامت بہت دور ہے اور وہاں حساب میں بہت دیر لگے گی۔ اتنا بڑا حساب صدیوں میں ہوگا۔ نہ معلوم میری باری کب آئے۔ ابھی تو آرام کرلیں پھر دیکھا جائے گا۔ اللہ عنقریب اور جھٹ پٹ حساب لینے والا ہے۔ خیال رہے کہ جیسے توحید الٰہی عالم کے ہر ذرہ ذرہ سے ظاہر ہے۔ ایسے ہی حضور ﷺ کی نبوت ذرہ ذرہ سے عیاں ہے اگر انسان میں کچھ بھی عقل و ہوش ہے تو وہ ہر چیز سے حضور کی نبوت ثابت کرسکتا ہے' اتنے دشمنوں میں گھر کر حضور انور ﷺ کا سلامت رہ جانا ہی آپ کی صداقت کی دلیل ہے۔ جس کا دشمن سارا ملک ہو۔ بادشاہت میں اسے قتل کر دینا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ نیز حضور کی محبوبیت آپ کا عام چرچہ حضور کی حقانیت کی دلیل ہے۔ نیز قرآن کا بقا حضور ﷺ کی حقانیت کی دلیل ہے کہ توریت و انجیل عبرانی زبان میں آئیں۔ ہندو کہتے ہیں کہ وید کتاب الٰہی ہے جو سنسکرت میں آیا۔ پارسیوں کے ہاں یہ کتاب الٰہی ہے لیکن رب نے ان تینوں زبانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ زندان کے بولنے والا دنیا میں کوئی نہیں مگر قرآن کی زبان عربی تمام جہان میں بلکہ خود مصر میں جہاں عبرانی زبان بولی جاتی تھی۔ باقی رکھی گئی یہ وہ زبانیں ہیں جن سے ہر ہوش والا حضور کی حقانیت ماننے پر مجبور ہے۔ غرضیکہ رب کی توحید حضور کی نبوت ایسے مضامین ہیں جو کسی کتاب سے نہیں سیکھے جاتے۔ عالم کی ہر چیز ان کی کتاب ہے۔

فضیلت: شَهِدَ اللّٰهُ سے الحکیم تک آیت کے بڑے فضائل ہیں۔ چنانچہ دیلمی نے ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ جب سورۂ فاتحہ اور آیت الکرسی اور یہ آیت شَهِدَ اللّٰهُ الخ اور آیت قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ...... بِغَيْرِ حِسَابٍ (آل عمران: ۲۶-۲۷) تک نازل ہوئیں۔ تو یہ عرش الٰہی سے لپٹ گئیں۔ اور عرض کیا کہ اے مولا تو ہمیں ایسی قوم پر اتار رہا ہے جو تیری نافرمانی کرے گی۔ رب تعالیٰ نے فرمایا مجھے اپنی عزت کی قسم اپنے جلال کی قسم اپنے درجہ کی قسم جو بندہ ہر فرضی نماز کے بعد تمہیں پڑھ لیا کرے گا۔ میں اس کے سارے گناہ بخش دوں گا۔ اور اسے جنت الفردوس میں رکھوں گا۔ اور روزانہ اس پر ستر بار نظر رحمت کروں گا اور اس کی ستر حاجتیں پوری کروں گا۔

(۲) ابن عدی' طبرانی' بیہقی' خطیب اور ابن نجار نے حضرت غالب قطان سے روایت کی۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک بار کوفے گیا۔ حضرت اعمش رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قریب ہی ٹھہرا۔ میں نے دیکھا کہ ایک رات وہ تہجد کیلئے اٹھے تو انہوں نے یہ ہی آیت پڑھی اور بار بار فرمایا کہ جس کی رب نے گواہی دی۔ اس کی میں بھی گواہی دیتا ہوں۔ اے اللہ یہ میری گواہی تیرے پاس امانت ہے! میں نے پوچھا۔ جناب آپ یہ کیوں فرما رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ مجھے ابو وائل ابن عبداللہ نے خبر دی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ جب اس آیت کا پڑھنے والا قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوگا تو رب تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے پاس ایک بندہ کا عہد ہے اور میں عہد ضرور پورا کروں گا۔ میرے اس بندہ کو جنت میں لے جاؤ۔ (روح المعانی)

(۳) ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ جب مدینہ منورہ میں یہ آیت اُتری تو خانہ کعبہ کے تین سو ساٹھ (۳۶۰) بتوں نے کعبہ کی طرف سجدہ کیا۔
(۴) جو کوئی سوتے وقت یہ آیت کریمہ پڑھ لیا کرے۔ تو رب تعالیٰ اس پر ستر ہزار (۷۰۰۰۰) فرشتوں کو مقرر فرماتا ہے جو قیامت تک اسکے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ (مدارک)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** علمائے کرام بڑے درجہ والے ہیں۔ کہ رب تعالیٰ نے ان کا ذکر اپنے اور ملائکہ کے ساتھ کیا۔ اور اپنی توحید پر ان کو گواہ بنایا۔ اور بڑے مدعی کا گواہ بننا بھی فخر کی بات ہے۔ **دوسرا فائدہ:** غیر مسلم کی کوئی نیکی قبول نہیں۔ کافر کی نیکیاں ایسی ہیں جیسے بے وضو شخص کی نماز۔ جیسا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ الخ سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** دلائل و حالات کی گواہی معتبر ہے۔ جیسے شَھِدَ اللّٰہِ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا۔ لہٰذا بعض جگہ علامات کی گواہی سے فیصلہ ہو سکتا ہے۔ **چوتھا فائدہ:** رب تعالیٰ کا ہر کام عین عدل ہے کوئی ظلم نہیں' جیسا قَائِمًا بِالْقِسْطِ سے معلوم ہوا کہ جسکو دیا عدل و کرم سے دیا۔ **پانچواں فائدہ:** کوئی فرشتہ بے دین نہیں' انسان ہزار ہا بے دین ہیں' جیسا کہ قائمًا بالقسط کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** کبھی حسد سے دین جاتا رہتا ہے۔ جیسے بَغْیًا بَیْنَھُمْ سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** اسلام اور ایمان ایک ہی چیز ہے کیونکہ یہاں دین پر لفظ اسلام بولا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ دین عقائد کا نام ہے نہ کہ محض اعمال کا۔ **آٹھواں فائدہ:** ہر سچا دین اسلام کہلاتا ہے۔ لہٰذا یہودیت اور نصرانیت اپنے اپنے وقت میں اسلام کہلاتے تھے۔ اب جب منسوخ ہو گئے تو ان کا یہ نام بھی جاتا رہا۔ اب صرف دین محمدی کا نام اسلام ہے۔

حقانیت اسلام

دنیا کی ہر قوم اپنے دین کو حق جانتی ہے اور دوسرے ادیان کو باطل۔ مگر سچ یہ ہے کہ دین اسلام ہی حق ہے۔ اس کے سوا تمام دین باطل۔ اس کے عقلی و نقلی دونوں دلائل موجود ہیں۔ چونکہ آج کل اسلام کے بعض دعویداروں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ ہر دین میں رہ کر انسان تقویٰ اختیار کر لیتا ہے۔ جیسے ابوالکلام آزاد وغیرہ۔ اس لئے ہم پہلے حقانیت اسلام پر نقلی دلائل عرض کرتے ہیں۔ پھر عقلی رب تعالیٰ قبول فرمائے۔ اور اپنے بندوں کو راہِ راست پر چلنے کی توفیق دے۔

حقانیت اسلام کے نقلی دلائل: (۱) اگر ایک محبوب کے چند عاشق ہوں اور ہر ایک کا دعویٰ یہ ہو کہ محبوب مجھ سے ہی راضی رہے تو اس کے فیصلہ کی بہتر صورت یہ ہی ہے کہ خود محبوب سے پوچھ لیا جائے کہ تو کس سے راضی ہے۔ اس کے بیان کے بعد کسی کو جھگڑنے کا حق نہیں۔ صرف رب تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے دین اختیار کیا جاتا ہے ہر دین والا یہ ہی سمجھے ہوئے ہے کہ رب تعالیٰ مجھ سے راضی ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ رب تعالیٰ سے پوچھ لیا جائے کہ تو کس سے خوش ہے؟ رب تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا کہ تم جھگڑتے کیوں ہو ہم نے ہم راضی کرنے کے لئے دین اختیار کیا۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ

سے ہم بارگاہِ عالیہ سے علیحدہ کر دیئے گئے، خیال رہے کہ شَاوِرْ کا مصدر مشاورۃ ہے مشور سے بنا، شور کے معنی ہیں چھتے سے شہد نکالنا، کہا جاتا ہے شرث العسل یا جانور پر اس کا قیام گاہ پیش کرنا، اسی لئے اصطبل کو عربی میں مشوار کہتے ہیں (کبیر) رائے لینے کو مشورہ اسی لئے کہا جاتا ہے، کہ اس سے دوسرے کے دل کی بات معلوم کی جاتی ہے، دلی خیالات نکلوائے جاتے ہیں، بعض نے فرمایا کہ یہاں مشورہ سے مراد آئندہ جنگوں، جہادوں میں مشورہ لینا ہے مگر حق یہ ہے کہ ہر مشورہ مراد ہے، کیونکہ آیت میں مشورہ کے ساتھ کوئی قید مذکور نہ ہوئی، یعنی اے محبوب ان حضرات کو اپنے حقوق کی معافی دو اور حقوق اللہ کی معافی کے لئے ہم سے ان کی سفارش و شفاعت فرماؤ، اور گذشتہ کی طرح پھر انہیں اپنا ہم نشین اور مشیر کار بنالو، غرضکہ اس واقعہ کی بنا پر ان کے قرب حضوری میں کوئی فرق نہ آئے، خیال رہے کہ معافی اور استغفار تو ان سارے صحابہ کے لئے ہے، مگر مشورہ میں شریک فرمانا اہل الرائے صحابہ کے لئے ہے، کہ مشورہ ہر شخص سے نہیں کیا جاتا، اور ان امور میں مشورہ مراد ہے جو قابل مشورہ ہوں، احکام قرآنیہ یا احکام نبویہ میں مشورہ مراد نہیں، کہ یہ چیزیں مشورہ کے لائق نہیں فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ، عزم کے معنی ہیں عقد قلبی یعنی دل کا پختہ ارادہ، اسی لئے سخت جنگجو کو عزوم کہا جاتا ہے، حضور غوث پاک فرماتے ہیں عَزُوْمٌ قَاتِلٌ عِنْدَ الْقِتَالِیْ، توکل کے معنی بارہا بیان ہو چکے، کہ توکل اپنا کام دوسرے کے سپرد کر دینے کو کہتے ہیں، اسی سے ہے وکیل، یعنی اے محبوب جب آپ مشورہ وغیرہ کے بعد کسی کام کا مصمم ارادہ فرمالیں، تو رب تعالیٰ پر بھروسہ کریں، نہ اپنی قوت پر، نہ دوستوں کی جماعت پر یعنی تدبیر کے بعد تقدیر پر صابر و شاکر رہیں، امر الٰہی کا انتظار فرمائیں اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ یہ جملہ توکل کی وجہ ہے، یعنی توکل اس لئے کریں کہ توکل رب تعالیٰ کو پیارا ہے، اور متوکل لوگ رب تعالیٰ کے محبوب، اور یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنے محبوبوں کو دشمنوں کے حوالہ کر دیں، شعر

محال است چوں دوست دارد ترا — کہ در دستِ دشمن گدازد ترا

لہٰذا آپ جہاد وغیرہ میں توکل کے ہتھیار ضرور ساتھ رکھیں،

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے غازیان احد جن کے میدان میں قدم اکھڑ گئے تھے، ان کی ہمت افزائی، بلکہ عزت افزائی کے لئے اپنی معافی کا دو بار اعلان فرما کر، اور کفار کے طعنوں کے جوابات دے کر اپنے محبوب ﷺ کی تعریف و توصیف فرما کر ان کے متعلق تین باتیں بیان فرمائیں، فرمایا اے محبوب ﷺ آپ پر یا آپ کی امت پر اللہ تعالیٰ کی بڑی ہی رحمت ہے، کہ آپ قدرتی طور پر ان حضرات پر بہت ہی نرم دل واقع ہوئے، کہ جنگی حالات میں حکم سے سرتابی کرنے والے سپاہیوں کو نرم سے نرم بادشاہ و سلاطین بھی سخت سے سخت سزائیں دیتے ہیں، خصوصاً جب کہ ان کی غلطی سے سخت نقصان بھی پہنچا ہو، مگر آپ بفضلہ تعالیٰ ایسے رؤف ہیں، ایسے رحیم و کریم ہیں، کہ احد کی جنگ سے چلے جانے والے صحابہ پر بھی آپ نے کوئی سختی نہ کی، حالانکہ ان کی اس غلطی سے جنگ کا نقشہ بھی بدل گیا، آپ کو بھی تکالیف پہنچیں، یہ وقت سخت سزا دینے کا تھا، مگر آپ نے اس وقت بھی کرم ہی سے کام لیا، اگر آپ سخت زبان یا سخت دل ہوتے، تو لوگ آپ پر ایسے فدا نہ ہوتے بلکہ سب آپ کے پاس سے بھاگ جاتے، لہٰذا اب ہم ان

کی سفارش فرماتے ہیں، کہ آپ کو جو کچھ تکالیف پہنچیں انہیں معاف فرمادو، اوران کے بھاگ جانے پر جو کچھ دین کا نقصان ہوا اس کی درگذر کے لئے ہم سے شفاعت کرو، تا کہ ہم بھی انہیں مزید معافی دے دیں، اوران کے درجے بڑھادیں، اوراس بار جو ان سے غلطی رائے ہوئی، اس سے انہیں منصب وزارت سے علیحدہ نہ کرو، بلکہ پہلے کی طرح آئندہ بھی انہیں اپنے مشوروں وغیرہ میں شریک رکھو، ہر قابل مشورہ چیز میں ان سے مشورے لو، اور جب مشورہ وغیرہ کے بعد کسی کام کا پختہ مصمم ارادہ فرمالو، تو پھر اللہ تعالیٰ پر توکل کرو، نہ اپنی قوت پر، نہ ان کے مشوروں پر، اور پھر جو قدم اٹھ چکا ہے، اسے پیچھے نہ کرو، کیونکہ توکل کرنے والے رب تعالیٰ کو پیارے ہیں، اور پیارے دشمنوں کے حوالے نہیں کیے جاتے، تو تم کیسے مغلوب ہوگے،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** رب تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو جیسے اور صفات عالیہ میں کمال بخشا ہے، ایسے ہی نرمی طبیعت، اعلیٰ گفتار، خوش خلقی میں بھی کمال بخشا ہے، تفسیر کبیر نے یہاں فرمایا، کہ نبی کریم ﷺ قوت نظری میں نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ہیں، اور یہ آیت حضور انور ﷺ ہی کی شان میں ہے (کہ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ) (نور: ۳۵) اور قوت عملی میں انتہائی کمال کو پہنچے ہوئے ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَ اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (قلم: ۴) گویا آپ جسماً بشر اور روحاً فرشتہ ہیں، اسی لئے شہوت، غضب، حب مال اور حب جاہ سے آپ کی طبیعت پاک متاثر نہیں ہوتی (تفسیر کبیر) یہ فائدہ لِنْتَ الخ سے معلوم ہوا، **دوسرا فائدہ:** نرمی دل اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت ہے جو اس کے کرم ہی سے ملتی ہے، انسان فقط اپنی کوشش سے یہ وصف حاصل نہیں کرسکتا، جیسا کہ فَبِمَا رَحْمَةٍ سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** کسی کی طرف لوگوں کا میلان اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، اور لوگوں کی نفرت خدائے تعالیٰ کا عذاب جیسا کہ لَانْفَضُّوْا الخ سے معلوم ہوا، اللہ والوں کی قبروں پر بھی میلے لگے رہتے ہیں، یہ ان کی قبولیت کی علامت ہے، **چوتھا فائدہ:** حقوق العباد بندے ہی کے معاف کرنے سے معاف ہوسکتے ہیں، جیسا کہ فَاعْفُ عَنْهُمْ سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** خدائے تعالیٰ کی رحمتیں اوراس کے غضب سے پناہ حضور انور ﷺ ہی کے وسیلہ سے حاصل ہوسکتی ہیں، جیسا کہ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ سے معلوم ہوا، جب رب تعالیٰ اپنے بندوں کو کچھ دینا چاہتا ہے، تو اپنے حبیب ﷺ سے فرماتا ہے وَصَلِّ عَلَیْهِمْ (توبہ: ۱۰۳) اے حبیب ان کے لئے ہم سے دعائیں مانگو، اور جب بندوں کو معافی دینا چاہتا ہے، تو اپنے حبیب ہی سے فرماتا ہے وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ ان کے لئے ہم سے معافی مانگو، معلوم ہوا کہ دروازۂ عطاء جناب مصطفیٰ ﷺ ہیں، **چھٹا فائدہ:** غازیان احد جن کے قدم میدان سے اکھڑ گئے تھے بڑی ہی شان والے ہیں، کہ رب تعالیٰ نے پہلے تو اپنی معافی کا اعلان کیا، پھر اپنے حبیب ﷺ سے فرمایا کہ تم بھی انہیں معاف فرمادو، جنہیں اللہ بھی معاف کردے اور اس کا رسول بھی، اس کی عظمت کا کیا پوچھنا **ساتواں فائدہ:** حقوق اللہ کوئی بندہ معاف نہیں کرسکتا، اسی لئے رب تعالیٰ نے اپنے حبیب کو عفو کے بعد استغفار کا حکم دیا، یعنی اے حبیب اپنے حق تم معاف کردو، اور حقوق اللہ کے متعلق ہماری بارگاہ میں ان کی شفاعت فرماؤ، **آٹھواں فائدہ:** بڑا چھوٹے سے سفارش کرسکتا ہے، دیکھو اللہ تعالیٰ نے رب ہوکر اپنے حبیب سے خطا کاروں کی سفارش فرمائی، مگر اس کا نام سفارش ہوگا نہ کہ

شفاعت لہٰذا رب تعالیٰ کو شفیع نہیں کہہ سکتے، وہ جو حدیث شریف میں ہے، کہ کسی نے عرض کیا، یا رسول اللہ میں رب تعالیٰ کو آپ کی بارگاہ میں شفیع لاتا ہوں، تو سرکار اس پر بہت ناراض ہوئے، اس کی یہی وجہ تھی، لہٰذا وہ حدیث اس آیت کے خلاف نہیں، **نواں فائدہ:** اہم کاموں میں مشورہ لینا سنت رسول اللہ ﷺ بھی ہے اور حکمِ خداوندی بھی، مشورے سے کام کرنے والا نادم نہیں ہوتا، **دسواں فائدہ:** حضور انور ﷺ کی موجودگی میں اجتہاد جائز تھا، جیسا کہ شَاوِرْ سے معلوم ہوا، کیونکہ مشورے میں ہر شخص اپنے اجتہاد سے ہی رائے دے گا، **گیارھواں فائدہ:** صحابہ کرام بڑی ہی عظمتوں کے مالک ہیں، کہ رب العالمین نے انہیں اپنے حبیب کا مشیر بنایا، یہ دونوں فائدے تفسیر روح المعانی نے بیان کئے، اسی روح المعانی میں بروایت حاکم و بیہقی حضرت ابن عباس سے بسند صحیح روایت ہے کہ آیت وَشَاوِرْهُمْ میں حضرت صدیق اکبر و فاروق اعظم رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین مراد ہیں، یعنی اے محبوب ﷺ آپ ان دو بزرگوں کے مشورہ سے کام کیا کریں، فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کہ جس چیز پر ابوبکر و عمر جمع ہو جائیں، تو میں اس کی مخالفت کبھی نہ کروں گا، (احمد) اور فرمایا کہ جس پر یہ دونوں جمع ہو جائیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق ہے، یہ تمام فائدہ تفسیر روح المعانی و کبیر میں مصرّح ہے، **بارھواں فائدہ:** مشورے اور اسباب پر عمل توکل کے خلاف نہیں، دیکھو رب تعالیٰ نے پہلے اپنے حبیب کو مشورہ کا حکم دیا، پھر توکل کا، **تیرھواں فائدہ:** مسلمان کو چاہیے کہ خوب سوچ سمجھ کر کسی کام میں قدم رکھے، اور جب قدم رکھ دے، پھر پیچھے نہ ہٹائے، جیسا کہ فَاِذَا عَزَمْتَ الخ سے معلوم ہوا، بغیر سوچے ہر کام شروع کر دینا، پھر فوراً ہی چھوڑ دینا سخت غلطی ہے، استقامت کے بغیر حکمرانی، تجارت، جہاد کچھ بھی نہیں ہو سکتا، **چودھواں فائدہ:** خوش خلقی بھی حضور انور ﷺ کی سنت ہے، افسوس کہ آج ہم مسلمان رفع یدین، آمین بالجہر پر ان کو سنت جان کر جھگڑا کرتے ہیں اور جھگڑوں میں آپے سے باہر ہو کر اخلاق محمدی کو طاق میں رکھ دیتے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ اخلاق کا برتاؤ بھی تو سنت ہے،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ نرمی دل اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، مگر دوسری جگہ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (تحریم: ۹) اے محبوب ان پر خوب سختی کرو اور مسلمانوں کو حکم دیتا ہے وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً (توبہ: ۱۲۳) ان دونوں آیتوں میں تعارض ہے، **جواب:** یہاں مسلمانوں پر نرمی کا ذکر ہے، اور ان آیات میں جنگجو کفار و منافقین پر سختی کا حکم ہے، مسلمانوں پر نرمی اچھی ہے، کفار پر سختی ضروری، سانپ کا سر کچل دو، مفید جانوروں کی پرورش کرو، اس کی تفسیر وہ آیت ہے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (فتح: ۲۹) **دوسرا اعتراض:** اگر کفار پر سختی اچھی چیز ہے، تو رب تعالیٰ نے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے کیوں فرمایا تھا فَقُولَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (طہٰ: ۴۴) تم دونوں فرعون سے نرم گفتگو کرنا، فرعون بھی تو کافر تھا؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام میں فرعون پر سختی کرنے کی طاقت نہ تھی، کفار پر سختی طاقت حاصل ہونے پر کی جاتی ہے، دیکھو ہمارے حضور انور ﷺ کو ہجرت سے پہلے حکم دیا گیا کہ جاہلوں سے چشم پوشی کرو، ان سے درگذر کرو، کیوں؟ اس لئے کہ اس وقت جہاد کی قوت نہ تھی، بعدِ ہجرت جب اسباب جمع ہو گئے، تو جہاد کا

پہلے سر پر یتیمی کا سہرا باندھا گیا۔ بچپن شریف میں ہی ماں کی گود بھی نہ رہی۔ جو قرابت دار باقی بچے وہ خون کے پیاسے۔ سارے عالم کی سرداری' مگر دنیوی ساز و سامان ندارد۔

چوتھی صفت: پیغمبر خدا ﷺ نے تیئس سال کی تھوڑی سی مدت میں دنیا کی ہوا بدل دی' بے دینوں کو دیندار۔ بت پرستوں کو خدا پرست اور نہ معلوم کسے کیا کیا بنا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پہاڑ توڑ دینا آسان' دریا کا رخ بدل دینا سہل مگر بگڑی قوم کو بنا دینا دشوار۔ نوح علیہ السلام کی ایک ہزار سال تبلیغ میں کل ستر آدمی ایمان لائے۔ اور ان کے بعد بہت جلد دین بدل گیا۔ مگر حضور ﷺ کی تیئس سالہ تبلیغ میں بے شمار مسلمان ہوئے۔ اور قیامت تک دین باقی رہا۔ غرضکہ۔

بسیار خوباں دیدہ ام' لیکن تو چیزے دیگری !

اگر ہندو کہیں کہ رامچندر نے قوت بازو سے بھاری کمان کے دو ٹکڑے کر ڈالے تو مسلمان کہہ سکتا ہے کہ ہمارے پیغمبر ﷺ کی انگلی میں وہ طاقت تھی کہ اشارے سے پورے چاند کو توڑ کر دو کمانیں بنا دیا۔ اگر عیسائی کہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے مردے زندہ کئے تو مسلمان کہہ سکتا ہے کہ ہمارے پیغمبر (ﷺ) نے سوکھی لکڑیوں اور کنکروں کو جان بخش کر ان سے کلمہ پڑھوا لیا۔ اگر یہودی کہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی مار کر پتھر سے پانی کے چشمے بہا دیئے تو مسلمان کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے اپنی انگلیوں سے پانی کے فوارے ابال دیئے۔ یہ بطور نمونہ چند باتیں پیش کی گئیں۔

اسلامی قانون: اسلامی توانین ایسے ٹھوس اور مکمل اور نا قابل تبدیلی ہیں جن کی مثال نہیں مل سکتی۔ کفار طعنہ کیا کرتے تھے کہ ایک مرد کو چند عورتوں کی کیوں اجازت دی گئی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ عورتوں کی پیداوار زیادہ ہے اور مردوں کی موت بہت کہ لڑائیوں وغیرہ میں مرد ہی مارے جاتے ہیں تو اس کی حکمت سمجھے۔ اسلام نے چور کے ہاتھ کٹنے کا حکم دیا۔ دیگر مذاہب نے چور کو قید کرایا مگر بعد میں پتہ لگا کہ ہاتھ کٹنے سے ہی چوری بند ہو سکتی ہے۔ قید وغیرہ سے چوری بڑھے گی کہ چور جیل میں روٹی کھائے گا۔ اسلام نے جرمانہ لینے کی ممانعت کی۔ کفار نے اس کی اجازت دی۔ بعد میں پتہ لگا کہ جرمانے سے جرم بڑھیں گے۔ گھٹیں گے نہیں کہ مالداروں کو جرم پر دلیری ہو گی اور حکومت کو اس سے نفع' حکومت خود جرم چاہے گی تاکہ آمدنی ہو۔ اسلام نے ذبح حیوانات کی اجازت دی۔ ہندوؤں نے اس سے منع کیا مگر پتہ یہ لگا کہ اگر جانور ذبح نہ کئے جائیں تو انسانوں کی زندگی ناممکن ہو جائے کیونکہ ساری پیداوار وہ ہی کھا جائیں گے اور زمین انہی سے بھر جائے گی۔ اسلام نے جہاد کا حکم دیا۔ کفار نے اس سے منع کیا مگر پتہ لگا کہ بغیر جہاد کوئی قوم دنیا میں عزت پا سکتی ہی نہیں۔ امن و عزت و انتظام جہاد کی بدولت ہے۔ اسلام نے شراب' جوئے سود کو حرام کیا۔ بعض کفار نے ان چیزوں کی اجازت دی مگر تجربہ نے بتایا کہ یہ چیزیں جھگڑے' فساد' بدامنی کی جڑ ہیں۔ سود کی بدولت دن رات تاجروں کے دیوالے ہوتے ہیں۔ اس کی مزید تفصیل کے لئے اس تفسیر کا پہلا پارہ اور ہماری کتاب اسلامی زندگی دیکھو۔

پہلا فائدہ: قرآنی آیات درجہ و فضیلت میں یکساں نہیں۔ اگرچہ ہر آیت اللہ کا کلام ہے مگر درجہ و رتبہ مختلف جن آیات میں کفار یا ابلیس یا دوزخ کا ذکر ہے وہاں ذکر و ذاکر تو اعلیٰ ہے مگر مذکورہ خبریں خبیث ہیں اور جن آیات میں حضرات انبیاء یا سید الانبیاء یا رب تعالیٰ کی ذات و صفات کا ذکر ہے وہاں ذکر و ذاکر بھی اعلیٰ اور مذکور بھی اعلیٰ لہٰذا یہ آیات پچھلی آیات سے

دینے کی ہمت ہوئی، تفسیر کبیر نے یہاں بڑے مزے کی بات فرمائی، وہ فرماتے ہیں، کہ حضور انور ﷺ کے مشورے اپنا علم حاصل کرنے کے لئے نہ تھے، بلکہ ان حضرات کی ذہانت معلوم کرنے کے لئے تھے، کہ کن کی قوت اجتہادی کس درجہ کی ہے، اور بھی اس میں صدہا حکمتیں تھیں، **چھٹا اعتراض:** حضور انور ﷺ تو صحابہ کرام سے پہلے بھی مشورے کرلیا کرتے تھے، اب کیوں حکم ہورہا ہے کہ ان سے مشورے لو، **جواب:** اس لئے کہ ان بزرگوں کے مشوروں سے احد کی جنگ میدان میں لڑی گئی، جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا، انہیں خیال ہوا ہوگا کہ اب ہم سے مشورے نہ لئے جائیں گے، ہم اس لائق نہیں، اس لئے رب تعالیٰ نے فرمایا، اے محبوب آپ پہلے کی طرح اب بھی ان حضرات سے مشورے لیا کریں، **ساتواں اعتراض:** تم نے فوائد میں بیان کیا کہ شَاوِرْهُمْ میں هُمْ سے مراد صدیق و فاروق رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہیں، یہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کے قدم میدان سے اکھڑ گئے تھے، انہی کے لئے فرمایا گیا کہ انہیں معافی دے دو، ان کے لئے بخشش مانگو، ان سے مشورے کرو، جب یہ حضرات میدان سے ہٹے ہی نہیں، تو نہ ان کے لئے معافی، نہ ان سے مشورہ کا حکم، **نوٹ:** یہ اعتراض امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ نے تفسیر کبیر میں کیا، **جواب:** چونکہ اس بارے میں سیدنا عبداللہ ابن عباس کی روایت آچکی، اس لئے اعتراض کی گنجائش ہی نہیں، اور حدیث کا منشاء یہ ہے، کہ یہ دونوں حضرات علی وجہ الکمال مشورہ کے لائق ہیں، کہ صحابہ میں مجتہد اعظم ہیں، باقی دیگر حضرات بھی ان میں شامل ہیں، ہم تفسیر میں عرض کرچکے، کہ معافی اور استغفار سب کے لئے تھی، مگر مشورہ اہل الرائے سے، **آٹھواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا، کہ صرف نبی کریم ﷺ ہی نرم دل، خوش خلق تھے، باقی انبیائے کرام نہ نرم دل تھے، نہ خوش خلق، تو کیا وہ حضرات بدخلق تھے، بدخلقی تو عیب ہے! **جواب:** اولاً تو آیت کریمہ میں حصر کا لفظ ہے نہیں، تاکہ اس سے دوسرے انبیائے کرام کی بدخلقی ثابت ہو، اگر بلا دلیل حصر مان بھی لیا جائے، تو یہ حصر دوسرے سلاطین، امراء وغیرہم کے مقابلہ میں ہوگا، یعنی آپ دوسرے بادشاہوں، امیروں کی طرح کج خلق نہیں، جو بات بات میں اپنے ماتحتوں پر سختی کرتے ہیں، اور اگر حصر بھی مان لو، اور یہ بھی کہ یہ حصر دوسرے نبیوں کے مقابلہ میں ہے، تب بھی ان حضرات کی بدخلقی ثابت نہ ہوگی، بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ بعض انبیائے کرام جلالی تھے، اور یہ جمالی رسول ہیں، جلالی نبیوں نے کفار کو بددعا فرما کر ہلاک کرادیا، یہاں تفسیر صاوی نے فرمایا کہ اگر حضور انور ﷺ حضرت نوح و ہود اور صالح علیہم الصلوٰۃ والسلام کی طرح جلال والے رسول ہوتے رحمۃ للعالمین نہ ہوتے، تو ہم سب ہلاک ہوجاتے، ان جلالی پیغمبروں نے اپنے نافرمانوں کے لئے جو چیزیں رب تعالیٰ سے مانگیں، ہمارے رحمت والے رسول نے ان ہی چیزوں کے دفعیہ کی رب تعالیٰ سے سفارش فرمائی، **نواں اعتراض:** اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ حضور انور ﷺ بہت نرم دل ہیں، مگر حضور انور ﷺ نے کبھی چور اور زانی وغیرہ کو معافی نہ دی بہت سخت پکڑ کی، یہ نرمی کیسی؟! اسلام کے قوانین جس قدر سخت ہیں، اتنے کسی دین کے قوانین سخت نہیں! **جواب:** اپنے معاملات میں درگذر اور اپنے ذاتی مجرم کو معاف کردینا خوش خلقی ہے، مگر قوم و ملک کے دشمنوں سے درگذر کرنا لاقانونی ہے جس سے فساد پھیلتا ہے، حضور انور ﷺ نرم دل ہیں لاقانونی نہیں ہونے دیتے، سخت قوانین سے ہی جرم رکتے ہیں اور امن قائم ہوتا ہے، نرم قوانین

تفسیر صوفیانہ

یہ آیت بہت ہی پرلطف ہے۔ رب ہی مدعی وہ ہی سب کا مدعٰی وہ ہی دعویٰ وہ ہی شاہد وہ ہی حاکم۔

خود کوزہ و خود کوزہ گرو خود گل کوزہ

عالم اجمال میں نہ کوئی شاہد تھا نہ مشہود ماسوا اللہ کوئی موجود اس مقام پر خود ذات نے ذات پر ذات کی ذات کے سامنے گواہی دی۔ جس کے لئے فرمایا گیا۔ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ پھر مقام تفصیل میں جب سایہ کی طرح سب موجود ہوئے تو اصل نے ظلم کے ساتھ اپنی واحدانیت پر گواہی دی بلکہ سایہ نے اپنے سایہ والے کا پتہ دیا جس کے متعلق فرمایا گیا۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ۔ الخ خیال رہے کہ رب تعالیٰ مقسط ہے۔ یعنی عدل فرمانے والا۔ اس طرح کہ ساری کثرتیں اس واحد کا ظل ہیں۔ ان اظلال میں ہر ظل کو اس کی تعداد کے بقدر اپنا جود اپنا کمال اور اپنی تجلی سے حصہ دیا۔ جتنا جس کا ظرف (برتن) اتنی ہی رب کی عطا (ابن عربی) سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے ارواح کو جسم سے چار ہزار سال پہلے رزق ارواح سے چار ہزار سال پہلے پیدا کیا رب تعالیٰ کی یہ گواہی اس وقت کی ہے جب نہ زمین تھی نہ آسمان' نہ خشکی' نہ تری' پھر مخلوق نے پیدا ہو کر سیکھ کر گواہی دی۔ خیال رہے کہ مخلوق کی گواہی دو قسم کی ہے۔ اختیاری و غیر اختیاری۔ اختیاری گواہی سارے فرشتوں نے اور بعض انسانوں نے دی مگر غیر اختیاری گواہی سب نے دی۔ بت پرست و کافر کا رونگٹا بھی وحدانیت کی گواہی دیتا ہے۔ کافر کا دل و زبان مشرک ہے مگر اس کی ہر حالت توحید کی گواہ۔ اعضاء بدن کی اطاعت عبادت ہے۔ اور دل کی اطاعت عجز و نیاز۔ یہ ہی اس کا اسلام ہے اور یہ ہی عند اللہ مقبول' اور ساری ظاہری عبادات کا مغز ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سارا دین قلب کا غیر اللہ سے خالی ہونا اور نافرمانی کے عیب سے پاک و صاف ہونا۔ نیز وہ ہی علم نفع بخش ہے۔ جو معرفت کے ساتھ ہو۔ جس علم کے ساتھ نفسانی عیوب شامل ہوں۔ وہ وبال ہے۔ اہل کتاب کا علم اسی لئے اختلاف و فساد کا سبب بنا کہ ان کے نفس کی انانیت فنا نہ ہوئی تھی جس تختی پر اگلے نقوش باقی ہوں اور صاف نہ ہو اس پر دوسرے نقوش خرابی کا سبب ہیں۔ ایسے ہی جس دل پر حسد' بغض' عداوت کے عیوب موجود ہوں اس میں علم اور بھی خرابی کا ذریعہ ہوتا ہے علم اللہ کی نشانی ہے۔ جو اس کے بعد رب کو نہ پہچانے وہ سخت مجرم ہے۔

کلمہ توحید کی تین عبارتیں ہیں۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ۔ رب بندے کے پاس حاضر ہے مگر بندہ کبھی غائب ہوتا ہے کبھی حاضر' غیوبیت دوری کا کلمہ ہے۔ لا الٰہ الا ھو حضور ﷺ کا کلمہ ہے۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ مگر مقام فنا میں پہنچ کر اس کلمہ کی عبارت یوں ہو جاتی ہے۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا اس وقت بندہ انا میں فنا ہو کر انا کہتا ہے وہاں زبان بندے کی ہوتی ہے کلام رب تعالیٰ کا جیسے ریڈیو کی آواز نکلتی پیٹی سے ہے مگر ہوتی ہے بولنے والے کی یہ ہی وہاں ہوتا ہے۔ شعر

چوں روا باشد انا اللہ از درخت　　　کے روانہ بود کہ گوید نیک بخت

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ

پس اگر حجت بازی کریں وہ تم سے تو کہہ دو کہ تابع کیا میں نے منہ اپنا واسطے اللہ کے اور اس نے جس نے پیروی کی میری اور

صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلَّمَ

اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ

اگر مدد کرے تمہاری اللہ تو نہیں ہے کوئی غالب آنے والا تم پر اور اگر وہ

اگر تمہاری مدد کرے اللہ تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ

یَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ

چھوڑ دے تم کو تو کون ہے وہ جو مدد کرے تمہاری اس کے بعد

تمہیں چھوڑ دے تو ایسا کون ہے جو پھر تمہاری مدد کرے

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

اور اللہ پر ہی چاہئے کہ بھروسہ کریں ایمان لانے والے

اور مسلمانوں کو اللہ ہی پر بھروسہ ہے

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشورہ کرنے کا حکم دے کر رب تعالیٰ پر توکل کرنے کا حکم دیا تھا، اب اس حکم کی وجہ بتائی جارہی ہے، کہ مشورہ وغیرہ اس وقت کام دیتے ہیں جب ہماری مدد شامل حال ہو، ورنہ یہ سب بیکار، بلکہ بعض حال میں وبال بلکہ نکال بن جاتے ہیں گویا پہلے دو حکم تھے، اب ان حکموں کی وجہ کا بیان ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں رب تعالیٰ نے جنگِ احد کے دو نقشے دکھائے اولاً فتح وغنیمت بعد میں ہزیمت، اب ان دونوں باتوں سے نتیجہ نکالا جارہا ہے کہ سب کچھ ہمارے کرم پر موقوف ہے، اگر کرم کریں تو وہ ہو جو احد میں پہلے پہل ہوا، اگر نہ کریں تو وہ ہو جو بعد میں ہوا، لہٰذا ہم پر نظر رکھو، ہم کو راضی رکھنے کی کوشش کرو، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں حضور انور ﷺ کو دعائے خیر کرنے کا حکم دیا گیا، اب مسلمانوں کو در پردہ حضور انور ﷺ کی دعائیں لینے کا حکم دیا جارہا ہے، کہ ہمارے محبوب کی دعائیں لو اگر وہ دعا کریں گے، تو ہم تمہاری مدد کریں گے، اور جب ہم مدد کریں گے، تو تم پر کوئی غالب نہ آسکے گا، **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ کسی کام کا ارادہ مصمم کرنے سے پہلے مشورہ وغیرہ کرلیا کرو، مگر جب عزم بالجزم کرلو، تو صرف توکل کرو، اب کسی مشورہ وغیرہ کی ضرورت نہیں، اب اس آیت میں اس حکم کی حکمت بیان ہورہی ہے کہ ہماری مدد کے ہوتے تم پر کوئی غالب نہ آسکے گا، لہٰذا عزم کے بعد رزم ہی چاہیے نہ کہ بزم

تفسیر

اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ اِن شرطیہ ہے، جو شک کے موقعہ پر استعمال ہوتا ہے، مگر کلام الٰہی میں شک بندوں کے لحاظ سے ہوتا ہے نہ کہ

حق و باطل کی تحقیق مقصود نہ ہو صرف اپنے مقابل کو خاموش کرنا اپنی بات اونچی کرنا مقصود ہو مناظرہ بہترین عبادت ہے اور محاجہ بدترین فساد خصوصاً حق کے مقابلہ میں۔ اس کا فاعل یا اہل کتاب ہیں یا صرف نجران کے عیسائی یا سارے کفار اور ک میں حضور علیہ السلام سے خطاب ہے۔ چونکہ محاجہ مناظرہ میں فسادی وہ ہوتا ہے جو باطل پر ہو حق پرست فسادی نہیں۔ اگر پولیس اور ڈاکوؤں میں مقابلہ ہو جائے تو ڈاکو فسادی ہیں نہ کہ پولیس اسلئے یہاں حَاجُّوْکَ کا فاعل اُن کفار کو قرار دیا گیا نہ کہ حضور علیہ السلام کو نہ مسلمانوں کو۔ اس کا متعلق پوشیدہ ہے یعنی اے محبوب اگر کفار آپ علیہ السلام سے حقانیت اسلام میں کج بحثی کریں تو فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ۔ اَسْلَمْتُ اسلام سے بنا بمعنی اخلاص اطاعت وفرمانبرداری' سربسجود ہونا اپنے کو دوسرے کے سپرد کر دینا' یہاں تمام معانی بن سکتے ہیں۔ وجہ چہرے کو بھی کہتے ہیں۔ ذات کو بھی توجہ کو بھی عمل کو بھی (کبیر) یہاں سارے معنی بن سکتے ہیں۔ اور بہتر یہ ہے کہ ذات مراد لی جائے' کہ اس میں قلب قالب سب آ جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہوگا کہ بندے نے اپنے کو رب کے سپرد کر دیا کہ میرے خیالات ارادے' حرکات' سکنات سب رب کے زیر فرمان ہیں۔ وَمَنِ اتَّبَعَنِ کا واؤ یا تو عاطفہ ہے۔ اور یہ جملہ اَسْلَمْتُ کے فاعل پر معطوف' فاصلہ ہونے کی وجہ سے ضمیر پر اس کا عطف جائز ہوا۔ یا واؤ بمعنی مع ہے۔ اور یہ جملہ مفعول معہٗ ابو عمر اور نافع کے نزدیک اِتَّبَعَنِیْ کے ساتھ ہے۔ اور باقی قاریوں کے نزدیک اِتَّبَعَنِ حذف ی سے کلام عرب میں بہت دفعہ ی گر جاتی ہے۔ اعشیٰ کہتا ہے۔

فَهَلْ يَمْنَعَنِي ارْتِيَادِي الْبِلَادَ ۔۔۔ وَمِنْ حَذَرِ الْمَوْتِ اَنْ يَّاْتِيَنْ

یعنی تو آپ فرما دو کہ میں نے اپنی ذات کو یا اپنے عمل کو یا اپنے چہرہ کو یا اپنی توجہ کو اللہ کے لئے خالص کر لیا۔ اس کا مطیع بنا لیا۔ اور میرے پیروکاروں نے بھی اپنی ذاتوں کو خالص کیا۔ اس عبارت سے یا ترک مناظرہ مقصود ہے۔ یا کفار کو اچھے طریقہ سے دعوت اسلام دینا۔ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ۔ یہ جملہ پچھلے جملہ شرطیہ فان حَاجُّوْکَ الخ پر معطوف ہے۔ اور اوتوا الکتاب سے سارے اہل کتاب مراد یہودی ہوں یا عیسائی' عالم ہوں یا جاہل' اور اُمِّيّٖنَ سے سارے مشرکین مراد۔ ان دو لفظوں میں سارے غیر مسلم فرقے آ گئے۔ اگرچہ یہاں وَقُلْ لَّهُمْ بھی کافی ہو جاتا مگر عموم کے لئے صراحتًا ان سب کا ذکر کیا گیا۔ خیال رہے کہ امیین امی کی جمع ہے۔ اور امی اُمّ سے بنا ی نسبتی ہے۔ یعنی حال والا' بے پڑھے کو اس لئے امی کہتے ہیں کہ جیسے وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ ویسا ہی رہا۔ چونکہ عرب کے عام اہل کتاب پڑھے لکھے تھے اور مشرکین بے علم۔ اس لئے انہیں تو اُوْتُوا الْكِتٰبَ کہا گیا۔ اور انہیں امی۔ ہم امی کی نہایت نفیس تحقیق پہلے کر چکے ہیں۔ حضور علیہ السلام کے امی ہونے کے معنی ہیں۔ پیدائشی عالم۔ ءَ اَسْلَمْتُمْ۔ یہاں بھی اسلام بمعنی اطاعت ہے اور پہلا ہمزہ استفہامیہ اور اس کا معطوف پوشیدہ۔ اصل عبارت یوں ہے۔ ءَ اَسْلَمْتُمْ اَوْ دُمْتُمْ عَلٰى كُفْرِكُمْ۔ یعنی اے نبی علیہ السلام آپ ہر خاص وعام پڑھے بے پڑھے چھوٹے بڑے سے فرما دو کہ تم بھی میری اتباع میں اسلام قبول کرتے ہو یا نہیں۔ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا۔ یہ رب کا فرمان ہے' خیال رہے کہ اسلام عین ہدایت ہے۔ لہٰذا یا تو اِهْتَدَوْا سے مراد گمراہی سے نکلنا ہے یا اپنے کو نفع پہنچانا۔ (روح المعانی) اور ہو سکتا ہے کہ اِهْتَدَوْا سے مراد جنت کا راستہ پالینا ہو۔ یعنی اگر کفار آپ علیہ السلام کا یہ فرمان سن کر ایمان لے آئیں تو وہ گمراہی سے نکل گئے۔ یا انہوں نے اپنی جانوں کو نفع پہنچا لیا۔ انہوں نے جنت کا راستہ پالیا۔ تفسیر خازن میں ہے کہ جب

اہل کتاب نے یہ آیت سنی تو بولے ہم اسلام لے آئے' تو حضور علیہ السلام نے یہود سے پوچھا کیا تم عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول مانتے ہو۔ وہ بولے معاذ اللہ عیسیٰ بھی رسول ہو سکتے ہیں اور عیسائیوں سے پوچھا کہ کیا تم عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول مانتے ہو۔ وہ بولے معاذ اللہ بھلا عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے ہو سکتے ہیں۔ تب یہ آیت آئی۔ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ۔ تَوَلَّوْا کا مادہ ولی بمعنی پیٹھ پھیرنا ہے۔ اس کا فاعل اہل کتاب ہیں یا سارے کفار۔ ف جزائیہ ہے اور اس کا مابعد جزا نہیں بلکہ دلیل جزا ہے اور اس کا قائم مقام انما حصر کے لئے ہے۔ اور اس سے حصر اضافی مراد ہے۔ اور حصر ہدایۃ کے مقابل ہے۔ یعنی آپ ﷺ تبلیغ کے ذمہ دار ہیں نہ کہ ہدایۃ دینے کے اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ صرف تبلیغ کرنے والے ہیں نہ شفیع المذنبین نہ رحمۃ اللعالمین جیسے قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (الکہف: ۱۱۰) میں بشریت میں حصر الوہیت کے لحاظ سے ہے نہ کہ دوسرے صفات کے لحاظ سے ورنہ حضور ﷺ نبی' رسول' مصطفیٰ' نور' شفیع' ہادی وغیرہ سب کچھ ہیں۔ بلاغ کے معنی ہیں انتہا کو پہنچا دینا۔ یہاں تبلیغ احکام مراد ہے۔ یعنی اے نبی ﷺ اگر یہ اسلام سے منہ پھیریں اور آپ (ﷺ) کی بات نہ مانیں تو آپ ﷺ کو کوئی نقصان نہیں کیونکہ آپ کے ذمے صرف تبلیغ ہے نہ کہ ہدایت' ہدایت ہمارا کام ہے۔ اس توجیہہ پر یہ آیت محکم ہے' منسوخ نہیں۔ اور اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کے ذمہ صرف زبانی تبلیغ ہے نہ کہ جہاد اور قتال تو یہ آیت آیت جہاد سے منسوخ ہے۔ (خازن و روح المعانی) وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ۔ یہ پچھلے کلام کا خاتمہ ہے۔ اس میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔ اور عباد سے سارے مومن و کافر بندے مراد ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ سب کو دیکھنے والا ہے۔ مومنوں کو ثواب اور کافروں کو عذاب دے گا۔

خلاصہ تفسیر

جب دلائل سے ثابت کر دیا کہ سچا دین اسلام ہی ہے۔ رب تعالیٰ کی توحید اور اسلام کی حقانیت پر سب کا اتفاق بھی ہے اور جو اختلاف لوگوں نے پیدا کئے وہ محض ضد اور تعصب سے ہیں اگر اس پر بھی ناانصاف لوگ حجت بازی اور کج بحثی کئے جائیں تو آپ ان کی ساری بیہودہ گفتگو اور کل شبہات کے جواب اس عمدہ طریقہ سے دے دو کہ منصف مزاج کو سوا ماننے کے کچھ بن نہ پڑے کہ فرما دو اے کتابیو اور غیر کتابیو میں نے اور میرے ساتھیوں نے تو اپنی ذات اپنے اعمال' اپنی ہر چیز کو خالص اللہ کے لئے کر دیا۔ بولو تم بھی ہمارے ساتھ اس فرمانبرداری میں شریک ہوتے ہو یا نہیں۔ اور اپنے کو خدا کے لئے سمجھتے ہو یا نہیں۔ اگر وہ یہ سن کر اسلام لے آئیں اور آپ ﷺ کی پیروی کرنے لگیں تو وہ بھی گمراہی سے نکل کر راہ جنت پا گئے اور اگر اس فیصلہ کن کلام سے بھی منہ موڑیں اور کج بحثی کریں تو اے محبوب ﷺ آپ کا کوئی نقصان نہیں۔ آپ کیوں غم کرتے ہیں۔ آپ پر صرف تبلیغ واجب ہے نہ کہ کسی کو ہدایت دینا۔ اللہ تعالیٰ سب بندوں کو دیکھتا ہے۔ مومن کو ثواب اور کافر کو عذاب خود دے گا۔ خیال رہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے بھی کفار کے مقابل یہ ہی فرمایا تھا۔ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ۔ الخ (انعام: ۷۹) حضور علیہ السلام کو بھی حکم ہو رہا ہے کہ آپ یہ فرما دو۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل [illegible] فائدہ [illegible] لوگ [illegible] وعظ و نصیحت نفع نہ دے ان سے

مناظرہ نہ کرنا اور علیحدہ ہو جانا بہتر ہے۔ جیسا کہ اسلمت وَجْهِيَ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** دین کی تبلیغ عمدہ طریقہ اور خوش خلقی سے چاہیے نہ کہ تند خوئی اور کج خلقی سے جیسا کہ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (نحل:۱۲۵) (روح المعانی) **تیسرا فائدہ:** تبلیغ قولی کے ساتھ فعلی بھی ضروری ہے۔ یعنی کفار کے سامنے مسلمان ایسے عمدہ عمل پیش کریں جس سے وہ اسلام کے گرویدہ ہو جائیں۔ گویا ہماری صداقت دیانت داری خوش خلقی دین اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ ہو۔ جیسا کہ اَسْلَمْتُ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** اپنا عقیدہ اور ایمان سب پر ظاہر کرنا چاہیے۔ یہ چھپانے کی چیز نہیں۔ دیکھو رب نے اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیا کہ اپنے اور اپنے غلاموں کے اسلام و اطاعتِ خداوندی کا اعلان فرما دو۔ مستحب نیکیاں چھپانا بہتر ہے مگر فرائض و عقائد ظاہر کرنا افضل۔ تا کہ لوگ اس کی پیروی کریں۔ اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جن کے نزدیک تقیہ اصل دین ہے اور اپنے مذہب و ملت کو چھپانا اصول ایمان اگر تقیہ بہترین عبادت ہوتا تو حضور انور ﷺ۔ صحابہ کرام کفار کے ہاتھ کیوں ایذا پاتے' اپنے کو چھپا لیتے' آرام کرتے۔ نیز حضرت حسین یزید کے ہاتھوں کیوں اتنی مصیبت جھیلتے تقیہ کر کے یزید کی بیعت کر لیتے بجائے مصیبت کے انعام و اکرام حاصل کرتے۔ **پانچواں فائدہ:** صحابہ کرام اور اہل بیت کا ایمان یقینی ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ سے ان کے ایمان و اخلاص اطاعت کا اعلان کرایا۔ گویا حضور ﷺ کو ان کے ایمان پر اعتماد تھا کہ اپنے ساتھ ان کا بھی ذکر کیا اور ایک ہی اَسْلَمْتُ کا فاعل ان کو بھی قرار دیا گیا۔ یہاں تو بتایا گیا کہ صحابہ کرام حضور انور ﷺ کے سچے متبع ہیں کہ ارشاد ہوا وَمَنِ اتَّبَعَنِ۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا۔ (بقرہ: ۱۳۷) جو بھی تمہارا ایمان لائے گا' ہدایت پائے گا۔ اس آیت میں حضرات صحابہ کو ایمان و ہدایت کا معیار قرار دیا گیا کہ مومن وہ جس کا ایمان صحابہ کرام کا سا ہو۔ نیز اِبْتَغٰی میں اشارۃً فرمایا گیا کہ اسلام و ایمان حضور ﷺ کی اتباع میں منحصر ہے کہ آپ کی اتباع کے بغیر نہ اسلام ہے نہ ایمان۔ **چھٹا فائدہ:** حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ساری مخلوق کے نبی ہیں اور سب پر آپ ﷺ کی اطاعت واجب دیکھو ارشاد ہوا۔ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ۔ جس میں دنیا بھر کے سارے کفار سے خطاب ہے۔ خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا دوسرے اور خطاب کا عموم تب ہی درست ہے جب کہ حضور علیہ السلام سب کے پیغمبر ہوں۔ حدیث شریف میں ہے۔ بُعِثْتُ اِلَى الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ میں ہر سیاہ و سرخ کی طرف بھیجا گیا۔ جیسے چراغ' لالٹین' بجلی وغیرہ کی روشنیاں زمان و مکان سے محدود ہیں مگر سورج کی روشنی نہ جگہ سے محدود ہے نہ وقت سے یوں ہی دوسرے نبیوں کا نور ہدایت وقت جگہ سے محدود تھا۔ حضور انور ﷺ کا نور ہدایت نہ جگہ کا پابند ہے نہ وقت کا ہمیشہ آپ کا وقت ہے' ہر جگہ آپ کی سلطنت' آپ کی نبوت اصل مقصود ہے۔ دوسرے حضور ﷺ کے طفیل' حضور کا دین دائمی جنتری ہے جو ہمیشہ کام دے۔ دوسرے دین وقت خاص کی جنتریاں تھے۔ جو بعد میں بیکار ہو گئے۔ **ساتواں فائدہ:** ہدایت حضور ﷺ کی اطاعت میں منحصر ہے۔ آپ ﷺ کی غلامی کیے بغیر کوئی رب تک پہنچ سکتا ہی نہیں۔ جیسا وَمَنِ اتَّبَعَنِ۔ سے معلوم ہوا۔ نیز فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا۔ نے بھی یہ ہی بتایا کہ اگر یہ لوگ آپ کی اتباع کر کے مسلمان ہو جائیں تو ہدایت پائیں گے۔ **آٹھواں فائدہ:** تبلیغ [illegible] کریں۔ لوگوں کے عناد کی وجہ سے تبلیغ نہیں

گرچہ تیر از کماں ہے گزرد   از کماں دار بیند اہل خرد

حق یہ ہے کہ ایمان اللہ تعالیٰ کی مدد سے ملتا ہے، اور کفر وطغیان اس کے چھوڑ دینے سے ہمارے گلے پڑتے ہیں، صوفیاء کے نزدیک توکل کی تین (۳) علامتیں ہیں، ایک یہ کہ بندہ خدا کے غیر کو اپنا مددگار نہ جانے، دوسرے یہ کہ بندہ خدا کے سوا کسی کو اپنے رزق کا مالک نہ سمجھے، تیسرے یہ کہ خدا کے سوا کسی کو اپنے علم وعمل کا مقصود نہ جانے، ایسا توکل بے حساب وکتاب جنتی ہونے کا ذریعہ ہے، توکل دو قسم کا ہے، عقلی اور عشقی، عقلی توکل اسباب جمع کرنا، اور اسباب میں مسبب اسباب کو دیکھنا ہے، اور عشقی توکل اسباب کی آڑ کو پھاڑ کر یار تک پہنچنے کا نام ہے، اللہ تعالیٰ سچے توکل کی توفیق بخشے، فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ میری امت میں سے ستر ہزار مسلمان بے حساب جنت میں جائیں گے، عرض کیا گیا، حضور وہ کون ہیں؟ فرمایا جو ناجائز منتر ٹوٹکے نہیں کرتے، فال کے لئے پرندے نہیں اڑاتے، اور اپنے رب پر ہی توکل کرتے ہیں، حضرت عکاشہ نے عرض کیا، حضور دعا فرما دیں کہ میں بھی ان میں سے ہوں، فرمایا تم ان میں سے ہو، دوسرے شخص نے عرض کیا، حضور دعا فرمائیں، میں بھی ان سے ہوں، فرمایا عکاشہ پہل کر گئے، اور فرمایا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ پر پورا توکل کرو، تو تمہیں چڑیوں کی طرح روزی ملے، کہ وہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں، شام کو سیر ہو کر واپس ہوتے ہیں، غرضکہ توکل اللہ کی بڑی نعمت ہے،

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ
اور نہیں ہے ممکن کسی پیغمبر کے لئے یہ کہ خیانت کرے اور جو خیانت کرے وہ
اور کسی نبی پر گمان نہیں ہو سکتا کہ کچھ چھپا رکھے اور جو چھپا رکھے
يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى
لائے گا وہ مال جو خیانت کیا قیامت کے دن پھر پورا دیا جائے گا
وہ قیامت کے دن اپنی چھپائی چیز لے کر آئے گا پھر
كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾
ہر نفس کو وہ جو کمایا اس نے اور وہ نہ ظلم کئے جائیں گے
ہر جان کو ان کی کمائی بھرپور دی جائے گی اور ان پر ظلم نہ ہوگا

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جہاد پر رغبت دی، اب جہاد کے کچھ احکام بیان ہو رہے ہیں، یعنی غنیمت میں خیانت نہ کرنا، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیات میں مسلمانوں کو توکل کا حکم دیا گیا، اب خیانت سے روکا جا رہا ہے، کہ خیانت کرنے والا متوکل کبھی نہیں ہو سکتا، غرضکہ توکل کی

تفسیر صوفیانہ

اطاعت وعبادت کی اصل عشق ہے۔ عشق سے ہر مشکل حل ہوتی ہے اور عشق رہبر کامل ہے۔ عاشق طریقہ نیاز مندی خود بخود سیکھ جاتا ہے۔ جب دل میں عشق ہوگا تو ہر ظاہری عضو سے محبوب کی اطاعت صادر ہوگی۔ یہ ہی اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ کے معنی ہیں۔ نیز روح کا مقام قلب اور نفس کا مقام پیشانی ہے۔ نفس امارہ سرکش ہے جس نے پیشانی جھکا دی۔ اس نے اپنے کو دوسرے کے سپرد کر دیا۔ اسی لئے جانور پیشانی جھکا کر اظہار اطاعت کرتے ہیں اور مقابلہ کے وقت سر اونچا رکھتے ہیں۔ لہٰذا سرخم کرنا' پیشانی زمین پر رکھ دینا' کسی کے سامنے منہ جھکانا یہ اصل اطاعت ہے۔ اسلمت وجہی کے یہ ہی معنی ہیں۔ نیز عام انسان میں بہیمیت غالب ہے اور انبیائے کرام میں ملکی طاقت زیادہ انسان کی بہیمیت نبی کی ملکیت سے ہی دبتی ہے۔ بہیمیت میں سرکشی ہے۔ ملکیت میں اطاعت۔ لہٰذا ہر شخص کو نبی کی اطاعت ضروری ہے۔ ورنہ اس کی بہیمیت اسے تباہ کر دے گی۔ اسی لئے ارشاد ہوا کہ وَمَنِ اتَّبَعَنِ۔ اور اسی لئے کفار سے فرمایا گیا کہ بولو کیا تم بھی میرے پیروکاروں کی طرح میری اتباع کر کے ایمان لاتے ہو اگر میری اطاعت سے منہ موڑو گے تو تمہارا نفس تمہیں ہلاک کر دے گا۔ نفس بکری ہے۔ شیطان گویا خونخوار درندہ۔ شریعت رسی ہے' طریقت گویا میخ اور پیغمبر علیہ السلام گویا رکھوالے اور اسلام حفاظتی حصار کی مضبوط دیوار جس سے درندہ گلے میں نہ آسکے گا۔ علماء وصوفیاء گویا مالک گلہ کے نوکر چاکر جو گلہ کی حفاظت پر مامور ہیں۔ اگر نفس کے گلے میں شریعت کی رسی ہو اور وہ طریقت پر قائم رہے' اسلام کے حصار میں رہے' علماء صوفیاء کی حفاظت میں رہے' ان کی شاگردی و بیعت کرے تو ایمان درندۂ نفس امارہ۔ شیطان کے برے ساتھیوں سے محفوظ رہے گا۔ جانور کی حفاظت کے لئے یہ چار چیزیں ضروری ہیں۔ حصار' رسی' میخ' مالک کی نگرانی اور رکھوالے کو اس کی غذا و حفاظت کی فکر رہے گی اگر سرکشی کرے گا تو رکھوالے کو اس کی فکر بھی نہ ہوگی۔ جس سے وہ یقیناً ہلاک ہو جائے گا۔ اسی لئے ارشاد ہوا وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ ۢ بِالْعِبَادِ۔ اللہ تعالیٰ پابند شریعت اور بے قید بندوں کو دیکھتا ہے' بے قیدوں کو سزا اور پابندوں کو نجات دے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ
تحقیق وہ جو انکار کرتے ہیں ساتھ نشانیوں اللہ کی اور قتل کرتے ہیں نبیوں کو بغیر حق کے اور قتل کرتے ہیں
جو اللہ کی آیتوں سے منکر ہوتے ہیں اور پیغمبروں کو قتل کرتے ہیں ناحق شہید کرتے ہیں اور
الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢١﴾ اُولٰٓئِكَ
ان لوگوں کو جو حکم کرتے ہیں ساتھ انصاف کے لوگوں میں سے پس خوشخبری دو انہیں عذاب دردناک کی یہ لوگ
انصاف کا حکم کرنے والوں کو قتل کرتے ہیں انہیں خوشخبری دردناک عذاب کی یہ وہ
الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٢﴾
وہ لوگ ہیں کہ ضبط ہوئے اعمال ان کے بیچ دنیا اور آخرت کے اور نہیں ہے واسطے ان کے کوئی مددگار

لیں، جیسے رب تعالیٰ فرماتا ہے مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا (نمل: ۶۰) یا فرماتا ہے مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ (یوسف: ۳۸) یا فرماتا ہے مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ (یوسف: ۷۶) یا فرماتا ہے مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (آل عمران: ۱۴۵) ان سب میں ممکن ہی پوشیدہ ہے، ایسے ہی یہاں بھی، نبی کی تنکیر سے معلوم ہوا کہ نبی کبھی خیانت نہیں کر سکتے، وہ حضرات معصوم ہیں، اَنْ یَّغُلَّ غلول سے بنا، جس کا مادہ غلٌّ ہے، بمعنی چھپا کر لے لینا، اس لئے چوری کو بھی غلول کہہ دیتے ہیں، درخت کی جڑ میں پانی جذب ہونے کو غل کہتے ہیں، دل کی عداوت کو غل کہا جاتا ہے کہ دل میں چھپی ہوتی ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (حجر: ۴۷) گرمی کو اور سخت پیاس کو غلیل کہا جاتا ہے، نیچے کے کپڑے کو جو جسم سے متصل ہو غلالہ کہتے ہیں، کہ یہ سب چیزیں چھپی ہوتی ہیں، اب اصطلاح میں غنیمت میں خیانت کرنے کو غلول کہتے ہیں کہ وہ بھی خفیہ ہی کی جاتی ہے (معانی وغیرہ) بعض کا خیال ہے کہ یہاں مطلقاً خیانت مراد ہے نہ کہ غنیمت میں خیانت، کیونکہ اسلام سے پہلے کسی نبی کے دین میں غنیمت تقسیم نہ ہوتی تھی بلکہ غنیمت کا مال پہاڑ پر رکھ دیا جاتا تھا، جسے غیبی آگ جلا جاتی تھی، جب ان دینوں میں تقسیم غنیمت کا رواج ہی نہ تھا، تو وہاں اس میں خیانت کرنے نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، مگر صحیح تر یہی ہے، کہ یہاں غلول سے غنیمت ہی میں خیانت مراد ہے، جیسا کہ شانِ نزول کی روایات سے معلوم ہوتا ہے، اگرچہ پچھلے دینوں میں تقسیم غنیمت نہ تھی، مگر غنیمت کے مال آتے تو تھے، جمع تو کیے جاتے تھے، بعض دفعہ ان میں کچھ لوگ خیانتیں بھی کر لیتے تھے، جو بعد میں وصول کی جاتی تھیں، لہٰذا آیت بالکل درست ہے، اور رب تعالیٰ کا تمام نبیوں کی یہ صفائی بیان فرمانا بالکل برحق ہے، خیال رہے کہ ہماری قرأت یَغُلَّ ی کے فتح اور غ کے پیش سے ہے نصر کا مضارع معروف، مگر بعض قرأتوں میں یُغَلَّ ی کے پیش اور غ کے فتح سے باب نصر یا باب افعال کا مضارع مجہول، اس صورت میں اس لفظ کے تین معنی ہوں گے، ۱۔ کسی نبی کے متعلق یہ جائز نہیں کہ انہیں خیانت سے متہم کیا جائے۔ ۲۔ یا نا ممکن ہے کہ کوئی نبی خائن پائے جائیں، ۳۔ کسی نبی کے متعلق یہ جائز نہیں کہ ان کی غنیمتوں میں خیانت کی جائے، یعنی تا قیامت جہاد کی غنیمتیں نبی کے زیرِ تصرف ہیں ان میں خیانت کرنے والا نبی کا مجرم ہوگا (تفسیر کبیر و روح المعانی وغیرہ) اور نبی کا مجرم سخت سزا کا مستحق وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ نیا ہے اور واؤ ابتدائیہ اور ہو سکتا ہے کہ واؤ حالیہ ہو، اور یہ جملہ گذشتہ کا حال یعنی یہ نہیں ہو سکتا، کہ کوئی نبی خیانت کرے حالانکہ خیانت اتنا بڑا جرم ہے جس کی سزا یہ ہے، ظاہر یہ ہے کہ مَا غَلَّ سے مراد خیانت کیا ہوا سارا مال ہے جو بہت زیادہ اور وزنی ہو کر خائن کی گردن پر رکھا جائے گا جس سے وہ رسوا بھی ہوگا اور بوجھ میں دب کر پریشان بھی، اور ہو سکتا ہے کہ مَا غَلَّ میں ما مصدریہ ہو، اور مَا غَلَّ سے مراد اس کا خیانت کرنا کیونکہ قیامت میں سارے اعمال کی شکلیں بھی ہوں گی، اور جسامت بھی، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے، یوم قیامت سے مراد مخلوق کی قبروں سے اٹھ کر بعد فیصلہ جنت و دوزخ میں پہنچنے تک کا وقت ہے، یعنی پچاس ہزار سال کا زمانہ یعنی جو کوئی بھی خیانت کرے گا، وہ قیامت کے دن خیانت کا سارا مال گردن پر لاد کر لائے گا، یا اس کا جرم خیانت اس کی گردن پر سوار ہوگا، یہ تو قیامت کا حال ہے، اس کے بعد جو رب کا فیصلہ ہو، ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ حق یہ ہے کہ ثُمَّ اپنے ہی معنی میں ہے،

ﷺ ہوں۔ چونکہ ایک پیغمبر کا قتل سب کا قتل ہے۔ اس لئے جمع فرمایا گیا۔ حق باطل کا مقابل ہے۔ ہر قسم کے حق کی نفی کے لئے نکرہ اشارہ ہوا یعنی کفر کے ساتھ گذشتہ پیغمبروں کو بھی ناحق قتل کرتے ہیں یعنی ان کے قتل سے راضی ہیں۔ یا حضور ﷺ کو شہید کرنا چاہتے ہیں مگر موقعہ نہیں پاتے (معانی و کبیر وغیرہ) وَ یَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ۔ یہ کفار کا تیسرا عیب ہے اور یقتلون پر معطوف' اس کا فاعل وہ ہی کفار ہیں اور الَّذِیْنَ سے مراد مومنین ہیں نہ کہ انبیاء کیونکہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا۔ یَاْمُرُوْنَ امرٌ سے بنا بمعنی حکم یا مشورہ۔ اس کا فاعل الَّذِیْنَ ہے۔ قسط کی لفظی تحقیق ہم پہلے کر چکے اس کے معنی ہیں انصاف۔ یہاں قتل انبیاء سے باز آنا اوران کی اطاعت کرنا مراد ہے۔ مِنَ النَّاسِ الَّذِیْنَ کا بیان' یعنی یہ اہل کتاب انبیاء کرام کو شہید کرنے پر ہی باز نہ رہے بلکہ جو مسلمان انہیں اس حرکت سے روکے اور اچھی بات کا حکم دے۔ اس کو بھی قتل کر ڈالتے ہیں۔ یا یہ کہ موجودہ اہل کتاب جنگوں میں مسلمانوں کو شہید کرتے ہیں یا یہ کہو کہ یہود مدینہ صحابہ کرام کو قتل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس صورت میں قسط سے مراد ایمان اور احکام شرعیہ ہوں گے۔ یہاں تک ان کے عیوب کا ذکر تھا۔ اب جزاء کا ذکر ہے۔ فرمایا جارہا ہے۔ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ یہ جملہ ان کی خبر ہے چونکہ الَّذِیْنَ میں شرط کے معنٰی تھے۔ اس لئے یہاں ف جزائیہ لائی گئی۔ اِنَّ ف کو جب منع کرتا ہے جب جملے کے معنٰی بدل دے۔ چونکہ یہاں اِنَّ نے پچھلے جملے کے معنی بالکل نہ بدلے۔ لہٰذا خبر پر ف آ گئی (روح المعانی) بَشِّرْ بشارت سے بنا بمعنی خوشخبری ڈرانے کو بشارت کہنا ان کی اہانت کے لئے ہے' لَھُمْ سے مراد وہ ہی کفار ہیں۔ عذاب کے معنی بارہا بیان ہو چکے۔ اَلِیْمٍ الم سے بنا بمعنی رنج وغم۔ یہاں بمعنی مولم ہے یعنی تکلیف دہ دردناک یعنی اے نبی ﷺ آپ ایسے مجرموں کو دردناک عذاب کی خبر دے دو۔ اگرچہ دوزخی مسلمانوں کو بھی وہاں تکلیف تو ہوگی مگر کفار کو دوزخ میں تین تکلیفیں ہوں گی۔ جس سے مسلمان محفوظ ہوں گے۔ دوزخ میں آپس کے لعن طعن' مار پیٹ کفار میں ہوں گے۔ مومنوں میں نہ ہوں گے۔ مومن گنہگار کے عذاب کی کسی کو خبر نہ ہوگی۔ دوسرا یہ کہ مومن کو دوزخ سے نکل جانے کی امید ہوگی۔ اپیل' سفارش وغیرہ کی ہر وقت آس لگی ہوگی۔ کفار کو یہ آس نہ ہوگی۔ یاس ہو گی یہ یاس سخت تکلیف کا باعث ہوگی۔ تیسرا مومن کے دل و دماغ اعضاء باطنی اور سجدے کے ساتھ اعضاء کو آگ نہ جلائے گی۔ یہ محفوظ رہیں گے مگر کافر کے دل و دماغ کو بھی آگ جلادے گی۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ۔ (الھمزہ: ۷) ان وجوہ سے ارشاد ہوا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ کافر کا عذاب عذاب بھی ہے الیم بھی۔ ایک سزا تو یہ ہوئی' دوسری سزا یہ ہے کہ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ۔ (آل عمران: ۲۲) بعض کے نزدیک یہ جملہ اِنَّ کی خبر ہے اور فَبَشِّرْهُمْ الخ جملہ معترضہ تھا کیونکہ اِنَّ کے نزدیک ان کی خبر میں ف آ سکتی ہی نہیں۔ یہ ایسے ہے جیسے کوئی کہے زیدٌ فَافْھَمْ رجل عالمٌ شاعر کہتا ہے ۔

فَاعْلَمْ فَعِلْمَ الْمَرْءِ یَنْفَعُهٗ　　اِنَّ سَوْفَ یَاْتِیْ کُلُّ مَا قَدَرَ

لیکن عام علماء کے نزدیک یہ نیا جملہ ہے۔ اُولٰٓىِٕكَ مبتدا اور الَّذِیْنَ خبر۔ اُولٰٓىِٕكَ سے وہ کفار مراد ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا۔ حَبِطَتْ' حبوط سے بنا بمعنی ضبطی یا بربادی۔ اس کی تحقیق پہلے کی جا چکی ہے۔ اعمال سے یا تو ان کی وہ نیکیاں مراد ہیں جو ارتداد سے پہلے کی تھیں [illegible] اعمال مراد ہیں جو ایمان پر موقوف نہ ہوں۔ جیسے صدقہ اور صلہ رحمی وغیرہ فِی الدُّنْیَا

لوگ جب انہیں تہمت لگائیں، تو رب تعالیٰ ان کی صفائی دے، اور ان کے الزاموں کو اٹھائے۔

لطیفہ: قرآن کریم میں اکثر جگہ رب تعالیٰ کے اعتراضوں کو نبی کی معرفت دفع کیا گیا ہے، کہ جب لوگوں نے الوہیت پر اعتراض کیئے، تو قُلْ فرما کر حضور انور ﷺ سے جواب دلوائے گئے، جیسے قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ (زخرف:۸۱) یا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (اخلاص:۱) وغیرہ، اور نبی کے اعتراضوں کو بغیر قُلْ فرمائے خود رب تعالیٰ نے دفع فرمایا ہے، جیسے تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ الخ (لہب:۱) اور جیسے وَمَا كَانَ لِنَبِیٍّ الخ اس سے اندازہ کرو، کہ حضراتِ انبیاء کا بارگاہِ الٰہی میں کیا درجہ ہے، **دوسرا فائدہ:** حضرات انبیاء خصوصاً نبی کریم ﷺ کو عیب لگانا، ان میں نقص ڈھونڈنا سنت کفار و منافقین ہے، اور ان کی تعریفیں کرنا، ان پر سے اعتراضات کو اٹھانا سنتِ رب العالمین ہے، اللہ تعالیٰ سنتِ الٰہیہ پر عمل کی توفیق بخشے، **تیسرا فائدہ:** حضرات انبیاء گناہ کر سکتے ہی نہیں، خصوصاً وہ گناہ جو گھناؤنے بھی ہوں، جیسے چوری اور خیانت وغیرہ جیسا کہ مَا كَانَ لِنَبِیٍّ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا، ان حضرات کا گنہگار ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے خدا تعالیٰ کا شریک، **چوتھا فائدہ:** نبی کریم ﷺ کو اس قسم کی تہمت لگانا اسلامیت ہی نہیں، بلکہ انسانیت سے گری ہوئی بات ہے، جیسا کہ مَا كَانَ لِنَبِیٍّ کی دوسری تفاسیر سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** علماء و مشائخ کو لوگوں کے الزام و اتہام پر ناراض نہ ہونا چاہیے، جب لوگوں نے اللہ رسول کو الزام لگادیئے، تو ہم کس شمار میں ہیں، کسی شاعر نے کیا خوب کہا، شعر

مَا نَجَی اللّٰهُ وَالرَّسُوْلُ مَعًا مِنْ لِسَانِ الْوَرٰی فَكَیْفَ اَنَا

قِیْلَ اِنَّ الْاِلٰهَ ذُوْوَلَدٍ قِیْلَ اِنَّ الرَّسُوْلَ قَدْ كَهَنَ

یعنی جب اللہ رسول مخلوق کی زبان سے نہ بچے، تو میں کون ہوں، دیکھو لوگوں نے کہا خدا کے بال بچے ہیں، اور کہا گیا کہ نبی جادوگر تھے، اپنے کو لوگوں کے طعن سے بچانے کی کوشش کی جائے، ایسی حرکت نہ کی جائے جس سے کسی کو انگلی اٹھانے کا موقعہ ملے لیکن اگر پھر بھی لوگ الزام لگائیں تو پرواہ نہ کرو، **چھٹا فائدہ:** غلول یعنی خیانت بدترین جرم ہے، جس کی سزا بہت سخت ہے، جیسا کہ وَمَنْ یَّغْلُلْ الخ سے معلوم ہوا، چنانچہ مسلم بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی، کہ فرمایا نبی کریم ﷺ نے ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن تم میں سے کوئی اپنی گردن پر اونٹ لادے ہو جو آواز کر رہا ہو، یا اس کی گردن پر گھوڑا ہو، ہنہناتا ہوا، یا اس کی گردن پر بکریاں ہوں جو آواز کرتی ہوں، یا اس کی گردن پر کپڑے کے تھان لدے ہوں جو چر مر کرتے ہوں، اور مجھے کہے اَغِثْنِیْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ تو ہم فرمائیں، اب ہم تمہاری کسی چیز کے مالک نہیں، اب ہم تم سے عذاب الٰہی دفع نہیں کر سکتے نیز انہی بخاری و مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی، کہ حضور انور ﷺ کے غلام رفاعہ ابن زید ایک جنگ میں حضور انور ﷺ کے ساتھ تھے، ایک منزل پر اونٹ کس رہے تھے، کہ غائبانہ تیر لگا، شہید ہو گئے، ہم لوگوں نے کہا مبارک ہو رفاعہ تو سیدھے جنت میں گئے، حضور انور ﷺ نے فرمایا نہیں، کیونکہ انہوں نے خیبر کے دن ایک چادر مال غنیمت سے بغیر تقسیم کیئے ہوئے لے لی تھی وہ چادر ان پر آگ کا کام دے رہی ہے، یہ سن کر لوگ گھبرا گئے، ایک صاحب ایک دو تسمہ حاضر لائے، عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ میں نے خیبر کی غنیمت سے لے لیا تھا، فرمایا کہ یہ تسمہ بھی آگ

نے ایک دن صبح کے وقت تینتالیس پیغمبروں کو قتل کیا۔ جس پر ایک سو ستر مسلمانوں نے انہیں اس سے منع کیا اور توبہ وغیرہ کا حکم دیا تو ان سب کو بھی اسی دن شام کو قتل کر دیا۔ اس آیت میں انہی کا ذکر ہے۔ (خازن ومعانی وغیرہ)

نوٹ: بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ تین سزائیں تین عیوب کی ہیں کفر کی سزا عذاب قتل انبیاء کی سزا ضبطی اعمال اور قتل مومنین کی سزا مددگاروں کا نہ ہونا مگر یہ صحیح نہیں حق یہ ہے کہ یہ سب سزائیں کفر کی ہیں اور یہ جرم بھی کفر ہی کے اقسام ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** انکار نبی گناہوں کی جڑ ہے۔ دیکھو اس آیت میں کفر آیات یعنی انکار نبوت کے بعد سارے گناہوں کا ذکر ہوا۔ جس سے اشارۃً معلوم ہوا کہ جڑ کفر ہے اور سب جرم اس کی شاخیں۔

دوسرا فائدہ: عالم دین نائب رسول ہیں۔ ان کی توہین نبی کی توہین ہے۔ دیکھو قتلِ انبیاء کے ساتھ قتلِ علماء کا ذکر کیا گیا۔ اور دونوں پر یکساں عذاب مرتب کیا' دوسرے مقام پر رب تعالیٰ نے انبیاء' فرشتوں' علماء کو اپنی توحید کا گواہ قرار دیا کہ فرمایا شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ۔ (آل عمران:۱۸) تیسرے مقام پر رب تعالیٰ نے حضور ﷺ کی نبوت کی دلیل یہ دی کہ اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ۔ (شعراء:۱۹۷) انہیں اسرائیل کے علما جانتے پہچانتے ہیں۔ ان وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء کا بڑا درجہ ہے۔ **تیسرا فائدہ:** خوف قتل پر بھی تبلیغ کی جائے۔ اگر مبلغ عالم قتل ہوا تو ثواب پائے گا۔ دیکھو رب تعالیٰ نے ان علماء کی تعریف فرمائی جو ان خونخوار یہود کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ جنہوں نے ان انبیاء کو قتل کیا تھا۔ ان علماء کو ضرور اس وقت اپنی جان کا خطرہ تھا مگر اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وعظ ونصیحت سے باز نہ رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے سچی بات کہنا بڑا جہاد ہے۔ دوسری روایت ہے کہ سید الشہداء حمزہ ابن عبد المطلب ہیں۔ اور وہ شخص جو ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہہ کر مارا جائے۔ عمرو ابن عبیدہ فرماتے ہیں کہ سب سے بڑی نیکی تبلیغ پر قتل ہونا ہے۔ (احکام القرآن) شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا۔

ہر چہ میدانی از نصیحت و پند   گرچہ دانی کہ نشنوند بگو

چوتھا فائدہ: مرتد کی نیکیاں باطل ہو جاتی ہیں جیسا کہ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پہلے مومن تھے پھر عداوت انبیاء سے کافر ہوئے جس سے زمانہ ایمان کی نیکیاں برباد ہو گئیں۔

مسئلہ: مرتد کی نیکیاں تو باطل ہو جاتی ہیں مگر گناہ باقی رہتے ہیں۔ اس لئے جو کوئی مرتد ہو کر مسلمان ہو تو اسے زمانہ اسلام کی نماز' روزہ قضا کرنے ہوں گے کیونکہ قضائے نماز گناہ ہے اور گناہ ارتداد سے معاف نہیں ہوتا (درمختار باب المرتد)

مسئلہ: جو کوئی حج کے بعد مرتد ہو جائے اور پھر ایمان لائے تو اسے حج دوبارہ کرنا ہوگا مگر پڑھی ہوئی نمازیں نہ لوٹائے گا (درمختار) **مسئلہ:** اس میں اختلاف ہے کہ توبہ کے بعد مرتد کی نیکیاں لوٹ آتی ہیں یا نہیں۔ حق یہ ہے کہ گذشتہ ثواب تو نہیں لوٹتا مگر اصل عمل لوٹ آتے ہیں اور آئندہ وہ ثواب کا باعث بنتے ہیں۔ جیسے جو درخت جل کر ہرا بھرا ہو تو اس کے گذشتہ پھل نہیں لوٹتے مگر چونکہ جڑ باقی تھی لہٰذا آئندہ پھل پیدا ہوتے ہیں۔ (شامی)

پانچواں فائدہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام کی جناب میں بے ادبی کفر ہے دیکھو قتل انبیاء کو جو توہین

پیدائش کا ذکر تو ہے مگر دوسروں کی پیدائش کی نفی نہیں، چونکہ اصل مقصود انسان کی پیدائش تھی، باقی اس کے تابع، اس لئے ان کا ذکر نہ ہوا، دوسرے یہ کہ یہاں خیانت کے عمل کا بوجھ اٹھانا مراد ہے نہ کہ مال کا اٹھانا جیسے آج قرض، خون ایک بوجھ ہوتا ہے، ایسے ہی کل خیانت ایک بوجھ ہوگی، تیسرے یہ کہ یہ وصف ایک تمثیل ہے، جیسے رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر عمل ذرہ برابر ہو، پھر وہ پتھر کی چٹان یا آسمان میں ہو، تو یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ (لقمان:۱۶) تب بھی اللہ اسے لے آئے گا، یہاں بھی ایک مثال ہی دی گئی ہے، تفسیر کبیر نے یہ ہی جواب راجح قرار دیا، مگر فقیر کے نزدیک جواب اول قوی ہے، کسی آیت میں بلاضرورت شرعیہ تاویل نہ کرنا چاہیے، **دوسرا اعتراض:** تمہارے پیش کردہ فوائد سے معلوم ہوا، کہ قیامت میں حضور انور ﷺ خائن کی شفاعت نہ فرمائیں گے، تو مسئلہ شفاعت ختم ہوا، خیانت کی طرح اور بھی بہت سے جرم ہیں، چاہیے کہ ان کی شفاعت بھی نہ ہو، **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ یہ فرمان ڈرانے کے لئے ہے، بغیر مثال یوں سمجھو کہ ماں شریر بچے سے کہتی ہے کہ اگر تو نے میرا کہا نہ مانا، تو باپ کی مار سے نہ بچاؤں گی، تاکہ بچہ شرارت سے باز آجائے، مگر جب باپ مارتا ہے تو پھر رحم کھا کر بچا ہی لیتی ہے، ممکن ہے کہ وہاں بے کسی دیکھ کر رحم فرمائیں، فرماتے ہیں کہ میری شفاعت گناہ کبیرہ والے امتی کو پہنچے گی، شعر

دیکھی جو بے کسی تو انہیں رحم آ گیا   گھبرا کے ہو گئے وہ گنہگار کی طرف

دوسرے یہ کہ یہ وعید ان لوگوں کے لئے ہے جو خیانت حلال جان کر کریں، اب وہ کافر ہوئے، اور کافر کے لئے شفاعت نہیں، یہ ہی وعید مانعین زکوٰۃ کے لئے بھی ہے، وہاں بھی منکرین زکوٰۃ مراد ہیں، نہ کہ تارکین زکوٰۃ، **تیسرا اعتراض:** تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ سے معلوم ہوا، کہ ہر نفس کو پورا بدلہ دیا جائے گا، تو نہ معافی کوئی چیز رہی نہ شفاعت، **جواب:** اس کے چند ایک جواب ہیں، ایک یہ کہ یہاں قانون کا ذکر ہے، اور اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا (زمر:۵۳) میں اس کی قدرت کا تذکرہ ہے، ہمارا ایمان قانون پر بھی ہے، قدرت پر بھی، دوسرے یہ کہ تُوَفّٰى کے معنی یہ ہیں، کہ گناہوں کی سزا میں زیادتی نہ ہوگی اور نیکیوں ہی جزاء میں کمی نہ کی جائے گی، رہا گناہ معاف فرمادینا، نیکیوں کا بدلہ زیادہ دے دینا، یہ کرم ہے، غرضکہ یہاں عدل کا ذکر ہے عدل فضل کے خلاف نہیں، تیسرے یہ کہ یہ پورا دینا ظلم کے مقابل ہے، اس لئے فرمایا گیا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ، اگر رب تعالیٰ کسی کی نیکیاں ساری برباد فرمادے، تو ظلم نہیں اور اگر کسی کو بلا جرم سخت سزا دے، تب بھی ظلم نہیں، ظلم کے معنی ہیں دوسرے کی ملک میں بلا اجازت عمل درآمد کرنا سب اللہ کے بندے ہیں اسی کی ملکیت ہیں، وہ اپنے بندوں سے جو معاملہ فرمادے عین عدل یا فضل ہے، ظلم کیسا؟ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر نفس کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا، تو کیا نابالغ بچوں کے اعمال کی بھی سزا جزاء ہے؟ نفس تو وہ بھی ہیں، **جواب:** یہاں نفس سے مراد مکلف بندہ ہے جس پر شرعی احکام جاری ہوں، اسی لئے آگے ارشاد ہوا مَّا كَسَبَتْ اس کے کسب کا بدلہ دیا جائے گا، ناسمجھ بچے کے عمل کسب میں داخل نہیں، ان کا صدور ہوتا ہے کسب میں عقل، ارادہ سب معتبر ہے، صدور بے عقلی بے ارادہ افعال پر بولا جاتا ہے، اسی لئے یہاں كَسَبَتْ ارشاد ہوا، نہ کہ صَدَرَتْ بالغ کے بے اختیاری اعمال کی بھی سزا نہیں، **پانچواں اعتراض:** اس

نیکیاں تھیں کہاں کافر کا کوئی فعل نیکی ہی نہیں پھر ضبطی کس کی ہوئی۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گذر گیا کہ یا تو یہ مرتدین تھے۔ ان کے زمانہ ایمان کی نیکیاں برباد ہوئیں۔ یا نیکیوں سے وہ عمل مراد ہیں جن میں ایمان شرط نہیں۔ جیسے صلہ رحمی' سچ بولنا' عدل وانصاف وغیرہ۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ضبطی اعمال ہر کافر کے لئے نہیں بلکہ اس کے لئے ہے جو کفر کے ساتھ قتل انبیاء وعلماء بھی کرے کیونکہ یہاں تین جرموں کے بعد اس کا ذکر ہوا۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ یہ کفر کی سزا ہے اور کفر کی بہت سی نوعیتیں ہیں۔ انکار آیات کفر' قتل انبیاء کفر' قتل علما کفر' اور امر مشترک کی یہ سزا۔ دوسرا یہ کہ بیشک دنیا اور آخرت میں عمل کی بربادی انہی کے ساتھ خاص ہے۔ دوسرے کافر اپنے اعمال کا بدلہ دنیا میں کچھ نہ کچھ پالیتے ہیں۔ تیسرا یہ کہ آخرت میں اعمال کی بالکل بربادی توہین والے کافر کے لئے خاص ہے۔ ورنہ انبیاء سے محبت رکھنے والے کفار اپنی نیکیوں کا کچھ نتیجہ پالیں گے کہ ان کا عذاب ہلکا ہو جائے گا۔ جیسے ابو طالب' ابولہب' حاتم طائی وغیرہ۔ چوتھا یہ کہ اُولٰٓئِکَ سے اشارہ ہر ایک کی طرف ہے نہ کہ مجموعہ کی جانب' یعنی یہ کافر یہ قاتل انبیاء' قاتل علماء سب کے اعمال ضبط۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ بعض انبیاء کرام یہود کے ہاتھوں شہید ہوئے مگر دوسری جگہ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا۔ (مؤمن: ۵۱) ہم اپنے رسولوں کی مدد کریں گے تو رب نے ان رسولوں کی مدد کیوں نہ کی جو شہید ہوئے؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں' ایک یہ کہ نصرت الٰہی کا وعدہ جہاد کے لئے ہے کہ جہاد میں کوئی نبی کسی کافر کے ہاتھ شہید نہ ہوگا اور واقعی کوئی نبی جہاد میں شہید نہ ہوا۔ دوسرا یہ کہ شہادت یا موت مدد کے خلاف نہیں۔ جس مقصد کے لئے نبی تشریف لاتے ہیں اس میں کامیابی رب تعالیٰ کی مدد سے ہوتی ہے۔ اگر نبی شہید بھی ہو جائیں مگر دین کو مکمل کر جائیں تو وہ غالب ہیں کربلا میں امام حسین رضی اللہ عنہ جیتے یزید پلید ہارا کہ اس کا مقصد جنگ حاصل نہ ہوا۔

تفسیر صوفیانہ

عدل وانصاف توحید وایمان کا سایہ ہے۔ جس کا ایمان ناقص اس سے انصاف ناممکن۔ نیز کفار یار سے پردہ میں ہیں۔ اپنے بڑوں کی پیروی اور رسم ورواج کی پابندی ان کا حجاب ہے۔ حضرات انبیاء اس حجاب کے پھاڑنے والے تھے۔ چونکہ ان کا حجاب مضبوط اور ظلمت کفر گہری تھی۔ اس لئے ان تک نورِ نبوت نہ پہنچا۔ جس سے انہوں نے انبیائے کرام وعلماء کو قتل کر دیا۔ نیز روح کا مشغلہ شوق وعشق ہے اور اس کی حرکت پستی سے بلندی کی طرف ہے۔ نفس کا مشغلہ نافرمانی اور مشغولیت دنیا ہے۔ اور اس کی حرکت پستی کی جانب انبیائے کرام روح کی امداد کرنے اور نفس کو دبانے کے لئے تشریف لائے مگر ان کفار کے نفوس ان کی روحانیت پر غالب آئے۔ جس سے انہوں نے اپنے خیر خواہوں کو قتل کیا۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ نفس امارہ گویا کافر ہے۔ اور اس کے گناہ گویا تلوار' قلب خیر خواہ واعظ ہے۔ اور روح اور فرشتہ گویا ہادی پیغمبر' نفس کافر نے روح کی مخالفت کر کے اس کو ایسا دبایا کہ اس کی حکومت جسم سے جاتی رہی۔ یہ گویا قتل پیغمبر ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نفس نے کبھی جو جائز کام کر لئے تھے۔ ان کا بھی فائدہ جاتا رہا اور نفس ورب کے درمیان واسطۂ روح وقلب اٹھ گیا۔ جو ذریعہ فیض تھا۔ جس سے نفس رب سے بالکل بے تعلق ہو گیا۔ خیال رہے کہ روح وقلب ظلِ الٰہی ہیں اور ظل کا انکار اصل کا انکار ہے' نیز قلب اور روح آئینہ جمال الٰہی ہیں جس کے ذریعہ وہ نورِ لم یزل نفس تک پہنچتا ہے۔ ان شیشوں کو توڑنا اس نور سے محروم رہنا ہے۔ اور روح

عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

ہیں اللہ کے نزدیک اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں

اللہ کے ہاں درجہ بدرجہ ہیں اور اللہ ان کے کام دیکھتا ہے

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ نبی خیانت نہیں کر سکتے، جس کی ایک وجہ تو وہاں ہی بیان فرمادی گئی تھی، کہ خائن خیانت کا مال قیامت میں اپنے پر لادے پھرے گا، دوسری وجہ اب بیان ہورہی ہے، کہ خائن پر رب تعالیٰ سخت ناراض ہے، اور نبی سے اللہ تعالیٰ راضی ہے، تو نبی خائن کیونکر ہو سکتے ہیں، محبوبیت کے ہوتے ناراضی کے اعمال صادر ہو سکتے ہی نہیں، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اجمالاً فرمایا گیا تھا کہ ہر نفس کو اس کی کمائی ملے گی، اب اس کی تفصیل بیان ہورہی ہے، کہ خائنین اور رب تعالیٰ کو ناراض کرنے والوں پر غضب کی آگ ہوگی، اور نیک کاروں کو درجات عطا ہوں گے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں قانون الٰہی کا ذکر ہوا، کہ ہر نفس کو اس کے اعمال کا بدلہ ملے گا، اب اس آیت میں اس کی قدرت کا ذکر ہے، کہ نیک کاروں کو علاوہ جزاء کے درجات کی عطاء بھی ہوگی، گویا پہلے عدل کا ذکر تھا، اب فضل کا تذکرہ ہے، **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ بندوں پر ظلم نہ کیا جائے گا، اب اس کا مطلب سمجھایا جارہا ہے، کہ کسی کی نیکی ضائع نہ ہوگی، وہاں درجے بڑھادیئے جائیں گے، کہ یہ رب تعالیٰ کی عطا ہے، ظلم کی نفی کے بعد کرمِ کریمانہ اور رحم خسروانہ کا اثبات ہے، گویا یہ آیت پچھلی آیت کی تفسیر ہے،

شانِ نزول

جب حضور انور ﷺ نے مدینہ منورہ سے احد کی طرف چلنے کا حکم دیا، تو مخلصین مومنین تو بے تامل روانہ ہوگئے، مگر منافقین کچھ تو روانہ ہی نہ ہوئے، اور کچھ لوگ روانہ تو ہوئے، مگر بعد میں واپس لوٹ گئے، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، ان دونوں جماعتوں کے متعلق یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، جس میں ان دونوں گروہوں کی سزا و جزاء کا ذکر ہوا (تفسیر خازن و روح المعانی)

تفسیر

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ ہمزہ استفہامیہ ہے، اور اس جملہ میں انکاری استفہام ہے، مَنْ سے مراد سارے انسان ہیں، فرشتے و جنات اس میں داخل نہیں، کیونکہ آئندہ جو جزاء مذکور ہے، وہ صرف انسانوں کے لئے ہے، اتباع کے معنی ہوتے ہیں کسی کے پیچھے پیچھے چلنا، اپنی تحقیق چھوڑ دینا، جیسے انجن کے پیچھے ریل کے ڈبے دوڑتے ہیں، کہ لائن کی نگرانی کی ذمہ داری صرف انجن والوں پر ہے، یہاں چونکہ اس کا مفعول رضوان ہے نہ کہ کوئی انسان، اس لئے یہاں اتباع سے مراد ہے حاصل کرنے کی کوشش کرنا، اور اس کی طرف چلنا، چونکہ یہ دونوں کام نبی کے پیچھے چلنے سے میسر ہوتے ہیں، اس لئے اتَّبَعَ فرمایا گیا، رِضْوَانَ بمعنی رضا و خوشنودی ر کے پیش سے بھی ہے، جیسے کفر سے کفران، اور ر کے کسرہ سے بھی جیسے حسب سے حسبان، مگر

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٥﴾

اس کے اور پورا دیا جائے گا ہر نفس وہ جو کمایا اس نے اور وہ نہ ظلم کیے جائیں گے

اور ہر جان کو اس کی کمائی پوری بھر دی جاوے گی اور ان پر ظلم نہ ہوگا

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں اہل کتاب کے عناد کی ایک نوعیت بیان کی کہ وہ انبیائے کرام کے دشمن ہیں۔ اب دوسری طرح ان کا عناد ثابت کیا جارہا ہے کہ وہ درحقیقت اپنی کتابوں کے بھی معتقد نہیں۔ اور نہ ان کے احکام پر سر جھکاتے ہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں حضور ﷺ کو ایک طرح تسلی دی گئی کہ ان کفار کی مخالفت پر آپ غمگین نہ ہوں۔ آپ کی تو زبانی مخالفت ہی کرتے ہیں۔ پچھلے پیغمبروں کو تو انہوں نے شہید بھی کر دیا۔ اب دوسری طرح حضور علیہ السلام کو تسلی دی جارہی ہے کہ ان کا عناد اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ یہ لوگ جن کتابوں کے معتقد بنتے ہیں۔ درحقیقت انہیں بھی نہیں مانتے۔ ہمیشہ ان کی مخالفت ہی کرتے ہیں۔ جب یہ اپنی مسلّم کتابوں کے معتقد نہیں تو اگر آپ کے معتقد نہ ہوں تو کیا تعجب ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اہل کتاب کے بدترین جرموں کا ذکر کیا گیا۔ اب اس کی وجہ بیان کی جارہی ہے کہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم کچھ بھی کر لیں۔ ہمیں بہت معمولی عذاب ہوگا۔ اس لئے ایسے جرموں کی ہمت کرتے ہیں۔ **چوتھا تعلق:** گزشتہ آیت میں یہود کے وہ تاریخی جرم مذکور تھے جو حضور انور ﷺ کے زمانہ میں دیکھے نہ گئے تھے۔ صرف سنے گئے تھے۔ یعنی قتل انبیاء و قتل علماء وغیرہ اب ان کے موجودہ جرم کا تذکرہ ہے۔ جو اب زمانہ نبوی میں بھی دیکھا جارہا ہے یعنی انکار توریت اور اپنے کو بہرحال جنتی ماننا خواہ کتنے ہی جرم کریں۔

شان نزول

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ایک بار حضور سید عالم ﷺ بیت المدراس (یہود کا مدرسہ) میں تشریف لے گئے۔ اور یہود کو دعوتِ اسلام دی۔ ان میں سے نعیم ابن عمرو اور حارث ابن زید نے کہا کہ اے محمد (ﷺ) آپ کس دین پر ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ دین ابراہیمی پر۔ وہ بولے کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے۔ آپ نے یہودیت کیوں اختیار نہ کی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا توریت لاؤ۔ ابھی ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ ہوجائے گا۔ وہ اس پر تیار نہ ہوئے اور منکر ہو گئے۔ تب یہ آیت کریمہ اتری۔ نیز انہی عبداللہ ابن عباس اور امام کلبی سے روایت ہے کہ خیبر کے یہود میں سے کسی مالدار یہودی نے ایک یہودن سے زنا کیا۔ توریت میں زنا کی سزا رجم تھی (پتھر مار مار کر ہلاک کر دینا) لیکن چونکہ یہ دونوں مجرم خاندانی اور مالدار تھے۔ اس لئے یہود کو ان کا سنگسار کرنا گوارا نہ ہوا۔ اس مقدمہ کو حضور علیہ السلام کی خدمت میں اس لئے لائے کہ شاید آپ سنگساری کا حکم نہ دیں۔ غالبًا انہوں نے قرآن شریف کی یہ آیت سن لی ہوگی کہ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ۔ (النور: ۲) زانی و زانیہ کو سو کوڑے مار دو اور انہیں یہ پتہ نہ لگا ہوگا کہ یہ حکم کنوارے زانی کا ہے۔ شادی شدہ کے لئے اسلام میں بھی رجم ہے۔ اس لئے حضور انور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تا

اللہ بصیر بما یعملون یہاں یعملون کا فاعل سارے نیک و بد بندے ہیں، خیال رہے کہ دیکھنا رب تعالیٰ کی ایک صفت ہے، جاننا دوسری صفت لہٰذا بصیر ایک اسم الٰہی ہے اور علیم دوسرا نام، رب تعالیٰ کا دیکھنا نہ تو ہماری طرح آنکھ وغیرہ سے ہے اور نہ چیز کے ہو جانے پر موقوف، یعنی اللہ تعالیٰ سارے کفار و مومنین کے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے، کوئی اس سے چھپا ہوا نہیں، لہٰذا سب کو بقدر اعمال سزاء جزاء ضرور ملے گی،

خلاصہ تفسیر

دنیا میں دو قسم کے بندے ہیں، ایک رب تعالیٰ کی رضاء کے متلاشی، دوسرے اسے ناراض کرنے والے، تم غور تو کرو کہ اگرچہ دونوں قسم کے لوگ رنگ و روپ، شکل و صورت میں یکساں ہیں، مگر سوچو تو کیا اللہ کی رضاء کے پیچھے چلنے والے کہ جدھر اور جس کے ساتھ انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا نظر آئے ادھر ہی چل دیں، اور اسی کے ساتھ ہو جائیں، اسی میں زندگی گذار دیں، مرتے وقت تک رب تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کریں، ایسے لوگ کیا ان بدبختوں کی طرح ہو سکتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی ناراضی، اس کا غضب لے کر شام کو اپنے گھر لوٹیں، یا مرتے وقت رب تعالیٰ کی طرف لوٹیں اور جن کا ٹھکانہ و جائے قرار دوزخ ہو، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، یہ دونوں جماعتیں یکساں نہیں ہو سکتیں، دوزخ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے، تو اس میں جانے والے بہت ہی برے ہیں، یہ جنتی لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں مختلف درجوں والے ہیں، بعض اعلیٰ، اور بعض بہت ہی اعلیٰ، یا یہ دوزخی لوگ اللہ کے ہاں مختلف درجہ والے ہیں، بعض بد، اور بعض بدتر، یا یہ دوزخی جنتی یکساں نہیں، بلکہ درجوں میں مختلف ہیں، کہ جنتی اعلیٰ، اور دوزخی ادنیٰ، پھر یکساں کیسے ہو سکتے ہیں، خیال رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی وقت کسی کے عمل سے غافل نہیں، یہ دوزخی و جنتی جو کچھ کر رہے ہیں، رب تعالیٰ برابر دیکھ رہا ہے، ہاں سزا جزاء کا ایک وقت مقرر ہے، وہ وقت آنے پر بدلہ دیا جائے گا،

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** مومن کافر کے برابر نہیں، اور متقی فاسق کی مثل نہیں، جیسا کہ یہاں استفہام انکاری سے معلوم ہوا، دوسری جگہ قرآن کریم نے اسے اور بھی واضح فرما دیا ہے، کہ فرمایا لَا يَسْتَوِىٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (حشر: ۲۰) دوزخی و جنتی برابر نہیں، بلکہ قرآن شریف تو فرماتا ہے، کہ عالم و جاہل برابر نہیں، فرماتا ہے هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (زمر: ۹) جب ایمان کی وجہ سے مومن کافر جیسا نہیں، اور علم کی برکت سے عالم جاہل کی مثل نہیں، تو نبوت کے ہوتے ہوئے نبی غیر نبی کی مثل کیونکر ہو سکتے ہیں، جو لوگ بشریت یا عبدیت کی وجہ سے نبی کو اپنے جیسا کہتے ہیں، انہیں چاہیے کہ اسی بشریت کی وجہ سے اپنے آپ کو ابوجہل جیسا کہا کریں، اور اپنے سرداروں کو ابولہب جیسا بتایا کریں، اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (کہف: ۱۱۰) ایسا ہی ہے جیسے اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ (انعام: ۳۸) کہ اس میں رب تعالیٰ نے جانوروں کو انسان کا مثل قرار دیا، اس کی پوری بحث ہماری کتاب "جاء الحق" حصہ اول میں دیکھو، **دوسرا فائدہ:** مومن اگرچہ لاچار، نادار، بیمار ہو، کافر سے افضل ہے اگرچہ کافر مالدار بلکہ بادشاہ بھی کیوں نہ ہو، جیسا کہ اَفَمَنِ میں من کے عموم سے معلوم ہوا، کسی ہندی شاعر نے کیا خوب کہا،

ایک حصہ دیا گیا۔ باقی فنا ہو چکا۔ یا ان کی نظر کتاب اللہ یا توریت وانجیل کے ظاہری معنی تک ہے۔ اُوْتُوْا فرما کر یہ بتایا گیا کہ علم کتاب محض اپنی کوشش سے نہیں ملتا یہ تو عطیہ ربانی ہے جس پر وہ کرم کردے بڑے بڑے ذہین یہاں فیل ہو جاتے ہیں اور معمولی حیثیت کے لوگ اس سمندر میں غوطے لگا کر موتی نکال لیتے ہیں۔ اکثر علماء غربا اور مساکین ہی ہوئے ہیں۔ یُدْعَوْنَ اِلٰی كِتٰبِ اللّٰهِ۔ یا تو یہ نیا جملہ ہے جو جائے تعجب کو بیان کرتا ہے۔ اور یا اَلَّذِیْنَ کا حال۔ اس کتاب اللہ سے یا قرآن کریم مراد ہے جو کہ تبدیل تحریف سے محفوظ اور فیصلہ کن کلام ہے یا توریت شریف ہی مراد ہے۔ ان کی نافرمانی ظاہر کرنے کے لئے ضمیر نہ لائی گئی بلکہ دوبارہ ذکر کیا گیا۔ یعنی وہ اہل کتاب قرآن یا توریت کے فیصلہ کی طرف بلائے جاتے ہیں۔ بلانے والے حضور ﷺ ہیں یا ان کے نائبین علماء کرام اِنَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔ اس سے اشارۃً معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کی دعوت پر نہ حاضر ہونا سخت جرم ہے۔ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ۔ یہ یُدْعَوْنَ کے متعلق ہے۔ یَحْكُمُ حکم سے بنا بمعنی فیصلہ۔ جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہو چکا۔ خیال رہے کہ چونکہ حق سے ہٹنے والے یہود ہی تھے۔ اس لئے بَیْنَهُمْ فرمایا گیا۔ نہ کہ بینکم وَبَیْنَهُمْ۔ اور ممکن ہے کہ خود یہود میں اختلاف پڑ گیا ہو۔ اس لئے بَیْنَهُمْ فرمادیا گیا۔ یَحْكُمُ کا فاعل کتاب اللہ ہے۔ یا نبی کریم ﷺ جو کہ یدعون سے معلوم ہو چکے تھے۔ بعض قرأتوں میں لِیَحْكُمَ بصیغہ مجہول بھی ہے۔ (کبیر) ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ۔ ثُمَّ ترتیب اور مہلت کے لئے آتا ہے۔ یہاں ترتیب درجہ کی مراد ہے نہ کہ زمانی کیونکہ وہ فوراً ہی توریت سے منہ موڑ گئے تھے۔ یَتَوَلّٰی کے معنی بارہا بیان ہو چکے کہ یہ تولیٌ سے بنا بمعنی منہ موڑنا اور پیٹھ پھیرنا۔ فَرِیْقٌ فرقۃ سے بنا بمعنی گروہ۔ اس سے مراد یا تو اہل کتاب کے روساء ہیں یا ان کے علماء چونکہ منہ موڑنے میں پیش قدمی ان کے سرداروں نے کی تھی۔ پھر ان کی دیکھا دیکھی سب نے کی اس لئے انہی کو اس فعل کا فاعل بنایا گیا۔ یعنی پھر جان بوجھ کر اہل کتاب کا ایک گروہ توریت کے حکم سے منہ پھیر جاتا ہے۔ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ واؤ حالیہ اور یہ جملہ فریقٌ سے حال ہے یا مِّنْهُمْ کی ضمیر سے هُمْ کا مرجع یا سارے اہل کتاب ہیں یا وہ ہی فریق علماء مُعْرِضُوْنَ سے ان کا دائمی منہ پھیرنا مراد ہے یا یَتَوَلّٰی سے منہ پھیرنا مراد تھا۔ اور مُعْرِضُوْنَ سے دلی ناراضگی مقصود یا تولی ایک گروہ نے کی تھی اور اعراض ان سب نے (روح المعانی) یا تولی اس خاص حکم سے تھی اور اعراض سارے احکام سے یعنی وہ اس حکم سے منہ پھیرتے ہیں۔ حالانکہ وہ دل سے بھی ناراض ہیں۔ یا اب اس حکم سے منہ موڑتے ہیں۔ حالانکہ وہ سارے احکام سے ہی پھرے ہوئے ہیں۔ یا بظاہر ان میں ایک گروہ اس حکم سے منہ موڑتا ہے مگر درپردہ وہ سب ہی پھرے ہوئے ہیں یا منہ پھیرنا ان کی عادت ہو چکی ہے مگر سب سے بہتر وہ معنی ہیں جو اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے کئے کہ تَوَلّٰی سے پھر جانا اور مُعْرِضُوْنَ۔ سے روگرداں ہونا مراد لیا۔ اس بنا پر علماء فرماتے ہیں کہ قرآن شریف کی طرف پیٹھ نہ کرو کہ یہ بھی اعراض ہے۔ تلاوت قرآن کے وقت ہمہ تن گوش بن کر اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ قاری سامنے ہو تو سب ادھر متوجہ ہوں تاکہ تول و اعراض دونوں سے الگ رہے۔ اہل کتاب سے بچے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا۔ یہ نیا جملہ ہے۔ ذٰلِكَ سے تولی اور اعراض کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ یہود کے مذکورہ اعمال وعقائد بہت گندے اور اسلامیت کیا انسانیت سے بھی دور تھے۔ اس لئے ذٰلِكَ بعید اشارہ ہوا۔ ذالک بعید کے اشارہ کے لئے آتا ہے۔ بعید زمانا ہو یا مکانا یا اشارۃً چونکہ یہ بدعقیدگی یہود کے گذشتہ گناہوں کا باعث تھی۔ اس لئے ب سببیہ ارشاد ہوئی بِاَنَّهُمْ بِاَنَّ حاصل کا متعلق ہے۔ اور هُمْ کا مرجع سارے اہل کتاب

کر یہودی نصرانی بنتا ہے، بَآءَ بَوْءٌ سے بنا بمعنی اصل کی طرف لوٹنا، **جواب:** ہر شخص رب تعالیٰ کی طرف لوٹتا ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے والیہ المصیر جو ایمان لے کر گیا، وہ ایمان کے ساتھ اپنی اصل کی طرف لوٹا، اور جو کفر پر مرا، وہ کفر لے کر لوٹا، لوٹنا ادھر جانے کے لحاظ سے ہے، اسی لئے یہاں **الی سخط نہ** فرمایا بلکہ **بسخط** ارشاد ہوا، یعنی رب تعالیٰ کے غضب کے ساتھ لوٹا، کہاں لوٹا، رب تعالیٰ کی طرف، جہاں سے آیا تھا،

تفسیرِ صوفیانہ

رب تعالیٰ نے انسان کو دو رہبر دیئے ہیں، عقل و نفس، عقل تو جنت رضوان، رضائے رحمان کا راستہ دکھاتی ہے، نفس دوزخ، نیران، رضائے شیطان کی راہ بتاتی ہے، جو عقل کی مانتے ہیں، وہ رضوان کی راہ چل کر جنان تک پہنچتے ہیں، جو نفس کی پیروی کرتے ہیں، وہ شیطان کی راہ چل کر دوزخ تک پہنچتے ہیں، حتی کہ دنیا میں مشغولیت اگر سنتِ رسول سمجھ کر ہو، تو یہ رضوان کی راہ ہے، اور اگر نفس کی پیروی میں ہو، تو یہ ہی دوزخ کا راستہ ہے، یعنی جیسے نفس و عقل اور جنت و دوزخ، شیطان، رضوان یکساں نہیں، ایسے ہی ان کی پیروی کرنے والے یکساں نہیں، ان پیروکاروں میں وہی فرق ہوگا، جو ان راہوں میں فرق ہے، پھر مومن آپس میں یکساں نہ آج ہیں نہ جنت میں ہوں گے جنتیوں کے چار گروہ ہوں گے، انبیاء، اولیاء، علماء، عام مومنین، حضرات انبیاء نور کے منبروں پر ہوں گے، حضرات اولیاء تختوں پر، علماء کرسیوں پر، عام مومنین مشک کے ٹیلوں پر، شعر

قیامت کہ بازار مینو نہند　　　منازل باعمال نیکو دہند

دنیا میں مومنوں کا عملی فرق چند طرح ہے، ۱۔ عمر سے، کہ بڈھا مومن بچے مومن سے افضل ہے، ۲۔ وقت سے، چنانچہ رمضان، شب قدر، عاشوراء میں نیکیاں کرنے والا، دوسرے زمانہ میں نیکیاں کرنے والے سے افضل ہے، ۳۔ جگہ سے، چنانچہ مسجد حرام اور مسجد نبوی ﷺ کا نمازی دوسری جگہ کے نمازیوں سے بہتر ہے، ۴۔ حالت سے، چنانچہ جماعت سے نماز پڑھنے والا اکیلے نمازی سے افضل ہے، ۵۔ نوعیتِ عمل سے، چنانچہ اپنے عزیزوں کو صدقہ دینے والا اجنبیوں کو صدقہ دینے والے سے افضل ہے، شیخ سعدی فرماتے ہیں، شعر

بضاعت بچنداں کہ آری بری　　　اگر مفلسی شرمساری بری

ہر دن پکارتا ہے کہ میں خلقِ جدید ہوں، اور کل تیرے اعمال کا شہید، مجھے تو آج کے بعد نہ دیکھے گا تو یہ سمجھ کر عمل کر، کہ کل تجھے رب تعالیٰ کے ہاں ضرور پیش ہونا ہے　　　(از روح البیان مع زیادت)

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ
یقیناً احسان فرمایا اللہ نے مومنوں پر کیونکہ بھیجا ان
بے شک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں انہی
فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ

ہے اور اس سے پہلے جزا پوشیدہ ہے۔ یعنی جَزَا مَا کَسَبَتْ۔ کَسَبَتْ سے اختیاری اعمال مراد ہیں کیونکہ مجبوری اعمال پر سزا و جزا نہیں۔ یعنی ہر قابل عمل انسان کو اس کے اختیاری افعال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ وُفِّیَتْ کا بیان یہ ہے کہ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ۔ هُمْ کا مرجع كُلُّ نَفْسٍ ہے کیونکہ وہ معنًا جمع ہے اور ظلم سے مراد نقصان ہے۔ (معانی) یعنی ان کو نقصان نہ پہنچایا جائے گا۔ کہ نہ ان کی نیکیوں کا ثواب کم کیا جائے اور نہ گناہوں کا عذاب زیادہ بڑھایا جائے۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب ﷺ آپ اہل کتاب کی مخالفت پر غمگین نہ ہوں۔ یہ تو اپنے پیغمبروں کے بھی نہ ہوئے کہ انہیں شہید کر ڈالا۔ وہ تو پچھلا واقعہ تھا۔ اب ان کی موجودہ حالت یہ ہے جو آپ دیکھ ہی چکے کہ جب یہ اپنی جانی پہچانی مانی ہوئی کتاب یعنی توریت کی طرف بلائے جاتے ہیں اور ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس کا فیصلہ مان لو تو اس سے منہ پھیر جاتے اور انکار کر دیتے ہیں۔ جس کتاب کے ماننے کا دعویٰ ہے جب اس کے ساتھ ان کا یہ معاملہ ہے تو اگر قرآن و صاحب قرآن جس کے وہ ماننے کے مدعی نہیں اس کی مخالفت کریں تو کیا بعید ہے۔ اس بے دینی اور بے باکی کا سبب یہ ہے کہ ان کے پیروں مرشدوں نے کچھ ڈھکوسلے ان کے دل میں بٹھا دیئے کہ یہود چونکہ نسل ابراہیمی سے ہیں اس لئے انہیں چند روز ہی عذاب ہوگا۔ جتنے دن ان کے باپ دادوں نے بچھڑا پوجا تھا پھر ان کی رہائی یقینی ہے۔ خواہ وہ دنیا میں کچھ بھی کریں۔ یا یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام عیسائیوں کے گناہوں کے عوض سولی کھا گئے۔ ان کی صلیب ان کے گناہوں کا کفارہ ہو چکی۔ اب یہ جو چاہیں کریں انہیں کوئی عذاب نہیں۔ ان ڈھکوسلوں کو انہوں نے دین سمجھا ہے اور انہیں پر یہ مغرور ہیں۔ خیال تو کرو کہ اس وقت کیسی ہوگی جب ہم ان سب کو قیامت کے دن سزا و جزا کے لئے جمع کریں گے۔ جس میں کوئی شک نہیں اور ہر شخص کو اس کے اعمال کی پوری سزا و جزا دی جائے گی۔ تب ان کو اپنے خیالات خام کی حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ ہم کچھ سمجھتے تھے اور ہوا کچھ اور اس دن کسی پر ظلم نہ ہوگا کہ نہ کسی کی نیکیاں ضائع جائیں اور نہ برائیاں بڑھائی جائیں۔ بعض روایات میں ہے کہ قیامت کے دن سارے کفار سے پہلے یہود کا جھنڈا بلند کیا جائے گا اور انہیں سر محشر رسوا کر کے جہنم میں بھیجا جائے گا۔ (خازن و روح) نیز عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہود کا عقیدہ یہ تھا کہ جہنم کے دونوں کناروں میں چالیس سال کا فاصلہ ہے اور آخری کنارہ پر درخت خاردار ہے جسے زقوم کہتے ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ہم زقوم کے پہنچنے تک عذاب پائیں گے۔ وہاں پہنچ کر جہنم ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا ان کے عقیدہ میں دوزخ اور وہاں کا عذاب دائمی نہیں۔ اس آیت میں اسی عقیدہ کا بیان اور اسی کی تردید ہے۔ (روح البیان)

خیال رہے کہ دوزخ کی تپش دنیا میں بھی آ رہی ہے۔ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ دوپہری کی گرمی دوزخ کی بھڑک سے ہے۔ لہٰذا ظہر ٹھنڈی کر کے پڑھو مگر یہ گرمی رحمت ہے جس میں دنیا کا نظام قائم ہے۔ آخرت میں دوزخ کے عذاب کی چار نوعیتیں ہوں گی۔ قبر کافر میں دوزخ کا اثر گرمی بدبو وغیرہ آئے گی۔ بعینہ آگ نہ آئے گی۔ بعد حشر بعض دوزخ سے دور رہیں گے۔ صرف ایک چنگاری ان کے تلوے میں ہوگی۔ جس سے دماغ کھولتا ہوگا۔ بعض آگ میں داخل ہوں گے۔ بعض کے اندر آگ داخل ہوگی۔ پہلا عذاب سب سے ہلکا ہے۔ اس کو مس نار کہا جاتا ہے۔ آخری عذاب بہت سخت ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ۔ (الھمزۃ: ۷) یہود کہتے تھے کہ ہمیں ہلکا عذاب یعنی مس نار بھی نہ ہوگا مگر صرف چند روز پھر یہ مس نار

صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (بقرہ: ۲۶۴) ۴۔ بند کرنا اور کاٹ دینا، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَ اِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ (قلم: ۳) ۵۔ کسی کو بلا معاوضہ نعمت دینا، اور بغیر بدلہ اس پر احسان کرنا، رب تعالیٰ فرماتا ہے فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ (ص: ۳۹) یہاں مَنّ آخری معنی میں ہے، اسمائے الٰہیہ میں سے منّان بھی ہے، وہ اسی مَنّ سے مشتق ہے، اگرچہ حضور انور ﷺ کی تشریف آوری سارے جہانوں پر ہی نعمت اور احسان ہے، مگر چونکہ اس سے پورا اور دائمی فائدہ مسلمانوں نے ہی اٹھایا، اس لئے خصوصیت سے یہاں انہی کا ذکر ہوا، دیکھو حضور انور ﷺ کی برکت سے دنیا میں عذاب الٰہی آنا بند ہوئے، بلکہ مخلوق کو بارشیں اور روزیاں ملنا حضور انور ﷺ ہی کی طفیل ہے، جن سے کفار اور جانور بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں، مگر یہ فائدے موت کے بعد ختم ہو جائیں گے، مسلمانوں نے ان نعمتوں کے ساتھ ساتھ حضور انور ﷺ سے ایمان و عرفان بھی لیا، جو نعمتِ لا زوال ہے، اس لئے عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ فرمایا گیا، حق یہ ہے کہ اس سے سارے ہی مومن مراد ہیں نہ صرف مدینہ کے، نہ صرف حجاز یا عرب کے، خیال رہے کہ رب تعالیٰ کے ہاں مومن وہ ہوتا ہے جس کا خاتمہ ایمان پر ہونے والا ہو، کفر پر مرنے والا آدمی حضور انور ﷺ سے اخروی فائدے کیسے اٹھائے گا؟ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا۔ اِذَا کا تعلق مَنَّ سے ہے، اِذْ ظرفیہ بھی ہوتا ہے تعلیلیہ بھی، یہاں دونوں بن سکتے ہیں، اگر ظرفیہ ہو، تو مطلب یہ ہوگا کہ اگرچہ پہلے ہی سے رب تعالیٰ کے بندوں پر کروڑوں احسانات ہیں، مگر بڑا احسان اسی وقت ہوا جب یہ رسول بھیجا، اور اگر تعلیلیہ ہو تو معنی ظاہر ہیں، کہ اس لئے رب تعالیٰ نے احسان کیا کہ ان میں رسول بھیجا، نیست کو ہست کرنا خلق کہلاتا ہے، اور جو پہلے موجود ہو، اسے اپنے کام یا پیغام کے لئے کہیں بھیجنا بعثت، چونکہ نبی کریم ﷺ پیدائش میں سب سے پہلے ہیں، مگر تشریف آوری میں سب نبیوں کے بعد، اور یہاں تشریف آوری کا ہی ذکر ہے، نیز سب لوگ دنیا میں اپنے کام کے لئے آئے، اور حضور انور ﷺ رب تعالیٰ کے کام کے لئے، نیز سب لوگ عالم ارواح سے یہاں آئے، اور حضور انور ﷺ خاص بارگاہ قدس سے، اس لئے خَلَقَ نہ فرمایا بلکہ بَعَثَ فرمایا، اسی بناء پر ہم صرف مخلوق ہیں، مگر حضور انور ﷺ مخلوق بھی ہیں مبعوث بھی، ہمیں مبعوث نہیں کہا جا سکتا، فِيْهِمْ بَعَثَ کا ظرف ہے، هُمْ کا مرجع مومنین، چونکہ حضور انور ﷺ کی ولادت مکہ میں ہوئی، قریش و بنی ہاشم میں ہوئی، مگر بعثت سارے عالم اور سارے مومنین میں ہوئی، اس لئے فِيْهِمْ فرمانا بالکل صحیح ہے، سورج رہتا چوتھے آسمان پر ہے مگر چمکتا ہے سارے جہان پر، دن ہر جگہ نکال دیتا ہے، چراغ ہر جگہ کے گل کرا دیتا ہے، اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ زمین پر سورج چمکا، ایسے ہی نبوت کا سورج رہا تو مکہ مدینہ میں، مگر چمکا ہر مومن کے دل اور سینہ میں، اس لئے فِيْهِمْ ارشاد ہوا، اس فِيْهِمْ پر صوفیائے کرام وجد کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں، شعر

سنا ہے رہتے ہیں دولھا فقط مدینہ میں — غلط ہے رہتے ہیں وہ عاشقوں کے سینہ میں

رَسُوْلٌ بروزن فَعُوْلٌ رسالت کا صفت مشبہ ہے، بعثت اور رسالت میں فرق یہ ہے، کہ بعثت مطلقاً بھیجنے کو کہتے ہیں، اور رسالت یا ارسال پیغام دے کر بھیجنے کو، رسول کی تنوین تعظیمی ہے، یعنی شاندار رسول، چونکہ حضور انور ﷺ اللہ کے بھی رسول ہیں اور ہمارے بھی، کہ اللہ کی طرف سے لانے والے ہیں اور ہمیں پہنچانے والے، نیز حضور انور ﷺ کی رسالت کسی وقت

سے نہ تھا' نہ ان پر اسلامی احکام جاری ہیں۔ چنانچہ حضور انور ﷺ نے کبھی مشرکین عرب کو زنا کی وجہ سے رجم نہ کیا بلکہ خود ان کی کتاب کا حکم ان پر جاری فرمایا۔ وہ بھی اس لئے کہ انہوں نے حضور انور ﷺ کو اپنا حکم و حاکم مان لیا تھا۔ اب بھی اسلامی حاکم کفار پر ان کے مذہبی احکام ان پر جاری فرماوے گا۔ اگر ان کا مقدمہ اس کے پاس آئے۔ چنانچہ کفار کے میراث کے احکام ان کے مذہب کے مطابق ان پر جاری ہوں گے نہ کہ اسلام کے مطابق۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبیوں کی شفاعت اور باپ دادوں کی بزرگی پر ناز کرنا طریقہ یہود ہے کہ وہ اس شفاعت پر بھروسہ کئے ہوئے تھے۔ وہ مسلمان جو شفاعت انبیاء کے معتقد ہیں طریقہ یہود پر ہیں (بعض دیوبندی) **جواب:** شفاعت انبیاء پر ناز کرنا تقاضائے ایمان ہے۔ ہاں شفاعت پر اعتماد کر کے گناہوں پر دلیر ہو جانا اور ایمان کی پرواہ نہ کرنا طریقہ یہود ہے۔ اسی کا یہاں ذکر ہے۔ ہم شفاعت کی مکمل بحث پہلے سیپارے اور آیت الکرسی کی تفسیر میں کر چکے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جہنم سے گنہگار کبھی نہ نکلیں گے اور جہنم سے رہائی کا اعتقاد عقیدہ یہود ہے۔ (معتزلہ) **جواب:** گنہگار مومن جہنم سے ضرور رہائی پائے گا۔ اس پر آیات اور احادیث گواہ ہیں۔ کفار کے لئے رہائی ماننا اور محض نسب پر اعتماد کرنا طریقہ یہود ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ چونکہ ہم ابراہیمی ہیں لہٰذا خواہ انبیاء کو قتل کریں یا کتاب اللہ کا انکار' دین بدلیں' کتابوں میں تحریف کریں' کچھ کریں۔ جہنم ہمارے لئے دائمی نہیں۔ الحمد للہ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں۔ کافر کے لئے نسب کوئی چیز نہیں۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ معافی اور بخشش کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ فرمایا گیا۔ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ۔ اس آیت سے آریہ دھرم کی تائید ہوتی ہے۔ پھر مسلمانوں نے بخشش کا عقیدہ کہاں سے نکالا۔ اگر گناہ معاف ہوئے تو پورا بدلا نہ ملا۔ اور آیت فرما رہی ہے پورا بدلہ ملے گا۔ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ آیت نفی ظلم کے لئے ہے۔ اسی لئے اخیر میں فرمایا گیا۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ ہوگا کہ اس کی نیکی کم کر دی جائے۔ یا گناہ بڑھا دیئے جائیں۔ گناہ کی معافی اور نیکیاں بڑھانا اس کے خلاف نہیں۔ اگر بادشاہ ملازموں کو تنخواہ سے زیادہ عطا فرما دے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ میں کسی کا حق نہیں مارتا۔ پورا دیتا ہوں۔ یہ اردو کا بھی محاورہ ہے۔ جو دوست وعدہ سے زیادہ کام کرنے اسے وفادار بھی کہا جا سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ یہاں تین لفظ قابل غور ہیں۔ وُفِّيَتْ اور كُلُّ نَفْسٍ اور مَا كَسَبَتْ۔ ظاہر ہے کہ كُلُّ نَفْسٍ سے بچے' دیوانے' مجبور لوگ علیحدہ ہیں۔ ایسے ہی مَا كَسَبَتْ سے غیر اختیاری کام اور بچوں و دیوانوں کے کام خارج۔ ایسے ہی وُفِّيَتْ سے بخشش علیحدہ۔ تیسرا یہ کہ یہ آیت عقیدہ یہود کی تردید میں ہے۔ وہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہمیں کفر کے باوجود پوری سزا نہ ملے گی اور بلا نیکی کئے ثواب مل جائے گا۔ ان کی تردید میں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ بغیر کئے ثواب کیسا اور کفر کا بدلہ کیوں نہ دیا جائے ضرور دیا جائے گا لہٰذا یہ وُفِّيَتْ نقصان کے مقابلہ میں ہے کہ کافروں کی سزا میں کمی نہ کی جائے گی۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر نفس کو اپنے ہی اعمال کا بدلہ ملے گا پھر ثواب بخشنے کے کیا معنی؟ (آریہ) **جواب:** اس کا مکمل جواب لَهَا مَا كَسَبَتْ کی تفسیر میں بیان کیا جا چکا۔ اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ کسی کی نیکی ضائع نہ ہوگی۔ پوری ملے گی۔ دوسرے کو نیکی کے ثواب کا یہاں انکار نہیں۔ **چھٹا اعتراض** جَمَعْنٰهُمْ [illegible] قیامت جمع ہونے کا وقت ہے یعنی ظرف

یعنی تشریف لائے وہ رسول نفیس ترین بہترین جماعت سے، کہ آپ عربی، قرشی، مطلبی، ہاشمی ہیں، جو تمام جہان میں بہتر خاندان ہے، اس کی تحقیق انشاء اللہ لَقَدۡ جَآءَكُمۡ (توبہ:۱۲۸) کی تفسیر میں کی جائے گی، یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ یہ جملہ رَسُوۡلًا کا دوسرا حال ہے، یا دوسری صفت یَتۡلُوۡا تِلَاوَةً سے بنا، تلاوت کی پوری تحقیق پہلے پارہ میں ہو چکی ہے، عَلَیۡهِمۡ میں ھم ضمیر سارے مومنین کی طرف لوٹتی ہے، آیات سے مراد قرآنی آیتیں ہیں، اور تلاوت سے مراد بلا واسطہ و بالواسطہ دونوں تلاوتیں ہیں، کہ قیامت تک مسلمانوں کو حضور انور ﷺ ہی بواسطہ علماء و حفاظ قرآنی آیات سنا رہے ہیں یعنی وہ رسول مسلمانوں کو وہ قرآنی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں کہ اگر حضور ﷺ کا واسطہ نہ ہوتا، تو یہ آیتیں ان تک پہنچ سکتی ہی نہ تھیں، کیونکہ آیتیں عرشی تھیں اور یہ لوگ فرشی، سنانے والا بھی وہ چاہیے تھا جو عرشی بھی ہو اور فرشی بھی، وہ حضور انور ﷺ ہی ہیں حضور انور ﷺ کا یہ تلاوت فرمانا سنانے کے لئے بھی ہے اور سکھانے کے لئے بھی، حضور انور ﷺ کے بغیر سکھائے کوئی شخص قرآن پاک کی صحیح تلاوت نہیں کر سکتا، وَیُزَكِّیۡهِمۡ یہ جملہ یَتۡلُوۡا پر معطوف ہے اور رسول کا تیسرا حال یا صفت، یہ لفظ تزکیہ سے بنا بمعنی پاک و صاف کرنا، اکثر جسمانی اور ظاہری پاکیزگی کو طہارت کہا جاتا ہے، اور دلی و روحانی پاکیزگی کو تزکیہ، اسی لئے مذبوحہ جانور کو مزکی کہتے ہیں، اور ایک خاص صدقہ کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے، باب تفعیل مبالغہ کے لئے ہے نہ کہ محض آہستگی کے لئے، یعنی یہ رسول مسلمانوں کو برے اعتقاد، خراب رسوم، بداعمال وغیرہ سے خوب پاک و صاف کرتے ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ بمعنی مستقبل ہو، اور اس میں قیامت کا ذکر ہو، یعنی یہ رسول ان مسلمانوں کا تزکیہ بارگاہِ الٰہی میں کریں گے، عرض کریں گے کہ مولیٰ میری امت متقی ہے فاسق نہیں، مقبول الشہادت ہے مردود الشہادت نہیں، جیسا کہ دوسرے پارہ میں عرض کیا گیا، وَیُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ حکمت کے معنی بارہا عرض کئے جا چکے ہیں، قریباً سارے مفسرین تفسیر خازن، بیضاوی، روح البیان، جلالین اور مدارک وصاوی وغیرہم نے فرمایا کہ کتاب سے مراد قرآن شریف ہے، اور حکمت سے سنت، بعض لوگ کہتے ہیں کہ حکمت سے مراد قرآنی احکام ہیں، مگر یہ غلط ہے، کہ یہ تو الۡكِتٰبَ میں آچکے، خیال رہے کہ الفاظ قرآن کی تعلیم کا ذکر تو یَتۡلُوۡا میں ہو گیا، اور معانی قرآن، احکام قرآن، اسرار قرآن شریف کا ذکر یُعَلِّمُهُمۡ میں ہو گیا، اب حکمت سے مراد کتاب کے علاوہ کوئی اور چیز ہونی چاہیے، تا کہ کلام کا کوئی جز و بیکار نہ ہو، اور وہ سنت ہی ہے، چونکہ تلاوت قرآن ابتدائی چیز تھی، اور تعلیم قرآن انتہائی درجہ، اس لئے تلاوت کا ذکر پہلے ہوا، اور تعلیم کا ذکر تزکیہ کے بعد کہ علم کتاب و سنت اسی کو میسر ہوتا ہے جو پاک و صاف ہو وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ بعض مفسرین کا قول ہے کہ یہ اِنۡ اِنَّ کا مخفف ہے، جس کا اسم یعنی ضمیر ھم پوشیدہ ہے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بھی اس پر دال ہے، اور بعض نے فرمایا کہ واؤ وصلیہ ہے اور اِنۡ شرطیہ بمعنی اگرچہ، حق یہ ہے کہ كَانُوۡا کا فاعل سارے ہی انسان ہیں نہ کہ صرف اہل عرب اور قبل کا مضاف الیہ ۂ یا ھا پوشیدہ ہے، جس کا مرجع رسول ہیں یا بعثت لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ضلال سے مراد گمراہی ہے، عقائد کی ہو یا اعمال کی، یعنی حضور انور ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے سارے ہی لوگ خصوصاً اہل عرب عقائد کی گمراہی میں بھی تھے اور اعمال کی گمراہی میں بھی اور کیوں نہ ہوتے کہ عرب میں تو چار ہزار سال یعنی ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ سے کوئی نبی ہی نہیں آئے تھے، اور دوسرے ممالک میں اگرچہ نبی تشریف لائے تھے، مگر ان کی تعلیم گم ہو کر رہ

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ

کہو کہ اللہ مالک ملک کے دیتا ہے تو ملک جس کو چاہتا ہے اور چھینتا ہے ملک جس سے چاہتا ہے

یوں عرض کر اے اللہ ملک کے مالک تو جسے چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے

مِمَّنْ تَشَآءُ٘ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ٘ بِیَدِكَ الْخَیْرُ٘

اور عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ذلت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بیچ ہاتھ تیرے بھلائی ہے

اور جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے ساری بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے

اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۲۶) تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِی

تحقیق تو اوپر ہر چیز کے قدرت والا ہے داخل کرتا ہے تو رات کو بیچ دن کے اور داخل کرتا ہے تو دن کو بیچ

بیشک تو سب کر سکتا ہے تو دن کا حصہ رات میں ڈالے اور رات کا حصہ دن میں ڈالے

الَّیْلِ٘ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ٘

رات کے اور نکالتا ہے زندہ کو مردے سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے

اور مردے سے زندہ نکالے اور زندہ سے مردہ نکالے

وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ (۲۷)

اور رزق دیتا ہے تو جسے چاہے بے حساب

اور جسے چاہے بے گنتی دے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں اہل کتاب کی سرکشی اور ان کے عناد کا ذکر تھا۔ اب مسلمانوں کو خدا کی حمد وثناء کی تعلیم دی جارہی ہے تاکہ ان کی وفاداری اور اطاعت شعاری کا پتہ لگے۔ چونکہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ اس لئے سرکشی کے بعد اطاعت کا ذکر مناسب تھا۔ **دوسرا تعلق:** یہود کی نگاہ دنیا اور اس کے اسباب پر تھی۔ اس لئے وہ صحابہ کرام کو ان کی مفلسی کی وجہ سے نگاہ حقارت سے دیکھتے تھے۔ اور اپنی بڑائی پر نگاہ کرتے ہوئے کتاب اللہ کے احکام کی پرواہ بھی نہ کرتے تھے۔ جیسا کہ گذشتہ آیت سے معلوم ہوا۔ اس آیت میں اس کی تردید کی جا رہی ہے کہ اے محبوب ان لوگوں کو آپ ﷺ پڑھ کر سنا دو تاکہ انہیں اپنی کمزوری اور رب تعالیٰ کی قدرت کا پتہ لگے، جس سے وہ اطاعت پر راغب ہوں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت سے معلوم ہوا کہ یہود جنت کو اپنی میراث اور اپنے کو نبوت کا ٹھیکیدار سمجھتے تھے اسی لئے وہ کہتے تھے ہم کچھ بھی کریں ہمیں عذاب عارضی اور معمولی ہوگا۔ اس آیت میں اشارۃً ان کے اس

عقائد، اعمال، اخلاق، غذاؤں وغیرہ میں تمام دنیا سے گرے ہوئے تھے، جانور بھی اپنے بچے کو خود نہیں مارتا، مگر وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے، حضور انور ﷺ کی برکت سے یہی لوگ تمام دنیا سے افضل ہو گئے، انہی میں سے عالم، زاہد، عابد بلکہ صدیق و فاروق بن گئے، اس لئے رب تعالیٰ نے یہاں فِيهِمْ اور مِّنْ أَنفُسِهِمْ فرمایا،

تفسیر روح البیان نے فرمایا کہ حضور انور ﷺ کی پیدائش معجزہ نہیں بلکہ معجزات کا مجموعہ ہے، چنانچہ آپ کی ولادت پر بت اوندھے گرے، کسریٰ کے محل میں زلزلہ آیا، جس سے چودہ کنگورے گر گئے، اشارۃً بتایا گیا کہ چودہ بادشاہوں کے بعد یہ ملک مسلمانوں کے پاس پہنچ جائے گا، چنانچہ عہدِ فاروقی تک یہ ۱۴ سلاطین پورے ہو چکے تھے، فارس کی ایک ہزار سال کی جلتی ہوئی آگ بجھ گئی، بحیرۂ ساوہ کا چشمہ اچانک خشک ہو گیا، غرضکہ سورج کی طرح آپ کی ولادت کی خبر سارے عالم میں پھیلا دی گئی، اس جگہ روح البیان نے ابو طالب کا وہ خطبہ نقل کیا ہے، جو آپ نے نبی کریم ﷺ کا بی بی خدیجہ کے ساتھ نکاح کرتے وقت رؤسائے بنی ہاشم اور امرائے مضر کے سامنے ارشاد کیا، کہ فرمایا، اس خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں اولادِ ابراہیم، نسلِ اسمٰعیل، شاخ معد اور مضر کا درخت بنایا، اور حرم کا باشندہ، بیت اللہ کا خادم قرار دیا، میرے بیٹے محمد ابن عبد اللہ کو اگر تمام جہان کے ساتھ تولا جائے، تو یہ سب پر بھاری ہو گا، اور دیکھ لینا کہ آگے چل کر میرا یہ لختِ جگر بڑی شان والا ہو گا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، مجھ سے جبریل بولے یا رسول اللہ ﷺ میں نے زمین کے مشرق و مغرب چھان ڈالے تمہارے پائے کا نہ پایا، شعر

آدَمُ وَ مَنْ دُوْنَهٗ تَحْتَ اللِّوىٰ　　زانکہ بہر اوست خلق ما سوی

اس لئے رب تعالیٰ نے اِذْ بَعَثَ بطورِ احسان ارشاد فرمایا، اس جگہ روح البیان نے عبد المطلب کی عجیب خوابیں اور کاہنوں کی بہترین تعبیریں، بہت تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں، شعر

معراج میں جبریل سے کہنے لگے شاہِ امم　　تم نے تو دیکھے ہیں بہت بتلاؤ تو کیسے ہیں ہم

روح الامیں کہنے لگے اے مہ جبیں تیری قسم　　آفاقہا گردیدہ ام مہرِ بتان ورزیدہ ام

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری!

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** حضور انور ﷺ کی تشریف آوری اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں سے اعلیٰ نعمت ہے، کہ رب تعالیٰ نے قرآن کریم میں کسی نعمت پر لفظ مَنَّ نہیں فرمایا، صرف اس نعمت پر ہی فرمایا، وجہ ظاہر ہے کہ ساری دنیاوی نعمتیں فانی ہیں، اور ایمان و عرفان وغیرہ نعمتیں باقی، اور یہ حضور انور ﷺ ہی سے ملیں، نیز حضور انور ﷺ ساری نعمتوں کو نعمت بنانے والے ہیں، کہ اگر اعضاء اولاد، مال وغیرہ کو حضور انور ﷺ کی تعلیم کے مطابق استعمال کیا جائے، تو یہ سب رحمتیں ہیں ورنہ زحمتیں، نیز ہمارے اعضاء قیامت میں ہماری شکائتیں کر کے پردہ دری کریں گے، مگر حضور انور ﷺ ہماری سفارش اور پردہ پوشی فرمائیں گے، شعر

اے محبوب رب تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ عرض کرو تاکہ الفاظ ہمارے ہوں زبان تمہاری۔ زبان وکلام کی تاثیریں جمع ہوجائیں تو اثر زیادہ ہو۔ یا مسلمانوں کو یہ دعا سکھا دو انہیں اس دعا کی اجازت دے دو تاکہ تمہاری اجازت سے دعائی تاثیر زیادہ ہو۔ یا مضطر دعا مانگے یا مضطر و بیقرار سے۔ دعا منگوائے یا مضطر کی اجازت سے دعا کرے تاکہ اضطرار شامل ہو کر دعا کو قبولیت سے قریب کردے۔ اسی صورت میں قُلْ سے اجازت شیخ کا ثبوت ہوا کہ وظیفے دعا میں کسی کی اجازت سے استعمال کرو تلوار اپنی ہو میان دوسرے کی۔ یا ہر مسلمان کو اَللّٰھُمَّ اصل میں یا اللہ تھا یا حذف کر کے اس کے عوض آخر میں میم مشدد لگادی گئی۔ یہ اللہ کی خصوصیت ہے۔ زیدمٌ یا عمرمٌ نہیں کہہ سکتے۔ ایسے ہی بغیر اَیُّھَا کے یا کا آنا اور اس کے ہمزہ کا قطعی ہونا اور ت قسم کا آنا اور حرف ندا کے عوض ہمزہ استفہام آجانا اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ (روح المعانی) بعض نے کہا کہ اَللّٰھُمَّ کی اصل یا اللہ ام بخیر ہے۔ یعنی اے اللہ ہماری بھلائی کا ارادہ فرما۔ چونکہ اس کا استعمال زیادہ تھا اس لئے یا اور ام کے ہمزہ دونوں دور کردیئے گئے۔ اَللّٰھُمَّ ہوگیا۔ جیسے ھَلُمَّ کی اصل میں ھَلْ اور ام تھا (کبیر و معانی) بعض علماء فرماتے ہیں کہ اَللّٰھُمَّ کی میم میں تمام ان اسماء الٰہیہ کی طرف اشارہ ہے جن کے اول میں میم ہے جیسے ملک، مالک، منان، مقتدر، مجید، معید، مقیت وغیرہ جس نے اَللّٰھُمَّ کہہ کر دعا مانگی۔ اس نے گویا ان تمام ناموں کے وسیلہ سے دعا مانگی جن کے اول میم ہے۔ اس لئے اکثر دعاؤں میں اَللّٰھُمَّ آتا ہے۔ نیز اللہ اسم ذات ہے باقی اسماء صفاتیہ ہیں۔ اس ذات کو پکار کر دعا کرنا افضل ہے۔ بعض کے خیال میں اللہ اسم اعظم ہے۔ لہٰذا اس کے توسل سے دعا انشاء اللہ ضرور قبول ہوگی۔ **مالک الملک** یہ ترکیب میں یا دوسرا منادا ہے یا اَللّٰھُمَّ کی صفت (کبیر و معانی) ہم مالک اور ملک کا نفیس فرق مالک یوم الدین کی تفسیر میں کر چکے۔ ملک بمعنی قدرت ہے اور مالک بمعنی قادر، مالک الملک کے معنی ہوئے قدرت دینے پر قادر۔ اصطلاح میں کسی پر مضبوط قبضہ رکھنے کو ملک کہا جاتا ہے۔ ملک میم کے کسرہ سے بمنزلہ جنس ہے۔ ہر مُلک مِلک ہے مگر ہر مِلک مُلک نہیں۔ لسان العرب میں ہے کہ ملک وملکوت جب خدا کی طرف نسبت دیئے جائیں تو ان کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ تفسیر کشاف میں ہے کہ مالک الملک سے مراد ہے۔ ہر ملکیت کا مالک کہ وجود، عدم، موت، زندگی، عذاب و ثواب سب اسی کے قبضہ میں ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ تفسیر خازن نے فرمایا کہ اس کے معنی ہیں۔ مالک الملک بادشاہوں کا مالک اور ان کا وارث، اصطلاح میں بڑے علاقے کا نام ملک ہے۔ شہر، ضلع، صوبہ۔ علاقہ ملک ان سب میں ملک بڑا ہے، اللہ کے ملک بہت ہیں۔ ملک اجسام، ملک انوار، ملک امکان، ملک لہٰذا رب تعالیٰ ان سب ملکوں کا مالک ہے۔ ملک اجسام سب سے چھوٹا ملک ہے۔ تمام آسمان و زمین جنت کے مقابلہ میں سات کوڑیاں ہیں، میدان میں الملک میں الف لام جنسی ہے جو سب ملکوں کو شامل ہے۔ رب سارے ملکوں کا حقیقی مالک ہے...... **تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ** یہ نیا جملہ ہے جو مالک الملک کی وسعت کو بیان کر رہا ہے اور ممکن ہے کہ اَللّٰھُمَّ کا حال ہو۔ یا انت مبتدا کی خبر۔ خیال رہے کہ اس ملک سے پہلا ملک مراد ہے کیونکہ جب معرفہ کے بعد معرفہ آئے تو دوسرے سے پہلا مراد ہوتا ہے یعنی جس ملک کا تو مالک ہے وہ ہی دوسرے کو دے سکتا ہے۔ بعض کے نزدیک اس ملک سے مراد نبوت و رسالت و باطنی سلطنت ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا۔ (النساء: ۵۴) ہم نے آل ابراہیم کو بڑا ملک یعنی نبوت عطا فرمائی۔ چونکہ نبی کی [illegible] فقط ظاہر پر اس لئے نبوت کو ملک فرمایا گیا۔

انور ﷺ کی رحمت تین قسم کی ہے، عامہ، خاصہ، اور خاص الخاصہ، رحمت عامہ سارے عالم کے لئے، رحمت خاصہ سارے انسانوں کے لئے، اور خاص الخاصہ صرف مومنین کے لئے، ان تینوں آیتوں میں تین نعمتوں کا ذکر ہے، **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ ہم میں سے ہی ایک بشر ہیں، کہ فرمایا گیا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ پھر ہم میں اور ان میں فرق ہی کیا؟ **جواب:** فرق اس آیت سے ہی معلوم ہو رہے ہیں، حضور انور ﷺ اللہ کا احسان ہیں، حضور انور ﷺ اللہ کے رسول ہیں، حضور انور ﷺ ہم سب کو پاک فرمانے والے ہیں ہم پاک ہونے والے، حضور انور ﷺ سب کے معلم ہیں، ہم سب سیکھنے والے، مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کے وہ معانی ہیں جو تفسیر میں عرض کئے گئے کہ حضور انور ﷺ کی آمد ہم میں ایسی ہے جیسے جسم میں جان کا آنا، **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور انور ﷺ سے پہلے سب ہی گمراہ تھے، تو کیا حضور انور ﷺ کے والدین بھی گمراہ تھے تم تو انہیں مومنین مانتے ہو؟ **جواب:** اگر یہاں ضلال سے مراد ناواقفیت ہے، تو ظاہر ہے کہ حضور انور ﷺ کے والدین کریمین شرعی احکام سے ناواقف تھے کہ اس وقت تک شریعت آئی ہی نہ تھی، اور اگر اس سے مراد شرک وکفر ہے، تو روئے سخن ان لوگوں سے ہے جن میں حضور انور ﷺ نے نبوت کا اعلان فرمایا اور انہوں نے قبول کرنے سے پس وپیش کیا، اس کی پوری بحث ہماری تفسیر نعیمی جلد اول میں ملاحظہ فرمائیے، رب تعالیٰ حج کے احکام بیان فرماتے ہوئے فرماتا ہے وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ (بقرہ:۱۹۸) وہاں بھی ضال بمعنی ناواقف ہی ہیں، بہرحال آیت بے غبار ہے،

تفسیر صوفیانہ

جیسے درخت کی تروتازگی، اس کے پھول، پھل، اس کی رونق جڑ کا صدقہ ہے، جڑ کی طرف سے اندرونی رس برابر آتا ہے جو درخت کی رگ رگ میں پہنچتا ہے جس سے درخت کی بقاء ہے، اسی طرح عالم کی ساری نعمتیں گویا درخت ہیں، اور نبی کریم ﷺ ان سب کے اصل اصول، اسی لئے رب تعالیٰ نے اس نعمت پر لَقَدْ مَنَّ فرمایا، پھر جیسے جڑ رہتی ایک جگہ ہے، مگر فیض ہر جگہ پہنچاتی ہے، یونہی حضور انور ﷺ مدینہ میں رہ کر ہر ایک کے سینہ میں فیض پہنچاتے ہیں، خود بے سایہ ہیں، مگر عالم پر سایہ فگن ہیں، شعر

امی و دقیقہ دانِ عالم بے سایہ و سائبان عالم

جیسے قرآن کریم کے نقوش کاغذ میں ہیں، الفاظ زبان میں، معانی دماغ میں، اسرار دلوں میں، یونہی حضور انور ﷺ کا جسم اطہر عرب میں ہے، فرمانِ عالی شان تمام مسلمانوں کے جسموں پر جاری فیضان شریف دلوں میں، تجلی عرش وفرش میں، اسی لئے رب تعالیٰ نے ان کے متعلق فِيْهِمْ بھی فرمایا اور مِّنْ اَنْفُسِهِمْ بھی، حضور انور ﷺ تا قیامت ہمارے جسموں کو شریعت کے پانی سے، دلوں کو طریقت کے پانی سے، خیالات کو حقیقت کے پانی سے اور روح کو معرفت کے پانی سے پاک فرماتے ہیں اور پاک فرماتے رہیں گے، اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا وَيُزَكِّيْهِمْ، سارا عالم حضور انور ﷺ کا مدرسہ ہے، کتاب وسنت اس مدرسہ کا درسِ تعلیم، سارے علماء وصوفیاء حضور انور ﷺ کے نوکر چاکر مدرسین جو حضور انور ﷺ سے سیکھ کر دنیا کو سکھاتے

شر۔اس لئے خیر کا ذکر صراحتاً کیا اور شر کا ضمناً تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ۔ تُوْلِجُ ایلاج سے بنا جس کا مادہ ولج یا ولوج ہے۔ بمعنی تنگ جگہ میں داخل ہونا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ۔ (اعراف: ۴۰) چونکہ رات دن ضدین اور ایک دوسرے کے پورے مقابل ہیں۔ اس لئے یہاں ولوج فرمایا گیا۔ یا تو لیل سے مراد رات اور نہار سے دن مراد ہے اور ان کے داخل کرنے سے مراد رات دن کا گھٹنا بڑھنا ہے کہ گرمیوں میں دن پندرہ گھنٹے کا ہوتا ہے اور رات نو گھنٹے کی اور سردی میں اس کے برعکس یا رات دن کا آگے پیچھے آنا مراد ہے۔ یا لیل سے مراد تاریکی اور نہار سے مراد روشنی ہے کہ شام کے وقت روشنی پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ اور صبح کے وقت تاریکی پر روشنی غالب آتی ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ رات کی جگہ میں دن کو داخل کرتا ہے اور دن کی جگہ میں رات کو کہ ایک ہی زمین پر کبھی رات کا راج ہوتا ہے کبھی دن کا' چونکہ رات پہلے ہوتی ہے اس لئے رات کا ذکر پہلے فرمایا' دن کا بعد میں۔ خیال رہے کہ زمین کا دن رات اور ہے جسم کا دن رات کچھ اور' دل کا دن رات کچھ اور قوموں کا رات و دن کچھ اور' بیماری' تندرستی' زندگی و موت' جسم کی رات دن ہیں غفلت و بیداری کفر و ایمان فسق و اطاعت دل کے رات و دن ہیں زوال و کمال قوموں کے رات و دن ہیں کہ ایک قوم پر کبھی زوال ہے' کبھی ترقی۔ ایک زمین پر کبھی کفار کا راج ہے کبھی مسلمانوں کا' کفر کا راج رات ہے مسلمانوں کا راج دن' لہٰذا ہر شخص ہر قوم کو کمال کا زمانہ غنیمت جاننا چاہیے کہ اس کے لئے بقا نہیں۔ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ یہ جملہ تُوْلِجُ پر معطوف ہے۔ اور حَيٌّ حیات سے مشتق ہے اور مَيِّتٌ موت سے بعض نے کہا کہ مَيِّت اور مَيْت ایک ہی معنی میں ہے۔ جیسے هَيِّن یا لَيِّن اور لَيْن بعض کے نزدیک میت وہ جس پر موت آچکی ہو۔ اور میت وہ جو قابل موت ہو ابھی مرا نہ ہو۔ یہاں حی سے جاندار اور میت سے بے جان مراد ہے چونکہ حیات اور موت کی بہت قسمیں ہیں۔ اس لئے اس آیت میں بہت وسعت ہے۔ یعنی تو زندہ کو مردے سے مردے کو زندہ سے نکالتا ہے۔ زندہ انسان کو بے جان نطفے سے' بے جان نطفے کو جاندار انسان سے یونہی جاندار چوزے کو بے جان انڈے سے' بے جان انڈے کو جاندار مرغ سے' یونہی سبز گھاس کو خشک دانہ سے اور خشک دانہ کو سبز گھاس سے۔ ہرے بھرے درخت کو خشک بیج سے' خشک بیج کو ہرے بھرے درخت سے۔ ایسے ہی مومن کو کافر سے' کافر کو مومن سے' ایسے ہی ذکی کو غبی سے' غبی کو ذکی سے پیدا فرماتا ہے۔ شقی سے ولی اور ولی سے شقی نکالتا ہے۔ بلکہ ایک ہی شخص کبھی مومن ہوتا ہے کبھی کافر' کبھی بدنصیب کبھی خوش نصیب' کبھی خوبصورت' کبھی بدصورت' بلکہ ایک شخص کی بعض اولاد کافر بعض مومن۔ خلاصہ یہ ہے کہ جسم کی زندگی و موت اور ہے دل کی اور روح کی زندگی و موت کچھ اور سبزہ اور زمین کی زندگی موت کچھ اور ہی ہے۔ پھر جسم کے اعضاء کی زندگی و موت علیحدہ ہے۔ آنکھ کی زندگی نور نظر اس کی موت اندھا پن' کان کی زندگی سننا اس کی موت بہرہ پن' جان کی زندگی ایمان' دل کی زندگی عرفان' یہ تمام موت و زندگیاں قبضۂ رحمٰن میں ہیں جسے چاہے جب چاہے زندگی بخشے جب چاہے موت دے دے۔ یہ آیت کریمہ بہت جامع ہے۔ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ اس آیت کی تفسیر پہلے ہو چکی' یہاں اتنا سمجھ لو کہ رزق کے معنی ہیں حصہ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (واقعہ: ۸۲) اب رب تعالیٰ کی نعمت کے حصہ کو رزق کہا جاتا ہے۔ رزق تین قسم کا ہے۔ رزق جسمانی' رزق دلی' رزق روحانی' رزق جسمانی بہت قسم کا ہے۔ آنکھ' ناک' کان وغیرہ ہر عضو کا رزق علیحدہ ہے۔ دل کا رزق عشق و محبت ایمان و

تعلقات

اس آیت کا گذشتہ آیتوں سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** گذشتہ آیتوں میں منافقین کے اس بہتان کی تردید کی گئی تھی، کہ نبی کریم ﷺ نے مال غنیمت میں سے چادر لے لی، اب ان کے اس الزام کی تردید ہے کہ حضور انور ﷺ کے ہوتے ہوئے ہمیں جنگ احد میں ہزیمت کیوں پہنچی، گویا پہلے اس ذات کریم سے بہتان کو دفع کیا، اب الزام کی مدافعت کی جاتی ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور انور ﷺ کے فضائل شاندار طریقہ سے بیان فرمائے، جس پر کسی بد باطن کو اعتراض ہو سکتا تھا کہ جب حضور انور ﷺ اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت ہیں، تو احد میں اس رحمت کے ہوتے ہوئے مسلمان زحمت میں کیوں پڑ گئے، اس آیت کریمہ میں اس کا جواب دیا جا رہا ہے کہ یہ زحمت تمہاری اپنی غلطی سے ہے لین دین کے لئے دینے والے میں دینے کا زور چاہیے، اور لینے والے میں لینے کی طاقت، وہاں دینے والے کے زور کا ذکر تھا، یہاں ہم لینے والوں کی کمزوری کا، **تیسرا تعلق:** گذشتہ آیت میں بھی حضور انور ﷺ کی تعریف تھی، اور اس آیت میں بھی انہی کی مدحت و ثناء ہے، مگر وہاں اوصاف ثابت کر کے، اور یہاں عیوب کی نفی فرما کر، **چوتھا تعلق:** گذشتہ آیت سے معلوم ہوا تھا کہ نبی کریم ﷺ سارے مسلمانوں کو خدا تعالیٰ کی نعمتیں دیتے ہیں، تزکیہ (پاکی) تلاوت، علم، قرآن، سنت، سب انہی کے ہاتھوں ملتی ہیں، اب ہم گنہگاروں کو ان سے لینے اور مانگنے کا طریقہ سکھایا جا رہا ہے، کہ ان کی اطاعت کرو، کبھی ان کے فرمان سے باہر نہ ہو، دیکھو پھر کیسے باغ کھلتے ہیں، شعر

فیض جلیل خلیل سے پوچھو آگ میں باغ لگاتے ہیں

وہی رب ہے جس نے تجھ کو ہم تن کرم بنایا ہمیں بھیک مانگنے کو ترا آستاں بتایا

تجھے حمد ہے خدایا

تفسیر

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ، یہ نیا جملہ ہے، ہمزہ استفہام انکاری کا ہے، لَمَّا ظرف بمعنی شرط ہے جس کی شرط تو اَصَابَتْ ہے اور مظروف قُلْتُمْ، اسی قُلْتُمْ میں جزاء کے معنی بھی ہیں، اصابت متعدی بیک مفعول بھی ہوتا ہے، اور بدو مفعول بھی، یہ متعدی بیک مفعول ہے اور اَصَبْتُمْ متعدی بدو مفعول یعنی اس کے معنی پہنچنا بھی ہیں پہنچانا بھی، ظاہر یہ ہے کہ مصیبت سے مراد غزوۂ احد کی مصیبت ہے جو غازیوں کو پہنچی تھی، اور ہو سکتا ہے کہ اس سے ہر مصیبت مراد ہو، اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کا ترجمہ دوسرے معنی پر ہے، اور ہمارا ترجمہ پہلی توجیہ پر، یعنی جب تم کو احد میں ایک مصیبت پہنچی، یا تمہارا دستور یہ ہے کہ جب تمہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے، **قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا** یہ جملہ مُّصِيْبَةٌ کی صفت ہے، اَصَبْتُمْ متعدی بدو مفعول ہے مفعول اول یعنی کفار پوشیدہ ہے، اور مفعول دوم مِّثْلَيْهَا ہے، یعنی جب تمہیں ایک ایسی مصیبت پہنچی، جس سے دوگنی تم کفار کو پہنچا چکے تھے، اس میں گفتگو ہے کہ دوگنی سے کیا مراد ہے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ قتل و قید ہے، جو بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں کفار کو پہنچا، چونکہ قید بھی قتل کی طرح ہے کہ مسلمان ان قیدیوں کے قتل پر قادر ہو چکے تھے، اس لئے مِّثْلَيْهَا فرمایا، بعض

ہمیشہ رہے۔ جیسا کہ عرب خصوصاً قریش خاص کر بنی ہاشم ایسا چمکتا دمکتا سچا سورج پیدا فرمایا جس نے فرش و عرش کو چمکا دیا۔ اور بنی اسرائیل کے زندہ خاندان سے جس میں صدہا انبیاء تشریف لائے وہ یہود و نصاریٰ پیدا فرمائے جن میں زندگی کا کوئی اثر نہیں۔ یہ سب تیرے قبضہ قدرت میں ہیں۔ دنیا کی ٹیپ ٹاپ سب بے اصل و بے حقیقت ہے۔ اور اے مولیٰ تیرے دین پر بھی کسی کا قبضہ نہیں۔ جسے چاہے بے مشقت اتنا دے جو اس کے حساب میں نہ آسکے اور گمان سے بالاتر ہو۔ اور جسے چاہے مشقت کے باوجود کافی روزی ہاتھ نہ آئے' یا تو جسے چاہے وہ مال دے جس کا قیامت میں حساب نہیں۔ فرمایا نبی ﷺ نے کہ میری امت میں ستر ہزار انسان بغیر حساب جنتی ہیں۔ حضرت عکاشہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ دعا فرمادیں کہ میں ان میں سے ہوں۔ فرمایا تم ان میں سے ہو دوسرا آدمی بولا' حضور ﷺ دعا کریں میں بھی ان میں سے ہوں فرمایا۔ حضرت عکاشہ تم پر سبقت لے گئے گویا تم ان میں سے نہیں ہو یہ ہے اس آیت کی تفسیر۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** جیسی دعا مانگنی ہو رب کو اسی نام سے پکارنا چاہیے۔ رزق مانگنے کے لئے اسے رزاق کہو۔ شفا مانگنے کے وقت شافی الامراض کہہ کر پکارو۔ بندوں کی حاجتیں بہت ہیں۔ اس لئے رب کے نام بھی بہت چونکہ یہاں ملک کی دعا کرائی گئی تھی' اس لئے رب کو مالک الملک کہہ کر پکارا۔ دنیا کا بھی طریقہ ہے کہ جب فقیر کسی دروازہ پر بھیک مانگنے جاتا ہے تو گھر والے کو سخی داتا کہہ کر پکارتا ہے کیونکہ سخاوت چاہنے کے لئے آیا ہے اور جب جرنیل کسی فوج کو جنگ کی ترغیب دیتا ہے تو کہتا ہے اے میرے بہادرو۔ **دوسرا فائدہ:** رب کی حمد وثنا بھی در پردہ دعا ہے۔ دیکھو یہاں ملک مانگنا مقصود تھا مگر صاف نہ کہا گیا بلکہ اس کی یوں تعریف کردی کہ تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ خیال رہے کہ قرآن کریم میں دعا کے چار طریقوں کی تعلیم ہے۔ صراحۃً مانگنا' صرف اپنی حاجات کا ذکر کرنا مانگنے کے الفاظ نہ ہوں۔ رب تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا۔ اس کے محبوب پر درود پڑھنا۔ یہ چاروں طریقہ فطرت کے مطابق ہیں۔ غنی کے دروازے پر جب صدا دیتے ہیں تو کبھی صاف صاف لفظوں سے مانگتے ہیں۔ کبھی اپنا فقر و فاقہ بیان کرتے ہیں۔ بھوکا ہوں' مسافر ہوں' کبھی مالک کی تعریفیں کرتے ہیں۔ آپ سخی ہیں' داتا ہیں' کبھی مالک کے بچوں کو دعائیں دیتے۔ خانہ آباد دولت زیادہ' بال بچے شاد۔ یہ ہی طریقے رب تعالیٰ سے دعا مانگنے کے ہیں۔ جن کی روایات موجود ہیں۔ یہاں تیسرا طریقہ ارشاد ہوا ہے کہ رب سے ملک' عزت' خیر سب کچھ مانگا مگر طلب کا صیغہ نہیں آیا صرف رب کی مہر اس طرح کی کہ مانگ خود بخود آگئی مطلب یہ ہے کہ ہم کو ملک دے کفار سے چھین لے ہم کو عزت کفار کو خواری دے۔ ہمیں خیر کثیر بخش دے۔ **تیسرا فائدہ:** حضرات انبیاء و اولیاء بعطاء الٰہی رب کے ملکوں کے مالک ہیں۔ رب کے دیئے ہوئے اختیارات سے عالم میں نصرت کرتے ہیں۔ جیسا کہ تُؤتِی الْمُلْکَ سے معلوم ہوا اگر رب نے انہیں ملک نہ دیئے تو وہ پورا مالک نہ رہا۔ رب مالک بھی ہے مالک گر بھی۔ **چوتھا فائدہ:** سلطنت اور دنیوی تمام نعمتیں کسی شخص کے لئے لازم نہیں۔ رب جب چاہے چھین لے ان پر بھروسہ نہ چاہیے مگر نبوت شخص کے لئے لازم ہوتی ہے۔ قوم کے لئے نہیں' کوئی نبی کبھی معزول نہیں ہوسکتا اسے قرب الٰہی ہمیشہ رہے گا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ کچھ زمانہ کسی خاندان میں فضل آئیں اور پھر دوسرے خاندان میں۔ جیسے بنی اسرائیل

شہادت اس کے تو ہم منتظر ہیں، ہماری جانوں کی بڑی قیمت یہی ہے کہ راہِ خدا میں قربان ہو جائیں، چنانچہ بدر کے قیدیوں سے فدیہ لے لیا گیا، اور غزوۂ احد میں ان قیدیوں کی تعداد کے برابر ستر مسلمان شہید ہوئے (تفسیر خازن روح المعانی و تفسیر کبیر وغیرہ) مگر پہلی دو وجہیں قوی معلوم ہوتی ہیں، اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، رب تعالیٰ نے اس آیت کو اپنی قدرت کے ذکر پر ختم فرمایا، یا تو گذشتہ سے ڈرانے کے لئے یا آئندہ امید دلانے کے لئے یعنی تم نے آزمالیا کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں، دیکھو بدر میں تم صرف تین سو تیرہ تھے مگر غالب آ گئے، اور احد میں تم سات سو تھے مگر غالب نہ آ سکے، معلوم ہوا کہ فتح و شکست ہمارے قبضہ میں ہے، جن وجوہ سے جنگِ احد کا نقشہ بدلا، ان وجوہ سے آئندہ پرہیز کرنا، یا یہ مطلب ہے کہ مایوس نہ ہو اللہ ہر شئے پر قادر ہے، تمہیں آئندہ جنگوں میں فتح عطا فرمائے گا جس سے احد کا بدلہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو جائے گا، رب تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا، شَیْءٍ اور قَدِیْرٌ کے معانی ہم پہلے پارے میں عرض کر چکے ہیں، اس آیت سے مسئلہ امکانِ کذب کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتا، اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہو سکتے، کہ اللہ تعالیٰ ہر بری بھلی چیز، جھوٹ، زنا، موت وغیرہ سے موصوف ہو سکتا ہے جیسا کہ بعض نادانوں نے سمجھا، اس کی مکمل بحث پارۂ اول میں اسی آیت کے ماتحت دیکھو، وہاں پوری بحث کر دی گئی ہے،

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! یہ کچھ عجیب ہی سا معاملہ ہے کہ جب تمہیں جنگِ احد میں کچھ تکلیف پہنچ گئی کہ تم میں سے ستر حضرات شہید ہوئے، حالانکہ تم اس سے دوگنی تکلیف کافروں کو جنگِ بدر میں پہنچا چکے تھے، اور وہ کفار تمہارے ہاتھوں ڈبل مصیبت اٹھا چکے کہ تم تو صرف ستر ہی شہید ہوئے، اور وہ ستر مارے بھی گئے، اور ستر قیدی بھی ہوئے تھے، نیز تم تو صرف غزوۂ احد میں شہید ہوئے، وہ تمہارے ہاتھوں دو دفعہ مار کھا گئے، مگر اس کے باوجود وہ نہ ہمت ہارے، اور نہ کسی قسم کی انہوں نے شکایت کی، نہ انہیں اپنے دین میں کچھ تردد ہوا، بلکہ ایک سال بعد ہی بہت جوش سے تم پر حملہ آور ہو گئے، مگر تم ہو کہ ذرا سی مصیبت میں گھبرا کر اور قسم کی باتیں کرنے لگے، تم میں سے بعض نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہم حق پر بھی ہیں، ہمارا دین بھی سچا ہے، ہم لڑتے بھی اللہ کے لئے ہیں، ہمارے ساتھ اللہ کے رسول بھی ہیں جن کا لقب ہے رحمۃ للعالمین، اور کفار باطل پر بھی ہیں، وہ لڑتے بھی ہیں بتوں کے لئے، اور کسی کے سایہ میں بھی نہیں ہیں، پھر بھی غالب وہ آ گئے، مغلوب ہم ہو گئے، یہ واقعہ بن کیسے گیا اور ہماری مغلوبیت آئی کہاں سے، اے محبوب! آپ ان گھبرانے والوں کو جواب دے دو، کہ احد میں جو کچھ پیش آیا وہ تمہارے اپنے قصور سے تھا، ہمارے محبوب ﷺ کا سنبھالا ہوا درہ تم نے غلطی سے چھوڑ دیا، یا میدانِ جنگ معین کرنے اور نقشہ جنگ بنانے میں تم نے غلطی کی، یا بدر کے موقعہ پر قیدیوں سے فدیہ لیتے وقت تم خود یہ شہادت منظور کر چکے تھے، پھر اسلام کی حقانیت یا نبی کریم ﷺ کی رحمت عامہ کے متعلق تردد کیوں کرتے ہیں، اپنی غلطی میں غور نہیں کرتے، اچھا جو ہوا سو ہوا، اب آئندہ ایسی غلطیاں نہ کرنا، ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں فتوحات دیں گے ہم ہر چیز پر قادر ہیں جو چاہیں کریں، ہم پر توکل کرو، ہمارے محبوب کے زیرِ سایہ رہو،

ہمارے خاندان میں رہنی چاہیے کہ پہلے سے اسی خاندان میں تھی۔ دوسرا یہ کہ چھیننے سے مراد محروم رکھنا ہے۔ یعنی جسے چاہے نبوت دے۔ جسے چاہے محروم رکھے۔ جیسے رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ (بقرہ: ۲۵۷) اللہ مسلمانوں کو تاریکی سے روشنی میں لاتا ہے۔ مسلمان تاریکی میں تھے ہی کہاں۔ مطلب یہ ہی ہے کہ انہیں اندھیرے سے محفوظ رکھتا ہے۔ (کبیر) **دوسرا اعتراض:** اس آیت میں فرمایا گیا کہ مردہ کو زندہ سے اور زندہ کو مردہ سے پیدا فرماتا ہے۔ اس میں تسلسل یا دور لازم آتا ہے۔ ہر بے جان کا ہر جاندار سے نکلنا ناممکن ہے۔ (بعض سرپھرے منطقی) **جواب:** اس کے معنی یہ نہیں کہ ہر بے جان جاندار ہے اور ہر جاندار بے جان سے پیدا ہو بلکہ خدا کی قدرت کا اظہار ہے یعنی وہ ایسا قادر ہے کہ کبھی ایک ضد کو دوسری ضد سے پیدا فرماتا ہے۔ **تیسرا اعتراض:** بھلا زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ کبھی نکل سکتا ہے اور کیا قانونِ قدرت میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** پنڈت جی ایسا دن رات ہوتا ہے۔ بے جان منی سے لاکھوں زندہ اور بولتے ہوئے پنڈت بن گئے اور ہزاروں پنڈتوں سے بے شمار بے جان نطفے نکل چکے۔ پنڈت جی تم بھی بے جان نطفہ سے ہو پھر صدہا پاپیوں سے پوتر پیدا ہوتے ہیں اور پوتروں سے پاپی۔ اس کا دن رات مشاہدہ ہو رہا ہے۔ **چوتھا اعتراض:** آیت میں یہ فرمایا گیا کہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل فرماتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رات دن کو بیک وقت جمع فرماتا ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ دن رات کے گھٹنے بڑھنے پر یہ دخول صادق نہیں آتا۔ دخول جب ہوگا کہ رات رہے کہ دن آ جائے۔ **جواب:** دن اور رات وقت کے اوصاف ہیں جن کا اجتماع ناممکن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ ایک ہی وقت کو کبھی رات بنا دیتا ہے کبھی دن' یعنی دن رات دشمنی کے باوجود ایسی سخاوت کرتے ہیں کہ کبھی رات اپنا کچھ حصہ دن کو بخش دیتی ہے اور کبھی دن رات کو۔ اور یہ تبدیلی عبرت کے لئے ہے۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت میں فرمایا گیا بِیَدِکَ الْخَیْرُ۔ تیرے قبضہ میں صرف خیر ہے تو کیا شر اسکے قبضہ میں نہیں' ایمان مفصل میں پڑھا جاتا ہے۔ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَ شَرِّہٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی۔ اس آیت اور عقیدہ میں مطابقت کیونکر ہو۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ آیت میں ادب کا لحاظ ہے اور عقیدہ میں واقعہ کا ذکر' یعنی درحقیقت ہر چیز اللہ کے قبضہ میں ہے مگر ادب یہ ہے کہ اس کی طرف خیر کی نسبت کرو۔ دوسرا یہ کہ چونکہ یہ دعا کا موقعہ ہے اور اس سے خیر مانگنا مقصود ہے۔ لہٰذا شر کا ذکر نہ ہوا۔ تیسرا یہ کہ ہر شر میں خیر ہوتی ہے۔ مصیبت شر ہے مگر باعث ثواب۔ لہٰذا یہ خیر بھی ہے۔ صورتاً شر اور حکمت کے لحاظ سے خیر۔

تفسیر صوفیانہ

اے اللہ تو ملک جسم' ملک روح' ملک امکان' مالک انوار کا دائمی مالک ہے۔ تیرے سوا ان پر کسی کا مستقل قبضہ نہیں۔ ہاں جب تو چاہتا ہے کسی کو ظاہری قبضہ و ملک دے دیتا ہے۔ یہ قبضہ و ملک کی تبدیلیاں محض ظاہری و مجازی ہیں۔ جسے چاہتا ہے اپنے تجلیات دکھا کر عزت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے عزت کا لباس اتار کر ذلیل کر دیتا ہے جو کچھ تیری طرف سے ہے سب خیر ہے تو ہر بات پر قادر ہے۔ سب چیزیں تیرے صفات کی مظہر ہیں۔ کسی پر عزت و کبریائی کا ظہور فرما کر اسے عزیز فرماتا ہے اور کسی پر صفت قہر کی جلوہ گری فرما کر اسے ذلیل کرتا ہے کسی پر صفت غنا کی تجلی فرما کر اسے مالدار بنا دیتا ہے۔ کسی پر صفت اغنا کا

خزاں جائیگی جائیگی بہار آئیگی کلیوں میں لگیں کے نعرۂ تکبیر پھر دہلی کی گلیوں میں

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام بہت جلد گھبرا جانے والے تھے، اور معمولی آفتوں پر دین میں تردد کر لیتے تھے، یہ تردد کفر ہے! **جواب:** اگر اس آیت میں منافقین کا ذکر ہے، تب تو کوئی سوال ہی نہیں، اور اگر ضعفائے مومنین کا ذکر ہے جیسا کہ وہ ظاہر ہے، تو یہ کلام تردد کے لئے نہیں بلکہ تعجب کے طور پر ہے، فرشتوں نے عرض کیا تھا اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا (بقرہ: ۳۰) بنی اسرائیل نے طالوت کے بارے میں کہا تھا اَنّٰی یَکُوۡنُ لَهُ الۡمُلۡکُ عَلَیۡنَا الخ (بقرہ: ۲۴۷) حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرزند کی خوشخبری پا کر کہا تھا اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ وَلَدٌ (آل عمران: ۴۷) بلکہ زکریا علیہ السلام نے فرزند کی بشارت پا کر ایسا ہی سوال کیا تھا، **دوسرا اعتراض:** مِّثۡلَیۡهَا میں مصیبت کے لئے ضمیر مؤنث لائی گئی، اور قُلۡ هُوَ الخ میں اسی مصیبت کے لئے ضمیر مذکر ارشاد ہوئی، اس کی وجہ کیا ہے، مصیبت مذکر ہے یا مؤنث؟ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گذر گیا کہ ھو کا مرجع مصیبت نہیں بلکہ اَصَابَتۡ فعل کا مصدر ہے، چونکہ مصدر مذکر بھی استعمال ہوتا ہے مؤنث بھی، اس لئے ضمیر مذکر ادھر لوٹ گئی، **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام گناہ بھی کرتے تھے اور انہیں اس پر سزائیں بھی ملتی تھیں، دیکھو احد کی شکست ان کے گناہوں کا نتیجہ تھی، پھر تم کیسے کہتے ہو کہ تمام صحابہ عادل تھے؟ **جواب:** اس موقعہ پر ان حضرات سے گناہ نہ ہوا بلکہ خطا ہوئی، اور یہ عذاب نہ تھا بلکہ محبوبانہ عتاب تھا، خطاء پر عتاب انتہائی محبت کی دلیل ہے، استاد کو جس شاگرد سے زیادہ محبت ہوتی ہے اس کی کڑی نگرانی رکھتا ہے، اور بات بات پر اس پر عتاب کرتا ہے، کیوں؟ اس کی اصلاح کے لئے یونس علیہ السلام، آدم علیہ السلام جیسے مقدس بزرگوں سے معمولی لغزش ہوئی، جس پر سخت عتاب ہوا، کیا تم ان پر بھی زبان درازی کرو گے؟ غرضکہ عتاب، عقاب، عذاب میں فرق نہ کرنا بڑی غلطی ہے، خیال رہے کہ خطاء اجتہادی پر گناہ تو نہیں ہوتا، مگر عتاب ہو سکتا ہے، اور اس پر دنیاوی تکالیف بھی آسکتی ہیں، یہاں مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِکُمۡ میں اسی طرح اشارہ ہے، حضرت آدم و یونس علیہما السلام پر لغزش اجتہادی کے باعث عتاب بھی ہوئے تکالیف بھی آگئیں،

تفسیر صوفیانہ

دنیا میں انسان تین قسم کے ہیں، ایک وہ جن پر نفس غالب ہے، دوسرے وہ جن پر عقل غالب، تیسرے وہ جن پر عشق غالب، نفسانی لوگ چاہتے ہیں کہ بغیر کچھ کئے ان کی تعریفیں بھی ہوں اور انہیں سب کچھ مل جائے، رب تعالیٰ فرماتا ہے اَنۡ یُّحۡمَدُوۡا بِمَا لَمۡ یَفۡعَلُوۡا (آل عمران: ۱۸۸) بلکہ نفس کا جب غلبہ ہوتا ہے، تو انسان چاہتا ہے کہ میں کروں برائی اور ہو میری تعریف، جیسا کہ آج بھی دیکھا جا رہا ہے کہ بعض لوگ فسق پر تعریف چاہتے ہیں، جن پر عقل کا غلبہ ہے وہ اچھی باتوں کو تو اپنی طرف نسبت کرتے ہیں کہ ہم نے یہ کارنامے کئے، اور بری باتوں کو وہ رب تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہ عقل درحقیقت شیطانی ہوتی ہے، شیطان نے عرض کیا تھا رَبِّ بِمَاۤ اَغۡوَیۡتَنِیۡ (حجر: ۳۹) خدایا تو نے مجھے گمراہ کر دیا، یعنی میں تو ہدایت پر تھا، عابد

کہ دن رات کا معنوی نکاح ہوا جس سے اشیاء پیدا ہوئیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ یُغْشِی الَّیْلَ النَّھَارَ۔ (اعراف: ۵۴) جو چیز دن میں پیدا ہو اس کے لئے دن ماں ہے اور رات باپ اور رات کے اعمال کے لئے رات ماں ہے اور دن باپ۔ اسی پر عالم کا مدار ہے۔ ہر سلطنت و ملک کا دن رات' تاریخ' مہینہ' سنہ جداگانہ ہے۔ ایسے ہی رب تعالیٰ کا دن رات مخلوق کے دن رات سے جداگانہ ہے۔ اس کی پوری تحقیق آگے ہوگی۔

مجرب عمل: جس شخص پر بہت قرض ہوگیا ہو اور اس کے ادا کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو۔ اس کو چاہیے کہ نماز وتر کے بعد دو رکعت نفل کھڑے ہو کر پڑھا کرے۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد یہ آیتیں قُلِ اللّٰھُمَّ سے بغیر حساب تک پانچ بار پڑھا کرے۔ انشاء اللہ اس کا قرض بہت جلد ادا ہو جائے گا۔ یہ عمل نہایت مجرب ہے۔ خود میں نے اس کا تجربہ کیا۔ نیز اگر کوئی ہمیشہ وتر کے بعد دو نفل کھڑے ہو کر پڑھ لیا کرے جس میں سورۂ فاتحہ کے بعد ایک ایک بار یہ آیتیں پڑھ لیا کرے تو اس پر کبھی قرض نہ ہوگا۔

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ج
نہ بنائیں ایمان والے کافروں کو دوست سوا مسلمانوں کے
مسلمان کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں مسلمانوں کے سوا
وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰۃً ط
اور جو کوئی کرے گا یہ پس نہیں ہے وہ اللہ سے بیچ کسی چیز کے مگر یہ کہ ڈرو تم ان سے ڈرنا
اور جو ایسا کرے گا اسے اللہ سے کچھ علاقہ نہ رہا مگر یہ کہ تم ان سے کچھ ڈرو اور اللہ تمہیں
وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ط وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸﴾ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ
اور ڈراتا ہے تم کو اللہ ذات سے اپنی اور طرف اللہ کے لوٹنا ہے فرما دو اگر چھپاؤ تم وہ جو بیچ
اپنے غضب سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف پھرنا ہے تم فرما دو کہ اگر تم اپنے جی کی بات
صُدُوْرِکُمْ اَوْ تُبْدُوْہُ یَعْلَمْہُ اللّٰہُ ط وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ
سینوں تمہارے کے ہے یا ظاہر کرو اس کو جانے گا اللہ اس کو اور جانتا ہے جو بیچ آسمانوں کے ہے
چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ کو سب معلوم ہے اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے
وَمَا فِی الْاَرْضِ ط وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾
اور وہ جو بیچ زمین کے ہے اور اللہ اوپر ہر چیز کے قدرت والا ہے
اور جو کچھ زمین میں ہے اور ہر چیز پر اللہ کا قابو ہے

أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَّا
قریب ہیں کفر سے بمقابلہ ایمان کے کہتے ہیں اپنے منہ سے
ایمان کی بہ نسبت کھلے کفر سے زیادہ قریب ہیں اپنے منہ سے کہتے ہیں
لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿١٦٧﴾
وہ جو نہیں ہے ان کے دلوں میں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں
جو ان کے دل میں نہیں اور اللہ کو معلوم جو چھپا رہے ہیں

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں غزوۂ احد میں مسلمانوں پر مصیبت آجانے کی ایک وجہ بیان فرمائی گئی تھی، یعنی مسلمانوں کی اپنی غلطی، اب اس کی دوسری دو اور وجہیں بیان ہو رہی ہیں، یعنی مومن و منافق کی چھانٹ اور منافقوں کو ظاہر فرما دینا، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں غزوۂ احد کی تکالیف کی وجہ مذکور ہوئی تھی اس آیت میں اس کی حکمتِ الٰہیہ کا تذکرہ ہے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو غزوۂ احد میں پیش آنے والے واقعات کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اب ان کی اشک شوئی اور دلجوئی کی جا رہی ہے، کہ گھبراؤ مت، تمہاری اس غلطی میں بھی رب تعالیٰ کا راز ہے، تمہاری اس غلطی سے مسلمانوں کو بڑے فائدے حاصل ہوئے، **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ذکر تھا، اب اس قدرت کا اظہار ہے، کہ اس نے اپنی قدرت سے تمہاری غلطی سے لوگوں کو بہت فائدے پہنچائے،

تفسیر

وَمَآ أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ، یہ جملہ مستقل ہے، واؤ ابتدائیہ ہے، اَصَابَ سے وہ تکالیف و مصیبتیں مراد ہیں جو مسلمانوں کو پہنچیں، یَوْمَ سے غزوۂ احد کا دن مراد ہے، اور جمعان سے غازی مسلمانوں اور کفار مکہ کے لشکر مراد ہیں اِلْتَقٰی سے مراد جنگ میں بھڑ جانا ہے، یعنی اے مسلمان غازیو! غزوۂ احد کے دن جبکہ مومن و کافر لشکر بھڑ گئے تھے، اس دن جو کچھ تکلیف و مصیبت تمہیں پہنچی، فَبِإِذْنِ اللهِ یہ مَا کی خبر ہے، چونکہ ما مبتداء میں شرط کے معنی بھی تھے اسی لئے خبر پر ف آ گئی، اگر چہ یہ واقعہ ماضیہ کا ذکر ہے، اور ف مستقبل شرط و جزاء پر آتی ہے نہ کہ ماضی پر، مگر چونکہ اس کا ظہور اس آیت کے بعد ہوگا، اس لئے ایک لحاظ سے یہ مستقبل ہے، لہٰذا ف کا آنا درست ہوا (روح المعانی) یعنی رب تعالیٰ کے بتانے کے بعد مسلمانوں کو اس کی ہزیمت کی حکمتیں معلوم ہوں گی، عربی خصوصاً قرآنی اصطلاح میں اِذْن کے بہت معنی ہیں، ارادہ، علم، اسی لئے بتانے، اعلان کرنے کو اذان کہا جاتا ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے أَذَانٌ مِّنَ اللهِ وَرَسُولِهِ (توبہ: ۳) اور فرماتا ہے اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيدٍ (فصلت: ۴۷) اور فرماتا ہے فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللهِ وَرَسُولِهِ (بقرہ: ۲۷۹) قضاء و قدر، تخلیہ، حکم، یہاں سارے معنی درست ہیں، یہ جو کچھ ہوا اللہ کے ارادہ، اللہ کے علم سے، اللہ کے قضاء و قدر سے ہوا، اللہ کے تخلیہ سے ہوا، اس نے

اور دوستی بھی تین قسم کی ہے۔ معاملات کی دوستی جیسے بروقسط کہتے ہیں جائز ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا یَنۡهٰکُمُ اللّٰهُ الخ۔ (الممتحنہ: ۸) نبی علیہ السلام نے کفار سے لین دین کے معاملات کئے ہیں بوقت وفات آپ کی زرہ یہودی کے پاس گروی تھی۔ کفار سے محبت حرام ہے۔ کفر سے محبت کفر ہے۔ یہاں آخری دو محبتیں مراد ہیں۔ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ۔ یہ فاعل کا حال ہے اور متجاوزین کے متعلق۔ بعض نے کہا کہ اولیاء کی صفت ہے۔ بعض کے نزدیک یہ اتخاذ کے متعلق ہے۔ (روح المعانی) دُوۡنِ کے معنی کوتاہ یا پیچھے رہنے والا ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ ذلو کا مقلوب ہے۔ اب بمعنی غیر اور سوا استعمال ہوتا ہے مگر ہر سوا کو دون نہیں کہتے۔ ہر سواء کو اِلَّا کہا جاتا ہے۔ اجنبی کو غیر اور مقابل کو دون بولتے ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَوَجَدَ مِنۡ دُوۡنِهِمُ امۡرَاَتَیۡنِ۔ (قصص: ۲۳) اس لئے کلمہ طیبہ میں الا اللہ کہا جاتا ہے۔ دون اللہ نہیں کہا جاتا۔ یعنی مسلمانوں کو چھوڑ کر یا ان سے پیچھے رہتے ہوئے یا ان کے معاملہ میں کوتاہی کرتے ہوئے یا مسلمانوں کے سواء کافروں کو دوست نہ بناؤ۔ اگر دون بمعنی مقابل ہے تو معنی ظاہر ہیں کہ مسلمانوں کے مقابل کفار کو دوست نہ بناؤ کہ ان کی مدد لے کر مسلمانوں کو تباہ کرو اور اگر بمعنی سواء ہے تو یہ قید اتفاقی ہے نہ کہ احترازی جیسا کہ انشاء اللہ سوال جواب میں معلوم ہوگا۔ وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ فَلَیۡسَ مِنَ اللّٰهِ فِیۡ شَیۡءٍ..... ذٰلِکَ سے اتخاذ کی طرف اشارہ ہے جو یتخذ کا مصدر ہے۔ مِنَ اللّٰهِ میں ولایت یا محبت پوشیدہ ہے یعنی من ولایۃ اللہ یا من محبت اللہ۔ یہ لفظ شیئٌ کا حال مقدم ہے۔ یا شیئ کی تنوین حقارت کی ہے۔ اور فِیۡ شَیۡءٍ لیس کی خبر۔ اصل عبارت یوں تھی فَلَیۡسَ فِیۡ شَیۡءٍ مِنۡ وَلَایَةِ اللّٰهِ۔ یعنی جو کفار سے محبت کرے گا یا انہیں اپنا مددگار بنائے گا وہ اللہ کی دوستی کے کسی درجہ میں نہیں۔ یعنی اسے رب سے محبت کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ دشمن سے دوستی بھی دشمنی ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر ولایت کفار سے مراد کفر سے دوستی ہو تو یہاں شئی سے اسلام ہوگا یعنی جو کفار کے کفر سے دوستی رکھے گا وہ اللہ کے ہاں اسلام میں بالکل شمار نہ ہوگا۔ ان ہی کی طرح کافر ہوگیا اور اگر محبت کفار مراد ہے تو شئی سے مراد رحمت ہوگی یعنی جو کفار سے محبت کرے گا وہ اللہ کی رحمت میں بالکل نہ ہوگا۔ نہ دنیا میں نہ برزخ میں نہ آخرت میں۔ دنیا کی رحمت سے روحانی رحمت مراد ہے کیونکہ دنیا میں جسمانی نعمت تو دوست و دشمن سب کو مل جاتی ہے یعنی جو کفار کو دوست بنائے گا وہ دنیا میں روحانی نعمتوں ایمان، عرفان وغیرہ سے دور رہے گا۔ برزخ میں کامیابی امتحان اور آخرت میں مغفرت و غفران سے محروم ہوگا۔ اِلَّا اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ تُقٰةً۔ یہ لَا یَتَّخِذُ کے حالات سے استثناء ہے یا اس کے پوشیدہ مفعول لہٗ سے۔ اِنۡ سے پہلے حال یا اجل پوشیدہ یعنی حال اَنۡ تَتَّقُوۡا یا لِاَجۡلِ اَنۡ تَتَّقُوۡا۔ تتقوا کا مصدر اتقاءٌ ہے۔ مادہ وقی یا وقایۃ بمعنی بچنا یا ڈرنا یہاں دونوں معنی درست ہیں۔ مِنۡهُمۡ کا مرجع کفار ہیں۔ اور یہ پوشیدہ کے متعلق ہو کر تقۃً کا حال مقدم ہے۔ اصل عبارت یوں تھی۔ اِلَّا حَالَ اَنۡ تَتَّقُوۡا تُقٰةً ثَابِتَةً مِنۡ جِهَتِهِمۡ تُقٰةً اصل میں وَقِیَةً تھا واؤت سے بدلا گیا۔ جیسے وجاۃ سے تجاۃ اور ی ماقبل کے فتح کی وجہ سے الف ہوگئی۔ یہ بروزن فعلۃ ہے جیسے تخمۃ اور تُؤَدَةٌ یہ باب افتعال کا مصدر غیر قیاسی ہے۔ (روح المعانی) یا تو بمعنی مصدری ہے۔ تَتَّقُوۡا کا مفعول مطلق یا حاصل بالمصدر اور تَتَّقُوۡا کا مفعول بہ یعنی کفار کو کبھی کسی حال میں کسی غرض کے لئے دوست نہ بناؤ مگر اس صورت میں جب تم اس سے ڈرو یا تمہیں ان سے کوئی خوف ہو تب منہ سے ظاہری نرمی مدارات کرسکتے ہو۔ جیسے اولیاء کی تین تفسیریں تھیں۔ کفار کو مددگار نہ بناؤ۔ ان سے قومی دوستی نہ کرو۔ ان سے دینی دوستی نہ کرو۔ ایسے ہی اِلَّا اَنۡ

تعالیٰ نے موقعہ دیا ہے جہاد میں جواں مردی دکھاؤ اور اپنے پہ الزام دور کر دو، یا اے بدنصیبو! اگر تم جہاد فی سبیل اللہ نہیں کر سکتے، تو اپنے بال بچوں، گھر بار، اپنے ملک سے تو دشمن کو دور کرو، اگر دشمن غالب آ گیا، تو سارے مدینہ کو تباہ کرنے کی کوشش کرے گا، جس میں تمہارے بال بچے اور گھر بار بھی رگڑے جائیں گے کیونکہ ع سب مصیبت جھیلتے ہیں جب اجڑتا ہے چمن، قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ، یہ جملہ قِیْلَ لَهُمْ کا جواب ہے جس میں منافقین کا جوابی کلام نقل فرمایا گیا، اگرچہ جواب دینے والا صرف عبداللہ ابن ابی تھا، یا بعض سرداران منافقین، مگر چونکہ ان سب منافقوں کی طرف سے یہ جواب تھا اس لئے سب کو اس کا فاعل بنایا گیا، اور قَالُوْا ارشاد ہوا، لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا میں چند احتمال ہیں، اور ان کی اس بکواس کے چند مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ ہمیں لڑنا بھڑنا آتا ہی نہیں، ہم تو پالیسی باز صلح کل ہیں، اگر ہمیں لڑنا بھڑنا آتا ہوتا تو تمہارے ساتھ رہتے۔ دوسرے یہ کہ اگر ہم جانتے ہوتے کہ اس وقت جنگ ہوگی تو تمہارے ساتھ رہتے ہمیں یقین ہے جنگ کوئی نہیں ہوئی، لہٰذا ہمارے ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے، یہ انہوں نے طنزاً، مذاقاً، استہزاءً کہا، تیسرے یہ کہ اگر ہم اسے جنگ سمجھتے تو تمہارے ساتھ رہتے، یہ جنگ نہیں بلکہ مسلمانوں کا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، کیونکہ جنگ میں برابر کی طاقت چاہیے، تم مٹھی بھر سات سو، وہ کفار تین ہزار کا لشکر جرار، پھر یہ جنگ ہوئی کہ ہلاکت، خیال رہے کہ یہاں اتباع سے مراد مسلمانوں کی بات ماننا ہے یا مسلمانوں کے پیچھے پیچھے رہنا، کیسی بات ان کے منہ سے نکلی، جس سے ان کا نفاق اور بھی ظاہر ہو گیا، یعنی اگر ہم لڑنا بھڑنا جانتے ہوتے تو بھی لڑتے نہیں تمہارے ساتھ ہی رہتے، هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ یہ جملہ رب تعالیٰ کی طرف سے ان کی بکواس کا جواب ہے، اس میں چاروں ظرف یعنی لِلْكُفْرِ، يَوْمَئِذٍ، مِنْهُمْ اور چوتھا لِلْاِيْمَانِ اَقْرَبُ تفضیل کے متعلق ہیں، اور دونوں لام بمعنی الیٰ ہیں یا اپنے ہی معنی میں ہیں، کیونکہ اَقْرَبُ قرب سے بنا بعد کا مقابل یہ لام الیٰ اور من سب سے متعدی ہوتا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ یہ اَقْرَبُ قَرَبَ ر کے فتح سے مشتق ہو بمعنی تلاش پانی، اسی لئے مشکیزہ کو قارب اور قربت کہتے ہیں، اور گھاٹ پر آنے کے دن کو يَوْمَ الْقَرَب، بعض مفسرین نے فرمایا کہ لِلْكُفْرِ کا لام تعلیلیہ ہے (روح المعانی) الکفر یا تو اپنے ظاہری معنی پر ہے، یا بمعنی کفار یا اس سے پہلے اہل پوشیدہ ہے، بہر حال اس جملہ کے تین معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ وہ منافقین آج ظاہر ظہور بمقابلہ ایمان کفر سے زیادہ قریب ہیں کہ کفار کی حمایت کر رہے ہیں، اور تمہاری مخالفت دوسرے یہ کہ وہ منافقین آج ایمان کے مقابلہ میں کفر کے زیادہ طلب گار ہیں، اگرچہ اس سے پہلے وہ تمہارے طرف دار بنتے تھے، تیسرے یہ کہ وہ منافقین اپنے دلی کفر کی وجہ سے مومنوں کے مقابلہ میں کافروں سے زیادہ قریب ہیں، چوتھے معنی وہ بھی ہو سکتے ہیں جو اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ اپنے اس ترجمہ میں اشارۃً بیان فرما گئے کہ کفر سے مراد ان کا حقیقی اور دلی کفر ہے، اور ایمان سے مراد ان کا وہ ادعائی ایمان ہے جس کا وہ اظہار کرتے تھے، یعنی اب تک تو وہ ظاہری ایمان اور حقیقی کفر کے درمیان رہنے کی کوشش کرتے تھے، لیکن آج ان کے اس عمل سے کھل گیا کہ وہ ادعائی ایمان کے مقابل اپنے چھپے کفر سے زیادہ قریب ہیں، يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ نیا ہے جس میں ان کی عام عادت کا ذکر کیا گیا اور ہو سکتا ہے کہ اقرب کے فاعل سے حال ہو، اس صورت میں ان کے اس وقت کے کلام کا ذکر ہے، اگرچہ انسان منہ سے ہی

بوقت ضرورت ان سے سلام وکلام مصافحہ وغیرہ کرلو (روح المعانی) مگر خبردار دل میں ان سے محبت نہ رکھنا۔ رب تعالیٰ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے۔ سمجھ لو کہ سب کو رب ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ کوئی اس کی پکڑ سے باہر نہیں چونکہ سب رب کی طرف سے ہی آئے ہیں کہ پہلے رب کے سوا تمہارا کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی تمہیں جانتا پہچانتا تھا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا۔ (الدھر:۱) ایسے ہی پھر تمہارا حال ہونے والا ہے کہ رب کے سوا کوئی تمہارا نہ ہوگا۔ اس لئے رجوع یعنی لوٹنا فرمایا گیا۔ لوٹنا کہتے ہیں پہلی حالت پر پہنچ جانا۔ اگر تم اپنی دلی باتیں چھپاؤ یا ظاہر کرو۔ خدا سب جانتا ہے کیونکہ وہ تو آسمان و زمین کی ہر چیز پر خبردار ہے۔ اس سے تمہارے دلی حالات کیونکر چھپ سکتے ہیں پھر وہ اس علم کے ساتھ ہر چیز پر قدرت بھی رکھتا ہے۔ لہٰذا تمہیں جزاو سزا دینا اس کے نزدیک کوئی مشکل نہیں۔

خیال رہے کہ سینہ کو صدر اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں جسم کا صدر یعنی دل رہتا ہے۔ صدر کے معنی ہیں اشرف مقام۔ سینہ تمام جسم میں اشرف اس لئے ہے کہ یہ اشرف عضو کا مقام ہے کہ مکہ معظمہ مدینہ منورہ اس لئے شریف کہلائے کہ اس میں اشرف الخلق کا تعلق ہے اگرچہ رب تعالیٰ ہر چیز جانتا ہے مگر خصوصیت سے سینہ کی باتوں کا اس لئے ذکر فرمایا کہ اس میں دل ہے اور دل کا شانہ یار ہے۔ اگر دل ٹھیک ہوگیا تو سب جسم ٹھیک ہے اور اگر دل خراب ہوگیا تو سارا جسم خراب ہے۔ سارا قالب اور کاموں میں لگادو مگر دل یار کے کام میں لگادو۔ چونکہ اس آیت میں اشارۃً دل کی صفائی کا ذکر تھا۔ اس لئے یہ آیت قُلْ سے شروع فرمائی گئی تا کہ مضمون کی اہمیت کا پتہ لگے۔ نیز ان کا ذکر خصوصیت سے علیحدہ کیا گیا۔ اگرچہ یہ سینہ والی چیزیں بھی مَافِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں داخل ہیں۔ خیال رہے کہ رب تعالیٰ دل کی باتیں آسمان و زمین کی چیزیں حقیقی طور پر خود جانتا ہے مگر اس نے بعض بندوں کو اس صفت کا مظہر بنایا جن کو دلوں کی باتوں آسمان و زمین کی چیزوں پر اطلاع بخشی۔ نیز کبھی دل کی جہالت چہرے سے عیاں ہو جاتی ہے۔ دل کا غم غصہ خوشی وغیرہ کا پتہ چہرہ دے دیتا ہے۔ قیامت میں کفر و ایمان فسق و تقویٰ چہرے سے عیاں ہوگا۔ ہر شخص چہرے سے پہچانا جائے گا۔ یہ علوم رب تعالیٰ کے علم کے خلاف نہیں۔ چشم تو بنیندہ مافی الصدور۔

نوٹ: اس آیت سے تین اہم مسئلے ظاہر ہوئے۔ کفار سے محبت کی ممانعت۔ ان سے مدد حاصل کرنے کی ممانعت تقیہ کا حکم۔ ہم ان تینوں مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ رب تعالیٰ قبول فرمائے۔

کفار سے محبت کرنے کا حکم

کفار سے محبت سخت منع ہے۔ اس کی ممانعت میں بہت آیتیں اور بیشمار حدیثیں وارد ہوئیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ۔ (مائدہ:۵۱) یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ نیز فرماتا ہے لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ۔ (الممتحنہ:۱) میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ نیز فرماتا ہے۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ الخ۔ (مجادلہ:۲۲) یعنی اے محبوب آپ مسلمانوں کو ایسا نہ پائیں گے کہ وہ اللہ و رسول ﷺ کے مخالفوں سے دوستی رکھیں۔ اگرچہ وہ ان کے باپ دادا ہی ہوں۔ احادیث میں بھی اس کی سخت ممانعت آئی مگر خیال رہے کہ تعلقات کی چند قسمیں ہیں۔ اور ان کے جداگانہ احکام۔ (۱) دوستی (۲) محبت (۳) میلان طبع

مسلمانوں کے ساتھ رہ کر کفار سے کیوں بگاڑ لیں، آج کفار ہی جیتیں گے، تو ہم ان کے ساتھ مل جائیں گے، اور ان سے بھی نفع اٹھائیں گے، کہہ دیں گے کہ تمہاری یہ فتح ہماری تدبیر کے طفیل ہوئی، کہ موقع پر ہمارے ہٹ جانے سے مسلمان دل چھوڑ گئے، اور تم غالب آ گئے، اللہ تعالیٰ ان کی چھپی سازشوں کو خوب جانتا ہے، وہ سزا دے گا جو ان کے لائق ہوگی،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** بزرگوں کی خطاء بھی عبث نہیں ہوتی، اس میں رب تعالیٰ کے راز ہوتے ہیں، دیکھو احد کی ہزیمت میں کتنے راز تھے جو یہاں بیان فرمائے گئے، **دوسرا فائدہ:** مقبولوں کی لغزشیں رب تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں نہ کہ محض نفس یا شیطان کی طرف سے، اگرچہ بظاہر شیطان اس کا سبب بن جاتا ہے، جیسا کہ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا، اور ہماری حرکتیں اور گناہ محض نفسانی و شیطانی ہوتے ہیں، جب ہماری اور ان کی غلطیوں میں اتنا فرق ہے تو عبادتوں میں کتنا فرق ہوگا، اس لئے مولانا فرماتے ہیں، شعر

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

شیر آں باشد کہ مردم را درد — شیر آں باشد کہ مرد او را خورد

یعنی اپنے کو بزرگوں پر قیاس نہ کرو، تمہارا اور بزرگوں کا ہم شکل ہونا ایسا ہے جیسے شیر و شیر کا لفظوں میں یکساں ہونا کہ شیر اور شیر ایک ہی طرح لکھے جاتے ہی، مگر انسان شیر کی غذا ہے، اور شیر (دودھ) انسان کی خوراک، **تیسرا فائدہ:** مصیبتیں اور تکلیفیں، دوست، دشمن، مخلص و منافق کی پہچان کا بہترین ذریعہ ہیں، جیسا کہ لِيَعْلَمَ الخ سے معلوم ہوا، **چوتھا فائدہ:** جہاد میں صرف رضائے الٰہی کی نیت چاہیے، ملک گیری یا مال حاصل کرنے کی نیت ہرگز نہ ہو، جیسا کہ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** میدانِ جہاد میں لڑنا بھی عبادت ہے، اور دشمن کے مقابل ڈٹ جانا، تاکہ وہ حملہ آور نہ ہو سکے، یہ بھی عبادت ہے جیسا کہ اَوِ ادْفَعُوْا سے معلوم ہوا، مگر لڑنا اول درجہ عبادت ہے، اور محض ڈٹنا درجہ دوم اسی لئے قَاتِلُوْا کا ذکر پہلے ہوا، اور ادْفَعُوْا کا ذکر بعد میں، **چھٹا فائدہ:** ضرورت کے وقت جہاد سے باز رہنا اور جھوٹے بہانے بنانا بھی منافقوں کی علامت ہے، جیسا کہ لَوْ نَعْلَمُ الخ کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا، **ساتواں فائدہ:** صحابہ کرام کا مذاق اڑانا کفر و بے دینی ہے، جیسا کہ لَوْ نَعْلَمُ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا، **آٹھواں فائدہ:** جسمانی قرب سے روحانی قرب قریب تر ہے، دیکھو منافق بظاہر مسلمانوں سے قریب تھے، کہ ان کے ساتھ مدینہ میں رہتے تھے، اور کافروں سے دور، مگر رب تعالیٰ نے فرمایا وہ کافروں سے قریب ہیں، مسلمانوں سے دور، ابو جہل اگرچہ مکہ معظمہ میں رہتا تھا، مگر حضور انور ﷺ سے دور تھا، حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ یمن میں رہتے تھے، مگر حضور انور ﷺ سے قریب تھے، لقاء کی کوشش نہ کرو، رضاء کی کوشش کرو، شعر

لقائے دوست چہ خواہی رضائے دوست طلب — کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

نواں فائدہ: منہ کی بات وہی قوی ہے، جس کے ساتھ دلی جوش بھی ہو، بات گولی ہے اور دلی جوش بارود، وہی گولی شکار

قسمیں ہیں۔ اور ان کے الگ الگ احکام' دینی تقیہ کا حکم یہ ہے کہ اگر مسلمان کفار میں ایسا پھنسے کہ وہاں اپنا دین ظاہر نہ کر سکے یا کبھی کفر بکنے پر مجبور ہو جائے تو جان چھڑانے کے لئے اس وقت اس پر عمل کرے مگر پھر وہاں سے ایسی جگہ ہجرت کر جائے جہاں دینی آزادی ہو۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ۔ (النحل: ۱۰۶) اسی لئے انبیاء کرام نے کفرستان سے ہجرتیں کیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا۔ (النساء: ۹۷) ہاں بچے اور عورتیں' جو ہجرت پر قادر نہ ہوں ان کے اور احکام ہیں پھر بھی اگر کوئی کلمہ کفر نہ نکالے اور جان دیدے تو شہید ہو گا۔ (احکام القرآن وروح المعانی) چنانچہ مسیلمہ کذاب نے دو صحابہ کرام کو پکڑ کر ان میں سے ایک سے پوچھا کہ کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد اللہ کے رسول ہیں (ﷺ) انہوں نے کہا ہاں' پھر بولا کہ تم گواہ ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ انہوں نے فرمایا ہاں اس نے چھوڑ دیا۔ دوسرے سے پوچھا کہ کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں انہوں نے فرمایا ہاں پھر کہا کیا تم گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ میں بہرہ ہوں تین بار یہ ہی سوال و جواب ہوئے۔ آخر انہیں شہید کر دیا گیا۔ جب یہ واقعہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ پہلے نے رخصت کو اختیار کیا اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اور دوسرا صدق و یقین پر گیا اسے مبارک ہو (احکام القرآن ومعانی وکبیر وغیرہ) غرضکہ بلا وجہ اپنا دین چھپانا یا جہاں دین ظاہر نہ کر سکیں وہاں رہنا حرام ہے۔ دوسرا تقیہ یعنی دنیوی معاملات میں کفار سے مدارات کرنا یہ ضرورتاً جائز بلا ضرورت منع۔ کفار سے خندہ پیشانی سے ملنا۔ ان سے مصافحہ کرنا۔ انہیں ہدیئے تحفے دینا۔ ان سب کا یہ ہی حکم ہے خیال رہے کہ تبلیغ دین بھی ایک ضرورت ہے جو کفار مائل باسلام ہوں۔ ان کے ساتھ معاملات ضرور کئے جائیں۔ شروع اسلام میں تو ایسے کافروں کو زکوٰۃ دینا بھی جائز تھی۔ اس دنیوی تقیہ کا اس آیت میں ذکر ہے۔ دینی تقیہ سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ جیسا کہ آیت کی روش سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس نے بوقت خوف کفار کو ولی' یعنی ظاہری دوست بنانے کا حکم دیا نہ کہ کفر کا۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ تقیہ کا حکم شروع اسلام میں تھا کہ مسلمان کمزور تھے۔ اب نہیں رہا۔ ان کے قول پر اب کسی قسم کا تقیہ جائز نہیں مگر عوف نے امام حسن سے روایت کی کہ تقیہ قیامت تک جائز ہے کیونکہ جان کو بقدر طاقت نقصان سے بچانا ضروری ہے۔ (تفسیر کبیر ومعانی وخازن) حضرت سعید نے فرمایا کہ تقیہ بحالت جنگ جائز ہے نہ کہ بحالت امن (خازن) تقیہ کا وہ ہی مطلب ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا۔ خیال رہے کہ کفر چھپانا ایمان ظاہر کرنا منافقت ہے اور ایمان چھپانا زبان سے کچھ ظاہر نہ کرنا ستر ہے اور ایمان چھپانا کفر ظاہر کرنا تقیہ ہے۔ منافقت تو بہر حال سخت جرم ہے۔ اس کی سزا اصلی کفر سے زیادہ۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: ۱۴۵) اور ستر ضرورتاً جائز ہے بلا ضرورت منع۔ اپنے ایمان کا اعلان صورت' سیرت' قول و فعل سے کرنا چاہیے۔ تقیہ دھوکے کے لئے جرم ہے ضرورت خطرۂ جان کے وقت درست ہے۔

صوفیاء کا تقیہ: صوفیائے کرام کے نزدیک اسرار الٰہیہ کا اغیار سے چھپانا تصوف کا تقیہ ہے اور یہ اہم واجبات میں سے ہے اسی لئے یہ حضرات اسرار ایسی عبارت میں بیان کر جاتے ہیں جو عام کی سمجھ سے باہر ہو۔ بعض ظاہرین علماء ان کی ظاہری عبارت پر فتوئ کفر دے دیتے ہیں۔ حضرت محی الدین ابن عربی بایزید بسطامی کی پیچیدہ عبارتیں اسی تقیہ کی مثالیں ہیں۔ اسی لئے فقہائے کرام صوفیاء کے علم کو علم باطن کہتے ہیں یعنی عام سے چھپا ہوا۔ حضرت امام شعرانی نے اپنی کتاب در

ہے کہ وہ ایمان سے بھی قریب ہیں، حالانکہ وہ تو بہت دور تھے، **جواب:** اس کے کئی جواب ہیں، ایک وہ جو امام حسن نے دیا، کہ قرآن کا اقرب فرمانا یقینی عینیت کے لئے ہوتا ہے، دیکھو رب تعالیٰ نے فرمایا وَمِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ (صافات: ۱۴۷) یقیناً وہ لوگ (یعنی قوم یونس علیہ السلام) لاکھ سے زائدہ ہی تھے، مگر فرمایا گیا اَوْ، دوسرے یہ کہ منافقین قومی مومن تھے اور دینی کافر، اور قومیت سے دینیت قریب تر ہوتی ہے، تیسرے یہ کہ ان منافقین پر دنیا میں مومنوں کے احکام جاری رہے، کہ ان پر جہاد نہ ہوا، انہیں مسجدوں میں آنے، مسلمانوں کے ساتھ عبادات کرنے کی اجازت دی گئی، مرے بعد مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کئے گئے، مگر آخرت میں ان پر کفار کے احکام جاری ہوں گے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں ہی رہیں گے بلکہ اسفل السافلین میں، دنیا دور ہے کہ جا رہی ہے، آخرت قریب ہے کہ آ رہی ہے، تیسرے یہ کہ وہ زبانی طور پر مسلمانوں سے قریب تھے، اور روحانی طور پر کفار سے، خلاصہ یہ ہے کہ منافق تھے کافر ہی، مگر ان وجوہ کی بنا پر انہیں کفر سے قریب تر کہا گیا،

ساتواں اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جہاد میں کفار و منافقین سے امداد لینا جائز ہے، مگر حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور انور ﷺ نے مشرکین کی امداد قبول نہ فرمائی، حدیث و قرآن میں مطابقت کیونکر! **جواب:** اس کے چند جواب ہیں، ایک یہ کہ وہ حدیث مشرکین و کفار کے متعلق ہے، اور یہ آیت منافقین کے بارے میں جو اسلام کے مدعی تھے، جیسے انہیں ظاہری اسلام کی بنا پر مسجدوں میں آنے اور نماز پڑھنے کا حکم تھا، یونہی انہیں جہاد میں جانے اور کفار سے لڑنے کا بھی حکم تھا، دوسرے یہ کہ بلا ضرورت کفار سے امداد نہ لی جائے، ضرورۃً لی جائے، حدیث شریف میں بلا ضرورت کا ذکر ہے، اور قرآن شریف میں ضرورت کا عہد فاروقی میں بارہا جہادوں میں مشرکین سے امداد لی گئی ہے،

تفسیر صوفیانہ

دنیا گویا احد کا میدان ہے، شیطانی لوگ کفار ہیں اور رحمانی لوگ مومنین، نفسانی لوگ گویا منافقین ہیں جو بظاہر مومنوں کے ساتھ ہیں، مگر در پردہ نفس امارہ کے تابع، کہ جدھر نفس لے جاتا ہے ادھر جاتے ہیں، اور نفس کی یہ کیفیت ہے کہ یہ دو منہ والا سانپ ہے، جس کے منہ میں بھی زہر ہوتا ہے دم میں بھی، اگر کبھی ایمان کی طرف مائل ہو تو بھی اس میں کچھ فی ہوتی ہے (چال) اور اگر کفر کی طرف مائل ہو تو بھی کچھ شرارت ہوتی ہے، نفس اور نفسانی لوگ بمقابلہ ایمان کفر سے قریب تر ہیں، مسلمانوں کو ان کی چالوں میں نہیں آنا چاہیے، اللہ تعالیٰ ان کی شرارتوں سے بے خبر نہیں، یہ مت سمجھو کہ فرعون اور فرعونی لوگ ختم ہو چکے، ہمارے پہلوؤں میں ہمارا فرعون ساتھ ہے، اس کے شر سے بچنا بہت مشکل ہے، مولانا فرماتے ہیں، شعر

نفس ما ہم کمتر از فرعون نیست لیک او را عون ما را عون نیست

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا
وہ لوگ جنہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے لئے اور بیٹھ رہے اگر اطاعت کرتے ہماری تو نہ قتل کیے جاتے
وہ جنہوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا اور آپ بیٹھ رہے کہ وہ ہمارا کہا مانتے تو نہ مارے جاتے

عنہ کو تینوں خلفاء سے ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔ رہا آبرو کا خطرہ وہ بھی ان کیلئے کوئی نہیں کیونکہ۔ راؤندی شارح نہج البلاغت نے سلمان فارسی سے

حکایت: کی کہ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ کے کسی باغ میں ملے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں ایک کمان تھی۔ فرمایا اے عمر مجھے خبر ملی ہے کہ تم میرے ساتھیوں کو برا کہتے ہو۔ یہ کہہ کر آپ نے کمان زمین پر ڈال دی۔ وہ کمان بڑا اژدہا بن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نگلنے کو دوڑا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ اے علی خدا کے لئے مجھے بچالو۔ اب میں تمہاری مخالفت کبھی نہ کروں گا۔ جب بہت خوشامد کی' تب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے پکڑا پھر وہ کمان بن گئی۔ سلمان فارسی کہتے ہیں کہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اس کا بہت خوف طاری ہو گیا اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کے اے سلمان اس کمان کا خوف عمر کو مرتے وقت تک رہے گا۔ اس روایت کی بناء پر جناب امیر کو عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خوف کے کیا معنی؟ اور اگر خوف ہوتا بھی تو تبلیغ دین میں مشقت و ایذا اٹھانا اور اس پر صبر کرنا طریقہ انبیاء ہے۔ اہل بیت عظام کو اس کی اقتداء چاہیے تھی۔ نیز جناب مولیٰ علی کا چھ ماہ تک حضرت صدیق کی بیعت نہ کرنا پھر کر لینا۔ اس تقیہ کی جڑ کاٹ دیتا ہے اگر تقیہ ہی کرنا تھا تو آپ پہلے دن بیعت کر لیتے۔

غرضکہ روافض کا تقیہ جھوٹ' منافقت' اور دغابازی کا مجموعہ ہے۔ معاذ اللہ۔ پہلا تقیہ ابلیس نے کیا کہ وَقَاسَمَهُمَا اِنِّی لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ۔ (اعراف:۲۱) قسم کھا کر بولا کہ اے آدم وحوا میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ نیز واقعہ کربلا میں امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تقیہ نہ کیا بلکہ عبداللہ ابن زیاد نے کیا کہ وہ امام حسین کے لباس میں کوفہ آیا۔ قرآن کریم اور انبیائے کرام اور اہل بیت اطہار اس سے بالکل پاک وصاف ہیں۔ یہاں اور ان احادیث میں مدارات وغیرہ کے وہ ہی معنی ہیں جو ہم نے عرض کیے کہ سخت مجبوری کی حالت میں خطرہ جان کے وقت کفار سے ظاہری رواداری برت لینا' بلکہ اشد ضرورت پر منہ سے کفر نکال لینا۔ بشرطیکہ دل میں ایمان رہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ۔ (نحل ۱۰۶) ضروریات عبادات نہیں بن جائیں بلکہ ضرورت پوری کرنے کو ان کی اجازت ہو جاتی ہے۔ ضرورت پر شرعی تقیہ کا جواز ایسا ہی ہے جیسے جان پر بن جانے کے وقت مردار یا حرام جانور کی حلت

چوں علی شیر ست و حق را شیر نر ظلم نتوان کرد بر شیر اے پسر

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار سے دوستی کرنا منع ہے' جیسا کہ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ نے بتایا تو چاہیے کہ مسلمانوں کے ساتھ کفار سے دوستی جائز ہو اس طرح کہ کفار سے بھی دوستی رکھے اور مسلمانوں سے بھی؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ قید اتفاقی ہے نہ کہ احترازی جن کے حق میں یہ آیت آئی۔ ان کا عمل یا ارادہ ایسا ہی تھا اس لئے یہ قید لگا دی گئی۔ جیسے قرآن کریم فرماتا ہے۔ لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً۔ (آل عمران: ۱۳۰) کہ تم دگنا تگنا سود نہ کھاؤ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سوایا ڈیوڑھا کھا لیا کرو' دوسرا یہ کہ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ کافرین کی صفت ہے یعنی وہ کفار جو مسلمانوں کے ہر طرح غیر ہیں تم ان سے دوستی مت رکھو۔ تیسرا یہ کہ دوسری آیتوں میں

رہنے سے مراد گھرے ہونے کا مقابل نہیں، بلکہ نکلنے کا مقابل ہے اگر چہ وہ چلتے پھرتے ہوں مگر جہاد کے لئے نہ نکلے تو بیٹھ ہی رہے، لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا یہ قَالُوْا کا مفعول ہے، اس کا مقصد اظہار افسوس نہیں بلکہ شہداء پر طعن وتشنیع ہے، اسی لئے رب تعالیٰ نے ان منافقین کے کفریات کے سلسلہ میں ان کا ذکر فرمایا، اطاعت سے مراد یا تو ان کی بات ماننا ہے یا ان کا سا عمل کرنا یعنی اگر یہ شہداء مومنین یا سارے مسلمان ہماری بات مان لیتے اور ہماری رائے پر عمل کرتے، کہ مدینہ پاک میں رہ کر ہی مدافعانہ جنگ کرتے، میدانِ احد میں نہ جاتے یا ہماری طرح وہ بھی بیٹھ رہتے، حضور انور ﷺ کے فرمان پر عمل نہ کرتے یا جیسے ہم لوٹ آئے تھے، ہمارے ساتھ وہ بھی لوٹ آتے، وہاں نہ ٹھہرتے تو ہماری طرح وہ بھی قتل سے بچ جاتے، یہ توجیہیں اس لئے کی گئیں کہ منافقین نے احد کے موقع پر مسلمانوں کو جنگ میں جاتے سے زبانی منع نہ کیا، لہٰذا ان کی یہ بات نہ ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا قُلْ فَادْرَءُوْا یہ جملہ قَالُوْا کا جواب ہے جو حضور انور ﷺ کی زبان مبارک سے دلوایا گیا، فَادْرَءُوْا شرط پوشیدہ کی جزاء ہے، اور ف جزائیہ، اِدْرَءُوْا درءٌ سے بنا بمعنی ایک جانب مائل ہو جانا، جب اس کے بعد عن آئے، تو بمعنی دفع ہوتا ہے، کہا جاتا ہے دَرَءَ تُ عَنْهُ یعنی دَفَعْتُهٗ، کبھی بغیر عن بھی دفع کے معنی دیتا ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (رعد: ۲۲) عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ، عَنْ فَادْرَءُوْا کا صلہ ہے، اور مَوْتَ اس کا مفعول، اَنْفُسِ سے مراد اپنی ذاتیں یا جانیں ہیں، یعنی آپ فرما دو، کہ اگر واقعی جنگ میں جانے سے موت آ جاتی ہے اور بیٹھے رہنے سے آدمی موت سے بچ جاتا ہے، تو تم بیٹھ رہے تھے، اب موت سے بچ جاؤ اور موت کو اپنے وقت سے ٹال دو اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ یہ جملہ گذشتہ جملہ کی شرط مؤخر ہے اور یا اس کی جزاء پوشیدہ ہے یعنی اگر تم سچے ہو تو ضرور یہ کام کر گزرو،

خلاصہ تفسیر

یہ منافقین وہ بے ایمان ہیں، جو خود تو جہاد میں جاتے نہیں، اور جانے والے غازیوں اور شہداء کا مذاق اڑاتے ہیں، کہ خود تو بیٹھ رہتے ہیں یا میدان میں جا کر لوٹ آتے ہیں، اور جو ان کے عزیز، قرابت دار مسلمان جہاد میں شہید ہو جاتے ہیں، ان پر طعن کرتے ہوئے آپس میں کہتے ہیں کہ یہ کیسے بے وقوف ہیں کہ مفت جانیں گنواتے ہیں، اگر یہ ہماری رائے مان لیتے یا ہماری طرح یہ بھی عقل سے کام لیتے، کہ جہاد میں جاتے ہی نہ یا جا کر لوٹ آتے، تو جیسے ہم محفوظ رہے ایسے ہی یہ بھی محفوظ رہتے، اور مارے نہ جاتے، یہ لوگ نہ تو خود عقلمند ہیں نہ ہم عقلمندوں کی مانتے ہیں، جس کی سزا بھگتتے ہیں، اے محبوب ﷺ آپ ان سے اتنا تو فرما دو کہ اگر تم سچے ہو، اور واقعی جہاد سے بیٹھ رہنا موت سے بچا لیتا ہے، اور تم اسی وجہ سے بچے، کہ غزوۂ احد میں نہ گئے، تو اپنے سے موت دفع کر دو اور دنیا میں ہمیشہ زندہ رہ کر دکھاؤ، تم جھوٹے ہو، جہاد میں جانا مارا نہیں دیتا اور نہ جانا بچا نہیں لیتا، جب موت بہر حال آنی ہی ہے، اور وقت مقرر پر آنی ہے، اور جان جانی ہی ہے، تو بہتر یہ ہی ہے کہ راہِ خدا میں جائے، اس سے بڑھ کر جان کی قیمت اور کیا ہو سکتی ہے، وہ شہداء عزت کی موت فوت ہوئے، اور تم ذلت کی موت مرو گے، چنانچہ تفسیر کشاف، تفسیر صاوی، تفسیر روح المعانی اور تفسیر خزائن العرفان نے اس جگہ فرمایا کہ جس دن منافقین نے شہدائے احد پر یہ طعن کیا، اسی دن بیک وقت ستر منافق مر گئے، غالباً ہارٹ فیل ہو کر رب تعالیٰ نے شہدائے احد کی تعداد کے برابر انہیں ہلاک کیا،

صرف رب تعالیٰ کا خوف ہو۔ چونکہ سب کا انجام اس توحید پر ہی ہوگا۔ لہٰذا تم اس سے خوف کرو (ابن عربی)

دوسری تفسیر

روح اور اس کے معاملات مومنین ہیں۔ نفس اور اس کے معاملات کفار۔ روح کو حکم دیا جا رہا ہے کہ تو نفس اور اس کے نظرات کو اپنا دوست نہ سمجھ۔ یہ اگر بظاہر کبھی تیری دوستی کا دم بھرے مگر حقیقت میں یہ تیرا سخت دشمن ہے۔ اگر تو نے ان سے محبت کی تو یار سے آڑ میں رہے گی۔ ہاں جب کبھی اس کی بربادی کا اندیشہ ہو تو اس کی ظاہری پرورش کرتا کہ وہ فنا نہ ہو جائے بلکہ تیرا خادم بن کر تیری امداد کرے اور تیری سواری کا کام دے۔

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ محبت چار قسم کی ہے۔ جسمانی' نفسانی' شیطانی' رحمانی۔ اولاد وغیرہ سے محبت جسمانی ہے خونی رشتہ کی وجہ سے۔ مال و دولت سے محبت نفسانی ہے۔ کفار و کفر سے محبت شیطانی ہے۔ اللہ کے پیاروں سے محبت رحمانی ہے۔ پہلی دو محبتیں فانی ہیں کہ نفس کو فنا ہے تو اس کی محبت کو بھی فنا ہے۔ تیسری یعنی شیطانی محبت عداوت میں تبدیل ہو جائے گی۔ چوتھی یعنی رحمانی محبت کو بقاء ہے۔ رحمٰن باقی ہے تو رحمانی محبتیں بھی باقی ہیں۔ دنیا میں حضور انور ﷺ کو دیکھنے والے کفار ابو جہل وغیرہ قبر میں حضور انور ﷺ کو نہ پہچان سکے مگر نہ دیکھنے والے مسلمان پہچان لیتے ہیں' یہ ہی محبت رحمانی کا نتیجہ۔ جیسے صاف آئینہ ذرا میں دھندلا ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی آئینہ دل گناہ اور محبت کفار سے دھندلا ہو جاتا ہے۔ اگر آئینہ دل ان گرد و غبار سے صاف رہے تو اس میں سارا عالم بلکہ خالق عالم بھی ہے۔ جیسے صاف شیشہ میں گھر اور گھر کا ساز و سامان...... بلکہ گھر والا نظر آتا ہے۔ شعر ؎

الٰہی رنج و غم کافور کر دے ۔۔۔ یہ سینہ نور سے معمور کر دے

نبی کی کالی زلفوں کا تصدق ۔۔۔ سیاہی میرے دل کی دور کر دے

صوفیاء کے نزدیک چیزیں تین قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو زبان میں بھی ہیں دل میں بھی۔ جیسے اللہ کا ذکر یار کا چرچہ' بعض چیزیں وہ ہیں جو صرف دل میں آئیں زبان پر نہ آئیں۔ جیسے اسرار الٰہی کہ دل کے خزانے میں رہیں۔ زبان کے دروازے پر نہ آنے پائیں۔ شعر ؎

بر دہانش قفل در دل رازہا

بند لبہا دل پر از آوازہا

بعض چیزیں وہ ہیں جو زبان پر رہیں دل میں نہ اتریں۔ جیسے دنیاوی باتیں وغیرہ جیسے بستی میں لوگوں کے مکان بھی ہوتے ہیں۔ اللہ کا گھر یعنی مسجد بھی۔ مسجد تمام گناہوں سے پاک و صاف رکھی جاتی ہے۔ ایسے ہی جسم مومن ایک بستی ہے جس کے تمام اعضاء سے دنیاوی کام کیے جائیں' مگر دل وہ مسجد ہے جس میں رب کے سوا کچھ نہ رہنا چاہیے۔ مشائخ کی بیعت اس لئے کرتے ہیں کہ دل کی صفائی میسر ہو۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ

شہداء پر روتے ہوئے دیکھا تو فرمایا اَمَّا حَمْزَةُ فَلَا بَوَاكِيَ لَهُ آج بے کس حمزہ پر رونے والی کوئی نہیں، یہ فرمان عالی انتہائی صدمہ پر دلالت کرتا ہے، **جواب:** منافقین کی یہ بکواس اپنی سلامتی کی خوشی اور غازیوں کی شہادت پر طعن کے لئے تھی،

تفسیر صوفیانہ

عقل انسان اگر ایمان کی معاون ہو تو نعمت ہے، اور اگر اس سے رکاوٹ کا ذریعہ بنے تو لعنت، منافقت کی عقل جس پر انہیں ناز تھا لعنت تھی، غازیوں اور شہیدوں کی عقل، جس پر منافقین طعن کرتے تھے رحمت تھی، اللہ تعالیٰ کی راہ میں لٹ جانا، سب کچھ لٹا دینا حسینی عقل ہے، جسے ایمانی عقل کہا جاتا ہے، اور دوسرے کو لوٹ لینا، تباہ کر دینا یزیدی عقل ہے، ایمانی عقل لٹ جانے پر خوشی ہوتی ہے، اور شیطانی عقل بچ جانے پر ناز کرتی ہے، یہاں شیطانی عقل والوں یعنی منافقوں پر اظہار غضب فرمایا جا رہا ہے، شعر

جس نے اپنے خون سے ملت کو دھویا وہ حسین — جو دہکتی آگ کے شعلوں پہ سویا وہ حسین
جس نے سب کچھ کھو کے پھر کچھ بھی نہ کھویا وہ حسین — جو جواں بیٹے کی میت پر نہ رویا وہ حسین

جس نے قانون شرع جاں دے کے پورا کر دیا
بیعت باطل نہ کی اور راہ حق میں سر دیا

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ نہ تو ہمیں اپنی موت کی عمر معلوم ہے، نہ وقت معلوم، نہ جگہ معلوم، نہ مرض معلوم، نہ معلوم کتنی عمر میں کہاں کب اور کس بیماری سے مریں گے، یہ اس لئے ہے تاکہ ہم ہر دم موت کے لئے تیار رہیں، یہاں روح البیان نے ایک عجیب حکایت لکھی، کہ حضرت دانیال علیہ السلام ایک جنگل میں ایک جوان شخص کی لاش پر گذرے جس کے سر پر سونے کا تاج تھا اور بائیں ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی، بہترین لباس اور زیورات سے آراستہ، اس کے پاس ایک تختی پر لکھا تھا کہ میں صمصام ابن عود ابن عنق ابن عاد ابن ارم ہوں، میں نے ایک ہزار سات سو برس عمر پائی، اس زمانہ میں بارہ ہزار کنواری لڑکیوں سے نکاح کئے، چالیس ہزار شہر آباد کئے، کئی ہزار جنگیں جیتیں، میرے خزانوں کی چابیاں چار سو خچر اٹھاتے تھے مگر میں نے عاقلوں سے دوری اور غافلوں سے قرب اختیار کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں دعویٰ خدائی کر بیٹھا، میں اس جنگل میں پھنس گیا، میں نے بہت چاہا کہ ایک تھیلی سچے موتیوں کے عوض مجھے مٹھی بھر جوار کے دانے مل جائیں جنہیں چبا کر میں جان بچالوں مگر نہ ملے، چنانچہ اب میں بھوک سے دم توڑ رہا ہوں، اے دنیا والو! مجھ سے عبرت لو، اور دنیا سے دھوکہ نہ کھاؤ دیکھو اس وقت کوئی چیز میرے کام نہیں آرہی ہے، اور میں نہایت بے کسی کی حالت میں رب تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو رہا ہوں (تفسیر روح البیان)

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا
اور ہرگز گمان نہ کر دان لوگوں کو جو قتل کئے گئے اللہ کی راہ میں مردہ
اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے ہرگز انہیں مردہ خیال نہ کرنا

اس سے خارج ہیں جیسے رعشہ کی حرکت یا سانس وغیرہ کیونکہ ان پر سزا و جزا نہیں۔ عَمِلَتْ سے سارے قلبی و ظاہری اعضاء کے کام مراد ہیں۔ اس لئے کہ دلی ارادوں پر بھی سزا جزا ہے۔ یعنی تمہیں خدا کی طرف اس دن لوٹنا پڑے گا یا خدا اس دن سے تمہیں ڈراتا ہے۔ یا ہر نفس اس دن آرزو کرے گا۔ یا اللہ کی قدرت اس دن ظاہر ہو گی یا اس دن کو یاد رکھو جس دن ہر جان اپنے سارے اعمال پائے گی۔ اس دن سے مراد یا تو موت کا دن ہے کہ مرتے وقت ہی مرنے والے کو اپنے اعمال یاد آ جاتے ہیں یا قبر میں جانے کا دن' یا قیامت کا دن تیسرا معنی زیادہ قوی ہے کہ اصل سزا اور جزا کا دن وہ ہی ہے۔ خیال رہے کہ بعض کے نزدیک یہاں ما سے پہلے جزا یا کتاب پوشیدہ ہے۔ اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنا نامۂ اعمال یا اعمال کی سزا جزا ہر نفس پائے گا۔ رب تعالیٰ فرمائے گا اِقْرَاْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۔ (الاسراء: ۱۴) اپنی کتاب خود پڑھ لے آج تو ہی اپنا کافی محاسب ہے یا خود اعمال کو مختلف شکلوں میں موجود دیکھے گا۔ نیک اعمال کی اچھی شکلیں' برے اعمال کی شکلیں بری۔ سانپ' بچھو وغیرہ' بلکہ نیک و بد اعمال کا اثر خود عامل کے شکل و صورت پر نمودار ہو گا۔ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ (آل عمران: ۱۰۶)۔ مگر بہتر یہ ہے کہ کچھ پوشیدہ نہ کیا جائے۔ اور آیت کا یہ ہی مطلب لیا جائے کہ بعینہ اپنے اعمال کو پائے گا۔ جیسا کہ ہم انشاء اللہ آئندہ عرض کریں گے۔ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ۔ مِنْ بیانیہ ہے۔ مَا کا بیان خبر سے ہر جائز کام یا نیکی مراد ہے اگرچہ معمولی ہی ہو۔ مُحْضَرًا یحضر کا دوسرا مفعول ہے۔ اس کے معنی ہیں حاضر کیا ہوا' یعنی فرشتے یا رب تعالیٰ اسے حاضر فرمائے گا۔ خواہ نامہء اعمال کے ذریعہ یا بلا واسطہ مُحْضَرًا کے بعد عِنْدَهَا پوشیدہ ہے اور وَمَا عَمِلَتْ پہلے مَا پر معطوف ہے۔ تَجِدُ کا مفعول مِنْ سُوْٓءٍ کا بیان ہے۔ اصل عبارت یوں تھی۔ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ مُّحْضَرًا۔ چونکہ بھلائی مقصود بالذات ہے اور گناہ مقصود تبعاً نیز نیکی رحمت رب کی مظہر ہے اور گناہ قہر کا مظہر نیز رحمت قہر پر غالب ہے۔ اس لئے خیر کا ذکر پہلے کیا اور گناہ کا بعد میں۔ نیز چونکہ اگلے مضمون کا تعلق صرف گناہوں سے ہے۔ اس لئے یہاں علیحدہ مَا عَمِلَتْ فرمایا گیا۔ ورنہ پہلا ہی فعل کافی تھا۔ یعنی جو کچھ بھلائی یا برائی کی ہے۔ اسے اپنے پاس حاضر پائے گا۔ پھر یہ حال ہو گا کہ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَ بَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيْدًا..... تَوَدُّ وَدٌّ سے بنا بمعنی چاہنا اور خواہش کرنا۔ اس کا فاعل گنہگار نفس ہے نہ کہ ہر نفس کیونکہ یہ تمنا گنہگار ہی کریں گے۔ لَوْ اَنَّ الخ تَوَدُّ کا مفعول ہے۔ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗ ان کی خبر اور اَمَدًا بَعِيْدًا اس کا اسم۔ بَيْنَهَا کا مرجع نفس اور بَيْنَهٗ کا مرجع یا دن ہے یا اس کے برے اعمال۔ اَمَدًا بمعنی فاصلہ آتا ہے۔ بعید بمعنی دراز امد اور ابد میں یہ فرق ہے کہ ابد غیر محدود وقت کو کہا جاتا ہے۔ اور امد وہ مدت ہے جس کی حد ہو مگر معلوم نہ ہو۔ بعض کے نزدیک یہاں امد سے مراد عمر بھر کا فاصلہ ہے۔ بعض کے نزدیک مشرق و مغرب کی دوری۔ جیسے رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ۔ (زخرف: ۳۸) گویا وہ آیت اس جملہ کی تفسیر ہے۔ یعنی اس دن گنہگار نفس آرزو کرے گا کہ کاش مجھ میں اور اس قیامت میں یا مجھ میں اور میرے نامۂ اعمال یا سزا اعمال میں بہت فاصلہ ہوتا۔ یعنی یہ چیزیں میرے پاس نہ ہوتیں۔ قبر کے امتحان میں پاس ہوتے ہی بندہ قیامت قائم ہونے کی تمنا کرتا ہے کہ جلد قیامت قائم ہو۔ اور میری کامیابی پر لوگ مطلع ہوں۔ اور وہاں فیل ہو جانے والا تمنا کرتا ہے کہ قیامت کبھی نہ آئے تاکہ میرا حال کسی پر ظاہر نہ ہو۔ قیامت کے دن میں یہ دونوں تمنائیں بھی موجود ہوں گی اور دونوں قسم کے لوگ

ہے تو مخلص مومن بن کر اللہ کی راہ میں مرو، جس سے نہ مٹنے والی دائمی زندگی پاؤ،

شانِ نزول

اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں چند روائتیں ہیں، ۱۔ یہ آیت کریمہ شہدائے بدر کے متعلق نازل ہوئی جو چودہ تھے، چھ مہاجر اور آٹھ انصار (تفسیر خازن، کبیر وصاوی) ۲۔ یہ آیت شہدائے احد کے متعلق نازل ہوئی، جو ستر حضرات تھے، چار مہاجر، حضرت حمزہ ابن عبد المطلب مصعب ابن عمیر، عثمان ابن شہاب اور عبداللہ ابن جحش، باقی چھیاسٹھ انصار (تفسیر روح البیان، صاوی، روح المعانی) چنانچہ احمد، ابوداؤد و دیگر محدثین نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی، کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تمہارے بھائی احد میں شہید ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو سبز پرندوں میں رکھا، کہ وہ جنت کی نہروں پر جاتی اور وہاں کے پھل کھاتی ہیں، اور ان سنہری قندیلوں میں رہتی ہیں جو عرش کے نیچے لٹکی ہوئی ہیں، انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا، کہ کاش ہمارے اس عیش کی خبر ہمارے ان بھائیوں کو مل جاتی جو ابھی دنیا میں ہیں، تاکہ وہ جہاد سے سست نہ ہوتے، رب تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ خبر ہم بھیجے دیتے ہیں، چنانچہ یہ آیتیں نازل فرمائیں، نیز ترمذی نے باسناد حسن اور حاکم وغیرہ نے باسناد صحیح حضرت جابر ابن عبداللہ سے روایت کی کہ ایک بار مجھے نبی کریم ﷺ نے دل شکستہ دیکھ کر فرمایا، کیوں پریشان ہو؟ میں نے عرض کیا کہ میرے والد احد میں شہید ہو گئے، اور بہت قرض اور بال بچے چھوڑ گئے جن کا بوجھ مجھ پر ہے، فرمایا کہ میں تمہیں خوشخبری دوں؟ میں نے عرض کیا، ہاں! فرمایا کہ آج تک رب تعالیٰ نے کسی سے بے حجابانہ کلام نہ فرمایا، حجاب میں ہی کلام ہوتا تھا سوائے تمہارے والد کے، کہ انہیں اپنا دیدار دیا اور کلام فرمایا کہ فرمایا اے میرے بندے کچھ مجھ سے مانگ! انہوں نے عرض کیا کہ مولیٰ! مجھے پھر زندہ کر دنیا میں بھیج، تاکہ پھر تیری راہ میں جہاد کروں اور مارا جاؤں، ارشاد باری ہوا، کہ بعدِ موت ہم واپس نہیں بھیجا کرتے، تمہارے والد نے عرض کیا کہ اچھا پھر میری یہ خبر دنیا میں بھیج دے، کہ تو نے میرا اتنا احترام فرمایا، رب تعالیٰ نے فرمایا، ہاں یہ کئے دیتے ہیں، چنانچہ یہ آیت نازل فرمائی (روح المعانی، کبیر، خازن وصاوی وغیرہ) ۳۔ یہ آیت ان ستر قاریوں کے متعلق نازل ہوئی جو غزوۂ احد کے چار ماہ بعد ماہِ صفر ۴ ھ میں بمقام بیر معونہ شہید ہوئے، جن میں مشہور صحابہ یہ ہیں، منذر ابن عمرو، حارث ابن صمہ، حرام ابن ملحان، عروہ ابن اسماء، نافع ابن یزید، عامر ابن فہیرہ جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے انہی کی لاش آسمان پر اٹھائی گئی جیسا کہ بخاری شریف وغیرہ میں ہے، اور یہاں تفسیر خازن نے بھی نقل فرمایا، بیر معونہ مکہ معظمہ اور عسفان کے درمیان علاقہ ہزیل میں واقع ہے، کچھ نجدی لوگ دھوکا سے ان حضرات کو تبلیغ کے بہانہ لے گئے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ مجھے نجدیوں کا اعتبار نہیں، ان کی جانوں کا خطرہ ہے، مگر ابو براء عامر ابن مالک ابن جعفر بولا کہ میں ان کا ذمہ دار ہوں، تب حضور انور ﷺ نے بادل نخواستہ ان کو بھیجا، ان بدنصیب نجدیوں نے مقام بیر معونہ پر سوائے کعب ابن زید کے سب کو شہید کر دیا، اور یہ بھی آخری سانسوں میں بچ رہے، اور پھر غزوۂ خندق میں شہید ہوئے، ان کے بارے میں یہ آیت کریمہ اتری (تفسیر خازن، روح المعانی، صاوی وغیرہ) یہاں تفسیر خازن نے غزوۂ بیر معونہ کا تفصیلی واقعہ بیان فرمایا تفسیر کبیر نے فرمایا کہ ان روایات میں کچھ تعارض نہیں ہو

گے۔ اگر چہ پھر بعض کی بخشش ہو جائے۔ پانا اور چیز ہے اور سزا و جزا ملنا اور۔ **دوسرا فائدہ:** بعض کے خیال میں صرف وہ ہی عمل پیش ہوں گے جن پر سزا جزا ملنے والی ہو۔ معاف شدہ گناہ کا وہاں ذکر بھی نہ ہوگا۔ بلکہ مسلمان کے بعض بخشے ہوئے گناہ نیکی کی شکل میں نمودار ہوں گے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمۡ حَسَنٰتٍ۔ (الفرقان: ۷۰) خلاصہ اختلاف یہ ہوا کہ بعض کے نزدیک دکھا کر معافی ہوگی اور بعض کے نزدیک پہلے ہی۔ لہٰذا آیات مغفرت اور اس آیت میں کوئی مخالفت نہیں۔ **تیسرا فائدہ:** قیامت میں ہر شخص کی نظری طاقت بڑھی ہوئی ہوگی کہ اپنے اعمال و عقائد کو جو کیے تھے وہ دیکھ لے گا۔ **چوتھا فائدہ:** قیامت کا دن پردہ اٹھنے کا دن ہوگا کہ ہر چیز اپنی اصلی حالت میں نظر آئے گی۔ مسلمانوں کو اپنے کافر قرابت داروں سے سخت نفرت ہوگی کیونکہ وہ نہایت بدشکل اور بدصورت نمودار ہوں گے۔ **پانچواں فائدہ:** آیات عذاب بھی خدا کی رحمت ہیں کہ ان کے ذریعہ دل میں خوف پیدا ہوتا ہے جو عبادات کی اصل ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ سارے اعمال ہر شخص پر پیش ہوں گے اور دوسری آیتوں سے پتہ لگتا ہے کہ بعضے گناہ مٹا بھی دیئے جائیں گے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ (ہود: ۱۱۴)۔ اور بعض نیکیاں ضبط کی جاتی ہیں۔ فرماتا ہے۔ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ (مائدہ: ۵۳) ان آیتوں میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ مَا عَمِلَتۡ سے باقی اعمال مراد ہیں نہ کہ برباد شدہ۔ دوسرا یہ کہ یہاں پیشی کا ذکر ہے اور ان آیتوں میں سزا جزا کا یعنی ہر عمل ہر شخص کو دکھایا ضرور جائے گا۔ خواہ اسے جزا ملے یا نہ ملے۔ مثلاً بعض گنہگاروں سے کہا جائے گا کہ کیا تم نے یہ گناہ کیے تھے۔ عرض کریں گے۔ ہاں مولیٰ قصور ہوا۔ یہ ہوئی پیشی۔ پھر ارشاد ہوگا' جاؤ معاف کر دیا۔ یہ ہوئی مغفرت لہٰذا آیتوں میں کوئی مخالفت نہیں۔ اس کی تفسیر وہ آیت ہے۔ فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔ (الزلزال: ۸) اعمال کا دکھانا مراد ہے۔ ان پر سزا جزا دینا کچھ اور' دکھلانا سب کے لئے سزا جزا بعض کے لئے۔

دوسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر نفس کے ہر عمل پیش ہوں گے تو کیا کافروں کے صدقات و خیرات بھی انہیں دکھائے جائیں گے۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ ان کا کوئی عمل نیکی ہی نہیں کیونکہ نیکی کی شرط ایمان ہے جس کے بغیر ساری نیکیاں بے کار لہٰذا انہیں جو بھی دکھایا جائے گا وہ بدی ہی ہوگی دوسرا یہ کہ ہاں ضرور دکھائی جائے گی مگر یہ کہہ کر اگر تم ایمان کے ساتھ یہ کام کرتے جزا پاتے مگر چونکہ بغیر ایمان تم نے یہ نیکیاں کیں۔ لہٰذا برباد گئیں۔ غرضکہ کفار کے لئے اپنی نیکیاں دیکھنا باعث ملال ہوگا اور مغفور گنہگار کے لئے گناہ دیکھنا باعث خوشی۔ حدیث شریف میں ہے کہ پاس شدہ مومن کو قبر میں پہلے اس کا دوزخ والا ٹھکانا دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر آج تو پاس نہ ہوتا تو تیرا ٹھکانہ یہ تھا۔ اللہ نے تجھ پر کرم فرمایا کہ تو پاس ہو گیا۔ اب تیرا ٹھکانہ یہ ہے۔ پھر جنتی جگہ دکھاتے ہیں تاکہ اس کی خوشی دوبالا ہو جائے۔ قبر میں فیل ہو جانے والے سے معاملہ برعکس ہوتا ہے کہ پہلے اسے جنتی ٹھکانہ دکھاتے ہیں کہ اگر تو پاس ہو جاتا تو تیرا ٹھکانہ یہ ہوتا۔ اب چونکہ تو فیل ہو گیا۔ دیکھ اب تیرا ٹھکانہ یہ ہے تاکہ اسے غم پر غم ہوں۔ ایسے ہی قیامت میں مومنوں کو ان کے گناہ دکھا کر معافی دی جائے گی اور کفار کو ان کے نیک اعمال دکھا کر ضبطی کا اعلان ہوگا تاکہ مومن کو خوشی پر خوشی ہو۔ کافر کو غم پر غم۔ یہاں تک کہ حدیث

ورنہ اسے عذاب کیسے ہوتا، نیز روزی کھانا جسم کا کام ہے نہ کہ فقط روح کا، نیز دیکھا گیا ہے کہ شہید کا جسم قبر میں گلتا نہیں، اگر جسم زندہ نہیں ہے تو نہ گلنے کی کیا وجہ، نیز یہاں تفسیر کبیر و خازن نے فرمایا کہ حضرت امیر معاویہ نے ایک موقعہ پر کسی ضرورت سے کچھ شہداء کی قبریں اکھیڑنے اور ان کی لاشوں کو منتقل کرنے کا حکم دیا، حضرت جابر فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کی لاشیں نکالیں تو تازہ تھیں، حتیٰ کہ ایک شہید کی انگلی میں پھاوڑا لگ گیا تو اس سے خون جاری ہو گیا، اسی خازن میں ہے کہ امام بغوی نے حضرت عبداللہ ابن عمیر سے روایت کی، کہ نبی کریم ﷺ جب احد سے واپس ہوئے، تو حضرت مصعب ابن عمیر شہید کی لاش پر کھڑے ہوئے، ان کے لئے دعا کی، اور یہ آیت پڑھی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا الخ (احزاب: ۲۳) پھر فرمایا میں گواہ ہوں کہ یہ شہید ہیں تم ان کی زیارتیں کیا کرو، انہیں سلام کیا کرو، قسم رب کی قیامت تک جو انہیں سلام کرے گا یہ اس کا جواب دیں گے (تفسیر خازن) بہر حال صحیح یہی ہے کہ شہداء کی روح بھی زندہ ہے اور جسم بھی، تعلق روح کا جسم سے قائم ہے، ان کے حواس درست ہیں، بلکہ بمقابلہ زندگی زیادہ قوی ہیں، اس کی پوری تحقیق ہم دوسرے پارہ میں کر چکے ہیں، عِنْدَ رَبِّهِمْ یہ ھم محذوف کی خبر دوم ہے، خبر اول اَحْيَآءٌ تھی، عِنْدَ بمعنی مقرب یا معظم ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَ مَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (انبیاء: ۱۹) اور فرماتا ہے فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ الخ (فصلت: ۳۸) بعض نے فرمایا کہ عِنْدَ ظرف فیہ ہی ہے اور یہ يُرْزَقُوْنَ کا ظرف مقدم ہے، مگر پہلی توجیہیں زیادہ قوی ہیں (تفسیر خازن، مدارک، بیضاوی، کبیر، روح المعانی، روح البیان وغیرہ) یعنی وہ شہداء زندہ ہیں رب تعالیٰ کے ہاں مقرب معظم و مکرم ہیں، منکرین حیات شہداء نے عِنْدَ کو اَحْيَآءٌ کا ظرف مانا اور معنی یہ کئے کہ وہ دنیا میں زندہ نہیں بلکہ رب تعالیٰ کے نزدیک زندہ ہیں، دیکھو تفسیر بیان القرآن مصنفہ مولوی محمد علی صاحب لاہوری قادیانی، شاید ان کے ہاں دنیا خدا سے دور ہو گئی، کوئی اور عالم خدا کے نزدیک ہوگا، اللہ کے بندو دنیا بھی خدا کے نزدیک ہی ہے، یہاں قرب مکانی بن سکتا ہی نہیں يُرْزَقُوْنَ یہ ھم کی تیسری خبر ہے، رزق کے معنی اور اس کی قسمیں ہم مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ (بقرہ: ۳) کی تفسیر میں پہلے پارہ میں عرض کر چکے ہیں، یہاں جنت کا رزق مراد ہے، وہاں کے پھل، پانی، دودھ، شربت وغیرہ سب کچھ جیسا کہ گذشتہ مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا، اور اس میں شہداء کی جسمانی زندگی کی تاکید ہے (تفسیر روح البیان) کہ اگر وہ حضرات مع روح و جسم زندہ نہ ہوتے تو رزق دیئے جانے کے کیا معنی، رزق ملنا جسم ہی کی صفت ہے، اس کے مضارع فرمانے سے پتہ لگا کہ ان کو برابر مسلسل رزق مل رہا ہے فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ یہ عبارت یا تو يُرْزَقُوْنَ کی ضمیر سے حال ہے یا اَحْيَآءٌ سے یا عِنْدَ رَبِّهِمْ کے متعلق کی ضمیر سے فرح وہ خوشی ہے جو رنج و غم سے مخلوط نہ ہو، فخر و تکبر کی فرح و خوشی تو ممنوع ہے، اور شکر کی فرحت و خوشی بہتر، رب تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ (قصص: ۷۶) یہاں فخر کی فرحت سے ممانعت ہے، اور فرماتا ہے قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (یونس: ۵۸) یہاں شکر کی فرحت و سرور کا حکم ہے، رب کے فضل سے مراد شہادت، مغفرت، جنت اور وہاں کی نعمتیں رب کی رضاء ہیں، چونکہ یہ سب کچھ اس کریم و رحیم کی مہربانی سے ملا نہ کہ محض اپنی بہادری سے، اس لئے اسے مِنْ فَضْلِهٖ فرمایا، مِنْ فَضْلِهٖ میں مِنْ بیانیہ ہے، بِمَآ کا بیان یعنی ان شہداء کو اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتوں کے ساتھ خوشی بھی بخشی، کہ وہ خوش و خرم ہیں ان

گناہ تمہارے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے فرمادو کہ اطاعت کرو اللہ اور پیغمبر کی
اور تمہارے گناہ بخشدے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے تم فرمادو کہ حکم مانو اللہ اور رسول کا
فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۲
پس اگر منہ پھیریں وہ پس تحقیق اللہ نہیں پسند کرتا کافروں کو
پھر اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ کو خوش نہیں آتے کافر

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں مسلمانوں کو کفار سے علیحدگی کا حکم دیا گیا اور ان سے محبت کی ممانعت کی گئی۔ اب محبوب ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا جارہا ہے۔ گویا پہلے پرہیز کا ذکر تھا اب علاج کا یا پہلے نہ کرنے والے کام بتائے گئے۔ اب کرنے والی چیز کا کام ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں کفار کی محبت سے منع کیا گیا تھا۔ اب وہ بہترین چیز بتائی جارہی ہے جس سے محبت کفار خود بخود دل سے نکل جائے۔ یعنی اطاعت مصطفیٰ ﷺ کیونکہ جب تک محبوب سے حجاب ہے تب تک غیر پر نظر ہے۔ جن آنکھوں نے قدم پاک مصطفیٰ ﷺ دیکھ لیا پھر کسی اور کو کیا دیکھیں۔ جس دل میں محبت خدا اور رسول ہو اس میں دوسری محبتوں کی جگہ ہی نہیں۔

تیرے قدموں میں جو ہیں غیر کا منہ کیا دیکھیں　　کون آنکھوں میں جچے دیکھ کے تلوا تیرا

گویا پہلے بڑی سخت چیز کا حکم دیا گیا کہ کفار سے محبت توڑ دو۔ ان سے رشتے قرابتیں کاٹ دو۔ یہ کام ہر شخص کے لئے آسان نہ تھا۔ اب وہ چیز بتائی جس سے یہ سب کچھ آسان ہو جائے۔ یعنی عشق مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کیونکہ عشق ہر مشکل کو آسان کر دیتا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں ڈرا دھمکا کر دعوت ایمان دی گئی تھی۔ اب محبوبیت کا لالچ دے کر ان سب کو ایمان کی طرف بلایا جارہا ہے کہ اگر تم اس رسول کی اطاعت کرو گے تو خدا تمہیں پیارا بنالے گا۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیتوں میں رب کے غضب و قہر کا ذکر تھا۔ اب اس کی رحمت خاصہ کا تذکرہ ہے کہ کوئی سختی سے مانتا ہے اور کوئی نرمی سے۔ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رؤف یعنی بہت مہربان ہے۔ اب ان بندوں کا ذکر فرمایا جارہا ہے جن پر اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے۔ یعنی رحمت دینے والے رب کا ذکر پہلے ہوا اور رحمت لینے والے بندوں کا ذکر اب ہے۔ جو رحمت لینے کے لائق ہوں۔ یعنی حضور ﷺ کے مطیع و متبع۔ **چھٹا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ قیامت میں سب کے اعمال سامنے آجائیں گے۔ اب ارشاد ہے کہ اگر پردہ پوشی چاہتے ہو تو محبوب کی اتباع و پیروی کرو اس کی برکت سے تمہارے عیوب پر دنیا و آخرت میں دوسرے لوگ اطلاع نہ پائیں گے۔

شان نزول

ایک دفعہ نبی کریم ﷺ جماعت قریش پر گذرے جنہوں نے بت گاڑے ہوئے تھے اور انہیں آراستہ کر رہے تھے۔ اور ان کے سامنے سجدہ میں گرتے تھے تو فرمایا کہ اے گروہ قریش تم نے اپنے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی مخالفت کی

والی نعمتوں پر بھی وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ، ہماری قرأت میں اَنَّ الف کے فتح سے ہے، اصل میں بِاَنَّ تھا بِنِعۡمَةٍ پر معطوف، اور امام کسائی کی قرأت میں اِنَّ الف کے کسرہ سے نیا جملہ یُضِیۡعُ اضاعۃ سے بنا بمعنی برباد کردینا، ثواب نہ دینا، یعنی وہ شہداء اس پر بھی خوشیاں مناتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت نعمتیں بخشیں، اور اس پر بھی شادماں ہیں کہ اللہ تعالیٰ تا قیامت کسی مومن کا اجر وثواب ضائع نہیں فرمائے گا، سب کو بقدر اعمال بدلہ دے گا فضل اس کے علاوہ ہے، یہاں مومنین فرمانے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا الخ سے مراد سارے مومن تھے نہ کہ صرف صحابہ کرام نہ صرف غازیانِ اسلام نہ صرف آئندہ شہید ہونے والے حضرات کیونکہ لفظ مومنین سب کو ہی شامل ہے (از تفسیر کبیر و معانی وخازن وغیرہ)

خلاصہ تفسیر

اے محبوب ﷺ یا اے قرآن پر ایمان رکھنے والے! کبھی خیال وگمان بھی نہ کرنا کہ جو لوگ راہ خدا میں مارے گئے وہ مردہ ہیں نہیں ہرگز نہیں وہ تو زندہ ہیں اپنے رب تعالیٰ کی بارگاہ میں مقرب ہیں، انہیں برابر جنت کی روزیاں، پھل فروٹ، کوثر و سلسبیل وغیرہ نعمتیں مل رہی ہیں، ہر وقت خوش ہیں کبھی رنج وغم ان کے پاس نہیں پھٹکتا، کیونکہ رب تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل و کرم سے بہت کچھ دے رکھا ہے، صرف اپنی کامیابی پر وہ خوش نہیں بلکہ قیامت تک جس قدر مسلمان ایمان پر مرنے والے ہیں، جو ابھی تک ان سے نہیں ملے، یا تو پیدا ہو چکے ہیں مگر فوت نہیں ہوئے، یا ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے پیچھے آنے والے ہیں ان کے حالات سے بھی خبردار ہیں، اور ان کو ملنے والی نعمتوں پر بھی خوشیاں منا رہے ہیں، کہ ان لوگوں پر بھی نہ دنیا میں کوئی خوف اور نہ آخرت میں کچھ غم، یہ شہداء اللہ کی نعمتوں یعنی غزوۂ شہادت، حسن خاتمہ اور اعمال کے ثواب پر بھی خوش ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کے علاوہ جو انہیں ملا اس پر بھی شاداں اور اس پر بھی خوش وخرم ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کسی مسلمان کا اجر برباد نہ کرے گا، سب کو بقدر عمل جزا دے گا کمی نہ فرمائے گا، بلکہ اپنے کرم سے زیادہ بخشے گا، ان تمام وجوہ سے بہت ہی خوش وخرم ہیں، ایسی پاکیزہ اور عیش و بہار والی زندگی رکھنے والے لوگ بھی مردہ ہو سکتے ہیں؟ نہیں بلکہ ان کی زندگی بھی دائمی ہے یا اور ان کی نعمتیں وعیش وخوشیاں بھی دائمی، غرضکہ شہداء کی زندگی بھی اعلیٰ ہے اور موت بھی افضل،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** جنت اور وہاں کی نعمتیں پیدا ہو چکی ہیں، اب موجود ہیں، **دوسرا فائدہ:** بعض مقبول بندے مرنے کے بعد وہ نعمتیں کھاتے ہیں، یہ دونوں فائدے یُرۡزَقُوۡنَ سے حاصل ہوئے، بلکہ بعض بندوں کو زندگی ہی میں جنت کی نعمتیں دی جاتی ہیں، دیکھو قرآن کریم فرما رہا ہے کہ حضرت مریم زندگی میں جنت کے میوے کھاتی تھیں، حضور انور ﷺ نے صحابہ کو جنت کا پانی پلایا، جو آپ کی انگلیوں سے چشمہ کے طور پر ظاہر ہوا، **تیسرا فائدہ:** بعد موت روح کو فنا نہیں بلکہ اپنے اعمال کے مطابق مقام میں رہے گی، **چوتھا فائدہ:** شہید بعد موت زندہ ہیں، ان کے جسم بھی زندہ کہ نہ سڑتے ہیں نہ گلتے ہیں، اور ان کے حواس درست رہتے، روزی اخروی کھاتے پیتے ہیں جیسا کہ یُرۡزَقُوۡنَ کی تفسیر سے معلوم ہوا، ان کو موت آتی ہے بایں معنی کہ جسم سے روح نکل جاتی ہے، اور وہ زندہ ہیں بہ

کہتے ہیں۔ صرف فرائض اور واجبات میں اتباع ناقص اتباع ہے۔ ان چاروں اعمال شریف کی اتباع کامل اتباع ہے۔ جس قدر اتباع کامل ہوگی اسی قدر رب تعالیٰ کی محبوبیت اعلیٰ۔ غرضکہ اِتَّبِعُوْنِیْ اور یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ میں بڑی وسعت ہے۔ اگر تم نے ایک یہ کام کر لیا تو تمہیں دو عظیم الشان انعام ملیں گے۔ ایک یہ کہ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ الخ اس کم میں بھی وہ ہی احتمالات ہیں جو کُنْتُمْ میں تھے کہ اس میں کسی خاص جماعت سے خطاب ہو یا عام سے یعنی اب تک تو تم خدا کے طالب بننا چاہتے تھے۔ لیکن پھر اس کا برعکس ہوگا کہ رب تمہیں اپنا مطلوب محبوب کر لے گا اور دوسرا انعام یہ کہ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔ یَغْفِرْ اور ذُنُوْبَ کی لغوی تحقیقات بارہا ہو چکی۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ ذُنُوْبَ سے سارے حق اللہ اور تمام چھوٹے بڑے گناہ مراد ہیں اور کم میں سب سے خطاب۔ لَكُمْ میں لام نفع کا ہے یا ملکیت کا یعنی اسکے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ تمہارے سارے اگلے پچھلے چھوٹے بڑے کھلے چھپے گناہ معاف کر دے گا۔ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ الرَّحِیْمٌ۔ اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے مگر اسکی ان صفتوں کے مظہر غلامان مصطفیٰ علیہ السلام ہیں۔ دشمنانِ رسول پر صفت قہر کا ظہور ہوا کرے گا۔ اگر تم سے پوری اتباع نہ ہو سکے تو قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ۔ الخ بعض روایتوں میں ہے کہ جب پچھلی آیت اتری تو عبداللہ ابن ابی سلول منافقوں کا سردار بولا کہ دیکھو محمد مصطفیٰ علیہ السلام نے اپنی فرمانبرداری کو رب تعالیٰ کی اطاعت کی طرح بنا دیا۔ اور ہمیں اپنے ساتھ ایسی محبت کا حکم دیا جیسے عیسائی عیسیٰ علیہ السلام سے کرتے ہیں۔ تب یہ آیت آئی (خازن) اور یہود بولے کہ محمد علیہ السلام خدا بننا چاہتے ہیں کہ ہم آپ کو خدا بنا لیں۔ جیسے عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو رب بنا لیا۔ تب یہ آیت اتری (مدارک) قُلْ میں بھی حضور علیہ السلام سے خطاب ہے اور اَطِیْعُوْا میں سب لوگوں سے اللہ اور رسول دونوں کے لئے ایک ہی اَطِیْعُوْا ارشاد ہوا کیونکہ رب تعالیٰ کی اطاعت نبی علیہ السلام کے ضمن میں ہے مگر چونکہ ان دونوں کی نوعیتوں میں فرق ہے کہ رب تعالیٰ کی اطاعت صرف احکام میں ہوگی۔ نہ کہ افعال میں۔ اور حضور علیہ السلام کی اطاعت ساری چیزوں میں۔ اس لئے بعض جگہ اَطِیْعُوْا مکرر لایا گیا کہ فرمایا گیا۔ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ۔ خیال رہے کہ اطاعت صرف احکام میں فرمانبرداری کرنے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا اس کا درجہ اتباع کے بعد ہے۔ اس لئے اس کا ذکر اتباع کے بعد ہوا (روح البیان) اور اتباع کے ساتھ محبوبیت کا ذکر ہوا۔ اور اطاعت کے لئے فرمایا گیا فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ۔ تَوَلَّوْا کی لغوی تحقیق بارہا ہو چکی۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ یہ جمع مذکر غائب ماضی بھی ہو سکتا ہے اور جمع حاضر مضارع بھی پہلی صورت میں یہ رب کا فرمان ہوگا اور دوسری صورت میں نبی علیہ السلام کا یعنی اگر وہ لوگ اطاعت سے منہ موڑیں یا آپ فرما دو کہ اگر تم نے اطاعت سے منہ موڑا تو کافر ہو جاؤ گے اور خدا کے دشمن کیونکہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی علیہ السلام آپ ان لوگوں سے فرما دو جو آپ کے بغیر وسیلہ ہماری محبت کا دم بھرتے ہیں یا جو اپنے کو رب کا پیارا جان کر آپ سے بے نیاز ہونا چاہتے ہیں یا جو آپ کی اطاعت کے سوا دوسرے اسباب سے خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان سب کو اعلان عام کر دو کہ اے عیسائیو، یہودیو، ہندیو، سندھیو، عابد اور بت پرستو! اگر تم خدا سے محبت کرنا چاہتے ہو تو نہ مجھ سے مقابلہ کرو، نہ میری برابری کا دم بھرو۔ نہ مجھ سے آگے آگے چلو بلکہ غلام بن کر میرے پیچھے چلے آؤ۔ اپنے اقوال، افعال، اعمال، غرض

اعتراضات

پہلا اعتراض: بہت سی آیتوں اور صدہا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی، ولی، شہید سب کو موت آتی ہے، یہ آیت ان تمام کے خلاف ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (زمر: ۳۰) اے محبوب آپ کو موت آتی ہے اور ان سب کو بھی، اور فرماتا ہے كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (رحمٰن: ۲۶) اور فرماتا ہے كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران: ۱۸۵) اور فرماتا ہے اَفَاِئنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (آل عمران: ۱۴۴) اور فرماتا ہے لَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا (احزاب: ۵۳) وغیرہ، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور انور ﷺ کی وفات کے دن فرمایا کہ جو محمد (ﷺ) کو پوجتا ہو، تو وہ تو وفات پاگئے، اور جو اللہ کو پوجتا ہو، تو وہ حی لایموت ہے، اور فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کہ اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے، تو میری اتباع انہیں کرنا پڑتی یعنی وہ زندہ نہیں ہیں، نیز اگر حضرات شہداء زندہ ہیں تو ان کا کفن دفن کیوں ہوتا ہے؟ ان کی میراث کیوں تقسیم ہوتی ہے، ان کی بیویاں نکاح کیوں کر لیتی ہیں؟ لہٰذا ان جیسی آیتوں میں جہاں کہیں حیات کا لفظ ہے، وہاں صرف روحانی، برزخی یا کارناموں کی زندگی مراد ہے یا عند اللہ سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کے علم میں زندہ ہیں، جیسے کہا جاتا ہے هٰذَا عِنْدَ اَبِیْ حَنِیْفَةَ یہ مسئلہ امام اعظم کے نزدیک ہے، یعنی ان کے علم میں، ان کے مذہب میں ہے، لہٰذا یہاں اَحْيَآءٌ کے معنی یہ ہیں کہ شہداء کے کام، ان کے نام زندہ ہیں کہ یہ لوگ انہیں اچھی طرح یاد کرتے ہیں، یا ان کی روحیں زندہ ہیں بحیات برزخی، یا وہ کسی اور عالم میں زندہ ہیں، نہ کہ اس جہان میں،

نوٹ ضروری: گجرات کے بعض جہلاء نے آج کل مسئلہ حیات النبی، حیات ولی، حیات الشہداء کا شدت سے انکار کیا ہے، ان کے یہ دلائل ہیں بلکہ جس متانت سے ہم نے ان کی طرف سے دلائل بیان کر دیئے، انشاء اللہ وہ خود بھی بیان نہ کر سکیں گے، آج کل اسی مسئلہ پر بہت زور ہے، **جواب:** اس اعتراض کے تفصیلی جوابات ہم اسی تفسیر کے دوسرے پارے میں زیر آیت وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ (بقرہ: ۱۵۴) عرض کر چکے ہیں، نیز مرأت شرح مشکوٰۃ جلد دوم باب الجمعہ میں مسئلہ حیات النبی بہت تحقیق سے ہم عرض کر چکے ہیں، یہاں اتنا سمجھ لو، زندگی وموت کے بہت معنی ہیں، ایک معنی سے جسم کو زندہ و مردہ کہا جاتا ہے، دوسرے معنی سے روح کو، تیسرے معنی سے زمین کو، چوتھے معنی سے شہر وغیرہ کو، اور پانچویں معنی سے دل کو زندہ ومردہ کہا جاتا ہے، ان تمام معنی میں یہ لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے، رب تعالیٰ نے زندہ کافروں کو مردہ فرمایا ہے، جسم انسان کی زندگی وموت کے دو معنی ہیں، روح کا جسم سے نکل جانا، روح کا جسم چھوڑ دینا، پہلے معنی سے ہر شخص کو موت ہے، خواہ نبی ہو، ولی ہو، شہید ہو یا عام مومن یا غیر مومن، تمہاری پیش کردہ آیتوں وحدیثوں میں موت سے یہ ہی مراد ہے، یعنی روح ہر ایک کے جسم سے نکلنے والی ہے، یقیناً اس معنی سے سب کو موت آنے والی ہے، مگر دوسرے معنی سے حضرات انبیاء، اولیاء، شہداء کو ہرگز موت نہیں، ان کے جسم سے روح نکل کر جسم کو چھوڑتی نہیں، جس سے ان کا جسم سڑتا گلتا نہیں، اس کے حواس بھی قائم رہتے ہیں، دیکھو دل نکل جانے پر موت یقیناً واقع ہو جاتی ہے، مگر معراج وغیرہ میں حضور انور ﷺ کا دل نکالا گیا، چاک کیا گیا، صاف فرمایا گیا، مگر موت واقع نہ ہوئی، حیات کی تمام آیات وحدیث میں یہ ہی مراد دوسرے معنی کی موت کی نفی ہے،

بتایا گیا۔ اتباع تبع سے بنا بمعنی پیچھے چلنا۔ اس طرح کہ اگلے کے قدم پر قدم رکھنا کہ راستہ کے غار و خار وغیرہ کا اگلا ذمہ دار ہوگا۔ یہ پچھلا تو صرف اس کے قدم پر قدم رکھے جیسے ریل کے ڈبے انجن کی اتباع کرتے ہیں کہ لائن کی صفائی سگنل وغیرہ انجن والے دیکھیں ڈبہ اور ڈبہ والے صرف انجن کے پیچھے پیچھے دوڑیں۔ یہاں اِتَّبِعُوْنِیْ فرما کر اس جانب اشارہ ہے کیا کہ میرے محبوب کی پیروی عقل کے ماتحت نہ کرو بلکہ عشق کے ماتحت کرو۔ عشق اندھا ہو کر محبوب کی اطاعت پر مجبور کرتا ہے۔ سب کی باتیں سوچ سمجھ کر مانو' حضور ﷺ کی باتیں حضور کا فعل ہے۔ بغیر سوچے سمجھے کرو جیسے بچہ ماں باپ کی نقل بے سوچے سمجھے کرتا ہے۔ یا بیمار طبیب کا نسخہ بے سوچے سمجھے لیتا ہے۔ اس اتباع پر مدار ایمان ہے یہاں چھوڑنا کمال ہے ع

عقل قربان کن بہ پیش مصطفیٰ

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حضور سید عالم ﷺ حق تعالیٰ کے محبوب اعلیٰ ہیں کہ جب ان کے غلام رب کے محبوب ہیں تو جن کی بدولت غلاموں کو یہ شرف ملا۔ ان کی محبوبیت کا کیا پوچھنا۔ نیز حق تعالیٰ نے اپنی اطاعت کو ان کی اطاعت کے ساتھ ملایا۔ **دوسرا فائدہ:** جو حضور ﷺ کی محبت کا دعویٰ کرے اور ان کی سنت کا مخالف ہو وہ بشہادت قرآن جھوٹا ہے جیسا کہ فَاتَّبِعُوْنِیْ سے معلوم ہوا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا۔

تَعْصِی الرَّسُوْلَ وَاَنْتَ تَظْهَرُ حُبَّهٗ ۔۔۔ هٰذَا لَعُمْرِیْ فِی الْفِعَالِ بَدِیْعٌ

لَوْ کَانَ حُبُّکَ صَادِقًا لَاَطَعْتَهٗ ۔۔۔ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٌ

عشق کا قانون اور محبت کا قاعدہ یہ ہے کہ عاشق کو محبوب کی ہر شئے پیاری ہو۔ اس کی سیرت' اس کی صورت بلکہ اس کے غلاموں' اس کے وطن اس کے ملک' اس کا محلہ اور در و دیوار بلکہ سگانِ کو عزیز ہوں۔ مجنون عامری نے کیا خوب کہا۔

اَمُرُّ عَلَی الدِّیَارِ دِیَارِ لَیْلٰی ۔۔۔ اُقَبِّلُ ذَاالْجِدَارَ وَ ذَاالْجِدَارَا

وَ مَاحُبُّ الدِّیَارِ شَغَفْنَ قَلْبِیْ ۔۔۔ وَلٰکِنْ حُبُّ مَنْ سَکَنَ الدِّیَارَا

یعنی میں لیلیٰ کے دیار پر پہنچ کر وہاں کے در و دیوار چومتا ہوں۔ مجھے ان دیواروں سے محبت نہیں بلکہ اس سے محبت ہے جس کے وطن کی یہ دیواریں ہیں۔

تیسرا فائدہ: اتباع اور اطاعت میں بڑا فرق ہے۔ اتباع خاص ہے اور اطاعت عام۔ اس لئے اتباع کے ساتھ محبوبیت کا ذکر کیا اور اطاعت کے ساتھ سزا کا کہ اگر اس سے بھی روگردانی کرو گے تو کافر ہو جاؤ گے۔ اطاعت رب تعالیٰ' نبی' سلطان' شیخ' ماں باپ' استاد سب کی ہو سکتی ہے مگر اتباع صرف حضور انور ﷺ کی ہوگی۔ اتباع رب تعالیٰ کی بھی نہیں ہو سکتی۔ اتباع کا معنی ہے کسی کی دیکھا دیکھی عمل کرنا۔ رب تعالیٰ روزانہ صدہا کو موت دیتا ہے۔ ہم ایک کو بھی ماردیں تو قتل کئے جائیں' غرضکہ اتباع رب تعالیٰ کی بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اِتَّبِعُوْا کے ساتھ صرف حضور ﷺ کا ذکر ہوا اور اطاعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ رسول اور اولو الامر سب ہی کا ذکر ہوا۔ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ (النساء: ۵۹) یہ فرق بہت خیال میں رہے۔ **چوتھا فائدہ:** محبت تین قسم کی ہے طبعی' عقلی' ایمانی۔ حضور علیہ السلام سے محبت طبعی چاہیے۔

استقبال کی تیاریاں کرتا ہے، یہ مطلب نہیں کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے حالات سے باخبر رہتا ہے، جیسا کہ تفسیر خازن وروح المعانی وغیرہ میں ہے، لہٰذا اس سے شہید کا علم غیب ثابت نہیں ہوتا، **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک الزامی، دوسرا تحقیقی، الزامی جواب تو یہ ہے کہ یہ بھی تمہارے وہابیوں کے مذہب کے خلاف ہے، تمہارا عقیدہ تو یہ ہے کہ خدا کے سواء کسی کو ایک کے انجام کی بھی خبر نہیں، سعادت وشقاوت علوم خمسہ میں سے ہیں، اس کا علم دوسرے کو ماننا شرک اکبر ہے، اگر ان شہداء کو ان غازیوں کے شہید ہونے، ایمان پر مرنے، ان کے پاس پہنچنے کا علم ہوا اور انہوں نے ان غازیوں کے استقبال کی تیاری کی، تو ان کی سعادت وشقاوت، وقت موت کا علم ہوگیا، کسی کا استقبال وہی کرسکتا ہے، جو اس کی آمد اور وقت آمد اور آمد کی جگہ سے خبردار ہو، ان چیزوں سے بے خبر استقبال کیا خاک کرے گا، جواب تحقیقی یہ ہے کہ آیت کریمہ میں کوئی قید نہیں اَلَّذِیۡنَ اور لَمۡ یَلۡحَقُوۡا دونوں عام ہیں، قرآنی عموم کو محض اپنے قیاس سے ختم نہیں کرسکتے، ہم تفسیر صاوی کا حوالہ پیش کرچکے کہ انہوں نے تا قیامت کا صاف صاف ذکر فرمایا، احادیث سے تو ثابت ہے کہ شہید کو بھی اپنی شہادت سے پہلے انجام وموت کی خبر ہو جاتی ہے، زندگی میں جنت اور اپنا مقام دیکھ لیتا ہے، زخمی صحابہ نے بدر کے میدان میں تڑپتے ہوئے جان نکلنے سے پہلے ہی مسلمانوں کو جنت، وہاں کی نعمتوں کی خبر دے دی، کہ ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں، جنگِ جمل میں حضرت زبیر نے اپنے بیٹے عبداللہ سے فرمایا کہ آج میری شہادت ہے تم میرے بعد میرے مال کا اس طرح انتظام فرمانا (بخاری شریف) ایک نومسلم صحابی نے جو عین جنگ کی حالت میں ایمان لایا کھجوریں پھینک دیں اور بولا کہ اب آگے چل کر جنت کے پھل کھائیں گے اور کچھ دور جا کر بولا، یارسول اللہ (ﷺ) میں جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، وہ تلواروں کے سایہ میں ہے، جب شہید کا اپنی زندگی میں یہ حال ہے تو بعد شہادت کیا حال ہوگا، بہر حال حق یہ ہی ہے کہ شہید تا قیامت ہر مسلمان کے انجام سے خبردار ہے، ہر ایک کا انجام، مقام درجہ جانتا ہے، آیت کریمہ بالکل ظاہری معنی پر ہے کسی تاویل یا قید کی گنجائش نہیں،

تفسیر صوفیانہ

عوام کی زندگی ان کی روح سے ہے، خواص کی زندگی رب سے، روحانی زندگی والے روح نکل جانے سے مر جاتے ہیں، مگر ربانی زندگی والے روح نکلنے کے بعد طبعی زندگی سے منتقل ہو کر اصلی وحقیقی زندگی میں پہنچ جاتے ہیں، شریعت کی تلوار سے مرنے والے زندہ ہیں، مرزوق ہیں، تو صدق وصفا اور عشق کی تلوار سے مرنے والے بھی زندہ جاوید ہیں، شعر

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است برجریدہ عالم دوام ما

کفار سے جہاد، جہادِ اصغر ہے، اور نفس نابکار سے جہاد، جہاد اکبر، جہادِ اصغر میں شہید ہونے والے بعد وفات جنت صوری میں رہتے ہیں، اور جہاد اکبر سے شہید ہونے والے جیتے جی معنوی جنت میں رہتے ہیں اور وہاں کے پھل پاتے ہیں، کیا تمہیں خبر نہیں کہ حضور انور ﷺ نے فرمایا کہ اَبِیۡتُ عِنۡدَ رَبِّیۡ یُطۡعِمُنِیۡ وَیُسۡقِیۡنِیۡ میں اپنے رب کے پاس رات گذارتا ہوں وہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے، صوفیائے کرام فرماتے ہیں، کہ کل قیامت میں ہر ٹولہ اپنے اپنے امام کے ساتھ رب تعالیٰ کے سامنے پیش ہو گا، چنانچہ صدیقین کا ٹولہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جھنڈے کے نیچے ہوگا، عادل بادشاہوں کی جماعت لواء فاروقی

اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ وَالرَّسُوْلَ میں واؤ عطف تفسیری کا ہے۔ فرائض و سنن غذا و پانی کی طرح ہیں کہ فرائض روحانی غذائیں، سنتیں رحمت کا پانی منکرین حدیث اس آیت پر عمل نہیں کر سکتے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہ عجب تماشا ہے کہ جو کوئی محمد ﷺ صاحب کی طرف ہو جائے تو خدا بھی اس کی طرف ہو جائے اور وہ دوسرں کو ستانے کے لئے جو گناہ کرے وہ معاف ہو جائیں۔ بھلا ایسی باتیں سچے خدا کی ہو سکتی ہیں۔ (ستیارتھ پرکاش)

جواب: پنڈت جی اس پر اعتراض کیا ہے۔ خدا ہمیشہ حق کی طرف ہے اور نبی ﷺ حق پر ہیں۔ جو ان کی غلامی کرے گا وہ حق پر ہوگا۔ لہٰذا خدا اس کی طرف ہوگا یہ تو عین انصاف ہے اور تم نے ستانے کے معنی کہاں سے نکالے۔ آیت میں ارشاد ہوا کہ نبی ﷺ کی پیروی سے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ بندوں کے حقوق کا ذکر تو نہیں ہے۔ یہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ قاتل مقروض وغیرہ مسلمان ہو جائیں تو ان کا قتل و قرض معاف ہو جاتا ہے۔ حقوق بہر حال ادا کرنے پڑیں گے۔ ہاں اسلام کی برکت سے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں کیونکہ اسلام وہ سمندر ہے جو ہر گندگی کو دور کر دیتا ہے۔ یہ آریہ دھرم نہیں ہے کہ جس سے کوئی فائدہ نہ ہو۔ **دوسرا اعتراض:** اگر حضور ﷺ سے طبعی محبت ایمان کا مدار ہے تو چاہیے کہ کوئی مسلمان نہ ہو کیونکہ ہر ایک کو اپنی اولاد اور جان و مال سے قدرتی طور پر میلان طبع زیادہ ہوتا ہے۔ اولاد کی خاطر انسان گناہ بھی کر لیتا ہے۔ لہٰذا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا مطلب یہ ہی ہونا چاہیے کہ حضور ﷺ سے عقلی محبت زیادہ ہو یعنی مومن کی عقل تقاضا کرے کہ حضور ﷺ سے محبت ہونی چاہیے۔ (دیوبندی) **جواب:** یہاں صرف محبت عقلی مراد نہیں بلکہ محبت طبعی ہی مراد ہے جیسا کہ اولاد اور ماں باپ کے مقابلہ سے معلوم ہوا اور الحمد للہ ہر سنی مسلمان کو حضور ﷺ سے محبت طبعی ہوتی ہے۔ سنیوں کی جاہل عورتیں کافر اولاد کو منہ نہیں لگاتیں۔ گناہ غفلت کا نتیجہ ہے نہ کہ محبت ہونے کا۔ بے وقوف بیمار بد پرہیزی کر کے بیماری بڑھا لیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسے اپنی جان سے محبت نہیں محبت تو ہے مگر غفلت سے یہ حرکت کر بیٹھا۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت میں ارشاد ہوا۔ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔ رب تمہارے سارے گناہ معاف کر دے گا اور ذنوب میں حقوق بھی داخل ہیں تب تو چاہیے کہ نو مسلم کے پچھلے قرض اور خون بھی معاف ہو جائیں۔ **جواب:** حق العبد کہتے ہی اسے ہیں جو بغیر بندہ کے معاف کئے معاف نہ ہو۔ اور حق اللہ وہ ہے جس میں بندہ کی معافی کی ضرورت نہ پڑے۔ ہر حق عبد میں اللہ کا بھی حق ہے جو بندہ کا حق مارتا ہے وہ رب کا قانون توڑتا ہے۔ اسلام کی برکت سے حق اللہ معاف ہو جائے گا مگر بندہ کا حق ادا کرنا ہوگا۔ ہم اس کی پوری تحقیق دوسرے سیپارہ کی تفسیر میں حج کے بیان کے بعد کر چکے ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** حضور ﷺ خدا تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں اور منزل مقصود پر پہنچ کر وسیلہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اپنا اسٹیشن آ جانے پر ریل چھوڑ دی جاتی ہے تو چاہیے کہ جو کوئی خدا تک پہنچ جائے وہ حضور ﷺ کو چھوڑ دے؟ **جواب:** محض وسیلہ چھوٹ جاتا ہے مگر جس وسیلہ سے مقصود وابستہ ہے وہ کبھی نہیں چھوٹتا۔ گیس بجلی و روشنی کا وسیلہ ہے مگر روشنی حاصل کرنے کے بعد انہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ ورنہ پھر اندھیرا ہے۔ حضور ﷺ دوسری قسم کا وسیلہ ہیں۔ اس لئے ہر ولی، غوث کلمہ میں حضور ﷺ کا نام ضرور لے گا۔ نماز میں حضور ﷺ کو سلام ضرور [illegible] سے تعلق دنیا میں بھی ضروری ہے اور آخرت میں بھی۔

بعد ہی بطور کفارہ ادا کیا یعنی غزوۂ حمراء الاسد کے لئے اپنے کو پیش کر دینا، **تیسرا تعلق:** گذشتہ آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا، اب ان مومنوں کے صفات بیان ہو رہے ہیں، کہ یہ حضرات وہ ہیں جو مصیبت پہنچنے پر بھی اللہ رسول کے فرماں بردار رہتے ہیں، **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ شہدائے احد پیچھے آنے والے مسلمانوں کے استقبال کی تیاریاں کر رہے ہیں، اور ان کی ملاقات کی خوشیاں منا رہے ہیں، اور ان کے مراتب سے واقف ہیں، اب ان ہی پیچھے جانے والے مسلمانوں کے اعمال کا ذکر ہو رہا ہے،

شانِ نزول

اس آیت کریمہ کے شانِ نزول کے بارے میں بہت روائتیں ہیں، زیادہ قوی اور صحیح روایت یہ ہے کہ پندرہ شوال ہفتہ کے دن جنگِ احد ختم ہوئی، جب ابوسفیان اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکہ معظمہ لوٹتے ہوئے مقام روحاء پہنچے، تو حسرت سے کہنے لگے کہ ہم نے بڑی غلطی کی جیتا ہوا میدان یونہی چھوڑ آئے، نہ ان کے کچھ قیدی ساتھ لائے، نہ ان کے چوٹی کے سرداروں کو شہید کیا، اور نہ ان کی عورتوں کو لونڈی بنایا، یہ سوچ کر پھر مدینہ پاک کا رخ کرنا چاہا، یہ خبر مدینہ منورہ پہنچی، تو نبی کریم ﷺ نے ۱۶ شوال کو اتوار کے دن یعنی احد کے ایک دن بعد اعلان فرمایا کہ ابوسفیان کے مقابلہ کے لئے نکلو، اور فرمایا کہ اس غزوہ میں صرف وہی لوگ جائیں گے جو کل ہمارے ساتھ جنگِ احد میں تھے، سوائے غازیانِ احد کے اور کسی کو اس غزوہ میں شرکت کی اجازت نہ ہو گی، یہ اعلان ہوتے ہی یہ غازی اور کل کے زخمی شیر پھر تیار ہو گئے، تیار اس طرح ہوئے کہ بعضوں نے اپنے زخموں پر پٹیاں باندھ لی تھیں اور بعض ابھی مرہم پٹی بھی نہ کر سکے تھے اور اس طرح روانہ ہوئے، کہ ایک زخمی دوسرے زخمی کو کچھ دور اپنے کندھے پر اٹھاتا، پھر یہ اتر کر اپنے اٹھانے والے کو اپنے کندھے پر اٹھاتا، بعض کا یہ حال تھا کہ ان میں سے ایک کچھ دور دوسرے پر ٹیک لگا کر چلتا اور کچھ دور دوسرا اس پر ٹیک لگا کر چلتا، کیونکہ یہ حضرات سخت کمزور و بیمار تھے، مسلسل پیدل نہ چل سکتے تھے، غرضکہ حضور انور ﷺ کے ساتھ ستر حضرات اس شان سے روانہ ہوئے، ان میں حضرت ابوبکر و عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد، سعید، عبدالرحمٰن ابن عوف، ابوعبیدہ ابن جراح، عبداللہ ابن مسعود، حذیفہ ابن یمان جیسے حضرات بھی تھے، جو حضرات رہ گئے تھے وہ حضور انور ﷺ کے حکم سے رہے تھے، خود نہ رہے تھے، جیسے حضرت جابر کو سرکار عالی نے حکم دیا تھا کہ کل تمہارے والد شہید ہو چکے ہیں تمہاری سات یتیم بہنیں رہ گئی ہیں انہیں سنبھالو، یہ قافلہ اس شان سے مدینہ طیبہ سے روانہ ہوا، اور شام تک منزل حمراء الاسد میں پہنچ گیا، تفسیر کبیر نے فرمایا کہ یہ منزل مدینہ پاک سے تین میل ہے، مگر روح المعانی وغیرہ میں ہے کہ آٹھ میل ہے، ہوسکتا ہے کہ ایک راستے سے تین میل ہو، اور دوسرے سے آٹھ میل، جیسے منیٰ شریف مکہ معظمہ سے پرانے راستہ سے تین میل ہے اور نئے سرکاری راستہ سے گیارہ میل، لہٰذا دونوں روایتیں درست ہیں، ادھر قدرتی معاملہ یہ بنا کہ اس جماعت کو معبد ابن ابی معبد خزاعی نے دیکھا، یہ ابوسفیان کا بہت دوست تھا، اور ابھی ایمان نہ لایا تھا، اسے مسلمانوں کا یہ حال دیکھ کر حیرت ہو گئی، جب یہ مقامِ روحاء پہنچا، تو ابوسفیان کو دیکھا کہ وہ مدینہ منورہ پر دوبارہ حملہ کرنے کے لئے لوٹ رہے ہیں، ابوسفیان نے پوچھا کہ معبد تجھے کچھ خبر ہے، معبد بولا ہاں! وہ تمہارے مقابلہ کے لئے اس شان سے نکل چکے ہیں اور حمراء

بیشک اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم کی آل اور عمران کی آل کو سارے جہان سے

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةً ۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ۚ

نسل کو بعض ان کے بعض سے ہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے

یہ ایک نسل ہے ایک دوسرے سے اور اللہ سنتا جانتا ہے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں کفار سے الگ رہنے اور حضور ﷺ کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جس پر اعتراض ہو سکتا تھا کہ سارے انسان ایک اللہ کی مخلوق' ایک دادا کی اولاد' ایک زمین پر بسنے والے ایک آسمان کے نیچے رہنے والے اور شکل و شباہت میں یکساں ہیں۔ پھر اس فرق کے کیا معنی کہ کفار سے ملو تو بے دین ہو جاؤ۔ اور پیغمبر سے نہ ملو تو بے دین ہو جاؤ۔ اس آیت میں اس وہم کو دفع فرمایا جا رہا ہے کہ یہ دنیا اس درخت کی طرح ہے۔ جس میں شاخیں' پتے' کانٹے' پھل پھول سب کچھ ہیں۔ اور یہ سب ایک ہی تخم سے ایک ہی جڑ پر قائم ایک ہی زمین میں ہیں۔ ایک ہی ہوا' پانی سے پرورش پاتے ہیں مگر کانٹوں سے پرہیز کیا جاتا ہے اور پھول سے محبت کفار اس درخت کے کانٹے ہیں اور انبیائے کرام پھول۔ آؤ تمہیں دکھاتے ہیں کہ اس گلدستہ میں کیسے کیسے پھول ہیں۔ اس لئے گذشتہ انبیائے کرام کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ یہ بیماری کہ ہم اور نبی یکساں ہیں' بڑی پرانی ہے۔ اس بیماری میں گذشتہ امتوں کے کفار گرفتار تھے بلکہ ان کے کفر کی وجہ یہ ہی تھی کہ انہوں نے اپنے میں اور نبی میں فرق نہ کیا۔ وہ نہ سمجھے کہ سانپ اور بھینس اگرچہ اللہ کی مخلوق ہے۔ اس کی روزی کھاتے پیتے ہیں مگر سانپ کے پاس زہر ہے۔ بھینس کے پاس دودھ اس لئے آپ سانپ کو مارتے ہیں اور بھینس کی خدمت کرتے ہیں۔ ایسے ہی کفار کے پاس کفر کا زہر ہے۔ اور حضرات انبیاء' اولیاء و علماء کے پاس ایمان کا دودھ معرفت الٰہی کا مکھن ہے یہ منافقانہ بیماری آج بھی لوگوں میں موجود ہے کہ سب کو بصارت سے دیکھتے ہیں۔ بصیرت سے نہیں دیکھتے۔ بصارت کہتی ہے کہ گھر کی ساری عورتیں یکساں ہیں۔ شکل و شباہت برابر' مگر بصیرت کہتی ہے کہ اپنی ماں اور بیوی کچھ اور بیٹی کچھ اور۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ محبت اتباع رسول کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ جس میں اشارتاً نبی کی شان کا اظہار ہوا۔ اب صراحتاً انبیائے کرام کی شان بیان فرمائی جا رہی۔ گویا یہ آیت پچھلے اجمال کی تفصیل ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ حضور ﷺ کی اطاعت کے بغیر ایمان نہیں مل سکتا۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ یہ حکم نیا نہیں ہے بلکہ ہر زمانہ میں پیغمبر رہے۔ اور ہر وقت کے لوگوں کو ان کی اتباع کا حکم دیا گیا۔

شانِ نزول

یہود نے کہا تھا کہ ہم حضرات ابراہیم و اسحٰق و یعقوب علیہم السلام کی اولاد ہیں اور ان کے دین پر ان کے رد میں یہ آیت کریمہ اتری جس میں ارشاد ہوا کہ وہ تمام خدا کے پیارے تھے تم مشرک تم انکے دین پر کیسے ہو سکتے ہو۔ (خازن و خزائن و معانی وغیرہ)

(۲) چونکہ عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ... یہ آیت آئی۔ جس میں عیسیٰ علیہ السلام کا شجرہ

قبول کرنا، اسی سے ہے، جواب، بعض علماء نے فرمایا کہ یہاں استفعال مجرد ہے، باب افعال کا ہم معنی ہے (یعنی قبول کیا یا قبولیت کا جواب دیا) اور بعض کے نزدیک مبالغہ کے لئے ہے، یعنی خوب ہی قبول کیا، عملاً، قولاً، اعتقاداً ہر طرح قبول کیا، اور حضور انور ﷺ کی فرماں برداری کا ریکارڈ قائم کردیا، اگرچہ اس موقعہ پر ان حضرات کو بلایا حضور انور ﷺ نے تھا، اور ان مقبولوں نے حضور انور ﷺ ہی کا فرمان قبول کیا تھا، اور حضور انور ﷺ ہی کے پاس دوڑ کر آئے تھے تو چونکہ حضور انور ﷺ کی پکار رب تعالیٰ کی پکار ہے، حضور انور ﷺ کی اطاعت رب تعالیٰ کی اطاعت ہے، حضور انور ﷺ کے پاس آنا رب تعالیٰ ہی کے پاس آنا ہے، اس لئے یہاں ارشاد ہوا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ شعر

ہر کہ خواہد ہم نشینی باخدا او نشیند در حضور مصطفیٰ (با اولیاء)

جسے رب تعالیٰ کے حضور بیٹھنے کا شوق ہو وہ جناب مصطفیٰ ﷺ کی بارگاہ میں بیٹھے، یعنی اے محبوب ہم بہت ہی خوش ہیں، اور تعریف کرتے ہیں ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ رسول کی پکار قبول کی اور دوڑے ہوئے آگئے بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ یہ اسْتَجَابُوْا کا متعلق ہے، مِنْ زائدہ ہے، جو بعدیت کا قرب بیان کرنے کے لئے لایا گیا ما مصدر یہ ہے یا موصولہ، اَلْقَرْحُ زخم کو کہتے ہیں، مگر یہاں بمعنی زخم وتکالیف ہے، اسی لئے جرح نہ فرمایا قَرْحٌ فرمایا، یعنی انہوں نے یہ پکار قبول بھی کی، تو کب زخم کھانے، تکلیف اٹھانے، احد میں مصیبتیں جھیلنے کے فوراً ہی بعد لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ اگر پہلا اَلَّذِیْنَ مبتداء تھا، تو یہ پوری عبارت اس کی خبر ہے، اور اگر وہ اَلْمُؤْمِنِیْنَ کا بدل تھا یا اَمْدَحُ کا مفعول، تو یہ مستقل جملہ ہے کہ اَلَّذِیْنَ مع صلہ کے خبر مقدم ہے، اور اَجْرٌ عَظِیْمٌ مبتداء موخر، چونکہ ان غازیانِ احد کا تقویٰ، پرہیزگاری، نیک کاری بھی بیان کرنا مقصود تھی، اس لئے رب تعالیٰ نے اتنی دراز عبارت ارشاد فرمائی، صرف لَهُمْ نہ فرمادیا، اَحْسَنُوْا اور اتَّقَوْا ماضی فرما کر یہ بتایا کہ یہ لوگ تو پہلے ہی سے نیک کار اور پرہیزگار ہیں، اور یہ بھی بتایا کہ کل احد میں ان کے پاؤں اکھڑ جانے سے ان کی نیک کاری اور پرہیزگاری میں کوئی فرق نہ آیا، یہ بدستور پہلے کی طرح محسن بھی ہیں اور متقی بھی، خیال رہے کہ ہر قسم کے نیک اعمال کرنے کو احسان کہتے ہیں، اور ہر قسم کے گناہ سے بچنے کو تقویٰ، اللہ تعالیٰ نے ان دو لفظوں میں ان حضرات غازیانِ احد کی زندگی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا، کہ ان کی زندگی کیا ہے نیک کاری اور پرہیزگاری کا مرقعہ ہے، تفسیر روح المعانی وکبیر وغیرہ نے فرمایا کہ مِنْهُمْ کا مِنْ تبعیضیہ نہیں بلکہ بیانیہ ہے، کیونکہ وہ سارے ہی حضرات محسن اور متقی ہیں، اَجْرٌ عَظِیْمٌ فرما کر بتایا گیا کہ ان کا اجر وثواب تمہارے حساب کتاب، خیال، وہم وگمان سے وراء ہے کیونکہ جس رب تعالیٰ نے تمام دنیا کو قلیل فرمایا وہ ان کے اجر کو عظیم فرمارہا ہے، تو سمجھ لو کہ ان کا اجر کیسا ہوگا، یعنی ان سارے محسنوں اور متقیوں کا ہماری بارگاہ میں بڑا ہی ثواب ہے جو تمہارے خیال وگمان سے وراء ہے،

خلاصہ تفسیر

اے محبوب انور (ﷺ) ہم مدح وثناء کرتے ہیں ان مہاجرین وانصار غازیوں کی، جنہوں نے احد میں صدہا مصیبتیں جھیلنے کے بعد ہی اللہ رسول کی پکار سنی اور اطاعت کی، کہ کل ہفتہ ہی کے دن یہ حضرات مصیبتوں کا نشانہ بنے، اور آج اتوار کو آپ کی پکار پر

ہو۔ بعض کے نزدیک آل ابراہیم حضور سید عالم ﷺ ہیں۔ کیونکہ حضور تمام ذریت ابراہیمی میں فرد اعلیٰ ہیں۔ وَاٰلَ عِمْرَانَ کا یہ آل ابراہیم پر معطوف ہے۔ اور اصطفیٰ کا مفعول عمران دو ہیں۔ ایک حضرت موسیٰ و ہارون کے والد ماجد جن کا نسب نامہ یہ ہے۔ عمران ابن یصھر ابن فاھث ابن لاوی ابن یعقوب ابن اسحٰق ابن ابراہیم علیہم السلام۔ دوسرے عمران ابن ماثان حضرت مریم کے والد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نانا ہیں۔ جن کا نسب شریف یہ ہے عمران ابن ماثان ابن عادر ابن ابی ھود ابن رب بابل ابن سالیان ابن یوحنا ابن اوشا ابن اوموذ ابن میشک ابن خارقا ابن یونام ابن غرزیا ابن یوزان ابن ساقط ابن ایشا ابن راحیم ابن سلیمان ابن داؤد ابن ایشا ابن عویل ابن سلمون ابن یاعر ابن مشون ابن عمیاد ابن دام ابن حضروم ابن فارض ابن یہودا ابن یعقوب ابن اسحٰق ابن ابراہیم علیہم السلام (روح البیان) ان دونوں عمرانوں کے درمیان ایک ہزار آٹھ سو برس کا فاصلہ ہے۔ (کبیر و خزائن) یہاں یا تو پہلے عمران مراد ہیں یعنی موسیٰ علیہ السلام کے والد یا دوسرے عمران یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے نانا اور یہ ہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ آگے حضرت مریم و عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ ہی آ رہا ہے۔ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ یہ اصطفیٰ کے متعلق ہے عالمین کی تفسیر سورۂ فاتحہ میں گذر چکی۔ چونکہ عالم بہت تھے۔ فرشتے، جن، انسان، پھر عالم بر، عالم بحر، عالم ارض، عالم سماء، عالم اجسام، عالم ارواح، عالم امکان، عالم امر، عالم انوار وغیرہ۔ اس لئے عالمین جمع فرمایا گیا۔ اگر آل ابراہیم میں حضور ﷺ داخل ہوں تو یہاں علی العالمین میں کسی قید کی ضرورت نہیں۔ بے شک آل ابراہیم قیامت تک ساری مخلوق سے افضل ہے اور اگر اس میں حضور ﷺ داخل نہ ہوں تو العالمین سے اس زمانہ کے اہل جہاں مراد ہیں جیسے یہود سے کہا گیا وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ۔ (بقرہ: ۴۷) اب حضور سید عالم ﷺ اور آپ کی امت سب سے افضل ہے۔ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ۔ یہ دونوں آل سے بدل ہے۔ ذریۃ ذرٌّ سے بنا بمعنی پھیلنا اور بکھرنا اس لئے چھوٹی چیونٹی کو ذر اور ریتے کے ذرات کو ذرہ کہا جاتا ہے نسل اور اولاد کو بھی اسی لئے ذریت کہتے ہیں کہ وہ عالم میں پھیلتی ہیں۔ یا اس لئے کہ وہ آدم علیہ السلام کی پشت سے چیونٹیوں کی شکل میں نکالی گئی تھیں۔ بعض کا خیال رہے کہ یہ ذرء بمعنی خلق سے بنا (خازن) بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ۔ یہ جملہ ذریت کا صفت اور نسبی حالت میں ہے یا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے بعض بعض کی اولاد ہیں۔ یا یہ مراد ہے کہ سارے پیغمبر اصل توحید میں ایک ہی ہیں۔ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ یہ نیا جملہ ہے۔ سمیع کا مفعول بندوں کے اقوال ہیں۔ اور علیم کا مفعول ان کے احوال و افعال یعنی اللہ تمام بندوں کی باتیں سننے والا اور ان کے کام اور حالات جاننے والا ہے۔ ہر شخص کو اس کی لیاقت کے مطابق درجات عطا فرماتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے لوگو سارے انسان یکساں نہیں۔ ان میں سے بعض مثل پھول کے ہیں۔ جن کی صحبت مہکا دیتی ہے۔ بعض کانٹوں کی طرح جن کے پاس بیٹھنا باعث ایذا ہے۔ یہ فرق نیا نہیں بلکہ ہمیشہ سے ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ نے حضرت آدم، نوح، ابراہیم علیہم السلام کی مومن آل اور حضرت عمران کی اولاد کو تمام جہان سے چھانٹ کر چن کر اپنا مقرب بنا لیا کہ آدم علیہ السلام کو انسانوں کا جد امجد فرشتوں کا مسجود بنایا۔ جنت میں ٹھہرایا۔ سارے علم انہیں عطا فرمائے۔ نوح علیہ السلام کو آدم ثانی کا خطاب دیا۔ زمین پر انہی کی اولاد پھیلائی۔ انکے [illegible] کفار کو ہلاک کیا۔ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں اولوالعزم پیغمبر پیدا فرمائے۔ اے

کرنے والوں کے متعلق اور نہ غازیانِ احد کے متعلق، جیسا کہ تفسیر کبیر اور خازن میں ہے، لہٰذا اس سے احد میں بھاگ جانے والوں کے فضائل ثابت نہیں ہوتے، **جواب:** تفسیر کبیر اور خازن نے اس قول کو ضعیف کہا ہے، بدر صغریٰ والوں کے لئے اگلی آیت ہے، نیز بدر صغریٰ کے موقعہ پر احد کے زخم مندمل ہو چکے تھے، کیونکہ وہ احد سے ایک سال بعد ہوا، اور مِنْۢ بَعْدِ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ زخم لگتے ہی ہوا تھا، اور یہ غزوۂ حمراء الاسد میں ہی ہوا، جو غزوۂ احد سے ایک دن بعد پیش آیا، اگر مان بھی لیا جائے، تب بھی تمہیں مفید نہیں، کیونکہ بدر صغریٰ میں بھی حضرت عثمان اور احد میں ہٹ جانے والے صحابہ شریک تھے، لہٰذا وہ ان درجات کے بہر حال مستحق ہوئے، **دوسرا اعتراض:** اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے غازیانِ احد نہ محسن تھے نہ متقی، اور نہ ان درجوں کے مستحق کیونکہ مِن تبعیضیہ ہے، **جواب:** ہرگز نہیں بلکہ مِن تبیینیہ ہے، جیسا کہ تفسیر روح المعانی وغیرہ میں ہے، کیونکہ آیت کریمہ میں اِسْتَجَابُوْا کو اجر عظیم کا باعث قرار دیا گیا ہے، یعنی جن لوگوں نے زخمی ہونے کے باوجود اس وقت اللہ رسول کی فرماں برداری کی ان کے لئے بڑا ثواب ہے، اور یہ فرمانبرداری تو سارے ہی غازیانِ احد نے کی تھی، تو سب ہی محسن ہوئے، سب ہی متقی اور سب ہی اجر عظیم کے مستحق، خلاصہ یہ ہے کہ اس دن کی استجابت، احسان، تقویٰ اور بڑے ثواب کی علت ہے، جب علت اور درجہ عام ہے، تو اس کے یہ تین نتیجے بھی عام ہوں گے، **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو احد میں زخمی ہوئے، اور پھر حضور انور ﷺ کے بلانے پر آ گئے، ان کے تو یہ درجے ہیں اور جو زخمی ہی نہ ہوئے، ان کے یہ مراتب بھی نہیں، تو اس درجہ کے مستحق نہ صدیق و فاروق ہیں نہ عثمان غنی، کیونکہ انہیں احد میں زخم نہیں پہنچے تھے، **جواب:** جی ہاں! نہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کیونکہ وہ بھی احد میں زخمی نہ ہوئے تھے، جناب جسم کے جرح یعنی زخم تو بعض کو لگے تھے، مگر دل کے قرح یعنی زخم سب کو ہی پہنچے تھے، جب یہ خبر اڑی ہے کہ حضور انور ﷺ شہید ہو گئے، تو صحابہ کو کتنا دکھ پہنچا اور کتنا صدمہ ہوا، اس کا اندازہ بے دردے کیا لگائیں، پھر حاصل شدہ فتح کا فوت ہو جانا، ہر ایک کے کسی نہ کسی عزیز کا شہید یا زخمی ہو جانا، یہ وہ زخم تھے جو سب کے دلوں پر لگے، لہٰذا یہ آیت سارے غازیانِ احد کو اپنے میں لئے ہوئے ہے، اس دن تو بیبیاں اپنی شہید شدہ اولاد پر غم کرنا بھول گئی تھیں، اس سے بڑا قرح اور کیا ہوگا؟

تفسیر صوفیانہ

صوفیائے کرام فرماتے ہیں، کہ ہمارے مشرب میں زخمی جگر، بے قرار دل، مجروح نفس، جبکہ یہ زخم تلوارِ عشق سے ہوں، اور بے قراری فراقِ یار میں ہو بڑے درجہ والے ہیں، جو یہ زخم اور بے قراری لے کر اللہ رسول کی بارگاہ میں حاضر ہو وہ بڑے ہی درجہ والا ہے، اس زخم اور بے قراری کو حاصل کرنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور بڑی مصیبتیں جھیلنا پڑتی ہیں، زخمی دل والے کا ایک سجدہ، بے قرار دل کی ایک آہ، مجروح نفس والے کی آنکھ کا ایک آنسو دوسروں کی صدہا عبادات سے افضل ہے یا تو خود زخمی اور بے قرار بنو، یا کسی بے قرار و مجروح کے ہو کر رہو، اس قسم کا ایک بے قرار ہزاروں کو قرار دے دیتا ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے، شعر

سے چیونٹی کی آواز سنی۔ یعقوب علیہ السلام نے قمیص یوسفی کی خوشبو مصر سے پائی۔ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو آگ نہ جلا سکی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے حضور علیہ السلام نے علم کے ہزار باب سکھائے۔ اور میں نے ہر باب سے ہزار باب علم کے نکالے۔ جب ولی کا یہ حال ہے تو نبی کا علم کتنا ہوگا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے خادم آصف ابن برخیہ ایک آن میں یمن سے بلقیس کا تخت شام میں لے آئے۔ جسے قرآن کریم نے نقل فرمایا۔ یہ جسمانی فوقیت تھی۔ ان کی روحانی اور عقلی فوقیت کو رب ہی جانے۔ اتنا سمجھ لو کہ نبی کی عقل تمام جہان کی عقلوں سے بڑھ کر اور حضور علیہ السلام کی عقل تمام پیغمبروں کی عقلوں سے بڑھ کر ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی الخ (تفسیر کبیر)

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام حضور ﷺ سے افضل ہیں کیونکہ آل عمران کو العالمین سے افضل فرمایا گیا۔ اور عالمین میں حضور بھی داخل ہیں۔ (عیسائی) **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ اس آیت میں آل ابراہیم بھی ہے۔ جس میں حضور ﷺ داخل ہیں۔ دوسرا یہ کہ عالمین سے اس زمانہ کے جہان والے مراد ہیں۔

لطیفہ: ایک عیسائی نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے کہا ؎

کسے بگفت کہ عیسیٰ ز مصطفیٰ اعلیٰ است　　　کہ او بزیر زمین دفن و آں باوج سما است

یعنی عیسیٰ علیہ السلام چوتھے آسمان پر ہیں۔ اور تمہارے پیغمبر زمین میں دفن لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام افضل ہوئے۔ آپ نے فوراً جواب دیا

بگفتمش کہ نہ ایں حجت قوی باشد　　　حباب بر سر آب و گہر تہِ دریا ست!

یعنی یہ دلیل قوی نہیں۔ دیکھو حباب پانی کے اوپر ہے اور موتی پانی کے نیچے۔ مگر موتی بلبلہ سے افضل اور قیمتی ہے۔

دوسرا اعتراض: اس آیت میں حضرت آدم و نوح اور دیگر تمام پیغمبروں کے لئے اصطفیٰ فرمایا گیا تو چاہیے کہ سارے نبیوں کو مصطفیٰ کہا جا سکے حالانکہ صرف حضور کو مصطفیٰ کہا جاتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ **جواب:** بعض الفاظ بعض ہستیوں کے لئے خاص ہو جاتے ہیں اگرچہ ان کے معنی ہر جگہ درست ہوں مگر ان کا استعمال ہر جگہ درست نہیں ہوتا۔ انہی میں سے لفظ مصطفیٰ بھی ہے۔ رسول کے معنی قاصد ہیں مگر انبیاء کے سوا کسی پر نہیں بولا جاتا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ (احزاب: ۴۳) جس سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ سب پر رحمتیں نازل فرماتا ہے مگر حضور علیہ السلام کے سوا کسی کو ﷺ نہیں کہہ سکتے۔ ایسے ہی السلام علیکم ہر مسلمان کو کہا جاتا ہے مگر علیہ السلام غیر نبی کو کہنا منع۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت میں فرمایا گیا کہ آل ابراہیم کو تمام جہانوں سے افضل کیا مگر اولاد ابراہیمی میں بڑے بڑے کفار مشرکین ہوئے۔ نیز متبعین ابراہیم یعنی مسلمانوں میں بڑے بڑے گنہگار ہیں۔ پھر یہ تمام عالمین سے کیوں افضل ہوئے۔

جواب: کچھ افراد کے خراب ہونے سے قوم و جماعت خراب نہیں ہو جاتی۔ چونکہ اس قوم میں اعلیٰ ہستیاں تھیں کہ خود ہی ان کی وجہ سے قوم اشرف ہو گئی۔ نیز نسبت کی عظمت انہی کی وجہ سے کی جاتی رہی۔ بیت اللہ میں بت رہے۔ صفا و مروہ پر بت رہے مگر چونکہ انکی نسبت قوی تھی لہٰذا انکی عظمت میں فرق نہ آیا بتوں سے بھرے ہوئے کعبہ کی طرف حضور انور ﷺ نے

فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

پس نہ خوف کرو ان سے اور ڈرو مجھ سے اگر تم ایمان والے ہو

تو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اگر ایمان رکھتے ہو

تعلقات

ان آیات کا گذشتہ آیتوں سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیات میں غازیان احد کی ایک بہادری کا ذکر تھا جو انہوں نے احد کے ایک دن بعد غزوۂ حمراء الاسد میں دکھائی، اب انہی کی دوسری دلیری کا ذکر ہے جو انہوں نے احد سے ایک سال بعد غزوۂ بدر صغریٰ کے موقعہ پر ظاہر کی، گویا پچھلی آیت بھی انہی بزرگوں کے مناقب کی تھی، اور یہ آیت بھی انہی کے فضائل کی ہے، مگر نوعیت منقبت میں فرق ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں غازیانِ احد کا یہ استقلال بیان ہوا کہ وہ جہاد کے موقعہ پر اپنے زخم و تکلیف کی بھی پرواہ نہیں کرتے، اب ان کا دوسرا استقلال بیان ہو رہا ہے کہ وہ کسی کے ڈرانے دھمکانے پر کان نہیں دھرتے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں محسنوں کے لئے بڑے ثواب کا وعدہ کیا گیا تھا، اب فرمایا جا رہا ہے کہ ان کو ثواب صرف آخرت میں ہی نہ ملے گا بلکہ دنیا میں بھی اللہ کا فضل ان کے شامل حال رہے گا، جس کی مثال کے لئے غزوۂ بدر صغریٰ کا واقعہ سامنے ہے،

شانِ نزول

غزوۂ احد کے ختم ہونے پر جب ابوسفیان مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ لوٹے، تو بولے اے محمد (ﷺ) اگلے سال مقام بدر صغریٰ میں ہمارے اور آپ کے دو دو ہاتھ پھر ہوں گے تیار رہنا، حضور انور ﷺ نے فرمایا، اے عمر جواب دو کہ ہاں انشاء اللہ تعالیٰ، چنانچہ اگلے سال ۴ھ میں ابوسفیان ایک بھاری جماعت لے کر مکہ مکرمہ سے اس میدان کی طرف روانہ ہوئے، مگر جب مر الظہران یا منزل عسفان میں پہنچے، تو قدرتی طور پر ان سب کے دل میں مسلمانوں کی ایسی ہیبت چھائی کہ آگے بڑھنے کی ہمت نہ رہی، اتفاقاً نعیم ابن مسعود اشجعی عمرہ کر کے واپس آتے ملے، ابھی تک نعیم ایمان نہ لائے تھے آپ غزوۂ خندق میں ایمان لائے ہیں، ابوسفیان نے پوچھا، نعیم کہاں جا رہے ہو، بولے اپنے وطن، ابوسفیان نے پوچھا کیا مدینہ بھی جاؤ گے؟ نعیم بولے ہاں مدینہ سے گزروں گا، ابوسفیان نے کہا کہ ہمارا ایک کام کر دو تو ہم تمہیں دس اونٹ بطور انعام دیں گے، نعیم نے کہا وہ کیا؟ ابوسفیان بولے، ہم نے گذشتہ سال محمد (ﷺ) سے بدر صغریٰ میں جنگ کا وعدہ کیا تھا، اور اسی ارادہ سے ہم آج نکلے تھے، مگر اب خیال یہ ہے کہ یہ وقت جنگ کے لئے مناسب نہیں، کیونکہ اس سال قحط ہے، جب بارشیں ہوں گی، اور ہمارے اونٹ خوب چر لیں گے، اور ہم دودھ پی لیں گے تو لڑ بھی لیں گے، لیکن اگر ہم تو لوٹ جائیں اور مسلمان وہاں پہنچ جائیں، تو ہماری عزت خاک میں مل جائے گی، اور مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو جائیں گے، تم مدینہ میں مسلمانوں سے کہہ دو کہ ابوسفیان لشکر جرار لے کر تمہارے مقابلہ کے لئے بدر صغریٰ پہنچ گئے ہیں، تم ہرگز نہ جاؤ، ورنہ زندہ نہ لوٹو گے، غرض جس طرح ہو سکے

بیت المقدس کے سردار ہیں۔ مادر زاد ولیہ حضرت مریم کے والد ہیں۔ اور کلمۃ اللہ عیسیٰ علیہ السلام کے نانا ہیں۔ نسبت کی یہ بہاریں ہیں۔ رب تعالیٰ نسبت قوی رکھے۔ بزرگوں سے بیعت اسی نسبت کے لئے کی جاتی ہے۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ إِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ

جبکہ کہا بیوی نے عمران کی کہ اے رب میرے تحقیق میں نے نذر مانی واسطے تیرے وہ جو بیچ پیٹ میرے کے ہے

کیا ہوا جب عمران کی بیوی نے عرض کی اے میرے رب تیرے لئے منت مانتی ہوں جو میرے پیٹ میں ہے کہ خالص تیری

مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ج إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ

آزاد پس قبول کر مجھ سے تحقیق تو سننے والا جاننے والا ہے پس جبکہ جنا اس کو تو عرض کیا اے رب میرے

ہی خدمت میں رہے تو مجھ سے قبول کر لے بیشک تو ہی ہے سنتا جانتا پھر جب اسے جنا بولی اے رب میرے

إِنِّيْ وَضَعْتُهَا أُنْثٰى ط وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ط وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى ج

تحقیق میں نے جنا اس کو لڑکی اور اللہ بہت جانتا ہے اس کو جو جنا اور نہیں ہے لڑکا مثل اس لڑکی کے اور تحقیق میں نے

یہ تو میں نے لڑکی جنی اور اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ وہ جنی اور وہ لڑکا جو اس نے مانگا اس لڑکی سا نہیں اور میں نے

وَإِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّيْ أُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾

نام رکھا اس کا مریم اور تحقیق میں پناہ میں دیتی ہوں اس کو تیری اور اولاد اس کی کو شیطان راندے ہوئے سے

اس کا نام مریم رکھا اور میں اسے اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں راندے ہوئے شیطان سے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں انبیائے کرام کی برگزیدگی کا اجمالی ذکر تھا اب آل عمران کی بزرگی کی تفصیل فرمائی جارہی ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ رب نے آل عمران کو بھی چن لیا۔ اور آل عمران عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں اور ان کی والدہ ماجدہ اور نانی صاحبہ بھی ان کے چناؤ کی مختلف نوعیتیں تھیں کسی کو نبوت سے چنا اور کسی کو ولایت سے۔ اب ان کی تفصیل فرمائی جارہی ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ رب تعالیٰ نے ان حضرات کو چن لیا۔ جس سے پتہ نہ لگا تھا کہ کیسے چنا اور کب چنا۔ اس آیت میں چننے کی نوعیت کا ذکر ہے کہ یہ حضرات پیدائش سے پہلے ہی چنے ہوئے تھے۔

تفسیر

اِذْ قَالَتِ امْرَاَۃُ عِمْرَانَ۔ اِذْ یا تو زائدہ ہے یا اذکر فعل پوشیدہ کا ظرف یا اِصْطَفٰی کا یا سمیع علیم کا ظرف ہے۔ اس لحاظ سے اس کے معنی بھی چند ہوں گے۔ اگر اذکر کا ظرف ہو تو اذکر کے معنی ہیں یاد کرو یا یاد رکھو یا یاد کراؤ۔ اگر یاد کرو معنی ہوں تو

سے بنا بمعنی اکٹھا کرنا، اکٹھا ہونے کے لئے اجتماع آتا ہے، اسی لئے یہاں مفعول پوشیدہ مانا گیا ہے اَلْجُمُوْعَ یا اَلْعَسَاکِرَ فَاخْشَوْهُمْ، ف تعقیبیہ ہے، خشیت، خوف، رہبت، اتقاء، ان سب کے معنی ہیں ڈرنا مگر ان کے استعمال کے موقعے علیحدہ ہیں، خشیت اکثر اس ڈر کو کہتے ہیں جس کے ساتھ خشوع، خضوع، عجز، ترک مقابلہ پایا جائے، خوف اس سے عام ہے اسی لئے نعیم نے فَاخْشَوْا کہا یعنی کفار سے خوب ڈرو، ان کا مقابلہ نہ کرو، ان کے سامنے پست ہو جاؤ، مگر آگے رب تعالیٰ فرما رہا ہے، فَلَا تَخَافُوْهُمْ ان سے بالکل کسی طرح نہ ڈرو، فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا، زَادَ زیادت سے بنا بمعنی بڑھنا یا بڑھانا، یہاں دوسرے معنی میں ہے اس کا فاعل یا تو پہلا اَلنَّاسُ ہے یا ان کا کلام، هُمْ کا مرجع صحابہ کرام ہیں، زاد کا مفعول، معنی اس کی تمیز ہیں، یا یوں کہو کہ اصل عبارت زَادَ اِيْمَانَهُمْ تھی جسے اس طرح بیان فرمایا گیا اہتمام کے لئے ایمان کی زیادتی سے مراد کیفیت کی زیادتی ہے نہ کہ مقدار کی، کیونکہ ایمان مرکب چیز نہیں تاکہ مقدار میں گھٹے بڑھے، اگرچہ ایمان بڑھانے والا اللہ تعالیٰ ہے، مگر چونکہ نعیم کی یہ خبر صحابہ کرام کے لئے زیادتی ایمان کا باعث بنی، اس لئے اس قول کو فاعل قرار دیا گیا ہے، جیسے نوح علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا تھا فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَاۗءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا (نوح: ۶) یا جیسے رب تعالیٰ فرماتا ہے مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (فاطر: ۴۲) یعنی ابو نعیم کی اس خبر نے صحابہ کرام کا ایمان بڑھا دیا، اس طرح کہ ان کے دل میں کفار کا خطرہ مطلقاً پیدا نہ ہوا، اور رب تعالیٰ پر توکل، حضور انور ﷺ کی خبروں پر اعتماد اور زیادہ بڑھ گیا اور یہ چیزیں واقعی کمال ایمان ہیں، وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ خیال رہے کہ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا میں ان صحابہ کے دل کی حالت کا ذکر تھا، اور وَقَالُوْا الخ میں ان کے زبانی کلام کا بیان ہے، چونکہ حال قال سے افضل ہوتا ہے، نیز دل کا جوش اس کلام سے پہلے تھا، اس لئے اولاً صحابہ کا کمال ایمان بیان کیا گیا، پھر ان کا یہ کلام، حسب کے معنی ہیں کفایت (کافی ہونا) یہاں بمعنی اسم فاعل ہے، مُحْسِبُنَا اضافت مفعول کی طرف ہے واضافت لفظی اسی لئے یہ نکرہ کی صفت بھی آجاتا ہے اگرچہ معرفہ کی طرف مضاف ہو کہا جاتا ہے، رَجُلٌ حَسْبُكَ، واوٗ عاطفہ ہے اور نِعْمَ فعل مدح، اَلْوَكِيْلُ وکلّ سے بنا بمعنی سپرد کرنا، بروزن فعیل، بمعنی مفعول ہے یا بمعنی فاعل کفیل کافی، مختار عام، ذمہ دار سب کو وکیل کہا جاتا ہے (تفسیر کبیر) نِعْمَ الْوَكِيْلُ کو اگر جملہ خبریہ مانو، تب تو بلا تکلف حَسْبُنَا اللّٰهُ پر معطوف ہو جائے گا، اور اگر جملہ انشائیہ مانا جائے تب ان لوگوں کے مذہب پر دشواری ہوگی جو انشاء کا عطف خبر پر جائز نہیں مانتے، مگر چونکہ یہ دونوں جملے قَالُوْا کا مفعول ہیں، اور مفعول مفرد کے حکم میں ہوتا ہے، اس لئے ان کے ہاں بھی عطف جائز ہو گیا یعنی نعیم کی اس خبر سے صحابہ کا ایمان بڑھ گیا اور انہوں نے اطمینان سے بے ساختہ یہ کہا کہ کوئی پروا نہیں، ہمیں لشکر کفار سے کوئی ڈر نہیں، ہمارا رب تعالیٰ ہمیں کافی ہے، اور وہ بہترین کارساز ہے فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ یہاں ایک عبارت پوشیدہ ہے خَرَجُوْا وَ بَلَغُوْا وَاَقَامُوْا فَانْقَلَبُوْا یعنی وہ حضرات روانہ ہو گئے، میدان میں پہنچ گئے، وہاں ٹھہرے، پھر لوٹے، مگر خالی نہیں، بلکہ اللہ کی نعمت اور فضل لے کر، نعمت اور فضل کے معنی بارہا بیان ہو چکے، یہاں نعمت سے مراد عافیت ہے اور فضل سے مراد تجارتی نفع، یا نعمت سے مراد دنیوی نفعے ہیں اور فضل سے مراد اخروی اجر و ثواب، چونکہ انہیں یہ سب کچھ رب تعالیٰ کی طرف سے بطور عطیہ ملا تھا، اس لئے مِّنَ اللّٰهِ ارشاد ہوا یعنی یہ لوگ دین و دنیا کی نعمتوں سے اپنے دامن بھر کر لوٹے، رب

خدمت کے لئے محرر نہ ہوں (تفسیر کبیر) فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ۔ یہ بظاہر دعاء قبول ہے اور در پردہ دعاء فرزند کیونکہ لڑکیاں بیت المقدس میں نہ رکھی جاتی تھیں کہ وہ حیض و نفاس کی وجہ سے فرائض خدمت انجام نہ دے سکتی تھیں۔ اس لئے عرض کیا کہ تو مجھے فرزند دے تاکہ میری نذر پوری ہو اور تو قبول فرمائے۔ بعض نے فرمایا کہ تَقَبَّلْ کے معنی راضی ہو کر قبول کرنا ہیں۔ یہ مقابلہ کا ہم معنی ہے کیونکہ اس کے عوض جزا ملتی ہے۔ بعض کے نزدیک تَقَبَّلْ کے معنی بہ تکلف قبول کرنا ہیں کہ وہ چیز قابل قبول نہ ہو مگر کرم سے قبول کر لی جائے۔ یعنی اے مولیٰ یہ حقیر نذرا گرچہ قابل قبول نہیں مگر تو کرم سے قبول فرمالے۔ عمل سے پہلے اس کی قبولیت کی دعا کر سکتے ہیں۔ نیک فال کے لئے متشابہ ہے کہ عمل کی بھی توفیق دے اور قبول بھی کرے اس واقعہ کے بیان میں ہم لوگوں کو تعلیم ہے کہ اپنے بچوں کا انتظام ان کی پیدائش سے پہلے ہی کرو۔ صالح لڑکی سے نکاح کرو' ماں باپ زمانہ حمل میں اللہ کی یاد' عبادات دعائیں زیادہ کریں۔ بوقت ولادت اللہ کا ذکر کریں۔ پرورش دینی ماحول میں ہو۔ جس چیز کی ابتدا اچھی ہو اس کی انتہا بھی اچھی ہوتی ہے۔ بچہ کی دکان زندگی ناچ گانے میراثیوں کی بکواس پر نہ کھولو۔ اللہ کے ذکر پر کھولو۔ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ تو ہی میری دعا کا سننے والا اور میری نیت کا جاننے والا ہے۔ لہٰذا میری یہ دعا اور عاجزی قبول فرما اور فرزند عطا فرما۔ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا۔ وضع کے معنی ہیں رکھنا یہاں مراد ہے جنا کیونکہ جن کر بچہ زمین پر رکھا جاتا ہے۔ اس کا فاعل عمران کی بیوی ہیں۔ ھَا کا مرجع مَا ہے۔ چونکہ رب کے علم میں وہ لڑکی تھی۔ اس لئے ضمیر مؤنث ارشاد ہوئی۔ یا ہر شخص میں نفس و روح ہے جو مؤنث ہے۔ یعنی پس جب انہوں نے اس لڑکی کو یا اس نفس کو جنا تو قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی۔ یہاں بھی وَضَعْتُهَا میں ہا کا مؤنث ہونا نفس اور روح کے لحاظ سے ہے۔ اور انثیٰ ہا کا بدل ہے۔ یا حال اس سے مقصود رب کو خبر دینا نہیں بلکہ فقط اظہار غم ہے کہ نذر کا پورا ہونا بظاہر ناممکن ہو گیا۔ آپ کا یہ غم بے صبری یا ناشکری کا نہ تھا۔ بلکہ ایک نعمت یا ایک عبادت سے محرومی کا تھا کہ بیٹا ہوتا تو خدمت بیت المقدس کرتا مجھے دائمی ثواب پہنچتا۔ لڑکی نہ یہ کام کر سکے گی نہ مجھے اجر ملے گا۔ بے صبری کا غم برا ہے محرومی کا غم و حسرت عبادت۔ ایک فقیر اپنے مالدار نہ ہونے پر اس لئے غم کرتا ہے کہ اگر میں مالدار ہوتا تو دوسروں کی طرح میں سینما دیکھتا' شراب پیتا تو یہ مجرم ہے۔ اگر اس لئے غم کرتا ہے کہ میں مالدار ہوتا تو کوٹھیاں' موٹر تیار کرتا نہ مجرم ہے نہ ثواب کا مستحق۔ اگر اس لئے غم کرتا ہے کہ میرے پاس پیسہ ہوتا تو میں بھی زکوٰۃ دیتا' حج کرتا' وغیرہ یہ غم عبادت ہے۔ اور یہ فقیر ان عبادات کا ثواب پائے گا۔ آپ کا یہ غم اس تیسری قسم کا تھا۔ یعنی عرض کیا کہ مولیٰ یہ کیا ہوا میں نے تو لڑکی جنی۔ اب اپنی نذر کیسے پوری کروں۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ۔ ہماری قرأت وضعت ت کے سکون سے ہے اور یہ رب کا فرمان ہے حضور سے خطاب اور اس سے مقصود اس لڑکی کی تعظیم ہے۔ یعنی اے محبوب حنہ کو کیا خبر تھی کہ یہ صاحبزادی کس درجے کی ہے۔ یہ تو رب ہی جانتا ہے کہ کیسی بیٹی ہے۔ بعض قرأتوں میں وضعتُ ت کے پیش سے ہے۔ حنہ کا کلام گویا حنہ نے کہا کہ رب میری مجبوری اور معذوری کو خوب جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میرے لڑکی پیدا ہوئی میں نذر کیسے پوری کروں۔ ایک قرأت میں وضعتِ ت کے کسرہ سے ہے۔ رب کا کلام جو حنہ سے ارشاد ہوا یعنی رب نے فرمایا کہ اے حنہ مت گھبراؤ تمہاری مجبوری کو رب جانتا ہے۔ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی۔ یہ بھی تو رب کا کلام ہے۔ جملہ معترضہ اور اَلذَّكَرُ اور الْاُنْثٰی میں الف لام عہدی ہے۔ ذکر سے ان کا مانگا ہوا لڑکا مراد ہے۔ اور انثی سے یہی ہوئی بچی یعنی ان کا مانگا ہوا بیٹا درجے اور مرتبے میں اس

بارادۂ جہاد ہرگز نہ جاؤ، کیونکہ انہوں نے تمہارے مقابلہ کے لئے بہت ساز و سامان والے بے شمار لشکر جمع کر رکھے ہیں، تمہارا وہاں جانا گویا موت کے منہ میں جانا ہے، ان سے ڈرو اور خوف کرو، مفت کیوں جانیں گنواتے ہو، تو اس کلام کو سن کر ان مقبولوں کے دلوں میں بجائے خوف و ڈر پیدا ہونے کے اور زیادہ کمالِ ایمان پیدا ہو گیا، ان کا ایمان و توکل بڑھ گیا، بے ساختہ بول اٹھے کہ کوئی مضائقہ نہیں، ہمیں کفار کی یلغار سے کوئی ڈر نہیں، ان کے مقابلہ میں ہمیں اللہ کافی وافی ہے، ہمارا تو وہی کارساز ہے، جس کا کارساز ایسا شاندار ہو اسے کیا پرواہ، چنانچہ وہ حضرات بے دھڑک روانہ ہو گئے، وہاں پہنچے تو میدان خالی پایا، مزے سے وہاں رہے، بدر صغریٰ کے پاس ہی میلہ میں تجارتیں کیں، خوب کمائی کی اور لوٹے تو اس طرح، کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت یعنی تجارتی نفع اور اللہ تعالیٰ کے فضل یعنی اخروی ثواب سے ان کے دامن بھرے ہوئے تھے، انہیں اس سارے سفر میں تکلیف پہنچنا تو کیا معنی، کسی معمولی خراش نے چھوا بھی نہیں، اور مزید مہربانی یہ ہوئی، کہ یہ حضرات اس سفر کے سارے حالات میں رضائے الٰہی کے تابع رہے، کہ ان کے ہر حال، ہر جنبش سے رب تعالیٰ راضی ہوا، اللہ تعالیٰ بڑے ہی فضل و کرم والا ہے، اے جماعتِ صحابہ کی مقبول جماعت! یہ شیطان ہے جو تمہیں اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے یا مدینہ منورہ میں جو شیطان کے دوست یعنی منافقین ہیں انہیں ڈراتا ہے، تم ان سے کیوں ڈرو، خیال رکھنا کہ ان شیاطین اور ان کے دوستوں سے کبھی نہ ڈرنا، ہمیشہ مجھ سے ہی ڈرنا، اگر تم سچے مسلمان ہو تو اس نصیحت پر کاربند رہنا ایمان کا تقاضا ہے کہ مومن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو، غیروں کا خوف نہ ہو، **نوٹ:** بخاری نے بَابُ الْاَسْمَاءِ وَالصِّفَاتِ میں حضرت عبداللہ ابن عباس اور عبدالرزاق وغیرہ نے حضرت عبداللہ ابن عمر سے روایت کی کہ جب ابراہیم علیہ السلام نمرود کی آگ میں گئے، تو آپ پڑھ رہے تھے حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ابن مردویہ نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی، کہ فرمایا نبی کریم ﷺ نے جب تم کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو تو پڑھا کرو حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ابن ابی الدنیا نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ کو جب بہت غم ہوتا، تو اپنے سر مبارک اور داڑھی شریف پر ہاتھ پھیرتے اور لمبی سانس لے کر فرماتے حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ، ابو نعیم نے شداد ابن اوس سے روایت کی، کہ فرمایا نبی کریم ﷺ نے ہر خوف زدہ کی امان ہے حَسْبِيَ اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ (تفسیر روح المعانی)

عمل: صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جو کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو، وہ چار سو پچاس بار پڑھے حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ اللہ تعالیٰ اسے نجات دے گا (تفسیر صاوی) بعض لوگ روزانہ اتنی بار پڑھتے ہیں، مگر حق یہ ہے کہ ایک بار پڑھنا بھی انشاء اللہ کافی ہوگا،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** مصیبت کے موقعہ پر ذکر اللہ کرنا اس مصیبت کے دفعیہ کا ذریعہ ہے، ذکر سے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت کرے، مصیبت خود دفع ہو جائے گی، دانہ کے لئے کھیت کرو انشاء اللہ تعالیٰ بھوسا بھی مل جائے گا، یہ ذکر سنتِ انبیاء اور سنتِ صحابہ ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا، **دوسرا فائدہ:** مصیبت

بھی حضرت حنہ جیسی بہت پر تاثیر ہوتی ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی ﷺ وہ وقت بھی یاد کرو اور انہیں سناؤ جبکہ عمران کی بیوی حنہ نے حاملہ ہو کر بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ اے مولیٰ چونکہ تو نے مجھے ناامیدی کے بعد اولاد کی امید دکھائی اس لئے نذر مانتی ہوں کہ جو کچھ میرے پیٹ میں اولاد ہے وہ بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف ہے نہ میں اس سے اپنی خدمت لوں نہ گھر کے کام کاج۔ اے مولیٰ یہ میرا حقیر ہدیہ اپنے فضل و کرم سے قبول فرمالے۔ تو میرے کلام کا سننے والا اور میری نیت و اخلاص کا جاننے والا ہے۔ وہ لڑکے کی امید پر بہت خوش و خرم تھیں۔ جب وقت ولادت آیا اور حضرت مریم پیدا ہوئیں تو حیران رہ گئیں اور عرض کرنے لگیں کہ اے مولیٰ یہ کیا ہوا۔ میرے تو لڑکی پیدا ہوگئی۔ اب میں اپنی نذر کیسے پوری کروں۔ اے محبوب حنہ کیا جانیں کہ لڑکی کیسی ہے یہ تو رب ہی جانتا ہے کہ وہ لڑکی کس درجہ کی ہے۔ لڑکا اس لڑکی کی طرح ہو سکتا ہی نہیں۔ انہوں نے یہ بھی عرض کیا کہ اے مولیٰ چونکہ ان کے باپ تو پہلے ہی وفات پا گئے ہیں اس لئے میں ہی ان کا نام مریم رکھتی ہوں بمعنی عابدہ اور میری نیت یہ ہے کہ یہ بیت المقدس میں رہ کر تیری عبادت کرے تا کہ بقدر طاقت میری منت پوری ہو۔ اے مولیٰ چونکہ میں انہیں اپنے سے الگ بیت المقدس میں رکھوں گی اس لئے میں اس کو اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں کہ تو شیطان سے بچا اور اسے صالح پرہیز گار بنا۔

خیال رہے کہ بیٹے کی دعا و خواہش کرنا سنت انبیاء بھی ہے، سنت اولیاء بھی۔ حضرت ابراہیم و زکریا علیہما السلام نے فرزند کی دعا کی۔ بی بی حنہ نے جو لیہ تھیں بیٹے کی دعا کی مگر یہ تمام دعائیں دنیاوی اغراض کے لئے نہ تھیں، صرف دین کے لئے تھیں کہ خدا ہمیں بیٹا دے وہ دین کی خدمتیں کرے ہم کو ثواب ملے، جیسے دوسرے کاموں میں اخلاص ہو تو برکت ہوتی ہے۔ ریا ہو تو بے برکتی۔ ایسے ہی طلب اولاد اگر دین کے لئے ہو تو اولاد برکت والی ہے اگر دنیا کے لئے ہے تو نہ عذاب نہ ثواب اگر بری نیت کے لئے ہو تو نقصان دہ۔ حضرت مریم کی یہ عظمتیں بی بی حنہ کے اخلاص کی برکت سے تھیں۔ ماں باپ کا اخلاص اولاد کے کام آتا ہے۔

اصل واقعہ

فاقوذا کی دو بیٹیاں تھیں۔ حنہ اور ایشاع۔ حنہ عمران کے نکاح میں آئیں اور ایشاع حضرت زکریا بن اذن علیہ السلام کے نکاح میں۔ یہ دونوں بہنیں لاولد تھیں۔ یہاں تک کہ انہیں بڑھاپا آ گیا۔ اور اولاد سے مایوسی ہوگئی۔ ایک دن حضرت حنہ نے ایک چڑیا کو دیکھا کہ وہ اپنے بچے کو دانہ کھلا رہی ہے آپ کے دل میں اولاد کا شوق پیدا ہوا اور دعا کی کہ مولیٰ یہ چڑیا بچے سے اپنا دل بہلا رہی ہے۔ مجھے بھی ایک فرزند دے۔ جو میرے دل بہلانے کا ذریعہ ہو۔ یا تو اسی وقت وقف کی منت مان لی یا حمل کے بعد غرض کہ یہ دعا مانگنا تھی کہ انہیں حیض جاری ہوا۔ حیض سے فارغ ہوتے ہی حاملہ ہوگئیں۔ اور عمران سے کہنے لگیں کہ میں نے یہ منت مانی ہے۔ عمران نے کہا تم نے یہ کیا کیا۔ اگر لڑکی پیدا ہوئی تو کیا کرو گی۔ تب بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ اے مولیٰ میں منت مان چکی ہوں کہ جو کچھ میرے شکم میں ہے وہ بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف ہے۔ اس سے نہ خدمت لوں گی نہ گھر کا کام کاج۔ اس زمانہ میں اس وقف کا رواج تھا کہ لوگ اپنی اولاد کو بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف کر دیتے

رب تعالیٰ فرماتا ہے فِي السَّمَآءِ إِلٰهٌ وَّفِي الْأَرْضِ إِلٰهٌ (زخرف: ۸۴) دیکھو دونوں جگہ اِلٰہ نکرہ ہے، مگر زمین و آسمان کا معبود ایک ہی ہے، لہٰذا آیت بھی درست ہے، قاعدہ اکثریہ بھی درست، **دوسرا اعتراض:** علم کلام کا مسئلہ ہے کہ ایمان میں زیادتی کمی نہیں، وہ تو ایک بسیط چیز ہے، مگر قرآنی آیت یہاں فرما رہی ہے کہ ایمان زیادہ ہوتا ہے تو لامحالہ کم بھی ہونا چاہیے کہ زیادتی بغیر کمی کے ناممکن ہے، وہ قاعدہ اس آیت کے خلاف ہے؟ **جواب:** علم کلام میں مقدار کی زیادتی کمی کی نفی ہے یہاں اسی آیت میں کیفیت کی زیادتی و کمی کا ذکر ہے، یہ مطلب نہیں کہ حضرات صحابہ اس سے پہلے آدھے یا پونے مومن تھے آج پورے مومن ہوئے، یا اب تک پورے مومن تھے، آج سوائے، ڈیوڑھے مومن بنے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اب تک کامل مومن تھے آج کامل تر یعنی اکمل مومن بنے، لہٰذا آیت بھی درست ہے اور علم کلام کا مسئلہ بھی صحیح، **تیسرا اعتراض:** یہاں رب تعالیٰ نے قتال و جنگ کو سُوْٓءٌ کیوں فرمایا سُوْٓءٌ تو بری چیز کو کہتے ہیں، اور جہاد اچھی چیز ہے جس سے لوگ غازی یا شہید بنتے ہیں، **جواب:** سُوْٓءٌ سے مراد یہاں تکلیف دہ چیز ہے، اور ظاہر ہے کہ جنگ و قتال میں تکلیف تو ہوتی ہے، یہ تکلیف ہی باعثِ ثواب ہے، سُوْٓءٌ سے مراد شر یعنی خیر کا مقابل نہیں، **چوتھا اعتراض:** رب تعالیٰ نے نعیم یا کفار قریش کو شیطان کیوں فرمایا؟ بعد میں نعیم بھی ایمان لے آئے، اور ان کفار قریش میں سے بہت سے لوگ بھی، رب تعالیٰ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ہے اسے خبر تھی کہ یہ بہت سے آخر کار مومن بننے والے ہیں، **جواب:** یہاں شیطان سے شیطانی کام کرنے والے ہیں نہ کہ آئندہ شیطان رہنے والے بھی، واقعی اس وقت نعیم اور یہ سرداران کفر شیطانی کام کر رہے تھے، جھوٹ، فریب، دھوکا دہی، مسلمانوں کو جہاد سے روکنے کی کوشش وغیرہ، اس وقت کے لحاظ سے انہیں شیطان کہا گیا، جب وہ مسلمان ہو گئے، تو ان کے خطاب بھی بدل گئے، کام بدلے، نام بدلا، وہ تو اس وقت کافر تھے، اب اگر کوئی مسلمان بھی برا کام کرنے لگے، تو اسے شیطان کہہ دیتے ہیں کہ فلاں آدمی بڑا شیطان ہے، پھر جب توبہ کر کے اپنے حال کو درست کر لے، تو اسی کو اچھے خطابات سے یاد کرتے ہیں، رب تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (طٰہٰ: ۱۲۱) حضرت یونس علیہ السلام نے اپنے متعلق فرمایا اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (انبیاء: ۸۷) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لئے فرمایا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ (شعراء: ۲۰) اس ظالم و ضال کے جو معنی بھی کئے جائیں اس خاص وقت کے لحاظ سے ہیں، بعد میں جو انہیں ایسا کہے، وہ بے ادب و گستاخ ہے، اب نعیم یا ایمان نہ لے آنے والے سرداران قریش کو جو ان الفاظ سے یاد کرے، وہ بے دین ہے، **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار و منافقین شیطان کے دوست ہیں رب تعالیٰ نے فرمایا يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ شیطان مسلمانوں کو اپنے دوستوں یعنی کفار قریش سے ڈراتا ہے یا اپنے دوستوں منافقوں کو ڈراتا ہے، مگر دوسری جگہ رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (یوسف: ۵) شیطان ہر انسان کا کھلا دشمن ہے، انسان خواہ مومن ہو، یا کافر شیطان اس کا دشمن ہے، ان دونوں آیتوں میں تعارض ہے، **جواب:** یہاں اگر شیطان سے مراد ابلیس ہو تو یہاں ظاہری دوستی کا ذکر ہے اور تمہاری پیش کردہ آیت میں حقیقی دشمنی کا تذکرہ، یعنی شیطان بظاہر کفار کا بہت دوست ہے، مگر درحقیقت ان کا بھی سخت دشمن ہے، دونوں آیتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں، دیکھو رب تعالیٰ فرماتا

آیت کے مضمون سے معلوم ہوا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قبر انور کی منتظمہ تھیں اور اس وقت سے اب تک روضۂ رسول اللہ ﷺ پر خدام رہتے ہیں۔ جس حدیث میں قبر پر بیٹھنے کی ممانعت آئی۔ اس سے قبر پر چڑھ کر بیٹھنا مراد ہے نہ کہ وہاں کا مجاور بننا۔ **نواں فائدہ:** بزرگانِ دین کے قصے سننا' پڑھنا' یاد کرنا باعث برکت ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے حنہ کا پورا قصہ قرآن شریف میں بیان فرمایا کہ لوگ اس سے عبرت پکڑیں۔ **دسواں فائدہ:** مرد عورت سے افضل ہے مگر بعض عورتیں مردوں سے بڑھ کر جیسا کہ لَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى۔ سے معلوم ہوا۔ **گیارھواں فائدہ:** اولاد کے نام اچھے رکھنے چاہئیں کہ اکثر نام کا اثر کام پر پڑتا ہے' جیسا کہ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ سے معلوم ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ لڑکی لڑکے سے افضل ہے۔ دوسری جگہ فرمایا گیا اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء: ۳۴) اور ایک مقام پر فرمایا گیا وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ: ۲۲۸) ان میں مطابقت کیونکر ہو؟

جواب: نوعِ مرد نوعِ عورت سے افضل ہے لیکن بعض عورتیں بعض مردوں سے افضل ہیں یعنی مردیت عوریت سے بڑھ کر نبوت سلطنت قضاء امامت مردوں کے لئے خاص ہیں۔ اگرچہ عورتوں کے بعض افراد مردوں سے بڑھ جائیں۔ اس آیت میں افراد کا ذکر ہے ان آیتوں میں نوعیت کا۔

حکایت: ایک جگہ روح البیان نے فرمایا کہ کسی نے حضرت رابعہ بصریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامنے مردوں کی بڑائی بیان کی۔ آپ نے فرمایا کہ عورتوں کو برا نہ جانو۔ عورتیں انبیاء و اولیاء کی کان ہیں۔ بعض نبی بغیر باپ پیدا ہو گئے مگر کوئی پیغمبر بغیر ماں صرف باپ سے پیدا نہیں ہوا۔ اعلیٰ چیز کا سانچہ بھی اعلیٰ ہوتا ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت حنہ کو لڑکی پیدا ہونے کا رنج ہوا اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی پر رنج کرنا طریقہ کفار ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (نحل: ۵۸)۔ پھر حضرت حنہ سے یہ فعل کیوں واقع ہوا؟ **جواب:** لڑکی سے نفرت اور صرف لڑکے سے محبت کرنا واقعی برا ہے۔ یہاں یہ نہ ہوا انہیں رنج اس کا تھا کہ اب میری نذر کیسی پوری ہوگی۔ نیز چونکہ بیٹے کی امید تھی اور خلاف امید لڑکی ہوئی۔ اس پر قدرے ملال ہوا۔ نیز لڑکوں سے غیر اختیاری محبت سب کو ہوتی ہے مگر لڑکی سے نفرت یا لڑکے کو اس پر ترجیح دینا یا اس کی پیدائش پر ناشکری کے الفاظ بولنا برا ہے۔

تیسرا اعتراض: کیا اسلام میں اولاد کا ایسا وقف صحیح ہے؟ **جواب:** ہاں صحیح ہے مگر کچھ فرق کے ساتھ۔ وقف شرعی مملوک مال کا ہی جائز ہے۔ اولاد کا وقف لغوی درست ہے۔ یعنی دین کے لئے روک دینا۔ **چوتھا اعتراض:** تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ یحییٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام کے ماموں تھے کیونکہ وہ حضرت مریم کے خالہ زاد بھائی تھے مگر حدیث معراج میں ہے کہ یحییٰ و عیسیٰ سے ملاقات کی جو آپس میں خالہ زاد بھائی ہیں۔ ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** حدیث میں مجازاً اس طرح فرمایا گیا یعنی حضرت عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام میں خالہ کا رشتہ ہے۔ بعض نے کہا کہ حضرت ایشاع حنہ کی اخیافی بہن ہیں۔ اور حضرت مریم کی علاتی بہن کہ عمران نے پہلے حنہ کی ماں سے نکاح کیا۔ جس سے ایشاع پیدا ہوئیں۔ پھر حنہ سے اس دین میں ربیبہ سے نکاح ... لہٰذا یحییٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام کے ماموں بھی ہوئے اور خالہ زاد بھائی بھی مگر

ساتھ کیا گزری، فرمایا کہ مجھ سے جب انہوں نے پوچھامَنْ رَبُّکَ تیرا رب کون ہے، میں نے کہارب سے پوچھو، اگر وہ مجھے اپنا بندہ کہے، تو مجھے کافی وافی ہے، ورنہ میں ہزار بار اسے اپنا رب کہے جاؤں بے کار ہے، صوفیائے کرام فرماتے ہیں، کہ اپنی ذات، اپنی عبادات، بلکہ تمام ماسوئی کو کچھ سمجھنا یہ بھی کفر کا زنار ہے،

حکایت: حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے آخر وقت میں محراب مسجد میں داخل ہوئے، بولے مولیٰ! نہ میرے پاس نمازیں ہیں، نہ روزے نہ کوئی اور نیکی، صرف یہ عرض کرتا ہوں، کہ میں نے اپنی عمر برباد کردی، گناہوں میں صرف کردی، خدایا میں یہ تمام زناریں توڑ کر دروازہ پر حاضر ہوں، حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے اپنے شیخ کا ایک واقعہ یوں نقل فرمایا، شعر

شبے دانم از ہولِ دوزخ نہ خفت بگوش آدم صبح گاہے کہ گفت

چہ بودے کے دوزخ زمن پر شدے مگر دیگراں را رہائی بدے

یعنی مجھے خوب یاد ہے کہ میرے شیخ ایک رات دوزخ کے خوف سے بالکل نہ سوئے، صبح کے وقت میں نے انہیں کہتے سنا کہ کاش میرا جسم اتنا بڑا ہو جاتا کہ ساری دوزخ مجھ سے ہی بھر جاتی، تاکہ دوسروں کو وہاں سے رہائی مل جاتی، مومن کو چاہیے، کہ اپنے اور اپنے نیک اعمال کو معدوم سمجھے، اپنے گناہوں کو پہاڑ تصور کرے، حق کے معاملہ میں کسی سے خوف نہ کرے، کسی عارف نے کیا خوب فرمایا، شعر

میں تھا بھی کہاں، اور ہوں بھی کہاں، ہستی ہے مری اک وہم و گماں

جب آئے یقیں، مٹ جائے گماں، بس تو ہی رہے اور میں نہ رہوں

صحابہ کرام کا یہ واقعہ جو رب تعالیٰ نے یہاں نقل فرمایا، ان کے انتہائی توکل، فنا، رضاء بالقضاء، دنیا سے بے خوفی رب پر انتہائی بھروسہ حضور ﷺ کے وعدوں پر انتہائی اعتماد، اپنے کو موت کے لئے پیش کرنا وغیرہ صفات حمیدہ بتا رہا ہے، جو قوم رب تعالیٰ اور اس کے رسول اکرم ﷺ پر اس طرح جان فداء کردے اسے رب تعالیٰ کیوں نہ اپنے کرم سے نوازے، خدائے تعالیٰ ان اچھوں کے صدقے ہم بروں پر بھی رحم فرمادے، آمین (از روح البیان)

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ
اور نہ غمگین کریں آپ کو وہ لوگ جو جلدی کرتے ہیں کفر میں
اور اے محبوب ان کا کچھ غم نہ کرو جو کفر پر دوڑتے ہیں
اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ
بیشک وہ ہرگز نہ نقصان دیں گے اللہ کو کچھ بھی ارادہ کرتا ہے اللہ یہ کہ نہ بنائے
وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑیں گے اور اللہ چاہتا ہے کہ آخرت

لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

ہے واسطے تمہارے یہ وہ بولیں وہ پاس سے اللہ کے ہے تحقیق اللہ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے حساب
پاس کہاں سے آیا بولیں وہ اللہ کے پاس سے ہے بیشک اللہ جسے چاہے بے گنتی دے

تعلق

اس آیت کریمہ کا تعلق پچھلی آیتوں سے چند طرح ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں حضرت حنہ کی دعا کا ذکر تھا۔ اب اس کی قبولیت کا تذکرہ ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں حضرت حنہ کی بزرگی ان کے اخلاص اور ان کی نذر کا تذکرہ تھا۔ اب ان کی صاحبزادی حضرت مریم کی عظمت' شان اور مقبولیت بارگاہ اور منظوریٔ نذر کا تذکرہ ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت پاک کی تمہید تھی۔ اب ولادت یحییٰ کی تمہید ہے علیہ السلام۔

تفسیر

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ یہاں باب تفعل زیادتی اور مبالغہ کے لئے ہے ھا کا مرجع حضرت مریم ہیں۔ اور دوسرے ھا کا مرجع یا مریم ہیں یا حنہ چونکہ قبول اور تقبل ہم معنی ہیں۔ اس لئے بجائے فتقبل کے بِقَبُوْلٍ فرمایا گیا۔ نیز چونکہ تَقَبَّلَ میں تکلفا قبول کرنے کا احتمال تھا۔ اس کو دفع کرنے کے لئے بِقَبُوْلٍ فرمایا گیا۔ سیبویہ نے کہا کہ پانچ مصدر بروزن فعول آتے ہیں۔ قبول' طہور' وضو اور قعود اور ولوع قبول حسن میں چند احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ باوجودیکہ لڑکی خدمت بیت المقدس کے قابل نہیں۔ مگر حضرت حنہ کے اخلاص کی بناء پر مریم کو قبول فرمالیا۔ دوسرے یہ کہ حضرت مریم اور ان کے فرزند عیسیٰ علیہ السلام کو پاکدامن اور شیطان سے محفوظ رکھا۔ تیسرے یہ کہ انہیں گندے اخلاق اور بری باتوں سے بچایا۔ چوتھے یہ کہ حضرت مریم نے کسی کا دودھ نہ پیا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرح بچپن میں کلام کیا (تفسیر کبیر و معانی وغیرہ) یعنی رب تعالیٰ نے حضرت مریم کو راضی ہو کر اچھی طرح قبول فرمالیا اور حنہ کی ساری دعائیں منظور کیں۔ کہ مریم کو اول ولادت سے خاتمہ زندگی تک شیطان سے محفوظ رکھا۔ یہاں رب تعالیٰ نے فَتَقَبَّلَ فرما کر بتایا کہ ہم نے حنہ کی ساری دعائیں من وعن اسی طرح قبول فرمائیں۔ جس طرح انہوں نے دعائیں مانگیں۔ کوئی دعا رد نہ فرمائی۔ ھا فرما کر بتایا کہ ان کی دعا کی وجہ سے اپنا قانون بدل دیا۔ کہ بیت المقدس کی خدمتگاروں میں لڑکی کا ہونا۔ اس زمانہ کے قانون کے خلاف تھا۔ جیسا کہ آج اسلام میں عورت کا امام نماز بننا۔ بزرگوں کی دعا سے قانون بدل دیئے جاتے ہیں۔ قبول حسن فرما کر بتایا کہ ان بی بی حنہ کی دعا سے زیادہ مریم کو نعمتیں دی گئیں۔ انہوں نے صرف یہ دعا مانگی تھی کہ مریم شیطان کے شر سے محفوظ رہیں۔ ہم نے بھی یہ قبول فرمائی اور کئی دن مریم کو جنتی ہونے' میوے دینا نبی کی پرورش میں رہنا زیادہ اچھی طرح پروان چڑھانا بھی بخشا۔ جوان کی دعا کے سواء ہے پھر عیسیٰ روح اللہ کی ماں بننا اور آپ کے ہاتھ سے کرامات کا ظاہر ہونا۔ قرآن شریف میں آپ کا ذکر ہونا' تا قیامت آپ کا ذکر خیر دنیا میں رہنا یہ سب چیزیں ان کی دعا کے سوا ہیں۔ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا اَنْبَتَ نَبَات سے بنا۔ لغت میں نبات پھیلنے والی گھاس کو کہتے ہیں۔ جس کا تنا نہ ہو۔ پھر استعمال میں ہر بڑھنے والی شے پر بولنے لگے۔ سبزی ہو یا درخت حیوان ہو یا انسان' انبات

میں بالکل واضح ہیں، امام قفال فرماتے ہیں کہ یہ سارے ہی واقعات آیت کا شانِ نزول بن سکتے ہیں، ان میں کوئی تعارض نہیں (تفسیر کبیر روح المعانی خازن وغیرہ)

تفسیر

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ، ہماری قرأت میں لَا يَحْزُنْكَ ی کے زبر، ز کے پیش اور نون کے جزم سے ہے باب نصر کا نفی مضارع، مگر نافع کی قرأت میں سارے قرآن شریف میں يُحْزِنُ ی کے پیش اور ز کے کسرہ سے ہے سوا اس آیت کریمہ کے لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (الانبیاء: ۱۰۳) خلاصہ یہ ہے کہ اس ایک آیت میں تو یہ باب نصر سے ہے، باقی میں باب افعال سے ہماری قرأت میں نون کے جزم سے ہے بعض قرأتوں میں نون کے پیش سے ہے، حزن کے معنی ہیں غمگین ہونا بھی اور غمگین کرنا بھی، پہلے معنی میں لازم ہے دوسرے میں متعدی، یہاں دوسرے معنی میں ہے، نیز یہ باب سمع یسمع سے بھی آتا ہے اور نصر ینصر سے بھی، یہاں نصر سے ہے اور سورۂ یونس میں سمع سے، کہ ارشاد ہوا لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس: ۶۲) جیسے مِتُّ بھی قرآن شریف میں آیا ہے م کے کسرہ سے، اور مُتُّ بھی م کے پیش سے، نصر سے بھی ہے اور ضرب سے بھی ک میں خطاب نبی کریم ﷺ سے ہے، کیونکہ حضور انور ﷺ کو ان کی ان حرکات سے سخت رنج و غم ہوتا تھا، الَّذِيْنَ سے مراد منافقین یا مرتدین یا یہود یا کفار مکہ ہیں، جیسا کہ شانِ نزول میں عرض کیا، يُسَارِعُوْنَ مسارعت سے بنا جس کا مادہ سرعت ہے بمعنی جلدی، یہاں مفاعلت مقابلہ کے لئے نہیں بلکہ مبالغہ کے لئے ہے، جلدی کرنے کو بھی سرعت کہا جاتا ہے اور جلدی فارغ ہونے کو بھی، جیسے اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (ابراہیم: ۵۱) اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے یعنی عنقریب حساب لے گا یا منٹوں میں حساب لے گا، کفر کے معانی ابھی شانِ نزول میں عرض کئے گئے، یعنی اے محبوب وہ لوگ آپ کو غمگین نہ کریں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں کہ ذرا سی بات پر اسلام چھوڑ دیتے ہیں یا آپ کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں، اگرچہ یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ آپ غم نہ کریں، مگر یہ طریقہ بیان بہت پیارا اور دل کش ہے، کہ لوگ آپ کو غمگین کرنا چاہتے ہیں مگر ہم آپ کا غم غلط فرماتے ہیں کہ آپ ہمارے محبوب ہوئے، کیونکہ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا، یہ جملہ پہلے جملہ کی علت اور وجہ ہے، اللہ کو نقصان نہ دینے سے مراد رسول اللہ ﷺ یا صحابہ کرام یا سارے مومنوں کو نقصان نہ دے سکنا ہے، تفسیر کبیر، روح المعانی، خازن، بیضاوی، جلالین وغیرہ تمام مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر فرمایا اور اپنے محبوب یا مومنین مراد لئے کہ ان حضرات کو نقصان پہنچانا در پردہ رب تعالیٰ کو نقصان پہنچانا ہے کہ انہیں وہ ہی سزا ملے گی جو اگر کوئی اللہ کو نقصان پہنچاتا تو اسے ملتی، قرآن کریم میں بہت جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر فرمایا اور اپنے محبوب کا ارادہ کیا، ان میں سے یہ مقام بھی ہے، شَيْئًا نکرہ فرما کر تمام قسم کے نقصانات کی نفی فرما دی یعنی یہ لوگ اپنی ان حرکتوں سے آپ کو، اسلام کو، آپ کے خدام کو بھی کچھ بھی نقصان نہ دے سکیں گے، وہ رب کو یا آپ کو یا آپ کی چیزوں کو تو کیا نقصان دیتے، حقیقت یہ ہے کہ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ یہ جملہ نیا ہے، جس میں ان کے کفر کی اصل وجہ بیان فرمائی گئی، يَجْعَلَ جعل سے بنا بمعنی پیدا کرنا اور بنانا، پہلی صورت میں ایک مفعول چاہتا ہے دوسری صورت میں دو مفعول، یہاں دوسرے معنی میں

خیال رہے کہ مفعال ظرف زمان کے لئے بھی آتا ہے۔ اور ظرف مکان کے لئے بھی جیسے میلاد اور معراج یہاں مراد بالا خانہ ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ۔ عمر ابن ربیعہ کہتا ہے

رُبَّهٗ مِحْرَابِ اِذَا جِئْتُمُهَا لَمْ اُدْنُ فِیْ اِرْتَقِیَا سَلْمَا

چنانچہ روایت میں ہے کہ زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کے لئے ایک بالا خانہ بنایا تھا جس کے سات دروازے تھے۔ وہاں ان کو رکھا' یا اس سے بیت المقدس کی کوئی اعلیٰ جگہ مراد ہے۔ یا مسجد ہی مراد ہے۔ اس زبان میں ساری مسجد کو محراب کہتے تھے جیسے اب مسجد کے غربی دیوار کے درمیانی حصہ کو محراب کہا جاتا ہے۔ جہاں کمان نما طاق بنا ہوتا ہے۔ جیسے آج بیت اللہ' مسجد حرام پورے مکہ معظمہ' حدود مکہ کو حرم کہتے ہیں۔ بلکہ مسجد نبوی شریف' حدود مدینہ کو بھی حرم کہا جاتا ہے۔ یعنی حرمت والی جگہ' ایسے ہی لفظ محراب بہت معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ یہاں بیت المقدس کا بالا خانہ وہاں کا کوئی خاص مقام مراد ہے جو حضرت مریم کی پرورش کے لئے منتخب ہوا تھا۔ یعنی جب زکریا علیہ السلام حضرت مریم کے پاس ان کے بالا خانے یا مسجد میں جاتے تو وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا رزق اگرچہ رب کے ہر عطیہ کو کہا جاتا ہے۔ مگر جب مطلق بولا جائے تو اس سے کھانا مراد ہوتا ہے۔ جیسے مَا اُرِیْدُ مِنْ رِّزْقٍ (الذاریات: ۵۷) یا جیسے وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ (الذاریات: ۲۲) ابن جریر نے حضرت ربیع سے روایت کی کہ یہاں رزق سے مراد بے موسم پھل ہیں۔ یعنی سردی کے پھل گرمی میں اور گرمی کے پھل سردی میں۔ رِزْقًا کی تنوین تعظیمی ہے۔ یعنی عظیم الشان رزق' سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں۔ کہ یہ جنت کے پھل ہوتے تھے۔ (روح المعانی) یعنی حضرت زکریا مریم کے پاس عظیم الشان پھل پاتے تھے۔ خیال رہے کہ جنت میں دانے نہیں پھل ہیں۔ دانے غذا کے لئے کھائے جاتے ہیں۔ پھل لذت کے لئے۔ وہاں غذا کی کوئی ضرورت نہیں حضرت آدم کے لئے آزمائش کے طور پر عارضی گندم وہاں تھی۔ نیز جنت کے پھل بعض حضرات نے جنت میں جا کر کھائے ہیں۔ بعض نے زمین پر رہ کر حضرت مریم و خبیب نے زمین پر رہ کر کھائے۔ نیز جنت کے پھل پانی وغیرہ تو کھائے بھی گئے۔ اور کھائے بھی جائیں گے۔ مگر وہاں کی حوروں کا استعمال قیامت کے بعد ہوگا۔ ورنہ حضرت حوا کی پیدائش کی ضرورت نہ ہوتی۔ نیز وہاں کے پھل کھانے سے ختم نہیں ہوتے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ اُكُلُهَا دَآئِمٌ۔ حضور ﷺ نے فرمایا اگر ہم جنت کے پھل آج توڑ لیتے تو تم قیامت تک کھاتے' دیکھو ہوا' دھوپ استعمال سے کم نہیں ہوتے۔ حضرت مریم وہ پھل کھا بھی لیتی تھیں اور واپس بھی ہو جاتے تھے۔ کھانے سے ختم نہ ہوتے تھے۔ قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا۔ یہ نیا جملہ ہے۔ جو گذشتہ مضمون کو واضح کر رہا ہے۔ انّٰی کی نفیس تحقیق ہم دوسرے سپارہ میں کر چکے کہ اس کے معنی یا من این ہوتے ہیں۔ یا کیف یا صرف این اور من پوشیدہ چنانچہ شاعر کہتا ہے۔

تَمَنّٰى بِوَادِی الرِّمْثِ زَیْنَبُ ضَلَّةً فَكَیْفَ وَمَنْ اَنّٰى بِذِی الرِّمْثِ تَطْرُقُ

یہاں انّٰی بمعنی این ہے۔ دوسرا شاعر کہتا ہے

اَنّٰى وَمَنْ اَیْنَ اٰبَكَ الطَّرَبُ مَنْ حَیْثُ لَا صَبْوَةٌ وَلَا رِیَبُ

یہاں انّٰی بمعنی کیف ہے۔ آیت میں دونوں معنی درست ہیں۔ یعنی تو فرماتے کہ اے مریم تمہارے پاس یہ کہاں سے آئے آج کل اس کا موسم نہیں [illegible] کا یہ سوال نہ تو بے خبری سے تھا نہ تعجب یا

مخالفت ہے، ان کی محبت، رب تعالیٰ سے محبت، ان کو نقصان پہنچانا گویا رب تعالیٰ کو نقصان دینا ہے جیسا کہ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰہَ سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ**: نفی اور عدم بھی مشیت الٰہی کے ماتحت ہے، یہ بھی رب کے ارادہ سے ہی ہوتی ہے، یہی اہلسنت کا مذہب ہے، معتزلہ کہتے ہیں کہ عدم ارادہ ثبوت نفی کی علت ہے، مگر ہم کہتے ہیں کہ ارادۂ عدم نفی کی علت ہے، دیکھو یہاں فرمایا گیا اللہ ارادہ کرتا ہے کہ ان کا حصہ آخرت میں نہ ہو، حصہ نہ ہونے کا ارادہ ہوا، **ساتواں فائدہ**: کافر کا کفر، منافق کا نفاق سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہے، ارادہ، حکم (امر) اور رضاء میں بڑا فرق ہے، اہلسنت کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر خیر وشر رب تعالیٰ کے ارادہ سے ہے، یہ آیت ہماری دلیل ہے، **آٹھواں فائدہ**: دنیا میں کافر مومن، منافق مرتد سب رب تعالیٰ کی رزاقیت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، مگر آخرت میں صرف مومنوں کو رحمتِ الٰہی سے حصہ ملے گا، کفار کیسی ہی نیکیاں کر کے جائیں مگر آخرت کی رحمت سے محروم ہیں، **نواں فائدہ**: نکرہ نفی کے تحت عموم کا فائدہ دیتا ہے دیکھو یہاں حظًّ ظ سے نکرہ ہے اَلَّا یَجْعَلَ کے تحت آ کر مفید عموم ہوا کہ اس کے معنی ہوئے ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، **دسواں فائدہ**: بڑا عذاب صرف کفار کو ہوگا، مسلمان کیسا ہی گنہگار ہوا سے بڑا عذاب نہ ہوگا جیسے کہ لَهُمْ کے مقدم کرنے سے معلوم ہوا، بلکہ گنہگار مومن کو عذاب ہوگا ہی نہیں، اگر ہوگا تو عتاب ہوگا جس کے ذریعہ اسے پاک وصاف کیا جائے گا،

اعتراضات

پہلا اعتراض: کفار کے کفر پر غم کرنا تو عبادت ہے، اس سے رب تعالیٰ نے اپنے حبیب کو منع کیوں فرمایا؟ **جواب**: بہت غم کرنا جس سے اپنے دل کو سخت تکلیف پہنچے، اس سے منع فرمایا اس کی تفسیر وہ آیت ہے فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ (فاطر: ۸) یا اس خیال پر غم کرنا کہ ان کے اسلام سے نکل جانے پر اسلام ترقی نہ کر سکے گا، یا یہ مسلمانوں کو مٹا دیں گے، یہ ممنوع ہے، **دوسرا اعتراض**: تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ کفار مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے، مگر دن رات مسلمانوں کو کفار کے ہاتھوں نقصان پہنچ رہا ہے، تو آیت کیونکر صحیح ہوئی؟ **جواب**: کبھی مسلمانوں کا کفار کے ہاتھوں شہید یا زخمی ہو جانا ضرر نہیں، اس میں تو مسلمانوں کا نفع ہے کہ شہادت عین سعادت ہے، یہاں ضرر سے مراد اسلام کا خاتمہ کر دینا یا مسلمانوں کو جڑ سے اکھیڑ دینا ہے یہ انشاء اللہ کفار سے ناممکن ہے وہ ہی یہاں مراد ہے، **تیسرا اعتراض**: کفار و منافقین تو پہلے ہی کافر تھے، ان کے متعلق یہ فرمانا کیسے درست ہوا کہ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ کہ وہ کفر میں جلدی سے داخل ہو جاتے ہیں، کفر میں داخل وہ ہو جو پہلے سے خارج ہو؟ **جواب**: اگر یہ آیت مرتدین کے متعلق ہے، تب تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، اور اگر کفار مکہ یا منافقین کے متعلق ہے تو کفر سے مراد کفر کے اعمال ہیں نہ کہ عقائد یعنی یہ لوگ بہت جلد اعمال کفریہ کرنا شروع کر دیتے ہیں، منافقین تو اس طرح کہ کفار سے سازشیں کرنے لگتے ہیں، کفار مکہ اس طرح کہ وہ موقعہ پاتے ہی مسلمانوں کے مقابل لشکر کشی کرنے لگتے ہیں، بہر حال آیت بالکل واضح وصاف ہے، **چوتھا اعتراض**: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی نہیں چاہتا کہ ان منافقین مرتدین کفار کا آخرت کی رحمتوں میں حصہ ہو تو پھر ان بیچاروں کا کیا قصور ہے وہ تو رب تعالیٰ کی طرف سے روکے ہوئے ہیں پھر ان پر الزام کیسا؟ **جواب**: یہ سوال مسئلہ تقدیر پر مبنی ہے، اس کی نفیس

یہود نے حضرت مریم کو بہتان لگا دیئے تھے۔ اسلام کی وسعت قلبی ہے کہ عیسائی یہودی اسلام کو برا کہیں۔ بانی اسلام کو گالیاں دیں۔ مگر اسلام نے ان کے مانے ہوئے بزرگوں کی گواہیاں دیں۔ ہمیشہ مدعی اپنے گواہ کی تعریف کرتا ہے کہ مقدمہ اس کی گواہی پر جیتنا ہے۔ ہمارے حضور ﷺ سب نبیوں کے گواہ برحق ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ وہ اپنے اس گواہ اعظم محمد رسول اللہ ﷺ کے مخالف ہیں۔ اگر حضور سچے نہیں تو ان کے دینوں نبیوں' کتابوں کی حقانیت کیسے ثابت ہوگی۔ انہیں چاہیے کہ اپنے نبیوں کی حقانیت کے لئے حضور ﷺ کو برحق مانیں۔

واقعہ

حضرت حنہ نے مریم کے پیدا ہوتے ہی انہیں ایک کپڑے میں لپیٹا اور بیت المقدس میں لے گئیں جہاں چار ہزار خدام رہتے تھے۔ (روح البیان) اور ان کے سردار ستائیس یا ستر تھے۔ جن کے امیر حضرت زکریا علیہ السلام تھے۔ (خزائن) چونکہ حضرت عمران بنی اسرائیل کے امام تھے۔ اس لئے ان ستر میں سے ہر ایک نے حضرت مریم کے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ ان کی خدمت کا شرف مجھے حاصل ہو۔ زکریا علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کا زیادہ مستحق میں ہوں۔ کیونکہ ان کی خالہ میرے نکاح میں ہیں۔ وہ احبار بولے کہ اگر قرابت داری کی بنا پر یہ ملتا تو ان کی والدہ کو ملتا۔ اب فیصلہ یہ ہے کہ قرعہ ڈالا جائے جس کے نام پر قرعہ نکلے وہ انہیں حاصل کرے۔ یہ سب حضرات نہر اردن کی طرف قلم لے کر چلے جس سے وحی لکھتے تھے اور طے یہ ہوا کہ جس کا قلم پانی میں نہ ڈوبے نہ بہ جائے وہ حضرت مریم کو لے اور جس کا قلم ڈوب جائے یا بہہ جائے وہ ان کا مستحق نہیں چنانچہ ایسا کیا گیا۔ سب کے قلم ڈوب گئے یا بہ گئے۔ مگر زکریا علیہ السلام کا قلم پانی میں ٹھہرا رہا۔ لہٰذا حضرت مریم کی پرورش انہیں کے سپرد ہوئی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ تین بار قرعہ ڈالا گیا۔ اور ہر دفع ایسا ہی ہوا۔ اسے قرآن کریم نے یہاں فرمایا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا۔ دوسری جگہ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ (آل عمران: ۴۴) حضرت زکریا علیہ السلام نے مریم کے لئے بیت المقدس میں ایک بالا خانہ بنایا جس کا دروازہ بیچ بیت المقدس کے تھا۔ جہاں زینہ کے ذریعہ پہنچ سکتے تھے۔ سوا زکریا علیہ السلام کے وہاں کوئی نہ جاتا تھا۔ صحیح روایت میں ہے کہ حضرت مریم نے کسی عورت کا دودھ نہ پیا اور بچپن میں نہایت فصیح و بلیغ کلام فرمایا اور آپ کی پرورش کی یہ کیفیت تھی کہ آپ ایک دن میں اتنا بڑھتی تھیں جتنا دوسرے بچے ایک سال میں۔ اور آپ کو جنتی پھل ملا کرتے تھے۔ جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے اسی لئے رب نے فرمایا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء: ۹۱) ہم نے مریم اور ان کے فرزند کو سارے جہاں کے لئے اپنی قدرت کا نشان بنایا۔

لطیفہ: کل گیارہ بچوں نے گہوارے میں کلام کیا (۱) محمد رسول اللہ ﷺ (۲) حضرت یحییٰ (۳) حضرت ابراہیم (۴) حضرت عیسیٰ (۵) حضرت مریم علیہم السلام (۶) جریج کی گواہی دینے والا بچہ (۷) یوسف علیہ السلام کا گواہ (۸) کھائی والوں کا بچہ (۹) اس لونڈی کا بچہ جسے زمانہ اسرائیل میں زنا کی تہمت لگائی گئی (۱۰) حضرت آسیہ (فرعون کی بیوی) کی خادمہ کا وہ بچہ جسے کھولتے ہوئے تیل میں جلایا گیا۔ (۱۱) یہود کا وہ بچہ جو اپنے ماں باپ کو لے کر حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ اور حضور ﷺ کو صلوٰۃ و سلام عرض کیا۔ مولینا فرماتے ہیں۔

وہ جنہوں نے ایمان کے بدلے کفر مول لیا اللہ کا کچھ نہ بگاڑیں گے
شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ
کچھ بھی اور انہی کے لئے عذاب ہے دردناک اور ہرگز گمان نہ کریں وہ لوگ جو
اوران کے لئے دردناک عذاب ہے اور ہرگز کافر اس گمان
كَفَرُوٓا أَنَّمَا نُمْلِى لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِى لَهُمْ
کافر ہوئے کہ ہمارا ان کو مہلت دینا بہتر ہے ان کی جانوں کے لئے اس کے سوا نہیں کہ ہم مہلت دیتے ہیں ان کو
نہ رہیں کہ وہ جو ہم انہیں ڈھیل دیتے ہیں کچھ ان کے لئے بھلا ہے ہم تو اسی لئے
لِيَزْدَادُوٓا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿۱۷۸﴾
تا کہ وہ گناہ بڑھالیں اور انہی کے لئے خواری واہانت والا عذاب ہے
انہیں ڈھیل دیتے ہیں کہ اور گناہ میں بڑیں اوران کے لئے ذلت کا عذاب ہے

تعلقات

اس آیت کا گذشتہ آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں اسلام کی ایک دشمن جماعت کا ذکر تھا، مرتدین یا منافقین، اب دوسری دشمن جماعت کا ذکر ہے یعنی علمائے یہود، پچھلی آیت میں ان دشمنوں کے شر سے حفاظت کا وعدہ فرمایا گیا تھا، اس آیت میں دوسری جماعت کی شر سے اسلام کی حفاظت کا وعدہ ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ کفار کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اب اس آیت میں فرمایا جارہا ہے کہ ان بدنصیبوں کا دنیا کی رحمتوں میں کوئی حصہ نہیں، کہ جنہیں یہ رحمتیں سمجھ رہے ہیں وہ درحقیقت ان کے لئے لعنتیں ہیں، جیسے لمبی عمریں، مال واولاد وغیرہ، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ کفار کے لئے بڑا ہی عذاب ہے، اب ارشاد ہورہا ہے کہ اگر وہ غور کریں، تو ان کے لئے دنیاوی زندگی بھی عذاب الٰہی ہے، کہ اس زندگی میں وہ گناہ کر کے رب تعالیٰ کی ناراضی خرید لیتے ہیں، **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ کفار اللہ رسول کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، اب ترقی کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے بلکہ وہ اپنے کو بھاری نقصان پہنچارہے ہیں کہ اپنی زندگی کا بیش قیمت موتی برباد ہی نہیں کرتے بلکہ اسے وبال بنارہے ہیں،

شانِ نزول

کفار مکہ اور یہود مدینہ کہا کرتے تھے کہ اسلام کا دعویٰ تو یہ ہے کہ کفار کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، مگر حال یہ ہے کہ دنیا میں ہر قسم کی نعمتوں سے ہمیں پورا پورا حصہ ملا ہوا ہے، مال، اولاد، جائیداد ہمارے پاس زیادہ ہے، اور دنیا آخرت کا نمونہ ہے جو یہاں ہورہا ہے وہی وہاں ہوگا، تو آخرت میں ہم تو خدا تعالیٰ کی نعمتوں سے حصہ پائیں گے، اور مسلمان وہاں بھی محروم رہیں گے،

اولیاء حالات اصفیاء بیان کرنا۔ اولیاء اللہ کے مناقب پڑھنا سنت الٰہیہ ہے۔ ہم لوگ گیارھویں شریف میں اولیاء اللہ کے فضائل وکرامات ہی بیان کرتے ہیں۔ کرامات وارھاصات کبھی پیدائش سے پہلے ظاہر ہوتے ہیں۔ کبھی وفات کے بعد۔ آج بھی اصحاب کہف برابر سورہے ہیں یہ ان کی کرامت ہے۔ **دوسرا فائدہ:** بعض حضرات مادرزاد ولی ہوتے ہیں۔ ولایت عبادت پر موقوف نہیں۔ دیکھو حضرت مریم صغرسنی میں ولی تھیں۔ اور یہ کرامات اسی عمر شریف میں آپ سے ظاہر ہوئیں۔ **تیسرا فائدہ:** ولایت نبوت کا سایہ ہے کبھی اس کا ظہور شروع سے ہوتا ہے کبھی کچھ عرصہ بعد' جیسے بعض انبیائے کرام کی نبوت کا ظہور چالیس سال کی عمر شریف میں ہوا اور بعض کا پیدائش سے ہی جیسے حضرت عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام۔ ولایت تین قسم کی ہے۔ وھبی' عطائی' کسبی حضرت مریم کی ولایت وھبی یعنی خالص عطیہ پروردگار ہے۔ بلا واسطہ انسان۔ **چوتھا فائدہ:** نیک کام میں حرص جائز ہے جیسا کہ حضرت زکریا اور بیت المقدس کے دیگر احبار نے حضرت مریم کو حاصل کرنے میں کی۔ **پانچواں فائدہ:** خالہ کو پرورش کا حق ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے مریم پر اپنا حق پرورش اسی سے ثابت کیا۔ کہ ان کی خالہ میرے نکاح میں ہیں۔ **چھٹا فائدہ:** مسجد میں رہنا سہنا بوقت ضرورت جائز ہے۔ حضرت مریم کی بیت المقدس میں پرورش کی گئی۔ جیسا کہ **كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ** سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** بزرگوں کی اولاد کی خدمت کرنا نیک بختی کی علامت ہے۔ ہمیشہ سے اس پر عمل رہا۔ بیت المقدس کے خدام نے حضرت مریم کی خدمت کو اسی لئے سعادت سمجھا کہ وہ حضرت عمران کی دختر تھیں۔ اسی لئے سادات کرام کی عزت وحرمت ان کی خدمت باعث ثواب ہے۔ **آٹھواں فائدہ:** قرعہ کے ذریعہ فیصلہ کرنا سنت انبیاء ہے۔ نہر اردن میں قلم ڈالنا قرعہ ہی تو ہے۔ اس سے بہت سی مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ اگر مسلمان بجائے الیکشن کرانے کے قرعہ ڈال لیا کریں جس کے نام پر قرعہ نکلے وہ ہی ممبری کے لئے کھڑا ہوا کرے۔ باقی بیٹھ جایا کریں تو بڑی مصیبت دور جائے۔ **نوٹ:** خیال رہے کہ قرعہ کی مختلف صورتیں ہیں۔ سب سے آسان یہ ہے کہ لوگوں کے نام علیحدہ پرچیوں پر لکھ کر ان کی گولیاں بنادی جائیں۔ اور کسی ناواقف شخص سے اٹھوالی جائے جس کے نام کی گولی اٹھے وہ ہی مستحق سمجھا جائے۔ **نواں فائدہ:** دعا میں اخلاص کو بڑا دخل ہے۔ حضرت حنہ کے اخلاص نے نہ ہونے والی بات بھی کردی۔ کہ ان کی بیٹی کی نذر قبول ہوئی۔ اور حضرت مریم وعیسیٰ علیہما السلام کو رب نے شیطان سے محفوظ رکھا۔ حدیث شریف میں ہے کہ شیطان ہر بچہ کو پیدائش کے وقت اپنی انگلی سے چوکیں مارتا ہے۔ جس سے وہ بچہ روتا ہے۔ مگر حضرت مریم اور ان کے فرزند عیسیٰ علیہ السلام اس سے محفوظ رہے (خیال رہے کہ متکلم مستثنیٰ ہوتا ہے حضور علیہ السلام بھی اس سے محفوظ تھے) (کبیر و معانی وغیرہ) **دسواں فائدہ:** اولیاء کو علم لدنی ملتا ہے۔ حضرت مریم رب کی ذات وصفات اور جنت و دوزخ سے پیدائشی باخبر تھیں۔ اسی لئے آپ نے زکریا علیہ السلام کو ایسا نفیس جواب دیا۔ **گیارھواں فائدہ:** بزرگوں کی دعا سے رب تعالیٰ اپنے قانون بدل دیتا ہے۔ دیکھو رب نے حضرت حنہ کی دعا سے اس زمانہ کا شرعی قانون بدل دیا۔ حضور ﷺ کی خواہش سے بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا قانون تبدیل کردیا۔ حضرت ابراہیم وزکریا علیہما السلام کی دعا سے بانجھ وبوڑھی عورتوں کو اولاد بخشی یہ بھی قانون ولادت کے خلاف ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے آسمان سے روٹی و مچھلی کا دستر خوان آیا حالانکہ آسمان سے پانی آنے کا قانون ہے۔ وہاں سے روٹی آنے

صورت میں اَلَّذِیْنَ اس کا پہلا مفعول ہوگا اور اَنَّمَا الخ دوسرا مفعول (تفسیر کبیر، معانی وخازن) اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے مراد وہ کفار ہیں جو دنیوی مال و دولت کو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اپنی حقانیت کی دلیل سمجھے بیٹھے تھے، جن کے بارہ میں یہ آیت کریمہ اتری ہے، اور ہوسکتا ہے کہ سارے ہی کفار مراد ہوں کیونکہ آیات میں الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ شانِ نزول کی خصوصیت کا، اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ اَنَّمَا کا مایا مصدریہ ہے، جس کی وجہ سے نُمْلِیْ املاءَ کے معنی میں ہوگیا، تفسیر کشاف نے اسی کو اختیار کیا، یا موصولہ بمعنی الذی، اس کا صلہ نُمْلِیْ الخ ہے جو دراصل نُمْلِیْهِ تھا کیونکہ صلہ میں موصول کی ضمیر چاہیے چونکہ یہ ضمیر مفعول تھی، اس لئے حذف کردی گئی، خیال رہے کہ رسم خط کے لحاظ سے ما، اِنَّ سے الگ ہونا چاہیے تھا، کیونکہ اِنَّ کے ساتھ صرف ما کافہ ہی ملتا ہے نہ کہ ما موصولہ یا مصدریہ، مگر چونکہ مصحف عثمانی میں ایسے ہی لکھا گیا ہے، اس لئے اسی کی پیروی کی جاتی ہے کہ قرآن کی قرأت وکتابت میں نقل کی پیروی ہے نہ کہ محض عقل وقیاس کی (تفسیر کبیر و روح المعانی) خیال رہے کہ ہماری قرأت میں اَنَّمَا الف کے فتح سے ہے کہ یہ درمیان کلام میں ہے، لَا یَحْسَبَنَّ کا مفعول، مگر یحییٰ ابن وثاب کی قرأت میں اِنَّمَا الف کے کسرہ سے ہے نیا جملہ ہے قائم مقام مفعول (تفسیر روح المعانی) نُمْلِیْ املاءَ سے بنا جس کا مادہ مَلَاءَۃٌ یاملیّ ہے بمعنی درازمدت کہا جاتا ہے مَلَاوَۃٌ مِّنَ الدَّهْرِ اور کہا جاتا ہے مَلِیٌّ مِّنَ الدَّهْرِ، قرآن کریم میں ہے وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا (مریم:۴۶) اسی لئے دن رات کو ملوان کہا جاتا ہے، کہ یہ دونوں ایک درازمدت پر شامل ہیں، کتاب لکھوانے کو املاءَ کہتے ہیں، کیونکہ اس میں بھی دیر لگتی ہے، بڑی جماعت کو ملاءَ کہا جاتا ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (اعراف:۶۶) کیونکہ جماعت کا اجتماع دیر ہی میں ہوتا ہے (تفسیر کبیر، روح المعانی وغیرہ) لہٰذا املاءَ کے معنی ہوئے عرصہ تک چھوڑے رہنا، ڈھیل دینا، مہلت دینا، لِّاَنْفُسِهِمْ فرما کر یہ بتایا کہ کفار کو لمبی عمریں اور مال و دولت ملنا ان کے لئے بہتر نہیں، مسلمانوں کے حق میں بہتر ہے، جس میں ہزاروں ہی فائدے ہیں، یعنی کفار اس خیال میں ہرگز نہ رہیں کہ ہم جو انہیں مہلت دے رہے ہیں، کہ ان کے گناہ وکفر کے باوجود انہیں دولت، اولاد، عمر سے نواز رہے ہیں، یہ ان کے حق میں بہتر ہے، یا کفار اس خیال میں نہ رہیں، کہ ہمارا انہیں ڈھیل دینا ان کے لئے بہتر ہو، نہیں بلکہ اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْٓا اِثْمًا چونکہ یہ نیا جملہ ہے اور اِنَّمَا شروع کلام میں واقع ہے، اس لئے یہاں اِنَّمَا الف کے کسرہ سے ہے، اس کا ما کافہ ہے اسی لئے اِنَّ سے مل کر آتا ہے، یہ کلمہ حصر کے لئے ہے لِیَزْدَادُوْٓا میں لام ارادہ یا انجام کا ہے لِیَزْدَادُوْٓا باب افتعال سے ہے اس کا مصدر اِزْدِیَادٌ مادہ زِیَادَۃٌ ہے بمعنی بڑھالینا، زیادہ کرلینا، اثم کے معنی بارہا بیان ہوچکے ہیں، یہاں اس سے قالب وقلب دونوں کے گناہ مراد ہیں، کفر وفسق یعنی ہمارا ان کفار کو مہلت دینا اس ہی ارادہ سے ہے کہ وہ مال وعمر کے ذریعہ اور زیادہ گناہ کرلیں یا ہمارے مہلت دینے کا انجام یہی ہے کہ وہ اس مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کفر وطغیان ہی بڑھائیں گے، اور یہی سمجھتے رہیں گے کہ ہم اچھا کررہے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ، مُهِیْنٌ اَهَانَةٌ کا اسم فاعل ہے جس کا مادہ هَوْنٌ ہے بمعنی ہلکا ہونا، اسی سے ہے، هَیِّنٌ بمعنی ہلکا وآسان، چونکہ ذلیل آدمی لوگوں کی نگاہوں میں ہلکا ہوتا ہے، اس لئے ذلیل کرنے کو اہانت کہتے ہیں، ذلیل کرنے والے کو مهین، اور ذلیل چیز کو مهان یا مستهان یعنی دنیا میں، برزخ میں، حشر میں اور بعد حشر

تفسیر صوفیانہ

روح اول ظہور میں گویا آدم ہے۔ اور اپنے دوسرے ظہور میں گویا نوح۔ دل گویا ابراہیم ہے جسے نمرود نفس نے شہوتوں کی گوپھن سے فتنوں کی آگ میں ڈالا۔ اور روحانی قوتیں گویا آل ابراہیم ہیں۔ عقل گویا عمران ہے جو جسم کے بیت المقدس میں امام ہے۔ اور اس جسم کے اعضا آل عمران جن میں سے بعض بعض کی ذریت ہیں کیونکہ سب کی جائے ورود ایک ہی ہے اس عمران عقل کی زوجہ نے کہا کہ مولیٰ میں اپنی اندرونی چیز کو شہوات نفسانی سے آزاد کردوں گی۔ اور اسے تیری عبادت میں ما سوی اللہ سے بچاؤں گی۔ رب تعالیٰ نے اس کی یہ نذر قبول فرمائی۔ اور اسے مخلوق کی نگاہوں سے بچایا کہ اس کو سوائے زکریا کے کوئی نہ پاسکا۔ اور پھر اسے قدرتی پانی سے سینچ کر خوب ہرا بھرا کیا جس میں نبوت ولایت کے پھل لگے اور پھر زکریا یعنی شیخ طریقت کو اس کا مربی بنایا۔ جب کبھی وہ شیخ اس کے پاس محراب سینہ میں جاتا ہے۔ تو وہاں رزق روحانی یعنی علم وحکمت معرفت و حقیقت کے پھل پاتا ہے۔ تو شیخ پوچھتا ہے کہ اے مریم نفس مطمئنہ تیرے پاس یہ پاک وصاف رزق کہاں سے آیا۔ وہ عرض کرتی ہے۔ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ اللہ کے پاس سے کیونکہ رزق جسمانی بندوں کے ذریعے ملتا ہے۔ مگر رزق روحانی رب کا خاص عطیہ ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت مجاہد سے نقل کیا کہ یہاں رزق سے مراد علم وحکمت ہے۔ (روح المعانی)

دوسری تفسیر

عقل گویا عمران ہے۔ اور نفس مطمئنہ عمران کی زوجہ۔ نفس مطمئنہ نے نذر مانی کہ مولیٰ جو کچھ میرے شکم میں ہے یعنی قلب میں اسے مخلوق کی اطاعت سے آزاد رکھوں گی۔ مگر جب لڑکی جنی یعنی نفس مطیعہ تو رب کی بارگاہ میں عرض کیا۔ کہ مولی یہ تو لڑکی ہوئی مگر رب جانتا ہے۔ کہ یہ لڑکی یعنی اطاعت شعار نفس عجیب وغریب شی ہے۔ اس سے عجیب آثار نمودار ہوں گے۔ یہ حامل اسرار الٰہیہ ہوگی۔ اس نفس مطعیہ کا نام مریم یعنی عابدہ رکھا گیا۔ عرض کیا کہ مولیٰ میں اسے شیطان یعنی شہوات نفسانیہ سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ یہ شہوات ہی نفس کو باغ قدس سے محروم رکھتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے اسے قبول کیا۔ اور اس پر نورانی بارشیں برسائیں۔ اور اسے اچھی طرح پرورش فرمایا کہ اسے دنیاوی جھگڑوں سے محفوظ رکھ کر اپنے قرب خاص کے بیت المقدس میں جگہ بخشی اور زکریا یعنی استعداد کامل کو اس کا ذمہ دار بنایا۔ جب یہ زکریا نفس کے پاس مسجد قلب میں جاتا۔ تو اس کے پاس روحانی غذا عالم الملکوت والی پاتا تو پوچھتا کہ یہ رزق معنوی تیرے پاس کہاں سے آیا۔ وہ عرض کرتی۔ رب کے پاس سے۔ اس رزق علم کو نہ فکر نے پیدا کیا نہ اس کا موجد انسان ہے بلکہ خاص ربانی رزق ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا علم بقدر قابلیت واستعداد بغیر حساب عطا فرماتا ہے۔ کیونکہ وہ جواد ووہاب ہے (روح المعانی)

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ حسن ذاتی کے ساتھ حسن خارجی بھی جمع ہوجائے تو نور پر نور ہوجاتا ہے۔ حضرت مریم خود نبوت کے خاندان سے تھیں۔ رب کی مقبول جنتی میوے کھانے والی مگر جب حضرت زکریا کی پرورش اور بیت المقدس میں رہائش بھی میسر ہوگئی تو آپ کا کمال لازوال بفضل رب ذوالجلال اور بھی اعلیٰ واکمل ہوگیا۔ پھر بعد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ بننے کے شرف نے ان کی عزت وعظمت کو اور چار چاند لگا دیئے۔ اس لئے ان کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران ۴۲) اے مریم [illegible] جہاں بھر کی عورتوں میں منتخب فرمایا اور چن لیا آج بھی جسے

فائدہ: لمبی عمر اور زیادتی مال وعیش وآرام، اس وقت اچھے ہیں جبکہ ان کے ذریعہ نیکیاں کمائی جائیں، ورنہ یہ سب چیزیں وبالِ جان ہیں، لہٰذا مومن پرہیزگار کی لمبی عمر رحمت ہے، اور کافر بدکار کی لمبی عمر عذاب شیطان کی عمر بڑی ہی لمبی ہے، مگر وہ بڑا ہی مردود ہے، **چھٹا فائدہ:** کبھی کفار کی عمریں اور ان کے مال مسلمانوں کے لئے مفید ہو جاتے ہیں کہ جہاد میں ان کے مال غنیمت بنتے ہیں، اور وہ خود مسلمانوں کے لونڈی غلام، سانپ اور اس کا زہر بھی کبھی کام آجاتا ہے، یہ فائدہ لِاَنْفُسِهِمْ سے حاصل ہوا، **ساتواں فائدہ فائدہ:** ہر خیر وشر رب تعالیٰ کی طرف سے اور اس کے ارادہ سے ہے جیسا کہ لِيَزْدَادُوْٓا الخ سے معلوم ہوا، **آٹھواں فائدہ:** کافر کا جینا اور کھانا پینا بھی گناہ ہے، اور مومن کا جینا اور کھانا پینا وغیرہ انشاء اللہ رحمت ہیں، یہ فائدہ بھی لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا سے حاصل ہوا، **نواں فائدہ:** مومن کو اگرچہ گناہوں کی وجہ سے عذاب ہو جائے، مگر انشاء اللہ دردناک عذاب نہ ہوگا، دردناک عذاب تو کفار کے لئے خاص ہے جیسا کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ میں لھم کے مقدم ہونے سے معلوم ہوا، چنانچہ گنہگار مومن کو عین عذاب کے زمانہ میں چھوٹنے کی امید ہوگی، اور یہ رہائی کی خوشی اس کی تکلیف کو ہلکا کردے گی، وہ منتظر رہے گا کہ اب کوئی چھوڑانے والا آتا ہے اور مجھے دوزخ سے نکال لے جاتا ہے، نیز دوزخ کی آگ نہ تو مومن کے قلب پر اثر کرے گی، نہ اس کے اعضائے سجدہ پر، یہ دونوں باتیں کافر کو میسر نہ ہوں گی، اس لئے ارشاد ہوا کہ دردناک عذاب کفار ہی کے لئے ہے، **دسواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ گنہگار مومنوں کو قیامت میں ذلیل نہ کرے گا، ذلت و رسوائی کفار کے لئے خاص ہے جیسا کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ میں لھم کے مقدم کرنے سے معلوم ہوا حتی کہ مومن کے گناہوں کا حساب بھی خفیہ لیا جائے گا جیسا کہ حدیث شریف میں ہے، **گیارھواں فائدہ:** کبھی گناہ کرنے کے لئے بھی لمبی عمر مل جاتی ہے، جیسا کہ لِيَزْدَادُوْٓا سے معلوم ہوا تھا، رب تعالیٰ نے شیطان کو اتنی لمبی عمر گمراہی پھیلانے کے لئے دی، لہٰذا نیکیاں کرنے کے لئے بھی لمبی عمر مل سکتی ہے، چنانچہ حضرت نوح، حضرت خضر، حضرت الیاس علیہم السلام کو بہت لمبی عمریں ملی ہیں، اصحاب کہف کی لمبی عمر تو قرآن مجید سے ثابت ہے، وہ سوتے میں بھی، ہر سانس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کررہے ہیں جیسا کہ پاس انفاس والوں کا حال ہوتا ہے، حدیث شریف میں ہے کہ خوش نصیب ہے وہ بندہ جس کی عمر دراز ہو، اور اعمال صالح ہوں، اور بدنصیب ہے وہ بندہ جس کی عمر دراز ہو، اور اعمال برے ہوں، خدائے تعالیٰ جب زندگی دے، تو نیکیوں کی توفیق بھی دے، جب دولت نہ ہو تو خالی بٹوے گھر میں رکھنا بے کار ہیں، شعر

جو دل بخشا ہے مولیٰ بخش دے الفت محمد ﷺ کی ۔۔۔ جو آنکھیں دی ہیں دکھلا دے مجھے تربت محمد ﷺ کی
مسلمانوں کو کوئی خلد سے روکے تو کیوں روکے ۔۔۔ وہ جنت ہے محمد ﷺ کی یہ امت ہے محمد ﷺ کی

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کافروں نے ایمان کے عوض کفر خریدا، ان کے پاس ایمان تھا ہی کہاں؟ پھر خریدنا کیونکر درست ہوا؟ **جواب:** اس کے کئی جواب ہیں جو تفسیر اور خلاصہ تفسیر میں بیان کئے گئے، کہ ان کفار سے مراد یا تو مرتدین ہیں جن کے پاس پہلے حقیقی ایمان تھا یا منافقین ہیں جن کے پاس ظاہری ایمان تھا یا عام کفار مراد ہیں جن کے پاس

ہوتے ہیں۔ اس جگہ چونکہ یہ اپنے عامل دعا کے پہلے آیا لہٰذا حصر کے معنی حاصل ہوئے۔ یعنی اس ہی جگہ۔ کبھی مجازاً زمانہ اور وقت کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ (اس ہی وقت) خیال رہے کہ عِنْدَ اور حِیْنَ وقت کے لئے آتے ہیں۔ اور هُنَالِکَ حقیقتاً جگہ کے لئے اور مجازاً وقت کے لئے رب تعالیٰ فرماتا ہے فَغُلِبُوْا هُنَالِکَ (اعراف:۱۱۹) اور فرماتا ہے۔ هُنَالِکَ الْوَلَایَةُ لِلّٰهِ (کہف: ۴۴) پہلا هُنَالِکَ جگہ کے لئے ہے اور دوسرا وقت کے لئے ہے۔ یہاں حقیقی معنی مراد ہیں۔ اس سے مراد حضرت مریم کی قیام گاہ ہے۔ جہاں زکریا علیہ السلام نے ان سے گفتگو فرمائی تھی۔ دعا دعاءٌ سے پہلے بمعنی پکارنا یا دعا کرنا۔ یعنی اس جگہ جہاں حضرت مریم سے ان کی یہ گفتگو ہوئی۔ زکریا علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ دعا کی یا پکارا۔ اور ہوسکتا ہے کہ مجازی معنی مراد ہوں۔ یعنی جواب سنتے ہی اُسی وقت یہ دعا کی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ دونوں معنی مراد ہوں۔ بطریق عموم مجاز یعنی حضرت زکریا نے اسی وقت اُسی جگہ یہ دعا کی حصر سے معلوم ہوا۔ کہ آپ نے مسجد کے منبر یا مسجد امام یا کسی اور گوشہ میں یہ دعا نہ کی بلکہ اس حصہ میں دعا کی جو بی بی مریم کا قیام گاہ تھا کہ یہاں مریم کے قیام کے سبب دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔ آج حجاج روضہ رسول اللہ کے پاس مواجہ شریف میں کھڑے ہوکر زیادہ دعائیں مانگتے ہیں بعض مسجدوں میں بزرگوں کے مزارات یا ان کی عبادت گاہیں ہوتی ہیں۔ وہاں زیادہ دعائیں مانگی جاتی ہے۔ ان سب اعمال کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے۔ اور حضرت زکریا کا عمل ہے۔ قَالَ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً یہ دعا کی شرح ہے۔ هب هبۃ سے بنا بمعنی بلا معاوضہ بطور احسان دینا یہاں بغیر ظاہری اسباب دنیا مراد ہے۔ لِیْ اور مِنْ لَّدُنْ دونوں هَبْ کے متعلق ہیں۔ لَدُنْ بمعنی عند آتا ہے چونکہ انہوں نے بے وقت بڑھاپے میں اولاد مانگی تھی اس لئے مِنْ لَّدُنْکَ عرض کیا۔ نیز طیب طاہر ستھری اولاد مانگی تھی۔ جس میں عقیدہ عمل عبادت کسی چیز میں نقص نہ ہو۔ اس لئے مِنْ لَّدُنْکَ عرض کیا۔ یعنی ایسا صاف ستھرا بیٹا دے جو تیرا عطیہ تحفہ کہلائے مستحق ہو جسے دیکھ کر تو یاد آجایا کرے۔ ورنہ ہر چیز رب ہی کی طرف سے ہے۔ ذریۃ بمعنی نسل آتا ہے۔ اس کی لغوی تحقیق ہم پہلے کر چکے ہیں۔ یہ واحد جمع مذکر مؤنث سب ہی پر بولا جاتا ہے۔ (روح المعانی) یہاں بمعنی ایک فرزند ہے کیونکہ زکریا علیہ السلام کے صرف یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور ان کی نسل نہ چلی۔ جیسا کہ حصوراً سے معلوم ہوگا چونکہ ذریۃ لفظ میں مؤنث ہے۔ اس لئے اس کی صفت مؤنث لائی گئی۔ کیونکہ کبھی اسم جنس میں لفظ کا لحاظ ہوجاتا ہے۔ ہاں علم میں معنی کا لحاظ ہوتا ہے۔ نہ کہ لفظ کا۔ لہٰذا جاءَ ت طلحة نہیں کہہ سکتے (روح المعانی وکبیر) طَیِّبَةً سے مراد پاک ہے۔ یا متقی پرہیزگار یا صالح و دیندار جس کے اخلاق اور اعمال عیوب سے پاک وصاف ہوں۔ یعنی اے اللہ مجھے اپنی قدرت سے بغیر عادی واسطہ کے ایک مبارک نیک صالح فرزند عطا فرما اس میں اپنی نیت کا اظہار ہے۔ کہ مولیٰ میں یہ بچہ کسی دنیاوی مقصد کے لئے نہیں مانگتا۔ صرف خدمت دین اور توشہ آخرت کے لئے مانگتا ہوں۔ اس لئے مالدار یا بادشاہ یا جائیدار والا بیٹا نہیں مانگتا۔ بلکہ طیب وستھرا مانگتا ہوں۔ اِنَّکَ سَمِیْعُ الدُّعَآءِ۔ یہ جملہ دعا کا خاتمہ ہے اور سمیع سے مراد قبول فرمانے والا ہے۔ رب تعالیٰ سنتا سب کی ہے۔ مگر کسی کی مردودیت وغضب کے ساتھ کسی کی لاپرواہی سے کسی کی توجہ کرم وقبولیت سے۔ الدُّعَآءِ میں الف لام عہدی ہے۔ یعنی اس قسم کی دعائیں سنتا ہے جو شرائط ارکان اخلاص واضطراب دل کے ساتھ ہو نماز کی طرح دعا کے بھی ارکان وشرائط جگہ ووقت ہیں جو دعا ان سب کی جامع ہو وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ اس جملہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

دوسرا انجام کا، ہم چور سے کہتے ہیں تو چوری کرتا ہے جیل جانے کے لئے، حالانکہ وہ چوری کرتا ہے مال حاصل کرنے کے لئے، تفسیر کبیر وروح المعانی وغیرہ نے اس سوال کو مشکل ترین سمجھا، اور اس کے نہایت دقیق جوابات دیئے ہیں، فقیر نے جو جواب عرض کیا ہے اس میں بفضلہٖ تعالیٰ کفایت ہے، **پانچواں اعتراض:** عقائد کا مسئلہ ہے کہ رب تعالیٰ کے افعال وکام غرض سے پاک ہیں، اس کے کام بے غرض ہیں مگر لِيَزْدَادُوْٓا الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کاموں کی بھی غرض ہوتی ہے، دیکھو ان کفار کو ڈھیل دینے کی غرض ان کے گناہوں کی زیادتی ہے کہ وہ اس مدت میں گناہ زیادہ کریں، **جواب:** رب تعالیٰ کے کام غرض سے خالی ہیں، حکمت سے خالی نہیں، بے غرض ہیں بے فائدہ نہیں، لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا میں حکمت کا بیان ہے غرض کا نہیں، غرض اپنے فائدہ کو کہتے ہیں حکمت دوسرے کے فائدے کو، رب تعالیٰ کسی چیز، کسی کام سے خود فائدہ حاصل نہیں فرماتا، دوسروں کو فائدہ عطا فرماتا ہے وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ (انعام: ۱۴) تمام رزق اور روزی کی پیدائش رب تعالیٰ کے فائدے کے لئے نہیں ہمارے فائدے کے لئے ہے لہٰذا غرض سے نہیں فائدے سے ہے،

تفسیر صوفیانہ

دنیا ایک منڈی ہے جس میں مختلف قسم کی دکانیں ہیں، ان دکانوں میں مختلف سودے، رحمانی دکانوں میں ایمان وعرفان کے سودے ہیں، اور شیطانی دکانوں میں کفر وطغیان کے سودے، دونوں قسم کی دکانوں پر منیم اور ایجنٹ کام کررہے ہیں، شیطانی لوگ شیطان کے ایجنٹ ہیں، اور رحمانی لوگ رب تعالیٰ کے مقرر کردہ گویا منیم اور ایجنٹ ہیں، ہر شخص کی استعداد وقابلیت گویا رائج الوقت سکہ ہے، جیسے سو کے نوٹ سے شراب اور خنزیر بھی خریدا جاسکتا ہے، اور مصلے وتسبیح بھی، نوٹ یکساں ہیں مگر جیبیں دو قسم کی، شرابی کی جیب میں یہ نوٹ لعنت ہے، حاجی اور نمازی کی جیب میں یہی نوٹ رحمت ہے، کفار نے ایمان یعنی اپنی استعداد وقابلیت کے ذریعہ کفر وطغیان خریدا، اگرچہ لوگ بظاہر ان کی تعریف کریں اور ان کے مال ومنال کو للچائی نگاہوں سے دیکھیں، مگر درحقیقت ان کا مال ان کے لئے وبال ہے، زہر آلود مٹھائی ہے، کہ منہ میں خوش ذائقہ اور پیٹ میں پہنچ کر مہلک، شعر

غرہ مشو بآنکہ جہانت عزیز کرد اے بس عزیز را کہ جہاں کرد زود خوار

ماراست ایں جہاں وجہاں جوئے مار گیر واز مار گیر مار بر آرد گہے و مار

یعنی دنیا والوں کی تعریف اور انکے زندہ باد کے نعروں سے دھوکا مت کھاؤ کہ دنیا داروں کو ذلیل کرتے اور مردہ باد کے نعرے لگاتے دیر نہیں لگتی، دنیا گویا سانپ ہے، دنیا دار سپیرا، سپیرا کبھی سانپ سے ہی مرتا ہے، رب العالمین نے اپنے حبیب ﷺ سے فرمایا کہ میں نے تمہاری امت پر چند خصوصی احسان کئے ہیں، ایک یہ کہ انکی عمریں عموماً کم رکھیں تاکہ گناہ کم کریں، دوسرے یہ کہ انہیں مال کم دیا، تاکہ ان کا قیامت میں حساب ہلکا ہو، اور انہیں سب سے آخر میں پیدا کیا، تاکہ قبروں میں کم رہنا پڑے، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ نفس کی مثال شتر مرغ کی سی ہے، کہ بہت کھاتا ہے اور بہت بہانے بناتا ہے، اگر اس پر بوجھ لاددو تو کہتا ہے میں پرندہ ہوں، میرے پر دیکھو، اور اگر اس سے اڑنے کو کہو، تو کہتا ہے میں چرندہ ہوں، میرے پیر دیکھو، غرضکہ ہر ساعت اس کا نیا قبلہ ہے، یہاں کی نعمتیں کھاتے وقت آخرت کے حساب کا خیال رکھو، کسی

تمہیں یحییٰ علیہ السلام کے یا ان کے ذریعہ خوشخبری دیتا ہے کہ تمہارے ہاں ایک فرزند ہوگا۔ جس کا نام ہم نے یحییٰ رکھ دیا ہے۔ خیال رہے کہ ہمارے بچوں کے نام ان کے ماں باپ رکھتے ہیں۔ وہ بھی پیدائش کے ساتویں دن مگر ہمارے حضور انور ﷺ اور حضرت یحییٰ کا نام خود رب تعالیٰ نے رکھا۔ وہ بھی ولادت سے بہت پہلے۔ نیز ہمارے بچوں کے نام کبھی کام کے خلاف بھی ہوتے ہیں۔ تمام نام صحیح نہیں ہوتے۔ غلط بھی ہوتے ہیں۔ کالے آدمی کا نام یوسف خان بزدل کا نام شیر بہادر جاہل کا نام محمد فاضل بہرے کا نام سمیع اللہ خان اندھے کا نام نور اللہ خان رکھ دیا جاتا ہے۔ مگر رب تعالیٰ کے رکھے ہوئے نام بالکل صحیح اور کام کے مطابق ہوتے ہیں۔ دیکھو رب نے حضور انور ﷺ کا نام محمد رکھا یعنی بہت سراہا ہوا تعریف کیا ہوا۔ آج بھی اس نام کی بہار دیکھی جا رہی ہے۔ کہ ہر جگہ ہر وقت ہر زبان میں حضور ﷺ کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ رب نے ان کا نام یحییٰ رکھا۔ یعنی زندگی بخشنے والے یا زندہ جاوید رہنے والے یہ نام ان پر بہت ہی سجا اب تک وہ زندہ ہیں اور تا قیامت زندگی بخشیں گے۔ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ مُصَدِّقًا یحییٰ کا حال ہے۔ کلمہ بات کو کہتے چونکہ عیسیٰ علیہ السلام بغیر والد لفظ کُنْ سے پیدا ہوئے۔ اس لئے آپ کا لقب کلمۃ اللہ ہوا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (آل عمران: ۵۹) من اللہ کلمہ کی صفت ہے۔ اور کائنۃٌ پوشیدہ کا متعلق اگرچہ دیگر لوگوں نے بھی عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی مگر چونکہ یحییٰ علیہ السلام نے بچپن شریف بلکہ حمل شریف ہی سے تصدیق فرمائی۔ اس لئے مُصَدِّقًا فرمایا گیا۔ یعنی تصدیق کرنیوالے۔ کلمۃ اللہ عیسیٰ علیہ السلام کی۔ بعض لوگوں نے کلمۃ اللہ کے معنی انجیل شریف کئے ہیں۔ مگر یہ نہایت ضعیف سی بات ہے۔ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا سَیِّد سود یا سواد سے بنا۔ سود بمعنی جماعت اور سواد بمعنی سیاہی بلکہ بڑی جماعت کو بھی سواد اسی واسطے کہتے ہیں۔ کہ اس سے میدان سیاہ ہو جاتا ہے۔ سید وہ ہے جو سواد یعنی بڑی جماعت کا متولی و سردار ہو یا تو اس سے مراد کریم ہے یا حلیم یا متقی یا شریف یا فقیہہ عالم یا رب کے فرمان پر راضی یا سردار بعض اہل لغت نے اس کے معنی ہمت والا اور مالک بھی کئے ہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ (یوسف: ۲۵) یہاں سَیِّد کے معنی مالک یا خاوند ہیں۔ کہ عزیز مصر زلیخا کا خاوند تھا۔ سفیان ثوری فرماتے ہیں۔ کہ سید وہ جو کسی پر حسد نہ کرے۔ اور ابو اسحاق نے فرمایا کہ سید وہ جو علم اور تقویٰ میں اپنی قوم سے افضل ہو۔ اب اصلاح میں ہر دینی یا دنیوی فوقیت رکھنے والے کو سید کہتے ہیں۔ (روح المعانی) چونکہ یحییٰ علیہ السلام میں یہ ساری صفتیں تھیں۔ اس لئے انہیں سید فرمایا گیا۔ بعض لوگوں نے فرمایا کہ آپ نے کبھی کوئی خطا نہ کی (روح البیان) تفسیر کبیر نے فرمایا کہ آپ نے کبھی کسی پر غصہ نہ کیا۔ اس لئے رب نے آپ کو سیّد فرمایا۔ حصور حصر سے بنا بمعنی روکنا۔ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اصطلاح میں حصور وہ ہے جو قدرت کے باوجود محض زہد و تقویٰ سے عورتوں کے پاس نہ جائے۔ نامرد حصور نہیں۔ کیونکہ یہ عیب ہے۔ نہ کہ خوبی (عام تفاسیر) خیال رہے کہ عنین خصی مجبوب اور حصور یہ چار لفظ ہیں۔ جن کے مختلف معنی ہیں عنین وہ جس کے اعضائے تناسل سب درست ہوں مگر کمزوری کی وجہ سے قابل جماع نہ ہو۔ خصی وہ جس کے خصیے نہ ہوں۔ اور مجبوب وہ جس کے خصیے تو ہوں مگر ذکر کٹا ہو۔ لیکن حصور وہ ہے جس کے پاس اعضاء اور طاقت سب کچھ ہو محض زہد کی بنا پر عورتوں سے الگ رہے۔ اور اپنے نفس کو شہوت سے دور رکھے۔ جن لوگوں نے اس کے معنی نامرد ثابت کئے سخت غلطی کی۔ کیونکہ انبیائے کرام اس مرض سے پاک ہوئے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ حصور وہ

تعلقات

اس آیت کا گزشتہ آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** بہت دور سے جنگِ احد، غزوۂ حمراء الاسد اور بدر صغریٰ کا ذکر چلا آرہا ہے، اب اس آیت میں ان تمام حادثات کی حکمت بیان ہو رہی ہے کہ یہ واقعات کھرے کھوٹوں میں چھانٹ کا ذریعہ ہیں، کہ جو ان موقعوں پر گھبرا کر کفار کے حمایتی بن جائیں وہ کھوٹے ہیں، اور جو اسلام پر قائم رہیں وہ کھرے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا، کہ بعض لوگ ایمان کے عوض کفر خرید لیتے ہیں، ان کی عمر و دولت نعمت نہیں عذاب ہے، اب ارشاد ہو رہا ہے کہ ایسے لوگوں کو تم لوگ خود نہیں پہچان سکتے، جب تک کہ ہم اپنے نبی کی معرفت پہچان نہ کرائیں، کیونکہ بظاہر کھرے کھوٹے رنگ و روپ میں یکساں ہیں، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ بعض لوگوں کی عمر زیادتی گناہ کا ذریعہ ہے، اب ارشاد ہو رہا ہے کہ تم ان میں سے نہ بننا، اس طرح کہ ہم پر اور ہمارے رسولوں پر ایمان لے آنا، خلاصہ یہ ہے کہ بدنصیبوں کا ذکر فرمانے کے بعد ان سے بچنے کا طریقہ بتایا جا رہا ہے، **چوتھا تعلق:** پچھلی آیتوں میں کفار و منافقین کے اخروی عذاب کا ذکر تھا، اب ان کے دنیوی عذاب کا ذکر ہے وہ مسلمانوں سے چھٹ جائیں گے، ذلیل وخوار ہو کر رہیں گے، مگر چونکہ اخروی عذاب دائمی ہے، اور سخت تر اور دنیوی عذاب عارضی و آسان، اس لئے پہلے دائمی و سخت عذاب کا ذکر کیا، پھر عارضی و ہلکے عذاب کا،

شانِ نزول

اس آیت کریمہ کے نزول کے بارے میں چند روائتیں ہیں،

ایک وہ جو واحدی نے امام سدی سے روایت کی، کہ ایک دن حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جیسے آدم علیہ السلام پر روحیں پیش کی گئی تھیں، ایسے ہی عالم کی پیدائش سے پہلے مجھ پر میری امت (امتِ دعوت یعنی سارے انسان) اپنی صورتوں میں پیش کئے گئے، میں نے سب کو جان پہچان لیا، کہ کون مجھ پر ایمان لائے گا، اور کون کفر کرے گا، جب یہ خبر منافقوں کو پہنچی تو وہ مذاقاً بولے کہ محمد (ﷺ) تو ان لوگوں کو پہچاننے کا دعویٰ کرتے ہیں جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے، اور ہم تو عرصہ سے آپ کے ساتھ ہیں، ہمیں آج تک آپ نہ پہچان سکے، یہ خبر نبی کریم ﷺ کے گوش گذار ہوئی، تو آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر رب تعالیٰ کی حمد و ثناء کی پھر فرمایا لوگوں کا کیا حال ہے کہ ہمارے علم کے متعلق زبانِ طعن دراز کرتے ہیں؟ آج سے قیامت تک کی جو بات چاہو پوچھ لو، تم جو بھی پوچھو گے ہم بتائیں گے، حضرت عبداللہ ابن حذافہ سہمی کھڑے ہو گئے اور بولے یارسول اللہ ﷺ میرا باپ کون ہے؟ فرمایا تمہارے باپ حذافہ ہیں! اور پوچھو، تب حضرت عمر نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ ہم اللہ کی ربوبیت، اسلام کے دین ہونے، قرآن کے امام ہونے اور آپ کے نبی ہونے پر ایمان رکھتے ہیں ہمیں معافی دیجئے، تب حضور انور ﷺ نے ارشاد فرمایا، کہ کیا تم ایسے طعنوں سے باز رہو گے کیا تم باز رہو گے؟ اور منبر سے نیچے اتر آئے، تب یہ آیت کریمہ اتری،

دوسری وہ جو ابن جریر نے انہی امام سدی سے روایت کی، کہ ایک بار کفار عرب نے کہا تھا کہ اگر محمد (ﷺ) سچے ہیں تو

بات نکلتی تھی حق ہوتی تھی اور جیسا آپ کہتے تھے ویسا ہی ہوتا تھا۔ گویا آپ کی گفتگو کلمۃ اللہ ہوتی تھی۔ اس لئے آپ کا لقب کلمۃ اللہ ہوا۔ (۲) مومنوں کا سردار ہوگا۔ (۳) ہمیشہ عورتوں سے پرہیز کرے گا کہ زہد و تقویٰ اور یادِ الٰہی میں مشغول ہو کر عورتوں کی طرف توجہ نہ کرے گا نبی ہوگا اور رب تعالیٰ کے خاص نیکوں میں سے ہوگا۔ خیال رہے کہ اس وقت زکریا علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ اور بیوی صاحبہ کی عمر اٹھانوے سال یہ بھی خیال رہے کہ اس بشارت اور اس کے ظہور میں تقریباً تیرہ یا انیس سال کا فاصلہ ہے۔ کیونکہ یہ دعا اور بشارت حضرت مریم کے لڑکپن میں ہوئی۔ اور یحیٰی علیہ السلام کی پیدائش کے وقت حضرت مریم کی عمر شریف تیرہ سال یا ۲۰ سال تھی۔ (روح المعانی وخزائن وغیرہ) تفسیر خازن وخزائن میں ہے کہ ایک دن حضرت ایشاع یحیٰی علیہ السلام کی والدہ نے حضرت مریم سے کہا۔ کہ میں حاملہ ہوں انہوں نے کہا میں بھی۔ ایشاع بولیں کہ اے مریم جب میں تمہارے پاس آتی ہوں تو میرے پیٹ کا بچہ تمہارے پیٹ کے بچے کو سجدہ کرتا ہے یہ مُصَدِّقًا کے معنیٰ ہیں خیال رہے کہ یحیٰی علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر جانے سے چھ ماہ پیشتر شہید کئے گئے۔ اور میر دوس یہودی نے آپ کو شہید کیا (تفسیر روح المعانی وکبیر وخازن وغیرہ)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** وہ دعائیں بہت جلد قبول ہوتی ہیں جو بزرگوں سے منقول ہوں۔ کیونکہ ان الفاظ میں تاثیر ہوتی ہے۔ زکریا علیہ السلام نے ان الفاظ سے دعا مانگی۔ جو ابراہیم علیہ السلام سے منقول تھے۔ **دوسرا فائدہ:** اولیاء اللہ کے قرب میں دعا جلد قبول ہوتی ہے جیسا کہ ھُنَالِکَ سے معلوم ہوا۔ کیونکہ زکریا علیہ السلام نے اللہ کی ولیہ حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس کھڑے ہو کر دعا مانگی۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ جب مجھے کوئی حاجت پیش آتی ہے تو میں فلسطین سے چل کر امام ابوحنیفہ کی قبر پر بغداد شریف آتا ہوں اور دو رکعت پڑھ کر ان کی قبر شریف کے پاس دعا مانگتا ہوں تو میری حاجت بہت جلدی پوری ہوتی ہے۔ (مقدمہ شامی فضائل ابوحنیفہ) بلکہ شامی میں اسی جگہ ہے۔ کہ امام شافعی امام ابوحنیفہ کے مزار پر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) جب حاضری دیتے ہیں تو نماز میں نہ بسم اللہ جہر سے پڑھتے تھے نہ قنوت نازلہ محض امام صاحب کے ادب کی وجہ سے۔ **تیسرا فائدہ:** نزول رحمت کے وقت دعا مانگنا سنت انبیاء ہے۔ دیکھو حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کے پاس بے موسم پھل دیکھ کر دعا کی۔ حدیث شریف میں ہے کہ بارش کے وقت دعا مانگو کہ یہ نزول رحمت کا وقت ہے۔ **چوتھا فائدہ:** اکیلے آدمی کو محراب میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ جیسا کہ یُصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ سے معلوم ہوا۔ حدیث شریف میں جو ممانعت ہے وہ جب ہے کہ اکیلا امام محراب میں ہو اور قوم باہر۔ **پانچواں فائدہ:** مسجدوں میں محراب بنانا جائز ہے۔ بلکہ سنت انبیاء کہ زکریا علیہ السلام کے زمانہ میں بیت المقدس میں محراب تھی۔ جیسا کہ فِی الْمِحْرَابِ کی تیسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** انبیاء کرام کی نعت بیان کرنا سنت الٰہیہ ہے۔ رب تعالیٰ نے اس آیت میں یحیٰی علیہ السلام کی پانچ صفتیں بیان کیں۔ مصدق، سید، حصور، نبی اور مِنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ **ساتواں فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ فقط کلمہ کن سے پیدا ہوئے جیسا کہ بِکَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ سے معلوم ہوا۔ اس کی زیادہ تحقیق انشاء اللہ سوال و جواب میں کی جائے گی۔ **آٹھواں فائدہ:** نماز میں فرشتوں کی بات

گا، ان کو بین بین کر نکالا جائے گا، اس لئے اَلْخَبِیْثَ کو یَمِیْزَ کا مفعول بنایا گیا، ردی چیزیں کھری میں سے نکال کر پھینکی جاتی ہیں، وہ چھانٹنے والے اسباب کیا ہیں، غزوات کی مصائب تکالیف جس سے منافقین گھبرا جاتے ہیں اور مومنین مطمئن رہتے ہیں اور مسلمانوں کی فتوحات ہیں جنہیں دیکھ کر مسلمان خوش ہوتے ہیں، منافقین جلتے ہیں وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ نیا ہے، واؤ ابتدائیہ، اس میں مخلصین و منافقین کے ممتاز کرنے کا طریقہ ارشاد ہوا مَا كَانَ الخ کی تفسیر و ترکیب وہ ہی ہے جو ابھی مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الخ میں گذر گئی، يُطْلِعُ طَلَعَ سے بنا بمعنی چمکنا و ظاہر ہونا ہے، اسی سے طلوع ہے کہ سورج طلوع ہو کر چمکتا و ظاہر ہوتا ہے، اطلاع باب افعال سے ہو یا افتعال سے معنی ہوتے ہیں ظاہر کرنا، خبر دار کرنا، چونکہ اس میں تسلط کے معنی بھی ہیں، اسی لئے اس کے بعد علیٰ آتا ہے، غیب کی تعریف و تقسیم نیز غائب و غیب کا فرق نیز علم غیب و علم بالغیب میں فرق شروع پارہ الم میں عرض کیا گیا، یہاں اتنا سمجھ لو کہ اس جگہ غیب سے مراد وہ غیب ہے جو دلائل سے بھی معلوم نہ ہو سکے، جیسے آئندہ واقعات، لوگوں کے دل کے حالات جو رب تعالیٰ کا علم ہے جیسے غیبیہ کہا جاتا ہے، وہ غیب جو دلائل سے معلوم ہو جائے جیسے رب تعالیٰ کی ذات و صفات، یہ تو لوگوں کو دلائل کے ذریعہ بتایا گیا، اسی غیب کے جاننے پر ایمان موقوف، رب تعالیٰ فرماتا ہے يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (بقرہ: ۳) لہٰذا یہ آیت واضح ہے، یہاں كُمْ میں خطاب عام لوگوں یا عام مسلمانوں سے ہے، اس میں حضور ﷺ داخل نہیں، جیسا کہ اس آیت کے مضمون سے واضح ہے یعنی اے مسلمانو! خبیث و طیب منافق و مخلص میں فرق اس طرح نہ ہوگا کہ تم عوام کو رب تعالیٰ غیب پر مطلع کر دے، جس سے تم سب لوگ لوگوں کے دلی حالات، دماغی خیالات، اخلاص و نفاق ایمان و کفر معلوم کر لیا کرو، بلکہ اس چھانٹ کا طریقہ یہ ہوگا کہ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ لٰكِنَّ حرف استدراک ہے یعنی گذشتہ جملہ سے وہم کا دفع کرنا، یہ ایسے دو جملوں کے بیچ میں آتا ہے جن کے مضامین مختلف ہوں، پہلے جملہ سے وہم پیدا ہو، دوسرے جملہ سے دفع ہو جائے لٰكِنَّ کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے جملہ میں جس چیز کی نفی ہوگی، دوسرے میں اس کا ثبوت ہوگا، جیسے میرے پاس زید نہ آیا لیکن عمرو آیا، چونکہ مَا كَانَ اللّٰهُ الخ سے شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید رب تعالیٰ نے اپنے حبیب کو بھی علم غیب نہ دیا، اس وہم کو دفع فرمانے کے لئے یہاں لٰكِنَّ ارشاد ہوا، اور اس جملہ میں اپنے حبیب کے لئے اسی غیب کی عطاء کا ذکر کیا گیا جس کی دوسروں سے نفی کی گئی تھی، يَجْتَبِيْ جَبْيٌ سے بنا جس کے معنی ہیں حوض میں پانی جمع کرنا، کہا جاتا ہے جَبَيْتُ الْمَآءَ میں نے پانی حوض میں جمع کیا، اس لئے حوض کو جَابِيَه کہتے ہیں جس کی جمع جواب آتی ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ (سبا: ۱۳) اِجْتِبَاءٌ کے معنی ہیں فیوض ربانی جمع کرنے کے لئے کسی کو چن لینا، تفسیر روح المعانی نے فرمایا کہ اجتباء، اصطفاء، اختیار ہم معنی ہیں، اسی روح المعانی میں ہے کہ مِنْ رُّسُلِهٖ میں مِنْ ابتدائیہ ہے نہ کہ تبعیضیہ کیونکہ رب تعالیٰ نے سارے ہی رسولوں کو علم غیب بخشا ہے، اور آیت کا مقصد یہ ہے کہ حضور انور ﷺ کا یہ علم بالکل ظاہر ہے کیونکہ آپ رسولوں کے سردار ہیں، اور سارے رسول علم غیب کے لئے چنے جا چکے ہیں تو آپ کے علم کا کیا پوچھنا، اور ہو سکتا ہے کہ مِنْ تبعیضیہ ہو، اور مطلب یہ ہو کہ خاص غیوب کے لئے خاص رسولوں کا انتخاب ہو چکا ہے، ان میں ہمارے یہ حبیب بھی ہیں، اسی روح المعانی میں اسی جگہ یہ بھی ہے کہ بعض اہل کشف اولیاء اللہ بھی

نکاح کے لوازمات میں زیادہ مشغول نہ ہوئے۔ نکاح اور چیز ہے اور اس میں مشغولیت دوسری چیز۔ عیسیٰ علیہ السلام بھی آسمان سے واپس تشریف لا کر نکاح کریں گے۔ اور صاحب اولاد ہوں گے۔ حصور کے معنی ہیں نفس کو شہوت سے روکنے والا۔

دوسرا اعتراض: کیا حضرت مریم کے پاس پھل دیکھ کر زکریا علیہ السلام کو خدا کی قدرت کا علم ہوا اس سے پہلے نہ تھا۔ اگر تھا تو ھُنَالِکَ کے کیا معنی؟ (مرزائی) **جواب:** پہلے علم تو تھا اولاد کا شوق نہ تھا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر قدرتی طور پر دل میں شوق ہوا۔ نیز یہ وقت رحمت الٰہی کا تھا۔ اور رحمت کے وقت دعا مانگنا بہتر۔ **تیسرا اعتراض:** کلمۃ من اللہ کے معنی کتاب اللہ یعنی انجیل شریف ہے۔ نہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بغیر باپ کے نہیں۔ وہ یوسف نجار کے بیٹے ہیں۔ جن کا نکاح حضرت مریم سے ہوا تھا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے کَبُرَتْ کَلِمَۃً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ (کہف: ۵) نیز فرماتا ہے اِنَّھَا کَلِمَۃٌ ھُوَ قَآئِلُھَا (مومنون: ۱۰۰) بھلا انسان بھی کلمہ ہو سکتا ہے؟ (قادیانی) **جواب:** یہ تفسیر قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کے بالکل خلاف ہے۔ رب تعالیٰ نے کتاب اللہ کو کہیں کلمہ نہیں فرمایا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کو بارہا کلمہ فرمایا ہے۔ سنو فرماتا ہے اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ اَلْقٰھَا اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْہُ (النساء: ۱۷۱) نیز فرماتا ہے وَبِکَلِمَۃٍ مِّنْہُ (آل عمران: ۴۵) نیز فرماتا ہے۔ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (آل عمران: ۵۹) چونکہ ان کی پیدائش کلمہ کن سے ہوئی نہ کہ نطفہ سے لہٰذا ان کا لقب کلمۃ اللہ ہوا۔ اگر وہ کسی مرد کے بیٹے ہوتے تو انہیں عیسیٰ ابن مریم نہ کہا جاتا کیونکہ اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہوتی ہے نہ کہ ماں کی طرف رب تعالیٰ فرماتا ہے اُدْعُوْھُمْ لِاٰبَآئِھِمْ (احزاب: ۵) تم انہیں ان کے باپوں کی طرف منسوب کر کے پکارو۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے والد ہوتے تو رب تعالیٰ انہیں عیسیٰ ابن مریم فرما کر نہ پکارتا۔ رب تعالیٰ نے قرآن کریم میں صرف مریم کا نام لیا۔ ان کے سوا کسی عورت کا نام قرآن میں آیا ہی نہیں۔ لہٰذا کَلِمَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ کے معنی عیسیٰ روح اللہ ہی ہیں۔ بھلا حضرت مریم کا نکاح یوسف نجار کے ساتھ کہاں ثابت ہے۔ اور نکاح پڑھانے کوئی مرزائی جی گئے تھے؟ قرآن کریم نے حضرت مسیح کے بغیر باپ پیدا ہونے کا واقعہ پورے ایک رکوع میں بیان فرمایا جس کا واقعہ سورۂ مریم میں آئے گا۔ انشاء اللہ **چوتھا اعتراض:** حدیث شریف میں ہے کہ مسجد میں محراب بنانا منع ہے۔ چنانچہ ابن ابی شیبہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ محراب ان بدعتوں میں سے ہے جو پہلے زمانہ میں نہ تھی۔ ابو موسیٰ جہنی نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں خیر رہے گی جب تک کہ مسجدوں میں عیسائیوں کی طرح محرابیں نہ بنائی جائیں۔ عبداللہ ابن جعد فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام کے نزدیک محراب علامت قیامت میں سے ہے۔ عبداللہ ابن عمر سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ محرابوں سے بچو اس بارے میں امام سیوطی نے ایک مستقل رسالہ لکھا پھر اس آیت میں اور ان احادیث میں مطابقت کیونکر ہو۔ (روح المعانی) **جواب:** نفس محراب منع نہیں بلکہ رنگین اور نقشین محراب بہتر نہیں جس سے نماز میں دھیان بٹے۔ یا صرف امام کا محراب میں کھڑا ہونا منع ہے۔ اسی لئے ان احادیث میں عیسائیوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جیسے عیسائیوں کا صرف امام محراب میں کھڑا ہوتا ہے اور محراب صرف امام ہی کے لئے ہوتی ہے۔ اس سے بچو۔ ایک روایت میں اِتَّقُوْا ھٰذَا الْمَذَابِحَ (روح المعانی) ان محرابوں سے بچو۔ اس کا یہ ہی مطلب ہے کہ محراب میں اکیلے نہ کھڑے ہو۔ زمانہ

جسے چاہیں اس کے ایمان و کفر پر مطلع کر دیں، چنانچہ دیکھ لو کہ آقائے دو جہان نے بشارتیں دے دیں کہ حسن و حسین جوانانِ جنت کے سردار ہیں، صدیق و فاروق جنت میں میرے ساتھی ہیں وغیرہ وغیرہ، یہ رسولوں کا انتخاب اس لئے ہے تاکہ تم بھی بھی ان سے مستغنی و بے نیاز نہ ہو سکو، اپنا حال بھی ان سے پوچھو، اوروں کا حال بھی ان سے پوچھو، بیماری ہوتی تو ہے مریض کے جسم میں، مگر بتاتا ہے طبیب، لہٰذا تم اللہ رسول پر ایمان لاؤ، اور انہی پر ایمان رکھو کہ جسے وہ مخلص یا جنتی فرمائیں، اسے مخلص و جنتی مانو، اور جسے وہ منافق یا جہنمی بتائیں، اسے ویسا ہی مانو، ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تم ایمان و تقویٰ اختیار کئے رہو، تو تمہیں بہت بڑا ثواب ملے گا، جو تمہارے وہم و گمان سے وراء ہوگا، اس نعمت کو ہاتھ سے نہ جانے دو،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** زمانہ رسالت ہی میں مخلصین و منافقین کی چھانٹ ہوگئی تھی، کہ کوئی منافق صحابہ پر چھپا نہ رہا تھا، جیسا کہ حَتّٰی یَمِیْزَ الخ سے معلوم ہوا، بلکہ ایک بار حضور انور ﷺ نے بر سر منبر فرما دیا تھا کہ فلاں فلاں منافق ہے، دیکھو ہماری کتاب "جاء الحق" حصہ اول، اب جو شخص کہے (کہ سوائے چار پانچ کے باقی سارے صحابہ چھپے منافق تھے، جن کا نفاق حضور انور ﷺ کی وفات کے بعد ظاہر ہوا کہ وہ سیدنا علی کے مقابلہ میں خلافت کے دعویدار یا دعویداروں کے طرفدار بن گئے) وہ خود منافق ہے اور اس آیت کا صاف انکاری ہے، کیسے ہو سکتا ہے، کہ رب تعالیٰ حضور انور ﷺ کی وفات تک اس بات کو صاف نہ کردے، **دوسرا فائدہ:** اللہ تعالیٰ نے حضور انور کو قیامت تک کے ہر شخص کے ہر حال کی خبر دے دی، حضور انور ﷺ ہر ایک کا ایمان و کفر اور گنہگاری و پرہیزگاری اچھی طرح جانتے ہیں، تمام عالم کے ایمان کی نبض پر حضور انور ﷺ کا ہاتھ ہے، جیسا کہ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ الخ سے معلوم ہوا، ع

اک ماہ مدن، گورا سا بدن، نیچی نظریں، کل کی خبریں

شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر عزیزی میں آیت وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَہِیْدًا (بقرہ: ۱۴۳) کی تفسیر میں فرمایا کہ حضور انور ﷺ ہر ایک کے ایمان و اعمال کے مدارج کو جانتے ہیں، تب ہی تو آپ قیامت میں سب کی گواہی دیں گے، اس کی نہایت نفیس تحقیق ہماری کتاب "جاء الحق" حصہ اول میں ملاحظہ فرمایئے، **تیسرا فائدہ:** اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو ساری خلق کی ایسی پوشیدہ باتوں پر مطلع فرمایا ہے جو دوسروں کو نہیں معلوم ہو سکتیں، دیکھو سیدنا عبد اللہ کے باپ حذافہ ہی ہیں نہ کہ کوئی اور، یہ ایسی بات ہے جو عبد اللہ کی ماں کے سوا کوئی نہیں جان سکتا، مگر حضور انور ﷺ باذنِ پروردگار اس پر بھی مطلع ہیں، حدیث شریف میں ہے کہ اس واقعہ کے بعد عبد اللہ کی والدہ اپنے بیٹے عبد اللہ پر بہت ناراض ہوئیں اور بولیں کہ تم نے تو آج مجھے بدنام کر دیا تھا، اگر زمانہ جاہلیت میں میں نے کوئی جرم کیا ہوتا، تو آج میں بھرے مجمع میں کیسی رسوا ہوتی، ہم لوگوں نے دورِ جاہلیت میں بڑے بڑے گناہ کئے ہیں، ان سے پوچھ پوچھ کر کیوں ہمارے پردے فاش کراتے ہو! میرے ایک دوست حاجی عبد اللطیف ایوب بھورانے جو میرے شیخ الدلائل بھی ہیں، ایک شعر بہت وجد آفریں فرمایا ہے، عرض کرتے ہیں یا رسول اللہ، شعر

تمہیں رب تعالیٰ یحیٰ یعنی عقل فعال کی خوشخبری دیتا ہے۔ جو عیسیٰ (قوت قلبی) کی تصدیق کرے گا۔ اور ان پر ایمان لائے گا یہ قلب گویا کلمتہ اللہ ہے۔ کیونکہ وہ جسمانی آلائش سے پاک ہے۔ اور وہ یحیٰ تمام قوموں کا سردار ہوگا۔ اور حصور یعنی طبیعت جسمانی کی مباشرت' اور بدنی گندگیوں سے اپنے کو دور رکھے گا۔ اور نبی یعنی معرفت الٰہیہ اور حقیقت کلیہ اخلاق جمیلہ۔ اور اچھی تدابیر کی خبر دے گا اور صالحین یعنی قرب الٰہی کی صلاحیت رکھنے والوں میں سے ہوگا (ابن عربی) گویا فکر نفس مطمئنہ کو دیکھ کر رب سے عقل مانگتی ہے۔ یہ دعا اس کی قبول ہوتی ہے۔ اور رب تعالیٰ کی طرف یہ عطیہ ملتا ہے۔

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ مقبول بندوں کی دعا سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ انہونی بات ہو جاتی ہے۔ دیکھو بانجھ عورت جو نا قابل اولاد ہو اور بالکل بڈھے مرد سے جو بالکل قابل اولاد نہ رہے۔ بچہ پیدا ہونا انہونی بات ہے مگر ایک مقبول کی دعا سے یہ دونوں ناممکن باتیں ممکن نہیں بلکہ واقع ہوگئیں۔ بعض لوگ جو بزرگوں سے اولاد مانگتے ہیں ان کا مطلب یہ ہی ہوتا ہے کہ ان کی دعا سے رب تعالیٰ اولاد دے دیتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ نبی ولی کچھ نہیں دیتے۔ وہ سب کچھ دیتے ہیں باذن پروردگار رب فرماتا ہے اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ (التوبۃ: ۷۴) حضرت ربیعہ ابن کعب اسلمی نے حضور سے جنت مانگی اور پالی۔ اولاد جنت سے بڑھ کر نہیں لہٰذا ان سے اولاد مانگی جاسکتی ہے۔ حضرت جبرائیل نے بی بی مریم سے کہا تھا کہ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (مریم:۱۹) میں تمہیں ستھرا بیٹا دوں گا نیز فرماتے ہیں کہ بزرگوں کی دعا سے ملا ہوا بچہ بہت نیک و صالح ہوتا ہے۔ اس میں دعا کرنے والے کا اثر ہوتا ہے۔ دیکھو بی بی حنہ ولیہ کی دعا سے کلمتہ اللہ جیسا فرزند پیدا ہوا۔ زکریا علیہ السلام کی دعا سے یحیٰ علیہ السلام جیسا فرزند پیدا ہوا۔ ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے اسماعیل جیسا نور نظر پیدا ہوا۔ یہ عظمتیں دعا کرنے والوں کی برکتوں سے حاصل ہوئیں۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِىْ
کہا اے رب میرے کیسے ہوگا واسطے میرے لڑکا حالانکہ بیشک پہنچ گیا مجھ کو بڑھاپا اور بیوی میری
بولا اے میرے رب میرے لڑکا کہاں سے ہوگا مجھے تو پہنچ گیا بڑھاپا اور میری عورت
عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْٓ
بانجھ ہے فرمایا اسی طرح اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے عرض کیا اے رب میرے بنا واسطے میرے
بانجھ فرمایا اللہ یوں ہی کرتا ہے جو چاہتا ہے عرض کی اے میرے رب میرے لئے کوئی نشانی کردے
اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ
نشانی فرمایا نشانی تمہاری یہ ہے کہ نہ کلام کروگے تم لوگوں سے تین دن مگر اشارے سے اور یاد کرو
فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تین دن تو لوگوں سے بات نہ کرے مگر اشارے سے اور اپنے

موقعہ مختلف ہیں، مگر یہ جواب کچھ ضعیف سا ہے، کیونکہ اس آیت کے شانِ نزول سے معلوم ہوا کہ حضور انور ﷺ کو ازل ہی میں دنیا بھر کے مخلص منافق مومن دکھا دیئے گئے تھے، اور آپ اول ہی سے سب کو پہچانتے ہیں، دوسرا یہ کہ لَا تَعْلَمُهُمْ میں حضور انور ﷺ سے خطاب نہیں ہے بلکہ عام قرآن خواں مسلمان سے، یعنی اے مسلمان ان منافقوں کو تو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں تاکہ آیات متعارض نہ ہوں، تیسرا یہ کہ لَا تَعْلَمُهُمْ میں حضور انور ﷺ ہی سے خطاب ہے، مگر اس کا مقصد حضور انور ﷺ کے علم کی نفی نہیں بلکہ منافقوں پر اظہارِ غضب ہے، بلاتشبیہ باپ نالائق بیٹے کو مارنے لگے، ماں سفارش کرے، تو باپ کہتا ہے کہ اس موذی کو تم نہیں جانتیں، اسے تو میں ہی جانتا ہوں، حالانکہ ماں اس کی نالائقی کو جانتی ہے، مقصد یہ ہوتا ہے کہ تم اسے چھوڑ او مت، میں ضرور سزا دوں گا، ایسے ہی یہ بھی ہے، لہٰذا آیات میں تعارض نہیں، یہ جواب قوی ہے، اللہ تعالیٰ نے حضور انور ﷺ کو لوگوں کے انجام و آغاز پر مطلع فرمایا ہے تو کیسے ہوسکتا ہے کہ حضور انور ﷺ منافقوں کے موجودہ حالات سے بے خبر ہوں، اس کی تحقیق ہماری کتاب ''جاء الحق'' حصہ اول میں ملاحظہ فرمائیے، **تیسرا اعتراض:** اس آیت میں فرمایا گیا کہ اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تمہیں غیب پر اطلاع نہیں بخشتا، مگر بغیر غیب جانے ایمان نہیں ملتا، رب تعالیٰ کی ذات و صفات، فرشتے، جنت و دوزخ، قیامت وغیرہ سب ہی غیب ہیں، ان سب ہی پر ایمان لانا ضروری ہے، بغیر غیب جانے ماننا اور ایمان لانا کیسا؟ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گذر گیا، کہ غیب دو قسم کے ہیں، ایک قسم کے غیب پر ایمان لانا ضروری ہے، ہر مومن کو اس کی اطلاع دی گئی، دوسرا وہ جو رب تعالیٰ کا خاص غیب ہے، اس پر ایمان لانا ضروری نہیں، نہ ان کی اطلاع عام مسلمانوں کو دی گئی، آیات ثبوت میں اور قسم کا غیب مراد ہے، اور آیات نفی میں دوسری قسم کا غیب مراد، **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ رسولوں کو چن لیتا ہے، اس میں یہ کب فرمایا گیا کہ انہیں علم غیب بھی دیتا ہے، آیت میں رسولوں کو علم غیب دینے کا بالکل ذکر نہیں، **جواب:** ہم تفسیر میں عرض کر چکے ہیں کہ لٰكِنَّ اس چیز کا ثبوت کرتا ہے جس کی پہلے پر نفی ہوئی ہو، جبکہ پہلے علم غیب دینے کی نفی ہوئی، جس سے شبہ ہوسکتا تھا کہ شائد لِیُطْلِعَكُمْ کے خطاب میں حضور انور ﷺ بھی داخل ہوں، اور آپ کو بھی علم غیب نہ دیا گیا ہو، تو ارشاد ہوا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ الخ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو چن لیتا ہے، کاہے کے لئے چن لیتا ہے، اس کے لئے جس کی ابھی نفی ہو چکی یعنی عطائے علم غیب کے لئے، میں کہتا ہوں کہ میں نے کسی کو نہ بلایا، لیکن زید کو میں نے منتخب کیا، کاہے کے لئے منتخب کیا بلانے اور دعوت دینے کے لئے، نہ کہ دوسرے کام کے لئے، لہٰذا یہ چناؤ عطائے علم غیب کے لئے ہے، **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ عطائے علم غیب کے لئے صرف رسولوں کا انتخاب ہوتا ہے، تو کیا اولیاء کو غیب نہیں سکھایا بتایا جاتا؟ **جواب:** اس کا جواب تفسیر روح المعانی نے اسی جگہ یہ دیا ہے کہ قوت قدسیہ والے اہل کشف کو بھی غیوب پر مطلع فرمایا جاتا ہے، مگر وہ بواسطہ نبی ہوتا ہے نہ کہ بلاواسطہ، یہاں بلاواسطہ علم غیب کے لئے انتخاب کا ذکر ہے لہٰذا یہ آیت کریمہ علم اولیاء کے خلاف نہیں، اولیاء اللہ کا علم غیب قرآنی آیات سے ثابت ہے، دیکھو ہماری کتاب ''جاء الحق'' حصہ اول،

ولادت کا پوچھنا ہے۔ اور یہ ہی قول قوی تر ہے۔ یعنی عرض کیا کہ اے میرے رب فرزند کہاں سے ہوگا۔ اس بانجھ اور بوڑھی بیوی سے یا مجھے دوسرا نکاح کرنا ہوگا۔ یا اے رب میرے فرزند کیسے ہوگا۔ میری جوانی واپس کی جائے گی۔ اور میری بیوی کا حال بدلا جائے گا۔ یا اسی طرح اس معنی پر قَالَ کَذٰلِکَ کا جواب نہایت چسپاں ہے۔ (کبیر روح المعانی) بعض لوگوں نے اور ضعیف وجوہ بھی بیان کئے ہیں جن کا ذکر بے فائدہ ہے۔ مثلاً کسی نے کہا کہ آپ کو شیطان نے عرض کیا کہ یہ بشارت فرشتہ کی آواز نہ تھی۔ بلکہ شیطانی آواز تھی۔ آپ نے دلی اطمینان کے لئے یہ سوال فرمایا مگر یہ غلط ہے پیغمبر پر فرشتے اور شیطان کی آواز مشتبہ نہیں ہوسکتی۔ خیال رہے کہ ناسمجھ بچے کو صبی کہتے ہیں۔ سمجھدار کو غلام قریب بلوغ کو مراہق' بالغ کو شاب ادھیڑ کو کہول اور بڈھے کو شیخ۔ غلام کہنے میں ادھر اشارہ ہے کہ وہ فرزند صاحب عمر ہوگا۔ وَقَدْ بَلَغَنِیَ الْکِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ یہ وجہ سوال ہے اور بَلَغَنِیَ الْکِبَرُ ترکیب قلوب ہے۔ اصل عبارت یوں تھی وَقَدْ بَلَغْتُ الْکِبَرَ (خازن) بعض نے فرمایا کہ اس سے بڑھاپے اور ضعف کا غلبہ بیان کرنا مقصود ہے۔ خیال رہے کہ یہ واؤ حالیہ ہے۔ اور جملہ ضمیر متکلم سے حال۔ کبر بمعنی بڑائی ہے۔ بڑائی قد وقامت سے بھی ہوتی ہے۔ اور درجہ عزت سے بھی۔ اور زمانہ عمر کے لحاظ سے بھی۔ یہاں اخیری معنی مراد ہیں۔ یعنی بڑھاپا آپ کی عمر اس وقت ایک سو بیس سال تھی۔ اور بیوی صاحبہ کی عمر اٹھانوے سال بعض مفسرین نے فرمایا کہ آپ کی عمر ننانوے سال تھی۔ بعض کے نزدیک بانوے سال۔ بعض کے نزدیک پچاسی سال بعض کے نزدیک پچھتر سال۔ بعض نے کہا ستر بعض نے کہا ساٹھ مگر پہلا قول زیادہ قوی ہے۔ (روح المعانی) عَاقِرٌ عقر سے بنا بمعنی اصل اور جڑ اسی لئے کہا جاتا ہے عَقَرْتُ النَّخْلَ۔ میں نے کھجور کو جڑ سے اکھیڑ ڈالا۔ ذبح کرنے اور پاؤں کاٹنے کو بھی عقر کہتے ہیں۔ یعنی اصل فنا کر دینا۔ کہا جاتا ہے۔ عقرت العبیر میں نے اونٹ ذبح کر دیا رب تعالیٰ فرماتا ہے فَعَقَرُوْهَا (الشمس: ۱۴) اور فرماتا ہے فتعاطی فَعَقَرَ (قمر: ۲۹)۔ بانجھ عورت کو اسی لئے عاقرہ کہتے ہیں کہ وہ نطفے کی اصل کو برباد کر دیتی ہے۔ روح المعانی نے فرمایا کہ عقر بمعنی کاٹنا ہے۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ رمل عاقر اس زمین کو کہتے ہیں جس میں پیداوار نہ ہوسکے یعنی اے رب مجھے بڑھاپا پہنچ گیا اور میری بیوی بڑھاپے کے ساتھ بانجھ بھی ہے پھر بیٹا کیونکر ہوگا قَالَ کَذٰلِکَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ یہ ان کے سوال کا جواب ہے قَالَ کا فاعل رب تعالیٰ ہے۔ یا فرشتے کَذٰلِکَ یا تو یکون پوشیدہ کے متعلق ہے اور اللّٰهُ یَفْعَلُ نیا جملہ ہے۔ یا یہ پورا ایک جملہ ہے۔ یعنی اے زکریا یہ عطائے فرزند بلا فرق ایسے ہی ہوگی۔ نہ تم جوان کئے جاؤ گے۔ اور نہ تمہیں دوسرا نکاح کرنا ہوگا۔ کیونکہ اللہ جو چاہے کرے یا اے زکریا اللہ اسی طرح جو چاہے کرتا ہے۔ تم تعجب مت کرو۔ چونکہ زکریا علیہ السلام چاہتے تھے کہ استقرار حمل سے ہی عبادت اور شکر میں مشغول ہو جاؤں۔ اور حمل کی علامت حیض کا بند ہونا ہے۔ حضرت ایشاع کو بڑھاپے کی وجہ سے حیض آتا ہی نہ تھا۔ اور اگر آتا بھی ہوتا تب بھی حمل کا پتہ کچھ عرصہ بعد چلتا۔ اس لئے آپ نے بیوی صاحبہ کے حمل کی علامت رب سے پوچھی کہ عرض کیا قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰیَةً اے مولیٰ میرے لئے اس حمل کی کوئی نشانی مقرر فرما دے۔ کہ میں وہ نشانی پا کر شروع حمل سے ہی شکر میں مشغول ہو جاؤں۔ دیگر علامات کے ظہور تک مجھے انتظار نہ کرنا پڑے۔ خیال رہے کہ اجعل جعل سے مشتق ہے۔ اور جعل متعدی بیک مفعول بھی ہوتا ہے۔ اور بدو مفعول بھی۔ پہلی صورت میں آیۃ مفعول ہے۔ اور لی اس کا حال۔ اور دوسری صورت میں آیۃ مفعول اول ہے۔ اور لی مفعول دوم۔ قَالَ اٰیَتُکَ

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ
اور ہرگز نہ گمان کریں وہ لوگ جو کنجوسی کرتے ہیں اس میں جو اللہ نے انہیں
اور جو بخل کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ نے انہیں اپنے
مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ
دی اپنے فضل سے اس کو اپنے لئے اچھا بلکہ وہ ان کے لئے برا ہے عنقریب طوق ڈالے
فضل سے دی ہرگز اسے اپنے لئے اچھا نہ سمجھیں بلکہ وہ ان کے لئے برا ہے عنقریب وہ جس
مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ
جائیں گے اپنی بخل کی ہوئی چیز کا قیامت کے دن اور اللہ ہی کے لئے ہے میراث آسمانوں اور
میں بخل کیا تھا قیامت کے دن ان کے گلے کا ہار ہوگا اور اللہ ہی وارث ہے آسمانوں اور
وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾
زمین کی اور اللہ اُس پر خبردار ہے جو تم کرتے ہو
زمین کا اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے خبردار ہے

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق**: پچھلی آیت میں مومن و منافق کی دنیاوی چھانٹ کا ذکر تھا، اب اس آیت کریمہ میں ان کی اخروی چھانٹ کا ذکر ہے، کہ مومن عملاً سخی ہوتا ہے منافق عموماً بخیل، تو قیامت میں عموماً منافقین کے گلوں میں ان کے مال بطور ہار پڑے ہوں گے، مومنین کے گلے کھلے ہوں گے، **دوسرا تعلق**: پچھلی آیت میں لوگوں کو ایمان و تقویٰ کا حکم دیا گیا تھا، اب زکوٰۃ و خیرات کا حکم دیا جا رہا ہے جو تقویٰ کا رکن اعلیٰ ہے، گویا اجمال کے بعد قدرے تفصیل ارشاد ہو رہی ہے، **تیسرا تعلق**: پچھلی آیات میں مسلمانوں کو جہاد کی رغبت متعدد طریقوں سے دی گئی، جہاد میں جان راہِ خدا میں ہی خرچ کی جاتی ہے، اب راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کی ترغیب ہے، گویا جانی جہاد کے بعد مالی جہاد کا حکم ہے، **چوتھا تعلق**: بہت دور سے جہاد کی ترغیب اور جہاد نہ کرنے والوں کی برائیوں کا ذکر چلا آ رہا ہے، اور جہاد میں پہلے مال خرچ کیا جاتا ہے، ہتھیار وغیرہ خرید کئے جاتے ہیں پھر جان کے خرچ کی باری آتی ہے، اسی لئے اب ان لوگوں کی مذمت کا تذکرہ ہے جو ایسے موقعوں پر بخل سے کام لیتے ہیں،

شانِ نزول

حضرت امام جعفر صادق و ابن مسعود، شعبی، سدی وغیرہم فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ان مالدار مسلمانوں کے متعلق نازل ہوئی

ہوئے اس کا عطف عشی پر صحیح نہیں۔ یعنی صبح شام رب کی تسبیح پڑھو۔ اور اس کی پاکی بولو۔

خلاصہ تفسیر

زکریا علیہ السلام نے جب فرزند کی بشارت سنی تو عرض کیا کہ اے مولیٰ میرے فرزند کیونکر ہوگا۔ میں تو ایک سو بیس سال کا بوڑھا ہوں اور میری بیوی اٹھانوے سال کی بڈھی ہونے کے علاوہ بانجھ بھی ہیں۔ آیا ہماری حالتوں میں تبدیلی کی جائے گی۔ یا ہم دونوں اسی طرح رہیں گے اور فرزند ہو جائے گا۔ جواب ملا کہ اے زکریا تمہارے اولاد ایسے ہی ہوگی۔ نہ تمہاری جوانی لوٹے گی اور نہ تمہیں دوسرے نکاح کی ضرورت پیش آئے گی اور نہ تمہاری بیوی میں تبدیلی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ وہ ہر طرح قادر ہے تب عرض کیا کہ اے میرے مولیٰ میری خواہش یہ ہے کہ میرے لئے میری بیوی کے حاملہ ہونے پر کوئی نشانی مقرر کر دی جائے۔ تاکہ میں شروع حمل سے ہی تیرے ذکر میں مشغول ہو جاؤں اور مجھے ظہور حمل تک انتظار نہ کرنا پڑے۔ کیونکہ میری بیوی کو تو حیض آتا ہی نہیں۔ تاکہ اس کی بندش حمل کی علامت ہو۔ تب رب نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے لئے علامت یہ ہے کہ تم زوجہ کے حاملہ ہوتے ہی تین دن تک لوگوں سے کلام نہ کر سکو گے۔ بجز اشاروں کے اور بات پر تمہیں قدرت نہ ہوگی۔ اور اپنے رب کا ذکر خوب کرنا اور صبح و شام تسبیح و تحلیل میں مشغول رہنا۔ خیال رہے کہ چونکہ یحیٰی علیہ السلام بڑے پائے کے عابد و زاہد اور تارک الدنیا اور لوگوں سے بے تعلق تھے۔ اسی لئے ان کے آنے کی علامت بھی رب کی عبادت اور دنیا سے بے تعلقی قرار دی گئی۔ اور انسان کی قوتیں رب کے قبضہ میں ہیں جب چاہے معطل کر دے۔ جب چاہے واپس فرما دے۔ بعض لوگوں کو شب کوری ہوتی ہے۔ کہ ان کی آنکھ رات میں نہیں دیکھ سکتی چمگادڑ کی آنکھ رات کو خوب دیکھتی ہے دن میں کام نہیں کرتی۔ آنکھ ایک ہے مگر ایک وقت کام کی ہے دوسرے وقت بیکار بعض لوگوں کی نگاہ قریب کو دیکھ لیتی ہے دور کے لئے بے کار بعض کی نگاہ اس کے برعکس لوگ موٹی چیز کو دیکھ لیتے ہیں باریک چیز انہیں نظر نہیں آتی۔ پتہ لگا کہ ہماری قوتیں رب کے اختیار میں ہیں۔ ایسے ہی ہو سکتا ہے کہ زکریا علیہ السلام کی زبان شریف تسبیح و تبلیغ میں مشغول رہے۔ مگر کلام نہ کر سکے اس پر تفصیلی گفتگو سوال و جواب میں کی جائے گی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** فرزند کی خواہش سنت انبیاء ہے۔ خصوصاً جب خدمت دین کی نیت سے ہو۔ قرآن کریم نے زکریا علیہ السلام کا یہ قول نقل فرمایا۔ رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ (انبیاء:۸۹) نیز فرمایا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا (مریم:۶) نیک بیٹا ماں باپ کے لئے صدقہ جاریہ ہے۔ کہ زندگی اور قبر و حشر میں کام آتا ہے۔ **دوسرا فائدہ:** انبیائے کرام بارگاہ الٰہی میں بڑی عزت والے ہیں۔ کہ ان کے آنے سے پہلے ان کی آمد کی خبر دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے فرشتوں کو خبر دے دی گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کی خبر پہلے ہی سے دنیا میں پھیل چکی تھی۔ ایسے ہی یحیٰی علیہ السلام کی خبر اس کی علامتیں وغیرہ پہلے ہی سے ظاہر کر دی گئیں۔ ہمارے نبی ﷺ کی شہرت تمام جہان میں پہلے ہی سے ہو چکی تھی۔ **تیسرا فائدہ:** نعمت کی [illegible] آدمی خدا کا [illegible] شکر ادا کرنا سنت انبیاء۔ دیکھو یحیٰی علیہ السلام کی

طوق ہے، خواہ قدرتی ہو، جیسے کبوتر کے گلے کا طوق یا مصنوعی جیسے ہار ہنسلی وغیرہ، کبھی لازم چیز کو طوق کہہ دیا کرتے ہیں، کہا جاتا ہے قرض میرے گلے کا ہار بن گیا یا فلاں کا احسان میرے گلے کا طوق ہے، اس فعل میں ضمیر ھم پوشیدہ ہے جو اس کا پہلا مفعول ہے اور مَابَخِلُوْا الخ دوسرا مفعول، اگر مَابَخِلُوْا سے مراد وہ مال ہے جس میں بخل کیا گیا تو طوق سے حقیقی معنی مراد ہیں کہ وہ مال سانپ کی شکل میں بخیل کی گردن میں پڑے گا، اسے ڈسے گا، اور اگر مَابَخِلُوْا الخ سے مراد علم ہے تو طوق سے مجازی معنی مراد ہیں، يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فرما کر دو باتیں بتائی گئیں، ایک یہ کہ بخیل کی قیامت میں پردہ پوشی نہ ہوگی بلکہ اس طوق کے ذریعہ اسے سارے میں رسوا کیا جائے گا، دوسرے یہ کہ بخل کا اصلی عذاب تو بعد قیامت ہوگا، عارضی سزا اس کی یہ ہوگی کہ پچاس ہزار سال کے دن میں اسے یہ طوق ڈالے ہوئے پھرنا ہوگا یعنی بخیل لوگوں کو قیامت کے دن ان کے بخل کئے ہوئے مال کا طوق و ہار پہنایا جائے گا یا بخیل علماء کا بخل کیا ہوا علم قیامت کے دن گلے کا طوق بن کر انہیں لازم ہو جائے گا جس کے وبال سے وہ چھوٹ نہ سکیں گے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جس عالم سے دینی مسئلہ پوچھا جائے، اور وہ بلا مانع شرعی نہ بتائے، علم دین چھپائے، تو قیامت میں اس کے منہ میں آگ کی لگام دی جائے گی (تفسیر کبیر) وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ نیا جملہ ہے جس میں بخیلوں کی نادانی کا ذکر ہے، مِيْرَاثُ مصدر ہے، جیسے مِيْعَاد، میلاد، معراج وغیرہ، میراث، مِوْرَاثٌ تھا، میم کے کسرہ کی وجہ سے واو یاء بن گیا، اس کا مادہ و ر ث ہے، کسی چیز کا دوسرے کی طرف بغیر کسی عقد کے منتقل ہو جانا ورثہ کہلاتا ہے، اس جملہ کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ آسمان و زمین کی وہ چیزیں جو ایک دوسرے کو بطور میراث ملتی ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں، نہ مال تمہارا اپنا ہے نہ علم تمہارا اپنا، اس صورت میں آیت بالکل ظاہر ہے دوسرے یہ کہ آسمان و زمین والے آخر فنا ہوں گے اور ان کی ظاہری ملکیتیں ختم ہوں گی، ان کی مملوک چیزیں ظاہری طور پر بھی اللہ ہی کی رہ جائیں گی، جیسے فانی مردہ کا مال زندہ وارثوں کا ہو جاتا ہے، اس صورت میں اسے میراث فرمانا مجازاً ہے، یعنی بخیل بڑے بے وقوف ہیں، وہ بخل کریں یا سخاوت مال وغیرہ ان کے پاس رہیں گے نہیں، اللہ ہی کے ہیں، اللہ ہی کے رہیں گے، تو کیوں بخل کرتے ہیں، خوشی سے اللہ ہی کے نام پر خرچ کر دیں، ورنہ مال تو فنا ہو جائے گا، اس کا وبال رہ جائے گا، (تفسیر کبیر و روح المعانی) وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ، یہ جملہ وعید بھی ہے وعدہ بھی ہے، بشارت بھی ہے انذار بھی، یعنی اے سخیو! جو کچھ تم سخاوت کرتے ہو ہمیں اس کی خبر ہے، تمہیں پورا پورا بدلہ مع انعام کے عطا فرمائے گا اور اے کنجوسو! تمہارے بخل و کنجوسی کی رب تعالیٰ کو خبر ہے اپنا حال سنبھالو ورنہ مار کھاؤ گے،

خلاصہ تفسیر

اس آیت کریمہ کی چار پانچ تفسیریں ہیں جو ابھی ابھی عرض کی گئیں، ہم ان میں سے ایک تفسیر کا خلاصہ عرض کرتے ہیں، وہ لوگ جو اس مال میں بخل و کنجوسی کرتے ہیں، جو انہیں اللہ نے محض اپنے فضل سے دیا نہ کہ محض ان کے کمال سے، اس طرح کہ مال کے شرعی حقوق ادا نہیں کرتے، زکوٰۃ اور دیگر واجب صدقے نہیں دیتے، خود نہیں کھاتے پیتے، بال بچوں کو تنگی میں رکھتے ہیں، ماں باپ، عزیز و اقارب پر ان کی حاجت کے باوجود خرچ نہیں کرتے، مسلمانوں کو اڑی ضرورت میں بھی مال نہیں دیتے وہ

بشارت پا کر تعجب اور اپنے بڑھاپے کا ذکر کیوں کیا۔ تمہاری زبان ہی بند کر دی جائے گی (خازن و کبیرہ وغیرہ) مگر یہ جواب صحیح نہیں۔ کیونکہ بشارت فرزند پر تعجب اور اپنے بڑھاپے کا ذکر تو ابراہیم علیہ السلام نے بھی کیا تھا کہ فرمایا تھا۔ اَبَشَّرْ تُمُوْنِیْ عَلٰی اَنْ مَّسَّنِیَ الْکِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ (حجر:۵۴) حضرت سارہ نے بھی یہ ہی عرض کیا تھا۔ ءَ اَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّھٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا (ھود:۷۲) اگر اس پر عتاب ہوتا تو ان پر بھی ہونا چاہیے تھا۔ دوسرا یہ کہ آپ کا علامت مانگنا ادائے شکر اور عبادت کے لیے تھا۔ اس نشانی سے ان کے ارادہ کی تائید فرمائی گئی کہ چونکہ آپ ہمارا ذکر چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہم صرف ذکر میں مشغول رکھنے کے لئے۔ دوسری گفتگو سے آپ کی زبان ہی بند کر دیں گے۔ اگر عتاب کے لئے زبان بند ہوتی تو زبان شریف بالکل بند ہو جاتی۔ تیسرا یہ کہ جیسی نعمت ویسا اس کا نشان۔ سورج کی بشارت صبح صادق کے نور سے دی جاتی ہے۔ کہ سورج نور ہے۔ تو نور ہی اس کا مبشر ہے۔ بارش کی بشارت بادل سے دی جاتی ہے۔ رات کی آمد افق کی سیاہی سے بتلائی جاتی ہے۔ غرض کہ ہر شے کا نشان اس کے مطابق ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام جلالی پیغمبر تھے۔ تو ان کی آمد پر قتل وغیرہ نشانی ظاہر ہوئی۔ ہمارے نبی ﷺ رحمت عالم ہیں۔ اس لئے ان کی آمد پر بارش اور خدا کی دوسری نعمتوں کا نزول ہوا۔ یحییٰ علیہ السلام تارک الدنیا رب کے ذاکر خوف الٰہی میں ہمیشہ رونے والے تھے کہ آپ کی آنکھوں میں ہمیشہ آنسو رہتے تھے۔ اور کبھی ٹھٹھا مار کر نہ ہنسے اور آپ دنیا کے پانچ رونے والوں میں سے ایک ہیں۔ لہٰذا آپ کی علامت بھی ایسی ہی مقرر ہوئی۔ چوتھا یہ کہ آپ کی زبان بندی ہوئی ہی نہ تھی۔ خود اپنی خوشی سے کلام نہ فرمایا۔ پانچواں یہ کہ آپ نے کلام کا روزہ رکھا تھا۔ جیسا کہ ہم نے تفسیر میں عرض کر دیا۔ خیال رہے کہ حضرت آدم کی آمد کی دھوم صرف فرشتوں میں ڈالی گئی۔ حضرت ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام کی آمد کی خبریں صرف ایک ملک میں دی گئیں۔ جناب یحییٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کا چرچہ صرف ایک خاندان میں کیا گیا۔ مگر حضور ﷺ کی ولادت پاک کی دھوم تمام جہانوں میں مچا دی گئیں کہ پہلے تمام جہان میں تین سال تک بارش نہ ہوئی۔ حمل شریف کی شب تمام جگہ خوب بارشیں ہوئیں۔ برکتیں نازل ہوئیں صعوہ خشک ہوا۔ ایران کی ایک ہزار سال کی روشن آگ بجھ گئی۔ قصر کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے۔ فقیر نے یہ محل بغداد کے پاس مسلمان پاک میں دیکھا ہے۔ غرضیکہ عالم میں کوئی جگہ نہ رہا۔ جہاں حضور ﷺ کی بشارت نہ پہنچی ہو۔ رحمۃ اللعالمین ہیں۔ عالمین کو آپ کی اطلاع دے دی گئی۔

تفسیر صوفیانہ

پہلے عرض کیا جا چکا کہ صوفیائے کرام کے نزدیک فکر صحیح گویا ذکریا ہے اور عقل صحیح گویا یحییٰ۔ وہ بطریق اشارہ اس کی تفسیر یوں کرتے ہیں کہ زکریائے فکر نے عقل کی بشارت پا کر بارگاہ الٰہی میں ذکر کیا کہ میں اپنی تمام منازل طے کر کے اخیری منزل تک پہنچ چکی اور میری بیوی یعنی روح نفسانی نور سے خالی۔ اور دنیا میں پھنسی ہوئی گویا بانجھ ہے۔ ہم دونوں سے عقل کا یحییٰ کیونکر پیدا ہوگا۔ اور اس نور محض کے حصول کی علامت کیا ہوگی۔ تو خطاب زبانی ہوا۔ کہ اے فکر اس نور کے ظہور کی پہچان یہ ہے کہ تو اپنے عمر کے تین دن جن میں ہر دن دس سال کا گویا دس سال کی عمر سے چالیس سال کی عمر تک بدنی قوتوں کے ساتھ مشغولیت اور ان کی فضول لذتوں سے دور رہے گی۔ ہاں ان کے ساتھ مخفی اشارہ کیا کرے گی۔ اور ان سب اعضاء کو ان کی خاص تسبیح پڑھنے کا حکم کرے گی اور تو [illegible] اپنی تسبیح [illegible] مشغول [illegible] گی (ابن عربی) خلاصہ یہ کہ جسے رب کی طرف

اعتراضات

پہلا اعتراض: تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ لَا يَحْسَبَنَّ کا پہلا مفعول بُخْلَهُمْ پوشیدہ ہے، حالانکہ لَا يَحْسَبَنَّ افعال قلوب میں سے ہے، اس کا مفعول پوشیدہ نہیں ہو سکتا، **جواب:** افعال قلوب کا مفعول پوشیدہ ہونا اس وقت منع ہوتا ہے جبکہ وہ قرینہ سے بھی معلوم نہ ہو سکے، یہاں يَبْخَلُونَ سے معلوم ہو رہا ہے، **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ بخیل کا مال طوق بن کر اس کے گلے میں پڑے گا، مگر دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مال گرم کر کے بخیل کے جسم پر رکھا جائے گا، اور اس سے داغا جائے گا فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ (توبہ: ۳۵) ان میں سے کون سی آیت صحیح ہے؟
جواب: دونوں آیات درست ہیں، طوق کا عذاب قیامت کے دن ہوگا، اور داغنے کا عذاب دوزخ میں پہنچ کر یا قیامت ہی میں پہلے داغنے کا عذاب ہوگا، پھر طوق کا، یا سونے چاندی سے داغا جائے گا اور دوسرا تجارتی مال طوق بن کر گلے میں پڑے گا،
تیسرا اعتراض: اونٹ گائے بیل وغیرہ طوق کیسے بنیں گے؟ **جواب:** مختلف بخیلوں کی مختلف سزائیں ہیں، جانوروں کا بخیل قیامت میں جانور لادے پھرے گا اور دوزخ میں ان سے روندا جائے گا، سونے چاندی کا بخیل داغا جائے گا، دوسرے تجارتی مالوں کا بخیل طوق پہنایا جائے گا، **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں بخیلوں کو رسوا کیا جائے گا، مگر حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ میری امت کے گناہ چھپائے گا، انہیں رسوائی سے بچائے گا، آیت و حدیث میں مطابقت کیسے ہو؟ **جواب:** اس امت کے خفیہ گناہ قیامت میں ظاہر نہ کئے جائیں گے، ان کا حساب بھی خفیہ ہی ہوگا، مگر اعلانیہ گناہ کا وہاں اظہار ہو جائے گا، یہ اظہار رب تعالیٰ نے نہ کیا بلکہ گنہگار نے خود کیا، نہ وہ دنیا میں بے حیائی سے علانیہ گناہ کرتا، نہ آخرت میں رسوا ہوتا، اللہ تعالیٰ اپنا خوف اور نبی اکرم ﷺ کی شرم ہر مسلمان کو عطا فرمائے،
پانچواں اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانی زمینی چیزوں کا ابھی مالک نہیں ہے، بلکہ موجودہ مالکوں کے مرنے کے بعد بطور وراثت مالک ہوگا کیونکہ وارث میراث کا مالک جب ہی ہوتا ہے جب مورث مر جائے (آریہ) **جواب:** اس کا جواب ہماری تفسیر سے معلوم ہو گیا کہ یا تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ آسمانی زمینی چیزیں جو میراث میں تم ایک دوسرے سے لیتے ہو وہ سب اللہ تعالیٰ کی ہیں، تب تو کوئی اعتراض ہی نہیں، یا مطلب یہ ہے کہ جیسے جب مورث مر جاتا ہے، تو زندہ وارث اس کی چیز کے مالک ہو جاتے ہیں، ایسے ہی تمہیں فنا ہے، ہم حی و باقی ہیں، لہٰذا جن چیزوں پر تم آج قابض و مالک ہو، ایک وقت ایسا آئے گا کہ تم نہ ہو گے تمہاری چیزیں ظاہری طور پر بھی صرف ہماری ہی ملک رہیں گی، یہاں بندوں کی ملکیت مٹ جانے کے لحاظ سے میراث فرمایا گیا، وصیت، میراث وغیرہ جب رب تعالیٰ کی صفتیں ہوں، تو ان کے معانی رب تعالیٰ کی شان کے لائق ہوتے ہیں، خیال رہے کہ رب تعالیٰ کا نام وارث بھی ہے، وہاں وارث بمعنی حامی و مددگار ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں میرا والی وارث ہے،

تفسیر صوفیانہ

جیسے اکسیر جمادات کی حقیقت بدل دیتی ہے، تانبہ کو سونا، رانگ کو چاندی بنا دیتی ہے، ایسے ہی بخل، شقاوت و بدنصیبی کی اکسیر

طرف آپ کے اور نہ تھے آپ نزدیک ان کے جب ڈالتے تھے وہ قلم اپنے کہ کون ان میں سے کفیل ہے
تمہیں بتاتے ہیں اور تم ان کے پاس نہ تھے جب وہ اپنی قلموں سے قرعہ ڈالتے تھے کہ مریم کس کی پرورش میں رہیں
مَرْيَمَ ۖ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿٤٤﴾
مریم کا اور نہ تھے تم پاس ان کے جب وہ جھگڑتے تھے
اور تم ان کے پاس نہ تھے جب وہ جھگڑتے تھے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** ان آیتوں میں آل عمران کی برتری اور ان کے چناؤ کا ذکر تھا۔ درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر اس کی تاکید کے لئے حضرت زکریا و یحیٰ علیہما السلام کا قصہ آ گیا۔ اب پھر آل عمران کا باقی قصہ بیان ہو رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** زکریا علیہ السلام کے قصے سے پہلے عمران کی بیوی حنہ کی برگزیدگی کا ذکر تھا اب اُن کی بیٹی حضرت مریم کی بہتری اور افضلیت کا ذکر ہے۔ **تیسرا تعلق:** کچھ پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آل عمران کو دنیا والوں پر بزرگی دی۔ اس کی ایک دلیل حنہ کا قصہ بیان ہوا۔ اب دوسری دلیل حضرت مریم کے قصہ سے بیان ہو رہی ہے۔ گویا یہ سارا کلام یا اس کا اجمال کی تفصیل ہے۔ یا اس دعویٰ کی دلیل۔

تفسیر

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یہ جملہ یا تو پچھلے اِذْ پر معطوف ہے۔ یا نیا جملہ ہے اور اُذْكُرْ فعل پوشیدہ کا ظرف۔ ملائکہ سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ سورۂ مریم میں فرمایا گیا۔ فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا (مریم: ۱۷) یا ان کی عظمت کے لئے ملائکہ جمع ارشاد ہوا یا اس لئے کہ وہ فرشتوں کی جماعت کے سردار ہیں۔ اور سردار کا کلام گویا جماعت ہی کا کام ہوتا ہے۔ جیسے يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ۔ یہاں بھی ملائکہ سے حضرت جبریل مراد ہیں (کبیر و معانی وغیرہ) اور ممکن ہے کہ حضرت مریم کے پاس فرشتوں کی جماعت آئی ہو۔ اور سب نے ہی یہ کلام کیا ہو۔ مگر سورۂ مریم میں ان سے ایک کے کلام کا ذکر ہو (مدارک) يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ یہ فرشتوں کا کلام ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ گفتگو حضرت مریم سے سامنے ہو کر کی گئی۔ مگر چونکہ یہ کلام تبلیغی وحی نہ تھا۔ اس لئے حضرت مریم کی نبوت اس سے ثابت نہیں ہو سکتی۔ نبوت مردوں سے خاص ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ (النحل: ۴۳) فرشتوں کی یہ گفتگو یا حضرت مریم کی کرامت ہے۔ یا عیسیٰ علیہ السلام کا ارہاص کیونکہ ہاس اس سے بنا۔ دیوار کا نچلا حصہ۔ اصطلاح میں اس عجیب چیز کو ارہاص کہتے ہیں۔ جو دعویٰ نبوت سے پہلے ظاہر ہو خواہ وہ نبی کی ولادت سے پہلے یا ولادت کے بعد۔ ظہور نبوت سے پہلے۔ جیسے حضور ﷺ پر بچپن شریف میں بادل کا سایہ کر دینا۔ پتھروں کا سلام کرنا آپ پر سایہ کرنے کے لئے درختوں کا جھک جانا۔ یا جیسے ولادت پاک سے پہلے اصحاب فیل کا قصہ اور ولادت شریف کے وقت نور کا ظاہر ہونا۔ پرندوں چرندوں کا ایک دوسرے کو خوشخبری دینا۔ یا سیدنا عبداللہ کا ولادت پاک ﷺ سے پہلے معجزات کا دیکھنا کہ آپ جب کعبہ معظمہ میں جاتے تو وہاں کے سارے

عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ

جلنے کا عذاب یہ اس وجہ سے ہے جو آگے بھیج چکے تمہارے ہاتھ

آگ کا عذاب یہ بدلہ ہے اس کا جو تمہارے ہاتھوں

وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾

اور بے شک اللہ نہیں ہے ظلم کرنے والا بندوں پر

نے آگے بھیجا اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** گزشتہ آیت میں صدقہ وخیرات نہ کرنے کے دنیاوی و دینی نقصانات بتائے گئے، اب مسئلہ زکوٰۃ وصدقات سے مخالفین کے اعتراضات اٹھائے جارہے ہیں، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں صدقات کا حکم تھا جس کی وجہ سے یہود نے نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار کر دیا، اور بولے کہ اگر آپ سچے نبی ہوتے، تو امیروں کے صدقات وزکوٰۃ فقیروں کو کیوں کھلاتے بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی طرح یہ سب کچھ پہاڑ پر رکھوا دیا کرتے جسے غیبی آگ آکر کھا جایا کرتی، اس آیت میں ان کے جوابات دیئے جارہے ہیں (تفسیر کبیر) **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں بخل کے اخروی برے انجاموں کا ذکر کیا گیا، اب دنیاوی برے نتائج کا ذکر ہے کہ اس بخل ہی کی وجہ سے گزشتہ قوموں نے نبیوں کو قتل کر دیا، **چوتھا تعلق:** گزشتہ آیات میں رب تعالیٰ نے بندوں کو ایمان وتقویٰ کا حکم دیا تھا، اب کفر وفسق کا ذکر ہو رہا ہے جن سے بچ کر انسان مومن ومتقی بنتا ہے،

شان نزول

ابن اسحٰق، ابن جریر، ابن ابی حاتم نے بروایت عکرمہ عن ابن عباس نقل فرمایا کہ ایک بار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہود کے بیت المدارس یعنی کنیسہ یا مدرسہ میں گئے، خود یا حضور انور ﷺ کے فرمان عالی سے، تو آپ نے وہاں ملاحظہ فرمایا کہ قبیلہ بنی قینقاع کے یہود جمع ہیں، اور ان کے بڑے بڑے علماء جیسی حیی ابن اخطب، کعب ابن اشرف اشع بھی موجود ہیں، اور ان کا لاٹ پادری فنحاص ابن عاذوراء بھی وہاں ہے، حضرت صدیق نے فنحاص کو خطاب کر کے فرمایا، اے فنحاص اللہ سے ڈر، اسلام لے آ قسم خدا کی تو جانتا ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (ﷺ) وہی سچے رسول ہیں، جن کی بشارتیں توریت میں دی گئیں، لہٰذا ایمان اختیار کر، نماز قائم کر، زکوٰۃ ادا کر اور رب تعالیٰ کو قرض دے، اجر وثواب پائے گا، فنحاص بولا کہ اگر ہم خدا کو قرض دیں تو ہم غنی ہوئے اور خدائے تعالیٰ فقیر کہ فقیر ہی غنی سے قرض لیتے ہیں، نیز تمہارے رسول سود کے لین دین کو حرام کہتے ہیں، پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خیرات کرنے والے کو ایک کے دس بلکہ سات سو تک بلکہ اس سے بھی زیادہ دے گا، یہ خالص سود ہوا، اگر خدا تعالیٰ فقیر نہ ہوتا، تو ہم غنی لوگوں کو ایک ایک کے بدلے دس دس کیوں دیتا، ایسے اسلام کو ہم کیسے قبول کرلیں جس

ہے۔ تو یہ جملہ اس کا تتمہ ہے۔ کہ ان تینوں چیزوں میں نماز کے ارکان کا ذکر فرمایا گیا اور اس مجموعہ سے نماز مراد ہوئی۔ اور اگر قنوت سے ہر عبادت مراد تھی۔ تو یہ جملہ اس کی تفصیل ہے یا عام کے بعد خاص کا ذکر۔ سجدہ کو رکوع پر مقدم کرنا یا تو اس لئے ہے کہ واؤ میں ترتیب نہیں مطلب یہ ہوا کہ تم رکوع سجدہ دونوں کام کرلو۔ یا اس لئے کہ سجدہ رکوع سے افضل ہے۔ یا اس لئے کہ اس شریعت میں سجدہ رکوع سے پہلے تھا۔ مگر یہ قول کچھ ضعیف سا ہے۔ بعض نے فرمایا کہ یہاں سجدہ سے پوری نماز مراد ہے۔ چونکہ سجدہ سارے ارکان سے افضل ہے۔ اس لئے اس جز سے کل مراد لیا گیا۔ جیسا کہ مقامات نماز کو مسجد کہا جاتا ہے۔ حالانکہ وہاں پوری نماز پڑھی جاتی ہے۔ مع الراکعین فرما کر یہ بتایا کہ نماز جماعت کے ساتھ چاہیے۔ مگر یہاں ہمراہی مکانی نہیں بلکہ فعلی ہے۔ کیونکہ عورت مرد کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتی۔ خیال رہے کہ یہ کلام یا انہی فرشتوں کا ہے۔ یا رب تعالیٰ کا یعنی اے مریم اپنے رب تعالیٰ کی اطاعت کرو۔ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع سجدہ کرو۔ (نماز پڑھو) چونکہ امام کے ساتھ رکوع میں مل جانے سے رکعت ملتی ہے۔ اس لئے رکوع میں شرکت بیان کی۔ یہ نہ کہا وَاسْجُدِیْ مَعَ السّٰجِدِیْنَ: ۔ ذٰلِکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ اب تک تو گذشتہ پیغمبروں کا ذکر فرمایا اب اس کی وجہ بیان فرمائی جارہی ہے کہ اے محبوب یہ تمام تذکرے صرف قصہ کہانی کے طور پر بیان نہیں ہوئے۔ بلکہ ان سے مقصود تمہاری نبوت ثابت فرمانا ہے۔ تا کہ یہ علوم غیبیہ تمہاری نبوت کی دلیل ہوں۔ یہاں مذکورہ حضرات ہیں مقصود تم اور تمہاری صفات ہیں۔ ذالک سے حضرت مریم اور ان کی والدہ کے سارے واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ اَنْۢبَآءُ نباءٌ سے بنا ہے بمعنی مطلق خبر یا عجیب خبر غیب مشاہدہ کا مقابل ہے۔ یعنی یہ سارا قصہ غیب کی عجیب خبروں میں سے ہے۔ چونکہ حضور ﷺ نے نہ علماء کی صحبت پائی تھی نہ تاریخی کتب کا مطالعہ کیا تھا۔ اور نہ آپ اس جسم کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ اس لئے اسے غیب فرمایا گیا۔ ورنہ تواریخ کے ذریعہ واقعات کا معلوم ہو جانا علم غیب نہیں۔ علم الغیب اور علم بالغیب کا فرق شروع تفسیر میں بیان ہو چکا۔ ہمیں قیامت کا علم یہ علم بالغیب ہے۔ نبی کو علم الغیب نُوْحِیْهِ اِلَیْکَ یہ اَنْۢبَآءُ الغیب کی صفت ہے۔ نُوْحِیْ وحی سے بنا بمعنی خفیہ اطلاع قرآن کریم میں وحی چند معنی میں استعمال ہوئی۔ (۱) رسالت کی وحی جیسے نُوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ (نحل: ۴۳) (۲) الہام جیسے وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی (قصص: ۷) (۳) بات دل میں ڈالنا جیسے بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَهَا (الزلزال: ۵) (۴) اشارہ جیسے فَاَوْحٰٓی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا (مریم: ۱۱) الخ زکریا علیہ السلام نے انہیں اشارہ کیا۔ (۵) قدرتی ہدایت جیسے وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ (النحل: ۶۸) (روح البیان) یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں۔ جس کی ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔ اور یہ وحی آپ کے نبوت کی دلیل ہے۔ وحی، الہام، القاء، وسوسہ کا فرق پہلے بتایا جا چکا ہے۔ وَمَا کُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ یہ مستقل جملہ ہے۔ اور نوحیہ کی تفصیل لدیھم کا مرجع بیت المقدس کے وہ علماء ہیں جنہوں نے حضرت مریم کو حاصل کرنے کی خواہش کی۔ اقلام قلم کی جمع ہے۔ بمعنی آہستگی سے کاٹنا۔ اسی لئے کٹے ہوئے ناخن کو قلامت الظفر کہتے ہیں۔ اردو میں بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں کا سر قلم کر دیا گیا۔ اس سے مراد یا عام قلم ہیں یا توریت شریف لکھنے کے قلم جو لکھتے لکھتے چھوٹے ہو گئے تھے اور قابل تحریر نہ رہے تھے مگر بادب محفوظ رکھے گئے۔ کیونکہ ان سے توریت لکھی گئی تھی۔ یہ چھ تھے (کبیر و معانی) بعض نے کہا کہ اس سے فال نکالنے کے تیر مراد ہیں۔ جس سے اس زمانہ میں قرعہ ڈالا جاتا تھا۔ یُلْقُوْنَ سے مراد دریا میں ڈالنا ہے۔ جس کی تفصیل

ذہن یہود اس قسم کے بکواس کرتے ہی رہتے تھے، اگر کبھی بارش نہ ہوتی تو کہتے یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (مائدہ: ۶۴) اللہ کے ہاتھ بند ہیں، یعنی وہ کنجوس ہو گیا، اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا تھا کہ آپ اور آپ کا رب جاؤ کفار سے جہاد کرو ہم یہاں بیٹھے ہیں، جب جیت لو گے آجائیں گے یعنی رب تعالیٰ قوی قادر ہے، اس کے ہوتے ہمیں جہاد میں جانے کی کیا ضرورت ہے، ایسے ہی آج کہہ رہے ہیں، کہ رب تعالیٰ غنی ہے اس کے ہوتے ہمیں فقیروں کو دینے کی کیا ضرورت ہے وہ خود فقیروں کو دے لے گا، اس لئے رب تعالیٰ نے ان کا کوئی جواب نہ دیا، بلکہ فرمایا سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا ظاہر یہ ہے کہ یہاں لکھنے سے مراد فرشتوں کا ان کے نامۂ اعمال میں لکھنا ہے، چونکہ فرشتے اللہ کے محبوب بندے ہیں، ان کا کام گویا رب تعالیٰ کا کام ہے، اس لئے فرمایا کہ ہم لکھ لیں گے، اگر چہ یہ تحریر تو ان کے بولتے ہی ہو چکی تھی، مگر چونکہ یہ تحریر قیامت تک رہنے والی تھی، اور کسی عمل سے نہ مٹنے والی تھی، اس لئے فرمایا گیا ہم لکھ لیں گے، کہا جاتا ہے تمہاری بات میرے دل پر لکھی گئی، دل پر نقش ہوگئی، یعنی یاد ہوگئی، بھولوں گا نہیں، یا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کی یہ گفتگو یا بکواس قرآن میں لکھ دیں گے، کہ قیامت تک لوگ پڑھیں گے اور ان پر ہنسیں گے، مَا قَالُوْا سے مراد ان کی وہی گفتگو ہے جو جناب صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ہوئی، ما مصدریہ ہے قَالُوْا بمعنی مصدر وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ یہ عبارت مَا قَالُوْا پر معطوف ہے، چونکہ وہ بھی ما مصدریہ کی وجہ سے مصدر ہو گیا تھا اس لئے مصدر کا مصدر پر عطف درست ہوا، مقصد یہ ہے کہ یہ تو پرانے جاہل اور بدکار ہیں، انہوں نے تو گذشتہ نبیوں کو ناحق قتل کر دیا، اگر آج ایسی بکواس کریں تو ان سے کیا بعید ہے، ان کے وہ قتل بھی تحریر میں آچکے ہیں اور یہ بکواس بھی محشر میں برسر عام ان کی یہ حرکتیں پڑھ کر سنائی جائیں گی، اور انہیں رسواء کیا جائے گا، اور صرف رسوائی پر ہی بس نہیں ہوگی بلکہ وَنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ اگر چہ یہ کہنے والے فرشتے ہوں گے مگر چونکہ رب تعالیٰ کے حکم سے کہیں گے لہٰذا گویا رب تعالیٰ ہی فرمائے گا، ذَوْق کے معنی ہیں چکھنا، کبھی یہ لفظ کمی بیان کرنے کے لئے آتا ہے، کہا جاتا ہے میں نے کھایا نہیں صرف چکھا ہے، کبھی انتہائی شدت بیان کرنے کے لئے، کہا جاتا ہے کہ اپنے کئے کا مزا چکھ، یہاں دوسرے معنی میں ہے، یہ فرمان یا تو ان کے مرتے وقت ہوگا یا قبر میں جا کر یا محشر میں پہنچ کر یا دوزخ میں داخل ہو کر (تفسیر کبیر) اَلْحَرِيْقِ حرق سے بنا بمعنی جلنا، جلانا اور جلن، یہاں تینوں معنی بن سکتے ہیں، آگ کو بھی حریق کہتے ہیں کہ وہ جلانے والی ہے (از غیاث) خیال رہے کہ کفار کو مرتے وقت اور قبر میں بلکہ محشر میں بھی آگ کا عذاب ہوگا اور دوزخ میں پہنچ کر آگ میں عذاب ہوگا لہٰذا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ہر جگہ صادق آئے گا، ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ یہ نیا جملہ ہے جو پچھلے جملوں کی وعیدوں کی وجہ بیان فرما رہا ہے ذٰلِكَ سے اشارہ، یا قول کی طرف ہے یا ذوق کی طرف یا عذاب کی جانب یا حریق کی طرف، ب سببیہ ہے مَا مصدریہ، اور قَدَّمَتْ تقدیم سے بنا بمعنی آگے بھیجنا یا آگے کرنا، اگر چہ کفار سارے ہی اعضاء سے گناہ کرتے ہیں مگر چونکہ زیادہ تر گناہ ہاتھوں سے ہوتے ہیں، اس لئے یہاں اَيْدِيْ کا ذکر فرمایا، نیز کبھی يَد یا وَجْه بول کر پوری ذات مراد لیتے ہیں، یعنی ہمارا یہ فرمان عذاب یا تمہارا عذاب کو چکھنا یا عذاب یا آگ ان اعمال کی وجہ سے ہے جو تم دنیا کی زندگی میں پہلے بھیج چکے ہو، تمہارے گناہوں کے سارے پارسل ہمارے پاس محفوظ ہیں وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ، واؤ عاطفہ ہے اور یہ جملہ بِمَا قَدَّمَتْ پر معطوف ظلام

(مائدہ: ۶۷) یا فرمایا یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا (النساء: ۱۳۶) ان تمام میں مراد ہوتا ہے۔ ایسے ہی یہ کام کیئے جاؤ یا اور زیادہ کیئے جاؤ۔ کیونکہ یہ حضرات پہلے ہی عابد عارف عبادات میں مجاہد ہوتے ہیں عابد کو عبادت کا حکم دینا تحصیل حاصل ہے۔ لہٰذا ان کا وہ ہی منشاء ہے جو عرض کیا گیا۔ اے محبوب یہ مریم وحنہ زکریا و یحییٰ علیہم السلام کے واقعات ان غیبی خبروں میں سے ہیں۔ جو ہم نے بذریعہ وحی آپ کو بتائیں۔ ورنہ آپ نے نہ کتب تواریخ کا مطالعہ فرمایا نہ آپ کو مؤرخین کے ساتھ رہنے کا کبھی اتفاق ہوا۔ اور نہ آپ بایں جسم شریف وہاں موجود تھے۔ جب بیت المقدس کے خدام حضرت مریم کو حاصل کرنے اور ان کی پرورش کی عزت پانے کے لئے آپس میں جھگڑتے تھے اور جھگڑا مٹانے کے لئے انہوں نے یہ قرعہ ڈالا کہ توریت لکھنے کے چھ قلم ہیں ایک دریا میں ڈالے اور طے یہ کیا کہ جس کا قلم تر جائے یا بہاؤ کے خلاف بہنے لگے وہ ہی حضرت مریم کا کفیل بنے۔ اس قرعہ میں زکریا علیہ السلام کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اور وہ ہی آپ کے متکفل بنے۔ ان تمام واقعات کا تفصیل وار بیان فرمانا آپ کی نبوت کی کھلی دلیل ہے۔

خیال رکھو کہ جیسے دنیاوی حکومتیں پبلک مین اور سرکاری آدمیوں میں فرق کے لئے اپنے محکموں کو وردی' پیٹی' ٹوپی وغیرہ دیتی ہے۔ جن سے وہ دوسروں سے ممتاز ہیں۔ ایسے ہی رب تعالیٰ عام لوگوں اور سرکاری حضرات یعنی انبیاء کرام اور اولیاء عظام میں فرق کے لئے انہیں معجزات و کرامات دیتا ہے۔ یہ معجزات و کرامات گویا ان کی نبوت وولایت کی علامات ہوتے ہیں۔ یہ معجزات دو قسم کے ہوتے ہیں علم غیبیہ اور تصرف غیبیہ ان کے خداداد اختیارات۔ مکی زندگی شریف میں تو حضور انور ﷺ نے اختیارات کے معجزات زیادہ دکھائے۔ اور مدنی زندگی میں معجزات علم غیب دکھائے گئے۔ کہ مکہ معظمہ میں عام طور پر لوگ بے علم تھے۔ اور مدینہ منورہ میں یہود و نصاریٰ کے پوپ پادری بکثرت تھے۔ تاکہ یہ لوگ حضور انور ﷺ کی غیبی خبریں اور گذشتہ کے بتائے واقعات اپنی کتب کے موافق پائیں۔ اور آپ پر ایمان لائیں اور اس لئے ارشاد ہوا ذٰلِکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ

حضرت مریم و فاطمہ و عائشہ و خدیجہ رضی اللہ عنہن

اس میں اختلاف ہے کہ ان بیویوں میں افضل کون ہے۔ بعض نے فرمایا کہ حضرت مریم سب سے افضل ہیں۔ بلکہ بعض کے نزدیک وہ نبی ہیں۔ (۱) کیونکہ اس میں آیت میں ارشاد ہوا کہ مریم تمام جہان کی عورتوں سے افضل ہیں۔ اور عالم مطلق سے فقط رائے سے اس کو خاص نہیں کر سکتے۔ (۲) نیز ابن جریر نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی۔ کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ اے فاطمہ تم مریم کے سوا باقی تمام جنتی بیویوں کی سردار ہو (۳) ابن عساکر نے عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جنتی بیویوں کی سردار مریم پھر فاطمہ پھر خدیجہ پھر آسیہ پھر فرعون کی بیوی ہیں (۴) ابن ابی شیبہ نے ابن کہول سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اونٹ پر سوار ہونے والی عورتوں میں سب سے افضل قریش کی عورتیں ہیں۔ جو اپنے بچوں پر مہربان اور شوہر کی خیر خواہ ہیں۔ اور اگر ہمیں تحقیق ہوتی کہ مریم بنت عمران اونٹ پر سوار ہوئیں ہیں۔ تو ہم ان پر کسی کو بزرگی نہ دیتے۔ (۵) حضرت مریم عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہیں۔ اور ان بیویوں کو نبی کی والدہ ہونے کا شرف حاصل نہیں (۶) حضرت مریم نے بچپن شریف میں کلام فرمایا ان بیویوں کو یہ شرف حاصل نہیں۔ (۷) حضرت مریم کی پرورش

مگر لفظ فقیر ہلکا ہے، اس لئے حضور انور ﷺ کے لئے نہ بولو، دیکھو رب تعالیٰ کو زارع کہہ سکتے ہیں حارث نہیں، اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (واقعہ: ۶۴) یوں ہی رب تعالیٰ کو حکیم کہہ سکتے ہیں، شافی الامراض کہہ سکتے ہیں، طبیب نہیں کہہ سکتے، کہ حارث پیشہ ور کسان کو، اور طبیب پیشہ ور حکیم کو کہا جاتا ہے، رب تعالیٰ کے لئے یہ لفظ موزوں نہیں، اس کی مکمل بحث ہمارے فتاویٰ میں ملاحظہ فرمایئے، **چوتھا فائدہ:** رب تعالیٰ کے مقابلہ میں اپنے کو غنی کہنا حرام بلکہ کفر ہے جیسا کہ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ سے معلوم ہوا، انسان کتنا ہی غنی و مالدار ہو، مگر اللہ رسول کے دروازے کا فقیر ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے اللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (محمد: ۳۸) اللہ تعالیٰ غنی ہے اور تم سب اس کے فقیر، اور فرماتا ہے اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ (توبہ: ۷۴) انہیں اللہ رسول نے اپنے فضل و کرم سے غنی کر دیا، معلوم ہوا کہ سب حضور انور ﷺ کے فقیر ہیں، غناء ان کے دروازہ کی بھیک ہے، مولانا فرماتے ہیں، شعر

چونکہ ذاتش ہست مُحتاجٌ اِلَیہ　　زاں سبب فرمود حق صَلُّوا عَلَیہِ

چونکہ سب حضور انور ﷺ کے محتاج ہیں، اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا انہیں دعائیں دو، کہ فقیر غنیوں کو دعائیں دے کر ہی بھیک مانگتے ہیں، **پانچواں فائدہ:** فرشتے بارگاہ الٰہی میں بڑے مقبول بندے ہیں کہ رب تعالیٰ نے ان کے کام کو اپنا کام فرمایا، دیکھو نامۂ اعمال لکھنا فرشتوں کا کام ہے، مگر رب تعالیٰ نے فرمایا سَنَكْتُبُ ہم لکھ رکھیں گے، اس کا عکس بھی ثابت ہے، حضرت جبریل نے بی بی مریم سے عرض کیا لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (مریم: ۱۹) تاکہ میں تمہیں ستھرا بیٹا بخشوں، دیکھو بیٹا دینا رب تعالیٰ کا کام ہے، مگر حضرت جبریل فرماتے ہیں میں بیٹا دوں گا، عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ باذنِ پروردگار میں مردے زندہ، کوڑھے، اندھے اچھے کرتا ہوں، **چھٹا فائدہ:** گناہ سے راضی ہونا، گنہگار کی حمایت کرنا بھی گناہ ہے، دیکھو موجودہ بنی اسرائیل نبیوں کے قاتل نہ تھے، مگر چونکہ وہ قاتلوں کے حمایتی تھے، اس لئے انہیں بھی قاتلوں کی صف میں رکھا گیا، یہاں تفسیر کبیر میں ہے کہ کسی نے امام شعبی کے پاس بیٹھ کر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قتل کا واقعہ بیان کیا اور قاتلین کی تعریف کی، تو امام شعبی نے فرمایا کہ تو بھی خونِ عثمانی میں شریک ہو گیا اور یہ آیت تلاوت کی فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ (آل عمران: ۱۸۳) دیکھو ان قاتلین اور ان قائلین میں سات سو برس کا فاصلہ تھا، مگر قائلین کو قاتلین فرمایا گیا، آج جو بدنصیب قتل حضرت عمر یا قتل عثمان یا قتل حسین پر خوشی منائے یا قاتلوں کی حمایت کرے وہ بھی قاتلین کے زمرہ میں شامل ہے (تفسیر کبیر) **ساتواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ بغیر جرم کسی کو دوزخ میں نہ ڈالے گا جیسا کہ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ سے معلوم ہوا، لہٰذا کفار کے ناسمجھ بچے، دیوانے، جو ناسمجھی میں فوت ہو گئے دوزخ میں نہ ڈالے جائیں گے، یہ ہی صحیح ہے،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کریمہ میں رب تعالیٰ نے یہود کا اعتراض تو بیان فرمایا مگر جواب نہ دیا بلکہ اس اعتراض پر سزا کا ذکر فرما دیا، اعتراض کا جواب دینا چاہیے نہ کہ معترض کو سزا، **جواب:** اس کے چند ایک جواب ہیں، ایک یہ کہ جواب اس اعتراض کا دیا جاتا ہے جو شبہ کی وجہ سے کیا جائے مگر جو مذاق، دل لگی، استہزاء کے طور پر کیا جائے، اس کا جواب جوتہ کاری ہے،

رشتۂ آئین حق زنجیر پاست　پاس فرمانِ جناب مصطفیٰ ست
ورنہ گرد تربتش گردیدمے　سجدہ ہا برخاک دے پاشیدمے

ہم نے عرض کیا ہے۔

نبی کی لاڈلی بانو ولی کی، ماں شہیدوں کی　یہاں جلوہ نبوت کا ولایت کا شہادت کا

(۵) حضرت مریم کو تہمت لگی تو حضرت عیسیٰ کو بچپن میں گویائی بخش کران کی عظمت کی گواہی دلوادی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو تہمت لگی تو بھی ایک شیر خوار بچے ہی کے ذریعے ان کی پاک دامنی ظاہر فرمادی گئی۔ مگر جب محبوبہ محبوب عائشہ صدیقہ کو تہمت لگی تو ہوسکتا تھا کہ وہاں بھی کسی شیر خوار بچے سے یا لکڑی پتھر درخت وغیرہ کو گویائی بخش کر دلوادی جاتی مگر ایسا نہ کیا بلکہ رب تعالیٰ نے خود آپ کی پاکدامنی عصمت جنتی ہونے کی گواہی اس طرح دی کہ سورۂ نور میں اٹھارہ آیتیں اتاریں جن میں آپ کی پاکدامنی کا ذکر فرمایا اور تہمت لگانے والوں بلکہ دل میں شبہ کرنے والوں بلکہ خاموش رہنے والوں یعنی تردید نہ کرنے والوں پر سخت عتاب فرمایا۔ یہ فرق کیوں ہے اسی فرق کے مراتب کو ظاہر کرنے کے لئے کہ اس سے حضرت عائشہ صدیقہ کی بی بی مریم سے افضلیت مطلقہ ثابت ہو کہ ان کا گواہ شیر خوار بچہ اور صدیقہ کا گواہ خود رب العالمین۔

حضرت عائشہ صدیقہ وفاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہما

اس میں بھی اختلاف ہے کہ ان دونوں حضرات میں کون افضل ہے۔ بعض کے نزدیک حضرت فاطمہ زہرہ عائشہ صدیقہ سے افضل۔ اس لئے کہ (۱) مصطفیٰ ﷺ کی لخت جگر ہیں۔ آپ کی شرافت ذاتی واصلی ہے۔ اور سب کی عارضی (۲) چونکہ حضور ﷺ ہر موجود کے سردار اور فاطمہ زہرہ حضور صلی اللہ علیہ سلم کا جز لہٰذا جو کل کا حال وہ جزو کا (۳) حضرت فاطمہ جنتی بیویوں کی سردار ہیں جن میں حضرت عائشہ صدیقہ بھی داخل ہیں۔ (۴) حضرت فاطمہ زہرہ ہمشکل محبوب ﷺ ہیں۔ چنانچہ آپ کی رفتار، گفتار، شکل وشباہت بالکل حضور ﷺ کی مثل تھیں۔ (۵) وہ فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا حیض ونفاس سے پاک تھیں۔ (مدارج النبوت) (۶) فاطمہ زہرا جنت کی کلی ہیں۔ اسی لئے آپ کا لقب شریف زہرہ ہے۔ بمعنی کلی۔ آپ کو فاطمہ اور بتول بھی اسی لئے کہا جاتا ہے کہ آپ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے بے تعلق ہیں۔ فاطمہ فطم سے بنا ہے۔ بمعنی چھوٹنا جس بچے کا دودھ چھوٹ جائے اسے فطیم کہتی ہیں۔ بتول بتل سے بنا بمعنی الگ ہونا وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا (مزمل:۸) (۷) مبسوط کتاب الکراہیۃ باب الس میں ہے۔ کہ حضور ﷺ فاطمہ زہرہ کو سونگھا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ مجھے ان سے جنت کی خوشبو آتی ہے۔ ہم نے عرض کیا ہے

بتول و فاطمہ زہرہ لقب اس واسطے پایا　کہ دنیا میں رہیں اور دیں پتہ جنت کی نکہت کا

(۸) فاطمہ زہرہ نسل مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ عائشہ صدیقہ میں یہ وصف نہیں۔ مگر بعض کے نزدیک حضرت عائشہ صدیقہ فاطمہ زہرہ سے افضل ہیں۔ چند وجوہ سے (۱) رب نے فرمایا یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (احزاب:۳۲) اے نبی کی

پانچواں اعتراض: وَاَنَّ اللّٰہَ میں اَنَّ فتح سے ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ نیا جملہ نہیں بلکہ مَاقَدَّمَتْ پر معطوف ہے، اور عذاب کا دوسرا سبب تو گناہ تو سزا کا سبب ہے، رب کا ظلم نہ کرنا سزا کا سبب کیسے ہو سکتا ہے؟ **نوٹ:** اس اعتراض کو تفسیر روح المعانی نے بہت اہمیت دی اور اس کے بہت جوابات دیئے، **جواب:** اس کا سہل جواب یہ ہے کہ سزا کی وجہ تو ہے گناہ، اور گناہوں پر سزا کی وجہ ہے رب تعالیٰ کا ظالم نہ ہونا، یعنی ہم گناہوں پر ہی سزا کیوں دیتے ہیں، بغیر گناہ کیوں نہیں پکڑتے، اس لئے کہ ہم بندوں پر ظلم نہیں کرتے، یا دونوں ایک ہی کی وجہ ہیں یعنی انہیں سزا سخت کیوں دیں گے، اس لئے کہ وہ مجرم ہیں اور ہم ظالم نہیں بلکہ عدل فرمانے والے، اور بھی جوابات دیئے گئے ہیں مگر یہ جواب کافی ہے، **چھٹا اعتراض:** اس آیت میں رب سے ظَلَّام یعنی بڑا ظالم ہونے کی نفی کی گئی، معلوم ہوا کہ وہ ظالم تو ہے مگر بڑا ظالم نہیں (آریہ) **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گذر گیا کہ یہاں ظَلَّام مبالغہ کے لئے نہیں بلکہ نسبت کے لئے ہے جیسے تَمَّار، تمر والا، نَمَّام، چغلی والا، حَمَّام، گرمی والا (روح المعانی، تفسیر کبیر) بلکہ روح المعانی نے یہ بھی جواب دیا کہ رب تعالیٰ کی جو صفت بھی ہے عظیم ہی ہے، اگر ظلم بھی اس کی صفت ہوتی، تو عظیم ہی ہوتی، وہ نعوذ باللہ ظلم بھی کرتا، تو بڑا ہی ظلم کرتا، لہٰذا رب تعالیٰ کے لئے بڑے ظلم کی نفی گویا اصل ظلم کی نفی ہے کہ ناقص چیز اس کی صفت بن سکتی ہی نہیں، مگر پہلا جواب زیادہ قوی ہے،

تفسیر صوفیانہ

دنیا میں انسان دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن پر ھُدیٰ غالب ہے، دوسرے وہ جن پر ھویٰ غالب، ھُدیٰ والے کبھی اس مرتبہ میں پہنچ جاتے ہیں کہ ان کی زبان پر فرشتہ بلکہ خالق بولتا ہے، اور ھویٰ والوں کی زبان پر اولاً تو نفس امارہ بولتا ہے، پھر شیطان بولنے لگتا ہے زبان اس کی ہوتی ہے بات شیطان کی، اس حالت میں شیطان اس کی زبان سے ایسی باتیں ادا کرتا ہے جو خود نہیں بول سکتا، دیکھو شیطان نے خود نہ کہا تھا کہ میں رب ہوں، مگر فرعون سے کہلوایا، شیطان نے خود کبھی نہ کہا کہ اللہ فقیر ہے، میں غنی، مگر ان پڑھے لکھے اسرائیلیوں سے کہلوایا، انسان اگر درست رہے تو وہ کر دکھائے جو فرشتوں سے نہ ہو سکے اور اگر ٹیڑھا ہو تو وہ کرے جو شیطان سے نہ ہو سکے، اسرائیلیوں کی یہ بکواس وحی شیطانی سے تھی، رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِھِمْ (انعام: ۱۲۱) یہ بکواسیں وحی شیطانی ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان اسرائیلیوں کے اسی قول اور قتلِ انبیاء والے فعل کی وجہ سے ہم ان کے دلوں پر شقاوت لکھ دیں گے، بدنصیبی کی مہر لگا دیں گے، جس سے وہ ایمان و نیک اعمال کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں گے اور انہیں دنیا میں فراقِ یار کی نار میں جلائیں گے اور آخرت میں قہر قہار کی نار کا مزہ چکھائیں گے، کیونکہ ان کے اعمال واحوال نے انہیں وصالِ یار اور گلزار دار القرار کے لائق نہ رکھا، رب تعالیٰ ظالم نہیں کہ غیر لائق کو دے، وصال کے اہل کو وصال دیتا ہے، فراق کے لائق کو فراق (روح البیان) اگرچہ الفاظ قرآن سب پڑھ لیتے ہیں مگر اس کے رموز واسرار سے کوئی کوئی فائدہ اٹھاتا ہے، یہ آیت کہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا (بقرہ: ۲۴۵) کوئی ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے، عاشقوں کو تڑپا دیتی ہے، وہ تو کہتے ہیں سبحان اللہ! خود ہی دینے والا، خود ہی لینے والا، اپنا مال، اپنا بندہ، اپنی ہی توفیق، اپنے فقیر، اپنے امیر، اپنی طرف سے حاجات، اپنی طرف سے مرادات، سب کچھ اپنا، مگر پھر کیسا ناز وانداز کا اعلان ہے کہ ہے

بنیں۔ گھر کا بڑا محلہ کا بڑا شہر کا بڑا بادشاہ امیر اگر نمازی پرہیزگار ہوں تو ان کے ماتحت لوگ پرہیزگار ہو جاتے ہیں۔ دیکھو حضرت مریم کو رب نے خلق کی پیشوائی دی تو انہیں عبادات کی زیادہ تاکید بھی فرمائی۔ تاکہ مریم کے نقش قدم پر چلنے والے ان کے سے اعمال کریں۔ دیکھا گیا ہے کہ بے نمازی پیر کے مرید نمازی نہیں ہوتے جن کا پیر گھر میں نماز پڑھنے کا عادی ہو وہ لوگ بھی مسجد میں نہیں آتے کیوں! پیر کی اتباع کے لئے اس لئے حضور ﷺ نے آخر وقت تک نماز با جماعت مسجد میں ادا کی۔ **چوتھا فائدہ:** غیر نبی سے فرشتے کلام کر سکتے ہیں خواہ ظاہر طور پر یا باطنی طور پر جسے الہام کہتے ہیں جیسا وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ سے معلوم ہوا۔ مگر تبلیغی وحی نبیوں کے ساتھ خاص ہے۔ **پانچواں فائدہ:** بعض عورتیں بعض مردوں سے افضل ہیں اگرچہ مرد ہونے کی صفت عورت ہونے کی صفت سے افضل ہے جیسا کہ وَاصْطَفٰکِ سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** حضرت مریم حیض ونفاس وغیرہ گندگی سے پاک تھیں جیسا کہ طَھَّرَکِ کی تفسیر میں عرض کیا گیا۔ **ساتواں فائدہ:** واؤ ترتیب نہیں چاہتا۔ جیسا وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ سے معلوم ہوا کہ سجدہ رکوع کے بعد ہوتا ہے مگر بیان میں پہلے آیا ہے۔ **آٹھواں فائدہ:** بعض امتی کے لئے کچھ احکام خصوصی بھی ہوتے ہیں دیکھو حضرت مریم نبی نہ تھیں امتی تھیں مگر انہیں خصوصیت سے فرمایا گیا اُقْنُتِیْ۔ **مسئلہ:** مرد کا انتہائی کمال نبوت ہے۔ عورت کا انتہائی کمال صدیقیت کسی ولی سے پوچھا گیا کہ کل ابدال کتنے ہیں جواب دیا گیا کہ چالیس نفس پوچھا گیا کہ آپ نے چالیس مرد کیوں نہ کہا نفس کیوں فرمایا جواب دیا کہ ان میں کچھ عورتیں بھی ہیں۔ (تفسیر روح البیان) **نواں فائدہ:** نماز با جماعت پڑھنا چاہیے جیسا کہ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ سے معلوم ہوا۔ **دسواں فائدہ:** امام کے ساتھ رکوع میں جانے سے رکعت ملتی ہے نہ کہ سجدہ میں ملنے سے کیونکہ یہاں وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ فرمایا وَاسْجُدِیْ مَعَ السّٰجِدِیْنَ نہ کہا گیا۔ **گیارھواں فائدہ:** عورتیں مردوں کی نماز میں شرکت کر سکتی ہیں دیکھو وَارْکَعِیْ صیغہ مونث کا ہے۔ اور مَعَ الرّٰکِعِیْنَ مذکر۔ **بارھواں فائدہ:** صرف عورتوں کی جماعت منع ہے۔ اس طرح کہ عورت ہی امام ہو۔ اور عورتیں ہی مقتدی کیونکہ یہاں مَعَ الرّٰکِعِیْنَ فرمایا گیا۔ نہ کہ مَعَ الرّٰکِعَاتِ **مسئلہ:** نماز میں عورت امام نہیں ہو سکتی۔ نہ مردوں کی نہ عورتوں کی نہ دونوں کی بلکہ مرد امام ہوگا۔ عورت مقتدی اس لئے حضرت مریم کو علیحدہ عورتوں کی جماعت قائم فرمانے کا حکم نہ دیا گیا۔ بلکہ ارشاد ہوا کہ جو مرد راکعین ہیں۔ ان ہی کے ساتھ تم بھی رکوع سجدہ کر لیا کرو علیحدہ اپنی عورتوں کی جماعت نہ کرنا۔ اس لئے حضور انور ﷺ کی ازواج پاک نے کبھی عورتوں کی جماعت نہ کی۔ اور وہ یہاں عورتوں کی امام نہ بنیں۔ بلکہ ہمیشہ مردوں کی جماعت میں شریک ہوئیں۔ **تیرھواں فائدہ:** رب تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو علم غیب عطا فرمایا اور اسی کو ان کی نبوت کی دلیل بنایا جیسا کہ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ سے معلوم ہوا۔ نبوت کا منصب صرف یہ نہیں ہے کہ نبی مولویوں کی طرح فقط شرعی مسئلے بتائیں۔ بلکہ غیب کی خبریں رکھنا۔ اور دینا ان کے لئے ضروری ہے۔ **چودھواں فائدہ:** قرعہ ڈالنا اور اس کے ذریعہ فیصلہ کرنا سنت انبیاء ہے۔ امام جعفر صادق فرماتے ہیں کہ جس قوم نے قرعہ سے فیصلہ کیا۔ اس نے اپنا معاملہ رب تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ رب تعالیٰ حق دار کو حق پہنچائے گا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے فَسَاھَمَ فَکَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ (الصافات: ۱۴۱) (روح البیان) [illegible] ڈالا گیا۔ وہ مریم بنت عمران ہیں۔

جو لائے روشن نشانیاں اور صحیفے اور روشن کتاب

جو صاف نشانیاں اور صحیفے اور چمکتی کتاب لے کر آئے تھے

تعلقات

ان آیات کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہود کا وہ اعتراض بیان فرمایا تھا جس کا تعلق قرآن سے تھا یعنی مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ الخ (بقرہ: ۲۴۵) اب ان کا وہ اعتراض بیان فرمایا جا رہا ہے جس کا تعلق قرآن لانے والے محبوب ﷺ سے ہے، چونکہ قرآن اور صاحب قرآن دونوں رکن ایمان ہیں، اس لئے اعتراض کے بعد اس اعتراض کا ذکر ہوا، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کی اس بکواس کا ذکر تھا، جس کا تعلق ذات باری تعالیٰ سے تھا، رب تعالیٰ کی شان میں بے ادبی، اسے فقیر کہنا، اب اس کے رسول کی شان میں بے ادبی کا ذکر ہے، کہ وہ خدا تعالیٰ کے بے ادبی یوں کرتے ہیں، اور اس کے محبوب کی شان میں گستاخی اس طرح کرتے ہیں، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کی عداوت انبیاء کا ذکر تھا کہ انہوں نے رسولوں کو قتل کیا، اب عداوت سید الانبیاء کا تذکرہ ہے، کہ وہ آپ پر دانستہ طور پر ایمان نہیں لائے بلکہ بہتان لگاتے ہیں، **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کے قتل انبیاء کا ذکر تھا، اب آسمانی کتابوں پر بہتان لگانے کا ذکر ہے کہ غلط باتیں ان کتب کی طرف منسوب کرتے ہیں، **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کا وہ عیب بیان ہوا جو ہم نے دیکھا نہیں سن کر جانا مانا یعنی قتل رسل، اب ان کا وہ عیب بیان ہو رہا ہے جو اب آنکھوں دیکھا جا رہا ہے یعنی آسمانی کتابوں پر بہتان باندھنا،

شانِ نزول

حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ ایک بار کعب ابن اشرف، کعب ابن اسد، مالک ابن صیف، وہب ابن یہودا، زید ابن تابوت، فنحاص ابن عازوراء وغیرہ علماء یہود حضور انور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، اور بولے کہ ہم آپ پر ایمان تو لے آتے، مگر ایک مجبوری ہے، وہ یہ کہ توریت شریف میں ہم کو تاکیدی حکم دیا گیا کہ ہم اسی پیغمبر پر ایمان لائیں جو اپنی نبوت کے ثبوت کے لئے قربانی کرے، پھر قربانی کا گوشت ایک پہاڑ پر رکھے، غیب سے سفید رنگ کی بے دھوئیں والی آگ نمودار ہو، اور گوشت جلا یا جاوے، جو نبی یہ معجزہ دکھائے، اس پر ہم ایمان لا سکتے ہیں، آپ نے یہ معجزہ دکھایا نہیں، اس لئے ہم بحکم توریت آپ پر ایمان نہیں لا سکتے، اگر آپ یہ معجزہ دکھا دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں، ان کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، جس میں ان کی پرزور تردید کی گئی، کہ نہ توریت شریف میں یہ حکم ہے، اور نہ خود یہ لوگ اس پر عامل ہیں (تفسیر کبیر، روح المعانی، روح البیان، تفسیر جلالین، خازن مدارک، بیضاوی، خزائن العرفان وغیرہ)

تفسیر

اَلَّذِیْنَ قَالُوْٓا یہ جملہ یا تو ھم پوشیدہ کی خبر ہے، اور حالتِ رفعی میں ہے یا لِلْعَبِیْدِ کا بدل، اور حالت جری میں یا قَوْلَ الَّذِیْنَ کے اَلَّذِیْنَ کا بیان یا پوشیدہ فعل کا مفعول ہے، اور حالتِ نصبی میں اَلَّذِیْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں، جو حضور انور ﷺ کے

کے ساتھ پڑھو۔ اس طرح کے اپنے حجرے سے امام کی اقتدا کرلو۔ جیسے آج کل عورتیں مسجدوں میں الگ جگہ کھڑے ہوکر با جماعت نماز پڑھتی ہیں۔ کہ وہ جماعت میں ساتھ ہوتی ہیں مگر جگہ میں علیحدہ۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ ہر جگہ حاضر و ناضر نہیں۔ رب فرماتا ہے وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ یعنی آپ ان کے پاس نہ تھے (دیو بندی) **جواب:** حاضر و ناظر کی مکمل بحث اور اس سوال کا تفصیلی جواب ہماری کتاب جاء الحق اوّل میں دیکھو یہاں اتنا سمجھ لو کہ یہاں جسمانی حاضری کی نفی ہے۔ یعنی آپ بایں جسم وہاں موجود نہ تھے۔ اور پھر اس واقعہ سے باخبر ہیں۔ معلوم ہوا کہ آپ نبی ہیں حضور ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے کے یہ معنی ہیں۔ کہ حضور ﷺ کے سامنے سارا عالم ایسا ہے جیسا کہ ہاتھ کی ہتھیلی۔ اور آپ کا حاضر و ناظر ہونا ایسا ہے جیسے سورج کا ایک وقت میں ہر جگہ ہونا۔ کہ سورج ہے تو ایک ہی مقام پر مگر اس کی تجلی ہر جگہ ہے۔ یا جیسے ملک الموت کا ہر جگہ تصرف کرسکنا کہ وہ ایک ہیں۔ مگر ایک وقت میں ہر جگہ لوگوں کی جان قبض کر سکتے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

روحانی قوتیں گویا فرشتے ہیں اور نفس مطمئنہ گویا مریم اور نفوس امارہ دیگر عورتیں گویا آیت میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ روحانی قوتوں نے نفس مطمئنہ کو پکارا کہ اے مریم نفس تجھے اللہ نے برگزیدہ کیا۔ کیونکہ تو شہوات سے بچی ہوئی ہے۔ اور تجھے گندے اخلاق اور بری صفتوں سے پاک صاف کیا۔ اور تجھے جہان کی عورتوں یعنی نفوس امارہ اور خواہشات شہوانیہ اور برے افعال پر چن لیا۔ لہٰذا اے مریم نفس تو اپنے رب کی اطاعت و عبادات میں مشغول رہ۔ اور اپنی ذلت و عاجزی احتیاج انکساف ظاہر کر کے سجدہ کر اور خشوع و خضوع کے مقامات میں اللہ کے مقبول بندوں کے ساتھ رکوع کر یعنی جھکی رہو اے نبی روح یہ تیرے وجود کے غیبی حالات ہیں جن کی تجھے ہم نے خبر دی تو روحانی اور نفسانی قوتوں کے پاس اس وقت موجود نہ تھی۔ جبکہ وہ اس مریم نفس کے حاصل کرنے میں کوشش کررہے تھے کہ نفس امارہ اس کا شکار کر کے اسے اپنے جیسا بنانا چاہتا تھا اور قوت روحانیہ اسے اپنی طرف کھینچتی تھی۔ یہ اختلاف دریائے سینہ پر ہوا۔ جو روحانی قوت اور نفسانی شہوت کا محل ہے۔ چونکہ تیرا مقام ان سے بلند و بالا ہے۔ اس لئے وہاں موجود نہ تھی۔ ہماری اطلاع سے تو مطلع ہوئی رب تعالیٰ نے فضل و کرم فرمایا۔ کہ اس مریم (نفس مطمئنہ) کو زکریائے روحانیت کے سپرد کیا۔

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ درد دل تو دل کی عبادت ہے اور یہ نماز روزے وغیرہ جسم کی عبادات در دِل ان عبادات کی شرط قبول ہے۔ بے درد کی عبادات بارگاہ الٰہی تک نہیں پہنچتی۔ اس لئے رب نے اقنتی پہلے فرمایا اور سجدے و رکوع کا حکم بعد میں دیا۔ ان کے مشرب میں درد دل اصل قنوت ہے۔ نیز صوفیاء فرماتے ہیں کہ نماز وغیرہ تمام عبادات میں صرف رب کو راضی کرنے کی نیت چاہیے جنت حاصل کرنے یا دوزخ سے بچنے کی بھی نیت نہ کرے عبادات اللہ کے لئے ہیں نہ کہ دوزخ یا جنت کے لئے اس لئے ارشاد ہوا کہ لِرَبِّكِ اے مریم قنوت وغیرہ جو کچھ بھی کرو۔ اپنے رب کے لئے کرو نہ کہ جنت وغیرہ کے لئے شعر

مروت نہ باشد کہ مردِ خدا — بخواہند غیر از خدا از خدا

نیز حضرات صوفیاء فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں جو گذشتہ نبیوں کے واقعات مذکور ہوئے ان سے مقصود حضور انور ﷺ کی نبوت کا ثبوت دینا ہے۔ یہ سب کچھ آپ کی خاطر ہے الغرض آیات حضور ﷺ کی نعت ہیں۔ اس لئے فرمایا گیا ذٰلِكَ مِنْ

لانے کا بہانہ تھا قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیْ قُلْتُمْ یہ جملہ ان کے اس بہتان کا جواب ہے، قُلْ فرما کر اشارۃً فرمایا گیا، کہ مناظرہ کیجئے آپ، کراتے ہم ہیں، جواب ہمارا ہے زبان تمہاری، سبحان اللہ کیسا پیارا، دلکش الزامی جواب ہے، یہ نہ فرمایا گیا کہ توریت میں یہ حکم نہ تھا کیونکہ وہ کہہ سکتے تھے کہ ہم سے حضرات انبیاء کرام زبانی فرما گئے تھے، یا توریت میں حکم تو تھا مگر کچھ توریت ضائع بھی ہوگئی، اس ضائع شدہ میں تھا جو سینہ بسینہ ہم تک پہنچا، بلکہ بطور الزام فرمایا گیا کہ تم جھوٹے ہو، تم قربانی لانے والے نبیوں پر بھی ایمان نہ لائے، خیال رہے کہ یا تو کُمْ سے پہلے اٰبَاءَ پوشیدہ ہے، اصل عبارت یوں تھی قَدْ جَآءَ اٰبَاءَ كُمْ کیونکہ گذشتہ رسول موجودہ یہود کے پاس نہیں آئے تھے، بلکہ ان کے باپ دادوں کے پاس یا کچھ پوشیدہ نہیں، چونکہ باپ دادوں کے پاس رسولوں کا آنا گویا ان کے پاس ہی آنا تھا، اس لئے جَآءَكُمْ فرمایا گیا، رُسُلٌ کی تنوین تقلیل (بیان کی) کے لئے ہے یعنی کچھ چند ہی رسول قربانی لائے سب نہ لائے، مِّنْ قَبْلِیْ میں اشارۃً فرمایا گیا کہ جتنے رسول آئے تھے مجھ سے پہلے آچکے، اب کوئی رسول نہ آئے گا کہ میں آخری نبی ہوں، ورنہ ارشاد ہوتا کہ مجھ سے پہلے بھی انبیاء قربانیاں لائے تھے اور میرے بعد بھی لائیں گے بینات بینۃ کی جمع ہے جس کا مادہ بینٌ ہے بمعنی ظہور، اسی لئے کلام کو بیان کہا جاتا ہے، کہ وہ دل کی بات ظاہر کردیتا ہے، گواہوں کو بینہ اسی واسطے کہتے ہیں کہ وہ دعوے کو ظاہر کرتے ہیں، بَیِّنَہ کے معنی ظاہر یا ظاہر کرنے والی چیز ہے، یہاں اس سے معجزات مراد ہیں، کہ وہ نبوت کو ظاہر کرتے ہیں، معجزہ، کرامت، ارہاص، استدراج کی تعریفیں اور ان کے فرق ہم پہلے پارہ کی تفسیر میں عرض کرچکے، خیال رہے کہ پچھلے نبیوں کو ایک ایک دو دو معجزے ملے تھے، موسیٰ علیہ السلام کو نو (۹) معجزے عطا ہوئے، ہمارے حضور انور ﷺ کے معجزے ان گنت ہیں، بِالَّذِیْ قُلْتُمْ سے مراد وہی قربانی ہے جس کا ذکر انہوں نے کیا تھا یعنی آپ فرمادو کہ مجھ سے پہلے کچھ رسول روشن معجزات بھی لائے تھے اور یہ قربانی بھی جس کا تم مجھ سے مطالبہ کرتے ہو، مگر تم ان پر ایمان نہ لائے ورنہ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ، اگرچہ قاتلینِ انبیاء موجودہ یہود کے باپ دادے تھے نہ کہ خود، مگر چونکہ یہ ان قاتلوں کا ادب واحترام بھی کرتے تھے اور حمایت بھی، اس لئے انہیں بھی قاتل قرار دیا گیا یعنی اگر تم سچے ہو کہ واقعی تم قربانی لانے والے نبی پر ایمان لے آتے ہو، تو بتاؤ تم پچھلے قربانی والے نبیوں پر ایمان کیوں نہ لائے، تم ان پر ایمان تو کیا لاتے تم نے انہیں شہید کر ڈالا، فَاِنْ كَذَّبُوْكَ ف تحقیقیہ ہے اور اِنْ فقط تعلیق کے لئے نہ کہ شک کے لئے، کیونکہ وہ یہود تو ظاہر ظہور حضور انور ﷺ کو جھٹلاتے تھے، اور ہوسکتا ہے کہ اِنْ شک کے لئے ہی ہو، اور جھٹلانے سے مراد اس مذکورہ بیان میں جھٹلانا ہو یعنی اے محبوب اگر اب بھی یہ لوگ آپ کو جھٹلائیں اور آپ کو نبی نہ مانیں یا اگر اپنی بے حیائی سے کہہ بیٹھیں کہ قتلِ انبیاء کا واقعہ ہم سے ہوا ہی نہیں یا جنہیں ہم نے قتل کیا تھا وہ قربانی لائے ہی نہ تھے تو آپ غم نہ کریں، کیونکہ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فقد کی ف تعلیلیہ ہے نہ کہ جزائیہ، یہ جملہ پوشیدہ جزاء کی علت ہے، كُذِّبَ تکذیب سے بنا بمعنی جھوٹا کرنا، جھوٹا کہنا، جھوٹا سمجھنا، یہاں آخری دو معنی میں ہے، یعنی آپ غم نہ کریں، آپ سے پہلے بہت سے رسولوں کو جھوٹا کہا گیا، جھوٹا سمجھا گیا، کسی رسول کو سب نے نہیں مانا جَآءُوْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ، یہ جملہ رُسُلٌ کی صفت ہے، بینات سے مراد معجزات ہیں، زبر جمع زبور کی ہے جس کا مادہ زَبْرٌ ہے بمعنی لکھنا، اچھا کرنا، ڈانٹنا،

اس آیت میں ہے۔

تفسیر

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ مستقل ہے اور اِذْ قَالَتْ اذکر فعل پوشیدہ کا ظرف کیونکہ فرشتوں کا یہ کلام پچھلے کلام سے بہت عرصہ بعد ہوا۔ وہ کلام حضرت مریم کے بچپن شریف میں تھا۔ اور یہ کلام ان کے حاملہ ہونے کے وقت (روح المعانی و کبیر وغیرہ) اسی لئے اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے یہاں یاد کرو پوشیدہ نکالا۔ بعض کے خیال میں یہ اِذْ پہلے اِذْ قَالَتْ کا ظرف ہے۔ اور یہ دونوں کلام فرشتوں نے ایک ہی وقت میں کئے۔ یعنی حضرت مریم کے بچپن شریف میں۔ بعض نے فرمایا کہ یہ اِذْ يُلْقُوْنَ کا بدل ہے۔ اور اس کا عامل مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ ہے۔ یعنی آپ اس وقت بھی بایں جسم وہاں موجود نہ تھے۔ جب فرشتے بی بی مریم سے کہہ رہے تھے کہ فرشتوں اور مریم کی گفتگو ایسی غیبی چیز ہے جو مورخین کو بھی نہیں معلوم ہو سکتیں۔ یہ خبریں آپ کی نبوت کی قوی دلیل ہیں۔ ان اعتبارات سے اس آیت کے تین معنی ہوں گے۔ مگر پہلا معنی زیادہ قوی۔ ظاہر یہ ہے کہ قالت سے ظاہر ظہور گفتگو مراد ہے۔ جیسے پہلے قالت میں عرض کیا جا چکا۔ ملائکہ سے جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔ یعنی اس وقت کو بھی یاد کرو۔ جب حضرت جبریل علیہ السلام نے ظاہر ظہور مریم سے یہ کہا تھا يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ یہ جملہ قَالَتْ کا مقولہ ہے۔ يُبَشِّرُ بشارت سے بنا جس کے معنی بارہا بیان ہو چکے۔ ب صلہ کی ہے۔ اور کلمۃ سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ آپ کو کلمۃ اللہ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ آپ کی پیدائش بغیر باپ لفظ کن سے ہوئی (کلمہ بمعنی لفظ) جیسے سخی کو سراپا جود کہہ دیتے ہیں۔ یا اس لئے کہ آپ کا چرچا پچھلی کتابوں میں بہت تھا (کلمہ بمعنی متکلم فیہ و مذکور) چنانچہ توریت شریف کی بیسویں فصل پانچویں دفتر میں ہے۔ کہ اللہ نے سینا سے توجہ کی اور ساعیر سے بجلی ڈالی۔ اور فاران سے ظاہر ہوا۔ سینا کوہ طور اور ساعیر بیت المقدس کا پہاڑ جہاں عیسیٰ علیہ السلام عبادت کرتے تھے اور فاران مکہ مکرمہ کا پہاڑ جہاں حضور ﷺ نے عبادت فرمائی۔ یا اسلئے کہ آپ ہدایت دین میں مثل کلمہ کے ہیں جیسے کلمہ کی برکت سے کافر مومن ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی آپ کی برکت سے بے دین دیندار بن جاتے تھے۔ یا اس لئے کہ آپ دم فرما کر بیماروں کو اچھا کرتے تھے گویا آپ کی بات میں بیماروں کی شفا تھی۔ مِنْهُ کا مِنْ تبعیضیہ نہیں ہے۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ جز وکل سے پاک ہے۔ بلکہ ابتدائیہ ہے۔ اور ثابت کا متعلق ہو کر کلمہ کی صفت ہ کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ یعنی اے مریم تمہیں اللہ ایسے فرزند کی خوشخبری دیتا ہے جو رب کی طرف سے کلمہ ہے۔ اِسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اسم بعض کے نزدیک وسم سے بنا بمعنی نشانی و پہچان۔ لغت میں ہر نشانی کو اسم کہتے ہیں۔ مگر اصطلاح میں صرف نام کو۔ یہاں یا تو لغوی معنی میں ہے کیونکہ یہ تینوں عیسیٰ علیہ السلام کے نام نہیں۔ بلکہ مسیح آپ کا لقب ہے۔ عیسیٰ نام اور ابن مریم کنیت۔ یعنی ان کی پہچان اور نشانی یہ ہے کہ وہ مسیح ہیں۔ عیسیٰ ہیں اور ابن مریم ہیں۔ اس صورت میں کہ تینوں لفظ اسمہ کی خبریں ہیں۔ یا اسم اصطلاحی معنی میں ہے بمعنی نام اور اس کی خبر عیسیٰ ہے۔ ابن مریم صفت اور مسیح وضاحت کے واسطے لایا گیا۔ جیسے کوئی کہے کہ میرا نام خان بہادر عبداللہ خاں حنفی قادری ہے۔ تو خان بہادر اور حنفی قادری نام نہیں اسمہ کی ضمیر کلمہ کی طرف لوٹتی ہے۔ چونکہ کلمہ سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور وہ مذکر لہٰذا ضمیر مذکر لائی گئی مسیح آپ کا لقب ہے۔ جو نبوت کے بعد ملا۔ جیسے صدیق و فاروق بعض کے نزدیک یہ لفظ عبرانی سے معرب ہے۔ اصل میں مشیخ تھا بمعنی

صبر تلخ ہے مگر اس کے پھل میٹھے ہیں،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ**: کفار کا کفر اور جھوٹوں کا جھوٹ ان کی تردید کے لئے بیان کرنا برا نہیں، دیکھو رب تعالیٰ نے یہود کا جھوٹ بیان فرما کر ان کی تردید فرمائی، ہاں اس جھوٹ سے راضی ہو کر اس کی اشاعت کرنے کے لئے بیان کرنا منع ہے، فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ جو ہر سنی بات بیان کر دے وہ بھی جھوٹا ہے، **دوسرا فائدہ**: نبی پر، کتاب الٰہی پر، اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا بدترین جرم ہے اور طریقہ یہود، اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو جھوٹی اور گندی باتیں قرآن شریف یا حدیث شریف کی طرف نسبت کر دیتے ہیں، اور پھر آیات واحادیث میں کھینچ تان کر کے اس پر چسپاں کرتے ہیں، جیسا کہ آج کل عام طور پر ہو رہا ہے، **تیسرا فائدہ**: ایمان میں رسول مقدم ہیں، آسمانی کتاب اور دیگر چیزیں بعد میں، دیکھو ان لوگوں نے یہاں ایمان کے ساتھ رسول کا ذکر کیا نہ کتاب وغیرہ کا، **چوتھا فائدہ**: ثبوت نبوت کے لئے ایک معجزہ بھی کافی ہوتا ہے، اپنی طرف سے معجزے مقرر کر کے اس کا مطالبہ کرنا طریق یہود ہے جیسا کہ حَتّٰى يَاْتِيَنَا الخ سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ**: سارے نبی قربانی کا معجزہ نہیں لائے صرف چند حضرات ہی لائے جیسا کہ رُسُلٌ کی تنوین تقلیلی سے معلوم ہوا، مگر مطلقاً معجزہ ہر پیغمبر کے پاس تھا، **چھٹا فائدہ**: قتل نبی، وایذائے نبی انکار نبوت کی دلیل ہے جیسا کہ قَتَلْتُمُوْهُمْ سے معلوم ہوا، دیکھو رب تعالیٰ نے استہزائے نبی کو کفر قرار دیا ہے کہ فرمایا لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ (توبہ:٦٦) فقہاء فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کو گندگی میں ڈالنا کفر ہے، کہ یہ انکار قرآن کی دلیل ہے، ان کا ماخذ یہ آیت بھی ہے، یوں ہی حضور انور ﷺ کی سنتوں اور یا نسبتوں کا مذاق اڑانا کفر ہے کہ یہ انکار نبی کی علامت ہے، حتیٰ کہ امام یوسف کے سامنے کسی نے کہا کہ کدو حضور انور ﷺ کو محبوب تھا، دوسرا بولا مگر مجھے پسند نہیں، آپ نے اس سے توبہ کرائی، اگر توبہ نہ کرتا، تو آپ اسے قتل کرا دیتے، ان سب کا ماخذ یہ آیت کریمہ بھی ہے، **ساتواں فائدہ**: قول کی تصدیق عمل سے ہوتی ہے، جس کا عمل اس کے قول کے خلاف ہو وہ جھوٹا ہے، دیکھو رب تعالیٰ نے یہاں یہود کو جھٹلانے کے لئے ان کی بد عملی یعنی قتل انبیاء کو پیش فرمایا، آج جو کہتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی سے مدد نہ مانگو، مگر خود مدد مانگنے کے لئے حاکموں، حکیموں، وکیلوں، مالداروں کے دروازوں پر پھرتے ہیں، وہ اپنے عمل سے خود جھوٹے ہیں، ایسے ہی جو کہتے ہیں کہ اولیاء اللہ کی قبور پر قبہ وغیرہ بنانا حرام ہے، امام ضامن باندھنا شرک ہے، مگر خود قائداعظم کے مزار کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے پر شرکت کریں، اس کام کی تعریف کریں، اور صدر ایوب صدر پاکستان کے بازو پر امام ضامن باندھیں، وہ اپنے عمل سے اپنی خود تردید کرتے ہیں، **آٹھواں فائدہ**: پچھلی آسمانی کتابیں معجزہ نہ تھیں، صرف قرآن شریف آسمانی کتاب بھی ہے اور معجزہ بھی، دیکھو یہاں الْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ کو بینات پر معطوف کیا گیا، اور معطوف ہمیشہ معطوف علیہ کا غیر ہوتا ہے (تفسیر کبیر) **نواں فائدہ**: کفار کے جھٹلانے اور اسلام قبول نہ کرنے پر دل تنگ نہ ہونا چاہیے بلکہ صبر کے ساتھ تبلیغ کئے جائے کام کرنا ہمارے ذمہ ہے انجام خدا کے قبضہ میں،

(۶) نیز موسیٰ علیہ السلام نے امت مصطفیٰ ﷺ ہونے کی تمنا کی تھی جو پوری نہ ہو سکی عیسیٰ علیہ السلام کو یہ فخر حاصل ہوا (۷) نیز آپ دنیا میں مقبول الدعا ہوئے۔ اور آپ کے ہاتھ پر مردے زندہ اور بیمار شفایاب ہوئے۔ ان وجوہ سے آپ دنیا میں عزت والے ہیں۔ آخرت میں بھی آپ کی خصوصی عزت کئی طرح ظاہر ہوگی۔ دیگر انبیائے کرام نہ شفاعت فرمائیں گے نہ شفیع المذنبین کا صحیح پتہ دیں گے۔ اِذۡهَبُوۡٓا اِلٰی غَيۡرِیۡ کہیں گے۔ عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں جن سے شفیع المذنبین کا صحیح پتہ لگے گا (۲) نیز قیامت کے دن طلب شفاعت کے وقت پیغمبر اپنی کوئی خطا یاد فرمائیں گے ہم سے فلاں خطا ہوئی تھی ہم شفاعت کیسے کریں سوا عیسیٰ علیہ السلام کے کہ یہ اپنی کوئی خطا نہ بیان فرمائیں گے اسی لئے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام سے کوئی خطا سرزد نہ ہوئی۔ اس لحاظ سے آپ کے متعلق فرمایا گیا وَجِيۡهًا فِی الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ۔ یا وجیہ وہ ہے جس کی بات مانی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ان کی شان یہ ہے کہ دنیا میں بھی رب تعالیٰ ان کی ہر بات مانے گا۔ اور آخرت میں بھی اور کیوں نہ مانے کہ وہ رب کی ہر بات مانتے ہیں۔ حضور انور ﷺ فرماتے ہیں کہ میری امت میں بعض وہ ہوں گے جو پراگندہ بال و پریشان حال ہوں گے مگر لَوۡ اَقۡسِمُ عَلَی اللّٰهِ لَاَ بَرَّهٗ اگر رب تعالیٰ پر قسم کھالیں تو رب ان کی قسم پوری فرما دے۔ جب ولی کی بات اس قدر مانی جاتی ہے۔ تو آپ تو کلمۃ اللہ اور روح اللہ نبیوں میں بہت شاندار نبی ہیں۔ دوسرا وصف یہ کہ وَمِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ یہ وجیھا پر معطوف ہے۔ اور کائناً پوشیدہ کا متعلق۔ مقرب تقریب سے بنا جس کا مادہ قرب ہے۔ بعد کا مقابل اس سے یا قرب درجہ مراد ہے یا قرب مکانی، پہلی صورت میں معنی یہ ہوئے کہ وہ اللہ سے قرب رکھنے والوں یعنی انبیاء میں سے ہوں گے۔ دوسری صورت میں یہ معنی ہوئے کہ وہ مقربین یعنی فرشتوں میں سے ہوں گے۔ کہ ان کے ساتھ رہیں گے ان کی سی عبادت کریں گے اور بغیر ظاہری غذا چوتھے آسمان پر زندہ رہیں گے (کبیر و معانی وغیرہ) چوتھی صفت یہ کہ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِی الۡمَهۡدِ وَكَهۡلًا صحیح یہ ہے کہ واؤ عاطفہ ہے نہ کہ حالیہ اور جملہ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ پر معطوف ہے۔ (کبیر) یکلم کلام سے بنا بمعنی بات۔ الناس اس لئے فرمایا گیا کہ آپ نے لوگوں سے گفتگو پیدا ہونے کے بعد کی۔ ورنہ والدہ کے شکم میں ہی توریت شریف پڑھتے تھے۔ جسے حضرت مریم سنتی تھیں (خازن و روح البیان از مجاہد) سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ پیدائش کے بعد عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں سے صرف ایک بار کلام کیا پھر اپنی عمر پر پہنچ کر بولے (خازن و روح المعانی) مگر ابن اخشید نے کہا کہ آپ بچپن میں ہمیشہ ہی کلام فرماتے رہے (روح المعانی) مہد کے معنی ہیں شروع و ابتدا اسی لئے شروع کلام کو تمہید کہا جاتا ہے اصطلاح میں بچے کے جھولے اور گہوارے کو مہد کہتے ہیں کیونکہ بچہ وہیں رہتا ہے پھر کچھ دن بعد گہوارے میں لٹایا جاتا ہے۔ آپ نے اپنی پیدائش کے کچھ دیر بعد لوگوں سے کلام کیا کہ جنگل میں پیدا ہوئے ماں آپ کو لے کر شہر آئیں شہر کے دروازے پر ہی لوگوں نے گھیر لیا جن سے آپ نے نہایت فصیح و بلیغ کلام کیا۔ ابھی گہوارے میں جھولنے کی عمر ہی نہ ہوئی تھی ہاں پھر بعد میں جو کلام ہوئے وہ گہوارے میں تھے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ مہد کے ایسے معنی کئے جائیں جو گود اور گہوارہ دونوں کو شامل ہوں کہل کے لغوی معنی بڑھاپے اور جوانی کی درمیانی حالت ہے۔ جس کی ابتدا چالیس سال سے ہے اور بڑھاپے کی ابتدا پچپن سال سے۔ چونکہ آپ جوانی یعنی تینتیس سال کی عمر میں اٹھائے گئے اور واپس آکر چالیس سال اور زندہ رہیں گے آپ کی کل عمر شریف تہتر برس ہوگی۔ اس لئے کہول ہو کر بولنا آپ کے حق میں

بچہ خوش ہو گیا، ماں گئی بچہ رونے لگا، دن بھر میں کئی مرتبہ یہ واردات اس پر گذرتی ہے، دنیا دار کا بھی یہی حال ہے، کہ جب دنیا آئی اکڑ گیا، جب دنیا گئی، بچھڑ گیا، مولانا فرماتے ہیں، شعر

گر تو سنگ و صخرہ و مرمر شوی   چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

کسی شاعر نے کیا مزے کا شعر لکھا ہے، شعر

عَدوی البَلِیْدِ اِلَی الجَلِیْدِ سَرِیْعَۃٌ   وَالجَمْرُ یُوْضَعُ فِی الرَّمَادِ فَیَخْمُدُ

یعنی خسیس نفیس پر جلد اثر کر لیتا ہے، راکھ کی صحبت چنگاری کو بجھا دیتی ہے، (تفسیر روح البیان) لہٰذا کوئی اپنے پر اعتماد کر کے بری صحبت اختیار نہ کر لے،

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ
ہر جان چکھنے والی ہے موت کو اور بات یہی ہے کہ
ہر جان کو موت چکھنی ہے اور تمہارے بدلے تو
اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ
تم پورے دیے جاؤ گے اپنی اجرتیں قیامت کے دن تو جو کوئی آگ سے دور
قیامت ہی کو پورے ملیں گے تو جو
النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ
رکھا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ یقیناً کامیاب ہو گیا اور نہیں ہے
آگ سے بچا کر رکھا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچا اور
الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾
دنیوی زندگی مگر دھوکے کا سامان
دنیا کی زندگی تو یہی دھوکے کا مال ہے

تعلقات

اس آیت کا گذشتہ آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** گذشتہ آیت میں نبی کریم ﷺ کو گذشتہ انبیائے کرام کے حالات سنا کر تسلی تشفی دی گئی تھی، اب اس آیت میں آئندہ آنے والی موت کی طرف دھیان دلا کر تسلی دی جا رہی ہے کہ یہ تکالیف عارضی ہیں کیونکہ ان تکالیف کی جگہ یعنی دنیا بھی عارضی ہے (روح المعانی و کبیر) **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں کفار کی ضد اور ڈھٹائی کا ذکر کیا گیا، اب اس ضد کی انتہاء اور اس کے انجام کا ذکر ہے، کہ یہ ضد ہمیشہ نہ رہے گی، موت کو

قرب رکھنے والوں سے ہوں گے۔ یا انسان ہو کر ملائکہ مقربین میں سے ہوں گے۔ کہ کچھ زمانہ انہی کی طرح زندگی گذاریں گے اور انہی کی سی عبادت کریں گے اور ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ لوگوں سے گہوارے اور پختہ عمر میں یکساں فصیح وبلیغ وحکیمانہ کلام فرمائیں گے۔ دوسرے بچوں کی طرح نہ ہوں گے کہ پہلے بے معنی لفظ بولیں پھر عمدہ یا ان کا بچپن میں کلام کرنا بھی معجزہ ہو گا۔ اور بڑھاپے میں بولنا بھی معجزہ کہ آسمان سے اتر کر کلام فرمائیں گے۔ ان سب کے باوجود وہ خاص نیک کاروں میں سے ہوں گے۔ کہ نہ کبھی خطا کریں گے اور نہ انہیں نیکیاں کرنے میں کچھ تکلف ہوگا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام بغیر والد پیدا ہوئے جیسا کہ کَلِمَةٍ مِّنْهُ اور ابن مریم سے معلوم ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** حضرات انبیائے کرام اللہ کے نزدیک بڑے عزت وجاہت والے بندے ہیں جو انہیں رب تعالیٰ کی بارگاہ میں ذلیل جانے وہ خود ذلیل وکمین ہے۔ دیکھو یہاں رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو دنیا اور آخرت میں وجیہہ فرمایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے لئے فرمایا وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا (احزاب:۶۹) ہمارے حضور ﷺ کے لئے فرمایا وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (منافقون:۸) جو دیوبندی اور وہابی اسمٰعیل دہلوی کی پیروی میں حضرات انبیاء کرام کو ذلیل کہیں بے دین ہیں۔ **تیسرا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر تشریف لے گئے اور وہاں فرشتوں کے ساتھ ان کی سی زندگی گزار رہے ہیں جیسا کہ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ آسمان سے تشریف لائیں گے۔ اور لوگوں کو ہدایت دیں گے جیسا کہ **وکھلا** سے معلوم ہوا۔ کیونکہ بڑھاپے میں کلام کرنا جب ہی معجزہ ہوسکتا ہے کہ اس میں کوئی خصوصیت ہو ورنہ ہر بڈھا باتیں کرتا ہے۔ **پانچواں فائدہ:** انبیائے کرام کی نعت گوئی سنت الہیہ ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی نعت ارشاد فرمائی۔ بعض نیکیاں صرف انسان کرتے ہیں جیسے جہاد میں شہید وزخمی ہونا حج کی مشقتیں جھیلنا کہ یہ نیکیاں نہ ملائکہ کر سکتے ہیں نہ جنات' بعض نیکیاں صرف فرشتے کرتے ہیں۔ جیسے ہمیشہ عبادت میں رہنا وغیرہ۔ بعض نیکیاں وہ ہیں جو جن وانس وفرشتے سب کرتے ہیں جیسے نماز اور رب تعالیٰ کی اطاعت مگر ایسا کوئی کام نہیں جو خدا تعالیٰ بھی کرے اور جن وانس وفرشتے بھی سوا۔ نعت انبیائے کرام اور مناقب اولیاء اللہ کے کہ یہ کام خالق ومخلوق میں مشترک ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (احزاب:۵۶) رب نے کسی حکم میں اپنا اور اپنے فرشتوں کا ذکر نہ کیا سواء درود شریف کے تو جو حضور کی نعت اولیاء کے مناقب بیان کرتا ہے وہ سنت الہیہ سنت ملائکہ سنت انبیاء سب پر عمل کرتا ہے اور انبیائے کرام کے کمالات کا سب سے پہلے انکار کرنے والا ابلیس ہے۔ آج جو ان کے کمالات کا انکار کرے انہیں اپنے جیسا ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اس سنت ابلیسی پر کار بند ہے۔ **چھٹا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام نہ خدا ہیں' نہ خدا کے بیٹے نہ خدائی شان کے مالک' کیونکہ ابن مریم ہونا گہوارے میں جھولنا۔ پھر عمر کے انقلابات آنا' بڈھا ہونا سب بندگی کی علامات ہیں۔ **ساتواں فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام ضرور آسمان سے اتریں گے۔ کیونکہ آپ کہولت سے پہلے تینتیس سال کی عمر میں آسمان پر گئے۔ اگر آپ اب آسمان سے نہ آئیں تو کھلا کے معنی نہیں درست ہو سکتے۔ **آٹھواں فائدہ:** کبھی اسلام کو شرافت ماں کی طرف سے بھی ملتی ہے۔ اور کبھی ماں

خاص حساب کا دن مع انتہاء ہے، قیامت کی انتہاء جنت و دوزخ کو ہے، لہٰذا آیت صاف ہے، یَوْمَ بمعنی وقت ہے نہ کہ بمعنی دن کہ قیامت میں دن رات نہ ہوں گے، سورج دن نہ نکالے گا، تجلی رب تعالیٰ کے نور کی ہوگی، چونکہ اس دن سب کھڑے ہوں گے یا اپنی قبروں سے اٹھیں گے اسی لئے اسے قیامت کہتے ہیں یعنی کھڑے رہنے یا اٹھنے کا دن یعنی موت تو ہر جاندار کو آنی ہے مگر انسانو! سزا و جزا صرف تم ہی کو ملنی ہے، اور وہ سزاء جزاء مکمل طور پر صرف قیامت ہی کو ملے گی، دنیا یا برزخ میں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ نہ پوری سزاء ہے نہ پوری جزاء، پورے بدلہ کا دن صرف قیامت ہے، فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ، ف تفصیل کی ہے، یہ جملہ تُوَفَّوْنَ کا تفصیل بیان ہے، مَنْ سے مراد صرف انسان ہیں جنات و ملائکہ اس سے بھی خارج ہیں کہ جنت میں ثواب انسان ہی کو ہے، زُحْزِحَ زَحْزَحَةٌ سے بنا بمعنی دور رکھنا، جلدی سے کھینچ لینا، پیچھے رکھنا، چنانچہ اعتراض اٹھ جانے پر کہتے ہیں زاح السوال، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ الخ (بقرہ:۹۶) نار سے مراد دوزخ کے تمام طبقے ہیں گرم ہوں یا سرد کہ وہاں دونوں گرمی و سردی آگ کی وجہ سے ہیں زُحْزِحَ اور اُدْخِلَ مجہول فرما کر بتایا گیا کہ آگ سے بچنا، جنت میں پہنچنا محض انسان کے کمال سے نہیں بلکہ عطائے ذوالجلال سے ہے، جنت کے معنی اور اس کی پوری تحقیق پہلے پارے کے شروع میں ہو چکی، کہ اس کے معنی ہیں چھپنا اور گھنا باغ، فَازَ فَوْزٌ سے بنا جس کے معنی ہیں کامیابی کے ساتھ بھلائی پالینا، چونکہ یہاں ہر قسم کی کامیابی مراد ہے نہ کہ خاص کامیابی، اس لئے فَازَ کا مفعول بیان نہ ہوا، یعنی جو انسان اللہ کے فضل و کرم سے اس دن آگ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا حقیقۃً کامیاب وہ ہی ہوا، دنیا میں مالدار، عیالدار، تاجدار ہونا حقیقی کامیابی نہیں، وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ یہ نیا جملہ ہے واؤ ابتدائیہ ہے، یہاں دنیا لفظاً اگرچہ حَيٰوة کی صفت ہے مگر معنیً مضاف الیہ، حیوٰت موت کا مقابل ہے بمعنی زندگی یعنی روح کا جسم میں رہنا، دنیا کی زندگی وہ ہے جو غفلت میں گذرے، جس زندگی میں آخرت کی تیاری کر لی جاوے، وہ دنیا میں زندگی تو ہے مگر دنیا کی زندگی نہیں، یہاں دنیا کی زندگی کا ذکر ہے متاع وہ سامان ہے جو برت کر چھوڑ دیا جائے جو برت کر فنا کر دیا جائے اسے متاع نہیں کہتے لہٰذا کھانا کپڑا متاع نہیں کہ انہیں کھا پہن کر فنا کر دیا جاتا ہے، مگر برتن بھانڈے مکان وغیرہ متاع ہیں کہ برتنے کے بعد ویسے ہی رہتے ہیں چونکہ دنیا رہ جاتی ہے، دنیا دار برت کر چل دیتا ہے، اس لئے اسے متاع فرمایا گیا، کبھی تجارتی سامان کو بھی متاع کہتے ہیں، یہاں پہلے معنی زیادہ موزوں ہیں، تفسیر روح المعانی نے فرمایا کہ لذتیں، شہوتیں، زینتیں دنیا ہیں، اور ان چیزوں کے سامان متاع دنیا، الْغُرُوْرِ غرور سے بنا بمعنی غفلت دھوکا، غرور مصدر بھی ہے اور غارہ کی جمع بھی، یعنی غفلت پیدا کرنے والے یا دھوکا دینے والے، یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں یعنی دنیا کی زندگی جو غفلت میں گذرے وہ دھوکے کا سامان ہے یا دھوکا دینے والے شیاطین کا سامان، تفسیر کبیر نے فرمایا کہ دنیا اس تجارتی سامان کی طرح ہے جو ملمع کر کے رات کے اندھیرے میں کسی ناواقف کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے کہ دیکھنے میں بڑا خوبصورت ہو، مگر دن نکلنے اور واقف کے بتانے پر اس کی اصلیت کھل جائے، جس سے خریدار کو سخت صدمہ ہو، انسان خریدار ہے، شیطان بیوپاری، دنیا ملمع کیا ہوا سامان جو بظاہر بڑا دلفریب ہے، مگر علماء کے بتانے یا موت آنے سے اس کی اصلیت کھل جاتی ہے، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

طور پر پہنچ کر بڑھاپے میں بھی کلام کرے گا۔ اس میں مقام معرفت تک پہنچنے کی صلاحیت ہے۔ تجھے مبارک ہو کہ تو ایسے پاک قلب کی حاملہ ہونے والی ہے (روح المعانی وابن عربی)

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ

وہ بولیں اے رب میرے کہاں سے ہوگا واسطے میرے فرزند حالانکہ نہ چھوا مجھے بشر نے فرمایا

بولی اے میرے رب میرے بچہ کہاں سے ہوگا مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ نہ لگایا فرمایا

اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ

اسی طرح اللہ پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے جب فیصلہ کرتا ہے کسی چیز کا تو اس کے سوا نہیں کہ کہتا ہے واسطے

اللہ یوں ہی پیدا کرتا ہے جو چاہے جب کسی کام کا حکم فرمائے تو اس سے یہی کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتا ہے

فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾

اس کے ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے اور سکھائے گا انہیں کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل

اور اللہ اسے سکھائے گا کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ

اور رسول ہوں گے وہ طرف بنی اسرائیل کے

اور رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں اس بشارت کا ذکر تھا۔ جو حضرت مریم کو ملائکہ کے ذریعے دی گئی۔ اب حضرت مریم کے تعجب یا خوشی کا ذکر ہے۔ جو انہیں بشارت سے حاصل ہوئی۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں حضرت مسیح کی ولادت کا ذکر تھا۔ اب کیفیت ولادت کا تذکرہ ہے۔ کہ ان کی پیدائش کنواری مریم سے بلا واسطہ شوہر ہوگی۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسیح علیہ السلام کے ظاہری صفات کا ذکر تھا اب ان کے باطنی یعنی علم و حکمت و رسالت کا تذکرہ ہے۔ یہاں خیال رہے کہ حضور ﷺ کی ولادت شریف کے اس قسم کے بلکہ اس سے اعلیٰ قسم کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام کی ولادت پر قسم قسم کے معجزات کا ظہور ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ تمام احادیث و تاریخی واقعات قابل قبول ہیں۔ کہ حدیث ضعیف عمل امت قبول علماء اور تائید قرآن سے قوی ہو جاتے ہیں۔ دیکھو حدیث اَنَا نُوْرٌ مِّنْ نُّوْرِ اللّٰهِ اگرچہ ضعیف بھی ہوگی مگر اس کی تائید ان آیات سے ہو رہی ہے قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (مائدہ: ۱۵) اور سِرَاجًا مُّنِيْرًا (احزاب: ۴۶) لہٰذا وہ حدیث قبول ہے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے ان

پانچواں فائدہ: سزاو جزاء اخروی صرف انسانوں کو ہے، فرشتوں یا جنات کو نہیں، جانور، جنات تو بدعملیوں، ظلموں کی سزادے کر مٹی کر دیئے جائیں گے، فرشتے ذکر الٰہی یا اہل جنت کی خدمت کے لئے رکھے جائیں گے، جیسا کہ اُجُوۡرَکُمۡ سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ نے ہر نفس کو یہاں مخاطب نہ فرمایا صرف انسانوں کو مخاطب کیا، **چھٹا فائدہ:** نیک و بداعمال کا پورا بدلہ قیامت ہی کو ملے گا اس سے پہلے نہیں، اس لئے اس قیامت کو یوم الدین یا یوم الجزاء بھی کہتے ہیں جیسا کہ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ سے معلوم ہوا، **ساتواں فائدہ:** نیکیوں کا اجر و ثواب تو پورا ملے گا، جس میں بالکل کمی نہ ہوگی، مگر گناہوں کی سزا کم بلکہ معاف بھی ہو جائے گی جیسا کہ اُجُوۡرَکُمۡ اشارۃً سے معلوم ہوا، **آٹھواں فائدہ:** صرف آگ سے نجات پا جانا پوری کامیابی نہیں کہ یہ تو جنات و جانوروں کو حاصل ہوگی، بلکہ جنت میں داخلہ پوری کامیابی ہے جیسا کہ وَاُدۡخِلَ الۡجَنَّۃَ سے معلوم ہوا، **نواں فائدہ:** آگ سے نجات جنت کا داخلہ، رب تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہی میسر ہوگا نہ کہ اپنی بہادری سے، کوئی شخص بغیر رحمت الٰہی جنت میں نہیں جا سکتا جیسا کہ زُحۡزِحَ اور اُدۡخِلَ مجہول فرمانے سے معلوم ہوا، **دسواں فائدہ:** دنیاوی زندگی پر اعتماد نہ کرنا چاہیے کہ یہ دھوکا ہے بلکہ یہاں جس قدر کمایا جاسکے کمانا چاہیے، جیسا کہ مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ سے معلوم ہوا، دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یہاں کماؤ وہاں کھاؤ، حدیث شریف میں ہے کہ مرد صالح کے لئے مال صالح اللہ کی نعمت ہے (روح المعانی) حضرت صدیق اکبر و عثمان غنی کا مال رحمت تھا، فرعون کا مال عذاب،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر جاندار کو موت آنی ہے، مگر دوسری جگہ قرآن کریم فرماتا ہے فَصَعِقَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰہُ (زمر:٦٨) جس سے معلوم ہوا کہ بعض کو موت نہ آئے گی جیسا کہ اِلَّا کے استثناء سے معلوم ہوا، **جواب:** تفسیر کبیر و روح المعانی وغیرہ نے یہاں فرمایا کہ کُلُّ نَفۡسٍ سے بعض چیزیں مستثنٰی ہیں اور یہ ہی آیت پیش فرمائی، فقیر کی تحقیق یہ ہے کہ کُلُّ نَفۡسٍ اپنے عموم پر ہے کسی قید کی ضرورت نہیں، تمہاری پیش کردہ آیت میں نفخ صور سے مرنے کا استثناء ہے یعنی قیامت کے دن پہلا صور پھونکنے پر سب فنا یا بے ہوش ہو جائیں گے سوائے چند کے، چنانچہ خود صور اور پھونکنے والے یعنی حضرات اسرافیل، اور حضرت جبرائیل وغیرہ فنا نہ ہوں گے، وہ حکم الٰہی سے فنا ہوں گے تم بھی مر جاؤ، پھر بہت عرصہ کے بعد صور یہ فرشتے بحکم پروردگار پیدا ہوں گے، اور حضرت اسرافیل صور پھونکیں گے، تب تمام لوگ زندہ ہوں گے، لہٰذا نہ تو صور سے سب کی موت ہے نہ صور سے سب کی زندگی بلکہ اکثر کی موت و زندگی ہے لہٰذا وہ آیت کریمہ اس آیت کے عموم کے خلاف نہیں، نیز یہاں موت کا ذکر ہے وہاں صعقہ یعنی غشی کا، چنانچہ پہلے نفخہ پر تمام روحوں کو بھی غشی آ جائے گی مگر موت نہیں کہ روح موت سے علیحدہ ہے، **دوسرا اعتراض:** جنتی حور و غلمان کو بھی موت ہے یا نہیں، اگر ہے تو احادیث بلکہ دوسری آیات کے بھی خلاف ہے، اور اگر نہیں تو اس آیت کے خلاف ہے، **جواب:** اس کا مکمل جواب تو انشاء اللہ وَنُفِخَ فِی الصُّوۡرِ (کہف:٩٩) کی تفسیر میں عرض کیا جائے گا، یہاں اتنا سمجھ لو کہ یہاں نفس سے مراد وہ اجسام ہیں جن میں روح پھونک کر زندہ کیا گیا ہو، حور و غلمان کی زندگی ایسی نہیں، لہٰذا وہ نفس سے خارج ہیں انہیں موت نہیں، **تیسرا**

نہ مادے کی ضرورت نہ کسی آلہ اور اسباب کی حاجت نہ محنت و جانفشانی کی ضرورت اور ممکن ہے کہ کُنْ کہنے سے کلام نفسی مراد ہو۔ جو ان ممکنات سے متعلق ہو جو علم الٰہی میں موجود ہیں (روح المعانی) مگر پہلی توجیہ زیادہ صحیح ہے یعنی رب تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ جب کسی بندے کے پیدا کرنے کا فیصلہ یا حکم فرماتا ہے تو اس معلوم سے کن فرماتا ہے اور وہ ہو جاتی ہے۔ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ یہ یا تو نیا جملہ ہے۔ یا یُبَشِّرُکَ یا یَخْلُقُ پر معطوف۔ ہماری قرأت یُعَلِّمُ ہی سے ہے۔ دیگر قرأتوں میں نُعَلِّمُ نون سے ہے یُعَلِّمُ تعلیم سے بنا بمعنی سکھانا۔ یہاں بلا واسطہ مراد علم فقہ یا علم حلال و حرام یا سارے علوم دینیہ یا سارے عقلی و نقلی علوم ہیں۔ اس صورت میں توریت و انجیل کا ذکر بلا تکلف درست ہوا (روح المعانی و کبیر) روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علم کتابت کے دس حصے کئے۔ نو حصے عیسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائے۔ اور ایک حصہ میں ساری دنیا۔ (روح المعانی) چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام بہت خوش خط تھے۔ اور ممکن ہے کہ کتاب سے مراد زبور ہو یا مطلقاً آسمانی کتابیں۔ اور علم کتاب سے الفاظ کا علم مراد ہے اور حکمت سے اس کے اسرار و رموز اس صورت میں توریت انجیل کتاب کا بیان ہے۔ یا خاص بعد عام اور ہوسکتا ہے کہ کتاب سے مراد قرآن شریف ہو۔ اور حکمت سے مراد حدیث پاک۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے واپس آکر امت مصطفیٰ ﷺ کے بڑے مجتہد ہوں گے اور قرآن و حدیث کے بڑے ماہر حالانکہ کسی سے نہ پڑھیں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے دو حصے ہوں گے پہلا حصہ آسمان پر جانے سے پہلے اور دوسرا حصہ آسمان سے آنے کے بعد پہلے حصہ میں وہ توریت و انجیل کے بڑے ماہر ہوں گے۔ دوسرے حصے میں چونکہ توریت و انجیل کا چراغ گل ہو چکا ہوگا قرآن و حدیث مصطفوی کا سورج چمک رہا ہوگا اس لئے وہ قرآن و حدیث کے بڑے عالم ہوں گے کہ زمین پر جا کر نہ حنفی ہوں گے نہ شافعی نہ مالکی وغیرہ خود مجتہد اعظم ہوں گے نیز نہ قادری ہوں گے نہ چشتی نقشبندی بلکہ خود بانی سلسلہ ہوں گے۔ یہ تمام علوم انہیں رب ہی سکھائے گا کسی معلم روحانی یا جسمانی سے نہ سیکھیں گے۔ چونکہ قرآن و حدیث توریت و انجیل سے افضل ہیں۔ اس لئے رب تعالیٰ نے افضل کا ذکر پہلے کیا۔ اگرچہ ترتیب میں قرآن و حدیث کی تعلیم بعد میں ہے اور توریت و انجیل کی تعلیم پہلے وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ یہ واؤ بھی عاطفہ ہے۔ اور جملہ یُعَلِّمُهٗ پر معطوف ہے۔ اور رَسُوْلًا یکون فعل پوشیدہ کی خبر اور ممکن ہے نبعثہ کا حال ہو۔ بنی اسرائیل فرمانے میں یہود کا رد ہے کہ عام یہود ان کی نبوت کے منکر تھے۔ اور ان میں فرقہ عنانیہ ان کی نبوت کا معتقد تو تھا مگر ایک خاص قبیلہ کی طرف۔ اس میں اختلاف ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو نبوت کب ملی۔ بعض نے فرمایا کہ آپ مادر زاد نبی تھے۔ کیونکہ آپ نے پیدا ہوتے ہی فرمایا وَاٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا (مریم: ۳۰) بعض کے نزدیک تین سال کی عمر میں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ بالغ ہو کر آپ پر وحی آئی۔ بعض نے فرمایا کہ آپ کو نبوت تیس سال کی عمر میں ملی۔ اور تین سال تین مہینے تین دن تبلیغ فرما کر آسمان پر تشریف لے گئے۔ یہ یہی قول زیادہ مشہور ہے۔ (روح المعانی)

لطیفہ: انسان میں پہلے نبی آدم علیہ السلام اور آخری نبی حضور ﷺ ہیں۔ اور بنی اسرائیل میں پہلے نبی یوسف علیہ السلام اور آخری نبی عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

خلاصہ تفسیر

حضرت مریم نے جب فرزند کی بشارت اور ان کے اوصاف سنے تو ازراہ تعجب یا نوعیت دریافت کرنے کے لئے بولیں کہ اے

خطابات میں روئے سخن عاقلوں بالغوں سے ہوتا ہے، غیر مکلف عقلی طور پر ان احکام سے مستثنیٰ ہوتے ہیں، دیکھو رب تعالیٰ فرماتا ہے اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ (بقرہ: ۴۳) نماز قائم کرو، اور فرماتا ہے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (بقرہ: ۱۸۳) اور فرماتا ہے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ (بقرہ: ۲۱۶) ان سب آیتوں میں خطاب مطلق ہے، مگر روئے سخن عاقلوں، بالغوں سے ہے، ایسے ہی یہاں بھی ہے، **ساتواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن سب کو اعمال کی اجرتیں پوری ملیں گی، تو جن کے پاس اعمال ہی نہ ہوں جیسے دیوانے اور ناسمجھ بچے، انہیں کس چیز کا بدلہ ملے گا؟ اور وہ کہاں جائیں گے؟ **جواب:** انہیں اللہ کا فضل ملے گا اور وہ انشاء اللہ جنت میں جائیں گے، یہاں جنت کسبی کا ذکر ہے، وہ اعمال سے ہے، **آٹھواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ دنیوی زندگی دھوکا ہے، تو رب تعالیٰ نے اسے پیدا ہی کیوں فرمایا، دھوکہ کی چیز کا پیدا کرنا بھی تو برا ہے، **جواب:** ہرگز نہیں، بلکہ دھوکا دینا برا ہے، زہر پیدا کرنا برا نہیں، کسی کو دھوکا دے کر زہر کھلانا برا ہے، اگر رب تعالیٰ نے ہمیں اس پر مطلع نہ کیا ہوتا یا اس حیات دنیوی کو اچھا بتایا ہوتا اور ہوتی بری، تو یہ دھوکا دینا ہوتا، جب وہ بار بار اعلان فرما رہا ہے کہ اس کی ٹیپ ٹاپ میں پھنسنا مت، یہ ایک دھوکا ہے، تو پھر رب تعالیٰ نے دھوکا کہاں دیا، نیز ہمیں زندگی آخرت کی تیاری کرنے کے لئے ملی، اگر ہم یہ نہ کریں اور اس میں پھنس کر رہ جائیں، تو ہم نے اسے دھوکا بنا لیا، بہر حال عیب دار ہم ہیں،

تفسیر صوفیانہ

ہر نفس کو موت آنی ہے، مگر نفس تین قسم کے ہیں، تو ان کی موتیں بھی تین طرح کی، ایک وہ جن کے لئے موت ہے مگر حشر نہیں، جیسے عام جانور کہ ان میں سے جو زندہ کئے بھی جائیں گے، تو کچھ دیر کے لئے، اور پھر ایک دوسرے کا بدلہ دلا کر فنا کر دیئے جائیں گے، دوسرے وہ جنہیں دنیا میں موت ہے اور آخرت میں حشر، جیسے عام انسان، فرشتے، جنات، شیاطین، تیسرے وہ نفس جنہیں موت دنیا میں ہے اور حشر دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، کہ وہ ایک آن کے لئے مرتے ہیں، پھر دائمی حیات پا لیتے ہیں، جیسے حضرات انبیاء کرام و شہداء اور خاص مومنین، یہ وہ نفوس ہیں جو عشق کی تلوار سے جیتے جی ہی مر گئے اور مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا پر عمل کر گئے، ان کی فنا فِی اللّٰهِ اور لِلّٰهِ ہے، تو ان کی بقاء بِاللّٰهِ ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ (انعام: ۱۲۲) اس آیت کریمہ میں اسی صوفیانہ موت و حیات کا ذکر ہے جو دنیا میں ہی اللہ والوں پر طاری ہوتی ہے، اور وہ آیت اس آیت كُلُّ نَفْسٍ الخ کی تفسیر ہے، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ آگ سے دوری، جنت کی حضوری (داخلہ) گناہوں سے بچنے اور طاعتوں میں جلدی کرنے سے میسر ہوتی ہے، یہ اسی کو حاصل ہوگا، جو مقام نفس سے نکل کر حرمِ دل میں داخل ہو جائے، جو اس حرم میں آیا امن میں آ گیا وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (آل عمران: ۹۷) اب پڑھو یہ آیت فَمَنْ زُحْزِحَ الخ (آل عمران: ۱۸۵) یہ آگ سے دوری جنت میں داخلہ دنیا میں ہی ہو رہا ہے، بعض لوگ سستی جنت نہیں خریدتے، اور دوزخ بڑی مہنگی خرید لیتے ہیں، لاکھوں روپے فسق و گناہ میں خرچ کرتے ہیں اور دوزخ خریدتے ہیں، چند پیسے اللہ کی راہ میں نہیں دیتے اور جنت نہیں خریدتے، ان کے لئے دنیا متاع غرور ہے، شیخ سعدی

جامع ہیں۔ اور رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (انعام:۹۰) اور خط و کتابت کمالات انبیاء میں سے ہے۔ کہ عیسیٰ و ادریس علیہما السلام اس کے ماہر تھے۔ اس کی پوری تحقیق ہماری کتاب شان حبیب الرحمٰن میں دیکھو۔ اسی تفسیر میں بھی انشاء اللہ اس آیت کے ماتحت آئے گی وَلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (عنکبوت:۴۸) چنانچہ حضور ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقعہ پر صلح نامہ کی ابتدا میں محمد رسول اللہ کاٹ کر محمد ابن عبد اللہ خود لکھا تھا۔ کفار مکہ بضد تھے کہ آپ اپنا نام شریف یوں لکھیں آپ نے ہی لکھا۔ خرپوتی شریف میں حضرت امیر معاویہ کی روایت سے بیان فرمایا کہ حضور انور ﷺ نے مجھے قلم پکڑنا دوات رکھنا بسم اللہ کی سین دراز کر کے لکھنا سکھایا تاکہ میں وحی لکھا کروں۔ **چوتھا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام کو علم لدنی عطا ہوا کہ بغیر استاد سے پڑھے آسمانی کتابوں کے پورے واقف تھے۔ جیسا کہ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ سے معلوم ہوا۔ اور علم کسبی خواہ کتنا ہی ہو علم لدنی کا مقابلہ نہیں کر سکتا بجلی و گیس خواہ کتنی ہی پاور کے ہوں سورج و چاند کا مقابلہ نہیں کر سکتے کہ بجلی کا نور کسبی ہے۔ اور سورج چاند کا نور لدنی نیز بڑے استاد کے شاگرد بھی بڑے ہوتے ہیں تو یقیناً رب تعالیٰ کے شاگرد و حضرات انبیاء کرام تمام خلق سے بڑے عالم ہیں۔ **پانچواں فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام قرآن شریف و حدیث شریف سے واقف ہو کر آسمان سے تشریف لائیں گے۔ کیونکہ بغیر کسی سے پڑھے اسلام کے بڑے مجتہد ہوں گے۔ اور اجتہاد قرآن و حدیث کے علم کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ فائدہ الکتاب کی تیسری تفسیر سے حاصل ہوا۔ اور علم کتاب تمام علوم سے اعلیٰ ہے علم ابدان سے علم ادیان اعلیٰ کہ علم ابدان کا تعلق جسم سے ہے اور علم ادیان کا تعلق روح دل سے۔ چونکہ جسم سے روح اعلیٰ ہے۔ لہٰذا علم ادیان اعلیٰ اور تمام علوم ادیان میں علم کتاب اعلیٰ کہ کتاب خود اعلیٰ چیز ہے۔ تو اس کا علم بھی اعلیٰ ہے۔ **چھٹا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کے نبی ہیں۔ جیسا کہ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ سے معلوم ہوا۔ لہٰذا حضور انور ﷺ کے والدین عیسائی نہ تھے۔ کیونکہ وہ بنی اسمٰعیل ہیں۔ اس کی تحقیق پہلے سیپارہ میں ہو چکی۔ سارے عالم کا نبی ہونا ہمارے حضور ﷺ کی خصوصیت ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (الفرقان:۱) کسی عیسائی کو حق نہیں کہ ہم لوگوں کو عیسائی ہونے کی دعوت دے کیونکہ ہم لوگ بنی اسرائیل نہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کے نبی ہیں۔ **ساتواں فائدہ:** اب جب بھی عیسیٰ علیہ السلام زمین پر آئیں گے تو نبی نہ ہوں گے بلکہ اسلام کے مجتہد مجدد ولی ہوں گے خیال رہے کہ تمام نبیوں کی نبوتیں وقت اور قوم سے محدود تھیں مگر حضور ﷺ کی نبوت کسی چیز سے محدود نہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب مسلمان خدا کے سوا دوسروں کی پہلے سے ہستی نہیں مانتے تو کن سے کہا گیا اور کس نے سنا اور کون ہو گیا اس کا جواب مسلمان سات جنم میں بھی نہیں دے سکتے۔ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** اس اعتراض کا نہایت نفیس جواب پہلے سیپارہ میں اسی آیت کی تفسیر میں گزر گیا۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ یہ عبارت قدرت الٰہی کے اظہار کے لئے ہے۔ یعنی وہ آریوں کے پرمیشور کی طرح کسی کو بنانے میں روح مادہ کا حاجتمند نہیں۔ بلکہ غنی بے نیاز ہے صرف اس طرف توجہ اور ارادہ کر دیتا ہے کہ وہ چیز ہو جاتی ہے وہ روح و مادہ کا بھی خالق ہے اور کن کا بھی۔ یہ لفظ عربی میں مستقل اختیار کے لئے بولا جاتا ہے کاف ونون فرماتا مراد نہیں رب کو اس سے کلام کی نفسی یا ادبی جملفظ سے بے نیاز ہے اور جو چیزیں علم الٰہی میں موجود تھیں ان

تعلقات

اس آیت کے گذشتہ آیت سے چند طرح تعلق ہیں، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں آنے والی موت اور آئندہ ملنے والے ثواب کا ذکر فرما کر مسلمانوں کی تسلی کی گئی تھی کہ گھبراؤ مت، ان تمام تکالیف کا خاتمہ ہونے والا ہے، یہ تکالیف عارضی ہیں، اب آئندہ لئے جانے والے امتحانوں کا ذکر فرما کر مسلمانوں کو تسلی ہی دی جا رہی ہے کہ آئندہ تمہارے امتحانات ہوں گے گھبرانا مت گویا موجودہ تکالیف سے تسلی تشفی گذشتہ آیت میں دی گئی تھی اور آئندہ پیش آنے والی تکالیف سے تسلی اس آیت میں دی جا رہی ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ دنیا، دار محنت وغرور ہے، اب بتایا جا رہا ہے کہ دنیا جائے امتحان ہے، یہ دونوں مسلمانوں کے صبر واجر کے لئے ہیں، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں دنیا کی تکالیف کا اجمالی ذکر تھا، اب اس آیت میں دنیاداروں کی طرف سے پہنچنے والی تکالیف کا تذکرہ ہے،

شانِ نزول

اس آیت کریمہ کے نزول کے متعلق چند روائتیں ہیں،

۱۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق کی معرفت قبیلہ بنی قینقاع کے سردار فنحاص کے پاس ایک خط بھیجا جس میں فرمایا گیا تھا کہ مشرکین کے مقابل تم ہماری مدد کرو، اور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تاکید فرمائی گئی تھی کہ تم اگر فنحاص کی طرف سے کوئی تکلیف دہ بات سنو، تو اس سے جنگ نہ کرنا، جب صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ خط فنحاص کو دیا، تو وہ بولا کیا تمہارا رب تھک گیا جو ہم سے مدد مانگی جاتی ہے؟ جناب صدیق نے اسے قتل کرنا چاہا، مگر سرکار کا حکم یاد آیا اور واپس آگئے، تب یہ آیت کریمہ اتری (تفسیر خازن وکبیر)

۲۔ امام واحدی نے عروہ ابن زبیر سے روایت کی کہ اسامہ ابن زید کہتے ہیں، ایک بار میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ دراز گوش پر سوار تھا حضور انور ﷺ قبیلۂ بنی حارث میں سعد ابن عبادہ کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے، راستہ میں ایک مقام پر گذرے جہاں مسلمان کفار مشرکین بھی تھے، حضور انور ﷺ نے وہاں قیام فرما کر مجمع کو دعوت اسلام دی، دراز گوش کا غبار اڑ رہا تھا، عبداللہ ابن ابی اپنی ناک پر کپڑا رکھ کر بولا کہ آپ کی یہ باتیں اگر حق ہوں تو اچھی ہوں گی، لیکن ہم کو ہماری مجلسوں میں مت ستایا کرو، جو آپ کے پاس آئے اسے تبلیغ کیا کرو، حضرت عبداللہ ابن رواحہ نے کہا یا رسول اللہ آپ ضرور تبلیغ کریں، ہمیں آپ کی باتیں پیاری معلوم ہوتی ہیں، اس پر مسلمانوں اور کفار میں تو تو میں میں ہوگئی قریب تھا کہ مار پیٹ ہو جاتی، لیکن نبی کریم ﷺ نے بہت حلم وتدبر سے معاملہ رفع دفع فرمایا، اور سعد کے پاس تشریف لے گئے، حضرت سعد سے عبداللہ ابن ابی کی اس حرکت کا ذکر فرمایا، سعد نے عرض کیا، حضور اہل مدینہ عبداللہ ابن ابی کو اپنا سردار چن رہے تھے، آپ کی تشریف آوری سے اسے یہ نمبرداری نہ ملی، اس لئے وہ جل کر یہ باتیں کرتا ہے تب یہ آیت کریمہ اتری (تفسیر روح المعانی) یہ واقعہ بدر سے پہلے کا ہے جبکہ عبداللہ ابن ابی نے اسلام ظاہر نہیں کیا تھا،

۳۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں ایک یہودی تھا کعب ابن اشرف جو شاعر بھی تھا اور مالدار بھی، مشرکین کو

عمران:۵۹) (۲) انہیں عیسیٰ ابن مریم کہا گیا حالانکہ قرآن کریم نے سوا مریم کے کسی عورت کا نام نہ لیا۔ اگر وہ کسی مرد کے فرزند ہوتے تو اس کی طرف ہی نسبت کی جاتی۔ (۳) یہود نے حضرت مریم کو تہمت زنا لگائی تو عیسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں قوت گویائی دے کر ان سے ماں کی عصمت بیان کرائی۔ اگر مریم شادی شدہ تھیں تو یہود تہمت کیوں لگاتے اور اس تہمت کے لئے اتنا بڑا واقعہ کیوں ہوتا۔ صرف یوسف کہہ دیتے کہ یہ میرا بچہ ہے (۴) عیسیٰ علیہ السلام کا لقب روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہوا کیونکہ وہ کلمہ کن سے پیدا ہوئے (۵) قرآن کریم نے ان کی ماں کا یہ قول بار بار نقل فرمایا وَلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ مجھے مرد نے چھوا بھی نہیں اگر نکاح ہو چکا تھا تو اس کہنے کے کیا معنی۔ (۶) حضرت مریم جنگل میں جا کر وضع حمل سے فارغ ہوئیں اگر یوسف کی بیوی ہوتیں تو اس قدر مشقت اٹھانے کی کیا ضرورت تھی وغیرہ وغیرہ رہے تمہارے اعتراضات وہ لغو ہیں کہ معجزہ تو کہتے ہی اسے ہیں جو قانون قدرت کے خلاف ہو اور عجیب ہو۔ پتھروں کا کلام کرنا۔ انگلیوں سے پانی بہنا وغیرہ عصا موسیٰ کا سانپ بن جانا خلاف عادت الٰہیہ ہی تو ہیں دیکھو آدم علیہ السلام اس قانون کے خلاف ہی پیدا ہوئے۔ رہا احصنت فرمانا جناب احصنت احصان سے بنا بمعنی حفاظت اسی سے حصن بمعنی قلعہ ہے اور حصین بمعنی مضبوط ہر پاک دامن پر یہ لفظ بولا جاتا ہے شادی شدہ کو بھی حصن اس لئے کہتے ہیں کہ وہ پاک دامن ہو جاتا ہے پوری آیت یوں ہے وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا (انبیاء:۹۱) وہ مریم جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی (یعنی پاک دامن رہیں) پس ہم نے ان میں اپنی روح پھونکی۔ اگر وہ شادی شدہ ہوتیں تو چاہیے کہ یہ عبارت ہر حلالی انسان پر صادق آ جاتی۔ حضرت مریم کی خصوصیت نہ ہوتی۔ انجیل محرف کتاب ہے اس حوالے سے پیش کرنا حماقت ہی ہے نیز عیسائیوں کا بھی یہ عقیدہ ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بغیر باپ ہوئی۔ بعد میں مریم کا یوسف نجار سے نکاح ہوا۔

لطیفہ: مرزائیوں کو ان تمام تحریفوں کی اس لئے ضرورت پڑی کہ ان کے ولایتی نبی اور بناپتی رسول مرزا قادیانی کو مثیل مسیح بننے کا شوق ہوا۔ مگر ان میں عیسیٰ علیہ السلام کے صفات ندارد تھے اس لئے انہوں نے اس جناب کی صفات کا انکار شروع کر دیا اگر مرزا جی مثیل مسیح ہوتے یا مسیح موعود ہوتے تو عیسیٰ علیہ السلام کی صفات ان میں ہوتیں عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ پیدا ہوئے عیسیٰ علیہ السلام نے لڑکپن میں کلام کیا آپ مردوں کو زندہ پیدائشی اندھوں کو بینا کوڑھیوں کو اچھا کر دیتے تھے گھروں میں چھپ کر کھانے والوں کو ان کے کھائے ہوئے بچائے ہوئے کھانوں کی خبر دے دیتے تھے بتاؤ مرزا جی میں یہ کونسی صفت ہے پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں دوبارہ آ کر دجال کو قتل کریں گے۔ دمشق میں آسمان سے اتریں گے شرک و کفر کو دنیا سے مٹائیں گے تمام عالم میں اسلام پھیلائیں گے بتاؤ مرزا جی میں یہ کونسا وصف ہے۔ مرزا اور مرزائیوں کے پاس سوا باتوں کے اور کیا تھا اور کیا ہے۔ مثل ہونا کام سے ہوتا ہے نہ کہ محض کلام سے اگلی آیتوں میں انشاء اللہ ان کی تحریفوں کی اور بھی پرزور تردید کی جائے گی۔ افسوس ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کیلئے قانون کا بہانہ کرتے ہیں مگر آدم و حوا علیہما السلام کو بلا چون و چرا بغیر ماں باپ پیدا مانتے ہیں۔ دن رات جانور بغیر ماں باپ پیدا ہوتے رہتے ہیں حالانکہ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (انبیاء:۳۰) ہم نے ہر زندہ کو پانی سے بنایا وہاں پانی کا نام بھی نہیں سمندل کیڑا آگ میں پیدا ہو کر آگ ہی میں رہتا ہے وہاں پانی نہیں۔ پانچواں اعتراض: عیسیٰ علیہ السلام کے چار بھائی تھے یوسف، شمعون، یہودا،

درستی ہے کیونکہ برائی کے بدلہ میں برائی کرنے سے زیادہ برائی پھیلتی ہے کہ سامنے والا اور زیادہ برائی کرنے پر آمادہ ہوتا ہے، لیکن صبر کے ذریعہ برائی وہیں رک جاتی ہے اگلا شرمندہ ہو جاتا ہے، غرضکہ صبر دنیوی تکالیف کم کرنے والا ہے، اور تقویٰ اخروی تکالیف کو دفع کرنے والا، فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ یہ جملہ اِنْ تَصْبِرُوْا کی جزاء نہیں، اس کی جزاء تو پوشیدہ ہے بلکہ وجہ جزاء ہے، اس کی ف تعلیلیہ ہے، ذٰلِكَ سے صبر وتقویٰ کی طرف اشارہ ہے، عَزْمِ مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، اس کے معنی ارادہ وقصد بھی ہیں اور ہمت وجرأت بھی، رب تعالیٰ فرماتا ہے کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف: ۳۵) یہاں عزم بمعنی بہادری وہمت ہے، اور فرماتا ہے وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ: ۱۱۵) یہاں عزم بمعنی ارادہ ہے، کہ ہم نے آدم کا ارادہ گناہ نہ پایا، یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں، یعنی یہ صبر وتقویٰ لائق ارادہ کاموں میں سے ہے کہ ہر مومن کو ان کاموں کا ارادہ کرنا چاہیے، یا یہ صبر وتقویٰ، ہمت وبہادری کے کاموں میں سے ہے، بہادر لوگ ان پر کاربند رہتے ہیں، تم بھی صبر وتقویٰ کا دامن مضبوط پکڑو، بہادر بنو، محبوب کی امت ہو،

خلاصہ تفسیر

اے محبوب ﷺ کے جاں نثار صحابہ ہم تم کو اطلاع دے دیتے ہیں کہ تم کو دو قسم کی سختیاں جھیلنا پڑیں گی، ایک یہ کہ تمہارے جانی ومالی امتحانات لئے جائیں گے یا اس طرح کہ تمہارے مالوں میں سے زکوٰۃ، صدقات، قربانیاں، جہادوں میں خرچ وصول کئے جائیں گے، اور جانی بھاری عبادات تم پر لازم کی جائیں گی، روزہ، حج، جہاد وغیرہ یا اس طرح کہ وقتاً فوقتاً تمہارے جانی ومالی نقصان قدرتی طور پر ہوا کریں گے، کہ کبھی بیماری، کبھی اولاد کی موت، کبھی تجارتوں میں نقصانات، کبھی باغوں میں، کھیتوں کی تباہی، کبھی جہاد میں زخمی یا شہید ہونا ہوتا رہے گا، دوسرے یہ کہ تمام اہل کتاب کفار اور سارے مشرکین وکفار سے ایذاء رساں تکلیف دہ باتیں سنا کرو گے، کہ وہ تمہارے دین کا مذاق اڑائیں گے، تمہارے پیغمبر ﷺ پر زبان طعن دراز کریں گے، تم پر پھبتیاں کسیں گے، تمہارے خلاف قصیدے لکھیں گے، حضرت عیسیٰ وعزیر علیہما السلام کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہیں گے، بی بی مریم کو تمہارے سامنے رب تعالیٰ کی بیوی بتائیں گے وغیرہ وغیرہ، اگر تم ان موقعوں پر طیش میں نہ آگئے، صبر کئے رہے، تقویٰ و پرہیزگاری نہ چھوڑ بیٹھے، تو تمہارے واسطے بہت ہی اچھا ہوگا، کیونکہ تقویٰ، صبر بڑی بہادری کے کام ہیں، ان پر بہادر لوگ ہی کاربند رہتے ہیں، **خیال رهے** کہ اگر یہاں صبر سے مراد کفار پر سختی نہ کرنا، ان کی تکالیف پر صبر کئے رہنا، بدلہ نہ لینا، ان پر جہاد نہ کرنا ہے، تب تو یہ حکم منسوخ ہے، اس کی ناسخ آیات جہاد ہیں، اور اگر صبر سے مراد مصیبت میں گھبرا نہ جانا، اہل کتاب کی اخلاق سوز حرکتوں پر طیش میں نہ آنا، اپنے کو بد اخلاق نہ بنانا، ان کی توہین کے جواب میں حضرت عیسیٰ وعزیر اور موسیٰ علیہم السلام کی شان میں گستاخی نہ کر بیٹھنا ہے، تو یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں، مسلمانوں کو تاقیامت یہ حکم ہے، دوسرے معنی زیادہ ظاہر ہیں کیونکہ یہ آیت مدنیہ ہے بلکہ بعض مفسرین کے خیال میں اس کا نزول غزوۂ احد کے بعد ہوا ہے، تو یہ آیت حکم جہاد سے کیسے منسوخ ہو سکتی ہے، خود اس کا نزول حکم جہاد کے بعد ہوا، مدنی آیتیں حکم جہاد سے منسوخ نہیں کہ بعد ہجرت حکم جہاد آ گیا تھا (از کبیر ومعانی وغیرہ مع زیادۃ)

تحقیق میں بیشک لایا تمہارے پاس نشانی طرف سے رب تمہارے کے تحقیق میں بناتا ہوں واسطے تمہارے
یہ فرماتا ہوا کہ میں تمہارے پاس ایک نشانی لایا ہوں تمہارے رب کی طرف سے کہ میں تمہارے لئے مٹی سے
كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ
گارے سے مثل صورت پرندہ کی پس پھونکتا ہوں بیچ اس کے پس ہو جاتا ہے وہ پرندہ ساتھ حکم
پرندہ سی صورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ فوراً پرندہ ہو جاتی ہے اللہ کے حکم سے
وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ
اللہ کے اور اچھا کرتا ہوں پیدائشی اندھے اور کوڑھے کو اور زندہ کرتا ہوں مردہ کو ساتھ حکم اللہ کے اور
اور میں شفا دیتا ہوں مادرزاد اندھے کو اور سفید داغ والے کو اور میں مردے جلاتا ہوں اللہ کے حکم سے اور
اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُیُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ
خبر دیتا ہوں میں تم کو اس کی جو کھاتے ہو تم اور جو جمع کرتے ہو تم بیچ گھروں اپنے کے تحقیق بیچ اس کے
تمہیں بتاتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو بے شک ان باتوں میں تمہارے لئے
لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۚ﴿۴۹﴾
البتہ نشانی ہے واسطے تمہارے اگر ہو تم ایمان والے
بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کی پیغمبری کا ذکر تھا۔ اب ان کے پیغام کا ذکر ہے۔ کہ انہوں نے بنی اسرائیل کو پہلا پیغام کیا دیا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا ذکر تھا۔ اب ان کے معجزات بتائے جا رہے ہیں جو نبوت کی دلیل ہیں۔ گویا پہلے دعویٰ تھا اب دلیل کا ذکر ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کے تقرب اور ان کے مقبول بارگاہ ہونے کا ذکر تھا۔ اب ان کے خصوصی اختیارات کا ذکر ہے۔ جو انہیں رب تعالیٰ کی طرف سے ملے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے علم کتاب وحکمت وغیرہ کا ذکر فرمایا تھا اب فرمایا جا رہا ہے کہ لوگو تم یہ نہ سمجھنا کہ مولویوں کی طرح انہیں صرف شرعی مسئلے ہی معلوم تھے۔ نہیں بلکہ انہیں قدرتیں اور غیبی علوم بھی بخشے گئے جن کے باعث وہ تمام انسانوں سے ممتاز شان کے مالک تھے غرضیکہ آپ کے دینی علوم ومعرفت کا ذکر پچھلی آیت میں تھا۔ اور آپ کی قدرتوں عطائی علم غیب کا ذکر اس آیت میں ہے۔

میں اور اس آیت کی تفسیر میں دے چکے ہیں کہ امتحان ہمیشہ ممتحن کے علم کے لئے نہیں ہوتا، کبھی دوسروں کو بتانے دکھانے کو ہوتا ہے، کبھی بھلے برے کی چھانٹ کے لئے اور عطائے درجات کے لئے بھی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے امتحانات ان آخری حکمتوں پر مبنی ہیں، **دوسرا اعتراض:** پھر رب تعالیٰ صرف مومنوں مخلصوں کا ہی کیوں امتحان لیتا ہے کفار کا کیوں نہیں لیتا، وہ بھی تو رب کے بندے ہیں اس کی نعمتیں کھاتے ہیں، **جواب:** اس لئے کہ درجات مومنین کو ملتے ہیں، امتحان اسی کا لیا جاتا ہے جسے نوکر رکھنا ہو، کچھ دینا ہو، ہر ایک کا امتحان کوئی نہیں لیا کرتا، سونے کو ہی کسوٹی پر کسا جاتا ہے پیتل تانبے کو کوئی نہیں کستا، **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو کفار و مشرکین کی گستاخی پر ہمیشہ صبر ہی کرنا چاہیے، خواہ وہ رب تعالیٰ کو گالیاں دیں یا اسلام کو قرآن کو یا انبیاء کو اولیاء کو تو پھر مسلمان ان گستاخوں کو قتل کیوں کر دیتے ہیں؟ فقہاء فرماتے ہیں کہ نبی کے گستاخ کی توبہ قبول نہیں، اسے قاضی قتل ہی کرائے گا، فقہ کا یہ حکم اس آیت کے خلاف ہے، **جواب:** اس کا جواب ابھی تفسیر میں گذر چکا کہ اگر صبر سے مراد گستاخوں کو سزا نہ دینا ان پر جہاد نہ کرنا ہو تو یہ آیت جہاد سے منسوخ ہے جیسے مسامحت، اعراض و چشم پوشی کی دوسری آئتیں، اور اگر صبر سے مراد یہ ہے کہ تم ان کی گستاخی کے بدلہ میں اگلے نبیوں کی شان میں گستاخی نہ کرو، تو یہ حکم تا قیامت باقی ہے، کوئی مسلمان اس کی جرأت نہیں کر سکتا کہ عیسائیوں، یہودیوں کی گستاخی کے جواب میں حضرت عیسیٰ و موسیٰ علیہما السلام کی شان میں گستاخی کرے، تفسیر کبیر نے یہاں فرمایا کہ صبر و تقویٰ سے مراد نرمی کے ساتھ تبلیغ کرنا ہے، رب تعالیٰ نے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو حکم دیا تھا فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (طٰہٰ: ۴۴) **چوتھا اعتراض:** وَاِنْ تَصْبِرُوْا الخ کی جزاء فَاِنَّ ذٰلِكَ الخ کیسے ہو سکتی ہے، اس سے تو آیت کے معنی فاسد ہو جائیں گے کیونکہ معنی یہ ہوں گے کہ اگر تم صبر کرو تو صبر بہادری کا کام ہے، تو کیا اگر ہم صبر نہ کریں وہ بہادری کا کام نہیں؟ **جواب:** ہم تفسیر میں عرض کر چکے ہیں کہ فَاِنَّ کی ف جزائیہ نہیں بلکہ تعلیلیہ ہے وَاِنْ تَصْبِرُوْا کی جزاء پوشیدہ ہے، آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر تم صبر و تقویٰ اختیار کرو تو بہت اچھا ہے کیونکہ یہ بہادری کا کام ہے،

تفسیر صوفیانہ

اللہ تعالیٰ نے مومن کی زندگی کو مصیبتوں، بلاؤں، دشمنوں سے گھیر دیا ہے، اور ان سب پر صبر کا حکم دیا، کیونکہ نفس انسانی سخت زمین کی طرح ہے جس میں ایمان و عرفان معرفت رحمان کے باغ و کھیت لگانے ہیں اور سخت زمین کو نرم کرنے کے بعد ہی یہ سب کچھ لگایا جا سکتا ہے، یہ ساری آفتیں و مشکلات وہ ہل یا ٹریکٹر ہیں جس سے یہ زمین نرم پڑتی ہے، چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ ہمیشہ آرام سے رہنے والے لوگ حد بندگی سے نکل جاتے ہیں، فرعون، نمرود، شداد نے اسی لئے دعوائے خدائی کر دیا کہ ان کے نفسوں پر یہ ہل نہ چلے تھے، اور جب فرعون غرقابی میں گرفتار ہوا، تو پکار اٹھا کہ مولیٰ بنی اسرائیل کی طرح میں بھی ایمان لاتا ہوں، مگر چونکہ کاشت کا وقت نکل چکا تھا، اس لئے اس کا یہ ہل چلانا بیکار رہا، اس آیت میں اسی جانب اشارہ ہو رہا ہے کہ مسلمانو تمہاری زمین نفس پر یہ ہل چلتے رہیں گے، گھبرا نہ جانا، صبر کرنا، اگر صبر کر گئے، تو دیکھنا اس نفس میں کیسے باغ لگتے ہیں، مولانا فرماتے ہیں، شعر

جوتے کے برابر کر دیا اسی لئے برابر حصہ کو خلاق کہتے ہیں۔ مَالَهُ فِي الْأٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (بقرہ: ۱۰۲) لائق اور مستحق کو خلیق کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے فلاں خلیق بکذا۔ فلاں اس کام کے لائق ہے چکنے پتھر کو صخرة خلقاً غرضکہ اس کے بہت سے معنی ہیں شاعر کہتا ہے

وَلَاَنْتَ تَفْرِیْ مَا خَلَقْتَ وَبَعْضُ الْقَوْمِ یَخْلُقُ ثُمَّ لَا یَفْرِیْ

دوسرا کہتا ہے

وَلَا یُعْطِیْ بِاَیْدِی الْخَلِقِیْنِ وَلَا اَیْدِی الْخَوَالِقِ اِلَّا جَیِّدًا لِاَدِمٍ

یہاں بمعنی بنانا یا گھڑنا ہے (تفسیر کبیر و معانی) لکم میں لام نفع کا ہے۔ من الطین اخلق کے متعلق ہے کھیئة کا کاف اسمیہ اخلق کا مفعول بہ یا حرف ہے۔ تشبیہ کے لئے ثابت کے متعلق ہو کر صورتا پوشیدہ کی صفت ہیئت باب تفعیل کا اسم مصدر ہے۔ بمعنی اسم مفعول اس کے لفظی معنی ہیں تیاری اس سے تھیئو ہے کہا جاتا ہے تَھَیَّأ لا کل کھانے کی تیاری کی رب تعالیٰ فرماتا ہے وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا (الکہف: ۱۰) نیز فرماتا ہے وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ اَمْرِكُمْ مِرْفَقًا (کہف: ۱۶) مگر اصطلاح میں بمعنی مشکل صورت آتا ہے۔ یہاں یہ ہی مراد ہے طیر طائر کی جمع ہے۔ بمعنی اڑنے والا اس کا مصدر طیران ہے۔ اس کی جمع طیور ہے قرآن کریم میں عمل اور تقدیر کو طائر کہا گیا فرماتا ہے وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ (اسراء: ۱۳) نیز ہر حرکت کرنے والی چیز کو بھی طائر کہہ دیتے ہیں حدیث شریف میں خواب کے بارے میں کہا گیا وَهِيَ عَلٰى رِجْلِ طَائِرٍ یہاں طیر حقیقی معنی میں ہے بمعنی چڑیا اور اس سے جنس مراد۔ جو اسے بلا وجہ مجازی معنی میں لے وہ گمراہ ہے کہ ایک پیغمبر کے معجزہ کا منکر ہے۔ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ اَنْفُخُ نفخ سے بنا بمعنی پھونکنا ہر پھونکنے کو نفخ کہا جاتا ہے۔ خواہ منہ سے پھونکنا ہو یا کسی آلہ سے یا روح پھونکنا جیسے وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (صٓ: ۷۲) اور جیسے وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ (یٰسین: ۵۱) بگل میں پھونکا گیا اور جیسے قَالَ انْفُخُوْا حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا (کہف: ۹۶) یہاں دھونکنی سے آگ پھونکنا مراد ہے۔ شیطان کے دم کرنے کو بھی نفخ کہا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ نَفْخِهٖ فیه کا مرجع هيئت ہے۔ یا کاف اسمیہ اذن سے مراد ارادہ یا رب تعالیٰ کا حکم ہے۔ یعنی اے لوگو میں تمہیں سمجھانے کے لئے تمہارے سامنے گارے سے چڑیا کی شکل بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے سچ مچ پرندہ بن جاتا ہے جسے تم اڑتے ہوئے دیکھتے ہو بظاہر یہ ایک معجزہ ہے۔ مگر درحقیقت بہت سے معجزوں کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ پرندے میں پر، چونچ، پنجے، کھال، خون، گوشت، دل، کلیجی، پھیپھڑا غرضیکہ ان گنت چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک مٹی سے ان سب چیزوں کا بن جانا اس میں روح پڑ جانا بہت سے معجزات ہوئے۔ جیسے ہمارے نبی کریم ﷺ کی برکت سے حضرت طلحہ و جابر کے گھر گوشت و آٹے میں ایسی برکت ہوئی چار سیر آٹے کی روٹیاں اور تھوڑا گوشت تقریباً دو ہزار آدمیوں نے کھالیا اور ویسا ہی رہا۔ شوربے میں نمک، مرچ، گھی، مصالحے پھر جلنے والی لکڑی پکانے والی کے ہاتھ میں طاقت یہ سب چیزیں ہی عالم غیب سے آگئیں۔ پھر یہاں طیر سے مراد جنس پرندہ ہے۔ جس پرندہ کی فرمائش کرو مجھ سے بنوالو۔ ایک ہی مٹی ابھی چمگادڑ ابھی اس مٹی کا بقیہ کوا، چیل، کبوتر بنا سکتا ہوں۔ میرا دوسرا معجزہ یہ ہے کہ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ جملہ اخلق پر معطوف ہے۔ اُبْرِئُ ابراء سے بنا جس کا مادہ برّاء

اجمالی ذکر ہے کہ وہ تکلیف دہ باتیں کیا ہیں، ان پوپ پادریوں کا توریت وانجیل کی آیات نعت چھپانا اور اس کے خلاف ظاہر کرنا، گویا یہ آیت پچھلی آیت کا اجمالی بیان ہے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں پوپ پادریوں کا مسلمانوں کو تکلیف دینے کا ذکر تھا، اب اس کی وجہ بیان ہو رہی ہے کہ یہ لوگ ان ایذاء رسانیوں سے اپنے پیٹ پال رہے ہیں کہ اسی ذریعہ سے اپنے معتقدین سے پیسے کماتے کھاتے ہیں، پھر تمہاری ایذاء سے باز کیسے آئیں، یہ تو ان کا بزنس اور کاروبار ہوا، خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کھاتی انہی کے نام پر ہے، کوئی ان کے گیت گا کر اور کوئی ان کے اوصاف چھپا کر، **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں سے فرمایا گیا تھا کہ تم یہود کی ایذاء پر صبر کرنا، اب ارشاد ہو رہا ہے کہ انہوں نے تم سے زیادہ تو مجھے ایذاء پہنچائی کہ میرے معاہدوں کو توڑا اور میری کتابوں سے منہ موڑا، مگر میرا صبر دیکھو کہ میں انہیں روزی بھی دے رہا ہوں، ان پر عذاب نہیں بھیجتا، تو تم بھی صبر کرو کہ صبر سنت الٰہیہ ہے، صبر پر کاربند رہو۔

تفسیر

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔ اذ ظرفیہ ہے جس کا مظروف فعل اُذْكُرْ یا ذَكِّرْ پوشیدہ ہے، یعنی اے محبوب یاد کرو یا لوگوں کو یاد دلاؤ، مِيْثَاقَ وَثِقَ یا وَثُوْق کا مصدر ہے بمعنی مفعول وَثِقَ کے معنی ہیں مضبوطی، اصطلاح میں مضبوط وعدہ کو میثاق کہا جاتا ہے، جس کے پورا نہ کرنے پر کچھ سزا بھی مقرر کی گئی ہو، وعدہ، عہد، میثاق اور اصر کے معانی اور ان میں فرق ہم تیسرے پارے کی تفسیر میں عرض کر چکے ہیں، سیدنا ابن جبیر، ابن عباس وعکرمہ فرماتے ہیں الَّذِيْنَ سے مراد صرف یہودیوں کے پوپ ہیں، مگر حضرت علقمہ فرماتے ہیں کہ اس سے یہودیوں کے پوپ بھی مراد ہیں اور عیسائیوں کے پادری بھی (تفسیر روح المعانی وکبیر) پہلی صورت میں کتاب سے مراد توریت شریف ہے، دوسری صورت میں توریت وانجیل دونوں، مگر کتاب دیئے جانے سے مراد ان کتابوں کا علم دیا جانا ہے، یعنی اے محبوب وہ وقت یاد کرو یا ان اہل کتاب کو یاد دلاؤ یا مسلمانوں کو یاد کراؤ جبکہ رب تعالیٰ نے ان لوگوں سے مضبوط عہد لیا تھا جنہیں توریت وانجیل دونوں کا علم دیا گیا، یہ عہد کب لیا گیا یا تو یثاق کے دن یا توریت وانجیل میں انبیائے کرام کی معرفت لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ، یہ اس عہد کا بیان ہے لَتُبَيِّنُنَّ تَبيِيْنٌ سے بنا جس کا مادہ بیان ہے بمعنی اظہار تَبيِيْن کے معنی ہیں خوب بیان کرنا، آہستہ آہستہ سمجھا کر بیان کرنا کہ سننے والے کے دل میں اتر جائے، یا ہمیشہ بیان کرتے رہنا، تاکہ لوگ بھول نہ جائیں، ہٗ کا مرجع یا میثاق ہے یا کتاب یا حضور انور ﷺ کی ذات با برکات یا حضور انور ﷺ کی صفات (تفسیر کبیر وروح المعانی) سدی وابن جبیر کا یہی قول ہے کہ ہٗ کا مرجع حضور انور ﷺ ہیں چونکہ آپ سب کو معلوم ہیں، اس لئے بغیر ذکر کئے ہوئے ادھر ضمیر لوٹ گئی (معانی) ہماری قرأت لَتُبَيِّنُنَّ ت سے ہے جس میں اس وقت یعنی یثاق کے دن کا کلام دہرایا گیا ہے، جیسے وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ (الاسراء: ۴) وغیرہ مگر ابو بکر، عاصم، ابو عمرو کی قرأت میں لَيُبَيِّنُنَّ ی سے ہے لئے ہوئے عہد کا بیان، بہر حال خطاب یا ذکر پوپ وپادریوں کا ہے وہ ہی اس فعل کا فاعل ہیں، لِلنَّاسِ سے مراد یا تو عوام یہود ونصاریٰ ہیں یا عام لوگ، دوسرے معنی زیادہ ظاہر ہیں اگر اس زمانہ کے لوگ مراد ہوں، تو بیان سے قولی بیان مراد ہوگا، اور اگر عام لوگ مراد ہوں خواہ

ہے۔ یعنی ان میرے معجزات میں تمہارے لئے میری نبوت پر کھلی ہوئی نشانی ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یہ علیحدہ جملہ ہے۔ اس کی جزاء پوشیدہ ہے۔ مومنین سے مراد ایمان کی توفیق والے ہیں یا ایمان کو قبول کرنے والے۔ پہلی صورت میں اٰمَنُوْا پوشیدہ ہے اور دوسری صورت میں اِطْمَئِنُّوْا یعنی اگر تمہیں رب نے ایمان کی توفیق دی ہے تو مجھ پر ایمان لے آؤ یا اگر تم ایمان لا چکے ہو تو ان معجزات کو دیکھ کر اور زیادہ مطمئن ہو جاؤ۔

خلاصہ تفسیر

اے مریم تمہارے فرزند عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے رسول ہوں گے اور انہیں یہ تبلیغ کریں گے کہ اے اسرائیلیو میں سچا نبی ہوں رب کی طرف سے میری صداقت پر کھلی نشانی میرے پاس موجود ہے۔ وہ یہ کہ میں تمہارے سامنے گارے سے چڑیا کی شکل بناتا ہوں علیحدگی یا اکیلے میں نہیں بناتا تاکہ تمہیں کچھ شک وشبہ ہو یا یہ تمام تمہارے نفع کے لئے ہے تاکہ تم کو اس معجزے کے ذریعہ ایمان میسر ہو محض کھیل تماشہ کے لئے نہیں اور اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ پرندہ بن جاتی ہے یہ معجزہ میری نبوت کی دلیل ہے یہ دیکھ کر تم مجھے خدا نہ کہنا کیونکہ یہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہے نیز مجھے رب تعالیٰ نے یہ معجزہ دیا کہ میں مادر زاد اندھے اور کوڑھوں کو پھونک مار کر شفا بخشتا ہوں جن کے علاج سے طبیب عاجز ہیں اور اس کے علاوہ مردے کو دم کر کے باذن اللہ زندہ کرتا ہوں جو کہ طبیبوں کے نزدیک ناممکن بات ہے میری قدرت کی تو یہ کیفیت ہے اور میرے علم کا یہ حال ہے کہ جو کچھ تم میری غیر موجودگی میں اپنی کوٹھڑیوں میں بیٹھ کر کھاتے اور بچاتے ہو اس کی میں تمہیں خبر دے سکتا ہوں کہ تم نے اتنا کھایا اور اتنا بچایا۔ ان معجزات میں میری حقانیت کی کھلی ہوئی نشانی ہے اگر توفیق ہو تو مجھ پر ایمان لے آؤ خیال رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے یہ مراتب شکریہ کے طور پر بیان فرمائے نہ کہ فخر وتکبر کے لئے تاکہ لوگ آپ کے ان مراتب کو مان کر مومن عارف بنیں نبی کے مراتب جاننے ہی کا نام تو ایمان ہے لہٰذا آپ کا یہ فرمان عالی شکر بھی ہے اور تبلیغ بھی نیز آپ نے اس وقت اپنے عمومی صفات بیان نہ کئے کہ میں تم جیسا بشر ہوں بندہ مجبور ہوں مجھے تو دیوار کے پیچھے کی بھی خبر نہیں بلکہ خصوصی صفات بیان فرمائے کیونکہ انبیاء کرام کے عمومی اوصاف بشریت وغیرہ ماننے کا نام ایمان نہیں یہ صفات تو شیطان و ابو جہل بھی مانتا تھا ایمان اس کا نام ہے کہ حضرات انبیاء کے خصوصی صفات مانے جائیں اس لئے کلمہ طیبہ میں **محمد رسول اللہ** ﷺ پڑھا جاتا ہے **محمد بشر** مثلاً نہیں کہا جاتا۔

واقعات: روایات میں ان واقعات کی تفصیل یہ ہے کہ جب آپ نے یہ دعوے کئے تو لوگوں نے کہا کہ اچھا ہمیں مٹی سے چمگادڑ بنا کے دکھاؤ اس انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ چمگادڑ میں چند خصوصیتیں ہیں۔ جو دوسرے پرندوں میں نہیں ہوتیں (۱) اس میں ہڈی نہیں ہوتی صرف گوشت اور خون ہے (۲) اس کے پر نہیں ہوتے یہ گوشت سے اڑتی ہے (۳) یہ انڈے نہیں دیتی بلکہ بچے دیتی ہے حالانکہ چڑیاں انڈے ہی دیا کرتی ہیں (۴) اس کی چھاتی پر پستان ہوتے ہیں جس سے اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہے (۵) اس کی چونچ نہیں بلکہ منہ ہوتا ہے (۶) اس کے منہ میں دانت بھی ہوتے ہیں جس سے وہ چباتی ہے اور ہنستی بھی ہے (۷) اسے حیض بھی آتا ہے (۸) یہ دن کی روشنی میں نہیں دیکھ سکتی (۹) بلکہ رات کے اندھیرے میں بھی اس کی آنکھیں بے کار ہوتی ہیں صرف طلوع سے ایک گھنٹہ پہلے اور غروب کے ایک گھنٹہ بعد تک دیکھ سکتی ہے (روح المعانی وخازن وخزائن

دیدہ و دانستہ کیا کہ اپنے ماتحتوں سے نذرانے، ہدیے لئے اور حضور انور ﷺ کی نعت کی آئتیں چھپائی ہی نہیں بلکہ بدل ڈالیں تاکہ اپنے معتقدین میں ان کی نمبرداری و چوہدریت قائم رہے، خیال رکھو کہ ان کی یہ تجارت بہت گھاٹے کی ہے کہ انہوں نے مال سے قیمت خریدی ہے جس کے وبال میں ہمیشہ رہیں گے،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ**: دینی علماء کو بڑی اہمیت حاصل ہے، ان کی درستی میں دین کی درستی ہے اور ان کے بگڑ جانے سے دین کا فساد اور قوم کی تباہی ہے، دیکھو رب تعالیٰ نے یثاق کے دن یا توریت میں علماء سے علیحدہ عہد لیا کہ تم درست رہنا تاکہ لوگ درست رہیں، یہ فائدہ لِلنَّاسِ کے لام سے حاصل ہوا، **دوسرا فائدہ** علماء کتاب الٰہی کے امین ہیں، امین اگر امانت داری سے کام لے تو اس کا بڑا درجہ ہے اگر خیانت کرے تو بڑا مجرم ہے، علماء اگر کتاب اللہ کو چھپائیں یا اس میں غلط تاویلیں کریں تو خائن ہیں اور رب تعالیٰ کے بھی مجرم ہیں قوم کے بھی، اور اگر صحیح تبلیغ کریں تو ان کے برابر کسی کا ثواب نہیں، یہ فائدہ لَتُبَيِّنُنَّهُ سے معلوم ہوا، یہ مت سمجھو کہ یہ پابندیاں اور تاکیدی احکام صرف علماء اہل کتاب کے لئے ہی تھے، علمائے اسلام پر بھی یہ فرائض عائد ہوتے ہیں، **تیسرا فائدہ**: شرعی مسئلہ چھپانا حرام ہے، علماء پر لازم ہے کہ اپنے علم سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچائیں، جیسا کہ فَنَبَذُوْهُ سے معلوم ہوا، **چوتھا فائدہ**: علماء کو چاہیے کہ اپنا لباس وضع قطع عالموں کی سی رکھیں تاکہ لوگ انہیں عالم سمجھ کر مسائل پوچھ لیا کریں، عالم کا غیر عالم کے لباس میں رہنا بہتر نہیں، خطرہ ہے کہ یہ بھی علم چھپانے میں داخل ہو جائے، **پانچواں فائدہ**: تقیہ حرام ہے کیونکہ اپنا ایمان و علم ظاہر کرنا ضروری ہے، اور تقیہ میں یہ سب چھپایا جاتا ہے، یہ فائدہ بھی لَتُبَيِّنُنَّهُ سے حاصل ہوا، **چھٹا فائدہ**: روپیہ لے کر احکام شرعی بدلنا یا چھپانا حرام بلکہ قریباً کفر ہے جیسا کہ وَاشْتَرَوْا بِهٖ الخ سے معلوم ہوا، قرآن شریف چھاپ کر فروخت کرنا، تعلیم قرآن پر اجرت لینا، امامت، مدرسی پر تنخواہ لینا اس میں داخل نہیں، ورنہ علمائے متاخرین اسے کبھی جائز نہ رکھتے، حضرات خلفائے راشدین نے امامت کبریٰ یعنی خلافت پر تنخواہیں لی ہیں سوائے حضرت عثمان غنی کے، **ساتواں فائدہ**: دین بیچ کر جتنی دولت بھی وصول کی جائے تھوڑی ہے کیونکہ وہ حرام دنیا ہے، جب حلال دنیا تھوڑی ہے قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ (نساء: ۷۷) تو حرام دنیا کا کیا کہنا، یہ فائدہ ثَمَنًا قَلِيْلًا سے حاصل ہوا، **آٹھواں فائدہ**: علم دین چھپانا حرام ہے، قتادہ فرماتے ہیں جو علم بتایا نہ جائے، وہ اس مدفون خزانہ کی طرح ہے جس سے کچھ خرچ نہ کیا جائے، اور جو حکمت ظاہر نہ کی جائے، وہ اس بت کی طرح ہے جو نہ کھائے نہ پیئے، ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جس سے علمی مسئلہ پوچھا جائے وہ چھپالے، تو قیامت میں اس کے منہ میں آگ کی لگام دی جائے گی، سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے جاہلوں کو علم سیکھنے کا حکم پیچھے دیا، پہلے علماء کو علم سکھانے کا حکم دیا، (تفسیر خازن و روح المعانی)

اعتراضات

پہلا اعتراض: دوسری آیتوں میں دو ہی یثاقوں کا ذکر ہے ایک رب تعالیٰ کی ربوبیت کا وعدہ جو سب سے لیا گیا،

تھے (روح المعانی) اٹھ کر پوچھنے لگے کہ کیا قیامت آ گئی عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ نہیں بلکہ میں نے تمہیں اسم اعظم سے زندہ کیا۔ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ مجھے پھر واپس بھیج دیا جائے اور اب سکرات کی شدت نہ ہو چنانچہ اسی وقت ان کا انتقال ہو گیا۔ (روح المعانی وخازن وخزائن) نیز آپ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ تم نے کل کیا کھایا ہے اور آج کیا کھاؤ گے اور اگلے وقت کے لئے تم نے کیا کھانا تیار کر رکھا ہے کیونکہ آپ کی نگاہ نزدیک دور کھلی چھپی اندھیرے اجالے پس پردہ وغیرہ تمام کو دیکھتی تھی۔ کوئی چیز آپ کے لئے حجاب نہ تھی اس واقعہ میں آپ کے چند معجزے ظاہر ہوتے ہیں نزدیک دور سے آپ کی آنکھ کا دیکھنا بیک وقت سب پر نظر کہ کون کیا کھا رہا ہے اور بچا رہا ہے پس پردہ اور اندھیرے میں نگاہ کا کام کرنا۔ دل کے ارادوں پر مطلع ہونا چنانچہ آپ کے پاس بچے بہت جمع رہتے۔ آپ انہیں بتاتے کہ تمہارے گھر فلاں چیز تیار ہوئی ہے اور تمہارے گھر والوں نے تمہارے لئے فلاں فلاں چیز اٹھا رکھی ہے۔ بچے گھر جاتے تو رو کر گھر والوں سے وہ چیز مانگتے وہ پوچھتے کہ تمہیں کس نے بتایا بچے کہتے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے آخر ان لوگوں نے مشورہ کیا کہ اگر ہمارے بچے عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہے تو بگڑ جائیں گے اور ان پر ایمان لے آئیں گے چنانچہ ان سب نے ان بچوں کو ایک گھر میں بند کر دیا عیسیٰ علیہ السلام نے جب محسوس کیا کہ بچے نہ آئے تو آپ ان کی تلاش میں یہاں پہنچے اور لوگوں سے پوچھا کہ بچے کہاں گئے۔ تو لوگوں نے کہا کہ وہ یہاں نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا پھر اس گھر میں کون ہے انہوں نے کہا کہ اس میں ہمارے سور ہیں فرمایا اچھا سب سور ہو گئے۔ چنانچہ وہ سب سور بن گئے۔ (خزائن و روح المعانی ابن عساکر عن عبداللہ ابن عمرو ابن عاص) مگر عبدالرزاق نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ مسخ کا واقعہ خوان اترانے کے بعد ہوا جس کا قصہ سورۂ مائدہ میں آ رہا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ دونوں دفعہ ہوا ہو نیز یا تو آپ یہی دونوں خبریں دیا کرتے تھے یا غیب کی ساری خبریں سناتے تھے مگر خصوصیت سے ان ہی دو کا ذکر کیا گیا کیونکہ انسان کو اکثر کھانے کا خیال رہتا ہے (روح المعانی)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حضرات انبیاء کرام باذن پروردگار دافع البلاء دافع وباء ہوتے ہیں دیکھو پیدائشی اندھا ہونا۔ یوں ہی کوڑھی ہونا عظیم بلا اور وباء ہے مگر عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں اسے دفع کرتا ہوں لہٰذا ان محبوبوں کو دَافِعُ الْبَلَآءِ وَالْوَبَاءِ وَالْقَحْطِ وَالْمَرَضِ وَالْاَلَمِ کہنا بالکل درست ہے۔ جب بارش کے قطرے دافع قحط ہوتے ہیں بعض جڑی بوٹیاں دافع جریان دافع بخار ہوتی ہیں ایک شربت کا نام فریاد رس ہے ایک دوا کا نام شافی ہے تو کیا حضرات انبیاء کرام کی برکات و فیوض ان جڑی بوٹیوں سے بھی کم ہیں حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میری یہ قمیص لے جاؤ اسے میرے والد کی نابینا آنکھوں کی شفاء کے لئے ان کے چہرے پر ڈال دو ان کی آنکھیں اچھی ہو جائیں گی یہ ہے دَافِعُ الْبَلَاءِ وَالْوَبَاءِ کی جلوہ گری۔ **دوسرا فائدہ:** نبی کی شان پہچاننا ایمانیات میں سب سے مقدم ہے دیکھو عیسیٰ علیہ السلام نے سب سے پہلے لوگوں کو اپنی پہچان کرائی کہ مجھ میں یہ صفات ہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں کیونکہ جس نے نبی کو مانا اسے ان کے سارے فرمان ماننے پڑیں گے۔ ہمارے نبی ﷺ نے بھی سب سے پہلے لوگوں کو اپنی پہچان کروائی۔ کہ بتاؤ مجھے کیا سمجھتے ہو سب نے عرض کیا کہ ہم آپ کو سچا اور امین جانتے ہیں۔ **تیسرا فائدہ:** انبیائے کرام رب تعالیٰ کے

تفسیر صوفیانہ

رب تعالیٰ نے شریعت کے احکام جسم کے لئے بھیجے اور طریقت کے اسرار دل و روح کے لئے، جسم ظاہر ہے تو شریعت بھی ظاہر دل و روح پوشیدہ ہیں لہذا طریقت کے اسرار بھی پوشیدہ ہی چاہئیں، اگر جسم زمین میں دبایا چھپایا جائے تو انسان مر جائے گا، اور اگر دل کو باہر نکال کر ظاہر کر دیا جائے تو موت واقع ہو جائے گی، اگر زندگی چاہیے، تو ظاہر کو ظاہر رہنے دو، باطن کو باطن، کہ اس کے ردو بدل میں ہلاکت ہے، اس آیت کریمہ میں پہلی قسم کی تبدیلی کا ذکر ہے کہ علمائے اہل کتاب نے ان عقائد و مسائل کو چھپایا یا بدلا جو ظاہر کرنے چاہیے تھے، جس سے ان کی دینی موت واقع ہو گئی، اسی دینی خودکشی کی وجہ سے ان پر عتاب، عذاب، عقاب ہوا، اور وہ رب تعالیٰ سے حجاب میں ہو گئے، تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ جو کوئی طریقت کے اسرار و رموز نامحرموں پر ظاہر کر دے وہ بھی ایسا ہی مجرم ہوگا، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے دو قسم کے علم سیکھے ایک وہ جو تم میں ظاہر کر دیا دوسرا وہ علم کہ اگر میں ظاہر کروں تو میری گردن ماردی جائے (مشکوۃ شریف کتاب العلم) صوفیائے کرام کا ارشاد ہے کہ مال بخفسہٖ پاک وطیب ہے، مگر اس کے حاصل کرنے کے راستے دو ہیں، طیب و خبیث، اگر طیب راستے سے آئے گا تو مال طیب رہے گا بلکہ اس کی پاکی اور بڑھ جائے گی، اور اگر خبیث راہ سے آئے گا تو مال خبیث ہی ہوگا اور استعمال کرنے والے کو بھی خبیث بنا دے گا، اسی مال کے متعلق ارشاد ہوا فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ ان کی یہ خریداری بھی بری اور اس خرید سے جو مال حاصل ہوا وہ بھی برا، مال کی مثال بارش کے پانی یا ہوا کی سی ہے کہ یہ دونوں چیزیں بذات خود طیب و طاہر ہیں لیکن گندے راستے سے گذرنے سے گندے ہو جاتے ہیں اور لوگوں کو بیمار کر دیتے ہیں، گلشن کی ہوا، بھینی مہک رکھتی ہے، بیماروں کو تندرست کر دیتی ہے، گندگی کی ہوا دماغ سڑا دیتی ہے تندرستوں کو بیمار کر دیتی ہے، مال پر ہی کیا موقوف ہے، علم و عقل اگر نفس کے راستہ سے آئیں تو گندے ہیں، اگر دل کے راستہ آئیں تو پاک، شیخ کو اس لئے پکڑتے ہیں کہ اس کے دل کے راستہ سے جو ذکر و فکر اور علم آئے گا، ہمارے بیمار دل کو تندرست کر دے گا، ذریعہ معرفت کا بڑا اثر ہے،

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوا وَّيُحِبُّونَ

ہرگز نہ گمانی کرو ان کو جو شاد ہوتے ہیں اس پر جو انہوں نے کیا اور پسند کرتے ہیں

ہرگز نہ سمجھنا (یعنی) جو خوش ہوتے ہیں اپنے کیے پر اور چاہتے ہیں

أَنْ يُّحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ

یہ بات کہ تعریف کیے جائیں اس پر جو انہوں نے نہ کیا تو تم انہیں ہرگز گمان نہ کرنا دور

کہ بے کیے ان کی تعریف ہو ایسوں کو ہرگز

مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ

السَّمَآءِ وَاِلٰهُ مَنْ فِی الْاَرْضِ لَا اِلٰهَ فِیْهِمَا غَیْرُکَ وَاَنْتَ جَبَّارُ مَنْ فِی السَّمَآءِ وَجَبَّارُ مَنْ فِی الْاَرْضِ لَا جَبَّارَ فِیْهِمَا غَیْرُکَ وَاَنْتَ مَلِکُ مَنْ فِی السَّمَآءِ وَمَلِکُ مَنْ فِی الْاَرْضِ لَا مَلِکَ فِیْهِمَا غَیْرُکَ قُدْرَتُکَ فِی الْاَرْضِ کَقُدْرَتِکَ فِی السَّمَآءِ وَسُلْطٰنُکَ فِی الْاَرْضِ کَسُلْطٰنِکَ فِی السَّمَآءِ اَسْئَلُکَ بِاسْمِکَ الْکَرِیْمِ وَجْھِکَ الْمُنِیْرِ وَمُلْکِکَ الْقَدِیْمِ اِنَّ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وھب فرماتے ہیں کہ اگر یہ دعا مجنون اور پریشان حال پر پڑھ کر دم کی جائے اور اس کا تعویذ بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے نیز اسے گھول کر پلایا جائے تو انشاء اللہ بہت فائدہ ہوگا اگر کسی کو سانپ کاٹے اور وہ بغیر کچھ بولے ہوئے زخم پر ہاتھ رکھ کر یہ کہے یا محمد میرے سانپ نے کاٹا (ﷺ) تین دفعہ یہ عمل کرے اور ہر بار تین تین دفعہ یہ پڑھے انشاء اللہ تعالیٰ سانپ کا اثر نہ ہوگا نہایت مجرب ہے سبحان اللہ حضور ﷺ کے نام شریف میں نفخ مسیح کی تاثیر ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

چوں نام ایں است نام آور چہ باشد گرامی تر بود از ہر چہ باشد

جو کوئی آم کے موسم میں آم کے بور کو اپنے ہاتھ پر مل لے جس پر اس کی پہلی نگاہ پڑے تو سال بھر تک اس کے ہاتھ میں یہ تاثیر رہے گی کہ بچھو کے کاٹے پر یہ ہاتھ لگا دے تو آرام ہو جائے مگر شرط یہ ہے کہ پہلا دیکھا ہوا بور ملے جب آم کے بور میں یہ تاثیر ہے تو عیسیٰ علیہ السلام کے سانس کی تاثیر کا کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے۔ خیال رہے کہ اس زندہ کرنے یا بیماروں کو شفا دینے کی یہ صورت نہ تھی کہ آپ صرف دعا کرتے تھے اور رب تعالیٰ زندگی یا شفا بخش دیتا تھا۔ بلکہ باذن پروردگار دعا کے ساتھ اپنا تصرف بھی کرتے تھے مردہ کو زندہ ہو جانے' بیمار کو اچھا ہو جانے کا حکم بھی دیتے تھے ورنہ اگر صرف دعا سے اللہ تعالیٰ زندگی یا شفا دیتا تو آپ احی اور اُبْرِئُ متکلم کے صیغے نہ فرماتے کہ میں یہ کرتا ہوں اگر میری دعا سے بارش آ جائے تو میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے بارش برسائی ہے نیز اور انبیاء کرام کی دعا سے مردے زندہ ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ستر اسرائیلی زندہ ہوئے۔ ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ (بقرہ:۵۶) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے چار پرندے حضرت عزیر علیہ السلام کی دعا سے ان کا گدھا حضرت حزقیل کی دعا سے داوردان والے ستر اسی ہزار مردے ہمارے حضور ﷺ کی دعا سے آپ کے والدین زندہ ہوئے انہوں نے نہ فرمایا کہ ہم مردے زندہ کرتے ہیں غرضیکہ ماننا پڑے گا کہ آپ اپنے اختیار خداداد سے یہ کام کرتے تھے۔

اعتراضات وجوابات

نوٹ: ان تمام معجزات کا مرزائیوں نے انکار کیا اور اس آیت میں یہودیانہ تحریفات کیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے گھریلو نبی اور خود ساختہ مثیل مسیح مرزا غلام احمد قادیانی میں کوئی کمال نہ تھا لہذا انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے ان تمام کمالات کا انکار کر دیا۔ ہم ان کے اعتراضات مع جوابات عرض کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ قبول فرمائے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: پیدا کرنا خدا کی صفت ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ (الرعد:۱۶) نیز فرماتا ہے

تفسیر

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا، ہماری قرأت میں لَا تَحْسَبَنَّ ت کے ساتھ ہے ب مفتوح صیغہ واحد مخاطب جس میں خطاب نبی کریم ﷺ سے یا ہر قرآن پڑھنے والے سے، اَلَّذِیْنَ مع صلہ کے اس کا پہلا مفعول ہے اور بِمَفَازَةٍ الخ دوسرا مفعول اس صورت میں آیت کے معنی بالکل واضح ہیں، مگر بعض قرأتوں میں تَحْسَبُنَّ ب کے پیش سے ہے صیغہ جمع مخاطب، تمام مسلمانوں سے خطاب، اس صورت میں بھی اَلَّذِیْنَ الخ مفعول اول ہے اور بِمَفَازَةٍ الخ مفعول دوم، ابن کثیر، نافع، ابوعمرو، ابن عامر کی قرأت میں لَا یَحْسَبَنَّ ی سے ہے اور ب کے فتح سے صیغہ واحد غائب، اس صورت میں اَلَّذِیْنَ الخ اس کا فاعل ہے اور مفعول اول اَنْفُسَهُمْ پوشیدہ ہے اور بِمَفَازَةٍ دوسرا مفعول، اور بعض قرأتوں میں لَا یَحْسَبُنَّ ہے ی سے اور ب کے پیش سے صیغہ جمع غائب، اس صورت میں اس کا فاعل هُمْ ہے جس کا مرجع عام مسلمان ہیں، اَلَّذِیْنَ الخ مفعول اول، اور ہوسکتا ہے کہ هُمْ سے مراد علمائے یہود ہوں اور اَلَّذِیْنَ اس کا بدل، لہٰذا آیت کریمہ کی پانچ تفسیریں ہوں گی، اور ہر تفسیر کے ماتحت مختلف فائدے (تفسیر کبیر و معانی) اَلَّذِیْنَ سے مراد وہ سرداران یہود یا منافقین مراد ہیں جن کا اس آیت میں بیان ہے، یَفْرَحُوْنَ فرحٌ سے بنا بمعنی خوشی یا شیخی، یہاں دوسرے معنی میں ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ (قصص: ۷۶) شیخی نہ مارو! اللہ شیخی خوروں کو پسند نہیں فرماتا، اور دوسری جگہ فرماتا ہے وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا (یونس: ۵۸) اللہ کے فضل و رحمت پر خوب خوشیاں مناؤ، ب سببیہ ہے ما موصولہ ہے، اس سے مراد ہے بدکاریاں اور گناہ، آتی اور جاء کبھی فَعَلَ کے معنی میں آتے ہیں، یہاں اسی معنی میں ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ (نساء: ۱۶) اور دوسری جگہ فرماتا ہے لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا (مریم: ۲۷) ان دونوں آیتوں میں یہ دونوں کلمے اِتْیَانِ اور مَجِیْ بمعنی فعل ہیں یعنی اے محبوب یا اے قرآن پڑھنے والے مسلمان! تم ان لوگوں کو ہرگز عذاب سے دور نہ سمجھنا، جو اپنی بدکاریوں پر خوش ہوتے ہیں کہ کرتے ہیں منافقت، دھوکا بازیاں اور ہوتے ہیں اس پر خوش وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا، یہ جملہ یَفْرَحُوْنَ پر معطوف ہے اور ان منافقین و علمائے یہود کے دوسرے عیب کا بیان، یُحِبُّوْنَ حبٌّ سے بنا بمعنی چاہنا، پسند کرنا، خواہش کرنا، ما سے مراد نیک اعمال ہیں، اور یہ ما بھی موصولہ ہی ہے یعنی یہ منافقین اور سرداران یہود برے کام کر کے خوش ہوتے ہیں اور نیکیاں کرتے نہیں، مگر چاہتے یہ ہیں کہ انہیں نیک کار پرہیزگار کہا جائے اور ان کی تعریفیں کی جائیں، جہاد میں نہ جائیں مگر غازی کہلائیں، ہو منافق مگر پکارے جائیں مومن، توریت سے جاہل ہوں مگر انہیں عالم سمجھا جائے، ایسے لوگوں کے متعلق فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ۔ فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ تاکید کے لئے دوبارہ لایا گیا، کیونکہ پہلا لَا تَحْسَبَنَّ بہت دور ہوگیا تھا، جیسے کہا جاتا ہے تم زید کو سچا نہ سمجھنا، جب وہ تمہارے پاس آئے، اور تم سے فلاں فلاں باتیں کہے تو اسے سچا نہ سمجھنا، یہ دوسرا نہ سمجھنا تکرار کے لئے لایا گیا بِمَفَازَةٍ ایک پوشیدہ لفظ کا متعلق ہے، مفازہ یا مصدر میمی ہے بمعنی فوز و کامیابی یا نجات یا ظرف مکان بمعنی کامیابی یا نجات کی جگہ، تفسیر کبیر میں فرمایا کہ فوز کے لغوی معنی آفتوں سے دوری ہے، کامیابی کو اسی لئے فوز کہتے ہیں کہ کامیاب آدمی ناکامی سے دور رہتا ہے، روح المعانی میں فرمایا کہ وسیع میدان کو مفازہ کہا جاتا

رب تعالیٰ نے خشک زمین کہ میت اور بارش سے تر ہو جانے کو زندگی فرمایا ہے ایسے ہی یہاں ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا (انعام: ۱۲۲) نیز فرماتا ہے۔ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ (فاطر: ۲۲) ان آیتوں میں حیات سے مراد علم ہے۔ اور موت سے جہالت وہ ہی یہاں مراد ہے۔ (بیان القرآن محمد علی لاہوری)

جواب: اس کا بھی وہ جواب ہے جو پہلے گذر گیا۔ کہ یہ حیات ہر پیغمبر بلکہ اولیاء وعلماء بخشتے ہیں پھر اس کا ذکر خصوصیت سے عیسیٰ علیہ السلام کے لئے کیوں فرمایا گیا دیگر پیغمبروں کے لئے یہ معجزہ کیوں نہ ثابت ہوا۔ نیز معجزہ کہتے ہی اس کو ہیں۔ جو خلاف عادت الٰہیہ ہو عادی کام دن رات ہر شخص کرتا رہتا ہے تمہاری پیش کردہ آیتوں میں اس قانون کا ذکر ہے کہ ہلاک شدہ بستیوں کو زندہ کرنا ہمارا قانون نہیں رہی خصوصیات وہ اس کے علاوہ ہیں ملاحظہ ہوں۔ قرآن کریم نے حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ یوں بیان فرمایا کہ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ (بقرہ: ۲۵۹) اللہ نے انہیں سو سال مردہ رکھ کر پھر زندہ کیا پھر فرمایا وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا (بقرہ: ۲۵۹) اے عزیر اپنے مردے گدھے کی خشک ہڈیوں کو دیکھ کہ ہم انہیں کس طرح جمع کر کے گوشت پہناتے ہیں۔ حضرت حزقیل کی قوم کا واقعہ یوں بیان فرمایا فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (بقرہ: ۲۴۳) یعنی رب تعالیٰ نے داوردان والوں کو اولاً موت دے دی۔ پھر ان سب کو زندہ فرمایا نیز قرآن کریم نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ تم نے ایک دفعہ موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت سے منہ موڑا تو فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ (بقرہ: ۵۶) یعنی تمہیں دیکھتے ہوئے کڑک نے پکڑ لیا پھر تمہیں ہم نے مرے بعد زندہ کیا غرض مردے زندہ کرنے کے بے شمار واقعات قرآن کریم نے بیان فرمائے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ قریب قیامت دجال لوگوں کو مار کر زندہ کرے گا۔ اگر ان سب آیتوں میں مجازی معنی مراد لئے جائیں تو پھر قرآن ایک تماشا بن جائے اور کسی آیت پر اعتماد نہ رہے نعوذ باللہ صلوٰۃ سے مرادرات کو سونا مراد لے لو زکوٰۃ سے کھیت کا ثاروزہ سے باتیں کرنا لیجئے جناب روزہ نماز زکوٰۃ سب ختم۔ رہا تمہارا یہ کہنا کہ جب وہ اپنی عمر ختم کر کے مرے تھے تو انہیں دوبارہ زندگی کیونکر مل گئی۔ یہ اعتراض تم نے آریوں سے سیکھا ہے۔ جس کے جواب ہم بارہا دے چکے ہیں جو رب تعالیٰ انہیں ایک دفعہ عمر دینے پر قادر ہے وہ دوبارہ بھی دے سکتا ہے۔ جب ہم اپنے بجھے ہوئے چراغ میں دوبارہ تیل وبتی ڈال کر اسے روشن کر سکتے ہیں تو رب تعالیٰ بھی ان چراغوں میں دوبارہ عمر کا روغن ڈال کر روشن فرما سکتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ میثاق کے دن آدم علیہ السلام نے پوچھا کہ مولیٰ داؤد علیہ السلام کی عمر کتنی ہے۔ فرمایا ساٹھ سال عرض کیا میری عمر میں سے انہیں چالیس سال اور عطا فرما۔ ان کی یہ گذارش منظور ہوئی۔ دیکھو مشکوٰۃ شریف باب الایمان بالقدر بروایت ترمذی) خیال رہے کہ تقدیر چند قسم کی ہے۔ جن میں سے بعض کی تبدیلی ہو سکتی ہے بعض کی نہیں۔ انشاء اللہ اس کی تحقیق اس آیت میں کی جائے يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ (الرعد: ۳۹)

تیسرا اعتراض: باذن اللہ فرمانے سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ کام کرنے کا مطلقاً اختیار نہ تھا۔ جب رب تعالیٰ چاہتا تھا تو آپ کے ہاتھ پر معجزات ظاہر فرما دیتا تھا۔ معجزات نبی کے اختیار سے باہر ہوتے ہیں۔ وہ محض بندہ مجبور اور بے اختیار ہوتے ہیں (بعض وہابی)

جواب: یہ غلط ہے اگر وہ حضرات محض بے اختیار ہوتے تو اخلق انفخ' اُبرئ' احیی متکلم کے صیغے ارشاد نہ ہوتے کہ میں بناتا ہوں، میں زندہ کرتا ہوں۔ میں شفا دیتا ہوں۔ بلکہ یوں

عذاب سے بچ سکتے ہیں کیونکہ آسمانوں وزمینوں کا مالک وقابض اللہ تعالیٰ ہی ہے، جہاں جائیں گے اللہ کے ملک میں رہیں گے اس کے باوجود رب تعالیٰ ہر چیز پر قادر بھی ہے، لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ اس کے ملک میں رہتے ہوئے چھپ کر، دب کر اس کے عذاب سے بچ جائیں ان کے عذاب سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ یہ لوگ ان گناہوں سے توبہ کرلیں، چالاکیاں، دھوکا بازیاں چھوڑ دیں، ہمارے محبوب پر سچے دل سے ایمان لے آئیں،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** گناہ کرنا ایک گناہ ہے، اور گناہ پر خوش ہونا دوگنا بلکہ دس گنا گناہ ہے، جب نیکی پر شیخی جائز نہیں تو گناہ پر شیخی کیونکر جائز ہوگی، یہ فائدہ یَفْرَحُوْنَ الخ سے حاصل ہوا، **دوسرا فائدہ:** جو خوبیاں اپنے اندر موجود نہ ہوں، ان کا اظہار اور ان پر تعریف چاہنا طریقۂ کفار ہے جیسا کہ وَّیُحِبُّوْنَ الخ سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** بے علموں کو شمس العلماء، بزدلوں کو خان بہادر، جاہلوں کو مولوی فاضل وغیرہ کے خطاب دینا حرام ہے، اور ان خطابوں پر خطاب یافتہ لوگوں کا اکڑنا، شیخی مارنا بدترین جرم ہے، یہ فائدہ بھی وَّیُحِبُّوْنَ الخ سے معلوم ہوا، جب واقعی خوبی پر شیخی مارنا جائز نہ ہوا تو غیر واقعی بناوٹی خوبی پر فخر کیسے جائز ہوگا، آج کل بعض جاہل چالاکیوں سے مولوی عالم، فاضل وغیرہ کی ڈگریاں حاصل کر لیتے ہیں، پھر اپنے کو مولوی، عالم وغیرہ لکھتے بھی ہیں کہلواتے بھی ہیں، وہ اس آیت سے عبرت پکڑیں، **چوتھا فائدہ:** دنیا اور آخرت میں عذاب الٰہی مختلف شکلوں میں نمودار ہوتے ہیں اور ہوں گے جیسا مجرم ویسا اس کا عذاب، ایسے شیخی خوروں کا دنیاوی عذاب یہ بھی ہے کہ وہ کمال سے محروم رہ جاتے ہیں کہ جو برتن پہلے ہی بھر گیا، وہ کنوئیں سے کیا لائے گا، **پانچواں فائدہ:** رب تعالیٰ کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں، اس کے غضب کی چکی چلتی ہے آہستہ، مگر پیستی ہے باریک، **چھٹا فائدہ:** آخرت میں عذاب کے درجے مختلف ہوں گے بعض نرم، بعض گرم، مگر سخت تر عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو عیب کو ہنر اور ہنر کو عیب جانیں، جیسا کہ لَهُمْ کو مقدم کرنے سے معلوم ہوا، کیونکہ لَهُمْ کا مقدم فرمانا حصر کا فائدہ دے رہا ہے، **ساتواں فائدہ:** سارے عالم پر حقیقی ملکیت رب تعالیٰ کی ہی ہے، جو کوئی کسی بندہ کو ایک ذرہ کا مالک حقیقی جانے وہ مشرک ہے جیسا کہ لِلّٰهِ کے مقدم فرمانے سے معلوم ہوا، **آٹھواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ ہر چیز کے خلق پر قادر ہے، مگر بری چیزوں کے کسب پر قادر نہیں کہ وہ برائیوں سے پاک ہے، تمام اچھائیوں، برائیوں کا پیدا کرنے والا وہی ہے فرماتا ہے، خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (انعام:۱۰۲) مگر اچھائیوں سے موصوف ہے نہ کہ برائیوں سے، جیسا کہ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ سے معلوم ہوا، **نواں فائدہ:** اپنی تعریف کرنا، لوگوں سے کرانا، اس پر فخر کرنا، اکڑنا رب تعالیٰ کو ناپسند ہے،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اپنے کئے ہوئے اعمال پر خوش ہونا برا ہے، حالانکہ مال کی طرح اعمال بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، اور خدا تعالیٰ کی نعمتوں پر خوش ہونا اچھا ہے، اس سے منع کیوں فرمایا گیا؟ **جواب:** اس کے دو جواب تفسیر سے معلوم ہو چکے، ایک یہ کہ بِمَآ اَتَوْا میں مَا سے مراد گناہ ہیں گناہوں پر خوش ہونا منع ہے، دوسرے یہ کہ فرحت سے

ہیں۔ **جواب:** جناب اس میں اپنے علم غیب کا اظہار ہے۔ نبی کے معنی ہیں خبر دینے والا کہاں کی آخرت کی جس کو جہاں کی خبر نہ ہوا سے وہاں کی خبر کیا ہو گی ابو جہل نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا تھا

گر رسولی چیست دردستم نہاں   تو خبرداری ز راز آسماں

آپ کا مقصد یہ ہی تھا کہ جب میری آنکھ سے یہاں کی باتیں پوشیدہ نہیں تو میں سچا نبی ہوں اور اس ملک کی سچی خبر دے رہا ہوں قادیانی جی! یہ سچے مسیح کے سچے معجزات ہیں جھوٹے مسیح کے واقعات نہیں جو محمدی بیگم کے آسمانی نکاح کی خبر بھی دے اور حاصل کرنے کی کوشش کرے اور ناکام رہے۔ **پانچواں اعتراض:** چھپی باتیں کبھی نجومی بھی بتا دیتے ہیں کیا انہیں بھی علم غیب ہوتا ہے؟ **جواب:** علم غیب وہ ہے جو بلا دلائل اور بلا مقدمات حاصل ہو۔ کاہن رمال یا تو شیطانی اطلاع سے یا علم جعفر کے حساب سے معلوم کر کے بتاتے ہیں ایسے آج کل آلہ کے ذریعہ حمل کا حال معلوم کر لیتے ہیں کہ لڑکا ہے یا لڑکی پھر بھی نجومی اور رمال اکثر غلطی کرتے ہیں انبیائے کرام کا علم آسمانی وحی سے ہوتا ہے نہ کہ حساب وغیرہ سے اور ہمیشہ صحیح (تفسیر خازن)

تفسیر صوفیانہ

مسیح روح نے کفار نفسانیات سے کہا کہ میں تمہارے پاس عالم غیب سے کھلی نشانیاں لایا ہوں۔ وہ یہ کہ ناقصین کے نفوس کے گارے اور تزکیہ اور حکمت عملی کے ذریعہ مثل پرندہ بناتا ہوں پھر اس میں حیات حقیقی اور علم الہی کی پھونک مارتا ہوں جس سے اس میں امید و خوف کے دو باز و پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر وہ پرندہ یعنی نفس زندہ ہو کر فضائے جلال و جمال میں اڑتا ہوا بارگاہِ الہی کے باغ تک باذن الہی پہنچ جاتا ہے۔ نیز میں ان اندھوں کو جو اغیار میں پھنس کر انوار کے دیکھنے سے محروم ہیں اور ان کوڑھیوں کو جو فاسد عقیدوں اور کمینی بیماریوں میں مبتلا ہیں جس کی وجہ سے ان کا فطری رنگ بگڑ گیا شفا بخشتا ہوں کہ اندھوں کے حجاب کو پھاڑ کر بارگاہ رب ارباب دکھاتا ہوں اور ان بدعملوں کی بدعملی دور کر کے انہیں ایمان فطری کی طرف متوجہ کرتا ہوں نیز میں جہالت کے مردوں کو بحکم الہی علم حقیقت کی حیات سے زندگی بخشتا ہوں اور اے نفسانی جماعت میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ تم کون کون سے گناہ شہوات ولذات کھاتے یعنی استعمال کرتے ہو۔ اور کون کون سی امیدیں اپنی نیتوں کے گھروں میں چھپا کر رکھتے ہو مجھ پر سب روشن ہے میرے ان معجزات میں اے نفس تیرے لئے کھلی دلیل ہے۔ اگر تو میری مخالفت چھوڑ دے اور میری اطاعت کرے تو کامیاب ہو جائے (از ابن عربی و روح المعانی) خیال رہے کہ یہ صوفیانہ ارشادات ہیں نہ کہ قادیانی بکواس۔ ان حضرات نے عیسیٰ سے مراد قلب لیا ہے نہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام۔

صوفیائے کرام اس آیت کے ظاہر کے متعلق فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کھانے اور بچانے کا ذکر مثالاً فرمایا ورنہ آپ ہر شخص کے حال سے ہر گھر کے کام سے باخبر تھے جو کھانا اور بچانا دیکھ سکتا ہے بشریت کے سلسلے میں ان سے پردہ ہے نورانیت سے پردہ نہیں فرشتے بلکہ رب تعالیٰ ہم کو ہر طرح دیکھتے ہیں ان سے حجاب نہیں اور فرماتے ہیں کہ جناب مسیح نے انبئکم میں دو باتیں فرمائیں ایک یہ کہ میں ان معلومات میں حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھنے کا حاجت مند نہیں۔ کہ ان سے پوچھ کر بتاؤں دوسرا یہ کہ میرے یہ علوم غیبیہ تو وہ ہیں جن کی خبر تم کو دے سکتا ہوں باقی علوم اسرار جو بتانے کے لائق نہیں وہ تو سمندر ہیں حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا تھا مجھے حضور علیہ السلام سے دو علم ملے ہیں۔ ایک علم تو میں نے تم میں پھیلا دیا۔ دوسرا علم

عیوب نے ہمارے عیب چھپالئے ہیں لوگوں کو ہمارے عیبوں کی خبر نہیں ہے، اس لئے تعریفیں کر رہے ہیں، ایسے موقعہ پر تم اپنے عیب سوچ کر اپنی برائی کرنے لگو، انشاء اللہ نفس قابو میں رہے گا، اس تعریف کے زہر کا یہ تریاق ہے،

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ
بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا فرمانے اور رات و دن
بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور دن و رات
وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ
کے متفرق ہونے میں البتہ نشانیاں ہیں خالص عقل والوں کے لئے جو
کی اہم تبدیلیوں میں نشانیاں ہیں عقلندوں کے لئے جو اللہ
یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ
ذکر کرتے ہیں اللہ کا کھڑے ہوئے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر
کی یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹ پر لیٹے
وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا
اور سوچ بچار کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اے پالنہار
اور آسمانوں و زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں اے رب ہمارے
مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾
ہمارے نہیں پیدا کیا تو نے یہ عبث پاکی ہے تجھے تو بچالے ہم کو آگ کی سزا سے
تو نے یہ بے کار نہ بنایا پاکی ہے تجھے تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت کے آخر میں ارشاد ہوا تھا کہ آسمان و زمین میں بادشاہت رب تعالیٰ ہی کی ہے، اب اس آیت میں اسی بادشاہت کا ثبوت دیا جا رہا ہے کہ خود آسمان و زمین کے حالات اس کے گواہ ہیں، ان کے حالات کی تبدیلیاں بدلنے والے کا پتہ دے رہی ہیں، پتنگ اڑتے ہوئے بھی بتاتی ہے کہ میری ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے، وہ جدھر چاہتا ہے مجھے جنبش دیتا ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ یہود اپنے فضائل و کمالات سوچتے رہتے ہیں، اور اپنی تعریف چاہتے ہیں اب مسلمانوں کو حکم ہے کہ تم ان کے برخلاف رب تعالیٰ کی

یعنی تحریف شدہ توریت کو جاننا پہچاننا۔

تفسیر

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ یا تو یہ مضمون رَسُوْلًا پر معطوف ہے اور یُعَلِّمُهٗ کا حال یا جِئْتُكُمْ پوشیدہ فعل کی ضمیر کا حال ہے۔ مُصَدِّق تصدیق سے بنا' بمعنی سچا کرنا اور سچا کہلوانا' سچا منوانا' سچا ماننا یہاں سارے معنی درست ہیں کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام نے توریت کو سچا کہا بھی اور آپ کی تشریف آوری توریت کی وہ آیتیں سچی ہوگئیں جن میں آپ کی بشارت تھی۔ نیز آپ نے لوگوں سے توریت بنوائی اسے سچا کہلوایا مقصد یہ ہے کہ اے یہودیو میں تم پر احسان کرنے آیا ہوں کہ میرے ذریعہ تمہاری کتاب کی تصدیق ہوئی۔ لِمَا کا لام صلہ کا ہے۔ بَيْنَ يَدَيَّ کے لفظی معنی ہیں ہاتھوں کے درمیان۔ یہاں مراد سامنے ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ زمانی لحاظ سے سامنا ہونا مراد ہے یعنی پہلے اور ممکن ہے کہ مکانی لحاظ سے سامنے ہونا مراد ہو بمعنی پاس و نزدیک یعنی تمہاری تحریف کردہ توریت جو تقریباً اصلی رنگ میں دنیا سے غائب ہو چکی۔ وہ میرے سامنے ہے میں اسے دیکھ رہا ہوں آپ نے فرمایا کہ اے اسرائیلیو میں تو اپنے سے پہلی یا اپنے پاس والی توریت کی تصدیق کرنے آیا ہوں نہ کہ جھٹلانے۔ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ یہ جملہ پہلے جملہ پر معطوف ہے اور لِاُحِلَّ جئت فعل پوشیدہ کا متعلق۔ اُحِلَّ احلال سے بنا بمعنی حلال و جائز کرنا بعض سے معلوم ہوا کہ سارے محرمات حلال نہ ہوں گے بلکہ بعض حرم علیکم سے یا تو توریت کی بعض حرام کردہ چیزیں مراد ہیں جو بنی اسرائیل پر سزا کے طور پر حرام کردی گئی تھیں جیسے اونٹ کا گوشت' مچھلی آنتوں کی چربی اس صورت میں انجیل شریف، توریت کے احکام کی ناسخ ہے یا حرم سے مراد وہ چیزیں ہیں جو علمائے یہود نے اپنی طرف سے لوگوں پر حرام کر کے توریت کی طرف انہیں منسوب کر دیا تھا (کبیر و روح المعانی وغیرہ) اس صورت میں انجیل توریت کی ناسخ نہیں اس میں صرف مثالیں' اور نصیحتیں ہیں۔ عیسائیوں پر توریت ہی کے احکام جاری تھے مگر ان کے پادریوں نے ہفتے کا دن چھوڑ کر اتوار اختیار کیا۔ بیت المقدس سے منہ موڑ کر مشرق یا مغرب کو اپنا قبلہ بنالیا۔ ختنہ چھوڑ دیا سور کھانے لگے وغیرہ مگر تفسیر اول قوی ہے روح المعانی نے اس جگہ فرمایا کہ یہ حرکتیں پادری پطرس نے کیں یعنی نیز میں اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے لئے بعض وہ چیزیں حلال کر دوں جو تم پر توریت میں یا یہودی رہبروں کی طرف سے حرام کردی گئی تھیں۔ خیال رہے کہ جیسے یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا سمجھتے تھے ایسے ہی اپنے پوپ پادریوں کو حرام حلال کا مالک سمجھتے تھے۔ اپنے گناہوں کی معافی بھی پوپ پادریوں سے ہی مانگتے تھے' اس لئے پادریوں نے بہت سی حلال چیزیں ان پر حرام کردی تھیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وہ حلال کیں۔ یعنی دین کی خرابیوں کو دور فرمایا پہلے زمانوں میں حضرات انبیاء کرام ہی دینی خرابیوں کو دور کرتے تھے اب اسلام میں یہ کام حضرات علماء ربانین اور مجددین کے سپرد ہوا کہ قرآن و حدیث و احکام شریعہ کتر بھی کتر بیونت کرنے والے پیدا ہوتے رہے مگر علماء ربانین نے دین کو محفوظ رکھا حضور انور ﷺ نے خبر دی تھی کہ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہوں گے اللہ ہر سو برس پر مجدد بھیجے گا۔ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ یہاں یا تو آیت سے پچھلے مذکورہ معجزات مراد ہیں اور یہ کلام اسی کی نقل ہے یا اس آیت سے آپ کے باطنی معجزات مراد یعنی بغیر کسی کے پڑھے عالم ہونا توریت کا حافظ و ماہر ہونا وغیرہ یعنی میں اپنی نبوت اور انجیل کی حقانیت پر تمہارے پاس نشانی بھی لایا ہوں۔

الْاَرْضِ الخ پھر فرمایا خرابی ہے ان کی جو یہ آیت پڑھیں اور مصنوعات الٰہی میں غور نہ کریں (کبیر و معانی)،
روایت: حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ایک رات جبکہ حضور انور ﷺ کی باری میری خالہ ام المومنین میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں قیام کی تھی، میں ان کے گھر رات کو رہا تا کہ حضور انور ﷺ کی رات کی عبادات اپنی آنکھوں دیکھوں، میں نے دیکھا کہ حضور انور ﷺ نے اول شب آرام فرمایا، آدھی رات یا کچھ آگے پیچھے بیدار ہوئے، اور آپ نے یہ آیات اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ تلاوت فرمائیں، پھر وضو کیا پھر تہجد پڑھی (بخاری مسلم، از تفسیر خازن و روح المعانی)

تفسیر

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ چونکہ رب تعالیٰ کی توحید و قدرت کے بہت لوگ انکاری تھے بھی اور ہیں بھی، جو ان مذکورہ چیزوں کو دلیل توحید نہیں مانتے، اس لئے یہ آیہ کریمہ اِنَّ سے شروع فرمائی گئی، خَلْقِ یا مصدر ہے اور السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس کا مفعول یا حاصل مصدر ہے، اور السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس کا فاعل، اور ہو سکتا ہے کہ خَلْقِ بمعنی مخلوق ہو، اور السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس کا ظرف فِیْ پوشیدہ ہو اور چونکہ آسمان فیض دینے والے ہیں اور زمین فیض لینے والی، اس لئے آسمانوں کا ذکر پہلے ہوا زمین کا بعد میں، آسمان کو جمع زمین کو واحد فرمانے کی وجہ پہلے بیان ہو چکی یعنی آسمانوں و زمین کے پیدا فرمانے میں یا آسمانوں و زمین کی پیدائش میں یا اس مخلوق میں جو آسمانوں اور زمین میں ہے (روح المعانی) غرضکہ اس آیت کی تین تفسیریں ہیں وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ واؤ عاطفہ ہے، اخْتِلَافِ خَلْقِ پر معطوف اخْتِلَافِ خَلْفٌ سے بنا بمعنی پیچھے، اصطلاح میں بدلنے کو اختلاف کہتے ہیں کہ اس میں حالات آگے پیچھے آتے ہیں، یہاں اختلاف سے مراد یا تو رات و دن کا آنا جانا ہے یا گھٹنا بڑھنا کہ سردیوں میں رات بڑی دن چھوٹا، اور گرمیوں میں اس کے برعکس یا بیک وقت مختلف جگہوں میں دن رات کا مختلف ہونا کہ کہیں اس وقت سویرا ہے کہیں دوپہر کہیں شام کہیں رات کا آخر کہیں درمیانی حصہ، اور یا رات دن کا سرد و گرم ہونا، یا مختلف مقام میں رات و دن کا چھوٹا بڑا ہونا کہ آج کسی ملک میں دن دس گھنٹے کا ہے، کسی میں چودہ گھنٹے کا بلکہ کہیں چھ ماہ کا دن ہے اور چھ ماہ کی رات، مگر پہلے دو معنی زیادہ ظاہر ہیں، چونکہ وجود میں رات پہلے ہے دن بعد میں، اس لئے لیل کا ذکر پہلے ہوا نہار کا بعد میں، لیل یا تو جنس ہے کہ ایک رات کو بھی لیل کہتے ہیں، اور بہت سی راتوں کو بھی، یا لیلۃ واحد ہے اور لیل و لیالی جمع بعض نے فرمایا کہ لیل واحد ہے لیالی اس کی جمع، جیسے اہل واحد ہے اہالی جمع (از روح المعانی مع زیادت) یعنی رات و دن کے آنے جانے یا گھٹنے بڑھنے یا ٹھنڈے گرم ہونے یا کہیں چھوٹے کہیں بڑے ہونے وغیرہ میں لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ لَاٰیٰتٍ اِنَّ کا اسم ہے اور فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ الخ اس کی خبر تھی، اٰیٰت ایت کی جمع ہے بمعنی کھلی نشانیاں، اُولِیْ ذو کی جمع ہے بمعنی والا، اَلْبَابِ لُبٌّ کی جمع ہے بمعنی خالص ہونا، اصطلاح میں لب وہ عقل ہے جو وہم و حس کے دھوکوں سے خالی ہو، انسان کو اولاً عقل ملتی ہے بعد میں لُبّ، اور بعض لوگ لُبّ سے بالکل محروم ہی رہتے ہیں (کبیر و معانی و روح البیان) یعنی ان مذکورہ چیزوں میں خاص عقل رکھنے والوں کے لئے توحید و قدرت الٰہیہ کی ایک نشانی نہیں بلکہ بہت سی نشانیاں ہیں، رہے کفار وہ اگرچہ عقل تو رکھتے ہیں مگر لُبّ یعنی خاص عقل نہیں رکھتے، اس لئے وہ ان فائدوں سے محروم ہیں، خیال رہے کہ آیات جمع

سے منسوخ کردیں۔ **دوسرا فائدہ:** پیغمبروں کو کسی قدر شرعی احکام کا اختیار ہوتا ہے دیکھو عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا وَلِاُ حِلَّ لَکُمۡ میں حلال کردوں معلوم ہوا کہ حلال وحرام کرنے کا انہیں اختیار ہے۔ ایک دفعہ ہمارے حضور ﷺ نے فرمایا کہ حج کرو۔ کسی نے پوچھا کہ کیا ہر سال۔ فرمایا کہ اگر ہم ابھی ہاں کہہ دیتے تو ہر سال ہی حج فرض ہو جاتا نہیں عمر میں ایک بار۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی ہاں اور ناں میں تاثیر ہے۔ نیز ایک صحابی نے روزہ میں اپنی بیوی سے جماع کرلیا بارگاہ نبوت میں حاضر ہوکر اپنے اس قصور کی بابت عرض کیا۔ فرمایا غلام آزاد کردو عرض کیا نہیں کرسکتا۔ اور کھانا دینے اور ساٹھ روزے رکھنے سے بھی مجبوری ظاہر کی۔ حضور ﷺ نے انہیں ایک ٹوکری کھجور دے کر فرمایا اس سے اپنا کفارہ ادا کرو۔ عرض کیا حضور ﷺ مدینہ میں سب سے بڑا مسکین تو میں ہی ہوں۔ فرمایا خود ہی کھالو یہ حضور ﷺ کا اختیار تھا کہ خود خطا کار کو اس کا کفارہ کھلا دیا۔ اس کی صدہا مثالیں مل سکتی ہیں اس مسئلہ کے لئے ہماری کتاب سلطنت مصطفیٰ ﷺ کا مطالعہ کرو۔ **تیسرا فائدہ:** پیغمبر کی اطاعت کے بغیر تقویٰ حاصل نہیں ہوسکتا جیسا کہ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوۡنِ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** پیغمبر اپنی نبوت کے ساتھ اپنی بندگی کا بھی اعلان فرماتے ہیں تاکہ کوئی معجزات دیکھ کر انہیں خدا نہ کہہ دے۔ اسی لئے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ربی وربکم۔ **پانچواں فائدہ:** قرآن کا نسخ حدیث سے جائز ہے دیکھو عیسیٰ علیہ السلام فرمارہے ہیں کہ بعض وہ چیزیں جو توریت میں تم پر حرام کردی گئی تھیں انہیں میں حلال کردوں توریت کتاب اللہ تھی۔ اور اس کے بعض احکام کو منسوخ فرمانے والے عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ دیکھو والدین اور قرابت داروں کے لئے وصیت قرآن کریم سے ثابت ہے اَلۡوَصِیَّۃُ لِلۡوَالِدَیۡنِ وَالۡاَقۡرَبِیۡنَ (بقرۃ: ۱۸۰) مگر اسے حدیث نے منسوخ فرمایا کہ لَا وَصِیَّۃَ لِلۡوَارِثِ اور غیر وارث کے لئے بھی تہائی سے زیادہ کی وصیت حدیث شریف نے ہی منسوخ فرمائی۔ **چھٹا فائدہ:** سیدھا راستہ وہی ہے جس پر اللہ کے نیک بندے چلے ہوں اور منزل سے لوٹنے والے اس کے سیدھا ہونے کی خبر دیں جو مذہب دین' نبی یا ولی سے خالی ہو۔ وہ سیدھا نہیں۔ شرک مجوسیت وغیرہ نبوت سے خالی ہیں۔ لہٰذا ٹیڑھے راستے ہیں دیوبندیت' قادیانیت' نیچریت' رفض و وہابیت اولیاء اللہ سے خالی لہٰذا یہ بھی ٹیڑھے راستے ہیں۔ مذہب اہل سنت ہی سیدھا راستہ ہے کہ اس کو علماء اولیاء کی سرپرستی حاصل ہے۔ شاہی سڑک عام گزرگاہ ہوتی ہے۔ کہ اس پر پل اور سرکاری چوکیاں ہوتی ہیں۔ اجمیر شریف اور بغداد شریف اس کی سرکاری چوکیاں ہیں سورۂ فاتحہ میں صراط مستقیم کی پہچان یہ بتائی گئی صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ اس کی مکمل تحقیق اس ہی جگہ دیکھو۔ **ساتواں فائدہ:** انجیل شریف توریت کی ناسخ ہے جیسا کہ حُرِّمَ عَلَیۡکُمۡ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں اجتماع ضدین معلوم ہورہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے مُصَدِّقًا بھی فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ وہ توریت کو منسوخ نہ کریں گے صرف تصدیق کریں گے اور وَلِاُحِلَّ بھی فرمایا جس سے پتہ لگا کہ آپ نے توریت کو منسوخ کیا۔ ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کے دو جواب تفسیر میں گذر گئے۔ کہ نسخ تصدیق کے خلاف نہیں۔ اور اس کی تحقیق بارہا ہوچکی۔ یا حُرِّمَ سے علمائے یہود کی حرام کی ہوئی چیزیں مراد ہیں۔ یعنی جن چیزوں کو تمہارے علماء نے حرام

فکر صرف انسان، فکر یعنی غور وخوض صرف انسان کی عبادت ہے، خَلْقِ السَّمٰوٰتِ الخ میں وہی تین احتمال ہیں جو ابھی مذکور ہوئے یعنی آسمان وزمین کا پیدا فرمانا یا ان کی پیدائش یا وہ مخلوق جو ان میں ہے رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا، چونکہ اس جملہ میں دعا کی جارہی ہے، اس لئے اسے ربنا سے شروع فرمایا، هٰذَا سے مذکورہ بالا چیزوں کی طرف اشارہ ہے، آسمان زمین اور ان کی چیزیں چونکہ یہ سب مخلوقیت میں یکساں ہیں، اس لئے هٰذَا واحد فرمایا گیا، باطل حق کا مقابل ہے، حق کے معنی ثابت، صحیح، فائدہ مند حکمتوں پر مشتمل ہیں تو باطل کے معنی ہوں گے عبث، لغو، بے فائدہ، حکمتوں سے خالی، رَبَّنَا سے پہلے یَقُوْلُوْنَ پوشیدہ ہے اور بَاطِلًا هٰذا کا حال ہے یعنی وہ کہتے ہیں اے ہمارے پالنے والے ہم اقرار کرتے ہیں کہ تو نے آسمان وزمین اور ان کی چیزیں عبث، لغو، بے فائدہ نہ بنائیں، ان میں لاکھوں حکمتیں ہیں بعض حکمتوں تک ہمارے ذہنوں کی رسائی ہے اور بعض تک رسائی بھی نہیں سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ سُبْحَانَ کے معنی بارہا عرض کئے جاچکے ہیں، اصل عبارت یوں تھی نُسَبِّحُکَ سُبْحَانًا اے خدا ہم تجھے ہر عیب سے بالکل پاک جانتے ہیں، یہ کلمہ کبھی رب تعالیٰ کی عظمت بیان کرنے کے لئے بولا جاتا ہے، اور کبھی اپنے عجز کو ظاہر کرنے کے لئے، یہاں دونوں مطلب ہوسکتے ہیں، ایک یہ کہ تو اس سے پاک ہے، کہ کسی چیز کو بے فائدہ پیدا فرمائے یا ہم اس سے عاجز ہیں کہ تیری مخلوق کے اسرار ورموز پورے پورے معلوم کرلیں، فَقِنَا کی ف جزائیہ ہے جس کی شرط پوشیدہ ہے، نار سے مراد پورا دوزخ ہے، خواہ اس کے ٹھنڈے طبقے ہوں یا گرم، کیونکہ وہاں کی ٹھنڈک اور گرمی دونوں آگ کی ہی وجہ سے ہیں، آگ کی دوری سے ٹھنڈک ہے، اور آگ کے قرب سے گرمی، عذاب نار فرما کر ایک عجیب بات ارشاد ہوئی، وہ یہ کہ آگ سے پناہ نہ مانگو، بلکہ آگ کے عذاب سے پناہ مانگو، کفار برزخ میں آگ سے دور رہ کر بھی آگ کا عذاب پائیں گے، جنتی مسلمان گنہگار دوزخیوں کو نکالنے کے لئے دوزخ میں کود جائیں گے، مگر اس کا عذاب نہ پائیں گے، یعنی اے مولیٰ چونکہ ہم مومن ہیں، تیری پاکی، تیری مخلوق کی حکمتوں کا اقرار کرتے ہیں، لہٰذا تو ہمیں دوزخ کی سزا سے بچالے،

خلاصہ تفسیر

جو چیز دیکھی نہ جاسکے، اسے آثار وعلامات سے جانا پہچانا جاتا ہے، ذات باری تعالیٰ ہماری عقل، گمان، وہم سے برتر ہے، اور ایمان کے لئے اس کا جاننا پہچاننا ضروری ہے تو اس پہچان کی صرف یہی صورت ہے کہ اس کی مخلوق کو دیکھو اور اسے پہچانو! اس لئے قرآن کریم میں جگہ جگہ مخلوق کے ذریعہ خالق کی معرفت کرائی گئی ہے، چنانچہ سورۂ بقر پارہ دوم میں آٹھ چیزوں کا ذکر تھا، آسمان زمین کی پیدائش، دن رات کی تبدیلی، لدی ہوئی کشتیوں کا دریا میں تیرنا، آسمان سے بارش آنا، بارش سے خشک زمین کا تر ہوجانا، اور اس تری سے ہر قسم کے جانوروں کی پیداوار، اور ان کا بقاء وقرار، ہواؤں کا انقلاب وگردش، بادلوں کا آسمان و زمین کے درمیان دوڑنا، یہاں تین چیزوں کا ذکر فرمایا، آسمان وزمین کی پیدائش اور دن رات کی تبدیلی، چونکہ عالم اجسام کی مخلوقات کروڑوں ہیں مگر ہیں تین قسم کی، صرف آسمانی، صرف زمینی اور آسمانی زمینی میں مشترکہ، ان تین میں سب کچھ آجاتا ہے، خَلْقِ السَّمٰوٰتِ میں پہلی مخلوق کا ذکر ہے، وَالْاَرْضِ میں دوسری کا، اور رات دن کی تبدیلی میں تیسری مخلوق کا کہ یہ

ذلیل رکھو کہ موت کو قریب اور اپنی امیدوں کو دور جانو۔ پوچھا گیا کہ بندہ میں یہ صفتیں کیونکر پیدا ہوں فرمایا قلب مفرد سے جس میں توحید مجرد ہو۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ استقامت ہی بہت دشوار چیز ہے۔ یہ محض فضل رب سے واصل ہوتی ہے۔ سچے بندے کی یہ پہچان ہے کہ ہمیشہ اطاعت میں مشغول رہے۔ رب تعالیٰ کے سوا کسی کو نہ دیکھے۔ نہ جنت کو نہ دوزخ کو جس کا عقیدہ عمل غرض سے خالی ہو گیا۔ اسے استقامت حاصل ہو گئی۔ اس کے لئے ازلی قابلیت اور شیخ کامل کی تربیت ضروری ہے۔ اچھوں کی نگاہ اور صحبت پتھر کو جوہر اور قطرہ کو گوہر کر دیتی ہے۔ مولینا فرماتے ہیں۔

سالہا باید کہ اندر آفتاب لعل یابد رنگ و رخشانی و تاب

اسی لئے یہاں فَاتَّقُوا اللّٰهَ کے ساتھ وَاَطِیْعُوْنِ فرمایا گیا (روح البیان) مگر یہ اوصاف ایک دم حاصل نہیں ہوتے۔ اس کے لئے مدت درکار ہے۔ نہ قطرہ ایک دم موتی بن جاتا ہے۔ نہ پتھر ایک دم لعل صوفیاء فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آخر میں فرمانا فَاتَّقُوا اللّٰهَ اس تمام گفتگو شریف کا مقصد بیان کرنے کے لئے ہے۔ یعنی میں نے اپنے فضائل بڑائی شیخی کے لئے بیان نہ کئے۔ بلکہ اس لئے تاکہ تم رب سے ڈرو' ایمان لاؤ۔ رب سے ڈرو محرمات سے بچو رب سے ڈرو تشابہات سے بچو' غافل کرنے والی دنیا سے بچو' تقویٰ کے چاروں درجے ایک فَاتَّقُوا اللّٰهَ میں بیان کر دیئے۔ اپنی اطاعت کا ذکر فرما کر یہ بتایا کہ تم تقویٰ کے کسی درجہ پر پہنچ کر میری اطاعت سے بے نیاز نہیں ہو سکتے' کوئی شخص گیس کی روشنی حاصل کر کے گیس سے بے نیاز نہیں۔ اطاعت رب کی بھی ضروری ہے مگر جب کہ اس کے احکام نبی کی معرفت ہم کو ملے۔ اور اطاعت حاکم ماں باپ' عالم' شیخ کی بھی ضروری ہے۔ مگر جب ان کے حکم خلاف شرع نہ ہوں۔ نبی کی اطاعت ہر حال لازم ہے۔ اگرچہ وہ کسی کو کسی قسم کا حکم دیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دوسرے نکاح سے روک دیا حضرت خزیمہ کی گواہی دو کے برابر فرما دی سب کی اطاعت ضروری ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ
پس جب محسوس کیا عیسیٰ نے طرف سے ان کے کفر کو تو فرمایا کون ہیں مددگار میرے طرف اللہ کے کہا
پھر جب عیسیٰ نے ان سے کفر پایا بولا کون میرے مددگار ہوتے ہیں اللہ کی طرف
الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾
ساتھیوں نے کہ ہم ہیں مددگار اللہ کے ایمان لائے ہم ساتھ اللہ کے اور گواہ رہئے اس کے کہ ہم مسلمان ہیں
حواریوں نے کہا ہم دین خدا کے مددگار ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ ہو جائیں کہ ہم مسلمان ہیں
رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۵۳﴾
اے رب ہمارے ایمان لائے ہم ساتھ اس کے جو اتارا تو نے اور پیروی کی ہم نے اس رسول کی پس لکھ تو ہم کو ساتھ گواہوں کے
اے رب ہمارے ہم اس پر ایمان لائے جو تو نے اتارا اور رسولوں کے تابع ہوئے تو ہمیں حق پر گواہی دینے والوں میں لکھ لے

اترتے چاند ڈھلتی چاندنی جو ہو سکے کرلے اندھیرا پاکھ آتا ہے یہ دو دن کی اجالی ہے

تیسرا فائدہ: عقل سے لُب افضل ہے، لب کے معنی تفسیر میں عرض کئے گئے، وہم دخیالات سے پاک وصاف عقل، **چوتھا فائدہ:** عاقل وہ ہے جو اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کی یاد میں گذارے، اگرچہ وہ دنیا زیادہ نہ کمائے جیسا کہ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ الخ سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ذکر چاہیے، کھڑے، بیٹھے، لیٹے، وضو، بے وضو، مرتے وقت کس کا وضو ہوتا ہے، مگر ذکر اللہ خصوصاً کلمہ طیبہ پڑھ کر مرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ذکر بہترین عبادت ہے، خواہ زبان سے ہو یا دل سے یا ارکان سے، ذکر وشکر کی نفیس تحقیق اور ان کے اقسام دوسرے پارہ کی تفسیر میں عرض کئے جا چکے ہیں، **چھٹا فائدہ:** فکر یعنی غور وخوض اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہرگز نہ کرو کہ یہ کفر تک پہنچا دیتی ہے، اس کی مخلوق میں فکر اعلیٰ درجہ کی فکر ہے، اسی لئے ذکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا، اور فکر میں فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ارشاد ہوا، اپنی بے کسی، بے بسی وگنہگاری سوچنا اللہ تعالیٰ کی قدرت ستاری میں غور کرنا عبادت ہے، کوئی مخلوق عبث نہیں اچھی ہو یا بری، پاک ہو یا ناپاک اس کی پیدائش میں لاکھوں حکمتیں ہیں اگرچہ شے خود بری ہو، **آٹھواں فائدہ:** دعا سے پہلے رب تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا قبولیت دعا کا ذریعہ ہے، دیکھو فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ دعا ہے اس سے پہلے رب تعالیٰ کی کیسی شاندار حمد بیان ہوئی، **نواں فائدہ:** دعا سے پہلے رب تعالیٰ کو رَبَّنَا یا اَللّٰهُمَّ کہہ کر پکارنا بہتر ہے، یہ پکار اس کا کرم حاصل کرنے کے لئے ہے نہ کہ غافل کو بیدار کرنے کے لئے، پروردگار غفلت سے پاک ہے، **دسواں فائدہ:** انسان کتنا ہی متقی پرہیزگار ہو، مگر عذاب سے پناہ مانگتا رہے، اپنے کو دعا سے مستغنی نہ جانے، دیکھو فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ سارے مسلمانوں سے کہلوایا گیا گنہگار ہوں یا ابرار، **گیارھواں فائدہ:** ذکر بالجہر بھی جائز ہے اور بالاخفا بھی دونوں پر ثواب ملے گا کیونکہ يَذْكُرُوْنَ مطلق ہے، **بارھواں فائدہ:** مومن صرف مراقبہ وفکر پر ہی قناعت نہ کرے بلکہ ذکر اللہ بھی کرے، دیکھو رب تعالیٰ نے یہاں ذکر و فکر دونوں کی تعریف فرمائی،

اعتراضات

پہلا اعتراض: سورۂ بقر میں آٹھ چیزوں کا ذکر کیوں تھا اور یہاں تین کا ذکر کیوں ہوا، پانچ چیزیں کیوں اڑا دی گئیں؟

جواب: دو وجہ سے، ایک یہ کہ وہ پانچ چیزیں ان تین چیزوں میں آ جاتی ہیں، کیونکہ ہوا اور بادل تو آسمان کے ذکر میں آ گئے، اور جانور کھیتیاں، کشتیاں وغیرہ زمین کے ذکر میں، دوسرے یہ کہ سورۂ بقر میں ابتدائی عقل والوں کا ذکر تھا، یہاں انتہائی عقل والوں کا تذکرہ ہے، عقل ابتداءً بہت دلائل چاہتی ہے، انتہاءً کم دلائل پر ہی کفایت کر لیتی ہے، اسی لئے وہاں ارشاد ہوا لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (بقرہ: ۱۶۴) یہاں ارشاد ہوا لِاُولِي الْاَلْبَابِ۔ **دوسرا اعتراض:** بیمار لاچار کو جو بیٹھنے پر قادر نہ ہو کروٹ پر لیٹ کر نماز پڑھنی چاہیے نہ کہ چت لیٹ کر، دیکھو یہاں ذکر اللہ سے نماز مراد ہے جس کے متعلق آخر میں ارشاد ہوا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ، پھر احناف کیوں کہتے ہیں کہ سخت بیمار چت لیٹ کر نماز پڑھے (شافعی) **جواب:** اس آیت سے مذہب شافعی پر دلیل پکڑنا بہت ضعیف ہے، اس لئے ذکر اللہ سے عام ذکر مراد ہیں، اور مقصد یہ ہے کہ عاقل وہ ہیں جو ہر حال میں خدا کو یاد

فرمانا بالکل حق ہے یعنی جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان یہود سے علامات کفر دیکھ لیں یا ان کا کفر یقین سے معلوم فرمالیا وَقَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ یہ کلام یا تو ہر مومن سے فرمایا جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ (الصف:۱۴) یا اپنے خاص دوستوں اور حواریوں سے جیسا کو سورۂ صف میں فرمایا گیا قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ الخ مَنْ استفہامیہ ہے۔ اور انصار نصیر کی جمع ہے۔ جیسے شریف کی جمع اشراف۔ بعض نے فرمایا کہ جمع نصر کی ہے الی یا تو اپنے معنی میں ہے اور یہ جار مجرور پوشیدہ سے متعلق ہو کر انصار کی ی کا حال ہے۔ جو کہ درحقیقت انصار کا مفعول ہے اصل عبارت یوں ہے مَنْ اَنْصَارِیْ مُلْتَجِئًا اور ذَاهِبًا اِلَى اللّٰهِ یعنی میں جب رب کی طرف جانے لگوں تو اس وقت میرا مددگار کون ہوگا۔ جو یہودیوں سے بچائے بعض نے فرمایا کہ یہ الی بمعنی مع ہے۔ یعنی رب کے ساتھ میری مدد کون کرے گا۔ بعض کے خیال میں الی بمعنی فی ہے یعنی اللہ کی راہ میں یا خدا کے واسطے میرا مددگار کون ہے۔ کہ جس کی نیت رضاء الٰہی ہو نہ کہ دنیا حاصل کرنا (کبیر و روح المعانی وغیرہ) قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ یہ اس جملہ کا جواب ہے۔ حواریون حواری کی جمع ہے بمعنی خالص دوست۔ اسی واسطے خالص آٹے کو دقیق حواری کہتے ہیں۔ اور خالص رنگ والی عورتوں کو نساء حواریات' بعض نے فرمایا حوار ایک شہر کا نام تھا چونکہ یہ لوگ وہاں کے رہنے والے تھے اس لئے ان کا لقب حواری ہوا۔ ی نسبتی ہے۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ حور سے بنا بمعنی لوٹنا رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ (انشقاق:۱۴) اسی لئے مشورہ کو تحاور کہتے ہیں کہ اس میں ایک دوسرے کی طرف کلام لوٹایا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا (مجادلہ ۱) چونکہ خالص دوست کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ اس لئے اسے حواری کہا جاتا ہے۔ بعض کے خیال میں حواری حور بمعنی سفیدی سے بنا۔ جس کی آنکھ کی سفیدی خوب تیز ہو۔ اسے حورہ کہتے ہی۔ اسی لئے جنت کی عورتوں کا نام حور ہے۔ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے یہ ساتھی یا تو دھوبی تھے کہ لوگوں کے کپڑے سفید کیا کرتے تھے یا خود سفید کپڑے پہنتے تھے۔ یا ان کے چہرے سفید تھے یا ان کے دل منور تھے اور اخلاق پاکیزہ اس لئے انہیں حواری کہا گیا قتادہ اور مقاتل وغیرہ نے یہ ہی فرمایا یہ کل بارہ حضرات تھے جن میں یعقوب' شمعون اور یوحنا بھی داخل ہیں۔ رہی یہ تحقیق یہ کون لوگ تھے انشاء اللہ اس کا ذکر خلاصہ تفسیر میں آئے گا بعض نے کہا کہ یہ انتیس آدمی تھے مگر پہلی بات صحیح ہے انصار اللہ میں یا دین پوشیدہ ہے یا کچھ پوشیدہ ہے عیسیٰ علیہ السلام کے خالص دوستوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ کے دین کے یا اللہ کے نبی کے یا اللہ کے مددگار ہیں۔ امنا باللہ یہ نیا جملہ ہے گویا پہلے جملہ کی دلیل ہے۔ اس جملہ کے دو مقاصد ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ ہم کو ایمان جیسی دولت آپ کے ذریعے سے ملی تو اس کا تو شکریہ ضرور ادا کریں گے کہ آپ پر پروانہ وار فدا ہو جائیں گے دوسرا یہ کہ ہم نے ایمان کا دعویٰ کیا ہے اس کے ثبوت کے لئے ہم آپ پر قربان ہوں گے جڑ کی دلیل شاخیں ہوتی ہیں ایمان کی دلیل اعمال۔ اور سب سے بڑا عمل نبی پر صدقے ہو جانا ہے۔ قیامت میں وضو کی چمک' سجدہ گاہ کی نورانیت دلیل ایمان ہوگی۔ بہر حال آمنا باللہ یا نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ کی دلیل ہے۔ یا اس کا عکس اس میں مسلمانوں کو تعلیم ہے کہ اپنے ایمان کا ثبوت دنیا میں قائم کریں۔ اور بوقت ضرورت دین پر نثار ہو جایا کریں۔ ایمان باللہ کے معنی بارہا ہو چکے یعنی ہم اللہ پر ایمان لے آئے۔ اور مومن کی شان ہے کہ وہ اللہ کے دین کی مدد کرے۔ خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ کا جاننا ماننا اور ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا کچھ

تعریف، مردودوں کی برائی سب اللہ کا ذکر ہے، سارا قرآن ذکر اللہ ہے، خواہ ابولہب کی برائی کی آیتیں ہوں یا حضرات انبیاء و اولیاء کی عظمت کی یا ذات و صفات کی آیتیں، **ساتواں اعتراض:** اٹھتے بیٹھتے اللہ کا نام لینا بالکل بیکار ہے عمل میں کوشش چاہیے، دوا کا نام جپنے سے بیماری نہیں جاتی بلکہ اس کے استعمال کرنے سے جاتی ہے، **جواب:** اللہ تعالیٰ کا نام جپنا بھی ایک عمل ہے، لہٰذا یہ بھی باعثِ نجات ہے، ہر دوا کھائی پی نہیں جاتی، بعض دوائیں لگائی جاتی ہیں، بعض سونگھی جاتی ہیں، بعض دیکھی جاتی ہیں بلکہ بولنے چلنے اور سننے سے بھی علاج کئے جاتے ہیں، باغوں میں چلنا، سبزہ کو دیکھنا علاج ہے، غمزدوں کو نغمے سنانا علاج ہے، اگر روزہ میں خشکی ہو جائے، تو روزہ دار کے سامنے لیموں کاٹنا بلکہ کھٹی چیزوں کا ذکر منہ میں پانی لاتا ہے اور خشکی کو دفع کرتا ہے، ہر وقت اللہ کے ذکر سے اس کی طرف دھیان رہے گا، اس سے محبت پیدا ہوگی، اس محبت سے نیک اعمال آسان ہوں گے اور برے اعمال سے نفرت ہوگی، دل کو چین نصیب ہوگا،

حکایت: کسی نے مجنوں کو دیکھا کہ ریگستان میں بیٹھا ہوا انگلی سے کچھ لکھ رہا ہے، پوچھا کسے خط لکھتا ہے، بولا لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں، بے چین دل کو چین دے رہا ہوں، اشعار

دید مجنوں را کسے صحرا نورد   در بیابان جنوں بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم   می نمودے نامہ بہر کس رقم
گفت اے مجنون شیدا چیست ایں   می نویسی نامہ بہرِ کیست ایں
گفت مشقِ نام لیلیٰ می کنم   خاطرِ خود را تسلی مے دہم

مجنوں کو لیلیٰ کے ذکر سے تسکین ہوتی ہے، بندے کو مولیٰ کے ذکر سے تسلی ہوتی ہے، اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (رعد:۲۸)

تفسیر صوفیانہ

جیسے آنکھ بیک وقت دو چیزیں نہیں دیکھ سکتی، ایسے ہی عقل بیک وقت دو چیزیں نہیں سوچ سکتی، عارف کا ابتدائی حال یہ ہے کہ دلائل میں غور کرے، رب تعالیٰ کو پہچانے، مگر انتہائی حال یہ ہے، کہ نورِ معرفت سے اسے، جب یہ نور مل جاتا ہے، تو دلائل اس کے لئے حجاب بن جاتے ہیں، جس قدر غیر اللہ میں مشغولیت کم ہوگی، اسی قدر نورِ معرفت زیادہ حاصل ہوگا، رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (طٰہٰ:۱۲) اے موسیٰ اپنے دونوں جوتے اتار دو، اب تم مبارک جنگل طویٰ میں آگئے ہو، دو جوتے کیا تھے، دلیل کے صغریٰ کبریٰ وادی مقدس کیا ہے؟ معرفت الٰہی کا میدان یعنی تم مجھے اب صرف دلائل سے نہ مانو بلکہ نورِ معرفت سے پہچانو (تفسیر کبیر) بندہ اولاً رب تعالیٰ کو عالم کے ذریعہ پہچانتا ہے پھر خود اپنی ذات کے ذریعہ سے اسے مانتا ہے وَفِيْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (ذاریات:۲۱) مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ کہ اپنے کچھ نہ ہونے سے رب تعالیٰ کا سب کچھ ہونا جانتا ہے، آخر میں رب کو رب سے ہی جانتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں عارف خود بھی فنا ہو چکا ہے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے معنی عام مومنین کے ہاں یہ ہیں کہ لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰهُ خواص فرماتے ہیں، اس کے معنی ہیں لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰه اور لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰه آگے بڑھ کر کہتے ہیں لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰه، اس مرتبہ میں پہنچ کر

سے عیسیٰ علیہ السلام نے کہے تھے اس لئے انہوں نے یہ دعا کی۔ ابو صالح نے کہا کہ شاہدین سے مراد انبیائے کرام ہیں۔ کیونکہ ہر نبی اپنی امت کا یا امت پر گواہ ہے۔ مقاتل نے فرمایا کہ اس سے سچے لوگ مراد ہیں۔ زجاج نے فرمایا کہ اس سے تمام انبیاء کی مومن امتیں مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ اس سے فرشتے مراد ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ الخ (آل عمران: ۱۸) بعض کا خیال ہے کہ شاہدین سے مراد شہود جمال میں مستغرق ہونے والے ہیں۔ جنہیں مشاہدہ جمال کی وجہ سے مشقتیں اور تکالیف محسوس ہی نہ ہوں گے۔ مگر پہلا قول نہایت صحیح ہے یعنی اے مولیٰ چونکہ ہم تیرے رسول کے ہر طرح پیرو کار بن چکے ہیں لہٰذا ہمارے نام گواہوں کے رجسٹر میں انہی کے ساتھ درج فرما ہمیں حق پر گواہی دینے والوں کے زمرے میں داخل کریا ہمیں آخرت میں انبیائے کرام کی ہمراہی و معیت نصیب فرما کہ اگر ان کی ہمراہی نصیب ہوگئی۔ تو سب کچھ مل گیا اور ہم ہر آفت سے بچ گئے شعر

میں مجرم ہوں آقا مجھے ساتھ لے لو کہ رستہ میں ہیں جا بجا تھانہ والے
گر محمد کا ساتھ ہو جائے پھر تو سمجھے نجات ہو جائے

برات کی دھوم دھام اگرچہ دولہا کے دم قدم سے ہوتی ہے۔ مگر دولہا کے طفیل اس کے ساتھی بھی کھانے وغیرہ سے نوازے جاتے ہیں۔ اور دولہا کے دائمی خدمت گار کھانے کے علاوہ انعامات بھی پاتے ہیں۔ یا ہمیں مشاہدہ کرنے والوں میں سے بنا کہ بوقت موت و قتل جنت وغیرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جس سے نہ ہمیں قتل کا احساس ہو نہ شدت نزع کا جیسے حضرت آسیہ کو چو میخا کرتے وقت جنت دکھائی گئی۔ شاہد محبوب کو بھی کہہ دیتے ہیں۔ اگر یہ معنی ہوں تو مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں اپنے محبوبوں کے ساتھ رکھ اکیلا نہ رکھ۔ کیونکہ شیطان اکیلے کو جلدی شکار کرتا ہے۔ نہ مردودوں کے ساتھ رکھ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ (آل عمران ۵۴) مکر کے لغوی معنی پوشیدگی ہیں اس لئے اندھیرے کو مکر کہتے ہیں کہا جاتا ہے کہ مکر اللیل رات کا اندھیرا (کبیر) اصطلاح میں خفیہ تدبیر کو مکر کہنے لگے جس کی دوسرے کو خبر نہ ہونے دی جائے یہ دو قسم کا ہے اچھا اور برا فساد کی تدبیر بری ہے۔ اور فسادیوں کو پکڑنے کی خفیہ تدبیر اچھی ڈاکوؤں نے ڈکیتی کی چھپی تدبیریں کیں وہ ملزم ہیں۔ پولیس نے انہیں گرفتار کرنے کی خفیہ تدبیر کی۔ یہ نہایت اچھا۔ اس لئے عربی میں بھی بری تدبیر کو مکر السیئ کہتے ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (فاطر: ۴۳) اچھی تدبیر کو مکر خیر جیسے وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ (آل عمران: ۵۴) بعض نے فرمایا کہ مکر کے لغوی معنی اجتماع و مضبوطی اور پختگی ہیں۔ اسی لئے حسین عورت کو امرۃ ممکورۃ کہتے ہیں۔ یعنی جس میں اسباب حسن جمع ہوں لہٰذا مضبوط فساد بھی مکر ہے۔ اور مضبوط پکڑ بھی مکر بعض نے کہا کہ مکر کے معنی خفیہ فساد ہی ہیں۔ مگر کبھی جرم کے بدلے کو بھی جرم کا نام دے دیتے ہیں۔ جیسے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ (شوریٰ: ۴۰) غرض ان دو مکروں میں بڑا فرق ہے۔ اسی لئے یہ صیغہ دو جگہ استعمال فرمایا۔ یہاں پہلے مکروا کا فاعل وہ یہود ہیں۔ جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی سازش کی یعنی ان یہودیوں نے حضرت مسیح کے قتل کی بڑی مضبوط خفیہ تدبیر کی۔ اور اللہ نے انہیں بچانے کی اہم اور خفیہ تدبیر فرمائی۔ کہ انہیں زندہ آسمان پر بلا لیا۔ اور انہی کے ایک آدمی کو قتل کرا دیا۔ اس کا واقعہ انشاء اللہ خلاصہ تفسیر میں آئے گا مگر خیال رہے کہ مکر مخالف تدبیر کو کہتے ہیں اور وہ مخالف ہی سے چھپائی جاتی ہے جس کے حق میں ہو اس پر ظاہر کر دی جاتی ہے چنانچہ رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی اسی تدبیر پر مطلع

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَمَا
اے ہمارے پالنہار بے شک تو جسے آگ میں ڈالے تو تو نے اسے رسوا کر دیا اور
اے رب ہمارے بے شک جسے تو دوزخ میں لے جائے اسے ضرور تو نے رسوائی دی اور
لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا
نہیں ہے ظالموں کا کوئی مددگار اے ہمارے پالنے والے بے شک ہم نے ایک پکارنے
ظالموں کا کوئی مددگار نہیں اے رب ہمارے ہم نے ایک منادی
يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا
والے کو سنا جو ایمان کے لئے پکارتا ہے کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ چنانچہ ہم ایمان لے آئے اے ہمارے پالنہار
کوسنا کہ ایمان کے لئے ندا فرماتا ہے کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لائے اے رب
فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ
تو بخش دے ہمارے لئے ہمارے گناہ اور دور کردے ہم سے ہماری خرابیاں اور موت دے
ہمارے تو ہمارے گناہ بخش دے اور ہماری برائیاں محو فرما دے اور ہماری موت
الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ؕ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ
ہم کو نیکوں کے ساتھ اے ہمارے پالنہار ہمیں وہ دے جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے اپنے رسولوں
اچھوں کے ساتھ کر اے رب ہمارے اور ہمیں دے وہ جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے اپنے رسولوں
وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾
کی زبان پر اور نہ رسوا کر ہم کو قیامت کے دن بے شک تو نہیں خلاف کرتا وعدہ
کی معرفت اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کر بے شک تو وعدہ خلاف نہیں کرتا

تعلقات

اس آیت کا گذشتہ آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں عذاب نار سے بچنے کی دعا سکھائی گئی تھی، اب اس آیت میں اس کی وجہ ارشاد ہو رہی ہے کہ اس لئے اس سے پناہ مانگو، کہ وہاں سخت تکلیف بھی ہے رسوائی بھی، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں عقلمندوں کی تین نشانیاں بیان فرمائی گئیں، ذکر، فکر، ہر چیز کی حقانیت کا اقرار، اب انہی عاقلوں کی کچھ اور نشانیاں بیان فرمائی جا رہی ہیں، یعنی اپنے کو گنہگار اور رب تعالیٰ کو غفار جانتے ہیں، **تیسرا تعلق:** پچھلی

کہ عیسیٰ علیہ السلام ایسے مقبول الدعا ہیں کہ انہوں نے اتنی جماعت کو سور بنا دیا۔ تو بھی ان کا مخالف ہے اپنی خیر منا۔ کبھی ان کی بد دعا سے تیرا بھی یہ ہی حال ہونا ہے۔ اس نے کہا کیا کیا جائے۔ ایسے مقبول بارگاہ کے مقابلہ میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔ وہ بولا کہ انہیں کسی حیلہ سے شہید کر دیا جائے۔ تا کہ ان کی بد دعا کا اندیشہ جاتا رہے چنانچہ ایک شخص ططیانوس کو اس کام کے لئے منتخب کیا گیا ططیانوس ایک منافق آدمی تھا جو بظاہر عیسیٰ علیہ السلام کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ اور در پردہ وہ یہود سے ملا ہوا تھا جب یہ واقعہ ہونے والا تھا تب ہی عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرما دیا تھا کہ آج صبح سے پہلے ایک شخص مجھے چند درم کے عوض فروخت کر دے گا ہمیشہ ہی سے پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی رہتے ہیں اور مخلصین کے ساتھ منفقین بھی رہتے ہیں۔ حضور ﷺ کے پاس بھی ایسے ہی مار آستین سانپ دوست نما دشمن تھے۔ وہ حضرات ان منافقوں کو پہچانتے ہیں۔ مگر چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے اس فرمان سے معلوم ہو رہا ہے۔ چنانچہ ططیانوس کو یہود کی طرف سے تیس درم یعنی ساڑھے سات روپے دینے کا وعدہ کیا گیا اس شرط پر کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو اچانک شہید کر دے۔ یا کرا دے چنانچہ ططیانوس جماعت یہود کو اپنے ساتھ لے کر اندھیری رات میں آپ کے قیام گاہ پر گیا۔ ان سب کو اس گھر کے آس پاس کھڑا کر کے خود اندر داخل ہوا کیا دیکھتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اچانک کھڑکی کے ذریعہ اس حجرہ میں سے نکل کر آسمان پر تشریف لے گئے۔ یہ حیران رہ گیا۔ باہر کے یہودی یہ سمجھے کہ شاید ططیانوس عیسیٰ علیہ السلام سے جنگ کر رہا ہے۔ اس لئے واپسی میں دیر ہوئی۔ رب تعالیٰ نے ططیانوس کو عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل بنا دیا۔ اب یہ باہر آیا اس کے نکلتے ہی ان یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے شبہ میں اسے پکڑ لیا۔ یہ لاکھ چیخا چلایا کہ میں تمہارا ساتھی ہوں حضرت مسیح کو قتل کرنے گیا تھا مگر کسی نے ایک نہ سنی بولے کہ اے عیسیٰ تو نے ہمارے آدمی کو قتل کر دیا اب ہمیں دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ یہ کہہ کر اسے سولی پر چڑھا دیا آج تک عیسائی اس وہم میں مبتلا ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر سولی دے دی گئی۔ اور پھر انہیں دوبارہ زندہ کر کے آسمان پر پہنچایا گیا۔ اس لئے سارے عیسائی صلیب کو پوجتے ہیں اور اس سولی کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ططیانوس کو سولی دی گئی۔ نہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کو۔ فقیر نے اس سولی گاہ اور تمام مقامات کی بیت المقدس میں زیارت کی۔ حضرت مریم کو خبر پہنچی کہ عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی۔ آپ ایک عورت کے ساتھ صلیب پر پہنچیں اور اس لٹکی ہوئی لاش کے سامنے بیٹھ کر زار زار رونے لگیں کئی روز تک برابر یہاں آتی تھیں اور روتی تھیں۔ ساتویں روز عیسیٰ علیہ السلام کو حکم الٰہی ہوا کہ جاؤ اپنی ماں کو تسکین دو۔ لہٰذا آپ ایک پہاڑ پر رات کے وقت اترے سارا پہاڑ نور سے منور ہو گیا۔ اپنی والدہ اور حواریوں کو بلایا آپ کی والدہ آپ سے لپٹ کر رونے لگیں۔ اور بولیں اے عیسیٰ تم کہاں۔ فرمایا والدہ محترمہ میں بخیریت ہوں جس کو سولی دی گئی ہے وہ اور شخص ہے۔ تم صبر کرو اپنے حواریوں کو تبلیغ احکام کی ہدایت فرمائی اور سب کے لئے علاقے مقرر کئے۔ کہ فلاں فلاں علاقے میں دین کی خدمت انجام دو یہ سارا کام تقسیم کر کے آپ پھر اوپر چلنے لگے۔ حضرت مریم نے کہا کہ کہاں جاتے ہو۔ فرمایا رب تعالیٰ کے پاس۔ بولیں کب ملو گے۔ فرمایا تم سے قیامت کے دن اور پھر نگاہوں سے غائب ہو گئے۔

نوٹ: حضرت مریم تیرہ سال کی عمر میں حاملہ ہوئیں۔ اور بیت المقدس میں بیت اللحم کے علاقہ میں ایک جنگل میں درخت کے کھجور کے نیچے جو پہلے خشک تھا آپ کے ہاتھ لگنے سے سرسبز اور پھل والا ہو گیا عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش

جیسا کہ اگلے مضمون سے ظاہر ہے، سننے سے مراد مطلقاً سننا ہے بلاواسطہ ہو یا بالواسطہ، حضرات صحابہ کرام نے حضور انور ﷺ کے فرمان براہ راست بلاواسطہ سنے، بعد کے لوگوں نے بواسطۂ علماء سنے، لہٰذا سارے مسلمانوں نے سن لیے، مُنَادِیْ نِدَاءٌ سے بنا بمعنی پکارنا، محض چلانے چیخنے کو بھی نداء کہہ دیا جاتا ہے جیسے اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً (بقرہ: ۱۷۱) مگر یہاں مقصود والی پکار کو نداء فرمایا گیا ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰی (شعراء: ۱۰) یا فرماتا ہے وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ (مائدہ: ۵۸) یہاں منادی سے مراد حضور انور ﷺ ہیں، حضرت ابن مسعود ابن عباس ابن جریج وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہ ہی قول ہے، دیکھو تفسیر کبیر، روح المعانی، خازن، بیضاوی، مدارک، روح البیان، جلالین وغیرہ، اس آیت کی تفسیر وہ آیت اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ (نحل: ۱۲۵) اور فرماتا ہے دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ (احزاب: ۴۶) اور فرماتا ہے اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ (یوسف: ۱۰۸) ان آیات و اقوال و روایات سے معلوم ہوا کہ حضور انور ﷺ ہی منادی ہیں، آپ ہی داعی ہیں، نداء و دعا ہم معنی ہی ہیں، بعض نے کہا کہ منادیا سے مراد قرآن شریف ہے بعض نے کہا مومن کی عقل جو حق کی طرف رہبری کرے، اس صورت میں منادی مجازی معنی میں ہوگا، کیونکہ قرآن شریف و عقل حقیقی نداء نہیں کرسکتے، بعض کے خیال میں حضور انور ﷺ اور قرآن کریم، عقل سلیم سب ہی مراد ہیں، اس صورت میں منادی کے حقیقی و مجازی معنی کا اجتماع لازم آئے گا، کہ حضور انور ﷺ تو حقیقی منادی ہیں، یہ دو چیزیں مجازی منادی بہرحال قوی تر یہ ہی ہے کہ یہاں منادی سے مراد ذات سرور کائنات ﷺ ہے، اگرچہ سرکار نے تبلیغ چیخ و پکار سے نہ کی، مگر چونکہ رب تعالیٰ نے آپ کی ہر بات تمام دنیا میں پھیلائی اور باقی رکھی، اس لئے حضور انور ﷺ کی تبلیغ کو نداء قرار دیا گیا اور آپ کو منادی یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا، یہ جملہ منادیًا کا بیان ہے یُّنَادِیْ بمعنی حال ہی ہے چونکہ حضور انور ﷺ کی نداء و تبلیغ اب تک قائم ہے اور تاقیامت قائم رہے گی، لہٰذا اسے یُّنَادِیْ صیغہ حال سے تعبیر فرمایا گیا، گویا حضور انور ﷺ اب بھی نداء دے رہے ہیں، نیز چونکہ یہ نداء کسی خاص جماعت یا قوم سے خاص نہیں، ہر شخص کے لئے عام ہے اس لئے یُّنَادِیْ کا مفعول بیان نہ ہوا کہ کسے پکار رہے ہیں یعنی سب کو پکار رہے ہیں بلا رہے ہیں، لِلْاِیْمَانِ کا لام یا تو بمعنی الی ہے، جیسے رب تعالیٰ فرماتا ہے ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (مجادلہ: ۸) یا فرماتا ہے بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (زلزلہ: ۵) یا فرماتا ہے هَدٰىنَا لِهٰذَا (اعراف: ۴۳) ان تمام آیات میں لام بمعنی الی ہے یا لام اجل کا ہے، یہ جملہ منادیًا کا حال ہے یا صفت، اَنْ اٰمِنُوْا الخ یُّنَادِیْ کا بیان ہے، رب تعالیٰ پر ایمان لانے سے مراد اس کی ذات و صفات، اس کے انبیاء و اولیاء، اس کی کتابوں، فرشتوں غرضکہ تمام ایمانی چیزوں کو صحیح طور پر مان لینا ہے اَنْ اٰمِنُوْا میں حضور انور ﷺ کے فرمان کا بیان ہے اور فَاٰمَنَّا میں اپنے عمل کا ذکر، کہ ان کا فرمان ہم نے سن لیا مان لیا اس پر عمل کرلیا کہ ہم ان کے تمام فرمانوں پر ایمان لے آئے یعنی اے مولیٰ ہم نے تیرے محبوب حضور محمد ﷺ کی نداء "ایمان" دعاء اسلام سن لی بواسطہ علماء ان کے فرامین ہم تک پہنچ گئے، تو ہم نے وہ نداء قبول کرلی اور ایمان لے آئے، لہٰذا اب رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا یہ اس دعاء کا تیسرا جملہ ہے جس میں تیسری بار رَبَّنَا فرمایا گیا، مغفرت کے معانی و اقسام بارہا بیان ہو چکے، لَنَا میں لام نفع کا ہے، ذُنُوْبَ ذنب کی جمع ہے بمعنی گناہ، یہاں گناہ سے مراد گناہ کبیرہ ہیں، اس جملہ میں تین دعائیں کی

لگایا تھا مالی نے ایک باغ ایسا　　نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا

بعض علماء فرماتے ہیں کہ کل قیامت میں ان حواریوں کا حشر امت مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ ہوگا کیونکہ انہوں نے دعا مانگی تھی فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ خداوندا ہمیں امت مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ لکھ دے۔ جو کہ نبیوں کے گواہ ہیں۔ جیسا کہ بعض کلمہ گو مسلمانوں کا حشر عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ ہوگا۔ جنہیں دنیا میں ان سے محبت ہے۔ قیامت میں ہر شخص اسی کے ساتھ ہوگا جس سے دنیا میں محبت کرتا رہا ہے۔ حواری تو پھر انسان ہیں اصحاب کہف کا کتا انسانی شکل میں اصحاب کہف کے ساتھ جنت میں جائے گا۔ کیوں؟ اسی لئے کہ وہ اگرچہ کتا ہے مگر رب کے پیاروں سے محبت کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ اچھوں کی صحبت نصیب کرے۔

حواریوں کی تبلیغ: محمد ابن اسحاق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر تشریف لے جانے کے بعد یہود نے حواریوں کو بہت ستایا اور انہیں بہت دکھ دیئے۔ یہ خبر کسی طرح بادشاہ روم داؤد ابن نوذہ کو پہنچی کہ شام میں ایک بزرگ پیدا ہوئے تھے۔ جنہوں نے دعویٰ نبوت فرمایا انہیں تو یہود نے سولی دے دیا۔ اور اب ان کے جانشین یہود کے ہاتھوں سخت مصیبت میں ہے۔ اس نے شاہ یہود سے سفارش کر کے ان حضرات کو اپنے ملک روم میں بلایا اور ان میں سے عیسیٰ علیہ السلام کے حالات سن کر ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر بنی اسرائیل پر حملہ کر کے ان کا قتل عام کیا۔ اس وجہ سے روم میں نصرانیت خوب پھیلی۔ پھر چالیس سال کے بعد شاہ طیطوس داؤد کا جانشین ہوا۔ اور اس نے بیت المقدس پر حملہ کر کے وہاں کے تمام یہود کو غارت کیا۔ شہر کو بالکل ویران کر دیا۔ کچھ یہود طیطوس کے ہاتھوں مارے گئے۔ اور کچھ جان بچا کر بھاگ گئے جن میں سے دو قبیلے بنی قریظہ اور بنی نضیر حجاز میں آباد ہو گئے۔ جو مسلمانوں کے ہاتھوں مدینہ منورہ سے کچھ نکالے گئے کچھ مارے گئے (تفسیر کبیر و روح المعانی وغیرہ) مکر اللہ کے یہ معنی ہوئے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** غیر اللہ سے مدد مانگنا جائز بلکہ سنت انبیاء ہے۔ بلکہ سنت الٰہیہ ہے۔ کہ رب نے فرمایا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (محمد:۷) یہ استمداد اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے خلاف نہیں دیکھو عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مَنْ اَنْصَارِيْ اِلَى اللّٰهِ حضرت سکندر ذوالقرنین نے فرمایا تھا وَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ (کہف:۹۵) بلکہ عیسائیوں کو نصاریٰ اس لئے کہتے ہیں کہ ان کے بزرگوں نے کہا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ صحابہ کرام کی ایک جماعت کا نام انصار ہے کیونکہ انہوں نے دین کی مدد کی تھی۔ **دوسرا فائدہ:** مقبولان خدا کی خدمت رب کی اطاعت ہے۔ کہ حواریوں نے اپنے آپ کو اسی لئے انصار اللہ کہا کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے مددگار تھے۔ **تیسرا فائدہ:** دنیا میں تو امتی نبی کی گواہی دیتے ہیں۔ مگر قیامت میں نبی انشاء اللہ امت کے ایمان کی گواہی دیں گے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرۃ:۱۴۳) ہم کو چاہیے کہ ہم حضور ﷺ اور مقبولان بارگاہ الٰہی کو اپنے ایمان کا گواہ بنالیں زائرین مدینہ سلام الوداع میں الوداعیہ کلمات کے ساتھ یہ بھی عرض کرتے ہیں یا رسول اللہ ﷺ حضور گواہ رہیں کہ میں آپ کا امتی ہوں پڑھتا ہوں لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ ان کلمات کی اصل یہ آیت کریمہ ہے۔ دیکھو حواریوں

عرض کئے گئے یوم قیامت سے مراد قیامت کا سارا دن ہے قبروں سے اٹھنے سے لے کر پل صراط گذر جانے تک یعنی ہم کو ثواب کے ساتھ قیامت میں سرخروئی و نیک نامی بھی عطا فرما، اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ سبحان اللہ کیسا اچھا تتمہ ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ مولیٰ ہم کو تیرے وعدہ خلاف ہونے کا اندیشہ نہیں، تو سچا، تیرے وعدے سچے، ہم کو اپنی طرف سے ڈر ہے کہ کہیں بہک کر تیرے وعدوں کے مستحق نہ رہیں، تو کرم فرما، ہم کو سیدھا راستہ دکھا، سیدھے راہ پر چلا، سیدھی راہ پر چلتے ہوئے اٹھا تا کہ تیرے وعدوں کے حقدار بنیں، تُخْلِفُ اور الْمِيْعَادَ کے معنی پہلے بیان ہو چکے کہ اخلاف کے معنی ہیں وعدہ کر کے پورا نہ کرنا، وعید دے کر پوری نہ کرنا، معافی ہے رب تعالیٰ اخلاف سے پاک ہے اور بہت ہی معاف فرمانے والا ہے، اگر اس کی معافی وسیع نہ ہو، تو ہمارا ٹھکانہ کہاں لگے، میعاد وعد کا مصدر ہے،

خلاصہ تفسیر

ہمارے مومن بندوں کی پہچان یہ ہے کہ ہر حال میں ہمارا ذکر، ہماری مخلوق میں غور و فکر بھی کرتے ہیں، ہماری پاکی بولتے ہیں، ساتھ ہی یہ دعائیں بھی کرتے ہیں کہ اے مولیٰ جو کفر پر مرے اور تو اسے کفر کی بنا پر دائمی عذاب کے لئے دوزخ میں داخل فرما دے، اسے تو تو نے رسوا کر دیا، ایسے ظالموں، کافروں کا کوئی شفاعت کرنے والا تو ہے ہی نہیں، ان کا مددگار بھی کوئی نہیں، جو انہیں تیرے عذاب سے بچالے یا ایسوں کا کوئی شفاعت کرنے والا نہیں، نہ ان کا کوئی یار ہے نہ مددگار، اے ہمارے پالنے والے ہم نے تیرے محبوب ﷺ کی پکار، ان کی دعوت سن لی، کہ وہ سارے بندوں کو ایمان کی دعوت دے رہے ہیں اور ان کی تبلیغی دعوت سارے جہان میں پہنچ رہی ہے، دنیا ان کی تعلیمی آواز سے گونج رہی ہے، ہم نے محض تیرے فضل و کرم سے ان کی دعوت قبول کر لی، ہم ایمان لے آئے اے مولیٰ ہمارا ایمان قبول فرما، اور اس کی برکت سے ہمارے بڑے گناہ یا نئے گناہ یا دانستہ کئے ہوئے گناہ تو معاف فرما دے، اور چھوٹے گناہ یا بھول سے کئے ہوئے گناہ یا جہالت سے صادر شدہ گناہ دفع فرما دے، اس کے ساتھ ہی ہم کو نیکوں کے زمرہ اور ان کے متبعین میں موت دے، کہ جب مریں تو تیرے مقبولوں کی جماعت میں ہوں، ان سے علیحدہ نہ ہوں، اے ہمارے پالنے والے تو نے جن نعمتوں بھلائیوں کا وعدہ اپنے رسولوں کی معرفت ہم سے کیا ہے وہ تمام نعمتیں ہم کو عطا فرما اور قیامت میں ہماری پردہ پوشی کر، ہم کو رسوا نہ کر، ہمارے پردے رہنے دے، ہم کو یقین ہے کہ تیرے سارے وعدے سچے ہیں تو اپنے وعدے خلاف نہیں کرتا، البتہ ہم کو اپنے سے اندیشہ ہے، کہ اس وعدے کے مستحق ہم رہیں یا نہ رہیں، اے کریم ہم کو توفیق دے، تیرے وعدوں کے اہل بنیں، اہل رہیں، تا کہ تیری نعمتوں کے مستحق ہوں،

نوٹ: یہ آیت کریمہ بہترین دعاؤں کی جامع ہے، یوں تو ہر وقت ہی یہ آیت پڑھنی چاہیے، مگر خصوصیت سے تہجد کے وقت اور تہجد کی نماز میں پڑھنے سے بہت لطف بھی آتا ہے، قبولیت کی بھی امید ہے، اس آیت میں چار بار رَبَّنَا عرض کیا گیا ہے، امام جعفر صادق فرماتے ہیں کہ جو کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے، وہ پانچ بار رَبَّنَا کہے، اللہ تعالیٰ اسے مصیبت سے نجات دے گا، ابن ابی حاتم نے حضرت عطاء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا، فرماتے ہیں جو بندہ تین بار یا رب، یا رب، یا رب کہے، اللہ تعالیٰ اس پر نظر کرم فرماتا ہے، جب یہ قول خواجہ حسن بصری سے بیان کیا گیا، تو آپ نے اس کی تائید میں یہ

ناممکن۔ پھر فَلَمَّآ اَحَسَّ کیوں فرمایا گیا؟ **جواب:** اس کے جوابات تفسیر میں گذر چکے۔ کہ یا تو احساس بمعنی یقین ہے اور یا کفر سے علامات کفر مراد ہیں۔ اور یا نگاہ انبیاء کرام غیر محسوس چیزوں کو بھی دیکھ لیتی ہے۔ جیسے ہمارے خواب وخیال۔
تیسرا اعتراض: جو دھوکا کھاتا ہے یا مکروفریب کرتا ہے وہ نیک آدمی ہی نہیں کہلایا جاسکتا چہ جائیکہ اسے خدا کہا جائے۔ بھلا خدا بھی کہیں فریب کرسکتا ہے (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** پنڈت جی عجیب دماغ آدمی ہیں۔ اردو کا لفظ لے کر عربی قرآن پاک پر اعتراض کررہے ہیں۔ عربی میں مکر کے معنی وہ ہیں جو ہم نے تفسیر میں بتائے اردو میں فریب کو مکر کہتے ہیں اور قرآن اردو میں نہیں عربی میں ہے۔ انگریزی میں بک (Book) کے معنی ہیں کتاب۔ اردو میں اس کے معنی ہیں گھونسا (مکا) اگر کسی انگریزی کتاب میں لکھا ہوا۔ کہ سپاہی نے بادشاہ کو بک دیا۔ تو اس کے معنی یہ نہیں کہ گھونسا مار دیا۔ فارسی میں مہتر کے معنی ہیں سردار۔ اردو میں بھنگی کو مہتر کہتے ہیں۔ اگر کسی فارسی کتاب میں بادشاہ کو مہتر لکھا ہو تو شاید آپ جیسے عقلمند اس کے معنی بھنگی کریں گے۔ سنسکرت میں سور سورج کو بھی کہتے ہیں اور بہادر کو بھی مگر اردو میں سور کو کہتے ہیں اب شاید پنڈت جی اس شعر کے معنی کہ

برن کو دکھ بہت ہے اور چھوٹن سے دکھ دور ۔۔۔ تارے سب نیارے رہیں گہن چاند اور سُور

یہ کریں گے کہ چاند اور سورج کو گہن لگتا ہے یہ اعتراض زبان سے نادانی پر مبنی ہے۔

تفسیر صوفیانہ

جب عیسیٰ قلب نے قویٰ نفسانیہ کے کفر یعنی محجوبیت اور انکار اور مخالف ربانی کا یقین کرلیا تو قویٰ روحانیہ سے خطاب کرکے کہا کہ میں اب نفسانی شیاطین سے منہ موڑ کر رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجانا چاہتا ہوں۔ اس کام میں میری کون مدد کرے گا۔ قویٰ روحانیہ کے حواری جو قلب مومن کے خالص دوست ہیں کہنے لگے کہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے اور نور روح سے منور اور دلائل عقلیہ پختہ ہوچکے ہیں۔ اے عیسیٰ قلب تو گواہ رہ کہ ہم تیرے مددگار ہیں۔ اے مولیٰ ہم تیرے اتارے ہوئے علم توحید اور فیض نور پر ایمان لاچکے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ان لوگوں میں شامل فرما جو تیری بارگاہ میں حاضر' تیرے حکم کے منتظر اور تیری واحدانیت کے گواہ ہیں۔ پھر وہم اور خیالات نے قلب کو دھوکا دینے اور اسے مختلف شبہات میں پھنسانے کی بہت تدبیر کی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے دلائل عقلیہ اور ان میں براہین یقینیہ سے قلب کی مدد کی۔ جو اس کے خیالات وشکوک کو دور کریں۔ اور عیسیٰ قلب کو آسمان روح کی طرف پہنچادیا۔ اور نفس کو قلب کا ہم رنگ بنا کر ان شبہات پر چھوڑ دیا۔ کہ وہ ان میں گرفتار رہے۔ اللہ کی تدبیر نہایت غالب ہے (ابن عربی) خیال رہے کہ رب تعالیٰ کی تدبیر سے صوفی بہت ڈرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بندہ کا ہر وقت نافرمانی کرنا' اور رب تعالیٰ کا ہمیشہ کرم فرمانا یہ بھی غضب الٰہی کی نشانی ہے۔ اس انعام پر خوش نہ ہونا چاہیے۔ اس نے خود خبر دی کہ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (اعراف: ۱۸۲) حضرت سہل فرماتے ہیں کہ مکر اللہ کے معنی ہیں انہیں نعمتوں سے امداد دی' اور شکر کی توفیق نہ دی۔ جب وہ نعمتوں میں پھنس کر نعمت والے کو بھول گئے۔ تو فوراً پکڑ لئے گئے۔ ابو العباس نے فرمایا کہ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ ان کی خطاؤں پر ہم نے عطائیں کیں۔ اور استغفار کی طرف ان کا دھیان نہ گیا۔ اس لئے وہ رب تعالیٰ [illegible] کے [illegible] اہمال نہیں یعنی دیر ہے اندھیر نہیں۔ امام احمد بن حنبل نے

یقیناً وسیلہ اعلیٰ ہیں، **آٹھواں فائدہ:** دعا سب مسلمانوں کے لئے کرنی چاہیے، صرف اپنے لئے ہی نہ کرے جیسا کہ فَاغْفِرْلَنَا وغیرہ میں نَا جمع سے معلوم ہوا، **نواں فائدہ:** اچھوں کا ساتھ رب تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے جو تمام نعمتوں سے اعلیٰ ہے جیسا کہ مَعَ الْاَبْرَارِ سے معلوم ہوا، لکڑی کے سہارے لوہا بھی تیر جاتا ہے، **دسواں فائدہ:** ہر شخص خواہ کتنا ہی نیک ہو، اپنے استقامت اور حسن خاتمہ کی دعا ہمیشہ کیا کرے، اس سے غافل نہ رہے جیسا کہ تَوَفَّنَا الخ سے معلوم ہوا، تمام اعمال کا مدار خاتمہ پر ہے، شعر

پانی بھریں پنھاریاں اور رنگ برنگے گھڑے بھریا اس کا جانئے جس کا توڑ چڑھے

کنوئیں سے پانی بھرنا آسان ہے، مگر پانی لے کر بخیریت گھر پہنچنا بہت مشکل ہے، اللہ تعالیٰ اس مشکل کو آسان کرے اور سارے مسلمانوں کو سب کی طفیل مجھ گنہگار کو ایمان وعمل صالح پر خاتمہ نصیب کرے، **گیارھواں فائدہ:** علمائے دین کی آواز درحقیقت حضور انور ﷺ کی نداء ہے لہٰذا ان حضرات کی ماننا حضور انور ﷺ کی بات ماننا ہے، ان کی اطاعت کرنا درحقیقت حضور انور ﷺ اطاعت ہے، ان علمائے دین کی نافرمانی حضور انور ﷺ نافرمانی ہے جیسا کہ سَمِعْنَا مُنَادِيًا سے معلوم ہوا، **بارھواں فائدہ:** ہم سب مسلمانوں کا ایمان حضور ﷺ کی نداء کی برکت سے ہے، حضور انور ﷺ کی نداء کے بغیر کوئی صحیح ایمان لا سکتا ہی نہیں، جیسا کہ فَاٰمَنَّا کی ف سے معلوم ہوا، یعنی جب حضور انور ﷺ نے نداء دی، تو ہم ایمان لائے، ان کی نداء کے بغیر ہم ایمان کے قریب بھی نہ ہوتے ہمارا ایمان حضور انور ﷺ کے فیض سے ہے، شعر

اے رضا احمد پاک کا فیض ہے ورنہ تم کیا سمجھتے خدا کون ہے

تیرھواں فائدہ: مسلمان اپنے کو گنہگار تو سمجھے مگر کافر ہرگز نہ سمجھے نہ کہے، اپنے کفر کا اقرار کفر ہے بلکہ اپنے کو مومن کہے، مومن سمجھے، جیسا کہ فَاٰمَنَّا سے معلوم ہوا، **چودھواں فائدہ:** حضور انور ﷺ کا رب تعالیٰ سے وعدہ ہے، جس کے پورا کرنے کی دعا کی جا رہی ہے جیسا کہ مَاوَعَدْتَّنَا سے معلوم ہوا، لہٰذا جس سے حضور انور ﷺ نے جنتی ہونے یا جنت میں حضور انور ﷺ کے ساتھ رہنے کا وعدہ فرما لیا اس سے رب تعالیٰ نے وعدہ فرما لیا، وہ یقیناً جنتی ہے، صدیق و فاروق، حسنین کریمین وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم یقیناً جنتی ہیں ان کے جنتی ہونے میں شک کرنا رب تعالیٰ کے وعدے میں تردد کرنا ہے کہ وہ تو بوعدۂ رب تعالیٰ جنتی ہو چکے ہیں، **پندرھواں فائدہ:** دعا میں حضور انور ﷺ کا حوالہ دیا جائے تا کہ وہ قریب القبول ہو جائے، خود رب تعالیٰ نے حکم دیا کہ ہمارے نبی کے حوالہ سے ہم سے دعا کرو، تہجد کے وقت جو دعا کی جائے اس میں حضور انور ﷺ کے وعدہ کا حوالہ ضرور دیا جائے کہ اس وقت کی دعا کی قبولیت کا حضور انور ﷺ نے وعدہ فرمایا ہے، امید ہے کہ اس حوالہ سے رب تعالیٰ ہم گنہگاروں کی دعا ضرور قبول فرمائے گا، **سولھواں فائدہ:** قیامت کی رسوائی بڑا سخت عذاب ہے، اللہ تعالیٰ اس سے ہر مسلمان کو بچائے جیسا کہ وَلَا تُخْزِنَا الخ سے معلوم ہوا، **سترھواں فائدہ:** رب تعالیٰ کے وعدے سچے ہیں ان کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا کہ خلاف وعدہ جھوٹ ہے، جھوٹ عیب ہے، رب تعالیٰ تمام عیبوں سے پاک ہے جیسا کہ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ سے معلوم ہوا، اس کی مکمل بحث پہلے پارہ میں مسئلہ امکانِ کذب میں ہو چکی

الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ
جنہوں نے کفر کیا دن قیامت تک پھر طرف میرے لوٹنا ہے تمہارا
قیامت تک تیرے منکروں پر غلبہ دوں گا پھر تم سب میری طرف پلٹ کر آؤ گے
فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾
پس فیصلہ کرونگا میں درمیان تمہارے بیچ اس کے کہ تھے تم اس میں اختلاف کرتے
تو میں تم میں فیصلہ فرماؤں گا جس بات میں جھگڑتے ہو

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ کی خفیہ تدبیر کا اجمالی ذکر ہے۔ اب اس تدبیر کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔ کہ رب تعالیٰ نے کیا تدبیر فرمائی۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے بچانے کی خفیہ تدبیر فرمائی جس میں شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید اس تدبیر کی عیسیٰ علیہ السلام کو بھی پہلے سے خبر نہ دی گئی ہو۔ اب اس شبہ کو دور کیا جا رہا ہے۔ کہ نہیں انہیں تو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ یہ راز صرف یہود سے چھپایا گیا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں عیسیٰ علیہ السلام کے کچھ فضائل بیان فرمائے گئے۔ اب بھی ان کے بقیہ فضائل ہی ارشاد ہو رہے ہیں۔ کہ رب تعالیٰ نے انہیں خاص طور پر بغیر موت آسمان پر اٹھایا۔ **چوتھا تعلق:** ہم پہلے عرض کر چکے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا دنیا میں آنا بھی معجزہ ہے۔ یہاں رہنا بھی معجزہ اور ان کا یہاں سے تشریف لے جانا بھی معجزہ۔ پچھلی آیتوں میں ان کے یہاں آنے اور رہنے کا ذکر کیا گیا تھا اب ان کے یہاں سے تشریف لے جانے کا ذکر ہے۔ گویا دو قسم کے معجزات کے بعد اب ان کے تیسرے معجزے کا بیان ہے۔

تفسیر

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ یہ اذ یا مکر اللہ کا ظرف ہے یا پوشیدہ فعل وقع ذالک کا یا اذکر کا۔ پہلی صورت میں یہ جملہ مکر کا ظرف ہے اور اخیری دو صورتوں میں نیا جملہ ہے یعنی یہ تدبیر اللہ نے جب فرمائی تھی جب عیسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا یا یہ واقعہ ہوا کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا اے محبوب ﷺ وہ وقت بھی یاد کرو جب رب تعالیٰ نے فرمایا (روح المعانی وغیرہ) اور ہو سکتا ہے کہ اذ تعلیلیہ ہو۔ اور یہ جملہ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ کی دلیل ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمام تدبیر کرنے والوں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کو اس نے ایسے نازک موقعہ پر اس طرح بچا لیا اس صورت میں پتہ لگا کہ حضرات انبیاء کرام اور ان کے واقعات۔ رب تعالیٰ کی ذات و صفات کے دلائل ہیں۔ اور دعویٰ توحید کے گواہ ہمیشہ دوست کا سارا زور دلائل و گواہ پر ہی ہوتا ہے مدعی کے دوست گواہوں کے حامی ہوتے ہیں۔ اور مخالف دھڑے والے گواہوں پر چوٹ کرتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام کے ان معجزات کے منکر رب کے حزب مخالف ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ خبر عیسیٰ علیہ السلام کو جب دی گئی جب انہیں یہود سے خطرہ قتل ہو چکا تھا جس کا ذکر فَلَمَّاۤ اَحَسَّ الخ میں ہوا۔ يٰعِيْسٰى سے اخیر تک قال کا مقولہ ہے۔ حق

سے مراد زمانی ہمراہی نہیں بلکہ رتبی ہمراہی ہے، یعنی ہمیں نیکوں کے زمرہ میں رہتے ہوئے وفات دے، اور اگر زمانی ہمراہی مراد ہو تو بھی ٹھیک ہے، مطلب یہ ہے کہ مولیٰ جب وہ وقت آئے کہ تمام نیک لوگ زمین سے اٹھ جائیں تو ہمیں اس فساد عالم کے وقت زندہ نہ رکھ، ایمان سے اٹھالے، اس کی شرح وہ حدیث ہے وَاِذَا اَرَدْتَ بِعِبَادِکَ فِتْنَۃً فَاقْبِضْنِیْ اِلَیْکَ غَیْرَ مَفْتُوْنٍ، خدایا جب تو اپنے بندوں پر فتنہ بھیجنے لگے تو مجھ کو فتنے سے بچے ہوئے وفات دے دے، امن میں زندگی اچھی، فساد میں ایمان کے ساتھ موت اچھی، **پانچواں اعتراض:** جب رب تعالیٰ کے وعدے خلاف ہو ہی نہیں سکتے، تو یہ دعا مانگنے کی کیا ضرورت ہے کہ خدایا جو تو نے نبیوں کی معرفت وعدے کئے ہیں وہ پورے کر، مانگی وہ چیز جاتی ہے جو حاصل نہ ہو، **جواب:** اس دعا کا مقصد یہ ہے کہ خدایا تو ہم کو اس وعدے کے اہل بنا کہ اس زمرہ میں آجائیں جن سے تیرا وعدہ ہے، ہمیں رب تعالیٰ سے وعدہ خلافی کا خوف نہیں، خوف اپنی حرکتوں سے ہے، مولانا عطار منطق الطیر میں فرماتے ہیں، شعر

خلق ترسد از تو من ترسم ز خود کز تو نیکی دیدہ ام و از خویش بد

چھٹا اعتراض: اس آیت میں فرمایا گیا کہ صرف ظالموں، کافروں کا مددگار کوئی نہیں، مگر دوسری آیت میں ہے وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (بقرہ:۱۰۷) اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں، جس سے معلوم ہوا، کہ مسلمانوں کا بجز خدائے تعالیٰ کوئی مددگار نہیں، آیتوں میں تعارض ہے، **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ اس آیت کا مطلب بھی یہ ہے کہ اے مسلمانو اگر تم نے شرک و کفر کیا تو تمہارا مددگار کوئی نہیں، دوسرے یہ کہ یہاں فرمایا گیا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اللہ کے مقابل ہو کر تمہارا مددگار کوئی نہیں، مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کی نفیس بحث ہماری کتاب ''درس القرآن'' کے دوسرے ایڈیشن میں دیکھو، دُوْنَ، سِوٰی، حَاشَا، اِلَّا ان سب کے معنی سوا یا علاوہ ہی ہیں، مگر اِلَّا ہر سوا کو کہتے ہیں، اپنا ہو یا غیر مگر حَاشَا غیر کو، دُوْنَ مقابل کو، الگ کو، اس لئے اگر کلمہ طیبہ یوں پڑھا جائے لَا اِلٰہَ دُوْنَ اللّٰہِ تو کلمہ توحید نہ بنے گا، دُوْنَ میں انقطاع کٹ جانا، علیحدگی ضروری ہے خواہ واقعی ہو یا اعتقادی، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَیْنِ تَذُوْدٰنِ (قصص:۲۳) موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مردوں سے علیحدہ، جدا، دو روو لڑکیاں پائیں جو بکریاں روکے ہوئے تھیں، لہٰذا آیات میں تعارض نہیں، **ساتواں اعتراض:** اس آیت میں ذنوب کی مغفرت اور سیئات کی تکفیر کی دعا فرمائی گئی، ذنوب اور سیئات تو ایک ہی چیز ہے، یعنی ہر گناہ ذنب بھی ہے اور سیئہ بھی، پھر یہ فرق کیوں؟ **جواب:** اس کا جواب ابھی تفسیر میں گذر گیا کہ یہاں ذنب سے مراد گناہ کبیرہ ہیں، اور سیئہ سے مراد گناہ صغیرہ، رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ (النساء:۳۱) اگر تم بڑے گناہوں سے بچو گے تو چھوٹے گناہ ہم مٹا دیں گے یا ذنوب سے مراد دیدہ و دانستہ کئے ہوئے گناہ ہیں، اور سیئات سے مراد غفلت و نادانی سے کئے گناہ، اس جملہ کی پندرہ تفسیریں ہو سکتی ہیں،

تفسیر صوفیانہ

دنیا کی جو چیز رب تعالیٰ سے غافل کرے وہ ہی آگ ہے، غافل کی دولت، اولاد بلکہ زندگی نار ہے کہ ذریعۂ فراق یار ہے، ایسے آگ میں رہنے والوں کا مددگار کوئی نہیں، یہ آگ نہ پانی سے بجھے، نہ مٹی سے ٹھنڈی پڑے، ایسے غافلوں کا انجام ذلت و خواری

زمینی جسم ہے۔ اس لئے ان میں مکانی بلندی مراد ہے۔ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ (بقرۃ: ۱۲۷) میں بھی دیواریں اٹھانا ہی مراد ہے اگر چہ اٹھانے کی نوعیت کچھ اور ہے اور اگر رفع کا مفعول جسم نہیں کوئی اور چیز ہو تو وہاں روحانی بلندی مراد ہوتی ہے۔ جیسے وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (بقرۃ ۲۵۳) یا وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ (الانشراح: ۴) یا جیسے اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ (النور: ۳۶) ان میں رفع کا مفعول ذکر یا نام یا درجے ہیں۔ اور یہ جسم نہیں لہٰذا یہاں بلندی روحانی مراد ہے۔ چونکہ اس آیت میں وَرَافِعُکَ فرمایا گیا جس سے عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں۔ جو جسم ہیں اس لئے یہاں مکانی بلندی مراد ہوگی نہ کہ درجات کی۔ نیز اگر یہاں بلندی درجات مراد ہوتی تو وہ شہادت سے نصیب ہوتی ہے۔ نہ کہ اپنی طبعی موت سے تو یہ جز مُتَوَفِّیْکَ کے موافق نہ ہوتا۔ پھر تو یوں فرمایا جاتا کہ ہم تمہیں یہود کے ہاتھوں میں شہید کرادیں گے۔ اور شہادت کے ذریعہ تمہارے درجات بلند کریں گے۔ اِلَیَّ رَافِعُکَ کے متعلق ہے۔ اور الیٰ انتہائے غایت کے لئے۔ یہاں الیٰ سے آسمان کی طرف اٹھانا مراد ہے۔ اگر چہ ہر جگہ خدا کی ہے مگر چونکہ آسمان خصوصیت سے تجلی گاہ الٰہی ہے۔ کہ نہ وہاں کسی کی ظاہری سلطنت ہے۔ نہ وہاں کفر' شرک' گناہ۔ اس لئے اس طرف اٹھانے کو رب تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھانا قرار دیا۔ فرماتا ہے ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ (ملک: ۱۶) یا فرماتا ہے اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ (فجر: ۲۸) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شام کی طرف جاتے وقت فرمایا۔ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ (الصّٰفّٰت: ۹۹) دیکھو ابراہیم علیہ السلام جا تو رہے علاقہ موصل سے شام کی طرف مگر فرماتے ہیں کہ میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں کیوں؟ اس لئے کہ مجھے سرزمین شام میں عبادت الٰہی کی آزادی ہوگی۔ آج بھی خانہ کعبہ یا مدینہ منورہ کی طرف جانے والا کہتا ہے کہ میں رب کے گھر کی طرف جا رہا ہوں۔ حالانکہ ساری زمین اور سارے مکانات اللہ تعالیٰ کی ہی ملک میں ہیں ایسے ہی یہاں فرمایا گیا وَرَافِعُکَ اِلَیَّ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ اس سے مراد ہے۔ رَافِعُکَ اِلَیَّ مَحَلِّ کَرَامَتِیْ نیز تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا کہ وفات ایک جنس ہے۔ جس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ بعض موت سے ہوتی ہیں۔ اور بعض آسمان پر اٹھانے سے۔ رَافِعُکَ اِلَیَّ نے وفات کو مقرر کر دیا کہ وہ موت نہ ہوگی۔ بلکہ اٹھانے سے ہوگی۔ لہٰذا آیت میں تکرار نہیں ہے۔ وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (آل عمران: ۵۵) یہ لفظ تطہیر سے بنا جس کا مادہ طہر ہے بمعنی پاکی اور صفائی خباثت سے دور کرنا تطہیر روحانی ہے' نجاست سے دور کرنا پاکی جسمانی' لیکن خبیثوں سے نجات دینا۔ اور ان سے الگ کر دینا ذاتی پاکی۔ یہاں تیسرے معنی مراد ہیں کیونکہ یہاں خبیثوں کا ذکر ہے۔ نہ کہ خباثتوں کا یعنی میں تمہیں کافروں سے نکال لوں گا۔ کہ آسمان پر بلاؤں گا یا ان سے نجات دوں گا۔ یہ تمہیں قتل نہ کرسکیں گے۔ (خازن و مدارک وغیرہ) تفسیر کبیر نے فرمایا کہ یہاں بجائے تخلیص کے تطہیر فرمانے میں عیسیٰ علیہ السلام کی انتہائی عظمت شان ہے۔ اور اس سے کفار میں اور عیسیٰ علیہ السلام میں مکانی فاصلہ کر دینا مراد ہے۔ کہ کفار زمین پر رہ جائیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر بلا لئے جائیں۔ ایک جگہ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ (المدثر: ۴) اپنے کپڑے پاک رکھو۔ یہاں نجاستوں سے پاکی مراد ہے۔ اور دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا (احزاب: ۳۳) یعنی اے اہل بیت رسول اللہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگیاں دور کرے اور تمہیں خوب پاک کر دے [illegible] گندگی سے تو پہلے ہی پاک ہوتے ہیں۔ اس

پس قبول کرلیا ان کے لئے ان کے پروردگار نے بے شک میں نہیں برباد کرتا تم میں سے کسی کام والے
تو ان کی دعا سن لی ان کے رب نے کہ میں تم میں کام والے کی محنت اکارت نہیں کرتا
مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ
کا کام مرد یا عورت کا تم میں سے بعض بعض سے ہیں
مرد ہو یا عورت تم آپس میں ایک ہو تو
فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا
پس وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور تکلیف دیے گئے
جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں
فِیْ سَبِیْلِیْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ
دیے گئے میری راہ میں اور انہوں نے جنگ کی اور قتل کیے گئے البتہ مٹادوں گا میں ان سے ان کے گناہ
ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے میں ضرور ان کے سب گناہ اتار دوں گا
وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ
اور ضرور داخل کروں گا میں ان کو ایسے باغوں میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں
اور ضرور انہیں باغوں میں لے جاؤں گا جن کے نیچے نہریں رواں
ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾
ثواب اللہ کے پاس سے اور اللہ تعالیٰ ہی کے نزدیک اچھا ثواب ہے
اللہ کے پاس کا ثواب اور اللہ ہی کے پاس اچھا ثواب ہے

تعلقات

اس آیت کا گذشتہ آیت سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو مقبول دعاؤں کی تعلیم دی گئی، اب اس آیت میں ان دعاؤں کی قبولیت کا وعدہ فرمایا جا رہا ہے، چونکہ قبول دعاء مقبول کا نتیجہ ہے، اس لئے پہلے دعا کا ذکر ہوا، پھر اس کی قبولیت کا، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں مومنوں کے چار نیک اعمال کا ذکر ہوا، (۱) ہر حال میں رب تعالیٰ کا ذکر، (۲) اس کی خلقت میں فکر، (۳) رب تعالیٰ کی حکمتوں کا اقرار، (۴) یہ سب کچھ کر کے رب تعالیٰ کی بارگاہ میں عاجزی سے گڑگڑا کر دعا مانگنا اب انہیں قبولیت کی بشارت دی جا رہی ہے تاکہ اس بشارت سے ان میں اور زیادہ جذبۂ عمل پیدا ہو،

جہاں نہ کوئی آپ کی مخالفت کرے گا نہ کوئی مقابلہ۔آپ ہماری حفظ و امن میں ہوں گے اور ہم آپ کو ان کفار سے نجات دیں گے۔اوران سے دور کریں گے یہ زمین پر رہیں گے اور آپ آسمان پر اور یہ کرم آپ کی ذات کے لئے خاص نہ ہوگا بلکہ آپ کی پیروی کرنے والوں کو آپ کے منکروں پر قیامت تک دینی حیثیت سے فوقیت اور غلبہ دیں گے کہ ان کا دین انکے دلائل یہود پر غالب رہیں گے یا اس طرح کہ آپ کے خدمت گار حواریوں کو تاقیامت آپ کے دشمن یہودیوں پر عزت وعظمت دیں گے۔کہ ان کے چرچے ہمیشہ بھلائی کے ساتھ ہوتے رہیں گے۔اور آپ کے دشمنوں پر دنیا لعنت کرتی رہے گی پھر اے مسلمانو اور کافر و تم سب کا ہماری ہی طرف لوٹنا ہے۔پھر ہم تمہارے درمیان ہر اس دینی چیز میں فیصلہ کر دیں گے۔جس میں تم دنیا میں جھگڑتے ہو۔کہ مومن کو جنت میں اور کافر کو جہنم میں بھیجیں گے۔اگر چہ دنیا میں بھی انبیائے کرام کے ذریعہ قولی فیصلہ تو کر دیا گیا ہے مگر وہاں عملی فیصلہ ہوگا جس سے جھوٹوں کو اپنے جھوٹ کا اقرار کرنا ہوگا۔

خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو تین خوشخبریاں دیں۔انہیں آسمان پر بلا کر فرشتوں کے ساتھ رکھنا کیونکہ اچھی صحبت اللہ کی بڑی نعمت ہے۔دوسرے کافروں کی صحبت سے انہیں بچالینا۔کیونکہ بروں کی صحبت سے علیحدگی بھی اللہ کی نعمت ہے۔اس سے صوفیائے کرام کا مسئلہ صحبت حل ہو جاتا ہے۔کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کا فرشتوں کے ساتھ رہنا اتنی بڑی نعمت ہے تو حضرات صحابہ کرام کا حضور انور ﷺ کے ساتھ رہنا اور حضرت صدیق و فاروق کا حضور ﷺ کے ساتھ دفن ہونا یقیناً اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔اس لئے کوئی شخص صحابہ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔تیسرا حضرت مسیح کے متبعین کا کفار پر غالب رہنا کیونکہ غلاموں پر کرم آقا پر کرم ہوتا ہے۔نوکروں کی تکلیف سے آقا کو تکلیف۔رب تعالیٰ فرماتا ہے عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (التوبۃ:۱۲۸)

حیات عیسیٰ علیہ السلام

عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہود کا عقیدہ تو یہ ہے کہ ہم نے انہیں سولی دے دی اور جان نکل جانے پر انہیں دفن بھی کر دیا اگر چہ وہ اس شبہ میں گرفتار ہیں کہ ہمارا اططیانوس کہاں گیا۔عیسائی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ واقعی عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر سولی دے دی گئی اور آپ کی وہاں جان بھی نکل گئی مگر پھر رب نے آپ کو دوبارہ زندگی بخشی اور آسمان پر اٹھا لیا۔اسی لئے وہ صلیب کو پوجتے ہیں اور اس سولی کو سارے عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ سمجھتے ہیں کفارہ کا مسئلہ سولی پر ہی مبنی ہے۔مگر مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ نہ آپ کو سولی دی گئی اور نہ آپ کی وفات واقع ہوئی۔بلکہ آپ کو اسی طرح مع جسم شریف زندہ اٹھا لیا گیا چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر زندہ اٹھایا جانا قطعی، یقینی، اجماعی مسئلہ ہے۔اس پر ساری امت مصطفیٰ ﷺ کا اتفاق ہے۔البتہ وہب نے فرمایا کہ رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو تین ساعت کے لئے موت دی پھر انہیں زندہ کر کے آسمان پر اٹھا لیا۔بہر حال وہب بھی عیسیٰ علیہ السلام کے اس وقت زندہ ہونے اور آسمان پر زندہ اٹھنے کے قائل ہیں غرضیکہ اس مسئلہ میں آج تک کسی کو اختلاف نہیں ہوا۔ اب چودھویں صدی میں مرزائیوں نے نبوت مرزا کے شوق میں اس مسئلہ یقینی قطعی کا انکار کیا۔ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو یہود نے تختہ دار پر لٹکایا۔اور انہیں بہت ذلیل بھی کیا۔مگر رب تعالیٰ نے ان کی جان صلیب پر نہ نکلنے دی بلکہ یہود انہیں مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے آپ غشی کی حالت سے بیدار ہو کر نصیبین وہاں سے افغانستان ہوتے ہوئے کوہ نعمان میں پہنچے اور وہاں

خوف خدا، عشق رسول وغیرہ یا بدن کا عمل، نماز روزہ، یا مالی عمل، زکوٰۃ، صدقہ وغیرہ، عامل سے مراد ہر نیک کار ہے بالغ ہو نابالغ، کیونکہ نابالغ کو بھی نیکیوں کا ثواب ملتا ہے، مِنْکُمْ میں مِن بیانیہ ہے، کُمْ سے مراد مسلمان ہیں، کیونکہ کفار کے اعمال نیک برباد ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (فرقان: ۲۳) یعنی رب تعالیٰ نے ان کے اعمال و دعائیں اس لئے قبول فرمائیں کہ اے مسلمانو ہم کسی نیک کار مسلمان کے عمل ضائع و برباد نہیں کرتے، اسے جزاء ضرور دیتے ہیں مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى یہ کلمہ یا تو عامل کا بیان ہے یا کُمْ کا بدل، ذَكَرٍ سے مراد مذکر مسلمان ہے، اُنْثٰى سے مراد مونث مسلمان بالغ ہوں یا نابالغ، کسی ملک کے ہوں، کسی خاندان و نسل سے ہوں، یعنی ہم کسی مرد و عورت کے نیک اعمال برباد نہیں کرتے جزاء عمل کی ہے نہ کہ نسل یا خاندان یا کسی خاص ملک کی بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ، بَعْضُكُمْ مبتداء ہے، مِنْ بَعْضٍ خبر، یا تو ثابت کے متعلق ہے یا حَاصِلٌ کے یا قَرِيْبٌ کے کُمْ سے مراد سارے مسلمان ہیں یعنی بعض مسلمان بعض کی جنس سے ہیں کہ عورت و مرد سب مسلمان ہیں یا تم سب ایک اصل حضرت آدم و حوا (علیہما السلام) سے ہو یا تم میں سے بعض کی پیدائش بعض سے ہے کہ مرد عورت سے اور عورت مرد سے پیدا ہوئے ہیں یا تم میں سے بعض بعض سے قرب و تعلق رکھتے ہیں، کہ عورتوں کو مردوں کی ضرورت ہے، مردوں کو عورتوں کی جیسے، حضور انور ﷺ فرماتے ہیں سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلِ الْبَيْتِ، سلمان فارسی ہم اہل بیت سے ہیں یا فرماتے ہیں اَلْحُسَيْنُ مِنِّيْ وَاَنَا مِنَ الْحُسَيْنِ، حسین مجھ سے ہیں اور میں حسین سے (رضی اللہ عنہ) ان جملوں کے یہ ہی معنی ہیں، فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ، یہ جملہ گزشتہ جملہ لَآ اُضِيْعُ کا بیان ہے، اَلَّذِيْنَ سے مراد سارے مسلمان مرد عورت، بچے، جوان اور بوڑھے ہیں، هَاجَرُوْا ہجر سے بنا بمعنی چھوڑنا، اصطلاح میں وطن چھوڑنے کو ہجرت کہتے ہیں، یہاں وہ ترک وطن مراد ہے جو رضائے الٰہی کے لئے کیا جائے کہ اسی پر ثواب ہے، اُخْرِجُوْا اخراج سے بنا بمعنی نکالنا یا نکلنے پر مجبور کرنا، دِيَارِ دار کی جمع ہے بمعنی گھر یا وطن، خیال رہے کہ یا تو اُخْرِجُوْا هَاجَرُوْا کی تفسیر ہے یا اس سے ہجرت کی دوسری قسم مراد ہے، بعض صحابہ تو عشق رسول اللہ ﷺ سے سرشار ہو کر مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر گئے کفار نے انہیں تنگ نہ کیا تھا اور بعض حضرات کو کفار نے تنگ کیا، اس لئے وہ ہجرت پر مجبور ہوئے، هَاجَرُوْا سے پہلے قسم کے مہاجر مراد ہیں اور اُخْرِجُوْا سے دوسری قسم کے مہاجر مراد، چونکہ پہلی قسم کے مہاجر درجہ میں اعلیٰ ہیں، اس لئے ان کا ذکر پہلے ہوا، دوسروں کا بعد میں (تفسیر کبیر) اور ہوسکتا ہے کہ هَاجَرُوْا سے مراد وہ لوگ ہوں جنہوں نے کفر و گناہ چھوڑے، اور اُخْرِجُوْا سے مراد وہ ہوں جنہوں نے وطن چھوڑا (روح المعانی) وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ، یہ جملہ اخرجوا پر معطوف ہے، ایذاء کے معنی ہیں ستانا، ظلم کرنا، خواہ جانی ظلم ہو یا مالی یا عزت و آبرو کا یا اولاد کا اللہ کی راہ میں ستائے جانے سے مراد اللہ کی اطاعت، اللہ رسول پر ایمان لانے کے سبب ستایا جانا ہے یا تو اس سے مراد وہ ہی مہاجرین ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا کہ ان لوگوں نے ہجرت سے پہلے کفار مکہ کے ہاتھوں بہت دکھ سہے، ظلم برداشت کئے یا وہ لوگ مراد ہیں جو مجبوراً ہجرت نہ کر سکے، مکہ معظمہ میں ہی رہے، کفار کے ظلم و ستم سہتے رہے، وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا، یہ جملہ اُوْذُوْا پر معطوف ہے، اس میں مسلمانوں کے چوتھے پانچویں وصف کا ذکر ہے کہ کمزوری کے زمانہ میں وہ مظلوم تھے مہاجر بنے، طاقت آنے پر مجاہد و شہید فی سبیل اللہ ہوئے، قتال سے مراد

قتادہ ضحاک رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے یہ ہی تفسیر نقل کی۔ اور فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ زمین پر آنے کی احادیث متواتر ہیں۔ نیز تفسیر کبیر وغیرہ نے اس آیت کے یہ ہی معنی کئے (٦) تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا (مائدہ:١١٠) اے عیسیٰ علیہ السلام آپ گہوارے اور بڑھاپے میں لوگوں سے کلام کریں گے قرآن کریم نے عیسیٰ علیہ السلام کا بڑھاپے میں کلام کرنا بطور معجزہ بیان فرمایا۔ یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ اس میں کچھ عجیب بات ہو۔ اور وہ یہ ہی ہے کہ آپ آسمان سے اتریں اور کلام فرمائیں چنانچہ امام جلال الدین سیوطی اور امام زہری وغیرہم نے اس سے یہ نتیجہ نکالا۔

احادیث: عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ تشریف لانے کے متعلق بے شمار احادیث وارد ہیں۔ چنانچہ (١) مسلم، بخاری، مشکوٰۃ شریف نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا قسم خدا کی عیسیٰ ابن مریم حاکم، عادل ہو کر تم میں اتریں گے۔ صلیب کو توڑیں، خنزیر کو فنا کریں گے۔ جزیہ کا حکم ساقط کریں گے۔ اور اس زمانہ میں ایک سجدہ دنیا بھر سے افضل ہوگا۔ اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر چاہو تو پڑھ لو۔ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ (النساء:١٥٩)

(٢) نیز مسلم نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ عیسیٰ ابن مریم حاکم، عادل ہو کر تم میں تشریف لائیں گے ان کے زمانہ میں اونٹ بے کار ہو جائیں گے۔ حسد و بغض دلوں سے نکل جائیں گے۔ مال کی اتنی کثرت ہوگی کہ کوئی زکوٰۃ نہ لے گا۔

(٣) انہی مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی۔ کہ حضور ﷺ نے فرمایا میری امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر جنگ کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام تم میں آ جائیں۔

(٤) ابن جوزی نے کتاب الوفا میں عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ عیسیٰ علیہ السلام زمین پر اتریں گے۔ نکاح کریں گے۔ صاحب اولاد ہوں گے۔ یہاں پینتالیس سال تک قیام فرمائیں گے۔ پس میرے ساتھ میرے مقبرے میں دفن ہوں گے۔ قیامت کے دن ہم اور عیسیٰ علیہ السلام ایک ہی مقبرہ سے اٹھیں گے۔ (مشکوٰۃ شریف باب علامات القیامۃ)

لطیفہ: مرزا غلام احمد قادیانی کہتے ہیں کہ ان احادیث میں عیسیٰ ابن مریم سے میں مراد ہوں مگر خیال رہے کہ نہ مرزا جی کا نام عیسیٰ ہے نہ ان کی ماں کا نام مریم۔ بلکہ ان کا نام غلام احمد اور ماں کا نام چراغ بی بی ہے۔ اور نہ مرزا جی مدینہ پاک میں مرے۔ نہ ان کے زمانہ میں مال کی کثرت ہوئی۔ خود چندوں پر گذارہ کیا اب بھی ان کی اولاد قبریں بیچ کر پیٹ پال رہی ہے۔ نہ اونٹ بیکار ہوئے۔ نہ معلوم کہ وہ ان احادیث کے مصداق کیسے بن گئے۔

(٥) ابوداؤد و احمد نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی۔ کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام آ کر دعوت اسلام فرمائیں گے ان کے زمانہ پاک میں اسلام کے سوا تمام دین مٹ جائے گا اور شیر اونٹ کے ساتھ اور چیتا گائے کے ساتھ اور بھیڑیا بکری کے ساتھ چریں گے۔ اور بچے سانپ کے ساتھ کھیلیں گے اور وہ انہیں نقصان نہ دے گا۔

(٦) بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم میں عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے اور تمہارے امام تمہیں میں سے ہوں گے۔ یعنی امام مہدی۔

(٧) ابن عساکر نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ عیسیٰ ابن مریم آسمان سے اتریں گے۔ امام ہادی حاکم،

بدلہ ضرور دیتے ہیں، خواہ مرد نیکیاں کرے یا عورت کیونکہ عورت و مرد صنف میں اگرچہ مختلف ہیں مگر جنس میں ایک ہیں، ایک آدم علیہ السلام سے پیدا ہوئے، ایک اللہ کے بندے، ایک نبی کے امتی، ایک قرآن کے ماننے والے، ایک کعبہ کے نمازی، ایک ایمان کے حامل ہیں، پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جزاء میں مرد و عورت مختلف ہوں، لہٰذا جن مسلمانوں نے بخوشی خاطر ہجرت کی، اور جو جبراً اپنے وطن سے نکالے گئے، اور جو میری راہ میں ستائے گئے یا اس طرح کہ مجبوراً مکہ معظمہ سے ہجرت نہ کرسکے اور کفار مکہ کے ظلم و ستم سہتے رہے یا اس طرح کہ ہجرت سے پہلے اور بحالتِ ہجرت انہیں دکھ دیئے گئے، اور وہ جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ جو شہید کردیئے گئے، ان سب کو ہماری طرف سے تین انعام ملیں گے، ایک یہ کہ ان کے تمام گناہ جو وہ اسلام لانے سے پہلے کرچکے تھے یا اسلام لانے کے بعد خطاءً ان سے سرزد ہوگئے سب معاف کردیئے جائیں گے، دوسرے یہ کہ ہم بغیر کچھ سزا دیئے پہلے ہی سے انہیں ایسے باغوں میں داخلہ دیں گے جن کے نیچے دودھ، پانی، شہد، شراب طہور کی مختلف نہریں بہہ رہی ہیں، یہ داخلہ ان کا ہمیشہ کے لئے ہوگا، کہ وہاں جانے کے بعد کبھی وہاں سے نکالے نہ جائیں گے، تیسرے یہ کہ انہیں ان نعمتوں کے علاوہ اور بہت شاندار ثواب دیں گے جو ان کے خیال و گمان و وہم سے وراء ہیں، سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے اس کے عطیہ اس کے اچھے ثواب ایسے ہیں جو کسی کے خیال میں نہ آسکیں،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** احکام و فضائل کی آیتوں میں اگرچہ صیغے مذکر ہیں اور ان میں خطاب مردوں سے ہے، مگر ان سب آیتوں میں عورتیں بھی داخل ہیں، دیکھو یہاں فرمایا گیا کہ تم مرد و عورت آپس میں ایک ہو، تو مردوں سے خطاب درحقیقت عورتوں سے بھی خطاب ہے، **دوسرا فائدہ:** مرد عورتوں سے افضل ہیں کہ رب تعالیٰ نے عموماً انہی سے خطاب فرمایا ہے، عورتوں کو ان کے تابع بنا کر ان میں داخل فرمادیا، جیسے بستی کے افسر کے نام پیغام در پردہ ساری بستی کے نام ہوتا ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء: ۳۴) اور فرماتا ہے وَ لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ: ۲۲۸) **تیسرا فائدہ:** سزا جزاء اعمال پر ہے نہ کہ محض نسب، نسل، خاندان یا عورت و مرد ہونے پر جیسا کہ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى سے معلوم ہوا، **چوتھا فائدہ:** عشق اطاعت سے افضل ہے جیسا کہ هَاجَرُوْا اور اُخْرِجُوْا کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ نے پہلے ان مہاجروں کا ذکر فرمایا جو حضور انور ﷺ کی محبت میں مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ چلے گئے، پھر بعد میں ان کا ذکر فرمایا جو مکہ معظمہ سے نکالے گئے اور مجبوراً ہجرت کرکے گئے، فرشتے اول درجہ کے مطیع و عابد ہیں مگر جنت کے حقدار نہیں، کیونکہ ان میں عشق کا مادہ نہیں، انسان اگرچہ اطاعت میں فرشتوں سے کہیں کم ہے مگر جنت کا حقدار ہے کیونکہ امانت یعنی عشق کا حامل ہے، **پانچواں فائدہ:** جبراً ہجرت پر بھی ثواب ہے جیسا کہ اُخْرِجُوْا الخ سے معلوم ہوا، مگر شرط یہ ہے کہ ہجرت سے مقصود رضائے الٰہی ہو نہ کہ محض دنیا کمانا، ورنہ آج بہت سے لوگ نوکری، تجارت وغیرہ کے لئے ترک وطن کرتے رہتے ہیں، اس لئے وطن چھوڑے کہ وہاں نماز اذان اور دیگر ارکان اسلام ادا کرنے کی آزادی نہ ہو، **چھٹا فائدہ:** اللہ کی راہ میں ظلم و ستم سہنا بھی ثواب کا باعث ہے جیسا کہ وَ اُوْذُوْا فِیْ

بارگاہ میں پیش ہو۔اسے بھی یہاں کلم فرمایا گیا۔

(۲) یثاق کے دن گروہ انبیاء سے عہد لیا گیا تھا کہ جب تم نبی آخر الزمان کا زمانہ پاؤ تو ان پر ایمان لانا اور ان کے دین کی مدد کرنا ضروری تھا کہ اس جماعت میں کوئی پیغمبر وہ بھی ہوتا جو اس عہد پر عمل کرتا۔اس کے لئے عیسیٰ علیہ السلام منتخب کئے گئے۔ تا کہ یہ عہد فقط قولی نہ رہ جائے۔

(۳) پچھلے آسمانی دینوں کو یہ فخر حاصل تھا کہ انبیائے کرام ان کی حمایت کرتے تھے۔دین موسوی کی حمایت کے لئے ہارون و دیگر انبیاء بھیجے گئے۔ضروری تھا کہ دین محمدی کو بھی یہ فخر حاصل ہو کہ اس کی حمایت کوئی نبی کرے۔مگر چونکہ حضور ﷺ خاتم النبیین ہیں کہ آپ کے بعد نیا نبی نہیں آ سکتا۔اس لئے عیسیٰ علیہ السلام منتخب ہوئے۔

(۴) حضرت جبریل کی گھوڑی کی ٹاپ کی خاک نے سونے کے بچھڑے میں آواز پیدا کر دی۔تو جب حضرت جبریل علیہ السلام کی سانس سے عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان میں اگر بچپن میں طاقت گویائی ہو اور آسمان سے اتر کے بھی اس گویائی سے کام لیں تو کیا بعید ہے۔

دوسری بحث حیات مسیح پر سوال و جواب

اس مسئلہ میں قادیانیوں کے بے شمار اعتراضات ہیں ہم ان کے چوٹی کے اعتراضات نقل کر کے جوابات دیتے ہیں۔**پہلا اعتراض:** رب تعالیٰ فرماتا ہے قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران:۱۴۴) حضور ﷺ سے پہلے سارے رسول وفات پا چکے۔اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص نہیں۔سارے انبیاء کے بارے میں خَلَتْ فرمایا گیا معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی وفات یافتہ ہیں؟ **جواب:** خَلَتْ خلو یا خلا سے بنا۔جس کے معنی موت نہیں۔بلکہ خالی ہونا۔اور گذر جانا۔ اسی لئے فضائے آسمانی کو خلا کہتے ہیں۔اور پاخانہ کو بیت الخلاء کہتے ہیں۔تنہائی کو خلوت۔اہل عرب کہتے ہیں خَلَتِ الدِّيَارُ مِنَ الْاَنِيْسِ دوست سے شہر خالی ہو گئے اور مادہ کے معنی ہر مشتق میں ضرور رہتے ہیں لہٰذا اس آیت کے معنی یہ ہی ہیں۔کہ ان سے پہلے نبی گذر گئے۔خواہ وفات پا کر یا آسمان پر جا کر اسی لئے یہاں ماتت نہ فرمایا گیا۔شاید مرزا جی کے ہاں بیت الخلاء پھانسی گھر کو کہتے ہوں گے۔جلالین شریف میں خلت کے معنی کئے مَضَتْ کہا جاتا ہے۔کہ ریل گزر گئی۔قافلہ گزر گیا۔دن گزر گیا۔آفتاب کنارے سے گذر گیا۔یہ سب چیزیں کسی جگہ سے گذر جاتی ہیں۔فنا نہیں ہو جاتیں۔ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام اس طرح گذر گئے۔کہ فنا نہ ہوئے۔یہاں سے سب گئے پھر یہ بھی کہا جاتا کہ گذشتہ قومیں گذر گئیں یعنی فنا ہو گئیں غرضیکہ گذرنے کی کئی نوعیتیں ہیں۔عیسیٰ علیہ السلام اور نوعیت سے گذر گئے۔اور دوسرے انبیاء کرام دوسری نوعیت سے قد خلت دونوں کو شامل ہے۔**دوسرا اعتراض:** رب تعالیٰ بتوں کے بارے میں فرماتا ہے۔اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ (النحل:۲۱) کہ وہ مردے ہیں۔زندہ نہیں۔اور ظاہر ہے کہ لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو بھی معبود مانا۔اس قاعدے سے وہ بھی اس آیت میں داخل ہوئے۔ان کا وفات یافتہ ہونا ثابت ہوا؟ **جواب:** اس آیت کا عیسیٰ علیہ السلام سے کوئی تعلق نہیں۔یہ بے جان بتوں کے بارے میں آئی۔عیسیٰ علیہ السلام کی تو بڑی شان ہے رب تعالیٰ شہداء کے لئے فرماتا ہے۔وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ

سے، دیکھو ابولہب و ابوطالب کافر ہیں، مگر ان کی یہ نیکیاں ضبط نہ ہوئیں، یہ آیت ان احادیث کے خلاف ہے، **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ ان کے یہ اعمال بھی ضبط ہو چکے ہیں اگر ضبط نہ ہوئے ہوتے، تو وہ جنت میں جاتے، عذاب میں تخفیف اور ہے عذاب سے نجات کچھ اور، اعمال اگر ضبط نہ ہوں تو عذاب سے نجات ہو جاتی ہے، تخفیف عذاب، ضبط اعمال کے خلاف نہیں، دوسرے یہ کہ کافر کی عبادات، معاملات وغیرہ تو ضبط ہیں، مگر عشق رسول (ﷺ) خدمتِ پیغمبر ضبط نہیں، یہاں عَمَلَ عَامِلٍ ارشاد ہوا، نہ کہ عشقِ عاشق، کافر کو محبت رسول ﷺ کا صلہ تخفیف عذاب کی صورت میں اسے مل جائے گا، اگر مومن ہو کر عشق کرتا تو جنت کا اعلیٰ مقام پاتا، ابولہب اگرچہ بعد میں دشمن ہو گیا مگر حضور انور ﷺ کی ولادت کے وقت اس نے حضور انور ﷺ سے محبت کی، لونڈی کو آزاد کیا، اتنی محبت کا کچھ نہ کچھ اثر ہو ہی گیا، تو جس مسلمان کو اللہ تعالیٰ عشق رسول خدمتِ محبوب ﷺ نصیب کرے اس کا کیا کہنا، **تیسرا اعتراض:** آپ کے اس جواب سے معلوم ہوا کہ کفار کو تخفیفِ عذاب ہو جائے گی، مگر رب تعالیٰ فرماتا ہے فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ (بقرہ:۸۶) کفار کا عذاب ہلکا بھی نہ ہوگا، تمہارا یہ جواب اس آیت کے خلاف ہے، **جواب:** اس اعتراض کا جواب اس ہی آیت میں موجود ہے کہ فرمایا گیا فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (بقرہ:۸۶) انہیں عذاب سے مہلت نہ دی جائے گی، جس سے معلوم ہوا کہ وہاں تخفیف عذاب سے مراد مدتِ عذاب میں کمی کر دینا ہے، جیسے کسی کو پانچ سال کی قید ہو، اپیل پر دو سال کی رہ جائے، تو کہا جاتا ہے کہ سزا میں تخفیف ہو گئی یعنی مدت کم ہو گئی، رہا نوعیتِ عذاب میں ہلکا ہونا، وہ تو ثابت ہے، ورنہ دوزخ کے سات طبقے کیوں ہیں؟ کہ بعض طبقوں میں عذاب سخت ہے بعض میں ہلکا، لَا يُخَفَّفُ کی اور بھی بہت توجیہیں ہیں، یہ توجیہ جواب کے لئے کافی ہے بہر حال آیات و احادیث میں تعارض نہیں، **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ مرد و عورت یکساں ہیں کہ فرمایا گیا بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ مگر تم کہتے ہو کہ مرد عورت سے افضل ہے، دوسری آیات سے بھی یہ افضلیت ثابت ہے، لہٰذا آیات میں تعارض ہے، **جواب:** یہاں جزائے عمل میں یکسانیت کا ذکر ہے، اور ان آیات میں درجوں، مراتب میں فرق کا تذکرہ، لہٰذا دونوں آیتیں برحق ہیں، بادشاہ اسلام رعایا سے افضل ہے، مگر جزائے اعمال میں شاہ و گدا سب برابر ہیں، **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن مسلمانوں میں مذکورہ پانچ وصف جمع ہوں، ہجرت، دیس نکالا، مظلومیت، جہاد، شہادت، وہی معافی گناہ، جنت میں داخلہ اور ثواب کے مستحق ہوں گے جس میں کوئی وصف بھی کم ہو، وہ مذکورہ انعامات میں سے کسی انعام کا مستحق نہیں، کیونکہ واوٴ جمع کے لئے آتا ہے، **جواب:** لَاُدْخِلَنَّهُمْ میں هُمْ ضمیر ان تمام کی طرف لوٹتی ہے نہ کہ مجموعے کی طرف، هُمْ افرادی ہے نہ کہ مجموعی! کیونکہ اس سے پہلے ارشاد ہو چکا ہے لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ، عامل نکرہ ہے، ہر عامل کو شامل ہے، چونکہ یہ حضرات اعلیٰ درجہ والے ہیں اس لئے ان کا ذکر خصوصیت سے ہوا، ورنہ ہر مومن جنتی ہے، اگرچہ اسے کسی عمل کا موقعہ نہ ملے، **چھٹا اعتراض:** یہاں رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم ان لوگوں کے گناہ معاف کر دیں گے اور جنت میں داخل کریں گے، گناہ کی معافی کے لئے جنت کا داخلہ لازم ہے، پھر اسے الگ ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی، **جواب:** لازم نہیں، معافی گناہ اور چیز ہے، داخلہ جنت کچھ اور دیکھو مومن جنت نی

سکتا ہے۔ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر بغیر ان ضرورتوں کے زندہ رکھ سکتا ہے۔ اب ان کی زندگی فرشتوں کی سی ہے۔ دجال کی آمد پر مسلمان ذکر الٰہی سے زندگی گزاریں گے۔ بعض اولیاء اللہ نے برسوں غذا نہ کھائی۔ ذکر خدا سے زندہ رہے ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام ذکر اللہ سے زندہ ہیں۔ جناب سب مرزا غلام احمد کی طرح شک وغیرہ سے زندگی نہیں گذارتے کچھ اللہ والے بھی ہوتے ہیں حق بات یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام بلکہ بعض خاص اولیاء اللہ نورانی بشر ہوتے ہیں۔ ظہور بشریت کے وقت وہ کھاتے پیتے بھی ہیں۔ اور دنیا سے تعلقات بھی قائم رکھتے ہیں مگر جب نورانیت کا ظہور ہوتا ہے تو انہیں کھانے پینے کی مطلقاً ضرورت نہیں رہتی۔ عیسیٰ علیہ السلام زمین پر بشری حیثیت سے رہے اس لئے انہیں کھانے پینے سانس لینے وغیرہ بشری عوارضات کی ضرورت رہی۔ آسمان پر نورانیت کے ساتھ ہیں وہاں وہ نہ ہوا کے محتاج' نہ کھانے کے' نہ پینے کے۔ حضور علیہ السلام کبھی تو دو دو وقت کھانا نہ کھانے پر پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے۔ اور کبھی روزہ وصال کے موقع پر مسلسل نہ کھاتے نہ پیتے اور کچھ احساس نہ ہوتا۔ وہ بشریت کا ظہور تھا۔ یہ نورانیت کی جلوہ گری ہے۔ حضرت زید ابن ثابت کو حضور علیہ السلام نے حکم دیا کہ ابرانی زبان سیکھو تا کہ دوسرے بادشاہوں کے خطوط کا ترجمہ مجھے سناؤ۔ یہ بشریت کا ظہور ہے۔ پھر جانوروں کی بولی سمجھ رہے ہیں۔ پتھروں کی فریاد سن رہے ہیں لکڑیوں کی آہ وزاری پر توجہ فرما رہے ہیں۔ پتھروں کے کلام کا جواب دے رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ انسان تو کیا لکڑیوں پتھر کی بولی بھی جانتے ہیں یہ نورانیت کا ظہور ہے۔ بلکہ یہ تبدیلی حالات تو فرشتوں اور دیگر مخلوقات کی بھی ہوتی رہتی ہے۔ دیکھو ہاروت ماروت نورانی فرشتے ہیں جو نہ کھائیں نہ پئیں مگر جب شکل بشری میں بھیجے گئے تو کھانے پینے بھی لگے اور عورتوں سے اختلاط کے قابل بھی ہو گئے۔ حضرت جبریل علیہ السلام جب شکل انسانی میں آتے تو کپڑے بھی پہنتے ان کے بال سیاہ ہوتے تھے اور سواری بھی کرتے تھے یہ بشریت کا ظہور تھا۔ ورنہ فرشتوں کو لباس کی کیا ضرورت اور ان کے بال کالے کیسے۔ عصائے موسوی لکڑی کا تھا مگر جب سانپ بن جاتا تو کھاتا پیتا بھی تھا اور سانس لے کر پھنکاریں بھی مارتا تھا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُوْنَ (اعراف: ۱۱۷) جب حالات کی تبدیلی کا یہ عالم ہے تو عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر رہ کر نہ کھائیں نہ پئیں تو کیا اعتراض ہے؟ **نواں اعتراض:** اگر عیسیٰ علیہ السلام اخیر زمانہ میں تشریف لائیں تو اس وقت نبی ہوں گے یا نہیں؟ نبی نہ رہنا خلاف عقل ہے۔ اور نبی نہ ہونے کی صورت میں احکام کس کے جاری ہوں گے۔ حضور علیہ السلام کے یا عیسیٰ علیہ السلام کے؟ **جواب:** نبی کو رب تعالیٰ سے بھی تعلق ہے۔ اور مخلوق سے بھی۔ ربانی تعلق کبھی نہیں ٹوٹتا۔ ان کو ہمیشہ عظمت و وقار حاصل رہتا ہے۔ مگر نسخ کے بعد ان کا تعلق مخلوق سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس طرح کہ ان کے احکام جاری نہیں رہتے۔ یہ ہی حال عیسیٰ علیہ السلام کا ہو گا اگر کوئی جج کسی عدالت میں گواہ بن کر پیش ہو تو وہ اپنے وقت اور اپنی جگہ میں جج ہے۔ مگر اس عدالت میں اس کی ججی کا ظہور نہیں۔ اس کی حیثیت گواہ کی سی ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام عدالت مصطفیٰ علیہ السلام میں اسی حیثیت سے تشریف لائیں گے۔ کہ اللہ کے نزدیک نبی ہوں گے مگر مخلوق پر حضور علیہ السلام کے احکام جاری کریں گے۔ **دسواں اعتراض:** کسی شخص کا دوسرے کے ہم شکل ہو جانا غیر ممکن ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ططیانوس عیسیٰ علیہ السلام کی ہمشکل ہو کر پھانسی پا جائے؟ **جواب:** شکلیں بدلنا اور کسی کا دوسرے کی ہمشکل ہو جانا ممکن ہی نہیں واقع ہے۔ گورے آدمی بیماری سے کالے ہو جاتے ہیں۔ کالے گورے بن جاتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کا عصا سانپ

مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾
یہ تھوڑی سی پونجی ہے پھر ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بہت برا بستر ہے
تھوڑا برتنا ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور کیا ہی برا بچھونا
لٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ
لیکن وہ لوگ جو ڈرتے ہیں اپنے پالنے والے سے انہی کے لئے ہیں ایسے باغات جن
لیکن وہ جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں ان کے لئے جنتیں ہیں جن کے نیچے
تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ
کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے مہمانی اللہ کے پاس سے
نہریں بہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں اللہ کی طرف کی مہمانی
وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾
اور وہ جو اللہ کے پاس ہے بہتر ہے نیکوں کے لئے
اور جو اللہ کے پاس ہے وہ نیکوں کے لئے سب سے بھلا

تعلقات

ان آیات کا گزشتہ آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مومنوں کے اخروی ثواب کا ذکر تھا، اب ان آیات میں کفار کے دنیوی آرام وعیش کا تذکرہ ہے تاکہ پتہ لگے کہ کفار نقصان میں ہیں، اور مسلمان نفع میں، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ مسلمان اللہ کے پیارے ہیں اور اس کی نعمتوں کے مستحق، جس سے شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ دشمن کفار یہاں عیش و بہار کیوں کر رہے ہیں، اس آیت کریمہ میں یہ شبہ دفع کیا جا رہا ہے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں کے آخر میں فرمایا گیا تھا کہ اللہ کے پاس ہی اچھا ثواب ہے، اب اسی کو واضح فرمانے کے لئے بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی نعمتیں اگرچہ کفار کے اعمال کا ثواب ہیں، مگر یہ اچھا ثواب نہیں، چونکہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے، اس لئے اچھے ثواب کے بعد اب برے ثواب کا ذکر فرمایا گیا،

شانِ نزول

مشرکینِ مکہ اور یہودِ مدینہ عموماً تاجر تھے، جو تجارتی سلسلہ میں مختلف جگہ جاتے اور خوب کما کر لاتے اور عیش اڑاتے تھے، بعض فقراء مومنین نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا کہ اللہ کے دشمن تو عیش میں ہیں، ان کے لئے ہر جگہ بہار اور ہم فقر و فاقہ میں گرفتار، اس میں کیا حکمت ہے؟ تب یہ آیت کریمہ ان کی فہمائش کے لئے نازل ہوئی (تفسیر کبیر، خازن، جلالین، روح

انچ زمین کسی کافر کی نہیں آئی۔ سارا سفر اسلامی سلطنتوں میں ہی گذرا۔ چنانچہ پاکستان سے نکل کر ایران میں داخل ہوئے۔ ایران سے عراق، عراق سے کویت، کویت سے نجد میں وہاں سے حجاز مقدس میں اور یہ سب ممالک اسلامی ہیں۔ اگر آج بھی اسلامی سلطنتیں سر جوڑلیں تو دنیا میں بڑی طاقت بن جائیں۔ افسوس کہ ان کے نصیب میں اتفاق نہیں تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان کبھی بھی کفار سے نہ مرے آپس کی نا اتفاقی کا شکار ہوئے ہمیشہ اپنوں ہی نے اپنوں کو کچلا۔ **بارھواں اعتراض:** حضور علیہ السلام کو معراج میں کچھ دیر عرش پر بلا کر واپس بھیج دیا گیا مگر عیسیٰ علیہ السلام کو صدیوں تک چوتھے آسمان پر رکھا گیا۔ معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام حضور ﷺ سے افضل ہیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ سے جو قرب انہیں حاصل ہے۔ حضور علیہ السلام کو حاصل نہیں (عیسائی) **جواب:** اس کے بہت جواب ہیں۔ نہایت آسان جواب اس مثال سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ کسی بادشاہ نے کسی افسر کو امن قائم کرنے کے لئے کہیں بھیجا۔ مگر اس سے رعایا نہ دبی۔ باغیوں نے افسر کو قتل کرنا چاہا سلطان نے فوراً اس افسر کو اپنے پاس بلالیا تاکہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس کے بعد دوسرا افسر بھیجا گیا جس نے تمام باغیوں اور سرکشوں کو اپنا تابعدار کر لیا بادشاہ نے حکم دیا کہ چونکہ تم سے نظام سلطنت خوب قائم ہوا لہٰذا تم وہاں ہی رہو۔ اور حکومت کئے جاؤ پھر کبھی اس افسر کو مہمان بنا کر اپنے ہاں بلایا اس کا جلوس نکالا خلعت اور تمغے عنایت فرمائے یقیناً اس افسر کا یہاں رہنا پہلے افسر کے بادشاہ کے پاس رہنے سے افضل ہے۔ حضرت مسیح کا آسمان پر جا کر پھر عہد مصطفیٰ میں حضور ﷺ کی امن میں زمین پر تشریف لانا اور حضور ﷺ کا عرشی مہمان بن کر جانا اور کونین میں دھوم دھام کا ہونا۔ پھر سرکشوں کی سرکوبی کے لئے دنیا میں تشریف لانا اور فرش پر جلوہ گر ہونا ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ حضور علیہ السلام زمین پر اسی واسطے رکھے گئے کہ حضور علیہ السلام سے یہاں کا انتظام قائم ہے۔ مرکز دائرہ میں ہی رہنا چاہئے کیونکہ اس کے ہٹنے سے سارا دائرہ بگڑ جائے گا۔

تفسیر صوفیانہ

رب تعالیٰ نے عیسیٰ قلب سے فرمایا کہ اے عیسیٰ تجھے نفس و نفسیات سے نکال کر آسمان روح کی طرف پہنچانے والا ہوں جہاں میرا انتہائی قرب ہوگا۔ اور تجھے خبیث قوتوں اور نفسانی خواہشوں صحبتوں کی پلیدی سے نکالنے والا ہوں۔ اور تیرے متبعین روحانی طاقتوں کو ان نفسانی کفار پر بڑی قیامت یعنی مقام وحدت کے پہنچنے تک غالب رکھوں گا پھر تم سب کا رجوع میری طرف ہوگا۔ اور وہاں تمہارا حقیقی فیصلہ جذب اور عنایت سے پہلے جو تم میں اختلاف تھا اس کا فیصلہ یوں ہوگا کہ ہر ایک کو اسی کے لائق ٹھکانا دیا جائے گا۔ (ابن عربی)

دوسری تفسیر

معرفت الٰہی گویا آسمان سے ہے اور نفس اور نفسانیات گویا زمین ہے شیاطین یہاں کے کفار۔ سالک کو چاہئے کہ ماسویٰ اللہ سے بچتا ہوا مقام معرفت اللہ تک پہنچے تب اس کا حال فرشتوں کا سا ہوگا۔ کہ اس سے شہوتیں، غضب، برے اخلاق سب دور ہو جائیں گے تختی قلب کو نقش غیر سے صاف کر دو تاکہ تمہیں مثل عیسیٰ علیہ السلام وصال کی بلندی ہو۔

حکایت: مثنوی شریف میں ہے کہ ایک نحوی کشتی میں بیٹھا۔ اور کشتی بان سے بولا کیا تجھے نحو آتی ہے اس نے کہا نہیں۔ کہنے لگا کہ تیری آدھی عمر برباد ہوئی۔ کچھ دور جا کر کشتی بھنور میں پھنس گئی کشتی بان نے نحوی سے کہا کہ بولو کیا تمہیں پھنسی کشتی

ارشاد ہوا لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لٰکِنْ حرف استدراک ہے جو وہم دور کرنے کے لئے آتا ہے، الَّذِيْنَ سے مراد مسلمان ہیں، اتَّقَوْا سے تینوں قسم کے تقویٰ مراد ہیں، تقویٰ عام، تقویٰ خاص، تقوی خاص الخاص، جس کی تحقیق پہلے پارے کے اول میں ہو چکی ہے، لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، لَهُمْ میں لام ملکیت کا ہے یا نفع کا، پہلی بات زیادہ قوی ہے، کیونکہ جنتی جنتوں کے مالک ہوں گے نہ کہ محض مسافر و مہمان، باقی الفاظ کی تحقیقات بارہا ہو چکی ہے، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا یہ عبارت اتَّقَوْا کے فاعل هم سے حال ہے، خلود کے معنی دائمی قیام نہ کہ بہت عرصہ تک ٹھہرنا یعنی پرہیز گار مسلمان اگرچہ تاجر ہوں، کاروباری ہوں، مگر ان کے لئے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ وہاں وہ ہمیشہ ہی رہیں گے، نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ، نُزُلْ وہ کھانا یا سامان ہے جو نازل یعنی نو وارد مہمان کے لئے تیار کیا جائے، چونکہ نئے مہمان کے لئے بہت ہی تکلف کیا جاتا ہے کہ میزبان اپنی طاقت بھر کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتا، ایسے ہی جنت میں رب تعالیٰ جنتیوں کے لئے بہت پر تکلف سامان مہیا فرمائے گا کہ کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ ہوگا، اس لئے وہاں کی نعمتوں کو نُزُلْ فرمایا گیا، لطف تو دیکھو کہ جنتی لوگ جنتوں کے مالک بھی ہوں گے مہمان بھی، قبضہ کے لحاظ سے مالک، خاطر تواضع کے لحاظ سے مہمان، نُزُلًا جَنّٰتٌ وغیرہ کا حال ہے، بعض لوگوں نے کہا کہ جنت کی تمام نعمتیں مہمانی کا سامان ہیں، اصل چیز رضائے الٰہی ہے اس لئے انہیں نُزُلْ فرمایا گیا (روح المعانی) وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ، ما موصولہ اپنے صلہ مَا عِنْدَ اللّٰهِ سے مل کر مبتداء ہے اور خیرٌ اپنے متعلق لِلْاَبْرَارِ سے مل کر خبر، ابرار بار کی جمع ہے بمعنی نیک کار، اس عبارت میں لطیف اشارہ اس جانب ہے کہ کفار تجار، فجار بن گئے مگر مسلمان پرہیز گار تجار ابرار رہے، اس لئے ان کے یہ درجات ہوئے، یہ دنیا میں بھی مزے میں رہے اور آخرت میں بھی عیش میں،

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو کفار کے ہر چہار طرف پھرنے اور ان کے عیش و آرام سے تجارتی سفر کرنے، اور خوب مال کمانے، عیش اڑانے سے یہ دھوکا نہ کھانا کہ یہ لوگ خدا کے پیارے ہیں، اگر رب تعالیٰ کے دشمن ہوتے، تو ایسے عیش میں کیوں ہوتے، دنیاوی عیش ہماری رضاء کی دلیل نہیں، دنیاوی چیزیں نہایت حقیر، ذلیل اور تھوڑا سا سامان ہیں، کیونکہ یہ سب چیزیں اول سے اب تک نیست تھیں، کچھ دنوں کے لئے انہیں ہستی ملی، پھر ابد تک نیست رہیں گی، ان کے وجود کا زمانہ ازلی ابدی عدم کے مقابلہ میں بہت ہی تھوڑا ہے، اس کے باوجود یہاں کی ساری نعمتیں، آفتوں، حسرتوں، تکلیفوں سے گھری ہوئی ہیں، اس کے ساتھ بڑی مصیبت یہ بھی ہے کہ ان پر حساب، عتاب، عقاب سخت ہے، ایسی عارضی چیز جو اتنی آفتوں کا باعث ہو وہ دل لگانے کے قابل کب ہے، کفار کچھ دن دنیا برتیں گے پھر ان کا دائمی ٹھکانہ دوزخ ہوگا، اور دوزخ بدترین بستر ہے کہ وہاں کی آگ دوزخی کو ہر طرف سے ایسے گھیرے ہوگی، جیسے بستر سونے والے کو ہر طرف سے گھیر لیتا ہے، یہ سب مار کفار کے لئے ہے، رہے پرہیز گار مسلمان، وہ یہاں تجارتیں کریں پاک کمائیاں حاصل کریں، وہ بہر حال جنتی ہیں کہ ان کے یہ سارے کام رضائے ذوالجلال کے لئے ہیں، ان کی متاع قلیل نہیں بلکہ کثیر ہے، کہ رضائے رب جلیل کی کفیل ہے، وہ ان جنتوں کے مالک کر دیئے گئے، اور جنتیں ان کے نامزد ہو گئیں، جن کے نیچے ایک نہیں بلکہ بہت سی نہریں رواں ہیں، اس میں ان کا قیام عارضی نہ ہوگا بلکہ دائمی ہوگا، ہمیشہ رب

پس لیکن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا پس عذاب دوں گا میں ان کو عذاب سخت بیچ دنیا
تو وہ جو کافر ہوئے ہیں انہیں دنیا اور آخرت میں سخت عذاب دوں گا
وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
اور آخرت کے اور نہیں ہے واسطے ان کے کوئی مددگار اور لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اور
اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا اور وہ جو ایمان لائے اور
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾
عمل کئے انہوں نے اچھے پس پورا دے گا وہ ان کو اجران کے اور اللہ نہیں محبت فرماتا ظالموں سے
اچھے کام کئے اللہ ان کا نیگ انہیں بھرپور دے گا اور ظالم اللہ کو نہیں بھاتے
ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾
یہ تلاوت کرتے ہیں ہم اس کو اوپر تمہارے آیتوں سے اور ذکر حکمت والا
یہ ہم تو پڑھتے ہیں کچھ آیتیں اور حکمت والی نصیحت

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ کے فیصلے کا اجمالی ذکر تھا فرمایا گیا تھا کہ ہم تمہارے اختلافات کا فیصلہ کریں گے اب اس فیصلے کی تفصیل ارشاد ہو رہی ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں شبہ پیدا ہوتا تھا کہ جب کفار و مومنین کا فیصلہ قیامت ہی میں ہوگا تو انبیائے کرام اور آسمانی کتابوں کے دنیا میں تشریف لانے سے کیا فائدہ۔ وہ حضرات اس فیصلہ ہی کے لئے تو آتے ہیں اب اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔ کہ اس فیصلہ سے وہ عملی فیصلہ مراد ہے۔ جس سے ہر مجرم کو اپنے مجرم ہونے کا اقرار کرنا پڑے۔

تفسیر

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ف تفصیلیہ ہے اور امّا شرطیہ اور کفر سے یا تو عام کفر مراد ہے۔ یا یہود کا کفر یعنی مسیح علیہ السلام کی توہین یا عیسائیوں کا کفر یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں حد سے آگے بڑھنا ہے پہلے معانی عام ہیں اور آخری دو معنی موقعہ کے مناسب یعنی لیکن جنہوں نے کسی قسم کا کفر کیا یا عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا یا جو ان کی شان میں حد سے بڑھ کر کافر ہوئے۔ فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ یہ جملہ امّا کی جزا ہے۔ اور کفر کا نتیجہ۔ عذاب عذب سے بنا بمعنی روکنا۔ اسی لئے میٹھے پانی کو عذب کہتے ہیں کہ وہ پیاس کو روکتا ہے سزا کو عذاب اس لئے کہتے ہیں کہ اس جرم سے رکتا ہے فِي الدُّنْيَا عذاب کی صفت ہے یا اُعَذِّبُ کا ظرف اور دنیا سے یہ ظاہر زندگی مراد ہے۔ اور آخرت سے قبر اور قیامت کی زندگی مقصود۔ دنیا میں سخت عذاب قتل قید اور جز[illegible] سلطنت چھن [illegible] پہلے یہود کو رب نے عزت، سلطنت سب

میں روزے نماز کی طرح حلال کمائی حاصل کرنا بھی عبادت ہے، امیر بنو تا کہ زکوۃ و حج ادا کرسکو، غریبوں کی امداد کرسکو، بہت سی عبادتیں مال پر موقوف ہیں، **دوسرا اعتراض:** لَهُمْ کے مقدم فرمانے سے معلوم ہوا کہ جنت صرف متقی مسلمانوں کو ملے گی، گنہگار مسلمان ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے کیونکہ لَهُمْ کا مقدم کرنا حصر کے لئے ہے، **جواب:** اتَّقَوْا رَبَّهُمْ میں تقویٰ سے عام تقویٰ مراد ہے جو ہر مومن کو حاصل ہے یعنی خوف خدا میں کفر و شرک کو چھوڑ دینا، ہر مومن متقی ہے کہ کفر سے بچا ہوا ہے، **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنتی لوگ جنت اور وہاں کی نعمتوں کے مالک نہ ہوں گے، کیونکہ فرمایا گیا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ، ظاہر ہے مہمان گھربار کا مالک نہیں ہوتا، **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گذر چکا کہ ہوں گے تو وہ جنت کے مالک مگران کی خاطر تواضع مہمانوں جیسی ہوگی، گھر والے کی گھر میں خاطر نہیں ہوا کرتی، بلکہ وہ دوسروں کی خاطر کرتا ہے، لَهُمْ میں لام ملکیت کا ہے جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ حضرات جنت کے مالک تام ہوں گے، **چوتھا اعتراض:** اگر جنتی لوگ جنتوں کے مالک ہیں، تو کیا وہ اپنی جنت یا وہاں کی نعمتیں فروخت بھی کرسکیں گے، **جواب:** ہرگز نہیں، کیونکہ وہاں فروخت کی ضرورت ہی نہ پڑے گی، گھربار ضرورت مند ہی فروخت کرتا ہے، وہاں ہر ایک کی جائیداد روئے زمین سے بھی زیادہ ہوگی، پھر فروخت کرنے کی ضرورت ہی کیا، وہاں فروخت یا ہبہ نہ کرنے کی وجہ دوسری ہے نہ کہ ملکیت کا نقصان،

تفسیر صوفیانہ

فعل کا عمل فاعل کے لحاظ سے ہوتا ہے، اور چیز کا اثر مالک کے اعتبار سے، ایک ہی غلام فقیر کی ملکیت ہو تو حقیر ہے، اور اگر اسی غلام کو بادشاہ خرید لے تو شاندار ہے، کسی نے کیا خوب کہا، ع

مالک کشور شود بندہ سلطان خرید

ایک ہی زمین پر کسی کا مکان بنا ہو، تو اس کی اور حالت ہوتی ہے، لیکن اگر اسی پر مسجد بن جائے تو اس کی شان ہی اور ہو جاتی ہے، اسی طرح دنیا ایک ہے، مگر دنیا والے دو، کافر و مومن، کافر کی دنیا مَتَاعٌ قَلِيلٌ ہے، مگر مومن کی دنیا غیر فانی اور ذریعۂ عطائے جزیل ہے، یہاں رب تعالیٰ نے کفار کی دنیا کو مَتَاعٌ بھی فرمایا اور قَلِيلٌ بھی اور لٰکن فرما کر مسلمانوں کی دنیا کو حصول جنت کا ذریعہ قرار دیا، وجہ یہ ہے کہ کافر دنیا کو نفس کے لئے حاصل کرتا ہے، نفس کو فنا ہے تو نفسانی دنیا کو بھی فنا، مگر مومن یہی دنیا رب تعالیٰ کے لئے حاصل کرتا ہے، رب تعالیٰ باقی ہے تو ربانی دنیا بھی باقی، مومن کی دنیا آخرت کا تخم ہے جس سے لازوال باغ کھلتے ہیں، کافر کی دنیا بوریوں میں بھرا ہوا دانہ ہے، جسے چوہے، دیمک، گھن، پئی وغیرہ جلد ہلاک کر دیتی ہیں، مومن کبھی کافر کی دنیا پر رشک نہ کرے، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ آسمان کو قرار نہیں، ہمیشہ حرکت میں ہے، ایسے ہی آسمان کے سایہ میں رہنے والی چیزوں کو بھی قرار نہیں، یہاں کی دولت یار بے وفا ہے، آج ایک کے پاس ہے کل دوسرے کے، جب کسی کو رب تعالیٰ ملک و دولت دے، تو وہ اسے اپنی جاگیر نہ سمجھ لے، بلکہ اسے غنیمت جان کر کچھ اس سے آخرت کمالے، دنیا چلی جاتی ہے مگر دنیادار پر دائمی مدح یا قدح چھوڑ جاتی ہے، شعر

نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ ذَالِكَ سے عیسیٰ علیہ السلام کے مذکورہ واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ وہ عظیم الشان تھے اس لئے ذَالِكَ فرمایا۔ نَتْلُوْ تلاوت سے بنا۔ اس کی لغوی تحقیق بارہا ہو چکی۔ یہاں خبر دینا ذکر کرنا یا پڑھنا مراد ہے۔ اگرچہ یہ کام جبریل علیہ السلام کے تھے مگر چونکہ رب تعالیٰ کے حکم سے تھے اس لئے اسے رب تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا۔ مِنَ الْاٰیٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِیْمِ یہ عبارت نَتْلُوْ کی ضمیر سے حال ہے۔ آیات سے مراد یا قرآن پاک کی آیتیں ہیں۔ یا حضور علیہ السلام کی نبوت کی نشانیاں ذکر سے مراد قرآن شریف ہے اور حکیم یا حکم بمعنی مضبوطی سے بنا یا حکمت سے (خازن) بعض لوگوں نے کہا کہ ذکر حکیم سے مراد لوح محفوظ ہے۔ جہاں سے آسمانی کتابیں آتی ہیں یعنی یہ واقعات اور مضبوط قرآن کی آیات آپ کو ہم ہی بتاتے ہیں۔ نہ آپ نے کسی سے پڑھیں نہ کہیں سنیں یہ آپ کی نبوت کی نشانیاں ہیں قرآن مضبوط یا حکمت والا کہ نہ اس کی کوئی آیت لغو اور نہ اسے کوئی مٹا سکے۔ آپ پر ان چیزوں کا آنا آپ کی نبوت کی دلیل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آیات سے مراد قرآن کی عام آیتیں ہوں۔ اور ذکر حکیم سے مراد نعت انبیائے کرام کی آیات۔

خلاصہ تفسیر

مسلمانوں اور کفار میں اس طرح فیصلہ ہوگا کہ کفار کو تو دنیا میں بھی ہم سخت عذاب دیں گے کہ ان پر جزیہ مقرر کریں گے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل کرائیں گے۔ دنیا میں انہیں ذلیل و خوار رکھیں گے۔ اور آخرت میں بھی آگ و تکالیف کی سخت سزا دیں گے۔ اور ان کے لئے کوئی کسی قسم کا مددگار نہ ہوگا۔ کہ انہیں مال و دولت یا اپنی عزت آبرو کے ذریعے ہمارے عذاب سے بچا لے۔ ہاں جو ایماندار ہیں اور ہر قسم کی نیکیاں بقدر طاقت کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ انہیں ان کا اجر پورا پورا دے گا۔ کسی قسم کی کمی نہ فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ ظالموں یعنی کافروں کو پسند نہیں فرماتا۔ خیال رہے کہ قرآن کریم میں چار قسم کی آیتیں ہیں بعض وہ جن میں فرمایا گیا کہ کافروں کا مددگار کوئی نہیں۔ جیسے یہاں۔ بعض وہ جن میں ارشاد ہوا کہ اے مسلمانو تمہارا مددگار کوئی نہیں جیسے وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (بقرہ:۱۰۷) بعض وہ جن میں فرمایا گیا کہ مومنوں کے مددگار بہت ہیں جیسے اِنَّمَا وَلِیُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ الخ (مائدہ:۵۵) یا جیسے وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِیْرًا (النساء:۷۵) بعض وہ جن میں ارشاد ہوا کہ بعض کفار بعض کے مددگار ہیں۔ جیسے بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (انفال:۷۲) یا جیسے وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـٴُـهُمُ الطَّاغُوْتُ الخ (بقرہ:۲۵۷) ان اثبات ونفی کی مختلف آیات میں مختلف امدادوں کا ذکر ہے۔ مثلاً کفار کا آخرت میں کوئی مددگار نہیں۔ یا دنیا میں ان کا راہ نما کوئی نہیں اور مسلمانوں کا اللہ کے مقابل کوئی مددگار نہیں۔ اس لئے وہاں مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ارشاد ہوا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنْ یَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ اِنْ یَّمْسَسْكَ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ فلا مرسل له (آل عمران:۱۶۰) اور اللہ کے بنانے سے مسلمانوں کے مددگار بہت ہیں اور بعض کافر بعض کے کفر و طغیان کے مددگار ہیں۔ کہ جو انہیں اور زیادہ کافر و طاغی بنا دیتے ہیں للہذا ان چاروں قسم کی آیتوں میں کوئی تعارض نہیں خیال ہے کہ جب اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا کے ساتھ آئے گا تو اس سے جنات اور انسان سب ہی مراد ہوں گے۔ اور جب اَلَّذِیْنَ کے بعد ایمان کا ذکر ہوگا تو اس سے صرف مومن انسان مراد ہوں گے کیونکہ دوزخ سارے کافروں کے لئے ہے۔ جنات ہوں یا انسان مگر جنت صرف انسان مومنوں کے لئے ہے۔ نہ جنات کے لئے نہ فرشتوں کے

وَرَابِطُوْا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٢٠٠﴾

اور تیاری جہاد کرو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو

اور سرحد پر اسلامی ملک کی نگہبانی کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اس امید پر کہ کامیاب ہو

تعلقات

ان آیات کا گزشتہ آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں مومنین و کفار کا انجام بیان کیا گیا کہ تمام کافروں کا ٹھکانہ دوزخ ہے، کتابی کافر ہوں یا مشرک کافر، اور مسلمانوں کا ٹھکانہ جنت، اب ارشاد ہو رہا ہے کہ وہ کفار جہنم میں جائیں گے جو کفر پر جائیں، بعض اہل کتاب کفار مرنے سے پہلے ایمان لے آتے ہیں، وہ دائمی مومنوں کے زمرے ہی میں ہیں، انہی کے ساتھ ان نومسلموں کا بھی حشر ہوگا، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں کچھ مہاجر مسلمانوں کے فضائل بیان کیے گئے تھے جو اپنے وطنوں کو چھوڑ کر پردیسی بنے، اب ان اہل مدینہ کے فضائل بیان ہو رہے ہیں جو پہلے اہل کتاب تھے، پھر ایمان لاکر ان مہاجروں کے میزبان بنے، یعنی مہمانوں کا ذکر پہلے تھا اور میزبانوں کا ذکر اس آیت میں، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت کے آخر میں فرمایا گیا تھا کہ نیک کاروں کا ثواب اللہ کے ہاں بہت بڑا ہے، اب نیک کاروں کی ایک خاص جماعت کا ذکر ہو رہا ہے جن کا ڈبل ثواب ہے، یعنی وہ اہل کتاب جو پہلے اپنے پیغمبر و کتاب پر ایمان لائے، بعد میں نبی کریم ﷺ اور قرآن شریف پر، **چوتھا تعلق:** گزشتہ آیات میں فرمایا گیا تھا کہ کفار کے پاس جو کچھ ہے مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ہے جس سے معلوم ہوا تھا کہ اہل کتاب کا ایمان، نیک اعمال بھی متاع قلیل ہیں، جس کا ثواب اللہ کے ہاں کچھ نہیں، اب وہ طریقہ بتایا جا رہا ہے جس سے ان کے وہی ایمان و اعمال متاع کثیر بن جائیں، ناپائیدار دولت پائیدار نعمت بن جائے یعنی قرآن و صاحب قرآن پر ایمان،

شانِ نزول

اس آیت کے نزول کے بارے میں چند روائتیں ہیں،

۱۔ بادشاہ حبشہ (جس کا نام اصحمہ یا مکحول ابن صعصعہ تھا لقب نجاشی) کا رجب ۹ ھ میں انتقال ہوا، مدینہ طیبہ میں حضور انور ﷺ نے صحابہ کو ان کی وفات کی خبر دی اور فرمایا، چلو ان پر نماز جنازہ پڑھیں، چنانچہ مع صحابہ کرام کے جنت البقیع میں تشریف لائے، رب تعالیٰ نے زمین حبشہ اور نعش نجاشی حضور انور ﷺ پر منکشف فرمادی، حضور انور ﷺ نے مع صحابہ ان کا جنازہ پڑھا، جس پر منافقین نے طعنہ زنی کی، کہ حضور انور ﷺ نے ایسے شخص کا جنازہ پڑھا جو مذہباً عیسائی تھا اور جسے حضور انور ﷺ نے کبھی دیکھا بھی نہیں، منافقین کی تردید، حضور انور کی تائید، نجاشی کی تعریف میں یہ آیت کریمہ اتری (تفسیر کبیر، معانی، خازن و خزائن) خیال رہے کہ حضور انور ﷺ نے اس جنازہ میں چار تکبیریں کہیں اور بعد نماز جنازہ نجاشی کے لئے دعائے مغفرت بھی کی (خازن و خزائن) معلوم ہوا کہ نماز جنازہ میں چار تکبیریں چاہئیں، اور دعا بعد نماز جنازہ سنت ہے

مسلمان کے واسطے رحمت ہے اور کافر کے لئے عذاب نیز مسلمان غربت میں بھی خوش رہتا ہے اور کافر غنی ہو کر بھی پریشان راحت مال پر موقوف نہیں۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ نیک مسلمان کو پورا ثواب ملے گا۔ مگر احادیث سے ثابت ہے کہ بعض اعمال کا ثواب ایک لاکھ گنا تک ملے گا۔ ان دونوں میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ یہاں پورے سے مراد کمی نہ ہونا ہے زیادتی اس کے خلاف نہیں دوسرا یہ کہ پورے سے مراد قانون کے مطابق ہے نہ کہ عمل کے مطابق جس نیکی کا ثواب ایک لاکھ ملتا ہے وہ ہی اس کا پورا ثواب ہے۔ کیونکہ قانون کے ماتحت ہے۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمان کو پورا ثواب ملے گا مگر بعض آیتوں اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گناہ نیکیاں برباد کر دیتے ہیں۔ حالانکہ گنہگار مومن ہوتا ہے ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کا جواب فوائد میں گذر گیا کہ پورا اجر ملنا تقویٰ پر موقوف ہے۔ اور گناہ سے بچنا بھی تقویٰ میں داخل ہے لہٰذا گنہگار اس آیت سے خارج ہے۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اجر و ثواب کا ملنا۔ ایمان و اعمال دونوں پر موقوف ہے۔ تو جن لوگوں کو ان کا وقت ہی نہ ملا۔ تو وہ کہاں جائیں گے جنت میں یا دوزخ میں اگر دوزخ میں گئے تو رب کے کرم کے خلاف ہے۔ اگر جنت میں گئے تو اس آیت کے خلاف یہ سوال مسلمانوں کے چھوٹے بچوں پاگلوں دیوانوں ایمان لاتے ہی مر جانے والوں کے متعلق بھی ہے۔ اور ان کے متعلق بھی جو ابتدائے اسلام میں فوت ہو گئے جبکہ اعمال آئے ہی نہ تھے۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک عالمانہ اور دوسرا عاشقانہ علماء فرماتے ہیں کہ ان جیسی آیتوں میں بقدر طاقت کی قید ہے۔ رب فرماتا ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرۃ: ۲۸۶) لہٰذا ایسے لوگ بغیر اعمال ہی جنت میں جائیں گے۔ عشاق فرماتے ہیں کہ جنت کسبی بھی ہے اور عطائی بھی ان جیسی آیتوں میں جنت کسبی کا ذکر ہے دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو دوسروں کے طفیل جنت ملے گی۔ اور بعض آیات سے معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کو محض اللہ کے کرم سے جنت عطا ہو گی۔ قانون اور ہے اور رب کا فضل کچھ اور۔ لہٰذا آیت واضح ہے نہ تو کوئی شخص عمل سے بے پرواہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی اپنے عمل پر اعتماد کر سکتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

دنیا مثل کھیتی کے ہے جیسے کھیت میں بھوسہ اور دانہ ایک ہی کھاد پانی پاتے ہیں مگر کٹنے کے بعد دانے کی جگہ اور ہے اور بھوسے کی جگہ دوسری۔ ایسے ہی دنیا میں کفار مومن یہاں کی نعمتوں سے عام فائدہ حاصل کر رہے ہیں مگر قیامت کا دن گویا اس کھیت کے کٹنے کا دن ہو گا جس کے بعد مسلمانوں کی جگہ جنت ہو گی۔ اور کفار کی جگہ دوزخ۔ صوفیائے کرام کے نزدیک کفار کا مقام قلب سے محروم رہنا اور اپنی بدعملی میں پھنسا رہنا حق تعالیٰ سے محجوب رہنا سخت عذاب ہے لیکن وہ لوگ جو ایمان شہودی رکھیں اور ہر طرح نفس کا تزکیہ اور تصفیہ کریں اور نیک عمل سے اسے آراستہ کریں اور نفس کے مقابلہ میں قلب کو توجہ الی اللہ میں امداد کریں۔ حق تعالیٰ انہیں قدسی انوار اور روحانی اشراق سے پورا پورا حصہ دے گا۔ رب تعالیٰ ظالم یعنی اعمال میں کوتاہی کر کے اجر میں کمی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ یہاں کامل مومن وہ ہے جس کے لئے دنیا رب تعالیٰ سے حجاب نہ بن جائے۔ ہر شخص کو رب سے قدرتی عشق ہے اور عاشق کے لئے محبوب سے جدائی انتہائی کا میابی ہے اور محبوب سے محجوبی انتہائی ناکامی۔

ایمان لانا ہو، قرآن ماننے سے پہلے وہ لوگ مسوخ، منسوخ، محرف کتاب کو مانے بیٹھے تھے، اب صحیح طور پر ان کتابوں کو مانا، چوتھی صفت یہ کہ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ من لفظاً واحد ہے، معنیً جمع، کہ اس سے مومنین اہل کتاب کی جماعت مراد ہے، اس لئے یومن واحد فرمایا گیا، اور خٰشِعِيْنَ جمع، يُّؤْمِنُ میں لفظ من کا لحاظ تھا اور خٰشِعِيْنَ میں معنی من کا اعتبار ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خٰشِعِيْنَ اِلَيْهِمْ ضمیر سے حال ہو، خٰشِعِيْنَ خشوع سے بنا، خشوع وہ خوف ہے جو دل میں گھر کر جائے، اور جس سے گناہوں سے پرہیز، نیک اعمال کی طرف میلان میسر ہو، اس کلمہ میں منافقین پر چوٹ ہے کہ بے ایمانو! تم نجاشی وغیرہ کے ایمان پر کیا اعتراض کرتے ہو، تم سے وہ لاکھ درجہ اچھے تھے کہ تمہارا ایمان محض زبانی ہے، وہ بھی تلوار کے خوف سے، ان کا ایمان جنانی وروحانی، اور وہ بھی رب غفار وجبار کے خوف سے، پانچویں صفت یہ کہ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا، اس آیت کی تفسیر بارہا ہوچکی کہ خریدنے سے مراد ہے تبدیل کرنا، تحریف کرنا، اور آیات اللہ سے مراد توریت وانجیل کی وہ آئتیں ہیں جن میں حضور انور ﷺ کی نعت تھی، یا احکام کی وہ آئتیں، جن میں پادری صاحبان کچھ پیسے لے کر بدل دیتے تھے، ثَمَنًا قَلِيْلًا سے وہ رشوتیں مراد ہیں جو وہ اس تبدیلی کے عوض اپنے ماتحتوں سے وصول کرتے تھے، یعنی اے مسلمانو! سارے اہل کتاب برے نہیں، ان میں بعض ایسے مقبول بندے بھی ہیں جو صحیح طور پر ہمارے محبوب ﷺ کی معرفت اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں، تمہاری کتاب قرآن کریم کو بھی مانتے ہیں، اور اپنی کتاب توریت وانجیل کو بھی، پھر منافقوں کی طرح جوتے کے خوف سے نہیں بلکہ رب کے خوف سے ایمان لاتے ہیں، پھر دوسرے پادریوں کی طرح رشوتیں لے کر آیات الٰہیہ میں تبدیلی نہیں کرتے، جن میں یہ پانچ صفتیں موجود ہیں، اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ، اُولٰٓئِكَ سے انہی کتابیوں کی طرف اشارہ ہے جن کے پانچ صفات مذکور ہوئے، لَهُمْ میں لام استحقاق کا ہے، اور ہوسکتا ہے کہ ملکیت اور نفع کا ہو، اجر سے مراد ان کے ایمان اور سارے نیک اعمال کا ثواب ہے، زمانہ کفر میں کئے ہوں یا ایمان لانے کے بعد، کیونکہ کافر کو بعد ایمان کفر کے زمانہ کی نیکیوں کا بھی ثواب ملتا ہے، اَجْرُهُمْ سے اس ثواب کی طرف اشارہ ہے جو مومنین اہل کتاب کے ساتھ خاص ہے یعنی ڈبل، رب تعالیٰ فرماتا ہے اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ (قصص: ۵۴) اور فرماتا ہے يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ (حدید: ۲۸) حضور انور ﷺ فرماتے ہیں کہ تین شخصوں کو دوہرا ثواب ملتا ہے، ان میں سے وہ کتابی بھی ہے جو پہلے اپنے نبی پر ایمان لاچکا ہو، پھر مجھ پر ایمان لائے، عِنْدَ رَبِّهِمْ فرما کر دو باتیں فرمائی گئیں، ایک یہ کہ اگرچہ ان مومنین اہل کتاب کو دنیا میں بھی غنیمتیں ہیں نعمتیں ملیں گی، مگر ان کا اصلی ثواب اس عالم سے جانے کے بعد ہی ملے گا، دوسرے یہ کہ ان کا ثواب ضائع نہیں ہوسکتا کہ دنیا کی چیزیں آفات وغیرہ سے برباد ہوجاتی ہیں، مگر جو چیز رب تعالیٰ کے پاس ہے، اسے کون برباد کرے، یعنی ان اہل کتاب کو ان کا خاص اجر ان کے رب تعالیٰ کے پاس ضرور ملے گا، کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ پروردگار عالم ایسا علم وقدرت والا ہے کہ سارے بندوں کا حساب صرف چار گھنٹوں میں لے لے گا، چھوٹے دن کے آدھے میں، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے (جلالین) ایسی قدرت وعلم کا مالک انہیں پورا ثواب ضرور دے سکتا ہے، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اہل کتاب نو مسلموں کے صفات کاملہ بیان فرما کر پرانے مسلمانوں کو چار حکم دیئے گئے، چونکہ ایمان سارے اعمال پر مقدم ہے، اس لئے

پھر مباہلہ کریں تو جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ڈالیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** دعوے کو چند طرح ثابت کیا جاتا ہے۔ دلائل سے واقعات سے اور معترض کے شبہات دور کر کے۔ پچھلی آیتوں میں عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت دلائل اور واقعات کی روشنی میں دکھائی گئی۔ کہ پیدا ہونا۔ رزق کھانا بندگی کی علامتیں ہیں۔ اب عیسائیوں کے اعتراض کا الزامی جواب دیا جا رہا ہے۔ اور ان کے شبہات دور کئے جا رہے ہیں۔ **دوسرا تعلق:** منصف مقابل سے مناظرہ کیا جاتا ہے اور ہٹ دھرم سے مباہلہ یعنی جھوٹے کے لئے بددعا۔ اب تک عیسائیوں سے مناظرہ و گفتگو تھی۔ جس سے منصف فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اب ضدی عیسائیوں کے مقابلہ میں فیصلہ کن مباہلہ کی تعلیم ہے۔ گویا مناظرے کے بعد مباہلے کا ذکر ہو رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں عیسیٰ علیہ السلام کے حیران کن واقعات بیان کئے گئے۔ جن سے شاید معترض ان کی الوہیت ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ اب اس غلط فہمی کو دور کیا جا رہا ہے اور آدم علیہ السلام کا واقعہ پیش کر کے بتایا جا رہا ہے کہ معجزات الوہیت کی علامت نہیں۔

شان نزول

وفد نجران جس کا ذکر شروع آل عمران میں ہو چکا۔ جب حضور ﷺ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا تو ان کے سردار عاقب اور عبدالمسیح نے حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کیا کہ کیا آپ فرماتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں فرمایا ہاں اس کے بندے، اسکے رسول، اس کے کلمے جو کنواری بتول مریم کی طرف القاء کئے گئے۔ وہ لوگ غصے ہو گئے اور کہنے لگے کہ کیا آپ نے کوئی ایسا بندہ بھی دیکھا ہے جو بغیر باپ پیدا ہو۔ عیسیٰ علیہ السلام کا اس طرح پیدا ہونا ان کے ابن اللہ کی دلیل ہے۔ اسی وقت جبریل علیہ السلام یہ آیت لے کر آئے جس میں بتایا گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام سے غریب تر اور بہت انوکھی آدم علیہ السلام کی پیدائش ہے۔ کہ وہ بغیر ماں و باپ خشک مٹی سے پیدا ہوئے جب تم انہیں خدا کا بیٹا نہیں مانتے اللہ کا بندہ مانتے ہو تو عیسیٰ علیہ السلام کو عبداللہ ماننے میں کیا تعجب ہے۔ (خازن و خزائن)

تفسیر

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ چونکہ اس مضمون کے عیسائی منکر تھے اس لئے اِنَّ سے شروع فرمایا گیا نیز یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور ان کی والدہ کو اس لئے برا کہتے تھے کہ آپ بغیر والد پیدا ہوئے۔ اسی وجہ سے جناب مریم کی تہمت لگاتے تھے اور کہتے تھے کہ نعوذ باللہ چونکہ آپ ثابت النسل نہیں ہیں اسی لیے آپ نبی تو کیا ولی بھی نہیں ہو سکتے اور ان کی تردید کے لئے بھی اِنَّ فرمایا گیا۔ کہ اگر بغیر باپ پیدا ہونا نبوت کے خلاف ہے۔ تو بے وقوف یہودیو تم حضرت آدم علیہ السلام کو نبی کیسے مانتے ہو ان کا نسب تو نہ باپ کی طرف ہے نہ ماں کی طرف سے جناب مسیح کا نسب ماں کی طرف سے تو ہے نیز رب جانتا تھا کہ مسلمانوں میں بعض ایسے بے دین پیدا ہوں گے جو جناب مسیح کا نسب یوسف نجار سے ثابت کریں گے اور بغیر والد ہونے کا انکار کریں گے۔ ان کی تردید کے لئے بھی اِنَّ ارشاد ہوا غرض کہ ایک اِنَّ سے یہود عیسائی، مرزائی، تینوں فرقوں کی بلیغ تردید فرما دی گئی۔ مَثَلَ کی تحقیق اور مَثَلٌ و مِثْلٌ میں فرق تو ہم پہلے پارے میں عرض کر چکے یہاں یا بمعنی کہاوت ہے یا بمعنی

قدرت وعلم والا ہے، وہ ایسی قدرت والا ہے کہ ساری مخلوق کا حساب تھوڑی دیر میں لے لے گا، اے مسلمانو! اعمال صالح سے بے نیاز نہ ہو جاؤ، عبادتوں پر قائم رہو، مصیبتوں میں گھبرا نہ جاؤ، گناہوں سے بچے رہو، غرضکہ ہر قسم کے صبر اختیار کرو، اور جب کفار سے مقابلہ ہو جائے، تو میدانِ جنگ میں کفار سے زیادہ تم صابر رہو، لوگوں کی کج خلقی، بداطواری پر صبر سے کام لو، ہمیشہ اللہ کی راہ میں تیاری جہاد کے لئے گھوڑے پالو، یا اسلامی سرحدوں کی حفاظت کرو یا اپنے نفس کو اطاعت میں لگا دو، اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم دونوں جہان میں کامیاب رہو،

فضائل

مسلم بخاری نے حضرت سہل ابن سعد سے مرفوعاً روایت کی کہ ایک دن کا رباط یعنی تیاری جہاد دنیا اور دنیا کی چیزوں سے بہتر ہے اور جنت میں کوڑا رکھنے کی جگہ، دنیا اور دنیا کی چیزوں سے افضل ہے، صبح شام اللہ تعالیٰ کی راہ میں کچھ چل لینا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، مسلم نے حضرت سلمان خیر سے مرفوعاً روایت کی، کہ ایک دن کی تیاری جہاد ایک ماہ کے روزوں اور رات کے نوافل سے افضل ہے، تیاری جہاد والے کا عمل تا قیامت جاری رہتا ہے، اسے غیب سے روزی ملتی رہتی ہے، فتنۂ قبر سے امن میں رہتا ہے، یعنی اسے قبر کا حساب وعذاب نہیں ہوتا، مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً روایت کی، کہ حضور انور ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا، کیا میں تمہیں وہ عمل نہ بتاؤں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ خطا مٹا دے، درجے بڑھا دے، سب نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ (ﷺ) فرمایا وضو صحیح کرنا خصوصاً سردیوں میں، مسجدوں کی طرف زیادہ آنا جانا، نماز کے بعد نماز کا انتظار کرنا، فرمایا یہ بھی رباط ہے یا یہی رباط ہے (تفسیر خازن) فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ سورۂ آل عمران پڑھنے والے کو ہر آیت کے عوض پل صراط پر امان ملے گی، فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کہ جو جمعہ کے دن سورۂ آل عمران پڑھے، اس کے لئے دن ڈوبے تک ملائکہ دعائے رحمت کرتے ہیں (تفسیر بیضاوی) فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کہ دو چمکدار سورتیں پڑھا کرو، سورۂ بقر و آل عمران، کہ کل قیامت میں یہ دونوں سورتیں بدلی بن کر مسلمان پر سایہ کریں گی، اور تلاوت کرنے والے کے لئے رب تعالیٰ سے جھگڑ جھگڑ کر شفاعت کریں گی، رب تعالیٰ نے سورۂ بقر کے خاتمہ پر بھی دعائیہ آیات ارشاد فرمائیں اور سورۂ آل عمران کے آخر میں بھی دعاؤں کی تعلیم دی گئی، مگر سورۂ بقر میں قبولیت کا وعدہ نہ تھا اور سورۂ آل عمران میں قبولیت کا وعدہ بھی فرما لیا گیا کہ ارشاد ہوا فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ الخ (آل عمران: ۱۹۵) معلوم ہوا کہ مسلمان قاری قرآن سورۂ آل عمران ختم کرنے تک مقبول الدعا بن جاتا ہے،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** اہل کتاب کو اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اہل کتاب کہا جا سکتا ہے، کہ صحیح معنی سے اہل کتاب ہونا انسان کے لئے باعث فخر ہے، دیکھو رب تعالیٰ نے سیدنا عبداللہ ابن سلام، اور نجاشی کو ایمان لانے کے بعد بھی اہل کتاب فرمایا، اب نو مسلم یہودی یا عیسائی کو عیسائی یا یہودی نہیں کہیں گے، کہ ہماری اصلاح میں یہ

ایک جسم بنایا۔ پھر اس جسم سے فرمایا کہ تو مکمل انسان ہو جا۔ یہ فرماتے ہی فوراً ایسا ہو گیا (روح المعانی) اس طرح کہ وہی مٹی جسم انسان بن گئی۔ جس میں پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک سارے اعضاء بن گئے۔ جیسے صابن کا خمیر میدہ' تیل' ریشے وغیرہ سے ہوتا ہے مگر سوڈا کاسٹک کے پڑتے ہی یہ سب چیزیں اپنی حقیقت چھوڑ کر صابن بن جاتی ہیں۔ یا جیسے نطفہ ماں کے پیٹ میں گوشت پوست' ہڈی سب کچھ بن جاتا ہے نیز اس کن سے آپ کے جسم شریف میں روح بھی پڑ گئی۔ اور آپ اس کن سے عالم اسماء بھی ہو گئے۔ یعنی ہم نے کہا سب کچھ ہو جاؤ وہ سب کچھ ہو گئے غرضیکہ اس کن میں تین احتمال ہیں۔ (۱) اے مٹی کے جسم' جسم انسانی ہو جا (۲) اے بے جان جسم جاندار ہو جا (۳) اے آدم تم بشر زندہ خلیفہ عالم' عارف' نبی ساری خلق سے افضل سب کچھ ہو جاؤ ایسے ہی فَیَکُوْنُ میں یہ تینوں احتمال ہیں۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ یا تو اَلْحَقُّ مبتدا ہے۔ اور مِنْ رَّبِّکَ خبر یعنی حق وہ ہے جو رب تعالیٰ کی طرف سے ہو یا اَلْحَقُّ ہذا پوشیدہ کی خبر ہے اور مِنْ رَّبِّ حق کی صفت یا دوسری خبر۔ حق مقابل باطل کا ہے جیسے کذب مقابل صدق کا یعنی یہ سارے واقعات حق ہیں۔ آپ کے رب کی طرف سے ہیں۔ لہٰذا فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ اس میں بظاہر خطاب نبی ﷺ سے ہے مگر مقصود ہر قرآن پڑھنے والا ہے۔ مُمْتَرِیْنَ امتراء سے بنا جس کا مادہ مَرِیٌ یا مِریۃٌ ہے بمعنی جذب کرنا اور کھینچنا۔ اسی لئے بولتے ہیں مریت الناقت میں نے اونٹنی کا دودھ دوھ لیا۔ چونکہ شک انسان کے قلب کو کھینچے پھرتا ہے۔ ایک جگہ جمنے نہیں دیتا اسی لئے اسے مریۃ کہا جاتا ہے لہٰذا اے مسلمان تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔ یعنی شک کرنا تو کیا تو شک کرنے والوں کی جماعت سے بھی نہ ہو فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ بیان دلائل اور دفع شبہات کے بعد اخیری فیصلہ کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے یہاں مِنْ سے مراد نجران کے عیسائی ہیں کیونکہ اس وقت انہی سے مقابلہ تھا اور فیہ کی ضمیر سے مراد شان عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی عبدیت ہے۔ حَآجَّ مُحَاجَّۃٌ سے بنا بمعنی ایک دوسرے کے مقابل حجت کرنا یعنی اے نبی ﷺ اتنے دلائل کے بعد بھی جو کوئی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آپ سے جھگڑا کرے مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ مِنْۢ بَعْدِ حَآجَّ کے متعلق ہے علم سے مراد یقینی آیتیں اور مضبوط دلائل ہیں کیونکہ وہ علم کا ذریعہ ہیں اور مِنْ بیانیہ ہے۔ مَا کا بیان نہ کہ تبعیضیہ۔ اس لئے کہ نبی ﷺ کو اس کا پورا علم عطا فرمایا گیا تھا نہ کہ بعض چونکہ مناظرہ تو ہر قطعی و ظنی مسئلہ پر ہو سکتا ہے مگر مباہلہ صرف عقائد قطعی پر ہی ہو سکتا ہے اسی لئے یہ جملہ ارشاد ہوا یعنی جبکہ آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت و نبوت کا آیات قرآنیہ کے ذریعہ قطعی و یقینی علم دیدیا گیا لہٰذا اب جو آپ کے مقابل اس پر ضد کرے تو مباہلہ کرو۔ اس ایک عبارت میں رب تعالیٰ نے ہم کو مباہلہ کے متعلق بہت سے مسائل بتا دیئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کو اس کے سوا اور چیزوں کا علم نہیں۔ فَقُلْ تَعَالَوْا یہ جملہ مِنْ حَآجَّکَ کی جزا ہے تَعَالَوْا کا مصدر تعالیٰ ہے بمعنی اوپر چڑھنا اس کا مادہ علو بمعنی بلندی ہے۔ اسکے معنی ہیں اوپر آؤ مگر اب مطلقاً آنے کے لئے استعمال ہے یعنی فرما دو کہ خوب پختہ ارادہ کر کے آؤ۔ نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَکُمْ ندع دعوے سے بنا بمعنی بلانا۔ ابناء کے معنی ہیں بیٹے' مگر یہاں بیٹے' پوتے' نواسے سب ہی مراد ہیں یعنی مذکر اولاد اس لئے کہ نبی ﷺ اس موقعہ پر اپنے ساتھ امام حسن و حسین کو لے گئے تھے رضی اللہ عنہم جو کہ حضور ﷺ کے نواسے ہیں بعض نے فرمایا کہ یہاں ابناء سے مجازاً اولاد اور داماد مراد ہیں۔ کیونکہ حضور ﷺ سیدنا علی کو بھی ساتھ لے گئے تھے جن کا شمار داماد کی وجہ سے حضور ﷺ

مخصوص ہے یعنی دوگنا ثواب وہ انہی کو ملے گا، اسی لئے یہاں اَجْرُهُمْ فرمایا گیا، پرانے مسلمان اس ثواب خاص کے مستحق نہیں، دیگر ہزاروں ثوابوں کے مستحق ہیں، **چوتھا اعتراض:** ایمان کے ساتھ خشوع کا ذکر کیوں ہوا؟ ایمان تو ہوتا ہی خشوع سے ہے، کیا کوئی ایسا ایمان بھی ہے جو خشوع سے خالی ہو؟ **جواب:** جی ہاں ہے، وہ منافقین کا ایمان ہے، جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نہیں تلوار کے خوف سے لاتے تھے، ان کا یہ ایمان شرعاً ایمان کہلاتا تھا جس پر بعض شرعی احکام جاری ہو جاتے تھے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہ وہ ایمان ایمان تھا اور نہ یہ لوگ مومن، یہاں ایمان مقبول کا ذکر ہے اس لئے خشوع کی قید لگی، **پانچواں اعتراض:** جب حساب اتنی جلدی ہو جائے گا، تو یوم حساب اتنا بڑا کیوں ہے؟ تعجب ہے کہ حساب چار گھنٹوں میں اور روزِ حساب پچاس ہزار سال کا، **جواب:** بقیہ وقت مقدمات حساب، تلاشِ شفیع، نعتِ مصطفوی ﷺ میں خرچ ہوگا، رب تعالیٰ کی مرضی یہ ہوگی کہ کفار کو دوزخ میں بھیجنے سے پہلے محبوب ﷺ کی شان دکھادی جائے، اس لئے سب کے سامنے انہیں مقامِ محمود پر جلوہ افروز کر دیا جائے گا، سب سے نعتیں پڑھوائی جائیں گی، پھر انہیں دوزخ میں بھیجا جائے گا، تاکہ انہیں عذابِ نار کے ساتھ حضور انور ﷺ پر ایمان نہ لانے کا غم و افسوس بھی ہو، قرآن کریم فرماتا ہے یَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْهِ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِی اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلًا (فرقان: ۲۷) یعنی کفار غم و غصہ میں اپنے ہاتھ چبائیں گے کہ ہائے، کاش میں نے ان رسول اکرم ﷺ کا راستہ اختیار کیا ہوتا، **چھٹا اعتراض:** قرآن کریم آہستگی سے تئیس سال میں اترا، تو اس کے لئے یہاں اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ کیوں فرمایا گیا، انزال کے معنی ہیں یک دم اتارنا، **جواب:** یا تو یہاں انزال بمعنی تنزیل ہے یا اُنْزِلَ میں تجرید ہے بمعنی اتارنا، آہستگی و جلدی کا ذکر نہیں یا آیتوں کا اترنا مراد ہے نہ کہ پورے قرآن کا یعنی ان تمام آیتوں پر ایمان لاتے ہیں جو تم پر اتاری گئیں، اور ظاہر ہے کہ ہر آیت ایک دم ہی آئی،

تفسیر صوفیانہ

اہل کتاب یعنی قرآن مجید ماننے والوں میں سے بعض وہ اہل اللہ بھی ہیں جو واردات، الہامات، کشف کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اور الفاظِ قرآن اور اسرارِ قرآن پر ایمان شہودی لاتے ہیں، الفاظِ قرآن تو سارے مومنین کے لئے اترے، مگر اسرارِ فرقان صرف ان لوگوں کے دلوں پر نازل ہوئے، یہ لوگ حکماء الٰہیہ ہیں جو اپنے کشف و الہام کو تھوڑی قیمت یعنی جنت کے عوض نہیں بیچتے بلکہ وہ طالب مولیٰ ہیں، اللہ تعالیٰ ان کا حساب قیامت پر موقوف نہیں رکھتا، بلکہ ان کا ثواب قرب الٰہی معرفت وغیرہ بقدرِ درجہ یہاں ہی عطا فرما دیتا ہے، عاقلین قیامت کے بعد جنت صوری میں جائیں گے، مگر واصلین دنیا ہی میں جنت معنوی میں موجود ہیں، اسی جنت میں جیتے ہیں اسی میں مرتے ہیں، مگر اس جنت کے لئے بڑی محنت درکار ہے، حضرت ابراہیم ابن ادھم نے کسی حمام میں جانا چاہا، حمام والے نے کہا پہلے اجرت لاؤ، پھر دروازہ میں قدم رکھو، آپ رو پڑے، اور بولے کہ جب دار شیاطین یعنی حمام میں بغیر اجرت نہیں جاسکتے تو دار نبیین اور صدیقین میں مفت کیسے جاسکتے ہیں، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، شعر

کنوں باید اے خفتہ بیدار بود   چو مرگ اندر آرد ز خوابت چہ سود

حقیق رب فرماتا ہے حَقِیْقٌ عَلٰی اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ (اعراف:۱۰۵) اوراس کی حقانیت پر یقین کرو اور اے محبوب ﷺ ان یقینی دلائل اور منہ توڑ جواب سننے کے بعد بھی جو عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آپ سے جھگڑا کریں اور عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا ہی کہیں تو آپ ان سے اب مناظرہ نہ کرو بلکہ انہیں مباہلہ کی دعوت دو۔ اور فرما دو کہ میدان میں آؤ ہم تم اپنی اولاد یعنی بیٹی بیٹے اور اپنے آپ کو ایک جگہ جمع کریں پھر خدا کی بارگاہ میں عاجزی سے دعا کریں۔ کہ مولیٰ ہم دونوں میں سے جو جھوٹا ہو اس پر لعنت کر۔ یہ آپ کا اور ان کا اخیری فیصلہ ہے۔ خیال رہے کہ رب تعالیٰ کی طرف سے حضرات انبیاء کرام کو تین نوعیتوں سے علم عطا ہوتے ہیں۔ پیدائش علم جیسے معرفت الٰہی۔ ایمانیات وغیرہ کے علوم۔ دوسرے وہ جو حسب موقعہ الہام کے ذریعہ عطا ہوتے ہیں۔ تیسرے وہ جو بذریعہ وحی عطا ہوتے ہیں ان تینوں علوم کی آیات قرآنی موجود ہیں یہاں مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ میں علم سے مراد یہ تیسرا علم ہے۔ اور اس عبارت میں ہم کو بتانا مقصود ہے۔ کہ اے مسلمانوں صرف قطعی یقینی مسئلہ پر مباہلہ کرنا ظنی۔ اجتہادی مسئلہ پر کبھی مباہلہ نہ کرنا۔ اس لئے حضور ﷺ نے صرف ایک ہی بار مباہلہ کی تیاری فرمائی۔ مناظرے بارہا کئے۔ اور حضور انور ﷺ سے پہلے انبیاء کرام نے مناظرے کئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مناظرہ نمرود سے تو قرآن کریم میں مذکور ہے مگر مباہلہ کسی رسول نے نہ کیا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے نجرانی عیسائیوں کو اس مباہلے کی دعوت دی اور یہ آیت انہیں سنائی وہ بولے کہ ہمیں تین دن کی مہلت دی جائے ہم اس معاملہ میں غور کرلیں ان کی یہ گذارش منظور کی گئی چنانچہ وہ تنہائی میں جمع ہوئے اور بنی نضیر اور بنی قریظہ کو بھی بلایا عاقب نے عبدالمسیح سے کہا کہ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ وہ بولا عیسائیو! تم پہچان چکے کہ محمد رسول اللہ ﷺ سچے رسول ہیں اگر تم نے ان سے مباہلہ کیا تو سب ہلاک ہو جاؤ گے اگر اپنا دین قائم رکھنا ہے تو مباہلہ نہ کرو گھر لوٹ چلو۔ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کی خبر توریت میں ہے۔ یہ مشورہ ہونے کے بعد یہ لوگ وقت مقررہ پر حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ ادھر نبی کریم ﷺ اس طرح تشریف لائے کہ حضور ﷺ کی گود میں امام حسین ہیں اور دست مبارک میں امام حسن کا ہاتھ ہے اور فاطمہ زہرہ وعلی المرتضیٰ حضور ﷺ کے پیچھے ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور حضور ﷺ ان سے فرما رہے ہیں کہ جب میں دعا کروں تو تم سب آمین کہنا گویا ادھر پنجتن پاک تھے اور ادھر عیسائیوں کے چودہ سرداران کے ساتھ بہت مخلوق عیسائیوں کے سردار نے ان حضرات کو دیکھ کر کہا کہ اے عیسائیو! میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ لوگ اللہ سے پہاڑ ہٹانے کو کہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا سے پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دے۔ خدا کے لئے ان سے مباہلہ نہ کرو۔ ورنہ قیامت تک روئے زمین پر کوئی نصرانی باقی نہ رہے گا۔ آخر کار انہوں نے عرض کیا کہ مباہلے کی ہماری رائے نہیں اور ہم آپ سے جزیہ پر صلح کرتے ہیں کہ ہر سال آپ کو دو ہزار جوڑے، تینتیس زرہ، تینتیس اونٹ اور چونتیس گھوڑے دیا کریں گے۔ حضور ﷺ نے قبول فرمایا۔ اور فرمایا کہ قسم رب کی نجران والوں پر عذاب قریب ہی آ گیا تھا اگر وہ مباہلہ کرتے تو بندر سور بن جاتے۔ اور ان کا جنگل آگ سے بھڑک اٹھتا۔ اور نجران کے چرند پرند تک نیست و نابود ہو جاتے بلکہ ایک سال کے اندر روئے زمین کے عیسائی ہلاک ہو جاتے۔ (خزائن العرفان و روح المعانی و کبیر وغیرہ) تفسیر کبیر نے فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد ہی حضور ﷺ نے اپنے کمبل شریف میں حضرات حسنین و فاطمہ زہرہ و علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کو داخل فرما کر دعا کی کہ مولیٰ یہ میرے اہل بیت ہیں انہیں خوب

سورۃ النساء

شرح: ہم مقدمہ قرآن کریم میں سورۃ، آیت، رکوع، منزل کا فرق بیان کر چکے ہیں، ہجرت سے پہلے جو سورتیں یا آئتیں اتریں، انہیں مکی کہا جاتا ہے بعد ہجرت والی مدنی کہلاتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مکی مدنی ہونا محبوب الکل ﷺ کی صفت ہے، مگر ان کی وجہ سے قرآن کریم مکی مدنی ہو جاتا ہے، جیسی جڑ، ویسی شاخیں اور پھل پھول، حق یہ ہے کہ ساری سورۂ نساء مدنی ہے سوائے اس آیت کریمہ کے اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ الخ (النساء: ۵۸) اور اس میں بھی گفتگو ہے کہ یہ آیت مدنی ہے یا مکی، جو اسی آیت کی تفسیر میں عرض کی جائے گی، بعض مفسرین نے فرمایا کہ آیت **کلالہ** بھی مکی ہے، مگر یہ بھی قوی نہیں، بخاری شریف میں ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سورۂ بقرا اور نساء کی جو آیت بھی اتری میری موجودگی میں اتری، میں حضور انور ﷺ کے پاس تھی، اور ظاہر ہے کہ آپ ام المومنین بعد ہجرت ہی حضور انور ﷺ کے پاس تھیں، کوفی قراء کے نزدیک اس میں ایک سو چھہتر آئتیں ہیں، شامیوں کے نزدیک ایک سو ستتر، باقی قراء کے ہاں ایک سو پچھتر، یہ اختلاف دو آیتوں کی وجہ سے پڑا، ایک اَنْ تَضِلُّوا السَّبِیْلَ (النساء: ۴۴) اور دوسری فَیُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا (النساء: ۱۷۳) کوفی لوگ پہلی کو ایک ہی آیت مانتے ہیں، شامی دوسری آیت، اور باقی قراء فرماتے ہیں کہ وہ دونوں ایک ہی آیت کا جز ہیں (تفسیر روح المعانی)

تعلق: سورۂ نساء کو سورۂ آل عمران سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** سورۂ آل عمران میں دو بیبیوں کا ذکر تھا، عمران کی بیوی حنہ اور عمران کی بیٹی مریم، اسی لئے اس کا نام سورۂ آل عمران تھا، اور اس سورت میں عام عورتوں کے احکام کا تذکرہ، گویا خاص بیبیوں کے ذکر کے بعد عام بیبیوں کا ذکر ہے، **دوسرا تعلق:** سورۂ آل عمران میں غزوۂ احد کا تفصیلی ذکر تھا، اس سورۃ میں اسی غزوہ کا تتمہ بیان ہوگا فَمَا لَكُمْ فِی الْمُنٰفِقِیْنَ فِئَتَیْنِ الخ (النساء: ۸۸) میں گویا اصل واقعہ کے بعد تکملہ کا ذکر ہے، **تیسرا تعلق:** سورۂ آل عمران میں غزوۂ احد کے بعد والے غزووں بدر صغریٰ (غزوۂ حمراء الاسد) وغیرہ کا اجمالی ذکر تھا، جیسے اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ الخ (آل عمران: ۱۷۲) اس سورۃ میں ان غزوات کا بقیہ مذکور ہوگا وَلَا تَهِنُوْا فِی ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ (النساء: ۱۰۴) تالیف ابن مسعود میں سورۂ نساء آل عمران سے پہلے ہے، مگر تالیف متواتر میں بعد میں، ہماری عرض و گذارش سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ سورۂ نساء بعد ہی میں ہونی چاہیے، (روح المعانی)

نواسے بھی تو وصیت میں صرف پوتے داخل ہوں گے نہ کہ نواسے (احکام القرآن) **چھٹا فائدہ:** کفار سے ضروریات کے وقت مباہلہ کرنا حضور علیہ السلام کی سنت ہے۔ مگر مباہلہ صرف کفار سے کیا جائے اور یقینی عقائد کے بارے میں ہو ظنی مسائل پر نہیں ہو سکتا (ماخوذ از روح المعانی) دنیاوی جھگڑوں اور ظنی مسائل پر مباہلہ نہیں کر سکتے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جبکہ ابھی جسم آدم میں سننے، سمجھنے کی طاقت نہ تھی تو کُن کس سے کہا گیا؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں کُنْ فرمانے سے مراد آدم علیہ السلام کی ہستی چاہنا ہے۔ اور آپ کی پیدائش کا ارادہ کرنا ہے۔ دوسرا یہ کہ یہاں کن فرمانا ہی مراد ہے۔ اور رب تعالیٰ اپنی ساری مخلوق پر احکام نافذ فرماتا ہے۔ اور سب اس کے فرمان پر عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ طوفان نوح کے موقعہ پر آسمان سے فرمایا تھا یَا سَمَآءُ اَقْلِعِیْ (ھود: ۴۴) اور زمین سے فرمایا تھا یَآ اَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَ کِ (ھود: ۴۴) اور پہاڑوں سے فرمایا تھا یَا جِبَالُ اَوِّبِیْ (سبا: ۱۰) غرضیکہ یہاں بھی رب نے آدم علیہ السلام کی مٹی سے یہ فرمایا۔ رب تعالیٰ کی عطا سے اس کے بعض بندے بھی عالم کی چیزوں کو حکم دیتے ہیں۔ اور وہ چیزیں ان کی اطاعت کرتی ہیں۔ رب تعالیٰ حضرت سلمان علیہ السلام کے بارے میں فرماتا ہے تَجْرِیْ بِاَمْرِہٖ (انبیاء: ۸۱) یعنی آپ کے حکم سے ہوا چلتی تھی۔ ایک بار حضور غوث پاک نے دجلہ کی طغیانی کے موقعہ پر فرمایا کہ اے دجلہ میرے اس قائم کردہ مقام سے آگے نہ بڑھنا چنانچہ وہ آگے نہ بڑھا نبی علیہ السلام نے مرگی کی بیماری سے خطاب فرمایا۔ کہ اے اللہ کے دشمن نکل جا میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس فرمان سے بیمار کو قے ہوئی۔ اور ایک کالا کیڑا اس کے منہ سے نکلا بیمار کو شفاء ہوگئی غرض کہ ساری چیزوں میں حواس ہیں جن سے وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے مقبولوں کی بات سنتی ہیں۔ اور اطاعت کرتی ہیں۔ **دوسرا اعتراض:** حضور علیہ السلام نے اس مباہلہ میں اپنی اولاد و علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو داخل کیوں فرمایا؟ **جواب:** تاکہ اس سے آپ کا پورا یقین ظاہر ہو جائے اور جزم ثابت ہو کیونکہ انسان اور اپنی اولاد کے لئے اس وقت بددعا کرتا ہے جب اسے کسی شی کا پورا یقین ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اگر میری بات صحیح نہ ہو تو میرے بال بچے ہلاک ہو جائیں۔ **تیسرا اعتراض:** مباہلہ کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ اگر عیسائی مباہلہ کر لیتے تو ہلاک ہو جاتے حالانکہ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ وَاَنْتَ فِیْھِمْ (احزاب: ۳۳) کہ آپ کی موجودگی میں اللہ انہیں عذاب نہ بھیجے گا ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس آیت میں عام ظاہری عذاب مراد ہے جیسا پچھلی امتوں پر آیا جس سے سارے کفار تباہ ہو گئے ورنہ خاص عذاب اب بھی آ سکتا ہے۔ اور قرب قیامت آئے گا بھی؟ (تفسیر کبیر) **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت علی مرتضیٰ تمام صحابہ سے افضل ہیں اور وہ ہی حضور علیہ السلام کے بعد خلافت کے مستحق۔ کہ حضور علیہ السلام نے انہیں اپنا نفس فرمایا۔ کیونکہ انفسنا سے حضور علیہ السلام کی ذات مراد تو ہو سکتی نہیں۔ کہ کوئی بھی اپنے آپ کو نہیں بلاتا تو لامحالہ سیدنا علی ہی مراد ہوں گے۔ اور یقینی بات ہے کہ اس نفس کے حقیقی معنی مراد نہیں۔ بلکہ اس سے مثل اور مساوی مراد ہے اور جو نبی کا مساوی ہو وہ ہی خلافت کا مستحق ہے جیسے حضور علیہ السلام کی موجودگی میں کوئی خلافت کا حق دار نہیں۔ ایسے ہی مثل حضور علیہ السلام کی موجودگی میں کوئی خلافت کا مستحق نہیں؟ (شیعہ) **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ یہاں نفس سے مراد سیدنا علی نہیں بلکہ خود حضور

کچھ تفصیل بیان ہو رہی ہے، کہ حقوق العباد کا لحاظ رکھو، کیونکہ درستی معاملات بھی تقویٰ کا رکن اعلیٰ ہے، **تیسرا تعلق:** گذشتہ آیت میں فرمایا گیا تھا کہ اللہ جلد حساب لینے والا ہے، اب فرمایا جارہا ہے کہ اپنے آپس کے معاملات صاف رکھو تاکہ حساب میں آسانی ہو، گویا حساب کا ذکر پہلے تھا، اب تیاری حساب کا ذکر بعد میں ہو رہا ہے،

تفسیر

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ، یا پکارنے کے لئے آتا ہے، لیکن اگر نبیوں کو پکارا جائے، تو اظہار کرم مقصود ہوتا ہے، کفار کو پکارا جائے تو اظہارِ غضب، ورنہ سوتوں کو جگانے اور غافلوں کو بیدار کرنے کے لئے، یہاں تیسرے مقصد میں استعمال ہوا، اَلنَّاسُ انسان کی جمع ہے اصل میں اُنَاس تھا، الف لام آنے پر ہمزہ گر گیا، لام نون میں مدغم ہوگیا، اس کی تحقیق پہلے پارہ میں کی جاچکی ہے، سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اَلنَّاسُ میں خطاب اہل مکہ سے ہوتا ہے، اور اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں خطاب اہل مدینہ سے، مگر بقیہ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اَلنَّاسُ میں سارے ہی مکلف انسانوں سے خطاب ہے، کیونکہ اس میں الف لام استغراقی ہے جو سارے افراد کو گھیرتا ہے، نیز آگے ذکر ہو رہا ہے کہ تم کو ایک جان سے پیدا کیا، اور ظاہر ہے کہ اس ایک جان سے سارے ہی انسان پیدا ہوئے ہیں نہ کہ محض مکہ والے، نیز یہاں تقویٰ اور پرہیزگاری کا حکم دیا گیا ہے جو سارے انسانوں پر لازم ہے، نہ کہ صرف مکہ والوں پر (تفسیر کبیر) حق یہ ہے کہ اس سے تا قیامت انسان مراد ہیں، گذشتہ انسان اس میں داخل نہیں (تفسیر کبیر وروح المعانی) اگرچہ بعض نے یہ بھی فرمایا کہ اس میں گذشتہ انسان بھی داخل ہیں، مگر یہ قوی نہیں کہ اعمال زندہ ہی کریں گے نہ کہ مردے، اگرچہ جنات پر بھی تقویٰ وعبادت لازم ہے مگر چونکہ انسان اصل مقصود ہے جنات تابع، نیز انسان کے لئے تقویٰ پر جنت ہے، جنات کے لئے نہیں، نیز انسان تقویٰ پر وہ اعمال کرسکتا ہے جو جنات نہیں کرسکتے، اس لئے صرف انسانوں سے خطاب ہوا، **اتَّقُوْا رَبَّكُمُ**، اِتَّقُوْا اگرچہ مذکر کا صیغہ ہے، مگر عورتیں بھی اس میں شامل ہیں یا اس لئے کہ عورتیں مردوں کے تابع ہیں، یا اس لئے کہ ناس سب کو شامل تھا، عورت ہو یا مرد مگر ناس تھا مذکر اس لئے اتَّقُوْا مذکر ارشاد ہوا، رب فرما کر اپنا استحقاق عبادت بیان ہوا، کہ چونکہ ہم تم کو پالتے ہیں، ہمارا تم پر حق ہے کہ تم ہم سے ڈرو، خوف رکھو، خیال رہے کہ کفار کے لئے تقویٰ ایمان ہے، اور مومنوں کا تقویٰ ہے نیک اعمال، اس لئے اتَّقُوْا میں کافر و مومن سب ہی سے خطاب ہے،

الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ، یہ عبارت رَبَّكُمُ کی صفت ہے، اس میں رب تعالیٰ کے دوسرے احسان کا ذکر ہے، یعنی ہم کو نیستی سے ہست کرنا، حق یہ ہے کہ خلق بمعنی ایجاد کرنا ہے نہ کہ صورت بخشنا یا بنانا، کُمْ میں سارے انسانوں سے خطاب ہے، اور نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں کہ وہ ہی ابوالبشر ہیں، جو لوگ کہتے ہیں کہ ہزارہا آدم گذرے، ابوالبشر صرف یہ آدم ہیں جو ہمارے باپ ہیں غلط ہے کہ وہ فرضی ہزارہا آدم بھی آدمی تھے، وہ کس کی اولاد میں تھے، اگر کسی کی اولاد سے نہ تھے، تو حضرت آدم علیہ السلام ابوالبشر نہ رہے، بعض بشر ان کی نبوت سے خارج ہوگئے (تفسیر روح المعانی) ہمارے حضور انور ﷺ کی ولادت آدم علیہ السلام سے چھ ہزار سات سو پچاس سال بعد ہے، اس فرمان عالی میں اشارہ اس جانب ہے کہ انسان کو حسب نسب پر فخر نہ چاہیے، دوسرے مسلمانوں کو ذلیل نہ سمجھنا چاہیے کہ سب ایک بشر سے بنے ہیں وَ

جناب حسین سے کیسے درست ہوا وہ بھی تو اس غصب کا نتیجہ تھیں۔ ذرا ہوش کرو بغض صحابہ میں اہل بیت پر کیوں تبرے کرتے ہو۔ **ساتواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور انور صلی اللہ وسلم کی بیٹی حضرت فاطمہ زہرہ ہی تھیں چار بیٹیوں والی روایات غلط ہیں۔ ورنہ آپ چاروں بیٹیوں کو مباہلہ میں لے جاتے صرف فاطمہ زہرہ کو کیوں لے گئے؟ **جواب:** حضور ﷺ کی بیٹیاں چار ہیں۔ زینب' رقیہ' کلثوم' فاطمہ زہرہ' رب تعالیٰ فرماتا ہے یَاۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَبَنَاتِکَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ (احزاب:۵۹) بنات جمع فرمانے سے معلوم ہوا کہ حضور کی لڑکیاں چند ہیں کیونکہ مسلمان عورتوں کا ذکر تو آگے آ رہا ہے۔ یہاں صرف فاطمہ زہرہ کو لیجانے کی تین وجہ ہوسکتی ہیں یا تو مباہلہ کے وقت دوسری لڑکیاں وفات پا چکی تھیں یا ابھی مکہ معظمہ سے آئی نہ تھیں یا اس لئے کہ فاطمہ زہرا زیادہ پیاری تھیں کہ سب سے چھوٹی تھیں نیز ان ہی کے بچپن میں حضرت خدیجہ نے وفات پائی تھی۔ **آٹھواں اعتراض:** بعض دفعہ کفار نے حضور ﷺ کے مقابل مباہلہ کیا مگر ان پر عذاب نہ آیا رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ کَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِکَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ (انفال:۳۲) اے اللہ اگر قرآن سچا ہو تو ہم پر پتھر برسا دے پتھر نہ برسے ممکن تھا کہ یہاں بھی مباہلہ ہوتا اور عذاب نہ آتا؟ **جواب:** وہ مباہلہ نہ تھا مباہلے کے معنی وہ ہیں جو تفسیر میں عرض کیے گئے سرداران قریش قوم پر اپنی پختگی ظاہر کرنے کے لئے صرف منہ سے یہ دعائیں کر لیتے تھے دل ان کے کانپتے تھے اور حضور ﷺ کے مقابل نہ تھے اس کے باوجود جب بھی ان پر مصیبت آتی تو حضور ﷺ سے دعا کراتے۔ اس کی صدہا مثالیں موجود ہیں غرضیکہ اس دعا کو مباہلے سے کوئی تعلق نہیں۔

تفسیر صوفیانہ

انسان کو مٹی سے بنانے میں چند حکمتیں ہیں۔ (۱) مٹی میں تواضع اور انکسار ہے۔ چاہیے کہ انسان بھی متواضع اور منکسر ہو۔ (۲) مٹی میں عیب پوشی ہے۔ کہ وہ ہر چیز کے لئے آڑ بن جاتی ہے چاہیئے کہ انسان بھی عیب پوش ہو۔ (۳) انسان کو زمین کی خلافت کے لئے پیدا کیا گیا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (بقرہ ۳۰) لہٰذا اسے مٹی سے بنایا۔ تاکہ اس کو زمین سے قوی تعلق رہے۔ (۴) اس میں رب کی قدرت کا اظہار کیا ہے کہ شیاطین کو آگ سے بنایا جس میں روشنی اور نور ہے۔ مگر انہیں گمراہی کی اندھیریوں میں مبتلا کر دیا۔ فرشتوں کو ہوا سے بنایا۔ جو تمام جسموں سے زیادہ لطیف ہے۔ مگر انہیں پوری قوت عطا فرمائی۔ ورنہ لطافت میں قوت کیسی۔ آدم علیہ السلام کو کثیف اور تاریک مٹی سے بنایا۔ مگر انہیں محبت' معرفت اور ہدایت کا نور بخشا۔ آسمانوں کو رقیق پانی کی موج سے بنایا اور پھر انہیں معلق لٹکا دیا۔ تاکہ پتہ لگے کہ عطائے الٰہی اسباب پر موقوف نہیں۔ نور میں ظلمت اور ظلمت میں نور کو جلوہ گر کر دیتا ہے۔ (۵) مٹی آگ کو بجھا دیتی ہے۔ چونکہ انسان میں حرص' غصہ اور شہوت کی آگ تھی لہٰذا اسے مٹی سے بنایا۔ تاکہ اس آگ کو بجھایا جائے۔ نیز مٹی پانی سے مل کر مختلف صورتیں قبول کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا رب تعالیٰ نے کثیف مٹی کو لطیف پانی سے ملا کر گارا بنایا تاکہ قابل صورت ہو پھر کن فرما کر روح پھونکی۔ جو عالم امر کی چیز ہے۔ تاکہ انسان عالم خلق اور عالم امر کا مجموعہ ہو اور صورتاً بشر ہو اور سیرتاً فرشتہ۔ اس لئے فرمایا خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ یہ اس کی صورت کا بیان ہے۔ اور ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ اس کی سیرت کا تذکرہ انبیائے کرام چونکہ بشریت کے اعلیٰ طبقہ میں

یقین رکھو کہ ہم تمہارے اور تمہارے ہر کام کے حافظ ہیں، کوئی چیز ہمارے علم سے باہر نہیں،

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے دو سورتوں کو اس مضمون سے شروع فرمایا، ایک سورۂ نساء کو جو اول قرآن کی چوتھی سورت ہے، دوسرے سورۂ حج کی جو آخری نصف کی چوتھی سورت ہے، مگر یہاں مبدے کا ذکر فرما کر تقویٰ کا حکم دیا گیا کہ فرمایا گیا خَلَقَكُمْ اور سورۂ حج میں منتہی کا ذکر ہوا کہ ارشاد ہوا اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ (حج:۱) پہلی صورت میں مبدے کا ذکر ہے آخری سورت میں منتہاء کا ارشاد ہوا کہ اے سارے انسانو! اس سے ڈرو جو تمہارا پالنہار ہے، جس کی پرورش سے تم کبھی مستغنی نہیں، جس نے تم سب مختلف انسانوں کو ایک شخص آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پیدا کیا، اس کی قدرت تو دیکھو، کہ اس نے ایک آدم سے پہلے ان کی ایک بیوی کو اس طرح پیدا کیا کہ ان کی پسلی سے انہیں بنا دیا، پھر ان دونوں آدم وحواء علیہما السلام سے بہت سے مرد وعورت بکھیر دیئے پھیلا دیئے کہ باوجود اصل ایک ہونے کے یہ لوگ رنگ وروپ، مزاج، عادات، غذا، لباس، زبان وطرز معاشرت میں جداگانہ ہیں، دوسرے جانوروں کی طرح یک شکل، یک زبان ویک غذا نہیں، جو رب تعالیٰ ایک جان سے اتنی رنگ برنگی مخلوق پیدا کر سکتا ہے وہ کل قیامت میں انہیں مٹی سے دوبارہ نکال سکتا ہے، لہٰذا ہر وقت اس سے ڈرتے رہو، جس کے نام پر فقیر امیروں سے بعض انسان بعض سے مانگا کرتے ہیں جب کسی سے کچھ مانگنا ہو تو کہتے ہیں اللہ کے لئے اللہ کے نام پر مجھے یہ دو، اور آپس کی قرابت داریوں کا بہت لحاظ رکھو، صلہ رحمی کرو، قطع رحمی نہ کرو کہ اس کی سخت سزا ہے، خیال رکھو کہ اللہ تمہارے کاموں کا، تمہارے حالات کا حافظ ہے ہر حال میں تمہیں دیکھ رہا ہے، جب اس کا علم وحکمت اتنا وسیع ہے، تو اس کا مجرم بجز اس کے کرم کے اور کسی طرح چھوٹ نہیں سکتا، لہٰذا تمہیں چاہیے کہ اس کے کرم کے حقدار بن کر اس کی بارگاہ میں حاضر ہو،

صلہ رحمی

مسلمانوں پر جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ضروری ہے، ایسے ہی اپنے قرابت داروں کے حق ادا کرنا بھی نہایت ضروری ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (الاسراء:۲۳) یعنی رب تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا کہ خدا تعالیٰ کے سواء کسی کو نہ پوجو، اور ماں باپ سے بھلائی کرو، اور فرماتا ہے اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ (محمد:۲۲) اور فرماتا ہے وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ (النساء:۳۶) مسلم بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مرفوعاً روایت کی، فرماتے ہیں ﷺ رحم عرش سے متعلق ہے پکار رہا ہے جس نے مجھے جوڑا، اللہ اسے اپنے سے ملائے گا، اور جس نے مجھے توڑا، اللہ اسے جدا کر دے گا، مسلم وبخاری نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جو چاہے کہ اس کے رزق وعمر میں برکت ہو، وہ رشتہ داروں سے سلوک کرے، مسلم وبخاری نے حضرت جبیر ابن مطعم سے روایت کی، فرمایا نبی کریم ﷺ نے قاطع رحم جنت میں نہ جائے گا، امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کے نام پر تم سے مانگے، اسے ضرور دو، اور جو قرابت

اے ملحد خجندی ریش بزرگ داری　　　کز غایت بزرگی دہ ریش می تواں گفت

اس شعر کا شیخ کے قلب پر بہت اثر پڑا۔ کچھ لبوں کو جنبش دی لب ہلتا تھے کہ شاعر وہیں گر کر مر گیا اسی لئے فرماتے ہیں کہ عاقل وہ جو بزرگوں کو اذیت نہ دے کیونکہ اس کا الٹا اثر اس پر پڑتا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (فاطر: ۴۳) کسی شاعر نے کیا خوب کہا

نائے کند نالہ بدیں قول راست　　　از نفس پیر بترس اے جواں

(روح البیان)

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ عذاب الٰہی بندگان خدا کی ہی بے ادبی سے آتا ہے۔ فرعون نے صدیوں دعوئے خدائی کیا مگر جب تک موسیٰ علیہ السلام کی بددعا نہ لی ہلاک نہ ہوا۔ دیکھو نجران کے عیسائیوں نے رب تعالیٰ کو عیب لگایا مگر عذاب نہ آیا اگر حضور علیہ السلام کی بددعا لے لیتے تو عذاب میں گرفتار ہو جاتے۔ رب غنی ہے مولینا فرماتے ہیں۔

چوں خدا خواہد کہ راز کس درد　　　میلش اندر طعنہ پاکاں دہد

صوفیائے کرام فرماتے ہیں۔

باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

حلیم کے غضب سے اللہ کی پناہ

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ
تحقیق یہ البتہ وہ بیان سچا ہے اور نہیں ہے کوئی معبود سوا اللہ کے اور تحقیق اللہ البتہ وہ
یہ ہی بیشک سچا بیان ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک اللہ ہی
لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ ۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾
غالب حکمت والا ہے پس اگر منہ پھیریں وہ پس تحقیق اللہ جاننے والا ہے فساد پھیلانے والوں کو
غالب ہے حکمت والا پھر اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ فسادیوں کو جانتا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مناظرے کی انتہائی منزل بیان کی گئی یعنی مباہلہ جس سے ضدی انسان بھی ضد چھوڑ دے۔ اب مباہلہ نہ کرنے کا انجام بیان ہو رہا ہے۔ یعنی ترک تعلق اور ضدیوں سے علیحدگی اور انہیں خدا کے سپرد کر دینا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں الوہیت مسیح کے مسئلہ کے متعلق چند شبہات کا جواب دیا گیا تھا اس آیت میں بھی بقیہ شبہات کا جواب دیا جا رہا ہے کہ خدا وہ جو عزیز و حکیم یعنی کامل غلبہ اور علم والا ہو۔ اور چونکہ یہ وصف عیسیٰ علیہ السلام میں نہیں لہٰذا وہ خدا کیسے؟ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں نجرانی عیسائیوں سے مناظرہ و مباہلہ کا ذکر تھا اب اس مناظرہ و مباہلہ کا بہترین نتیجہ بیان ہو رہا ہے۔ کہ اے محبوب علیہ السلام یہ مباہلہ کریں یا نہ کریں۔ آپ کا

اچھا ہے کہ ان سے بقدر رشتہ احسان کئے جائیں، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار پر بھی عبادات وتقویٰ لازم ہے کہ یہاں النَّاسُ فرما کر اِتَّقُوْا کا حکم دیا گیا، حالانکہ کفار پر نہ عبادات لازم ہیں، نہ تقویٰ ضروری، **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ کفار کا تقویٰ و عبادات قبول ایمان ہے جوان پر لازم ہے جیسا مخاطب ویسا تقویٰ، دوسرے یہ کہ کفار پر بھی عبادات وتقویٰ لازم ہے مگر بشرط ایمان، یعنی ان کو حکم ہے کہ ایمان لا کر نماز پڑھو، اسی لئے انہیں قیامت میں ترک عبادات پر بھی سزا ملے گی، قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (مدثر: ۴۳) **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام ایک ہی ہیں اور سارے انسان ان کی اولاد، مگر اثر ابن عباس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے ہر طبقے میں انسان ہیں، ان میں آدم بھی ہیں، نوح بھی اور محمد بھی، تو زمین کے سات طبقوں میں سات قسم کے انسان، ان کے سات آدم، سات نوح، سات محمد، یہ آیت اور وہ اثر ابن عباس مطابق کیونکر ہوں؟ **جواب:** تفسیر روح المعانی وغیرہ مفسرین نے ان جیسے آثار واحادیث کو محض موضوع، روافض کی اختراع وگھڑنت قرار دیا، اگر اس جیسے آثار درست بھی ہوں، تو وہاں ان طبقات میں جو انسان ہیں وہ بھی ان ہی ایک آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، اور ان میں آدم ونوح علیہما السلام جیسے ہادی موجود ہیں نہ کہ حقیقۃً آدم ونوح علیہما السلام، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد: ۷) جیسے زمین کے اس اوپری طبقے میں ہر جگہ انسان آباد ہیں، اگر اور طبقات بھی ہوں تو رب تعالیٰ قادر ہے، **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت حواء بھی آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیٹی اور دوسرے انسانوں کی بہن ہیں، کیونکہ خَلَقَكُمْ میں جب خلق سے مراد بطور نسل پیدا فرمانا ہے تو خَلَقَ مِنْهَا میں بھی بطور نسل پیدائش ہی مراد ہونی چاہیے، **جواب:** قرآن کریم کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ حضرت حواء کی پیدائش آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بطور نسل نہیں، اگر دوسرے انسانوں کی طرح بطور نسل ہوتی، تو ان کے لئے علیحدہ خلق نہ فرمایا جاتا، پہلا خلق کافی ہوتا، نیز پھر ان حواء کو آدم کی زوجہ نہ فرمایا جاتا بلکہ بنت فرمایا جاتا، نیز آگے بَثَّ مِنْهُمَا ارشاد نہ ہوتا کہ ہم نے ان دونوں آدم وحواء سے باقی انسان بنائے، **نوٹ:** خیال رہے کہ نطفہ سے پیدائش نسلی پیدائش ہے، اس کے سواء اور طریقہ سے پیدائش نسلی نہیں، حضرت حواء کی پیدائش پسلی والی ہے نہ کہ نطفے سے نسلی والی، ہاں چونکہ حضرت حواء آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہم جنس تھیں، اسی لئے ان سے نکاح درست ہوا، **چوتھا اعتراض:** حضرت حواء بھی آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرح مٹی سے ہی پیدا ہوئیں، کہ ان کی پسلی سے، یہاں خَلَقَ مِنْهَا میں مِنْ بیان جنس کے لئے ہے، جیسے رب تعالیٰ فرماتا ہے جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (نحل: ۷۲) اور فرماتا ہے خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا (الروم: ۲۱) دیکھو یہاں بھی مِن موجود ہے، مگر ہماری بیویاں ہماری پسلیوں سے پیدا نہ ہوئیں (مرزائی محمد علی صاحب لاہوری) **جواب:** یہ محض غلط ہے، قرآن کریم نے مٹی سے پیدائش صرف آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیان فرمائی، کسی جگہ حضرت حواء کی پیدائش مٹی سے بیان نہ کی، اگر جناب حواء کی پیدائش بھی مٹی ہی سے ہوتی، تو کہیں تو قرآن کریم میں اس کا بھی ذکر ہوتا، حضرت حواء کے لئے جہاں

سے ملا کہ نجران کے عیسائی اس کے خلاف مباہلہ کرنے پر تیار نہ ہوئے اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں کیونکہ کامل غلبہ اور محیط علم اسی کی صفت ہے اور جس میں یہ صفتیں ہوں وہ ہی لائق عبادت ہے عیسیٰ علیہ السلام بلکہ سارے انبیاء کے علم وقدرت رب تعالیٰ کے مقابل کالعدم ہیں۔ لہٰذا وہ خدا کیسے۔ اس بیان سے عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت آفتاب کی طرح ظاہر ہوگئی۔ اگر اب بھی عیسائی قبول حق سے منہ پھیریں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا کہے جائیں۔ تو آپ انہیں رب تعالیٰ کے حوالے کرو۔ یہ فسادی ہیں۔ رب تعالیٰ فسادیوں کو خوب جانتا ہے۔ وہ انہیں سخت سزا دے گا آپ کیوں غم کرتے ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** ضد کا کوئی علاج نہیں اس کا علاج صرف جوتا ہے۔ **دوسرا فائدہ:** دلائل میں نظر نہ کرنا ضد ہے اور ضد فساد اور ضدی اول درجے کا فسادی ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے فَاِنۡ تَوَلَّوۡا کہہ کر انہیں مفسد قرار دیا۔ **تیسرا فائدہ:** دلائل اور رد شبہات اظہار حق کا ذریعہ ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے دلائل وغیرہ بیان فرما کر ارشاد فرمایا اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ **چوتھا فائدہ:** کوئی مخلوق کسی صفت میں رب تعالیٰ کی مثال نہیں۔ کیونکہ صفات سے ذات کا پتہ لگتا ہے اسی لئے عزیز وحکیم سے رب تعالیٰ کی توحید ثابت کی گئی۔ **پانچواں فائدہ:** ہمیشہ بددعا سے بچنا چاہئے خصوصاً تین شخصوں کی بددعا بڑی خطرناک ہے (۱) اپنے محسن کی جیسے ماں باپ استاد شیخ وغیرہ (۲) مظلوم کی (۳) نبی کی۔ دیکھو نجران کے عیسائی جب حضور علیہ السلام کی بددعا سے محفوظ رہے تو ان پر عتاب آیا مگر دنیوی عذاب نہ آیا۔ **چھٹا فائدہ:** مقبول بندوں کا سیف زبان ہونا اور جو ان کے منہ سے نکلے۔ رب وہ کردے یہ ایسا مسئلہ ہے جس کے کفار بھی قائل تھے۔ دیکھو نجرانی عیسائیوں نے ان پنجتن پاک کے چہروں کو دیکھ کر ہی کہہ دیا کہ ان کی بددعا سے بچو یوسف علیہ السلام نے قیدی باورچی وساقی سے فرمایا قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ (یوسف:۴۱) موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے سامری فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ (طٰہٰ:۹۷) چنانچہ سامری دیوانہ کتے کی طرح خطرناک ہوگیا کہ جو اسے چھو جائے تو وہ بھی اور سامری بھی بیمار پڑ جائے۔ اب جو کلمہ گو مسلمان بزرگوں کی صیف زبانی میں شک کرے۔ وہ ان عیسائی کفار سے بدتر ہے۔ **ساتواں فائدہ:** حضرت فاطمہ زہرا حسنین کریمین وعلی مرتضیٰ کا توسل قبول دعا کے لئے اکسیر اعظم ہے۔ انشاء اللہ ان کے وسیلہ سے مانگی ہوئی دعا رد نہیں ہوتی۔ دیکھو حضور ﷺ نے اپنی مباہلہ والی دعا پر آمین کہنے کے لئے ان حضرات کو ہی منتخب فرمایا۔ حضور ﷺ کے اس انتخاب میں ہم امتیوں کو ان توسل کی تعلیم ہے۔ حضرت عمر نے جناب عباس کے توسل سے دعا بارش فرمائی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: حضور ﷺ رحمت عالم ہیں اور آپ نے کبھی کسی کے لئے بددعا نہ فرمائی حتیٰ کہ طائف والوں کے لئے بھی جنہوں نے آپ پر بہت ظلم کئے۔ پھر یہاں نجرانیوں کے مقابل بددعاء کی کیوں تیاری فرمائی۔ **جواب:** حضور ﷺ نے اپنے ذاتی معاملات میں کسی پر بددعا نہ کی۔ ظلم سہے کچھ نہ فرمایا مگر دینی معاملات میں کسی کی رعایت بھی نہ کی۔ وہ چونکہ دین کے دشمن تھے [illegible] تیاری فرمائی [illegible] بھی فرمایا اور موذی کو ہلاک کرنا عین

کی حلت کا وقت بعدِ قیامت ہے، اگر کسی انسان نے انہیں چھوا ہوتا، تو آیت کریمہ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ (رحمٰن:۵۶) کیسے درست ہوتی، **نواں اعتراض:** آخر اس میں حکمت کیا تھی کہ اس وقت حوریں ہونے کے باوجود حضرت حواء پیدا کی گئیں اور حوریں علیحدہ رکھی گئیں، **جواب:** اس کی حکمت بالکل ظاہر ہے کہ حوریں صرف خدمت وراحت کے لئے ہیں نہ کہ نسل کی پیدائش کے لئے، کیونکہ نسل کی پیدائش اپنی ہم جنس بیوی سے ہوسکتی ہے، اور حوریں بشر یا انسان نہیں، وہ تو جنت کے زعفران سے پیدا ہوئیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے (روح المعانی) اس لئے جنت میں نسل نہ ہوگی، صرف جزاء ہوگی، اور اس وقت نسل کی ضرورت تھی کہ دنیا حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسل سے ہی پیدا ہونے والی تھی، اسی نسل کے لئے ان ہی کی ہم جنس بیوی حضرت حواء پیدا ہوئیں، آج بھی انسان کا نکاح جنات یا گائے بھینس جانور سے نہیں ہوسکتا، کہ اس نکاح سے نسل حاصل نہیں ہوسکتی، **دسواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرح رحموں سے بھی ڈرنا چاہیے کہ وَ الْاَرْحَامَ لفظ اللہ پر معطوف ہے، رحم سے کیا ڈرنا؟ **جواب:** اس کا جواب تفسیر سے معلوم ہوگیا کہ والارحام پوشیدہ فعل کا مفعول ہے اور جملہ جملہ اِتَّقُوْا پر معطوف، تب تو کوئی اعتراض ہے ہی نہیں، اور اگر ارحام لفظ اللہ پر معطوف بھی ہو، تو مطلب واضح ہے، کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور قطع رحم یعنی قرابتداروں پر ظلم سے بچو، ڈرو کہ اس کا عذاب سخت ہے،

تفسیر صوفیانہ

ہر کثرت کی انتہاء وحدت پر ہے، آسمان میں کروڑوں تارے مگر ایک سورج سے منور درخت میں ہزار ہا پتے وشاخیں مگر ان کا مرکز ایک جڑ، جسم میں بہت سے اعضاء مگر سب کا اصل ایک دل، ملک میں لاکھوں آدمی، مگر ان کا بادشاہ یا صدر ایک ریل میں بہت سے ڈبے مگر انجن ایک، مخلوق کروڑوں مگر خالق ایک، پھر اس ایک مبداء فیاض سے پہلا فیض لینے والا مستفیض بھی ایک جڑ سے ایک تنہ پہلے فیض لیتا ہے اس سے دوسرے، سورج سے پہلا مستفیض چاند، ایک بادشاہ سے پہلا مستفیض وزیر اعظم ایک دل سے پہلا فیض لینے والا دماغ ہے، تو چاہیے عالم انسان کی اصل ایک ہی ہو، اس ہی اصل کا نام آدم ہے، اور اس ایک فیاض سے پہلا فیض لینے والا بھی ایک، اس کا نام حواء ہے، یہ تو عالم اجسام میں تھا، عالم انوار میں سارے عالم کی اصل ایک نور محمدی و حقیقت محمد یہ (ﷺ) ہے، اور اس مبداء فیاض سے پہلا فیض لینے والا ایک ہے یعنی حقیقت صدیقیہ جیسا کہ روایات میں ہے، دیکھو ہماری کتاب ''رسالہ نور'' اب ذرا اپنے میں غور کرو تو ہمارا دل گویا آدم ہے، دماغ یا نفس گویا حواء، ان دونوں کے اختلاط سے کروڑوں اعمال پیدا ہوئے، جن میں دینی اعمال گویا مرد ہیں، دنیوی مشاغل گویا عورتیں، ہماری شخصی زندگی یہ دنیا ہے، یہاں ارشاد ہورہا ہے کہ اس رب سے ڈرتے رہو جو وحدت سے کثرت اس طرح پیدا فرماتا ہے، اور دل ونفس سے قطع تعلق نہ کرو، ان سے بہت اچھے اعمال کے پھل پیدا ہوں گے، اللہ تعالیٰ تمہیں ہر وقت دیکھ رہا ہے اس سے ڈرتے رہو، جو کچھ کرو اس سے ڈرتے ہوئے کرو، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ تقویٰ کے معنی ہیں نفس کو اخروی نقصان دہ چیزوں سے بچانا، تقویٰ تین قسم کا ہے، کفر وشرک سے اپنے کو بچانا تقویٰ عوام ہے، گناہوں سے بچانا تقویٰ خواص اغیار سے بچا کر یار تک نفس کو پہنچانا تقویٰ خاص الخاص، اللہ تعالیٰ رقیب ہے، تو انسان کو چاہیے کہ مراقبہ میں مشغول رہے کہ اپنے ہر حال پر کڑی نگرانی رکھے،

سوا اللہ کے پس اگر منہ پھیریں وہ تو کہہ دو گواہ رہو اس کے کہ ہم مسلمان ہیں
اللہ کے سوا پھر اگر وہ نہ مانیں تو کہہ دو تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں
يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ
اے کتاب والو کیوں جھگڑتے ہو تم بیچ ابراہیم کے اور نہ اتاری گئی توریت
اے کتاب والو ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو توریت و انجیل
وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾
اور انجیل مگر پیچھے ان کے کیا پس نہیں عقل رکھتے تم
تو نہ اتری مگر ان کے بعد تو کیا تمہیں عقل نہیں

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مناظرانہ رنگ میں اہل کتاب سے خطاب تھا اب تبلیغی رنگ میں انہیں دعوت اسلام دی جا رہی ہے۔ کیونکہ بعض مناظرے سے ہدایت پر آتے ہیں اور بعض نرمی سے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں صراحتاً عیسائیت کی تردید تھی۔ اب نہایت لطیف پیرایہ میں عیسائیت کے بطلان اور اسلام کی حقیقت کا بیان ہے کہ عیسائیت کا کلمہ یکساں نہیں اور عیسائیوں کے نزدیک سب بندے ایک حال میں نہیں۔ کوئی معبود ہے کوئی عابد۔ اسلام میں بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بندوں کے احکام بندگی یکساں ہیں گویا صریحی تردید کے بعد اب لطیف تردید ہو رہی ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں اہل کتاب کے سارے شبہات کے نفیس جواب دیئے گئے۔ اب ان کے اس شبہ کا جواب دیا جا رہا ہے جسے وہ مجبور ہو کر اپنے بچاؤ کے لئے پیش کرتے تھے وہ یہ کہ عیسائیت بری ہو یا بھلی مگر چونکہ ابراہیم علیہ السلام عیسائی تھے۔ لہٰذا عیسائی ہونا سنت ابراہیمی ہے۔ غرضیکہ پچھلی آیتوں میں بھی ان کے شبہات کا جواب ہی تھا اور اس میں بھی۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں دین عیسوی' موسوی کی برتری بیان کی گئی تھی کہ عیسائیوں' یہودیوں نے موجودہ عیسائیت اور یہودیت میں ایسے برے عقیدے و اعمال داخل کر لئے ہیں اب دین اسلام کی برتری کا ذکر ہے۔ کہ اس دین میں عقائد و اعمال میں ایسی بے مثالی برابری ہے۔ کہ سبحان اللہ تا کہ اہل کتاب عیسائیت و یہودیت سے متنفر ہو کر اسلام قبول کریں۔ گویا تبلیغ اسلام کے ایک رکن کا ذکر پہلے تھا۔ اور دوسرے رکن کا ذکر اب ہے۔ **پانچواں تعلق:** اس سے پہلی آیت میں اسلام کی حقانیت کا ثبوت اس کے اعمال و عقائد دکھا کر کیا گیا ہے۔ اور دوسری آیت میں اسلام ہی کی حقانیت اس طرح بیان ہو رہی ہے کہ یہ دین مطابقت ملت ابراہیمی کے ہے۔ یہ مطابقت ملت ابراہیمی اسلام کی حقانیت کی پوری پوری دلیل ہے۔

شانِ نزول

نجران کے عیسائی جن کا واقع پہلے معلوم ہو چکا ان کا یہود مدینہ سے مناظرہ ہوا۔ ان عیسائیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام

تفسیر

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰٓی اَمْوَالَهُمْ اٰتُوا اِیْتَاءٌ سے بنا بمعنی دینا، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (بقرہ:۱۱۰) اس میں خطاب یتیموں کے والیوں سے ہے جو یتیم بچوں کی پرورش کریں اوران کا مال میراث سنبھالیں، اَلْیَتٰمٰی یتیم کی جمع ہے، اس طرح کہ اولاً یتیم کی جمع یَتْمٰی بنی، پھر یَتْمٰی کی جمع یَتٰمٰی جیسے اَسِیْر کی جمع اَسْرٰی پھر اس کی جمع اُسَارٰی ایسے ہی ندیم کی جمع اولاً نَدْمٰی پھر نَدَامٰی، ورنہ فعیل کی جمع بروزن فعالی نہیں آتا بلکہ بروزن فعال آتی ہے یا بروزن فعلاء، جیسے کَرِیْم کی جمع کِرَام یا شہید کی جمع شُهَدَاء، یتیم یَتْمٌ سے بنا بمعنی اکیلا یا علیحدہ ہونا، سیپ کے اکیلے موتی کو در یتیم کہا جاتا ہے، اور میدان میں دوسرے پہاڑوں سے ہٹے ہوئے پہاڑ کو جبل یتیم بولتے ہیں، اصطلاح میں وہ نابالغ بچہ جس کا باپ مرگیا ہو یتیم کہلاتا ہے، اور وہ جانور کا چھوٹا بچہ جس کی ماں مرجائے یتیم ہے کہ وہ اپنے مددگار و معاون سے علیحدہ ہو گیا، اکیلا رہ گیا، بلوغ کے بعد یتیمی جاتی رہتی ہے، یہاں اَلْیَتٰمٰی میں الف لام عہدی ہے، اور اس سے وہ یتیم مراد ہیں جن کے پاس مال ہو والی کے قبضہ میں، اموال جمع فرما کر یہ بتایا کہ یتیموں کے ہر قسم کے منقول وغیر منقول مال ان کے حوالہ کرو، خیال رہے کہ یتیم کو اس کا مال بعد بلوغ دیا جائے گا، اب اس وقت اسے یتیم کہنا مجازاً ہے کہ پہلے وہ یتیم تھا، جیسے رب تعالیٰ فرماتا ہے فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ (شعراء:۴۶) حالانکہ فرعونی جادوگر سجدہ میں گرتے وقت جادوگر نہ رہے تھے اور ہوسکتا ہے کہ یتیم سے مراد نابالغ یتیم ہی ہوں مگر اٰتُوا کے معنی یہ ہوں کہ بلوغ پر انہیں مال دے دینا یعنی حکم آئندہ کے لئے ہو، فتویٰ اس پر ہے کہ لڑکے لڑکی کے بلوغ کی انتہائی عمر پندرہ سال ہے، ابتدائی عمر لڑکے کے بلوغ کی بارہ سال ہے اور لڑکی کے بلوغ کی نو سال، وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ یہ دوسرا حکم ہے جو یتیموں کے والیوں کو دیا جا رہا ہے، خبیث سے مراد ردی مال ہے یا حرام مال اور طیب سے مراد کھرا مال ہے یا حلال، تبدل سے مراد ہے بدلہ میں لے لینا، یعنی یہ نہ کرو کہ اپنا ردی مال تو یتیموں کے مال میں رکھ دو، اور ان کا کھرا مال لے کر خود کھا جاؤ، یا یہ نہ کرو کہ خود حلال کمائی نہ کرو ان کا مال جو تمہارے لئے حرام ہے خرچ کرو وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓی اَمْوَالِكُمْ یہ تیسرا فرمانِ عالی ہے، اس میں بھی خطاب یتیموں کے والیوں کو ہے اگرچہ اکل کے معنی ہیں کھانا مگر یہاں مراد مطلقاً استعمال کرنا ہے، چونکہ کھانا اصل مقصود ہے، اس لئے اکثر کھانا بول کر استعمال کرنا مراد لیتے ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا (آل عمران:۱۳۰) ہم بھی سود لینے والے کو سود خوار کہتے ہیں، الیٰ بمعنی مع ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ (آل عمران:۵۲) اَیْ مَعَ اللّٰهِ (کبیر) یعنی اے والیو! یہ بھی نہ کرو کہ یتیموں کا مال اپنے مال میں ملا کر کھاؤ یا برتو، جب اپنے مال سے ملا کر استعمال کرنا حرام ہوا، تو نرا ان کا مال ہی برتنا بدرجہ اولیٰ حرام ہے، خیال رہے کہ یہاں بدنیتی سے ملانے کی ممانعت ہے جبکہ برائے نام اپنا مال لے زیادہ یتیموں کا اور کھا جائے لیکن اگر اس نے ان کا آٹا، سبزی، گوشت ملا کر پکایا ہے تا کہ ان کا خرچ کم ہو، علیحدہ پکانے میں یتیم کا نقصان ہے، تو بالکل جائز بلکہ بہتر ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (بقرہ:۲۲۰) لہٰذا آیات میں تعارض نہیں، اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا، اس عبارت میں گذشتہ جرموں کی برائی کا ذکر ہے، ہٗ کا مرجع وہ سارے کام ہیں جن سے ابھی منع کیا گیا، یعنی یتیم کے اچھے مال سے برے مال کی تبدیلی، یتیم کا مال اپنے

اسی لئے فرمایا گیا تَعَالَوْا یعنی تم نیچے تو اب ہو اسلام کے قلعہ میں چڑھ آؤ عزت و بلندی پاؤ گے کَلِمَۃٍ اگرچہ لغتہ ایک لفظ کو کلمہ کہتے ہیں۔ مگر عرف میں قصیدے قصہ شرح اور پورے کلام کو کلمہ کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسے اردو میں بات سَوَآءٍ کلمۃ کی صفت ہے۔ یہ مصدر بمعنی اسم فاعل ہے اس کے معنی وسط عدل اور برابر ہیں یہاں سارے معنی بن سکتے ہیں کیونکہ یہود و نصاریٰ کے عقائد ظلم تھے۔ کہ ان کے ہاں بعض نبیوں کو تو خدا مان لیا گیا تھا۔ جیسے حضرت عزیر علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بعض نبیوں کی نبوت کا انکار کیا گیا تھا جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام اور اسلامی عقیدے عدل نیز اہل کتاب کے عقائد میں افراط و تفریط تھی۔ کہ یہود کے ہاں چوتھائی زکوٰۃ فرض تھی۔ عیسائیوں کے ہاں زکوٰۃ تھی ہی نہیں۔ یا یہود کے ہاں حلال چربیاں بھی حرام تھیں عیسائیوں کے ہاں سور و شراب بھی حلال اسلام میں میانہ روی ہے۔ نیز اہل کتاب میں تفریق تھی۔ کہ ان کے ہاں قوم ملک، زبان کی بنا پر اونچ نیچ تھی اسلام میں یہ کچھ نہیں یہاں عزت و عظمت اعمال و تقویٰ سے ہے۔ اسلام میں برابری۔ لہٰذا جو چاہو اس کے معنی کر لو تفسیر کبیر نے فرمایا کہ سواء کے معنی ہیں انصاف جس کا مادہ نصف ہے بمعنی آدھا انصاف آدھا کرنا۔ چونکہ عدل میں برابری ہوتی ہے۔ اور ہر ایک کو کل میں سے آدھا دیا جاتا ہے اس لئے اسے انصاف بھی کہتے ہیں۔ اور سَوَآءٍ بھی بیننا مع معطوف کے سواء کا ظرف ہے خیال رہے کہ یہاں کلمۃ سواء کے عقائد اسلامیہ اور عام اسلامی اعمال مراد ہیں۔ یعنی اے محبوب ﷺ آپ سارے اہل کتاب سے فرما دو کہ اے کتابیو ان عقائد یا اس دین کی طرف آؤ ہمارے تمہارے درمیان مشترک ہے یعنی جس میں نہ توریت کا اختلاف ہے نہ انجیل کا یا جس میں سارے بندے برابر ہیں یا جو بالکل عدل و انصاف کی بات ہے کہ اگر تم کلمہ پڑھ لو تو ہم پر اور تم پر یکساں احکام جاری ہوں یا وہ جس میں رسولوں اور کتابوں کا اختلاف نہیں اور کسی کو کسی پر فوقیت خصوصی نہیں۔ وہ کلمہ یہ ہے کہ وَلَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهُ یہ جملہ کلمۃ سواء کی تفصیل کا پہلا جزو ہے۔ یا تو ھی پوشیدہ کی خبر ہے اور رفعی حالت میں یا کلمۃ کا بدل ہے اور جری حالت میں یعنی وہ کلمہ مساوات یہ ہے کہ ہم رب تعالیٰ کے سوا نہ کسی نبی کی عبادت کریں نہ ولی کی نہ بتوں کی نہ چاند کی نہ سورج کی اس میں عیسائیوں پر چوٹ ہے کہ انہوں نے بعض بندوں کی عبادت شروع کر دی۔ اور وَلَا نُشْرِکَ بِهٖ شَیْئًا عملی شرک کی نفی کے بعد اعتقادی شرک کی نفی کی نُشْرِکَ اشراک سے بنا۔ بمعنی شریک کرنا یا شریک جاننا۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہے۔ شیئاً سے یہ ہر غیر خدا مراد ہے انسان ہو یا کچھ اور بعض نے کہا کہ یہ جملہ لَا نَعْبُدُ کی تاکید ہے مگر صحیح یہ ہے کہ تاسیس ہے۔ یعنی ہم رب تعالیٰ کا کسی کو شریک نہ جانیں اور نہ کسی کو عبادت کا حقدار سمجھیں اس میں بھی عیسائیت اور یہودیت کی تردید ہے جنہوں نے حضرت عیسیٰ و مریم یا عزیر علیہم السلام کو رب تعالیٰ کا شریک جانا اور صلیب وغیرہ کو عبادت کے لائق ٹھہرایا وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ تیسرا جملہ ہے اور کلمۃ سواء کی تفصیل کا تیسرا جزو یتخذ اِتخاذ سے بنا بمعنی اختیار کرنا پکڑنا بنانا یہاں بنانا مراد ہے مگر عقیدے کے لحاظ سے بَعْضُنَا سے عام لوگ مراد ہیں اور بعض سے خاص لوگ بعض نے کہا کہ اس سے مراد انبیائے کرام ہیں اور یہ جملہ بھی لَا نَعْبُدُ کی تاکید ہے بعض نے کہا کہ اس سے مراد عیسائیوں اور یہودیوں کے وہ علماء ہیں جنہیں عوام نے حرام و حلال کا اختیار دے رکھا تھا۔ اور جن سے عوام اپنے گناہ معاف کرایا کرتے ہیں۔ یہ ہی قول صحیح ہے ان کو بعض فرما کر اس جانب اشارہ کیا گیا کہ جب وہ ہمارے ہی ہم جنس ہیں تو ان میں یہ خصوصی شان یا الوہیت کہاں سے آئی ارباب رب کی جمع ہے بمعنی

ان پر ہی خرچ کرو، اس میں غبن بے ایمانی بھی اس میں ہی داخل ہے، **پانچواں فائدہ:** جب میت کے بعض وارث نابالغ ہوں تو اس کے مشترکہ ترکے سے فاتحہ، خیرات، صدقات کرنا حرام ہے، کہ اس میں مال یتیم مخلوط ہے، پہلے ترکہ تقسیم کریں پھر بالغ ورثاء اپنے حصہ سے یہ کار خیر کریں، **چھٹا فائدہ:** عورت کا کفن پانچ کپڑے ہیں، مرد کا کفن تین کپڑے، باقی اوپر کی چادر، جائے نماز کا کپڑا جو بعد میں خیرات کر دیئے جاتے ہیں کفن سے علیحدہ ہیں، یہ مشترکہ متروکہ مال سے ادا نہ کئے جائیں کہ اس میں یتیم کے مال کی خیرات ہے جو حرام ہے، **ساتواں فائدہ:** یتیم کا والی وارث یتیم کے لئے کسی سے مال لے سکتا ہے مگر کسی کو یتیم کا مال دے نہیں سکتا کہ لینے میں یتیم کا نفع ہے دینے میں اس کا نقصان، **آٹھواں فائدہ:** اگر والی یتیم کا نکاح کرے، تو اس کے مال سے دعوت ولیمہ وغیرہ نہیں کر سکتا، اور اگر کرے تو لوگوں کو یہ کھانا حرام ہے کہ اس میں یتیم کا مال کھانا ہے، **نواں فائدہ:** بدنیتی سے یتیم کا مال اپنے مال سے مخلوط کرنا حرام ہے کہ اس بہانہ سے اس کا مال کھائے، نیک نیتی سے جائز بلکہ ثواب ہے، بدنیتی سے مال ملانے کی حرمت یہاں مذکور ہوئی اور نیک نیت سے ملانے کا جواز وہاں ہے وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (بقرہ: ۲۲۰) **دسواں فائدہ:** ضعیف پر ظلم کرنا قوی پر ظلم کرنے سے زیادہ خطرناک جرم ہے، کہ ضعیف ظلم سے بچنے یا بدلہ لینے پر قادر نہیں، دیکھو رب تعالیٰ نے یتیم کے مال کھانے کو حوب بھی فرمایا اور کبیر بھی، اسی لئے فقہاء فرماتے ہیں کہ جانور بے زبان پر ظلم کرنا، انسان پر ظلم کرنے سے زیادہ برا ہے کہ جانور بے زبان ہے، اس کا ناصر و مددگار رب تعالیٰ کے سواء کوئی نہیں، وہ کسی سے فریاد بھی نہیں کر سکتا، **گیارھواں فائدہ:** یتیم اپنے مال کا مالک ہوتا ہے اگرچہ پورا قابض نہیں، خواہ اس کا مال اپنی کمائی کا ہو یا کسی کا دیا ہوا یا میراث سے ملا ہوا جیسا کہ اَمْوَالَهُمْ میں اموال کی اضافت سے معلوم ہوا، اٰتُوْا سے معلوم ہوا کہ قابض اس کا والی ہے، اَمْوَالَهُمْ سے معلوم ہوا کہ مالک خود یتیم ہے، **بارھواں فائدہ:** یتیم کا ردی مال اپنے طیب مال سے بدل لینا جائز ہے کہ اعلیٰ درجہ کا مال اس کے مال میں رکھ دیا جائے، اس کا ردی مال خود کھالیا جائے خصوصاً بگڑ جانے، خراب ہو جانے والا مال،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ یتیم کا مال اس کی نابالغی کے زمانہ میں دے دینا چاہیے، جبکہ وہ یتیم ہو، بالغ ہو کر یتیم نہ رہے گا، حالانکہ فقہاء فرماتے ہیں کہ بلوغ سے پہلے ان کا مال انہیں نہ دو، یہ فقہی حکم اس آیت کے خلاف ہے،

جواب: اس کے دو جواب ابھی تفسیر میں گذر گئے کہ یا تو بالغ کو یتیم کہا گیا اس کے گذشتہ حال کے لحاظ سے، چونکہ بالغ ہوتے ہی بلا انتظار اسے مال دے دینا ضروری ہے، اس لئے اسے یتیم فرمایا کہ جو بھی ابھی یتیم تھا، اب بالغ ہو گیا اسے فوراً مال دے دو، یا اٰتُوْا مستقبل ہے یعنی یتیموں کا مال ان کے بلوغ پر دے دینا جیسا اٰتُوا الزَّكٰوةَ (بقرہ: ۱۱۰) معنی یہ نہیں ہیں کہ مال آتے ہی زکوٰۃ دے دو بلکہ سال گذرنے پر دے دینا، نابالغ یتیموں کو مال دینے کی ممانعت دوسری آیات میں ہے وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ (النساء: ۵) وغیرہ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ یتیموں کا مال خود ان پر بھی خرچ نہ کیا جائے بلکہ سنبھال کر رکھا جائے، بالغ ہوتے ہی سارے کا سارا مال حوالے کر دیا جائے جیسا کہ اموال جمع فرمانے سے معلوم

مسلمان امیر، وزیر، بادشاہ، فقیر، چھوٹے بڑے کالے گورے آقا غلام کا کوئی فرق نہیں۔ اور جو افراط و تفریط سے خالی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم رب کے سوا کسی کو نہ پوجیں انبیاء اولیاء اللہ سب کو اللہ کا بندہ سمجھیں ان میں سے کسی کو معبود نہ بنالیں اور کسی کو خدا کا شریک نہ سمجھیں نہ بتوں کو نہ چاند سورج کو نہ صلیب کو نہ کسی اور شئی کو نیز کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب اور احکام کا مالک نہ بنائے۔ علماء و صلحاء سب کو دین کا پیروکار سمجھیں خیال رہے کہ انسان کے سوا تمام جاندار چیزیں رنگ، شکل، بولی غذا میں برابر ہیں۔ ہر جگہ کے کوے بکری مینڈک کی غذائیں بولی شکل و صورت میں کوئی فرق نہیں انسان وہ مخلوق ہے جو نہ زبان میں متفق ہے نہ غذا میں نہ شکل و شباہت میں نہ لباس میں ان بکھیروں کو ایک کرنے والا اور ان سب کو ایک جگہ جمع کر دینے والا اگر کوئی ہے تو وہ اسلام ہے۔ اس لئے فرمایا گیا سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اگر وہ لوگ اس سے بھی منہ موڑیں اور عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننے اور صلیب کی پرستش کرنے اور اپنے پادریوں کو احکام کا مالک ماننے پر ضد کریں تو آپ ان سے کہہ دو کہ تم یہاں بھی گواہ بن جاؤ اور آخرت میں بھی گواہی دینا کہ ہم مخلص مسلمان ہیں چونکہ اہل کتاب میں یہ تینوں حرکات تھیں کہ وہ صلیب کی پرستش بھی کرتے تھے حضرت عیسیٰ و مریم کو خدا کا شریک بھی ٹھہراتے تھے کہ انہیں رب کا بیٹا بیوی مانتے تھے اور اپنے پادریوں کو مالک احکام بھی سمجھتے تھے اس لئے یہاں تبلیغ میں ان تین چیزوں کا ذکر ہوا۔ قیامت و فرشتوں وغیرہ کا ذکر نہ ہوا کہ یہ چیزیں تو وہ مانتے ہی تھے کسی کافر کو مسلمان کرتے وقت اس کے کفریات سے توبہ کرانا ضروری ہے۔ دہریہ سے یہ کہلوایا جائے کہ خالق ہے مشرک سے کہلوایا جائے کہ خالق ایک ہے۔ مرزائی سے کہلوایا جائے کہ حضور انور ﷺ آخری نبی ہیں۔ عیسائیوں سے کہلوایا جائے کہ حضرت عیسیٰ و مریم اللہ کے بندے ہیں اے اہل کتاب تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں آپس میں کیوں جھگڑتے ہو کہ یہودی کہتے ہیں وہ یہودی تھے اور عیسائی کہتے ہیں وہ عیسائی تھے۔ ذرا اتنا سوچو کہ یہودیت توریت آنے کے بعد بنی اور نصرانیت نزول انجیل کے بعد ظہور میں آئی۔ اور ابراہیم علیہ السلام ان دونوں سے بہت پہلے گذرے۔ کہ آپ کا زمانہ موسیٰ علیہ السلام سے ایک ہزار سال اور عیسیٰ علیہ السلام سے تین ہزار سال پہلے ہے۔ (روح المعانی و بیان وغیرہ) پھر وہ یہودی یا عیسائی کیونکر ہو سکتے ہیں کیا کوئی شخص کتاب آنے سے پہلے اس کی پیروی کر سکتا ہے تم میں اتنی بھی عقل نہیں کہ اتنی موٹی بات سمجھ سکو۔ نہ وہ یہودی تھے نہ عیسائی بلکہ حنیف و مسلم تھے اسلام ان کی ملت کے موافق ہے اگر تم ان کی پیروی چاہتے ہو تو مسلمان ہو جاؤ۔

خیال رہے: کہ اس آیت میں وہ پیغام ہے جو حضور ﷺ سلاطین روم و شام و فارس وغیرہ کو بھیجتے اور اس کے ذریعہ انہیں دعوت اسلام دیتے تھے چنانچہ آپ نے قیصر روم کو جو فرمان نامہ بھیجا اس کا مضمون یہ تھا کہ فرمان محمد رسول اللہ ﷺ کی جانب سے شاہ روم ہرقل کی طرف ہے۔ سلام ہو اس پر جو ہدایت قبول کرے اے شاہ روم میں تجھے دعوت اسلام دیتا ہوں اسلام لے آ۔ سلامت رہے گا تجھے اللہ دگنا اجر دے گا اور اگر منہ پھیرے گا تو تجھ پر پیشواؤں کا گناہ ہوگا پھر یَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ سے مُسْلِمُوْنَ تک آیت تحریر فرمائی۔

جب یہ فرمان شاہ روم کے پاس پہنچا تو اس نے حضور ﷺ کے حالات دریافت کئے اور بولا کہ اگر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو ان کے پیر دھوتا۔ بعض روایات میں ہے کہ ان کے قدم چومتا مگر سلطنت کے خوف سے ایمان نہ لایا اسی عظمت کی

مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ

ان عورتوں سے جو پسند ہوں تمہیں دو دو اور تین تین اور چار چار

جو عورتیں تمہیں خوش آئیں دو دو تین تین چار چار

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ

پس اگر خوف کرو تم یہ کہ نہ انصاف کرو گے تو ایک سے یا وہ جس کے تمہارے ہاتھ

پھر اگر ڈرو کہ بیویوں کو برابر نہ رکھ سکو گے تو ایک ہی کرو یا کنیزیں جن کے تم مالک ہو

اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ؕ وَاٰتُوا النِّسَآءَ

مالک ہیں یہ قریب ہے اس کے کہ ظلم نہ کرو اور دو عورتوں کو

یہ اس سے زیادہ قریب ہے کہ تم سے ظلم نہ ہو اور عورتوں کو

صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ

مہر ان کے عطیہ پھر اگر بخوشی دیں وہ بیویاں

ان کے مہر خوشی سے دے دو پھر اگر وہ اپنے دل کی خوشی سے مہر میں سے کچھ

نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــًٔا مَّرِیْٓــًٔا ۝۴

تم ہی کو تو کھاؤ اسے مبارک خوش گوار

تمہیں دے دیں تو اسے کھاؤ رچتا پچتا

تعلقات

ان آیات کا پچھلی آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں یتیموں کے حقوق ادا کرنے کا ذکر تھا جو کہ بے کس و بے بس ہوتے ہیں، ان آیات کریمہ میں اپنی بیویوں سے اچھے برتاوے کا ذکر ہے کہ بیویاں بھی قریباً بے کس اور خاوند کے بس میں ہوتی ہیں، اس لئے ان کا ذکر یتیموں کے ساتھ ہوا، مگر چونکہ یتیم کی بے کسی زیادہ ہے عورت کی کم، اس لئے پہلے یتیم کا ذکر ہوا پھر بیویوں کا، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ یتیم کا مال اس کے حوالے کرو، اس حوالے کرنے میں پس و پیش نہ کرو، اب حکم ہو رہا ہے کہ بیوی کا مہر اس کے حوالہ کرو، اس میں ٹال مٹول نہ کرو، ایک حق کی ادائگی کا حکم دے کر دوسرے حق کی ادائگی کا حکم دیا گیا، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں یتیم سے اچھے برتاوے کا ذکر تھا، اب اس یتیمہ سے اچھے برتاوے کا ذکر ہے جس سے ولی نکاح کرے گویا ایک قسم کے یتیم کے متعلق احکام جاری فرمانے کے بعد دوسری

رب تعالیٰ نے ان پر سے یہ الزام دور کر کے ان کی نبوت کا اعلان کیا فرمایا وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (بقرہ:۱۰۲) **چوتھا فائدہ:** دینی مناظرے اور حقانیت اسلام پر دلائل قائم کرنا کفار کے شبہات کا جواب دینا واجب ہے۔ **پانچواں فائدہ:** علم تاریخ اعلیٰ علم ہے۔ جس کا جاننا ضروری ہے کہ اس پر بہت سے دینی احکام مرتب ہوتے ہیں۔ دیکھو یہاں اہل کتاب کو تاریخی لحاظ سے جواب دیا گیا کہ چونکہ ابراہیم علیہ السلام توریت و انجیل کے نزول سے پہلے گذرے۔ اس لئے یہودی یا عیسائی نہیں ہو سکتے۔ **چھٹا فائدہ:** اپنے ایمان و نیک اعمال کا لوگوں کو گواہ بنالینا چاہئے۔ تاکہ ان کی گواہی قیامت میں کام آئے جب کفار کو اپنے ایمان کا گواہ بنایا گیا تو مسلمانوں خصوصاً حضرات انبیاء و اولیاء اللہ کو ضرور گواہ بنایا جائے۔ حتیٰ کہ پانی کے قطروں ریت کے ذروں کو اپنا گواہ ایمان بنالے کہ دریا اور جنگلوں میں بھی کبھی بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھے گواہ بنانے کی تین صورتیں ہیں لوگوں پر اپنا ایمان ظاہر کرے اپنے نیک اعمال علانیہ بھی کرے اپنی شکل مسلمانوں کی سی رکھے۔ تاکہ لوگ اس کے ایمان کے گواہ ہوں۔ **ساتواں فائدہ:** اپنی کچھ نیکیاں اعلانیہ بھی کرے۔ ہر نیکی چھپا کر ہی نہ کرے۔ تہجد خفیہ پڑھے مگر نماز پنجگانہ' نماز عید' علانیہ پڑھے۔ **آٹھواں فائدہ:** اسلام و ایمان کبھی ہم معنی ہوتے ہیں۔ کبھی الگ الگ معنی میں یہاں بمعنی ایمان ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: ان آیتوں میں تین چیزوں کی نفی کی گئی غیر خدا کی عبادت۔ غیر خدا کو شریک جاننا۔ غیر خدا کو رب ماننا ان تینوں میں کیا فرق ہے تینوں ایک ہی معلوم ہوتے ہیں؟ **جواب:** کسی کو خدا کی ذات یا صفات میں شریک سمجھنا یہ تو ہے شرک اور غیر خدا کی پرستش کرنا اس کے سامنے جھک جانا۔ یہ ہے عبادت غیر اللہ اور کسی کو خدا کی مثل احکام شرعیہ کا مالک بالذات سمجھنا۔ یہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا اختیار کرنا ہے لہٰذا شرک اور اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا تعلق عقیدہ سے ہے اور عبادت کا تعلق عمل سے جیسے عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا یا اس کی مثل سمجھتے ہیں۔ یہ شرک ہوا۔ پھر ان کا صلیب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا' اسے سجدہ کرنا' یہ ہے غیر خدا کی عبادت پھر پادری صاحب کو شرعی احکام کا مالک سمجھنا' ان سے اپنے گناہ معاف کرانا' کہ چھ دن خوب گناہ کئے۔ اور اتوار کے دن پادری صاحب کے سامنے اقرار کرلیا۔ انہوں نے کہا کہ جاؤ بیٹا معاف ہیں سب کی معافی ہوگئی یہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا اختیار کرنا ہے اسلام ان عیوب سے پاک ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا کو چھوڑ کر اوروں کو رب ماننا جرم ہے۔ کیونکہ فرمایا گیا ہے اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ تو چاہئے کہ خدا کے ساتھ اوروں کو معبود ماننا جائز ہو کیونکہ وہ اَرْبَابًا مَّعَ اللّٰهِ ہوگا۔ نہ کہ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ **جواب:** آیت کا مطلب یہ ہے کہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وحدہ ایک خدا کے ساتھ کسی کو مالک نہ مانو لہٰذا دوئی توحید کے مخالف ہے اور من دون اللہ میں داخل۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام کے احکام سب کے لئے یکساں ہیں۔ حالانکہ اسلام میں بھی بڑا فرق ہے غریب پر زکوٰۃ و حج اور حائضہ عورت پر نماز' دیوانے پر ساری عبادات فرض نہیں۔ ایسے ہی صحابہ کی معمولی نیکی پر ثواب زیادہ سادات کرام کو زکوٰۃ کھلانا حرام' حضرت علی کو فاطمہ زہرہ کی موجودگی میں دوسرا نکاح حرام اور صدیق اکبر کو جنابت کی حالت میں مسجد میں آنا جائز۔ حضرت [illegible] انصاری کی ایک گواہی دو کی مثل [illegible] تمام [illegible] احادیث سے ثابت ہیں پھر احکام

لڑکیوں سے نکاح کر کے عدل وانصاف نہ کرو گے، یا اے والیو! اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ زیادہ بیویاں نکاح میں رکھنے سے یتیموں میں انصاف نہ کرسکو گے، ان کا مال بیویوں پر خرچ کرو گے، یا اے یتیموں کے والیو! جب تم یتیموں کی پرورش سے اس لئے ڈرتے ہو کہ ان پر ظلم نہ کر بیٹھو تو فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ یہ عبارت گذشتہ اِنْ کی جزاء ہے، اَنْكِحُوْا صیغہ امر مباح کرنے یا استحباب کے لئے ہے نہ کہ وجوب کے لئے، کیونکہ چند عورتوں سے نکاح کرنا واجب کبھی نہیں، ہاں نفسِ نکاح کبھی واجب ہوتا ہے کبھی مستحب کبھی مکروہ کبھی حرام جیسا کہ کتب فقہ سے معلوم ہوتا ہے اگرچہ مَا غیر عاقل چیزوں کے لئے آتا ہے اور مَنْ عاقلوں کے لئے، مگر چونکہ یہاں ذات مراد نہیں بلکہ وصف مراد ہے یعنی پسند آنا، اس لئے عورتوں پر بھی مَا آ گیا (مدارک، کبیر، روح المعانی وغیرہ) خلاصہ یہ ہے کہ عاقل کی ذات کے لئے مَنْ آتا ہے، مگر عاقل کی وصف کے لئے مَا، کہ عاقل کی ذات تو عقل رکھتی ہے، مگر اس کے اوصاف تو غیر عاقل ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (بقرہ:۸۹) جب ان کے پاس جانا پہچانا نبی تشریف لایا، تو انکار کر بیٹھے، دیکھو وہاں نبی کے لئے ما فرمایا گیا، اس وجہ سے کہ وہاں معرفت نبی کی طرف اشارہ ہے، معرفت عاقل نہیں یہ قاعدہ خوب خیال میں رہے طَابَ طَيِّبٌ سے بنا، طیب کے دو معنی ہیں، اچھا ہونا، پسندیدہ ہونا، دل کو پسند آنا، تب اس کا مقابل خبیث ہوگا اور بمعنی حلال، تب اس کا مقابل حرام ہوتا ہے، یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں، مِّنَ النِّسَآءِ میں مِنْ بیانیہ ہے ما کا بیان یعنی ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہیں پسند ہوں، ان ناپسندیدہ یتیمہ لڑکیوں سے ہرگز نکاح نہ کرو، یا ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہیں حلال ہوں، حرام عورتوں سے ہرگز نہ کرو، ظاہر یہ ہے کہ فَانْكِحُوْا میں آزاد مردوں سے خطاب ہے نہ کہ غلاموں سے، کیونکہ چار بیویاں آزاد مرد رکھ سکتا ہے نہ کہ غلام، غلام صرف دو رکھ سکتا ہے، نیز آیت کا اگلا مضمون اسی کی تاکید کر رہا ہے مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ، یہ عبارت طاب کے فاعل ھو ضمیر سے حال ہے، یا مِّنَ النِّسَآءِ سے حال، مثنیٰ اصل میں اثنین، اثنین تھا، اور ثُلٰثَ دراصل ثلث ثلث اور ربع دراصل اربع اربع تھا، ان سے عدل ہو کر مَثْنٰى، ثُلٰثَ، رُبٰعَ بن گئے، اس لئے ان لفظوں کے معنی ہیں دو دو، تین تین، چار چار، یہاں واوَ جمع کے لئے نہیں بلکہ اختیار دینے کے لئے ہے، لہٰذا اس جملہ کا یہ مطلب نہیں کہ دو، تین، چار کا مجموعہ ۹ بیویاں نکاح میں رکھو بلکہ مطلب یہ ہے کہ چاہو تو دو بیویاں رکھو، چاہو تو تین، چاہو تو چار، اس سے زیادہ نہیں، اس معنی پر تمام امت کا اجماع ہے، جن لوگوں نے اس آیت کی بنا پر چار سے زیادہ بیویاں رکھنا جائز مانا ہے وہ اہل بدعت ہیں، ان کا یہ قول فرقِ اجماع ہے نہ کہ اجماع باطل کرنے والا (تفسیر کبیر وروح المعانی) یہاں تفسیر کبیر وروح المعانی نے بہت شاندار مبسوط تقریر فرمائی ہے، ان کی تردید میں جو چار سے زیادہ کا جواز اس آیت سے ثابت کرتے ہیں، انشاء اللہ سوال وجواب میں اس کے متعلق کچھ عرض کیا جائے گا، فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً، اس جملہ میں گذشتہ اجازت پر پابندی لگائی گئی، خِفْتُمْ میں خطاب سارے ہی آزاد مردوں سے ہے کہ انہی آزادوں کو چار بیویوں کی اجازت دی گئی تھی، تَعْدِلُوْا عدل سے بنا بمعنی انصاف بیویوں میں پورا انصاف کرنا لازم ہے، باری میں، روزی میں، عطاء میں حتیٰ کہ بعدِ موت میراث میں، رہا میلانِ قلبی، یہ انسان کے اختیار سے باہر ہے اس پر پکڑ نہیں، بشرطیکہ عملاً سب میں برابری کرے، فَوَاحِدَةً فَاِنْ خِفْتُمْ کی جزاء ہے، یہ پوشیدہ فعل اَنْكِحُوْا

احترام تھا۔ اس لئے ہر دین والا یہی کہتا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے دین پر تھے تاکہ ان کی نسبت سے ہمارے دین کو قوت پہنچے حتیٰ کہ مشرکین عرب نے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے نام کے بت خانہ کعبہ میں رکھے۔ جن کے ہاتھوں میں فال والے تیر دیئے تھے۔ اس لئے یہ یہود و نصاریٰ بھی ان کو اپنے دین کی طرف نسبت دیتے تھے۔ **چھٹا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کو مالک احکام سمجھنا شرک اور اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ میں داخل ہے۔ اور عیسائیت کی پیروی (دیوبندی) **جواب:** حضور علیہ السلام نے بے شک مالک احکام ہیں۔ جس پر بہت سی آیات قرآنیہ احادیث صحیحہ اور علماء کرام کے اقوال گواہ ہیں۔ اس کی تفصیل ہماری کتاب سلطنت مصطفیٰ میں دیکھو کیونکہ ان کا فرمان وحی الٰہی ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم: ۴) اگر وہ بالکل غیر مختار ہوں تو ان میں اور علمائے مجتہدین میں کیا فرق رہے۔ عیسائیوں نے اپنے عالموں کو مالک احکام مانا۔ جنہوں نے کتاب الٰہی کے خلاف حکم دیئے۔ عیسائیوں نے کتاب کو چھوڑا اور علماء کی بات مانی یہ ہوا اربابا من دون اللہ بنانا۔ اور نبی رب کی طرف سے مالک احکام بنائے گئے۔ فرماتا ہے وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (اعراف: ۱۵۷) نبی گندی چیزیں حرام کرتے ہیں جیسے تم بادشاہوں اور حکام کو دنیوی احکام کا مالک مانتے ہو بتاؤ یہ بھی شرک ہے یا نہیں لہٰذا اس آیت کو اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں خلاصہ یہ ہے کہ جسے رب تعالیٰ نے مالک احکام نہ بنایا ہوا سے رب کے مقابل مالک ماننا شرک ہے۔ جیسے عیسائیوں کے پوپ پادری اور جسے رب تعالیٰ نے ہی اپنے فضل سے مالک و مختار بنایا ہوا ہے اسے یہ عطاء الٰہی مالک و مختار ماننا عین ایمان پہلی قسم کے لوگ من دون اللہ ہیں اور یہ حضرات من جانب اللہ ہیں دیکھو کعبہ کی طرف سجدہ کرنا عین ایمان ہے۔ اور گنگا و صلیب کی طرف سجدہ کرنا سراسر شرک کیوں اس لئے کہ کعبہ معظمہ کو رب نے مسجود الیہ بنایا ہے۔ اور صلیب گنگا کو رب نے مسجود الیہ نہ بنایا۔ سچے نبیوں کو نبی ماننا عین ایمان ہے۔ کہ یہ حضرات نبی اللہ ہیں۔ اور غیر نبی کو نبی مان لینا عین کفر ہے۔ **ساتواں اعتراض:** سنیوں کا عقیدہ ہے کہ حضور علیہ السلام گناہوں سے پاک و صاف فرما سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی ظاہری و باطنی گندگیوں کو دور کر سکتے ہیں یہ بھی شرک و کفر ہے عیسائی اپنے گناہ پادریوں سے معاف کراتے ہیں۔ اور مسلمان نبیوں سے۔ یہ عقیدہ بھی اربابا من دون اللہ میں داخل ہے۔ (دیوبندی) **جواب:** بے شک حضور علیہ السلام ہم کو ہی گناہوں سے پاک کرتے ہیں اور رب تعالیٰ کے عذاب سے بچاتے ہیں رب تعالیٰ فرماتا ہے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (التوبہ: ۱۰۳) اے محبوب علیہ السلام آپ ان کے مالوں سے صدقے لے کر اس کے ذریعہ انہیں پاک و صاف کر دو نیز فرماتا ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ الخ (النساء: ۶۴) فرماتا ہے وَيُزَكِّيْهِمْ حضرت ماعز نے ایک گناہ کر کے عرض کیا طَهِّرْنِيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ حضرت عائشہ صدیقہ نے عرض کیا اَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ میں اللہ و رسول اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتی ہوں اگر اس کی تفصیل دیکھنا ہے تو ہماری کتاب سلطنت مصطفیٰ کا مطالعہ کرو میں اپنے حقوق معاف کر کے دوسرے کو اس سے پاک و صاف کر سکتا ہوں اس آیت کو اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ عیسائی رب تعالیٰ کے گناہ اپنے علماء سے معاف کراتے تھے۔ زنا، چوری شراب خوری کو پادری صاحب معاف کرتے تھے۔ یہ یقیناً کفر ہوا۔ لیکن اگر حضور علیہ السلام کی دعا سے رب تعالیٰ کے حقوق معاف ہو جائیں۔ یا حضور علیہ السلام کی جنبش لب سے رب تعالیٰ خود معاف فرمادے تو یہ شرک نہیں۔ نیز حضور علیہ السلام کو اس معافی کا اختیار رب تعالیٰ

بمعنی عطیہ، امام راغب فرماتے ہیں کہ نحل کے معنی ہبہ، اسی لئے شہد کی مکھی کو نحل کہتے ہیں کہ وہ جس شاخ پر بیٹھتی ہے اسے خراب نہیں کرتی بلکہ موجب نفع ہی ہوتی ہے، یہاں مہر کو نحل فرمانے میں یا تو اس طرف اشارہ ہے کہ مہر ادا کرنا دینی حکم ہے ضرور ادا کرو یا اس طرف اشارہ ہے کہ مہر خاوند کی طرف سے ایک قسم کا تحفہ ہے، اس پر کسی قسم کے معاوضہ کی امید نہ رکھو کہ اگر عورت جہیز زیادہ لائے تو ہم مہر دیں ورنہ نہ دیں، بعض نے فرمایا کہ نِحْلَةً کے معنی ہیں خوش دلی سے دیا ہوا عطیہ، یعنی مہر خوش دلی سے دو، یعنی اے خاوندو! اپنی آزاد بیویوں کو ان کے مہر حوالہ کردو، یہ شرعی و دینی حکم ہے یا انہیں بطور عطیہ و تحفہ دے دو، ان سے اس کے معاوضہ کے طلب گار نہ ہو، یا انہیں خوش دلی سے دو، ٹال مٹول کر کے دل تنگی سے نہ دو، اے عورت کے والیو وارثو! عورت کا مہر خود اس کے ہی حوالہ کردو، تم اس پر قبضہ نہ کرو کہ یہ اس کا اپنا حق ہے، تمہارا لے لینا ظلم ہے فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا خاوندوں کو ادائے مہر کا حکم دے کر بیویوں کے ہبہ مہر کا ذکر ہے، طِبْنَ طِیْبٌ سے بنا بمعنی خوشی، یہ جمع مونث ہے، اس کا فاعل نساء یعنی بیویاں ہیں، مِّنْهُ میں من بیانیہ ہے ہٗ ضمیر کا مرجع صداق یعنی مہر ہے جو صدقات سے معلوم ہوا، نَفْسًا طِبْنَ کی ضمیر ھن سے تمیز ہے چونکہ نفس جنس ہے جو کم و زیادہ پر بولی جا سکتی ہے، نیز اس کے واحد لانے میں کوئی دعوکا تھا نہیں، کہ چند عورتوں کا دل ایک نہیں ہوتا، چند ہی ہوتے ہیں، اس لئے نَفْسًا واحد ارشاد ہوا، نفس سے مراد دل ہے (روح المعانی و کبیر وغیرہ) اصل عبارت یوں تھی اِنْ طَابَتْ اَنْفُسُهُنَّ لَكُمْ عَنْ شَیْئٍ مِنَ الصُّدَاقِ، یعنی اگر تمہاری بیویاں اپنی خوش دلی سے تمہیں مہر میں سے کچھ دے دیں یا اس طرح کہ جو مہر تم سے وصول کر چکی ہیں وہ کل یا بعض تم کو واپس کر دیں، یا جو مہر انہیں تم سے وصول کرنا ہے وہ کل یا بعض تم کو معاف کر دیں، پہلی صورت میں ہبہ ہے، دوسری صورت میں ابراء یعنی معافی، مگر شرط یہ ہے کہ یہ خوشی سے کریں، جبراً ان سے نہ کرایا جاوے جیسا کہ طِبْنَ فرما کر بتایا گیا، تو فَكُلُوْهُ هَنِیْٓئًا مَّرِیْٓئًا، یہ جملہ شرط کی جزاء، كُلُوْا میں خاوندوں سے خطاب ہے، اُكُلْ کے معنی تو ہیں کھانا، مگر یہاں مراد مطلقاً استعمال ہے، چونکہ کھانا مال کے تمام مقاصد سے اعلیٰ مقصد ہے، اس لئے اس کا ذکر ہوا، هَنِیْٓئًا اور مَّرِیْٓئًا دونوں صفت مشبہ ہیں بروزن فعیل، هَنِیْٓ کا مصدر هَنُوْءٌ ہے بمعنی بے تکلف حلق سے اتر جانا جسے سَائِغًا بھی کہا جاتا ہے، مَرِیْ کا ماخذ مَرُوْ یا امرؤا ہے، موء معدہ کے منہ کو کہتے ہیں، جو چیز معدہ میں ثقیل نہ ہو، آسانی سے ہضم ہو جائے وہ مری ہے، خلاصہ یہ ہے کہ نگلنے میں آسان هَنِیْٓئًا ہے، ہضم میں آسان مَّرِیْٓئًا، اب هَنِیْٓئًا بمعنی مبارک بولا جاتا ہے، کہا جاتا ہے هَنِیْٓئًا لَکَ، تجھے مبارک ہو، یعنی تو تم ان کا بخشا ہوا یا معاف کیا ہوا مہر استعمال کرلو، جو تمہارے لئے لذیذ بھی ہے، حلال بھی، کہ اس پر پکڑ نہیں، خیال رہے کہ هَنِیْٓئًا مَّرِیْٓئًا یا تو اکلاً پوشیدہ مصدر کی صفتیں ہیں یا فَكُلُوْهُ کی ہٗ ضمیر سے حال، دونوں صورتوں میں مقصد یہ ہی ہے کہ تم بیویوں کو ان کا مہر دے دو، لیکن اگر وہ خود پورا مہر یا کچھ حصہ واپس دے دیں یا معاف کر دیں، تو تمہارے لئے وہ حلال وطیب ہے تم پر اس میں کچھ پکڑ نہیں،

خلاصہ تفسیر

اے یتیم لڑکیوں کے والیو! اگر تمہیں خطرہ ہو کہ اگر تم ان یتیم بچیوں سے نکاح کرلو، تو ان سے انصاف نہ کرو گے، اور دوسری

نہیں۔**نواں اعتراض:** اس آیت میں یہودی و نصاریٰ کو ہمارے اسلام پر گواہ بنایا گیا۔ کہ ارشاد ہوا۔ فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ حالانکہ وہ کفار ہیں۔ اور کفار کی گواہی مسلمانوں پر شرعاً معتبر نہیں۔ پھر اس آیت کا مطلب کیا۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ یہ گواہی قیامت کے متعلق ہے۔ یعنی اے اہل کتاب تم قیامت میں ہمارے اسلام کی گواہی دینا جیسا کہ ہم تمہارے کفر کی گواہی دیں گے۔ وہاں کفار کی گواہی مسلمانوں کے موافق قبول ہوگی۔ حدیث شریف میں ہے کہ جہاں تک موذن کی اذان کی آواز پہنچتی ہے وہاں تک کی ہر چیز اس کے ایمان کی گواہی دے گی۔ ہر چیز میں اس علاقہ وایریا کے کفار بھی داخل ہیں۔ یہ بھی مسلمانوں کے ایمان کی گواہی دیں گے۔ قیامت میں کفار تو اپنا کفر چھپائیں گے۔ بلکہ اس سے انکاری ہی ہو جائیں گے کہ کہیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (انعام:۲۳) اور مسلمان ان کے خلاف گواہی دیں گے کہ یہ کفار تھے ان کا کفر ہم نے دیکھا تھا مگر مسلمان اپنے اسلام کے اقراری ہوں گے قبر میں بھی قیامت میں بھی اور کفار سے ان کے ایمان کی گواہی لی جائے گی۔ تو مسلمانوں کی گواہی کفار کے خلاف ہوگی۔ اور کفار کی گواہی مسلمانوں کے حق میں لہٰذا اشھدوا نہایت ہی درست وصحیح ہے۔ اگر مسلمان ان سے یہ نہ بھی کہیں۔ تب بھی انہیں گواہی دینا پڑے گی۔ یہ کہنا اہمیت کے لئے ہے۔ دوسرا یہ کہ کفار کی گواہی کے مقابل اور مسلمانوں کے موافق قبول ہوتی ہے۔ اگر مسلمان مدعی اور کافر مدعیٰ علیہ ہو اور اس مدعی علیہ کا ہم مذہب مسلمان کے حق میں گواہی دے تو مانی جائے گی۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے تیسرا یہ کہ یہاں شہادت سے اصلاحی معنی مراد نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اچھا تم اقرار کرلو کہ ہم دین حق پر ہیں مسلم ہیں اور تم کافر ہو گویا ان سے اپنی بے ایمانی کا اقرار کرانا منظور ہے۔ چوتھا یہ کہ اس سے اپنی پختگی اور اہل کتاب کی کمزوری کا اظہار مقصود ہے۔ شہادت بمعنی معائنہ ہے۔ یعنی دیکھ لو ہم مسلمان ہیں تمہاری طرح اپنے دین کو چھپاتے نہیں تم میں صدہا منافق ہیں جو اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں ہم میں ایسا کوئی نہیں جو اپنے کو یہودی ظاہر کرے تمہارا اپنے دین کو چھپانا اپنی کمزوری کا اقرار ہے۔ اور ہمارا اسلام کو ظاہر کرنا اپنی قوت کا اعتراف مسلم بمعنی کھلا مومن۔

تفسیر صوفیانہ

تمام آسمانی ادیان طریقہ عبادت میں مختلف ہیں۔ مگر عبودیت سب کی ایک گویا شریعتیں جداگانہ ہیں اور طریقتیں متحد اسی لئے ارشاد ہوا تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ طریقہ تقرب میں اختلاف ہے اور قرب میں اتحاد اور وہ مشترک چیز یہ ہے کہ ہم عبادت میں سواء رضاء الٰہی کے اور کچھ طلب نہ کریں۔ رب سے رب ہی کو مانگیں نہ کہ غیر رب کو نیز طلب رزق میں اسباب و وسائل پر توجہ نہ کریں۔ اور کسی کو اپنا رب نہ مانیں اگر کفار اس قاعدہ سے منہ پھیریں تو تم انہیں اپنی اطاعت و فرمانبرداری‘ توحید‘ اخلاص اور شرک جلی و خفی سے براءت پر گواہ بنالو۔ تاکہ قیامت کے دن وہ تمہارے اسلام و توحید پر گواہ ہوں۔ اور تم ان کے کفر و شرک پر حضور ﷺ نے ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ جب تم جنگل میں ہو اور نماز کا وقت آ جائے تو بلند آواز سے اذان کہو کیونکہ جہاں تک تمہاری آواز پہنچے گی وہاں تک کے جن وانس‘ شجر و حجر اور ساری چیزیں قیامت میں تمہارے ایمان کی گواہی دیں گی۔ انس کے عموم سے معلوم ہوا کہ کفار بھی مسلمانوں کے ایمان کی گواہی دیں گے۔ توحید اصل اصول ہے اور مضبوط رسی۔ یہ عالم غیب سے اس کو ملتی ہے جس پر رب تعالیٰ کا کرم ہوتا ہے۔ وہ ابراہیم علیہ السلام جو انبیائے کرام کے والد

والوں کو دے یا سسرال والوں کو، جیسا کہ فَاِنْ طِبْنَ الخ سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** دیا ہوا مہر خاوند واپس لے سکتا ہے اگر عورت خود اپنی خوشی سے دے، اس میں نہ حرمت ہے نہ اور کوئی قباحت، جیسا کہ فَکُلُوْهُ الخ سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** جبراً مہر معاف کرانا یا واپس لینا حرام ہے، اگر لیا تو خاوند مالک نہ ہوگا، جیسا کہ طِبْنَ الخ سے معلوم ہوا، رب تعالیٰ فرماتا ہے فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْئًا (النساء: ۲۰) حضرت عمر و قاضی ابو شریح نے تو حکم دیا تھا کہ اگر عورت مہر دے کر پھر واپس لے تو لے سکتی ہے کہ واپسی کے مطالبہ سے معلوم ہوا کہ اس نے اسے بخوشی نہ دیا تھا جبراً دیا تھا، دیکھو روح المعانی و کبیر، مگر جب واقعی خوشی سے دے دے تو واپس نہیں لے سکتی، کہ زوجیت ہبہ میں رد سے مانع ہے، احناف، بلکہ چاروں اماموں کا یہ ہی مذہب ہے، **ساتواں فائدہ:** عورت کے مہر کا پیسہ بہت مبارک ہے، اس میں شفاء ہے جیسا کہ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا سے معلوم ہوا، عبد حمید وغیرہ محدثین نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرمایا کہ جو کوئی بیمار ہو وہ اپنی بیوی سے اس کا مہر لے، تین درہم یا کم وبیش، اس سے شہد خریدے، بارش کے پانی میں شہد ڈال کر پیئے، انشاء اللہ شفا ہوگی، کہ رب تعالیٰ نے بارش کے پانی کو مَآءً مُّبٰرَكًا فرمایا، وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا (ق: ۹) اور شہد کو شفاء فرمایا فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (نحل: ۶۹) اور بیوی کے مہر کو هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا (النساء: ۴) فرمایا، جب ان تینوں کا اجتماع ہوگا تو ضرور رب تعالیٰ کرم فرمائے گا (روح المعانی) اسی لئے علماء فرماتے ہیں کہ درود شریف میں شفاء ہے کہ یہ ہماری پہلی ماں حضرت حواء کا مہر ہے جیسا کہ پہلے گزر گیا، **آٹھواں فائدہ:** مہر صرف مال ہو سکتا ہے غیر مال نہیں ہو سکتا، کیونکہ لین دین، معافی وغیرہ مال کی ہوتی ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے، اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ (النساء: ۲۴) یہاں فرمایا وَاٰتُوا النِّسَآءَ، **نواں فائدہ:** عورت کا مہر مرد کی طرف سے عطیہ و تحفہ ہے جو اس کے ذمہ لازم قرار دیا گیا، کسی چیز کی قیمت یا اجرت نہیں، اسی لئے خاوند عورت کے کسی عضو کا مالک نہیں ہوتا، رہا انتفاع وہ عورت مرد دونوں کو ہے، جیسا کہ نِحْلَةً کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا (تفسیر کبیر وغیرہ)، **دسواں فائدہ:** مولیٰ اپنی لونڈی سے، مالکہ اپنے غلام سے نکاح نہیں کر سکتے، جیسا کہ اَوْ مَا مَلَكَتْ کے عطف سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ نے اسے نکاح پر معطوف کیا، اور ہمیشہ معطوف، معطوف علیہ کا غیر ہوتا ہے، (روح المعانی) اس کے قوی دلائل کتب فقہ میں ملاحظہ کرو، **گیارھواں فائدہ:** ایک آزاد مرد چار بیویوں سے بیک وقت نکاح کر سکتا ہے زیادہ سے نہیں، مگر عورت صرف ایک ہی مرد کے نکاح میں رہ سکتی ہے، وہ ایک سے زیادہ بیک وقت نکاح نہیں کر سکتی، جیسا کہ مَثْنٰی الخ سے معلوم ہوا، **بارھواں فائدہ:** حضور نبی کریم ﷺ احکام قرابت میں کہیں داخل نہیں بھی ہوئے، صرف امت کو وہ احکام دیئے جاتے ہیں، دیکھو فَانْكِحُوْا الخ کے حکم میں حضور انور ﷺ داخل نہیں، آپ کو جس قدر چاہیں بیویاں رکھنے کی اجازت ہے، چار کی پابندی ہمارے لئے ہے، حضور انور ﷺ کی وفات کے وقت ۹ بیویاں آپ کے نکاح میں تھیں، اس کی نفیس ولذیذ تحقیق ہماری کتاب ''درس القرآن'' میں دیکھو، **تیرھواں فائدہ:** بلکہ حضور انور ﷺ جس امتی کو چاہیں جیسا حکم قرآن کریم سے چاہیں علیحدہ فرما دیں، دیکھو یہاں مسلمانوں کو چار بیویاں تک رکھنے کی اجازت دی گئی، مگر حضرت علی کو فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی موجودگی میں دوسرے نکاح سے منع فرما دیا، اس کی تحقیق ہماری کتاب ''سلطنت مصطفیٰ''

تھے ابراہیم یہودی اور نہ عیسائی اور لیکن تھے وہ باطل سے مائل مسلمان
ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ ہر باطل سے جدا مسلمان تھے
وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٦٧﴾
اور نہ تھے وہ مشرکوں میں سے
اور مشرکوں سے نہ تھے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود و نصاریٰ کی بے علمی بتائی گئی۔ کہ یہ تاریخ سے ناواقف ہیں اب ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کا بیان ہے۔ کہ انہیں ہر بات میں اڑنے کی عادت ہے خواہ خبر ہو یا نہ ہو۔ گویا ایک عیب کے بعد ان کا دوسرا عیب بیان کیا جا رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ان کے جھگڑے کی ایک وجہ بیان کی گئی تھی یعنی لاعلمی۔ اب دوسری وجہ بیان ہو رہی ہے۔ یعنی عناد اور ہٹ دھرمی گویا ان کی ضد نا معلوم باتوں پر ہی موقوف نہیں بلکہ جو جانتے ہیں اس کا بھی بلاوجہ انکار ہی کئے جاتے ہیں۔ اے مسلمانو یہ مت سمجھنا کہ تم سے یہ محققانہ جواب سن کر خاموش ہو جائیں گے نہیں بلکہ یہ ہی کہے جائیں گے کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے۔ **تیسرا تعلق:** کسی بزرگ سے فیض نہ لینے کی دو وجہیں ہوتی ہیں جہالت اور ضد۔ جاہل اور ضدی ہر جگہ سے محروم لوٹتا ہے۔ وہ ہی ڈول کنویں سے پانی لاتا ہے جو خالی جائے جو پہلے ہی پیشاب سے بھرا ہو وہ کنویں کو ہی گندا کرے گا۔ پانی مطلقاً نہ لائے گا پچھلی آیت میں علماء یہود کی جہالت کا ذکر تھا اب ان کی ضد و عناد کا تذکرہ ہے۔ تاکہ مسلمانوں کو سمجھا دیا جائے کہ اگر ان بدنصیبوں پر تمہاری باتوں کا اثر نہ ہو تو تم ملول نہ ہو اس کی وجہ سے تمہاری تبلیغ کی کمی نہیں بلکہ وجہ ان کی اپنی عدم قابلیت ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں ابراہیم علیہ السلام سے یہودیت اور نصرانیت کا الزام نفیس طریقہ سے دور کیا گیا' اب بتایا جا رہا ہے کہ وہ کون تھے۔ اور ان کا دین کیا تھا گویا پہلے عیوب کی نفی تھی اب صفات کا ثبوت۔

تفسیر

هَا نْتُمْ هٰؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ ها حرف تنبیہ ہے۔ اور اَنْتُمْ مبتدا۔ هٰؤُلَاءِ خبر اوّل اور حَاجَجْتُمْ خبر دوم' بعض نے فرمایا کہ اَنْتُمْ سے پہلے یا پوشیدہ ہے۔ اور اتم اس کا منادا (خازن) اخفش نے کہا کہ یہ اصل میں ءَاَنْتُمْ تھا۔ ہمزہ استفہامیہ ھ سے بدل گئی جیسے ارقت سے حرقت اور الف زائدہ ہے۔ هٰؤُلَاءِ اسم اشارہ ہے۔ اور بعض کے نزدیک اصل میں اولاء بمعنی اَلَّذِىْ اور ھا زائدہ ہے اور حَاجَجْتُمْ اس کا صلہ۔ لہٰذا اس جملہ کے چند معنی ہوں گے۔ اَنْتُمْ میں یہود و نصاریٰ دونوں سے ہی خطاب ہے۔ یعنی خبردار تم ایسے بے وقوف ہو کہ اب تک اس میں تو جھگڑتے رہے جس کا تمہیں علم تھا یا کیا تم وہ لوگ ہو کہ اب تک تم نے اپنی معلومات کے بارے میں جھگڑا کیا یا کیا تم وہ جھگڑالو ہو کہ تم اپنی جانی ہوئی باتوں میں جھگڑے۔ خیال رہے کہ یہاں ما سے مراد یا تو نبی کریم علیہ السلام کی صفات ہیں اور علم سے مراد توریت و انجیل کا علم یا ما سے مراد حضرت موسیٰ

السلام کی ۹۹ بیویاں تھیں، رام چندر کے والد راجہ جسرتھ کی دو بیویاں تھیں، ہندوؤں کے مشہور اوتار کنھیا کے ایک ہزار بیویاں تھیں، اگر چند بیویاں رکھنا عورت پر ظلم ہے، تو کیا ان سب نے ظلم کیے؟ پنڈت جی اپنے گھر کی خبر لو عورت پر ظلم جب ہے جبکہ ان میں انصاف نہ کرے، قرآن کریم نے اسی لئے یہاں قید لگا دی کہ اگر انصاف نہ کرو تو ایک ہی بیوی رکھو، **چوتھا اعتراض:** جب مردوں کو چار بیویوں کی اجازت ہوئی تو عورتوں کو چار خاوندوں کی اجازت کیوں نہ ہوئی؟ **جواب:** دو وجہ سے ایک یہ کہ اس میں بے حیائی و بے غیرتی اول درجہ کی ہے، دوسرے یہ کہ بچہ کا نسب اپنے باپ سے چلتا ہے، چند خاوندوں کی صورت میں نہ معلوم ہوتا کہ بچہ کس مرد کا ہے، کون اس کی پرورش و تربیت کرے، اس صورت میں بچہ کی عمر برباد ہوتی، **پانچواں اعتراض:** جب مسلمانوں کو چار بیویوں کی پابندی ہے تو نبی کریم ﷺ نے ۹ بیویاں کیوں رکھیں؟ **جواب:** یہ حضور انور ﷺ کی خصوصیات سے ہے ان زیادہ ازواج میں صدہا حکمتیں تھیں، حضور انور ﷺ کی ازواج عورتوں کی مبلغہ تھیں، نیز حضور انور ﷺ نے ان قوموں کی لڑکیاں لیں جن سے رشتہ قائم ہونے کی وجہ سے اشاعت اسلام میں بہت مدد ملی، جیسے حضرت ام حبیبہ بنت ابوسفیان، صفیہ بنت حیی سردار یہود کی صاحبزادی وغیرہن رضی اللہ تعالیٰ عنہن، **چھٹا اعتراض:** اسلام میں لونڈیوں کا سلسلہ کیوں رکھا گیا یہ تو خلاف انسانیت معلوم ہوتا ہے، **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ اسلام غلامیت کو مٹانا تو چاہتا تھا، مگر چونکہ یہ مسئلہ بین الاقوامی تھا، جب تک کہ دوسری قومیں اسے تسلیم نہ کر لیتیں تب تک غلامیت بند نہ ہوتی ورنہ ہم تو کافروں کو آزاد چھوڑ دیتے اور ہمارے آدمی جنگ میں قید ہو کر کفار کے لونڈی غلام بنتے رہتے، ہاں اسلام نے بات بات پر غلام آزاد کرنے کا حکم دیا حتیٰ کہ قسم کے کفارہ میں غلام آزاد کرایا پھر لونڈی غلاموں سے برابر کے سلوک کا حکم دیا، دوسرے یہ کہ غلامیت کفر کا اثر ہے کہ جو کفار بحالتِ جہاد گرفتار ہوں وہ لونڈی غلام بنائے جائیں، جب جہاد میں کفار کو جان سے مار دینے کی بھی اجازت ہے تو اسے غلام بنا لینے کی بھی اجازت ہے، حربی کافر جانور کی مثل ہے کہ اس کا ذبح بھی جائز اس کو مملوک بنا کر رکھنا بھی درست، اب چونکہ بین الاقوامی قانون سے یہ چیزیں ختم ہوگئیں، تو غلامیت کا سلسلہ بھی بند ہو گیا، **ساتواں اعتراض:** تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ لونڈی کا مولیٰ پر کچھ حق نہیں، تو کیا اسے بھوکے پیاسے بھی مار سکتے ہیں، **جواب:** لونڈی کا مولیٰ پر حقِ زوجیت نہیں، حقِ ملکیت غذا پانی لباس وغیرہ ضرور ہے، یہ حق تو جانوروں کا بھی مالک پر ہے، مملوکہ جانور کو بھوکا پیاسا رکھنا، اس سے طاقت سے زیادہ کام لینا سخت جرم ہے، آج بھی چار سے زیادہ سواریاں لادنا جرم ہے، کیوں؟ جانور کے حق کی وجہ سے، **آٹھواں اعتراض:** فَانْكِحُوْا حکم عام ہے جو غلام و آزاد سب مردوں کو شامل ہے، تو چاہیے کہ غلاموں کو بھی چار بیویوں کی اجازت ہو تم نے اس کے لئے دو کی پابندی کہاں سے لگائی؟ **جواب:** آیت کریمہ کی اگلی عبارت ہی بتا رہی ہے کہ یہ حکم صرف آزادوں کو ہے، کیونکہ آگے ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر انصاف نہ کر سکو تو ایک بیوی سے نکاح کر دیا جس کے مالک ہو اس پر کفایت کرو، اور ظاہر ہے کہ غلام کسی لونڈی کا مالک نہیں ہوتا، نیز آگے فرمایا کہ بیویوں کو ان کے مہر دے دو، اور ظاہر ہے کہ غلام اپنی بیوی کا مہر نہیں دیتا کہ اس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں، بلکہ اس کا مہر مولیٰ دیتا ہے، نیز آگے ارشاد ہے کہ اگر بیویاں تمہیں کچھ مہر واپس کر دیں یا بخش دیں تو کھاؤ، اور

ستھرے رہے اور اس کے ساتھ ہی وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ یا تو یہ عطف تفسیری ہے اور حنیف و مسلم کا بیان۔ اس صورت میں مشرکین سے مراد عیسائی یہودی ہوں گے کیونکہ یہ صلیب وغیرہ کے پجاری ہیں اور عیسیٰ و عزیر علیہما السلام کو خدا کا شریک مانتے ہیں۔ یا علیحدہ مضمون ہے۔ اس صورت میں مشرکین سے کفار عرب مراد ہوں گے یعنی نہ وہ یہودی تھے نہ عیسائی' نہ بت پرست مشرک۔ کیونکہ یہ چیزیں اسلام اور اطاعت کے خلاف ہیں۔ وہ ان سب سے جدا سچے پکے مسلمان تھے۔ لہٰذا تم دونوں جھوٹے ہو۔

خلاصہ تفسیر

اے اہل کتاب اسلام کی حقانیت پیغمبر اسلام ﷺ کی صداقت جس کا تمہیں پورا یقین ہے۔ اور جس کی گواہی توریت و انجیل دے رہی ہیں' تم نے اس کا اقرار کیا۔ توریت و انجیل میں رب کی وحدانیت کا اعلان ہے مگر تم نے دو تین خدا مان لئے اور موحدین سے جھگڑتے رہے۔ توریت و انجیل میں اعلان ہے کہ حضرت عیسیٰ و مریم رب کے بندے ہیں۔ تم نے انہیں رب کی بیوی بچے کہا۔ اور مسلمانوں سے جھگڑے بلکہ تم نے خود موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑے کئے...... اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مخالفتیں کیں۔ ہمیشہ جھگڑتے ہی رہے۔ تو اب ابراہیم علیہ السلام کے دین اور ان کی ملت کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔ نہ اس کا تمہیں علم ہے اور نہ توریت و انجیل میں ان کا ذکر۔ اس کی خبر اللہ ہی کو ہے جو ان کا خالق و مالک ہے۔ تمہیں کیا پتہ' تمہارے علم کا ذریعہ صرف توریت و انجیل تھیں۔ جب وہ ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں خاموش ہیں تو تم کیوں لڑتے مرتے ہو۔ ہم سے سنو کہ ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے' نہ عیسائی' نہ بت پرست۔ وہ ان تمام دینوں سے دور اور ان تمام بیہودگیوں سے نفور اللہ کے سچے فرمانبردار بندے تھے اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ ان میں سے ہوتے کیونکہ یہ عقیدے یہ کام ان کے بعد کی پیداوار ہیں۔ الوہیت مسیح و عزیر کا عقیدہ ان کے زمانہ میں کہاں سے آیا۔ صلیب کی پوجا بیت المقدس کی طرف نماز ان کے زمانہ میں کہاں تھی۔ بیت المقدس کی یہ عمارت ان سے بہت بعد تعمیر ہوئی۔ صلیب وغیرہ جب کہاں تھی۔ ایسے ہی یہودی اور نصرانی نام اس زمانے میں تھے ہی نہیں۔ یہودا کے بعد یہودی بنے اور عیسیٰ علیہ السلام کے مددگار نصرانی کہلائے۔ جب ان کے زمانہ پاک میں نہ یہودا تھے نہ عیسیٰ علیہ السلام تو ان کا یہ نام کہاں سے آیا۔ نیز وہ شرک و بت پرستی مٹانے کے لئے آئے تھے۔ اسی پر نمرود سے مقابلہ کیا۔ اسی بنا پر آگ میں ڈالے گئے پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ خود ہی شرک کرتے۔ لہٰذا تمہارا یہ قول عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔ خیال رہے کہ اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تین چیزوں کی نفی کی گئی۔ یہودیت' نصرانیت' شرک اور دو چیزیں آپ کے لئے ثابت کی گئیں۔ حنیف ہونا' مسلم ہونا نفی کی تین چیزوں کے لئے دو جگہ ما کان ارشاد ہوا۔ اور مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ میں یا تو مشرکین مکہ کی تردید ہے جو حضرت ابراہیم کو مشرک کہہ کر اپنے کو دین ابراہیمی پر کہتے تھے اور یا خود یہود و نصاریٰ کی تردید ہے یعنی نہ تو ابراہیم اصلی یہودی و عیسائی تھے جن میں توحید تھی اور نہ موجودہ یہودیت و عیسائیت پر تھے۔ جس میں شرک و بت پرستی ہے کہ تم لوگ مشرک ہو چکے۔ وہ جناب مشرکین میں سے نہ تھے۔

لطیفہ: حضرت قبلہ شاہ سید محمد صاحب محدث کچھوچھوی دام ظلہم کی ایک شیعہ سے اس پر گفتگو ہوئی کہ سنی اور شیعہ میں کون مذہب پرانا ہے۔ محدث صاحب نے فرمایا کہ پرانا مذہب وہی ہے اس لئے اس کا نام ہے۔ اہل سنت والجماعت۔ جب سے

وہاں جواب ضرور دینا ہے؟

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ
اور نہ دو نادانوں کو اپنے مال کہ بنایا
اور بے عقلوں کو ان کے مال نہ دو جو تمہارے پاس ہیں
جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا
اللہ نے واسطے تمہارے باعث قیام اور روزی دو نہیں اس مال میں
جن کو اللہ نے تمہاری بسر اوقات کیا ہے اور انہیں اسی میں سے کھلاؤ
وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝
اور کپڑا دو ان کو اور کہو ان سے بات پسندیدہ
اور پہناؤ اور ان سے اچھی بات کہو

تعلقات

اس آیت کا گذشتہ آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** گذشتہ آیتوں میں یتیموں کے والیوں کو حکم دیا گیا تھا کہ یتیموں کا مال ان کے حوالے کرو، اب فرمایا جا رہا ہے کہ حوالہ جب کرو جب ان میں مال سنبھالنے کی قابلیت بھی ہو، نا قابل یتیموں کا مال اپنے قبضہ میں رکھو گویا پہلے حکم تھا، اب اس حکم کی شرائط کا بیان ہے، **دوسرا تعلق:** گذشتہ آیات میں حکم تھا کہ اپنی بیویوں کا مہر دے دو، ان کا قبضہ کرا دو، اب حکم ہے کہ جو بیویاں نا سمجھ، بے وقوف ہوں، جو مال کو صحیح طور پر خرچ کرنا نہ جانتی ہوں انہیں ہرگز نہ دو تاوقتیکہ ان میں سمجھ آ جائے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیات میں مال خرچ کرنے کا ذکر تھا، اب مال کی قدر کا ذکر ہو رہا ہے، کہ مال کے ذریعہ بہت سے شرعی احکام وابستہ ہیں، **چوتھا تعلق:** گذشتہ آیات میں مال دینے والوں کا ذکر تھا، اب مال لینے والوں کا ذکر ہے کہ مال کا تعلق دینے والوں سے بھی ہے اور لینے والوں سے بھی، دینے والوں کا ذکر پہلے تھا، لینے والوں کا اب ہو رہا ہے،

تفسیر

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمْ ظاہر یہ ہے کہ لَا تُؤْتُوا میں خطاب یتیموں کے والیوں سے ہے جن سے پہلے بھی خطاب تھا، اور ہو سکتا ہے کہ خاوندوں سے خطاب ہو، جن سے ابھی ابھی خطاب تھا، لَا تُؤْتُوا سے مراد ان کو مالک بنا دینا ہے، السُّفَهَاءَ سفیہ کی جمع ہے، اس کی تحقیق پہلے پارے کے شروع میں ہو چکی کہ سفاہت کے معنی ہیں خفت عقل، یہاں وہ دیوانہ پن یا پاگل پن مراد ہے جس کی وجہ سے انسان محجور التصرف ہو جاتا ہے کہ اسے شرعاً مالی لین دین اور مالی معاملات کرنے کا حق نہیں ہوتا،

فائدہ: دینی مسائل پر علمی و عقلی دلائل قائم کرنا اور مخالفین کے شبہات کا رد کرنا اشد ضروری اور باعث ثواب ہے۔ جیسا کہ ان آیات میں کیا گیا۔ **پانچواں فائدہ:** بغیر علم مناظرہ و مجادلہ کرنا سخت برا ہے۔ جاہل اگر اتفاقاً حق بھی کہہ جائے تب بھی خطا کار ہے کیونکہ اگر اسے بغیر علم مسائل بیان کرنے کی ہمت ہوگئی تو بارہا غلطی کرکے لوگوں کو گمراہ کرے گا۔ دیکھو رب تعالیٰ نے یہود کو بغیر علم مناظرہ کرنے پر ملامت فرمائی مناظرے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اور اپنے مقابل کے مذہب سے بخوبی واقف ہو (از احکام القرآن)

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب صاحب علم تھے۔ اور ان کے علمی مناظرے درست و جائز تھے کیونکہ رب تعالیٰ نے ان کے متعلق دو باتیں فرمائیں۔ ایک اپنی معلومات پر مناظرہ کرنا' اس پر کوئی ملامت نہ کی۔ دوسرا بغیر علم کج بحثی کرنا۔ اس پر ملامت کرتے ہوئے فرمایا فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ کیا یہ درست ہے؟ **جواب:** اس کے نفیس جوابات تفسیر میں گذر گئے کہ علم سے ان کا ادعائی علم مراد ہے۔ یا وہ چیزیں جو توریت و انجیل میں جن کا ذکر ہے جیسے حضور ﷺ کے اوصاف حمیدہ یا حضرت عیسیٰ و موسیٰ علیہما السلام کے حالات لہٰذا اس سے ان کی تعریف مقصود نہیں بلکہ ان پر ملامت منظور ہے۔ یعنی جن چیزوں کا تمہیں علم دیا گیا تم نے انہیں بھی قبول نہ کیا۔ ان میں بھی کج بحثی کی اس لئے حَاجَجْتُمْ فرمایا گیا۔ کیونکہ جانی پہچانی بات کو نہ مان کر اس پر کج بحثی کرنا اور بھی زیادہ برا ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام مسلم تھے اور ان کا دین اسلام تھا۔ آیا ان کا دین صرف اصول عقائد میں اسلام کے مطابق تھا یا اصول و فروع سب میں۔ اگر صرف اصول میں تھا تو وہ یہودی و نصرانی بھی تھے کیونکہ اصل عقائد میں سارے پیغمبر یکساں ہیں اور اگر فروع میں بھی اسلام کے موافق تھے تو ظاہر ہے کہ اسلامی نماز میں تلاوت قرآن فرض ہے۔ ان کی نماز میں نہ تھا کیونکہ اس وقت قرآن اترا ہی نہ تھا۔ اسی طرح اسلام میں حدیث پاک کا درس' تلاوت قرآن کی مجالس عبادت بھی اس زمانہ میں نہ تھے پھر ان کے مسلم ہونے کے کیا معنی؟ **جواب:** اس کا تفصیلی جواب سورۂ بقر قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا (بقرہ:۱۳۵) کی تفسیر میں گذر گیا۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ موجودہ یہودیت و عیسائیت اصولاً بھی دین ابراہیمی کے خلاف ہے نہ کہ اصلی دین موسوی و عیسوی۔ لہٰذا ابراہیم علیہ السلام اصولاً مسلمان تھے نہ یہودی و عیسائی۔ کیونکہ وہ نہ الوہیت مسیح کے معتقد تھے نہ صلیب کے پجاری۔ یا یہ کہ ابراہیم علیہ السلام سارے اصول اور اکثر فروع میں اسلام کے موافق تھے۔ جیسا کہ سورہ بقر میں تفصیل وار بیان ہو چکا۔

تفسیر صوفیانہ

علم مفید بھی ہے مضر بھی۔ جس علم سے ہدایت ملے دل میں اطاعت کا جذبہ پیدا ہو' عبادت کا شوق ہو اس میں تصوف کی چاشنی ہو۔ وہ مفید ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا۔

کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

جس علم سے کج بحثی' ضد' ہٹ دھرمی پیدا ہو اور جس میں تصوف کی چاشنی نہ ہو وہ سخت نقصان دہ ہے۔ اسی کے بارے میں فرمایا

خلاصه تفسیر

اے یتیموں کے والیو! تم کو حکم تو دیا گیا ہے کہ یتیموں کا مال ان کو دے دو، مگر خیال رکھنا کہ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، یہ مال دینے کا بھی وقت ہے، جب تک وہ نابالغ ہوں یا اگر وہ مجنوں دیوانہ ہوں تو ایسے نادانوں ناسمجھ بچوں دیوانوں کو ان کا وہ مال نہ دو جو تمہارے پاس ہے، جانتے ہو کہ مال ہی وہ نعمت ہے جو تمہارے لئے بقائے زندگی، عیش و آرامِ جاں اور گذر اوقات کا ذریعہ ہے، اس کی قدر کرو، اسے دیوانوں کے حوالہ کر کے برباد نہ کراؤ، ہاں اسی مال میں یتیموں کو بقدر حیثیت کھانا کپڑا دیتے رہو اس طرح کہ مال تجارت سے بڑھاؤ اور نفع ان پر خرچ کرو، اور ہمیشہ ان سے اچھی بات کرو کہ انہیں مال سے مایوس نہ کرو، دینے کا وعدہ کرتے رہو یا انہیں علم و ادب و ہنر سکھاؤ، **نوٹ:** عام صحابہ و مفسرین نے اس آیت کریمہ کی یہی تفسیر کی ہے مگر حضرت عبداللہ ابن مسعود و عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ سفہآء سے مراد بے عقل دیوانی بیویاں اور نا سمجھ بچے و یتیم سب ہی ہیں، یتیموں کے والیوں، خاوندوں وغیرہ سب کو حکم دیا گیا ہے کہ ناسمجھ دیوانوں اور نابالغوں کو مال نہ دیں ورنہ وہ ضائع کر دیں گے، **حضرت انس** رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت بارگاہِ نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر بولی کہ ہماری برائیاں تو بہت ہیں، ہم ناقصِ عقل، ناقصِ دین سب کچھ ہیں، کچھ ہمارے فضائل بھی ہیں فرمایا ہاں تم میں سے حاملہ عورت کو مرابط فی سبیل اللہ یعنی تیاری جہاد کرنے والوں کا ثواب ہے، جنتے وقت اس شہید کا ثواب ہے جو اپنے خون میں لوٹے، اور دودھ پلانے کے زمانہ میں بچہ کے ہر گھونٹ پر غلام آزاد کرنے کا ثواب، بچہ کی پرورش میں راتوں کے جاگنے پر شب بیداری و ریاضت کا ثواب بشرطیکہ اللہ کی اور اپنے خاوند کی مطیع رہے (روح المعانی)

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** مال اللہ تعالیٰ کی بڑی اعلیٰ نعمت ہے، اس کی قدر اور اس کی حفاظت چاہیے جیسا کہ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ سے معلوم ہوا، قرآن کریم میں مال کی حفاظت کے متعلق بہت آیات وارد ہوئیں، چنانچہ قرآن کریم کی سب سے بڑی آیت یعنی آیت مداینہ قرض کے لین دین کی آیت ہے جس میں قرض کی تحریر دستاویز لکھنے کا طریقہ وغیرہ سکھایا گیا، کیوں حفاظت مال کے لئے، نیز رب تعالیٰ نے فرمایا لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا (الاسراء: ۲۶) فضول خرچی نہ کرو، اور فرماتا ہے وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ (الاسراء: ۲۹) خرچ میں ہاتھ کھول نہ دو، اور فرماتا ہے لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا (فرقان: ۶۷) مومن وہ ہیں جو خرچ کرنے میں زیادتی و کمی نہیں کرتے، یہ تمام احکام حفاظتِ مال کے لئے ہیں، حضرت قیس ابن جد دعا کرتے تھے، خدایا مجھے حمد و مجد دے، حمد بغیر اعمال حاصل نہیں ہوتی اور مجد بغیر مال ناممکن ہے، سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ مال کمانے سے غافل نہ رہو، تجارت وغیرہ کرتے رہو، کیونکہ آج غریب آدمی پہلے اپنا دین کھاتا ہے، اسلام کی اکثر عبادات مال پر موقوف ہیں، زکوٰۃ، قربانی، حج، جہاد، فطرہ، خدمتِ والدین وغیرہ، بغیر مال ناممکن ہے، دیکھو یہاں رب تعالیٰ نے ہمارے مال کو ہمارے لئے قیام یعنی بقا کا ذریعہ فرمایا، لہٰذا مسلمانوں پر مال کمانا اور کمانے کے بعد اس کی حفاظت کرنا اشد ضروری ہے (کبیر و معانی) فراغت قلبی بغیر مال ناممکن ہے، اور بغیر فراغت دلی عبادات میں کمال نہیں

ایمان والے اور ایمان والوں کا والی اللہ ہے کتابیوں کا ایک گروہ

الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾

کتاب والوں میں سے کاش گمراہ کر دیں وہ تم کو اور نہیں گمراہ کرتے وہ مگر جانوں اپنی کو اور نہیں شعور رکھتے

دل سے چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں گمراہ کر دیں اور وہ اپنے ہی آپ کو گمراہ کرتے ہیں اور انہیں شعور نہیں

تعلق

ان آیتوں کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا تعین کیا گیا کہ ان کا دین کیا تھا۔ اب ان کے متعین کا تقرر فرمایا جا رہا ہے کہ ان کے دین پر کون ہے؟ **دوسرا تعلق:** یہود کے دو دعوے تھے ایک یہ کہ ابراہیم علیہ السلام ان کے دین پر تھے۔ دوسرا یہ کہ ہم لوگ ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار ہیں پچھلی آیتوں میں ان کے پہلے دعویٰ کی تردید تھی اور اب ان کے دوسرے دعویٰ کا رد فرمایا جا رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں بتایا گیا کہ یہودی ضدی اور ہٹ دھرم ہیں۔ حق قبول کرنے والے نہیں۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ وہ خود تو ایمان کیا لاتے تمہیں ایمان سے پھیرنے کی کوشش میں ہیں گویا پہلے ان کی گمراہی کا ذکر تھا۔ اب گمراہ گری کا کہ ان کی بیماری متعدی ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیتوں میں یہودیت و نصرانیت کے نام اور ان کے عقائد سے ثابت فرمایا گیا کہ ابراہیم اس دین پر نہیں ہو سکتے کہ ان کے زمانہ میں نہ یہ نام تھے نہ یہ عقائد۔ اب اس کا ثبوت کام سے دیا جا رہا ہے کہ جس کے یہ کام ہوں وہ ابراہیمی ہے ورنہ نہیں اور چونکہ اہل کتاب کے یہ کام نہیں۔ اس لئے وہ ابراہیمی نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہود و عیسائیوں کا کبھی تو یہ کہنا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمارے دین پر تھے اور کبھی کہتے تھے کہ ہم لوگ حضرت ابراہیم کے دین پر ہیں ان کی اولاد ہیں۔ ہماری جماعت بنی اسرائیل میں ہزارہا انبیاء کرام ہوئے۔ تم بنی اسمٰعیل میں کوئی نبی نہیں ہوا۔ سوائے اسمٰعیل علیہ السلام کے زیادہ نبیوں والا دین بھی افضل، اور زیادہ نبیوں والی قوم بھی بہتر، پہلے کلام کا جواب تو پچھلی آیات میں دیا گیا تھا۔ دوسری گفتگو کا جواب اب دیا جا رہا ہے۔ بہر حال یہ آیت کریمہ پچھلی آیات سے پورا پورا تعلق رکھتی ہے۔ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیات میں اشارۃً اہل کتاب کی ضد اور ہٹ دھرمی کا ذکر تھا کہ یہ اپنی گمراہی میں بڑے پکے ہیں۔ اب ان کی گمراہ گری کا ذکر ہے کہ خود تو ایمان کیا قبول کرتے یہ تو اے جماعت صحابہ تمہیں بہکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسے گمراہ گروں کی اصلاح کی امید کیا ہو سکتی ہے۔

شانِ نزول

(۱) عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار سرداران یہود نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا کہ اے محمد (ﷺ) آپ جانتے ہیں کہ ہمیں ابراہیم علیہ السلام سے نہایت قرب ہے کیونکہ وہ بھی یہودی تھے۔ ہم بھی یہودی آپ محض حسد سے انکار کرتے ہیں۔ اس پر پہلی آیت اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ الخ نازل ہوئی (روح المعانی)

(۲) کلبی نے عبداللہ ابن عباس اور محمد بن اسحٰق نے ابن شہاب سے (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) روایت کی کہ جب بعض مسلمان کفار

اولاد ہے، تو معنی یہ ہوئے، کہ نا سمجھ بیویوں کو ان کا مہر نہ دو، اور اپنے نادان بچوں کو اپنا مال نہ دو، اور ظاہر ہے کہ مہر ادا کرنے سے پہلے خاوند کا اپنا مال ہوتا ہے، اور اس کے بعد بیوی کی ملک بنتا ہے، دوسرے یہ کہ اَلسُّفَهَآءَ سے مراد نادان بے عقل یتیم بچے، اور اَمْوَالَكُمْ میں مال کی اضافت قبضہ کے لحاظ سے ہے نہ کہ ملکیت کے اعتبار سے، یعنی اپنا مقبوضہ مال جو یتیموں کی ملک ہے ان کو سپرد نہ کرو، تیسرے یہ کہ یتیموں کے مال کو مجازاً اولیاء کا مال فرمایا کہ جیسے تمہیں اپنے مال کا درد ہوتا ہے ویسے ہی ان کے مال کا درد کرو، یہ گویا تمہارا اپنا ہی مال ہے، **دوسرا اعتراض:** یہاں فرمایا گیا کہ اس مال کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے قیام کا ذریعہ بنایا، یتیموں کا مال والیوں کے بقاء کا ذریعہ نہیں، وہ تو یتیموں کے بقاء کا ذریعہ ہے تو یہ فرمان کیونکر درست ہوا؟
جواب: اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ یہاں مطلق مال کا ذکر ہے نہ کہ خاص یتیم کے مال کا یعنی مال بقاء انسان کا ذریعہ ہے، دوسرے یہ کہ اگر یتیم کا مال ہی مراد ہو، تو قیام سے مراد دینی قیام ہے، یعنی یتیموں کا مال تمہارے دین کے قیام کا ذریعہ ہے، اگر اس کی حفاظت کرو گے، ثواب پاؤ گے، برباد کرو گے، عذاب کے مستحق ہو گے، **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اَلسُّفَهَآءَ یعنی بے وقوفوں کو ان کا مال نہ دینا چاہیے، تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کیوں فرماتے ہیں کہ پچیس سال کی عمر پر بہر حال ان کا مال دے دیا جائے، عاقل ہوں یا نہ ہوں ان کا یہ فتویٰ اس آیت کے خلاف ہے، (شوافع)
جواب: امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں اَلسُّفَهَآءَ سے مراد نابالغ بچے اور دیوانے لئے، کہ یہ دونوں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بھی مجور ہیں کہ وہ مال خود خرچ نہ کریں، ان کا ولی خرچ کرے، جب بچہ بالغ بھی ہو عاقل بھی، عمر بھی اس کی پختہ ہو جائے پھر اسے تصرف سے کیوں روکا جائے، ان کے پورے دلائل حدایہ، فتح القدیر وغیرہ میں ملاحظہ کرو، **چوتھا اعتراض:** تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ یتیم کا ولی یتیم کے مال میں تجارت کرے حالانکہ وہ تو محض امین ہے، امین کو امانت کے مال میں تجارت جائز نہیں، وہ صرف حفاظت کا ذمہ دار ہے، **جواب:** یتیم کا ولی محض امین نہیں بلکہ یتیم کا اور اس کے مال کا متولی بھی ہے، اور متولی کو ان تصرفات کا حق ہوتا ہے، اگر محض امین ہوتا، تو اسے یتیموں کی غذا و لباس کے انتظام کا بھی حق نہ ہوتا، حالانکہ یہاں ان دونوں کا حکم ہے،

تفسیر صوفیانہ

انسان کا مال اس کے دین و دنیا کے قیام کا ذریعہ ہے، عاقل وہ ہے جو اس مال کو بقدر ضرورت تو دنیا کے لئے خرچ کرے، باقی دینی مصلحتوں میں صرف کرے، سفیہ و بے وقوف وہ ہے جو اسے دنیا پر ہی صرف کرے، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ تیرے اندر ایک سفیہ نادان ساتھی موجود ہے جو تجھے ہر وقت غلط مشورہ دیتا ہے، یعنی تیرا نفس یہ سفیہ بھی ہے اور تیرا دشمن بھی، اس کے مشورے سے اس پر مال خرچ نہ کر کہ اس میں مال کی بربادی ہے، اسے صرف روزی دے یعنی بقدر ضرورت کھانا پینا اور لباس دے، جس سے نفس کے عیوب چھپ جائیں جو اس کے علاوہ خرچ ہیں وہ اسراف و فضول خرچی ہیں اور اس نفس سے ہمیشہ اچھی باتیں کہا کر کہ اے نفس تو نے اللہ کی روزی کھائی تو اس کا شکریہ بھی کر، تو نے اللہ تعالیٰ کا دیا لباس پہنا تو اس کی نافرمانی سے بچ، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اپنے کھانے کو عبادات کے جورن سے ہضم کرو، کم از کم یہ کہ ہر لقمہ پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو

غائبانہ ادا کی کہ حضرت جبریل امین نے ان کی نعش شریف حضور انور ﷺ کے سامنے پیش کی اور آپ نے نماز جنازہ ادا کی ان کے سوا حضور انور ﷺ نے کسی کی نماز جنازہ غائبانہ ادا نہ فرمائی اور نہ کسی صحابی نے کسی کا جنازہ غائبانہ پڑھا۔ حتیٰ کہ خود حضور ﷺ کا بھی نماز جنازہ غائبانہ کسی صحابی نے ادا نہ کی۔ حالانکہ اس وقت بہت صحابہ کرام مدینہ منورہ سے دور تھے۔ اس لئے مولانا خسرو نے فرمایا شعر ۔

کششے کہ عشق دارد نہ گذاردت بزیں سان بہ جنازہ گر نہ آئی بہ مزار خواہی آمد

دوسری آیت: وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ۔ کا شان نزول یہ ہے کہ ایک بار سرداران یہود نے حضرت عمار و حذیفہ و معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر ڈورے ڈالے اور انہیں یہودی بن جانے کی رغبت دی۔ تب آیت وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ الخ نازل ہوئی جس میں اہل کتاب کو مایوس کیا گیا۔ (تفسیر کبیر و معانی وغیرہ)

تفسیر

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ۔ چونکہ اس مضمون کے سارے اہل کتاب سخت منکر تھے اس لئے اسے اِنَّ اور لام تاکید سے مؤکد کیا۔ اَوْلیٰ ولی سے مشتق ہے بمعنی قرب اور استحقاق یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ یہ باب ضرب کا اسم تفضیل ہے۔ لہٰذا اس کے معنی ہوئے قریب ترین یا زیادہ حقدار۔ کہا جاتا ہے فُلَانٌ اَوْلٰى بِكَذَا يَعْنِيْ اَجْدَرُ۔ (روح المعانی) بعض نے اس کے معنی اخص بھی کئے ہیں اگر اولیٰ بمعنی قرب ہو تو قرب سے مراد یا تو قرب مکانی ہے یا قرب روحانی و دلی۔ یعنی قیامت میں حضرت ابراہیم سے قرب ترین یہ لوگ ہوں گے کیونکہ قیامت میں ہر شخص اسی کے ساتھ ہوگا جس کی محبت دنیا میں رکھتا تھا۔ یا دنیا میں حضرت ابراہیم سے قریب جنانی و ایمانی رکھنے والے یہ لوگ ہیں نہ کہ یہود و عیسائی و مشرکین کہ یہ تینوں دین ہیں۔ ان سے علیحدہ ہو گئے یا حضرت ابراہیم کے دعویٰ دار مستحق یہ لوگ ہیں نہ کہ یہود و عیسائی وغیرہ۔ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا سے ابراہیم علیہ السلام کے ہم زمانہ متبعین مراد ہیں۔ اس کلمہ میں عجیب راز ہے فرمایا جا رہا ہے کہ کوفہ والے جو کہ حضرت ابراہیم کے ہم وطن ہم قوم بلکہ عزیز و اہل قرابۃ بھی تھے مگر وہ آپ کے اقرب نہ ہوں کیونکہ آپ کے متبع نہ تھے۔ اور اہل شام جو نہ آپ کے ہم وطن تھے نہ ہم قوم نہ عزیز مگر متبع تھے وہ آپ سے اقرب ہوئے تو اے یہود و نصاریٰ تم صرف اولاد ابراہیم ہو کر ان سے اقرب کیسے ہو سکتے ہو جبکہ تم دین اعمال سب ہی میں ان کے خلاف ہو۔ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ یہ الَّذِيْنَ پر معطوف ہے اور تخصیص کے بعد تعمیم۔ هٰذا سے حضور ﷺ کی طرف اشارہ ہے۔ اٰمنوا کا متعلق پوشیدہ ہے۔ یعنی اٰمنوا باللہ یا بمحمد ﷺ۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام سے بہت قرب رکھنے والے یا ان کے زیادہ حقدار یا ان کے خاص لوگ وہ ہیں جو ان کے زمانہ میں ان کے دین پر تھے اور اب یہ پیغمبر اور ان کے متبعین ہیں خیال رہے کہ هٰذَا النَّبِيُّ کو اتَّبَعُوْا سے علیحدہ کرنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ یہ پیغمبر حقیقی معنی میں ابراہیم علیہ السلام کے تابعدار نہیں موافقت اور اتباع میں فرق ہے۔ نیز آئندہ وَالَّذِيْنَ اٰمنوا فرما کر اشارۃً بتایا گیا کہ نبی عام مومنین میں داخل نہیں۔ وہ خصوصی شان کے مالک ہیں کہ عام مومنوں کا ایمان سنا ہوا ہے اور نبی ﷺ کا ایمان دیکھا ہوا عام مومن ایمان لینے والے ہیں اور نبی ﷺ ایمان دینے والے۔ لہٰذا یاایُّها الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ کے خطاب میں حضور داخل نہیں ہوا کرتے۔ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ ولیٌّ ولایۃ سے

ان پر اور کافی ہے اللہ حساب لینے والا
گواہ کرلو اور اللہ کافی ہے حساب لینے والا

تعلقات

اس آیت کا گزشتہ آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** گزشتہ آیت میں والیوں کو حکم تھا کہ یتیموں کو ان کے مال دے دیں، اب ارشاد ہو رہا ہے کہ کب دیں، گویا دینے کا حکم پچھلی آیت میں تھا اور دینے کا وقت اس آیت میں بتایا جا رہا ہے، **دوسرا تعلق:** ابھی پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ نادانوں یتیموں کو مال حوالہ نہ کرو، اب ان کی نادانی دفع کرنے کا علاج، اس آیت میں ارشاد ہو رہا ہے، کہ ان سے تجارتیں کرواؤ، ان کی آزمائش کرو تاکہ نادانی دور ہو، غرضکہ بیماری کا ذکر پہلے تھا اور اس کے علاج کا ذکر اب ہے، **تیسرا تعلق:** گزشتہ آیت میں یتیموں کے والیوں کو یتیموں کا مال کھانے سے سخت منع فرمایا گیا تھا، اب بعض صورتوں میں کھانے کی اجازت دی جا رہی ہے، قانون کا بیان پہلے تھا اور قانون کی تشریح اب ہے، **چوتھا تعلق:** ابھی پچھلی آیت میں یتیموں سے اچھی بات کرنے کا حکم تھا، اب یہاں اس اچھی بات کی شرح کی جا رہی ہے کہ انہیں علم و ہنر سکھاؤ، انہیں جانچتے رہو، **پانچواں تعلق:** پچھلی آیات میں یتیموں کے مال سپرد کرنے کا حکم تھا، اب اس سپرد کرنے کے قاعدے ارشاد ہو رہے ہیں کہ دیتے وقت گواہ بنالو تاکہ بعد میں جھگڑا نہ ہو،

شانِ نزول

حضرت رفاعہ کا انتقال ہو گیا، ان کا فرزند ثابت ابن رفاعہ تھا جو ابھی بچہ تھا، چنانچہ یہ بچہ اور رفاعہ کا متروکہ مال رفاعہ کے بھائی کو سپرد ہوئے، ثابت کے یہ چچا حضور انور ﷺ کی خدمت عالی میں حاضر ہوئے، عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے ثابت یتیم اور اس کے مال کا متولی بنایا گیا ہے فرمایا جائے، کہ میں بحق خدمت اس مال میں سے کچھ کھا سکتا ہوں یا نہیں؟ اور یہ مال اس بچہ کو کب اور کس طرح حوالہ کروں، ان کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، جس میں ان کے تینوں سوالوں کے جوابات دیئے گئے، (تفسیر خازن)

تفسیر

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى اِبْتَلُوا باب افتعال سے ہے ابتلاء کا امر، اس کا مادہ بَلْوٌ ہے بمعنی جانچ، امتحان، آزمائش اسی سے ہے بلاء، کہ آفات میں بھی انسان کی جانچ ہوتی ہے، اس میں خطاب یتیموں کے والیوں سے ہے، حق یہ ہے کہ اس آزمائش سے مراد دینی و دنیاوی دونوں قسم کی آزمائشیں ہیں کہ والی اپنے زیرِ پرورش یتیموں کی ہر قسم کی آزمائش کرے، ان کے نماز روزے وغیرہ کو بھی آزمائے، ان سے تجارتی لین دین اور کاروبار بھی کرائے، یَتٰمٰی سے مراد وہ یتیم ہیں جو سمجھ دار بھی ہوں اور صاحبِ مال بھی، بالکل ناسمجھ بچے آزمائش کے قابل نہیں، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آزمائش کا طریقہ یہ ہے کہ ان کا کچھ مال انہیں حوالہ کر کے کہا جائے کہ اس سے کچھ تجارت کرو یا انہیں اپنی دکان پر بٹھایا جائے کہ وہ کچھ سودے بیچیں یا انہیں خریداری کے لئے دکانوں پر بھیجا جائے، امام شافعی کے ہاں اس جانچ کی یہ صورت نہیں، کیونکہ ان کے ہاں نابالغ بچے کو نہ تصرف کرنے

دھوکا دے رہے ہیں۔ نہ ان کے مٹائے قرآن شریف مٹے نہ سارے مسلمان بہکیں نہ اسلام ختم ہو۔ یعنی یہ یہود اپنی حرکتوں سے اپنی گمراہی میں ترقی دے رہے ہیں اور اپنی ہی جانوں کو ہلاک کر رہے ہیں لیکن بے وقوف ہیں۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۔ یہ شعور سے بنا جس کی نفیس تحقیق پارہ سیقول میں ہو چکی۔ یعنی انہیں اس کا شعور نہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے اہل کتاب تم اتباع ابراہیمی کا غلط دعویٰ کیوں کرتے ہو۔ ان سے قرب رکھنے والے وہ لوگ تھے جو اس سے پہلے ان کے مطیع و فرمانبردار رہے اور اب یہ نبی اور ان کے امتی ہیں کہ ان کے عقائد بعینہٖ عقائد ابراہیمی ہیں اور ان کے مخصوص عمل جیسے ناخن کٹانا' مونچھیں کتروانا اور داڑھی کا حد اعتدال میں رکھنا نہ مشت سے زیادہ نہ اس سے کم' حج کرنا خانہ کعبہ کا طواف' ختنہ' قربانی' روزے وغیرہ انہیں کے دین میں ہیں۔ تمہارے دین میں نہیں۔ لہٰذا ان کے کام سے ان کے حال کا پتہ لگاؤ۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ اللہ ان کا والی وارث ہے۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام کفار میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود آخر کار ان پر غالب رہے۔ ایسے ہی یہ بھی صد ہا دشمنوں میں گھر کر بھی غالب رہیں گے۔ اے مسلمانو تم ان اہل کتاب کے ایمان کی امید نہ رکھو۔ ان کی گمراہی یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ ان میں کا ایک گروہ تمہیں بہکا کر گمراہ کر دینے کا خواہشمند ہے جو فرقہ گمراہ اور گمراہ گر ہو اس کے ایمان کی کیا امید مگر اہل کتاب اطمینان رکھیں وہ تم میں کسی کو نہیں بہکا سکتے۔ اپنی ہی گمراہی میں اضافہ کر رہے ہیں اور اپنی ہی جانوں کو ہلاک کرتے ہیں مگر ایسے اندھے ہیں کہ انہیں اس کا شعور نہیں۔

ضروری نوٹ: حرقل بادشاہ نے دعوت اسلام پہنچنے سے پہلے خواب اور نجومی سے حساب سے پتہ لگایا تھا کہ میرے ملک پر ایک ختنہ کرانے والی جماعت قبضہ کرے گی۔ اس نے اپنے وزیر ناطور کو بلا کر یہ ماجرا سنایا اور کہا کہ بتاؤ اس زمانہ میں ختنہ والی قوم کون ہے۔ وہ بولا کہ صرف یہود ہی ختنہ کرتے ہیں۔ ان سے ہمیں کوئی کھٹکا نہیں۔ اپنے مملکت کے حکام کو لکھ کر بھیجو۔ جہاں کہیں یہود ہوں قتل کر دیئے جائیں۔ یہ ہی مشورے ہو رہے تھے کہ شاہ غسان نے حرقل کے پاس ایک قاصد کے ذریعہ حضور (علیہ السلام) کی خبر بھیجی۔ حرقل نے فوراً حکم دیا کہ تحقیقات کرو وہ ختنہ بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ اس کے محققین نے خبر دی کہ ہاں ختنہ کرتے ہیں۔ حرقل بولا بس میرے ملک پر انہیں کا قبضہ ہوگا۔ پھر حرقل نے اپنے دوست کو خط لکھا جو رومیہ میں تھا کہ میرا یہ خیال ہے۔ تیری کیا رائے ہے اور خود حمص چلا گیا۔ اسے حمص پہنچ کر جواب ملا کہ تیرا خیال صحیح ہے وہ سچے نبی ہیں۔ تب حرقل نے رومیوں کو جمع کر کے کہا کہ اگر تم اپنے ملک کی بقا چاہتے ہو تو اس نبی سے بیعت کر لو اور مسلمان ہو جاؤ۔ جس پر وہ سب بھڑک گئے۔ حرقل سلطنت کے خوف سے ایمان قبول نہ کر سکا۔ (بخاری شریف) اس روایت سے پتہ چلا کہ مسلمانوں کے اعمال ان کے حال کا پتہ ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** پیغمبر کا قرب ان کی اتباع سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ محض ان کی اولاد ہونے سے۔ دیکھو بعض اہل کتاب ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں تھے اور بعض مومن ان کی اولاد میں نہیں مگر قرآن کریم نے ان کے متبعین اور اہل ایمان کو ان کا قریبی قرار دیا۔ لہٰذا کفار نفس سید نہیں۔ اگرچہ سیدنا علی مرتضیٰ کی نسل میں ہوں۔

دوسرے سمجھ، مگر امام صاحب فرماتے ہیں کہ ۲۵ سال کی عمر میں ناسمجھ کو بھی اس کا مال دے دیا جائے کیونکہ ان کے ہاں اٹھارہ سال بلوغ کی عمر ہے، اور سات سال ناسمجھ میں سمجھ آنے کے انتظار کی مدت، شریعت نے سمجھ کی مدت سات سال مانی، اسی لئے سات سال کے بچے کو نماز کا حکم ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ۲۵ سال کی عمر میں انسان کی لُب یعنی خالص عقل کی انتہاء ہوتی ہے، اطباء کہتے ہیں کہ جو ۲۵ سال کا ہو گیا وہ اپنے رشد یعنی پورے کمال کو پہنچ گیا (تفسیر روح المعانی) ہاں مجنون دیوانے شخص کو اس کا مال کبھی نہ دیا جائے گا اگرچہ بوڑھا ہو جائے جب تک عاقل نہ ہو وَلَا تَأْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا، یہ یتیموں کے اولیاء کو تیسرا حکم ہے، عقل سے مراد یا تو کھانا ہی ہے یا کھانا و پہننا دونوں، تَاْكُلُوْا میں خطاب صرف یتیم کے والی کو ہے جس میں اس کے بال بچے شامل نہیں، کیونکہ یتیم کے مال سے کچھ کھانے یا پہننے دونوں کی اجازت صرف اسی کو ہے، اسراف کے معنی بارہا عرض کئے جا چکے ہیں، یہ سَرَف سے ہے بمعنی حد سے بڑھنا، ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف کہلاتا ہے، اور ناجائز کو تبذیر کہتے ہیں، بِدَارًا کے لغوی معنی جلدی ہیں، اسی سے مبادرت ہے، چودھویں رات کے چاند کو بھی بدر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ آفتاب ڈوبتے ہی جلدی نکل آتا ہے، بعض نے فرمایا کہ بدار کے معنی ہیں بھر جانا، چودھویں رات کے چاند کو اس لئے بدر کہتے ہیں کہ وہ نور سے بھرا ہوتا ہے، کھانے کے ڈھیر کو بیدر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ کھانے سے بھرا ہوتا ہے، روپے پیسے سے بھری تھیلی کو بدرہ کہا جاتا ہے کہ وہ مال سے بھری ہوتی ہے، مگر یہاں پہلے معنی بن سکتے ہیں، روح المعانی میں یہاں اسراف اور بدار دونوں اسم یا تو مفعول لہ ہیں یا بمعنی اسم فاعل ہو کر حال، يَّكْبَرُوْا باب سمع یسمع کا مضارع ہے، اس کا مادہ كِبَرٌ ہے، لفظ کبر جب باب سمع سے آئے تو عمر کی بڑائی کے معنی دیتا ہے، اور جب کرم یکرم سے آئے، تو عزت و شرف میں بڑائی کے معنی دیتا ہے اور اگر اس کے بعد علی آجائے تو بھاری پڑنا مشقت کے معنی میں ہوتا ہے، قرآن کریم میں یہ لفظ تینوں طرح استعمال ہوا ہے، یہاں پہلے معنی میں اَنْ يَّكْبَرُوْا سے پہلے خَوْفًا پوشیدہ ہے یعنی اے یتیموں کے والیو! تم اس خطرہ سے کہ یتیم بڑے ہو کر اپنا مال لے لیں گے، ان کا جلدی جلدی فضول خرچی سے نہ کھا ڈالو وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ، یہ یتیموں کے اولیاء کو چوتھی ہدایت ہے، فَلْيَسْتَعْفِفْ باب استفعال کا امر ہے، اس کا مصدر استعفاف ہے مادہ عفٌّ بمعنی کفٌّ یعنی رکنا اور باز رہنا، اسی لئے پاکدامنی کو عفت اور پاکدامن کو عفیف یا عفیفہ کہتے ہیں یعنی بے حیائیوں اور گناہوں سے بچنے والا غنی سے مراد شرعی غنی نہیں جس پر زکوٰۃ فرض ہو بلکہ لغوی غنی ہے یعنی جو مال یتیم کھانے کا حاجت مند نہ ہو یعنی جو ولی اللہ کے فضل سے یتیم کے مال سے بے نیاز ہے وہ اس مال سے بہت ہی پرہیز کرے، اس کے قریب بھی نہ جائے، صرف اللہ کے لئے یتیم کی پرورش کرے وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ یہ غریب والی کے لئے اجازت ہے، مَنْ سے مراد صرف والی ہے نہ کہ اس کے بال بچے، فقیر سے مراد لغوی فقیر ہے یعنی حاجتمند نہ کہ شرعی فقیر جس پر زکوٰۃ واجب نہ ہو، لہٰذا اگر غریب آدمی یتیم کے مال کا حاجت مند نہ ہو تو ہرگز نہ کھائے فَلْيَاْكُلْ سے مراد یا تو صرف کھانا ہی ہے یا کھانا پہننا دونوں، دوسری بات زیادہ قوی ہے کہ حاجت مند ولی کو یتیم کے مال سے بقدر ضرورت کھانے کی بھی اجازت ہے اور پہننے کی بھی، مگر بشرطیکہ بالمعروف ہو، اس طرح کہ اس کے مال سے موٹا کھائے، موٹا پہنے، حتی کہ

ہی یہ حرکتیں کرتے تھے۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت میں فرمایا گیا کہ اہل کتاب نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے نفسوں کو وہ تو پہلے ہی سے گمراہ تھے پھر گمراہ ہونے کے کیا معنی؟ تحصیل حاصل ناممکن ہے۔ **جواب:** اس کے چند جواب تفسیر میں گذر گئے کہ یا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ہی گمراہ رہیں گے یا یہ کہ وہ اس کوشش میں اپنی جانیں ہلاک کریں گے مگر صحابہ کرام کو بہکا نہ سکیں گے یا یہ کہ اپنے آپ کو گمراہ گر بنالیں گے یا یہ کہ موجودہ گمراہی سے بڑھ کر گمراہی اختیار کریں گے۔

تفسیر صوفیانہ

جسمانی قرب یا مکانی ہوتا ہے یا زمانی مگر روحانی قرب مکان و زمان سے آزاد ہے۔ وہاں اتباع و اطاعت کا لحاظ ہے۔ مسلمان اگرچہ ابراہیم علیہ السلام سے زمانہ میں بھی دور ہیں اور جگہ میں بھی مگر چونکہ ان کے متبع ہیں۔ لہٰذا قریب ہیں۔ نمرود و دیگر کفار اگرچہ زمانہ اور جگہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قریب تھے مگر ان سے بہت دور تھے۔ اسی لئے یہاں فرمایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام سے قرب رکھنے والے ان کے پیروکار ہیں۔ خواہ اس زمانہ کے مومنین ہوں یا اس وقت کے۔ نیز وارثت مال جسمانی رشتہ سے ملتی ہے مگر وارثت کمال روحانی رشتہ سے' ناخلف اولاد اگرچہ مال کی وارث ہو جائے مگر کمال کی وارث نہیں۔ لائق شاگرد اگرچہ مال کی میراث نہ پائے گا مگر کمال میں شیخ کا جانشین ہوگا۔ اسی لئے یہاں ارشاد ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کے زیادہ حقدار مومنین نہ کہ ان کی ناخلف اولاد جیسا کہ کفر وغیرہ مالی میراث سے محروم کرنے والے اسباب ہیں۔ ایسے ہی روحانی دوری کمالی میراث کا مانع۔ نیز کفر تاریکی ہے اور ایمان روشنی جیسا کہ تاریکی ہمیشہ نور کو بجھانے کی فکر میں ہے۔ ایسا ہی کفار ہمیشہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی فکر میں لیکن اگر مسلمانوں کو شمع جمال مصطفوی سے تعلق رہا تو یہودیت' نصرانیت' شرک و بت پرستی کی تمام تاریکیاں ناکام رہیں گی اور وہ خود گم ہو کر رہ جائیں گی مگر ہاں اس آفتاب نبوت سے وابستگی چاہئے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن ہم کو حضور ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دولت خانہ میں جمع فرمایا۔ پھر ہم کو دیکھ کر حضور علیہ السلام کے چشم مبارک سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور فرمایا کہ فراق کی گھڑی سر پر کھڑی ہے اور اب ہمیں بارگاہ الٰہی میں حاضر ہونا ہے۔ اللہ تمہیں خوش و خرم رکھے اور تم پر رحمت فرمائے۔ میں تم سب کو تقویٰ و پرہیزگاری کی وصیت کرتا ہوں۔ بعد وفات ہم کو ہمارے اہل بیت غسل دیں۔ اور یمانی حلہ میں کفن دیا جائے' تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر ایک ساعت کے لئے ہمارے پاس سے سب علیحدہ ہو جانا۔ ہم پر اولاً جبریل پھر میکائیل پھر اسرافیل پھر ملک الموت نماز پڑھیں گے۔ پھر مسلمان فوج در فوج نماز ادا کریں گے۔ یہ سن کر سب لوگ رو کر کہنے لگے کہ یا رسول اللہ (ﷺ) حضور ہمارے رب کے رسول اور ہماری انجمن کی شمع اور ہمارے دین کے سلطان ہیں اب ہم کس کی طرف رجوع کیا کریں گے۔ فرمایا کہ ہم نے تم میں دو واعظ چھوڑے ہیں۔ ایک خاموش دوسرا بولتا ہوا۔ خاموش واعظ موت ہے۔ ناطق واعظ قرآن۔ اپنی ہر مشکل میں قرآن کی طرف رجوع کرو۔ اور جب تمہارے قلب میں سختی پیدا ہو تو موت کو یاد کرو۔ یہ چیزیں تمہیں راہ حق پر قائم رکھیں گی۔ (روح البیان) اعتقاد و عمل میں۔ انسان تین قسم کے ہیں۔ ایک کامل جو مضبوط ہیں' جنہیں دنیا کے مصائب و آلام راحت و آرام جنبش نہیں دے سکتے۔ دوسرے ناقص جنہیں ہلکے پتہ کی طرح ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں' یہ وہ ہیں جن کی دستگیری رحمت الٰہی نے نہ کی۔ تیسرے درمیانی لوگ۔ اس دوسری آیت میں پہلی جماعت کی استقامات کا ذکر ہے۔ حق تعالیٰ ہم

جائیں، اور یتیم عاقل و بالغ ہو جائیں، تم ان کا مال انہیں سپرد کرنے لگو، تو اس پر گواہ بنالو کہ گواہوں کے سامنے ان کا سارا آمد و خرچ کا حساب سمجھا کر بقیہ مال ان کے حوالے کردو، ہر حال میں خیال رکھنا کہ تمہیں ہمارے پاس آنا ہے، اور ہم نے تمہارا حساب لینا ہے، اگر تمہیں یہ خیال رہا، تو انشاء اللہ گناہ نہ کرسکو گے، ہم علیم و خبیر ہیں، تمہارا حساب لینے کے لئے کافی ہیں ہمیں کوئی دھوکا نہیں دے سکتا،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** ماں باپ اور یتیموں کے والیوں پر لازم ہے کہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دیں اور ان کی اچھی تربیت کریں، جیسا کہ وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی الخ سے معلوم ہوا، **دوسرا فائدہ:** بچوں کا امتحان کرتے رہنا اور ان کی دانائی و فراست جانچنا حکم قرآنی ہے، یہ بھی اس جملہ سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** نابالغ بچوں کا خرید و فروخت کرنا جائز ہے، اس مقصد کے لئے انہیں کچھ مال بھی دیا جاسکتا ہے جبکہ وہ کچھ شعور رکھتے ہوں یہی احناف کا مذہب ہے، یہ آیت ان کی دلیل ہے، کیونکہ یہاں یتیموں کی اس جانچ کا حکم ان کے بلوغ سے پہلے ہے، **چوتھا فائدہ:** اگر بالغ یتیم دیوانہ ہو تو اسے اس کا مال عمر بھر نہ دیا جائے جب تک کہ اس کا جنون زائل نہ ہو جائے، اور اگر ہو تو عاقل مگر بھولا پرواہ، مال کا ناقدرا، تو اس کی دانائی کا انتظار کیا جائے، اس دانائی کی مدت ہمارے امام صاحب کے ہاں ۲۵ سال کی عمر ہے کہ اب اگر وہ نا سمجھ بھی ہوں تو ان کا مال دے دیا جائے، اس کا ماخذ ابھی تفسیر میں عرض کیا گیا، یہ فائدہ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ الخ سے حاصل ہوا، **نوٹ:** امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں لڑکی کو بغیر نکاح اس کا مال نہ دیا جائے بلکہ ان کے ہاں بالغہ لڑکی نکاح سے پہلے کوئی عقد نہیں کرسکتی لڑکے میں نکاح کی قید نہیں صرف بلوغ کافی ہے بلکہ ان کے ہاں بعد نکاح لڑکی بغیر خاوند کی اجازت کوئی عقد نہیں کرسکتی، جب تک کہ پختہ عمر اور تجربہ کار نہ ہو جائے، یہ آیت بظاہر ان کے خلاف ہے (خازن) **پانچواں فائدہ:** بالغ لڑکا لڑکی اپنا نکاح خود کرسکتے ہیں، اجازتِ ولی کے محتاج نہیں جیسا کہ بَلَغُوا النِّکَاحَ سے معلوم ہوا، کیونکہ اس کے معنی ایک یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ جب وہ خود نکاح کرنے کی عمر کو پہنچ جائیں، **چھٹا فائدہ:** بچوں کو مال کمانے کے ساتھ مال کا خرچ کرنا بھی سکھانا چاہیے، کمانا کمال نہیں بلکہ صحیح خرچ کرنا کمال ہے، کمانا سب جانتے ہیں، صحیح خرچ کرنا کوئی کوئی جانتا ہے، یہ فائدہ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ سے حاصل ہوا، **ساتواں فائدہ:** بچوں کو دین کے ساتھ دنیا کمانا بھی سکھانا چاہیے تاکہ وہ بڑے ہو کر بھیک نہ مانگیں، جیسا کہ اس آیت کے مضمون سے ظاہر ہے، **آٹھواں فائدہ:** حتی الامکان یتیم کا مال نہ کھائے اگر حاجت نہ ہو تو ان کی پرورش مفت کرے جیسا کہ فَلْیَسْتَعْفِفْ سے معلوم ہوا، **نواں فائدہ:** دینی خدمت پر اجرت لینا جائز ہے، جیسا کہ فَلْیَاْکُلْ سے معلوم ہوا دیکھو یتیم کی پرورش دینی خدمت ہے اور اسلامی فریضہ ہے، مگر اس پر اجرت لینے یعنی یتیم کے مال سے بقدر ضرورت کھانے پینے کی اجازت دی گئی، بعض خلفاء راشدین نے خلافت پر اجرت لی، لہٰذا امامت دینی مدرسی پر اجرت لے سکتے ہیں، ورنہ مسجدیں ویران ہو جائیں گی اور دینی مدرسے برباد، **دسواں فائدہ:** کھانے، کپڑے سے اجرت مقرر کرنا جائز ہے اگرچہ یہ خبر نہ ہو کہ ملازم کتنا کھائے گا اور

اس گروہ کا ذکر ہے جو دیدہ دانستہ توریت و انجیل سے خبردار ہوتے ہوئے اسلام اور بانیٔ اسلام کے منکر ہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اہل کتاب کے مکروفریب کا اجمالی ذکر تھا کہ وہ مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ اب ان کے فریب کی کچھ تفصیل فرمائی جارہی ہے کہ وہ دیدہ دانستہ آیات الٰہی کا انکار کرتے اور حق کو باطل سے ملاتے ہیں اور مسلمانوں کو بہکانے کی زبردست تدبیریں کرتے ہیں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت فرمایا گیا تھا کہ مسلمانوں کو بہکانے والے اہل کتاب مسلمانوں کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے اپنی ہی گمراہی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اب ان آیتوں میں اسی کا ثبوت دیا جارہا ہے گویا پہلے دعویٰ تھا۔ اب دلیل۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ اہل کتاب صحابہ کرام یا تمام مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اور اسلام کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب ارشاد ہورہا ہے کہ یہ لوگ اس کوشش سے خود پہلے ہی اپنی کتاب توریت و انجیل کا انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ توریت و انجیل میں یہ مذکور ہے کہ حضور ﷺ کے صحابہ اس کچی کھیتی کی طرح ہوں گے جن کی حفاظت مالک ہمیشہ کرتا ہے۔ پھر یہ حضرات کیسے گمراہ ہوسکتے ہیں۔ نیز فرمایا ہے کَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ الخ۔ (الفتح:۲۹) نیز توریت و انجیل میں ہے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کا دین نہ منسوخ ہوگا نہ مسوخ اسے مٹا سکے گا۔ اب ان اہل کتاب کی یہ کوششیں اپنی آیات کا انکار ہے۔ یہ لوگ ان آیات کا انکار کرکے کفر کرتے ہیں۔

شانِ نزول

اس آیت کے شانِ نزول میں دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ خیبر کے علمائے یہود میں سے بارہ شخصوں نے آپس میں مشورہ کرکے مسلمانوں کو بہکانے کا یہ مکر سوچا کہ یہود کی ایک جماعت صبح کو اسلام لے آئے اور شام کو مرتد ہوجائے اور لوگوں سے کہے کہ ہم ضدی اور ہٹ دھرم نہیں بلکہ طالب حق ہیں۔ اس لئے ہم لوگ مسلمان ہوگئے تھے مگر کریں کیا۔ جب ہم نے اپنی کتابوں میں دیکھا تو ثابت ہوا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ وہ پیغمبر نہیں ہیں، جن کی ہماری کتابوں نے خبر دی تھی اور نہ اسلام میں کوئی خوبی ہے۔ اس لئے ہم اسلام سے پھر گئے۔ یہ سب تدبیر اس لئے تھی کہ اس حرکت سے مسلمانوں کو حقانیت اسلام میں شبہ پیدا ہوجائے اور وہ سمجھیں کہ واقعی یہ لوگ حق کے طلبگار ہیں، ضدی نہیں۔ اسی لئے تو ایمان لے آئے تھے اور چونکہ یہ اہل کتاب اور اہل علم ہیں واقعی انہوں نے اسلام میں کوئی خرابی ہی دیکھی ہوگی ورنہ یہ مسلمان ہوکر مرتد نہ ہوتے۔ اس موقعہ پر آیت کریمہ وَقَالَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ الخ نازل ہوئی (تفسیر خازن وخزائن العرفان وغیرہ) دوسری روایت میں ہے کہ یہ آیت کریمہ تبدیلی قبلہ کے موقعہ پر نازل ہوئی کہ جب کعبہ معظمہ کو قبلہ اسلام مقرر کیا گیا تو یہود کو بہت گراں گذرا۔ ان کے سردار کعب ابن اشرف اور مالک ابن سیف نے اپنے دوستوں سے کہا کہ مسلمانوں کو بہکانے کی بہتر تدبیر یہ ہے کہ صبح کی نماز مسلمانوں کے ساتھ کعبہ کی طرف پڑھ لو اور دن کے اخیری حصے میں اپنے قبلہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھو اور مسلمانوں سے کہو کہ چونکہ ہمیں تبدیلی قبلہ کا پتہ اپنی کتابوں سے نہیں ملا۔ اس لئے ہم نہیں مانتے، تاکہ مسلمان شک میں پڑ جائیں۔ حالانکہ توریت و انجیل میں حضور ﷺ کی صفات خصوصیہ میں یہ مذکور ہے کہ وہ نبی الحرمین ہوں گے یعنی پیدا ہوں گے ایک حرم میں رہیں گے دوسرے حرم میں اور یہ کہ آپ امام القبلتین ہوں گے کہ دو قبلوں کی طرف نماز پڑھیں گے، پڑھائیں گے اور ان کے مقبول سجدوں سے دونوں قبلوں یعنی کعبہ اور بیت المقدس کو شرف ملے گا مگر جانتے ہوئے ان بدنصیبوں نے یہ حرکات کیں۔ تب یہ آیت کریمہ وَقَالَتۡ طَّآئِفَةٌ

دیں تاکہ ہمارے بعدان کے ساس سسران کی اچھی تربیت کریں، اور انہیں ایک پورے خاندان کا سہارا مل جائے، اگر یہ ناجائز ہوتا، تو یہ بوڑھے یہ فکر لے کر قبروں میں جاتے، جوانوں کی کمزوری بچپن کے نکاح سے نہیں بلکہ سینما بینی، تمباکو کے استعمال، کالجوں کی آزادیوں، عورتوں کی بے پردگیوں، لڑکے اور لڑکیوں کے اختلاط، عشقیہ ناولوں، فلمی گانوں، فحش کتابوں اور گندے افسانوں کی وجہ سے ہے، اگران بچے بچیوں کی شہوتیں ان ذریعوں سے بھڑکا دی جائیں اور نکاح پر اٹھارہ سال کی پابندی لگادی جائے، نکاح پابند رہے اور زنا آزاد، تو ظاہر ہے کہ یہ بھڑکی ہوئی شہوت حرام جگہ ہی صرف ہوگی اور اس کے جو نتائج ہوں گے وہ ہم اور آپ سب دیکھ رہے ہیں، چھت کا پانی پرنالہ کے ذریعہ نکال دو ورنہ چھت پھاڑ دے گا، مکان ڈھاوے گا، رہی گھر کی نااتفاقی، اس کی بڑی وجہ زوجین میں سے ہر ایک کی دوسرے کے حقوق سے بے خبری ہے، سب کی زندگیاں اسلامی بنادو، دیکھو پھر کیسا چین ہوگا، بہت جوان لڑکے بھی اولاً نیک ہوتے ہیں، بعد میں بدمعاش ہو جاتے ہیں، جوانوں کا ماحول درست کرو، انہیں صحبتیں اچھی دو، دیکھو پھر کیسے چین سے گزرے گی۔

تفسیر صوفیانہ

مریدین گویا یتیم ہیں، مشائخ کرام گویا ان کے والی وارث ہیں، فیوض گویا ان یتیموں کا مال ہے، جوان کے مشائخ کے پاس محفوظ ہے، نفس کو روح سے وابستہ کر کے نفس کی اصلاح کر دینا گویا روحانی نکاح ہے، مشائخ کو ارشاد ہو رہا ہے کہ تم ان یتیم مریدین کا اکثر امتحان لیتے رہو، پتہ لگاؤ کہ یہ لوگ فیوض ربانی رموز رحمانی اسرار ایمانی انوار قرآنی کے اہل ہیں یا نہیں، جب یہ تمہاری صحبت میں رہ کر اس قابل ہو جائیں، کہ ان کے نفسوں کا نکاح، ان کی روحوں اور دلوں سے کر کے نفس کو ان کا تابع کر دیا جائے، اور تم یہ بھی محسوس کرلو، کہ یہ ان اسرار کے متحمل ہو جائیں گے اور اغیار میں انہیں ضائع نہ کریں گے، تو ان کی وہ اسرار و انوار و فیوض کی امانتیں جو تمہارے سینوں کے اندر محفوظ ہیں ان کے حوالے کردو، یہ خوف نہ کرو کہ یہ ہم سے فیوض لے کر ہم سے بڑے ہو جائیں گے پھر ہمیں کون پوچھے گا جو تم میں سے غنی باللہ ہے، وہ تو اپنے مرید کے فیوض میں سے کچھ اپنے کام میں نہ لائے، اور جو اس درجہ پر نہ پہنچا ہو، وہ بقدر ضرورت اپنے مرید کے حصہ کا فیض اپنے کام میں لاسکتا ہے جب تم آنکھ سے ان کا فیض دینے لگو، تو اس پر اللہ تعالیٰ کو اور ارواح اولیاء کو گواہ بنالیا کرو (از روح المعانی) صوفیائے کرام کے نزدیک بزرگوں کے سینے آب رحمت کے کنوئیں ہیں، جیسے کنوئیں کے پانی میں سارے محلے کا حصہ ہوتا ہے، ہر ایک کو اپنا ہی حصہ ملتا ہے، جتنا اپنا برتن اتنا پانی ایسے ہی مشائخ کے سینوں میں سارے معتقدین و مریدین کا حصہ ہوتا ہے، ہاں یہ حضرات بہت جانچ کر اپنی صحبتوں میں رکھ کر مشقتیں کرا کر ان کے حصے حوالے کرتے ہیں، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے، شعر

فقیروں کی جھولی میں ہوتا ہے سب کچھ
مگر چاہیے ان سے لینے کا ڈھب کچھ
بہت جانچ لیتے ہیں دیتے تب کچھ

شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو دس سال اپنی صحبت میں رکھا، نکاح و بکریاں چرانا بہانہ تھا، درحقیقت انہیں کلیم الٰہی کے

اسلام سے پھسلانے کی کوشش کرتے تھے۔ پہلی آیت میں پہلے گروہ سے خطاب تھا۔ دوسری آیت میں دوسرے گروہ سے خطاب ہے۔ لہٰذا یہاں اہل کتاب سے ان کے وہ علماء مراد ہیں جو توریت و انجیل میں تحریفیں کرتے تھے۔ تَلْبِسُوْنَ لبسٌ سے بنا بمعنی خلط ملط کرنا' ملاوٹ کرنا اور چھپانا۔ کپڑے کو اسی لئے لباس کہتے ہیں کہ وہ بدن کو چھپاتا ہے۔ مشابہت کو ملابست اور دھوکے کو التباس اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس سے اصل شے چھپ جاتی ہے۔ یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ چھپانا بھی اور خلط کرنا بھی۔ اگر چھپانا مراد ہو تو بالباطل کی ب استعانت کی ہے۔ یعنی حق کو باطل کے ذریعہ کیوں چھپاتے ہو۔ اور اگر خلط مراد ہو تو ب بمعنی مع ہو گی۔ یعنی حق کو باطل کے ساتھ کیوں ملاتے ہو۔ یا تو حق سے مراد توریت و انجیل کی اصل آیتیں ہیں اور باطل سے مراد ان کی بناوٹی آیتیں یہ حسن اور ابن زید کا قول ہے یا حق سے مراد ان کا اقراری اسلام ہے اور باطل سے مراد دلی کفر یہ ابن عباس اور قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے۔ یا حق سے مراد ان کا دلی اعتراف ہے اور باطل سے مراد ان کا زبانی انکار ہے۔ یہ ابوعلی اور ابو مسلم کا قول ہے۔ یا حق سے مراد گذشتہ انبیائے کرام پر ایمان کا اظہار ہے۔ اور ان بزرگوں کی تعریف و توصیف اور باطل سے مراد مشرکین کی سی بدعملیاں' رشوت خوری' شراب نوشی' جوا' زنا وغیرہ جو ان پوپ پادریوں میں مروج تھے۔ یا حق سے مراد توریت کی واضح اور صاف آیتیں ہیں اور باطل سے مراد توریت کے متشابہات کی غلط تاویلیں۔ (روح المعانی و کبیر) یعنی اے علمائے اہل کتاب تم توریت و انجیل کی اصل آیتوں کو اپنی بناوٹی آیتوں سے کیوں خلط ملط کرتے ہو۔ یا اپنے دلی اعتراف کو اپنے زبانی انکار کے ساتھ کیوں ملاتے ہو۔ یا اپنے ایمان کو کفر بالقرآن کے ساتھ کیوں مخلوط کرتے ہو وغیرہ۔ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ حق چھپانے والا دو جرم کرتا ہے ایک شبہات پیدا کرنا۔ دوسرا حق کے دلائل کو لوگوں تک نہ پہنچنے دینا۔ پہلے جرم کا نام تلبیس ہے جس کا لِمَ تَلْبِسُوْنَ میں ذکر فرمایا گیا۔ دوسرے قصور کا نام کتمان حق ہے۔ جس کا ذکر اب ہو رہا ہے۔ یہ واؤ عاطفہ ہے اور تَكْتُمُوْنَ تَلْبِسُوْنَ پر معطوف اور وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کا واؤ حالیہ ہے اور یہ جملہ تَلْبِسُوْنَ اور تَكْتُمُوْنَ کے فاعل سے حال ہے۔ یہاں حق سے مراد یا حضور علیہ السلام کی نبوت ہے یا اسلام کی حقانیت یا توریت شریف کی آیات نعت جن کے چھپانے کی علمائے یہود انتہائی کوشش کرتے تھے۔ تَعْلَمُوْنَ کا مفعول پوشیدہ ہے۔ یعنی تم اپنا جھوٹ' اپنا حسد' عناد جانتے ہو۔ یا تمہیں خبر ہے کہ حاسد سخت گنہگار ہے مگر پھر بھی تم اس جرم کی جرأت کرتے ہو۔ یا مطلب یہ ہے کہ تم جاہل نادان اور بے وقوف نہیں۔ اصحاب علم میں سے ہو۔ اس صورت میں تَعْلَمُوْنَ کو مفعول کی ضرورت نہیں۔ یعنی اے علمائے اہل کتاب تم حق کو چھپاتے ہو حالانکہ تمہیں خبر ہے کہ تم حاسد ہو اور حاسد کی سزا جہنم ہے۔ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ۔ علمائے یہود کے چند فریب بیان فرمانے کے بعد ان کا ایک انتہائی مکر بتایا جا رہا ہے جو انہوں نے مسلمانوں کو بہکانے کے لئے کیا۔ طائفہ بمعنی جماعت ہے' جماعت کو طائفہ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس سے حلقہ بن سکتا ہے جس کے ارد گرد گردش کی جا سکے (طواف بمعنی گردش) (روح المعانی) کعبہ کے ارد گرد گھومنے کو طواف کہتے ہیں۔ ایک شہر کا نام طائف ہے کہ وہاں کی زمین کو کعبہ کا طواف کرایا گیا۔ نیز وہاں جانے والا گھومتا ہوا جاتا ہے کہ وہاں کا راستہ پیچیدہ اور خم دار ہے۔ یہاں اہل کتاب سے عام کتابی مراد ہیں۔ اور طائفہ سے ان کے خاص علماء اور قال کا متعلق پوشیدہ ہے یعنی علمائے اہل کتاب نے اپنے بعض لوگوں سے کہا کہ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ۔ اٰمِنُوْا سے یا اظہار ایمان مراد ہے یا کعبہ کی طرف نماز پڑھنا مراد جیسا

کریں، اب بتایا جارہا ہے کہ یتیموں کے پاس مال آئے گا کہاں سے، گویا ان کے مال کی حفاظت کے بعد مال کی آمد کے دروازہ کا ذکر ہے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں یتیموں کا مال حاصل ہوچکنے کے بعد اس کے خرچ کا طریقہ سکھایا گیا تھا، اب ان یتیموں کو مال دینے کا طریقہ بتایا جارہا ہے کہ ان کے مورثوں کی وفات پر انہیں مال کیونکر دیا جائے،

شانِ نزول

حضرت اوس ابن ثابت صحابی کا انتقال ہوا جو بہت مال چھوڑ گئے اور بیوی ام کحہ، تین لڑکیاں، چچا کے دو بیٹے سوید وعرفجہ چھوڑے، اس زمانہ کے دستور کے مطابق اس کے سارے مال پر سوید وعرفجہ نے قبضہ کرلیا، ام کحہ اور اوس کی تینوں بیٹیوں کو کچھ نہ دیا، اس زمانہ میں لڑکیوں، بیویوں اور چھوٹی اولاد کو میراث نہیں دی جاتی تھی، وہ کہتے تھے کہ میراث وہ پائے جو جنگ میں جائے، ام کحہ نے کہا کہ جب تم ان یتیم بچیوں کا مال لیتے ہو تو ان سے نکاح بھی کرلو، انہوں نے انکار کیا، کیونکہ یہ بچیاں کچھ زیادہ خوبصورت نہ تھیں، ام کحہ حضور انور ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں جبکہ آپ مسجد فضیخ میں تشریف فرما تھے اور بولیں کہ اوس ابن ثابت فوت ہوگئے، تین یتیم بچیاں اور مجھ بیوہ کو چھوڑ گئے، ان کے پاس مال تو بہت تھا مگر سارا مال سوید اور عرفجہ نے لے لیا، اب میں کیا کھاؤں اور بچیاں کس سے پالوں؟ ایسی درد بھری داستان سنائی کہ خاطر اقدس پر بہت اثر پڑا، حضور انور ﷺ نے ان دونوں سوید وعرفجہ کو بلایا اور اس ظلم کی وجہ پوچھی، انہوں نے عرض کیا کہ ہماری قوم میں میت کا مال بالغ مرد وارث لیتے ہیں عورتوں اور نابالغوں کو نہیں دیا جاتا، تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، اس کے نزول پر نبی کریم ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا کہ تم اس مال کو ہاتھ نہ لگانا جب تک کہ میراث کی تفصیل نازل نہ ہوجائے، چنانچہ وہ سارا مال یونہی محفوظ رکھ دیا گیا، کچھ عرصہ کے بعد یہ آیت کریمہ نازل ہوئی يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِىۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ (النساء:۱۱) تب نبی کریم ﷺ نے اوس مرحوم کا مال اس طرح تقسیم فرمایا کہ اوس کی بیوی کو آٹھواں حصہ ان کی بیٹیوں کو دو تہائی، باقی بچا ہوا سوید وعرفجہ کو مرحمت کیا، یوں سمجھو کہ مال کے ۲۴ حصے کئے، جن میں سے تین ام کحہ کو دیئے، ۱۶ تین بیٹیوں کو باقی پانچ دونوں چچازاد بھائیوں کو (تفسیر کبیر، روح المعانی، صاوی، روح البیان، خازن، بیضاوی، مدارک، خزائن وغیرہ) خیال رہے کہ ان بی بی صاحبہ کے نام میں اختلاف ہے، ام کحہ بنت کحہ، ام کحلہ، ام کلثوم، مگر صحیح تر ام کحہ ہے، بعض مفسرین نے ان مرحوم صحابی کا نام بجائے اوس ابن ثابت کے اوس فرمایا ہے، مگر یہ غلط ہے کیونکہ اوس ابن صامت کی وفات خلافتِ عثمانیہ میں ہوئی، زمانہ نبوی ﷺ میں اوس ابن ثابت اور اوس ابن مالک کی وفات ہے، اور یہ واقعہ اوس ابن ثابت کی وفات پر پیش آیا (روح المعانی)

تفسیر

لِلرِّجَالِ نَصِيۡبٌ یہ لام استحقاق کا ہے، رِجَالِ سے مراد میراث پانے والے قرابت دار مرد ہیں، اولاد ہوں یا ان کے سوا کوئی اور، نابالغ ہوں یا بالغ، صرف بالغ مرد مراد نہیں، کیونکہ اسی قاعدے کو توڑنے کے لئے تو یہ آیت کریمہ اتری، لِلرِّجَالِ کو مقدم فرمانے سے حصر کا فائدہ ہوا یعنی جس وارث کا جو حصہ ہے وہ خود ہی لے گا کوئی اور اس کے حصہ پر جبراً قبضہ نہیں کرسکتا، نَصِيۡبٌ سے مراد میراث کا وہ حصہ ہے جس کا وارث مستحق ہو، اس نَصِيۡبٌ میں لڑکوں کے سارے حصوں کا اجمالی ذکر آگیا، اس کی

اپنے خاص لوگوں سے کہا کہ تم صبح کے وقت بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر اسلام لے آؤ اور مشرف باسلام ہو کر مسلمان بن جاؤ اور شام کو پوری جماعت کی جماعت اسلام سے پھر کر مرتد ہو جاؤ۔ تاکہ تمہاری جماعت کا لوٹنا سیدھے سادھے مسلمانوں پر برا اثر ڈالے اور وہ یہ سمجھیں کہ یہ لوگ ضدی نہیں بلکہ تلاش حق میں اسلام لائے تھے اور چونکہ یہ اہل علم ہیں۔ اب ان کا لوٹنا اس کی دلیل ہے کہ واقعی انہوں نے اسلام میں کچھ کمی پائی۔ اس لئے پھر گئے۔ لہٰذا تمہارے ساتھ وہ بھی اسلام سے پھر جائیں۔ رب کی قدرت کے قربان کہ ادھر تو انہوں نے یہ خفیہ تدبیر کی۔ ادھر اس نے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا۔ اور ان کا راز فاش کر دیا گیا۔ جس سے ان کا یہ وار بھی خالی گیا۔ اور کیا تعجب تھا کہ جو لوگ مصنوعی مسلمان بنتے وہ حضور علیہ السلام کی صحبت سے حقیقی مومن ہی ہو کر اس شعر کے مصداق بنتے ؎

شد غلامے کہ آب جو آرد آب جو آمد و غلام ببرد

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** علم بے عمل وبال اور باعثِ عذاب الٰہی ہے۔ دیکھو علمائے یہود نے جان بوجھ کر حضور علیہ السلام کا انکار کیا۔ لہٰذا وہ سخت عذاب وعتاب کے مستحق ہوئے۔ اسی لئے صوفیائے کرام فرماتے ہیں اَلعِلمُ حِجَابٌ اَکبَرُ خیال رہے کہ علم ایک تلوار ہے جس کا صحیح استعمال مفید اور غلط استعمال خود عالم کے لئے مضر ہے۔
دوسرا فائدہ: تمام گواہیوں میں صرف قول کافی ہے مگر ایمانیات کی گواہی میں عقیدہ بھی ضروری یہاں بغیر عقیدت کلمہ پڑھنا اور توحید ورسالت کی گواہی دینا کفر ہے۔ اس گواہی میں لطف یہ ہے کہ بسا اوقات کلام سچا ہوتا ہے مگر بولنے والا جھوٹا ہوتا ہے جیسا کہ وَاَنتُم تَشهَدُونَ سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** کفار نے اسلام کے مٹانے میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ اسلام کی بقا محض رب تعالیٰ کے کرم سے ہے۔ جیسا کہ اس واقعہ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** تقیہ کرنا تمام عیبوں کی جڑ اور انتہاء درجہ کی برائی ہے۔ علماء یہود نے اپنے ان لوگوں کو تقیہ کی تعلیم دے کر اسلام کو برباد کرنا چاہا۔ سب سے پہلا تقیہ ابلیس نے کیا کہ حضرت آدم سے عرض کیا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں حالانکہ بدخواہ تھا۔ جس دین میں تقیہ ہو وہ یہودیت سے نکلا ہے۔
پانچواں فائدہ: کفار کی چاپلوسی پر اعتماد نہ کرنا چاہیے۔ بسا اوقات ان کی نمازیں، روزے بلکہ ان کا کلمہ طیبہ پڑھنا سیاسی ہوتا ہے نہ کہ دینی۔ غضب تو دیکھو کہ یہود نے مسلمانوں کو بہکانے کے لئے ایمان قبول کر کے نمازیں پڑھ کر مرتد ہونے کی ٹھان لی۔ خیال رہے کہ کفار کی یہ تدبیریں اب بھی باقی ہیں۔ ہر سال بعض یہودی فرمان مصطفوی کے نام سے اشتہار چھاپتے ہیں۔ جس میں لکھتے ہیں کہ شیخ احمد خادم روضہ رسول اللہ (ﷺ) نے حضور علیہ السلام کی خواب میں زیارت کی کہ ان سے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اس ہفتے میں اتنے مسلمان مرے، جن میں سے پچانوے فی صدی کافر ہو کر مرے۔ اور پانچ فی صد مسلمان ہیں۔ خدا کے سامنے اپنی امت کی بدعملیوں سے سخت شرمندہ ہوں۔ فلاں سنہ میں سورج مغرب سے نکلے گا اور فلاں سنہ میں یاجوج وماجوج ظاہر ہوں گے۔ اور فلاں سنہ میں لوگوں کی صورتیں مسخ ہوں گی اور جو اس مضمون کو نہ مانے کافر ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب یہود کی حرکتیں ہیں تاکہ مسلمان ان حالات کو سن کر اسلام سے بددل ہوں۔ اور ان پیشنگوئیوں کی غلطی معلوم کر کے بانی اسلام ﷺ سے پھر جائیں ... بارہا ایسی پیشنگوئیاں ہوئیں مگر ظاہر کچھ بھی نہ ہوا حالانکہ

عبارت قرآن میں کوئی قید نہیں اور شانِ نزول اسی معنی کی تائید کر رہا ہے (از روح المعانی وغیرہ) مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ یہ مِمَّا دوسرے مِمَّا کا بدل ہے، لہٰذا یہاں مَا سے مراد مال ہی ہے، چونکہ یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ میت کے متروکہ مال میں سے جو مال مردوں کے لائق ہو وہ تو مردوں کو دیا جائے گا، جیسے گھوڑا، تلوار، زرہ وغیرہ، اور جو مال عورتوں کے لائق ہو وہ عورتوں کو دیا جائے، جیسے زیور، کھانا پکانے کے برتن، چرخہ وغیرہ باقی مشترکہ مال دونوں میں تقسیم کیا جائے، اس وہم کو دفع فرمانے کے لئے یہ عبارت ارشاد ہوئی یعنی متروکہ مال تھوڑا ہو یا بہت کسی قسم کا ہو، سب میں سے سب وارثوں کو حصہ میراث ملے گا، نَصِيبًا مَّفْرُوضًا یہ عبارت قَلَّ و كَثُرَ کے فاعل سے حال ہے، مَفْرُوْضَه نصیب کی صفت ہے یا اَوْجَبَ فعل محذوف کا مفعول بہ ہے، نصیب نصبٌ سے بنا بمعنی قائم کرنا، حصہ کو نصیب اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ قائم کیا ہوا ہوتا ہے، مفروض فرض سے بنا جس کے معنی ہیں کاٹنا الگ کرنا، حدود مقرر کرنا، علامات قائم کرنا، شرعی فرض کو اسی لئے فرض کہتے ہیں کہ وہ باقی کام سے الگ تھلگ اور حدود مقرر کیا ہوا ہوتا ہے، ہمارے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں فرض وہ کام ہے جو یقینی دلیل سے لازم کیا جائے اس کا چھوڑنا فسق ہے انکار کفر اور واجب وہ کام ہے جو ظنی دلیل سے لازم کیا جائے اس کا چھوڑنا تو فسق ہو مگر انکار کفر نہ ہو، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں واجب اور فرض میں کوئی فرق نہیں، یعنی ہم نے ہر ایک وارث کے حصے مقرر کئے ہیں جس کا دینا تم پر فرض کیا گیا ہے، لہٰذا ان حصوں میں گڑبڑ کرنے والا ایسا ہی گنہگار ہوگا جیسے نماز وغیرہ میں گڑبڑ کرنے والا،

خلاصہ تفسیر

خطہ عرب میں صدیوں سے شراب نوشی، بیوگان اور یتیموں کا مال مارنا، عورتوں کی ذلت و حقارت لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا وغیرہ کا رواج ایسا چلا آرہا تھا کہ کسی کے خیال میں بھی نہ آتا تھا کہ یہ عیب یہاں سے مٹ جائیں گے، ان کے نزدیک میت کے متروکہ مال میں کمزوروں، یتیموں، لڑکیوں، بیوگان کا کوئی حصہ نہ تھا، یہ اسلام کا کھلا معجزہ ہے اور قرآن کریم کی زندہ کرامت اور نبی کریم ﷺ کی بے مثال قوت و شوکت کہ عرب کے صدیوں کے رواج کو ایک ایک لفظ کے ذریعہ صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا اور اس طرح مٹایا کہ اس کا نام و نشان باقی نہ رہا، اور اس نوعیت سے مٹایا کہ ان لوگوں کو محسوس بھی نہ ہوا، تقسیم میراث میں بے قاعدگی ان لوگوں کی طبیعت میں جم چکی تھی، اس لئے پہلے تو اس کی اس آیت میں اجمالی اصلاح کی گئی، پھر اگلی آیت میں تفصیل فرما دی گئی، چنانچہ ارشاد ہوا کہ اے مسلمانو! میت کے متروکہ مال میں کمزور بچے بچیوں کا بھی حصہ ہے، اور بے کس بیوگان و بوڑھے ماں باپ کا بھی، جو کچھ ماں باپ چھوڑیں اور جو کچھ قریب ترین رشتہ دار چھوڑیں، اس میں سے لڑکوں کا حصہ ان کے حوالہ کر دو، اور لڑکیوں، عورتوں کے حصے ان کے سپرد کر دو، پھر مال میں یہ فرق نہ کرو کہ میت کا گھوڑا جوڑا، زرہ تلوار تو بہادر جوان مرد لیں، کرگہ، چرخہ بوڑھی عورتوں کو دو، زیور وغیرہ نوجوان لڑکیوں کو، انہیں میت کے سارے مال میں سے تھوڑا ہو یا زیادہ، اس کے سارے وارثوں کو دو، اگر وہ مال خود تقسیم ہو سکتا ہو تو اسے ہی تقسیم کر دو، ورنہ اس کی قیمت ڈال کر حصہ کے مطابق ہر ایک کو دے دو، خیال رکھو کہ رب تعالیٰ کی طرف سے ان کے حصے مقرر ہو چکے ہیں، ان کا ادا کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسے دوسری عبادات کا ادا کرنا فرض، اگر تم نے اس میں کوتاہی کی یا بعض بعض کا حصہ کھا گئے، تو انہیں سخت سزا دی جائے گی،

لئے شروع دن اور کفر کے لئے آخر دن کیوں منتخب کیا کہ کہا صبح کو ایمان لے آؤ اور شام کو کافر ہو جاؤ؟ **جواب:** اس کے بھی چند جواب ہیں ایک یہ کہ شروع دن سے نماز صبح مراد ہے اور آخر دن سے نماز مغرب اور اٰمِنُوْا بِالَّذِیْ الخ سے کعبہ کی طرف نماز پڑھنا مراد ہے۔ مطلب یہ تھا کہ فجر کی نماز کعبہ کی طرف با قاعدہ اسلامی پڑھ لو اور مغرب کی نماز یہود کے طریقہ پر بیت المقدس کی طرف۔ چونکہ ان دونوں وقتوں میں نمازی زیادہ ہوتے ہیں اس لئے تمہارا ایمان و کفر سب پر ظاہر ہوگا اور تدبیر کارگر رہے گی۔ دوسرا یہ کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ صبح کے وقت جب بارگاہ نبوی ﷺ میں صحابہ کرام کا مجمع کافی ہوتا ہے۔ تب سب کے سامنے ایمان قبول کرو۔ پھر شام کو بھی صبح کی سی رونق ہوتی ہے۔ تب سب کے سامنے مرتد ہو جاؤ اور وجہ ارتداد بھی بیان کردو۔ تیسرا یہ کہ صبح شام سے مراد تھوڑی مدت ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ایمان لا کر بہت جلد مرتد ہو جاؤ۔ مسلمانوں میں زیادہ نہ ٹھہرو۔ ایسا نہ ہو کہ وہیں رہ جاؤ۔

تفسیر صوفیانہ

انسان کا دل زرخیز زمین کی طرح ہے۔ زرخیز زمین میں اگر پھل پھول کا تخم ڈالا جائے تو وہاں پھلوں پھولوں کے باغ لگ جاتے ہیں اور اگر کانٹوں کا بیج بویا جائے تو وہ تمام خطہ خارستان بن جاتا ہے۔ نیز بارش کا پانی بویا ہوا تخم ہی اگاتا ہے۔ تخم کو بدلتا نہیں۔ اگر انسان کے دل میں سعادت کا بیج ہے تو قرآن و توریت و انجیل کی آیتیں جو کہ رحمت کا پانی ہیں اس سعادت کو ظاہر کردیں گی۔ اور اگر اس میں بدبختی کا تخم ہے تو ان ہی آیات سے بدبختی اور زیادہ ظاہر ہو جائے گی۔ یہاں رب نے فرمایا اے کتاب والو آیات اللہ کے ذریعہ کافر کیوں ہوئے جاتے ہو حالانکہ تم اپنا کفر خود مشاہدہ کررہے ہو۔ مولانا فرماتے ہیں۔ شعر

اے کہ من زشت و خصالم جملہ زشت — کے شوم گل چوں بمن آں خار کشت

نوبہارا حسن گل دہ خار را — زینت طاؤس دہ ایں مار را!

اے عظیم از ما گناہان عظیم ! — می توانی عفو کردن اے کریم !

دستگیرم در چنین بے چارگی !! — شاد گروانم دریں غمخوارگی !!!!

حرمت آنکہ دعا آموختی — در چنین ظلمت چراغ افروختی

دستگیر و رہنما توفیق دہ — جرم بخش و عفو کن بکشا گرہ

صوفیاء فرماتے ہیں کہ دین حق ہے۔ دنیا باطل اور دین کو دنیا سے مخلوط کرنا کہ نماز ریا کے لئے پڑھے۔ علم دین، دولت، شہرت کے لئے سیکھے یہ حق کو باطل سے ملانا ہے۔ اسی طرح مسلمان ہو کر کافروں کے سے اخلاق ان کی سی صورتیں اختیار کرے یہ بھی حق کو باطل سے ملانا۔ جیسے دودھ گائے، بھینس کے گوبر و خون میں سے آتا ہے مگر صاف ستھرا ہوا ہوتا ہے کہ اس میں گوبر و خون کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے ہی مومن کے اعمال صالحہ ایسے خالص صاف اور ستھرے، نکھرے ہوئے ہونے چاہئیں کہ ان میں نفس امارہ اور دنیا کا شائبہ بھی نہ ہو۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ تَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ میں حق سے مراد حضور ﷺ ہیں کیونکہ حق کے معنی لازوال چیز یا صحیح درست یا حکمت اسرار والی چیز حضور ﷺ کی نبوت لازوال ہے۔ آپ کا ہر قول و فعل درست ہے۔ آپ کی ہر ادا میں حکمت و راز ہے۔ اس لئے آپ کا نام شریف حق ہوا۔ اس آستانہ تک باطل کی رسائی نہیں۔ کفار اندھے چور

اطہرنا جائز ماننا پڑے گا، اسی لئے خلفائے راشدین نے جن میں علی مرتضٰی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی داخل ہیں، حضور انور ﷺ کی میراث تقسیم نہ کی، بلکہ املاک کو اوقاف مانا، **دسواں فائدہ:** قانون کا بیان قانون کے ساتھ ہونا ضروری نہیں ہو سکتا ہے کہ قانون کچھ پہلے بنے، مگر اس کی تشریح کچھ عرصے کے بعد ہو، دیکھو میراث کا یہ قانون تو پہلے بن گیا تھا مگر اس کی تشریح اور وارثوں کے حصوں کا تعین کچھ بعد میں ہوا، نماز معراج کی رات فرض ہوئی، مگر اس کا بیان زمین پر واپس آنے کے بعد کیا گیا، **گیارھواں فائدہ:** عورتوں، یتیموں، کمزور بچوں پر اسلام کا عظیم الشان احسان ہے کہ یہ سب کسمپرسی کے عالم میں تھے، ذلت کے گڑھے میں گرے ہوئے تھے، ان کے اٹھنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی، اسلام نے انہیں بامِ عروج پر پہنچایا، ان کے حقوق مقرر کئے،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کریمہ میں اَلْوَالِدٰنِ سے مراد ماں باپ بھی ہیں اور دادا دادی بھی، کیونکہ وہ بھی بالواسطہ ماں باپ ہی ہوتے ہیں، قرآن کریم نے بہت جگہ والدین میں دادے دادیوں کو داخل کیا ہے، اَقْرَبُوْنَ میں ان دو رشتوں کے علاوہ دوسرے رشتہ دار داخل ہیں، چچا، تائے، بھائی بھتیجے وغیرہ، آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ماں باپ کے ترکہ میں اولاد کا حصہ ہے، اور دادا دادی کے ترکہ میں پوتے پوتی کا حصہ، لہٰذا یتیم پوتا پوتی اپنے دادا کے ترکہ سے حصہ ضرور پائے گا اگرچہ اس کا چچا یعنی دادا کا بیٹا زندہ ہو (پرویزی جماعت) **جواب:** اس کے چند جواب ہیں، (۱) ایک یہ کہ زمانہ رسالت سے لے کر آج تک کسی نے اس آیت کے یہ معنی نہ کئے، نہ نبی کریم ﷺ نے، نہ صحابہ کرام نے، نہ امت نے، لہٰذا یہ تفصیل نہیں بلکہ تحریف ہے، مسلمانوں میں بڑے بڑے ظالم اور جابر بادشاہ گذرے، مگر کسی نے چچا کی موجودگی میں دادا کی میراث سے پوتے کو حصہ نہ دیا، بعض بے دین بادشاہوں نے اسلام کے دیگر قوانین میں ترمیم کی ناکام کوششیں کی، مگر یتیم پوتے کی میراث میں ترمیم کرنے کی کسی نے ہمت نہ کی تھی، (۲) دوسرے یہ کہ اس سے اسلام کا ایک عام قانون میراث ٹوٹ جاتا ہے کہ قریب کے رشتہ دار کے ہوتے دور کے رشتہ دار کو میراث نہیں ملتی، اگر بیٹے کے ہوتے پوتے کو میراث دلوائی گئی، تو باپ کے ہوتے بیکس اور بوڑھے دادا کو بھائی کے ہوتے بھتیجے کو بیٹی کے ہوتے یتیم نواسوں وغیرھم کو میراث دینا پڑے گی، غرض اس ایک ترمیم سے بیسیوں ترمیمیں کرنا پڑیں گی، بلکہ پوری اسلامی میراث درہم برہم ہو جائے گی، (۳) تیسرے یہ کہ اگر اَلْوَالِدٰنِ میں دادا دادی داخل ہیں تو نانا نانی کیوں داخل نہیں؟ وہ بھی بالواسطہ ماں اور باپ ہیں، اور نانا کی میراث سے ان کی بیٹی بیٹوں کے ہوتے ہوئے یتیم اور بے کس نواسی نواسوں کو میراث کیوں نہیں ملتی، ایسی آیت ہم کو نہیں ملی جہاں والدین میں دادا دادی داخل ہوں اور نانا نانی خارج، (۴) چوتھے یہ کہ اگر دادا کے مال میں پوتے کا حصہ ایسے ہی ہے جیسے ماں باپ کے مال میں بیٹی بیٹوں کا حصہ، تو یتیم پوتے کی قید کیوں لگاتے ہو، پوتے کو بہرحال حصہ ملنا چاہیے، خواہ یتیم ہو یا باپ والا، تفسیر بالرائے کے یہی نتیجے ہوتے ہیں، **دوسرا اعتراض:** یہ بڑا ظلم ہے کہ یتیم پوتا جو کمزور بھی ہے اور لاوارث بھی، وہ تو دادا کی میراث سے محروم رہے، اور اچھے خاصے چچا اسے دکھا دکھا کر اس کے دادا کا مال کھائیں، آخر پوتے کا قصور کیا ہے؟ آیا یہ قصور ہے کہ وہ

مرتد ہو جاؤ مگر ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی تھی کہ تم سوا اپنے علماء کے کسی کی بات نہ ماننا۔ ایسا نہ ہو کہ تم صحابہ کرام کی باتوں اور نبی کریم ﷺ کی دلکش ہدایتوں کو سن کر انہی کے ہو جاؤ۔ گویا انہیں دو ہدایتیں کی تھیں۔ ایک کا ذکر پچھلی آیت میں ہو چکا۔ اور دوسری کا اب ہو رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں علمائے یہود کا کلام نقل فرمایا گیا۔ اب رب تعالیٰ مسلمانوں کو ہدایت فرما رہا ہے کہ تم ہر نو مسلم کی چکنی چپڑی باتوں پر اعتماد نہ کر لیا کرو بلکہ پختہ مسلمانوں کی بات پر اعتماد کرو۔ جیسا کہ اس کی ایک تفسیر سے معلوم ہوگا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ علماء یہود نے اپنے جن ساتھیوں کو ظاہری مسلمان ہو جانے پر آمادہ کیا ان سے یہ بھی کہا تھا کہ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ مسلمان شاید ہی اسلام سے ہٹیں۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ تم یہ کوشش اپنے دینی بھائیوں کی پختگی کے لئے کرو نہ کہ مسلمانوں کو ہٹانے کے لئے۔ ان کا ہٹانا بہت مشکل ہے۔ تمہاری اس حرکت سے خود تمہارے بھائی یہودیت پر پختہ ہو جائیں گے۔ گویا اس فریب کی ایک وجہ پچھلی آیت میں بیان ہوئی تھی اور دوسری وجہ اب بیان ہو رہی ہے۔ خیال رہے کہ علماء یہود کی ان تمام تقریروں کا تعلق شان نبوت سے تھا کہ وہ لوگ حضور ﷺ کی نبوت کے انکاری تھے مگر چونکہ نبوت کا انکار در پردہ رب کی شان کا انکار ہے۔ اس لئے رب تعالیٰ نے انہیں اپنا انکاری قرار دیا۔ اور ان کی تردید میں اپنی صفات عالیہ کا ذکر فرمایا۔ صفات الٰہی کا آئینہ ذات پیغمبر ہے۔ لہٰذا آیت پر یہ سوال نہیں کہ اس آیت کو ان کی تقریر سے کوئی تعلق نہیں۔

تفسیر

خیال رہے کہ یہ آیت کریمہ ترکیب و ترجمہ کے لحاظ سے نہایت دشوار ہے۔ اسی لئے مفسرین کرام نے اس کی چند تفسیریں اور مختلف ترکیبیں کی ہیں۔ نہایت آسان اور قوی اور واضح تر تفسیر یہ ہے کہ وَلَا تُؤْمِنُوْا سے عِنْدَ رَبِّكُمْ تک سارا کلام یہود کا ہے۔ سوا اس جملہ کے قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ۔ اور یہ آیت امنوا اور واکفروا پر معطوف ہے اور وَلَا تُؤْمِنُوْا میں ایمان یا بمعنی تصدیق ہے تو لِمَنْ تَبِعَ کا لام زائدہ ہے۔ جیسے ردف لکم کا لام اور یا بمعنی اقرار ہے تو لام صلہ کا ہے۔ اور اَنْ يُّؤْتٰى اَحَدٌ الخ لَا تُؤْمِنُوْا کا مفعول ہے۔ اور واؤ عاطفہ ہے۔ يُحَآجُّوْكُمْ یوتی پر معطوف اور عِنْدَ رَبِّكُمْ يُحَآجُّوْكُمْ کا ظرف ہے۔ اب معنی بالکل واضح ہو گئے۔ یعنی علمائے یہود نے جنہیں ظاہری مسلمان ہونے پر آمادہ کیا۔ انہیں یہ ہدایت کی کہ تم اپنے دین والے یعنی یہودیوں کے سوا کسی کے متعلق نہ یہ اقرار کرنا کہ کسی کو تم جیسے درجات، تم جیسی ہدایت اور تم جیسی کتاب مل سکتی ہے اور نہ یہ خیال کرنا کہ کوئی قیامت میں رب کے نزدیک تم سے مناظرہ کر سکے کیونکہ حق پر تم ہو۔ اور باقی سب باطل پر خلاصہ یہ ہے کہ بظاہر مسلمان تو بن جاؤ لیکن در پردہ اپنے ایمان پر قائم رہنا۔ درمیان میں جملہ معترضہ کے طریقہ پر رب تعالیٰ نے فرمایا کہ بے وقوفو ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے جسے چاہے ہدایت بتا دے اور جس ذہن کو چاہے گمراہی قرار دے۔ تم ہدایت کو اپنے دین میں محدود کیوں مانتے ہو۔ ایک وقت یہودیت ہدایت تھی۔ اب اسلام ہدایت ہے۔ اسی پر تفسیر کبیر و روح المعانی و خازن وغیرہ نے اعتماد کیا۔ اور اسی تفسیر کی جانب اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کا ترجمہ اشارہ کر رہا ہے۔ چونکہ امنوا ایمان سے بنا، ایمان کے لغوی معنی ہیں ماننا، قبول کرنا اصطلاحی معنی ہیں۔ حضور ﷺ کی لائی ہوئی چیزوں کو قبول کرنا اس جگہ دونوں معنی درست ہیں۔ اس لئے اس کے علاوہ کچھ تفسیریں اور بھی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ساری آیت رب تعالیٰ کا کلام

ہاں میراث کمال کی بھی،

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ
اور جب موجود ہوں تقسیم کے وقت قرابت والے اور یتیم اور مسکین
پھر بانٹتے وقت اگر رشتہ دار اور یتیم اور مسکین آجائیں
فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ⑧
پس دو انہیں اس مال سے اور کہو ان سے بھلی بات
تو اس میں سے انہیں بھی کچھ دو اور ان کو اچھی بات کہو

تعلقات

اس آیت کا گذشتہ آیت سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** گذشتہ آیت میں میراث کے مستحق عزیزوں کا ذکر تھا، اس آیت میں محروم رشتہ داروں کا تذکرہ ہے گویا مرزوقین کے بعد محرومین کا ذکر ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں میت کے مال کی فرضی تقسیم کا ذکر تھا، اب اسی مال کی نفلی تقسیم کا ذکر ہے، چونکہ فرض نفل پر مقدم ہوتا ہے اس لئے پہلے اس کا ذکر ہوا بعد میں اس کا، **تیسرا تعلق:** گذشتہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا تھا نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا جس سے معلوم ہوا تھا کہ ہر وارث کا حصہ شرعی حق ہے، جس میں کسی کو کمی بیشی کا اختیار نہیں، اب ارشاد ہو رہا ہے کہ صرف فرضی تقسیم پر ہی قناعت نہ کرنا بلکہ اس کے ساتھ کچھ نفلی تقسیم بھی کرنا جس سے تم ثواب کے مستحق ہو جاؤ، **چوتھا تعلق:** گذشتہ آیت کریمہ میں عدل والی تقسیم کا ذکر تھا جس پر عمل نہ کرنا سخت گناہ ہے، اب اس آیت میں فضل والی تقسیم کا ذکر ہے جس پر بڑے ثواب کا وعدہ ہے،

تفسیر

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ، اِذَا بمعنی اِنْ ہے یا اپنے ہی معنی میں ہے، حضور سے مراد مجلسِ تقسیم میں موجودگی ہے، قسمت سے مراد میراث کی تقسیم ہے، امام رازی فرماتے ہیں کہ اس سے منقولی میراث روپیہ وسامان کی تقسیم مراد ہے نہ کہ غیر منقولی میراث کی، کیونکہ محروموں کو منقولی میراث میں سے کچھ دینا چاہیے اور غیر منقولی میراث کی تقسیم پر ان سے اچھی بات کہہ دینی چاہیے، قسمت اگرچہ حَضَرَ فعل کا مفعول ہے اور اُولُوا الْقُرْبٰى فاعل، لیکن مفعول کو مقدم کیا گیا یا اظہار اہتمام کے لئے یا بیانِ حصر کے لئے، یعنی اگر یہ محرومین صرف تقسیم کے وقت ہی آئیں، آگے پیچھے کبھی نہ آئے ہوں، تب بھی انہیں کچھ دے دو، یہ نہ کہو کہ یہ خود غرض لوگ ہیں، غرض پڑی تو آئے اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ یہ سب حَضَرَ کا فاعل ہیں، اُولُوا الْقُرْبٰى سے مراد میت کے قرابتدار ہیں، اور یتیموں مسکینوں سے مراد اجنبی لوگ، اور ہو سکتا ہے کہ اُولُوا الْقُرْبٰى سے مراد مالدار جوان عزیز ہوں، اور الْيَتٰمٰى سے مراد یتیم مالدار عزیز، اور مساکین سے مراد غریب بالغ عزیز لہٰذا ان کلمات میں تکرار نہیں، یعنی اگر تقسیم میراث کے وقت یا تقسیم کی جگہ میت کے ایسے قرابت دار یتیم اور مسکین بھی موجود ہوں جو میراث سے محروم ہوں، اس لئے کہ

اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس رحمت سے مراد اللہ کا ذکر ہے۔ ابن جریج رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سے اسلام اور قرآن مراد ہے۔ قول ہے کہ اس سے نبوت مراد ہے۔ (روح المعانی) اس جملہ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ رب جسے چاہتا ہے۔ اپنی رحمت سے خاص فرماتا ہے کہ اسے مخصوص رحمت عطا فرماتا ہے۔ یا رب جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے ذریعہ اپنی نعمتوں سے خاص کرتا ہے۔ یا برحمتہ کی ب یا صلہ کی ہے یا سببیہ۔ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔ فضل اور عظیم کی تفسیر بارہا ہو چکی۔ یہاں ذو یا تو بمعنی لک ہے۔ جیسے زیدٌ یا بمعنی موصوف جیسے زید ذو علم یعنی اللہ بڑے فضل کا مالک ہے۔ یا اللہ بڑے فضل والا ہے مگر مالک کے معنی زیادہ قوی ہیں کیونکہ بعض لوگوں نے فضلِ عظیم سے دین اسلام مراد لیا ہے اور بعض نے توفیق خیر۔ اور ظاہر ہے کہ خدا پاک اس کا مالک ہے نہ کہ اس سے موصوف (از خازن) خیال رہے کہ فضل بمعنی فضیلت بھی ہوتا ہے۔ اور بمعنی فاضل بھی۔ یعنی اصل پر زائد اور بمعنی تفضل بھی (مہربانی کرنا) یہاں ہر معنی بن سکتے ہیں۔ (خازن)

خلاصہ تفسیر

علمائے یہود نے جب بعض لوگوں کو دھوکے کے لئے اسلام لانے پر آمادہ کیا تو انہیں یہ تعلیم دی کہ اے دوستو اپنے دین والوں کے سوا کسی کے متعلق یہ بات نہ ماننا کہ اس کو تمہاری طرح درجات و بزرگیاں دی جائیں۔ تم موسیٰ علیہ السلام کی امت صاحب توریت اور صاحب درجات ہو۔ تمہارے سوا اور کسی کو یہ بزرگیاں حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اور یہ بھی نہ خیال کرنا کہ کوئی قیامت میں رب تعالیٰ کے سامنے تم سے حجت بازی کر سکے' کیونکہ تم ہی سچے اور سب جھوٹے۔ اور جھوٹوں کی کیا طاقت کہ سچوں کے منہ لگیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس جا کر ان کی صحبت میں رہ کر انہیں سچا نہ جان لینا بلکہ اپنے دین پر قائم رہنا۔ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اے محبوب ﷺ ان بیوقوفوں سے فرما دو کہ حقیقی ہدایت وہ ہے جو اللہ کی طرف سے ملے۔ رب تعالیٰ جب چاہے جس دین کو چاہے ہدایت بنا دے اور جس کو چاہے منسوخ کر کے اسے گمراہی قرار دے۔ اس سے پہلے یہودیت ہدایت تھی اور اب اسلام۔ رات میں چراغ نور کا ذریعہ تھا مگر دن میں سورج۔ دن میں چراغ سے نور نہ لو ورنہ پاگل کہلاؤ گے۔ اب آفتابِ ہدایہ طلوع ہو چکا۔ توریت و انجیل کی شمعیں گل ہو چکیں۔ اب ان سے ہدایت لینا حماقت ہے۔ اور اے محبوب ﷺ یہ بھی فرما دو کہ فضل و کرم اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے جسے چاہے دے۔ جس پر خدا فضل کرے وہ تمہاری ان فریب کاریوں سے پھسل نہیں سکتا۔ تم لاکھ کوشش کرو' مسلمان اسلام سے نہیں ہٹیں گے۔ اللہ وسعت والا بھی ہے اور علم والا بھی۔ جس شخص کو جس نعمت کا اہل جانتا ہے اسے وہ ہی عطا فرماتا ہے۔ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص فرماتا ہے۔ اب تک نبوت سے بنی اسرائیل کو شرف بخشا اور اب بنی اسمٰعیل کو۔ اس کی رحمت پر کسی کا ٹھیکہ نہیں۔ اللہ بڑے فضل و کرم والا ہے۔ اس کے کرم کی حد نہیں۔ پھر تم نے اس کے کرم کو محض اپنے ساتھ کیوں خاص سمجھ لیا۔ تم کو اس کی اطاعت چاہیے نہ کہ اپنی قوم کی پچھ' جس پر وہ فضل فرمائے تم اس کے غلام بن جاؤ۔ یا اللہ تعالیٰ بڑی مہربانی والا ہے۔ کسی کو اپنی خاص رحمت سے مخصوص فرما دینا بھی اس کی مہربانی ہے۔ کسی زمین کو زعفران کی پیداوار کے لئے مخصوص فرماتا ہے' کسی کو تیل و کوئلہ' سونے چاندی کے لئے ایسے ہی کسی انسان کو نبوت کے لئے مخصوص فرما دیتا ہے کسی کو ولایت کے لئے' کسی کو خاص ہدایت کے لئے۔ یا اللہ تعالیٰ بڑی فضیلت سے موصوف ہے۔ اس کی شان مخلوق کے وہم و گمان سے برتر ہے۔ شعر

عام جگہ پر ہو، جہاں دوسرے بھی آسکیں، جیسا کہ وَ اِذَا حَضَرَ الخ سے معلوم ہوا، **دوسرا فائدہ:** بہتر یہ ہے کہ تقسیم میراث کے وقت صرف وارث ہی نہ ہوں بلکہ کچھ دوسرے محروم رشتہ دار اور اجنبی بھی ہوں تا کہ جو کچھ تقسیم ہو، سب کے سامنے ہو، سب گواہ ہو جائیں کہ اگر کل کو جھگڑا پڑے تو ان کی گواہی کام آئے، جیسا کہ اُولُوا الْقُرْبٰی سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** میراث کی تقسیم سے پہلے اس متروکہ مال سے کچھ خیرات کر دینا بہتر ہے، جس کام کی ابتداء خیرات سے ہوگی انشاء اللہ اس میں برکت ہوگی جیسا کہ فَارْزُقُوْا سے معلوم ہوا، بعض کاشتکاری میں شریک، دکان کے شرکاء پیداوار و آمدنی تقسیم کرتے وقت کچھ خیرات کرتے ہیں پھر تقسیم، ان کا ماخذ بھی یہ آیت کریمہ ہے، بعض لوگ کوئی دنیاوی کاروبار شروع کرتے وقت ختم کراتے ہیں غرباء مساکین کو کھانا کھلاتے ہیں پھر کام شروع کرتے ہیں ان کا ماخذ بھی یہ آیت کریمہ ہے، دینی کام خیرات وصدقہ سے شروع کرنا بہتر ہے، بچہ کو مکتب میں بھیجتے وقت، کتاب شروع کرتے وقت تقسیم شیرینی یہاں سے ماخوذ ہے، **چوتھا فائدہ:** جو رشتہ دار میراث سے محروم ہوگئے ہوں انہیں بھی میراث سے کچھ دے دینا علی الحساب بہتر ہے، باقی بچا ہوا مال وارثین آپس میں تقسیم کرلیں، یہ بھی فَارْزُقُوْهُمْ سے معلوم ہوا، لہٰذا یتیم پوتا، یتیم نواسا، یتیم بھتیجا وغیرہ جب کہ اس میراث سے محروم ہوگیا ہو، اسے کچھ ضرور دیں، مگر خیال رہے کہ غائب، دیوانے، نابالغ وارثوں کا حصہ پہلے الگ کر لیں، پھر یہ خیرات اور محروموں کو داد و دہش کریں جیسا کہ تفسیر میں عرض کیا گیا، **پانچواں فائدہ:** ان محروم عزیزوں کو یہ دیا جائے جو محجوب ہوں یعنی قریبین یا قوی عزیز کی وجہ سے محروم ہوگئے ہوں، جیسے بیٹے کے ہوتے پوتا، بیٹی کے ہوتے نواسا مگر جو اپنے کسی حال کی وجہ سے محروم ہوا اسے کچھ نہ دیا جائے، چنانچہ قاتل رشتہ دار جو اس قتل کی وجہ سے میراث سے محروم ہے اسے پھانسی دلوائیں، میراث نہ دیں جیسا کہ اُولُوا الْقُرْبٰی کی تفسیر سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** میت کے ترکہ سے اس کا تیجہ اور دسواں چالیسواں اور فاتحہ وغیرہ کر دینا بہتر ہے، مگر یہ کھانا مساکین وفقراء کو ہی کھلایا جائے، جیسا کہ وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنُ کی تفسیر سے معلوم ہوا کیونکہ آیت کریمہ نے ترکہ سے یَتٰمٰى وَ مَسٰكِیْن کو بھی کچھ دینے کا حکم دیا کہ ارشاد فرمایا فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ (النساء:۸) تفسیر خزائن العرفان میں فرمایا کہ زمانہ صحابہ میں اس پر عمل تھا، چنانچہ محمد ابن سیرین فرماتے ہیں کہ میرے والد نے تقسیم میراث کے وقت ایک بکری ذبح کرا کر کھانا پکایا اور رشتہ داروں، یتیموں و مسکینوں کو کھلایا، اور یہی آیت پڑھی، تفسیر خازن میں انہیں محمد ابن سیرین سے روایت کی کہ عبیدہ سلمانی رحمۃ اللہ علیہ نے میراث تقسیم کی، تو ایک بکری ذبح کرا کر کھانا پکوایا، یتیموں، مسکینوں اور عزیزوں کو کھلایا اسی آیت پر عمل کرتے ہوئے، اور فرمایا کہ اگر یہ آیت نہ ہوتی، تو میں یہ خرچ اپنے مال سے کرتا، اس آیت کی وجہ سے میراث سے خرچ کیا (خازن) مگر وہی بات خیال رہے کہ یہ تمام خرچ یتیم، دیوانے، غائب وارثوں کے مال سے نہ ہوں، ان کا حصہ علیحدہ کر کے پھر خیرات وغیرہ ہو، **ساتواں فائدہ:** یہ خیرات اور محروم عزیزوں کو کچھ دینا منقولی مال سے ہوں، رہی میت کی جائیداد مکانات اور دوسری غیر منقولی چیزیں وہ خیرات وغیرہ میں نہ دی جائیں بلکہ ان کے متعلق محرومین سے معذرت کر دی جائے، منقولی چیزوں کے لئے فرمایا فَارْزُقُوْهُمْ اور غیر منقولی چیزوں کے لئے ارشاد ہوا وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (تفسیر خازن) **آٹھواں فائدہ:** ہر امر وجوب کے لئے نہیں

مسلمانوں کا اولاد ابراہیم علیہ السلام کے لئے نبوت خاص ماننا قرآن کریم سے ثابت ہے۔ رب کی رحمت کو خود رب خاص فرما سکتا ہے نہ کہ کوئی اور۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ بڑے فضل والا ہے اور اس کا فضل ہمیشہ جاری اور نبوت بھی ایک فضل ہے پھر وہ ختم کیوں ہوگئی۔ چاہیے کہ دیگر نعمتوں کی طرح اس کا سلسلہ بھی باقی رہے۔ ختم نبوت کا عقیدہ یہودیانہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر نبوت ختم مان کر عیسیٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے تھے۔ (مرزائی) **جواب:** نبوت ختم نہیں ہوئی بلکہ نئے نبی کا آنا بند ہوگیا۔ ہمارے حضور ﷺ کی نبوت قیامت تک ہے۔ آپ کی موجودگی میں کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں' فرمادیا گیا اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ (مائدہ: ۳) یہود کا موسیٰ علیہ السلام کو خاتم النبیین ماننا توریت کے خلاف ہے کہ توریت میں حضور علیہ السلام کی آمد کی خبر دی تھی۔ مسلمانوں کا حضور علیہ السلام کو خاتم النبیین ماننا قرآن کریم سے ثابت۔ قرآن کریم میں حضور علیہ السلام کو خاتم النبیین کا لقب دیا اور کسی پیغمبر کو یہ لقب عطا نہ فرمایا۔ ہر چیز اپنے وقت میں نعمت ہے۔ بے وقت ہو تو زحمت و عذاب ہے۔ بارش اس وقت تک رحمت ہے جب تک کہ کھیتی کچی ہو۔ کھیت پک جانے پر عذاب۔ دین کی کھیتی پک چکی اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ کا اعلان ہو چکا۔ اب نئی نبوت آنا کھیت کو خراب ہی کرے گا۔ **تیسرا اعتراض:** اس کی کیا وجہ ہے کہ بنی اسرائیل میں صدہا پیغمبر آئے مگر بنی اسمٰعیل میں صرف ہمارے نبی ﷺ۔ اسی لئے تو یہود گھبراتے تھے کہ بنی اسمٰعیل کا خاندان' خاندان نبوت ہی نہیں پھر اس میں نبی کیسے۔ اگر اس خاندان میں بھی نبی آتے رہتے تو اہل کتاب کو اس اعتراض کا موقعہ نہ ملتا۔ **جواب:** سارے پیغمبر تاروں کی مثل ہے اور ہمارے نبی ﷺ سورج ہیں۔ آٹھویں آسمان پر ہزاروں تارے مگر چوتھے آسمان پر صرف سورج ہی ہے۔ ایک ملک میں حکام بہت سے رہ سکتے ہیں مگر بادشاہ ایک ہی رہے گا۔ یہود اس راز کو نہ سمجھے۔

تفسیر صوفیانہ

جیسا کہ ایمان صدہا اوصاف کی جڑ ہے کہ مومن کے جسم اور روح پر اعمال صالح کا باغ لگا دیتا ہے۔ ایسے ہی حسد بدعملیوں کی اصل ہے یہود کی یہ ساری حرکتیں محض حسد سے تھیں۔ اگرچہ حسد جبلت انسانی میں داخل ہے جسے خدا بچائے وہ ہی اس سے محفوظ رہتا ہے مگر علماء سوء کو یہ بیماری خاص طور پر ہوتی ہے کہ وہ جس عالم کو اپنے سے افضل پاتے ہیں جل جاتے ہیں۔ علمائے یہود حاسد ہی تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ چند لوگ حساب سے پہلے جہنم میں جائیں گے۔ ظالم حکام' خائن تاجر' حاسد عالم' صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ تین چیزیں گناہوں کی جڑ ہیں۔ تکبر' حرص اور حسد۔ تکبر نے عزازیل کو ابلیس بنادیا۔ حرص نے قابیل کو تباہ کیا اور حسد نے بہت سے گھر برباد کر دیئے۔ حاسد کی علامت یہ ہے کہ محسود کے سامنے اس کی چاپلوسی کرتا ہے اور پیٹھ پیچھے غیبت' اور مصیبت پر طعن۔ رب تعالیٰ حاسد نہ بنائے' محسود بنائے' حاسدوں کے حسد سے محسود کے فضائل ظاہر ہیں۔ جیسے آگ سے عود کی خوشبو پھیلتی ہے ہم نے حسد کے اسباب اور اس کے علاج دوسرے پارے میں تفصیل سے بیان کئے۔ جسے یہ بیماری ہوا سے چاہیے کہ ذکر اللہ کثرت سے کیا کرے اور آثار قدرت پر نظر رکھے کہ یہ اس کا بڑا علاج ہے۔ حق تعالیٰ ہمیں برے عیوب سے بچائے اور مسلمانوں کے صفات عطا فرمائے۔ (از تفسیر روح البیان)

صوفیاء فرماتے ہیں کہ اس آیت میں رب تعالیٰ نے اپنے تین نام بیان فرمائے۔ واسع' علیم' ذوالفضل العظیم۔ وَاسِعٌ وسعۃ

تفسیر صوفیانہ

صوفیائے کرام ومشائخ عظام کے ذکر وفکر کے حلقے گویا تقسیم میراث کی مجلسیں ہیں ان کے مریدین وخدام وطالبین جو ایسی مجلسوں میں حاضر ہیں وہ تو حق دار وارث ہیں مگر اجنبی لوگ جو اتفاقاً وہاں آ گئے یا گذرتے ہوئے وہاں ٹھہر گئے یہ محجوب ومحروم عزیز قرابت دار ہیں، ارشاد ہو رہا ہے کہ اے فیض دینے والے اور میراث نبی بانٹنے والے عالمو! صوفیو! جب اس تقسیم میراث کی مجلسوں یعنی ذکر وفکر کے حلقوں میں کوئی اجنبی آدمی آ بیٹھے یا آ نکلے تو تم اسے بھی محروم نہ چھوڑو، انہیں بھی ولایت، ہدایت، عنایت، رعایت میں سے کچھ دے دو، کہ ان مجلسوں میں آ جانے والا بھی محروم نہ رہے، ان کا پڑوسی بھی کچھ نہ کچھ لے ہی جائے، اور کچھ دینے کے ساتھ ساتھ ان اجنبیوں کو اچھی اچھی باتیں بھی بتا دو انہیں دنیا سے اعراض رب تعالیٰ کی رضا جوئی، راہ راست پر قائم رہنے، سنت رسول اللہ ﷺ پر کاربند رہنے کی نصیحتیں کر دو کہ یہ ان کے لئے قول معروف ہے، احوال والوں کی مجلس میں آ جانے والے بھی کچھ کمال لے جاتے ہیں، بعض اللہ والوں نے جذب کے عالم میں گذرتے ہوئے کافروں کو ولی بنا دیا، کیا تمہیں خبر نہیں کہ حضور قطب ربانی، محبوب سبحانی، قندیل نورانی حضرت محی الدین سید عبدالقادر جیلانی بغدادی قدس سرہٗ نے اس چور کو ولی بنا دیا جو رات کو آپ کے گھر چوری کرنے آیا تھا، فرمایا اگرچہ چور ہے مگر میرے گھر میں تو آ گیا، یہ بھی محروم کیوں جائے، یہ ہے فَارۡزُقُوۡهُمۡ مِّنۡهُ پر عمل، ایک بار سرکار بغداد رات کے وقت جنگل میں تنہا جا رہے ہیں، بہت قیمتی لباس زیب تن کئے ہوئے ہیں، کہ ایک راہزن ڈاکو نے بری نیت سے پیچھے سے آپ کا دامن پکڑا، آپ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا، اے قیوم وقادر اس نے دامن پکڑا عبدالقادر کا، اب قیامت تک یہ دامن اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹے، ابھی یہ دعا پوری نہ ہوئی تھی کہ وہ چور ڈاکو ولی ہو چکا تھا، حضرت سائیں توکل شاہ صاحب انبالوی قدس سرہٗ کے آستانہ پر ایک بوڑھا بیمار آ پڑا اور پکارنے لگا اے میری ماں! اے میری ماں! آپ نے جوش میں فرمایا ارے کہو اے میرے رب! اے میرے رب! وہ یہ ہی کہنے لگا، کچھ دیر میں جان نکل گئی، آپ نے فرمایا کہ دم آخر اس کا ایمان سلب ہو رہا تھا، میں نے خیال کیا کہ میرے دروازے پر گرا ہے کافر نہ مرے، ایمان کے ساتھ بھیج دیا، خیال رکھو کہ اچھوں کے دروازے پر مرنا بھی اچھا، یہ فَارۡزُقُوۡهُمۡ کی عملی تفسیر، اسی لئے صوفیائے کرام فرماتے ہیں، شعر

آدمی سے آدمی بھلی آدمی سے بھی آدھ بھیکا سنگت سادھ کی کاٹے کوٹ اپرات

اللہ والوں کے پاس آدمی بلکہ پاؤ گھڑی بھی بیٹھنے والا محروم نہیں رہتا، اچھوں کی سنگت گناہوں کے پہاڑ گلا دیتی ہے، اللہ تعالیٰ ہم گنہگاروں کو کسی کی نظر کرم نصیب فرمائے، آمین

وَلۡيَخۡشَ الَّذِيۡنَ لَوۡ تَرَكُوۡا مِنۡ خَلۡفِهِمۡ ذُرِّيَّةً

اور چاہئے کہ ڈریں وہ لوگ کہ اگر چھوڑ جائیں اپنے پیچھے بچے

اور ڈریں وہ لوگ کہ اگر اپنے بعد ناتواں اولاد چھوڑتے

مواخذہ نہیں اور اللہ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھتے ہیں ہاں کیوں نہیں جس نے اپنا
اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۷۶﴾
پورا کرے عہد اپنا اور پرہیزگار رہو پس تحقیق اللہ محبت فرماتا ہے پرہیزگاروں سے
عہد پورا کیا اور پرہیزگاری کی تو بیشک پرہیزگار اللہ کو خوش آتے ہیں

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں فرمایا گیا تھا کہ یہود اپنے کو دینی مراتب کا مالک کہتے ہیں اور اپنے سواء سب کو گنہگار جانتے ہیں۔ اب ان کے اعمال کا قبیحہ دکھا کر ان کے اس دعوے کی تردید کی جارہی ہے کہ خیانت' بدعہدی ان کے دن رات کے اعمال ہیں۔ پھر کس منہ سے یہ اپنے کو بڑا کہتے ہیں۔ گویا پہلے ان کا دعویٰ نقل کیا گیا تھا اور اب اس کی تردید ہو رہی ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کی دینی خیانتوں کا ذکر تھا کہ انہوں نے توریت کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ۔ لَا تُؤْمِنُوْۤا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ۔ اب ان کے معاملات کی خیانت کا ذکر ہے۔ گویا دو خیانتوں میں سے ایک کا ذکر پچھلی آیت میں ہوا اور دوسری خیانت کا ذکر اب ہو رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ یہودی ہمیشہ مسلمانوں کے نقصان کے خواہاں ہیں کہ ان کے ایمان چھیننے کی تدبیریں کرتے رہتے ہیں۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ وہ مسلمانوں کے مالی دشمن بھی ہیں۔ انہیں جب موقعہ مل جائے تو مسلمانوں کو مالی نقصان پہنچانے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیتوں میں یہود کی علمی خیانت کا ذکر تھا کہ یہ توریت کی ان آیتوں کو چھپاتے ہیں جن میں نبی آخر الزمان (ﷺ) کی نعت ہے۔ اب ان کی مالی خیانت کا ذکر ہے تاکہ مسلمان سمجھ جائیں کہ یہ ہمارے دینی دشمن بھی ہیں اور دنیوی بھی کیونکہ دنیا دار لوگ دنیوی دشمن سے بہت بچتے ہیں۔ دینی دشمن سے چنداں پرہیز نہیں کرتے۔

شانِ نزول

ایک قریشی نے عبداللہ ابن سلام کے پاس بارہ سو اوقیہ یعنی اڑتالیس ہزار دینار امانت رکھے۔ جب اس نے مانگے تب آپ نے بلا حیل و حجت اس کے حوالے کر دیئے۔ دوسرے شخص نے فنحاص ابن عازورا یہودی کے پاس ایک اشرفی امانت رکھی مگر جب مانگنے گیا تو فنحاص انکار کر گیا کہ مجھے نہ دی تھی۔ تب یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی جس میں عبداللہ ابن سلام کی تعریف اور فنحاص کی مذمت کی گئی (تفسیر کبیر و خازن) ایک روایت یہ ہے کہ کسی شخص نے کچھ یہود سے زمانہ کفر میں لین دین کیا تھا پھر وہ مسلمان ہو گیا اور اسلام لانے کے بعد اس یہودی سے اپنا قرضہ مانگا۔ یہودی بولا کہ چونکہ تم بے دین ہو گئے ہو اس لئے میں تمہارا قرض نہیں ادا کروں گا اگر اپنا قرض چاہتے ہو تو اسلام چھوڑ دو۔ تب یہ آیت کریمہ اتری۔ (تفسیر کبیر)

تفسیر

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ۔ اہل کتاب کے معنی پہلے ذکر ہو چکے ہیں کہ اس کے معنی ہیں آسمانی

صدقات وخیرات کا مشورہ دیتے تھے، کہتے تھے کہ یہ وارثین میراث لے کر تجھے کیا نفع پہنچائیں گے، یہ تو تجھے یاد بھی نہ کریں گے تو اپنے ساتھ صدقات وخیرات کا توشہ لے جا، یہ سب نصیحتیں اس غرض سے کرتے تھے کہ وارث لوگ میراث سے کچھ نہ پائیں، یا پائیں تو کم پائیں، ان لوگوں کے متعلق آیت کریمہ وَلْيَخْشَ الخ نازل ہوئی۔ (روح المعانی)

تفسیر

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ وَلْيَخْشَ خَشْيَةٌ کا امر غائب ہے جس کے معنی ہیں ڈرنا، خشیۃ، خوف، تقویٰ وغیرہ کے فرق ہم دوسرے پارے کی تفسیر میں عرض کر چکے ہیں الَّذِينَ اس کا فاعل ہے، اس الَّذِينَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو میت کے مرتے وقت اس کے پاس پہنچیں اور اس کے وارثوں کو نقصان پہنچانے کے لئے میت کو زیادہ صدقہ وخیرات اور مختلف وصیتوں کا حکم ومشورہ دیں جیسا کہ شانِ نزول سے معلوم ہوا، ممکن ہے کہ اس سے یتیموں کی پرورش کرنے والے ولی و وصی مراد ہوں، اور ہوسکتا ہے کہ اس سے سارے ہی لوگ مراد ہوں کہ آیت کی عام عبارت کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ خاص شانِ نزول کا، الَّذِينَ اسم موصول ہے اور لَوْ تَرَكُوا شرط خَافُوا جزاء سے مل کر اس کا صلہ، یہاں حَالُهُمْ پوشیدہ ہے جو مبتداء ہے اور لَوْ تَرَكُوا الخ خبر، تَرَكُوا سے مراد مرنے کے بعد چھوڑ جانا ہے، خلف مطلقاً پیچھے کو کہا جاتا ہے، مگر یہاں بعد موت و پسِ مرگ مراد ہے اور لَوْ بمعنی اِنْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ذریت کی تحقیق پہلے ہو چکی ہے کہ یہ ذر سے بنا بمعنی پھیلنا، چھوٹی چیونٹی کو ذر اور ریگ کے ذروں کو ذرہ کہا جاتا ہے کہ یہ بھی زمین میں پھیلے ہوئے ہیں یہاں چھوٹی اولاد مراد ہے جو چیونٹیوں کی طرح کمزور و بے بس ہے، ضعاف ضعیف بمعنی کمزور کی جمع ہے جیسے کریم کی جمع کرام لئیم کی جمع لئام، خَافُوْا سے مراد ہے بچوں کے ضائع برباد ہوجانے کا خوف و ڈر یعنی وہ میت کے مشیر کار جو میت کے وارثوں کو نقصان دینے کے لئے اسے زیادہ خیرات کرنے کا حکم دیتے ہیں جن کا حال یہ ہے کہ وہ خود اس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم مرجائیں اور ہمارے پیچھے ہمارے چھوٹے بچے برباد و ضائع نہ ہوجائیں انہیں چاہیے کہ میت کے بال بچوں کے متعلق بھی یہ ہی رہیں اور اس کے بال بچوں کو ضائع کرنے کے لئے میت کا مال دوسری جگہ خرچ نہ کرائیں فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُولُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا، پچھلے جملہ میں تو انہیں دنیاوی امور سے ڈرایا گیا تھا، اس جملہ میں انہیں آخرت کے عذاب سے دھمکایا جارہا ہے، سَدِيْدًا اسدٌ سے بنا بمعنی روکنا، اسی لئے دیوار کو سد کہتے ہیں کہ وہ باہر والوں کو اندر آنے سے روکتی ہے، اچھی بات کو سدید اس لئے کہتے ہیں کہ وہ برائیوں کو روکتی ہے، یہاں درست بات سے مراد یا تو مرنے والے کو اچھا مشورہ دینا ہے کہ وہ زیادہ خیرات یا وصیت کر کے ورثا کو نقصان نہ پہنچائے یا اس کے مرے بعد اس کے یتیموں سے اچھی بات کرنا انہیں تسلی و دلاسا دینا مراد ہے یعنی یہ مشیر کار اللہ سے ڈریں مرنے والے کو غلط مشورہ نہ دیں اور اس سے اچھی بات کہیں یا اس کے پسماندگان کو تسلی تشفی دیں تعزیت کریں، اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا، یہ نیا کلام ہے جس میں گذشتہ ہدایتوں کا تکملہ وتتمہ ہے، چونکہ اہل عرب یتیموں کے مال کھا جانے کو مطلقاً برا نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کی تائید کرتے تھے اس لئے یہ جملہ اِنَّ سے شروع فرمایا گیا الَّذِيْنَ سے مراد تمام مسلمان ہیں خواہ میت کے وصی ہوں یا یتیموں کے والی وارث یا حکام یا پنچ یا عام مسلمان، کھانے سے مراد یتیموں

ہے۔اس کا ترجمہ ہے اشرفی۔شاید اس کے موجد کا نام اشرف ہوگا۔اس لئے اسے اشرفی کہا جانے لگا۔یعنی بعض اہل کتاب وہ ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک اشرفی بھی امانت رکھ دو تو بھی خیانت کر جائیں ادا نہ کریں۔اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْهِ قَآئِمًا۔ یہ عام حالات یا عام اوقات سے استثناء ہے۔اس سے پہلے لَا یُؤَدِّهٖۤ اِلَیْکَ کا حال یا ظرف پوشیدہ ہے۔مَا مصدریہ ہے اور یہ جملہ بمعنی مصدر ہو کر ظرف یا حال ہے۔قائم قیام سے بنا جسکے لغوی معنی ہمیشگی اور ثبوت ہیں۔رب تعالیٰ فرماتا ہے۔یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ۔ اور فرماتا ہے۔دِیْنًا قِیَمًا۔ (انعام:۱۶۱) بمعنی دائم ثابت غیر منسوخ (کبیر) اصطلاح میں قیام کھڑے ہونے کو کہتے ہیں یا تو یہاں یہ ہی معنی مراد ہیں یا مجازی معنی۔حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہاں قیام سے تقاضا، مطالبہ یا مقدمہ مراد ہے۔(کبیر) امام حسن فرماتے ہیں کہ قیام سے مراد پکڑ لینا اور اس کے ساتھ ساتھ پھرنا یا تقاضا کرنا ہے۔تفسیر روح المعانی نے فرمایا کہ اس آیت کی اصل عبارت یوں ہے۔لَا یُؤَدِّهٖۤ اِلَیْکَ فِیْ حَالٍ مِّنَ الْاَحْوَالِ یَا فِیْ وَقْتٍ مِّنَ الْاَوْقَاتِ اِلَّا حَالَ دَوَامِ قِیَامِکَ یا وَقْتِ دَوَامِ قِیَامِکَ۔یعنی بعضے اہل کتاب ایسے نا دہند ہیں کہ وہ کسی صورت میں امانت کی ایک اشرفی بھی ادا نہ کریں سوا اس کے کہ تم ان کے سر پر سوار رہو۔یا ان سے تقاضا کرتے رہو۔یا ان پر مقدمہ کر دو۔یا اسے پکڑ لو کہ بغیر لئے نہ چھوڑو۔ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا۔ ذٰلِکَ سے نادہندگی کی طرف اشارہ ہے جو لَا یُؤَدِّهٖ سے معلوم ہوئی۔یہ مبتدا ہے اور بِاَنَّهُمْ الخ خبر۔ هُمْ کا مرجع مَنْ ہے۔چونکہ اس سے جماعت مراد تھی۔اس لئے ضمیر جمع لائی گئی۔لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ۔ یہ جملہ قَالُوْا کا مقولہ ہے۔عَلَیْنَا سے سارے اہل کتاب مراد ہیں۔اُمِّیّٖنَ امی کی جمع ہے۔جس کی تحقیق دوسرے پارہ میں ہو چکی۔یہاں اتنا سمجھ لو کہ یا اس سے ام القریٰ یعنی مکہ مکرمہ کے رہنے والے لوگ مراد ہیں۔یا بے پڑھے لوگ جو تحریر اور حساب کتاب سے ناواقف ہوں یا بے دین۔سبیل کے معنی ہیں۔راستہ یہاں اس سے ذریعہ یا وسیلہ مراد ہے۔تفسیر خازن نے فرمایا کہ یہاں سبیل معنی گناہ اور حرج ہے یعنی یہود کی یہ خیانت اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر مکہ والوں یا بے دینوں کے مال کھا لینے میں کوئی گناہ نہیں۔کیونکہ ہم خدا کے بیٹے اور پیارے ہیں۔یا یہ لوگ بے دین ہیں اور بے دین کا مال ہر طرح حلال۔یا یہ مطلب کہ ہم پر بے پڑھوں کا مال ہضم کر لینے میں کوئی دشواری نہیں کیونکہ ان کے پاس نہ کوئی تحریر ہے نہ گواہ کسی طرح ہم سے مال وصول نہیں کر سکتے۔غرضکہ یہود اپنے اس جرم کو جائز قرار دیتے تھے۔رب تعالیٰ نے ان کی تردید اس طرح فرمائی کہ وَیَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْکَذِبَ۔ یہ لوگ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔توریت شریف میں اس گناہ کی کہیں اجازت نہیں دی گئی۔پھر نادانی سے نہیں بلکہ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ۔ وہ اپنا فریب خود جانتے ہیں۔بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی۔ بَلٰی نعم اور ای وجیر۔سب جواب کے حروف ہیں بمعنی ہاں مگر فرق یہ ہے کہ نعم نفی کے اثبات کے لئے آتا ہے۔بلیٰ منفی کے اثبات کے لئے یہود نے کہا تھا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ۔ ہم پر مسلمانوں کا مال کھانے میں گناہ نہیں۔رب تعالیٰ نے بلیٰ فرما کر اس منفی کا ثبوت کر دیا۔یعنی ہاں ضرور گناہ ہے۔مَنْ اَوْفٰی الخ نیا جملہ ہے۔جو بلیٰ کے مضمون کو ثابت کر رہا ہے۔مَنْ یا موصولہ ہے یا شرطیہ۔اس سے مراد سارے انسان ہیں۔خواہ کسی خاندان کے ہوں، کسی نسل، کسی ملک کے اور کسی زمانہ کے مَنْ فرما کر یہودی تردید فرمائی کہ نسل موسوی کا آدمی رب کا پیارا ہے۔اَوْفٰی ایفاء سے بنا بمعنی خوب پورا کرنا عهدہ کی ضمیر یا من کی طرف لوٹتی ہے جو کہ عہد کا فاعل ہے۔یا رب کی

ہی معاملہ و پرورش دوسرے کے یتیموں سے انہیں کرنا چاہیے، لہٰذا یہ لوگ اللہ سے ڈریں اور مرنے والے سے نیز ان یتیموں سے اچھی باتیں کریں کہ مرنے والے کو ظلم سے روکیں، ان یتیموں کو تسلی وتشفی دیں، یقین رکھو کہ جو کوئی وارث یا غیر وارث یتیموں کا کسی قسم کا مال ناحق مارے گا اور ظلماً کھائے گا وہ درحقیقت پیٹ بھر کر دوزخ کی آگ کھائے گا کہ یہ مال کل دوزخ کے انگارے بن کر اس کے پیٹ میں بھرا جائے گا، اور کوئی دم جاتا ہے کہ یہ بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے، اس لئے یتیم کے مال سے بہت ڈرنا چاہیے، حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے معراج کی خبریں سنائیں، فرمایا کہ ہم نے ایک قوم کو ملاحظہ فرمایا جن کے ہونٹ اونٹوں کے سے ہیں، ان پر فرشتے مقرر ہیں جو انہیں آگ کے پتھر کھلاتے ہیں، یہ پتھر ان کے منہ سے داخل ہو کر پاخانہ کے مقام سے نکل جاتے ہیں، ہم نے پوچھا اے جبریل! یہ لوگ کون ہیں؟ فرمایا یہ یتیموں کا مال ظلماً کھانے والے ہیں، امام سدی فرماتے ہیں کہ قیامت میں یتیموں کا مال ظلماً کھانے والے اس طرح اٹھیں گے کہ ان کا کانوں، ناک اور آنکھوں سے دھواں نکلتا ہوگا لوگ انہیں پہچان لیں گے کہ یہ یتیموں کا مال کھانے والے ہیں، (تفسیر خازن)

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** میت کو مرتے وقت برا مشورہ دینا جس سے میت کے وارثوں یتیموں کا نقصان ہو حرام ہے، اگرچہ وہ بظاہر اچھا معلوم ہوتا ہو، جیسا کہ پہلی آیت کے شانِ نزول سے معلوم ہوا، **دوسرا فائدہ:** مستحق وارثوں کو محروم کر کے نفلی صدقہ وخیرات کرنا ممنوع ہے، صدقہ وہ اچھا جس سے کسی کا حق نہ مارا جائے، یہ بھی اسی شانِ نزول سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** میت مرتے وقت اپنے مال کے متعلق وصیت بھی کر سکتا ہے اور خیرات بھی ورنہ اسے اس کا مشورہ دینے کا کیا فائدہ ہوتا، مگر جو کچھ بھی کرے تہائی مال سے کرے، **چوتھا فائدہ:** کبھی اچھا کام درحقیقت برا ہوتا ہے، دیکھو خیرات صدقہ اچھا ہے مگر جب اس سے مستحقین کو نقصان پہنچے تو برا ہے، بعض وقت نماز پڑھنا بھی جرم ہوتا ہے بلکہ نماز توڑ دینا ضروری ہو جاتا ہے، نمازی نے کسی اندھے کو کنوئیں میں گرتا دیکھا تو فرض ہے کہ نماز توڑے اور اندھے کا ہاتھ پکڑ کر اس کی جان بچائے، **پانچواں فائدہ:** ہمیشہ دوسروں کے ساتھ وہ معاملہ کرو، اور ان سے ایسی گفتگو کرو کہ دوسرا تمہارے ساتھ کرے تو تمہیں ناگوار نہ ہو، شعر

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو کلام ایسا کہ جو تم سے کوئی کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

جو بات سن نہ سکو، وہ دوسرے سے کہو بھی نہیں، جو برتاوا برداشت نہ کر سکو، وہ دوسرے سے کرو بھی نہیں، یہ آیت کریمہ اخلاقیات کا خزانہ ہے، **چھٹا فائدہ:** جو دوسرے کے یتیموں پر ظلم کرتا ہے، تو دوسرے اس کے یتیموں پر ظلم کرتے ہیں، اپنے بچوں کی خیر چاہتے ہو، تو دوسروں کے بچوں کی خیر چاہو، "کر بھلا، ہوگا بھلا" ایسے ہی جو اپنے ماں باپ کو ستاتا ہے، تو اس کی اولاد اسے ستاتی ہے، جو اپنے اہلِ قرابت سے سلوک کرتا ہے، تو بوقت ضرورت اس کے عزیز اس سے سلوک کرتے ہیں، جو دوسرے کمزور بڈھوں کی دستگیری کرتا ہے تو اس کے بڑھاپے پر دوسرے اس کی دستگیری کرتے ہیں، ع

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

ہے۔ ہمارے حضور ﷺ کو یہ صفت ایسی کامل عطا ہوئی تھی کہ ظہور نبوت سے پہلے کفار آپ کو محمد امین کہتے تھے۔ اب بھی روضۂ مطہرہ کی جالی میں یہ عبارت ہے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَادِقُ الْوَعْدِ الْاَمِيْنِ۔ حضرت عبداللہ ابن سلام کو امانتداری کی برکت سے ایمان وغیرہ ملا اور حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تین اسرائیلی ایک غار میں پھنس گئے تو انہوں نے اپنے نیک اعمال کے توسل سے دعائیں کیں۔ ایک شخص نے اپنی امانت و دیانت کے صدقہ سے دعا کی کہ مولیٰ میرے کھیت کا مزدور اپنی مزدوری کے دانے چھوڑ گیا تھا۔ بارہ برس کے بعد لینے آیا جبکہ میں نے اس کے دانے بو کر غلہ کے ڈھیر جانوروں کے گلے لونڈی و غلام جمع کر لئے تھے۔ میں نے وہ سب اس کے حوالہ کر دیئے۔ میرے مولیٰ اس امانت داری کے طفیل نجات دے۔ انہیں نجات ملی۔ غرضکہ امانتداری بہت اعلیٰ صفت ہے۔ **دوسرا فائدہ:** بعض کفار مسلمانوں کا مال کھانا' انہیں ایذا دینا ثواب سمجھتے ہیں۔ ہندوستان کے ہندوؤں کا یہ ہی حال ہے۔ اس کا تجربہ ان لوگوں کو خوب ہے جنہیں بنیوں سے لین دین کا اتفاق رہتا ہے۔ یہ ہزار بہانے سے مسلمان سے پیسہ نکلوانا چاہتے ہیں جو کفار اپنا معاملہ صاف بھی رکھتے ہیں۔ وہ فقط اپنی تجارت کے فروغ کے لئے نہ کہ مسلمان کی خاطر۔ **تیسرا فائدہ:** معاملات کا اثر عبادات عقائد پر پڑتا ہے۔ خراب معاملے والا عبادات مکمل نہیں کر سکتا۔ اور عبادات میں سستی کرنے والے کے عقائد بھی خطرہ میں ہیں۔ بے نمازی قرض سے نہیں ڈرتا۔ اور خائن نماز چھوڑنے سے خوف نہیں کرتا کیونکہ نماز بھی رب کا قرض ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے یہود کی بددیانتی ان کا مردود ہونا ثابت فرمایا۔ **چوتھا فائدہ:** کفار کو امانت دینا' ان کی امانتیں لینا' ان کے ساتھ قرض وغیرہ مالی معاملات کرنا' جائز ہیں۔ جیسا کہ اِنْ تَاْمَنْهُ سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** ادائے امانت بہت ضروری ہے۔ خواہ مسلمان کی امانت ہو۔ خواہ کافر حربی کی یا ذمی کی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جاہلیت کی ساری چیزیں میرے قدم کے نیچے ہیں۔ سوا امانت کے کہ وہ ضرور ادا کی جائے گی۔ خواہ نیک کی ہو یا بد کی (معانی) نیز ہجرت کے وقت حضور علیہ السلام کے پاس ان خونخوار کفار کی امانتیں تھیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ تم ان کی امانتیں ادا کر کے مدینہ پاک پہنچ جانا۔ **چھٹا فائدہ:** کفار کی گواہی ایک دوسرے پر صحیح ہے کیونکہ گواہی بھی ایک امانت ہے۔ جب مالی امانت جائز تو یہ بھی جائز۔ نیز رب تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو امین فرمایا۔ لہٰذا وہ گواہی کے قابل ہوئے۔ (احکام القرآن) **ساتواں فائدہ:** وعدہ پورا کرنا بہت ضروری ہے۔ جیسا کہ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ سے معلوم ہوا۔ **مسئلہ:** ناجائز وعدے پورے کرنا حرام' ناجائز مال کی امانت رکھنا سخت جرم ہے۔ مثلاً کسی نے کسی سے شراب پینے یا چوری یا کفر کرنے کا وعدہ کیا ہو تو ہرگز پورا نہ کرے یا چوری کے مال کی ہرگز امانت نہ رکھے بلکہ اسے مالک یا حاکم کے پاس پہنچا دے۔ **مسئلہ:** کسی کا راز اور دینی علم بھی امانت ہے۔ جو عالم ضرورت کے وقت مسئلہ بیان نہ کرے یا جو کسی کا راز ظاہر کر دے وہ خائن ہے۔ **مسئلہ:** غیر ضروری مسائل و خطرناک راز امانت نہیں۔ جس مسئلہ کی ضرورت نہ ہو اور اس کے بیان کرنے سے فتنہ پھیلتا ہو وہ بیان نہ کیا جائے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ خانہ کعبہ کی تعمیر بنیاد ابراہیمی پر مکمل نہیں مگر درست نہ فرمایا۔ کیونکہ موجودہ کعبہ میں حرج تھا نہیں اور درست کرنے میں فتنہ کا اندیشہ تھا۔ اسی طرح اگر کسی نے مسلمانوں کے خلاف خطرناک سازش کی اور ہم کو پتہ لگ جائے تو ہم پر اس کا اظہار کرنا ضروری ہے تاکہ مسلمان نقصان سے بچیں۔ خود قرآن کریم نے جابجا کفار اور منافقین کی خفیہ

دینے والا فقیر کا مال مارتا نہیں بلکہ اپنا مال اسے دیتا نہیں مگر یہ بدنصیب یتیم کا مال مارتا ہے، دوسرے یہ کہ فقیر کبھی جوان، تندرست، قابلِ کسب بھی ہوتا ہے، مگر یتیم لاوارث بچہ ہے، اس پر ظلم سخت تر ہے، تیسرے یہ کہ زکوٰۃ حق اللہ ہے، مگر مال یتیم حق العبد، حق اللہ مارنے سے حق العبد مارنا سخت جرم ہے کہ حق العبد بغیر بندے کے معاف کئے معاف نہیں ہوتا اور یتیم معاف کرنے کے قابل نہیں، اگر اس حال میں یہ شخص مرگیا تو ناقابلِ معافی گناہ کر کے مرے گا، **چھٹا اعتراض:** تیموں کا مال مارنے والا خود مجرم ہے، اس کی اولاد نے کیا جرم کیا کہ ان پر بھی وبال پڑا، جیسا کہ لَوْ تَرَكُوْا ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا سے معلوم ہوا، **جواب:** اس کے چند جواب ہیں، ایک یہ کہ اس آیت کریمہ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اگر تم لوگوں نے تیموں پر ظلم کیا تو تمہارے بچے بھی یتیم ہوں گے اور لوگ ان پر بھی ظلم کریں گے بلکہ مقصد یہ ہے کہ تم مرحوم میت کے رنج وصدمہ کا اندازہ کرو کہ اگر تمہارے بچے یتیم رہ جائیں، اور لوگ ان پر ظلم کریں، تو تم کو کتنا صدمہ ہوگا، اور مرتے وقت تمہیں اپنے تیموں کی کیسی فکر ہوگی، ایسے ہی دوسرے کو بھی صدمہ وفکر ہوگی، اور اگر مان بھی لیا جائے، تب بھی قانونِ قدرت یہ ہے کہ کبھی گنہگاروں کی وجہ سے بے گناہ بھی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں، اگر ایک شخص جہاز کا تختہ توڑ دے، تو جہاز کے سارے مسافر ڈوب جاتے ہیں، جن قوموں پر عذاب الٰہی آیا، ان کے بچے اور جانور بھی ہلاک ہوئے، ایسے ہی ظالم ماں باپ کے ظلم کی پاداش اس کی اولاد بھگتتی ہے، ممکن ہے کہ آئندہ آخرت میں ان بے قصوروں پر اس کے عوض کرم ہو جائے، نیز ظالم کے بال بچے اس کے ظلم کے مال سے پلتے ہیں، جب اس کے مال سے نفع اٹھا رہے ہیں تو سزا بھی بھگتیں، ہم نے مظلوموں کو یہ بددعا دیتے سنا ہے کہ خدا کرے تیری زیادتیاں تیری اس اولاد کے آگے آئیں،

تفسیر صوفیانہ

دنیا میں چار قسم کے لوگ ہیں دنیاوی ڈر سے ماننے والے اخروی خوف سے بعض لالچ سے قبول کرتے ہیں بعض شوق ومحبت سے، اسی لئے قرآن کریم میں چاروں طریقے استعمال فرمائے گئے، یہاں پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اولاً تو ان ظالموں کو جو یتیموں کو ستائیں دنیاوی خوف دلایا، فرمایا ایسا نہ ہو کہ تمہارے بچے بے یارومددگار رہ جائیں، پھر خوف آخرت دلایا کہ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ خوف دلا کر ارشاد ہوا کہ جو لوگ اپنے یتیم قلب وروح کا حق مار لیتے ہیں کہ دنیا میں عبادت، ریاضت کبھی نہیں کرتے، زندگی کی ہر ساعت نفس کی پرورش میں گذار دیتے، ان کے سارے مال، سارے اعمال، سارے احوال، سارے کمال نفس پر خرچ ہوتے ہیں، یہ لوگ آگ کھا رہے ہیں، عنقریب دوزخ حرص، دوزخِ ہوا، دوزخِ محرومی اور پھر دوزخ آگ میں داخل ہوں گے، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جیسے قریباً ہر پھل میں مغز تمہارے لئے ہے چھلکا گٹھلی جانوروں کے لئے، اگر تم پورا پھل مع چھلکا و گٹھلی کھا جاؤ، تو ہلاک ہو جاؤ گے، ہر ایک کو اس کا حصہ دو، ایسے ہی وقت مال، عزت، سانس اور تمام اعضائے بدن میں نفس کا حصہ بھی ہے، اور روح کا حصہ بھی، کچھ ساعتیں نمازوں کے لئے وقف کرو کچھ کام کاج کے لئے، کچھ سونے و آرام کے لئے، کچھ سانسیں رب تعالیٰ کی یاد کے لئے ہوں، کچھ دنیاوی کاموں کے لئے، ہر عضو کا یہی حال ہے جو شخص ساری زندگی ساری سانسیں اور سارے اوقات دنیا وطلب دنیا میں گذارے وہ ظالم ہے یتیم کا مال ناحق کھا رہا ہے، اس کا ٹھکانہ

نے بعض اہل کتاب کی امانت داری کی تعریف فرمائی مگر مسلمان سمجھتے ہیں کہ کافر کو اچھا کہنا کفر ہے۔(آریہ) **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ یہ امانتدار وہ ہی تھے جو پہلے یہودی تھے اوراب مسلمان ہو چکے تھے لہٰذا اس میں مسلمانوں کی تعریف ہے نہ کہ کفار کی۔ دوسرا یہ کہ کفار کی ...... واقعی نیکیوں کا ذکر کرنا منع نہیں۔ یہ تو عین انصاف ہے۔ ہم دن رات انگریزوں کے انتظام ان کی پابندی وقت وغیرہ کا ذکر کیا ہی کرتے ہیں۔ کفار کے کفر کی تعریف کرنا کفر ہے اور بلاوجہ خوشامد میں ان کی جھوٹی سچی تعریفیں کرنا ناجائز۔ یہ تو قرآن پاک کی حقانیت ہے کہ وہ دشمن کی واقعی نیکی کا بھی اعتراف فرمالیتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

قالب کا قلب پر صورت کا معنی پر اثر پڑتا ہے۔ عبادات کی درستی کے لئے اپنے معاملات ٹھیک رکھو اور عقائد کی اصلاح کے لئے اپنے اعمال کی اصلاح کرو۔ دل ایک آئینہ ہے۔ کفر اس کا زنگ ہے اور معاملات و عبادات کی خرابی اس کے گردو غبار۔ کوئی شخص اعمال خراب رکھ کر رب تعالیٰ کا پیارا نہیں بن سکتا۔ دیکھو رب تعالیٰ نے یہود کی مردودیت ان کی خرابی معاملات و عبادات سے ثابت کی۔ ولی وہ ہے۔ جس کی قوت نظری و عملی دونوں درست ہوں۔ اسی طرح عہد پورا کرنا' ولایت کے لئے بہت ضروری ہے کیونکہ عبادات کا مدار دو چیزوں پر ہے۔ رب تعالیٰ کے حکم کی تعظیم اور خلق پر مہربانی اور وفائے عہد میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ لہٰذا اس کے بغیر کوئی عابد ہو سکتا ہی نہیں۔ اسی لئے حدیث شریف میں ارشاد ہوا کہ خیانت' جھوٹ اور بدعہدی منافق کی علامت ہے۔ خیال رہے کہ عہد رب تعالیٰ سے بھی ہے۔ نفس سے بھی اور مخلوق سے بھی۔ وہ ہی شخص وفادار ہے جو سارے عہدوں کو پورا کرے۔ یعنی شریعت پاک کی پوری اتباع کرے (از روح البیان) صوفیاء فرماتے ہیں کہ امین دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جسے صرف امانت کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا ہو کہ ضائع نہ ہونے دے۔ دوسرا وہ جسے امانت میں تصرف کرنے کا حکم دیا گیا ہو کہ مالک کے حکم کے ماتحت اس میں عمل درآمد کرے اور مطالبہ پر بخوشی اس کی امانت واپس کر دے۔ دل پر میل نہ لائے۔ جو اسمیں کھرا نکلا وہ امین ہے۔ جو غلط رو ہوا وہ خائن ہے۔ تمام انسان اللہ تعالیٰ کے امین ہیں۔ اور انسان کے اعضاء' مال' اولاد وغیرہ اللہ تعالیٰ کی امانتیں ہیں جن کے متعلق رب تعالیٰ نے احکام نافذ فرمائے ہیں کہ اس طرح ان میں تصرف کرتے رہو۔ اور جب ہم اپنی امانت واپس مانگیں تو بلا عذر ہمارے حوالہ کر دو۔ جو ان ہدایات پر کاربند رہا وہ امین ہے اور جو رب کے فرمان کے خلاف عمل کرتا رہا اور مال یا اولاد یا جان جانے پر بے صبری کرتا رہا وہ ہی خائن ہے۔ امین پر اللہ کی رحمتیں ہیں۔ خائن پر قہر۔ حضرت طلحہ کا پیارا بچہ ان کے پیچھے فوت ہو گیا۔ سفر سے واپس آنے پر ان کی زوجہ نے صبح کے وقت خبر دی کہ اے ابوطلحہ اللہ نے اپنی امانت واپس لے لی ہے۔ ملول نہ ہوؤ اس خبر پر حضور انور ﷺ نے ان کے لئے دعا فرمائی۔ حضرت طلحہ کا اولاد اور اولاد کی اولاد سے اللہ نے گھر بھر دیا۔ سو بچوں کا خاندان دیکھ کر آپ کی وفات ہوئی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ
تحقیق وہ لوگ جو خریدتے ہیں بدلے عہد اللہ کے اور قسموں اپنی کے قیمت تھوڑی یہ لوگ
وہ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے ذلیل دام لیتے ہیں

شریف مجھ پر چھڑکا، مجھے ہوش آگیا، تو میں نے حضور انور ﷺ اور جناب صدیق کو اپنے سرہانے بیٹھا پایا، شعر

سرِ بالیں انہیں رحمت کی ادا لائی ہے حال بگڑا ہے تو بیمار کی بن آئی ہے

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں اپنے مال کے متعلق کیا فیصلہ کروں؟ میرے بعد یہ کیسے تقسیم ہوگا؟ حضور انور ﷺ نے مجھے کچھ جواب نہ دیا، حتی کہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (خازن و معانی) دوسری روایت میں ہے کہ اس سوال پر وہ آیت میراث اتری یَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ (النساء:۱۷۶)

۲۔ مقاتل و کلبی کہتے ہیں کہ یہ آیت بھی انہیں ام کحہ زوجہ اوس ابن ثابت کے متعلق نازل ہوئی، جن کا ذکر پہلے ہو چکا جن کے متعلق پہلی آیت نازل ہوئی تھی (خازن)

۳۔ ترمذی نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی، کہ حضرت سعد ابن ربیعہ شہید ہوئے، انہوں نے ایک بیوی، دو لڑکیاں، ایک بھائی چھوڑا، اس زمانہ کے دستور کے مطابق سعد کے بھائی نے سارا مال لے لیا، ان بیوہ اور یتیم بچیوں کے لئے کچھ نہ چھوڑا، وہ بیوہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئیں، عرض کرنے لگیں، یا رسول اللہ ﷺ! میں اب کہاں جاؤں اور یہ یتیم بچیاں کہاں دھکے کھائیں؟ میرا خاوندان کا باپ آپ کے ساتھ شہید ہوگیا، مال پر ان کے چچا نے قبضہ کر لیا، حضور انور ﷺ نے فرمایا مت گھبراؤ، رب تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا، تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، حضور انور ﷺ نے سعد کے بھائی کو حکم بھیجا کہ سعد کے مال کا آٹھواں حصہ ان کی بیوی کو دو، دو تہائی ان کی لڑکیوں کو، باقی جو بچے وہ تمہارا (خازن و کبیر و روح المعانی)

۴۔ امام سدی فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں میت کے مال سے عورتوں اور چھوٹے بچوں کو کچھ نہ دیا جاتا تھا، صرف جوان مرد ہی ترکہ لیتے تھے، حضرت حسان شاعرِ رسول کے بھائی عبدالرحمٰن نے وفات پائی، ایک بیوی، پانچ بیٹیاں چھوڑیں، دستور کے مطابق دوسرے وارثوں نے سارا مال لے لیا، ان لوگوں کو کچھ نہ دیا، عبدالرحمٰن کی بیوی نے بارگاہِ نبوت میں شکایت کی، تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، (خازن) مگر ان روایات میں کوئی تعارض نہیں، کچھ وقفہ سے یہ سارے واقعات رونما ہوئے ہوں گے اور دربارِ رسالت میں شکایات پیش ہوئی ہوں گی تب یہ آیت نازل ہوئی،

تفسیر

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ يُوْصِي اِيْصَاءٌ سے بنا بمعنی پہنچانا، اس کا مادہ وَصْيٌ ہے باب ضرب سے وَصٰى يَصِي ماضی مضارع ہے، کہا جاتا ہے اَرْضٌ وَّاصِيَةٌ گھنے درختوں والی زمین، جو اللہ کی روزی ہم تک پہنچائے، اصطلاح میں وصیت وہ حکم ہے جو کوئی اپنی وفات کے بعد کے متعلق کرے خواہ زندگی میں کرے یا مرتے وقت، کہ اس کے ذریعہ سے میت اپنا مال دوسروں تک پہنچاتا ہے، پھر ہر تاکیدی حکم کو وصیت کہنے لگے، کہ اہلِ عرب وصیت کا بہت اہتمام و احترام کرتے تھے کہ حتی الامکان وصیت ضرور پوری کرتے تھے، اس لئے تاکیدی حکم وصیت کہلایا، یہاں یہ ہی تیسرے معنی مراد ہیں یعنی تاکیدی حکم دینا، واجب و لازم کرنا، کُمْ سے خطاب سارے مسلمانوں کو ہے، کفار پر یہ احکام جاری نہیں، ہمارا حاکم ان کی میراث ان کے مذہب کے مطابق تقسیم کرے گا، بعض لوگوں نے کہا کہ یہ خطاب مال والے مسلمانوں سے ہے جن کا ترکہ بٹے، مگر قوی یہ ہے کہ سارے مسلمانوں

اتری (احکام القرآن) (۶) احمد اور ابن جریر نے عدی ابن ابی عمیرہ سے روایت کی کہ ایک دفعہ امرئ القیس اور حضر موت کے کسی آدمی کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ مقدمہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں آیا۔ حضور علیہ السلام نے حضرمی سے فرمایا کوئی گواہ لاؤ۔ اس نے کہا میرے پاس گواہ کوئی نہیں۔ فرمایا تو امرئ القیس کی قسم پر فیصلہ ہوگا حضرمی نے عرض کیا کہ پھر تو امرئ القیس میری زمین لے لیں گے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کوئی اپنے بھائی کا مال مارنے کے لئے جھوٹی قسم کھائے وہ حق تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر ناراض ہوگا۔ امرئ القیس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) جو کوئی سچی قسم بھی نہ کھائے اور اپنا مال چھوڑ دے۔ فرمایا اس کے لئے جنت ہے۔ عرض کیا حضور گواہ رہیں۔ میں نے زمین کو چھوڑ دیا۔ تب یہ آیت کریمہ اتری (روح المعانی' کبیر و خازن وغیرہ)

تفسیر

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ...... انّ اس جگہ بولا جاتا ہے جہاں کسی کو کچھ تردد ہو۔ چونکہ بڑے گناہوں کو تو اکثر لوگ گناہ سمجھتے ہیں۔ گنہگار کو برا جانتے ہیں ہمیشہ نہیں کرتے۔ زنا' چوری' شراب خوری کا یہی حال ہے مگر چھوٹے گناہ جھوٹی قسمیں جھوٹے وعدے وغیرہ ایسے ہیں کہ انہیں عموماً لوگ کم برا جانتے ہیں۔ ان کی پرواہ نہیں کرتے دن رات کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ چھوٹے گناہ اس چھوٹی چنگاری کی طرح ہیں جو کبھی گھر جلا دیتی ہے۔ اس لئے رب نے یہ آیہ کریمہ اِنَّ سے شروع فرمائی۔ حق یہ ہے کہ الَّذِيْنَ سے مراد سارے انسان ہیں۔ مومن ہوں یا کافر۔ اونچے خاندان کے ہوں یا نیچے کے اور اگر اس میں جنات بھی داخل ہوں تو تعجب نہیں۔ ہر وعدہ خلاف جھوٹی قسمیں کھانے والا ان پانچوں سزاؤں کا مستحق ہوگا۔ يَشْتَرُوْنَ اشراء" سے بنا بمعنی خریدنا۔ یہاں بدلنا مراد ہے۔ بلاعوض مال دینا ھبہ ہے۔ اگر رضاء الٰہی کے لئے دیا جائے تو صدقہ ہے۔ اور رضاء انسان کے لئے دیا جائے تو ہدیہ اگر چھوٹا بڑے کو دے تو اس ہدیہ کو نذرانہ کہتے ہیں۔ اور بڑا چھوٹے کو دے تو عطیہ اور بالعوض مال دینے کی دو صورتیں ہیں اگر منافع کے عوض دیا ہے تو اجارہ یا کرایہ ہے اور اگر مال کے عوض دیا ہے تو بیع وشرا یعنی خرید و فروخت ایمان متاع روحانی ہے۔ اس کے عوض مال لینا بیع وشرا قرار دیا گیا۔ ایک جگہ رب تعالیٰ نے اسے تجارت فرمایا ہے۔ کہ فرمایا فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ۔ (بقرہ: ۱۶) بِعَهْدِ اللّٰهِ کی ب عوض کی ہے۔ عہد کی اضافت اپنے مفعول کی طرف ہے اور اس سے یا تو وہ عہد مراد ہے جو میثاق کے دن رب تعالیٰ نے سب سے لیا۔ یا وہ عہد مراد ہے جو اسلام لاتے وقت بندہ اللہ سے کرتا ہے۔ یا وہ عہد مراد ہے جو یہود سے توریت میں لیا گیا تھا۔ یعنی حضور علیہ السلام پر ایمان لانا۔ اور آپ کی اطاعت کرنا۔ بعض نے فرمایا کہ عہد سے مراد عقل کی ہدایت ہے کہ ہر شخص کی عقل اسے برائی سے روکتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ عہد اللہ سے وہ وعدے ہوں جو اللہ کو ضامن دے کر لوگوں سے کیے گئے۔ اس میں جھوٹ بھی ہے اور اللہ کے نام کی توہین بھی۔ ایمان یمین کی جمع ہے۔ اس کی لفظی تحقیق پہلے ہو چکی یا تو اس سے وہ جھوٹی قسمیں مراد ہیں جو تجارت وغیرہ میں کھائی جاتی تھیں یا وہ قسمیں مراد ہیں جو یہود نے حضور علیہ السلام پر ایمان لانے کی کھائیں۔ ثمن قلیل سے رشوت یا تجارت کا نفع مراد ہے۔ (روح البیان و معانی) اس مال کو ثمن فرمانے میں اس جانب اشارہ ہے کہ دنیا غیر مقصود اور آخرت مقصود ہے کیونکہ تجارت میں قیمت غیر مقصود ہوتی ہے۔ قلیل فرما کر یہ بتایا کہ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت آخرت کے مقابل

کے عموم میں ہر قسم کا مال داخل ہے منقول ہو یا غیر منقول گھوڑا، جوڑا، تلوار وغیرہ ہو، یا چرخہ وغیرہ یعنی تو ان لڑکیوں کو سارے متروکہ مال کا دو تہائی ملے گا، وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ، یہ لڑکی کا دوسرا حال ہے کَانَتْ کی ضمیر ھِیَ ہے جو اولاد یا مولودہ کی طرف لوٹ رہی ہے، مولودہ اولاد کے ضمن میں سمجھا گیا، وَاحِدَةً سے مراد ہے صرف اکیلی نہ اس کی کوئی بہن ہو نہ بھائی، میت کی صرف ایک بیٹی اولاد ہو یعنی اگر اولاد صرف اکیلی لڑکی ہے تو اسے کل متروکہ مال کا آدھا ملے گا، بقیہ آدھا دوسرے وارثوں ماں باپ، خاوند، بیوی، بھائی وغیرہ میں تقسیم ہوگا، اس کی تفصیل ہماری کتاب ''علم المیراث'' میں ملاحظہ فرمائیے، چونکہ لڑکی لڑکے کے بغیر ذی فرض ہوتی ہے اس لئے اس آیت میں اس کا حصہ مقرر کر دیا گیا کہ ایک لڑکی کو آدھا، ایک سے زیادہ کو (دو ہوں یا بہت) دو تہائی، ہماری قرأت میں نِصْفُ نون کے کسرہ سے ہے، حضرت زید ابن ثابت کی قرأت میں نُصْفُ نون کے پیش سے ہے وہ فرماتے ہیں کہ جیسے رُبُعُ، ثُمُنُ، ثُلُثُ، وغیرہ کا اول حرف پیش والا ہے، ایسے ہی نصف کا اول حرف بھی پیش والا ہے، یہ بھی ایک لغت ہے (روح المعانی)

خلاصہ تفسیر

اسلام سے پہلے عرب میں دو وجہ سے میراث ملتی تھی، نسب، عہد، نسبی رشتہ میں بچوں اور عورتوں کا کوئی حق میراث ہی نہ تھا، عہد کی دو صورتیں تھیں، کسی سے موت و زندگی میں تعاون کا معاہدہ جسے حلف کہتے تھے، دوسرا تبنی یعنی منہ بولا بیٹا بنانا، شروع اسلام میں ان دونوں صورتوں کو باقی رکھا گیا کچھ فرق کے ساتھ، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ (النساء: ۳۳) اور فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ (النساء: ۳۳) پھر اس میں دو چیزیں اور بڑھائیں ہجرت اور عقد مواخات، چنانچہ اس وقت مہاجر، غیر مہاجر کا وارث نہ ہوتا تھا، اگرچہ عزیز ہو، یوں ہی جس مہاجر کو جس انصاری کا بھائی بنا دیا گیا وہ ہی ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے اور رشتہ دار وارث نہ ہوتے تھے، پھر یہ تمام چیزیں منسوخ ہو گئیں اور وراثت کے تین اسباب مقرر ہوئے، نسب، نکاح، ولاء یعنی غلام کو آزاد کرنا کہ یہ مولا غلام کا وارث ہوتا ہے اور غلام مولا کا، باقی تمام اسباب منسوخ ہو گئے، اس آیت میں نسبی وراثت کا ذکر ہے اگلی آیت میں نکاح کی وراثت کا، یہ آیت ان تمام آیات کی ناسخ ہے جن میں وراثت کے دوسرے اسباب کا ذکر ہے، نسبی وراثت میں اولاد کا ذکر پہلے ہوا کہ اولاد سے محبت بھی زیادہ ہوتی ہے اور ان سے رشتہ بھی قوی تر مانا جاتا ہے، فرمایا جا رہا ہے کہ اے مسلمانو! اب تک جو ہو چکا وہ ہو چکا، اب تم کو تاکیدی حکم دیا جاتا ہے کہ اپنے متروکہ مال سے اپنی اولاد کو اس طرح وارث بناؤ کہ ایک بیٹے کو دو بیٹیوں کے برابر حصہ دو، یعنی بیٹے کا حصہ دوہرا ہے اور بیٹی کا اکہرا، یہ اس صورت میں ہے جبکہ میت کی بیٹی بیٹا دونوں ہوں، لیکن اگر اس نے بیٹا کوئی نہیں چھوڑا صرف بیٹی ہی چھوڑی ہے، تو اگر ایک چھوڑی ہے، تو اسے سارے مال کا آدھا ملے گا، اور اگر ایک سے زیادہ چھوڑیں، دو یا تین، تو مال کا دو تہائی، یہ اولاد چھوٹی ہو یا بڑی، عاقل ہو یا دیوانی، بہر حال میراث سے یہ حصہ پائے گی، چونکہ یہ آیت کریمہ بہت معرکہ کی ہے، اس لئے اس کے متعلق کچھ مسائل سمجھ لو، **مسئلہ ۱:** میت کے مال کو اس طرح خرچ کیا جائے گا کہ پہلے اس کے مال سے اس کا کفن دفن، پھر ادائے قرض پھر بقیہ مال کی تہائی سے اس کی وصیتوں کا اجراء پھر تقسیم میراث،

نے کہا کہ یہاں نظر بمعنی رحمت ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں۔ اُنْظُرْ اِلَیَّ اس سے مطلب ہوتا ہے اِرْحَمْنِیْ۔ مجھ پر رحم کر۔ بعض نے فرمایا کہ اس نظر سے مراد مطلقاً دیکھنا ہے نہ کہ آنکھ سے دیکھنا۔ قیامت میں مسلمان رب تعالیٰ کو دیکھیں گے اور رب تعالیٰ ان پر نظر رحمت فرمائے گا۔ کفار رب تعالیٰ کے دیدار سے بھی محروم اور اس کی نظر رحمت سے بھی بعض نے فرمایا کہ یہاں نظر سے مراد احسان کرنا ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں فُلَانٌ لَا یَنْظُرُ اِلَیَّ فلاں مجھ پر احسان نہیں کرتا (کبیر و روح المعانی وغیرہ) بہر حال نظر کے معنی دیکھنا، رحم فرمانا، احسان کرنا، مہلت دینا۔ ان سب معنی سے مسلمانوں پر رحمت نظر ہوگی۔ کفار ان سے محروم رہیں گے۔ چوتھا یہ کہ وَلَا یُزَکِّیْهِمْ۔ یُزَکِّیْ تزکیہ سے بنا۔ بمعنی پاک کرنا یا پاک کہنا (صفائی بیان کرنا) یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ یعنی رب تعالیٰ قیامت میں نہ ان کے گناہ معاف کر کے انہیں اس میل سے پاک کرے گا بلکہ سزا دے گا۔ یا رب تعالیٰ ان کا تزکیہ یعنی تعریف نہ فرمائے گا۔ مسلمانوں کی تعریفیں بہت ہوں گی کہ فرمایا جائے گا سَلَامٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (الرعد: ۲۴) وغیرہ اور ہو سکتا ہے کہ یہ بمعنی حال ہو۔ یعنی رب تعالیٰ دنیا میں ایسوں کی تعریف نہیں کرتا۔ پرہیزگار مسلمانوں کی تعریف سے قرآن پاک اور دیگر آسمانی کتابیں پر ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ۔ (التوبہ: ۱۱۲) اور فرماتا ہے۔ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ۔ (حم السجدہ: ۳۱) (کبیر و خازن وغیرہ) نیز مسلمان دنیا میں بہت طریقوں سے پاک و صاف ہوتا رہتا ہے۔ بیماریاں، تکالیف، پریشانیاں بھی اسے پاک کرتی رہتی ہیں اور عبادات، ریاضات کے پانی سے بھی وہ دھلتا رہتا ہے۔ کفار مصیبتوں میں اور زیادہ کفر کرتے ہیں اور عبادات سے محروم۔ پانچواں یہ کہ۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ گزشتہ چار چیزوں میں فضائل کی نفی تھی۔ اب رذائل کا ثبوت ہے۔ لَهُمْ کا مرجع وہ ہی اَلَّذِیْنَ ہیں۔ اس کے مقدم ہونے سے حصر کا پتہ لگا۔ عَذَابٌ عذب سے بنا بمعنی روکنا۔ سزا کو اسی لئے عذاب کہتے ہیں کہ وہ جرم کو روکتی ہے۔ اسی سے ہے عذب یعنی میٹھا پانی کہ وہ پیاس کو روکتا ہے۔ اَلِیْمٌ الم سے بنا بمعنی تکلیف اور درد یعنی ان لوگوں کے لئے تکلیف دہ یا دردناک عذاب ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اس سے عذاب آخرت مراد ہے۔ اور ممکن ہے کہ دنیوی عذاب مراد ہو۔ جیسے رسوائی بدنامی یا جیسے یہود پر جزیہ مقرر ہونا۔ لڑائیوں میں قتل ہونا وغیرہ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا اور آخرت کے دونوں عذاب مراد ہوں۔ (روح المعانی)

خلاصہ تفسیر

اے محبوب ﷺ جو ذلیل مال کی خاطر اور حقیر دنیا کے لئے اللہ سے کئے ہوئے عہد توڑ دیتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھا لیتے ہیں۔ گویا اعلیٰ کے عوض ادنیٰ چیز خرید لیتے ہیں ان کے لئے پانچ سخت سزائیں ہیں۔ ایک یہ کہ دوسری زندگی میں انہیں رحمت الٰہی سے کوئی حصہ نہیں۔ نہ قبر میں آرام پائیں نہ حشر میں راحت نہ جنت میں حور و قصور نہ رضائے رب غفور۔ دوسرا یہ کہ رب تعالیٰ کے شرف کلام سے محروم رہیں گے کہ پروردگار پرہیزگاروں سے کلام رحمت فرمائے گا اور ان سے نہیں یا تو بلا واسطہ کوئی کلام نہ فرمائے گا جو کچھ ہوگا فرشتوں کے ذریعہ سے یا عتاب اور عذاب کا کلام فرمائے گا۔ تیسرا یہ کہ قیامت کے دن ان پر نظر رحمت بھی نہ فرمائے گا۔ یہ خدا تعالیٰ کے دیدار سے بھی محروم ہوں گے اور اس کی نظرِ رحمت سے بھی۔ اور نہ ان کے گناہ معاف کر کے انہیں پاک کرے اور نہ ان کی تعریف فرمائے۔ اتنی محرمیوں کے باوجود ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ جس کی عظمت بیان سے باہر ہے۔

بیٹیاں بھی ثُلُثَین ہی پائیں گی اور یہی ظاہر بھی ہے چند وجہ سے، ایک یہ کہ رب تعالیٰ نے یہاں فرمایا کہ اگر لڑکی ایک ہو تو اس کے لئے آدھا ہے، معلوم ہوا کہ اگر ایک سے زیادہ ہوں تو ان کے لئے آدھا نہیں، دوسرے یہ کہ رب تعالیٰ نے حقیقی بہنوں کے لئے فرمایا فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ (النساء:۱۷۶) کہ اگر بہنیں دو ہوں، تو ان کے لئے دو تہائی ہے جب دو بہنوں کے لئے دو تہائی ہے، تو دو بیٹیوں کے لئے بدرجہ اولیٰ دو تہائی چاہیے، اگر انہیں آدھا ملا تو وہ بہنوں سے کم رہیں، تیسرے یہ کہ خود نبی کریم ﷺ نے سعد ابن ربیع کی دو بیٹیوں کو دو تہائی دیا تھا جیسا کہ اس آیت کے شانِ نزول میں گذر گیا، چوتھے یہ کہ جب ایک بیٹی اپنے بھائی کے ساتھ تہائی پاتی ہے تو بدرجہ اولیٰ بہن کے ساتھ بھی تہائی ہی پائے گی، اور یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ جب دو بیٹیوں کا حصہ دو تہائی ہو اگر ان دونوں کا آدھا ہوا، تو ایک بیٹی کو چہارم ملے گا، اس کے اور بہت دلائل ہیں جو اس جگہ تفسیر کبیر اور روح المعانی نے بیان فرمائے،

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہاں رب تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری اولاد کا یہ حصہ ہے کہ بیٹی کو بیٹے سے آدھا، اولاد میں بیٹی بیٹے، پوتی پوتے سب داخل ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمْ (النساء:۲۳) تم پر تمہارے بیٹوں کی بیویاں حرام ہیں، حالانکہ پوتے کی بیوی بھی حرام ہے، معلوم ہوا کہ ابناء میں پوتے داخل ہیں اور فرماتا ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ (النساء:۲۳) تم پر تمہاری مائیں حرام ہیں، حالانکہ دادیاں بھی حرام ہیں، معلوم ہوا کہ ماؤں میں دادی شامل ہے، اور فرماتا ہے نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ (بقرہ:۱۳۳) اے یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام ہم آپ کے اور آپ کے باپ دادوں کے معبود کی عبادت کریں گے، معلوم ہوا کہ آباء میں دادے داخل ہیں، لہٰذا یتیم پوتے پوتی کو چچا کے ہوتے حصہ ملنا چاہیے، **جواب:** اس کا تفصیلی جواب ابھی پچھلی آیت میں مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ الخ (النساء:۷) کی تفسیر میں گذر چکا کہ اَوْلَادِكُمْ کی یہ تفسیر خود آپ کے بھی خلاف ہے، کیونکہ آپ بھی یہ کہتے ہیں کہ پوتا میراث اس وقت پائے گا جب اس کا باپ نہ ہو، قرآن شریف میں یہ قید کہاں ہے؟ اس ترجمہ کی بنا پر چاہیے کہ پوتی پوتوں کو بیٹوں کی طرح، بہرحال برابر کا حصہ ملے، نیز نواسی نواسے بھی اس میں شامل ہونے چاہئیں کہ وہ بھی از روئے قرآن وحدیث اولاد ہیں، رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آلِ عمران فرمایا، حالانکہ وہ نواسے تھے، حضور انور ﷺ نے حضرات حسنین کریمین کو اِبْنَایَ فرمایا، حالانکہ وہ نواسے تھے، تمہاری پیش کردہ آیتوں میں بھی ابناء میں نواسے اور امہات میں نانیاں شامل ہیں، چنانچہ نواسے کی بیوی نانا پر حرام ہے، اور نانی نواسے پر حرام ہے، اب پڑھیے وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمْ (النساء:۲۳) اور پڑھیے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ (النساء:۲۳) یہ تو دونوں آیتیں آپ کے خلاف ہیں، **دوسرا اعتراض:** نبی کی میراث ضرور تقسیم ہونی چاہیے، اس آیت میں نبی اور غیر نبی کی تخصیص نہیں، وہ حدیث کہ ہم گروہ انبیاء نہ وارث بنیں نہ مورث، خبر واحد ہے جو صرف ابوبکر صدیق نے سنی اور خبر واحد سے نہ قرآن کریم کو منسوخ کر سکتے ہیں اور نہ اس کی تخصیص، ابوبکر صدیق کا جناب فاطمہ کو ان کی میراث نہ دینا صریحی ظلم تھا، جناب فاطمہ نے یہی آیت پیش فرما کر ابوبکر صدیق سے کہا تھا کہ جب تمہاری اولاد تمہارا ورثہ لے گی، تو میں رسول کی بیٹی اپنے باپ کا

میں عرض کر چکے کہ اس صورت میں اس آیت میں دو قیدیں لگائی ہوں گی۔ایک اولاً کی دوسرے عدم مغفرت کی یعنی اگر ان کی مغفرت نہ ہو تو اول ہی سے انہیں یہ درجات نہ ملیں گے۔ بلکہ سزا پا کر۔ **دوسرا اعتراض:** یہاں فرمایا گیا کہ ایسے مجرموں سے نہ رب تعالیٰ بات کرے گا اور نہ انہیں دیکھے گا۔ اور دوسری آیت میں ہے کہ کفار سے فرمایا جائے گا۔ اِخْسَئُوْا فِیْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ (مومنون: ۱۰۸) یا ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ۔ (الدخان: ۴۹) اور کیا خداوند تعالیٰ صرف نیک کاروں کو دیکھے گا بدکاروں سے غافل رہے گا؟ (آریہ) **جواب:** ہم تفسیر میں اس کے دو جواب دے چکے۔ ایک یہ کہ یہاں کلام سے رحمت کا کلام مراد ہے اور کفار سے کلام عقب ہو گا۔ دوسرا یہ کہ یہاں کلام سے بلاواسطہ کلام مراد ہے۔ کفار سے جو کچھ گفتگو ہو گی فرشتوں کے واسطہ سے۔ ایسے ہی نظر سے محض دیکھنا مراد نہیں۔ جس کا مقابل بے خبری اور لاعلمی ہے بلکہ نظرِ رحمت مراد ہے۔ اسی لئے لَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ فرمایا نہ لَا یَنْظُرُهُمْ۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جھوٹی قسمیں کھانے والے کی معافی نہ ہو گی کہ فرمایا گیا۔ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ (النساء: ۱۱۶) شرک کے سوا سارے گناہ جس کو چاہے گا بخش دے گا۔ ان میں مطابقت کیونکر ہو۔ **جواب:** اگر یہ آیت کفار کے حق میں ہے اور ایمان سے ان کی وہ جھوٹی قسمیں مراد ہیں جو اسلام کے خلاف کھایا کرتے تھے۔ تب تو آیتوں میں تعارض کا احتمال ہی نہیں کیونکہ اس صورت میں وہ قسمیں کفر ہیں۔ اور کفر کی بخشش کیسی۔ اور اگر یہ آیت گنہگار مسلمانوں کے حق میں ہے اور ایمان سے مراد وہ جھوٹی قسمیں ہیں جو دنیوی معاملات میں لوگ کھا لیتے ہیں تب جواب یہ ہے کہ یہاں عدل کا ذکر ہے اور اس آیت میں فضل کا ذکر یعنی تقاضائے انصاف یہ ہے کہ ایسوں کی خطا معاف نہ کی جائے کیونکہ انہوں نے جھوٹی قسموں سے بندوں کے حق مارے ہیں اور معافی گناہوں کی ہوتی ہے نہ کہ حقوق العباد کی۔ اور اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب رب تعالیٰ فضل کرے گا تو کفر کے سوا ہر جرم معاف کر دے گا۔ اس طرح کہ اپنے حقوق خود معاف فرما دے گا اور حقوق العباد صاحب حقوق سے معاف کرا دے گا یا یہ کہا جائے کہ تزکیہ اور مغفرت میں فرق ہے۔ مغفرت صرف گناہ کی معافی ہے۔ اور تزکیہ میں گناہ سے معافی بھی ہے اور رفع درجات بھی۔ یہاں تزکیہ کی نفی ہے اور وہاں مغفرت کا ثبوت۔ مطلب یہ ہوا کہ حقوق العباد مارنے والے مجرموں کو ابتداءً بلند درجے ملیں گے۔ اگر ملیں گے تو مغفرت کے بعد۔ واللہ اعلم۔ یا کہا جائے کہ یہ سب سزائیں بخشش نہ ہونے کی صورت میں ہیں تو گویا آیت وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ نے ان تمام آیتوں کو نہ چاہنے سے مقید کر دیا۔ **چوتھا اعتراض:** لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ میں لَهُمْ کے مقدم کرنے سے معلوم ہوا کہ دردناک عذاب صرف عہد کے توڑنے والوں اور جھوٹی قسمیں کھانے والوں کے لئے تو کیا یہ لوگ کفار سے بدتر ہیں کہ صرف ان کے لئے دردناک عذاب ہو نہ کہ کفار کے لئے...... **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ عہد توڑنے والوں میں کفار بھی داخل ہیں بلکہ سب کو عذاب عہد توڑنے ہی کا ہو گا۔ کسی نے ایمان کا عہد توڑا کسی نے نیک کاری اور فرمانبرداری کا۔ دوسرا یہ کہ حصر اضافی ہے نہ کہ حقیقی یعنی بمقابلہ بعض گنہگاروں کے عہد توڑنے والوں کا عذاب سخت ہے۔

تفسیر صوفیانہ

جو لوگ اپنے میثاق والے عہد کو توڑ کر اور توحید سے منہ موڑ کر اور اپنی کھائی ہوئی قسموں سے دل پھیر کر نفسانی صفات اور نفع حواس

ہوتا ہے کہ وہ ازواج اپنے اپنے حجروں کی مالکہ تھیں رب تعالیٰ فرماتا ہے وَقَرْنَ فِىْ بُيُوْتِكُنَّ (احزاب: ۳۳) اے بیبیو! اپنے اپنے گھروں میں رہو، معلوم ہوا کہ وہ گھران بیبیوں کے ہی تھے، یہ نہ فرمایا فِىْ بُيُوْتِ الرَّسُوْلِ جب نبی کریم ﷺ کی بیویوں کو میراث ملی، تو ان کی بیٹی فاطمہ کو بھی ملنا چاہیے تھی، **جواب:** اس کا جواب تفسیر روح المعانی نے یہ دیا ہے کہ واقعی وہ بیویاں اپنے حجروں کی مالکہ تھیں، مگر میراث سے نہیں بلکہ ہبہ سے، کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی شریف میں ہر بیوی کے لئے الگ حجرہ بنوایا اور انہیں ہبہ کر کے قبضہ دے دیا، جیسے کہ فاطمہ زہراء اور اسامہ ابن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لئے حجرہ بنوا کر ان کے سپرد کر دیئے گئے، یہ دونوں حضرات بھی ان حجروں کے مالک وقابض رہے، ورنہ قرآن کریم حضور انور ﷺ کی زندگی میں ان بیویوں کو حجروں کا مالک نہ فرماتا، کیونکہ میراث بعدِ وفات تقسیم ہوتی ہے، رب تعالیٰ نے حضور انور ﷺ کی زندگی میں فِىْ بُيُوْتِكُنَّ نہ فرمایا، نیز اگر میراث ہوتی تو حساب سے ازواج کو ملتی کہ حضور انور ﷺ کے مال کا آٹھواں حصہ نو بیویوں میں تقسیم ہوتا، مگر فقیر کو یہ جواب پسند نہیں، میرے نزدیک یہ بیویاں اپنے حجروں میں مالکانہ حیثیت سے نہ رہیں، اگر یہ حجرے ان بیویوں کی ملک ہوتے، تو ان کی وفات کے بعد ان کے وارثوں میں تقسیم ہو جاتے، روضۂ اطہر رسول اللہ ﷺ نہ بنتے، ان بیویوں کا نفقہ حضور انور ﷺ کی وفات کے بعد بھی حضور انور ﷺ ہی کے ذمہ تھا، کیونکہ وہ اب بھی حضور انور ﷺ ہی کے نکاح میں تھیں، خلفائے راشدین نے حضور انور ﷺ کی نیابت میں حضور انور ﷺ کی طرف سے ان بیویوں کو خرچ بھی دیا اور ان حجروں سے علیحدہ بھی نہ کیا، حضرت عمر اور امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حجرۂ انور میں دفن کی اجازت مانگنا اس لئے نہ تھا کہ آپ اس حجرہ کی مالکہ تھیں، مقبرہ وقف ہوتا ہے، کسی کی ملک نہیں ہوتا، بلکہ اس لئے تھا کہ آپ وہاں کی متولیہ ومنتظمہ تھیں، اب بھی مسجد کی دکانیں ودیگر جائیداد متولی کی اجازت سے استعمال کی جاتی ہیں، قرآن کریم نے بُيُوْتِكُنَّ ان کی ملکیت کے لحاظ سے نہ فرمایا بلکہ رہائش کے لحاظ سے، کرایہ دار اپنے رہائشی مکان کو کہتا ہے میرا مکان، **پانچواں اعتراض:** اگر حضور انور ﷺ کی مالی میراث تقسیم نہ ہوتی، تو صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حضور انور ﷺ کی تلوار ذوالفقار، چتکبرا خچر دلدل کیوں دیا؟ اور حضرت زبیر ابن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور انور ﷺ کی چادر شریف، محمد ابن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور انور ﷺ کے بعض تبرکات کیوں عطا فرمائے، نیز حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باغِ فدک حضرت علی وعباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو کیوں دیا؟ افسوس ہے کہ یہ چیزیں تقسیم ہوں اور فاطمہ زہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا محروم رہیں، **جواب:** صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ذوالفقار اور دلدل دینا اور حضرت زبیر ومحمد ابن مسلمہ رضی اللہ عنہما کو دیگر چیزیں دینا بطور میراث نہ تھا کہ حضور انور ﷺ کے وارث نہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے نہ یہ حضرات بلکہ یہ چیزیں تبرکاً استعمال کے لئے دی گئی تھیں، اور دیگر صحابہ کرام کے پاس بھی حضور انور ﷺ کا تہبند، بال شریف اور پیالہ شریف تبرکاً محفوظ تھے صحابہ کرام جن کی زیارتیں کیا کرتے تھے، اسی لئے یہ ذوالفقار وغیرہ ان لوگوں کی میراث نہ بنی، جنابِ عمر فاروق نے اپنے زمانہ میں جناب علی وعباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو باغِ فدک بطور تولیت دیا نہ کہ بطور ملکیت، کہ آپ دونوں بزرگ وہاں کی آمد وخرچ کا انتظام کریں بطور اجرت

وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٨﴾

حالانکہ نہیں ہے وہ پاس سے اللہ کے اور کہتے ہیں وہ اوپر اللہ کے جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں

کے پاس سے نہیں ہے اور اللہ پر وہ دیدہ دانستہ جھوٹ باندھتے ہیں

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں خیانت کی برائیوں کا ذکر تھا۔ اب یہود کی خاص خیانت یعنی تحریف کتاب کا تذکرہ ہے جو کہ تمام خیانتوں سے بدتر ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں خیانت کا ذکر تھا۔ اور خیانت کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ مالک کے مال کا انکار کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ اس کی چیز کو اپنی ملکیت سے اس طرح خلط کر دیا جائے کہ ان میں کچھ فرق نہ رہے۔ یہ سخت تر خیانت ہے کیونکہ یہ خیانت بھی ہے اور دھوکہ بھی۔ اس آیت میں اسی کا تذکرہ ہے کہ اہل کتاب نے کتاب اللہ میں اپنی طرف سے ایسی زیادتی کی کہ ان دونوں میں فرق نہ رہا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں خیانت کی برائی اور خائن کے عذاب کا ذکر تھا۔ اور بدتر خائن وہ ہے جو متقی اور پرہیزگار کی شکل میں ہو اور لوگوں پر اپنی امانتداری کے خطبے پڑھتا پھرے۔ لہٰذا اب فرمایا جا رہا ہے۔ علمائے اہل کتاب اسی قسم کے خائن ہیں کہ کلام الٰہی کو بگاڑیں اور رب تعالیٰ کے احکام بدلیں اور پھر بھی عالم ہی کہلائیں۔

شانِ نزول

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ دونوں کے حق میں نازل ہوئی کہ انہوں نے توریت و انجیل کو بدل دیا اور کتاب اللہ میں اپنی طرف سے جو چاہا ملا دیا۔ جیسے کعب ابن اشرف مالک ابن صیف اور حیی ابن اخطب اور ابو یاسر اور شعبہ ابن عمرو شاعر (تفسیر خزائن العرفان و روح المعانی)

تفسیر

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا۔ چونکہ اہل کتاب تحریف سے انکاری تھے کہ ان کے علماء نو کہتے تھے۔ ہم نے توریت و انجیل میں کوئی تحریف نہ کی اور ان کے عوام کہتے تھے کہ ہمارے علماء کے پاس نری کھری خالص توریت و انجیل موجود تھے۔ اور ممکن تھا کہ بعض سادہ لوح مسلمان بھی کہنے لگتے کہ قرآن مجید کی طرح یہ آسمانی کتب بھی محفوظ رہیں۔ اس لئے اس کو اِنَّ اور لام تاکید سے مؤکد کیا گیا۔ مِنْهُمْ کا مرجع سارے اہل کتاب ہیں۔ یہودی ہوں یا عیسائی۔ فَرِيْقٌ فرقٌ سے بنا۔ بمعنی جدائی و علیحدگی اصطلاح میں جماعت اور گروہ کے معنی میں آتا ہے کیونکہ وہ بھی دوسری جماعتوں سے علیحدہ ہوتا ہے۔ یعنی یقیناً اہل کتاب میں ایک جماعت وہ بھی ہے۔ يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ۔ یہ جملہ فریقاً کی صفت ہے۔ يَلْوٗنَ لوىٌ يَالىٌ سے بنا بمعنی مروڑنا' پھیرنا کہا جاتا ہے لَوَيْتَ يَدَهٗ میں نے اس کا ہاتھ مروڑ دیا۔ اور اِلْتَوٰى فلانٌ فلاں آدمی بل کھا گیا۔ اور پھر گیا۔ اسی لئے ٹالنے کو لیٌّ کہا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ لَيُّ الْوَاجِدِ ظُلْمٌ۔ غنی مقروض کا ٹالنا ظلم ہے۔ السنہ لسان کی جمع ہے۔ لسان مذکر بھی ہے مؤنث بھی۔ ابی عمرو ابن علاء کہتے ہیں کہ جس نے اسے مؤنث مانا۔ اس نے اس کی جمع السن قرار دی اور

جواب: اس لئے کہ بیٹی کے ذمہ نہ اپنا خرچ ہے نہ دوسروں کا، شادی سے پہلے اس کا خرچ باپ کے ذمہ ہے اور شادی کے بعد خاوند کے، مگر بیٹے پر اپنا بوجھ بھی ہے اور بیوی بچوں کا بھی، زیادہ خرچ والے کو زیادہ حصہ دلوایا گیا، نیز مرد عورت سے افضل ہے اسی لئے نبوت امامت قضاء مردوں کے لئے ہے عورتوں کے لئے نہیں، نیز عورت کی گواہی مرد سے آدھی ہے، اس لئے اس کی میراث بھی مرد سے آدھی رکھی گئی، نیز عورت کی عقل کم شہوت زیادہ ہے، اس حالت میں اگر اسے مال کثیر دیا جائے تو فساد ہی برپا ہوگا، شاعر کہتا ہے، شعر

اِنَّ الْفَرَاغَ وَالشَّبَابَ الْجِدَةَ مُفْسِدٌ لِلْمَرْءِ اَیَّ مفسدہ

یعنی اگر جوانی فراغت اور مال جمع ہو جائیں، تو فساد پھیلا دیتے ہیں، نیز یہی سوال امام جعفر صادق سے کیا گیا تھا آپ نے فرمایا کہ جنت میں گندم کھاتے وقت بی بی حوا نے دو مٹھی گندم اپنے واسطے رکھی تھی، اور ایک مٹھی آدم علیہ السلام کو کھلائی، رب تعالیٰ نے اس کے برعکس لڑکیوں کو ایک حصہ میراث دی، لڑکوں کو دو حصہ، واللہ اعلم (تفسیر کبیر و روح المعانی) غرضکہ اس تقسیم میں صدہا حکمتیں ہیں، **نواں اعتراض:** تم بیٹی کے ہوتے یتیمہ پوتی کو چھٹا حصہ میراث دیتے ہو، حالانکہ بیٹی رشتہ میں قریب ہے اور پوتی دور، تو ایسے ہی بیٹے کے ہوتے یتیم پوتی کو بھی میراث دو، یہاں دور قریب کا کیوں لحاظ کرتے ہو؟

جواب: قرب و بعد ایک سلسلہ کے وارثوں میں معتبر ہے، نہ کہ دو سلسلوں کے ورثاء میں بیٹے کا سلسلہ اور ہے بیٹی کا اور پوتی بیٹے کی اولاد ہے نہ کہ بیٹی کی، اسی لئے نواسی بیٹی کے ہوتے محروم ہو جاتی ہے، تفسیر صوفیانہ انشاء اللہ آیت کے ختم پر ہوگی،

وَلِاَبَوَیْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا
اور واسطے اس کے ماں باپ کے ہر ایک کے لئے ان میں سے چھٹا حصہ ہے اس مال سے جو اس
اور میت کے ماں باپ کو ہر ایک کو اس کے ترکہ سے چھٹا
تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهٗ
نے چھوڑا اگر ہو اس میت کی اولاد پس اگر نہ ہو اس میت کی کوئی
اگر میت کے اولاد ہو پھر اگر اس کی اولاد نہ ہو
وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ
اولاد اور وارث ہوں اس کے، اس کے ماں باپ تو اس کی ماں کے لئے تہائی ہے پھر اگر
اور ماں باپ چھوڑے تو ماں کا تہائی پھر اگر
كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ
اس میت کے چند بہن بھائی ہوں تو اس کی ماں کے لئے چھٹا حصہ اس وصیت کے بعد

بلکہ صاف صاف کہتے ہیں کہ رب تعالیٰ کی آیتیں ہیں۔ حالانکہ وہ رب کی آیتیں نہیں بلکہ ان کی اپنی گھڑی ہوئی عبارتیں ہیں۔ یہ لوگ ایسے دلیر ہیں کہ مخلوق پر ہی نہیں بلکہ خالق پر جھوٹ باندھتے ہیں پھر خطاءً یا غلطی سے نہیں بلکہ دیدہ ودانستہ سمجھتے ہیں کہ یہ عبارتیں ہماری ہیں۔ اور کہتے ہیں اللہ کی۔

خیال رہے: کہ تفسیر روح المعانی نے اس جگہ فرمایا کہ بعض علماء کا خیال ہے کہ خود توریت میں تحریف نہ ہوئی۔ اس کی آیتیں اپنے حال پر رہیں۔ یہود نے ان کے پڑھنے میں تبدیلی کی یا آیتوں کی باطل تاویلیں کیں جیسا کہ یَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ سے معلوم ہوا۔ ہاں کچھ کتابیں ان کی اپنی بنی ہوئی تھیں۔ جسے وہ کتاب اللہ کہتے تھے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَيَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ (بقرہ:۷۹) اس سے معلوم بھی یہ ہی ہوا کہ مستقل کتابیں لکھ کر انہیں کتاب اللہ بتایا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ بارہا یہود سے الزاماً فرماتے تھے۔ اِئْتُوْا بِالتَّوْرٰةِ فَاتْلُوْهَا اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ اگر سچے ہو تو توریت لاؤ پڑھو۔ اگر توریت بدل چکی ہوتی تو انہیں توریت سے الزام کیوں دیا جاتا۔ مگر حق یہ ہے کہ اصل توریت و انجیل میں ہی تحریفیں ہوئیں۔ اور ان میں خلط ملط کیا گیا۔ ہاں کچھ آیتیں اصل بھی تھیں۔ اور اکثر بدلی ہوئی اصل آیات سے یہود کو الزام دیا جاتا تھا۔ حدیث پاک میں ہے کہ جب تم پر یہود توریت پڑھیں تو نہ ان کی تصدیق کرو نہ انہیں جھٹلاؤ۔ اس کا ثبوت بہت سی آیتوں اور حدیثوں سے ہے۔ نیز آج موجودہ انجیلوں کا اختلاف بتارہا ہے کہ یہ انجیلیں تحریف شدہ ہیں۔ چنانچہ آج کل چار انجیلیں زیادہ مشہور ہیں۔ (۱) انجیل متی جو عیسیٰ علیہ السلام کے آٹھ سال بعد سریانی زبان میں لکھی گئی جسے بارہ حواریوں نے لکھا۔ (۲) انجیل مرقس جو عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ سال بعد مقام رومیہ میں افرنجی زبان میں لکھی گئی۔ (۳) انجیل لوقا جو یونانی زبان میں مقام اسکندریہ میں لکھی گئی۔ (۴) انجیل یوحنا جو عیسیٰ علیہ السلام کے پیارے دوست یوحنا نے عیسیٰ علیہ السلام کے تیس سال بعد ملک روم کے شہر افسس میں لکھی۔ اب اگر ان انجیلوں کا مقابلہ کیا جائے تو ان میں سخت اختلاف ملتا ہے۔

انجیلوں کا اختلاف

چنانچہ متی رسول میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دو چوروں کو بھی سولی دی گئی جن میں سے ایک حضرت مسیح علیہ السلام کے دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف تھا اور وہ دونوں یہود کے ساتھ مسیح علیہ السلام سے مذاق کرتے تھے مگر انجیل لوقا میں ہے کہ ان میں سے ایک عیسیٰ علیہ السلام کا مذاق اڑا رہا تھا اور دوسرا آپ کی تعریفیں کر رہا تھا اور اس نے کہا کہ اے مسیح (علیہ السلام) مجھے اپنی ملکوت میں یاد رکھنا۔ آپ نے فرمایا۔ اے دوست تو جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ خیال تو کرو کہ متی رسول کے لحاظ سے یہ دونوں کافر ہیں۔ اور لوقا کے لحاظ سے ایک کافر اور ایک مومن۔ اور مرقس اور یوحنا میں یہ قصہ ہی ندارد ہے۔ نیز لوقا میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ انسان کا بچہ انسان کو ہلاک کرنے نہیں آیا بلکہ انہیں زندگی بخشنے آیا ہے مگر ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ مسیح علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا کہ انسان کا بچہ زمین پر سلامتی پھیلانے نہیں آیا بلکہ تلوار چلانے اور آگ بھڑکانے آیا ہے۔ خیال تو کرو کہ ایک کہتا ہے کہ انسان رحمت اور دوسرا کہتا ہے کہ انسان عذاب۔ نیز متی رسول میں ایک جگہ

جملہ کی اور بھی ترکیبیں کی گئی ہیں مگر یہ ترکیب آسان بھی ہے اور ظاہر بھی، لِكُلِّ وَاحِدٍ اس لئے فرمایا گیا تاکہ یہ شبہ نہ ہو کہ ایک سدس ماں باپ دونوں میں تقسیم ہوگا بلکہ باپ کو الگ چھٹا حصہ ملے گا، ماں کو الگ، مِمَّا تَرَكَ ایک پوشیدہ لفظ کا متعلق ہو کر سدس کا حال ہے، مِمَّا تَرَكَ میں بتایا گیا کہ میت کے سارے متروکہ مال میں سے ماں باپ ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا مال کسی قسم کا ہو منقولی یا غیر منقولی، مردوں کے استعمال کا ہو یا عورتوں کے استعمال کا، اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ چھٹا حصہ ملنے کی شرط ہے ولد سے مراد بطریق عموم مجاز بیٹا بیٹی، پوتا پوتی سب ہی ہیں، جیسا کہ حدیث شریف سے معلوم ہوا، لَهٗ کا مرجع میت ہے یعنی اگر میت نے ماں باپ کے ساتھ بیٹا یا بیٹی، پوتا یا پوتی چھوڑی ہو تو ماں کو بھی چھٹا حصہ ملے گا اور باپ کو بھی چھٹا، بیٹے کی صورت میں باپ کو صرف چھٹا حصہ ہی ملے گا، باقی مال بیٹا عصبہ لے لے گا، صرف بیٹی کی صورت میں باپ کو چھٹا حصہ بھی ملے گا اور عصبۃً بچا ہوا مال بھی، مثلاً کسی شخص نے ماں باپ اور بیٹی چھوڑی، تو متروکہ مال کے چھ حصے ہو کر تین بیٹی کو، ایک ماں کو، ایک باپ کو فرضاً مل گئے، باقی جو ایک بچا وہ پھر باپ کو ہی عصبۃً مل جائے گا، فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ، یہ والدین کی میراث کی دوسری صورت ہے کہ میت نے اولاد یعنی بیٹی بیٹے، پوتی پوتے دو بہن بھائی کچھ نہ چھوڑے، تب ماں باپ کی میراث کا طریقہ یہ ہوگا کہ ماں کو کل مال کا تہائی ملے گا اور باپ عصبۃً بچا ہوا مال لے لے گا، یہاں بھی لَهٗ اور وَرِثَهٗ اور اَبَوٰهُ اور لِاُمِّهِ ان سب کی ضمیروں کا مرجع میت ہے، اس صورت میں ماں کا حصہ مقرر کرنے اور باپ کا ذکر نہ فرمانے سے معلوم ہوا کہ ماں ذی فرض ہے تہائی کی مستحق، اور باپ محض عصبہ بچے ہوئے سارے مال کا مستحق، لہٰذا اگر میت نے صرف ماں باپ چھوڑے، تو ماں کو کل ترکہ کا تہائی ملے گا اور باپ کو باقی دو تہائی مال کے تین حصے ہوں گے ایک ماں کا اور دو باپ کے فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ، یہ ماں باپ کے ساتھ دو بھائی بہن کسی قسم کے چھوڑے، خواہ سگے خواہ باپ شریکے یا ماں شریکے، خواہ دونوں بھائی یا دونوں بہنیں یا ایک بھائی ایک بہن تو ماں کا چھٹا حصہ ہوگا باپ عصبہ ہو کر سارا بچا ہوا مال لے گا، خیال رہے کہ سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نزدیک اخوۃ سے تین یا زیادہ بھائی بہن مراد ہیں، کیونکہ یہ جمع ہے، اور جمع دو کے لئے نہیں آتی، باقی تمام صحابہ کرام، مفسرین، محدثین، فقہاء کے نزدیک اخوۃ میں دو بھائی بہن بھی داخل ہیں، کیونکہ مسائلِ میراث میں دو بھی جمع ہیں، نیز قرآن کریم میں دو کو جمع بہت جگہ فرمایا گیا ہے دیکھو دو بیٹیاں، دو بہنیں وہی میراث پاتی ہیں جو زیادہ بیٹیاں بہنیں پاتی ہیں، چنانچہ حاکم و بیہقی نے حضرت زید ابن ثابت کا واقعہ بیان فرمایا کہ ان سے بعض لوگوں نے عرض کیا کہ یہاں اخوۃ میں دو بھائی بہنیں کیوں داخل ہیں؟ آپ نے فرمایا اَلْعَرَبُ تُسَمِّيُ الْاَخَوَيْنِ اِخْوَةً یعنی عرب دو بھائی بہنوں کو بھی اخوۃ کہہ دیا کرتے ہیں (روح المعانی) لطف یہ ہے کہ باپ کے ہوتے بھائی بہنیں محروم رہتے ہیں، مگر ماں کو نقصان پہنچا دیتے ہیں کہ اس کا حصہ بجائے تہائی کے چھٹا کر دیتے ہیں، اس کی تفصیل کتب فرائض میں دیکھو، مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ، اس جملہ کا تعلق گذشتہ ساری عبارت سے ہے کہ اولاد ماں باپ سب کے مذکورہ حصے ادائے قرض و وصیت کے بعد ملیں گے، مِنْۢ بَعْدِ الخ يُوْصِيْ کے متعلق ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ مذکورہ بالا حصوں کا حال ہو، اس طرح کہ عبارت ھذا کی خبر ہو، پھر سارا جملہ حال، وَصِيَّةٍ سے جائز وصیت مراد ہے اور قرض سے بندوں کا قرض

ذرا ترجمہ سنئے۔اے محمدی بیگم (مرزا جی کی عرشی منکوحہ) توبہ کر توبہ کر (تو دوسرے کے نکاح میں کیوں چلی گئی) اے مرزا جی ہم اس عورت کو تم پر لوٹائیں گے اور تمہارے متبعین کو قیامت تک کفار پر غالب رکھیں گے۔ (حالانکہ مرتے وقت تک محمدی بیگم مرزا جی کے ہاتھ نہ آئیں) یہ ہے یَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ کی کھلی مثال مگر چونکہ قرآن پاک کا رب تعالیٰ محافظ ہے۔اس لئے یہ تحریفیں مٹ گئیں۔قرآن اپنے اصلی نور سے جگمگاتا رہا۔**دوسرا فائدہ:** گناہ رب کی طرف سے نہیں اور نہ رب تعالیٰ ان سے راضی ہے۔اس لئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (احکام القرآن) ہاں گناہ رب کی مخلوق ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ بندہ اپنے اعمال کا خود خالق ہے۔اعمال کا خالق رب نہیں۔چونکہ تحریف شدہ عبارتیں یہود کی تحریر تھیں۔رب نے فرمایا مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اگر بندوں کے فعل کا رب خالق ہوتا تو بیان فرمایا جاتا کہ یہ رب کی طرف سے ہے کیونکہ میرے بندوں کا فعل ہے۔جس کا میں خالق ہوں۔ (معتزلہ) **جواب:** یہاں فعل کی نفی نہیں بلکہ مفعول کی نفی ہے۔یعنی یہ بناوٹی عبارات رب کی طرف سے نازل نہیں ہوئیں۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہود کا یہ کام رب کی خلق نہیں (معانی و کبیر) **دوسرا اعتراض:** یہ آیت حنفیوں پر چسپاں ہے کیونکہ وہ امام ابو حنیفہ کے قیاسی مسائل کو دینی احکام اور ربانی فرمان سمجھتے ہیں۔لہٰذا تقلید یہودیت ہے۔ (غیر مقلد) **جواب:** استغفر اللہ نہ کسی مقلد نے امام کے کلام کو رب کا کلام کہا نہ ان کے فرمان کو رب کا فرمان مانا۔نہ ان عبارتوں کو قرآن شریف سے ملایا۔اس فن کا نام ہی کچھ اور رکھا۔قرآن کا نام کتاب اللہ اس فن کا نام فقہ۔فعل یہود سے انہیں کیا تعلق۔جیسے بے علم آدمی عالم سے کوئی مسئلہ سن کر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے کتاب سے دیکھ کر بتایا ہوگا اور پھر اسے دینی حکم سمجھ کر اس پر عمل کرتا ہے۔نہ عالم کو خدا سمجھتا ہے نہ اس کے کلام کو قرآن۔ایسے ہی مقلد اپنے امام کے بارے میں یہ نیک گمان کرتے ہیں کہ یہ جو کچھ کہتے ہیں قرآن و حدیث سے کہتے ہیں۔ان کے بتائے ہوئے مسائل درخت قرآن اور شاخ حدیث کے پھل ہیں۔بتاؤ اس میں کیا قباحت ہے۔اگر مقلد یہودی ہیں تو ہر جاہل غیر مقلد ضرور یہودی ہے۔خواہ ثنائی ہو یا غزنوی۔

تفسیر صوفیانہ

صوفیائے کرام کے کلمات گویا کتاب الٰہی ہیں اور ان کا علم در حقیقت علم لدنی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان مقبولوں کا زمین و آسمان ہی دوسرا ہے۔سب کہتے ہیں کہ لوح محفوظ ساتویں آسمان کے بھی اوپر ہے۔جس میں سب حالات موجود ہیں مگر یہ حضرات فرماتے ہیں کہ یار کی پیشانی لوح محفوظ ہے۔جس میں سارے کمالات موجود۔مولانا فرماتے ہیں شعر۔

لوح محفوظ است پیشانی یار راز پنہاں می شود زاں آشکار

یہ لوگ فرماتے ہیں کہ بزرگوں کی زبان رب کا قلم ہے۔ان کے فرمان رب کی کتاب جیسے اللہ کی کتاب میں تبدیلی ناممکن ہے۔ایسے ہی ان کے منہ سے نکلے ہوئے فرامین ناممکن تبدیل ہیں۔بعض مدعیان معرفت میں سے وہ یہودے بھی ہیں جو عارفین کے کلمات کو زبان پھیر کر منہ بھر کر بولتے ہیں تاکہ تم سمجھو کہ یہ وہ ہی علم لدنی ہے۔جو رب تعالیٰ نے عارفین کو دیا۔اور وہ مدعیان تصوف دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ہمارا یہ کلام اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ اور علوم لدنیہ میں سے ہے۔حالانکہ وہ رب تعالیٰ کی طرف

چھوڑی نہ ایک سے زیادہ بھائی بہن اس صورت میں ماں ذی فرض ہے، اور اس کا حصہ کل مال کا تہائی، اور باپ محض عصبہ کہ ذی فرض ورثاء سے بچا ہوا مال لے گا، تیسرا حال یہ ہے کہ میت نے ماں باپ کے ساتھ اولاد تو نہ چھوڑی، مگر ایک سے زیادہ بھائی بہن چھوڑے، اس صورت میں بھی ماں ذی فرض ہے، اور باپ عصبہ مگر اب مال کی میراث چھٹا حصہ ہوگی، باقی ذی فرض سے بچا ہوا سارا مال باپ لے گا، خیال رکھو کہ اصول و فروع کے یہ سارے حصے میت کی جائز وصیت اور ثابت شدہ قرض ادا کرنے کے بعد ہوں گے، اس طرح کہ کفن دفن کے خرچوں کے بعد کل مال سے اس کا قرض ادا کیا جائے گا، پھر بقیہ کی تہائی سے وصیتیں پوری کی جائیں گی، پھر تقسیم میراث، میراث کے حصوں کا تقرر تم محض اپنی عقل سے نہیں کر سکتے، تمہیں کیا خبر ماں باپ یا اولاد میں سے کون تمہارے واسطے دین و دنیا میں زیادہ نافع ہے، یہ تو ہم جانتے ہیں کہ ہم تمہارے اور ان کے خالق و مالک ہیں، یہ سارے حصے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ اور طے شدہ ہیں، اللہ تعالیٰ علیم بھی ہے اور حکیم بھی، اس کے ہر کام میں ہزار ہا حکمتیں ہیں، طبرانی و ابن مردویہ نے سیدنا عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی کہ فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ جنتی اپنے جنتی مقام پر پہنچ کر پوچھے گا کہ میری بیوی، ماں باپ، اولاد کہاں ہیں؟ فرمایا جائے گا، وہ ہیں تو جنت ہی میں، مگر تجھ سے نچلے مقام میں، کیونکہ ان کے اعمال صالح تجھ جیسے نہ تھے، عرض کرے گا مولیٰ میں نے دنیا میں نیکیاں اپنے لئے بھی کی تھیں اور ان سب کے لئے بھی، اس کی اس عرض پر دریائے کرم الٰہی جوش میں آجائے گا، حکم ہوگا کہ ان سب کو ترقی دے کر اس کے ساتھ رکھو، یہ حدیث اس آیت کریمہ کی تفسیر ہے کہ تمہیں کیا خبر کل جنت میں تمہیں ماں باپ کے ذریعہ عروج ملے یا اولاد کے ذریعہ (تفسیر کبیر و روح البیان)

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** عربی میں لفظ اَبَوَیْن (یعنی ماں باپ) میں دادا دادی، نانا نانی حقیقتاً داخل نہیں ہوتے، دیکھو یہاں لِاَبَوَیْهِ فرمایا گیا، مگر یہ حصے نہ دادا دادی کے ہیں نہ نانا نانی کے، تو جو لوگ اولاد کی میراث میں پوتوں کو شامل کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ ماں باپ کی میراث میں دادوں نانوں کو شامل کریں، **دوسرا فائدہ:** اولاد کی موجودگی میں ماں باپ دونوں ذی فرض ہیں، مگر اولاد کی غیر موجودگی میں ماں تو ذی فرض ہے، لیکن باپ ذی فرض نہیں، محض عصبہ ہے، جیسا کہ لِكُلِّ وَاحِدٍ الخ اور فَلِاُمِّهِ الخ سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** میراث کے حصے درجات کی بنا پر نہیں، دیکھو درجہ ماں باپ کا زیادہ، مگر میراث کا حصہ اولاد کا زیادہ، جیسا کہ مذکورہ تقسیم سے معلوم ہوا، **چوتھا فائدہ:** اولاد پر حق خدمت ماں کا زیادہ ہے، مگر حق مالی باپ کا زیادہ، جیسا کہ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** تقسیم میراث، ادائے قرض و اجرائے وصیت کے بعد ہے جیسا کہ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ الخ سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** میراث کے حصے، نماز کی رکعتوں اور زکوٰۃ کی مقدار کی طرح عقل سے وراء ہیں، جو رب تعالیٰ نے مقرر فرما دیئے ان پر ایمان لاؤ، جرح نہ کرو، جیسا کہ لَا تَدْرُوْنَ الخ سے معلوم ہوا، **ساتواں فائدہ:** صحیح تقسیم میراث ایسے ہی فرض ہے، جیسے نماز و روزہ، جیسا کہ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ سے معلوم ہوا، **آٹھواں فائدہ:** میراث کا حصہ نفع رسانی یا وارث کی

کاغذ' ناپاک قلم قرآن لکھنے کے قابل نہیں۔ ناپاک زبان جنبی وغیرہ کی قرآن پڑھنے کے لائق نہیں۔ یوں ہی ناپاک ذہن ناپاک دل قرآن سمجھنے کے لائق نہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ

نہیں ہے واسطے بشر کے یہ کہ دے اس کو اللہ کتاب اور علم اور پیغمبری پھر

کسی آدمی کا یہ حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور پیغمبری دے پھر

يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا

کہے وہ واسطے لوگوں کے کہ ہو جاؤ پجاری واسطے میرے سوائے اللہ کے اور لیکن کہے کہ ہو جاؤ

وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ ہاں یہ کہے گا

رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾

اللہ والے اس لئے کہ تھے تم پڑھتے کتاب کو اور اس لئے کہ تھے تم سبق دیتے

کہ اللہ والے ہو جاؤ اس سبب سے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور اس لئے کہ تم درس کرتے ہو

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا

اور نہ حکم دے گا تم کو اس کا کہ بناؤ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو رب کیا حکم کرے گا وہ تم کو

اور تمہیں یہ حکم دے گا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہرالو کیا تمہیں

اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

ساتھ کفر کے بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو

کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو لئے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت فرمایا گیا تھا کہ علمائے اہل کتاب رب تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں کہ اپنا گھڑا ہوا مضمون اس کی طرف نسبت دیتے ہیں۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں پر بھی جھوٹ بولنے سے درگذر نہیں کرتے کہ کہتے ہیں کہ ہمیں عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے کو معبود ماننے کا حکم دیا۔ گویا پہلے ان کی تحریف کتاب کا ذکر تھا۔ اب تحریف کلام انبیاء کا تذکرہ ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ وہ اپنی کتابوں یعنی توریت و انجیل میں تحریف کرتے ہیں۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ وہ آپ پر جھوٹ باندھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہتے ہیں محمد ﷺ اپنی پوجا کرانا چاہتے ہیں۔ (جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہوگا) **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اہل

اعتراض: تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ ادائے قرض وصیت پر مقدم ہے، مگر آیت کریمہ میں وصیت کو ادائے قرض پر مقدم رکھا، یہ تفسیر آیت کے خلاف ہے، **جواب:** واؤ یا اور ترتیب نہیں چاہتے، بہت دفعہ خلاف ترتیب بھی چیز کا ظہور ہوتا ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ (آل عمران: ۴۳) دیکھو سجدے کا ذکر پہلے ہے رکوع کا بعد میں، مگر نماز میں رکوع پہلے ہے سجدہ بعد میں، ایسے ہی یہاں ہے چونکہ وارثوں پر وصیت پوری کرنا شاق ہے، نیز وصیت بمقابلہ قرض زیادہ ہے، انسان قرض اپنی زندگی میں ادا کر جاتا ہے بعد موت کے لئے اس کا بوجھ نہیں رکھتا، مگر وصیت بعد موت ہی جاری ہوتی ہے، اس لئے رب تعالیٰ نے پہلے اسی کا ذکر فرمایا، یہ تقدیم اہمیت ظاہر کرنے کے لئے ہے، جیسا کہ تفسیر میں عرض کیا گیا،

پانچواں اعتراض: تم نے کہا کہ قرض کل مال سے ادا ہوگا مگر وصیت تہائی مال سے، نیز وصیت وارث کو درست نہیں، یہ دونوں حکم قرآن کریم میں تو ہیں نہیں، تم نے کہاں سے لئے؟ **جواب:** حدیث شریف سے حدیث میراث آیت میراث کی شرح ہے، قرآن کریم کا کوئی حکم بغیر حدیث کی مدد کے واضح نہیں ہوتا، صرف نماز و زکوٰۃ قرآن کریم سے ثابت ہے، مگر نماز کی تعداد نمازوں کی رکعت، زکوٰۃ کی مقدار قرآن کریم میں کہیں نہیں ملتی، جب نماز روزہ، زکوٰۃ جیسے اہم مسائل بغیر حدیث کے ادا نہیں ہوتے، تو دوسرے مسائل حضور انور ﷺ کی مدد کے بغیر کیسے قابل عمل ہوں گے، رب تعالیٰ چاہتا ہے کہ میرے بندے ہمیشہ میرے محبوب کے محتاج رہیں،

تفسیرِ صوفیانہ

جیسے مال کی میراث یا نسب کے ذریعہ ملتی ہے یا سبب یعنی نکاح کے باعث ایسے ہی کمال و احوال کی میراث یا تو روحانی نسب یعنی صحبت شیخ کے ذریعہ ملتی ہے یا روحانی سبب یعنی ارادت و اعتقاد کے باعث میسر ہوتی ہے، جو شخص نہ بزرگوں کا صحبت یافتہ ہے نہ ان کا معتقد، وہ محروم رشتہ دار ہے کہ اگرچہ رشتہ ایمانی تو ان سے رکھتا ہے مگر ان کے فیوض سے محروم ہے، اور جو ان مقبولوں کا صحبت یافتہ ہے وہ بہت ہی فیوض کا مستحق ہے جو ان کا صرف معتقد ہے وہ بھی کچھ نہ کچھ فیوض حاصل کر ہی لیتا ہے، اگرچہ حضور انور ﷺ کا فیض علیٰ وجہ الکمال صحابہ کرام کو نصیب ہوا، کہ وہ لوگ روحانی نسبت رکھتے تھے، مگر بعد والے مسلمانوں کو بھی پہنچا کہ وہ بھی حضور انور ﷺ سے سببی رشتہ رکھتے ہیں، پھر جیسے نسبی رشتہ میں بیٹے کا دوگنا ہے بیٹی کا اکہرا، ایسے ہی صحبت والے جو مجتہدین ہیں وہ گویا بیٹے ہیں، جو کم ہمت ہیں اجتہاد و مشقت میں ناقص وہ گویا بیٹیاں ہیں، بزرگوں کی میراث میں مجتہدین کا حصہ غیر مجتہدین سے دوگنا ہے، پھر جیسے میت کی کمائی میں ماں باپ کا بھی حصہ ہے، ایسے ہی کامل مرید کے فیض میں اس کے مشائخ کا بھی حصہ ہے، بارہا مرید سے شیخ کو کمال حاصل ہوا ہے، حضور غوث الثقلین اپنے بعض مشائخ سے بڑھ گئے، ان مشائخ کے لئے آپ کی ذات باعث فخر ہوئی، غرضکہ صوفیائے کرام کے ہاں ذکوریت و انوثت اجتہاد و استعداد سے ہے، اگر ڈبل حصہ لینا ہے، تو کمر ہمت باندھیے، مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں، شعر

چوں گزیدی پیر نازک دل مباش ست و ریزیدہ چو آب و گل مباش

چوں گرفتی پیرہن تسلیم شو ہمچو موسیٰ زیر حکم خضر رو

ہے جیسا کہ خدا کا شریک۔ کیونکہ ان کے نفس امارہ نہیں بلکہ مطمئنہ ہیں۔ اور شیطان کی وہاں تک پہنچ نہیں پھر ان سے گناہ کون کرائے۔ اور عوام کو لائق نہیں کہ وہ بندہ ہو کر مالک بن بیٹھیں۔ ورنہ وہ کتے سے زیادہ ناشکرے ہیں اور اس میں بھی اختلاف ہے کہ بشر سے مراد کون ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں کیونکہ یہود نے ان پر تہمت لگائی تھی۔ بعض کے خیال میں کچھ بشر سے ہر انسان مراد ہے۔ جیسا کہ شانِ نزول کی ایک روایت سے معلوم ہوا کہ...... بعض کے خیال میں بشر سے ہر انسان مراد ہے......

خیال رہے کہ بشر سے اس جانب اشارہ ہے کہ ایسی بکواس انسانیت کے خلاف ہے۔ چہ جائیکہ نبوت و رسالت۔ نبی اور رسول تو بڑے درجے والے ہیں کسی عام انسان کو دعویٰ خدائی زیبا نہیں۔ یعنی کسی انسان کے لئے لائق نہیں۔ یا عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ کے لئے ممکن نہیں جیسا کہ فرمایا گیا۔ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ۔ (الحاقة: ۴۵) یا نفوس انبیاء اور ان کے ارواح طیبہ ایسے پاک و صاف ہوتے ہیں کہ ان سے یہ دعویٰ ناممکن ہے۔ اس تفسیر سے بہت سے اعتراضات اٹھ گئے۔ جو ہم اعتراض و جواب میں عرض کریں گے۔ چونکہ نبوت اور کتاب و حکمت صرف انسان ہی کو ملی ہے۔ اس لئے یہاں بشر فرمایا۔ فرشتے جنات وغیرہ کا ذکر نہ کیا۔ اگر بشر سے مراد حضرات انبیاء ہوں تو تنوین تعظیمی ہے۔ یعنی ایسے عظیم الشان انسانوں سے یہ بات ناممکن ہے اور اگر اس سے مراد عام لوگ ہیں تو تنوین تحقیر کی یعنی کسی معمولی بشر کو یہ زیبا و لائق نہیں۔ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ۔ (آل عمران: ۷۹) یہ جملہ اپنے معطوف سے مل کر کَانَ کا اسم مؤخر ہے۔ اَلْكِتَابَ سے آسمانی کتاب اور حکم سے حکومت فیصلہ یا فہم یا علم مراد ہے۔ جو علمائے کتاب کے لئے لازم ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا۔ (مریم ۱۲) اور نبوت سے پیغمبری مقصود۔ چونکہ پہلے کتاب اترتی ہے پھر عقل نبی میں حاصل ہوتی ہے۔ پھر وہ لوگوں تک اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اس لئے پہلے کتاب کا ذکر ہوا۔ پھر حکم یعنی فہم کتاب کا پھر نبوت کا۔ یہ تمام تقریر اس صورت میں ہے ...... کہ بشر سے مراد انبیائے کرام ہوں۔ اور اگر بشر سے مراد سارے انسان خصوصاً علماء اہل کتاب ہوں تو یہاں کتاب سے مراد علم کتاب ہوگا۔ اور حکم سے حکومت اور نبوت سے نبوت کی روشنی اور اس کا فیضان۔ خیال رہے کہ بشر لفظ تو ایک ہے مگر حسب موقعہ اس کے معنی و مقصد مختلف ہوتے ہیں۔ اگر یہ حضرات انبیاء کرام کے لئے بولا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں اللہ کی ہاتھ کی بنائی ہوئی صنعت۔ مباشرت بالید سے ماخوذ ہے۔ رب فرماتا ہے۔ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا۔ (حجر: ۲۸) اور فرماتا ہے۔ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ۔ (ص: ۷۵) یعنی اے شیطان تو نے اسے سجدہ کیوں نہ کیا جسے میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا اور اگر بشر عام لوگوں کے لئے بولا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں بشرے والا۔ یعنی ظاہری کمال والا جس کے جسم پر نہ پر ہوں نہ زیادہ بال اور اگر خبث لوگوں کے لئے بولا جائے تو اس کے معنی ہوں گے شرارت والا ب بمعنی مع اور شر بمعنی شرارت تو یہ لفظ حضرات انبیاء کے لئے تعظیم کا ہے کفار کے لئے تحقیر کا اس لئے عام محاورہ میں ان حضرات کو ہم بشر کہیں کہ یہ لفظ اچھے برے دونوں معنی رکھتا ہے اگرچہ قرآن کریم سے ثابت ہے جیسے ظالم نبی کو نہیں کہہ سکتے اگرچہ قرآن کریم سے ثابت ہے۔ جیسے آدم و یونس علیہما السلام نے عرض کیا تھا۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا۔ (اعراف: ۲۳) یا اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (انبیاء: ۸۷) ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ یہ جملہ يُؤْتِيَهُ پر معطوف

اگر نہ ہو تمہارا کوئی بچہ پس اگر ہو تمہارا کوئی بچہ تو ان کے لئے ہے آٹھواں حصہ
اولاد نہ ہو پھر اگر تمہارے اولاد ہو تو ان کا تمہارے
مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ؕ
اس مال کا جو چھوڑ جاؤ تم پیچھے اس وصیت کے جس کی تم وصیت کر جاؤ یا قرض کے
ترکہ میں آٹھواں جو وصیت تم کر جاؤ اور قرضہ نکال کر

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے کئی طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں نسبی وارثوں یعنی اولاد ماں باپ کے میراثی حصوں کا ذکر تھا، اب اس آیت میں سببی وارثوں یعنی بیوی خاوند کے حصوں کا تذکرہ ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ان وارثوں کے حصوں کا ذکر تھا جو بذاتِ خود میراث پاتے ہیں، اب اس آیت میں ان زوجین کے حصوں کا تذکرہ ہے جن کی میراث نکاح کے عارضہ کی وجہ سے ہے، گویا ذاتی میراث کے بعد عارضی میراث کا ذکر ہو رہا ہے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ان وارثوں کا ذکر تھا جو خود بھی وارث ہوں اور ان کے ذریعہ دوسرے بھی وارث ہوں، اب ان وارثوں کا تذکرہ ہے جو خود تو وراث ہیں مگر ان کے ذریعہ کوئی دوسرا وارث نہیں، باپ اولاد خود بھی وارث ہیں اور ان کے ذریعے پوتے، دادے، بھائی، بھتیجا بھی وارث مگر زوجین خود تو وارث ہیں لیکن ان کے ذریعہ کوئی دوسرا وارث نہیں، سالی، ساس، دیور وغیرہ وارث نہیں،

تفسیر

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ واؤ ابتدائیہ ہے اور یہ جملہ مستقل ہے نیا ہے، لام استحقاق کا ہے اور کم میں خطاب سارے مسلمانوں سے ہے، اس خطاب میں نہ نبی داخل ہیں نہ غیر مسلم جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، مَا تَرَكَ سے بیویوں کا تمام مملوکہ مال مراد ہے خواہ انہیں میکے سے جہیز تحفہ کے طور ملا ہو یا تم نے انہیں مہر وعطیہ کے طور پر دیا ہو یا خود انہوں نے کسی ذریعہ سے حاصل کیا ہو، جیسے بعض عورتیں تجارت، ملازمت سے روپیہ جمع کر لیتی ہیں یا انہیں ان کے لڑکوں نے کچھ نذر کیا ہو، غرضکہ کسی طرح ان کا مملوک ہو، أَزْوَاجُ سے مراد مطلقاً بیویاں ہیں جن سے نکاح ہو چکا ہو، خواہ صحبت ہوئی ہو یا نہ، خواہ رخصتی بھی ہو چکی ہو یا نہ یعنی اے مسلمانو! تم کو اپنی مرحومہ بیویوں کے مملوکہ متروکہ مال کا آدھا حصہ میراث میں ملے گا، مگر اس شرط سے کہ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ یہ پہلے جملہ کی شرط مؤخر ہے، وَلَدٌ سے مراد ان کے اپنے پیٹ کی اولاد ہے خواہ تمہارے نطفہ سے ہو یا دوسرے خاوند سے یا مولیٰ سے، اگر مولیٰ نے اسے آزاد کر دیا اور تم نے اس سے نکاح کیا، نیز وَلَدٌ مرد ہو یا عورت یعنی بیٹا ہو یا بیٹی یا بیٹے کی اولاد یعنی پوتے غرضکہ بالواسطہ وبلاواسطہ اولاد سب شامل ہے اس لئے لَهُنَّ ارشاد ہوا لَكُمْ نہ فرمایا گیا تاکہ معلوم ہو کہ تم سے پیدا ہوں یا کسی اور خاوند سے یعنی اے مسلمانو! تمہیں اپنی بیویوں کے متروکہ مال سے آدھا

ہے۔ بمعنی سکھانا۔ کتاب سے مراد کتاب الہی ہے۔ تدرسون درس یا دراستہ سے بنا۔ بمعنی تکرار اور بار بار کرنا۔ اسی لئے مٹنے کو اندراس کہا جاتا ہے کہ اس پر دن رات بار بار گذر کر اسے فنا کر دیتے ہیں چونکہ سبق بھی بار بار پڑھا جاتا ہے۔ اس لئے اسے درس کہتے ہیں۔ یعنی تم عالم ربانی اس لئے بنو کہ تم لوگوں کو کتاب الہی پڑھاتے ہو اور اس کا درس دیتے ہو۔ خیال رہے کہ یا تو تعلیم کتاب سے مراد سبقا سبقا کتاب پڑھانا ہے اور درس کتاب سے مراد بطور وعظ لوگوں تک احکام پہنچانا اور ممکن ہے کہ تدرسون سے مراد درس کتاب نہ ہو۔ بلکہ دوسرے احکام کی تعلیم مراد ہو۔ اور ممکن ہے کہ تعلیم کتاب سے مراد کتاب پڑھانا ہو۔ اور درس کتاب سے مراد سبق لینا ہو کیونکہ درس سبق دینے کو بھی کہتے ہیں اور سبق لینے کو بھی۔ بعض نے فرمایا کہ یہاں درس بمعنی دراست ہے۔ بمعنی فہم و سمجھ بہر حال تَعْلَمُوْنَ اور تَدْرُسُوْنَ میں تکرار نہیں۔ یعنی اے اہل کتاب چونکہ تم کو رب تعالیٰ نے خصوصی نعمت بخشی ہے کہ تم لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہو۔ انہیں کتاب کا درس بھی دیتے ہو۔ سبق بھی پڑھاتے ہو۔ لہٰذا تم ربانی بن کر رہو۔ ربانی بننا اس نعمت کا شکریہ ہے۔ نیز تمہارا ربانی بننا تمہارے ماتحتوں کو ربانی بنا دیگا۔ تمہارا عمل بھی تبلیغ ہونا چاہیے۔ وَلَا یَأْمُرَکُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِکَۃَ وَالنَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا۔ ہماری قرأت میں لا یَأْمُرَ رے کے فتح سے ہے۔ ثُمَّ یَقُوْلَ پر معطوف اور مَا کَانَ لِبَشَرٍ کی تحت میں داخل لایا تو زائدہ نفی کی تاکید کے لئے یا غیر زائدہ (معانی و کبیر) بعض قرأتوں میں لا یَأْمُرُ رے کے پیش سے ہے اس صورت میں یہ نیا جملہ ہے۔ ارباب جمع رب کی ہے۔ بمعنی پالنے والا یعنی خدا۔ چونکہ مشرکین فرشتوں کا۔ اور اہل کتاب بعض پیغمبروں کا خدائی میں دخل مانتے تھے کہ مشرکین تو ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اور بعض اہل کتاب پیغمبروں کو خدا کا بیٹا۔ اس جملہ میں ان سب کی تردید کی گئی۔ یعنی نہ یہ ممکن ہے کہ پیغمبر تمہیں اس کا حکم دیں کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا کا شریک مان لو۔ وہ تو ان باتوں سے روکنے کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ اَیَأْمُرُکُمْ بِالْکُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ یہ استفہام تعجب یا انکار ہے۔ کفر سے مراد غیر خدا کی عبادت ہے۔ جس کا ذکر پہلی عبارت میں ہو چکا۔ اگر اس آیت میں مسلمانوں سے خطاب ہو اور ان کے بارے میں آئی ہو تب مُسْلِمُوْنَ بمعنی مسلمان ہے جیسا کہ خطیب کا قول ہے اور اگر خطاب اہل کتاب سے ہو اور ان کے بارے میں آیت اتری ہو تو مسلم بمعنی مطیع، فرمانبردار اور دین کا مستحق ہے۔ (کبیر و معانی) یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ تم تو رب کی اطاعت کے ارادے سے ان کے پاس حق کی تلاش کے لئے حاضر ہو اور وہ تمہیں بجائے ایمان کے کفر کی تعلیم کریں۔ وہ حضرات تو انبیاء ہیں، یہ حرکت تو عام انسان بھی نہیں کر سکتے۔

خلاصہ تفسیر

تمام مخلوق سے زیادہ انسان کو اللہ نے نعمتیں بخشی ہیں کہ غذائیں، لباس رہائش کی بے شمار چیزیں انسان ہی کو دیں نیز نبوت، ولایت، معرفت سے اسی کو نوازا۔ آخرت میں جنت اسی کے لئے رکھی۔ پھر نوع انسان میں سے مومنوں پر بہت احسان کئے اور پھر مومنوں میں سے حضرات اولیاء اللہ پر بہت سے خصوصی احسانات فرمائے پھر ایسی پاک جماعت میں حضرات انبیاء کرام پر تو بے حد احسانات فرمائے اور قاعدہ ہے کہ شکر بقدر نعمت چاہیے جس قدر رب کی نعمتیں زیادہ ہوں اسی قدر اس کا شکر یہ ضروری ہے تو سب سے زیادہ شکر حضرات انبیاء کرام کرتے ہیں چونکہ یہود و نصاریٰ نے ان اعلیٰ درجہ کے شاکروں کو بد ترین کفر کا بہتان لگایا کہ بولے کہ ہم کو انبیاء کرام فرما گئے ہیں کہ ہمیں خدا کا بیٹا مانو۔ لہٰذا ان کی پر زور تردید رب تعالیٰ نے

ہوا جہیز و تحفہ ہو یا تمہارا دیا ہوا مہر و ہدیہ ہو یا ان کا اپنا پیدا کردہ ہو، اس سب میں سے تم کو آدھا ملے گا، عورت کی رخصت ہو چکی ہو یا نہیں، بشرطیکہ عورت نے اپنے پیٹ کی اولاد (بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی) نہ چھوڑی ہو، تم سے یا کسی اور خاوند یا مولیٰ سے، لیکن اگر ان میں سے کوئی اولاد چھوڑی ہے، تو تم کو ان کے متروکہ مال سے چوتھائی حصہ ملے گا، یہ سب کچھ ان کی وصیتوں کے اجرا اور قرضوں کے ادا کے بعد ہوگا، باقی تین حصے مال مرحومہ کے میکہ والوں کو مذکورہ بالا تفصیل سے ملے گا، اور اگر تم مال چھوڑ کر فوت ہو جاؤ اور بیویاں چھوڑ جاؤ، تو ان کی میراث کی تفصیل یہ ہے کہ اگر تم نے کوئی اولاد بیٹا بیٹی، پوتا پوتی نہ چھوڑی ہے تو انہیں تمہارے مال سے چوتھائی ملے گا، اور اگر تم نے ان میں سے کوئی اولاد چھوڑی، خواہ اس بیوی سے، خواہ دوسری بیوی سے یا لونڈی سے تو انہیں تمہارے مال کا آٹھواں حصہ ملے گا، اس طرح کہ اگر بیوی ایک ہے تو یہ اس اکیلی کا حصہ ہوگا، اور اگر چند ہیں تو یہی آٹھواں یا چہارم ان سب میں تقسیم ہو جائے گا، یہ میراث بھی تمہاری جائز وصیتوں اور ثابت قرضوں کے ادا کے بعد دی جائے گی، یہ صریح ظلم ہے کہ تم تو اپنی بیویوں کی میراث کے وارث ہو جاؤ، اور وہ تمہاری میراث سے محروم رہیں،

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** زوجین میں خاوند بیوی سے افضل ہے، اسی لئے اس آیت میں مردوں سے خطاب ہے اور عورتوں کا ذکر غائبانہ ہے، مردوں کے لئے لَکُمْ ہے عورتوں کے لئے لَھُنَّ نیز خاوندوں کا حصہ بیویوں سے دگنا ہے، نیز ان آیات میں مردوں سے سات جگہ خطاب ہے مگر عورتوں کا ذکر سات سے کم جگہ وہ بھی غائبانہ، **دوسرا فائدہ:** رشتہ نکاح میں بجز زوجین کے کسی کو میراث نہ ملے گی، جیسا کہ لَکُمْ اور لَھُنَّ کے مقدم فرمانے سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** سوتیلی اولاد وارث نہیں مگر حاجب ہے، عورت کا سوتیلا بیٹا عورت کے مال سے کچھ نہ لے گا، لیکن اگر اس کا سگا باپ مرے گا تو عورت کا حصہ بجائے چہارم کے آٹھواں ہو جائے گا، یہی معاملہ خاوند کی طرف ہے، **چوتھا فائدہ:** اگر عورت کا مہر خاوند کے ذمہ رہ گیا اور عورت فوت ہو گئی، تو اس مہر میں بھی خاوند کا حصہ ہوگا کہ مہر بھی عورت کی ملک ہے، جیسا کہ مَاتَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ کے اطلاق سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** عورت کا ہر قسم کا مال خواہ میکہ سے جہیز، ہدیہ، سوغات یا میراث کے ذریعہ ملے یا سسرال سے مہر، چڑھاوا یا میراث کے ذریعے ملے، سب میں میراث جاری ہوگی، یہ بھی مَاتَرَكَ کے عموم سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** خاوند کے متروکہ مال سے پہلے بیوی کو دین مہر ادا کیا جائے گا پھر تقسیم میراث ہوگی، جیسا کہ اَوْدَیْنٍ سے معلوم ہوا، **ساتواں فائدہ:** میراث میں تو بیٹے پوتے میں ترتیب ہے، مگر حجب میں کوئی ترتیب نہیں، کہ بیٹا پوتا یکساں بیوی خاوند کے لئے حاجب بن جاتے ہیں، **آٹھواں فائدہ:** عورت کے پیٹ کی ہر اولاد خاوند کا حصہ کم کر دے گی، ایسے ہی مرد کی ہر اولاد عورت کا حصہ کم کر دے گی، خواہ اس عورت سے ہو یا دوسری عورت سے، جیسا کہ لَھُنَّ وَلَدٌ اور لَکُمْ وَلَدٌ سے معلوم ہوا، **نواں فائدہ:** زوجین صرف ذی فرض ہی ہوتے ہیں کبھی عصبہ نہیں بنتے، اور ذی فرض بھی ایسے کہ ان پر میراث رد نہیں ہوتی، حتیٰ کہ اگر کسی نے صرف بیوی چھوڑی اور کوئی والی وارث نہ چھوڑا، تو بیوی کو چہارم مال دے کر باقی تین حصے مال خیرات کر دیا جائے گا، لیکن اگر صرف بیٹی

کے عمل وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ بھی بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** انبیاء پر اعتراض درحقیقت رب تعالیٰ پر اعتراض ہے کہ اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ رب کا انتخاب غلط ہے۔ اس نے باغی و مجرم کو نبوت جیسا اعلیٰ عہدہ عطا فرما دیا یہ ہی اس آیت کا مقصود ہے کہ ناممکن ہے کہ جس کو رب تعالیٰ نبی بنائے وہ لوگوں کو گمراہ کرے۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ۔ (انعام: ۱۲۴) **چھٹا فائدہ:** انبیائے کرام کا کافر یا گمراہ ہونا غیر ممکن ہے جیسا کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ کی تفسیر سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** کوئی پیغمبر شرک و کفر کی تعلیم نہیں دے سکتے جو چیز کسی نبی کے دین میں کبھی رہی ہو وہ شرک نہیں جیسا کہ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ سے معلوم ہوا۔ لہٰذا غیر اللہ کو سجدہ تحیہ کہ اسلام میں حرام ہے مگر شرک نہیں کیونکہ دیگر انبیائے کرام کے دین میں جائز تھا۔ **آٹھواں فائدہ:** غلط تعلیم کو انبیائے کرام کی طرف نسبت دینے والا عملاً یہودی ہے کہ انہوں نے اپنے تراشے ہوئے عقیدے پیغمبر کی طرف نسبت کر دیئے۔ مشرکین عرب بھی بت پرستی کو ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت دیتے تھے۔ **نواں فائدہ:** غیر خدا کو سجدۂ عبادت کرنا شرک ہے جیسا شانِ نزول کی ایک روایت سے معلوم ہوا کہ کچھ لوگوں نے حضور نبی کریم ﷺ کو سجدہ کرنا چاہا۔ اس پر یہ آیت کریمہ اتری اور اسی سجدہ کو کفر فرمایا گیا۔ **دسواں فائدہ:** کتاب اللہ پڑھانے والے علماء کو چاہیے کہ ربانی عالم بنیں تب ان کی تعلیم سے لوگ ربانی بنیں گے۔ نفسانی و شیطانی عالم لوگوں کو بھی نفسانی و شیطانی ہی بنائے گا۔ علم کی تاثیر کے لئے زبان کا فیض بھی ضروری ہے۔ سامری نے حضرت جبریل کی گھوڑی کی خاک فرعونی سونے کے بچھڑے کے منہ میں ڈالی اس مٹی نے اپنا اثر تو دکھایا کہ اسے زندگی بخش دی۔ اس میں آواز پیدا کی مگر اس آواز سے لوگ گمراہ ہوئے ہدایت پر نہ آئے۔ ایسے ہی گمراہ عالم کے وعظ سے لوگ گمراہ ہوں گے۔ ہدایت پر نہ آئیں گے۔ ایسے ہی کتاب اللہ پڑھنے والوں کو چاہیے کہ ربانی عالم سے قرآن سیکھیں ورنہ گمراہ ہوں گے۔ یہ فائدہ بما کنتم کی ب سے حاصل ہوا۔ نماز کے لئے اچھا امام علاج کے لئے اچھا قابل طبیب۔ مشین کے لئے لائق مستری تلاش کرو۔ ایسے ہی اصلاحِ نفس کے لئے ربانی عالم تلاش کرو۔ یہ جملہ عالم متعلم واعظ اور وعظ سننے والوں سب ہی کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جسے خدا نبوت دے اس کو تو شرک کی تعلیم دینا لائق نہیں۔ باقی دیگر لوگ شرک یا کفر پھیلائیں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ یہاں فرمایا گیا کہ جسے خدا نبوت دے اسے تعلیم شرک کا حق نہیں (بعض بے دین) **جواب:** اس کا نہایت نفیس جواب تفسیر میں گزر گیا کہ یا تو لبشر سے پہلے ممکناً پوشیدہ ہے یعنی پیغمبر کے لئے تعلیم شرک ناممکن ہے کیونکہ ان کے معجزات ان کی حقانیت کے دلائل ہیں۔ نیز وہ حضرات علم و عمل کے جامع ہیں۔ نیز ان کے نفوس برے اخلاق سے بھی پاک ہیں پھر کیونکر ممکن ہے کہ جنہیں رب تعالیٰ نے ہدایت کے لئے منتخب کیا ہو اس سے ایسا جرم صادر ہو۔ یا آیت کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم شرک بشریت کے منافی ہے کہ محسن کا احسان ماننا فطرتِ انسانی ہے۔ اور انبیائے کرام افضل البشر ہیں۔ پھر ان سے یہ حرکت کیونکر صادر ہو سکتی ہے یا آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شرک و کفر کی تعلیم دے اسے نبی بنانا رب تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔ یہاں جواز و عدم جواز کا ذکر نہیں بلکہ امکان اور استحقاق کی نفی ہے۔ **دوسرا**

ہیں کہ بیوی بوقتِ ضرورت مردہ خاوند کو غسل دے سکتی ہے مگر خاوند مردہ بیوی کو ہرگز غسل نہیں دے سکتا، حتیٰ کہ اگر کوئی غسل دینے والا نہ ہو، تو خاوند ہاتھوں پر کپڑا باندھ کر بیوی کو تیمم کرادے، **نوٹ:** شافعی حضرات کا یہ انتہائی اعتراض ہے (تفسیر کبیر) **جواب:** اس لئے کہ خاوند کی موت سے عورت حکماً نکاح میں رہتی ہے، اسی لئے اس پر عدت واجب ہے اس بقیہ نکاح کی وجہ سے خاوند کو غسل دے سکتی ہے کہ بالکل اجنبی نہیں بنی بعض وجوہ سے اس کی بیوی ہے، اسی لئے اس پر عدتِ سوگ واجب ہے، اور خاوند کے گھر سے نکلنا عدت کے زمانہ میں حرام ہے، اگر نکاح بالکل ختم ہو چکا تھا، تو نکاح کی یہ پابندیاں کیسی؟ لیکن عورت کے مرنے سے نکاح بالکل ہی ختم ہو چکا کہ نہ خاوند پر عدت ہے نہ بیوی کا نان نفقہ، نہ نکاح کی کوئی اور پابندی، مردہ بیوی خاوند کے لئے بالکل اجنبیہ ہے، اور اجنبیہ کو غسل دینا حرام جنابِ علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف فاطمہ زہراء کو ہی غسل دیا ہے جس پر صحابہ کرام نے اعتراض بھی کیا، آپ نے فرمایا کہ حضور انور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا اے علی فاطمہ تمہاری دنیا و آخرت میں بیوی ہیں، میرا نکاح ان کی وفات سے نہیں ٹوٹا، یہ آپ کی خصوصیت ہے، آپ نے اپنی اور کسی بیوی کو غسل نہیں دیا، یہاں قرآن کریم نے مردہ بیویوں کو میراث کے حق میں ازواج فرمایا، کہ فرمایا مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ نہ کہ مطلقاً، اگر مطلقاً بیوی ہوتی، تو اس سے صحبت یا کم از کم بوس و کنار جائز ہوتا، ناپاک عورت سے اگرچہ صحبت حرام ہے، مگر مقدماتِ صحبت یعنی بوس و کنار جائز ہیں، یہاں سب کچھ حرام ہو گیا، معلوم ہوا بیوی نہ رہی، فقیر حقیر نے اپنی اس تقریر میں تفسیر کبیر کے بڑے اعتراض کا جواب دے دیا، چونکہ ابھی آیت ختم نہیں ہوئی، اس لئے تفسیر صوفیانہ نہیں عرض کی گئی، انشاء اللہ آیت کے آخر میں عرض کی جائے گی،

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ
اور اگر ہو وہ مرد جو وارث بنایا جاتا ہو لا ولد (او تر بے اصول و فروع والا) یا عورت اور اس کا
اور اگر کسی ایسے مرد یا عورت کا ترکہ بٹتا ہو جس نے ماں باپ اولاد کچھ نہ چھوڑے اور ماں کی طرف سے
اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ج
بھائی یا بہن ہو تو ہر ایک کے لئے ان میں سے چھٹا حصہ ہے
اس کا بھائی یا بہن ہے تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا
فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ
پس اگر ہوں وہ بھائی بہن زیادہ اس سے تو وہ سب شریک ہیں تہائی میں
پھر اگر وہ بہن بھائی ایک سے زیادہ ہوں تو سب تہائی میں شریک ہیں
مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ لا غَيْرَ مُضَآرٍّ ج

نائب خدا قدوس ہیں کہ اسلامی قانون بنانے والا اللہ تعالیٰ ہے اور چلانے والے حضور ﷺ ہیں اس لئے قانون بنانے والے کے ساتھ قانون چلانے والے کا نام فطرت کے مطابق ہے۔خیال رکھو کہ قانون چلانے والا اگر تگڑا نہ ہو تو قانون طاق کی زینت بنا رہتا ہے۔لوگوں کی اصلاح نہیں کرتا۔اگر حضور ﷺ نہ آتے تو قرآن نہ تو کعبہ سے بت نکالتا نہ عرب کے مشرکوں کو مومن و عارف بناتا۔قرآن کے ذریعہ سب کچھ حضور ﷺ نے کیا۔دیکھ لو آج قرآن' حدیث' فقہ سب کچھ موجود ہے مگر عہد فاروقی جیسے مسلمان نظر نہیں آتے۔کیوں! اس لئے کہ اگرچہ قانون بنانے والا رب وہ ہی ہے۔قرآن وہ ہی ہے مگر قانون چلانے والا فاروق دنیا میں نہیں۔پھر جب حضرت مسیح و مہدی آئیں گے اور اس قانون کو چلائیں گے تو لوگ پھر عہد فاروقی جیسے ہو جائیں گے۔ہمارے پاکستان میں ہر سال شب برات پر قانون کا اعلان ہوتا ہے کہ آتشبازی نہ چلائی جائے مگر چلتی ہے لوگ اور مکان جلتے ہیں۔دو سال سے یعنی ۱۹۶۱ اور ۱۹۶۲ سے گجرات میں ہر طرح امن ہے کیونکہ ایک دیندار حاکم رب نے بھیج دیا ہے۔اے ڈی ایم مہابت خاں جس سے آتش بازی سے ہر طرح امن ہے یہ ہے قانون چلانا۔

تفسیر صوفیانہ

اہل حقیقت پر فرض ہے کہ اپنے متبعین اور مریدین کو ربانی بنائیں۔یعنی حق تعالیٰ کے اخلاق سے موصوف کریں کیونکہ یہ حضرات کتاب اللہ یعنی قرآن شریف کی ظاہری تعلیم بھی دیتے ہیں اور حقیقی درس بھی شیخ کامل وہ ہی ہے جو مرید کے ظاہر و باطن کی اصلاح کرے۔صرف الفاظ سکھانے پر قناعت نہ کرے۔کیونکہ علم درخت ہے اور عمل اس کے پھل۔علم بے عمل اور عمل بغیر علم بے کار ہیں۔جس علم کو رب تعالیٰ سے تعلق نہ ہو وہ جہل سے بدتر ہے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ دو شخصوں نے میری پیٹھ توڑ دی۔عالم بے عمل نے اور جاہل باعمل نے کیونکہ بے عمل عالم لوگوں کو علم و علماء سے نفرت دلاتا ہے اور جاہل عامل غلط عمل کے ذریعہ لوگوں کو جہالت کی طرف رغبت دیتا ہے۔عالم ربانی وہ ہے جو اپنے علم کے ذریعہ رب تک پہنچ جائے۔جس کے قلب میں علم کا تخم بویا جائے اور اس کی شاخیں قلب و قالب کی طرف پہنچیں کہ اس کے ہر عضو پر تقویٰ کے آثار نمودار ہو جائیں اور جنہیں دیکھ کر رب یاد آ جائے انہی کو راسخین فی العلم بھی کہتے ہیں انہی کے حق میں فرمایا گیا۔اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ (فاطر: ۲۸) اس زمانہ میں بعض مدعیان ولایت جاہل پیر اور بدعمل عالم وہ ہیں جن کی خواہش نفسانی ان پر غالب ہے اور وقت سے پہلے شیخوخت کے سجادہ اور علم کی پگڑی پر قبضہ کرتے ہیں۔علماء اور صوفیاء کی کچھ باتیں یاد کر کے لوگوں کو پھانستے پھرتے ہیں۔گویا انہوں نے تصوف و علم کو انسانی شکار کا جال بنایا۔ہمیشہ اپنے مریدوں کو پیر کی خدمت کے آداب ہی سکھاتے ہیں کہ پیر کی یوں خدمت کرو۔اس طرح اس کی دعوت کرو۔یوں نذرانہ پیش کرو یہ نہیں بتاتے کہ رب تعالیٰ کی عبادت کس طرح کرو۔اپنے معاملات اس طرح صاف رکھو اپنے میں سے حرام رسمیں اس طرح دور کرو۔شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے انہی کے لئے فرمایا ؎

دمادم بشویند چوں گربہ رو　　طمع کردہ در صید موشان کوئے
ریاضت کش از بہر نام و غرور　　کہ طبل تہی را رود بانگ دور

ایک بگ ناں ڈھول ہیں جس کی آواز دور جاتی ہے مگر اندر سے خالی۔طالبان حق اور واصلان رب گوشہ نشینی کو پسند کرتے ہیں

آیت الصیف فرمایا (خازن) غرضکہ کلالہ کی میراث کا مسئلہ بہت اہم ہے اور اس میں علماء کے بڑے اختلافات ہیں،

تفسیر

وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ یہ جملہ مستقل ہے اور واؤ ابتدائیہ، چونکہ اس آیت میں مذکورہ بھائی بہن کبھی میراث پاتے ہیں کبھی نہیں، اس لئے اسے اِنْ شرطیہ سے شروع فرمایا گیا، اس جملہ کی پانچ ترکیبیں کی گئی ہیں، اس لئے اس جملہ کے پانچ معنی ہیں، ہم سب سے آسان ترکیب و معنی عرض کرتے ہیں، وہ یہ کہ كَانَ ناقصہ ہے اور رَجُلٌ معطوف علیہ اِمْرَاَةٌ معطوف، یہ دونوں موصوف ہیں يُوْرَثُ اس کی صفت موصوف صفت سے مل کر كَانَ کا اسم اور كَلٰلَةً اس کی خبر، اصل عبارت یوں تھی وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ اَوِ امْرَاَةٌ يُوْرَثُ كَلَالَةً اس صورت میں معنی بالکل واضح ہیں، كَانَ کو تامہ ماننا یا كَلٰلَةً کو يُوْرَثُ کی ضمیر سے حال ماننا یا رَجُلٌ سے مراد وارث لینا ان سب میں اشکال ہے، اب معنی یہ ہوئے کہ اگر وہ میت مرد یا عورت جس کی میراث بٹ رہی ہے کلالہ ہوں، مرد و عورت سے مراد میت ہے، يُوْرَثُ واؤ کے سکون اور ر کے زبر سے باب افعال کا مضارع مجہول ہے، كَلٰلَةً كَلٌّ سے بنا، اس کے بہت معنی ہیں، (۱) بوجھ، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ (نحل: ۷۶) وہ غلام اپنے مولیٰ پر بوجھ ہے (۲) گھیر لینا، اسی سے ہے، اِكْلِيْل بمعنی تاج کہ وہ سر کو گھیرے ہوتا ہے، (۳) قوت جاتی رہنا، اسی سے ہے کلیل بمعنی متھرا و کھنڈا چاقو چھری، جس میں ذبح کی قوت نہ ہو، تیز چاقو کو حاد کہتے ہیں اور کھنڈے کو کلیل (۴) دوری اور فاصلہ، کہا جاتا ہے كَلَتِ الرَّحْمُ بَيْنَهُمْ ان کے درمیان رشتے دور ہو گئے (۵) تھک جانا، کہا جاتا ہے كَلَتِ النَّاقَةُ فِي الْمَسِيْرِ راستہ میں اونٹنی تھک گئی، اصطلاح میں شریعت میں کلالہ کسے کہتے ہیں، اس میں دو قول ہیں، حضرت عمر و حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ کلالہ وہ شخص ہے جس کے اولاد نہ ہو، ماں باپ ہوں یا نہ ہوں، ان کی دلیل سورۃ نسآ کی، وہ آیت ہے قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ (النساء: ۱۷۶) دیکھو رب تعالیٰ نے کلالہ کی تفسیر خود فرما دی، لا ولد، باپ کے نہ ہونے کا ذکر نہ فرمایا، یہ ہی قوی قول طاؤس کا ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جمہور و صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ کلالہ وہ ہے جس کے نہ اولاد ہو نہ ماں باپ، کیونکہ یہ آیت کریمہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جواب میں آئی ہے، ان کے والد غزوۂ احد میں شہید ہو چکے تھے، اور اس وقت ان کی اولاد بھی کوئی نہ تھی، نیز یہاں رب تعالیٰ نے اولاد و ماں باپ وغیرہ کا ذکر تو پہلے کر دیا کلالہ کا ذکر اب بعد میں فرمایا، جس سے معلوم ہوا کہ کلالہ وہ ہے جو پہلوں کا غیر ہو جس کے نہ ماں باپ ہوں نہ اولاد، نیز آخر سورۂ نساء کی آیت میں یوں ہے لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ (النساء: ۱۷۶) اس سے بھی اشارۃً معلوم ہو رہا ہے کہ کلالہ وہی ہو گا جس کے ماں باپ بھی نہ ہوں، کیونکہ ماں باپ کے ہوتے بہن بھائی کو میراث نہیں ملتی، اور یہاں کلالہ کے بھائی بہن کو میراث دی جا رہی ہے، تفسیر روح المعانی نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی وفات سے کچھ پہلے اپنے مذہب سے رجوع فرما لیا اور فرمایا اب میں وہی کہتا ہوں جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے، خیال رہے کہ كَلَالَةً كَلَّ يَكِلُّ کا مصدر ہے جیسے دلالۃ اور وکالۃ، لاولد میت کو بھی کلالہ کہتے ہیں، اور اصول و فروع کے علاوہ دیگر رشتہ داروں کو بھی، کیونکہ ان

لوہے سونے کو آگ سے نرم کر کے ان سے چیزیں بناتے ہیں۔ ایسے ہی سخت اور ٹھنڈے دل کا کچھ نہیں بنتا۔ جب دل عشق کی آگ سے نرم ہو جائے تو سبحان اللہ عارف متقی وغیرہ سب کچھ بن جاتا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ

اور جب لیا اللہ نے عہد پیغمبروں کا کہ جب دوں میں تم کو کتاب

اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا جو میں تم کو کتاب

وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ

اور حکمت پھر آئے تمہارے پاس رسول سچا کرنے والا واسطے اس کے جو ساتھ ہے تمہارے البتہ ضرور ایمان لاؤ گے

حکمت دوں پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا

وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ

اس کے اور ضرور مدد کرو گے اس کی فرمایا کیا اقرار کیا تم نے اور لیا تم نے اوپر اس کے ذمہ میرا

اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا فرمایا کیوں تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری ذمہ

قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾

کہا انہوں نے اقرار کیا ہم نے فرمایا پس گواہ ہو جاؤ اور میں ساتھ تمہارے گواہوں میں سے ہوں

سب نے عرض کیا ہم نے اقرار کیا فرمایا تو ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں آپ تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

پس جو اعراض کرے بعد اس کے پس یہ لوگ اطاعت سے خارج ہیں

تو جو کوئی اس کے بعد پھرے تو وہی فاسق ہیں

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ کی توحید اور اس کے دلائل کا ذکر تھا۔ اب حضور ﷺ کے فضائل ارشاد ہو رہے ہیں۔ جو عقیدہ توحید کے لئے شرط ہے۔ گویا اسلام کے ایک رکن (توحید) کا پہلے ذکر ہوا۔ اور دوسرے رکن یعنی حضور ﷺ کی رسالت عامہ کا اب ذکر ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اہل کتاب کے اس اتہام کی تردید تھی۔ جو انہوں نے پچھلے انبیاء پر لگایا یعنی تعلیم کفر اب بھی اس کی تردید ہے مگر دوسری طرح گویا پہلے فرمایا گیا تھا کہ وہ حضرات نبی تھے اور نبی کفر و شرک کی تعلیم دے سکتے ہی نہیں۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ وہ حضرات میثاق کے دن ہم سے نبی آخر الزمان (ﷺ) پر ایمان لانے کا وعدہ کر گئے ہیں۔ وہ تو ان پیغمبر کی بھی مخالفت نہیں

پہنچانا ہو (کبیر) ان سب کے تفصیلی احکام کتب فقہ میں ملاحظہ فرمایئے وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ اس کی تفسیر پہلے ہو چکی وَصِيَّةً یوصی یا اوصی کا مفعول مطلق ہے اور روئے سخن مرنے والے اور وارثوں بلکہ مقروضوں، قرض خواہوں وغیرھم سب کی طرف ہے کہ رب تعالیٰ اے وارثو تم کو، اے مرنے والو تم کو، اے دوسرے لوگو تم سب کو تاکیدی حکم دیتا ہے کہ نہ تو وارث ایک دوسرے کو نقصان پہنچائے، نہ مرنے والا پسماندگان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے نہ مقرلہ وغیرھم جن کے لئے میت جھوٹا اقرار کر گیا ہے، غرضکہ کوئی کسی کو نقصان دینے کی کوشش نہ کرے وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ علم والا بھی ہے حلم والا بھی، اگر کسی مجرم کو جلد سزا نہ دے تو مجرم اس مہلت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے، نہ اس تاخیر سے دھوکا کھائے، اور کوئی وارث وغیرہ کسی کو نقصان پہنچا کر خوش نہ ہو کہ مجھے رب تعالیٰ نے پکڑا نہیں مال بھی مل گیا اور میں سزا سے بھی محفوظ رہا،

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! اگر کوئی مرد یا عورت کلالہ ہو کر مرے کہ نہ اس کے اولاد ہو نہ ماں باپ دادا وغیرہ ہوں مگر اس کے ماں شریکی بھائی یا بہن ہوں تو اس کی میراث یوں تقسیم ہوگی کہ اگر ایک اخیافی بھائی یا بہن ہے تو اسے کل مال کا چھٹا حصہ ملے گا اور اگر ایک سے زیادہ ہیں خواہ سب اخیافی بہنیں ہوں یا صرف بھائی یا بھائی بہن دونوں تو ان سب کو کل مال کا تہائی ملے گا، مگر یہ اخیافی اولاد اس تہائی میں برابر کے شریک ہوں گے مذکر کو مؤنث کے برابر ملے گا یہاں لڑکے کا لڑکی سے دوگنا نہ ہوگا، باقی مال دوسرے رشتہ داروں چچا تائے وغیرہ کو ملے گا، یہ تقسیم بھی وصیت و قرض ادا کرنے کے بعد جاری ہوگی، بشرطیکہ وصیت یا قرض ورثاء کو نقصان دہ نہ ہو، ناجائز وصیت اور ناجائز قرض کا بالکل اعتبار نہ ہوگا، تقسیم میراث کے یہ مسائل رب تعالیٰ کی طرف سے ہیں جن پر عمل کرنے کا تاکیدی حکم ہے اللہ تعالیٰ نے جس کو جو دیا ہے وہ اپنے کمال علم سے دیا کہ وہ علیم ہے، اگر کوئی شخص تقسیم میراث میں کمی بیشی کرے اور اس پر فوراً عذاب نہ آئے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حلیم ہے مجرم پر عذاب بھیجنے میں جلدی نہیں فرماتا، لہٰذا اس مہلت سے دھوکا نہ کھاؤ،

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** اخیافی بھائی بہن ذی فرض ہیں کہ ان کا حصہ مقرر ہے، دوسرے بھائی بہن حقیقی ہوں یا علاتی عصبہ ہیں جیسا کہ السُّدُسُ سے معلوم ہوا، **دوسرا فائدہ:** اخیافی اولاد مرد و عورت برابر حصہ پائیں گے، ان میں مرد کو عورت سے دوگنا نہ ملے گا جیسا کہ شُرَكَآءُ سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** اخیافی اولاد ماں باپ دادا اور بیٹی بیٹے کے ہوتے ہوئے محروم ہے جیسا کہ كَلٰلَةً سے معلوم ہوا، **چوتھا فائدہ:** جائز وصیت و جائز قرض تقسیم میراث پر مقدم ہے جیسا کہ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ الخ سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** ناجائز وصیت اور ناجائز قرض متروکہ مال سے ادا نہ کیا جائے گا جیسا کہ غَيْرَ مُضَآرٍّ سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** اگر خود ورثاء اس کی ناجائز وصیت یا ناجائز قرض ادا کر دینا چاہیں تو کر سکتے ہیں یہ بھی غَيْرَ مُضَآرٍّ سے معلوم ہوا، ناجائز وصیت کی چند صورتیں ہیں، تہائی سے زیادہ کی وصیت، وارث کو وصیت، حرام و ناجائز کاموں میں خرچ کرنے کی وصیت، کہ میرے بعد نوحہ

امتیں۔ گویا رب تعالیٰ نے سارے پیغمبروں سے حضور ﷺ پر ایمان لانے کا عہد و میثاق لیا۔ اور ان سب پیغمبروں کی امتیں بھی تبعًا اس میں داخل ہوئیں کہ وہ پیغمبر اس عہد میں اپنے اصیل اور امتوں کے نمائندے تھے۔ جیسے نماز کا امام۔ یہ ہی قول حضرت علی و ابن عباس، قتادہ، سدی رضی اللہ عنہم اجمعین کا ہے۔ (خازن و کبیر و معانی وغیرہ) اس لئے النبیین جمع اور معرف باللام۔ ارشاد ہوا نبی رسول اور مرسل دونوں سے عام ہے۔ نبیوں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ رسولوں کی تعداد تین سو تیرہ مرسلین کی تعداد چار نبی میں رسول و مرسل بھی شامل ہیں۔ لہٰذا میثاق کی اضافت اپنے مفعول کی طرف ہے۔ اس صورت میں آیت بلا تاویل و توجیہہ درست ہے اور اس پر جو سوال و جواب کئے گئے ہیں انشاء اللہ العزیز ہم اعتراض و جواب میں عرض کریں گے اس کے علاوہ اس کی دیگر تفاسیر بھی ہیں۔ چنانچہ سعید ابن جبیر، حسن اور طاؤس رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ یہ سارے پیغمبروں کا عہد ہے۔ جس میں حضور ﷺ بھی داخل ہیں۔ یعنی ہر ایک سے لیا کہ اگر تم کسی کا زمانہ پاؤ تو ایمان لانا۔ اسی قول کی بنا پر آیت میں بہت تاویلیں کرنی پڑیں گی۔ بعض نے فرمایا کہ میثاق کی اضافت فاعل کی طرف ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے امتوں سے پیغمبروں کا عہد لیا۔ یعنی ان کے بارے میں عہد لیا گیا کہ اے لوگو تم ان پر ایمان لانا۔ یہ تفسیر بھی نہایت بعید ہے۔ بعض نے فرمایا کہ یہاں نبیین سے پہلے امم یا اولاد پوشیدہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے نبیوں کی امت اور ان کی اولاد یعنی بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ یہ بھی بہت بعید تفسیر ہے۔ بعض نے فرمایا کہ یہاں نبیین سے مراد بنی اسرائیل ہیں چونکہ وہ اپنے آپ کو نبوت کا مستحق سمجھتے تھے۔ اس لئے بطور طعن انہیں نبی فرما دیا گیا۔ یہ اور زیادہ بعید تفسیر ہے۔ (معانی و خازن و کبیر) مگر تفسیر اول نہایت قوی ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں کوئی نبی نہ آیا مگر رب تعالیٰ نے ان سے حضور علیہ السلام پر ایمان لانے کا عہد لیا۔ پھر اس پیغمبر نے اپنی قوم سے عہد لیا کہ اگر تم ان کا زمانہ پاؤ تو ان پر ایمان لانا۔ اور ان کی خدمت کرنا (خازن و معانی) جمہور مفسرین اسی طرف گئے ہیں۔ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّ حِکْمَۃٍ۔ یہ میثاق کی تفصیل ہے۔ ہماری قرأت میں لَمَا لام اور میم کی فتح سے ہے۔ لام توطیہ کا ہے اور مایا موصولہ ہے اور اٰتَیْتُکُمْ اس کا صلہ۔ سب مل کر مبتدا اور لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ خبر یا ما شرطیہ ہے اور اٰتَیْتُکُمْ شرط اور لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ جزا۔ یا لَمَا بمعنی لما ہے۔ اس کا نہایت نفیس ترجمہ وہ ہے جو اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ ایک قرأت میں لِمَا ہے لام کا کسرہ اور میم کا فتح بمعنی چونکہ اس صورت میں یہ جملہ لَتُؤْمِنُنَّ کی علت ہے۔ کتاب سے آسمانی کتاب اور سارے صحیفے مراد ہیں۔ خواہ بالواسطہ ملے ہوں یا بلاواسطہ۔ کیونکہ سارے پیغمبروں کو بلاواسطہ کتاب نہیں ملی اور حکمت سے یا کتاب کا علم مراد ہے یا دیگر وحی یا حرام و حلال کے مسائل مِنْ کِتٰبٍ میں من یا تبعیضیہ ہے یا بیانیہ۔ یعنی اے نبی ﷺ انہیں یاد دلاؤ یا اہل کتاب تم توریت وانجیل میں پڑھتے ہوئے اس واقعہ کو بھی یاد کرلو کہ جب رب تعالیٰ نے پیغمبروں سے ایک پختہ عہد لیا کہ جب میں تمہیں اپنی کتاب اور اپنا علم خاص عطا فرماؤں۔ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ۔ ثُمَّ عاطفہ اور یہ جملہ اٰتیتکم پر معطوف ہے۔ جَآءَکُمْ سے مراد جَآءَ فِیْ زَمَانِکُمْ ہے۔ رسول کی تنوین عظمت کی ہے اور اس سے ہمارے نبی ﷺ مراد ہیں کیونکہ عظیم الشان نبی اور ساری خلقت کے مطلق رسول حضور علیہ السلام ہی ہیں۔ نیز قرآن کریم میں جہاں رسول بغیر قید کے ارشاد ہوتا ہے۔ وہاں حضور علیہ السلام ہی مراد ہوتے ہیں جیسے لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ (التوبہ: ۱۲۸) یا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بھائی بہن کی میراث چھٹا حصہ اور تہائی ہے اور بھائی بہن اپنی میراث میں برابر کے شریک ہیں، مگر سورۂ نساء کی آخری آیت میں بھائی بہن کو عصبہ قرار دیا گیا ہے اور بھائی کو دوگنا، بہن کو اکہرا دلوایا گیا ہے، آیتوں میں تعارض ہے نیز وہاں صرف بہن کو ذی فرض قرار دے کر ایک کو آدھا زیادہ کو دو تہائی دلوایا گیا ہے، **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گذر گیا کہ یہاں اخیافی یعنی ماں شریکے بھائی بہن مراد ہیں اور وہاں آخر سورت میں سگے اور علاتی بھائی بہن مراد، للہذا آیات میں تعارض نہیں اخیافی اولاد کا حکم اور ہے سگے اور علاتی کا حکم کچھ اور دونوں آیتیں برحق ہیں، **چھٹا اعتراض:** ان آیات میں حجب کے لئے جو اولاد ارشاد ہوا، اس سے بیٹا بیٹی، پوتا پوتی سب ہی مراد ہیں، دیکھو رب تعالیٰ نے فرمایا فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ یہاں ولد سے بیٹا، پوتا سب ہی مراد ہیں تو چاہیے کہ فِيٓ أَوْلَادِكُمْ (نساء:١١) میں بھی اولاد سے بیٹے پوتے سب ہی مراد ہوں، وہاں صرف بیٹے کیوں مراد لئے گئے، چاہیے کہ بیٹے کے ہوتے یتیم پوتا بھی وارث ہو، **نوٹ:** چکڑالویوں کا یہ انتہائی اعتراض ہے، **جواب:** یہ اعتراض تو تم پر بھی وارد ہوتا ہے کہ تم بھی آیت میراث يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِيٓ أَوْلَادِكُمْ میں پوتے کو مطلقاً داخل نہیں مانتے، بلکہ یتیم پوتے کو جس کا باپ فوت ہو چکا ہو اسے داخل کرتے ہو، یہاں حجب میں بیٹا پوتا برابر کے شریک ہیں کہ پوتا مستقل طور پر حاجب ہے، وہاں اولاد سے بلاواسطہ اولاد مراد ہونا اور یہاں ولد سے بیٹا پوتا سب مراد ہونا بحکمِ حدیث اور بحکم اجماع امت رسول اللہ ﷺ ہے، قرآن و حدیث دونوں واجب العمل ہیں، **ساتواں اعتراض:** حجب اور کلالہ میں نواسی نواسے کا اعتبار کیوں نہیں، یعنی پوتا بعض وارثوں کے لئے حاجب ہے نواسا نہیں، یوں ہی پوتا نہ ہو تو میت کلالہ ہے اگرچہ اس کا نواسہ موجود ہو، اس کی کیا وجہ ہے؟ **جواب:** پوتے کا رشتہ قوی ہے کہ وہ دادا کے نسب میں داخل ہے، نواسہ کا رشتہ نانا سے ضعیف ہے کہ وہ نسب میں داخل نہیں، سید کا پوتا سید ہے مگر سید کا نواسہ سید نہیں، جبکہ اس کے باپ دادے غیر سید ہوں، اسی وجہ سے پوتے اور نواسہ میں مذکور فرق ہوا۔

تفسیر صوفیانہ

مسلمان آدمی اس ڈاکیہ کی طرح ہے جو ڈاک خانہ سے صدہا حقوق کا تھیلہ لے کر صبح کو نکلتا ہے اور شام کو سب کے حقوق دے کر واپس ہوتا ہے، رجسٹری، پارسل، منی آرڈر، خطوط، لفافے، غرض جو جس کا ہو اس کو پہنچاتا ہے، اگر غبن کرے یا تقسیم میں غلطی کرے تو مجرم ہے، ایسے ہی انسان کے اپنے مال میں صدہا حقوق ہیں، اللہ رسول کے حق زکوٰۃ، فطرہ وغیرہ، بیوی، اولاد، ماں باپ، بھائی بہن غرضکہ تمام عزیزوں کے حقوق بقدرِ قرابت، اگر زندگی میں سب کے حقوق دے کر دنیا سے گیا، تو اس کا دنیا میں رہنا بھی کامیاب ہے اور دنیا سے جانا بھی کامیاب، اگر حقوق مار کر گیا تو گرفتاری ہے، پھر انسان مر جاتا ہے مگر اس کے ذمہ کے حقوق نہیں مرتے، بعد موت بھی اس کے مال میں حقوق ہیں، اگر صحیح تقسیم کرا گیا تو اس کی قبر و حشر ٹھیک ہے، اور اگر وصیت میں ظلم یا قرض میں خیانت کر کے مرا، تو پکڑ ہے، ان آیات میں انسان کو اس کی ذمہ داریوں پر متنبہ فرمایا گیا ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرے، پھر جیسے مال میں بقدرِ قرابت وارثوں کو حصہ ملتا ہے، ایسے ہی اعمال و کمال میں بقدرِ قرب حصہ تقسیم ہوتا ہے، مومن کے رہنے سہنے کی جگہ، وقت، مصلی، خدمتگار خدام سب ہی فیض پاتے ہیں، اس لئے مومن کے مرنے پر آسمان

جاتا ہے۔اس لئے اسے اقرار کہتے ہیں۔(کبیر) حقیقتاً گذشتہ کے لئے بولا جاتا ہے۔اور کبھی آئندہ کے لئے بھی بمعنی معاہدہ۔یہاں دوسرے معنی میں ہے۔ اَخَذْتُمْ بمعنی قَبِلْتُمْ ہے قرآن کریم میں بہت جگہ اخذ بمعنی قبول آیا ہے۔ لَا یُؤْخَذُ مِنْهَا یعنی لَا یُقْبَلُ۔(انعام:۷۰)اور فرمایا وَیَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ۔(التوبہ:۱۰۴) یعنی رب تعالیٰ صدقے قبول فرماتا ہے۔ ذالکم سے اس عہد کی طرف اشارہ ہے چونکہ یہ ہر پیغمبر کے حق میں مستقل عہد تھا اس لئے ذالکم بطریقہ جمع فرمایا گیا۔اصر کی تحقیق سورۂ بقر کے اخیر میں وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَآ اِصْرًا۔(بقرہ:۲۸۶) کی تفسیر میں ہو چکی کہ اس کے معنی بوجھ اور ثقل ہیں تاکیدی عہد کو اس لئے اصر کہتے ہیں کہ وہ معاہد پر ایک بوجھ ہوتا ہے کہ اس کے توڑنے پر سزا مرتب ہوتی ہے۔یعنی رب تعالیٰ نے فرمایا۔اے گروہ انبیاء! فرماؤ کیا تم نے اس کا اقرار کیا ہے اور میرے اس بوجھل عہد کو قبول کیا۔قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا۔ حضرات انبیائے کرام نے اس عہد کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے صرف بلیٰ نہ کہا بلکہ اَقْرَرْنَا کہا۔یعنی ان سب نے عرض کیا کہ اے مولیٰ ہم نے اقرار کرلیا۔ہم اس معاہدہ کی ضرور پابندی کریں گے۔معمولی چیزوں کا اقرار بلکہ ایجاب وقبول صرف ہاں کہہ دینے بلکہ کبھی خاموش رہ جانے سے بھی ہو جاتا ہے مگر بہت اہم وضروری چیز کا اعتراف ان چیزوں سے نہیں ہوتا وہاں اقرار یا قبول کے صریحی الفاظ بولنا پڑتے ہیں۔خرید وفروخت میں ہاں کہہ دینا کافی ہے۔بلکہ فقط لین دین سے بھی ہو جاتی ہے۔جسے بیع تعاطی کہتے ہیں مگر نکاح کے قبول کے لئے قَبِلْتُ کہنا لازم ہے۔توحید کے اقرار سے نبوت کا اقرار زیادہ اہم تھا۔اس لئے توحید کے لئے بلیٰ کہنا کافی ہوا مگر یہاں اقررنا کہلوایا گیا۔نیز قَالُوْٓا جمع فرما کر بتایا گیا کہ صرف ایک دو نبی نے دوسروں کا نمائندہ بن کر سب کی طرف سے یہ نہ کہا بلکہ سب نے صراحۃً خود کیا وکالۃً نہ کہا اور سجدہ ملائکہ کی طرح سب انبیاء نے بیک وقت یہ عرض کیا غرضکہ قالوا جمع فرماتے ہیں۔عجیب راز ہیں۔صرف اسی پر کفایت نہ فرمائی بلکہ ارشاد ہوا۔قَالَ فَاشْهَدُوْا۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ پیغمبروں سے خطاب ہے اور اِشْهَدُوْا سے بعض کا بعض پر گواہ بن جانا مراد ہے کہ آدم علیہ السلام نوح علیہ السلام پر گواہ بنیں۔اور نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کے وغیرہ وغیرہ بعض مفسرین نے فرمایا کہ اشھدوا میں سارے فرشتوں سے خطاب ہے۔یعنی اے فرشتو تم اس اقرار پر گواہ رہو۔بعض نے فرمایا کہ اس میں خطاب تو پیغمبروں سے ہی ہے مگر شہادت سے مراد گواہی دینا ہے نہ کہ گواہ بننا یعنی اے پیغمبرو تم دنیا میں اپنی امتوں کے سامنے اس عہد کی گواہی دو اور انہیں خبر پہنچاؤ تاکہ کسی کو بے خبری کا عذر نہ رہے۔بعض نے فرمایا کہ اس سے ہر نبی کا اپنے نفس پر گواہ بننا مراد ہے یعنی ہر ایک اپنے پر گواہ رہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ (اعراف:۱۷۲)۔ اور فرماتا ہے۔قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓی اَنْفُسِنَا (انعام: ۱۳۰)۔یہ ایک قسم کا مبالغہ ہے۔بعض نے فرمایا کہ اشْهَدُوْا شہود سے بنا بمعنی یقین۔یعنی اس پر یقین کرلو۔جیسے معائنہ اور مشاہدہ کی ہوئی چیز پر یقین ہوتا ہے۔(تفسیر کبیر) پھر اس پر بھی بس نہیں بلکہ وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ۔ میں تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ایک گواہ ہوں۔خیال رہے کہ حضرات انبیاء کی گواہی اس واقعہ پر ہوئی اور رب تعالیٰ کی گواہی اس گواہی پر یعنی میں تمہاری گواہی پر گواہ ہوں۔یہ گواہی ایسی تھی جیسے شہنشاہ ایک واقعہ کو دیکھے اس پر گواہ بن جائے کہ وہ حاکم بھی ہے اور گواہ بھی۔فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِکَ۔ یہ میثاق کا نتیجہ ہے ظاہر یہ ہے کہ مَنْ سے مراد عہد و پیمان کرنے والے انبیاء کرام ہیں۔تب یہ مطلب ہے کہ حضرات انبیاء عبدیت کے اعلیٰ منزل پر ہیں جس کے بعد الوہیت ہی ہے۔پھر ان میں بعض کو

احکام پر عمل کرنے والوں کے ثواب، نہ کرنے والوں کے عذاب کا ذکر ہے، گویا پہلے احکام کا ذکر تھا، اب ان پر عمل کرنے کی تاکید ہے، **دوسرا تعلق:** گذشتہ آیات میں رب تعالیٰ نے چند وارثوں کے کچھ میراثی حصے بیان فرمائے، اب ارشاد ہو رہا ہے کہ میراث کے بقیہ احکام ہمارے محبوب ﷺ سے معلوم کرو، اور فرائض میں میری طرح میرے محبوب کی بھی اطاعت کرو گویا خدائی بانٹ کا ذکر فرما کر اب رسولی بانٹ کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ارشاد ہو رہا ہے جنت کا مستحق وہ ہی ہوگا جو میراث میں میری بھی اطاعت کرے اور میرے رسول کی بھی، **تیسرا تعلق:** عقل انسانی کہتی تھی کہ اولاد ماں باپ وغیرہ کو تو میراث ملنا چاہیے کہ زندگی میں ماں باپ ہمیں پالتے ہیں، ہم اپنی اولاد کو پالتے ہیں، اور گھر کی رونق ماں باپ اولاد سے ہی ہوتی ہے، آپس میں اختلاط ان ہی سے زیادہ ہوتا ہے مگر بھائی بہن وہ بھی اخیافی دوسرے کی اولاد حصے کی مستحق کیوں ہوئی، یہ خلاف عقل ہے، اس لئے کلالہ کی میراث بیان فرما کر اب اس کی تاکید فرمائی جارہی ہے،

تفسیر

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ تِلْکَ میں تمام گذشتہ احکام متعلقہ اموال یتامیٰ، وصیت، میراث کی طرف اشارہ ہے، حد کے لغوی و اصطلاحی معانی بارہا بیان ہو چکے، یہاں بمعنی حد و کنارہ ہے، جو چیز حد کے اندر ہے وہ مفید ہے، حد سے بڑھ جائے تو نقصان دہ، ملکوں کی بھی حدیں ہوتی ہیں، زمین و زمان کی بھی، احکام و اعمال کی بھی، یہاں آخری قسم کی حد مراد ہے، یعنی یہ مذکورہ بالا تمام قسم کے احکام اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدیں ہیں جو اس نے اپنے بندوں کے لئے مقرر فرما دیں، ہر شخص کو ان کے اندر رہنا چاہیے، اس سے آگے نہ بڑھنا چاہیے، وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ، مَنْ سے مراد صرف انسان ہیں فرشتے اور جنات اس سے خارج ہیں، اگرچہ ان پر بھی اللہ رسول کی اطاعت واجب ہے، مگر ان کی اطاعت پر جنت کا داخلہ نہیں ملتا، جنت صرف انسانوں کے لئے ہے، اطاعت سے مراد بخوشی فرماں برداری ہے، جبری فرماں برداری تو منافقین بھی کر لیتے تھے جنت دل کی رغبت سے ملتی ہے، قرآنی احکام کو ماننا اور ان پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، حدیث شریف کو ماننا اور اس کے مطابق عمل کرنا رسول کی اطاعت ہے ﷺ، یا یوں کہو کہ حضور انور ﷺ ہی کی اطاعت خدا کی بھی اطاعت ہے کہ ہم تک خدائے تعالیٰ کے احکام حضور انور ﷺ ہی کی معرفت پہنچے ہیں رَسُوْلَهٗ سے مراد نبی کریم ﷺ کیونکہ اب تا قیامت اطاعت صرف حضور انور ﷺ ہی کی ہوگی ایمان سارے نبیوں پر یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یہ جملہ مَنْ یُّطِعِ کی جزاء ہے، دخول سے مراد جزاء کے لئے جسماً جنت میں جانا ہے جو بعد قیامت میسر ہوگا، شہداء کی روحیں مرتے ہی جنت میں پہنچ جاتی ہیں، تمام مسلمانوں کی قبروں میں جنت کی ہوائیں اور خوشبوئیں آتی ہیں، جو حضرات قیامت سے پہلے جنت میں پہنچے یا وہاں رہے وہ جزاء کے لئے نہ رہے، لہٰذا اس آیت میں کسی تخصیص یا تعیم کی ضرورت نہیں، چونکہ مَنْ سے مراد سارے ہی مسلمان ہیں، اس لئے جَنّٰتٍ جمع فرمایا گیا یعنی ہر قسم کے مطیع کو اس کے لائق جنت ملے گی، اور ہو سکتا ہے کہ ایک ایک جنتی کو بہت بہت جنتیں ملیں، تَجْرِیْ فرما کر یہ بتایا گیا کہ وہاں پانی دودھ وغیرہ کے تالاب نہ ہوں گے، کہ ان میں حسن نہیں ہوتا بلکہ چھوٹی چھوٹی دلکش نہریں ہوں گی جن میں پانی دودھ وغیرہ رواں ہوگا مِنْ تَحْتِهَا فرما کر یہ بتایا کہ وہ نہریں نقصان دہ نہ ہوں گی

علیہ السلام کو جنت سے ہندوستان کولمبو کے پہاڑ سراندیپ پر اتارا گیا۔ اور حضرت حوا کو جدہ میں تین سو سال تک ان میں جدائی رہی۔ اور آدم علیہ السلام معافی کے لئے گریہ زاری فرماتے رہے۔ پھر حضور علیہ السلام کے نام کی برکت سے توبہ قبول ہوئی۔ اور عرفات میں حضرت حواء سے ملاقات کی۔ پھر نعمان پہاڑ پر آدم علیہ السلام کی پشت سے تمام روحوں کو نکالا گیا جو باریک چیونٹیوں کی شکل میں تھیں۔ کفار کی روحیں سیاہ' مسلمانوں کی سفید اور انبیائے کرام کی ارواح روشن تھیں۔ ان سے یہ عہد لئے گئے جن میں تیسرا عہد وہ تھا جس کا ذکر اس آیت میں ہے کہ اے نبی ﷺ ان اہل کتاب کو نبیوں کا وہ عہد میثاق یاد دلا دو جس کا ذکر توریت وانجیل میں ہے تاکہ انہیں عبرت حاصل ہو۔ اور ان کے دلوں میں آپ کی عظمت پیدا ہو۔ وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے سارے پیغمبروں سے خواہ وہ محض نبی ہو یا رسول یا مرسل بھی۔ سب کے سامنے یہ عہد لیا کہ اے گروہ انبیاء جب میں تمہیں دنیا میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنی کتاب یا صحیفہ اور اپنا علم وحکمت عطا فرماؤں۔ تمہیں تمغہ نبوت سے سرفرازی بخشوں۔ پھر اسی حال میں جبکہ تمہاری نبوت کا آفتاب خوب چمک رہا ہو اور تمہارا کلمہ پڑھا جا رہا ہو تمہارے نام کے ڈنکے بج رہے ہوں' وہ پچھلا پیغمبر دعائے خلیل اور بشارت مسیح ساری خلقت کا ہادی۔ عرش وفرش کا بادشاہ احمد مجتبیٰ محمد ﷺ تمہارے پاس تشریف لے آئے تو تم ان کا کلمہ پڑھ کر ان پر ایمان لانا اور ہر طرح ان کی امداد کرنا' اور اعانت کرنا۔ بولو کیا اقرار کرتے ہو اور اس بھاری ذمہ کو اٹھاتے ہو۔ تمہیں یہ بات منظور ہوگی۔ سب نے عرض کیا۔ اے مولیٰ ہم سب کو اس کا اقرار ہے تجھ سے عہد کرتے ہیں اور اس کی پابندی کریں گے۔ فرمایا اچھا تم سب ایک دوسرے پر گواہ بن جاؤ۔ صرف تمہاری گواہی پر ہی بس نہیں بلکہ ہماری شاہی گواہی بھی اس میں شامل ہے۔ ہم بھی تمہارے ساتھ گواہ ہیں۔ خیال رہے کہ جو کوئی اس عہد وپیمان کے بعد اس نبی پر ایمان لانے سے منہ موڑے گا وہ کافر ہو گیا۔

فضیلت سید الانبیاء ﷺ

ساری امت کا اس پر اتفاق ہے کہ حضور ﷺ تمام نبیوں کے سردار ہیں۔ اس کے بیشمار دلائل ہیں جن میں سے بطور اختصار کچھ عرض کئے جاتے ہیں۔ (۱) یہ ہی آیت کریمہ جس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نبیوں کے بھی نبی ہیں اور سارے پیغمبر آپ کے امتی۔ سب سے آپ پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا۔ اور عہد بھی نہایت پختگی سے کہ عہد ربوبیت میں صرف اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى۔ (اعراف: ۱۷۲) پر کفایت ہوئی مگر یہاں بجائے بلیٰ کے اقرار کہلوایا۔ سب کو اس پر گواہ بنایا۔ رب تعالیٰ نے اپنی شاہی گواہی کو بھی شامل فرمایا۔ پھر اس کی مخالفت پر سزا مقرر فرمائی۔ (۲) كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الخ (آل عمران: ۱۱۰)۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ امت مصطفیٰ ﷺ تمام امتوں سے افضل ہے اور ظاہر ہے کہ امت کی افضلیت اس کے پیغمبر کی افضلیت سے ہوگی۔ (۳) يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ۔ (احزاب: ۳۲) جس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کے ازواج مطہرات جہان بھر کی عورتوں سے افضل ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ انہیں یہ افضلیت حضور علیہ السلام سے ملی۔ لہٰذا حضور علیہ السلام بھی سب سے افضل ہیں۔ (۴) وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ (احزاب: ۴۰) اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام آخری نبی اور آپ کا دین غیر منسوخ ہے اور ظاہر ہے کہ باقی فانی سے

اہانت کے عذاب کا ذکر ہے، اور اہانت کا عذاب کافروں کو ہی ہوگا یعنی وہ اس آگ میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا کہ نہ اسے وہاں موت آئے اور نہ وہاں سے نکالا جائے، خیال رہے کہ جنتی مومنوں کو وہاں کی نعمتیں بھی ملیں گی اور آپس میں بال بچوں اور یار دوستوں کے ساتھ رہنا بسنا بھی، جس سے ان کا لطف اور دوبالا ہو جائے گا، اس لئے مومنوں کے لئے خٰلِدِیْنَ جمع فرمایا گیا اور کافر دوزخ میں یا تو اکیلا ہی رہے گا یا دشمنوں کے ساتھ ہوگا جس سے وہاں کی زندگی اور تلخ ہو جائے گی کہ ہر وقت آپس میں دھول جوتا لعن طعن ہوتا رہے گا، کوئی کسی کا خیر خواہ نہ ہوگا اس لئے یہاں خَالِدًا واحد فرمایا گیا (تفسیر روح المعانی و روح البیان) وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ یہ اس مجرم کی تیسری سزا ہے کہ اسے آگ کی تکلیف کے ساتھ ذلت و رسوائی کی تکلیف بھی دی جائے گی یعنی جسمانی سزا کے ساتھ جنانی اور روحانی سزا بھی ہوگی، لَهٗ کے مقدم کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہانت کا عذاب صرف کافروں کو ہی ہوگا، اگر گنہگار مسلمان دوزخ میں گیا بھی، تو اس کی پردہ پوشی ہوگی، اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے نام لیوا کو رسوا نہ کرے گا،

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! اب تک تم نے جس قدر احکام سنے، یتیموں کی پرورش، وصیتوں کا جاری کرنا، میراث کی صحیح تقسیم وغیرہ سمجھ لو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدیں ہیں، انہیں مت توڑنا، ان کے اندر رہنا، جانور چرواہے کی حد میں رہے تو شکار ہونے سے محفوظ رہے گا، انسان اللہ کی حدود میں رہے تو شیطان کا شکار نہ بنے گا، جو اللہ تعالیٰ کی بھی اطاعت کرے اور اس کے رسول ﷺ کی بھی، کہ قرآن کریم پر بھی عمل کرے اور حدیث شریف پر بھی، تو اللہ تعالیٰ اسے بعدِ قیامت ایسے باغوں میں داخل فرمائے گا جن کے درختوں کے نیچے کوثر و سلسبیل، دودھ و شہد وغیرہ کی نہریں بہتی ہیں، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ لوگ ان نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے کہ نہ مریں نہ وہاں سے نکالے جائیں، نہ ان پر کسی قسم کی پابندی ہو بڑی کامیابی یہی ہے، اسی کے حاصل کرنے کی کوشش کرو، اور اس کے برعکس جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے کہ قرآن شریف پر عمل نہ کرے اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے کہ حدیث شریف پر عمل نہ کرے، اور صرف اسی پر بس نہیں بلکہ وہ اللہ کی قائم کردہ ایمانی و اسلامی حدوں سے بڑھ جائے کہ اللہ رسول کے احکام پر اعتراض کرنے لگے، انہیں غلط سمجھے، ایسے مجرم کو اللہ تعالیٰ بعدِ قیامت دوزخ میں داخل فرمائے گا، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا کہ نہ وہاں سے مر کر نکلے نہ جیتے جی اور اس کے ساتھ اسے ذلت و خواری کا بھی عذاب دیا جائے گا کہ ملائکہ بھی اس پر لعن طعن کریں گے، اور آپس میں دوزخی بھی ایک دوسرے کو برا بھلا کہا کریں گے، لہٰذا تم لوگ میراث صحیح طور پر تقسیم کرو، یتیموں کی پرورش میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، میت کا قرض ادا کرو، اس کی وصیت پوری کرو تا کہ خدا کے عذاب سے بچو، یہ آیت جزاؤں و سزاؤں کی جامع آیت ہے،

فائدے

ان آیات سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** میراث میں حدیث شریف قرآن کریم ہی کی طرح واجب العمل ہے، دیکھو یہاں رب تعالیٰ نے اولاد، ماں باپ، زوجین اور اخیافی بھائی بہن صرف ان چار وارثوں کے بعض حالات بیان فرما

(روح البیان) بلکہ اگر وفات یافتہ پیغمبر بھی اس میں داخل ہوں تو کوئی بعید نہیں کہ ان حضرات نے اپنی قبروں میں حضور علیہ السلام کا کلمہ پڑھا ہو۔ چنانچہ حجۃ الوداع میں بہت سے پیغمبروں نے حج کیا۔ معراج کی رات سارے پیغمبروں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیچھے نماز پڑھی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نماز و حج اسلامی تھے لہٰذا وہ سب حضرات حضور علیہ السلام کے پیروکار ہوئے (۱۸) وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (انفال: ۱۷) (۱۹) اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (الفتح: ۱۰) (۲۰) يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ الخ۔ (الفتح: ۱۰) ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کا فعل رب تعالیٰ کا فعل ہے۔ حضور علیہ السلام سے بیعت رب تعالیٰ سے بیعت۔ حضور علیہ السلام کا ہاتھ رب تعالیٰ کا دستِ قدرت اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے جب حضور علیہ السلام کو رب تعالیٰ سے قرب خاص حاصل ہو۔ (۲۱) عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔ (الاسراء: ۷۹) اس آیت سے معلوم ہوا کہ مقام محمود صرف حضور ﷺ کے لئے ہے۔ جہاں سب اولین و آخرین حضور علیہ السلام کی حمد و ثنا کریں گے۔ (۲۲) وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ (الشرح ۴) لَکَ سے معلوم ہوا کہ یہ بلندی ذکر حضور (ﷺ) سے خاص ہے کہ رب تعالیٰ کے نام کے ساتھ حضور علیہ السلام کا نام عرش و فرش، جنت و طوبیٰ میں آپ کا چرچا ہے۔ بہت اختصار کے ساتھ بائیس آیتیں پیش کی گئیں۔ ورنہ حضور علیہ السلام کی افضلیت مطلقہ بہت آیتوں سے ثابت ہے۔ **تعجب ھے** کہ حضرت مولانا احمد جیون رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو حضور انور ﷺ کی افضلیت کی کوئی صریح آیت نہ ملی جیسا کہ وہ اس جگہ فرماتے ہیں۔

احادیث: حضور علیہ السلام کی افضلیت بے شمار احادیث ہیں جن میں سے چند عرض کی جاتی ہیں۔

(۱) حضور علیہ السلام اولاد آدم کے سردار ہیں۔ قیامت میں اول حضور علیہ السلام کی ہی قبر انور کھلے گی۔ پہلے شفیع حضور ہی ہیں۔ (مسلم و مشکوٰۃ) (باب فضائل سید الانبیاء) (۲) حضور علیہ السلام کی امت تمام امتوں سے زیادہ ہے اور جنت میں سب سے پہلے حضور ہی تشریف لے جائیں گے (مسلم) (۳) حضور علیہ السلام کے لئے غنیمتیں حلال ہوئیں۔ تمام روئے زمین آپ کی مسجد بنائی گئی۔ حضور علیہ السلام ساری خلق کے نبی ہیں۔ حضور خاتم الانبیاء ہیں (مسلم) (۴) فرماتے ہیں (ﷺ) کہ ہمیں خزائن زمین کی کنجیاں عطا فرمائی گئیں۔ (مسلم و بخاری) (۵) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہم اس وقت نبی تھے جب آدم علیہ السلام روح و جسم کے درمیان تھے۔ (ترمذی و مشکوٰۃ) (۶) فرماتے ہیں (ﷺ) کہ میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں گا ہمارے ہاتھ لواء الحمد ہوگا کہ اس جھنڈے کے نیچے آدم و اولاد ہوں گے۔ (ترمذی) (۷) فرماتے ہیں ﷺ کہ ابراہیم خلیل اللہ ہیں۔ موسیٰ کلیم اللہ ہیں۔ عیسیٰ روح اللہ ہیں۔ آدم صفی اللہ ہیں۔ علیہم السلام۔ مگر ہم حبیب اللہ ہیں۔ ہم شفیع المذنبین ہیں۔ ہم ہی جنت کا دروازہ کھلوائیں گے۔ ہم اللہ کے نزدیک سارے اولین و آخرین سے افضل ہیں۔ (ترمذی، دارمی و مشکوٰۃ) اس کی شرح مرقات میں ہے کہ خلیل مرید ہے۔ حبیب مراد خلیل سالک ہے حبیب مجذوب۔ خلیل طالب ہے۔ حبیب مطلوب۔ خلیل وہ جو رب کی رضا چاہے۔ حبیب وہ کہ رب اس کی رضا چاہے۔ خلیل وہ ہے جسے مغفرت کی امید ہو۔ حبیب وہ جس کی مغفرت درجہ یقینی میں ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا وَالَّذِيْۤ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ۔ (شعراء: ۸۲) حبیب کے لئے فرمایا گیا لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ۔ (الفتح: ۲) اس لئے فرمایا گیا کہ

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنتی وہ ہی ہے جو اللہ رسول کی اطاعت کرے، تو جو بچپن میں فوت ہو جائے یا اسے نیک اعمال کا وقت ہی میسر نہ ہو، وہ دوزخی ہونا چاہیے، حالانکہ تم اسے بھی جنتی مانتے ہو۔ **جواب:** جنت ملنے کی بہت صورتیں ہیں جن میں سے ایک صورت کا یہاں ذکر ہے یعنی اپنے اعمال سے جنت ملنا، دوسری چند صورتوں کا ذکر دوسری آیات میں ہے کہ کسی کے طفیل بخشے جانا محض اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے جنت پالینا، اسی واسطے یہاں کوئی لفظ حصر کا ارشاد نہیں ہوا، مگر دوزخ میں جانے کی صرف ایک ہی صورت ہے یعنی ہماری بدعملیاں یا کفر و شرک، **دوسرا اعتراض:** یہاں ارشاد ہوا کہ جو اللہ رسول کی نافرمانی کرے اور اللہ کی حدوں سے بڑھے وہ دوزخی ہے، نافرمانی کرنا اور حد سے بڑھنا تو ایک ہی چیز ہے، اسے علیحدہ کیوں بیان فرمایا؟ **جواب:** اس کے جوابات تفسیر سے معلوم ہو چکے کہ یا تو نافرمانی سے مراد گاہے گاہے گناہ کر لینا ہے، اور حد سے بڑھنے سے مراد گناہ کا عادی بن جانا، یا نافرمانی سے مراد چھوٹے گناہ کرنا ہے اور حد سے بڑھنے سے مراد بڑے گناہ کرنا یا نافرمانی سے مراد جسمانی گناہ ہیں اور حد سے بڑھنے سے مراد دلی و روحانی گناہ یعنی بدعقیدگی، لہٰذا آیت میں تکرار نہیں، **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ گنہگار مسلمان بھی ہمیشہ دوزخ میں رہے گا، دیکھو یہاں گناہ کی سزا میں فرمایا گیا خَالِدًا فِیْهَا (معتزلہ) **جواب:** اس اعتراض کے چند جواب ہیں، ایک یہ ہے کہ یہاں حد سے آگے بڑھنے سے مراد اسلامی حدود سے نکل کر کفر میں داخل ہو جانا ہے دوسرے یہ کہ حُدُوْدُ اللّٰهِ سے مراد ساری حدیں ہیں یعنی جو ساری حدیں توڑ دے، وہ دائمی دوزخی ہے، اور ساری حدیں کافر ہی توڑتا ہے گنہگار مومن عقائد کی حد نہیں توڑتا، تیسرے یہ کہ یہاں خَالِدًا سے مراد بہت زیادہ رہنا ہے نہ کہ ہمیشہ رہنا، اسی لئے اس کے ساتھ اَبَدًا ارشاد نہ ہوا یعنی اس قسم کے گنہگار بہت عرصہ دوزخ میں رہیں گے، **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ گنہگار کو دوزخ میں ضرور جانا پڑے گا کیونکہ مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ کی جزاء یُدْخِلْهُ بیان ہوئی لہٰذا نہ شفاعت کوئی چیز ہے نہ معافی، **نوٹ ضروری:** آریہ اور ہندو شفاعت و بخشش کے انکاری ہیں، آج کل کے بعض ناسمجھ مسلمان ان کی دیکھا دیکھی اس بیماری میں گرفتار ہو گئے اور اس قسم کی آیتیں پیش کر کے اپنا مدعا ثابت کرنا چاہتے ہیں، **جواب:** اس کے چند جواب ہیں، ایک یہ کہ یہ آیت کفار کے لئے ہے جیسا کہ ہم تفسیر میں عرض کر چکے ہیں کہ حد سے بڑھ جانے سے مراد اسلامی حد سے بڑھ کر کافر بن جانا ہے عَذَابٌ مُّهِیْنٌ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ اگر یہاں گنہگار ہی مراد ہیں تو یہ قانون کا ذکر ہے، مغفرت اور شفاعت کی دوسری آیتیں ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا (زمر: ۵۳) اے گنہگار مسلمانو! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا اللہ سارے گناہ بخش دے گا، اور فرماتا ہے فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ (فرقان: ۷۰) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے گناہوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دے گا، **پانچواں اعتراض:** اس آیت میں فرمایا گیا کہ جو اللہ رسول کی اطاعت کرے وہ جنتی ہے اور جو اللہ رسول کی نافرمانی کرے وہ دوزخی، تو جو صرف اللہ یا صرف رسول اللہ کی اطاعت کرے یا ایک کی نافرمانی کرے وہ کہلایا جائے گا؟ **جواب:** یہ صورت ناممکن ہے یہ دونوں

تشریف لے گئے تو حضرت خضر نہ تو موسیٰ علیہ السلام کے امتی بنے نہ آپ کے مطیع بلکہ آپ سے عرض کیا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کرسکیں گے اور پھر آپ نے جتنے کام کیے وہ شریعت موسوی کے خلاف تھے۔ جیسے کشتی توڑنا' بے قصور بچہ کو ہلاک کر دینا وغیرہ۔ اسی لئے موسیٰ علیہ السلام نے اپنی شریعت کے مطابق آپ پر اعتراض کیے تو آپ نے رخصت تو فرما دیا مگر دین موسوی کی پیروی نہ کی۔ مگر اب حضور ﷺ کے پیرو ہیں۔ بیعت رضوان میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کر گئے ہیں۔ (۴) اگر ہر نبی کا اپنے ہم زمانہ نبی پر ایمان لانا واجب ہوتا تو دور لازم آتا۔ اس لئے کہ پھر ابراہیم علیہ السلام تو لوط علیہ السلام کے امتی بنتے اور لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے وغیرہ اور یہ باطل ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ یہ عہد حضور ﷺ کے متعلق لیا گیا ہو کہ حضور مطاع ہیں۔ اور سب مطیع (ﷺ)۔ **دوسرا فائدہ:** حضور ﷺ خاتم النبیین ہیں کیونکہ حضور علیہ السلام سب پیغمبروں کے مصدق ہیں کسی کے مبشر نہیں۔ جیسا کہ **مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ** سے معلوم ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ تصدیق کرنے والا مصدقین کے بعد ہوتا ہے۔ اگر حضور علیہ السلام کے بعد کوئی نیا نبی آنے والا ہوتا تو حضور ﷺ اس کے مصدق نہ ہوتے مبشر ہوتے۔ پھر دیگر انبیاء میں اور حضور علیہ السلام میں کیا فرق ہوتا۔ **تیسرا فائدہ:** ہندوستان اصل میں اسلامستان ہے کہ پہلے پیغمبر یعنی آدم علیہ السلام ہندوستان ہی میں اترے۔ اب بھی حضرت شیث ابن آدم علیہ السلام کا مزار شریف اجودھیا ضلع فیض آباد میں موجود ہے میں نے خود زیارت کی اور تاریخ اجودھیا میں اس قبر کا تاریخی ثبوت بھی دیا گیا ہے۔ نیز علماء و مشائخ اور علم و معرفت کے لحاظ سے یہ ملک دیگر اسلامی ممالک سے پیچھے نہ رہا۔ اسے ہندوستان کہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ جب اسلامی سلاطین غزنوی وغیرہ یہاں آئے تو انہوں نے یہاں ڈکیتی و چوری دیکھی۔ اسلامی ممالک میں اسلامی سزائیں رائج ہونے کی وجہ سے ان جرموں کا نام ونشان نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اسے ہندوستان کہا فارسی میں ہندو چور ڈاکو کو کہتے ہیں۔ اور ستان بمعنی جگہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را
بہ خال ہندواش بخشم سمر قند و بخارا را

چوتھا فائدہ: نبی رسول و مرسل سے عام ہے کہ ہر رسول نبی ہے مگر ہر نبی کا رسول ہونا لازم نہیں جیسا النبیین سے معلوم ہوا۔ رب تعالیٰ نے سارے نبیوں سے عہد لیا جس میں رسول و مرسل بھی داخل ہیں۔ **پانچواں فائدہ:** اہم اقرار میں صرف ہاں یا جی ہاں کافی نہیں بلکہ صاف الفاظ کہنا چاہئیں۔ جیسا کہ **اَقْرَرْنَا** سے معلوم ہوا۔ اسی لئے نکاح کے وقت شوہر سے کہلواتے ہیں۔ میں نے قبول کیا صرف جی ہاں پر کفایت نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہاں اور جی ہاں کے معنی لہجہ وغیرہ بدلنے سے بدل جاتے ہیں کہ بجائے اقرار کے انکار بن جاتا ہے۔ امت کا نبی کے ساتھ روحانی نکاح ہو جاتا ہے۔ یہ نکاح موت سے بھی نہیں ٹوٹتا۔ نکاح کے معنی ہیں ملنا۔ **چھٹا فائدہ:** گواہی پر گواہی درست ہے جیسا کہ **وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ** سے معلوم ہوا رب تعالیٰ کی گواہی ان حضرات کی گواہی تھی۔ **ساتواں فائدہ:** محفل میلاد شریف سنت الٰہیہ ہے۔ دیکھو مجلس میثاق میرے حضور (علیہ السلام) کی محفل میلاد تھی۔ جس میں حق تعالیٰ حضور ﷺ کا میلاد فرمانے والا بزم انبیاء سننے والی تھی۔ نبوت کی شیرینی اس مجلس کا تبرک تھا۔ جو بقدر قابلیت انبیاء کو تقسیم ہوا۔ خیال رہے کہ ذکر ولادت ہی کا نام محفل میلاد ہے۔ خواہ آئندہ کے لحاظ سے ہو یا گذشتہ زمانہ کے اعتبار سے۔ **آٹھواں فائدہ:** کوئی شخص کسی مرتبہ پر پہنچ کر حضور ﷺ سے مستغنی نہیں

ٹھوکریں کھاتے پھروگے ان کے در پر پڑ رہو قافلہ تو اے رضا اول گیا آخر گیا
ان کے در کا جو ہوا خلق خدا اس کی ہوئی ان کے در سے جو پھرا اللہ ہی سے پھر گیا

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا

اور وہ عورتیں جو لائیں بے حیائیاں تمہاری عورتوں میں سے پس گواہ بنالو

اور تمہاری عورتیں جو بدکاری کریں ان پر خاص اپنے میں سے

عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا

ان پر چار مرد اپنے میں سے پس اگر گواہی دیں وہ چاروں

چار مردوں کی گواہی لو پھر اگر وہ گواہی دے دیں

فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰى یَتَوَفّٰهُنَّ

تو قید کر دو ان عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ انہیں

تو ان عورتوں کو اپنے گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں

الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾

موت آلے یا اللہ ان کے لئے کوئی راستہ نکالے

موت اٹھالے یا اللہ ان کی کچھ راہ نکالے

تعلقات

اس آیت کا گذشتہ آیات سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، انہیں صحیح طور پر ان کی میراث کا حصہ دینے کا ذکر تھا، اب انہیں صحیح تربیت و تعلیم دینے کا حکم دیا جارہا ہے، گویا مالی احسانات کا ذکر پہلے ہو چکا، اعمالی احسان کا ذکر اب ہو رہا ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں عورتوں بچوں کو نفع پہنچانے کا حکم دیا گیا تھا، اب انہیں نقصان دہ چیزوں سے بچانے کا حکم دیا جارہا ہے، کیونکہ پوری تربیت ان دو کاموں سے ہی ہوتی ہے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت کے آخر میں فرمایا گیا تھا کہ اللہ رسول کی نافرمانی کرنے والوں کے لئے اہانت کا عذاب ہے، اب اس عذاب کی ایک جھلک یہاں دکھائی جارہی ہے، کہ زانیہ عورتوں کے لئے دنیا میں قید و بند بھی ہے، بہر حال یہ آیت پچھلی آیتوں سے بے تعلق نہیں، **چوتھا تعلق:** اسلام نے عورت کو ذلت و خواری سے نکالا، اس نکالنے کی دو صورتیں کیں، ان کے حقوق کی حفاظت، ان کی عصمت کی حفاظت، کہ بدکار عورت جانوروں سے زیادہ ذلیل ہے، پچھلی آیت میں حفاظت حقوق فرمائی تھی، اب اس آیت میں ان کی عصمت و عفت کی حفاظت فرمائی جارہی ہے، **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت میں

لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُکَ (الزمر:٦٥) نیز اس میں امتوں کو دکھایا گیا کہ جب مقربین سے یہ خطاب ہے تو تم کس شمار میں ہو اگر تم نے اسلام سے منہ پھیرا تو اپنا انجام سمجھ لو۔ **پانچواں اعتراض:** اس کی کیا وجہ ہے کہ جتنا اہتمام عہد نبوت کا کیا گیا اتنا ربوبیت کے عہد کا نہ کیا گیا۔ وہاں صرف بلٰی پر کفایت ہے۔ یہاں اقررنا کہلوایا۔ اس پر گواہی قائم فرمائی۔ اپنی گواہی شامل کی اور اس کی مخالفت پر سزا تجویز کی۔ کیا حضور کا درجہ اللہ سے بڑا ہے؟ **جواب:** رب تعالیٰ کو معلوم تھا کہ توحید ماننے والے بہت ہوں گے مگر رسالت ماننے والے تھوڑے۔ اور پھر رسالت کے ماننے والوں میں بھی کوئی بغیر سوچے سمجھے ان کی بشریت کی رٹ لگائے گا کوئی ان کی توہین کرے گا۔ اس لئے اتنا اہتمام فرمایا گیا تاکہ معلوم ہو کہ عقیدہ توحید بغیر رسالت معتبر نہیں۔ توحید سکہ ہے اور رسالت اس کی مہر۔ بازار قیامت میں شیطانی توحید کی کوئی قیمت نہیں۔ نیز ایمان کا مدار توحید پر نہیں بلکہ نبوت پر ہے۔ اگر توحید سے ایمان مل جاتا تو شیطان اور سارے کفار مومن ہوتے۔ نیز دین بدلتا ہے نبوت بدلنے سے تمام آسمانی دینوں میں عقیدہ توحید یکساں رہا مگر نبوت کے عقیدے بدلتے رہتے ہیں۔ دین بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا توحید سے اقرار نبوت کا اقرار بہت ہی اہم ہے۔ اس لئے یہاں اتنے اہتمام سے اقرار نبوت کرایا۔ **چھٹا اعتراض:** اگر اس آیت میں انبیاء سے خطاب ہے تو لَمَآ اٰتَیۡتُکُمۡ مِّنۡ کِتٰبٍ۔ کیسے صحیح ہوا۔ سب پیغمبروں کو کتاب نہیں ملی؟ **جواب:** یہاں کتاب سے لغوی کتاب مراد ہے جس میں صحیفے بھی داخل ہیں اور کتاب ملنے سے بلاواسطہ اور بالواسطہ ہر طرح ملنا مراد ہے اور واقعی اس معنی سے ہر نبی کو کتاب وصحیفہ ملا۔ کسی کو بلاواسطہ اور کسی کو بالواسطہ۔ نیز انبیاء میں اہل کتاب نبی افضل ہیں اور ان کے وزراء ان کے تابع افضل کا ذکر فرما کر تابعین کو اس میں داخل فرمالیا گیا۔ (کبیر) **ساتواں اعتراض:** اگر اس آیت میں پیغمبروں سے خطاب ہے تو ثُمَّ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ۔ کے کیا معنی پیغمبر امت کی طرف آتے ہیں نہ کہ نبیوں کی طرف؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ جَآءَکُمۡ سے مراد جَآءَ فِیۡ زَمَانِکُمۡ ہے۔ یعنی آخری رسول تمہارے زمانہ میں آئیں گے (کبیر) دوسرا یہ کہ اگر حضور ﷺ انبیائے کرام کے زمانہ میں تشریف لاتے تو وہ انبیاء حضور علیہ السلام کے امتی ہوتے۔ لہٰذا آپ کا آنا امت ہی میں ہوتا۔ **آٹھواں اعتراض:** یہاں فرمایا گیا مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمۡ۔ یعنی وہ آخری پیغمبر تمہاری کتابوں کی تصدیق کرنے والے ہیں حالانکہ حضور علیہ السلام تو ان کے ناسخ ہیں نہ کہ مصدق؟ **جواب:** اس کے جوابات بارہا دیئے جاچکے کہ نسخ تصدیق کے خلاف نہیں۔ حضور علیہ السلام نے سب کتابوں کو سچا کہا۔ ہاں ان کے احکام باقی نہ رکھے کہ وہ اس وقت تک کے لئے تھے۔ اس کی مکمل تحقیق اس تفسیر کے پہلے پارہ نسخ کی بحث میں دیکھو یا یہ مطلب ہے کہ ان کتابوں نے حضور علیہ السلام کی پیشینگوئی کی۔ حضور علیہ السلام نے دنیا میں جلوہ گری فرما کر ان سب کو سچا کر دیا۔ اگر آپ نہ آتے تو وہ کیسے سچی ہوتیں۔ جنتریاں چاند کی خبر دیتی ہیں کہ فلاں تاریخ کو ہوگا۔ چاند چمک کر سب کو سچا کر دیتا ہے۔ پچھلی کتابیں اس ماہ نبوت کی خدائی جنتریاں تھیں جو اس کے چمکنے سے سچی ہوگئیں۔ ﷺ **نواں اعتراض:** جب وہ عہد و میثاق ہمیں یاد ہی نہ رہا تو اس سے فائدہ کیا ہوا بے کار رہا۔ **جواب:** بے کار جب رہتا ہے جب یاد دلایا بھی نہ جاتا۔ انبیائے کرام اور آسمانی کتابوں سے یاد دلا دیا' کافی ہوگیا۔ سرکاری محکموں میں معاہدوں کی تحریر رجسٹری اس لئے کی جاتی ہے کہ بھول جانے پر ان کے ذریعے یاد آجائے۔ ہمیں والدہ کے شکم میں رہنا' اس کا دودھ پینا' اس کے پاس پلنا' بڑھنا کچھ بھی

کے لئے آتا ہے اور علیٰ نقصان کے لئے، کسی کے حق میں گواہ بنانا اِستِشہَادلَہٗ ہے، اور اس کے خلاف گواہ بنانا استشہاد علیہ ہے، چونکہ یہاں ان عورتوں کے خلاف گواہ بنانا مراد ہے اس لئے عَلَیۡہِنَّ فرمایا گیا، اَرۡبَعَۃً یعنی چار فرمانے سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کریمہ میں فاحشہ سے مراد زنا ہے نہ کہ مساحقت اور نہ دوسری آوارگی، کیونکہ چار گواہ زنا ہی کے ہوتے ہیں باقی تمام جرموں کے گواہ دو اس کی تفسیر وہ آیت ہے لَوۡلَا جَآءُوۡ عَلَیۡہِ بِاَرۡبَعَۃِ شُہَدَآءَ (النور: ۱۳) مِنۡکُمۡ فرما کر بتایا گیا کہ یہ گواہ سارے کے سارے مرد ہوں، ان میں کوئی عورت نہ ہو، مسلمان ہوں، کوئی کافر نہ ہو، متقی پرہیزگار ہوں کوئی فاسق و فاجر نہ ہو، کہ زنا کے گواہوں میں یہ تمام شرائط ہونی چاہئیں، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فاحشہ سے مراد زنا ہی ہے، غرضکہ نِسَآئِکُمۡ اور اَرۡبَعَۃً نیز مِنۡکُمۡ یہ تینوں کلمے پکار رہے ہیں کہ یہاں فاحشہ سے مراد زنا ہے فَاِنۡ شَہِدُوۡا فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ فِی الۡبُیُوۡتِ، شَہِدُوۡا سے مراد ادائے گواہی ہے، ظاہر یہ ہے کہ حاکم کے سامنے گواہی دینا مقصود ہے، اس گواہی میں ساری وہ قیدیں معتبر ہیں جو زنا کی گواہی میں ہوتی ہیں کہ فقط سنی سنائی گواہی نہ دیں، بلکہ آنکھوں دیکھی گواہی دیں، اور آنکھوں سے بھی خاص فعل گناہ دیکھا گیا ہو نہ کہ مقدمات گناہ فَاَمۡسِکُوۡ میں خطاب یا ان کے خاوندوں سے ہے یا عام مسلمانوں سے یا حکام سے، پہلی صورت میں گھر سے مراد خاوندوں کا گھر ہوگا، دوسری صورت میں میکہ کا گھر بھی مراد ہو سکتا ہے، اور تیسری صورت میں جیل خانہ کی کوٹھڑی بھی مراد ہو سکتی ہے یعنی اگر وہ چار گواہ ان عورتوں کے فعل زنا کی گواہ دے دیں، تو اے خاوندو! تم انہیں اپنے گھروں میں جہاں ان کا رہنا سہنا ہے یا اے مسلمانو! ان کے میکے کے گھروں میں یا انہیں جیل کی کوٹھڑیوں میں بند کر دو کہ نہ وہ کسی سے مل سکیں، نہ ان سے کوئی مل سکے، خیال رہے کہ اس وقت یہ قید ہی سزائے زنا تھی جو بعد میں منسوخ ہوگئی، حَتّٰی یَتَوَفّٰہُنَّ الۡمَوۡتُ، حَتّٰی انتہاء کا ہے اور یہ جملہ قید کی انتہاء، تَوَفّٰی سے مراد ہے موت دینا اور موت سے مراد ہے موت کے فرشتے یعنی مضاف پوشیدہ ہے یا تَوَفّٰی سے مراد ہے پورا پورا لے لینا، اٹھا لینا، اور موت سے مراد ہے یہی موت، لہٰذا فعل و فاعل علیحدہ علیحدہ ہیں یعنی انہیں دو چار مہینہ کی قید مت دو بلکہ عمر قید دو کہ وہ مر کر ہی وہاں سے نکلیں، اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا یہ جملہ یَتَوَفّٰی پر معطوف ہے اور سبیل سے مراد زنا کی قانونی سزا ہے جو حدیث پاک میں بھی مذکور ہے اور قرآن کریم میں سورۂ نور میں بھی، چونکہ حضور انور ﷺ کے فرمانِ عالیہ رب تعالیٰ ہی کے فرمان ہیں، اس لئے ان کے متعلق بھی یَجۡعَلَ اللّٰہُ فرمانا صحیح ہے، یعنی انہیں یہاں تک قید رکھو کہ یا تو انہیں موت ہی آجائے یا سزائے زنا کا قانون بدل جائے، اس میں اشارۃً بتایا گیا کہ یہ حکم عارضی ہے جو منسوخ ہو جائے گا، مسلم شریف میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے زنا کی سزا بیان فرمائی تو فرمایا خُذُوۡا عَنِّیۡ خُذُوۡا عَنِّیۡ قَدۡ جَعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا مجھ سے لے لو، مجھ سے لے لو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے راستہ نکال دیا کہ کنوارے کے لئے زنا کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کے لئے دیس نکالا ہے، خیال رہے کہ حضرت امام شافعی کے ہاں ایسے زانی و زانیہ دونوں کو ایک سال کا دیس نکالا بھی دیا جائے گا، امام مالک کے ہاں صرف مرد کو عورت کو نہیں (تفسیر صاوی) ہمارے امام صاحب کے ہاں ان کی حد صرف سو کوڑے ہیں، دیس نکالا بطور تعزیر ہے، اگر قاضی مناسب سمجھے تو دے، ورنہ نہیں،

کوئی اس عہد الٰہی کا جو نبیوں سے لیا گیا جان بوجھ کر انکار کرے گا۔ وہ رب تعالیٰ کے دین سے خارج ہے۔ جو حقیقی دین ہیں۔ باقی ادیان وہمی اور اعتباری ہیں۔ (ابن عربی)

دوسری تفسیر

سارے پیغمبر حضور علیہ السلام کے نائب ہیں اور ازل میں حضور علیہ السلام سب کی اصل۔ نائب کے لئے ضروری ہے کہ اپنی اصل کو پہچانے کہ اس کے پردے میں رہنے کے وقت اس کی نیابت میں حکومت کرے اور اس کی موجودگی میں اپنے کو گم کر دے۔ سارے پیغمبر ظل ہیں۔ حضور علیہ السلام اصل۔ سارے پیغمبر تیمم ہیں حضور علیہ السلام وضو۔ سارے پیغمبر دریا ہیں حضور علیہ السلام سمندر سارے پیغمبر چاند تارے ہیں حضور علیہ السلام سورج۔ سارے پیغمبر فیض لینے والے ہیں حضور ﷺ دینے والے۔ جہاں سمندر کا ظہور نہ ہو وہاں دریاؤں کی بادشاہت ہے۔ جب آفتاب درون پردہ ہوتا ہے تو چاند تاروں کی سلطنت ہے۔ جب وضو ناممکن ہو تو تیمم کی حکومت ہے مگر سمندر پر پہنچ کر دریا گم' سورج کے نکلتے ہی تارے غائب۔ پانی کے آتے ہی تیمم برخاست۔ فرمایا گیا تھا کہ اے گروہ انبیاء تم اپنے کو بھی پہچانو اور اپنے اس سیّد کو بھی ہم سے عہد کرو کہ اگر تم ان کا زمانہ پاؤ تو ان کے دامنِ نور میں تاروں کی طرح چھپ جانا اور اپنے کو ان میں ایسا گم کر دینا جیسے دریا سمندر میں پہنچ کر۔ اعلیٰ حضرت نے کیا خوب فرمایا ۔

آب آمد وہ کہے اور میں تیمم برخاست　　　مشتِ خاک اپنی ہو اور نور کا اہلا تیرا

بولو تم اس کا اقرار کرتے ہو۔ اگر اقرار کرو گے تو نبوت کا تاج' نیابت کا تخت جوڑا' ولایت سب کچھ تمہارے لئے ہے اور اگر اس سے منہ پھیرا تو نبوت و ولایت اور عنایت کا ذکر ہی کیا۔ کسی کو اسلام بھی نصیب نہیں ہو سکتا بلکہ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ.

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں　　　یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

ریاضت نام ہے تیری گلی میں آنے جانے کا　　　تصور میں تیرے رہنا عبادت اس کو کہتے ہیں

تجھ ہی کو دیکھنا تیری ہی سننا تجھ میں گم ہونا　　　حقیقت معرفت اہل طریقت اس کو کہتے ہیں

صوفیاء فرماتے ہیں کہ پچھلے پیغمبر دنیا میں آئے بھی اور چلے بھی گئے مگر حضور نبی کریم ﷺ آئے تو لیکن گئے نہیں۔ وہ آئے اور یہاں ہی رہے کہ ان کا دین تا قیامت بلکہ بعد قیامت بھی باقی ہے۔ اسی لئے ثُمَّ جَآءَکُمْ فرما کر ان کے آنے کا ذکر فرمایا مگر یہ نہ کہا کہ جب وہ چلے جائیں تو تم پر ان کی اطاعت لازم نہیں۔ زمانہ نبی اور ہے زمانہ نبوت کچھ اور پھر دوسرے انبیاء کرام زمین میں آئے مگر حضور ﷺ دلوں' جانوں' ایمانوں میں بھی آئے۔ اس لئے جَآءَکُمْ فرمایا جَآءَ فِیْ زَمَانِکُمْ یا جَآءَ فِیْ اَرْضِکُمْ نہ فرمایا۔ قرآن کریم میں حضور ﷺ کی آمد پر رسول نبی' نور برہان فرمایا گیا۔ مگر معراج میں بلانے پر عبد فرمایا کیونکہ حضور دنیا میں شانِ رسالت سے آئے اور رب کے پاس شان عبدیت سے گئے۔ حاکم دفتر میں ڈی سی بن کر آتا ہے مگر اپنے گھر میں بیٹا باپ بھائی بن کر جاتا ہے۔ دنیا میں حضور ﷺ کا دفتر ہے وہ جگہ حضور ﷺ کا گھر ہے۔

تفسیر روح المعانی نے فرمایا کہ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ حضور نبی مطلق رسول حقیقی اور مستقل صاحب شریعت ہیں باقی انبیاء حضور علیہ السلام کے تابع' یہ اقرار نامہ انبیائے کرام کی نبوت کی تمہید تھا۔ جس پر سارے انعام موقوف تھے۔ اللہ تعالیٰ ہم

سحق، اس جرم کی سزا اب بھی یہی ہے اور یہ آیت منسوخ نہیں، اسی لئے یہاں یَأْتِیْنَ جمع مونث کا صیغہ ارشاد ہوا، ورنہ زنا صرف عورتیں نہیں کر سکتیں بلکہ عورت و مرد کرتے ہیں، **جواب:** یہ تفسیر باطل ہے اس لئے کہ ابو مسلم اصفہانی سے پہلے امت رسول اللہ ﷺ میں کسی نے اس آیت کے یہ معنی نہیں کئے، لہٰذا یہ قول خرق اجماع ہے، اس سے اجماع ٹوٹے گا نہیں (تفسیر کبیر) نیز ہم ابھی تفسیر میں عرض کر چکے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے زنا کی سزا بیان فرماتے ہوئے فرمایا کہ لو اللہ تعالیٰ نے ان زانیہ عورتوں کا یہ راستہ نکال دیا، معلوم ہوا کہ اس آیت میں زانیہ عورتیں ہی مراد ہیں اور یہاں سبیل سے مراد سزائے زنا کا قانون بننا ہے، نیز عام مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے، ہاں اس میں اختلاف ہے کہ کس سے منسوخ ہے، بعض فرماتے ہیں سورۂ نور کی آیت سے، اور بعض فرماتے ہیں حدیث مذکورہ سے (تفسیر خازن) نیز سحق کرنے والی عورت کو گھر میں قید کرنا بیکار ہے کہ وہ گھر میں رہ کر بھی دوسری عورتوں کے ساتھ یہ جرم کر سکتی ہے، گھر میں قید کرنا زانیہ کے لئے مفید ہے کہ نہ باہر نکلے، نہ کسی مرد سے ملے، نہ زنا واقع ہو، **دوسرا اعتراض:** یہاں فاحشہ سے مراد بے حیائیاں اور زنا کی تیاریاں ہیں اور سبیل سے مراد توبہ کی توفیق ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو عورتیں بے حیا ہو جائیں اور جن سے اندیشہ پیدا ہو جائے کہ یہ زنا کر لیں گی، تو انہیں باہر نکلنے سے روک دو، حتی کہ وہ پردہ میں مر جائیں یا رب تعالیٰ انہیں توبہ کی توفیق دے دے، **نوٹ:** یہ تفسیر مولوی محمد علی صاحب لاہوری قادیانی نے اپنی کتاب بیان القرآن میں کی، **جواب:** یہ آیت کی تفسیر نہیں بلکہ تحریف ہے، کیونکہ اس قسم کی بے حیائیوں پر چار گواہ بنانے کی کیا ضرورت ہے ایسی شرارتیں تو اگر اشارۃً بھی معلوم ہو جائیں جب بھی ان کی روک تھام کرنی چاہیے، اب تو آیت کے معنی یہ ہو گئے کہ وہ کچھ بھی کرتی پھریں، غیر مردوں سے ناجائز تعلقات، اشارہ بازیاں، آوارہ پھرنا، تم ان کا کوئی انتظام نہ کرو، چار گواہوں کا انتظار کرو، ان کے ناجائز خطوط بھی پکڑ لو تو بھی ان سے کچھ نہ کہو، کیونکہ ابھی چار گواہ تو ملے نہیں، نیز اگر سبیل سے مراد توبہ ہے تو عورتوں کو بالکل آزادی ہے، جب ان کی بے حیائیوں پر چار گواہ ملے اور تم نے انہیں پکڑا، انہوں نے کہہ دیا ہم توبہ کرتے ہیں چلو چھٹی ہوئی، اب پھر نئے جرم کے لئے چار گواہوں کا انتظار کرو، جب وہ مل جائیں اور یہ پھر توبہ کر لیں، چھوٹ جائیں، غرضکہ یہ آیت ایک تماشا بن کر رہ گئی، پکڑے جاؤ چھوڑے جاؤ، اگر توبہ سے دلی توبہ مراد ہے تو بھی ایک کھیل ہی رہے گا کیونکہ دل کے حال کی خبر رب تعالیٰ کو ہے، یہ عورتیں کہیں گی ہم دل سے توبہ کر رہے ہیں، ہم کہیں گے جھوٹ بولتی ہو، صرف زبانی توبہ ہے چلو اندر، اللہ تعالیٰ اپنے کلام کی صحیح سمجھ عطا فرمائے، **تیسرا اعتراض:** جب یہ آیت تمہاری پیش کردہ حدیث سے منسوخ ہے تو اس حدیث میں سو کوڑوں کا بھی ذکر ہے اور ایک سال کے دیس نکالے کا بھی، پھر امام ابوحنیفہ دیس نکالے کا کیوں انکار کرتے ہیں (شافعی حضرات) **جواب:** اس کی تحقیق انشاء اللہ سورۂ نور کی تفسیر میں کی جائے گی، یہاں اتنا سمجھ لو کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے دیس نکالے کا مطلقاً انکار نہیں کیا ہے بلکہ اسے تعزیر مانا ہے، اگر حاکم مناسب سمجھے تو عمل کرے اس لئے کہ قرآن کریم نے کنوارے زانی کی سزا صرف سو کوڑے مقرر فرمائے اور اسی کو ان کی پوری سزا قرار دیا، اب حدیث پر ایسے عمل کرو کہ قرآن شریف کی پوری سزا آدھی نہ بن جائے کہ سو کوڑے حد مان لو اور دیس نکالا تعزیر، نیز طحاوی شریف میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک

ہے اور کوئی مجبوراً۔ زندگی یا موت کے وقت انہیں مانے گا۔ غرضکہ انتہا ابتدا کے موافق ہے۔ اگرچہ درمیان میں کچھ فرق ہو۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ حضور علیہ السلام تمام کے مصدق بہ ہیں۔ اب قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ میں اس تصدیق کا اظہار ہے کہ حضور علیہ السلام سے سارے پیغمبروں کی حقانیت کا اعلان کرایا گیا۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ ہم نے حضرات انبیاء کرام سے فرمایا تھا کہ جو کوئی نبی آخر الزمان ﷺ کی اطاعت سے منہ موڑے گا وہ فاسق ہوگا۔ اب اس کی وجہ بیان ہو رہی ہے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی اتباع عین دین ہے۔ اور دین سے نکل جانے والا فاسق ہی ہوتا ہے۔ گویا حکم پہلے بیان ہوا۔ وجہ حکم اب بیان ہو رہی ہے۔

شانِ نزول

ایک دفعہ اہل کتاب کے دو گروہ آپس میں جھگڑتے ہوئے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے فیصلہ چاہا۔ ہر ایک کا دعویٰ یہ تھا کہ ہمارا دین' دین ابراہیمی سے قریب تر ہے۔ حضور علیہ السلام نے فیصلہ فرمایا کہ تم دونوں (یہود و عیسائی) دین ابراہیمی سے دور ہو۔ اس سے تمہیں کوئی تعلق نہیں کیونکہ تمہارے عقائد و اعمال ان کے عقائد و اعمال سے بالکل مخالف ہیں جس پر وہ بولے کہ نہ ہم آپ کے فیصلے سے راضی ہیں اور نہ ہم آپ کا دین اختیار کریں گے۔ تب یہ آیت کریمہ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ الخ اتری۔ (کبیر و خازن و معانی)

تفسیر

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ۔ ہمزہ استفہام انکاری کا ہے اور ف عاطفہ یا تو یہ جملہ پچھلی شرط و جزا **فَمَنْ تَوَلّٰى الخ** پر معطوف ہے اور انشاء کا عطف خبر پر جائز یا پوشیدہ عبارت پر معطوف ہے۔ اصل عبارت یوں تھی **اَيَتَوَلَّوْنَ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ** (معانی) **غَيْرَ يَبْغُوْنَ** کا مفعول ہے۔ اس کے مقدم ہونے سے حصر کا فائدہ حاصل ہوا۔ **يَبْغُوْنَ بغيٌ** سے بنا بمعنی تلاش کرنا اور میانہ روی سے تجاوز چاہنا۔ دین اللہ سے اسلام مراد ہے جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہو چکا۔ اگرچہ سارے پیغمبروں کے دین اپنے وقت میں دین اللہ تھے۔ مگر چونکہ اب وہ سب منسوخ ہو چکے تھے۔ اس لئے اب صرف اسلام ہی دین اللہ ہے یا دین اللہ سے اللہ کا اصل دین مراد ہے کیونکہ پچھلے ادیان اللہ کے دین تھے مگر عارضی قابل نسخ اور ضروریات وقت کے لحاظ سے اور اسلام حقیقی باقی دائمی دین ہے۔ خیال رہے کہ دین اللہ میں اضافت لام کی ہے یعنی اللہ کا پسندیدہ دین۔ چونکہ اسلام میں میانہ روی ہے اور باقی ادیان میں افراط و تفریط۔ اس لئے یہاں **يَبْغُوْنَ** فرمایا گیا نہ کہ یطلبون۔ غیر و **يَبْغُوْنَ** کا فاعل سارے اہل کتاب ہیں۔ یعنی کیا یہ یہود و عیسائی اللہ کا پسندیدہ دین اسلام چھوڑ کر اور دینوں ہی کو تلاش کرتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ خود حضور انور ﷺ دین اللہ ہیں کہ آپ کا ماننا عین دین ہے۔ اس میں توحید و رسالت حشر و نشر سب کا ماننا آ جاتا ہے۔ حضور ﷺ کے جسم کے حالات شریعت ہیں۔ دل مبارک کے حالات طریقت' روح پاک کے حالات حقیقت' سر شریف کے حالات معرفت انہی چار چیزوں یعنی شریعت' طریقت' حقیقت' معرفت کا نام دین ہے اور حضور ﷺ دین اللہ۔ **وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔** واؤ حالیہ ہے اور یہ جملہ گذشتہ انکار کا حال مؤکدہ **لَهٗ اَسْلَمَ** کا متعلق ہے۔ اس کے مقدم ہونے سے حصر کا فائدہ حاصل ہوا یعنی تمام جمع حق تعالیٰ ہی کے ... اَسْلَمَ اسلام سے بنا بمعنی استسلام و اطاعت فرمانبرداری۔

فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ⑯

تو منہ پھیروان سے بے شک اللہ ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان

کا پیچھا چھوڑ دو بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے

تعلقات

چونکہ اس آیت کی تفسیریں مختلف ہیں، اس لئے اس کے تعلق بھی پچھلی آیتوں سے مختلف ہیں، ہم مختلف تفاسیر کے لحاظ سے اس کے تعلقات عرض کرتے ہیں، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں شادی شدہ زانیہ عورتوں کی سزا کا ذکر تھا اس آیت کریمہ میں کنوارے وکنواری کے زنا کی سزا کا ذکر ہے اسی لئے وہاں ارشاد ہوا تھا مِنْ نِّسَآئِكُمْ مگر یہاں یہ عبارت نہیں، معلوم ہوا کہ وہ زانیہ عورتیں کسی کی بیویاں تھیں یہ ایسی نہیں، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں زانیہ عورتوں کی ہلکی سزا کا ذکر تھا یعنی انہیں گھروں سے باہر نہ نکلنے دینا، اس آیت میں کچھ سخت سزا کا ذکر ہے یعنی انہیں مار پیٹ وغیرہ بھی کرنا، زنا کی سزا کے احکام تدریجاً آہستہ آہستہ آئے، کیونکہ عرب کے عوام زنا کے بہت عادی تھے، اور عادت آہستہ آہستہ ہی چھوٹتی ہے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں زنا کی سزا کا ذکر تھا، اب اغلام کی سزا کا ذکر ہے، اسی لئے یہاں اَلَّذٰنِ مذکر ارشاد ہوا کہ یہاں وہ بدکاری مراد ہے جو صرف مرد کریں، چونکہ اغلام ولواطت بھی زنا ہی کی شاخ ہے، اس لئے زنا کے ساتھ اس کا ذکر بھی کیا گیا، **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت کریمہ میں عورتوں کی آپس کی بدکاری کا ذکر تھا، یعنی سحق کی سزا بیان کی گئی تھی، اب مردوں کی آپس کی بدکاری یعنی لواطت کا ذکر ہے، اس لئے وہاں اَلّٰتِیْ اور یَاْتِیْنَ فرمایا گیا تھا یعنی جمع مؤنث کا صیغہ، اور یہاں اَلَّذٰنِ تثنیہ مذکر ارشاد ہوا، معلوم ہوا کہ وہ بدکاری صرف عورتوں کی تھی، اور یہ بدکاری صرف مردوں کی ہے،

تفسیر

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ چونکہ اس آیت کی بہت تفسیریں ہیں، اس لئے اَلَّذٰنِ کے متعلق بہت قول ہیں مگر ترجیح دو قولوں کو ہے، ایک یہ کہ اَلَّذٰنِ سے مراد مرد وعورت ہیں جو کنوارے ہوں مگر زنا کر بیٹھیں، چونکہ مرد عورت سے اعلیٰ ہے، نیز مرد فاعل ہے عورت مفعول، اس لئے تغلیباً اسے تثنیہ مذکر لایا گیا، خیال رہے کہ پچھلی آیت میں یَاْتِیْنَ جمع مؤنث لانا اس بنا پر تھا کہ اکثر زنا کا دارومدار عورت کی رضا پر ہوتا ہے، اس لئے گویا اصلی مجرم وہ ہی ہے اور یہاں اَلَّذٰنِ تثنیہ مذکر لانا اس وجہ سے ہے کہ فاعلِ زنا مرد ہی ہے، اور اکثر بدکار مرد ہی عورت کو بدکار بناتے ہیں، وہاں یَاْتِیْنَ مؤنث میں اور ہی لطف ہے اور یہاں اَلَّذٰنِ مذکر میں کچھ اور ہی بہار ہے، یہ لطف اہلِ ذوق ہی پاتے ہیں، دوسرے یہ کہ یہاں اَلَّذٰنِ سے مراد وہ دو مرد ہیں جو آپس میں اغلام کرلیں، اس صورت میں اَلَّذٰنِ کو مذکر فرمانا بالکل ظاہر ہے، مگر پہلی تفسیر بہت ظاہر ہے، اس پر اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کا ترجمہ ہے، اس لئے یہاں گواہی کا ذکر نہ فرمایا کہ یہاں گواہی وہ ہی ہے جو پہلے ذکر ہوئی یعنی چار مردوں کی گواہی جو مسلمان آزاد عاقل بالغ وغیرہ ہوں، ورنہ اغلام دو گواہوں سے بھی ثابت ہو جاتا ہے یَاْتِیٰنِ فرمایا نہ کہ یَغْفِلَانِ اس کی حکمت پچھلی

ساری چیزیں اللہ کے لئے اسلام لائے اور سب مومن ہو گئے مگر بعض خوشی سے اور بعض مجبوراً۔ خوشی والا اسلام فائدہ مند ہے اور ناخوشی والا بے فائدہ۔ غرضکہ اسلام عالمگیر مذہب ہے۔ وَاِلَیۡهِ یُرۡجَعُوۡنَ۔ واؤ عاطفہ ہے اور یہ جملہ لَهٗۤ اَسۡلَمَ پر معطوف الیہ کے مقدم ہونے سے حصر کا فائدہ ہوا۔ یُرۡجَعُوۡنَ کا نائب فاعل یا اہل کتاب ہیں یا سارے انسان یا آسمان وزمین کی ساری چیزیں اور یہ ہی ظاہر ہے۔ لہٰذا اس کا مرجع مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ ہے۔ یعنی سب رب تعالیٰ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے۔ خیال رہے کہ یہاں رب کی طرف لوٹنے سے یا تو اس کے دین کی طرف لوٹنا مراد ہے یا اس کی سزا وجزا کی طرف ورنہ رب تعالیٰ جگہ سے پاک ہے اور اٰمنا جمع فرما کر یہ بتایا گیا کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ اکیلے نہیں بلکہ جماعت مومنین کے ساتھ ہیں۔ وہ ہی عقیدے ہم نے اختیار کئے ہیں۔ جو تمام امت کے ہیں ایمان وہ دھاگہ ہے جو گھاس کے پھولوں کے ساتھ باندھ دیتا ہے۔ قُلۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡنَا۔ ظاہر یہ ہے کہ قُلۡ میں حضور علیہ السلام سے خطاب ہے۔ اور اٰمَنَّا اور عَلَیۡنَا کی ضمیریں بھی حضور ہی کے لئے ہیں۔ تعظیم کے لئے جمع فرمایا گیا۔ (معانی) اور ممکن ہے کہ قل میں ہر قرآن پڑھنے والے سے خطاب ہو۔ پچھلی آیت میں گذشتہ آسمانی دینوں کو غیر دین اللہ فرمایا گیا تھا جس سے شبہ ہوتا تھا کہ گذشتہ دینوں کی طرح گذشتہ نبیوں کو ماننا بھی ممنوع ہوگا۔ نیز پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ یہود ونصاریٰ اس لئے حضور کو نہیں مانتے کہ آپ بنی اسرائیل سے نہیں ان کی تردید کے لئے ارشاد ہوا۔ بعض نے یہ بھی فرمایا کہ قل میں خطاب حضور علیہ السلام سے ہے لیکن اٰمنا سے سارے مسلمان مراد گویا حضور علیہ السلام سے فرمایا گیا کہ آپ اپنی طرف سے اصالتاً اور اپنی امت کی طرف سے وکالتاً فرما دیں کہ ہم سب ایمان لائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قُلۡ میں چار احتمال ہیں ایک یہ کہ حضور ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ یہود ونصاریٰ سے ان کے جواب میں فرما دیں کہ تم بنی اسمٰعیل کے نبی پر ایمان نہیں لائے مگر ہم بنی اسرائیل کے انبیاء پر ایمان لاتے ہیں۔ تم نسبت پرست ہو۔ ہم خدا پرست ہیں۔ دوسرے یہ کہ اے محبوب آپ تا قیامت مسلمانوں سے فرما دیں تاکہ انہیں مومن بننا آ جائے۔ تیسرا یہ کہ اے قرآن پڑھنے والے تجدید ایمان کرتے ہوئے یہ کہا کرتا کہ تیرے دل کی صفائی ہوتی رہے۔ گھر میں جھاڑو لگتی رہے تو اچھا۔ چوتھے یہ کہ اے مسلمان لوگوں سے یہ کہا کرتا کہ تیرے ایمان کا اعلان ہوتا رہے۔ چونکہ اللہ کا ماننا سب سے مقدم تھا۔ اس لئے پہلے اس کو بیان کیا۔ اور مَاۤ اُنۡزِلَ میں مَا سے مراد یا قرآن شریف ہے یا سارے وحی الہام۔ اگر عَلَیۡنَا سے حضور ﷺ مراد ہیں تب تو معنی بالکل ظاہر ہیں اور اگر امت مراد ہے تو چونکہ نبی پر کلام کا آنا امت پر آنا ہے۔ اس لئے عَلَیۡنَا فرما دیا گیا۔ چونکہ قرآن پاک نے ہی سارے پیغمبروں اور کتابوں کا پتہ دیا اور ہم نے سب کو اسی کی رہبری سے مانا۔ لہٰذا قرآن کا ذکر پہلے کیا گیا اور دیگر کتب کا بعد میں وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلٰۤی اِبۡرٰهِیۡمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ ...... یہ پہلے مَاۤ اُنۡزِلَ پر معطوف ہے اور اس مَا سے یا تو صحیفے مراد ہیں یا ان حضرات کی ساری وحی۔ چونکہ اہل کتاب ان حضرات کو بالاتفاق مانتے تھے اور ان کی نبوت کے معتقد تھے۔ اس لئے ان کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا۔ ورنہ النبیون میں یہ سب داخل تھے۔ ابراہیم اسمٰعیل اسحٰق اور یعقوب کے لفظی معنی اور ان حضرات کے تاریخی واقعات پہلے سیپارے میں بیان کر چکے۔ اسباط کے معنی بھی ہم نے پہلے سیپارہ میں بیان کئے کہ یہ سبط کی جمع ہے۔ بمعنے شاخوں والا درخت۔ اصطلاح میں خاندان اور قبیلہ کو سبط کہتے ہیں بلکہ نسل کی اصل اور قبیلہ کے جد امجد کو بھی سبط کہا جاتا ہے۔ اس لئے

توبہ قبول فرمانے والا مہربان ہے، جب وہ اپنے مجرم کو معافی دے دیتا ہے، تو تم توبہ کے بعد اس کے پیچھے کیوں پڑتے ہو، تم بھی درگذر کرو تم بھی گنہگار ہو، اپنے گناہوں کی رب تعالیٰ سے معافی چاہو،

خلاصہ تفسیر

اس آیت کریمہ کی چار پانچ تفسیریں ہیں، بعض قوی بعض ضعیف ہم تین تفسیریں عرض کرتے ہیں جو بھی تفسیر میں بیان کی گئیں، ۱۔ اے مسلمانو! جو کنوارے اور کنواریاں تم میں سے زنا کر بیٹھیں، تو تم انہیں سخت سزا دو اس طرح کہ ان پر چار گواہیاں قائم کر کے حاکم کے سامنے ان کا زنا ثابت کرو تا کہ وہ انہیں سو کوڑے لگا دے، جیسا کہ سورۂ نور میں آ رہا ہے، پھر اگر اس سزا کے بعد یہ دونوں توبہ کر لیں، اور ان پر آثار اصلاح بھی ظاہر ہو جائیں، تو ان سے درگذر کرو، کہ اب ان کی اس حرکت کا ذکر بھی نہ کرو، ان پر زبان طعن دراز نہ کرو، اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرمانے والا مہربان ہے، جب وہ معافی دے چکا تو تم کیوں ان کے پیچھے پڑتے ہو (محکم ہے یعنی غیر منسوخ)، ۲۔ اے مسلمانو! اگر شادی شدہ مرد وعورت جو مسلمان ہوں اور زنا کر بیٹھیں، تو اب تک تو ان کی سزا گھروں میں پابند کر دینا تھا، مگر اب انہیں صرف قید نہ کرو، بلکہ انہیں زبانی طور پر برا بھلا کہو اور مارو پیٹو، اور اگر وہ توبہ کر لیں، تو یہ سزا بھی انہیں نہ دو، بشرطیکہ توبہ فقط زبانی نہ ہو بلکہ ساتھ میں اصلاح اعمال بھی ہو کہ ان پر تقویٰ کے آثار نمودار ہو جائیں، اللہ تعالیٰ تواب ورحیم ہے، وہ بڑے سے بڑے مجرم کو معافی دے دیتا ہے، یہ سزا تم خود دو، حکام سے دلوانے کی ضرورت نہیں، (اس صورت میں یہ آیت حدیث شریف سے منسوخ ہے) کیونکہ اب شادی شدہ زانی کی سزا رجم یعنی سنگسار کرنا ہے، حضور انور ﷺ نے حضرت ماعز وغیرہ کو رجم کرایا، ۳۔ اے مسلمانو! تم میں سے اگر دو مرد آپس میں بے حیائی یعنی لواطت کر بیٹھیں تو انہیں زبانی وبدنی ایذاء وتکلیف دو کہ انہیں زبان سے بھی برا بھلا کہو اور خوب مارو پیٹو! لیکن اگر وہ توبہ کر کے اپنے کو درست کر لیں تو ان سے درگذر کرو کہ پھر نہ زبانی طور پر انہیں برا بھلا کہو، نہ مارو پیٹو، بے شک اللہ تعالیٰ مہربان ہے، توبہ قبول کرنے والا ہے (اس صورت میں یہ آیت محکم یعنی غیر منسوخ ہے کہ تعزیر کا حکم اب بھی یہی ہے)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** سحق اور لواطت میں شرعاً حد مقرر نہیں بلکہ امام وحاکم بطور تعزیر جو چاہے انہیں سزا دے، جیسا کہ وَالّٰتِیْ الخ اور وَالَّذٰنِ الخ کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ نے سحق والی عورتوں کو تو گھروں میں قید کر دینے کا حکم دیا اور لوطی کو صرف ایذاء دینے کا، ایذاء کی حد مقرر نہ فرمائی، حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ آیت وَالَّذٰنِ الخ لواطت کے متعلق نازل ہوئی، اسی لئے صحابہ کرام نے لوطی کو مختلف سزائیں دیں، کسی نے انہیں قتل کرایا، کسی نے ان پر دیوار گروائی، کسی نے انہیں بالا خانے سے گرا کر انہیں پتھر مار کر ہلاک کیا، اگر زنا کی طرح اس کی سزا مقرر ہوتی تو صحابہ کرام کے عمل مختلف نہ ہوتے (از خزائن العرفان وتفسیر مدارک) امام اعظم ابوحنیفہ قدس سرہٗ کا یہی قول ہے، **دوسرا فائدہ:** اگر تعزیر والا مجرم تعزیر دینے سے پہلے توبہ کرے اور اس پر توبہ کے آثار بھی نمودار ہو جائیں تو تعزیر ختم ہو سکتی ہے جیسا کہ فَاِنْ تَابَا الخ کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا **تیسرا فائدہ:** بعض مجرموں کو خود مسلمان یا خاوند بھی

کی طرف سے ملیں۔ ہم انبیاء کرام کے درمیان تمہاری طرح ایمان میں فرق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں اور بعض کا انکار کریں بلکہ سب پر ایمان لاتے ہیں اور کیوں نہ لائیں۔ ہم تو رب تعالیٰ کے مطیع ہیں۔ نہ اپنے نفس کے جب رب تعالیٰ نے ان سب کو نبوت سے سرفراز فرمایا پھر بعض کے نہ ماننے کے کیا معنی لہٰذا ہم سارے رسولوں ساری کتابوں اور سارے صحیفوں اور انبیائے کرام کے سارے معجزات پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ہی اسلام کی حقیقت ہے اور اسی پر نجات کا مدار۔ خیال رہے کہ ہمارا ایمان قرآن شریف پر بھی ہے اور پچھلی ساری آسمانی کتابوں پر بھی مگر فرق یہ ہے کہ قرآن کریم پر ایمان بھی ہے اور عمل بھی۔ پچھلی کتابوں پر ایمان ہے عمل نہیں کہ وہ سب منسوخ شدہ ہیں۔ اس طرح ہمارا ایمان حضور ﷺ پر بھی ہے اور پچھلے تمام رسولوں پر بھی مگر حضور ﷺ پر ہمارا ایمان بھی ہے اور ہم حضور ﷺ کے امتی بھی ہیں۔ پچھلے انبیاء کرام پر ایمان تو ہے مگر ہم ان کی امت نہیں۔ اس لئے کلمہ صرف حضور ﷺ کا ہی پڑھتے ہیں۔ اس لئے مَا اُنْزِلَ میں فرق فرمایا گیا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** رب تعالیٰ کا پسندیدہ دین صرف اسلام ہے۔ باقی سارے ادیان مردود ہیں۔ ان میں رہ کر کوئی عبادت قبول نہیں۔ جیسا کہ دین اللہ سے معلوم ہوا۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔ (آل عمران ۱۹) اسلام ہی وہ دین ہے جس سے ہر قوم ہر زمانہ میں ہر طرح فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ کسی دین میں یہ خوبی نہیں۔ اسلام کے پیغمبر ﷺ اول نبی بھی ہیں اور اخیری بھی کہ اگلوں نے آپ کی بشارتیں دیں اور آپ نے ان سب کی تصدیق فرمائی۔ **دوسرا فائدہ:** اگرچہ بعض لوگ شرعی قوانین کی مخالفت کریں مگر فطری قانون کے سب پابند ہیں۔ موت، زندگی، بیماری، تندرستی، فقیری اور مالداری سب رب تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور سب کو یہ چیزیں اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ اس طرح زندگی میں اگرچہ بعض لوگ اسلام قبول نہ کریں مگر مرتے وقت بلکہ مصیبتوں میں سب کو اسلام کی پناہ پکڑنی پڑتی ہے۔ فرعون بھی ڈوبتے ہو کہہ گیا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ۔ (یونس ۹۰) لیکن اس وقت کا ایمان معتبر نہیں بلکہ اب تو تعلیم یافتہ قومیں آہستہ آہستہ اسلامی قوانین کی طرف مائل ہو رہی ہیں آریوں میں چند بیویاں رکھنے کا مسئلہ زیر غور ہے۔ ہندوؤں نے کوشش کی ہے کہ ان کے دھرم میں طلاق کا قانون جاری ہو جائے۔ بعض سمجھدار عیسائی پردے پر بہت زور دے رہے ہیں کہ عورتیں پردہ میں رہیں۔ غرضکہ اسلام کو برا کہتے ہوئے بھی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اس کی پناہ میں آ رہے ہیں۔ یہ ہے کرشمۂ اسلام۔ **تیسرا فائدہ:** حضور ﷺ ہر عرشی و فرشی کے پیغمبر ہیں جیسا کہ اسلم من فی السموات کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا کیونکہ وہ سب مسلمان ہیں اور حضور ﷺ ہر مسلمان کے نبی۔ بلبل کہے میرے نبی۔ پھول پکارتا ہے میرے نبی۔ چاند سورج کو کہتے ہیں ہمارے نبی۔ جن وانس کہتے ہیں ہمارے نبی۔ لوح وقلم کہتے ہیں ہمارے نبی اور رب تعالیٰ فرماتا ہے میرا نبی ﷺ۔ غرض خدا کے نبی ہیں، خدائی کے نبی، خالق کے نبی، مخلوق کے نبی، بحرو بر، شجر و حجر، خشک و تر، شمس و قمر، شام و سحر سب کے نبی ہیں۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ **چوتھا فائدہ:** اکثر نفلی نیکیاں چھپا کر کرنا بہتر مگر فرائض وعقائد کا اظہار ضروری جیسے کہ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ۔ سے معلوم ہوا۔ انسان کو چاہیے کہ اپنا دین سب پر ظاہر کرے بلکہ اپنے لباس، صورت و سیرت سے اسلام ظاہر کرتا رہے تاکہ بعد موت دشواری واقع نہ ہو کبھی مردہ پہچان

کفار کو اسلامی ملک میں دینی آزادی ہوگی، **چوتھا اعتراض:** اگر کفار کو اسلامستان میں آزادی دی جائے گی، تو حضور انور علیہ السلام نے یہودی زانی کو سنگسار کیوں کرایا، حالانکہ وہ تو اس کا کالا منہ کر کے شہر میں پھرا رہے تھے، انہیں دینی آزادی کیوں نہ دی؟ **جواب:** اس لئے کہ خود توریت شریف میں زنا کی سزا رجم تھی، یہود نے تحریف کر کے یہ سزا گھڑلی تھی، حضور انور علیہ السلام نے ان پر قرآنی واسلامی سزا جاری نہ کی، بلکہ ان پر خود ان کے دین کی سزا جاری فرمائی، اسی لئے انہیں قرآن نہ دکھایا بلکہ ان کے پادریوں کو جمع فرما کر توریت شریف کی آیت رجم بذریعہ سیدنا عبداللہ ابن سلام دکھا کر رجم فرمایا، اب بھی اسلامی حاکم کفار پر ان کے دینی احکام جاری کرے گا، ان کے مقدمات ان کے دین کے مطابق طے کرے گا، لہٰذا حدیث بالکل صاف ہے، **پانچواں اعتراض:** یہاں زانی یا لوطی کے لئے فرمایا گیا فَاٰذُوْهُمَا انہیں ایذاء دو، ایذاء مطلق ہے، خواہ صرف منہ سے ڈانٹ ہی دو، یا ایک چپت ہی ماردو، اگر یہ ہی سزا ہو تو لواطت وزنا کی عام اجازت ہو جائے گی (غیر مقلد) **نوٹ:** امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ پر یہ اعتراض عام غیر مقلد کیا کرتے ہیں، **جواب:** اگرچہ یہاں ایذاء مطلق ہے، مگر صحابہ کرام نے لوطی کو مار ڈالا ہے، ہاں مار ڈالنے کے طریقے مختلف تھے، کسی نے بالا خانے سے گرا کر مارا کسی نے اور طریقوں سے، لہٰذا اسلامی حاکم لوطی کی جان ہی لے، یہ ہی اس کی تعزیر ہے، صحابہ کرام کا یہ عمل گویا اس آیت کا بیان ہے، دیکھو جانور سے زنا کرنے والے کی سزا اسلام میں مقرر نہیں، مگر حاکم تعزیر کے طور پر اسے قتل کرا دے، سزا مقرر نہ ہونے سے اس جرم کی اجازت نہیں ہو جاتی، **چھٹا اعتراض:** اگر لوطی کی تعزیر قتل ہے تو پھر اس کے کیا معنی ہوں گے کہ فَاِنْ تَابَا وَ اَصْلَحَا الخ مرنے کے بعد توبہ اور چھوڑنا کیسے ہو سکتا ہے؟ **جواب:** اس کا مطلب تفسیر میں عرض کیا گیا کہ اگر تعزیر والا مجرم تعزیر قائم ہونے سے پہلے سچی توبہ بھی کر لے اور اپنا حال درست بھی کر لے اس پر علامات تقویٰ ظاہر بھی ہو جائیں، تو تعزیر ختم ہو جائے گی، وہ ہی اس آیت کریمہ کا مقصد ہے، صرف منہ سے توبہ کہہ دینا کافی نہیں، اس لئے توبہ کے ساتھ اَصْلَحَا فرمایا گیا،

تفسیر صوفیانہ

اے راہروان راہِ محبت، اگر تمہارے نفس وجسم دونوں باطنی وظاہری اعمال میں فحش کام کرنے لگیں کہ نفس، حسد، کینہ، بغض، غصہ، غفلت میں مشغول ہو جائے، اور جسم نماز میں سستی، آرام طلبی، عزت ودولت وجاہ طلبی میں مشغول ہو جائے تو تم ان دونوں کو تکلیفیں دو، اس طرح کہ انہیں ریاضتوں، مجاہدوں میں مشغول کرو، ان کی خواہش پوری نہ کرو، جو یہ چاہیں اس کے خلاف کرو پھر اگر یہ دونوں اپنی حرکتوں سے توبہ کرلیں کہ نفس تو ان عیبوں کو ترک کر دے جو رب تعالیٰ سے دوری کا باعث ہیں، اور جسم اطاعتِ خدا ورسول میں کمربستہ ہو جائے، اور ساتھ ہی ان دونوں کی اصلاح ہو جائے، کہ آئندہ ان کے ٹھیک رہنے کا گمان غالب ہو جائے، تو ان سے اعراض وچشم پوشی کرو، وہ سختیاں ختم کردو، اللہ تعالیٰ قبول فرمانے والا بھی ہے مہربان بھی، اس کے دروازے پر جو مجرم بھی عاجزی کرتا آ جائے وہ رحیم معاف فرما دیتا ہے، اگر اس کا رحم وکرم دیکھنا ہو، تو حضرت یوسف علیہ السلام کے عفو وکرم میں غور کرو کہ ستانے والے بھائی جب اپنے ہاں گندم لینے آئے تو ان پر کرم خسروانہ ہی فرمایا، انہیں نعمتوں سے مالا

کے شرعی احکام کیوں نہیں مانتے۔ سلطان کے بعد قوانین ماننا' بعض نہ ماننا بغاوت ہے۔ خیال رہے کہ ارادہ الٰہی کی مخالفت نا ممکن ہے۔ امر الٰہی کی مخالفت ممکن ہی نہیں بلکہ واقع ہے۔ لاکھوں آدمی نماز پڑھتے' دوسرے یہ کہ یہاں اسلام سے شرعی اسلام مراد ہو۔ تب بھی اس سے کفار کی حماقت بیان کرنا مقصود ہے کہ آخر کار انہیں پٹ کٹ کر اسلام لانا ہی ہے۔ تو ابھی بخوشی مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے۔ پھر پٹیں گے بھی اور وہ اسلام معتبر بھی نہ ہوگا۔ **تیسرا اعتراض:** کیا یہ ممکن ہے کہ رب اپنے ارادے کے خلاف حکم دے کہ ابوجہل کے کفر کا ارادہ کرے اور اسے ایمان کا حکم فرمائے۔ **جواب:** ممکن ہی نہیں بلکہ واقعہ ہے دنیا کے سارے کام اس کے ارادہ کے موافق ہیں۔ اور صدہا کام حکم کے خلاف۔ قتل' خونریزی اور کفر وغیرہ حکم کے مخالف ہیں۔ ارادے کے موافق دن رات۔ ہم بھی اپنے رضاء و ارادے کے خلاف حکم دیا کرتے ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** جب موت کے وقت کا ایمان معتبر نہیں تو حضور علیہ السلام کے والدین کا بعد وفات والا ایمان کیوں قبول ہو گیا؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ وہ قاعدہ اور قانون ہے اور یہ واقعہ خصوصی۔ خصوصیات پر قانون حاوی نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ وہ حضرات زندگی میں ہی مومن تھے جس کے صدہا دلائل ہیں۔ انہیں زندہ فرما کر کلمہ پڑھا کر صحابی بنایا گیا۔

پانچواں اعتراض: قرآن کریم دیگر کتابوں سے پیچھے آیا۔ تو یہاں اس کا ذکر پہلے کیوں کیا گیا کہ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَا أُنْزِلَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ۔ **جواب:** اگرچہ قرآن نزول میں پیچھے ہے لیکن ہمارے ایمان میں پہلے کہ ہم نے پہلے اسے مانا۔ پھر اس کی راہبری سے دیگر کتب کو۔ گویا راہبر کا ذکر پہلے ہوا۔ بعض صوفیاء فرماتے ہیں کہ کلمہ طیبہ میں پہلے محمد رسول اللہ ہونا چاہیے تھا اور پھر لا الہ الا اللہ۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کی راہبری سے ہمیں توحید ملی۔ مگر منشاء الٰہی یہ تھا کہ پہلے ذکر الٰہی رب تعالیٰ کے نام سے انسان کا منہ پاک وصاف کر دیا جائے تاکہ اس پاک وستھرے منہ سے سید الطاہرین ﷺ کا نام لے اس نام پاک کے لئے ذکر اللہ کی پاکی چاہیے۔

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

چھٹا اعتراض: یہاں انزل علینا فرمایا گیا۔ اور سورۂ بقر میں انزل الیک فرمایا گیا تھا۔ اس عَلٰی اور اِلٰی کی کیا وجہ ہے؟ **جواب:** وحی آسمان سے آتی ہے اور نبی تک آتی ہے ابتداء کے لحاظ سے عَلٰی فرمادیا جاتا ہے۔ انتہا کے لحاظ سے اِلٰی ان میں اعتباری فرق ہے بعض لوگوں نے کہا رسول کے لئے اِلٰی فرمایا جاتا ہے۔ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ۔ اور امت کے لئے عَلٰی کیونکہ امت رسول کے ذریعہ وحی پہنچتی ہے۔ گویا امت وحی کی انتہاء ہے مگر یہ غلط ہے۔ یہاں خود موجود ہے۔ أُنْزِلَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ اور وہاں تھا۔ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ۔ (از کبیر و معانی)

تفسیر صوفیانہ

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ دنیا و دین دونوں کا مدار اثبات ونفی پر ہے۔ مفید چیزیں اختیار کرنا' مضر غذاؤں وغیرہ سے بچنے پر جسمانی زندگی قائم ہے۔ یوں ہی نیک اعمال کرنے گناہوں سے بچنے کا نام تقویٰ ہے اس ہی طرح لا الہ نفی اور الا اللہ اثبات سے توحید قائم ہے۔ یوں ہی حضرات انبیاء کرام کے متعلق اثبات ونفی سے عقیدہ رسالت برقرار ہے۔ آمنا باللہ میں اثبات تھا۔ اور لا نفرق بین احد الخ میں نفی اس ایک کلمہ لانفرق نے رسالت کے متعلق نفی مکمل طور پر بیان فرمادی۔ تفرق بین الانبیاء کی چار

ترغیب تھی، اب توبہ کا وقت بیان ہو رہا ہے کہ کب تک توبہ کرلو، **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں توبہ کی رغبت دی گئی تھی، اب مسئلہ توبہ سے اعتراضات دفع فرمائے جا رہے ہیں کہ کفار توبہ کے مسئلہ پر اعتراض کرتے تھے کہ توبہ کے مسئلے سے لوگ گناہ پر دلیر ہوتے ہیں، لہٰذا فرمایا گیا کہ توبہ تو گناہ سے روکنے کا بہترین ذریعہ ہے نہ کہ گناہ کرانے کا ذریعہ،

تفسیر

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ اِنَّمَا عربی زبان میں حصر کے لئے آتا ہے یعنی اپنے مابعد کا ثبوت ماسواء کی نفی، یہاں اِنَّمَا فرما کر ایک توبہ کے قبول کی خبر دی گئی، اس کے ماسواء کی نفی فرما دی گئی، اَلتَّوْبَةُ توبٌ سے بنا بمعنی لوٹنا، رجوع کرنا، جب توبہ بندے کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوں گے گناہ سے نیکی کی طرف، غفلت سے بیداری کی طرف، برائی سے بھلائی کی طرف لوٹنا، اور اگر رب تعالیٰ کی صفت ہو تو اس کے معنی ہیں عذاب سے معافی کی طرف، پکڑ سے چھوڑ دینے کی طرف، عقاب سے ثواب کی طرف رجوع فرمانا، اسی لئے تَوّاب اللہ تعالیٰ کی بھی صفت ہے اور بندے کی بھی صفت مگر مختلف معانی سے، بندے کی توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ گذشتہ گناہوں پر نادم ہو، فی الحال ان سے باز آجائے اور آئندہ کے متعلق نہ کرنے کا عہد کرے، ان تمام چیزوں کا نام توبہ ہے، باقی توبہ کے کچھ شرائط ہیں کچھ ارکان کچھ مستحبات کچھ سنتیں اور توبہ کے لئے وقت بھی مقرر ہے، علیٰ لزوم کے لئے آتا ہے، یہاں التزام یعنی خود لازم وضروری فرمالینے کے لئے کہ رب تعالیٰ پر کوئی اور کچھ لازم نہیں کرسکتا، اور ہوسکتا ہے کہ علیٰ بمعنی عِنْدَ ہو یا بمعنی مِنْ یعنی وہ توبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لازم القبول فرمالی، یا توبہ مقبول اللہ کے نزدیک وہ ہے یا اللہ کی طرف سے جو بندے کو توبہ کی توفیق ملتی وہ، وہ توبہ ہے (روح المعانی وکبیر وغیرہ) خیال رہے کہ اَلتَّوْبَةُ میں الف لام عہدی ہے اور توبہ سے مراد توبہ مقبول ہے لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ، لِلَّذِيْنَ میں لام یا تو نفع کا ہے یا استحقاق کا یا صلہ کا، اور یہ عبارت توبہ کا صلہ ہے آخری احتمال زیادہ قوی ہے، اَلَّذِيْنَ سے مراد یا تو صرف مسلمان ہیں یا سارے انسان، خواہ کافر ہوں یا مسلمان یا سارے مکلف بندے، انسان ہوں یا جنات، تیسرے معنی زیادہ موزوں ہیں کیونکہ توبہ کفر سے بھی ہو جاتی ہے اور رب تعالیٰ قبول فرمالیتا ہے، نیز جنات کی بھی توبہ قبول ہے، اَلسُّوْٓءَ سے مراد یا صرف گناہ ہیں یا کفر وگناہ سب کچھ اور گناہ میں گناہ صغیرہ وکبیرہ حقوق اللہ حقوق شریعت حقوق العباد سب شامل ہیں کہ توبہ سب سے ہو جاتی ہے، اگرچہ ہر گناہ کی توبہ مختلف ہے، کفر سے توبہ ایمان لانا ہے، حق العباد سے توبہ ان کا ادا کرنا ہے، حق شرع سے توبہ قضاء شدہ عبادت کی قضاء و کفارہ ادا کرنا ہے، جہالت سے مراد بے علمی نہیں کہ جان بوجھ کر گناہ کی بھی توبہ ہو جاتی ہے بلکہ نا سمجھی، نادانی، حماقت اور بے وقوفی ہے جہل کے معنی نادانی بے وقوفی بھی ہیں، یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ تم نے گذشتہ حرکات جب کی تھیں اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ (یوسف: ۸۹) جب تم ناسمجھ و نادان تھے، نیز یوسف علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا تھا کہ مولیٰ اگر تو ہی مجھے ان عورتوں کے فریب سے نہ بچائے تو اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ (یوسف: ۳۳) میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادان بن جاؤں گا، رب تعالیٰ نے نوح علیہ السلام سے فرمایا تھا اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (ہود: ۴۶) ہم تم کو نصیحت فرماتے ہیں کہ آپ نادانوں میں سے ہوں، موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا اَعُوْذُ بِاللّٰهِ

جان قبض کرتے وقت ملک الموت رب تعالیٰ سے پوچھتے ہیں کہ مولیٰ اسے اسلام پر اٹھاؤں یا کفر پر۔ مجھے خبر نہیں کہ اس وقت میرے متعلق کیا جواب آئے گا۔ چوتھے یہ کہ قیامت میں فرمایا جائے گا۔ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ۔ (یٰسین ۵۹) اے مجرمو! نیک کاروں سے الگ ہو جاؤ مجھے خبر نہیں کہ میں کس فریق میں ہوں گا۔ کوئی شخص اپنے متعلق فیصلہ نہیں کرسکتا کہ میرا ایمان طوعی ہے یا کرہی فائدہ مند ہے یا بے فائدہ اس لئے حضرت شیخ صفی فرماتے ہیں کہ منازل سلوک طے کرنے کے بعد بھی بندہ اپنی مقبولیت کا یقین نہیں کرسکتا کیونکہ بہت لوگ اوپر سے بھی گر جاتے ہیں۔ بہت ولی بے دین ہو جاتے ہیں۔ شیطان کے واقعہ سے عبرت پکڑو۔ (روح البیان)

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ

اور وہ جو تلاش کرے سوا اسلام کے کوئی دین پس ہرگز نہ قبول کیا جاوے گا اس سے اور وہ بیچ

اور جو اسلام کے سوا کوئی دین چاہے گا وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جاوے گا اور وہ آخرت

مِنَ الْخٰسِرِينَ ﴿۸۵﴾ كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ

آخرت کے نقصان والوں میں سے ہے کیسے ہدایت دے اللہ اس قوم کو جو کافر ہوئے بعد ایمان لانے ان کے

میں زیاں کاروں سے ہے کیونکہ اللہ ایسی قوم کی ہدایت چاہے جو ایمان لا کر کافر ہو گئے

وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي

اور گواہی دی انہوں نے کہ تحقیق رسول سچے ہیں اور آئیں ان کے پاس نشانیاں اور اللہ نہیں ہدایت دیتا

اور گواہی دے چکے تھے کہ رسول سچا ہے اور انہیں کھلی نشانیاں آچکی تھیں اور اللہ ظالموں

الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ ﴿۸۶﴾

قوم ظالم کو

کی ہدایت نہیں کرتا

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں سے کہلوایا گیا تھا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ کہ صرف ہم ہی مسلمان ہیں۔ ہمارے سوا کوئی مسلم نہیں۔ اب اس کی دلیل دی جا رہی ہے کہ صرف مسلمانوں کا ہی دین مقبول ہے۔ چونکہ قبولیت صرف اسلام کی ہے۔ لہٰذا اللہ کے مقبول بندے صرف مسلمان ہیں۔ گویا پہلے دعویٰ تھا اب دلیل ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں سے معلوم ہوا تھا کہ اسلام عالم گیر مذہب ہے کیونکہ یہ ہی آسمان و زمین والوں کا دین ہے اور اس میں سارے پیغمبروں، ساری آسمانی کتابوں کی تصدیق ہے گویا خوبیوں کا جامع ہے۔ اب اس کا نتیجہ بیان ہو

سے پہلے پہلے توبہ کرلیں اوران کی توبہ ضرور قبول فرمالی جائے ،لہٰذا جولوگ بھی اس قانون کے ماتحت توبہ کریں گے رب تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے گا، اس قانونِ توبہ میں ہزار ہا حکمتیں ہیں، رب تعالیٰ جانتا ہے کہ بندے گناہ کریں گے، اگر توبہ کا قانون نہ ہو، تو ان کی بخشش کی کوئی راہ نہ رہے گی، اس لئے اس نے توبہ کا مسئلہ رکھا، رب تعالیٰ علیم بھی ہے حکمت والا بھی، حدیث شریف میں ہے کہ حضور انور ﷺ نے ایک وعظ کے آخر میں فرمایا جو اپنی موت سے ایک سال پہلے توبہ کرلے رب تعالیٰ توبہ قبول فرمائے گا، پھر فرمایا جو موت سے ایک مہینہ پہلے توبہ کرے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا پھر فرمایا مہینہ بھی بہت ہے جو موت سے ایک دن پہلے توبہ کرے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا پھر فرمایا دن بھی بہت ہے جو موت سے ایک گھڑی پہلے توبہ کرے رب تعالیٰ قبول فرمائے گا، پھر فرمایا گھڑی بھی بہت ہے، یہ فرما کر اپنے ہاتھ مبارک سے حلق شریف کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا جب جان یہاں آجائے جب بھی توبہ کرے تو قبول ہے، (روح المعانی) روح البیان نے یہ ہی حدیث اس طرح بیان کی، حضرت جبریل نے بارگاہِ نبوی میں اولاً ایک سال کی مدت بیان کی، حضور انور ﷺ نے فرمایا سال تو بہت ہے پھر عرض کیا ایک الخ، احمد وترمذی نے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مرفوعاً روایت کی، فرمایا نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ غرغرہ تک بندہ کی توبہ قبول فرماتا ہے، ابن ابی شیبہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضرت ابوقلابہ نے فرمایا کہ ابلیس نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ جب تک بندے کی روح اس کے بدن میں رہے گی میں اس کے اندر رہوں گا، وہاں سے نکلوں گا نہیں، میرا نکلنا روح کے بعد ہوگا، رب تعالیٰ نے فرمایا کہ جب تک بندے کی روح اس کے جسم میں رہے گی، اس پر توبہ بند نہ کروں گا اس وقت تک اس کی توبہ قبول کروں گا، ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی کہ ملک الموت کے دیکھنے تک کا وقت قریب میں داخل ہے، حضرت عکرمہ فرماتے ہیں ساری دنیا ہی قریب ہے کہ قریب الفناء ہے (روح المعانی) غرضکہ یہ آیت کریمہ بہت ہی ہمت افزاء امید افزاء ہے،

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** بڑے سے بڑے مجرم کو رب تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے، جب بھی رب تعالیٰ توفیق دے توبہ کرلے، یہ نہ خیال کرے کہ اتنی عمر تو گناہوں میں گذری، اب توبہ کیا کریں، شعر

اے کہ پنجاہ رفت در خوابی مگر ایں پنج روز دریابی!

اے وہ جو پچاس سال غفلت میں گذار چکا، اب بھی سنبھل جا، شاید یہ آخری ساعتیں ہی کفارہ بن جائیں، یہ فائدہ اَلتَّوْبَةُ کے اطلاق سے حاصل ہوا، **دوسرا فائدہ:** کفروشرک نیز ہر گناہ سے توبہ ہوسکتی ہے، کوئی بھی اپنے کو یقیناً دوزخی نہ سمجھے، توبہ کرے، یہ فائدہ بھی اَلتَّوْبَةُ کے اطلاق سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** توبہ کا وقت موت سے پہلے ہے، کفر سے توبہ غرغرہ سے پہلے ہوجانی چاہیے، اور گناہوں کی توبہ موت یعنی جان نکلنے سے پہلے، غرغرہ سے مراد علامات موت اور موت کے فرشتے دیکھنے کا وقت ہے جیسا کہ مِنْ قَرِیْبٍ سے معلوم ہوا، فرعون نے ڈوبتے وقت کفر سے توبہ کی مگر قبول نہ ہوئی، کہ اس کی یہ توبہ علامات موت دیکھنے کے بعد تھی، **چوتھا فائدہ:** جو توبہ قانون اسلامی کے مطابق ہو وہ ضرور بالضرور قبول ہوگی، اس کا

کا مفعول اسلام سے یا توحید واطاعت مراد ہے۔اس صورت میں اس آیت میں سارے آسمانی ادیان داخل ہیں کہ ان میں سے ہر دین اپنے وقت میں اسلام تھا۔اور یہ حکم دائمی ہے یا شریعت مصطفے ﷺ مراد ہے۔تب یہ حکم اس وقت کے لحاظ سے ہے۔دین کے معنی اور اسلام ودین میں فرق ہم پچھلی آیت میں بیان کر چکے۔اور اس کی مکمل تحقیق سورۂ فاتحہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کی تفسیر میں ہو چکی۔یعنی یہ حکم دائمی ہے کہ جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین تلاش کرے یا نبی آخر الزمان ﷺ کی تشریف آوری کے بعد اب جو کوئی ان کی شریعت کے علاوہ کسی اور دین کو تلاش کرے خوہ شرک وکفر کو یا یہودیت ونصرانیت کو کہ وہ ادیان اپنے وقت میں اسلام تھے۔اب ان کا اختیار کرنا گمراہی ہے۔غرض کچھ بھی سہی اس کا انجام یہ ہوگا کہ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ۔ یہ جملہ من یبتغ کی خبر ہے چونکہ اس میں شرط کے معنی تھے۔لہٰذا اس پر ف آئی۔لن یقبل قبول سے بنا۔اس کا نائب فاعل یا غیر اسلام یا دین یا ابتغاءً ہے۔جو یبتغ سے معلوم ہوا یا نیکیاں ہیں جو اشارۃً اسلام سے معلوم ہوئیں۔منہ کا مرجع من ہے یعنی اس کا یہ تلاش کرنا یا وہ دین یا ماسوائے اسلام یا اس شخص کی نیکیاں کبھی قبول نہ کی جائیں گی بلکہ وہ اور اس کا دین اور اس کے نیک اعمال سب مردود ہوں گے جن کا نہ ثواب اور نہ اس سے رفع درجات اور اس پر کفایت نہیں بلکہ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ۔ یا تو یہ نیا جملہ ہے اور واؤ ابتدائیہ اور یا فیہ کی ضمیر سے حال ہے۔اور واؤ حالیہ یا فلن یقبل پر معطوف ہے اور واؤ عاطفہ ہے۔جیسا اس کا حال ویسا ہی اعراب۔ھو کا مرجع من ہے۔آخرت سے مراد دنیوی زندگی کے بعد کی حالت ہے۔جس میں برزخ اور قیامت اور اس کے بعد کے سارے اوقات داخل ہیں۔خاسرین خسران سے بنا جس کے معنی ہیں ثواب سے محرومی بلکہ لغت میں خسران اصل پونجی کے جاتے رہنے کو کہتے ہیں۔خاسر وہ تاجر ہے جو بجائے نفع کے اپنا اصلی مال بھی کھو بیٹھے۔چونکہ کافر اپنا فطری دین کھو بیٹھتا ہے جو وہاں سے لایا تھا۔اس لئے اسے خاسر فرمایا گیا۔یعنی ایسا شخص آخرت میں ان نقصان پانے والوں میں سے ہوگا۔جو اپنی اصل پونجی کھو بیٹھے کہ نیکیوں کا ثواب تو کیا پاتا اپنا فطری دین بھی کھو بیٹھا۔ کَیْفَ یَهْدِی اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ۔ یہدی ہدایت سے بنا۔بمعنی راہ دکھانا یا منزل مقصود پر پہنچانا۔یہاں یا جنت کا راہ دکھانا مراد ہے۔یا دین حق کا راستہ دکھانا یا منزل مقصود پر پہنچانا یا توفیق خیر دینا یا ان کے دل میں معرفت پیدا کرنا مراد(کبیر ومعانی وغیرہ) لہٰذا اس کا متعلق پوشیدہ ہے۔یعنی اِلَى الدِّیْنِ الْحَقِّ یَا اِلَى الْجَنّٰتِ یَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ۔ قوما یہدی کا مفعول بہ ایمان سے ان کا اسلام قبول کرنا مراد ہے یا توریت وانجیل سے حضور ﷺ کو ماننا جیسا کہ شانِ نزول کی روایتوں سے معلوم ہوا۔لہٰذا کفر میں بھی دو احتمال ہو گئے۔ارتداد اور اصلی کفر یعنی اللہ اس قوم کو جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئی جنت کا راہ یا دین حق کا راہ کیسے دکھائے یا ان کے دلوں میں معرفت کیسے پیدا کرے یا انہیں توفیق خیر کیسے دے۔ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ۔ واؤ عاطفہ ہے اور یہ جملہ ایمان پر معطوف کیونکہ ایمان میں فعل کے معنے تھے گویا بَعْدَ مَا اٰمَنُوْا تھا۔بعض نے فرمایا کہ یہ ایمان کے معنے پر معطوف ہے نہ کہ لفظ پر جیسے۔ اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ۔ کہ یہاں اقرضوا مصدقین کے معنے پر معطوف ہے۔بعض نے فرمایا کہ شہدوا سے پہلے اَنْ پوشیدہ ہے۔جس سے یہ بمعنی مصدر ہو گیا یعنی و شہادتہم۔شاعر کہتا ہے ؎

وبس عباءة وتقر عینی   احبّ الیّ من بس الشفوف

گناہ اور کرو، جب تک قتل کے ملزم کو پھانسی کی سزا نہیں ملتی اسے جیل میں آزاد رکھا جاتا ہے کیونکہ اسے چھوٹ جانے کی امید ہوتی ہے، مگر پھانسی کا حکم ہونے پر اسے علیحدہ کال کوٹھڑی میں رکھتے ہیں، اور اس کی بہت نگرانی کرتے ہیں کہ اب یہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا، ممکن ہے کہ دو چار اور بھی قتل کر دے، غرضکہ مایوسی گناہ پر دلیر کرتی ہے، یوں ہی معافی کا یقین گناہ پر ابھارتا ہے، امید وخوف گناہ سے بچاتا ہے،

تفسیر صوفیانہ

نماز روزے کی طرح توبہ بھی ایک فرضی عبادت ہے بلکہ دیگر فرائض سے اہم فرض ہے، پھر جیسے دوسری عبادتوں کے لئے فرائض، واجبات، سنتیں، مستحبات، مکروہات ہیں ایسے ہی اس کے لئے بھی ہیں، اور جیسے دوسری عبادتوں کے لئے وقت مقرر ہیں، ایسے ہی توبہ کے بھی اوقات ہیں، پھر جیسے نماز کے لئے بعض اوقاتِ جواز ہیں، بعض اوقاتِ مستحبہ ہیں، اور بعض اوقاتِ مکروہہ، یہ ہی توبہ کا بھی حال ہے کہ اس کے لئے بعض اوقاتِ مستحب ہیں بعض مکروہ بعض جائز، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ توبہ کی شرائط چار ہیں، گذشتہ جرموں پر دل سے نادم ہونا، فی الحال گناہ چھوڑ دینا، آئندہ گناہ سے بچنے کا عہد، یہ سب کچھ صرف رب تعالیٰ سے حیا وشرم کی وجہ سے ہونا، نہ کہ ریاء ودکھلاوے کے لئے، اور کچھ توبہ کے ارکان ہیں، زبان سے بھی دعائیہ کلمات ادا کرنا، اپنے گناہ کا اقرار کرنا اور جو گناہ قابل تلافی ہوں ان کا بدلہ وتلافی کر دینا بے نمازی توبہ کرے تو گذشتہ فوت شدہ نمازوں کی قضا کرے، مقروض توبہ کرے تو قرض ادا کرے، ظالم توبہ کرے تو مظلوم سے معافی مانگے وغیرہ، توبہ کے لئے مستحب یہ ہے کہ توبہ کرنے والا رب تعالیٰ سے مایوس نہ ہو، حضور انور ﷺ ودیگر بزرگانِ دین کے توسل سے توبہ کرے، توبہ کے وقت آنکھوں سے اشک بہائے، دل خوف خدا سے بھرا ہوا ہو، ایسی توبہ تیر بہدف ہوتی ہے، مولانا فرماتے ہیں، شعر

ہر کجا آب رواں سبزہ بود ہر کجا اشکے رواں رحمت شود
تا نہ گرید ابر کے خندد چمن تا نہ گرید طفل کے جوشد لبن

جہاں پانی کی روانی ہوتی ہے وہاں سبزہ ہوتا ہے، جہاں آنسوؤں کی روانی ہوتی ہے وہاں رحمت الٰہی ہوتی ہے، بغیر بادل کے روئے چمن نہیں ہنستا، بغیر بچے کے روئے ماں کے پستانوں میں دودھ جوش نہیں مارتا، ایسی توبہ اکسیر ہے جو گناہوں کو نیکیاں بنا دیتی ہے، گنہگار کو ولی کر دیتی ہے، مولانا فرماتے ہیں، شعر

ملک برہم زن تو ادہم وار زود تا بیابی ہمچو او ملک خلود

اے اللہ کے بندے تو بھی حضرت ادہم سلطانِ خراساں کی طرح ملک درہم برہم کر دے، تاکہ تجھے دائمی ملک کی سلطنت میسر ہو، حضرت ادہم کا واقعہ مشہور ہی ہے کہ آپ نے سلطنتِ خراساں پر لات ماردی تو رب تعالیٰ نے انہیں جانوروں، پانی، ہوا وغیرہ کائنات کا بادشاہ بنادیا، مولانا عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، شعر

مشو مغرور این ملک مزوّر نہ عزت ماند و نے مال نے زر
اگر رنگت فرد شویند ز رخسار خریدارت نباشد کس بہ بازار

ہیں کہ اس آیت میں غیر سے مغایرت اور مخالفت مراد ہے یعنی جو کوئی اسلام کے خلاف دیگر ادیان یہودیت وغیرہ کو اختیار کرے گا وہ مردود ہے۔ اسلام اور ایمان ذاتاً ایک ہے۔ مفہوم میں فرق۔ **دوسرا فائدہ:** کافر کی کوئی نیکی قبول نہیں کیونکہ ایمان شرط قبولیت ہے۔ جیسے بے وضو کی نماز مردود ایسے ہی کافر کی نیکیاں باطل خواہ کسی قسم کی ہوں۔ کسی کے ثواب کا مستحق نہیں۔ جیسا کہ فلن یقبل سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** عالم کا جرم جاہل کے جرم سے سخت تر ہے کہ وہ جان بوجھ کر قصور کرتا ہے۔ نیز اس کے جرم میں ضد کا شائبہ ہے۔ نیز اس کا جرم دوسروں کو مجرم بنا دے گا۔ جیسا کہ جَآءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** گمراہ عالم کی ہدایت سخت دشوار ہے۔ جاہل کی ہدایت آسان جیسا کہ کیف یھدی اور لا یھدی سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** ایمان اور شہادت میں فرق ہے کیونکہ یہاں شھدوا کو ایمان پر معطوف کیا گیا۔ ایمان تصدیق کا نام ہے اور شہادت اقرار کا۔ ایمان دل کا فعل ہے اور شہادت زبان کا۔ لہٰذا اسلام اور ایمان میں مفہوماً فرق ہے کیونکہ معطوف معطوف علیہ کا غیر ہوتا ہے۔ **لطیفہ:** اس آیت سے اسلام و ایمان کا اتحاد بھی معلوم ہوتا ہے اور اختلاف بھی کیونکہ حضور علیہ السلام کی حقانیت کی گواہی دینا اسلام ہے مگر ایمان پر معطوف۔ ثابت ہوا کہ یہ دونوں ذاتاً ایک ہیں مفہوماً جداگانہ۔ **چھٹا فائدہ:** مسلمان کا اسلام اور طلب اسلام اور اس کے نیک اعمال سب قبول۔ جیسا کہ لن یقبل سے معلوم ہوا کہ کافر کا دین اور تلاش دین اور نیکیاں مردود۔ مومن کا حال اس کے خلاف ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہاں بہت دراز عبارت کیوں ارشاد فرمائی گئی کہ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا. صرف الکفار فرما دینا ہی کافی تھا؟ **جواب:** اس لئے کہ اس میں پانچ قوموں کو شامل کرنا منظور ہے۔ نیکیاں کرنے والے کفار جیسے سخی عادل کافر اور وہ مسلمان جو مسلمان کہلا کر دوسرے مذاہب کی حقانیت کا شک کریں اور ان میں حق تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ ہر دین کی کتابوں کا مطالعہ کریں۔ طالب حق کہلائیں۔ گویا انہیں اسلام کی حقانیت میں تردد ہے۔ وہ مسلمان جو دعوے اسلام کر کے تمام ادیان کو سچا جانیں اور کہیں کہ ہر مذہب والا اپنے مذہب کے اصول کی پابندی کر کے رب کو پا سکتا ہے اور ہر مذہب میں رہ کر نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ وہ مسلمان جو کفر کا ارادہ کرے اگرچہ اسے کافر ہونے کا موقعہ نہ ملے وہ جاہل مسلمان جو اسلامی عبادات سے منہ موڑیں اور اپنی ایجادات اور بیہودہ کاموں کو عبادت سمجھیں۔ جیسے بے نماز بھنگی چرسی فقیر اور گانے بجانے والے مسلمان سادھو۔ محرم میں پیٹنے والے جہلاء یہ سب من یبتغ میں داخل ہیں۔ الکفار یا کافر فرما دینے سے یہ فوائد حاصل نہ ہوتے۔ **مسئلہ:** ارادۂ کفر کفر ہے اگرچہ کفر بکنے کا موقعہ نہ ملے۔ **دوسرا اعتراض:** کیف یھدی اور لا یھدی الخ سے معلوم ہوا کہ مرتد کو اسلام کو توفیق نہیں ملتی اور خدا اسے ہدایت کبھی نہیں دیتا۔ حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے۔ بہت مرتد دوبارہ اسلام لے آتے ہیں؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ یہاں خاص ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جن کا گمراہ رہنا اور حق پر نہ آنا علم الٰہی میں آ چکا تھا۔ جیسے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ. (بقرہ:۶) کہ اس سے خاص کفار مراد ہیں نہ کہ عام۔ دوسرے یہ کہ ہدایت سے مراد راہ جنت کی ہدایت دینا ہے۔ یعنی آخرت میں رب تعالیٰ کفار کو جنت کی راہ نہ دکھائے گا اور ظالمین سے وہ لوگ مراد ہیں جو کافر ہو کر مر

شانِ نزول

ابن جریر نے حضرت ابو العالیہ سے روایت فرمائی کہ گذشتہ آیت مومن گنہگاروں کے متعلق اتری تھی، اور اس آیت کا پہلا جملہ منافقین کے متعلق نازل ہوا، اور دوسرا جملہ وَلَا الَّذِيْنَ الخ کفار و مشرکین کے متعلق نازل ہوا، (روح المعانی و خازن و تفسیر مدارک عن سعید ابن جبیر) تفسیر احمدی سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی آیت میں ان گنہگار مومنوں کا ذکر تھا جو موت سے پہلے توبہ کر لیں، ان کی توبہ یقیناً قبول ہے، جس کا وعدہ ہو چکا اور اس آیت کا پہلا جملہ ان گنہگار مومنوں کے لئے ہے جو مرتے وقت توبہ کریں، ان کی توبہ مشیت پر موقوف ہے قبولیت کا وعدہ نہیں اور دوسرا جملہ کفار کے متعلق ہے، اس کے نزول کے متعلق اور بھی چند قول ہیں مثلاً ایک یہ کہ اس آیت کے پہلے جملہ سے مراد کفار ہیں، جو علامات موت دیکھ کر توبہ کریں گے مگر قبول نہیں، اور دوسرے جملہ سے مراد وہ کفار ہیں جو بغیر توبہ مر جائیں،

تفسیر

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ، اگر یہ آیت کریمہ منافقوں کے متعلق ہے تو توبہ سے مراد توبہ مقبول ہے، اس میں الف لام عہدی ہے اور لِلَّذِيْنَ ثَابِتَةً کے متعلق ہو کر لَيْسَتِ کی خبر، اس صورت میں يَعْمَلُوْنَ دوام کے لئے ہے اور السَّيِّاٰتِ یعنی گناہوں سے مراد ان کا نفاق ہے جو تمام گناہوں کی جڑ ہے، اور اگر آیت کریمہ کھلے کافروں کے لئے ہے تو توبہ سے مراد کفر سے توبہ ہے اور لِلَّذِيْنَ مُفِيْدًا کے متعلق ہو کر لَيْسَتِ کی خبر، اس صورت میں بھی يَعْمَلُوْنَ دوام کے لئے ہے، اور السَّيِّاٰتِ سے مراد کفر و شرک اور تمام بدکاریاں ہیں اور اگر یہ جملہ گنہگار، غافل مسلمانوں کے لئے ہے جو عمر بھر توبہ نہ کریں، مرتے وقت ہی توبہ کریں تو التَّوْبَةُ سے پہلے قُبُوْل پوشیدہ ہے اور لِلَّذِيْنَ لَازِمٌ کے متعلق ہو کر لَيْسَتِ کی خبر، يَعْمَلُوْنَ اب بھی دوام کے لئے ہے، سیئات سے مراد گناہ ہیں صغیرہ ہوں یا کبیرہ، خلاصہ یہ ہے کہ اس جزء کے تین معنی ہوئے، ایک یہ کہ توبہ مقبول جس کا ابھی ذکر ہوا، ان منافقوں کو نصیب نہیں ہوتی، جو عمر بھر تو منافقت اور مسلمانوں سے چالبازیاں کرتے رہیں، دوسرے یہ کہ کفر سے توبہ کرنا ان لوگوں کے لئے مفید نہیں جو عمر بھر شرک و معاصی و گناہوں میں گذاریں، تیسرے یہ کہ قبولیت توبہ کا حتمی و یقینی وعدہ ان گنہگار مسلمانوں سے نہیں ہے جو عمر بھر گناہ کرتے رہیں کبھی توبہ کی طرف دھیان نہ دیں، ساری عمر ہر قسم کے گناہوں میں گذاریں، خیال رہے کہ ایک گناہ پر قائم رہنا، اس سے توبہ نہ کرنا صدہا گناہ بن جاتا ہے کہ گناہ پر اڑا رہنا بھی گناہ ہے، اور ہزارہا گناہ جن سے فوری توبہ میسر ہو جائے، وہ گویا ایک ہی گناہ ہے، جو معاف ہو گیا اسی وجہ سے پچھلی آیت میں السوء واحد فرمایا گیا تھا اور یہاں السَّيِّاٰتِ جمع ارشاد ہوا، (روح المعانی) کرم ہو جائے تو لاکھوں گناہ ایک بن جاتے ہیں وہ بھی معاف ہو جاتے ہیں بلکہ نیکی میں تبدیل ہو جاتے ہیں، اور اگر کرم نہ ہو تو ایک گناہ لاکھوں بن جاتے ہیں، رحمت کا پانی پڑے تو لگی آگ بجھ جاتی ہے، ورنہ ایک ہی چنگاری سارے گھر کو آتش کدہ بنا دیتی ہے، حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ، حَتّٰى انتہاء کے لئے ہے اور یہ جملہ يَعْمَلُوْنَ کی انتہاء ہے الْمَوْتُ سے مراد علاماتِ موت ہیں جبکہ زندگی سے مایوسی ہو جائے اور ملک الموت و دیگر فرشتے دکھ جائیں جسے غرغرہ کہتے ہیں کہ اس وقت کفر و نفاق سے توبہ

کرنا اور ہے برے کام کو دین سمجھنا کچھ اور۔

تفسیر صوفیانہ

صوفیائے کرام کے نزدیک اسلام توحید حقیقی ہے جو ماسوی اللہ کے خیال کو ختم کر دے وہ ہی دین اللہ ہے۔ اس کی جانب اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ۔ (آل عمران: ۲۰) میں اشارہ ہے اس توحید کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان رب تعالیٰ کا کامل مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے کیونکہ سارے اعضاء قلب کے تابع ہیں۔ جب قلب میں غیر خدا کا دھیان نہیں تو اعضائے ظاہری پر مخالفت رب تعالیٰ کا احتمال نہیں۔ اس درجہ میں پہنچ کر انسان مسلم حقیقی بنتا ہے۔ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ (بقرہ: ۱۳۶) میں اسی جانب اشارہ ہے اور حدیث مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ۔ اس درجہ کا بیان ہے کہ جو کوئی ولی ارادہ کے ساتھ نماز چھوڑ دے وہ غیر اللہ یعنی نفس و شیطان کا مطیع ہو گیا۔ جو اس توحید کے خلاف ہو کر اس توحید حقیقی کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرے۔ خواہ شیطان کی اطاعت میں یا نفس امارہ کی پیروی میں وہ ہرگز مقبول بارگاہ نہ ہو گا کیونکہ اس کا یہ دن اسے رب تعالیٰ تک نہیں پہنچا سکتا۔ وہ رب تعالیٰ سے ہمیشہ محجوب ہی رہے گا۔ اور آخرت میں سخت نقصان میں کیونکہ اس نے اپنے نفس کو حجابات کے عوض فروخت کر دیا۔ رب تعالیٰ نے اولاً سب کو ایمان میثاق کا نور دیا پھر انہیں نور استعدادی عطا فرمایا پھر ان میں سے بعض کو نورِ ایمانی بخشا یہاں تک کہ انہوں نے پیغمبر کی حقانیت کا مشاہدہ کر لیا اور اس کے ساتھ دلائل عقلیہ بھی انہیں مل گئے۔ جس سے انہیں کوئی شک باقی نہ رہا۔ پھر نفس کی ظلمت نے ان کے عقل و دل کے انوار کو ڈھانک لیا اور ان کے مشاہدہ کرنے والی روح کو پردے میں لے لیا۔ ایسے بدنصیبوں کو اب خدا تعالیٰ کیسے ہدایت دے کہ جنہیں **نور الانوار بلکہ نور فوق نور** حاصل تھا اور پھر **ظلمات بعضها فوق بعض** میں پھنس گئے۔ ایسے لوگ بڑے ظالم ہیں کیونکہ کوئی ظلم کرتا ہے غیروں پر یہ ظلم کرتے ہیں اپنے پر اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ حجاب و ظلمت اور حق سے دوری دو قسم کی ہے ایک وہ جس میں نفس امارہ دل پر پورا غلبہ حاصل کر لے جس سے سرکشی انتہاء کو پہنچ جائے اور حق سے انتہائی دوری ہو جائے۔ یہ کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ گلے ہوئے لوہے کی طرح ہیں جنہیں کوئی صیقل صاف نہیں کرتی۔ اسی کو ختم کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جس میں نفس امارہ نے دل پر پورا قبضہ نہ کیا ہو اور نور لم یزل کی شعاعیں بالکل بند نہ ہوئی ہوں۔ اور ان کے قلب میں منور ہونے کی قابلیت ہو۔ یہ اس زنگ آلودہ لوہے کی طرح ہیں جو کامل کاریگر اور اعلیٰ صیقل سے صاف ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ رحمت الٰہی ان کی دستگیری کرے وہ نادم ہو کر توبہ کر لیں ان کی طرف اگلی آیت میں اشارہ ہے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا الخ (آل عمران: ۸۹) (از ابن عربی) صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ کفر چند قسم کا ہے۔ بے پرواہی کا کفر جیسے عام کفار کا بے جا محبت کا کفر جیسے عیسائیوں کا رب کی عداوت کا کفر، عداوت انبیاء کا کفر جیسے یہود کا عداوت ملائکہ کا کفر جیسے ابن سوریا کا جس نے کہا کہ جبریل ہمارے دشمن ہیں۔ صحابہ کرام کی عداوت کا کفر مگر ان سب میں کفر عداوت سخت تر ہے۔ دشمن پیغمبر کو ایمان کی توفیق نہیں ملتی۔ رب چاہتا ہی نہیں کہ میرے محبوبوں کے دشمن جنت میں جائیں۔ انہی کے بارے میں فرمایا گیا كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا الخ اے محبوب ﷺ ہم اس ظالم قوم کو جنہوں نے جان بوجھ کر آپ کا انکار کیا جن کے دلوں میں آپ کی عداوت کی آگ بھڑک رہی ہے کیسے ہدایت دے دیں اور انہیں اپنی جنت میں کیسے آنے دیں۔ جنت تمہاری خاطر بنی۔

توبہ کرلو، مگر بندے نہیں مانتے، کل بندے کہیں گے مولیٰ ہماری توبہ ہے، مگر رب تعالیٰ نہ مانے گا شعر

آج لے ان کی پند آج حیا کر ان سے کل نہ مانیں گے قیامت میں اگر مان گیا

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** مجرم تین قسم کے ہیں اور ان کے تین ہی حالات ہیں، ایک وہ گنہگار مسلمان جو موت سے پہلے توبہ کرلیں، ان کی توبہ انشاء اللہ یقیناً قبول ہے، دوسرے وہ غافل مسلمان جو عمر بھر گناہ کرتے رہیں، مرتے وقت توبہ کریں غرغرہ یا جانکنی کی حالت میں ان کی توبہ کی مقبولیت یقینی نہیں، رب تعالیٰ کی مشیت پر ہے قبول فرمائے یا نہ فرمائے، تیسرے وہ کفار جو کفر پر ہی مرجائیں، وہ یقیناً دوزخی ہیں ان کی توبہ یقیناً غیر مقبول، جیسا کہ اس آیت کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا، **دوسرا فائدہ:** بحالتِ غرغرہ جب غیب منکشف ہوجائے نہاں عیاں بن جائے، تب نفاق وکفر سے توبہ قبول نہیں، اس وقت گناہوں سے توبہ قبول ہوسکتی ہے، جیسا کہ اس آیت کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** جس گناہ سے توبہ نصیب ہوجائے وہ بڑا بھی ہوتو چھوٹا ہے، زیادہ بھی ہوں تو تھوڑے بلکہ بالکل نہیں اور جس گناہ سے توبہ نصیب نہ ہوتو وہ ایک بھی ہوتو زیادہ ہے چھوٹا بھی ہوتو بڑا ہے، جیسا کہ پچھلی آیت میں سیئہ اور یہاں السَّیِّاٰتِ فرمانے سے معلوم ہوا، **چوتھا فائدہ:** حالت غرغرہ کی توبہ قبول ہے، مگر اس وقت کا ایمان قبول نہیں جیسا کہ اس آیت کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا، جب محشر میں بھی شفاعت ومعذرت گنہگاروں کے لئے قبول ہوسکتی ہے، تو اس وقت بھی قبولیت کی امید ہے (تفسیر کبیر) **پانچواں فائدہ:** گنہگار مسلمان میت کو ایصالِ ثواب کرنا مفید ہے، کفار کو مفید نہیں بلکہ انہیں ثواب پہنچانا حرام ہے جیسا کہ اَعْتَدْنَا کی تفسیر سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** کفار کو مرحوم یا رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کہنا حرام ہے کہ اس میں ان کے لئے دعائے رحمت ہے اور وہ لعنت میں گرفتار ہیں، جیسا کہ اَعْتَدْنَا سے معلوم ہوا، اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو مشرکین وکفار کے مرنے پر ان کے لئے مرثیے لکھیں، جس میں انہیں جنت باشی یا بیکنٹھ دوار کہیں یا ان کی سمادھ پر فاتحہ خوانی کریں یا ان کی موت کے دن قرآن پاک پڑھیں، محض مشرکین کی خوشامد میں، **ساتواں فائدہ:** دوزخ پیدا ہوچکی ہے اور وہاں کے درجات دوزخیوں کے نامزد ہوچکے ہیں، جیسا کہ اَعْتَدْنَا ماضی فرمانے سے معلوم ہوا، **آٹھواں فائدہ:** دوزخ کے تمام قسم کے عذاب بھی پیدا ہوچکے ہیں، آگ، سانپ، بچھو، کھولتا پانی وغیرہ جیسا کہ عَذَابًا اَلِیْمًا سے معلوم ہوا، **نواں فائدہ:** دوزخ بنی ہے صرف کفار کے لئے، اگرچہ کفار کے سے اعمال کرنے والے مومن گنہگار بھی وہاں کچھ روز کے لئے رکھے جائیں گے، دوزخ گنہگاروں کی منزل ہے، کفار کا اصلی ٹھکانہ جیسے بھٹی سونے کی منزل ہے کوئلے کی اصلی جگہ، جیسا کہ لَھُمْ سے معلوم ہوا، **دسواں فائدہ:** کفار کے لئے مذکورہ عذاب جب ہے جبکہ وہ کفر پر مرجائیں، اگر عمر بھر کوئی کفر کرے، مگر مرنے کے قریب مومن ہوجائے اور ایمان پر مرے وہ رحمتِ الٰہی کا مستحق ہے جیسا کہ یَمُوْتُوْنَ سے معلوم ہوا، ایسے ہی ایمان کا معاملہ ہے کہ کوئی عمر بھر مومن متقی پرہیزگار رہے مگر مرتے وقت کافر ہوکر مرے وہ اسی دوزخ کا مستحق ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اور سب کے صدقہ مجھ گنہگار کو ایمان پر موت نصیب فرمائے، خاتمہ کا وقت ہی نچوڑ کا ہے،

شانِ نزول

حارث ابن سوید انصاری کو کفار کے ساتھ جا ملنے کے بعد سخت شرمندگی ہوئی جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہو چکا۔ تب انہوں نے اپنی قوم کے پاس پیام بھیجا کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کرو کہ کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ ان کے حق میں آیت اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ تک اتری۔ حضور ﷺ نے ان کے بھائی جلاس کے ذریعہ یہ آیت ان تک پہنچائی۔ تب وہ مدینہ منورہ میں آ کر تائب ہوئے۔ حضور ﷺ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اس کے بعد ان کا اسلام نہایت کامل ہوا (تفسیر خزائن عرفان وخازن)

تفسیر

اُولٰٓئِکَ جَزَآءُ هُمْ اَنَّ عَلَیْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ اولئک سے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔ جن کے عیوب پہلے بیان ہو چکے۔ چونکہ وہ لوگ ان عیوب کی وجہ سے گویا محسوس ہو گئے تھے۔ اسلئے بجائے ضمیر کے اسم اشارہ لایا گیا۔ جزاء جزی یجزی کا مصدر ہے۔ بمعنی برابر ہونا' کافی ہونا' ہر بدلہ کو جزا کہا جاتا ہے۔ خواہ بدلہ نیکی کا ہو یا برائی کا جیسے وَجَزَآءُ هُمْ بِمَا صَبَرُوْا (الدھر: ۱۲) اور جیسے فَجَزَآءُ هٗ جَهَنَّمُ (النساء: ۹۳) یہاں بمعنی سزا ہے۔ اولئک مبتدا اول ہے اور جزاءھم دوسرا مبتداء۔ اگلا جملہ جزا کی خبر۔ پھر یہ پورا جملہ اولئک کی خبر۔ لعنت کے معنی ہیں دور کرنا' رحمت سے دور کرنا رب کی لعنت ہے اور اس دوری کی دعا کرنا بندوں کی لعنت۔ یہاں اللہ کے لحاظ سے بمعنی دوری رحمت ہے اور فرشتوں اور لوگوں کے لحاظ سے بمعنی دعائے دوری۔ یہاں لعنت کو جملہ اسمیہ سے بیان فرمایا گیا اور عذاب میں کمی یا مہلت نہ دینے کو مضارع سے جس سے معلوم ہوا کہ لعنت تو دنیا کی زندگی' مرتے وقت اور قبر وحشر میں ہمیشہ ہر جگہ ہے مگر عذاب میں کمی وغیرہ نہ ہونا آخرت میں ہوگا۔ دنیا میں اللہ کی لعنت یہ ہے کہ بندہ کو آخرت کی نعمتوں ایمان' عرفان' نیک اعمال کی توفیق نہ ملے اور دنیاوی نعمتیں اگر ملیں تو عذاب ورحمت بن کر ملیں کہ بندہ مال واولاد وعزت وسلطنت پا کر اور زیادہ سرکش ہو جائے۔ مرتے وقت کی لعنت یہ ہے کہ جوں جوں عمر زیادہ گذرے بندے کو دنیا میں مشغولیت زیادہ ہو۔ ورنہ چاہیے یہ کہ بڑھاپے میں انسان دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی تیاری کرے۔ پرندہ دن بھر کھیتوں میں چگتا ہے' شام کو اپنے آشیانے کی طرف اڑتا ہے۔ قبر کی لعنت یہ ہے کہ بندہ کو منکر نکیر کے سوالات کے جوابات نہ سوجھیں' آخرت کی لعنت یہ کہ بندے کا منہ کالا ہاتھ بندھے بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال ہوں۔ ظاہر یہ ہے کہ ملائکہ سے سارے فرشتے مراد ہیں اور ممکن ہے کہ اس سے صرف وہ فرشتے مراد ہوں جو جہنم پر مقرر ہیں یا وہ جو جان نکالنے کے لئے آتے ہیں یا وہ جو انسانوں کی حفاظت کرتے ہیں کہ یہ محافظ فرشتے اس کافر کی وجہ سے بتخانہ' جوئے شراب کے اڈوں' کھیل تماشوں کے ٹھکانوں میں جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہاں بادل نخواستہ جاتے ہیں مگر اس پر لعنت کرتے ہوئے اور ممکن ہے کہ اس سے حاملین عرش اور عرش کا طواف کرنے والے فرشتے مراد ہوں کہ وہ حضرات مومنوں کے لئے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہے اور کافر کے لئے لعنت کی بددعا کرتے ہیں۔ ایسے ہی الناس میں بظاہر سارے لوگ مراد ہیں اور ممکن ہے کہ صرف مسلمان مراد ہوں۔ اجمعین یا تو صرف الناس کی تاکید ہے یا ملائکہ اور ناس دونوں کی پہلی صورت میں اس کے معنی ہوں گے سب لوگوں کی لعنت۔ دوسری صورت میں اس کے معنی

گنہگار کو چاہے بخش دے گا، وہ لوگ مشیت میں ہیں خلاصہ یہ ہے کہ صحیح توبہ کرنے والے انشاء اللہ ضرور بخشے جائیں گے، بغیر توبہ کفر پر مرجانے والے ہرگز نہ بخشے جائیں گے، بغیر توبہ گنہگار ایمان پر مرنے والے تحت مشیت ہی بخشے جائیں یا گناہوں کی سزا پائیں، (تفسیر کبیر) **چوتھا اعتراض:** اس آیت کے آخری جملہ میں ارشاد ہوا کہ نہ ان کی توبہ قبول ہو جو کفر پر مر جائیں، کفر پر مرجانے والے توبہ کب کریں گے جو قبول نہ ہوگی، انہیں تو بعد موت توبہ کی اجازت ہی نہ ہوگی، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ (مرسلات: ۳۶) انہیں عذر و معذرت کرنے کی اجازت نہ ہوگی، **جواب:** یہ کفار قیامت میں بہت چیخیں گے چلائیں گے، دنیا میں واپس آنے کی درخواست کریں گے، گذشتہ کفر کا انکار بھی کریں گے، اور معذرت وتوبہ بھی، یہ تمام باتیں بہت سی آیات میں مذکور ہیں، کہیں گے رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا (مومنون: ۹۹-۱۰۰) اے مولیٰ ہمیں واپس دنیا میں بھیج دے تاکہ نیک کام کریں، عرض کریں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (انعام: ۲۳) اللہ کی قسم ہم مشرک نہ تھے وغیرہ، تمہاری پیش کردہ آیت میں ایک خاص وقت کا ذکر ہے کہ جب کفار اپنے ہاتھ پاؤں کی گواہی پاکر مجرم قرار دے دیئے جائیں گے اور ان کا حساب و کتاب ہو کر انہیں دوزخ میں جانے کا حکم ہو جائے گا تب انہیں میدانِ محشر میں عذر و معذرت کی اجازت نہ ملے گی، غرضکہ ان کے معذرت کرنے کا وقت اور ہے، اور چپ ہو جانے کا وقت اور، لہٰذا آیات میں تعارض نہیں،

تفسیر صوفیانہ

کافر مملکت الٰہیہ کا غدار ہے، اس کے تمام برے بھلے کام سیئات یعنی گناہ ہیں، وہ کھاتا ہے تو گناہ کرتا ہے، سوتا ہے تو مجرم ہے، چلتا پھرتا ہے تو مجرم ہے، کیونکہ جیسے زہر ساری دیگ کو زہر بنا دیتا ہے ایسے ہی کفر ساری عادات بلکہ عبادات کو معصیت کر دیتا ہے، فرمایا گیا کہ ہم ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں فرماتے، جو ہر وقت، ہر آن گناہ کرتے رہتے ہیں، جن کی ہر حرکت و سکون ہر جنبش گناہ ہے، پھر جب عذاب اور عذاب کے فرشتوں کو دیکھتے ہیں، تو کہتے ہیں الٰہی توبہ، اس لئے کہ انہوں نے پیغمبر کا کہانہ مانا، اپنی آنکھوں کا دیکھا مانا ایمان تو ان کا قبول ہے جو پیغمبر پر ایمان لائیں، نیز وہ لوگ بھی لائق بخشش نہیں جو مرتے وقت بھی توبہ نہ کر سکیں بعد مرے روئیں چلائیں، کیونکہ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، توبہ کا بھی ایک وقت ہے، بے موسم بوئے ہوئے کھیت میں دانہ نہیں لگتا، بے وقت کی ہوئی توبہ میں قبولیت کا پھل نہیں لگتا، اگر قبولیت چاہتے ہو تو اب زندگی میں توبہ کر لو، کہ ابھی وقت ہے، زندگی کی توبہ کایا پلٹ دیتی ہے، مولانا فرماتے ہیں، شعر

گر سیہ کردی تو نامہ عمر خویش   توبہ کن زانہا کہ کردستی تو پیش

توبہ آرند و خدا توبہ پذیر   او گیرند او نعم الامیر

اگر تو نے اپنی عمر کا دفتر گناہوں سے کالا کر لیا ہے، تو پھر بھی توبہ کر، کہ توبہ کا صابن سیاہ کو سفید کر دیتا ہے، تیرے گناہوں سے رب تعالیٰ کی رحمتیں زیادہ ہیں، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں توبہ میں دیر لگانے والوں کو توبہ نہ کرنے والوں کے زمرہ میں بیان فرمایا تاکہ پتہ لگے کہ توبہ میں ڈھیل کرنا توبہ نہ کرنے کی طرح برا ہے، اس لئے توبہ میں جلدی کرنا چاہیے،

سفیان و ہندہ کے قصور ایسے چھپائے کہ پھر ذکر بھی نہ ہونے دیا۔ یہاں یا تو مغفرت سے گناہوں کا معاف کرنا مراد ہے یا ثواب دینا مقصود یا مغفرت سے قیامت کے دن اُن کے عیب چھپانا مراد ہے اور رحمت سے اُن کی نیکیاں ظاہر کرنا مقصود۔ اس صورت میں یہ دونوں آخرت کے متعلق ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ مغفرت سے دنیا میں پردہ پوشی مراد ہے اور رحمت سے آخرت کی معافی مقصود۔ اس صورت میں یہ دونوں چیزیں دو جہانوں کے متعلق ہیں۔ مغفرت دنیا میں رحمت آخرت میں۔ مگر یہ توجیہہ بعید ہے یعنی اگر یہ اپنا حال درست کرلیں تو اللہ ان کے لئے غفور رحیم ہے۔ یا اللہ ان کے گناہ معاف کردے گا کیونکہ وہ غفور رحیم ہے۔

خلاصہ تفسیر

یہ لوگ جو مومن ہو کر رسول کی حقانیت کی گواہی دے کر دلائل تو بہ دیکھ کر محض عناد و حسد سے کافر ہو گئے چونکہ ان کی بغاوت سخت ہے۔ اس لئے ان کی سزا بھی سخت کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے۔ فرشتوں کی لعنت اور سارے انسانوں کی لعنت اور پھٹکار کہ رب تعالیٰ انہیں آخرت میں ہر رحمت سے دور رکھے گا اور سارے فرشتے اور سارے انسان ان پر لعنت اور پھٹکار اور دوری کی بددعا کریں گے۔ پھر یہ نہیں کہ اس ذلت و مصیبت کی کبھی انتہا ہو جائے بلکہ اس لعنت میں یا لعنت کے عذاب میں ہمیشہ ہی گرفتار رہیں گے۔ اس طرح کہ ہر وقت لوگ انہیں لعنت کرتے رہیں گے یا ہر وقت عذاب ہوتا رہے گا۔ نہ کبھی ان کا عذاب ہلکا ہو نہ احساس عذاب میں کچھ فرق پیدا ہو اور نہ کبھی مہلت دی جائے کہ کچھ دن کے لئے عذاب موقوف ہو جائے تاکہ راحت پا کر تازہ دم ہو جائیں بلکہ مسلسل اور یکساں عذاب رہے گا مگر جو ان جرموں کے بعد سچے دل سے توبہ کرلیں اور اپنے آپ کو اور اپنے اعمال کو سنبھال لیں یا اپنی بگاڑی چیزوں کو درست کردیں تو ان کی بخشش ہو جائے گی کیونکہ اللہ بخشنے والا بھی ہے۔ بہت رحم و کرم والا بھی اپنے دروازے پر آنے والوں کو دھتکارتا نہیں۔

توبہ

توبہ بڑی عبادت ہے۔ قرآن کریم میں اس کا بارہا حکم دیا گیا۔ نیز اس کے بارے میں احادیث بیشمار وارد ہیں۔ اس آیت میں بتایا گیا کہ توبہ وہ تریاق ہے جو گناہ، کفر، شرک غرضکہ ہر روحانی زہر کو دور کرتا ہے۔ قرآن کریم میں کہیں فرمایا گیا تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ۔ (النور:۳۱) کہیں فرمایا گیا اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا۔ غرضکہ توبہ ہر دلی بیماری کا علاج اور ہر دکھ، درد، رنج و غم کی دوا ہے۔ اس کے بارے میں بیشمار حدیثیں وارد ہیں جن میں سے ہم کچھ نقل کرتے ہیں۔ (۱) فرماتے ہیں ﷺ کہ ہم دن میں ستر بار سے زیادہ توبہ کرتے ہیں (بخاری و مشکوٰۃ باب الاستغفار و التوبہ) (۲) فرماتے ہیں ﷺ کہ اے لوگو رب سے توبہ کرو۔ ہم روزانہ سو بار توبہ کرتے ہیں (مسلم و مشکوٰۃ) (۳) حضور ﷺ فرماتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا اے میرے بندو تم دن رات خطائیں کرتے ہو اور ہم گناہ بخشتے ہیں۔ لہٰذا تم ہم سے مغفرت مانگا کرو ہم بخش دیا کریں گے۔ (مسلم و مشکوٰۃ) (۴) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر تم گناہ کرو تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو پیدا کرے جو گناہ کرکے توبہ کریں اور وہ معاف کرے۔ (مسلم) تاکہ اس کی شان غفاری ظاہر ہو۔ (۵) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہر رات کو اپنا دست قدرت پھیلاتا ہے

جانوں کے وارث بن جاؤ، قید کرنا اور ہے اور ان کا وارث و مالک بن جانا کچھ اور، گویا یہ آیت کریمہ ان کی قید کی تفصیل ہے،
تیسرا تعلق: ابھی پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ جو کافر مر جائیں، ان کی بخشش نہیں، اب فرمایا جا رہا ہے کہ کفر کے معنی صرف یہ ہی نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ یا رسول اکرم ﷺ کی ذات کا انکار کیا جائے، بلکہ اس کے احکام کا انکار بھی کفر ہے، جو لوگ اب بھی عورتوں کے مالک و وارث بنیں اور ان کے شرعی حقوق کا انکار کریں وہ بھی کافر ہیں اور نا قابلِ بخشش، گویا پہلے کفر کا اجمالی ذکر تھا، اب اس کی کچھ تفصیل بیان ہو رہی ہے،

شانِ نزول

اس آیت کریمہ کے شانِ نزول کے متعلق چند روایات ہیں،

۱۔ ابن جریر و ابن ابی حاتم نے سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی، کہ زمانہ جاہلیت میں کوئی شخص مر جاتا، تو اس کے وارث مرد اس کے مال کے ساتھ اس کی بیوی کے بھی مالک بن جاتے تھے کہ اس کی بیوی کا دیور یا اس کا سوتیلا بیٹا اس بیوہ پر کوئی چادر وغیرہ ڈال دیتا اور کہتا کہ میں اس کا بھی آج سے مالک ہو گیا پھر اگر چاہتا تو کسی سے اس کا نکاح کرا دیتا، جس کا مہر خود لیتا، ورنہ اسے اپنے گھر ہی میں لونڈی کی طرح خادمہ بنا کر رکھتا، اس کے روکنے کے لئے آیت کریمہ کا پہلا حصہ کَرۡهًا تک نازل ہوا، کبھی خود دیور اس سے نکاح کرتا، مگر بغیر مہر کے اور کہتا کہ جو میرا بھائی مہر دے چکا وہ کافی ہے، (تفسیر روح المعانی خازن، جلالین وخزائن وغیرہ)

۲۔ ابن منذر نے حضرت عکرمہ سے روایت کی کہ قبیلہ انصار کی ایک بی بی حضرت کبشہ بنت معن ابن عاصم حضرت ابوقیس ابن اسلت کے نکاح میں تھیں کہ بیوہ ہو گئیں، ابوقیس کے بیٹے نے جو دوسری بیوی سے تھا ان پر قبضہ کر لیا، وہ بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہو کر فریادی ہوئیں کہ یارسول اللہ میں بیوہ ہو گئی ہوں، مگر نہ تو اپنے خاوند کی وارث ہوئی، اور نہ مجھے نکاح ثانی کرنے کا حق ملا، اب میں بقیہ زندگی کیسے گذاروں؟ تب اس آیت کریمہ کا پہلا جملہ نازل ہوا، (معانی، خازن وغیرہ)

۳۔ امام زہری فرماتے ہیں، کہ بعض خاوند جن کو اپنی بیویاں ناپسند ہوتی تھیں، تو وہ انہیں نہ تو اچھی طرح بساتے ہی تھے اور نہ انہیں طلاق ہی دیتے تھے بلکہ ان کی موت کا انتظار کرتے تھے تا کہ ان کے گھر ان کے نکاح میں وہ عورت فوت ہو، اور اس کی تمام میراث یہ لیں، ان کو اس ظلم سے روکنے کے لئے اس آیت کریمہ کا دوسرا جملہ وَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ الخ نازل ہوا، (معانی وغیرہ)

۴۔ زمانہء جاہلیت میں بعض ظالم خاوند اپنی بیویوں کو طلاق دیتے، جب عدت قریب الختم ہوتی، تو رجوع کر لیتے ایسے ہی سالہا سال تک کرتے رہتے، کیونکہ ان کے ہاں طلاق کی تعداد مقرر نہ تھی، اس صورت میں یہ عورت نہ تو اس کے گھر ہی آباد ہوتی کہ مطلقہ ہے اور نہ دوسری جگہ نکاح کر سکتی کہ اس کی عدت پوری ہونے نہ دی جاتی، غرضکہ اس کی زندگی برباد کر دیتے، ان تمام ظالم خاوندوں کو اس ظلم سے روکنے کے لئے آیت کریمہ کا آخری جزء وَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ الخ نازل ہوا (خزائن العرفان) ان واقعات سے موجودہ زمانہ کے ان ظالم خاوندوں کو عبرت لینی چاہیے جنہوں نے اپنی بیویوں کی زندگی وبال کر رکھی ہے، یہ لوگ ان ہی ظالم کفار کے نقش قدم پر ہیں، یاد رکھو کہ قیامت قریب ہے اللہ حسیب ہے،

ہوتا ہے اور درجے بلند ہوتے ہیں۔ پھر توبہ کے مختلف درجے ہیں۔(۱) وہ توبہ جس سے گناہ معاف ہو جائیں۔(۲) وہ توبہ جس سے گناہ کی بخشش ہو کر توبہ کرنے والے کو ولایت حاصل ہو جائے۔ غرض جیسی توبہ اور جیسا توبہ کرانے والا ویسا اس کا اثر۔ حضور غوث پاک اور حضرت رابعہ بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے چور ایک دم ولی بن گئے۔ یہ توبہ کرانے والوں کا فیض تھا۔

توبہ کے شرائط و مستحبات وغیرہ

جیسے نماز کے لئے کچھ فرائض ہیں' کچھ واجبات' کچھ سنن' کچھ مستحبات۔ ایسے ہی توبہ کے لئے بھی اور جیسے نماز کے لئے کچھ ادا کی شرطیں ہیں' کچھ قبولیت کی۔ ایسے ہی توبہ کے لئے کچھ شرائط جواز ہیں کچھ شرائط قبولیت اور جیسے کہ نماز کے لئے کچھ اوقات مستحبہ ہیں' کچھ وقت مکروہ۔ ایسے ہی توبہ کے لئے **چنانچہ** توبہ کے شرائط یہ ہیں۔(۱) وقت پر توبہ کرے۔ توبہ مشرک کا وقت غرغرہ سے پہلے ہے۔(۲) توبہ کرتے وقت گناہ کا ارادہ نہ ہو بلکہ گناہ سے باز رہنے کا پورا قصد ہو۔(۳) توبہ کے وقت گذشتہ گناہوں پر پشیمانی ہو۔ (۴) قبولیت توبہ کا یقین نہ ہو بلکہ رب تعالیٰ کے کرم سے امید اور اس کے قہر سے خوف ہو۔ (۵) جیسا گناہ ہو ویسی توبہ کرے کہ علانیہ گناہ کی علانیہ توبہ۔ چھپے گناہ کی چھپی توبہ۔ مگر یہ شرط شریعت کے لحاظ سے ہے۔ جس پر شرعی احکام جاری ہوتے ہیں۔ اگر کافر دل سے توبہ کر کے مرے اور کسی کو ظاہر نہ کرے وہ شرعاً کافر ہے کہ اس کی تجہیز و تکفین وغیرہ نہ ہوگی مگر عند اللہ مومن ہے۔(۶) اگر ممکن ہو تو گذشتہ گناہ کا بدلہ کرے۔ لہٰذا چھوڑی ہوئی نمازیں قضا کرے۔ مارا ہوا قرض ادا کرے۔(۷) جن گناہوں کا بدلہ نہیں ہو سکتا۔ ان کا کفارہ دے۔ حضرت وحشی نے زمانہ کفر میں سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا تھا تو مسلمان ہو کر مسیلمہ کذاب کو مار کر اس کا کفارہ ادا کیا۔ حضرت خالد ابن ولید و عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی تلوار سے جیسے مسلمان شہید ہوئے ویسے ہی اسلام لانے کے بعد کافر مارے گئے۔ یہ کفارہ ہوا۔(۸) توبہ کا وقت مستحب یہ ہے کہ گناہ کی طاقت ہوتے ہوئے توبہ کرے۔ مثل مشہور ہے کہ بڑھیا رنڈی اور معزول حاکم۔ زنا اور ظلم سے توبہ نہ کریں تو کیا کریں۔ مجبور کی توبہ اگرچہ مقبول ہے مگر قادر کی توبہ کا درجہ بلند۔ شعر ؎

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری است — وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیزگار

توبہ کے یہ اجمالی مسائل بیان کئے گئے۔ انشاء اللہ اس کے تفصیلی احکام اس آیت کی تفسیر میں آئیں گے۔ **اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ** الخ (النساء:۱۷)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کفار پر نام لے کر اور گنہگار مسلمان پر بغیر نام لئے صرف اس کے وصف کے ساتھ لعنت کرنا جائز ہے مثلاً کہہ سکتے ہیں کہ جھوٹوں پر خدا کی لعنت' یہ نہیں کہہ سکتے کہ زید پر خدا کی لعنت۔ جیسا کہ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ سے معلوم ہوا۔ مرے بعد کسی کافر پر بھی لعنت جائز نہیں جب تک کہ اس کا کفر پر مرنا یقین سے معلوم نہ ہو۔ لہٰذا سوائے ابوجہل' ابولہب' امیہ ابن خلف فرعون وغیرہ ان کافروں کے جن کا کفر پر مرنا نص سے ثابت ہے اور کسی پر لعنت نہیں کر سکتے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندگی میں ملعون تھا۔ انشاء اللہ لعنت کی پوری تحقیق اٹھارویں سیپارہ آیت لعان میں آئے

مگر ابن جریر نے حضرت حسن سے روایت کی کہ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ سے مراد زنا و بدکاری ہے، اس صورت میں یہ آیت منسوخ ہے کہ جیسے پہلے پہلے زانیہ کو گھر میں قید کر دینے کا حکم تھا ویسے ہی زانیہ کو مہر واپس لے کر چھوڑ دینے کا بھی حکم تھا، زنا کی سزا مقرر ہو جانے سے دونوں حکم منسوخ ہو گئے، مگر پہلی تفسیر زیادہ قوی ہے (روح المعانی، خازن، کبیر، روح البیان وغیرہ) مُّبَیِّنَۃٍ ی کے فتح سے بھی ہو سکتا ہے، اور ی کے کسرہ سے بھی، ہماری قرأت ی کے کسرہ سے ہے، یعنی ہاں اگر عورتیں تیز زبان، نافرمان، بد خلق ہو جائیں تو اے خاوندو! تم کو اجازت ہے کہ تم مہر واپس لے کر انہیں طلاق دو، اس طرح کہ عورت خلع کرے، اس صورت میں خلع کے تم گنہگار نہ ہو گے وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ یہ تیسرا حکم ہے اور اس میں بھی خاوندوں کو خطاب ہے، عَاشِرُوْا معاشرت سے بنا جس کے معنی بارہا عرض کئے جا چکے ہیں، اس کا مصدر معاشرت ہے مادہ عَشْرٌ جس کے معنی ہیں کمال و خوبی، دس کو عشر اسی واسطے کہتے ہیں کہ وہاں دہائی پوری ہو جاتی ہے کنبہ کو عشیرہ اسی واسطے کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنے کنبے کی وجہ سے کامل ہوتا ہے اور اس کی زندگی بخوبی گذرتی ہے، (غیاث) اب اصطلاح میں اچھے برتاؤ اور بہترین مخالطت، هُنَّ سے مراد بیویاں ہیں اور مَعْرُوْفِ سے مراد ہر اچھا طریقہ گفتگو، اچھی زندگی باری میں انصاف، روزی میں برابری ہے یعنی اے خاوندو! اپنی بیویوں سے وہ برتاوے کرو جو شرعاً جانے پہچانے ہوں، اچھے ہوں، یہ ایک کلمہ ساری تدبیر منزل کو لئے ہوئے ہے فَاِنْ کَرِهْتُمُوْهُنَّ یہ چوتھی بات فرمائی جا رہی ہے، اس میں خطاب خاوندوں سے ہے اور هُنَّ سے مراد بیویاں، کَرِهْتُمْ کَرْهٌ سے بنا بمعنی ناپسندیدگی، اور اس سے مراد وہ ناپسندیدگی ہے جو خاوند کے دل میں پیدا ہو جائے، عورت کا اس میں کوئی قصور نہ ہو، جیسے عورت کی شکل پسند نہ آنا وغیرہ یعنی اگر تم عورت کی شکل و صورت یا کسی وجہ سے خود بخود اسے ناپسند کرو، تو ہرگز طلاق میں جلدی نہ کرو، کیونکہ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْــٴًـا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا، یہاں ف جزائیہ نہیں، اور نہ یہ جملہ گذشتہ مذکورہ شرط کی جزاء ہے، اس کی جزاء تو پوشیدہ ہے، یہ اس پوشیدہ جزاء کی علت ہے اور ف تعلیلیہ، شَیْــٴًـا سے مراد مطلقاً چیز ہے، جس میں عورت بھی داخل ہے یا مراد ایسی عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھنا ہے اور خَیْرًا كَثِیْرًا سے مراد اجر و ثواب اور اچھی اولاد ہے جو ماں باپ کے لئے توشۂ آخرت بنے، یعنی اگر بیویاں تمہیں ناپسند ہوں تو انہیں جلد طلاق نہ دو، خلع نہ کراؤ بلکہ صبر سے کام لو کیونکہ بہت ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو، مگر اس ناپسند چیز سے تمہیں رب تعالیٰ بہترین نعمت دے دے،

خلاصہ تفسیر

اس آیت کریمہ کی چند تفسیریں ہیں جیسا کہ تفسیر سے معلوم ہوا، یہاں صرف ایک تفسیر عرض کی جاتی ہے کہ لَا یَحِلُّ لَكُمْ میں تو میت کے وارثوں سے خطاب ہے اور لَا تَعْضُلُوْهُنَّ میں خاوندوں سے، اے مسلمانو! تمہارے واسطے یہ ہرگز جائز نہیں، کہ تم اپنے کسی عزیز کی فوتیدگی کے بعد اس کے مال کے ساتھ اس کی بیوی کے بھی جبراً وارث بن جاؤ، کہ اس کی بیوہ کو اپنے قبضہ میں کر لو کہ چاہو تو جبراً اسے اپنے نکاح میں لے آؤ، اور چاہو تو دوسرے سے نکاح کر دو، اور اس کے مہر پر خود قبضہ کر لو، اور چاہو تو اسے یوں ہی گھر میں بٹھا رکھو، یہ صریح ظلم ہے ہرگز جائز نہیں، اب وہ اپنے نفس کی مختار ہیں اور اے خاوندو تم اپنی بیویوں کو اس نیت سے تنگ نہ کرو کہ وہ تمہارے پنجۂ ظلم سے تنگ آ کر خلع کرنے پر آمادہ ہو جائیں، کہ تمہارا دیا ہوا کل یا بعض مہر وعطیے

کیونکہ تکلیف بقدر طاقت ہے نہ کہ طاقت سے زیادہ۔ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ کی ف سے معلوم ہوا کہ اگر لوگ توبہ کریں تب تو خدا غفور رحیم ہے ورنہ نہیں تو کیا اس کے صفات شرائط پر موقوف ہیں کہ ہم توبہ کریں تو وہ غفور رحیم ہو ورنہ نہ ہو۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک وہ جو تفسیر میں گذر گیا کہ یہ ف تعلیلیہ ہے اور ان اللہ الخ پوشیدہ جملے کی علت اور وہ جملہ پوشیدہ شرط کی جزا ہے۔ یعنی فَيَغْفِرُ لَهُمْ فَاِنَّ اللّٰهِ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ دوسرے یہ کہ ف جزائیہ ہے اور غفور رحیم سے ان کا گناہ بخشنا اور ان پر رحم کرنا مراد ہے یعنی جو توبہ کرلے اللہ اس کے لئے غفور رحیم ہے۔ خلاصہ یہ کہ صفات اور ہیں افعال کچھ اور خدا کی صفتیں قدیم ہیں مگر ان کے تعلقات حادث۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت کے شانِ نزول سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت مرتد ہوگئی۔ جن میں حارث ابن سوید اور ان کے کچھ ساتھی دوبارہ اسلام لائے۔ باقی کفر پر قائم رہے اور مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ سارے صحابہ متقی پرہیزگار ہیں۔ ان میں فاسق کوئی نہیں۔ اس واقعہ سے پتہ لگا کہ صحابہ فاسق تو کیا مرتد بھی ہوئے۔ (رافضی) **جواب:** صحابی وہ ہیں جو بحالت اسلام حضور علیہ السلام کی زیارت کریں اور اسلام پر ہی ان کا خاتمہ ہو۔ مرتد ہو کر مرنے والے صحابی نہیں کفار ہیں۔ نیز صحابہ کرام معصوم نہیں۔ عادل و متقی ہیں یعنی وہ گناہ پر اڑتے نہیں۔ اگر گناہ ہو جائے تو توبہ کرلیتے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

گناہ حجاب ہیں۔ اور توبہ ان کی قینچی۔ نیک اعمال و اصلاح نفس اس قینچی کی دھار مضبوط حجاب کے پھاڑنے کے لئے نہایت تیز قینچی چاہیے۔ معمولی حجاب کے لئے معمولی قینچی کافی ہے۔ اسی طرح حجاب کفر پھاڑنے کے لئے خاص توبہ کی قینچی اور اس پر اصلاحِ نفس و اصلاح اعمال گذشتہ پر ندامات۔ آئندہ کے لئے عہد پرہیزگاری کی دھار ضروری ہے۔ اس آیت کریمہ میں اسی کا ذکر ہے کہ کفار کا عذاب نہایت سخت ہے لیکن توبہ اور اصلاح عمل و تزکیہ نفس ان سب کا دفعیہ ہے مگر مرد کامل کی نگاہ سب سے زیادہ تاثیر والی ہے کہ آن میں گنہگار کو پرہیزگار اور فساق و فجار کو صاحب اسرار بنا دیتی ہے۔ ان کی بات ان کی ملاقات گناہوں کو برباد کر دیتی ہے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ کفار پر رب کی لعنت یہ ہے کہ ان کے دل سخت کر دیئے جاویں ان کے کان بہرے اور آنکھیں اندھی ہو جاویں کہ نہ کان حق سن سکیں نہ آنکھیں حق دیکھ سکیں۔ جیسے کہ نرم زمین میں دانہ بویا جاتا ہے۔ لوہا نرم کر کے کوٹا پیٹا جاتا ہے۔ آٹا پانی کے ذریعہ نرم کر کے روٹی وغیرہ بنتا ہے۔ مٹی پانی سے نرم ہو کر برتن وغیرہ بنتی ہے۔ سونا آگ سے نرم ہو کر زیور بنتا ہے۔ ایسے ہی انسان نرم دل ہو کر مومن عارف وغیرہ بن سکتا ہے۔ روئی میں جب تک سخت بنولہ موجود ہے نہ اس کا تار بنے نہ کپڑا وغیرہ۔ یونہی جب تک دل میں تکبر و کفر وغیرہ کی سختی ہے۔ انسان کچھ نہیں بن سکتا۔

حکایت: سری سقطی فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن کہا۔ تعجب ہے اس ضعیف پر جو قوی کی مخالفت کرے۔ دوسرے دن جب میں نماز فجر سے فارغ ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوبصورت مالدار نوجوان اپنے غلاموں کے ساتھ گھوڑے پر سوار مسجد میں آیا اور پوچھا تم میں سری سقطی کون ہیں۔ لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا کل تم نے کہا تھا کہ اس کمزور سے تعجب ہے جو قوی کی مخالفت کرے۔ اس کا مطلب کیا میں نے کہا کہ انسان بہت کمزور ہے اور رب تعالیٰ قوی مگر اس کمزوری کے باوجود وہ رب تعالیٰ کی مخالفت کی ہمت کرتا ہے جوان بہت رویا اور بولا کہ کیا پروردگار مجھ

رب تعالیٰ نے خیر بھی فرمایا اور کثیر بھی، **تیرھواں فائدہ:** امیر آدمی کو چاہیے کہ عورت کو خادمہ بھی دے، جبکہ وہ بڑے امیر گھرانے کی ہو کہ عَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ میں یہ بھی داخل ہے (روح المعانی)

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جبراً بیوہ عورت کا مالک ووارث بن جانا منع ہے تو چاہیے کہ عورت کی خوشی و مرضی سے اس کا ولی بن جانا درست ہو، کہ رب تعالیٰ نے فرمایا كَرْهًا الخ حالانکہ آزاد عورت کا کوئی مالک نہیں ہوسکتا، نہ جبراً نہ عورت کی خوشی سے، **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ یہاں جبراً کی قید اتفاقی ہے نہ کہ احترازی، چونکہ اہل عرب جبراً ہی مرحوم عزیز کی بیویوں کے وارث بن جاتے تھے، اسی لئے اس کا ذکر فرمایا، رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ دگنا تگنا سود نہ کھاؤ، اس کا مطلب یہ نہیں کہ سوایا ڈیوڑھا کھالیا کرو، دوسرے یہ کہ ہاں واقعی اگر بیوہ عورت خود اپنے دیور وغیرہ کو اپنا والی وارث مان لے، اور اپنے انتظامات اس سے کرائے تو درست ہے اب بھی بعض شریف عورتیں بیوہ ہو کر بھی اپنے سسر ساس کو اپنا اختیار دے دیتی ہیں کہ وہ ہی ان کے نکاح ثانی کا انتظام کرتے ہیں، یہ بہت اچھا ہے جس چیز سے یہاں روکا گیا ہے وہ چیز ہی کچھ اور ہے، **دوسرا اعتراض:** تمہاری تفسیر وفوائد سے معلوم ہوا کہ عورت کا مہر خود اسی کا اپنا ہے، ماں باپ بھی نہیں لے سکتے، تو حضرت شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نکاح میں اپنی دختر صفورا رضی اللہ عنہا دیں اور ان کا مہر مقرر کیا دس سال بکریاں چرانا، اس میں لڑکی کا مہر خود لینا ہے، تمہاری تفسیر اس آیت کے خلاف ہے، **جواب:** موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بکریاں چرانا مہر نہ تھا بلکہ شرط نکاح تھی، شرط نکاح اور ہے مہر کچھ اور، اس لئے انہوں نے فرمایا تھا عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِىْ ثَمٰنِىَ حِجَجٍ (قصص: ۲۷) علی شرط کے لئے آتا ہے نہ کہ معاوضہ کے لئے، نیز مہر مال ہوتا ہے نہ کہ خدمت، بہر حال وہ شرط نکاح تھی، **تیسرا اعتراض:** یہاں آیت کریمہ میں بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ کا ذکر علیحدہ کیا اور ناپسندیدگی کا ذکر علیحدہ کہ بعد میں فرمایا فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ الخ ان دونوں میں فرق کیا ہے، آیت میں تکرار معلوم ہوتی ہے؟ **جواب:** ان دونوں کا فرق تفسیر میں عرض کیا گیا کہ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ میں تو عورتوں کے اپنے قصور کا ذکر ہے، اور کراہیت وناپسندیدگی سے مراد وہ صورت ہے کہ عورت کا قصور کوئی نہ ہو، یوں ہی مرد کو ناپسند ہو جیسے قد یا شکل اچھی نہ ہونا، لہٰذا آیت میں تکرار نہیں،

تفسیر صوفیانہ

کمال تقویٰ کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنی عبادات بھی درست کرے اور معاملات بھی ٹھیک کرے، معاملات میں بہت اہم وضروری معاملہ اپنی بیویوں اور بیوہ عورتوں سے انصاف کرنا ہے کہ عورتیں عموماً خلق کی تنگ، عقل کی کمزور واقع ہوتی ہیں، عورتوں سے اچھا برتاؤ کرنے والا اور ناپسند بی بی پر صبر کرنے والا بڑا مجاہد ہے، جو شخص بڑا عابد وزاہد ہو، مگر اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہو، وہ سخت عذاب کا مستحق ہے اور جو عبادات مناسب ہی کرتا ہو، مگر بال بچوں پر مہربان ہو یا ناپسند وسخت بیوی پر صبر کرتا ہو، وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بندہ ہے،

ایک سے ان میں سے بھر کر زمین سونا اگرچہ فدیہ دے وہ اس کا یہ لوگ ہیں کہ واسطے ان

زمیں بھر سونا ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اگرچہ اپنی خلاصی کو دے ان

عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٩١﴾

کے عذاب ہے دردناک اور نہیں ہے واسطے ان کے کوئی مددگار

کے لئے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی یار نہیں

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں توبہ کا ذکر تھا۔ اب توبہ مردود کا تذکرہ ہے۔ **دوسرا تعلق:** کفار تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ جنہیں رب تعالیٰ کے فضل سے توبہ مقبول نصیب ہو جائے۔ دوسرے وہ جو توبہ کریں مگر توبہ مردود۔ تیسرے وہ جنہیں توبہ نصیب ہی نہ ہو اور بغیر توبہ مر جائیں۔ پچھلی آیت میں پہلی جماعت کا ذکر تھا۔ اب لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ میں دوسری جماعت کا اور وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ میں تیسری جماعت کا ذکر ہے۔ گویا مجرمین کا ترتیب وار ذکر ہو رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں گناہ مٹانے والی دوا یعنی توبہ کا ذکر تھا۔ اب توبہ برباد کرنے والے گناہوں کا ذکر ہے۔ گویا بعض گناہ وہ ہیں جو توبہ سے مٹتے ہیں اور بعض وہ جو توبہ کو مٹاتے ہیں۔ پہلی قسم کا ذکر پہلی آیت میں ہوا۔ اور دوسری کا ذکر اب ہے۔

شان نزول

یہود نے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے بعد عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کیا۔ پھر کفر میں یہاں تک بڑھے کہ سید الانبیاء ﷺ اور قرآن کریم کے بھی منکر ہوئے ان کے حق میں پہلی آیت هُمُ الضَّآلُّوْنَ تک اتری (خازن و خزائن عرفان) (۲) یہود اور عیسائیوں نے حضور ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے لوگوں میں آپ کی نبوت کا اعلان کیا پھر آپ کو دیکھ کر کافر ہوئے اور پھر کفر میں اتنے بڑھے کہ حضور ﷺ کے معجزات اور قرآن کریم کو دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے۔ ان سب کے متعلق یہ پہلی آیت هُمُ الضَّآلُّوْنَ۔ تک اتری (تفسیر خزائن عرفان و خازن و روح المعانی) (۳) ابو صالح سوئی اصہانی فرماتے ہیں کہ جب حارث ابن سوید کے ساتھیوں نے دیکھا کہ حارث مرتد ہونے کے بعد مسلمان ہو گئے اور ان کی توبہ قبول ہوئی تو انہوں نے سوچا کہ اسلام کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ جب تک دل چاہے کافر رہو۔ اور جب دل چاہے مسلمان ہو جاؤ۔ جب ہم دوبارہ مسلمان ہوں گے تو حارث کی طرح ہمارے بارے میں بھی یہ آیتیں اتریں گی۔ ان کے حق میں دوسری آیت وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۔ تک نازل ہوئی۔ چنانچہ فتح مکہ کے دن حارث کے ساتھیوں میں سے بعض اسلام لے آئے۔ جن کی توبہ قبول ہوئی اور بعض بحالت کفر ہی مرے۔ (تفسیر خازن و روح المعانی) (۴) بعض علماء نے فرمایا کہ حارث ابن سوید کے کچھ ساتھیوں نے کفر و اسلام کو کھیل سمجھ رکھا تھا کہ کبھی کافر ہو جاتے کبھی مسلمان۔ ان کے بارے میں پہلی آیت اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الضَّآلُّوْنَ تک اتری۔ (روح المعانی)

اور کیونکر اسے واپس لو گے حالانکہ تم میں ایک دوسرے کے
بَعۡضٍ وَّ اَخَذۡنَ مِنۡكُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا ﴿۲۱﴾
بعض تک اور لیا عورتوں نے تم سے عہد مضبوط
سامنے بے پردہ ہولیا اور تم سے گاڑھا عہد لے چکیں

تعلقات

ان آیات کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں خاوندوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ سخت بیویوں کو جلد طلاق نہ دیں حتی الامکان نباہ کریں، اب نباہ نہ ہوسکنے کی صورت میں طلاق دینے کے احکام بتائے جا رہے ہیں کہ طلاق کے بعد دیا ہوا مہر ان سے واپس نہ لیں، غرضکہ پچھلی آیت میں نباہنے کا ذکر تھا، اس آیت میں علیحدگی کا تذکرہ ہے، **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں نافرمان بیویوں پر سختی کرنے کی اجازت دی گئی تھی، اب اس آیت میں غیر فاحشہ عورت پر سختی نہ کرنے کی تاکید ہے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں بیویوں سے زوجیت کی حالت میں اچھا برتاؤ کرنے کا حکم تھا، اب زوجیت منقطع ہو چکنے کے بعد بھی اچھا سلوک کرنے اور گذشتہ صحبت یاد رکھنے کا حکم ہے،

شانِ نزول

اہل عرب جب اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتے اور دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہتے تھے تو اس بے قصور بیوی کو تہمتِ زنا لگا کر بدنام کرتے تھے، اور اسے خوب تنگ کرتے تھے تاکہ یہ بے چاری کچھ رقم دے کر طلاق لے اور خاوند اس رقم سے اپنا دوسرا نکاح کرے، ایسے ظالم خاوندوں کو اس ظلم سے روکنے کے لئے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (تفسیر کبیر، روح المعانی، روح البیان، مدارک و بیضاوی وغیرہ)

تفسیر

وَاِنۡ اَرَدۡتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّكَانَ زَوۡجٍ یہاں اَرَدۡتُّمۡ میں خطاب خاوندوں سے ہے، اِسۡتِبۡدَال سے مراد ہے اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوسری عورت سے نکاح کرنا یا تو اس لئے کہ وہ دوسری عورت بغیر اسے طلاق دیئے نکاح کرنے پر راضی نہ ہو، یا اس لئے کہ اس شخص میں دو بیویاں رکھنے کی طاقت نہ ہو، پہلی زوج سے مراد وہ عورت ہے جس سے مرد نکاح کرنا چاہتا ہے، اور دوسری زوج سے مراد وہ منکوحہ بیوی ہے جسے یہ طلاق دینا چاہتا ہے، خیال رہے کہ لفظ زوج کے معنی ہیں جوڑا، خاوند کو بھی زوج کہتے ہیں بیوی کو بھی، یہاں بیوی مراد ہے، اور چونکہ زوج اسم جنس ہے لہٰذا واحد پر بھی بولا جاسکتا ہے اور جمع پر بھی یہاں جمعیت کے لئے ہے، کیونکہ خطاب تمام مسلمان مردوں سے ہے اور بہت سے مردوں کی بیویاں بھی بہت سی ہی ہوں گی، یعنی اے مسلمانو! اگر تم اپنی بیویوں کی تبدیلی کا ارادہ کرو کہ موجودہ بیویوں کو طلاق دے کر دوسری عورتوں سے نکاح کرو، اِسۡتِبۡدَال کے معنی ہیں بدلہ میں لینا، ابدال کے معنی ہیں بدلے میں دینا، یہاں بدلہ لینا مراد ہے وَّاٰتَيۡتُمۡ اِحۡدٰٮهُنَّ قِنۡطَارًا

زبانی توبہ کرتے ہیں۔ قبول کیسے ہو۔ یا اس لئے کہ نزع کے وقت توبہ کرتے ہیں۔ یا اس لئے کہ وہ کفر سے توبہ کرتے نہیں۔ زیادتی کفر یا گناہوں سے توبہ کرتے ہیں اور کفر کے ہوتے ہوئے گناہوں سے توبہ کیسی۔ ان سب صورتوں میں عند اللہ توبہ مردود ہے۔ یا اس لئے کہ وہ بارہا کفر کر کے توبہ کر چکے۔ یا اس لئے کہ انہوں نے حضور علیہ السلام کی توہین کی ہے۔ اور توہین کی توبہ قبول نہیں۔ ان صورتوں میں شرعاً مردودیت مراد ہے۔ (از معانی و کبیر و خازن وغیرہ) وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الضَّآلُّوْنَ۔ یہ یا تو دوسری سزا ہے اور واؤ عاطفہ ہے اور یہ جملہ لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُھُمْ پر معطوف۔ یا توبہ قبول نہ ہونے کی علت ہے۔ اور ان الذین پر معطوف۔ تب یہ جملہ مستقل ہے۔ (روح المعانی) یعنی ان کافروں کی دو سزائیں ہیں۔ ایک ان کی توبہ قبول نہ ہونا کہ رب تعالیٰ کو کیسے راضی کرنا چاہیے۔ ھم سے حصر کا فائدہ ہوا۔ اور الضآلون سے کامل گمراہ مراد ہیں۔ یعنی کامل گمراہ صرف یہ ہی لوگ ہیں۔ دیگر کفار اگرچہ گمراہ ہیں مگر ان سے کم درجہ کے۔ ناقص توبہ کرنے والوں کے بعد اب ان بدنصیبوں کا ذکر ہے جنہیں ظاہری توبہ بھی نصیب نہیں ہوتی۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ۔ یہاں بھی کفروا سے یا مرتدین مراد ہیں یا اہل کتاب یا عام کفار زیادہ قوی یہ ہی ہے کہ کفر دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو حضرت آدم علیہ السلام سے قیامت تک کفر ہے۔ جیسے مشرک یا توہین نبی یا فرشتوں وغیرہ کا انکار اور بعض وہ جو کبھی ایمان تھے کبھی کفر بن گئے۔ جیسے بہن سے نکاح کا جواز ماننا شریعت حضرت آدم میں ایمان تھا۔ زمانہ نوحی سے کفر بن گیا۔ یا شراب وغیرہ کی حلت یا پچھلے نبیوں کے خصوصی مسائل جو اپنے اپنے زمانوں میں حق تھے۔ اب منسوخ ہو جانے کے بعد باطل ہو گئے اور ان کا ماننا کفر قرار دیا گیا۔ وماتوا کا واؤ عاطفہ ہے اور ماتوا کفروا پر معطوف وھم کفار کا واؤ حالیہ ہے اور یہ جملہ مَاتُوْا کے فاعل سے حال یعنی جو کافر ہوئے اور کافر ہی مر گئے۔ اس طرح کہ انہوں نے کفر سے توبہ کی ہی نہیں۔ لوگ چار قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو مومن جیسے مومن مرے دوسرے وہ جو کافر مرے۔ کہ تیسرے خواہ مومن جئے ہوں یا کافر اور کفر پر مرنے سے مراد یہ ہے کہ غرغرہ کے وقت تک کافر ہے۔ ورنہ بحالت غرغرہ سارے کافر ایمان لے آتے ہیں۔ اگرچہ غرغرہ کے وقت کا ایمان مقبول نہیں۔ لہٰذا آیت پر اعتراض یہ نہیں ہو سکتا کہ مرتے وقت کوئی کافر نہیں ہوتا۔ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِھِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَھَبًا۔ یہ جملہ الذین کفروا کی خبر بمعنی جزا ہے اور چونکہ کفر پر موت فدیہ قبول نہ ہونے کی مستقل علت تھی۔ ممکن نہیں کہ کافر کا فدیہ قبول ہو کر اس کی بخشش ہو جائے اس لئے یہاں ف لائی گئی۔ احدھم سے اس جانب اشارہ ہے کہ کفار کی جماعت نہیں بلکہ اگر ان میں سے ہر ایک زمین بھر سونا دے تو قبول نہ ہو۔ ملء الارض۔ لن یقبل کا نائب فاعل ہے اور ارض سے مراد ساری زمین ہے از مشرق تا مغرب از جنوب تا شمال۔ ذھبًا ملء الارض کی تمیز ہے۔ یعنی ان میں سے کسی کا زمین بھر سونا بھی قبول نہ کیا جائے گا کہ وہ دے کر اپنے کو عذاب سے چھڑا لے۔ وَلَوِ افْتَدٰی بِہٖ۔ یہ واؤ وصلیہ ہے اور لو شرطیہ۔ ابن منیر کہتے ہیں کہ واؤ وصلیہ در حقیقت عاطفہ ہے۔ اس سے پہلے ایک عبارت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور واؤ کا مابعد اس کا معطوف ہوتا ہے۔ جیسے کوئی کہے کہ تو زید کی تعظیم کر اگرچہ وہ تیرے ساتھ برائی کرے یعنی بھلائی کرے تو بھی اور برائی کرے تو بھی۔ بہر حال تعظیم کر۔ ایسے ہی یہاں ہے کہ دنیا میں صدقہ کرے تو بھی مردود اور آخرت میں فدیہ دے تو بھی مردود۔ افتدیٰ فدیہ سے بنا جس کی تفسیر ہم پہلے سیپارہ میں کر چکے۔ بہ کا مرجع یا ذھبًا ہے یا ملء الارض (روح المعانی) اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّ مَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ۔ یہ اگرچہ مستقل

ہے، اس پختگی کے بعد تم مہر کیسے واپس لیتے ہو، وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا، یہ جملہ پہلے جملہ وَقَدْ اَفْضٰى الخ پر معطوف ہے، واؤ عاطفہ ہے اَخَذْنَ کا فاعل وہ بیویاں ہیں جنہیں خاوند طلاق دینا چاہتے ہیں، مِنْكُمْ میں خطاب خاوندوں سے ہے، میثاق کے معنی اور وعدہ، عہد، میثاق میں فرق تیسرے پارے میں عرض کیا گیا، غلیظ کے معنی ہیں موٹا، مضبوط خفیف کا مقابل، اس میثاق غلیظ سے مراد یا تو رب تعالیٰ کے وہ سخت احکام ہیں جو خاوندوں کو بیویوں کے متعلق دیئے گئے یا نبی کریم ﷺ کی وہ تاکیدیں ہیں جو آپ نے مردوں کو عورتوں کے متعلق فرمائیں کہ وفات شریف کے وقت بھی بیویوں کے ساتھ اچھے برتاوے کا حکم دیا، وہ عہد و پیمان مراد ہیں جو نکاح کے وقت خاوند سے عورت کے متعلق لئے جاتے ہیں یا خود نکاح کا ایجاب قبول ہی مراد ہے کیونکہ ایجاب وقبول تمام حقوقِ نکاح پورے کرنے کے وعدے کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، یعنی تم یہ مال واپس لینے کی جرأت کیسے کرتے ہو، حالانکہ عورتوں نے تم سے بذریعہ قرآن وحدیث یا بذریعہ نکاح خواں بہت سخت تاکیدی مضبوط وعدے لے لئے ہیں، تم عقد نکاح کے وقت ہی ان کے تمام حقوق کے ذمہ دار بن چکے ہو، اب ایسے پختہ وعدے توڑنے کی جرأت کیسے کرتے ہو، اللہ سے خوف کیوں نہیں کرتے،

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! اگر تمہارے تعلقات اپنی بیویوں سے اس قدر خراب ہو جائیں کہ نباہ کی کوئی صورت نہ رہے، اور تم کو ان کے ساتھ رہنے میں تم دونوں کی زندگی برباد ہونے کا اندیشہ ہو، اس لئے تم تبدیلِ زوجہ پر مجبور ہو جاؤ کہ موجودہ بیوی کو طلاق دے دو، اور دوسری بیوی سے نکاح کرو، تو خیر ایسا کرلو، مگر اس صورت میں یہ خیال رہے کہ اگر تم نے انہیں بہت زیادہ مہر، سوغاتیں، عطیے، چڑھاوے دے دیئے ہوں تو ان میں سے حبہ بھر واپس نہ لو، یا جس قدر دینے کا وعدہ کرلیا ہو، اس میں سے کچھ بھی کم نہ کرو، کیا تم ان بیویوں کو بہتان لگانے اور خود سخت گنہگار ہونے کے لئے واپس لیتے ہو کہ لوگ سمجھیں کہ شاید عورت کا قصور تھا، جس کی وجہ سے اس نے مال دے کر طلاق لی، قصور تمہارا اپنا ہے کہ اس کے ساتھ نباہ نہیں چاہتے، اور تھوپتے ہو عورت کے سر، یہ سخت جرم ہے، بہت تعجب وحیرت کی بات ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ خلوتیں کر چکے، تنہائی میں رہ چکے، جس سے مہر کی تاکید ہو جاتی ہے، نیز وہ عورتیں تم سے اچھے برتاوے کا مضبوط عہد لے چکیں، اللہ رسول کو ضامن دے کر تم ان سے بہت کچھ وعدے کر چکے، پھر بھی تم ان سے بے وفائی کر کے انہیں دیا ہوا مال چھینتے ہو، ایسا ہرگز نہ کرو، ورنہ سخت مجرم ہو گے، جس کی دنیا میں بھی سزا پاؤ گے اور آخرت میں بھی پاداش بھگتو گے،

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** طلاق میں خاوند مستقل ہے، عورت کو حق نہیں کہ وہ خاوند بدل لے، ہاں خاوند کو حق ہے کہ وہ بیوی تبدیل کرلے، کہ موجودہ بیوی کو طلاق دے دے، دوسری عورت سے نکاح کرلے، جیسا کہ اِسْتِبْدَالَ زَوْجٍ سے معلوم ہوا، رب تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے اَلَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (بقرہ: ۲۳۷) مرد کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ اسے کھول سکتا ہے، **دوسرا فائدہ:** مہر وعطیہ خاوند اپنی بیوی کو دے، بیوی پر نہ مہر ہے نہ

توبہ قبول نہیں جیسا کہ لَنْ تُقْبَلُ تَوْبَتُهُمْ سے معلوم ہوا۔ اس کی نفیس تحقیق تفسیر میں ہو چکی۔ **مسئلہ:** شامی باب المرتدین میں ہے کہ گیارہ شخصوں کی توبہ قبول نہیں۔ (۱) جو بار بار مرتد ہو جائے۔ (۲) حضور علیہ السلام کی توہین کرنے والا۔ (۳) صدیق اکبر فاروق اعظم میں سے کسی کو گالیاں دینے والا۔ (۴) جادوگر (۵) زندیق (جس کا کوئی دین نہ ہو) (۶) خناق (جو لوگوں کو گلا گھونٹ کر مار ڈالتا ہو) (۷) کاھن (نجومی جو غیب کی خبریں دے) (۸) ملحد (وہ مدعی اسلام جو کفری عقائد کو اسلام بتائے۔ (۹) اباحی (جو ہر چیز کو حلال جانے) (۱۰) منافق (۱۱) ضروریات دین کا دل میں منکر اور زبان سے مدعی۔ خیال رہے کہ ان میں سے بعض کفار ہیں۔ بعض مرتدین اور بعض گنہگار ایسے ہی ڈاکو اہل ہوا۔ زانی' چور' شرابی وغیرہ کی توبہ قبول نہیں۔ یعنی یہ لوگ توبہ کر کے سزاؤں سے نہیں بچ سکتے مگر ان کی توبہ شرعاً نامقبول ہے نہ کہ عنداللہ **چوتھا فائدہ:** جو توبہ شرائط قبول سے خالی ہو وہ اللہ کے نزدیک نامقبول ہے۔ **پانچواں فائدہ:** کفر پر موت دائمی عذاب کا سبب ہے۔ جو کوئی مومن ہو کر مرے۔ زندگی میں کافر رہے' ناجی ہے۔ جیسا کہ وَمَا تُوا وَهُمْ كُفَّارٌ۔ سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** قیامت میں فدیہ قبول نہ ہونا اور مددگار نہ ہونا کافروں کے لئے خاص ہے۔ انشاء اللہ مسلمان کا فدیہ بھی قبول ہوگا اور اس کی نیکیاں صدقات گناہوں کا کفارہ بنیں گے اور مسلمان کے مددگار بھی بہت ہیں۔ انبیاء اولیاء وعلماء وغیرہ جیسا کہ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَّصِرِيْنَ۔ اور مِنْ اَحَدِهِمْ۔ سے معلوم ہوا۔

لطیفہ: دیوبندی وہابی کہتے پھرتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی مددگار نہیں۔ ان سے کہنا چاہیے کہ بے شک کافروں کے لئے رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۔ (بقرہ: ۲۷۰) اور فرماتا ہے وَمَا لَهُمْ مِنْ نَّصِرِيْنَ۔ مسلمانوں کے لئے رب تعالیٰ نے بہت مددگار پیدا فرمائے۔ خود فرماتا ہے۔ وَاَلْحَقْنٰهُمْ ذُرِّيَّتَهُمْ بِاِيْمَانٍ۔ (طور: ۲۱) ایسے ہی یہ لوگ کہتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء نہیں سنتے۔ ان سے کہہ دو بے شک وہ تمہاری نہیں سنتے ہماری سنتے ہیں۔ دشمنوں کی کوئی نہیں سنتا نہ انہیں کوئی دیکھے۔ لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ۔ (آل عمران: ۷۷) خود رب تعالیٰ فرمائے گا اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ۔ (مومنون: ۱۰۸) وہیں پڑے رہو بات مت کرو۔ نیز یہ کہتے ہیں کہ کفنی لکھنا قبر پر اذان تلقین دعا بعد نماز جنازہ حرام ہے۔ کہہ دو کہ تمہیں تو کفن دینا اور تم پر نماز جنازہ پڑھنا بھی حرام ہے کیونکہ یہ چیزیں مسلمانوں کے لئے ہیں نہ کہ کفار کے لئے۔ اس کی پوری تحقیق ہماری کتاب جاء الحق میں دیکھو۔ **ساتواں فائدہ:** کافر کی توبہ گناہ نامقبول ہے۔ اسے چاہیے کہ پہلے کفر سے توبہ کرے پھر گناہوں سے جیسا کہ لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ۔ کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا۔ **آٹھواں فائدہ** ہر کافر شرعی احکام کا مکلف ہے۔ اس پر واجب ہے کہ مسلمان ہو کر نماز پڑھے۔ قیامت میں کفر کا بھی عذاب پائے گا۔ اور نماز وغیرہ نہ پڑھنے کا بھی۔ یہ بھی لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ۔ کی اسی تفسیر سے معلوم ہوا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب جنتی جہنمی سے پوچھیں گے۔ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ۔ (مدثر: ۴۲) تمہیں دوزخ میں کون چیز لائی تو وہ جواب دیں گے۔ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَ لَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ۔ الخ (مدثر: ۴۴) **نواں فائدہ:** کافر کی نیکیاں مردود ہیں جیسا کہ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِلْءُ الْاَرْضِ۔ سے معلوم ہوا کیونکہ اس کے معنے ایک یہ بھی ہیں کہ اگر کافر نے زندگی میں زمین بھر سونا خیرات کیا ہو تو بھی مردود اور فدیہ دے تو بھی نامقبول (کبیر) **دسواں فائدہ:** شفاعت برحق ہے۔ کفار کیلئے فرمایا گیا کہ ان کا کوئی مددگار نہیں

ہی معنی ہیں جو تفسیر میں عرض کئے گئے، کہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوسری عورت سے نکاح کرنا، اس طلاق کی دو تین وجہیں ہوتی ہیں، دوسری عورت سوکن پر آنا پسند نہ کرے، خاوند میں دو عورتیں رکھنے کی طاقت نہ ہو، خاوند کا دل موجودہ بیوی سے لگتا نہ ہو، اور گذارہ کی کوئی صورت نہ رہے، **دوسرا اعتراض:** جب خاوند کو بیوی بدلنے کا حق ہے تو چاہیے کہ بیوی کو بھی خاوند بدلنے کا حق ہو، انصاف چاہیے، ایک کو تبدیلی کا حق دینا، دوسرے کو نہ دینا ظلم ہے، (آریہ ہندو) **جواب:** پنڈت جی آپ نے آدھی بات کہی، پورا انصاف کرو، یہ بھی ظلم ہے کہ عورت بچے جنے مرد نہ جنے، چاہیے یہ کہ ایک سال پنڈت جی بچے دیں، دوسرے سال پنڈ تانی، یہ کیا کہ ہر سال پنڈ تانی ہی بچے دیا کریں، یہ بھی ظلم ہے کہ سارا خرچہ خاوند کے ذمہ ہی ہو، بلکہ چاہیے یہ کہ ایک سال پنڈت جی نوکری کریں اور پنڈ تانی جی گھر سنبھالیں، اور دوسرے سال پنڈ تانی جی محنت مزدوری کریں اور پنڈت جی گھر سنبھالیں، پنڈت جی عورتوں کو طلاق کا حق دینا گویا دیوانہ کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے، پھر دن بھر میں پانچ پانچ طلاقیں ہوں گی، دیکھ لو آج امریکہ اور انگلینڈ میں طلاقوں کی کیسی بھر مار ہے کہ وہ لوگ چیخ پڑے ہیں، **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ بیوی کا مہر بہت زیادہ بھی باندھا جا سکتا ہے جسے رب تعالیٰ نے قنطار یعنی ڈھیر فرمایا، مگر حدیث شریف میں زیادہ مہر باندھنے کی ممانعت فرمائی، حتیٰ کہ خود حضور انور ﷺ کے اپنی ازواج کے مہر پانچ سو درہم یعنی سوا سو روپیہ تھے اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مہر چار سو مثقال چاندی یعنی ڈیڑھ سو تولہ چاندی تھا، آیت وحدیث میں تعارض ہے، **جواب:** ہرگز نہیں، قرآن کریم کی یہ آیت بیانِ جواز کے لئے ہے کہ اگر کوئی شخص لاکھوں روپیہ مہر مقرر کر دے، تب بھی اسے ادا کرنا پڑیں گے، اور حدیث شریف کا فرمان بیان استحباب کے لئے یعنی بہتر یہ ہے کہ مہر ہلکا ہوتا کہ بیوی خاوند پر بوجھ نہ بن جائے، خود حضرت ام حبیبہ زوجہ رسول اللہ ﷺ کا مہر بارہ ہزار درہم تھا جو نجاشی بادشاہ نے باندھا تھا، حضور انور ﷺ نے اسے جائز رکھا، یہ بیانِ جواز کے لئے تھا، لہٰذا آیت وحدیث میں تعارض نہیں، بلکہ اب علماء فرماتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں مہر زیادہ باندھنا بہتر ہے کہ خاوند کسی قدر دبا رہتا ہے، جلد طلاق دینے کی ہمت نہیں کرتا آج کل عموماً خاوند ظالم ہیں، یہ زیادتی مہر ظلم سے بچنے کی ایک تدبیر ہے، **چوتھا اعتراض:** حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسے بے علم تھے کہ انہیں قرآن کریم کی اس صریح آیت کا بھی علم نہ تھا، خود کہہ بیٹھے کہ عمر سے زیادہ قریش کی ایک عورت کا علم ہے، ایسے بے علم آدمی کی خلافت ناجائز ہے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ ہونے چاہیے تھے کہ وہ علم میں زیادہ تھے، **جواب:** نہ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس آیت سے بے خبر تھے، نہ انہوں نے یہ حکم ناجائز دیا تھا آپ کا یہ فرمان مسلمانوں کی بھلائی کے لئے بطور مشورہ تھا، حدیث شریف میں بھی ہلکا مہر باندھنے کی رغبت دی گئی ہے، قرآن کریم کی اس آیت میں بھاری مہر باندھنے کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ بھاری مہر جو باندھ دیا گیا ہو، اس کے ادا کی تاکید کی گئی ہے یا ادا شدہ کی واپسی سے منع فرمایا گیا، بھاری مہر باندھنا اور ہے اور باندھ چکنے کے بعد ادا کرنا کچھ اور، بلا وجہ قرض لینا اچھا نہیں مگر لیا ہوا قرض ادا کرنا ضروری ہے، ادائے قرض کی آیتیں پڑھ کر یہ سمجھنا کہ قرض ضرور لینا چاہیے، غلطی ہے، رہا آپ کا اس بی بی سے یہ فرمانا اس کی ہمت افزائی کے لئے تھا کہ ایک عورت ہو کر قرآنی آیات پر نظر رکھتی ہے اور اپنی کسر نفسی کے لئے تھا اور نہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علم

اور جنت میں پہنچ جانے کی نفی ہے اور احادیث میں تخفیف عذاب کا ثبوت لہٰذا آیات واحادیث میں تعارض نہیں۔ ملزم کو جیل سے رہا کر دینا اور ہے اور سی کلاس سے بی کلاس میں منتقل کر دینا کچھ اور بعض کفار کا عذاب بعض نیکیوں کی وجہ سے ہلکا ہو جاوے گا مگر ختم نہ ہوگا۔ **چوتھا اعتراض:** تمہاری گفتگو سے معلوم ہوا کہ نبی کے گستاخ اور بار بار مرتد ہونے والے جادوگر وغیرہ کی توبہ قبول نہیں مگر دوسری آیت میں ارشاد ہوا۔ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ (النساء: ۴۸) کفر کے سوا سارے گناہ جسے چاہے گا معاف کر دے گا۔ نیز نبی کریم ﷺ نے اپنے دشمنوں گستاخوں بدگویوں کا اسلام قبول فرمایا۔ ان کی توبہ منظور ہوئی۔ اگر گستاخ نبی کی توبہ مردود ہوتی تو ابوجہل وغیرہ کو دعوت اسلام کیوں دی جاتی اور حضرت عکرمہ اور ابو سفیان کی بیوی ہندہ کا ایمان کیوں قبول ہوتا (بعض بے علم) **جواب:** اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی توبہ قاضی کے نزدیک قبول نہیں کہ یہ لوگ توبہ کر کے شرعی سزا سے نہیں بچ سکتے اور چونکہ حضور ﷺ خود صاحب حق ہیں۔ لہٰذا اپنے گستاخ کو معافی دے سکتے ہیں۔ قاضی اسلام حضور علیہ السلام کے گستاخ کو معاف نہیں کر سکتا۔ دیگر حقوق العباد کا بھی یہی حال ہے کہ خود صاحب حق معاف کرے نہ کہ قاضی۔ خیال رہے کہ نبی کے گستاخ کا اسلام قبول ہے۔ رہی سزا' یہ دوسری وجہ سے ضرور ہو گی۔ لہٰذا اب بھی گستاخانِ رسول کو دعوتِ اسلام دی جائے گی اور پہلے بھی دی گئی اور جب وہ مسلمان ہو جائیں تو ان پر احکام اسلام جاری ہوں گے مگر سزائے توہین سے نہیں بچ سکتے۔ (درمختار باب المرتدین) **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن کافر کا زمین بھر سونا فدیہ میں قبول نہ ہوگا تو اس دن کفار کے پاس مال کہاں ہوگا کہ وہ پیش کریں اور وہ رد کیا جاوے۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ یہ فرضی اور تقدیری صورت ہے کہ اگر فرض کرو کافر کے پاس اتنا سونا ہو اور وہ اس سے فدیہ ادا کرنا چاہے تو منظور نہ ہو۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ رب تعالیٰ ہلکے عذاب والے کافر سے فرمائے گا کہ اگر آج تیرے پاس دنیا بھر کی دولت ہوتی تو تو وہ سب عذاب کے فدیہ میں دے دیتا۔ وہ عرض کرے گا' ہاں رب تعالیٰ فرمائے گا کہ دنیا میں ہم نے تجھ سے بہت سہل چیز طلب فرمائی تھی کہ تو شرک نہ کر تو نہ مانا (بخاری و مسلم) گویا یہ حدیث اس آیت کی تفسیر ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے دنیاوی صدقات وخیرات مراد ہیں کہ کفار کے دنیاوی صدقات وخیرات خواہ زمین' بھر سونا ہوں قبول نہ ہوں گے۔ (خازن وکبیر) کیونکہ کفار کی اطاعت مردود ہے۔ **چھٹا اعتراض:** اس آیت میں فرمایا گیا۔ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۔ کفار کے لئے بہت سے مددگار نہیں تو کیا ان کے ایک دو مددگار ہوں گے۔ یہاں جمع کی نفی ہے نہ کہ ہر فرد کی؟ **جواب** من استغراقیہ کی وجہ سے افراد ناصر کی نفی ہوئی نہ کہ جماعت ناصرین کی یعنی یہ عموم سلب ہے نہ کہ سلب عموم ہے کہ من استغراقیہ نے ناصرین کو عام کیا اور ما نے اس عام کی بطریق عموم نفی کی۔ دوسرے یہ کہ ناصرین سے مددگاروں کے اقسام مراد ہیں یعنی ان کے لئے انبیاء' اولیاء' شہداء' علماء' نابالغ بچے اعمال صالح کوئی مددگار نہ ہوگا۔ گویا جمیعت انواع کے لئے ہے۔ تیسرے یہ کہ لہم بھی جمع اور ناصرین بھی جمع اور جب جمع کے لئے جمع آوے تو تقسیم افراد ہو جاتی ہے کہ اس جمع کی ہر فرد دوسری جمع کی ہر فرد کے لئے ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے لوگ اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے یعنی ہر ایک آدمی ایک گھوڑے پر۔ اب آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی کافر کے لئے کوئی مددگار نہیں۔ **ساتواں اعتراض:** لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ سے معلوم ہوا کہ صرف کفار کو تکلیف دہ عذاب ہوگا تو کیا گنہگار مسلمانوں کو عذاب کی

کر روانہ کیا، اور نہ معلوم کیا کیا فیض دیئے، کامل لوگ مرے بعد بھی اپنے مرید کو بلکہ جو بھی ان کی صحبت میں رہ چکا ہو برابر یاد رکھتے ہیں، غرضکہ یہ آیت کریمہ حضرات صوفیائے کرام کی فیاضی وعطاء کے لئے دریائے ناپید کنار ہے، عورت کا مرد سے جسمانی نکاح ہوتا ہے جو آخر کار طلاق یا موت سے ٹوٹ جاتا ہے، جب اس عارضی جسمانی نکاح کے ایسے حقوق ہیں کہ طلاق کے بعد مرد پر عورت کا نفقہ عدت لازم بعد موت شوہر پر بیوی کا کفن دفن لازم تو مرید کا اپنے شیخ سے روحانی نکاح ہوتا ہے، جو نا قابل فسخ ہے، اس کے حقوق کیسے ہوں گے،

حکایت: ایک بزرگ کی اپنی بیوی سے ان بن رہتی تھی، کسی مرید نے اس جھگڑے کی وجہ پوچھی انہوں نے فرمایا، میرے گھریلو معاملات سے تمہیں کیا تعلق؟ میں جانوں میری بیوی جانے، تم پوچھنے والے کون؟ آخر طلاق کی نوبت آگئی، انہوں نے طلاق دے دی، عورت نے بعدِ عدت دوسرے سے نکاح کر لیا، مرید نے پوچھا، حضرت اب تو بتا دیجئے، کہ اس عورت میں کیا خرابی تھی؟ فرمایا اب وہ عورت دوسرے کی ہو چکی، مجھے دوسروں کا عیب کھولنا حرام ہے، یہ ہے، حق خدمت وحق صحبت، شیخ سعدی فرماتے ہیں، شعر

شنیدم کہ مردانِ راہ خدا دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

میں نے سنا ہے کہ اللہ کے مرد دشمنوں کا بھی دل نہیں دکھاتے، تجھے یہ مرتبہ کیسے مل سکتا ہے، تو تو اپنے دوستوں سے لڑتا جھگڑتا رہتا ہے، چمکتے ہوئے چاند پر کتا بھونکتا ہے، چاند اس کے کھلے ہوئے منہ میں بھی اپنا نور ڈالتا ہے، گویا یہ کہتا ہے کہ جو تیرے پاس ہے وہ تو دے، جو میرے پاس ہے وہ مجھ سے لے، تیرے پاس بھونکنا ہے اور میرے پاس چمکانا ہے،

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ
اور نہ نکاح کروان عورتوں سے جن سے نکاح کیا تمہارے
اور باپ دادا کی منکوحہ سے نکاح نہ کرو
النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ
باپ دادا نے مگر وہ جو گزر گیا بے شک یہ ہے
مگر جو ہو گزرا وہ بے شک
فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾
بے حیائی اور ناراضی کا کام اور برا ہے یہ راستہ
بے حیائی اور غضب کا کام ہے اور بہت بری راہ

طبقوں کے سات دروازے ہیں۔ جیسے کہ جنت میں وہ پہنچے گا جو جہنم کے ان ساتوں طبقوں کو طے کر جائے۔ ایسے ہی جنت قرب تک وہ پہنچے گا جو نفس کے ان سات عیبوں سے گذر جائے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ (الشمس:۹) کفار کی نیکیوں میں چونکہ ان سات عیوب کا دخل ہوتا ہے اس لئے وہ قابل قبول نہیں۔ مسلمان کی نیکیاں ان ساتوں عیبوں سے بفضلہ تعالیٰ صاف ہوتی ہیں۔ لہٰذا دربار یار تک پہنچ جاتی ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ۔ (فاطر:۱۰) ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ عبادت کی کنجی فکر ہے اور نیکی کی علامت مخالفت نفس (از روح البیان وابن عربی) حق تعالیٰ اس کو قال حال بنائے اور ہمارے اعمال کو ریاء فخر بڑائی اور نام ونمود کے خیال سے بچائے۔ اپنے مقبولوں کے طفیل ہمیں اعمال مقبول کی توفیق عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ تفسیر نعیمی کی یہ تیسری جلد سولہ شوال ۱۳۶۴ ہجری یوم دوشنبہ کو شروع ہو کر ستائیس جمادی الآخرہ ۱۳۶۵ ہجری یوم پنجشنبہ کو ختم ہوئی۔ رب تعالیٰ بقیہ جلدیں پوری کرنے کی توفیق دے اور انہیں قبول فرما کر میرے گناہوں کا کفارہ اور توشہ آخرت اور میرے لئے صدقہ جاریہ بنائے اور جن حضرات نے اس میں کوئی بھی امداد دی انہیں جزاء خیر دے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ وَزِيْنَتِ عَرْشِهٖ وَ عُرُوْسِ مُمْلِكَتِهٖ سَيِّدِنَا وَ شَفِيْعِنَا وَحَبِيْبِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحٰبِهٖ اَجْمَعِيْنَ اٰمِيْنَ بِرَحْمَتِهٖ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ۔

ناچیز

احمد یار خان نعیمی اشرفی اوجھانوی غفرلہ

ولوالدیہ یا وعفی عنہ وعن والدیہ

سکتے ہیں، صالحہ عورتیں ان کو منہ بھی نہ لگائیں، اور فرماتا ہے حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (بقرہ:۲۳۰) یہاں بھی نکاح بمعنی صحبت ہے، یعنی طلاق کے بعد عورت اس مرد سے نکاح نہیں کرسکتی، حتیٰ کہ دوسرے خاوند سے صحبت کرے، اور فرماتا ہے وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (النساء:۶) یہاں نکاح سے مجامعت مراد ہے ورنہ عقد نکاح تو چھوٹے بچوں کا بھی ہو سکتا ہے (کبیر) حضور انور ﷺ فرماتے ہیں وُلِدْتُ مِنْ نِكَاحٍ لَا مِنْ سِفَاحٍ یہاں بھی نکاح سے مراد صحبت ہے ورنہ سفاح یعنی زنا سے اس کا مقابلہ درست نہ ہوتا (کبیر) عربی شعراء نے بھی بہت جگہ نکاح بمعنی مجامعت استعمال کیا ہے، لہٰذا یہاں نکاح کے ایسے معنی ہیں جو عقد نکاح اور صحبت و مجامعت دونوں ہی کو شامل ہیں، اور ہوسکتا ہے لَا تَنْكِحُوْا میں نکاح بمعنی عقد نکاح ہو، اور مَا نَكَحَ میں نکاح بمعنی مطلق ہو، ما سے مراد عورتیں ہیں، چونکہ انہیں عام صفت سے بیان فرمایا گیا، اس لئے مَا ارشاد ہوا کہ ایسے موقعہ پر عقل والوں کے لئے بھی مَا بولا جاتا ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (بقرہ:۸۹) جب ان یہود کے پاس وہ جانے پہچانے نبی تشریف لائے تو وہ ان کا انکار کر بیٹھے، دیکھو یہاں حضور انور ﷺ کے لئے مَا ارشاد ہوا، اباء سے مراد بطریق عموم مجاز باپ، دادا، نانا وغیرہ تمام اصول ہیں، یعنی اے مسلمانو تم ان عورتوں سے عقد نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ، دادا، نانا نے عقد نکاح کرلیا ہو، یا حلال صحبت کرلی ہو، جیسے ان کی موطوءہ لونڈی یا حرام صحبت کرلی ہو، جیسے باپ دادا نانا کی زنا کی داشتہ عورت، بلکہ جسے باپ دادا وغیرہ نے شہوت سے بھی چھولیا ہو، وہ بھی اولاد کے لئے حرام ہے، یا اے مسلمانو تم ان عورتوں سے صحبت نہ کرو جن سے تمہارے باپ دادے صحبت کرچکے ہوں یعنی ان کی موطوءہ لونڈی کو بیٹا ہاتھ نہیں لگا سکتا، اگرچہ وہ لونڈی بیٹے ہی کی ملک میں آجائے خلاصہ یہ ہے، اولاد پر باپ دادا کی چند عورتیں حرام ہیں، جن سے انہوں نے فقط نکاح کرلیا، صحبت نہ کی، بغیر صحبت طلاق دے دی یا مر گئے، جن سے نکاح نہ کیا مگر حلال صحبت کر لی جیسے لونڈی، جن سے حرام صحبت کی جیسے زنا کی داشتہ عورت جن سے نکاح کرلیا صحبت بھی جیسے موطوءہ بیوی، جن سے بوس و کنار کیا، یہ سب عورتیں اولاد پر حرام ہیں، اس ایک جملہ سے بہت سی محرم عورتوں کا اجمالی ذکر فرمادیا، یہ ہی احناف کا مذہب ہے، مِّنَ النِّسَآءِ مِنْ بیانیہ ہے یہ عبارت مَا کا بیان ہے نِسَآءِ امراۃ کی جمع ہے خلاف قیاس، اگرچہ نساء جوان عورت کو کہتے ہیں، مگر یہاں مطلقاً عورت مراد ہے لہٰذا اگر باپ نے نابالغہ یا مراہقہ سے نکاح کرکے طلاق دے دی ہو، تب بھی وہ بیٹے پر حرام ہے، نیز نساء سے مراد وہ عورتیں ہیں جو باپ کے لئے حلال ہوں، اور جن سے نکاح درست ہو کہ اگر باپ کسی ایسی عورت سے نکاح کرے جو اسے حلال ہی نہ تھی، تو یہ عورت اس نکاح کی وجہ سے حرام نہ ہوگی، کہ یہ نکاح درست ہی نہ تھا، ان فوائد کی وجہ سے مِّنَ النِّسَآءِ فرمایا گیا، اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ قوی تر یہ ہی ہے کہ اِلَّا استثناء کا ہے، اور استثناء بھی متصل ہے، نہ تو اِلَّا بمعنی لٰكِنْ ہے نہ استثناء منقطع، ما موصولہ ہے، اور سَلَفَ سے مراد وہ نکاح ہیں جو یہ لوگ زمانہ جاہلیت میں کرچکے تھے اور وہ بیویاں فوت بھی ہو چکی تھیں یعنی تم پر اپنے باپ داداؤں کی بیویاں حرام ہیں، اگر ان سے نکاح کروگے تو سخت مجرم ہوؤ گے، ہاں جو اس قسم کے نکاح تم زمانہ جاہلیت میں کرچکے ہو یا اس قانون کے بننے سے پہلے کرچکے ہو، ان پر تم گنہگار نہ ہوؤ گے، قانون بننے سے پہلے کے اعمال پر سزا نہیں ہوا کرتی لیکن اب اگر ایسی عورت تمہارے نکاح میں ہو تو اسے علیحدہ کرنا پڑے گا،

لہٰذا یہ استثناء گناہ سے ہے نہ کہ جواز سے اور استثناء متصل ہے، اس جملہ کی اور بہت تفسیریں کی گئی ہیں، مگر یہ تفسیر آسان بھی ہے قوی بھی، اور اس صورت میں اس جملہ پر کوئی اعتراض بھی نہیں (کبیر، معانی، خازن وغیرہ) اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا یہ جملہ گذشتہ حکمت کی علتوں کا بیان ہے کہ دوسرے گناہوں میں ایک آدھی خرابی ہوتی ہے اس نکاح میں تین خرابیاں ہیں، اِنَّهٗ میں ہ ضمیر نکاح کی طرف لوٹتی ہے، جو لَا تَنْكِحُوْا سے سمجھا گیا كَانَ کے معنی ہیں ہے، فَاحِشَةً کے معنی بارہا بیان ہو چکے، حد سے بڑھا ہوا گناہ یا بے حیائی، مقت سخت ناراضی کو کہتے ہیں، یعنی اس نکاح میں تین خرابیاں ہیں، عقلی کہ وہ فاحشہ و بے حیائی ہے شرعی کہ وہ رب تعالیٰ کی سخت ناراضی کا باعث ہے، عرفی کہ یہ نکاح کرنا عرفاً بھی برا راستہ اختیار کرنا ہے (تفسیر احمدی و معانی و کبیر)

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! خیال رکھو کہ اب کبھی کسی ایسی عورت سے نکاح نہ کرنا جن سے تمہارے باپ دادے صحیح نکاح یا حلال حرام صحبت کر چکے ہوں، اگر ایسا کرو گے، تو سخت مجرم و گنہگار ہوؤ گے، ہاں اسلام سے پہلے یا اس قانون کے بننے سے پہلے جو تم اس قسم کا نکاح کر چکے، اس پر تمہاری پکڑ نہیں کہ سزائیں قانون بن جانے کے بعد ہوتی ہیں، پہلے کے کام قانون کی زد میں نہیں آتے، خیال رکھو کہ ایسی عورتوں سے نکاح کرنا عقلاً بھی بے حیائی ہے شرعاً بھی رب تعالیٰ کی سخت ناراضی کا باعث ہے، اور عرفاً بھی، یہ بہت ہی برا راہ ہے، ایسے کام کے قریب بھی نہ جاؤ، تم لوگ زمانہ جاہلیت میں بھی ایسے نکاح کو نکاحِ مقتی، اور ایسے نکاح کی اولاد کو اولادِ مقتی کہتے تھے، یعنی رب تعالیٰ کی ناراضی والا نکاح، حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میرے ماموں کے ہاتھ میں جھنڈا تھا وہ کہیں جا رہے تھے، میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہیں؟ آپ فرمانے لگے مجھے نبی کریم ﷺ نے بھیجا ہے کہ فلاں محلہ میں ایک شخص نے اپنے باپ کی منکوحہ سے نکاح کر لیا ہے میں اس کا سر کاٹ کر بارگاہِ رسالت میں پیش کروں، (تفسیر خازن)

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** مسلمانوں پر اپنی اصول کی منکوحہ بیویاں حرام ہیں، باپ، دادا، نانا، پردادا اور پرنانا وغیرہم کی بیویاں حرام ہیں، جیسا کہ مَا نَكَحَ سے معلوم ہوا، **دوسرا فائدہ:** یہ قانون صرف مسلمانوں کے لئے ہے، اگر اسلامی حکومت میں پارسی، مجوسی وغیرہ اپنی ماں، بہن سے نکاح کریں جو ان کے دین میں درست ہے ہم اسے نہ منع کریں گے، جیسا کہ لَا تَنْكِحُوْا کے خطاب سے معلوم ہوا، **تیسرا فائدہ:** اپنے سگے باپ دادا کی بیویاں حرام ہیں نہ کہ سوتیلے باپ دادا کی، لہٰذا سوتیلے باپ کی بیوی سے نکاح درست ہے جیسا کہ اٰبَآؤُكُمْ سے معلوم ہوا، **چوتھا فائدہ:** جس عورت سے باپ دادا صرف نکاح کر لیں وہ بھی حرام ہے، اگرچہ صحبت کئے بغیر طلاق دے دیں، یا مر جائیں، جیسا کہ مَا نَكَحَ کے اطلاق سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** جس عورت سے اپنا باپ دادا حلال صحبت کرے اگرچہ بغیر نکاح ہو وہ بھی حرام ہے، لہٰذا باپ کی موطوءہ لونڈی یا موطوءہ بالشبہ سے بیٹا، پوتا نکاح نہیں کر سکتا، یہ بھی مَا

نَكَحَ کے اطلاق سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** جس عورت سے اپنا باپ یا دادا حرام صحبت کرے یا بوس وکنار کرے وہ بھی بیٹے پوتے پر حرام ہے، جیسا کہ مَانَكَحَ کے عموم سے معلوم ہوا، یہ ہی احناف کا مذہب ہے کہ باپ کی مزینہ عورت بیٹے پر حرام ہے کہ یہاں نکاح بمعنی ضم ہے یعنی ملنا، خواہ جسما ملنا ہو یعنی صحبت کیسی ہی ہو، حرام یا حلال یا زبانی ملنا، یعنی عقد نکاح، امام کرخی فرماتے ہیں کہ لفظ نکاح کی وضع تو صحبت کے لئے ہے، عقد نکاح کو مجازاً نکاح کہہ دیتے ہیں کہ یہ صحبت کا ذریعہ ہے، جیسے عقیقہ حقیقۃً بچہ کے سر کے بال ہیں، مگر اب اس بکری کو بھی عقیقہ کہہ دیتے ہیں جو پیدائشی بال مونڈنے پر ذبح کی جائے، **ساتواں فائدہ:** دنیا میں انسان کا نکاح صرف انسان عورت ہی سے ہوسکتا ہے جن وغیرہ غیر انسان سے نہیں ہوسکتا، جیسا کہ مِّنَ النِّسَآءِ سے معلوم ہوا، ہاں جنت میں حور سے بھی نکاح ہوگا اگرچہ حوریں انسان یعنی آدم علیہ السلام کی اولاد نہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ (دخان: ۵۴) **آٹھواں فائدہ:** اگر مجوسی اسلام لائے اور اس کے نکاح میں اپنی ماں یا بہن یا بیٹی ہو، تو اسلام لاتے ہی اس کو علیحدہ کرنا پڑے گا، لیکن اسلام سے پہلے جو اس کے بچے اس عورت سے پیدا ہوچکے وہ حلالی مانے جائیں گے، جیسا کہ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ سے معلوم ہوا، دیکھو بعض کفار کے ہاں نکاح بغیر ایجاب قبول ہوتے ہیں، مگر اسلام ان نکاحوں کو درست مانتا ہے، حتیٰ کہ قرآن مجید نے ابولہب کی بیوی جمیلہ کو اس کی بیوی فرمایا، کہ ارشاد فرمایا وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (لہب: ۴) حالانکہ اس کا نکاح اسلامی قاعدے سے نہ ہوا تھا، **نواں فائدہ:** باپ دادا کی بیوی سے نکاح شرعاً بھی حرام ہے عقلاً بھی، عرفاً بھی، ایسی حرکت سے بچنا اشد ضروری ہے، جیسا کہ فَاحِشَةً اور مَقْتًا اور سَآءَ سَبِیْلًا فرمانے سے معلوم ہوا، بہرحال اس شرعی حکم کو عقل وعرف نے قوت دے دی،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر مجوسی، پارسی اسلام لائے، اور اس کے نکاح میں اس کی ماں یا بہن ہو اس پر علیحدہ ہو جانا واجب نہ ہو، کیونکہ یہاں ارشاد ہوا لَا تَنْكِحُوْا اے مسلمانو! ان عورتوں سے نکاح نہ کرو، نکاح کرنے کی ممانعت کی گئی، نہ کہ نکاح میں رکھنے کی، **جواب:** اس کا جواب تفسیر سے معلوم ہو چکا کہ یہاں نکاح بمعنی ضم ہے جو صحبت کو بھی شامل ہے اور نکاح کو بھی، یعنی ایسی عورتوں سے نہ نکاح کرو نہ صحبت، جبکہ اس مجوسی پر اسلام لاکر اس عورت کا ہاتھ لگانا بھی حرام ہوگیا، تو نکاح خود ہی ختم ہوگیا، اگر کافر نے بحالتِ کفر اپنی بیوی سے صحبت کی بعد میں اسلام لایا، تو اس پر غسل فرض ہے، اگرچہ بحالتِ کفر اس کے ذمہ غسل نہ تھا، اگر بحالتِ کفر اس کے کپڑے میں نجاست لگی، پھر وہ مسلمان ہوا، تو اب کپڑا دھونا فرض ہے، اگرچہ کفر میں دھونا فرض نہ تھا، مسلمان ہو کر کفر کے زمانہ کی چوٹی، دھوتی، زنار توڑنا فرض ہے، **دوسرا اعتراض:** یہاں نکاح سے مراد ہے عقدِ نکاح اور آیت کریمہ کے معنی یہ ہیں کہ جن عورتوں سے تمہارے باپ دادے نکاح کرلیں، تم ان سے نکاح نہ کرو، اب اگر اس نکاح سے صحبت بھی مراد لی جائے، تو یا حقیقت ومجاز کا اجتماع لازم ہوگا یا مشترک کا عموم، تم احناف کے ہاں یہ دونوں منع ہیں، لہٰذا اس سے تم صحبت مراد نہیں لے سکتے، **نوٹ:** یہ اعتراض امام شافعی کا ہے جو وہ امام ابوحنیفہ پر کرتے ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہما، ان کے ہاں باپ کی مزنیہ عورت سے بیٹا نکاح کرسکتا ہے، حرام صحبت سے حرمت مصاہرت ان

کے ہاں نہیں آتی، ان بزرگوں کا یہ انتہائی اعتراض ہے، **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک الزامی، دوسرا تحقیقی، جواب الزامی تو یہ ہے کہ پھر یہ آیت کریمہ آپ کے بھی خلاف ہوگی، اولاً اس لئے کہ آپ بھی باپ کی موطوءہ لونڈی سے لڑکے کو نکاح یا صحبت کی اجازت نہیں دیتے، مگر اب اسے اجازت ہوگئی، کہ جس عورت سے باپ لونڈی بنا کر صحبت کرے، پھر بیٹا اس سے نکاح کرے، یا بعد میں بیٹا اس کا مالک ہو جائے، تو اسے صحبت درست ہو، نیز اس سے لازم آئے گا کہ اگر مجوسی ایمان لائے حالانکہ اس کے نکاح میں پہلے ہی سے اپنے باپ کی موطوءہ ہو اسے علیحدہ نہ کرے، کیونکہ اب آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اے مسلمانو! جن سے تمہارے باپ نکاح کرلیں، تم ان سے نکاح نہ کرو اور طرح حلال صحبت کرلو، پہلے سے نکاح ہو چکا ہے تو نکاح میں رکھو، جواب تحقیقی یہ ہے کہ نفی یا منفی میں حقیقت مجازیوں ہی مشترک کا عموم جائز ہے (روح المعانی) مگر اس کا نفیس جواب وہ ہے جو ہم نے تفسیر میں عرض کیا کہ یہاں نکاح بمعنی لغوی ہے یعنی ملنا ملانا، جس کی دو فرد یں ہیں عقد نکاح اور صحبت، گویا یہ مشترک معنوی ہے نہ کہ مشترک لفظی، جیسا کہ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (احزاب:۵۶) میں صلوٰۃ بمعنی اظہار شان ہے، رب کی صلوٰۃ رحمت بھیجنا ہے، فرشتوں کی صلوٰۃ دعائے رحمت کرنا، وہاں بھی مشترک معنوی ہے نہ کہ لفظی، مشترک کا عموم وجمع، **تیسرا اعتراض:** ماں دادی وغیرہ کی حرمت تو اگلی آیت میں آرہی ہے، پھر یہاں علیحدہ کیوں بیان فرمائی، **جواب:** یا اس کے اہتمام کے لئے کہ تمام آئندہ حرمتوں میں اس کی حرمت سخت تر ہے، یا اس لئے کہ اہل عرب اسلام سے پہلے اس کی حرمت کے انکاری تھے یا اس لئے کہ اگلی آیت میں ماں کی حرمت کا ذکر ہے جس کے پیٹ سے انسان ہو، یہاں باپ کی منکوحہ کی حرمت مراد ہے، اور باپ کی مزنیہ یعنی سوتیلی ماں، لہٰذا آیت میں تکرار نہیں، **چوتھا اعتراض:** اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ کا استثناء نحوی قاعدہ سے درست نہیں، کیونکہ مستثنیٰ کو مستثنیٰ منہ میں داخل ہونا چاہیے، حالانکہ یہاں آئندہ کے نکاح سے منع فرمایا جارہا ہے، اور ما سلف گذشتہ کا نکاح ہے جو آئندہ کے نکاح میں داخل نہیں، پھر استثناء کیونکر درست ہو؟ **جواب:** اس جگہ بعض مفسرین نے بہت توجیہیں کی ہیں، قوی توجیہ وہ ہے جو ہم نے تفسیر میں عرض کی، کہ یہاں جواز نکاح سے استثناء نہیں بلکہ گناہ سے استثناء ہے، یعنی جو پہلے ایسے نکاح ہو چکے، ان پر تمہاری پکڑ نہیں، اب آئندہ کرو گے تو پکڑ ہوگی، لہٰذا آیت بالکل واضح ہے (تفسیر کبیر و معانی وغیرہ)

تفسیر صوفیانہ

عالم اجسام میں بعض چیزیں علویات ہیں جنہیں فلکیات کہا جاتا ہے، یہ گویا آباء یعنی والد ہیں کہ یہ فیض دینے والے ہیں، جیسے چاند سورج، آسمان ہوا وغیرہ اور بعض چیزیں سفلیات ہیں، یہ گویا امہات یعنی مائیں ہیں، جیسے زمین اور زمین کی چیزیں، یہاں گویا اشارۃً فرمایا جارہا ہے کہ زمین و زمینی چیزیں جو آسمان و آسمانی چیزوں کے تصرف میں آچکی ہیں، تم ان سے نکاح نہ کرو، ان میں دل نہ لگاؤ، یہ چیزیں تمہارے دل لگانے کے لئے نہیں ہیں، تمہارا نکاح ان سے نہیں ہو سکتا، تمہارا نکاح تو عالم ارواح جنت اور جنتی نعمتوں سے ہونے والا ہے، تم اس میں دل لگاؤ، ہاں اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ان زمنی چیزوں میں اسی قدر تعلق رکھو جو تمہارے لئے تدبیر الٰہی میں درست ہو چکا ہے کہ ان سے بقدر ضرورت نفع اٹھالو، ان سے نفع اٹھانا جائز ہے، ان میں دل

لگانا حرام ہے، بلکہ فاحشہ ہے، رب تعالیٰ کی ناراضی کا باعث ہے، مولانا جامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں، شعر

اے کہ در شرعِ خداوندانِ حال　　می کنی از سنت و فرضم سوال

سنت آمد دل ز دنیا تافتن　　فرض راہ قربِ مولیٰ یافتن

یعنی اگر تم حال والوں کی شریعت میں سنت وفرض کے بارے میں پوچھتے ہو تو سن لو دنیا سے منہ موڑنا سنت ہے، راہِ حق پر چلنا، جس سے خدا مل جائے فرض ہے، حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں، شعر

غلامِ ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود　　ز ہرچہ رنگ تعلق پذیرد آزاد ست

میں اس کی ہمت پر قربان جاؤں جو آسمان کے نیچے رہ کر ان رنگ و بو کی قیدوں سے آزاد رہے، مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ مثنوی شریف میں فرماتے ہیں، شعر

ہر کہ محجوبست او خود کودکے است　　مرد آں باشد کہ بیروں از شکے ہست

اے خنک آنکہ جہادے مے کند　　بر بدن زجری و دادے مے کند

ہماری شریعت میں بچہ نادان وہ ہے جو یار سے حجاب میں ہے، جو یہ آڑ پھاڑ دے، وہ ہی جواں مرد ہے، مبارک ہے، وہ جو اپنے پر ہمیشہ جہاد کرتا رہتا ہے، اپنے کو ہمیشہ برائیوں پر ملامت کرتا ہے، (روح البیان)

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ
حرام کی گئیں اوپر تمہارے مائیں تمہاری اور بیٹیاں تمہاری اور بہنیں تمہاری
حرام ہوئیں تم پر تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں
وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ
اور پھوپھیاں تمہاری اور خالائیں تمہاری اور بیٹیاں بھائی کی اور بیٹیاں بہن کی
اور پھوپھیاں اور خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں
وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ
اور مائیں تمہاری وہ جنہوں نے دودھ پلایا تم کو اور بہنیں تمہاری دودھ سے
اور تمہاری مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور دودھ کی بہنیں

تعلقات

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں سوتیلی ماں کی حرمت کا ذکر تھا کہ اس سے نکاح کرنا حرام ہے، اب سگی ماں کی حرمت کا ذکر ہے کہ عورت جس کے پیٹ سے تم پیدا ہوئے، ان سے نکاح بھی حرام ہے،

دوسرا تعلق: پچھلی آیت میں اس ماں کی حرمت کا ذکر تھا جو صرف ایک وجہ سے حرام ہو یعنی باپ کی بیوی ہونا، اب اس عورت کی حرمت کا ذکر ہے جو دو وجہ سے حرام ہو باپ کی بیوی یا موطوءہ ہونا اور اپنا ہمارا اس کے پیٹ سے پیدا ہونا، گویا ہلکی حرمت کے بعد سخت حرمت کا ذکر ہے، **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں صرف ایک عورت کی حرمت کا ذکر تھا یعنی باپ کی منکوحہ یا موطوءہ، اب چودہ عورتوں کی حرمت کا ذکر ہے، گویا اختصار کے بعد تفصیلی بیان فرمایا جا رہا ہے،

تفسیر

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ یہ جملہ خبر بمعنی امر ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ عورتیں تم پر پہلے حرام کی گئی تھیں، اب اس کی خبر دی جارہی ہے، بلکہ آج سے ان کی حرمت کے احکام دیئے جا رہے ہیں، حرمت کے معانی بارہا بیان کئے جا چکے کہ اس کے معنی ہیں علیحدگی، دوری، محرومی، ممنوع چیز کو حرام کہا جاتا ہے اور محترم معظم کو بھی، چنانچہ کہا جاتا ہے بَيْتُ اللّٰهِ الْحَرَام یعنی حرمت و عزت والا بیت اللہ، کیونکہ ممنوع چیز کے استعمال سے اور محترم چیز کی بے ادبی سے علیحدہ رہا جاتا ہے، یہاں حرمت بمعنی ممانعت ہے، عَلَيْكُمْ میں خطاب مسلمانوں سے ہے، اُمَّهَاتُ یا تو اُمَّةٌ کی جمع ہے جس کی ہ دور کر کے میم مشدد کردی گئی ہے، جمع میں ہ لوٹ آئی، یا اُمٌّ کی جمع ہے جس میں ہ زائدہ ہے، جیسے اراق کو اھراق، بریق کو بھریق کہا جاتا ہے، ہ زائدہ کے ساتھ، یہ دراصل اُمَّات تھا، ام کے لغوی معنی ہیں اصلی، اسی لئے مکہ معظمہ کو ام القریٰ اور سورۂ فاتحہ کو ام القرآن کہتے ہیں کہ مکہ معظمہ بستیوں کی اصل ہے اور سورۂ فاتحہ قرآن مجید کی اصل، اُمَّهَات میں جائز ناجائز مائیں سب ہی شامل ہیں، یعنی جس کے پیٹ سے بچہ پیدا ہو وہ ام ہے، خواہ جائز صحبت سے پیدا ہو یا حرام صحبت سے، اسی طرح امہات میں دادیاں نانیاں سب شامل ہیں، اس لئے امہات جمع ارشاد ہوا، تاکہ ہر قسم کی بلاواسطہ یا بالواسطہ ماں کو شامل ہو، یعنی اے مسلمانو! تم پر تمہاری ہر قسم کی مائیں حرام کردی گئیں، خواہ جائز ماں ہو یا ناجائز، خواہ ماں یا دادی نانی، خیال رہے کہ حرام و حلال ہونا فعل کی صفت ہے نہ کہ ذات کی، یعنی کام حرام یا حلال ہوتے ہیں خود شے حرام حلال نہیں ہوتی، لہٰذا یہاں نکاح پوشیدہ ہے یعنی تم پر اپنی ماؤں وغیرہ سے نکاح کرنا حرام ہے، جیسے شراب، حرام ہونے کے معنی یہ ہیں کہ تم پر اس کا پینا حرام ہے، اس کی تفسیر گذشتہ آیت کر رہی ہے جہاں فرمایا گیا کہ اپنے باپ کی منکوحہ سے نکاح نہ کرو وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ بَنَاتٌ بنت کی جمع ہے، اَخَوَاتُ اخت کی جمع ان دونوں کا لام کلمہ واؤ ہے کہ بنت دراصل بنوۃ ہے، اور اخت دراصل اخوۃ، مگر اخت کی جمع میں تو واؤ لوٹ آیا، لیکن بنت کی جمع میں واؤ نہ لوٹا (روح المعانی) بنت سے مراد مطلقاً بیٹی ہے حرام کی ہو یا حلال کی، یہ ہی احناف کا مذہب ہے، امام شافعی کے ہاں حرام کی بیٹی باپ کے لئے حلال ہے، مگر ہمارے ہاں حرام (کبیر و روح المعانی) نیز بنات میں پوتیاں نواسیاں سب شامل ہیں، اور اخوات میں سگی بہن، ماں شریکی بہن اور باپ شریکی بہن سب داخل، یعنی حرام کی گئیں تم پر تمہاری ہر قسم کی بیٹیاں جائز ہوں یا ناجائز، بالواسطہ ہوں یا بلاواسطہ، اور تمہاری مطلقاً بہنیں خواہ سگی ہوں یا سوتیلی، یہاں بھی حکم میں خطاب صرف مسلمانوں سے ہے، خیال رہے کہ ماں اور بیٹی کسی آسمانی دین میں کبھی حلال نہ ہوئی، حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملت میں بہن سے نکاح حلال تھا، نوح علیہ السلام کے زمانہ میں بہن حرام ہوئی، بلکہ سوائے زرتشت کے جو

مجوسیوں کا پیشوا تھا، کسی غیر آسمانی دین میں بھی ماں بیٹی وغیرہ حلال نہ ہوئیں، زرتشت نے ان تمام کو حلال کہا، مجوسی اب بھی اس پر عامل ہیں کہ ماں بیٹی، بہن وغیرہ سب سے نکاح کر لیتے ہیں، زرتشت بڑا مکار فریبی تھا، اپنے جسم پر کوئی دوا مل کر آگ میں کود جاتا، آگ اسے نقصان نہ پہنچاتی، تو کہتا تھا کہ میں نبی ہوں، میرا یہ معجزہ ہے، لوگ اسی عجوبہ کو دیکھ کر اسے رسول مان بیٹھے، بعض لوگوں نے کہا کہ آدم علیہ السلام کے زمانہ میں بھی، بہن سے نکاح حرام تھا، اس زمانہ میں مردوں کے لئے جنتی حوریں لائی گئی تھیں، مگر یہ محض غلط ہے، ورنہ پھر انسان خالص حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد نہ ہوتے بلکہ آدم و حور سے مخلوط ہوتے، حق یہ ہی ہے کہ اس زمانہ میں بہن سے نکاح حلال تھا، بطن کا فرق تھا یعنی اس دفعہ پیدائش کی بچی، دوسری دفعہ کی پیدائش کے بچہ کو حلال تھی (کبیر و معانی وغیرہ) وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ عمات عمة کی جمع ہے اور خالاۃ خالۃ کی جمع باپ کی بہن عمہ یعنی پھوپھی کہلاتی ہے، ماں کی بہن خالہ، خواہ ان کی سگی بہن ہو یا ماں شریکی یا باپ شریکی، بہر حال حرام ہے، خیال رہے کہ دادا پردادا کی بہن بھی حرام ہے، اور نانا پرنانا نیز نانی پرنانی کی بہن بھی حرام، یہ سب عورتیں ان دو لفظوں میں شامل وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ یہ الفاظ خالات پر معطوف ہیں ہر بھائی کی بیٹی حرام اور ہر بہن کی بیٹی حرام، خواہ سگے بھائی بہن ہوں یا ماں شریکے یا باپ شریکے، یہ سات عورتیں نسبی رشتہ سے حرام ہیں، وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْۤ اَرْضَعْنَكُمْ یہ جملہ یا تو بَنٰتُ الْاُخْتِ پر معطوف ہے یا اُمَّهٰتُكُمْ پر پہلا احتمال زیادہ قوی ہے، وہاں امہات فرمایا گیا تھا، نسب کے لحاظ سے یہاں امہات فرمایا گیا حرمت کے اعتبار سے، جیسے نبی کی بیویوں کو امہات فرمایا گیا، یا حرمت کے لحاظ سے یا ادب و احترام کی حیثیت سے، تفسیر کبیر نے فرمایا کہ دودھ کی ماں کو اس لئے ماں فرمایا، تاکہ معلوم ہو کہ جیسے سگی ماں کے بھائی بہن ہمارے ماموں خالہ ہیں اور اس کا خاوند ہمارا والد ہے، اس کے دیور ہمارے چچا تائے ہیں، اور ہم پر حرام ہیں، ایسے ہی دودھ کی ماں کے بھائی بہن، اس کا خاوند، دیور، نند وغیرہ ہمارے ماموں، خالہ، والد، چچا، پھوپھی ہیں، اور ہم پر حرام ہیں، اسی لئے حدیث پاک میں ارشاد ہوا کہ دودھ سے وہ ہی رشتے حرام ہوتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں، انہیں امہات فرما کر تمام گذشتہ رشتے اس میں داخل فرما لئے گئے، اور سب کو حرام قرار دیا گیا، اسی لئے آگے فرمادیا گیا کہ دودھ کی بہن بھی حرام ہے، جب دودھ کی ماں کی بیٹی ہماری بہن ہو کر حرام ہو گئی، تو اس کے باقی مذکورہ رشتہ بھی ہمارے عزیز ہو کر ہم پر حرام ہوئے، یہ بہت نفیس تحقیق ہے، اَرْضَعْنَ اِرْضَاعٌ سے بنا جس کا مادہ رضع ہے بمعنی تھن منہ میں دینا، اسی لئے شیر خوار بچے کو رضیع کہتے ہیں، اور دودھ پلانے والی کو مرضعہ کہا جاتا ہے، ارضعن فرما کر دو مسئلے بتا دیئے گئے، ایک یہ کہ اس عمر میں تم کو دودھ پلائے جب تم رضیع یعنی شیر خوار ہو یعنی دو ڈھائی سال کی عمر میں، اس کے بعد اگر تم کسی عورت کا دودھ پی لو تو وہ تم پر حرام نہ ہوگی کہ وہ تمہاری مرضعہ اور تم رضیع نہیں، دوسرے یہ کہ اگر ایک قطرہ دودھ بھی تم کسی عورت کا پی لو وہ تمہاری ماں ہے اور مع اپنے ان مذکورہ رشتہ داروں کے تم پر حرام، قربان جایئے قرآن کریم کی فصاحت کے، کہ ایک ایک کلمہ میں بہت سے مسائل بیان فرما دیتا ہے، وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ یہ عبارت اُمَّهٰتُكُمْ پر معطوف ہے، اخوات اخت کی جمع، اس سے دودھ کی بہن مراد ہے، مِّنَ الرَّضَاعَةِ فرما کر یہ بتایا کہ صرف دائی (دودھ پلانے والی) کے پیٹ کی بیٹی تم پر حرام نہیں، بلکہ اس کی ساری بیٹیاں حرام ہیں پیٹ کی ہوں یا

سوتیلی، یا دوسری کوئی اجنبی لڑکی جسے اس نے دودھ پلا دیا ہو وہ سب تمہاری بہنیں ہیں اور تم پر حرام، سگی ماں کی دودھ کی بیٹی، دودھ کی ماں کی سگی بیٹی، دودھ کی ماں کی دودھ کی بیٹی، یہ سب ہماری دودھ کی بہنیں ہیں، اور ہم پر حرام ہیں، رضاعۃ فرما کر گزشتہ دو قیدیں بتا دیں، کہ اس لڑکی نے دوڈھائی سال کی عمر میں اس کا دودھ پیا ہو، اور خواہ زیادہ پیا ہو یا کم سب تم پر حرام ہے، غرضکہ اخوات جمع فرما کر دودھ کی بہت سی قسم کی بہنیں بتا دیں اور مِّنَ الرَّضَاعَةِ فرما کر بہت سے مسائل بتا دیئے،

خلاصہ تفسیر

اس پوری آیت کریمہ میں چودہ عورتوں کی حرمت بیان فرمائی گئی، جن میں سے سات عورتیں نسبی رشتہ دار ہیں، ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی، اور سات عورتیں نسب کے علاوہ دوسرے سبب سے حرام، چنانچہ دو دودھ کے رشتہ سے رضاعی ماں، رضاعی بہن اور نکاح کے رشتے سے، یعنی ساس اور بیوی کی لڑکی، بیٹے کی بیوی کی حرمت یہاں مذکور ہے، اور باپ کی بیوی کی حرمت ابھی اوپر مذکور ہوئی، خاوند والی عورتیں، دو بہنوں کا نکاح میں اجتماع، ارشاد ہوا اے مسلمانو! تم پر حسب ذیل عورتیں حرام کی گئیں جن سے تمہارا نکاح نہیں ہو سکتا، تمہاری ہر قسم کی مائیں، جائز مائیں ہوں یا ناجائز، بلاواسطہ مائیں ہوں یا بالواسطہ دادیاں نانیاں وغیرہ، تمہاری ہر قسم کی بیٹیاں حلال کی بیٹی ہو یا حرام کی، بلاواسطہ بیٹی ہو یا بالواسطہ پوتیاں، نواسیاں وغیرہ، تمہاری ہر قسم کی بہنیں سگی ہوں یا باپ شریکی یا ماں شریکی، تمہاری ہر قسم کی پھوپھیاں، خواہ باپ کی سگی بہنیں ہوں یا ماں شریکی یا باپ شریکی، تمہاری ہر قسم کی خالائیں، خواہ ماں کی سگی بہنیں ہوں یا ماں شریکی یا باپ شریکی، نیز یہ پھوپھیاں خالائیں بلاواسطہ ہوں یا بالواسطہ یعنی دادا دادی، نانا نانی کی بہنیں یہ سب حرام ہیں، تمہاری بھتیجیاں خواہ سگے بھائی کی بیٹیاں ہوں یا باپ شریکے بھائی یا ماں شریکے بھائی کی، تمہاری بھانجیاں خواہ سگی بہن کی بیٹیاں ہوں یا ماں شریکی بہن کی یا باپ شریکی بہن کی، اور تمہاری دودھ پلانے والی مائیں یعنی دائیاں جو تم کو ڈھائی سال کی عمر میں دودھ پلائیں، جن کا دودھ کا قطرہ بھی تمہارے پیٹ میں کسی طرح پہنچ گیا تم پر حرام ہو گئیں تمہاری دودھ کی بہنیں، خواہ تمہاری سگی ماں کی شیر خوار ہوں یا دودھ کی ماں کی پیٹ کی ہوں، خواہ دودھ کی ماں کی دودھ کی بیٹی ہوں، خواہ تمہارے ساتھ دودھ پئیں یا تم سے آگے پیچھے، بہر حال تم پر حرام ہیں،

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** نسبی لحاظ سے چار قسم کی عورتیں مسلمان پر حرام ہیں، اپنے اصول جن کی اولاد میں تم ہو، جیسے ماں، نانی، دادی، پرنانی، پردادی، اپنے فروع بیٹی پوتی، نواسی پرپوتی، پرنواسی، اپنے اصول قریبہ، ماں باپ کی اولاد، بہن، بھانجی، بھتیجی اور بھانجی بھتیجی کی اولاد، خواہ کتنی ہی دور ہو، یوں ہی بھانجے بھتیجے کی اولاد، اصول بعیدہ، یعنی دادا نانا کی پیٹ کی اولاد تو حرام ہے، مگر اس کی اولاد کی اولاد حلال یعنی پھوپھی، خالہ تو حرام، مگر پھوپھی زاد اور خالہ زاد لڑکیاں حلال، دیکھو رب تعالیٰ نے صرف پھوپھیوں، خالاؤں کو حرام فرمایا، مگر بہن کو علیحدہ حرام قرار دیا، بھانجیوں بھتیجیوں کو علیحدہ حرام فرمایا، **دوسرا فائدہ:** ماں خواہ حلال کی ہو یا حرام کی اولاد پر حرام ہے، یعنی زنا کے بیٹے پر زانیہ ماں حرام جیسا کہ امہات کے عموم سے معلوم ہوا، کہ رب تعالیٰ نے امہات میں حلال کی قید نہ لگائی، یوں ہی حرام کی نانی دادی بھی مرد پر

حرام ہے، **تیسرا فائدہ:** جیسے ہر قسم کی ماں حرام ہے، ایسے ہی ہر قسم کی بیٹی باپ پر حرام ہے خواہ حلال کی ہو یا حرام کی، لہٰذا زانی پر اپنی حرام کی بچی حرام ہے جیسا کہ بنات کے عموم سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ نے یہاں بھی امہات کی طرح بنات میں بھی حلال کی قید نہ لگائی، تعجب ہے کہ حضرت امام شافعی حرام کی ماں کو تو بیٹے پر حرام مانتے ہیں، مگر حرام کے باپ کو بیٹی پر حرام نہیں مانتے، وہ فرماتے ہیں کہ زنا کی بیٹی سے زانی باپ نکاح کر سکتا ہے، حالانکہ قرآن کریم نے یہاں جیسے امہات (ماں) کو مطلقاً حرام فرمایا، ایسے ہی بنات (بیٹی) کو مطلقاً حرام قرار دیا، اس جگہ تفسیر کبیر نے اس پر بہت دلائل قائم کئے، جو انشاء اللہ اعتراض و جواب میں عرض کئے جائیں گے، **چوتھا فائدہ:** بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی مطلقاً حرام ہیں خواہ سگی ہوں یا ماں شریکی یا باپ شریکی، جیسا کہ ان الفاظ کے عموم سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** مطلقاً بہن کی مطلقاً اولاد حرام ہے خواہ حلال کی ہو یا حرام کی، کیونکہ یہاں امہات اور بنات کی طرح اخوات اور بنات الاخ میں کوئی قید نہیں، **چھٹا فائدہ:** بھائی بہن خود بھی حرام ہیں، ان کی اولاد در اولاد بھی حرام، مگر خالہ، پھوپھی خود تو حرام ہیں، ان کی اولاد حرام نہیں، لہٰذا خالہ زاد، پھوپھی زاد اولاد حرام نہیں حلال ہے، جیسا کہ ابھی تفسیر میں عرض کیا گیا، **ساتواں فائدہ:** جس عورت کا دودھ لڑکپن یعنی ڈھائی سال کی عمر میں بچے کے پیٹ میں پہنچ جائے، وہ عورت اس بچہ کی دودھ کی ماں ہوگئی اور ہمیشہ کے لئے حرام جیسا کہ اَرْضَعْنَ کے اطلاق سے معلوم ہوا، کہ آیت کریمہ میں پانچ یا دس گھونٹ دودھ کی قید نہیں لگائی گئی، **آٹھواں فائدہ:** اگر بچہ ڈھائی سال کی عمر میں کسی عورت کا دودھ پیئے، تب وہ عورت حرام ہوگی، ورنہ نہیں، اس عمر کے بعد دودھ پینا عورت کو حرام نہیں کرتا، یہ فائدہ بھی اَرْضَعْنَ سے حاصل ہوا، کہ جس عمر میں بچہ رضیع یعنی شیر خوار کہلائے اس عمر میں دودھ پینا حرام کرے گا بعد میں نہیں، **نواں فائدہ:** دودھ کی بہن مطلقاً حرام ہے، خواہ سگی ماں کی دودھ کی بیٹی ہو یا دودھ کی ماں کی سگی بیٹی یا دودھ کی ماں کی دودھ کی بیٹی، پھر خواہ ہمارے ساتھ دودھ پیئے یا آگے پیچھے، سب حرام ہیں، جیسا کہ یہاں اَخَوٰتُكُمْ کے اطلاق سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ نے ان مذکورہ قیدوں میں سے کسی قید کا ذکر نہ فرمایا، **دسواں فائدہ:** دودھ پلانے والی کے تمام وہ قرابت دار حرام ہیں جو سگی ماں کے حرام ہیں، لہٰذا دائی کا خاوند اس بچی کا باپ ہے، اس کے بیٹے اس کے بھائی، اس کی ساس بچی کی دادی وغیرہ وغیرہ، کیونکہ رب تعالیٰ نے دائی کو ماں فرمایا اور اس کی بیٹی کو بہن قرار دیا، معلوم ہوا کہ خود یہ سگی ماں کی طرح ہے، غرضکہ اس مختصر سے لفظ میں دودھ کے تمام رشتوں کا حکم بیان ہوگیا، شعر

از جانب شیر دہ ہمہ خویش شوند   و از جانب شیر خوار زوجان و فروع

یعنی شیر خوار بچے پر دائی کے سارے عزیز مذکورہ حرام ہوتے ہیں، مگر دائی اور دائی کے خاوند پر اس شیر خوار بچے کی اولاد و خاوند بیوی حرام ہیں باقی سب حلال، نسب و رضاعت کے تفصیلی مسائل کتب فقہ میں دیکھو، یہ آیت ان تمام مسائل کی اصل ہے، **گیارھواں فائدہ:** جیسے ان مذکورہ مردوں پر مذکورہ عورتیں حرام ہیں، ایسے ہی مذکورہ عورتوں پر یہ مذکورہ مرد حرام ہیں، یعنی جیسے بھائی پر بہن اور بہن کی تمام اولاد حرام ہے ایسے ہی، بہن پر بھائی اور بھائی کی تمام اولاد حرام، آیت کریمہ نے حرمت کا ایک رخ دکھا دیا، جس سے دوسرا رخ خود ہی نظر آ گیا (از تفسیر کبیر و معانی)

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں یہ تو ارشاد ہوا کہ تم پر یہ عورتیں حرام کی گئیں، مگر نہ تو یہ معلوم ہوا کہ کس نے حرام کیں اور نہ یہ کہ کب تک حرام فرمائیں، **جواب:** قرآن شریف جس کی کتاب ہے اسی نے یہ عورتیں حرام فرمائیں یعنی رب تعالیٰ نے، ایسے موقعہ پر خود قرینہ سے فاعل معلوم ہو جاتا ہے، نیز جب حرمت میں وقت کی قید نہیں، تو ہمیشہ ہی کے لئے حرام ہوئیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ (بقرہ: ۱۸۳) تم پر روزے فرض کئے گئے، کس نے فرض کئے؟ رب تعالیٰ نے، کب تک فرض کئے؟ جب تک تم زندہ ہو، ہر رمضان میں روزے رکھو (تفسیر کبیر) **دوسرا اعتراض:** یہاں بنات سے مراد حلال کی بیٹی ہے، خواہ نکاح کے ذریعہ پیدا ہو یا لونڈی کے ذریعہ سے، حرام کی بیٹی اپنی بیٹی ہی نہیں اگرچہ اپنے نطفہ سے ہو، لہٰذا زانی اپنی زنا کی بیٹی سے نکاح کر سکتا ہے، اگر حرام کی بیٹی کا نسب باپ سے ہوتا، تو اسے اس باپ کی میراث بھی ملتی مگر نہیں ملتی، اور یہ باپ کے خاندان سے مانی جاتی، مگر نہیں مانی جاتی، نیز باپ پر اس بیٹی کی پرورش واجب و لازم ہوتی، مگر واجب نہیں ہوتی، صرف ماں کی بیٹی مانی جاتی ہے، نیز حضور انور ﷺ فرماتے ہیں کہ بچہ مستحق فراش کا ہے، زانی کے لئے پتھر ہیں، معلوم ہوا کہ بچہ زانی کا ہوتا ہی نہیں جب حرام کی بیٹی پر نسب کے یہ احکام جاری نہیں، تو اس سے زانی باپ کا نکاح بھی حلال ہے، (امام شافعی از تفسیر کبیر) **نوٹ:** یہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے انتہائی دلائل ہیں جن کی بنا پر وہ حرام کی بیٹی کا نکاح زانی باپ سے جائز فرماتے ہیں، **جواب:** اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ یہاں قرآن مجید نے امہات اور بنات یعنی ماں اور بیٹیوں کو مطلقاً حرام فرمایا، حرام یا حلال کی قید نہیں لگائی، کہ فرمایا حُرِّمَتۡ عَلَیۡکُمۡ اُمَّهٰتُکُمۡ وَبَنٰتُکُمۡ آپ جب حرام کے بیٹے پر اس کی حرام کی ماں حرام کہتے ہیں، تو اسی قاعدے سے حرام کی بیٹی پر حرام کے باپ کو حرام مانیں کہ قرآنی طرز بیان بالکل یکساں ہے، دو حرمتوں کو یکساں طریقہ سے بیان فرمایا گیا، دوسرے یہ کہ حرمت اور چیز ہے، میراث و پرورش دوسری چیز، بہت جگہ میراث و پرورش نہیں جاری ہوتی، مگر حرمت موجود ہوتی ہے، دیکھو سوتیلی ماں پر نہ بچے کی پرورش ہے نہ میراث، مگر حرمت موجود ہے کہ سوتیلی ماں سے نکاح حرام ہے، بہت صورتوں میں بھانجی بھتیجی کو ماموں چچا کی میراث نہیں ملتی، اور نہ ماموں چچا کے ذمہ ان کی پرورش ہے مگر حرمت موجود ہے کہ ماموں پر بھانجی، چچا پر بھتیجی مطلقاً حرام ہے، حرمت کو میراث یا پرورش سے ثابت کرنا درست نہیں، تمہاری پیش کردہ حدیث کا مطلب کچھ اور ہے وہ یہ کہ ایک منکوحہ عورت کے بچہ پیدا ہوا، کوئی اجنبی شخص کہتا ہے کہ یہ بچہ میرا ہے، میں نے اس عورت سے زنا کیا تھا جس کا یہ بچہ ہے، مگر عورت کا خاوند کہتا ہے کہ بچہ میرا ہے، تو یہ بچہ خاوند کا ہوگا کہ وہ فراش یعنی مستحق ہے زانی کا نہ ہوگا، اسے تو اپنے اقرار زنا کی وجہ سے سنگسار کر دیا جائے گا، وہاں ثبوت نسب کا ذکر ہے نہ کہ حرمت کی بحث، بہر حال مذہب حنفی نہایت ہی قوی ہے، کہ حرام کی لڑکی زانی باپ پر حرام ہے،

تیسرا اعتراض: تم نے کہا کہ بچہ جس عورت کے دودھ کا قطرہ بھی پی لے، وہ بھی اس پر حرام ہے، مگر حدیث شریف میں ہے کہ ایک دو چسکیاں و گھونٹ حرام نہیں کر دیتے، پانچ گھونٹ حرام کرتے ہیں، تمہاری یہ تفسیر اس حدیث کے خلاف ہے (امام شافعی از تفسیر کبیر) **جواب:** حق یہ ہے کہ اس قسم کی تمام احادیث منسوخ ہیں، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ

تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ پانچ گھونٹ دودھ حرام کرتا ہے، پہلے یہ ہی حکم تھا مگر بعد میں منسوخ ہو گیا، حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آخری حکم جو قرار پایا وہ یہ ہے کہ تھوڑی سی رضاعت بھی حرام کرتی ہے اور بہت بھی، نیز کسی نے سیدنا عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا کہ عبد اللہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فتویٰ دیتے ہیں کہ ایک دو گھونٹ حرام نہیں کرتا آپ نے جواب دیا کہ رب تعالیٰ کا فتویٰ جناب ابن زبیر کے فتویٰ سے اعلیٰ ہے، رب تعالیٰ فتویٰ دیتا ہے کہ مطلقاً دودھ حرام کر دیتا ہے، پھر یہ ہی آیت تلاوت کی (روح المعانی) تمہاری پیش کردہ حدیث خود تمہارے بھی خلاف ہے، کیونکہ تمہارا مذہب یہ ہے کہ جب تک بچہ پانچ بار مختلف مجلسوں میں خوب پیٹ بھر کر دودھ نہ پی لے تب تک دائی اس پر حرام نہ ہوگی، اور تمہاری حدیث میں صرف پانچ چسکیوں کا ذکر ہے (روح المعانی) نیز تمہاری حدیث کا دوسری احادیث سے تعارض ہے، چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ دس گھونٹ دودھ سے بچہ عورت پر حرام ہوتا ہے، بہر حال مذہب حنفی بہت قوی ہے کہ جس عورت کے دودھ کا قطرہ بھی بچے کے پیٹ میں پہنچ جائے وہ عورت بھی بچہ پر حرام ہے، **چوتھا اعتراض:** تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ ڈھائی سال کی عمر میں دودھ پینا معتبر ہے، اس کے بعد اگر کسی کا دودھ پی لیا جائے، تو عورت حرام نہ ہو گی، اور یہ بچہ اس کا بیٹا نہ بنے گا، مگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑا آدمی بھی کسی کا دودھ پی لے، وہ بھی حرام ہو جاتی ہے، چنانچہ روایات میں ہے کہ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کسی کو اپنا دودھ کا بھانجا بنانا چاہتیں تو اپنی بہن ام کلثوم سے فرماتیں کہ وہ اسے اپنا دودھ پلا دیں، چنانچہ وہ کسی ذریعہ سے دودھ پلا دیتیں تو حضرت عائشہ صدیقہ اس سے پردہ نہ کرتیں، فرماتیں کہ میں اس کی خالہ ہوں، نیز حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ ابو حذیفہ کی بیوی سہلہ بنت سہیل حضور انور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر بولیں کہ یا رسول اللہ (ﷺ) سالم میرے پاس آتے ہیں تو ابو حذیفہ ناراض ہوتے ہیں، حضور انور ﷺ نے فرمایا کہ تم سالم کو اپنا دودھ پلا دو، پھر اس کی دودھ کی ماں ہو جاؤ گی، چنانچہ سہلہ نے ایسا ہی کیا، پھر حضرت سالم ان کے پاس آتے تو ابو حذیفہ ناراض نہ ہوتے، کہ اب حضرت سہلہ حضرت سالم کی دودھ کی ماں بن چکی تھیں، ان سے پردہ نہ رہا تھا، ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حرمتِ شیر خوارگی کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں، جس عمر میں بھی عورت کا دودھ پلا دیا جائے، عورت اس کی ماں بن جائے گی، نیز اس آیت کریمہ میں عمر کی کوئی قید نہیں، جب بھی عورت دودھ پلائے وہ اس کی ماں ہے اَرْضَعْنَكُمْ مطلق ہے، **جواب:** تم نے جس قدر احادیث پیش کیں، وہ تمام منسوخ ہیں جن پر اب حکم جاری نہیں، ان کی ناسخ یہ احادیث ہیں، چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ دو سال کے اندر رضاعت ہے، نیز ترمذی نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی، فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ رضاعت اس زمانہ ہی میں ہو سکتی ہے جبکہ دودھ پر بچہ گذارہ کرے، ابوداؤد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ رضاعت اس زمانہ میں ہی ہوگی جبکہ عورت کے دودھ سے گوشت و ہڈی بنے، مسلم بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک بار میرے پاس ایک شخص بیٹھا تھا کہ حضور انور ﷺ تشریف لائے، پوچھا یہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا، میرا دودھ کا بھائی ہے، فرمایا ذرا سمجھ لیا کرو کہ دودھ کا بھائی کون ہوتا ہے اَلرَّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ، شیر خوارگی

اس عمر میں ہوتی ہے جبکہ اس دودھ سے بھوک دفع ہو، اس قسم کی بہت سی احادیث ہیں، خود اس آیت کریمہ میں بھی اسی عمر کی طرف اشارہ ہے کہ فرمایا گیا اَرْضَعْنَكُمْ جس سے معلوم ہوا کہ دودھ جب ہی پلایا جائے جبکہ بچہ رضیع یعنی شیر خوار ہو، یہ احادیث ناسخ ہیں تمہاری پیش کردہ احادیث منسوخ (روح المعانی) **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا، کہ دودھ کے رشتہ سے صرف دو عورتیں ہی حرام ہوں گی، ایک دودھ کی ماں، دوسری دودھ کی بہن، مگر تمہارا عقیدہ یہ ہے کہ دودھ کے ذریعہ تمام وہ عورتیں حرام ہیں جو نسب کے ذریعہ حرام ہوتی ہیں، دودھ کی پھوپھی خالہ وغیرہ یہ حرمتیں کہاں سے نکال لیں؟ **جواب:** خود اس آیت سے اور بہت سی احادیث سے، اس آیت میں رب تعالیٰ نے دودھ دینے والی کو ماں فرمایا اور اس کی بیٹی کو بہن قرار دیا، جس سے معلوم ہوا کہ نسب کی طرح اس ماں کے تمام وہ رشتہ دار حرام ہوں گے جو نسبی ماں کے حرام ہوتے ہیں، اور اس بارے میں احادیث تو بے شمار وارد ہیں، ہمارا ایمان قرآن شریف کی طرح حدیث شریف پر بھی ہے، ہم نے نماز و زکوٰۃ قرآن شریف سے لیں، مگر ان کی تعداد و مقدار اور طریقہ ادا حدیث شریف سے لیا، چونکہ ابھی آیت ختم نہیں ہوئی، اس لئے اس کی تفسیر صوفیانہ یہاں بیان نہیں کی گئی، انشاء اللہ العزیز ختم آیت پر عرض کی جائے گی،

وَاُمَّهٰتُ نِسَآىٕكُمْ وَرَبَآىٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ

اور مائیں تمہاری عورتوں کی اور ان عورتوں کی بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں

اور تمہاری عورتوں کی مائیں اور ان کی بیٹیاں جو تمہاری گود میں ہیں

مِّنْ نِّسَآىٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ٘ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا

تمہاری ان بیویوں سے کہ صحبت کر لی ہے تم نے ساتھ ان کے پس اگر تم نے نہ صحبت کی ہو

ان بیویوں سے جن سے تم صحبت کر چکے ہو پھر اگر تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو

دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ٘ وَحَلَآىٕلُ اَبْنَآىٕكُمُ

ان سے تو نہیں کوئی گناہ تم پر اور بیویاں تمہارے بیٹوں کی

تو ان کی بیٹیوں میں حرج نہیں اور تمہارے نسلی بیٹوں

الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ٘ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ

جو تمہاری پشت سے ہوں اور یہ کہ جمع کرو تم درمیان دو بہنوں کے

کی بیویاں اور دو بہنیں اکٹھی کرنا

اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۟ۙ۲۳

مگر وہ جو گزر گیا بے شک اللہ ہے بخشنہار مہربان
مگر جو ہو گزرا بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

تعلقات

اس جملہ کا پچھلے جملہ سے چند طرح تعلق ہے، **پہلا تعلق:** مسلمان مرد پر عورتیں تین رشتوں سے حرام ہوتی ہیں، نسب رضاعت یعنی شیر خوارگی، سسرالیت جن میں سے دو رشتوں کا ذکر تو پہلے ہو چکا، نسب و رضاعت اور تیسرے رشتہ کا ذکر اب ہو رہا ہے، یعنی سسرالیت، لہٰذا یہ جزء پہلے جزء کا تمہ ہے، **دوسرا تعلق:** عورتوں کی حرمت دو طرح سے آتی ہے، اختیاری، غیر اختیاری، جن میں سے غیر اختیاری حرمتوں کا ذکر پہلے ہوا یعنی نسب و شیر خوارگی، کہ یہ رشتے انسان اپنے اختیار سے پیدا نہیں کرتا، اور اختیاری حرمت کا ذکر اب ہے، کہ انسان نکاح اپنے اختیار سے کرتا ہے جس سے یہ حرمتیں آتی ہیں، **تیسرا تعلق:** نسبی و رضاعی رشتے انسان نہیں توڑ سکتا، کہ جو عورت ماں بہن بن چکی وہ بن گئی، یہ شخص اس کے بیٹا ہونے، بھائی ہونے سے نکل نہیں سکتا، مگر سسرالی رشتہ انسان کے قبضہ میں ہے کہ چاہے رکھے چاہے توڑ دے، پہلے دو رشتوں کی تمام حرمتیں لازم ہیں کہ کبھی نہیں اٹھ سکتیں، مگر آخری سسرالی رشتہ کی دو حرمتیں لازم ہیں یعنی زوجہ کی ماں، دادی، نانی اور زوجہ کی بیٹی پوتی اور باقی حرمتیں غیر لازمی یعنی محض عارضی ہیں جیسے بیوی کی بہن، خالہ پھوپھی کی حرمت کہ جب تک بیوی نکاح میں ہے، یہ عورتیں حرام ہیں، جب بیوی نکاح سے باہر ہوئی، یہ عورتیں حلال ہوگئیں، ان دو حرمتوں اور ان کے رشتوں کا ذکر پچھلے جملہ میں تھا، تیسرے رشتہ و حرمت کا ذکر اب ہو رہا ہے، بہر حال یہ جملہ پہلے جملہ کے ساتھ پورا پورا تعلق رکھتا ہے،

تفسیر

وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ یہ عبارت وَاَخَوٰتُكُمْ پر معطوف ہے، واؤ عاطفہ ہے، یہاں بھی خطاب مسلمانوں ہی سے ہے، اُمَّهٰتُ سے مراد ساری اور ہر قسم کی مائیں ہیں بلاواسطہ ہوں یا بالواسطہ یعنی دادیاں نانیاں وغیرہ بشرطیکہ سگی ہوں، بیوی کی سوتیلی ماں، سوتیلی دادی وغیرہ حرام نہیں، نِسَآءِ سے مراد ہر وہ عورت ہے جس سے نکاح صحیح ہو چکا ہو، صحبت ہوئی یا نہ، جس عورت سے نکاح فاسد ہوا ہے اس کی ماں صحبت کے بعد حرام ہوگی پہلے نہیں (روح المعانی وغیرہ) جس سے نکاح باطل ہوا اس کی ماں بعد صحبت بھی حرام نہیں کہ یہ صحبت خالص زنا ہے اور زنا سے مزنیہ عورت کی ماں حرام نہیں ہوتی اس کی وہ بیٹی حرام ہوتی ہے جو اس مرد کے اپنے نطفے سے ہو، حضرت علی، زید ابن ثابت، عبداللہ ابن عمر، عبداللہ ابن زبیر، جابر، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ بیوی کی ماں بھی صحبت کے بعد حرام ہوگی، مگر جمہور صحابہ اور تمام ائمہ مجتہدین کا یہ ہی فرمان ہے کہ منکوحہ کی ماں بھی مطلقاً حرام ہے صحبت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، اس جملہ سے یہ ہی ظاہر ہے کہ یہاں نِسَآءِ مطلقاً فرمایا گیا، صحبت کی قید نہیں لگائی گئی، بعض مفسرین نے فرمایا کہ اسی میں لونڈیاں بھی داخل ہیں جن سے صحبت ہو چکی ہو، مگر حق یہ ہی ہے کہ یہاں اس میں وہ لونڈیاں داخل نہیں، نِسَآئِكُمْ میں صرف بیویاں داخل ہیں (روح المعانی و کبیر و خازن وغیرہ) وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ، یہ عبارت اُمَّهٰتُ پر معطوف ہے، واؤ عاطفہ ہے رَبَآئِبُ جمع ہے رَبِیْبَه کی جس کا مادہ ربی ہے بمعنی پرورش ربیب بروزن

فعیل صفت مشبہ ہے جو مذکر و مؤنث دونوں پر بولا جاتا ہے، مگر چونکہ یہاں صفتی معنی میں ہے، اس لئے اس پر مؤنث میں ت آ گئی، اور ربیب بمعنی مربوب ہے، یہاں ربیبہ سے مراد وہ لڑکی ہے جو اپنی بیوی کے پیٹ سے ہو دوسرے خاوند سے یعنی سوتیلی بیٹی، چونکہ عموماً سوتیلی لڑکی ماں کے ساتھ ہی رہتی ہے، اور سوتیلا باپ ہی اس کی پرورش کرتا ہے اس لئے اسے ربیبہ کہتے ہیں حُجُوْرِ، حجر کی جمع ہے بمعنی گود یعنی بغل سے لے کر کمر تک کا حصہ جسم جہاں بچہ کو بٹھایا جاتا ہے، یہ ح کے فتحہ سے بھی ہے کسرہ سے بھی، بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ حجرہ کی جمع ہے بمعنی گھر یعنی تم پر تمہاری وہ سوتیلی بیٹیاں حرام ہیں جو تمہاری پرورش میں ہیں یا رہیں، خیال رہے کہ پرورش کی قید اتفاقی ہے نہ کہ احترازی، چونکہ عرب میں عام طور پر سوتیلی بیٹیاں، سوتیلے باپ کی پرورش میں رہتی تھیں، اس لئے اس کا ذکر فرما دیا گیا، لہٰذا اگر سوتیلی بیٹی باپ کی پرورش میں بالکل نہ رہی ہو تب بھی حرام ہے جیسے رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ دونا دون سود نہ کھاؤ، اس کا مطلب یہ نہیں کہ سوایا ڈیوڑھا کھالیا کرو، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ فرماتے تھے جو سوتیلی بیٹی باپ کی پرورش میں نہ رہے وہ باپ پر حلال ہے، (روح المعانی) مگر تمام صحابہ وائمہ دین کا فرمان یہ ہے کہ سوتیلی بیٹی مطلقاً حرام ہے (روح المعانی، کبیر وغیرہ) مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ، یہ عبارت رَبَائِبُ کا حال ہے، نِّسَآئِكُمْ سے مراد بیویاں ہیں، دَخَلْتُمْ سے مراد صحبت یا خلوت صحیح ہے یعنی جن بیویوں سے تم نے صحبت یا خلوت کر لی ہو ان کے پیٹ کی بیٹیاں یعنی تمہاری سوتیلی بیٹیاں تم پر حرام ہیں، تمام مسلمانوں کے نزدیک یہ قید احترازی ہے یعنی جس منکوحہ عورت سے صحبت یا خلوت ہو جائے اس کی بیٹی، پوتی، نواسی، سب حرام ہیں فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ یہ جملہ اس مذکورہ شرط کا بیان ہے، دخول سے مراد صحبت، خلوت، شہوت سے بوس وکنار یا چھونا سب کچھ ہے، یعنی اگر تم نے اپنی بیوی سے صحبت، خلوت، بوس وکنار، مس وغیرہ کچھ نہ کیا تھا کہ وہ مر گئی یا اسے طلاق دے دی، تو اس کے پیٹ کی بیٹی سے تم نکاح کر سکتے ہو، اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں، خیال رہے کہ ربیبہ کی حرمت میں یہ قید اتفاقی تھی کہ فِیْ حُجُوْرِكُمْ اس سے کوئی شبہ کر سکتا تھا کہ شاید یہاں بھی صحبت کی قید اتفاقی ہوگی اس لئے فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا ارشاد ہوا جس سے بتایا گیا کہ یہ قید اتفاقی نہیں بلکہ واقعی اور احترازی ہے کہ جس عورت کی بغیر صحبت طلاق یا موت واقع ہو جائے اس کی بیٹی سے نکاح درست ہے، وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ یہ عبارت وَرَبَآئِبُكُمْ پر معطوف ہے، حَلَآئِلُ حلیلہ کی جمع ہے جو حلّ یا حلولٌ یا حلالٌ سے بنا، حل کے معنی ہیں کھولنا، حلال کے معنی ہیں مباح ہونا حلول کے معنی ہیں سمانا، چونکہ بیوی خاوند ایک دوسرے کو کھولتے بھی ہیں، ایک دوسرے کے بستر میں سماتے بھی ہیں اور ایک دوسرے کو حلال و مباح بھی ہوتے ہیں، اس لئے خاوند کو حلیل اور بیوی کو حلیلہ کہا جاتا ہے (روح المعانی وکبیر) حلیلہ میں بیوی حلال لونڈی دونوں داخل ہیں، اس لئے یہاں زوجہ نہ فرمایا، حلیلہ فرمایا، اَبْنَآءِ سے مراد ساری اولاد ہے، بیٹا، پوتا، نواسہ وغیرہ، اصلاب صلب کی جمع ہے بمعنی پشت و پیٹھ چونکہ نطفہ مرد کی پیٹھ میں رہتا ہے، عورت کے سینہ کی ہڈیوں میں، پھر بوقت صحبت ان مقامات سے چل کر رحم میں جا گزیں ہوتا ہے، اس لئے مِنْ اَصْلَابِكُمْ فرمایا، رب تعالیٰ فرماتا ہے یَخْرُجُ مِنْۢ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ (طارق: ۷) یعنی تم پر حرام ہیں اپنے صلبی و نسبی اولاد کی بیویاں اور لونڈیاں نسلی ونصبی کی قید پالک بیٹے کو

نکالنے کے لئے ہے کہ جسے منہ بولا بیٹا بنالیا جائے اس کی بیوی حرام نہیں، اپنے رضاعی وحرامی بیٹے کی بیوی بھی حرام ہے، نبی کریم ﷺ نے زینب بنت جحش اسدیہ سے نکاح کیا جو امیمہ بنت عبدالمطلب کے پیٹ سے تھیں یعنی حضور انور ﷺ کی پھوپھی کی بیٹی یہ پہلے زید ابن حارثہ کے نکاح میں تھیں، اور زید حضور انور ﷺ کے پالک یعنی منہ بولے بیٹے تھے، لوگوں نے اعتراض کیا کہ حضور انور ﷺ نے اپنی بہو سے نکاح کرلیا، تب یہ اور اسی قسم کی دوسری آیات نازل ہوئیں، جس میں ارشاد ہوا کہ اپنے نسلی وصلبی بیٹے کی بیوی حرام ہے نہ کہ منہ بولے کی (کبیر، خازن، روح المعانی، روح البیان وغیرہ) وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ یہ عبارت وَحَلَآئِلُ الخ پر معطوف ہے، اس لئے رفع کے محل میں ہے، اَنْ مصدر یہ ہے، جمع کرنے سے مراد نکاح یا حلال صحبت میں جمع کرنا ہے، الْاُخْتَيْنِ سے مراد ہر قسم کی بہنیں ہیں سگی ہوں یا ماں یا باپ شریکی یا دودھ کی، یعنی اے مسلمانو! تم پر یہ بھی حرام ہے کہ کسی قسم کی دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرو یا لونڈیاں خرید کر دونوں سے صحبت کرو، خواہ اس طرح کہ ایک بہن کو بیوی بنالو، دوسری کو لونڈی بنا کر صحبت کرو، یہ سب صورتیں حرام ہیں، اسی لئے اَنْ تَجْمَعُوْا فرمایا، خیال رہے کہ دو بہنوں کو جمع کرنا قرآن کریم نے حرام فرمایا، اور خالہ، بھانجی، پھوپھی، بھتیجی، ماں بیٹی، غرضکہ وہ دو عورتیں جو جانبین میں ایک دوسرے پر حرام ہوں ان کا جمع فرمانا حدیث شریف نے حرام کیا، لہٰذا اس قسم کی تمام عورتوں سے ایک ساتھ نکاح کرنا یا نکاح میں رکھنا حرام ہے اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اس کی تفسیر ابھی کچھ پہلے گذر چکی، کہ حق یہ ہے کہ یہاں گناہ سے استثناء ہے نہ کہ عمل سے، اور استثناء متصل ہی ہے نہ کہ منقطع، یعنی اب اگر ان مذکورہ عورتوں سے نکاح کرو گے یا انہیں نکاح میں رکھو گے تو سخت گنہگار ہو گے، ہاں جو پہلے ایسے نکاح کر چکے یا رکھ چکے وہ معاف ہیں کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا، اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے، احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی نے حضرت فیروز دیلمی سے روایت کی کہ جب میں اسلام لایا تو میرے نکاح میں دو بہنیں تھیں، فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ ان میں سے ایک کو رکھو، ایک کو طلاق دے دو، عطاء اور سدی فرماتے ہیں کہ دو بہنوں کا نکاح میں رکھنا اسلام میں حرام ہے پہلے بعض شریعتوں میں جائز تھا، چنانچہ لیاؔ اور راحیل دونوں بہنیں تھیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں بیک وقت تھیں، لیاؔ کے شکم سے یہودا پیدا ہوئے، اور راحیل کے بطن سے یوسف علیہ السلام اور بنیامین (واللہ اعلم) (تفسیر احمدی، حسینی وروح المعانی) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آپ نے ان دونوں بہنوں سے نکاح آگے پیچھے کیا، کچھ بھی سہی، اسلام کے اکثر احکام گذشتہ شریعتوں سے جداگانہ ہیں،

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! تم نسبی اور دودھ کے رشتوں سے عورتوں کی حرمت معلوم کر چکے، خیال رکھو کہ سسرالی رشتہ سے تم پر تین قسم کی عورتیں حرام ہیں، اپنی منکوحہ بیویوں کی ہر قسم کی مائیں بلاواسطہ ہوں یا بالواسطہ دادی نانی وغیرہ اور تم نے ان بیویوں سے صحبت کی ہو یا نہ کی ہو اور تمہاری مطلقاً سوتیلی بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں بشرطیکہ تم نے ان کی ماؤں سے صحبت کرلی ہو، اگر صحبت نہیں کی، اور وہ تمہارے نکاح سے خارج ہوگئیں کہ قبل از خلوت ان کی طلاق یا موت واقع ہوگئی، تو تم ان کی لڑکیوں سے نکاح کر سکتے ہو، یہاں بھی لڑکیوں میں بیٹیاں پوتیاں نواسیاں سب داخل ہیں، یوں ہی تم پر اپنے صلبی بیٹوں کی حلال عورتیں

حرام ہیں، خواہ ان کی بیویاں ہوں خواہ لونڈیاں جن سے وہ صحبت کر چکے ہوں منہ بولے بیٹے (پالک) کی بیوی حرام نہیں، کہ وہ تو تمہارا بیٹا ہی نہیں، اور تم پر یہ بھی حرام ہے کہ تم کسی قسم کی دو بہنوں کی خواہ حقیقی ہوں یا علاتی یا اخیافی نکاح یا صحبت میں جمع کرو کہ نہ تو ایک ساتھ دونوں بہنوں سے نکاح کر سکتے ہو، ورنہ ایک بہن کی موجودگی میں دوسری سے نکاح کر سکتے ہو، اگر ایسا کیا تو سخت گنہگار ہو گے، ہاں جو اس قسم کے نکاح تم اسلام سے پہلے یا اس قانون کے بننے سے پہلے کر چکے ہو اس کا تم پر گناہ نہیں، اللہ تعالیٰ اس قسم کے کاموں پر پکڑ نہیں فرماتا، کیونکہ وہ بخشنے والا بھی ہے مہربان بھی،

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **پہلا فائدہ:** اپنی بیوی کی ساری اصولی عورتیں حرام ہیں، ماں، دادی نانی وغیرہ جیسا کہ امھات کی تفسیر سے معلوم ہوا، **دوسرا فائدہ:** منکوحہ بیوی کی ماں مطلقاً حرام ہے، اس سے صحبت یا خلوت کی ہو یا نہ کی ہو، مگر لونڈی کی ماں جب حرام ہو گی جبکہ اس سے صحبت یا مس ہو چکا ہو، جیسا کہ نِسَآئِکُمْ کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ جب نساء کی نسبت مردوں کی طرف ہوتی ہے، تو اس سے آزاد عورتیں مراد ہوتی ہیں، **تیسرا فائدہ:** جس عورت سے زنا یا مقدماتِ زنا ہو جائیں، اس کی ماں وغیرہ بھی زانی پر حرام ہیں جیسا کہ نِسَآئِکُمْ کے اطلاق سے معلوم ہوا (حنفی)، **نوٹ:** یہ استنباط کچھ کمزور سا ہے، کیونکہ نِسَآئِکُمْ اکثر بیویوں پر بولا جاتا ہے جیسا کہ آیت ایلاء اور آیت ظہار میں نساء ارشاد ہوا، اور وہاں بیویاں مراد ہیں اگرچہ مباہلہ کی آیت میں نساء بیویوں بیٹیوں سب کو شامل ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَکُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَکُمْ (آل عمران: ۶۱) **چوتھا فائدہ:** اپنی سوتیلی بیٹی نواسی پوتی وغیرہ سب حرام ہیں، جیسا کہ وَرَبَآئِبُکُمُ کی تفسیر سے معلوم ہوا، **پانچواں فائدہ:** جس عورت کو بغیر خلوت طلاق دے دی جائے اس کی بیٹی مرد پر حلال ہے جیسا کہ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ کی تفسیر سے معلوم ہوا، **چھٹا فائدہ:** اپنے صلبی یا رضاعی بیٹے پوتے نواسے کی بیوی اور موطوءہ لونڈی حرام ہے جیسا کہ وَحَلَآئِلُ کی تفسیر سے معلوم ہوا، **ساتواں فائدہ:** اپنے سوتیلے اور پالک بیٹوں کی بیویاں حلال ہیں جیسا کہ مِنْ اَصْلَابِکُمْ سے معلوم ہوا، **آٹھواں فائدہ:** کسی قسم کی دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، لہٰذا اگر دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کیا تو دونوں نکاح فاسد ہوئے، اور اگر آگے پیچھے کیا، تو دوسرا فاسد یونہی اگر اپنی موطوءہ لونڈی کی بہن سے نکاح کیا، تو نکاح فاسد ہے، یہ حرام ہے کہ ایک سے نکاحاً صحبت کرتا ہے، دوسرے سے ملکاً، **نواں فائدہ:** مطلقہ کی بہن سے عدت کے اندر نکاح کرنا حرام ہے کیونکہ عدت بھی حکماً نکاح ہے، اسی لئے عدت کا خرچہ خاوند پر واجب ہے (حنفی) یہ تمام فوائد وَاَنْ تَجْمَعُوْا الخ سے حاصل ہوئے، **دسواں فائدہ:** کافر زمانۂ کفر میں جو اسلامی اصول کے خلاف نکاح کرے، پھر مسلمان ہو تو اس پر گذشتہ نکاح کی پکڑ نہیں، ہاں اب اسے اسلامی قانون کی پابندی کرنا پڑے گی، لہٰذا اگر کسی کافر کے نکاح میں دو بہنیں یا چار سے زیادہ بیویاں ہوں، اور وہ مسلمان ہو جائے، تو اب اسے ایک بہن اور چار سے زائد بیویوں کو الگ کرنا پڑے گا، مگر اس سے پہلے جو ان سے اولاد پیدا ہو چکی ہو وہ حلالی ہو گی، یہ فائدہ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ سے معلوم ہوا، **گیارھواں فائدہ:** جس عورت سے نکاح فاسد ہوا ہو، اس کی ماں صحبت کے

بعد حرام ہوگی، یہ فائدہ بھی نِسَآئِکُمْ سے حاصل ہوا کہ اپنی بیوی وہ ہی ہے جس سے صحیح نکاح ہو، اس کی ماں حرام ہے، نکاح فاسد والی بیوی ہی نہیں ہوتی نہ اس کی ماں ساس ہو،

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ صرف اپنی بیوی کی ماں حرام ہونی چاہیے نہ کہ اس کی نانی دادی، کہ فرمایا گیا وَاُمَّھٰتُ نِسَآئِکُمْ امہات ماؤں کو کہتے ہیں، پھر تم نے بیوی کی دادی نانی کو کیسے حرام مانا؟ **جواب:** تحریم کی آیات میں ام، اب، ابن سے مراد اپنے اصول وفروع ہوتے ہیں نہ کہ صرف ماں باپ بیٹا، پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ اُمَّھٰتُکُمْ تم پر تمہاری مائیں حرام ہیں، تو کیا معترض صاحب اپنی دادی نانی کو حلال مانیں گے؟ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ امہات سے مراد ہے تمام قسم کی مائیں بلاواسطہ ہوں یا بالواسطہ، اور نانی دادی بالواسطہ مائیں ہیں، **دوسرا اعتراض:** اس آیت کریمہ میں جب فرمادیا گیا کہ تمہاری وہ سوتیلی بیٹیاں تم پر حرام ہیں جن کی ماں سے تم صحبت کر چکے ہو، پھر بعد میں یہ کیوں فرمایا گیا کہ اگر تم نے ان کی ماں سے صحبت نہ کی ہو، تو وہ بیٹیاں حلال، یہ مضمون بے فائدہ اور زائد ہے، اس کی ضرورت نہ تھی، **جواب:** اس کی ضرورت تھی، کیونکہ فِیْ حُجُوْرِکُمْ کی قید اتفاقی تھی شاید کوئی سمجھ جاتا کہ یہ قید بھی اتفاقی ہے، اس لئے اس کی تصریح کی گئی، **تیسرا اعتراض:** صحبت یعنی مجامعت کی قید گذشتہ دونوں حکموں سے کیوں نہیں لگتی، آیت کے معنی یہ ہونے چاہئیں کہ اپنی بیوی کی ماں اور بیٹی دونوں اس وقت حرام ہیں جبکہ اس سے مجامعت کر لی ہو، **جواب:** یہ بالکل خلاف ظاہر ہے ظاہر یہ ہی ہے کہ یہ شرط جس جزء سے متصل ہو اسی کے لئے ہو، نیز بیہقی وغیرہ میں بروایت عمرو ابن شعیب عن ابیہ عن جدہ مروی ہے کہ فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ جس عورت سے نکاح کیا گیا اس کی ماں حرام ہے، خواہ اس بیوی سے صحبت ہو یا نہ ہو، اور اس کی بیٹی جب حرام ہوگی جب اس سے صحبت کر لی جائے، یہ حدیث اس آیت کی تفسیر ہے، نیز جمہور صحابہ کا یہ ہی قول ہے، نیز امام مالک نے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی، کہ کسی نے کوفہ میں ان سے مسئلہ پوچھا کہ اگر کسی عورت کو قبل از صحبت طلاق دے دی جائے تو اس کی ماں حرام ہے یا حلال؟ آپ نے فرمایا حلال ہے، پھر حضرت ابن مسعود مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو وہاں کے تمام فقہاء کو دیکھا، وہ ایسی ساس کو حرام قرار دیتے ہیں، تو آپ کوفہ آ کر پہلے اس سائل کے مکان پر گئے، اور اسے حرمت کا فتویٰ سنایا، پھر کسی اور کام میں مشغول ہوئے، خیال رہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسی ساس کو حلال فرماتے تھے، مگر جمہور صحابہ حرام کہتے ہیں (روح المعانی) **چوتھا اعتراض:** فِیْ حُجُوْرِکُمْ کی قید اتفاقی کیوں ہے؟ چاہیے کہ وہ ہی سوتیلی بیٹی حرام ہو جس کی یہ باپ پرورش کرے، **جواب:** یہ حکم صحابہ کرام کے قول سے معلوم ہوا، کہ سوائے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے باقی تمام صحابہ اس قید کو اتفاقی مانتے ہیں، (روح المعانی) **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ صرف دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، مگر تم کہتے ہو کہ خالہ، بھانجی، پھوپھی، بھتیجی وغیرہ کو بھی جمع کرنا حرام ہے، یہ حرمتیں کہاں سے لیتے ہو؟ **جواب:** حدیث سے قرآن کریم نے صرف سور کا گوشت حرام کیا، اس کے کلیجی گردوں کی حرمت حدیث شریف سے ثابت ہوئی، یوں ہی قرآن

کریم نے صرف سور کو حرام کیا، کتے، بلے، گدھے وغیرہ کی حرمت حدیث پاک سے ہی ثابت ہے پچانوے فی صدی شرعی احکام حدیث شریف سے اور پانچ فی صدی احکام قرآن کریم سے ثابت ہیں، پھر احکام قرآنیہ کی تفصیل بھی حدیث پاک ہی سمجھاتی ہے، بغیر حدیث کے قرآنی احکام بالکل ناممکن العمل ہیں، نماز وزکوٰۃ حکم قرآنی ہیں مگر حدیث شریف کے بغیر سمجھائے آپ نہ دو رکعت نماز پڑھ سکتے ہیں نہ ایک پیسہ زکوٰۃ دے سکتے ہیں، غرضکہ حدیث شریف قرآن کریم کی شرح ہے، اور شریعت کا رکن اعلیٰ، ضرورتِ حدیث کے لئے ہماری کتاب ''مرأت شرح مشکوٰۃ شریف'' کا مقدمہ ملاحظہ فرمایئے،

تفسیر صوفیانہ

اپنے جسمانی باپ دادوں کی بیویوں سے نکاح کرنا شریعت میں حرام ہے، اور روحانی باپ دادوں یعنی اپنے پیر، دادا پیر کی بیویوں سے نکاح کرنا طریقت میں ممنوع ہے، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جو مرید اپنے شیخ کی بیوی سے نکاح کرے وہ فیض سے محروم رہے گا کبھی کامیاب نہ ہوگا، اور جیسے اپنی جسمانی اولاد کی بیویوں سے نکاح کرنا شرعاً ممنوع ہے ایسے ہی اپنی روحانی اولاد یعنی اپنے مرید کی بیوی سے نکاح کرنا طریقت کے قواعد کے خلاف ہے، شیخ اپنے مرید کا مربی ہے اسے اور اس کے بیوی بچوں کو نظر شفقت سے دیکھے، دنیا و آخرت دو سگی بہنیں ہیں، آخرت بڑی بہن ہے اور دنیا چھوٹی بہن، جیسے دو بہنیں ایک کے نکاح میں جمع نہیں ہوسکتیں، ایسے ہی دنیا و آخرت ایک کے پاس جمع نہیں ہوسکتیں، طالب دنیا آخرت سے محروم رہے گا، اور طالب آخرت دنیا میں دل نہیں لگاتا، ایک دل میں یہ دونوں نہیں جمع ہوتیں، شعر

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دون ایں خیال است ومحال است وجنوں

یا انسان دنیادار ہی بن جائے یا دین دار ہی ہوجائے، خیال رکھو کہ دنیا وہ ہے جو رب تعالیٰ سے غافل کردے، جو رب تعالیٰ سے غافل نہ کرے وہ دین ہے، ایسی دنیا سنت رسول اللہ ﷺ، شعر

چیست دنیا از خدا غافل بودن نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

اللہ تعالیٰ ہم کو ان لوگوں سے بنائے جن کی دنیا بھی دین ہے، ان سے نہ بنائے جن کا دین بھی دنیا ہے، دین عدد ہے، دنیا صفر صفر علیحدہ ہو تو خالی ہے، اگر عدد سے مل جائے تو اسے دس گنا کر دیتا ہے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دنیا نے دین سے مل کر اسے دس گنا کر دیا، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان غنی کی غنا سے عطا فرمائے، آمین

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ وَ نُوْرِ عَرْشِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ
بِرَحْمَتِهٖ وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ

الحمد للہ کہ یہ پارہ ۲۶ شعبان ۱۳۸۰ھ بمطابق ۱۳ فروری ۱۹۶۰ء دوشنبہ کو شروع ہو کر آج ۲۲ ربیع الآخر ۱۳۸۱ھ ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۱ء یوم دوشنبہ کو ختم ہوا، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

احمد یار خاں نعیمی اشرفی بدایونی
مقیم چوک پاکستان گجرات۔ پاکستان